1947ء تا 2006ء
پاک بھارت تعلقات
تاریخ اور تجزیہ
طارق اسمٰعیل ساگر

(جملہ حقوق محفوظ ہیں)

نام کتاب ۔۔۔ پاک بھارت تعلقات

مصنف ۔۔۔ طارق اسمٰعیل ساگر

اہتمام ۔۔۔ سیّد فرحان زیدی

ٹائٹل ڈیزائن ۔۔۔ رامین امین

کمپوزنگ ۔۔۔ عاصم شہزاد (طاہر سنز آرٹ سیکشن)

پہلا ایڈیشن ۔۔۔ جولائی 2006ء

ناشر ۔۔۔ طاہر سنز اُردو بازار، لاہور

مطبع ۔۔۔ اکرم پریس، بلال گنج لاہور

قیمت ۔۔۔ -/750 روپے

ڈسٹری بیوٹر

اشرف بک ایجنسی کمیٹی چوک، راولپنڈی

فون: 051-5531610-5774682

Marfat.com

مضامین "پاک بھارت تعلقات"

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
	عرضِ مصنف	7
1	صورت اِک خرابی کی	9
2	حد بندی کا ڈھونگ	25
3	مسلم لیگ کا تحریری بیان	26
4	ریڈکلف کا غیر منصفانہ فیصلہ	27
5	منہ بولتا نقشہ	27
6	خفیہ سمجھوتہ	28
7	ماؤنٹ بیٹن کا ذوق خود پسندی	29
8	قائداعظم کا آہنی عزم	30
9	نامساعد حالات اور قیام پاکستان	30
10	جانبداری کا پول کھل گیا	31
11	ماؤنٹ بیٹن کی پاکستان دشمنی کے محرکات	33
12	بھارتی قیادت کی ریشہ دوانیاں	41
13	آزادی کے مسائل	42
14	سرحدوں کا تعین	44
15	اثاثوں کی تقسیم	46
16	باؤنڈری کمیشن	49
17	حیدرآباد، جوناگڑھ	52
18	فلیش پوائنٹ کشمیر	58
19	پاکستانی وفد کا جواب	93
20	مسٹر کرشنا مینن	94
21	گوپالا سوامی آئنگر	95
22	ہندوستان کی ہٹ دھرمی	96

Marfat.com

23	اجلاس ملتوی کرنے کی درخواست	96
24	دِلّی اور لندن میں ساز باز	97
25	منظر بدل گیا	98
26	یونائیٹڈ نیشن کمیشن برائے انڈیا و پاکستان	99
27	کمانڈر انچیف کی رپورٹ کا خلاصہ	100
28	سر اوون ڈکسن کا تقرر	103
29	سر جوزف فرینک گراہم کا تقرر	105
30	کشمیر کو کالونی بنانے کی پالیسی	106
31	پاکستان کو صحرا بنانے کی سازش	114
32	پاک بھارت خارجہ پالیسی کی ترجیحات	127
33	قیام پاکستان کے بعد اہم مذاکرات، پہلا دور 1947ء تا 1960ء	140
34	پاکستان میں مارشل لاء کا نفاذ	175
35	دوسرا دور 1961ء تا 1971ء	181
36	تاریخ سے مکالمہ	225
37	1972ء تا 1978ء	240
38	شملہ معاہدہ	244
39	معاہدۂ دہلی	248
40	اسلامی سربراہی کانفرنس	257
41	بھارت کا ایٹمی دھماکہ	259
42	کشمیر اکارڈ	261
43	ایٹمی تحفظ کی ضمانت	271
44	جنوبی ایشیا کو ایٹمی ہتھیاروں سے پاک رکھنے کی مہم	271
45	پاکستان کا نیوکلیئر پروگرام	273
46	سلال بند کا تنازعہ	276
47	1978ء تا 1988ء	278
48	مشترکہ وزارتی کمیشن	285
49	سیاچن کا مسئلہ	288
50	رنجیت ساگر اور وولر ڈیم	297
51	آپریشن Brass Tacks	298
52	براس ٹیکس کا پس منظر	300

Marfat.com

پاک بھارت تعلقات

53 1989ءتا1999ء 316

54 امریکی سفیر سری نگر میں 340

55 بھارتی ٹاسک فورس میں ٹوٹ پھوٹ 341

56 گوڑاحکومت کی خصوصی رشوت 342

57 سفیر براؤن کا دورۂ کشمیر 343

58 بھارتی اخبارات کا تجزیہ 344

59 پاک بھارت تجارت 345

60 مذاکرات یا جہاد 358

61 بھارت کے پردے میں امریکہ 362

62 تجارت کے اصل اہداف 365

63 کارگل 377

64 ''را'' کی پاکستان میں مداخلت 412

65 2000ءتا2006ء 425

66 ایشیا2005؟ 437

67 جنوبی ایشیا کا نیا نظام 438

68 ورکنگ باؤنڈری 441

69 آگرہ مذاکرات 448

70 نائن الیون 466

71 کنٹرول لائن پر بھارتی فوج کی نقل وحرکت 486

72 بھارتی پارلیمنٹ پر دہشت گردوں کا حملہ 492

73 ایک کے بعد ایک 521

74 بھارت کی جھنجھلاہٹ 552

75 کشمیراور پاک بھارت کشیدگی کا حل 576

76 بھا ت کا موقف 578

77 پاکستان کا موقف 578

78 ماضی میں مسئلہ کشمیر حل کرنے کی کوششیں 579

79 تعلقات کی بہتری کے لئے حالیہ پاک بھارت کوششیں 580

80 شوکت عزیز،من موہن سنگھ ملاقات 583

81 سٹیٹس کو 585

82 چناب فارمولا 586

Marfat.com

83 الحاق پاکستان 586
84 الحاق بھارت 586
85 مکمل خودمختاری 586
86 وادی خودمختار باقی تقسیم 587
87 وادی اور آزاد کشمیر ملا کر خودمختار علاقہ 587
88 2005ء اور 2006ء 596
89 پاک بھارت عسکری توازن 616
90 نیوی 618
91 فضائیہ 620
92 کشمیر کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا ہے 623
93 سارک پولیس کی مضحکہ خیز تجویز 640
94 مسئلہ کشمیر اور جمہوریت، امریکہ سے نا اُمیدی کے بعد؟ 645
95 سارک کا تاریخی پس منظر 647
96 دی ساؤتھ ایشین ایسوسی ایشن فار ریجنل کوآپریشن 648
97 سارک ممالک ایک نظر میں 649
98 سارک کی کہانی 651
99 سافٹا معاہدہ اور پاکستان کا معاشی مستقبل 670
100 بھارت کی آبی جارحیت 673
101 معاہدۂ امرتسر 677
102 معاہدہ قائمہ 679
103 کمیشن اقوام متحدہ برائے بھارت و پاکستان کی قراردادیں 682
104 ایوب نہرو مشترکہ اعلامیہ 686
105 اعلان تاشقند 687
106 معاہدۂ شملہ 689
107 2005ء میں پاکستان کی دفاعی پیش رفت 691
108 2005ء میں بھارت کے میزائل تجربات 692
109 بھارت کا میزائل نیٹ ورک 693
110 بھارت کی کامیاب خارجہ پالیسی 694
111 کتابیات 698

Marfat.com

عرضِ مصنف

''پاک بھارت تعلقات'' میرا ہمیشہ سے مرغوب موضوع رہا ہے۔ میرے قارئین جانتے ہیں کہ 1984ء میں جب میں نے صحافت کا آغاز روزنامہ ''نوائے وقت'' سے بطور سب ایڈیٹر کیا آج تک ''پاک بھارت تعلقات'' کے حوالے سے میں نے شاید ہی کوئی ایسا واقعہ ہوگا جس پر نہ لکھا ہو۔ احباب کا شدت سے تقاضا تھا کہ ان مضامین کو کتابی شکل دے کر محفوظ کرلیا جائے لیکن میں نے یہ مناسب نہیں جانا اور قیامِ پاکستان سے آج تک ''پاک بھارت تعلقات'' میں آنے والے نشیب وفراز کو اپنا موضوع بنا کر کوشش کی کہ ایک مکمل مربوط، تاریخی، تحقیقی، تجزیاتی اور واقعاتی عنصر کی مکمل تفصیلات رکھنے والی کتاب پیش کروں جو نہ صرف صحافت، تاریخ، عمرانیات، پاکستانیات کے طالب علموں کی راہنمائی کرتی رہے بلکہ ہر مسلمان پاکستانی نوجوان کی راہنمائی بھی کرے جو حقائق کی تلاش میں سرگرداں ہے اور جس کی آنکھوں کے سامنے تاریخ مسخ کی جارہی ہے۔

میں نے ایمانداری سے کوشش کی ہے کہ یہ کتاب ذاتی تعصبات سے بالاتر ہوکر لکھوں اور حالات کو پس منظر اور پیش منظر کے ساتھ قاری تک پہنچاؤں۔ اُمید تو یہی ہے کہ میں کامیاب رہا ہوں۔ فیصلہ بہرحال آپ نے کرنا ہے۔

Marfat.com

مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ پاکستان اور بھارت کے تعلقات کی تاریخ ہمہ پہلو ہے۔ صرف ترتیب وار واقعات کے اندراج سے کوئی درسی کتاب تو لکھی جا سکتی ہے تاریخ مرتب نہیں کی جا سکتی۔ اس حقیقت سے کوئی عقل کا اندھا ہی انکار کر سکتا ہے کہ بھارت نے پاکستان کو برابر کی حیثیت دینے کی کبھی کوشش نہیں کی اور ہمیشہ یہی سازش کی کہ پاکستان اُس کے کچھ کمزور ہمسایہ ممالک کی طرح اُس کی طفیلی ریاست بنا رہے جو انشاء اللہ کبھی ممکن نہیں ہوگا۔

اس کتاب میں اگر پروف ریڈنگ کی کوئی غلطیاں رہ گئی ہوں تو برائے کرم اُن کی اطلاع ضرور کیجئے۔

طارق اسمٰعیل ساگر
جولائی 2006ء

Marfat.com

صورت اِک خرابی کی

پاکستان اور بھارت کے باہمی تعلقات کا جائزہ لیا جائے تو اس تلخ سچائی سے انکار ممکن نہیں کہ دونوں ملکوں کے ماضی میں کبھی بھی مثالی تعلقات نہیں رہے۔ ''حال'' بھی یہی ہے اور مستقبل کے متعلق کوئی خوش فہمی پر مبنی رائے اس لیے نہیں دی جاسکتی کہ ماضی کے 58 سال سے صرف نظر ممکن نہیں۔ تاریخ کا طالبعلم بڑے مخمصے میں پڑ جاتا ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ دو بڑی عالمگیر جنگیں لڑنے کے بعد ایک دوسرے کے لاکھوں شہریوں کا قتل عام کرنے کے بعد بھی یورپی عوام ایک دوسرے کے لیے کیسے فراخدلانہ جذبات رکھتے ہیں اور انہوں نے دونوں عالمگیر جنگوں کو ماضی کی ایک تلخ سچائی سمجھ کر بھلا دیا ہے، اپنے شاندار مستقبل کے لیے اپنا حال سنوار لیا ہے۔ کیا پاکستان اور بھارت کی حکومتیں ایسا نہیں کر سکتیں؟ کیا ہم اچھے ہمسایوں کی طرح کبھی مل جل کر نہیں رہ سکتے؟ ان سوالات کے جوابات جاننے کے لیے قیام پاکستان کے تاریخی پس منظر پر ایک سرسری نظر ڈالنا ضروری ہے۔

ہندوستان ازمنہ قدیم سے بیرونی حملہ آوروں کی آماجگاہ رہا ہے۔ ابتدا میں وسط ایشیا کے آریاؤں نے ادھر کا رخ کیا اور مقامی دراوڑی قوم کو مغلوب کر کے انہیں جنوب کی طرف دھکیل دیا اور خود وادیٔ گنگا و جمنا میں آباد ہو گئے۔ ہندوستان کی تاریخ میں ایک عجیب بات یہ ہے کہ یہاں آریاؤں کے مذہب کے علاوہ اور کوئی مذہب پنپ نہیں سکا۔ ہندومت ہر نئی تہذیب کو اپنے اندر جذب کر لیتا اور کچھ عرصے بعد صرف اس کے چند نشانات رہ جاتے۔ بدھ مت اور جین مت گو ہندوستان کی پیداوار ہیں لیکن ہندوؤں نے ان کو بھی اپنی تہذیب و تمدن میں جذب کر لیا۔ تاریخ کا یہ عمل ہزاروں سال تک یونہی جاری رہا۔ اس طویل عرصے میں ہندوستان میں کئی عظیم الشان بادشاہتیں قائم ہوئیں جن میں موریہ اور گپتا سلطنتیں قابل ذکر ہیں۔ مسلمان ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں بطور تاجر جنوبی ہندوستان میں آئے پھر شمالی ہندوستان میں بطور فاتح داخل ہوئے۔ اس وقت ہندوستان پر مختلف ہندو راجاؤں کا غلبہ تھا اور ملک چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ یہ ہندو راجے آئے دن آپس میں برسرپیکار رہتے۔ توہمات اور مضحکہ خیز رسومات کا نام مذہب تھا۔ ہندو معاشرہ ذات پات کی تقسیم سے بری طرح مجروح ہو گیا تھا۔ براہمن کے علاوہ کسی اور کو بطور انسان جینے کے محدود حقوق حاصل تھے۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے جتنی غیر مسلم قومیں ہندوستان میں داخل ہوئیں، تمدنی لحاظ سے وہ بہت پسماندہ تھیں۔ اس لیے ان کی اپنی تہذیبیں بالکل مٹ گئیں اور انہوں نے ہندوؤں کے رسوم و رواج اختیار کر لیے اور انہی کی تہذیب اور انہی کا تمدن قبول کر لیا۔ مگر جب مسلمان ہندوستان میں آئے تو دوسری قوموں کی طرح ہندو انہیں اپنے معاشرے میں جذب نہ کر سکے کیونکہ مسلمانوں کے دینی عقائد نہایت مستحکم تھے۔ انہوں نے اپنی انفرادیت اور تشخص کو قائم رکھا۔ یہ دینِ اسلام کا

Marfat.com

فیضان تھا کہ مسلمانوں نے بدترین حالات میں بھی ''قوم رسول ہاشمی ﷺ'' کا تشخص برقرار رکھا۔ مسلمانوں نے برصغیر ہندوستان میں پہلی بار آٹھویں صدی عیسوی میں حکومت قائم کی تھی جبکہ عمادالدین محمد بن قاسم نے سندھ فتح کیا۔ اُسی زمانے سے برصغیر ہندوستان کی تاریخ پر اسلامی تہذیب اور ثقافت اثرانداز ہونے لگی۔ صدیوں پہلے ایرانی اور یونانی حملہ آور بھی برصغیر کی تاریخ میں اہم کردار ادا کرتے رہے مگر حق بات تو یہ ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی سے انیسویں صدی کے وسط تک مسلمان حکمرانوں نے برصغیر کا تہذیبی نقشہ ہی بدل ڈالا۔ وہ لگ بھگ ایک ہزار سال تک ہندوستان پر حکومت کرتے رہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ ان دس صدیوں میں مسلمان حکمرانوں نے اپنی ہندو رعایا کے ساتھ نہایت ہی عادلانہ سلوک روا رکھا۔ گو صدیوں سے ہندو اور مسلمان اکٹھے رہے تھے مگر ان میں کوئی بھی قدر مشترک نہیں تھی۔ پیدائش سے لے کر موت تک ان کے مزاج مختلف تھے۔ یہ دونوں قومیں ہر شعبۂ زندگی میں ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ تھیں۔ معمولی باتوں میں بھی ان دونوں قوموں کے اختلافات موجود تھے یہاں تک کہ ان کے لباس، ان کے بالوں کی کٹائی، ان کا رہن سہن، ان کی بود و باش، عادات، کھانا پینا، اُٹھنا بیٹھنا، زبان، فنونِ لطیفہ، فنِ تعمیر ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ مذہبی عقائد، نظریات، رسومات میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ہندوؤں نے بڑی کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کی انفرادیت ختم کر کے انہیں بھی دیگر اقوام کی طرح اپنے میں ضم کر لیں۔ بھگتی کی تحریک اور اس نوعیت کی دوسری تحریکوں کی یہی کوشش رہی مگر ان تحریکوں سے بھی مسلمان بالکل متاثر نہ ہوئے الٹا ہندوؤں میں مسلمانوں کے چند نظریات سرایت کر گئے جن میں سب سے بڑا نظریہ توحید کا ہے جس کی بنیاد پر ''سکھ دھرم'' نے جنم لیا اور ہندو دھرم پر پہلی بھرپور ضرب لگی۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تصادم کا سب سے اہم سبب بھی یہی ہے کہ ہندو مسلمانوں کو اپنے آپ میں جذب نہ کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ آگے چل کر مسلمان یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ اگر انہوں نے بحیثیت ایک الگ قوم ہندوستان میں زندہ رہنا ہے تو انہیں اپنے انفرادی تشخص کو قائم رکھنا ہوگا۔ ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یہ ہوتا رہا کہ ایک قوم جو باہر سے حملہ آور ہوئی اور یہاں آ کر آباد ہو گئی وہ اپنی تہذیب، تمدن، سیاست، ثقافت، غرض ہر شے سے بیگانہ ہو کر ہندومت میں جذب ہو کر ہندو قوم کا حصہ بن گئی۔ اس کا اپنے ماضی سے کوئی تعلق باقی نہ رہا۔ اس کے برعکس مسلمان ایک متحرک قوم تھی وہ ایک درخشاں تہذیب و تمدن کے وارث تھے، اُن کے علم اور حکمت کا شہرہ تھا، فنونِ جنگ میں بھی وہ ماہر تھے، مقامی باشندے ان کے مقابلے میں بہت ہی پسماندہ تھے۔ مغل بادشاہ اکبر نے جب الٹا ہندوؤں کو اسلام میں جذب کرنے کی کوشش میں دین اسلام سے انحراف کر کے دین الٰہی کی بنیاد رکھی اور سیاسی مصلحتوں کی بنا پر یہ چاہا کہ مسلمان قوم بھی اپنی انفرادیت اور تشخص سے الگ ہو کر ایک سیاسی وحدت اختیار کرے تو وہ اپنے مشن کی تکمیل میں بری طرح ناکام ہو گیا۔ اُس کا خیال تھا کہ دین الٰہی کے فروغ سے شاید مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان مذہب کی بنیاد پر ایک الگ قوم ہونے کا تصور باقی نہیں رہے گا، موقع پرست ہندوؤں نے تو دین الٰہی اختیار کر لیا مگر مسلمانوں نے اس بدعت کا مردانہ وار مقابلہ کر کے ''دین الٰہی'' کا نام و نشان تک مٹا دیا۔ مسلمانانِ ہندوستان کی تاریخ کے اس نازک موڑ پر جس رفیع المرتبت شخصیت نے مغل شہنشاہ اکبر سے ٹکر لی اور مسلمانوں کی جداگانہ قومیت، انفرادیت اور تشخص کو باقی رکھنے کا مجاہدانہ کردار ادا

Marfat.com

کیا وہ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ تھے۔ ان کے بعد ان کے مشن کو شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے آگے بڑھایا۔ تاریخ کا طالبعلم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہے کہ اورنگ زیب کے عہد میں ہندوستان کے گوشے گوشے میں مسلمانوں کی حکومت تھی، مگر تاریخ کے اس المیے سے ہر کوئی آگاہ ہے کہ 1707ء میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے انتقال کے بعد صرف پچاس سال کی مدت میں عیش کوشی، باہمی نفاق، جنگ و جدل، سازش اور غداری کے باعث ہندوستان سے مسلمانوں کی حکومت ختم ہوگئی اور برصغیر کی عظیم مغل سلطنت کو زوال آ گیا۔ یورپ سے آئے ہوئے فرنگی تاجر جو شہنشاہ جہانگیر کے عہد حکومت میں ہندوستان آئے تھے، خلیج بنگال اور بمبئی کی طرف سے قدم بہ قدم آگے بڑھتے رہے۔ سلطنت مغلیہ کے زوال سے جو چھوٹی بڑی ریاستیں وجود میں آئی تھیں وہ شاطر انگریزوں کا لقمۂ تر بن گئیں۔ برطانوی تاجر اپنی حیلہ جوئیوں اور پُرفریب چالوں سے ان میں پھوٹ ڈلواتے اور باہم لڑواتے رہے اور پھر خود ان کے علاقے غصب کرتے رہے۔ مسلمانوں کی بدقسمتی تھی کہ چند جاہ طلب مقامی امراء غداری اور دین فروشی پر اتر آئے۔ بنگال کا میر جعفر اور دکن کا میر صادق وطن فروشوں میں سرفہرست ہیں۔

مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان پہلا معرکہ 1757ء میں پلاسی کے میدان میں ہوا۔ اس جنگ میں بنگال کے نواب سراج الدولہ کو شکست ہوئی اور انگریز کامیاب ہوگئے۔ مسلمانوں کی شکست کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ ایک مارِ آستین میر جعفر نے نواب سراج الدولہ سے غداری کی اور وہ انگریزوں کے ساتھ مل گیا۔ بنگال کے ہندوؤں نے بھی اسلام دشمنی میں انگریزوں کا ساتھ دیا۔ امی چند، پورنیا، مہتاب رائے، سروپ چند اور ولبھ رام ہندو رؤسا نے نہ صرف مسلمانوں میں انتشار پیدا کیا بلکہ انگریزوں کے ساتھ سازش کر کے میر جعفر کو خریدنے میں بھی گھناؤنا کردار ادا کیا۔ میسور میں میر صادق برطانوی جرنیل ڈنلوپ کے ساتھ مل گیا اور اس نے شیر میسور سلطان فتح علی ٹیپو سے غداری کی اور اسلام دشمن فرنگیوں کا ساتھ دیا۔ سلطان ٹیپوؒ 4 مئی 1799ء کو قلعہ سرنگا پٹم کے دروازے پر لڑتے لڑتے شہید ہوگئے۔

سلطان ٹیپو شہید مسلمانانِ برصغیر کے ترکش کا آخری تیر اور برطانوی سامراجی عزائم کے سامنے آخری چٹان تھے۔ ان کے شہید ہوتے ہی پورا ہندوستان انگریزوں کی جھولی میں آ گرا۔ جنگ پلاسی 1757ء سے لے کر مئی 1799ء تک انگریز صرف بنگال، بہار، اُڑیسہ، مدراس اور بمبئی کے ساحلی علاقوں پر ہی قابض ہو سکے تھے لیکن 1803ء میں ہندوستان میں برطانوی سلطنت کی سرحد دریائے ستلج سے آ ملی تھی۔ ستلج کے پار سکھوں کی حکمرانی تھی۔ سلطان حیدر علی اور سلطان ٹیپو شہید کے بعد کوئی مقامی حکمران انگریزوں کا راستہ روکنے کی سکت نہیں رکھتا تھا۔ نظام حیدر آباد، تاجدار اودھ اور مختلف مرہٹہ راجاؤں نے انگریزوں کے بندگانِ بے دام بننا گوارا کر لیا تھا۔

آدھی صدی اور گزر گئی۔ اس دوران پنجاب میں سکھوں کے خلاف سید احمد شہید کی تحریک جہاد بظاہر ناکام ہو چکی تھی اور انگریز نے سکھوں کو دھوکہ دے کر اپنی حکومت درہ خیبر اور بولان تک قائم کر لی تھی۔ برصغیر پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے غاصبانہ قبضے کے پورے سو سال بعد مئی 1857ء میں جذبات کا لاوہ پھوٹ نکلا اور جنگ آزادی کا سلسلہ دہلی، کانپور، لکھنؤ، جھانسی اور دیگر شہروں تک پھیلتا چلا گیا۔ مقامی ریاستی حکمرانوں کی بے رخی، مغل دربار کی سازشوں اور ہندوؤں کے انگریزوں سے تعاون کا نتیجہ یہ نکلا کہ آزادی کی یہ عظیم جدوجہد ناکام رہی اور انگریزی استبداد پوری قوت کے ساتھ برصغیر

Marfat.com

پر مسلط ہو گیا۔ مسلمانوں کی امیدوں کا آخری چراغ جو دہلی میں ٹمٹما رہا تھا، وہ بھی 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد بجھ گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ ''انگریز بہادر'' جو تاجر کے روپ میں ہندوستان آیا تھا، اپنی عیاری اور مکاری اور مسلمانوں کے باہمی نفاق اور غداری اور ہندوؤں کی دشمنی سے ہندوستان کا تاجدار بن بیٹھا۔ انگریز مسلمانوں کو حریف اور قابلِ نفرت سمجھنے لگے۔ ہندوؤں کو اس بات کا بخوبی علم تھا کہ انگریز مسلمانوں کے خلاف ہیں چنانچہ انہوں نے مسلمان دشمنی میں اپنا دستِ تعاون انگریز حاکموں کی طرف بڑھا دیا۔ لہٰذا انگریز ہر میدان میں ہندوؤں کی سرپرستی کرنے لگے۔ اس کے نتیجہ میں ہندو تعلیم، تجارت، ملازمتوں اور صنعت پر چھا گئے۔

ہندوؤں کے نزدیک انگریزوں کی سب سے بڑی خدمت ایک ہی تھی کہ ان کو مسلمانوں کی حرکات سے خبردار رکھا جائے۔ جنگ آزادی کے فوراً بعد ہندوؤں نے اپنے آپ کو ایک نئے سانچے میں ڈھال لیا اور اپنی وضع قطع تبدیل کر کے انگریزوں کی مرضی کے مطابق بنالی۔ اپنا لباس اور رہن سہن بدل لیا، اپنے طور طریقے بدل لیے، انگریزی زبان سیکھ کر انہوں نے اپنے آپ کو مکمل طور پر انگریز کی مرضی کے مطابق ڈھال لیا اور انگریز کے ساتھ اس کی حکومت میں ''بابو'' بن کر داخل ہو گئے۔ مسلمانوں کے لیے یوں بدل جانا بہت مشکل تھا۔ وہ اسی طرح اپنی پرانی طرز پر قائم رہے۔ اپنی ہی ذات کے اندر محدود ہوتے گئے اور انگریزوں اور ہندوؤں دونوں نے مل کر مسلمانوں کے ساتھ اچھوتوں کا سا برتاؤ شروع کر دیا۔ انگریز کی اپنی ایک تہذیب تھی اور ایک مخصوص نظامِ حکومت تھا۔ اس نظام کی ایک خاص بات یہ تھی کہ رعایا کو مطمئن رکھنے کے لیے وہ ان کو نچلی سطح پر چھوٹے موٹے کام کرنے کے لیے شریکِ اقتدار کر لیتا تھا۔ اسی حکمت عملی سے اس نے ہندوؤں کو مراعات سے نوازنا شروع کر دیا۔ انگریز نے مسلمانوں سے سلطنت چھینی تھی لہٰذا وہ اُن پر اعتماد نہیں کر سکتا تھا اور مسلمانوں کے سینے میں بھی انگریز کے خلاف نفرت اور حقارت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ ہندو بھی ایک ہزار سال تک مسلمان کا غلام رہنے کے بعد جوشِ انتقام میں ہزار سالہ غلامی کا بدلہ لینے کے لیے انگریز کا کاسہ لیس بن گیا تاکہ اپنے انگریز آقاؤں کی شہہ پر وہ مسلمانوں پر اپنی برتری ثابت کر سکیں۔ چنانچہ انگریز نے مفتوحہ ہندوستان میں رعایا کو شریکِ اقتدار کرنے کے لیے جو تدابیر اختیار کیں ان میں ایک طریقہ یہ تھا کہ اس نے مقامی ادارے قائم کر دیئے جہاں ہندو اور مسلمان ایک محدود اور پابند طریقۂ انتخاب کے مطابق اپنے نمائندے منتخب کر سکیں۔ ان نام نہاد مقامی اداروں کے ذریعہ وہ اپنے اقتدار کو مضبوط کر رہے تھے۔

نظامِ حکومت اور تعلیمی نظام جو انگریزوں نے رائج کیا اس سے ہندوستان میں ایک نیا طبقہ پیدا ہو گیا۔ یہ نیا طبقہ انگریزی سیاست اور ادب سے بے حد متاثر تھا۔ اس طبقہ میں اکثریت ہندوؤں کی تھی کیونکہ زیادہ تر وہی انگریز سے تعاون کر رہے تھے۔ جب ہندوؤں میں انگریزی خواں طبقے کی تعداد بڑھی تو ان تعلیم یافتہ ہندوؤں نے انگریزوں سے مطالبہ شروع کر دیا کہ وہ زیادہ سے زیادہ ان کو حکومت کے اداروں میں شرکت کے مواقع دیں۔ آہستہ آہستہ ان کا یہ مطالبہ زور پکڑتا گیا۔ ہندو اسلام اور مسلمان دشمنی کے جذبے کے تحت مسلمانوں کے وجود کو مٹا دینے کی فکر میں تھے تاکہ آگے چل کر وہ ہندوستان پر بلا شرکت غیرے حکومت کر سکیں۔ اگر انگریز مقامی نمائندہ اداروں کے قیام کے عمل کو تیز کر دیتے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا کہ برطانوی سامراج کے سایہ تلے ہندوستان میں عملی طور پر ہندوؤں کی حکومت قائم ہو جاتی کیونکہ ان کی

Marfat.com

آبادی مسلمانوں سے تین گنا تھی اور طریقۂ انتخاب مخلوط تھا۔ اگر خدانخواستہ انگریزوں کے اشتراک سے حکومت میں ہندو غلبہ حاصل کر لیتے تو ان کی مذموم کوشش یہ ہوتی کہ اپنی غلامی کا بدلہ لینے کے لیے وہ مسلمانوں کے علیحدہ تشخص کو مٹانے کے لیے ایک آخری کوشش کرتے۔ مقامی اداروں کے قیام کے بعد ہندوستان کے مسلمان یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ وہ کس طرح اپنے سیاسی حقوق اور ملی وجود کا تحفظ کریں۔ اگر وہ ایسا نہ سوچتے تو ہندوؤں کی زبان، ان کی تاریخ اور مذہبی روایات مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے پر چھا جاتیں اور مسلمان صرف نام ہی کے مسلمان رہ جاتے۔

اکثر مسلمان انگریز کو غاصب سمجھتے تھے اور ان سے مفاہمت کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ جدید علوم اور انگریزی تعلیم حاصل کرنے سے گریز کرتے رہے چنانچہ برطانوی حکمرانوں اور ہندو بنیوں کی ملی بھگت سے مسلمان معاشی طور پر بھی مغلوب ہو گئے۔ انگریز اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ مسلمان برصغیر میں صدیوں حکمران رہے ہیں، گو ان کے اقتدار کا سورج غروب ہو چکا تھا مگر ان میں خوئے سلطانی ابھی باقی تھی۔ اس ''خوئے سلطانی'' کو ختم کرنے کے لیے انگریزوں نے ہندوؤں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیا اور مسلمانوں کو ہر شعبۂ زندگی میں کچلنے کے لیے منصوبے بنائے۔ جدید علوم کے لحاظ سے مسلمان بہت پیچھے تھے۔ معاشی طور پر نہایت ہی تنگدست تھے۔ سیاسی میدان میں وہ بے حیثیت تھے۔ ان کی سوچ بچار، فکر و عمل کے سوتے خشک ہو گئے اور ہر طرف یاس اور ناامیدی کی سیاہ گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ انہیں کہیں بھی امید کی کرن دکھائی نہیں دیتی تھی۔

ایسے وقت میں جب مسلمان قوم مایوس ہو کر ہمت ہار بیٹھی تھی۔ غم واندوہ اور محرومیوں کی اس تاریک اور طویل رات میں سرسید احمد خان کی شکل میں ایک درخشندہ ستارہ طلوع ہوا۔ مسلمانوں کی زبوں حالی، علمی پستی، ذہنی افلاس اور سیاسی ابتری کا بنظرِ غائر مطالعہ کر کے سرسید احمد خان اس نتیجہ پر پہنچے کہ اگر مسلمان معاشرتی، سیاسی اور علمی انحطاط کے گرداب سے نکلنا چاہتے ہیں تو انہیں تعلیم میں ترقی کرنا ہوگی۔ جدید علوم سیکھنا ہوں گے اور سرکاری زبان انگریزی پر عبور حاصل کرنا ہوگا۔ سرسید کی دوربین نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ اگر مسلمان تعلیمی لحاظ سے پسماندہ رہے تو وہ اپنا کھویا ہوا مقام حاصل نہیں کر سکیں گے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ہندو روز بروز ترقی کرتے چلے جا رہے ہیں اور حکومت کے کلیدی عہدے انہوں نے حاصل کر لیے ہیں۔ اقتصادی میدان میں بھی وہ اہم مقام حاصل کر چکے ہیں۔ لہٰذا ان کا خیال تھا کہ جدید تعلیم حاصل کیے بغیر مسلمان ہندوؤں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ سرسید نے اپنا سارا زور مسلمانوں کو نئے علوم سے روشناس کرانے کے لیے صرف کر دیا۔ یہ ایک بہت ہی مشکل، بے حد کٹھن اور سراسر جان لیوا کام تھا۔ ابتدا میں ان کے نظریات کی سخت مخالفت کی گئی لیکن سرسید بھی اپنی دھن کے پکے اور ارادے کے دھنی تھے۔ انہوں نے بے عزتی برداشت کر کے، گالیاں کھا کر، اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر اور تمام مخالفت کو نظر انداز کر کے 1875ء میں علی گڑھ میں ایک سکول قائم کر دیا جو دو برس بعد کالج اور بعد میں یونیورسٹی کی صورت اختیار کر گیا۔ یہی وہ علی گڑھ یونیورسٹی ہے جس کے متعلق قائداعظمؒ نے فرمایا تھا کہ یہ مسلم لیگ کا اسلحہ خانہ بنے گا۔ سرسید کی عظمت کے بارے میں ایک انگریز لکھتا ہے: ''سرسید کی صورت اور حکومت سے وفاداری پر مت جاؤ، یہ ہندوستان کا سب سے بڑا باغی ہے۔ اس کی برپا کردہ علمی تحریک کے پھلنے پھولنے کے ساتھ ہی برطانوی اقتدار کے دن پورے ہو جائیں گے''۔ اور آخر کار یہی ہوا کیونکہ اس مصلحِ قوم ہی نے سب سے پہلے فرمایا تھا کہ

Marfat.com

ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں جنہیں ایک دوسری سے الگ کرنے اور ایک دوسری سے دور رکھنے کی ساری ذمہ داری ہندو سوچ پر ڈالی جاسکتی ہے۔

1867ء میں جب ہندوؤں نے عدالتوں سے اُردو زبان کو ختم کرنے اور اس کی جگہ ہندی زبان کو رائج کرنے کی تحریک شروع کی تھی۔ سرسید احمد خان نے ہندوستان میں مخلوط انتخاب کے ذریعے تشکیل شدہ حکومتی اداروں کے قیام کی بھرپور مخالفت میں آواز بلند کی۔ انہوں نے ہندوستان کے انگریز حکمرانوں کو مخاطب کر کے یہ واشگاف اعلان کیا: ''مجھے یقین ہو گیا ہے کہ مسلمان اور ہندو اب کوئی کام بھی مل جل کر نہیں کر سکیں گے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی خلاف عداوت اور نفرت بڑھتی جائے گی اور تعلیم یافتہ ہندو اس نفرت کی آگ کو بھڑکانے میں جلتی پر تیل کا کام دیں گے۔ اس حقیقت کو اب تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ مسلمان اور ہندو دو الگ قومیں ہیں''۔

علی گڑھ کالج نے مسلمان اکابرین کی ایک کھیپ تیار کی۔ یہ لوگ ملی جذبات اور افکارِ حریت سے معمور تھے۔ وہ برطانوی حکمرانوں کو ان کی زبان میں ترکی بہ ترکی جواب دے سکتے تھے۔ ان قافلہ سالاروں میں سید فضل الحسن، مولانا ظفر علی خان، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی (علی برادران) شامل ہیں۔ یہ قائدین برصغیر میں مسلمانوں کی سیاسی تنظیم مسلم لیگ کو مضبوط کرنے میں بھی پیش پیش تھے۔ مسلم لیگ کی تشکیل میں بھی علی گڑھ سے وابستہ نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک کے علاوہ نواب سلیم اللہ خان آف ڈھاکہ اور ہز ہائی نس سر آغا خان کی خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں۔ اسلامیانِ ہند کی تحریکِ آزادی میں علی برادران کا کردار بھی قابلِ ستائش ہے۔ انہوں نے تحریکِ خلافت کے ذریعے پورے برصغیر میں آزادی کا شعلہ روشن کر دیا۔ دونوں بھائیوں نے آزادیٔ وطن اور اسلام کی خاطر بڑے دکھ اٹھائے حتیٰ کہ گیارہ برس جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں بھی رہے مگر انگریز سامراج کی سختیاں بھی ان کے پائے استقامت میں لغزش پیدا نہیں کر سکیں۔

سرسید احمد خان اور ان کے نظریات سے اتفاق کرنے والے مسلمانوں نے انگریز کے عطا کردہ مقامی اداروں کے قیام کی شدید مخالفت کی مگر مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو ہندوؤں کے خطرناک عزائم کے سامنے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کیے ہوئے تھا۔ وہ مستقبل کے اندیشہ ہائے دور دراز سے بالکل بے پروا تھا اور وہ ہندوؤں کے مذموم عزائم کو مطلقاً کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا اور ان کی نیت پر کوئی شک نہیں کرتا تھا۔ مسلمانوں میں یہ گروہ نہایت ہی مختصر تھا اور ان میں سے بیشتر انڈین نیشنل کانگرس میں شامل ہو گئے۔ ان کی سوچ یہ تھی کہ انگریز آقاؤں سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ زیادہ سے زیادہ نمائندہ حکومتی ادارے قائم کریں۔ اور انہیں بااختیار ادارے بنوائیں تاکہ ان کے ذریعے وہ اقتدار میں شرکت کر سکیں۔ اسی دور میں مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد ایسی بھی تھی جو انگریز حکمرانوں کے سخت خلاف تھی۔ ان کا حلقہ اثر بھی کافی وسیع تھا اور وہ کانگرس میں شمولیت کے سخت مخالف تھے۔ ان کا نکتہ نظر یہ تھا کہ ہندی مسلمان دنیائے اسلام کا ایک لازمی جزو ہیں لہٰذا ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے علیحدہ تشخص کو قائم رکھنے اور برطانوی سامراج سے نجات حاصل کرنے کے لیے دُنیائے اسلام کی تحریکوں کا ساتھ دینا چاہئے۔ مسلمانوں میں سیاسی اور ملی بیداری پیدا کرنے کے لیے ایک تحریک خلافت

Marfat.com

تھی۔ عالم اسلام کے ایک بہت بڑے لیڈر جمال الدین افغانی کی آرزو تھی کہ تمام دنیائے اسلام ایک جھنڈے تلے جمع ہو کر اپنا ایک خلیفہ چُنے۔اس کے احکامات کو مانے اور اپنے دل سے غیر مسلم حکومتوں اور غیر مسلم طاقتوں کا خوف بالکل نکال دے۔ جمال الدین افغانی کو ساری دنیا اکٹھی کرنے میں ایران، ترکی، مصر اور افغانستان میں تو اتنی کامیابی نہ ہوئی البتہ ہندوستان کے مسلمانوں پر ان کے خیالات کا گہرا اثر پڑا۔

1914ء کی پہلی عالمی جنگ میں ہندوستان کے مسلمانوں نے انگریزوں کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ انگریز کو مسلمان سلطنتوں کا دوست نہیں سمجھتے تھے۔لیکن انگریز کی اصلی طاقت کا راز چونکہ اس کی ہندوستانی مسلم فوج میں پوشیدہ تھا اس لیے انگریز نے مسلمانوں کے ساتھ سمجھوتہ کرلیا کہ جب جنگ ختم ہو جائے گی تو وہ ترکی کی خلافت بحال کروا دیں گے اور خلیفہ کو ساری دنیا کے مسلمانوں کا مذہبی لیڈر مانا جائے گا۔لیکن جب جنگ ختم ہوئی اور انگریز جیت گیا تو وہ اپنے وعدے سے پھر گیا۔اس نے خلافت بحال کرنے سے انکار کر دیا اسی سے ہندوستان میں مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تحریک خلافت کے نام سے چل نکلی۔اس وقت ہندوؤں کے سب سے بڑے لیڈر گاندھی نے بھی تحریکِ خلافت کا ساتھ دیا اور مسلمانوں کو یہ بتانا چاہا کہ ہندو لیڈران کے مطالبے میں ان کے ساتھ ہیں۔ چنانچہ 1920ء میں جب تحریک خلافت قائم ہوئی اور ترکِ موالات کی حکمت عملی کا آغاز ہوا تو ہندوستان کے بیشتر مسلمان زعماء نے اپنا مقصد برطانوی سامراج کا خاتمہ بنالیا اور اس کے حصول کے لیے وہ کانگرس میں شامل ہو گئی اور بڑی جرأت اور دلیری کے ساتھ ہندوؤں کے شانہ بشانہ انگریزوں کے خلاف تحریکوں میں حصہ لیتے رہے۔ان میں مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت سب سے نمایاں تھی۔ کچھ عرصہ تک مولانا محمد علی اور ان کے ساتھی کانگرس میں رہے لیکن جلد ہی ہندوؤں کے عزائم کھل کر سامنے آ گئے اور ان کا اصلی چہرہ بے نقاب ہو گیا۔ ہندوؤں کے مذہبی تعصب اور تنگ نظری سے یہ لوگ کانگرس کی پالیسیوں سے بیزار ہو گئے اور کانگرس سے مستعفی ہو گئے۔

تحریک خلافت کی ناکامی کے بعد کچھ ہندو لیڈر کھلم کھلا مسلم دشمنی پر اُتر آئے تھے جب انہوں نے دیکھا کہ انگریز مسلمانوں پر بندوق تان چکا ہے تو وہ اور بھی شیر ہو گئے۔ مسلمان دشمنی میں پہلی ہندو تحریک آریہ سماج تحریک تھی۔تحریک کا مقصد مسلمانوں کو ختم کرنا اور ہندوستان سے اسلام کو نیست و نابود کرنا تھا۔ان کے ساتھ ساتھ شدھی اور سنگٹھن کی تحریکیں بھی چلادی گئی تھیں ان کا مقصد بھی مسلمانوں کو ڈرا دھمکا کر یا ورغلا کر دوبارہ غیر مسلم بنانا تھا۔

انگریزوں نے ہندوؤں کو ان کی ''خدمات'' کے صلہ میں ایک تحفہ عطا کیا۔ یہ انڈین نیشنل کانگرس کا قیام تھا۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ ہندوؤں کی سب سے بڑی اور نمائندہ جماعت کانگرس جو آج بھی بھارت میں کام کر رہی ہے، 1885ء میں ایک انگریز مسٹر ہیوم نے اس کی بنیاد رکھی اور اسے ہندوؤں کے حوالے کر دیا۔شاید اس مہربانی کے صلہ میں کانگرس نے 1947ء میں آزادی حاصل کرنے کے بعد ایک انگریز لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہی اپنا پہلا گورنر جنرل بنائے رکھنا منظور کرلیا تھا۔

ہندوؤں کی نام نہاد قومی تحریک انڈین نیشنل کانگرس بظاہر انگریز دشمنی کا دعویٰ رکھتی تھی مگر در پردہ مسلمانوں کے خلاف سازشیں کر رہی تھی۔اس جماعت میں غالب اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ساری دنیا جانتی ہے کہ مسلمان بادشاہوں

Marfat.com

نے اپنے طویل دورِ حکومت میں ایک دن بھی ہندوؤں کو یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ ان کی رعایا ہیں یا انسانی رشتہ سے وہ مسلمانوں سے کمتر ہیں یا علمی اور ثقافتی اعتبار سے وہ ان سے چھوٹے درجے پر ہیں۔ حقیقت گو یہی تھی مگر مذہبی رواداری کی وجہ سے وہ یہ بات ظاہر نہیں کرتے تھے۔ لیکن جب ہندو اور مسلمان دونوں انگریز کے غلام بن گئے اور دونوں ایک بیرونی طاقت کی رعایا بن گئے تو اپنے اردگرد کے حالات سے اچھی طرح باخبر ہو کر ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنا جائزہ لیا اور انہیں پتہ چلا کہ انڈین نیشنل کانگرس مسٹر ہیوم نے صرف ہندوؤں کو فائدہ پہنچانے کے لیے بنائی ہے۔ چنانچہ 1906ء میں مسلمانوں نے ایک سیاسی جماعت کی بنیاد ڈالی اور اس کا نام مسلم لیگ رکھا لیکن ساتھ ہی یہ واضح اعلان کر دیا کہ یہ جماعت ہندوستان میں صرف مسلمانوں کے حقوق کی نگہداشت اور ان کی بہتری اور بھلائی کے لیے بنائی جا رہی ہے۔ اس میں کسی اور فرقے کو دھوکہ دہی سے یہ کہہ کر شامل نہیں کیا جائے گا کہ ہم اس کے حقوق کی نگرانی بھی کریں گے۔ یہ خالص مسلمانوں کی جماعت ہے اور اس کے ذمے مسلمانوں کے لیے ایک آزاد سنہرا اور روشن مستقبل پیدا کرنا ہے۔ مسلم لیگ کے قیام کے بعد اس کے قائدین نے سارے ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک جھنڈے تلے جمع ہو کر اپنے حقوق منوانے کے لیے آواز دی۔ اس وقت تک مسلمان اچھی طرح سے سمجھ گئے تھے کہ ہندو اور مسلمان دو قومیں ہیں اور وہ ساتھ ساتھ نہیں رہ سکتیں۔ وجہ یہ تھی کہ ہندو کی خواہش تھی کہ جونہی انگریز ہندوستان کو چھوڑ کر جائے، ہندوستان میں ہندو راج قائم کر دیا جائے، ہندوستان کا نام بدل کر اس کا ہزاروں برس پرانا نام بھارت رکھ دیا جائے۔ ہندوؤں کے رویئے اور ان کے عمل نے مسلمانوں پر ثابت کر دیا کہ وہ نہ صرف مسلمانوں سے نفرت کرتے ہیں بلکہ ان کے وجود کو بھی برداشت کرنے کو تیار نہیں۔

مسلمانوں کو جب احساس ہوا کہ ہندو ان کو غلام بنانے کے خواب دیکھ رہے ہیں اور ان خوابوں کو حقیقت میں تبدیل کرنے کے لیے سکیمیں سوچ رہے ہیں تو انہوں نے بھی دفاع کے لیے اقدامات کیے۔ انہی دنوں کراچی کا ایک نوجوان محمد علی جناح ولایت سے بیرسٹری کی تعلیم حاصل کر کے واپس وطن پہنچا، وہی بعد میں اسلامیانِ ہند کے قائداعظمؒ بنے۔ قائداعظمؒ جب لندن سے بیرسٹری کی ڈگری لے کر ہندوستان لوٹے تو وہ کانگرس میں شامل ہو کر ہندو مسلمانوں کی آزادی کا حل تلاش کرنے لگے۔ قائداعظمؒ چونکہ فطری طور پر غیر متعصب اور کھلے دل اور کھلے ذہن کے مالک تھے اس لیے انہوں نے ساری کوشش ہندو مسلم اتحاد پر صرف کر دی۔ ان کا خیال تھا کہ جس طرح سے میں ہندو اور مسلمان دونوں کو مظلوم سمجھتا ہوں اور عزت اور آبرو سے جینے کے لائق سمجھتا ہوں، دونوں کو غلام اور دونوں کو خوفزدہ اور سہمے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ دونوں کی آزادی کا خواہاں ہوں، اس طرح سے دوسرے ہندو لیڈر بھی یہی سمجھتے ہوں گے۔ 1905ء سے 1911ء تک قائداعظمؒ کانگرس کے ساتھ وابستہ رہے اور انہوں نے کسی ایسی جماعت کا ممبر بننا قبول نہ کیا جو مذہبی بنیادوں پر قائم کی گئی ہو وہ ایک آزاد خیال، صلح جو، امن پسند اور روشن ضمیر انسان تھے۔ قائداعظمؒ کی انتھک کوششوں کے باوجود نہ تو ہندو قوم کا رویہ بدلا اور نہ ہی کانگرس کے رویئے کے اندر لچک پیدا ہوئی۔ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھے۔ 1857ء کے بعد سے مسلمانوں پر پے در پے اتنے مظالم توڑے گئے تھے کہ ان کے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت ماند پڑ گئی تھی بس ایک بات تھی جس نے ہندوستان کے سارے مسلمانوں کو زندگی عطا کر رکھی تھی اور وہ زندہ رہنے کی آرزو، زندہ رہنے کا عزم اور مشکلات سے گزر جانے کا پختہ ارادہ قائداعظمؒ ہندو لیڈروں کی چالاکیوں اور مکاریوں سے تنگ آ کر

Marfat.com

کانگرس سے علیحدہ ہو گئے۔ اب انہوں نے اپنی تمام تر توجہ مسلمانوں کی پسماندہ اور مظلوم قوم پر دینا شروع کر دی۔ ان کا مقابلہ دو بڑے خوفناک دیوؤں کے ساتھ تھا جن میں سے ایک تو مکاری اور عیاری کا دیو تھا اور دوسرا ظلم اور وعدہ خلافی میں ساری دنیا میں مشہور تھا۔ بالآخر قائداعظمؒ، سرسیدؒ اور دیگر اکابرین کی طرح اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہندو اور مسلمان دو مختلف قومیں ہیں جو ہندوستان میں سینکڑوں سال سے ساتھ ساتھ آباد ہیں لیکن ان کے رہنے سہنے، کھانے پینے اور ان کے طریق عبادت اور ان کے فلسفۂ ایمان میں زمین آسمان کا فرق ہے اس لیے ان دونوں قوموں کو الگ الگ دو مختلف ملکوں میں اچھے ہمسایوں کی طرح رہنا چاہیے۔

مسلمان بادشاہوں نے اپنے دورِ حکومت میں اپنی ہندو رعایا کے ساتھ نہایت ہی شریفانہ سلوک روا رکھا تھا۔ زندگی کے ہر شعبے میں ان کی قدر و منزلت کی گئی اور ان کی مذہبی، تہذیبی اور تمدنی زندگی میں کوئی دخل نہ دیا۔ حکومت میں اعلیٰ عہدے بھی انہیں عطا کیے گئے۔ یہاں تک کہ ہندوؤں کے نزدیک ''متعصب'' بادشاہ اورنگ زیب کے دو قابلِ اعتماد فوجی جرنیل جسونت سنگھ اور جے سنگھ ہندو تھے۔ مسلمان بادشاہوں کی فراخ دلی، بردباری، سخاوت، اسلامی اقدار کی پاسداری کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ ایک ہزار سال تک ہندوستان میں مسلمان اقلیت ہی میں رہے۔ ہندوستان کے پایۂ تخت دہلی کے قرب و جوار کی آبادی کی اکثریت بھی ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ سکھوں کے گرو بابا نانک جی مسلمانوں کے زیرِ سایہ پروان چڑھے اگر مسلمان حکمران چاہتے تو ہندوستان کے ہر غیر مسلم کو مسلمان کر لیتے۔ اس فراخ دلانہ سلوک کے باوجود ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف جو نفرت کی چنگاریاں سُلگ رہی تھیں، مسلمانوں کی حکومت کے خاتمے اور انگریز کا سہارا حاصل ہونے کے بعد ان چنگاریوں نے شعلے کی شکل اختیار کر لی اور مسلمانوں کو تنہا ہی اس آگ سے محفوظ رہنے کے لیے غور و فکر کرنا پڑا۔ وہ اقلیت میں تھے۔ غیر منظم تھے اور جگہ جگہ بکھرے ہوئے تھے۔ لیکن مایوسی کے عالم میں انہوں نے اپنے ہوش و حواس قائم رکھے۔

اُس دور میں ہندی مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ان کا کوئی میرِ کارواں نہیں تھا۔ انہیں ایک رہبر کی تلاش تھی مگر ان ستم رسیدہ مسلمانوں کو راستہ بتانے والا کوئی بھی نہیں ملتا تھا۔ محمد علی جناحؒ جو آگے چل کر ہندی مسلمانوں کے قائداعظمؒ بنے، حالات سے دلبرداشتہ ہو کر انگلستان جانے کی فکر میں تھے۔ عین اس وقت انہیں امید کی ایک کرن نظر آئی۔ ایک مردِ قلندر کے نعرۂ باطل شکن سے طاغوتی منصوبے پرِ کاہ کی طرح بہہ گئے۔ یہ مردِ مومن شاعرِ مشرق حضرت علامہ محمد اقبالؒ تھے۔ ان کی ملی شاعری نے مسلمانانِ ہند کے ذہنوں میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔

1930ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس الہ آباد میں منعقد ہو رہا تھا جس کی صدارت شاعرِ مشرق حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ نے کی۔ وہ ایک عظیم قومی رہنما کی صورت میں ہندوستان کے سیاسی افق پر جلوہ افروز ہوئے اور ایک تاریخ ساز خطبہ میں ہندوستانی مسلمانوں کے علیحدہ وطن کا تصور پیش کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ برصغیر میں دو قومیں آباد ہیں: ہندو اور مسلمان۔ ان دونوں قوموں کے مابین اس قدر نظریاتی، تہذیبی اور تمدنی اختلافات ہیں کہ یہ کسی سیاسی نظام کے تحت بھی اکٹھی نہیں رہ سکتیں۔ مذہبی، ثقافتی، تاریخی اور فکری لحاظ سے مسلمان ہندوؤں سے بالکل الگ ہیں اس لیے ہندوستان کے وہ علاقے جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں، ملا کر ایک مسلم ریاست بنا دی جائے۔ آگے چل کر علامہ اقبالؒ کے یہی

Marfat.com

ارشادات ہی مملکت خداداد پاکستان کی اساس بنے۔ علاوہ اقبالؒ کے ان فرمودات نے برصغیر ہندوستان کی تاریخ کا رُخ ہی بدل ڈالا۔ آگے چل کر قائد اعظم محمد علی جناحؒ نے اقبالؒ کے خطبہ الہ آباد کی بنیاد پر ہی مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے حصول پاکستان کی جدوجہد کا آغاز کیا اور جب ان کی مساعی جمیلہ سے پاکستان معرض وجود میں آ گیا تو قائد اعظمؒ کے اس عظیم الشان کارنامے سے صرف تاریخ ہی نہیں بنی بلکہ جغرافیہ بھی بدل گیا۔ منتشر ہندی مسلمانوں کو ایک قوم وہ پہلے ہی بنا چکے تھے۔

علامہ اقبالؒ کے فرمودات نے ہندی مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کر دیا اور ان کے دلوں میں بھی اپنے لیے ایک علیحدہ آزاد مملکت قائم کرنے کا جذبہ پیدا ہونے لگا۔ اقبالؒ کے تصور پاکستان کو عملی جامہ پہنانے کے لیے قائد اعظمؒ نے یہ مطالبہ پیش کر دیا کہ برصغیر کے ان علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے ایک آزاد مملکت قائم کر دی جائے تاکہ مسلمان اپنے علیحدہ وطن میں اپنے دین، اپنی روایات اور اپنی ثقافت کے مطابق اپنی زندگی بسر کر سکیں۔ ہندوستان میں ایک علیحدہ اسلامی مملکت کے قائم ہونے سے نہ صرف ہندی مسلمانوں کے جذباتِ آزادی کی تسکین ہو جاتی بلکہ اُن کا علیحدہ ملی وجود اور تشخص بھی قائم رہ سکتا تھا اور برصغیر ہند میں ایک آزاد اسلامی مملکت کے قیام سے دنیائے اسلام کی قوت میں بھی اضافہ ہو جاتا۔ خطبہ الہ آباد میں اقبالؒ نے فرمایا:

''اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام بہ حیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ رہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم ایک مخصوص علاقے میں اپنی مرکزیت قائم کریں۔ میں ایک منظم اسلامی ریاست کا مطالبہ ہندوستان اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے کر رہا ہوں۔ اس سے ہندوستان میں توازنِ قوت کے باعث امن و امان پیدا ہو سکے گا اور اس امر سے مسلمانوں کو بھی اُس جمود کو توڑ ڈالنے کا موقع ملے گا جو صدیوں سے ان کی تہذیب و تمدن اور تعلیم اور شریعت پر طاری ہے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ ان کے صحیح ماضی کی تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانۂ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے''۔

برصغیر کے اندر ایک آزاد اسلامی مملکت کا یہ تصور دسمبر 1930ء میں پیش ہوا۔ ہندی مسلمانوں کی یہ خوش قسمتی تھی کہ اقبالؒ نے مسلمانوں کے تمام مصائب اور مسائل کا حل بروقت سوچ لیا۔ ہندوستان کے مسلمان جن سنگین مسائل سے دوچار تھے ان کا حل یہی تھا کہ برصغیر کو تقسیم کر کے مسلم اکثریت والے علاقوں میں مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ آزاد مملکت قائم کر دی جائے۔ پورے دس سال کی سخت جدوجہد کے بعد قائد اعظمؒ کی ذہنی فراست اور ولولہ انگیز قیادت سے 1940ء میں قراردادِ لاہور کی شکل میں اقبال کے تصورِ پاکستان کو عملی صورت حاصل ہوئی اور اس طرح پاکستان دنیا کے نقشے پر دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کے طور پر 1947ء کو اُبھر آیا۔

قراردادِ لاہور کے منظور ہونے پر ہندوؤں نے بُری طرح پیچ و تاب کھائے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ ''گئو ماتا'' کے ٹکڑے نہیں ہونے دیں گے۔ ان کے دامِ فریب میں آ کر سکھوں کے لیڈر ماسٹر تارا سنگھ نے اپنی کرپان نیام سے باہر نکال کر دھمکی دی کہ ہم پاکستان نہیں بننے دیں گے۔ آج چشمِ فلک وہ نظارہ بھی دیکھ رہی ہے جب وہی سکھ جنہوں نے اپنے ہندو آقاؤں کے اشاروں پر لاکھوں بے گناہ مسلمانوں کو شہید کیا، ہندوؤں کی گولیوں سے چھلنی کیے جا رہے ہیں۔

Marfat.com

قراردادِ پاکستان کے منظور ہوتے ہی کانگریسی لیڈروں کے سینے پر سانپ لوٹ گیا۔ انہوں نے اس کی مذمت میں بھرپور بیان دیئے اور ایک مرتبہ پھر پاکستان کے توڑنے کی ترکیبیں سوچنے لگے۔ ہندوؤں کے سب سے بڑے اور نامور لیڈر گاندھی نے کہا:

''دو قوموں کا نظریہ بالکل جھوٹ ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی اکثریت یا تو خود دوسرے مذاہب چھوڑ کر مسلمان ہوئی ہے یا ان کے آباؤ اجداد مسلمان ہوئے تھے۔ محض مسلمان ہو جانے سے وہ ایک جداگانہ قوم نہیں بن جاتی۔ میری روح اس امر کے تصور سے بغاوت کرتی ہے کہ اسلام اور ہندو دھرم دو مختلف اور متضاد کلچر ہیں اور دو مختلف نظریۂ حیات کے مذاہب ہیں'' (کلکتہ: 16 نومبر 1943ء)

کانگرس کے دوسرے بڑے لیڈر پنڈت جواہر لعل نہرو نے کہا:

''خود مسلمانوں کا فائدہ اسی میں ہے کہ وہ پاکستان کو قبول نہ کریں۔ ایسے پاکستان کو جسے وہ سنبھال نہیں سکیں گے اور جسے ہمیشہ غلامی میں مبتلا رہنا پڑے گا۔ کیونکہ اسے دوسری قومیں ہضم کر لیں گی۔ جنگ عظیم نے ہمیں یہ سبق دیا ہے کہ چھوٹی قوموں کی حفاظت ممکن نہیں اس لیے ہندوستان کو تقسیم کرنے کا موقع دینا بڑی غلطی ہے۔ پھر معاشی اور اقتصادی لحاظ سے بھی پاکستان کا بننا بہت غیر مفید بات ہے'' (دہلی: 22 اکتوبر 1944ء)

لارڈ ویول تو خیر اس وقت ہندوستان کا صرف وائسرائے ہی تھا۔ برطانیہ کے وزیراعظم لارڈ ایٹلی نے بھی نظریۂ پاکستان کے خلاف ڈٹ کر بیان دیا اور مسلم لیگ کو دھمکایا کہ کسی اقلیت کو اس بات کی اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ اکثریت یعنی ہندوؤں کے سیاسی ارتقاء کی راہ میں ایک بھاری پتھر بن جائے۔

اس وقت کے وزیر ہند لارڈ پیتھک لارنس نے کہا: ''ہمارا نصب العین یہی ہے کہ ہندوستان کو ہر حالت میں متحد رکھا جائے''۔

1940ء سے 1947ء تک کی مدت انگریزوں اور ہندوؤں کی سیاسی چالوں کی مدت ہے۔ سیاست کے میدان میں کوئی ایسا حربہ نہیں تھا جو انہوں نے مسلمانوں کو پاکستان بنانے سے روکنے کے لیے استعمال نہ کیا ہو۔ اس عرصے میں دوسری جنگ عظیم اور اس کا ہندوستان کی سیاست پر اثر، جنگی کونسل کا قیام، راجہ گوپال اچاریہ فارمولا، گاندھی- جناح ملاقاتیں، قائداعظمؒ اور گاندھی کے درمیان خط و کتابت، لیاقت- ڈیسائی معاہدہ، ویول پلان، شملہ کانفرنس اور اس طرح کے واقعات کے بیان کے لیے ایک الگ دفتر درکار ہے لیکن یہاں اتنی سی بات کا ذکر ضروری ہے کہ 1945ء کے آخر میں اور 1946ء میں جب ہندوستان کی مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے تو اس کے نتائج دیکھ کر ساری دنیا حیران رہ گئی۔ مرکزی اسمبلی میں مسلم لیگ نے یہ انتخابات نظریہ پاکستان کی بنیاد پر لڑے۔ ان انتخابات میں مسلم نشستوں پر مجلس احرار، خدائی خدمت گار، جمعیت العلمائے ہند اور یونی نسٹ پارٹی نے بھی مقابلہ کیا لیکن ہندوستانی مسلمانوں کے لیے مخصوص تیس نشستوں میں سے تیس کی تیس مسلم لیگ نے جیت لیں اور اس کے مخالفوں میں سے آدھے سے زیادہ لوگوں کی ضمانتیں ضبط ہو گئیں۔ اس طرح صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں بھی مسلم لیگ بھاری اکثریت سے جیت گئی۔ اس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ ہندوستان کے سارے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت مسلم لیگ ہی تھی۔

Marfat.com

برطانیہ کی حکومت اس بگڑی ہوئی صورت حال کو سنبھالنے کی اہل نہ تھی اور معاملہ اس کے اختیار سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ انگریز اس قتل و غارت گری کو اپنے سر لینا نہیں چاہتے تھے چنانچہ فروری 1947ء میں برطانیہ کے وزیراعظم نے اعلان کر دیا کہ ہندوستان میں جو شدید سیاسی اختلافات پیدا ہو گئے ہیں، ان کا دستور ساز اسمبلی پر بڑا اثر پڑ رہا ہے۔ یہ غیر یقینی صورت حال بہت خطرناک ہے اسے اور لمبا نہیں کیا جا سکتا اس لیے حکومتِ برطانیہ نے فیصلہ کیا ہے کہ ملک کا اقتدار جلد اس کے جائز وارثوں کے سپرد کر دیا جائے گا۔ اس خاص مقصد کے لیے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو لارڈ ویول کی بجائے ہندوستان کا وائسرائے مقرر کیا جا رہا ہے جو ہندوستانی نمائندوں کو حکومت کی ذمہ داریاں سونپیں گے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کے سارے وائسرایوں میں سب سے زیادہ کانگرس پرست نکلا۔ اس نے آتے ہی پہلے تو کانگرس کے ساتھ گہرے دوستانہ تعلقات استوار کیے۔ اس کے بعد وہ پنڈت جواہر لعل نہرو کا ''فیملی فرینڈ'' بن گیا۔ اپنی سرکاری ملاقاتوں میں اس نے کانگرس کے لیڈروں کے ساتھ تو گھریلو قسم کا رویہ اختیار کیا لیکن قائداعظمؒ کے ساتھ اس کا رویہ خشک اور گستاخ قسم کا رہا۔ لیکن فوراً ہی اسے معلوم ہو گیا کہ وہ ایک ایسی عظیم شخصیت سے دوچار ہے جس نے اپنی طویل سیاسی زندگی میں بڑے بڑے جابر حکمرانوں کے کس بل نکال دیئے تھے اور انہیں اپنی اصل حقیقت تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ جب ہندو لیڈروں، انگریز حاکموں اور سکھ سیانوں نے عزم و ہمت کے پرسکون پہاڑ یعنی قائداعظمؒ سے سر ٹکرا ٹکرا کر اپنا وجود زخمی کر لیا اور اس کی ہر دلیل کے سامنے اُن کے بڑے بڑے فلسفے ماند پڑ گئے تو انہوں نے ہندوستان کی تقسیم قبول کر لی اور پاکستان کا بننا منظور کر لیا۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل جیسے متعصب ہندو لیڈر نے بھی پاکستان کا وجود تسلیم کر لیا اور اپنے ایک خط میں لکھا کہ اگر مسلم لیگ پاکستان بنانے پر اصرار کر رہی ہے تو اس کو اسی صورت میں منظور کیا جا سکتا ہے کہ پھر بنگال اور پنجاب بھی تقسیم ہوں کیونکہ مسلم لیگ کو سارا بنگال اور سارا پنجاب نہیں دیا جا سکتا۔ بالآخر پنڈت نہرو نے بھی اس منصوبے سے اتفاق کر لیا کہ ہندوستان کو تقسیم کر کے اسے دو مملکتوں میں بانٹ دیا جائے۔ انہوں نے پاکستان قبول کر لیا تھا مگر اس شرط پر کہ بنگال اور پنجاب کی تقسیم عمل میں لائی جائے۔ آہستہ آہستہ ہندوستان کے دوسرے لیڈر بھی اس بات سے اتفاق کرنے لگے کہ اب پاکستان بن کر ہی رہے گا۔ اسے قبول کر لینا چاہیے۔

3 جون 1947ء کی شام وائسرائے ہندوستان لارڈ ماؤنٹ بیٹن، پنڈت جواہر لعل نہرو اور قائداعظمؒ نے آل انڈیا ریڈیو دہلی سے ہندوستان کے لوگوں کو مخاطب کیا اور بتایا کہ حکومت برطانیہ کے فیصلے کے مطابق ملک ہندوستان کا اقتدار ہندوؤں اور مسلمانوں کے نمائندوں کو الگ الگ سونپ دیا جائے گا۔ پنڈت نہرو نے کہا کہ میں اس فیصلے کا خیر مقدم خوشی کے ساتھ نہیں کر رہا ہوں۔ مجھے یہ گوارا نہیں تھا کہ ہندوستان کی کاٹ چھانٹ کی جائے مگر کشت و خونریزی روکنے کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں، اس لیے کانگرس اس منصوبے کو تسلیم کرتی ہے۔ سب سے آخر میں قائداعظمؒ نے اسلامیانِ ہند کو مخاطب کیا اور کہا کہ اگرچہ یہ منصوبہ مسلم لیگ کے مطالبات کے مطابق نہیں اس لیے میں اس سے مطمئن نہیں ہوں تاہم اس کی منظوری یا نامنظوری کا فیصلہ مسلم لیگ کی کونسل ہی کرے گی جس کا اعلان 9 جون کو طلب کیا گیا ہے۔ قائداعظمؒ نے اپنی تقریر ''پاکستان زندہ باد'' کے گرج دار نعرے پر ختم کی اور ہندوستان بھر کے مسلمانوں میں نہ ختم ہونے والی خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ گاندھی، نہرو، پٹیل اور تارا سنگھ کی شدید مخالفت کے باوجود آخر کار انگریز بادلِ نخواستہ برصغیر کے

Marfat.com

دس کروڑ مسلمانوں کا مطالبہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے اور سات برس کی کٹھن جدوجہد کے بعد 14 اگست 1947ء کو آفتابِ آزادی طلوع ہوا۔

ہندو قیام پاکستان کو تو نہ روک سکے مگر مکروہ سازش کے تحت انہوں نے پورے ہندوستان کو مسلمانوں کے خون سے رنگ دیا۔

پاکستان بن جانے کے بعد اور انگریزوں اور ہندوؤں کے شکست کھا جانے کے بعد دشمن کے لیے بس ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ وہ ہزاروں لاکھوں بے گناہ نہتے اور بے یارومددگار مسلمانوں پر مہلک ہتھیاروں سے حملے شروع کر دیں جو غیر مسلم اکثریتی علاقے چھوڑ کر قافلوں کی صورت میں پاکستان آ رہے تھے۔ ہزاروں لاکھوں معصوم اور بے گناہ عورتوں بچوں اور مردوں کا خون پاکستان کی بنیادوں میں اُتر رہا تھا اور پاکستان کو مضبوط کر رہا تھا۔ بھارت (ہندوستان کا اکثریتی علاقہ) اپنے انگریز گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی نگرانی میں اس کے احکام کے مطابق کشمیر جیسے مسلم اکثریت کے علاقے کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کر رہا تھا اور جوناگڑھ اور مانا وادر جیسی ریاستوں کو جنہوں نے پاکستان کے ساتھ شامل ہونے کا اعلان کیا تھا، بزورِ شمشیر اپنی مملکت کا حصہ بنا رہا تھا۔ پاکستان بن جانے کے بعد ہندوؤں نے اس کو کیسے کیسے گھیرا اور اس پر کس کس طرح سے وار کیے اس کے بیان کے لیے ایک الگ دفتر درکار ہے۔

تاریخ کے اوراق پر نظر دوڑائیں تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جائے گی کہ ہندوستان پر حکومت کے کم و بیش ایک ہزار سال کی طویل مدت میں مسلمان حکمرانوں نے اپنی غیر مسلم رعایا خاص طور پر ہندوؤں کے ساتھ جو فیاضانہ سلوک کیا اور جو رواداری برتی، فاتح اقوام کی تاریخ میں اس کی کہیں مثال نہیں ملتی۔ ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں نے ہندوؤں کے علوم و فنون کی سرپرستی کی، ان کے عالموں اور پنڈتوں کو سلطنت میں عزت و تکریم سے نوازا اور ان کی قدر افزائی کی۔ ان کے عہد حکومت میں ہندوؤں کی بہت سی مذہبی کتابوں کے سنسکرت سے ترجمے کرائے گئے اور کاروبارِ سلطنت میں بھی ہندوؤں کو اعلیٰ عہدے عطا کیے۔ جیسا کہ پہلے آ چکا ہے مغلیہ افواج میں بھی کئی سپہ سالار تک ہندو تھے جن میں راجہ مان سنگھ، جے سنگھ اور جسونت سنگھ کے نام نمایاں ہیں۔ مغلوں کا نظام مالگواری ایک ہندو منتظم راجہ ٹوڈرمل کا رائج کردہ تھا۔ اورنگ زیب عالمگیر جسے ہندو نفرت سے طعن و تشنیع کا نشانہ بناتے ہیں، حقیقت میں نہایت ہی عادل، نیک دل، روادار بادشاہ تھا۔ گذشتہ نصف صدی میں محققین اور مورخین نے شہنشاہ عالمگیر کے جو فرمان دریافت کیے ہیں ان کے مطالعہ سے یہ واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں اگر ہندوؤں کے کسی مندر کو کسی مسلمان کے ہاتھوں نقصان پہنچا تو ہندوؤں کی دلجوئی کے لیے وہاں فوراً سرکاری خرچ پر نیا مندر تعمیر کرا دیا گیا اور مقامی حکام کو نہایت ہی سختی سے تنبیہہ کی کہ وہ ایسے واقعات کا جو اسلامی شعائر کے خلاف ہیں اعادہ نہ ہونے دیں اور غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کا احترام کیا جائے۔ سلطان محمود غزنوی کے دور کے تمام مورخیں بھی اس امر پر متفق ہیں کہ سلطان کی غیر مسلم رعایا اپنی عبادت گاہوں، مندروں اور معبدوں میں اپنے اپنے طور طریقوں پر عبادت کرنے میں بالکل آزاد تھے۔ اور ان پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کی گئی تھی۔ سلطان ٹیپوؒ کی عطا کردہ مذہبی آزادی کی تفصیل دینے کے لیے علیحدہ دفتر درکار ہے۔ لیکن یہ افسوسناک بات ہے کہ فراخ دلانہ سلوک کے باوجود ہندو، مسلمانوں کو ہمیشہ ''شودر'' ہی سمجھتے رہے اور ان کے ساتھ وہ اُسی طرح پیش آتے

Marfat.com

رہے۔ وہ شودروں کی طرح مسلمانوں کو بھی ''ملیچھ'' اور ناپاک خیال کرتے رہے۔ مسلمانوں نے ہندوستان پر تقریباً ایک ہزار سال تک حکومت کی تھی اور ہندو صدیوں تک اُن کے محکوم رہے تھے۔ اگر مسلمان چاہتے تو وہ ہندوؤں کو اُس طرح ہندوستان کی سرزمین سے ملیامیٹ کر دیتے جس طرح مسلمانوں کا سپین سے صفایا کیا گیا تھا، مگر اسلام نے مسلمانوں کو رواداری کا درس دیا تھا لہٰذا ہندوؤں کی تہذیب اور ان کا تمدن اُس دور غلامی میں بھی محفوظ رہا۔ اُس کے برعکس ہندوؤں کے ادنیٰ سے ادنیٰ طبقے کا فرد بھی مسلمان سے نفرت کرتا تھا۔ اس سے میل جول بڑھانے کو ''مہاپاپ'' سمجھتا تھا اور اس سے علیحدہ علیحدہ رہتا تھا۔ اس کے دل میں مسلمان کے خلاف دشمنی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ نہ وہ کبھی مسلمان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتا اور نہ اُسے کبھی پاس بٹھا کر کھانا کھلاتا۔ ایک محکوم قوم ہوتے ہوئے جس طرح ہندوؤں نے ایک ہزار برس تک مسلمانوں کا سماجی بائیکاٹ کیے رکھا اُس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ جب ایک اکثریتی قوم کے دل میں اقلیتی قوم کے خلاف نفرت اور حقارت کا یہ عالم ہو تو اس کا لازمی ردعمل یہی ہوگا جو کہ ہندی مسلمانوں کا تھا۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ اکٹھے نہیں رہ سکتے، لہٰذا برصغیر کو تقسیم کر کے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ خطہ مختص کر کے ایک نئی مملکت کو معرض وجود میں لایا جائے۔ اقبالؒ نے فرمایا تھا کہ اگر مسلمان ایک قوم ہیں تو صرف اسلام کی بنیاد پر ہیں، اس کے سوا مسلمانوں کی قومیت کی اور کوئی بنیاد نہیں۔ انہوں نے ہندوؤں کے اس دعوے کی تردید کی کہ متحدہ ہندوستانی قومیت کی بنیاد رنگ و نسل، زبان اور جغرافیائی حدود پر قائم ہے۔ اسی نظریے کو بعد میں قائداعظمؒ نے مشعل راہ بنایا اور فرمایا کہ پاکستان کا مطلب یہ نہیں کہ ہم صرف انگریزوں کی حکومت سے چھٹکارا چاہتے ہیں، بلکہ اس سے ہماری مراد اسلامی نظریہ ہے جس کی حفاظت کرنا ہمارے لیے بے حد ضروری ہے۔ ہمیں صرف اپنی آزادی حاصل نہیں کرنا بلکہ اپنے آپ کو اس قابل بھی بنانا ہے کہ ہم نہ صرف اس کی حفاظت کر سکیں بلکہ اپنے آپ کو اس قابل بھی بنائیں کہ یہاں مسلمان اسلامی تصورات اور اصولوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ ایک اور موقعہ پر قائداعظمؒ نے ارشاد فرمایا: ''مسلمانوں اور ہندوؤں میں صرف مذہب ہی کا فرق نہیں بلکہ معاشرتی، تہذیبی اور تمدنی طور پر بھی یہ دو قومیں ایک دوسرے سے بالکل الگ تھلگ ہیں۔ ہمارا دین ہمیں ایک ضابطہ حیات عطا کرتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ ہم اسی ضابطے کے مطابق اپنی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں''۔ مسلم لیگ کے 1940ء کے تاریخی اجلاس لاہور میں قائداعظمؒ نے فرمایا: ''میرے لیے یہ اندازہ لگانا بہت مشکل ہے کہ آخر ہمارے ہندو بھائی اسلام اور ہندومت کی حقیقت اور ماہیت کو سمجھنے سے کیوں گریز کر رہے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ دونوں مذہب نہیں بلکہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف اور متصادم معاشرتی نظام ہیں اور اس بنا پر متحدہ قومیت ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھئے ہندو اور مسلمان مذہب کے معاملہ میں جداگانہ فلسفہ رکھتے ہیں۔ دونوں کی معاشرت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ یہ دو الگ الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کی بنیاد متضاد تصورات پر ہے۔ دو ایسی قوموں کو ایک نظام سلطنت میں یکجا کر دینا باہمی جنگ و جدل اور منافقت کو بڑھائے گا اور آخرکار اس نظام کو توڑ دے گا جو اس ملک کی حکومت کے لیے بنایا گیا ہے۔

14 اگست 1947ء بروز جمعۃ المبارک پاکستان اور ہندوستان کی دو الگ الگ مملکتیں معرض وجود میں آئیں اور اسی روز سے مشرقی پنجاب اور اس کی ریاستوں پٹیالہ، نابھہ، کپورتھلہ اور فرید کوٹ سے مسلمانوں کے منظم اور وسیع پیمانے پر قتل عام کی خبریں آنی شروع ہوگئیں۔ اس قتل و غارت میں ہزاروں مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ عورتوں کو اغوا کیا گیا۔ ان کے بے حرمتی کی گئی۔ بچوں کو سنگینوں کی نوکوں پر اچھالا گیا۔ عورتوں کی عصمت دری کے واقعات عام ہونے لگے۔ بعض قصبوں، شہروں، دیہاتوں میں مسلمان مردوں کو قتل کر کے نوجوان عورتوں کے برہنہ جلوس نکالے گئے۔ چند ہی ہفتوں میں تقریباً پانچ لاکھ مسلمان شہید کر دیئے گئے۔ اس کے بعد دہلی قتل و غارت کا میدان بن گیا۔ ہندوستان کے دارالخلافہ دہلی میں ستمبر کا سارا مہینہ نہتے مسلمانوں کا قتل عام ہوتا رہا۔ اس قتل عام کے مقابلے میں پہلے تمام تاریخی قتلِ عام ماند پڑ گئے۔ 15 اگست 1947ء سے ہندوستان میں مسلمانوں کے خون سے جو ہولی کھیلی گئی، ایک اندازے کے مطابق اس میں تقریباً دس لاکھ مسلمان شہید کر دیئے گئے۔ ایک کروڑ سے زیادہ مسلمان کسی نہ کسی طریقہ سے اپنی جان بچا کر نہایت ہی کسمپرسی کے عالم میں پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ ان مہاجرین کے ساتھ راستے میں کیا بیتی، وہ ایک علیحدہ داستان ہے۔ تارکین وطن کے قافلے جو پاکستان پہنچتے تھے ان میں ہزاروں پناہ گزیں مختلف بیماریوں میں مبتلا تھے۔ مہاجرین کی ایک ریل گاڑی جب دہلی سے لاہور پہنچی تو اس میں سفر کرنے والی عورتوں نے بتلایا کہ ہندوستان کی حکومت نے جو سپاہی ان کی حفاظت کے لیے گاڑی میں متعین کیے ہوئے تھے، انہوں نے کس طرح راستے میں ان کی عصمت دری کی۔ ایک ٹرین میں تقریباً تمام کے تمام دو ہزار مہاجرین کو امرتسر کے قریب ختم کر دیا گیا۔ اس طرح کے بے شمار دلخراش اور خونچکاں واقعات ہیں جن کے سامنے چنگیز خان، ہلاکو اور یزدگرد کے مظالم ہیچ دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن ایک طرف تو مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہایا جا رہا تھا مگر دوسری طرف دنیا پر اپنے مظالم پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ پروپیگنڈا کیا جا رہا تھا کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کو تباہ و برباد کر دیا ہے، ان کے گھر لوٹ لیے ہیں اور ان کی عورتوں کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ 26 ستمبر 1947ء کو اپنی پرارتھنا والی بیٹھک میں مسٹر گاندھی نے واویلا کیا کہ اگرچہ میں نے جنگ کی ہمیشہ مخالفت کی ہے لیکن اگر پاکستان میں ہندوؤں کا قتل روکنے کا کوئی اور طریقہ کامیاب نہ ہوا تو پھر اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہوگا کہ ہندوستان پاکستان کے خلاف جنگ کرے۔ عدم تشدد اور اہنسا کے دعویدار مہاتما کا یہ رُخ کتنا مضحکہ خیز تھا۔ پنڈت جواہر لعل نہرو بھی اسی انداز میں بولے: ''میں چاہتا تھا کہ اپنی فوجیں پاکستان پر حملہ کر دیں لیکن ہندوستان کی اندرونی گڑبڑ نے اس کی اجازت نہ دی''۔ مسلمانوں کو قتل و غارت کے ذریعے پاکستان دھکیلنے کا عمل جاری رہا حتیٰ کہ 1950ء میں بڑے پیمانے پر بنگال میں فساد شروع کرا دیا گیا جس کے نتیجہ میں وہاں سے قریباً دو لاکھ مسلمان کسمپرسی کی حالت میں مشرقی پاکستان میں ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئے۔

اپنی حکومت قائم کرنے کے بعد نہ صرف مسلمانوں کو مٹانے کی مہم چلائی گئی بلکہ ہندوؤں نے ان کی مساجد کو بھی شہید کرنا شروع کر دیا۔ سلطان محمود غزنوی کے زمانہ کی بنائی ہوئی سومنات کی جامع مسجد کو گرا کر اس کی جگہ مندر بنا دیا گیا اور اس ''رسم'' کی ادائیگی کے لیے ہندوستان کے صدر بابو راجندر پرشاد کو بلایا گیا۔ سومنات کی ایک ہزار سال پرانی مسجد گرانے کے بعد ہندوؤں نے دھڑا دھڑ مسلمانوں کی مسجدیں گرانی شروع کر دیں اور یہ عمل کئی سال تک جاری رہا۔ بجنور

Marfat.com

کے اخبار ''مدنیہ'' کی 28 جولائی 1965ء کے شمارے میں ایک خبر کے مطابق اس وقت تک صرف مشرقی پنجاب کے ایک شہر لدھیانہ میں 117 مسجدوں میں سے 9 گوردوارے بن چکے تھے۔ 15 میں مندر اور باقی ہندوؤں اور سکھوں کی رہائش گاہوں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ مسلمانوں کی تہذیب و تمدن مٹانے کے لیے بھی ہندوستان کی حکومت کے عزائم کوئی ڈھکے چھپے نہیں تھے۔

16.08.1947 کو دہلی کے انگریزی روزنامہ ہندوستان ٹائمز میں یوپی اسمبلی کے سپیکر معروف کانگرسی لیڈر لالہ پرشوتم داس ٹنڈن کی ہندوستان کے پہلے جشن آزادی کے موقعہ پر کی ہوئی تقریر شائع ہوئی جس میں اس نے کہا کہ ''ہندوستان میں جداگانہ زبان اور جداگانہ کلچر کی آواز کہیں سے نہیں نکلنی چاہئے۔ جو لوگ کسی خاص فرقے کے لیے جداگانہ زبان یا کلچر کی حمایت کرتے ہیں ان کے لیے ہندوستان میں کوئی جگہ نہیں۔ اگر یہ لوگ اپنے نظریات نہیں بدل سکتے تو انہیں ہندوستان چھوڑ کر کہیں اور چلے جانا چاہئے۔ اگر مسلمان ہندوستان میں رہنے کے خواہشمند ہیں تو انہیں ''ہندی'' کو بطور زبان اور ''ناگری'' کو بطور رسم الخط اختیار کرنا ہوگا۔ انہیں اپنی تہذیب اور تمدن کے لیے عرب یا پاکستان کی طرف نہیں دیکھنا چاہئے بلکہ بھارت کے کلچر کو اپنا کلچر بنانا چاہئے''۔ ایک اور کانگرسی لیڈر ہندو مسٹر وی پی شکلا نے جو صوبہ سی پی کا وزیر اعلیٰ تھا، بھی اسی طرح کی ہرزہ سرائی کی: ''میں ان مسلمانوں کو جن کے دماغ سے ابھی تک مسلم لیگی ذہنیت موجود ہے یہ چیلنج دینا چاہتا ہوں کہ آج ایک زبان اور تہذیب کے خلاف جو سازش ہو رہی ہے اسے ہم برداشت نہیں کریں گے''۔

(ملاپ: 12.12.1948)

دہلی کے اخبار ''الجمعیۃ'' فروری 1949ء کے شمارے میں بھارتی لوک سبھا کے سپیکر مسٹر ماولنکر کی ایک تقریر شائع ہوئی جس میں اس نے کہا: ''ہم اس وقت سخت کشمکش میں مبتلا ہیں۔ اگر اس کشمکش کا نتیجہ یہ نکلے کہ کسی اور فرقے کی زبان اور تمدن تباہ ہو تو اصول کا تقاضا ہے کہ اقلیت کے فرقے کی زبان اور تمدن کو تباہ ہو جانا چاہئے''۔

اس تلخ حقیقت سے کوئی ذی شعور انکار کی جرأت نہیں کر سکتا کہ ہندو لیڈر جو کانگرس جیسی بظاہر سیکولر جماعت کی نمائندگی کر رہے تھے قیام پاکستان کے مخالف تھے اور جب انہیں اس بات کا یقین ہو گیا کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو گمراہ کرنے کے باوجود بھی وہ پاکستان کو معرض وجود میں آنے سے نہیں روک سکتے تو انہوں نے اپنی حکمت عملی بدلی اور اس امر کے لیے کوشاں ہوئے کہ پاکستان کا قیام اگر ناگزیر ہی ہو چکا ہے تو یہ ایسا ٹوٹا پھوٹا اور کمزور ملک ہو کہ جس کے حکمران اور عوام اس کے قیام کے چند سال بعد ہی اپنی غلطی محسوس کر کے دوبارہ ہندوستان میں شامل ہو جائیں۔ اپنے اس منصوبے کا آغاز انہوں نے اپنے فرنگی مہربانوں کی مدد سے کیا۔ تفصیل اس اجمال کی سر ظفر اللہ خاں کی زبانی پیش ہے۔

Marfat.com

جسٹس دین محمد صاحب کا انکشاف کہ پنجاب کی حد بندی کی لائن بالا بالا طے پا چکی ہے اور حد بندی کمیشن کی کارروائی ایک ڈھونگ ہے

بدھ کی شام کو جسٹس دین محمد صاحب تشریف لائے وہ بہت پریشان معلوم ہوتے تھے۔ فرمایا تم اپنی طرف سے تحریری بیان تیار کرواور جیسے بن پڑے بحث بھی کرنا لیکن میں تمہیں یہ بتانے آیا ہوں کہ یہ سب کارروائی محض کھیل ہے۔ حد بندی کا فیصلہ ہو چکا ہوا ہے اور اسی کے مطابق حد بندی ہوگی۔ میں نے پوچھا آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا۔ انہوں نے فرمایا کل جب تم لوگ چلے گئے تو سر سیرل ریڈ کلف نے ہمیں بتایا کہ وہ کل صبح ہوائی جہاز میں اردگرد کا علاقہ دیکھنے جائیں گے اس پر میں نے کہا اگر آپ حد بندی کے سلسلے میں متنازعہ علاقہ اکیلے دیکھنے جارہے ہیں تو آپ ضرور اس معائنے سے کچھ تاثر لیں گے بطور امپائر آپ کا فرض ہے کہ اپنا فیصلہ اس مواد کی بنا پر کریں جو کمیشن کے روبرو پیش کیا جائے اور جو کمیشن آپ کی خدمت میں ارسال کرے۔ اس معائنے سے جو تاثر آپ لیں گے اس کا علم کمیشن کو کس طرح ہوگا؟ سر سیرل نے کہا اس پرواز کے لیے جو ہوائی جہاز مجھے مہیا کیا گیا ہے وہ فوجی قسم کا ہے اور اس میں زیادہ سواریوں کے لیے گنجائش نہیں۔ لیکن اگر آپ پسند کریں تو آپ میں سے دو اراکین میرے ساتھ چل سکتے ہیں۔ چنانچہ طے پایا کہ ایک مسلم اور ایک غیر مسلم رکن ریڈ کلف کے ساتھ جائیں۔ روانگی صبح سات بجے والٹن کے ہوائی اڈے سے تھی۔ جب یہ سب وہاں جمع ہوئے تو فضا گرد آلود تھی۔ پائلٹ نے کہا میں آپ کو لے چلتا ہوں لیکن گرد کی وجہ سے اوپر سے آپ کو کچھ نظر نہیں آئے گا اور آپ کا وقت ضائع ہوگا۔ اس پر ریڈ کلف نے پرواز منسوخ کردی۔ پائلٹ کو اس پرواز کے لیے جو تحریری ہدایات تھیں وہ میں نے دیکھی ہیں۔ تحریری ہدایات کے کاغذ پر پرواز کے لیے ایک لائن لگی ہوئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جس لائن پر پرواز کرنے کی ہدایت کی گئی ہے بالا بالا وہی حد بندی کی لائن پہلے سے طے پا گئی ہے۔ ریڈ کلف کو برصغیر میں آئے ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا، انہوں نے کچھ دن کلکتے میں گزارے ہیں۔ پنجاب کی حد بندی کے سلسلہ میں ابھی فریقین نے اپنے تحریری بیانات کمیشن کے روبرو پیش بھی نہیں کیے جن سے ریڈ کلف صاحب کو معلوم ہوتا کہ کون کون سے علاقے متنازعہ ہیں۔ فریقین کے بیانات سے متنازعہ علاقہ جات معلوم ہونے سے قبل ہی ان کے لیے ان علاقوں میں ایک خاص لائن پر پرواز کرنے کا انتظام کرنے سے یہی قیاس ہوتا ہے کہ حد بندی کے سلسلہ میں کسی طرف سے انہیں بریف کیا جا چکا ہے اور حد بندی کی لائن بھی تجویز کر کے ان کو دی جا چکی ہے جس کے مطابق بہت سا ایسا علاقہ جس میں مسلمانوں کی کثرت ہے بالخصوص ضلع گورداسپور کی تحصیلات بٹالہ و گورداسپور پاکستان میں شامل نہیں ہوں گی۔ ایسی صورت میں جبکہ حد بندی بالا بالا طے پا چکی ہے میرا اور منیر کا کمیشن کے ڈھونگ میں شامل رہنا مناسب نہیں۔ میں آج رات دِلی جا رہا ہوں کل صبح قائداعظمؒ سے مل کر یہ ماجرا ان کے گوش گزار کروں گا اور ان سے اپنے اور منیر کے کمیشن سے مستعفی ہو جانے کی اجازت طلب کروں گا۔ میں نے کہا اس واقعہ سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ حد بندی کا تعین پہلے سے ہو چکا ہے اور کمیشن کی کارروائی محض ڈھونگ ہے۔ آپ ضرور دِلی جائیں لیکن قائداعظمؒ کی خدمت میں یہ معاملہ پیش کرتے ہوئے یہ بات ضرور ذہن میں رکھیں کہ وہ قانونی طبیعت کے مالک ہیں اس لیے آپ اپنے استعفے کی بنیاد کسی قانونی عذر پر رکھیں ورنہ وہ رضامند نہیں ہوں گے۔ جسٹس دین محمد نے پوچھا تمہارے ذہن میں کوئی قانونی عذر آتا ہے۔ میں نے کہا آپ کہیں کہ ہم نے سر سیریل ریڈ کلف کو امپائر تسلیم

Marfat.com

کیا ہے اور ہم پر ان کے فیصلے کی پابندی لازم ہے لیکن امپائر کا فرض ہے کہ وہ اپنے فیصلے پر پہنچنے میں کسی دوسرے شخص کی رائے یا مشورے سے متاثر نہ ہو۔ پائلٹ کی ہدایاتِ پرواز سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی جانب سے امپائر کو یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ صوبہ پنجاب کی تقسیم کے لیے حد بندی کی لائن وہ ہونی چاہئے جو ہدایاتِ پرواز میں دکھائی گئی ہے۔ اب ہمارا حق ہے کہ امپائر کی مجوزہ پرواز کی غرض دریافت کریں اور یہ بھی دریافت کریں کہ اس لائن پر پرواز کرنے کا کس نے مشورہ دیا اور اس کی کیا اہمیت ہے۔ اگر ظاہر ہو کہ کسی دوسرے شخص نے مشورہ دیا ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں امپائر کی غیر جانبداری پر اطمینان نہیں رہا لہٰذا کمیشن کے پاکستانی نمائندے استعفے دے رہے ہیں۔ جسٹس دین محمد نے فرمایا میں اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش کروں گا اور پرسوں صبح دلی سے واپسی پر تمہیں اپنی ملاقات کے نتیجے سے مطلع کروں گا۔

جمعرات کی شام تک تحریری بیان کا مسودہ تیار ہو گیا۔ میں نے سردار شوکت حیات خاں صاحب کے دولت خانے پر ٹیلیفون کیا تو معلوم ہوا کہ سردار صاحب کی طبیعت ابھی تک علیل ہے۔ بخار کا درجہ حرارت 102 ہے اس لیے ٹیلیفون پر آنے سے معذور ہیں۔ پھر میں نے میاں ممتاز محمد خاں صاحب کی خدمت میں ٹیلیفون پر عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں آپ اور سردار صاحب دونوں تشریف لا کر مسودے کا ملاحظہ فرما لیں۔ لیکن سردار صاحب تو ناسازیٔ طبع کی وجہ سے معذور ہیں لہٰذا آپ ضرور تشریف لائیں اور تحریری بیان کا مسودہ دیکھ لیں۔ چنانچہ وہ تشریف لے آئے۔ میں نے تحریری بیان کا مسودہ ان کی خدمت میں پیش کیا اور گزارش کی کہ آپ اسے پڑھ لیں اور جو ترمیم آپ اس میں پسند فرمائیں وہ مجھے بتا دیں تا کہ آپ کے ارشاد کے مطابق اصلاح کر دی جائے۔ انہوں نے فرمایا جو کچھ تم نے لکھا ہے ٹھیک ہی ہو گا، مجھے پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے اصرار کیا آپ ضرور توجہ سے اسے پڑھیں اور آزادی سے تنقید کریں میں مسلم لیگ کی طرف سے بحث کرنے کی خاطر اطمینان چاہتا ہوں کہ لیگ کی طرف سے مجھے کیا ہدایت ہے۔ جس مسودے کی آپ تصدیق فرما دیں گے وہی میرا ہدایت نامہ ہو گا اور اسی کے مطابق میں بحث کروں گا۔ میرے اصرار پر میاں صاحب نے مسودہ توجہ اور غور سے پڑھا اور پڑھنے کے دوران میں بھی پسندیدگی کا اظہار فرماتے رہے اور آخر میں فرمایا: اس سے بہتر تحریری بیان نہیں ہو سکتا۔

مسلم لیگ کی طرف سے تحریری بیان پیش کر دیا گیا:

جمعہ کی صبح کو میں نے مسودے کی آخری نظر ثانی کی اور صاف ٹائپ ہونے کے لیے دے دیا۔ جسٹس دین محمد صاحب دلی سے واپسی پر سٹیشن سے سیدھے میری جائے قیام پر تشریف لائے اور بتایا کہ قائداعظمؒ استعفے کی تجویز پر رضامند نہیں ہوئے۔ انہوں نے فرمایا ہے کہ تم سب لوگ اپنی طرف سے پوری کوشش کرو امید ہے سب کچھ ٹھیک ہو گا۔ مسودہ صاف ٹائپ ہو گیا تو میں نے شیخ نثار احمد صاحب ایڈووکیٹ کے سپرد کیا اور وہ اسے باؤنڈری کمیشن کے دفتر میں بارہ بجے سے قبل داخل کر آئے۔

حد بندی کمیشن کے رُو برو بحث لاحاصل:

جمعہ کا باقی دن اور ہفتہ اور اتوار دونوں دن بحث کی تیاری میں صرف ہوئے۔ سوموار کو کمیشن کے روبرو بحث شروع ہوئی۔ فریق مخالف کی طرف سے مسٹر موتی لعل سٹیلواڈ جو تقسیم کے بعد بھارت کے اٹارنی جنرل مقرر ہوئے نے

Marfat.com

بحث کی۔ ان کے معاونوں اور مشیروں میں چیدہ چیدہ ہندو وکلاء شامل تھے جن میں بخشی ٹیک چند صاحب پیش پیش تھے۔ جس دن بحث ختم ہوئی اس سہ پہر کو مسٹر موتی لعل سیتلواڈ شیخ عبدالحق صاحب ایڈووکیٹ کے ہاں چائے پر مدعو تھے۔ چائے پر انہوں نے شیخ صاحب سے فرمایا: ''اگر حد بندی کا فیصلہ بحث میں پیش کردہ دلائل کی بنا پر ہوا تو تم لوگ بازی لے جاؤ گے''، لیکن کمیشن کی کارروائی ڈھونگ اور کمیشن کے روبرو بحث مباحثہ بالکل لاحاصل تھا۔

پنجاب کی حد بندی کے متعلق ریڈکلف کا غیر منصفانہ فیصلہ:

حد بندی کے فیصلے کے اعلان میں دیر ہوتی گئی۔ فیصلے کا اعلان 17 اگست کو ہوا۔ ان دنوں میں بھوپال میں تھا۔ ریڈیو پر فیصلے کا اعلان سن کر مجھ پر سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔ فیصلے میں حد بندی کی تقریباً وہی لائن مقرر کی گئی جس پر حد بندی کے تنازعہ کے متعلق فریقین کے تحریری بیانات کمیشن کے روبرو پیش ہونے سے بھی دو دن پہلے ریڈکلف نے معائنہ کے لیے پرواز کا ارادہ ظاہر کیا تھا، جو موسم کی خرابی کی وجہ سے پورا نہ ہو سکا۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے پرواز کے لیے پائلٹ کو جو ہدایات تھیں ان کا نقشہ جسٹس دین محمد صاحب کے ہاتھ لگ گیا تھا اور اسے دیکھ کر انہوں نے اس یقین کا اظہار کیا تھا کہ باؤنڈری کمیشن کی کارروائی صرف ایک ڈھونگ ہے اور جو لائن پرواز کی ہدایات والے نقشہ میں دکھائی گئی ہے وہی لائن بالا بالا پنجاب کی تقسیم کے لیے حد بندی کی لائن مقرر کی جا چکی ہے جس کے مطابق مسلم آبادی کی اکثریت والے کئی علاقے بالخصوص تحصیلات گورداسپور اور بٹالہ پاکستان کی بجائے ہندوستان میں شامل کیے جائیں گے۔ جس دن ریڈکلف نے پنجاب باؤنڈری کمیشن کے اراکین پر اپنے معائنہ کے ارادے کا اظہار کیا اس دن انہیں ہندوستان آئے ابھی صرف چھ دن ہوئے تھے۔ وہ 8 جولائی کو دلی پہنچے تھے اور ایک دو دن کے قیام کے بعد بنگال باؤنڈری کمیشن کے سلسلہ میں کلکتہ چلے گئے تھے جہاں سے وہ 14 جولائی کو لاہور آئے۔ یہ بات ناقابل یقین ہے کہ ان دو ایک دنوں میں جو وہ دلی میں ٹھہرے انہوں نے پنجاب کی تقسیم کے تنازعے کا خود مطالعہ کیا ہو اور بغیر فریقین کے دعاوی کو سنے حد بندی کے لیے خود ایک لائن تجویز کر کے اس پر معائنہ کے لیے پرواز کا فیصلہ کیا ہو۔ اس وقت تک وہ نہ پنجاب حد بندی کمیشن کے اراکین سے ہی ملے تھے نہ متعلقہ فریقین کے بیانات ہی دیکھے تھے۔ ظاہر ہے کہ حد بندی کی یہ لائن کسی اور نے تیار کرائی اور اس کا معائنہ کرنے کی انہیں ہدایت دی۔ یہ صرف قیاس ہی نہیں بلکہ اس کا ناقابل تردید ثبوت موجود ہے کہ پائلٹ کی ہدایاتِ پرواز والا نقشہ ماؤنٹ بیٹن کے چیف آف سٹاف لارڈ اسمے کے دفتر میں تیار کیا گیا تھا۔ جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے ہدایاتِ پرواز والا نقشہ دیکھ کر جسٹس شیخ دین محمد صاحب نے جس اندیشے کا اظہار کیا تھا وہ انہوں نے قائداعظمؒ سے بیان کر کے حد بندی کمیشن سے مستعفی ہونے کی اجازت چاہی تھی۔ قائداعظمؒ نے کمیشن سے مستعفی ہونے کی اجازت تو نہ دی لیکن 8 اگست 1947ء کو جسٹس دین محمد صاحب کی رپورٹ کی بنا پر انہوں نے چودھری محمد علی صاحب کی زبانی لارڈ اسمے کو ایک پیغام بھیجا کہ پنجاب کی تقسیم اور بالخصوص ضلع گورداسپور کی تقسیم کے متعلق انہیں تشویشناک رپورٹیں مل رہی ہیں اور اگر حد بندی وہی قرار پائی جس کے متعلق اطلاعات مل رہی ہیں تو اس سے پاکستان اور انگلستان کے تعلقات متاثر ہوں گے۔

منہ بولتا نقشہ:

چودھری محمد علی صاحب اپنی قابلِ قدر تصنیف جس کا نام The Emergence of Pakistan ہے،

Marfat.com

میں لکھتے ہیں کہ وہ یہ پیغام لے کر لارڈ اسمے سے ملنے وائسرائے ہاؤس گئے۔ اسمے اس وقت ریڈ کلف سے مذاکرات میں مصروف تھے۔ چودھری صاحب نے انتظار کیا۔ کوئی گھنٹہ بھر بعد اسمے فارغ ہوئے تو ان سے ملاقات ہوئی۔ چودھری صاحب نے قائداعظمؒ کا پیغام پہنچایا۔ اسمے نے کہا کہ انہوں نے یا ماؤنٹ بیٹن نے حد بندی کے معاملہ میں ریڈ کلف سے کبھی کوئی بات نہیں کیا اور انہیں اس امر کے متعلق ریڈ کلف کے خیالات کا کوئی علم نہیں۔ انہوں نے وضاحت سے کہا کہ حد بندی کے متعلق ریڈ کلف کو ان کی یا ماؤنٹ بیٹن کی طرف سے کوئی مشورہ نہ دیا گیا ہے نہ ہی دیا جائے گا۔ جب چودھری صاحب نے اس رپورٹ کی تفصیل بیان کی جو قائداعظمؒ کو ملی تھی تو اسمے نے کہا کہ انہیں چودھری صاحب کی بیان کردہ تفصیل سمجھ نہیں آ رہی۔ اسمے کے کمرے کی دیوار پر ایک نقشہ لٹک رہا تھا۔ چودھری صاحب نے اسمے کو اشارے سے نقشے کے قریب بلایا تاکہ نقشہ سے اپنی بات کی وضاحت کر سکیں۔ چودھری صاحب نے دیکھا کہ اس نقشہ پر صوبہ پنجاب میں پنسل سے ایک لکیر لگی ہوئی تھی جو بالکل اُس رپورٹ کے مطابق تھی جو قائداعظمؒ کو ملی تھی۔ چودھری صاحب نے اسمے سے کہا: قائداعظمؒ کو جو رپورٹ ملی اس کی وضاحت کے لیے کسی مزید تشریح کی ضرورت نہیں کیونکہ آپ کے نقشے پر پنسل سے لگی ہوئی لائن خود منہ سے بول رہی ہے۔ چودھری صاحب لکھتے ہیں:

"Ismay turned pale and asked in confusion who had been fooling with his map"

''اسمے کا رنگ فق ہو گیا اور وہ کھسیانہ ہو کر کہنے لگا میرے نقشے میں کس نے یہ گڑبڑ کی ہے۔''

آج تک نہ تو ریڈ کلف کی طرف سے اور نہ ہی ماؤنٹ بیٹن کی طرف سے اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ پنجاب حد بندی کمیشن کے اجلاس کے لیے لاہور پہنچنے سے پیشتر اور تنازعہ کے متعلق فریقین کے تحریری بیانات سے واقف ہونے سے پہلے ہی ریڈ کلف کے لیے جس لائن پر معائنہ کے لیے پرواز کا انتظام کیا گیا اس لائن کا نقشہ کس نے تجویز کیا اور اس معائنہ کی غرض کیا تھی۔ کیا یہ محض حسنِ اتفاق تھا کہ ریڈ کلف نے تقریباً اسی لائن کو ہی حد بندی لائن مقرر کرنے کا فیصلہ کیا جو ہدایاتِ پرواز میں دکھائی گئی تھی۔ چودھری محمد علی صاحب نے اپنی تصنیف میں اسمے کے نقشے کا جو واقعہ بیان کیا ہے اسؒ کی بھی آج تک تردید یا وضاحت نہیں کی گئی۔ ظاہر ہے کہ ریڈ کلف کے ہندوستان آنے سے پہلے ہی پنجاب کی تقسیم کے لیے ماؤنٹ بیٹن اور اس کے مشیروں نے حد بندی کا فیصلہ کر لیا ہوا تھا اور ریڈ کلف کو صرف ایک دستخط کرنے والی مشین کے طور پر استعمال کیا گیا۔

ماؤنٹ بیٹن اور کانگرس کا خفیہ سمجھوتہ:

تقسیمِ ہند کے متعلق پچھلے سالوں میں کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں اُن سے جو انکشافات ہوئے اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ ماؤنٹ بیٹن اور کانگرس کے ایک خفیہ سمجھوتے کے نتیجے میں ہوا جس کی رُو سے کانگرس نے ملک کی تقسیم اور تقسیم کے بعد برطانوی دولتِ مشترکہ میں شامل رہنا ان شرائط پر منظور کیا کہ اول: تقسیمِ ملک کی تکمیل اور انتقال اختیارات دو مہینوں کے اندر اندر کیا جائے۔ دوم: صوبہ بنگال کی تقسیم ہو اور کلکتہ ہندوستان میں شامل کیا جائے اور سوم: صوبہ پنجاب کی تقسیم ہو کر گورداسپور اور بٹالہ کی تحصیلات ہندوستان میں شامل کی جائیں تاکہ ریاستِ کشمیر کے ہندوستان

Marfat.com

سے الحاق کا جواز پیدا ہو سکے۔ اٹیلی کی وزارت کی طرف سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہدایت تھی کہ جس طرح بھی ہو سکے ہندوستان کی سالمیت قائم رکھی جائے اور فریقین کو کیبنٹ مشن پلان کے مطابق اختیارات کے انتقال پر رضامند کیا جائے کہ ہندوستانی افواج کی تقسیم کی نوبت نہ آئے اور دفاع کا یہ ادارہ آل انڈیا بنیاد پر قائم رہے اور دونوں ملک بحرِ ہند کے علاقہ کی حفاظت کے تعاون کرنے کا معاہدہ کریں۔ ظاہر ہے اٹیلی وزارت کی یہ ہدایات برطانوی مفاد کی حفاظت کی غرض سے تھیں تاکہ بحرِ ہند کے علاقہ میں روس کے اثر و نفوذ کو روکا جا سکے اور برطانیہ کے ہندوستان اور مشرقِ بعید کے تجارتی راستے محفوظ رہیں۔ ان ہدایات کے علاوہ ماؤنٹ بیٹن خود بھی ملک کی تقسیم کے سخت خلاف تھے اور ہندوستانی افواج کے بٹوارے کا تو ذکر بھی انہیں ناگوار تھا۔ انہوں نے آخر وقت تک سر توڑ کوشش کی کہ کسی طرح فریقین کو کیبنٹ مشن والی تجاویز کے مطابق انتقالِ اختیارات پر رضامند کر سکیں لیکن انہیں کامیابی نہ ہوئی۔ جب کیبنٹ مشن نے یہ تجاویز پیش کی تھیں تو تنازعہ ختم کرنے کی نیت سے قائداعظمؒ نے ان تجاویز کو منظور کر لیا تھا۔ کانگرس لیڈران نے بھی روایتی پُرکاری سے کام لیتے ہوئے اوپرے دل سے تو ان تجاویز کو منظور کر لیا لیکن فوراً بعد پنڈت نہرو اور بعض دوسرے کانگرسی لیڈران نے اپنے پبلک بیانات اور تقریروں میں کیبنٹ مشن کی تجاویز کی ایسی ایسی ''تعبیریں'' کیں جن سے ظاہر ہو گیا کہ ان کی نیت ان تجاویز پر عمل پیرا ہونے کی نہیں۔ کیبنٹ مشن کے اراکین کی ہمدردیاں اگرچہ مسلمہ طور پر کانگرس کے ساتھ تھیں لیکن انہوں نے ان ''تعبیروں'' کو غلط قرار دیا اور کوشش کی کہ کانگرسی لیڈران ان تعبیروں کو ترک کر کے کیبنٹ مشن کی تجاویز پر عمل پیرا ہونے کا صاف صاف اقرار کر لیں لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ لہٰذا مسلم لیگ نے بھی اپنی منظوری واپس لے لی۔ اس صورتِ حالات میں قائداعظمؒ ماؤنٹ بیٹن کے کہنے پر دوبارہ اس جال میں پھنسنے کو تیار نہ تھے اور انہوں نے کیبنٹ مشن کی تجاویز کو جن کا گلا کانگرسی لیڈر خود اپنے ہاتھوں سے گھونٹ چکے تھے، دوبارہ زندہ کیے جانے پر آمادگی ظاہر نہ کی۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا ذوقِ خود پسندی:

ماؤنٹ بیٹن کی شخصیت ضرور دلفریب تھی لیکن وہ سخت خود پسند تھے اور طبیعت میں خوشامد پسندی بدرجہ اتم تھی۔ جنگ میں جو کامیابی انہیں حاصل ہوئی تھی اس نے اُن کی خود پسندی میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ اپنے زعم میں وہ سمجھتے تھے کہ جس کام میں وہ ہاتھ ڈالیں اس میں انہیں لازماً کامیاب ہونا چاہیے۔ ایسی طبیعت والے شخص پر اپنے موقف کی مخالفت ناگوار گزرتی ہے اس لیے قائداعظمؒ کا مستقل مزاجی سے ان کے دام میں آنے سے انکار انہیں سخت ناگوار ہوا۔ یوں تو اپنے تقرر سے پہلے بھی ان کی شہرت ''کانگرس پسند'' اور ''مسلم لیگ کے مخالف'' کی تھی۔ اپنے قیام سنگاپور کے دوران میں وہ پنڈت نہرو سے مل چکے تھے اور ان سے بہت متاثر تھے۔ سر سٹیفورڈ کرپس کے دوست اور گاندھی جی کے ایلچی سدھیر گھوش کے قول کے مطابق کرپس نے ماؤنٹ بیٹن کے تقرر سے پہلے لندن میں ان کی دوبارہ ملاقات پنڈت نہرو سے کرائی تھی اور اس طرح ان کے تقرر پر ایک طرح پنڈت جی کی رضامندی حاصل کی تھی۔ ہندوستان آنے کے بعد ماؤنٹ بیٹن نے پنڈت نہرو اور دیگر کانگرسی لیڈران سے ذاتی تعلقات قائم کیے اور اول الذکر سے کھلم کھلا دوستانہ مراسم بڑھائے۔ ان کی خوشامد پسند طبیعت کا اندازہ لگا کر پنڈت نہرو اور دوسرے کانگرسی لیڈران نے ان کے جذبۂ خود پرستی کی ہر طرح تسکین کی اور ان کی اس کمزوری سے کماحقہ فائدہ اٹھایا۔ قائداعظمؒ تو خوشامد کے فن سے بالکل ناآشنا ایک سیدھے سادے مگر اپنی

Marfat.com

دُھن کے پکے انسان تھے لہٰذا وہ ماؤنٹ بیٹن کے ذوقِ خود پسندی کی تسکین کا سامان فراہم نہ کر سکے۔ اس کے برعکس انہوں نے مستقل مزاجی سے ملک کی تقسیم کے موقف پر قائم رہ کر ماؤنٹ بیٹن کے اولین مقصد یعنی برِاعظم کی سالمیت کو ناکام بنا دیا اور انہیں ان کی اور برطانوی لیبر وزارت کی مرضی کے خلاف تقسیمِ ملک پر مجبور کر دیا۔ اس شکست سے ماؤنٹ بیٹن کے پندار کو سخت ٹھیس لگی اور ان کے دل میں قائداعظمؒ اور ان کے مطالبۂ پاکستان کے خلاف گرہ بیٹھ گئی۔

قائداعظم کا آہنی عزم:

قائداعظمؒ کو تقسیم ملک کے مطالبے سے باز رکھنے کی نیت سے کانگرس نے جوابی مطالبہ کیا ہوا تھا کہ اگر ملک تقسیم ہوتا ہے تو پھر پنجاب اور بنگال کے صوبوں کی بھی تقسیم ہو کر مسلم آبادی والے علاقے علیحدہ ہونے چاہئیں۔ جب ماؤنٹ بیٹن قائداعظمؒ کو کسی طرح بھی تقسیم ملک کے مطالبہ کو ترک کرنے پر آمادہ نہ کر سکے تو انہیں ان کے انگریز افسران نے جنہیں وہ انگلستان سے ساتھ لائے تھے، مشورہ دیا کہ وہ قائداعظمؒ کو صاف صاف الفاظ میں دھمکی دیں کہ اگر وہ کیبنٹ مشن کی تجاویز پر عمل پیرا ہونے پر رضامند نہیں ہوتے تو پھر ملک کی تقسیم کی صورت میں بنگال اور پنجاب کے صوبے بھی لازماً تقسیم کیے جائیں گے۔ کانگرس کے چوٹی کے لیڈران کی طرف سے بھی انہیں یہی مشورہ دیا گیا بلکہ امید ظاہر کی گئی کہ جب بنگال اور پنجاب کے مسلمان اپنے صوبوں کی تقسیم کو ناگزیر پائیں گے تو وہ قائداعظمؒ کا ساتھ چھوڑ دیں گے اور پاکستان کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ ان مشوروں پر عمل کرتے ہوئے ماؤنٹ بیٹن نے قائداعظم کو بہت ڈرایا دھمکایا لیکن وہ ان کے آہنی ارادے کو متزلزل نہ کر سکے۔ قائداعظم نے بہ امرِ مجبوری بنگال اور پنجاب کی تقسیم منظور کر لی لیکن مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ آزاد مملکت کا مطالبہ ترک نہ کیا۔ بنگال اور پنجاب کے مسلمانوں نے ان صوبوں کی تقسیم کے فیصلے کے باوجود قائداعظم کا ساتھ نہ چھوڑا اور کانگری لیڈروں کی مسلمانوں میں پھوٹ پڑ جانے کی امیدیں خاک میں مل گئیں۔

نامساعد حالات اور قیامِ پاکستان:

ایک کانگری لیڈر نے ماؤنٹ بیٹن کو یہ مشورہ بھی دیا کہ مسلمانوں کا تقسیم ملک کا مطالبہ بظاہر منظور کر لیا جائے لیکن بنگال اور پنجاب کے صوبوں کی تقسیم اس طرح کی جائے کہ پاکستان ایک علیحدہ آزاد ملک کی صورت میں زیادہ دیر قائم نہ رہ سکنے کے قابل نہ رہے اور مسلم لیگ مجبور ہو کر از خود انڈین یونین میں شامل ہو جانا منظور کرے۔ ماؤنٹ بیٹن کو یہ تجویز ''بڑی دانشمندانہ'' معلوم ہوئی جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے اور اس نے اس پر عمل کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ یہ حکمتِ عملی اختیار کرنے کے رستے میں ماؤنٹ بیٹن کے لیے ایک بڑی دقت حائل تھی۔ اٹیلی کی وزارت کی طرف سے اسے ہدایت تھی کہ اگر ملک کو تقسیم کرنا پڑے تو کوشش یہ ہونی چاہئے کہ دونوں ملک برطانوی دولتِ مشترکہ میں شامل رہیں۔ قائداعظم تو ماؤنٹ بیٹن سے کہہ ہی چکے تھے کہ پاکستان دولتِ مشترکہ میں شامل رہے گا لیکن کانگرس نے ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی سے جو قراردادِ مقاصد منظور کرائی تھی اس میں واضح طور پر لکھا تھا کہ آزادی حاصل ہونے کے بعد بھارت ایک ری پبلک ملک ہوگا اور ان دنوں دولتِ مشترکہ میں ایک ''ری پبلک'' کی شمولیت کا جواز موجود نہ تھا۔ ہندوستان کی وحدت کے قیام میں ناکامی کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی بڑی خواہش تھی کہ کسی طرح کانگرس بھی برطانوی دولتِ مشترکہ میں شامل رہنا منظور کرے۔ ایسا ہونے سے ماؤنٹ بیٹن کی وہ خفت بھی مٹ سکتی تھی جو اپنے مقصدِ اول میں

Marfat.com

ناکام رہنے کی صورت میں لازمی تھی۔ کانگرسی لیڈر بھی اتنے نادان نہ تھے کہ انہیں اپنے بُرے بھلے کی تمیز نہ ہوتی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ماؤنٹ بیٹن ان کا طرفدار ہے اور اس سے بنائے رکھنے کی افادیت ان پر ظاہر تھی۔ وہ خود بھی کسی ایسے فارمولے کی تلاش میں تھے جس سے مجلسِ دستور ساز کی قراردادِ مقاصد کے باوجود ہندوستان کا برطانیہ سے گہرا تعلق قائم رہ سکے۔ حکومتِ ہند کے ایک ہندو افسر وی پی مینن تھے جو سردار پٹیل کے بڑے معتمد تھے۔ ماؤنٹ بیٹن نے آتے ہی انہیں اپنے خاص الخاص عملے میں شامل کر لیا تھا اور رفتہ رفتہ وہ ان کے بھی معتمد ہو گئے تھے۔ قراردادِ مقاصد کی روک کو راستے سے ہٹانے کی غرض سے وی پی مینن نے ایک سکیم تیار کی جس کے تحت ملک کی تقسیم ہو کر انتقالِ اختیارات دونوں ملکوں کو وقتی طور پر Dominion Status کی بنیاد پر کیے جانے کی تجویز تھی۔ ماؤنٹ بیٹن نے وی پی مینن کے ذریعے کانگرس کو پیشکش کی کہ اگر کانگرس یہ سکیم منظور کر لے تو وہ جون 1948ء سے پہلے ہی اختیارات منتقل کر دیں گے۔ مئی 1947ء کے دوسرے ہفتہ میں شملہ میں اس پیشکش پر ماؤنٹ بیٹن اور کانگرسی لیڈران میں سے پنڈت نہرو اور کرشنا مینن کے مابین گفت وشنید ہوئی اور ایک خفیہ سمجھوتہ ہوا جس کی رُو سے کانگرس نے اس پیشکش کو اُن تین شرائط پر منظور کیا جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے یعنی اول: انتقالِ اختیارات دو مہینوں کے اندر اندر مکمل کر دیا جائے۔ دوم: صوبہ بنگال کی تقسیم ہونے پر کلکتہ ہندوستان میں شامل کیا جائے اور سوم: صوبہ پنجاب کی تقسیم اس طور پر کی جائے کہ ضلع گورداسپور کی تحصیلات گورداسپور و بٹالہ کو جو مسلم اکثریت کے علاقے تھے ہندوستان میں شامل کیا جائے۔ ماؤنٹ بیٹن نے تینوں شرائط منظور کر لیں۔ پہلی شرط میں جو مطالبہ کیا گیا وہ صریحاً غیر معقول تھا۔ دو مہینوں کا عرصہ تو ایک متمول خاندان مشترکہ یا ایک کامیاب کاروباری شراکتی ادارے کی تقسیم کے لیے بھی کافی نہیں ایک عظیم ملک کی تقسیم کے لیے کس طرح کافی ہو سکتا تھا۔ اس شرط پر اصرار کرنے والوں کی منشا تو یہ تھی کہ ملک کی تقسیم کو ناقابلِ عمل ثابت کیا جائے۔ انتظامی امور کا تجربہ رکھنے والے ماؤنٹ بیٹن کا اس غیر معقول شرط کو منظور کر لینا ظاہر کرتا ہے کہ خود ان کی نیت بھی یہی تھی۔ کانگرسی لیڈروں اور ماؤنٹ بیٹن دونوں کو توقع تھی کہ عملِ تقسیم میں اس جلد بازی سے جو گڑبڑ پیدا ہو گی اس کے نتیجے میں نوزائیدہ مملکت پاکستان کے لیے ایسی ایسی problems کھڑی ہوں گی کہ پاکستان کا قیام ناممکن ہو جائے گا اور مسلم لیگ کو مجبوراً ہندوستان کی سالمیت برقرار رہنے پر آمادہ ہونا پڑے گا۔ یہ تو منشاء الٰہی تھا کہ پنجاب اور دلی میں غیر مسلموں اور بالخصوص سکھوں نے مسلمانوں کا جو قتلِ عام برپا کیا اس کے باوجود اور دیگر جملہ نامساعد حالات کے باوصف پاکستان کا قیام عمل میں آ گیا اور مخالفینِ پاکستان کی توقعات پوری نہ ہوئیں۔

جانبداری کا پول کھل گیا:

شملہ میں ہونے والے خفیہ سمجھوتے کی جن شرائط کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ان میں سے پہلی دو شرائط تو اب ڈھکی چھپی نہیں کیونکہ تقسیم کے بعد سردار پٹیل نے جو کانگرس کے چوٹی کے لیڈروں میں سے نسبتاً صاف گو تھے، اپنی پبلک تقریروں میں تسلیم کیا ہے کہ ان کی طرف سے یہ شرائط پیش کی گئی تھیں اور ان کے مانے جانے کے بعد ہی انہوں نے ملک کی تقسیم منظور کی تھی۔ کلکتہ کے متعلق سردار پٹیل کے مذکورہ بالا اعتراف کے علاوہ ماؤنٹ بیٹن کے چیف آف سٹاف لارڈ اسمے نے اپنے Memoirs میں تسلیم کیا ہے کہ تقسیمِ ملک کی جس تجویز کی منظوری برطانوی وزارت سے حاصل کی گئی تھی اس کے مطابق کلکتہ کو ہندوستان میں شامل رکھا گیا تھا۔ یہ بات مسلم لیگ سے مخفی رکھی گئی اور ظاہر یہ کیا گیا کہ کلکتہ کے متعلق

Marfat.com

فیصلہ باؤنڈری کمیشن کرے گا۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ کلکتہ ہندوستان میں شامل رکھنے کا فیصلہ بالا بالا ہو چکا تھا اور برطانوی کیبنٹ اس پر صاد کر چکی تھی۔ ظاہرا طور پر اس تنازعے کو بھی بنگال باؤنڈری کمیشن کے سپرد کیا گیا اور ریڈکلف سے کلکتہ کے متعلق فیصلہ ہندوستان کے حق میں کرایا گیا۔ صرف یہی ایک بات ریڈکلف، ماؤنٹ بیٹن اور خود ایٹلی کی وزارت کی جانبداری کا پول کھولنے کے لیے کافی ہونی چاہئے۔ شملہ میں ہونے والے خفیہ سمجھوتے کی تیسری شرط ریاست جموں وکشمیر پر تسلط قائم کرنے کی غرض سے تھی۔ اس شرط کو پورا کرنے اور تحصیلات گورداسپور اور بٹالہ کو جہاں مسلم آبادی کی اکثریت تھی، ہندوستان میں شامل کرنے کے لیے جو پاپڑ بیلے گئے ان کا تفصیل سے پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔

ریڈکلف کے لیے پرواز کی ہدایات والی لائن اور ریڈکلف کے فیصلے کے مطابق مقرر کی جانے والی حد بندی لائن میں تھوڑا سا فرق تھا۔ اول الذکر کے مطابق مسلم آبادی کی اکثریت والی تحصیلات فیروزپور اور زیرہ پاکستان کے علاقہ میں شامل تھیں لیکن موخر الذکر حد بندی کے مطابق وہ دونوں تحصیلات بھی ہندوستان کے علاقے میں شامل کر دی گئیں۔ اس بات کا ناقابل تردید ثبوت موجود ہے کہ یہ تبدیلی جو ہندوستان کے حق میں اور پاکستان کے مفاد کے مزید خلاف تھی، ریڈکلف سے 8 اگست 1947ء کے دو ایک روز بعد کرائی گئی۔ ان دنوں پنجاب کے گورنر سر ایون جنکنز تھے۔ سکھوں سے ان کی ہمدردیاں مسلمہ ہیں اور ان پر ہی کیا موقوف تھا خود ماؤنٹ بیٹن اور اس کے عملے کے انگریز افسران بالخصوص لارڈ اسمے سکھوں کی فوجی خدمات کی وجہ سے سکھ مفاد سے گہری دلچسپی رکھتے تھے اور سب خواہشمند تھے کہ کسی طرح سکھوں کی امداد کی جائے۔ سکھوں کے طرف سے زور دیا جا رہا تھا کہ پنجاب کی تقسیم پر نہری نو آبادیات جن کی اراضیات کی آبادکاری میں انہوں نے بہت محنت کی ہے، ہندوستان میں شامل کیے جائیں۔ گورنر جنکنز کے خیال کے مطابق سکھوں کا یہ مطالبہ بالکل غیر منصفانہ نہ تھا۔ گورنر جنکنز کے استفسار کے جواب میں ماؤنٹ بیٹن کے پرائیویٹ سیکرٹری جارج ایبل نے 8 اگست 1947ء کو جنکنز کے پرائیویٹ سیکرٹری کو جنکنز کی اطلاع کے لیے ایک خط لکھا جس کے ساتھ ایک نقشہ منسلک تھا جس میں پنجاب کی حد بندی کی وہی لائن دکھائی گئی تھی جو پائلٹ کی ہدایاتِ پرواز میں تھی اور جس کے مطابق گورداسپور اور بٹالہ کی تحصیلات تو ہندوستان میں شامل تھیں لیکن فیروزپور اور زیرہ کی تحصیلات پاکستان میں شامل تھیں۔ جارج ایبل کے خط میں واضح طور پر لکھا تھا کہ منسلکہ نقشہ اس حد بندی لائن کا ہے جو ریڈکلف اپنے فیصلے میں مقرر کر رہے ہیں۔ یہ خط مسٹر مودی کو جنہیں قائداعظم نے انتقالِ اختیارات کے بعد جنکنز کے بجائے پنجاب کا گورنر مقرر کیا، جنکنز کے خفیہ کاغذات میں ملا۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ جارج ایبل نے یہ خط جنکنز کے پرائیویٹ سیکرٹری کو جنکنز کی اطلاع کے لیے لکھا تھا لیکن نہ تو ریڈکلف کی طرف سے اور نہ ہی ماؤنٹ بیٹن کی طرف سے اس تبدیلی کی کوئی معقول وجہ پیش کی گئی ہے جو 8 اگست کے بعد حد بندی میں کی گئی۔ اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ جولائی 1947ء کے آخری عشرے میں جن دنوں ریڈکلف حد بندی کمیشن کی کارروائی کے سلسلہ میں دلی میں تھا اور ظاہرا طور پر حد بندی کا تعین کرنا ان کے سپرد تھا ماؤنٹ بیٹن کے دفتر میں یہ بات اکثر زیر بحث رہتی تھی کہ سکھوں کے مفاد کی حفاظت کے لیے حد بندی کی لائن کہاں لگائی جائے۔ سکھوں کے ایک مسلمہ ہمدرد مسٹر پنڈرل مون سابق انڈین سول سروس نے اپنی کتاب Divide and Quit میں لکھا ہے کہ جولائی 1947ء کے آخری عشرے میں اس مسئلہ پر کئی مرتبہ ان کی گفتگو ماؤنٹ بیٹن کے سٹاف سے ہوئی جن میں وی پی مینن شامل تھے اور موخر

Marfat.com

الذکر نے ان سے دریافت کیا:

"Whether by any juggling with the line the danger of disturbances (by Sikhs) would be diminished."

''کیا حد بندی کی لائن میں کچھ ہیرا پھیری کرنے سے فسادات کے خطرے کو کم نہیں کیا جا سکتا؟''

مسٹر پنڈرل مون کے اس بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ حد بندی کمیشن اور ریڈ کلف تو محض دکھاوا تھے ورنہ حد بندی کا تعین ماؤنٹ بیٹن کے عملے (اسمے وغیرہ) کو کرنا تھا اور ریڈ کلف کا کام صرف اس پر دستخط کرنا تھا۔ 8 اگست 1947ء کے بعد مجوزہ حد بندی لائن میں ہندوستان کے حق میں اور پاکستان کے مفاد کے مزید خلاف جو تبدیلی کی گئی اور فیروز پور اور زیرہ تحصیلات جن میں مسلمانوں کی کثرت تھی، ہندوستان میں شامل کر دیئے گئے وہ از قسم ''ہیرا پھیری'' ہی تھی جو سکھوں کی اشک شوئی کے لیے کی گئی۔

ماؤنٹ بیٹن کی پاکستان دشمنی کے محرکات:

ہندوستان کی تقسیم کے سلسلہ میں ماؤنٹ بیٹن نے پاکستان کے منصوبہ کی مخالفت میں جو کردار ادا کیا اس کی ایک وجہ تو یہ بھی تھی کہ وہ خود ابتدا ہی سے اس مطالبہ کے خلاف تھے۔ علاوہ ازیں اٹیلی وزارت نے ان کے ذمہ یہ فرض عائد کیا تھا کہ ہندوستان کی سالمیت بحال رکھنے اور کانگرس اور مسلم لیگ کو کیبنٹ مشن کی تجاویز پر عمل پیرا ہونے پر آمادہ کریں۔ قائداعظم کی مستقل مزاجی نے انہیں اس مقصد کے حصول میں کامیاب نہ ہونے دیا اور انہوں نے اس ناکامی کو ذاتی شکست سمجھ لیا۔ بیشک پنڈت نہرو سے ان کی ذاتی دوستی اور پنڈت جی اور دوسرے کانگرسی لیڈروں کی چاپلوسی بھی ماؤنٹ بیٹن کی خوشامد پسند طبیعت پر اثر انداز ہوئی ہو گی لیکن جس شدت سے انہوں نے پاکستان کے مفاد کے خلاف کام کیا اس سے ان کی قائداعظم اور ان کے مشن سے ذاتی رنجش اور عناد کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ جب ماؤنٹ بیٹن کی سر توڑ کوشش کے باوجود قائداعظم کیبنٹ مشن کی تجاویز کو زندہ کیے جانے پر رضامند نہ ہوئے اور ملک کی تقسیم ناگزیر ہو گئی تو ماؤنٹ بیٹن کو اپنی خفت مٹانے کی یہ تجویز سوجھی کہ ہندوستان تقسیم ہو کر بھارت اور پاکستان دو ڈومینین قائم کیے جائیں جو دونوں برطانوی دولتِ مشترکہ میں شامل رہیں اور وہ دونوں ڈومینیز کے پہلے گورنر جنرل ہوں۔ قائداعظم نے تو پاکستان کے برطانوی دولتِ مشترکہ میں شامل رہنے پر رضامندی دے دی ہوئی تھی اور ماؤنٹ بیٹن نے کانگرس کو بھی خفیہ سمجھوتے کی شرائط پر اس پر آمادہ کر لیا تھا۔ اب صرف اس کی یہ بڑی خواہش باقی تھی کہ کانگرس اور مسلم لیگ دونوں اسے پہلے گورنر جنرل کے طور پر قبول کر لیں۔ کانگرس نے ماؤنٹ بیٹن کا بھارت کا پہلا گورنر جنرل ہونا منظور کر لیا لیکن قائداعظم نے اس تجویز کو منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ اپنے زعم میں ماؤنٹ بیٹن کو یقین تھا کہ قائداعظم بھی اس تجویز کو منظور کر لیں گے اور انہوں نے کانگرسی لیڈروں اور برطانوی وزارت کو بھی یقین دلایا ہوا تھا کہ یہ تجویز مسلم لیگ اور اس کے قائد کو بھی منظور ہو گی۔ قائداعظم کے انکار نے جہاں ان کی امیدوں کے محل کو چکنا چور کر دیا وہاں انہیں برطانوی وزارت اور کانگرسی لیڈروں سے خفت بھی اُٹھانی پڑی۔ ان کے پندار پر یہ آخری ضرب ایسی کاری پڑی کہ وہ بوکھلا گئے اور قائداعظم سے اس مسئلہ پر گفتگو کے دوران دھمکیوں اور خفیف الحرکتی پر اُتر آئے۔ یہ گفتگو 2 جولائی 1947ء کو ہوئی تھی۔ دو دن بعد ماؤنٹ بیٹن نے

Marfat.com

قائداعظم کے انکاری فیصلے کی رپورٹ سیکرٹری آف سٹیٹ کو بھیجی۔ اس میں اس گفتگو کو ایک Bombshell قرار دیتے ہوئے لکھا: ''میں نے ان (قائداعظم) سے دریافت کیا: معلوم ہے آپ کو یہ انکار کتنا مہنگا پڑے گا؟'' انہوں نے افسردہ لہجہ میں جواب دیا: ''ہاں Assets کی تقسیم میں غالباً کروڑوں روپے کا نقصان اٹھانا پڑے گا''۔ میں نے ذرا تلخ لہجے میں کہا: ''کروڑوں کا نہیں بلکہ آپ سارے Assets کھو بیٹھیں گے اور پاکستان کا مستقبل بھی''۔ یہ کہہ کر میں کھڑا ہو گیا اور کمرے سے باہر چلا گیا''۔ (ماؤنٹ بیٹن کی رپورٹ نمبر 11 محررہ 4 جولائی 1947ء بنام سیکرٹری آف سٹیٹ)۔

اس دھمکی سے اور اس بدخلقی سے جس کا اعتراف خود ماؤنٹ بیٹن نے اپنی رپورٹ میں کیا ہے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قائداعظم کے انکار سے انہیں سخت تکلیف پہنچی اور انہوں نے اسے ذاتی ہتک سمجھتے ہوئے قائداعظم سے اس کا بدلہ لینے اور پاکستان کے منصوبے کو ناکامیاب کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ تقسیم ہند کے سلسلہ میں ماؤنٹ بیٹن پر جانبداری کا جو الزام لگایا جاتا ہے اس کی تردید میں ماؤنٹ بیٹن نے ایک انگریز مصنف مسٹر ہاؤسن سے ایک کتاب شائع کرائی ہے جس کا نام The Great Divide ہے۔ سیکرٹری آف سٹیٹ کے نام ماؤنٹ بیٹن کی متذکرہ بالا رپورٹ کا ذکر کرتے ہوئے اِن صاحب کو بھی اعتراف کرنا پڑا ہے کہ: ''اپنی انا کے زخمی ہونے پر وہ اس رپورٹ میں اپنے معاندانہ ردعمل کے اظہار سے باز نہ رہ سکے''۔ انتقالِ اختیارات کے بعد ماؤنٹ بیٹن نے انڈین اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے جس گرمجوشی کا اظہار کیا اس کا مقابلہ اس تقریر سے کرتے ہوئے جو ماؤنٹ بیٹن نے پاکستان اسمبلی میں کی جس میں ویسی گرمجوشی کا فقدان تھا، یہی مصنف تسلیم کرتے ہیں کہ ''علاوہ اور باتوں کے مسٹر جناح نے ماؤنٹ بیٹن کے دونوں ڈومینینز کا گورنر جنرل ہونے کی امیدوں پر جو پانی پھیر دیا تھا ممکن ہے اس کی رنجش ابھی ماؤنٹ بیٹن کے دل میں باقی ہو''۔ ماؤنٹ بیٹن کی پاکستان دشمنی اتنی ظاہر و باہر ہے کہ ان کے مداحین کو بھی دبی زبان سے ہی سہی اس کے محرکات کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔

(بحوالہ تحدیث نعمت صفحہ 519 تا 531، مصنف: سر ظفر اللہ خاں)

▪▪▪

کانگرسی مسلمانوں کی نمائندگی کرنے والے ہفت روزہ ''نئی دنیا'' دہلی نے اگست 1995ء میں ایک خصوصی شمارہ پاکستان اور بھارت کے حوالے سے شائع کیا تھا جس میں ایک اہم سوال یہ تھا کہ قیام پاکستان کی ذمہ داری کیا صرف محمد علی جناح پر ہی عائد کی جائے گی اور اس سوال کا جواب انہوں نے بہت سے کانگرسی لیڈروں سے مانگا تھا۔ اس سلسلے میں ایک انٹرویو مشہور تاریخ نویس اور گاندھی جی کے چیلے جناب بی این پانڈے سے بھی لیا گیا جس کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں:

سوال: آپ ایک ایسے بزرگ سیاست داں ہیں جو مہاتما گاندھی کے کافی قریب رہے ہیں۔ آپ کے خیال میں ایسے کون سے اسباب تھے جن کی وجہ سے ملک تقسیم ہوا۔ کیا بٹوارے کے لیے صرف مسلمان ہی ذمہ دار ہیں؟

جواب: ہندوستان کی تقسیم کے لیے جتنے مسلمان ذمہ دار ہیں اتنے ہی ہندو ذمہ دار ہیں۔ مدراس میں ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں 1927ء میں کانگرس کا جو اجلاس ہوا وہاں پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک کمیٹی بنائی گئی تھی جس کو یہ طے کرنا تھا کہ آزادی کے بعد ہندوستان کا کیا نظام ہوگا۔ اس کمیٹی میں محمد علی جناح، تیج بہادر، سپرو جے کرن اور مالویہ وغیرہ شامل تھے۔ انہوں نے کافی محنت سے ایک خاکہ تیار کیا اور سال بھر کے بعد 1928ء میں کلکتہ

Marfat.com

کانگرس کے موقع پر پھر آل پارٹی کانفرنس ہوئی تو یہ مسودہ جب پیش کیا گیا اس میں جناح صاحب نے کچھ تجاویز رکھیں۔ میں بھی وہاں شریک تھا۔ جناح صاحب کی ایک تجویز یہ تھی کہ سندھ کو بمبئی پریذیڈنسی سے الگ کر کے ایک علیحدہ صوبہ بنا دیا جائے۔ صوبہ سرحد کو بھی دوسرے صوبوں کی طرح مکمل اختیارات دیئے جائیں۔ پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی کے حساب سے سیٹیں دی جائیں۔ سنٹر کو نوکریوں میں 25 فیصد نمائندگی مسلمانوں کو ملے۔ جناح کی تجاویز کی ہندو مہا سبھا کے ڈاکٹر جے کرن اور ڈاکٹر منجے نے سخت مخالفت کی۔ برطانوی حکومت یہ دیکھ رہی تھی کہ کہیں ان میں آپس میں کوئی سمجھوتہ نہ ہو جائے۔ انہوں نے محمد شفیع کی صدارت میں ایک نئی آل انڈیا مسلم لیگ بنوائی۔ جے کرن نے یہ کہا کہ اصل مسلم لیگ کی نمائندگی جناح نہیں بلکہ محمد شفیع صاحب کرتے ہیں۔ سر تیج بہادر سپرو جناح صاحب کے حق میں بولے مگر اور دوسرے لوگوں نے اس کی مخالفت کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جناح کی تجاویز پاس نہیں ہو سکیں۔ وہ اپنی جگہ بیٹھ گئے میں نے دیکھا کہ انہوں نے اپنی جیب سے رومال نکال کر اپنی نم آنکھوں کو پونچھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ تھوڑے ہی دنوں بعد برطانوی حکومت کے سیکرٹری برائے انڈیا سر سیموئل ہول نے برطانوی پارلیمنٹ میں اعلان کیا کہ ہم سندھ کو الگ صوبہ بنا رہے ہیں، ہم صوبہ سرحد کو پورا اختیار دے رہے ہیں۔ انہوں نے تقریباً وہ تمام باتیں مان لیں جو جناح صاحب نے پیش کی تھیں۔ آپس میں صلح وصفائی کا بہت بڑا موقع ہاتھ سے گنوا دیا۔

سوال: 1937ء میں جو الیکشن ہوئے اس میں کیسے اختلافات کو ہوا ملی؟

جواب: الیکشن کے وقت تک کوئی اختلافات نہیں تھے بلکہ کانگرس اور مسلم لیگ نے مل کر الیکشن لڑا کیونکہ اس سے پہلے تعلقہ دار لوگ جیت جاتے تھے اور کانگرس اور مسلم لیگ کو ہار کا منہ دیکھنا پڑتا تھا۔ کانگرس کے جو لوگ پہلے ان کے ایجنٹ تھے دوسرے دن وہی لوگ مسلم لیگ کے ایجنٹ تھے۔ اسی طرح مسلم لیگ والے بھی دونوں کے ایجنٹ تھے اور دونوں نے مل جل کر الیکشن لڑا، اس الیکشن میں کچھ ایسا ہوا کہ امید کے برخلاف کانگرس اکثریت سے کامیاب ہوگئی جس سے کانگرس والوں کی نیت خراب ہوگئی۔ کانگرس نے ایک یہ اڑنگا بھڑایا کہ ہم اس وقت تک وزارتیں بنانا قبول نہیں کریں گے جب تک ہمیں یہ اطمینان نہ دلایا جائے کہ گورنر ہمارے فیصلوں کو ویٹو نہیں کرے گا کیونکہ کوئی قانون پاس ہوتا تو گورنر اسے ویٹو کر دیتا۔ اس طرح کئی ہفتوں تک کانگرسیوں نے وزارت قبول نہیں کی۔ جب کانگرس نے وزارت قبول نہیں کی تو مسلم لیگ سے کہا گیا۔ لیکن مسلم لیگ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ جب کانگرس نے وزارت بنانا قبول نہیں کیا تو وہ کیسے قبول کر سکتی ہے کیونکہ ہم دونوں نے مل کر چناؤ لڑا ہے اور ہم دونوں میں کوئی اختلاف نہیں۔ لہٰذا پھر تعلقہ داران کی طرف سے نواب چھتاری سے کہا گیا کہ آپ وزارت بنائیں۔

سوال: تو پھر کس کی وزارت بنی؟

جواب: جب برطانوی حکومت نے مان لیا کہ وہ ویٹو نہیں کرے گی تو کانگرس نے وزارت بنائی۔ کانگرس نے مسلم لیگ سے کہا کہ وہ اپنی وزارت میں دو لوگوں کو شامل کرے۔ ایک تو حافظ محمد ابراہیم کو اور دوسرے نواب اسماعیل کو۔ مسلم لیگ یہ چاہتی تھی کہ اسے جب نمائندگی دی جا رہی ہے تو نام پیش کرنے کا کام بھی اسی کا ہے۔ مسلم لیگ چاہتی تھی کہ خلیق

Marfat.com

الزماں صاحب اورنواب اسماعیل کو بنائیں اور اگر کانگرس حافظ ابراہیم کو بنانا چاہتی ہے تو وہ اپنے کوٹے سے بنائے۔ اسی بات کو لے کر کافی الجھن اور کشاکشی تھی حالانکہ گاندھی جی اور مولانا آزاد یہ چاہتے تھے کہ مسلم لیگ کی بات مان لی جائے۔ لیکن کانگرس میں دوسرے لوگ مسلم لیگ کی اس تجویز کو ماننے کو تیار نہیں ہوئے۔ جب مسلم لیگ کی بات قبول نہیں کی گئی تو اس نے کہا کہ اب ہم ایک اپوزیشن کی حیثیت سے کام کریں گے۔ مجھے یاد ہے کہ اس وقت گاندھی جی اور مولانا ابوکلام آزاد نے کہا تھا کہ اس کی بڑی قیمت چکانی پڑے گی لیکن کانگرسیوں کو سمجھ میں نہیں آیا۔ اگر ان دومواقع سے فائدہ اٹھالیا گیا ہوتا تو ہندوستان کی تاریخ دوسری ہوتی۔ جناح برگشتہ ہو کر لندن چلے گئے اور وہیں بیرسٹری کرنے لگے۔ اس لیے میرا اپنا خیال ہے کہ پاکستان بننے کے لیے مسلم لیگ بھی ذمہ دار ہے اور کانگرس بھی ذمہ دار ہے۔

سوال: اس وقت ہندومہاسبھا کا کیا رول تھا؟

جواب: یہ اسکیم تو بہت شروع سے انگریزوں کی بنائی ہوئی تھی کہ اگر ایسا موقع آیا کہ ہندوستان انہیں چھوڑنا پڑے تو ایسا چھوڑو کہ مذہبی بنیاد پر ہندوستان اور پاکستان دوالگ الگ ملک بن جائیں۔ ہندومہاسبھا اور آر ایس ایس کی دلچسپی تھی کہ اگر مسلم آبادی ایک جگہ ہو جاتی ہے اور خالص ہندو آبادی ایک جگہ ہو جاتی ہے تو ہم کو ہندوستان کو ہندوراشٹر بنانے میں آسانی ہوگی۔

سوال: یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کے بٹوارے اور پاکستان بننے کے بعد جناح بہت زیادہ خوش نہیں تھے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: جناح صاحب چاہتے تھے کہ تقسیم کے بعد آبادی کا بٹوارہ نہ ہو۔ اس کے لیے انہوں نے حتی الامکان کوشش بھی کی۔ انہوں نے وہاں کے ہندوؤں سے رکنے کی التجا کی اور کہا کہ انہیں برابری کے حقوق ملیں گے۔ اسی طرح انہوں نے یہاں کے لیڈروں سے اپیل کی کہ آپ مسلمانوں کو روکیں۔ لیکن تب یہاں سردار پٹیل اور دوسرے لوگوں کی رائے یہ تھی کہ بٹوارہ ہو گیا ہے تو آبادی کو بھی منتقل ہو جانے دو۔ اس کی گاندھی جی نے بھی مخالفت کی تھی کیونکہ اس کے نتیجے میں بڑے پیمانے پر خون خرابہ ہونا تھا۔ ایک اہم بات یہ ہوئی کہ جب سے یہاں سے لوگ پاکستان گئے تبھی سے انہیں یہ محسوس ہونے لگا کہ ہماری جیت دوسرے درجہ کی ہے اور اپنی تمام کوششوں کے باوجود یہ لوگ ابھی تک پاکستانی نہیں بن پائے وہ مہاجرین ہی رہے، اور آج بھی بری طرح مارکاٹ کے شکار ہیں۔

(نئی دنیا: دہلی 22 تا 28 اگست 1995ء)

اسی سوال کا جواب اُن دنوں بھارتی بنگال کے وزیر کلیم الدین شمس نے دیا تھا۔ ملاحظہ فرمائیں:

تقسیم کا اصل ذمہ دار کانگرس پارٹی کا وہ انتہا پسند گروپ تھا جس کی قیادت سردار ولبھ بھائی پٹیل کر رہے تھے۔ نیتاجی سبھاش چندر بوس نے الہ آباد کے آنند بھون میں جا کر گاندھی جی سے ملاقات کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ جس قیمت پر ہو ملک کو تقسیم ہونے سے بچایئے۔ جس وقت نیتاجی سبھاش چندر بوس اور مہاتما گاندھی کے درمیان بات چیت ہو رہی تھی اس وقت وہاں جواہر لال نہرو اور سردار ولبھ بھائی پٹیل بھی موجود تھے۔ گاندھی جی نے بڑے ہی بزرگانہ انداز میں نیتاجی

Marfat.com

سبھاش چندر بوس سے کہا تھا کہ ملک کی تقسیم میں نہیں چاہتا ہوں اور نہ ہی کانگرس تقسیم کے حق میں ہے مگر اس کو کیا کیا جائے کہ محمد علی جناح اس بات پر بضد ہیں کہ مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ ہوم اسٹیٹ ہو۔ گاندھی جی کی یہ بات سننے کے بعد نیتا جی سبھاش چندر بوس نے کہا کہ اگر محمد علی جناح ملک کی تقسیم کو روکنے پر تیار ہو جائیں تو کیا آپ اسے تسلیم کر لیں گے۔ اس پر گاندھی جی نے جواب دیا اگر اس طرح کی بات سامنے آئی تو ہم نہ صرف اسے مان لیں گے بلکہ اس اقدام کو ملک کے لیے اور ملک کے کروڑوں عوام کے لیے ایک تابناک اور روشن مستقبل سے تعبیر کریں گے۔ یہ سنتے ہی سبھاش چندر بوس آنند بھون الہ آباد سے جناح ہاؤس بمبئی تشریف لے گئے جہاں انہوں نے محمد علی جناح سے بات چیت کی اور مسئلے کے حل کی ایک تھیوری پیش کی جسے سبھاش تھیوری کے نام سے جانا جاتا ہے۔ سبھاش چندر بوس نے کہا کہ مہاتما گاندھی ملک کی تقسیم کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ہر معاملے میں مصالحانہ رویہ اختیار کر کے وہ مسئلے کو حل کرنا چاہتے ہیں لہٰذا میری یہ تجویز ہے کہ ملک تقسیم نہ ہو بلکہ یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ متحدہ آزاد ہندوستان کا صدر جمہوریہ پانچ سال تک مسلمان ہوگا اور وزیراعظم ہندو قوم سے منتخب کیا جائے گا۔ ٹھیک اسی طرح اگلے پانچ سال تک مسلمان وزیراعظم ہوگا اور اس دوران پانچ سال تک ہندو صدر جمہوریہ ہوگا۔ سبھاش چندر بوس کی یہ باتیں سننے کے بعد محمد علی جناح نے کہا کہ سبھاش مجھے تم پر پورا اعتماد اور بھروسہ ہے اور تمہاری اس تجویز کو ملک وقوم کی فلاح و بہبود کے لیے بلا تاخیر تسلیم کرنے کو تیار ہوں۔ یہ بات طے پانے کے بعد سبھاش چندر بوس بمبئی کے جناح ہاؤس سے الہ آباد کے آنند بھون آئے۔ اس وقت آنند بھون میں مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، سردار ولبھ بھائی پٹیل اور دوسرے کانگرسی لیڈران موجود تھے۔ سبھاش چندر بوس نے جناح کی اس تجویز کو آنند بھون میں تمام حاضرین کے سامنے پیش کیا۔ اس تجویز کو سنتے ہی سب سے پہلے آگ بگولا ہونے والوں میں سردار ولبھ بھائی پٹیل تھے جو وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔ اس کے بعد ہی جواہر لال نہرو بھی اٹھ گئے۔ نتیجہ کے طور پر نیتا جی سبھاش چندر بوس کی تھیوری ناکام ہو گئی اور ملک کو دو حصوں میں بانٹ دینے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں رہ گیا۔ اس واقعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تقسیم کے واحد ذمہ دار سردار پٹیل اور ان کے ہمنوا تھے۔

اگر پاکستان نہ بنا ہوتا تو ہندوستان کا وزیراعظم آج نرسمہا راؤ نہیں کلیم الدین شمس ہوتا۔ پاکستان کے قیام سے نہ صرف مسلمانوں کا وقار ختم ہوا بلکہ انہیں اس ملک میں دوسرے درجے کا شہری بنانے کی کوشش جاری رہی اور یہ سلسلہ آج بھی قائم ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی نظر میں پاکستان کی کوئی خاص اہمیت نہیں، وہ دنیا کے 56 مسلم ممالک کو جس نظر سے دیکھتے ہیں اسی نظر سے پاکستان کو بھی دیکھتے ہیں۔ (نئی دنیا: اگست 1995ء صفحہ 6)

''نئی دنیا'' دہلی کے اٹھائے سوالات کے جوابات ایک پاکستانی مسلمان نجم الاسلام نے بھی دیئے تھے جنہیں ''نئی دنیا'' نے من وعن شائع کیا تھا۔ پاک بھارت تعلقات کی موجودہ نوعیت کو سمجھنے کے لیے ''نئی دنیا'' دہلی کے شمارہ اگست 1995 کے صفحہ 16 پر شائع شدہ یہ مضمون بھی ملاحظہ فرمالیں:

ایک عرصہ سے خواہش تھی کہ ہندوستان کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے بزرگان دین اور صوفیائے کرام کی خانقاہوں اور آستانوں کی زیارت کروں۔ الحمدللہ میری یہ آرزو پوری ہوئی۔ اس بیچ آپ کے موقر ہفت روزہ نئی دنیا کا یہ اشتہار میری نگاہوں سے گزرا جس میں آپ نے 15 اگست یعنی یوم آزادی کے موقعہ پر جسے ہم یوم سیاہ مانتے ہیں، بعنوان

Marfat.com

''پاکستان اور ہندوستانی نمبر'' شائع کرنے کا اعلان کیا تھا۔ ہم نے اس تاریخ کو یوم سیاہ کیوں کہا؟ اس کی بھی ایک تاریخ ہے کیونکہ یہی وہ منحوس تاریخ ہے جس کے بعد ہم جیسے نہ جانے کتنے افراد بے وطن ہوئے تھے۔ اسی تاریخ کے بعد ہمیں صرف اپنا گھر بار، زمین جائداد، اپنی مسجدیں اور اپنے عزیز و اقارب چھوڑ کر ہندوستان سے ہجرت کرنی پڑی تھی۔ جو لوگ 14 اگست 1947ء سے قبل تک ہمارے اپنے تھے اور جو ہماری ہمدردی کا دم بھرتے تھے 15 اگست کا سورج طلوع ہوتے ہی انہوں نے اپنی نگاہیں پھیر لی تھیں اور ہمارے دشمن بن گئے تھے۔ ان کی دشمنی اتنی بڑھی کہ یہاں ہمیں اپنی عزت وعفت خطرے میں نظر آنے لگی۔ مجبوراً ہمیں برصغیر کے اس حصہ سے ہجرت کرنی پڑی جسے آزاد ہندوستان یعنی ہندوؤں کی سرزمین کہا جاتا ہے۔

کیا پاکستان بنوانے کے لیے صرف مسلمان ہی ذمہ دار ہیں؟ علماء اسلام نے پاکستان کے قیام کی مخالفت کیوں کی؟ پاکستان بنتے ہی جناح کا دل کیوں ٹوٹ گیا؟ اور آج ہندوستانی مسلمان پاکستان کے بارے میں کیا سوچتے ہیں، جیسے سوالات آپ نے رکھے ہیں۔ میں چونکہ بذات خود ملک کی تقسیم سے بری طرح متاثر ہوا ہوں اس لیے میں ہندوستان کی نئی نسل اور ہندوستان کے نام نہاد سیکولر سیاسی لیڈروں سے زیادہ بہتر طریقہ سے تقسیم ملک اور اس کے بعد مسلمانوں پر مرتب ہونے والے اثرات کو سمجھ سکتا ہوں۔ لہٰذا میں بھی ان سوالات پر اپنے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں۔

جہاں تک یہ سوال ہے کہ آج ہندوستانی مسلمان پاکستان کے بارے میں کیا سوچتے ہیں، اس بات کا فیصلہ تو وہی کر سکتے ہیں کہ آج ہندوستان میں خود ان کی اپنی پوزیشن کیا ہے؟ کیا انہیں آج وہ تمام حقوق حاصل ہیں جن کی ضمانت ہندوستان کے آئین میں ہندوستان کی عیار سیاسی جماعت کانگرس نے دی ہے یا وہ یہاں دوسرے درجہ کے شہری کی حیثیت سے رہ رہے ہیں جس کی وکالت ہندو مہا سبھا اور آر ایس ایس جیسی متعصب اور فرقہ پرست جماعتیں روز اول سے کرتی رہی ہیں؟ تاریخ عالم کا مطالعہ کر کے وہ خود فیصلہ کریں کہ آج وہ اسی دور سے نہیں گزر رہے ہیں جس سے اسپین کے مسلمان اپنے زوال کے دوران گزر چکے ہیں؟ یہ سوال کہ پاکستان بنتے ہی جناح کا دل کیوں ٹوٹ گیا؟ بالکل بے بنیاد اور سازشی ذہنیت رکھنے والوں کی اختراع ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد قائداعظم کے بے چین دل کو قرار آ گیا تھا۔

ہندو مسلم فسادات آزاد ہندوستان کے لیے کوئی نئی چیز نہیں ہیں بلکہ آزادی سے پہلے بھی فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہے ہیں اور ان میں بھی نقصان مسلمانوں کا ہی ہوتا رہا تھا۔ انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کرنے کے بعد سب سے پہلی حکمت جو اپنائی وہ ہندو اور مسلمانوں میں نفاق ڈالنے کی تھی۔ اس نفاق ڈالنے کے لیے غلط تاریخیں مرتب کی گئیں۔ ہندوؤں میں ایسے طبقے تیار کیے گئے جو مسلمانوں کے خلاف نفرت کا زہر پھیلا کر دونوں قوموں کے درمیان دشمنی پیدا کریں۔ انہی میں انگریزوں کی تنخواہ دار ایک تنظیم ہندو مہا سبھا بھی تھی جس کی منظم تحریک کا یہ نتیجہ ہوا کہ انیسویں صدی کے اختتام تک ہندو اور مسلمانوں کے درمیان خلیج کافی وسیع ہو چکی تھی۔ عام ہندوؤں کی بات ہی کیا وہ ہندو جو اٹھتے بیٹھتے مسلمانوں کی ہمدردی کا دم بھرتے تھے اپنے دل کے نہاں خانوں میں مسلمانوں کے تئیں نفرت کا گوشہ بھی رکھتے تھے۔

Marfat.com

ہندوؤں کی اسی منافقانہ روش کو سمجھ کر قائداعظم نے علیحدہ مسلم مملکت کا مطالبہ کیا تھا ورنہ قائداعظم تو تقسیم ملک کے حامی کبھی نہیں رہے یہاں تک کہ حکومت برطانیہ کے نمائندہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جب ملک دو حصوں میں تقسیم کر دیا اس وقت بھی قائداعظم نے معاہدے پر دستخط نہیں کیے بلکہ اس معاہدہ پر سب سے پہلے دستخط کرنے والوں میں انڈین نیشنل کانگریس ہی تھی۔ اگر قائداعظم ملک کا بٹوارہ چاہتے تو وہ مسلم لیگ میں شامل ہو سکتے تھے جس کی بنیاد 1906ء میں ڈالی جا چکی تھی۔ بلکہ قائداعظم مسلم لیگ کو غیر ضروری قرار دیتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ متحدہ ہندوستان میں دونوں قوموں کو مل کر رہنا چاہئے اور آئین میں دونوں کو مساوی حقوق ملنے چاہئیں مگر نہرو اور پٹیل جیسے فرقہ پرست لیڈروں نے مسلمانوں کو ساوی حقوق دینے سے انکار کر دیا بلکہ ان کے ہر فیصلہ میں ہندوؤں کا مفاد مقدم رہتا تھا اور مسلمانوں کو نظر انداز کیا جانے لگا تو پھر مسلم لیگ کے قیام کے 33 سال بعد 1939ء میں مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے قائداعظم نے مسلمانوں کے حقوق کا مطالبہ کیا۔

آج میں سمجھتا ہوں کہ قائداعظم کا مسلم ریاست کا مطالبہ بالکل درست تھا۔ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ آج اگر ہندوستان میں مسلمان نظر آتے ہیں تو صرف پاکستان کی وجہ سے نظر آتے ہیں ورنہ فرقہ پرستوں نے ان کا وجود ختم کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ آپ خود ہی بتائیں یہاں کی کانگریسی حکومت نے تقسیم ملک کے بعد سے اب تک کتنے مسلمانوں کو سرکاری ملازمتیں ہر سال دی ہیں؟ آبادی کے لحاظ سے تمام شعبوں میں مسلم ملازمین کی شرح کیا ہے؟ کیا صلاحیت رکھنے والے مسلمانوں کو یہاں آگے بڑھنے کا موقع مساوی طور پر ملتا ہے؟ آئین کی رو سے ہندوستان ایک سیکولر اور جمہوری ملک ہے مگر کیا یہاں آپ کو مذہبی آزادی حاصل ہے؟ اگر ہے تو پھر ہندو فرقہ پرستوں کے ذریعہ یکساں سول کوڈ کے مطالبہ کے کیا معنی ہیں؟ بہر حال یہ سوالات آپ کے ملک کے آئین اور قانون وانتظامیہ سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ان کا جواب آپ لوگ ہی بہتر طور پر دے سکتے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ آج پاکستان صرف برصغیر میں ہی ایک اسلامی طاقت نہیں ہے بلکہ قیام پاکستان سے عالم اسلام کو بھی طاقت ملی ہے۔ عالم اسلام میں پاکستان کو پوری توجہ سے سنا جاتا ہے۔ پاکستان کا شمار آج دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں میں کیا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کیونکہ جب ملک تقسیم ہوا تو پاکستان کو حصہ کیا ملا تھا؟ جن لوگوں نے جنگ آزادی کی تاریخ اور پھر آزادی کے بعد کے حالات کا بغور مطالعہ کیا ہوگا انہیں علم ہوگا کہ بٹوارے کے بعد مسلمانوں کو زمین کے صرف دو چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہی ملے تھے۔ یہ وہ علاقے تھے جہاں انسانی ترقی کا دور دور تک نام ونشان نہیں تھا۔ بٹوارے کے بعد جو اثاثے پاکستان کو ملنے تھے حکومت ہندوستان نے انہیں بھی غصب کر لیا تھا اور اس کے بعد پاکستان کو متواتر تین بار ہندوستان کی جارحیت کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن ان باتوں کے باوجود آج پاکستان اس مقام پر ہے جس کے بارے میں اگست 1947ء کے بعد تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ آزادی کے بعد پاکستان کے ملازمین اور حکام کو دریوں اور لکڑی کے بکسوں پر بیٹھ کر کام کرنا پڑا تھا۔ اپنے تھوڑے سے وسائل کو بروئے کار لا کر پاکستانی حکمرانوں نے ملک کو جس ترقی کی راہ پر لگایا ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ زندگی کا ہر شعبہ یہاں تک کہ کھیل کا میدان بھی پاکستانی کھلاڑیوں سے اچھوتا نہیں رہا ہے۔ پاکستان نے دنیا کو جہانگیر خان، عمران خان اور جان شیر خان جیسے مایہ ناز کھلاڑی دیئے۔ اگر پاکستان نہ بنتا

Marfat.com

تو کیا عمران خان کو وہ مقام حاصل ہوتا جو آج انہیں حاصل ہے۔ ہندوستان میں انہیں ابھرنے کا موقع ہی نہ دیا جاتا کیونکہ ہندوستان جہاں ذات پات کی بنیاد پر فیصلے ہوتے ہیں اس کی کرکٹ کی ٹیموں میں ایک دو سے زیادہ مسلم کھلاڑی کو موقع ہی نہیں دیا جاتا ہے۔

یہیں یہ سوال بھی اٹھ سکتا ہے کہ قائداعظم نے پاکستان جا کر اچھا کیا تھا تو پھر مشرقی پاکستان الگ کیوں ہوا اور آج سندھ میں مہاجروں کے خلاف کارروائیاں کیوں ہو رہی ہیں؟ تو اس سلسلہ میں بس اتنا ہی کہنا چاہوں گا کہ غلطیاں ہماری اپنی تھیں اور ہیں جس کا خمیازہ نئی نسل کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔ ان دونوں شورشوں میں غیر ملکی ہاتھ ملوث ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں تک تعلق مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا ہے تو اس میں سب سے پہلی غلطی ہم مہاجروں کی ہے جنہوں نے خود کو وہاں کی تہذیب سے بالکل الگ رکھا۔ ان میں گھلنے ملنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مہاجروں میں جنہیں عرف عام میں بہاری مسلمان بھی کہا جاتا تھا اور مقامی آبادی میں دوری روز بروز بڑھتی گئی اس خلیج کا فائدہ ہندوستان نے اٹھایا اور بغاوت کو ہوا دے کر پاکستان کو توڑنے کی سازش کی جس میں اسے کامیابی بھی ملی۔ مہاجر اسی غلطی کو مغربی پاکستان میں بھی دوہرا رہے ہیں۔

آپ کا آخری سوال ہے کہ ''علماء نے پاکستان کی مخالفت کیوں کی تھی؟'' تو جناب پاکستان کی مخالفت خود قائداعظم نے بھی کی تھی۔ انہوں نے پاکستان کبھی نہیں چاہا تھا۔ مگر جب کانگرسی لیڈروں نے مسلمانوں کو نظر انداز کرنا شروع کیا تو مجبوراً انہوں نے مسلمانوں کے لیے ایک خود مختار مسلم ریاست کا مطالبہ کیا تھا۔ علماء کی جس جماعت نے اس وقت قائداعظم کے مطالبہ کی مخالفت کی تھی وہ دراصل کانگرس کے تنخواہ دار علماء کی جماعت تھی جنہیں آزادی کے بعد کانگرس نے کونسلوں اور پارلیمنٹ میں چور دروازہ سے جگہ دی تھی۔ ایسے علماء کی عوام میں کوئی گرفت نہیں تھی اسی لیے کانگرس نے ان پر اپنی کرم فرمائیوں کے لیے چور دروازہ کا استعمال کیا تھا۔ کچھ لوگ نظریاتی طور پر کانگرس پارٹی سے ضرور جڑے تھے مگر انہیں عالموں کی جماعت جمعیت علماء ہند کا کارکن نہیں کہا جا سکتا۔ آپ اپنے اردگرد کا جائزہ لیں تو ایسے علماء کی بھی بڑی تعداد نظر آ جائے گی جو کانگرس کی بے التفاتی سے کبیدہ خاطر ہو کر پاکستان جا بسے تھے اور مسلم لیگی ہونے کا دعویٰ کرنے لگے تھے۔ لہٰذا مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ قائداعظم نے پاکستان لے کر کوئی غلطی نہیں کی بلکہ اگر پاکستان نہ بنتا تو آج ہندوستان کے سارے مسلمان غلام ہوتے۔

Marfat.com

بھارتی قیادت کی ریشہ دوانیاں

ایک ہزار سال سے زائد اکٹھے رہنے والے برصغیر کے ہندوؤں مسلمانوں کے متعلق البیرونی لکھتا ہے کہ ''غیروں کو یہ لوگ (ہندو) ملیچھ (ناپاک) سمجھتے ہیں۔ اس وجہ سے ان سے ملنا جلنا، شادی بیاہ کرنا، قریب جانا یا ساتھ بیٹھنا اور مل کر کھانا جائز نہیں سمجھتے بلکہ جس چیز میں غیر قوم کی آگ اور پانی سے کام لیا گیا ہو اور ان دونوں ضروریات زندگی پر انسانی زندگی کا انحصار ہے، اپنے لیے ناپاک سمجھتے ہیں۔ ہندوؤں میں کسی شخص کو جو ان کی قوم سے نہیں اپنے اندر داخل کرنے کی مطلق اجازت نہیں۔ یہ ایسی حالت ہے جو ہر رشتہ توڑ دیتی ہے اور کامل طور پر منقطع کر دیتی ہے''۔

بقول ہنری کسنجر: ''مسلمان اور ہندو کا ساتھ سینکڑوں سال کا ہے مگر وہ ایک دوسرے کے قریب نہ آ سکے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ من حیث القوم ہندو کی شخصیت سات پردوں میں نہاں اور مسلمان کا ظاہر و باطن کھلی کتاب کی طرح عیاں ہے۔ فکر و نظر کا یہ تضاد دونوں کے طرز تعمیر میں بھی جھلکتا ہے۔ نفیس تراش خراش کے ہندو مندر دیکھتے چلے جایئے، صناعی میں بے جا تفصیل تو ہے، کسی ایک منظر یا خیال کی عکاسی نہیں۔ لیکن مغلوں کی تعمیر کردہ مساجد اور قلعوں پر نظر ڈالیے کتنے وسیع و عریض، جاذب نظر اور سحر آفریں ہیں۔ جگمگ کرتی ان پرشکوہ عمارتوں سے جنگل میں منگل کا سماں ہے اور قدم قدم پر ابلتے حسین فواروں کے سائے ہیں۔ انسان ماحول کی تندی و تلخی بھول جاتا ہے''۔ (White House Years, P.845)

دونوں مذاہب کا یہ گہرا اختلاف ہندو اور مسلمان تہذیبوں کے درمیان ہمیشہ آویزش کا باعث رہا ہے۔ ہندو تہذیب ماضی میں کئی تہذیبوں کو اپنے اندر جذب کر چکی ہے۔ مسلم تہذیب کو ہندو ثقافت و دین میں مدغم کرنے کے لیے بھی ہندوؤں میں بہت سی تحریکیں اٹھیں اور خود مسلمانوں میں بھی وقتاً فوقتاً ایسے عناصر پیدا ہوئے جو ہندو تصورات کے قریب آنے لگے۔ اکبر اعظم کے دور حکمرانی میں اس سلسلے میں کافی کوششیں ہوئیں لیکن مسلمانوں نے ہمیشہ اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا۔ ہندو اور مسلم تہذیبوں کے درمیان تصادم اور مسابقت کی کیفیت میں تیزی و تلخی اس وقت آئی جب ہندوستان میں نمائندہ اداروں کے قیام کے امکانات پیدا ہونا شروع ہوئے اور یہ بات واضح ہوئی کہ ان اداروں میں نمائندگی دونوں کی تعداد کی بنیاد پر حاصل ہوگی۔ ہندوؤں کی خواہش یہ تھی کہ اپنی عددی اکثریت کے بل پر مسلمانوں کو اپنا تابع مہمل بنا لیا جائے اور آہستہ آہستہ ان کے اندر سے اپنی مخصوص تہذیبی حیثیت کا احساس ختم کر دیا جائے اور اس طرح ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت کے حقوق ان کی مرضی کے تابع ہو جائیں گے۔ اس پر مسلمانوں نے انگریز حکومت سے اپنے حقوق و مفادات کے تحفظ کے لیے جداگانہ نیابت اور صوبائی خود مختاری جیسے مطالبات پیش کیے۔

(Pakistan: The Formative Phase, 70-74)

Marfat.com

کانگرسی لیڈروں نے مسلمانوں کی آرزوؤں کی کوئی قدر نہ کی تو پھر انہوں نے مسلم قومیت کو اجاگر کیا اور قائداعظمؒ نے اعلان کیا کہ ہندوستان میں دو بڑی قومیں ہندو اور مسلمان آباد ہیں۔ مسلمان ہندوؤں سے رسم و رواج، مذہب وعقیدہ، تہذیب و تمدن، زبان وادب اور تاریخی روایات کے لحاظ سے بالکل الگ تھلگ ہیں۔ برصغیر کے مسلمان قوم کی ہر تعریف کے لحاظ سے ایک علیحدہ اور مکمل قوم ہیں لہٰذا ان کی علیحدہ قومی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے ان کے لیے ایک علیحدہ خودمختار مسلم ریاست قائم کی جائے۔ کانگرسی لیڈروں کو علیحدہ مسلم ریاست کا مطالبہ سخت ناگوار گزرا اور انہوں نے ہندوستان کی تقسیم کی جان توڑ مخالفت کی۔ مسلمانوں کی یہ کوشش اپنی بقا کے لیے تھی لیکن ہندو یہ کہتے تھے کہ دھرتی ماتا کے دو ٹکڑے نہیں ہو سکتے۔ جب انگریز نے 1946ء میں ہندوستان کو آزادی دینے کا فیصلہ کرلیا تو دونوں قوموں میں تلخی و تصادم بہت بڑھ گیا جو آخر کار انڈیا کی تقسیم اور پاکستان کے وجود پر منتج ہوا۔

آزادی کے مسائل:

برصغیر کی تقسیم دوقومی نظریہ کی بنا پر وجود میں آئی۔ کانگرس نے 3 جون 1947ء کے تقسیم ہند کے منصوبہ کو اس امید کے ساتھ قبول کیا تھا کہ ہندوستان دوبارہ متحد ہو جائے گا اور دوقومی نظریہ کی نفی ہو جائے گی۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا ریزولوشن جو 14 جون 1947ء کو منظور کیا گیا یہ تھا: ''ہندوستان جس طرح کا ہے جغرافیے پہاڑ اور سمندر نے اس کی یہ تشکیل کی ہے اور کوئی انسانی ادارہ اس کی یہ صورت نہیں بدل سکتا یا اس کے آخری مقدر کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا، اقتصادی حالات اور بین الاقوامی معاملات کے تقاضے ہندوستان کے اتحاد کو اور ضروری کر دیتے ہیں۔ ہمارے دلوں میں ہمیشہ متحدہ ہندوستان کا تصور قائم رہے گا۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی سنجیدگی سے یہ یقین رکھتی ہے کہ جب موجودہ جذباتی ہیجان بیٹھ جائے گا تو ہندوستان کے مسائل صحیح تناظر میں دیکھے جائیں گے اور ہندوستان میں دوقوموں کا باطل نظریہ مسترد و غیر معتبر قرار پائے گا۔'' (Transfer of Powe. of India, V.P. Menon. P.384)

گاندھی نے ہندوستان کی تقسیم کو ''مقدس گائے کو دو نیم کرنے کا عمل قرار دیا اور صاف لفظوں میں کہا کہ بالآخر ہندوستان پھر متحد ہو جائے گا اور مسلم لیگ ہندوستان میں واپسی کے لیے کہے گی۔ وہ نہرو سے واپسی کے لیے کہیں گے اور نہرو انہیں واپس لے لے گا''۔ (نیویارک ہیرالڈ ٹربیون 5 جون 1947ء)

نہرو کا کہنا تھا کہ پاکستان ناقابل عمل مذہبی تصورات کی حامل قرون وسطیٰ کی ایک ریاست ہے جو ایک دن بھارت میں ضم ہو جائے گی۔ نہرو نے یہ بھی کہا کہ ہم متحدہ ہندوستان کے آرزومند تھے لیکن جب ہم نے دیکھا کہ تقسیم کے علاوہ کوئی حل نہیں تو ہم نے اسے قبول کرلیا۔ قدرتی طور پر پاکستان کے ساتھ ہمارا ممکن حد تک قریبی تعاون ہونا چاہیے۔ ہم تعاون چاہتے ہیں اور اس کے لیے کام کر رہے ہیں اور ایک نہ ایک دن لازمی طور پر بھارت اور پاکستان کی یکجائی عمل میں آئے گی۔ تاہم میں نہیں جانتا کہ کب! چار پانچ یا دس سال بعد۔'' (H.V. Hudson: The Great Divide, P. 315.)

سردار ولبھ بھائی پٹیل جو تقسیم ملک کے بعد بھارت کے پہلے نائب وزیراعظم بنے ان کا یہ بیان ریکارڈ پر ہے کہ: ''اس دکھ درد اور صدمے کا احساس جو تقسیم برصغیر سے اٹھانا پڑا وہی کر سکتے ہیں جو عمر بھر اتحاد کے لیے جدوجہد

Marfat.com

کرتے رہے لیکن انہیں تقسیم برصغیر کے لیے زندہ رہنا پڑا۔ ہماری تمام تر توجہات ان کی فلاح کے لیے مختص رہیں گی۔ ہم ان کے مستقبل سے انمٹ لگن برقرار رکھیں گے اور اس امید پر جئیں گے کہ جلد یا بدیر ہم دوبارہ متحد ہو کر اپنے ملک کی کسی اطاعت گزاری میں باہم شریک ہو جائیں گے"۔ (امرت بازار پتریکا: 15 اگست 1947ء)

کانگرس کے صدر مسٹر اچاریہ کرپلانی نے کہا نہ تو کانگرس اور نہ بھارتی قوم ہی اکھنڈ ہندوستان کے دعوے سے دستبردار ہوئی ہے۔ آزادی سے ہی اس طرح پاکستان کے الگ وجود کو تسلیم کرنے پر بھارتی لیڈروں کی یہ باطنی نارضامندی دونوں ملکوں میں عدم اعتماد کا سبب بن گئی اس کے علاوہ آزادی اور قیام پاکستان کا فیصلہ ہوا ہی تھا کہ کانگرس اور دوسری متعدد ہندو اور سکھ متعصب تنظیموں نے پاکستان کو مصائب و مشکلات سے دوچار کرنے کے لیے مشرقی پنجاب اور مغربی بنگال کے بھارت کے کئی حصوں میں مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا اور مسلمانوں کو ان کے آبائی گھروں سے نکال کر پاکستان کی طرف دھکیلنا شروع کر دیا۔ جب مشرقی پنجاب میں مار دھاڑ اور قتل و غارت کا طوفان چل پڑا اور بے خانماں اور سراسیمہ مسلمان لاہور کی طرف بھاگنے لگے تو مغربی پاکستان میں بھی جوابی کارروائیاں شروع ہو گئیں۔ جبری ترک وطن اور بہیمانہ خونریزی سے نہ صرف انسانی دکھ درد میں اضافہ ہوا بلکہ پاکستان اور بھارت میں بداعتمادی اور نفرت گہری ہو گئی ہے۔

اگرچہ قتل و غارت سرحدوں کے دونوں طرف ہوئی لیکن مسلمانوں پر کیے جانے والے مظالم اپنی سنگینی اور شدت میں ان زیادتیوں سے کوئی نسبت نہیں رکھتے جو مسلمانوں کے ہاتھوں کہیں کہیں ہندوؤں اور سکھوں پر روا رکھی گئیں۔ جیسا کہ ایان سٹیفن نے لکھا ہے کہ ہندوؤں اور سکھوں کے بڑے بڑے قتل عام بہت باقاعدہ تھے اور منصوبہ بندی کے تحت کیے جاتے تھے جبکہ مسلمانوں کی طرف سے اس طرح ظالمانہ کارروائیوں کی مثالیں اگر تھیں تو بہت معمولی۔ تقریباً نصف ملین یعنی پانچ لاکھ افراد بے رحمی سے قتل کر دیئے گئے۔ دوطرفہ ترک وطن کرنے والوں کی تعداد تقریباً ایک کروڑ چالیس لاکھ ہے۔ ایک اندازے کے مطابق 53 لاکھ افراد پاکستان سے بھارت گئے اور 87 لاکھ افراد بھارت سے پاکستان آئے۔ اس طرح پاکستان پر اپنے ابتدائی دنوں میں یک لخت 17 لاکھ مزید انسانوں کا بوجھ پڑ گیا۔ اور بقول ایوب خان: ''بھارت نے ہمارے لیے پناہ گزینوں کی بحالی کا زبردست مسئلہ اس لیے پیدا کیا تھا کہ ہماری معیشت مفلوج ہو کر رہ جائے۔

(فرینڈز ناٹ ماسٹرز: صفحہ 115)

اس وقت جب کشت و خون میں مبتلا لاکھوں افراد کو ان کے گھروں سے نکالا جا رہا تھا تو دونوں حکومتوں میں جنگ کی باتیں بھی اکثر سنائی دیتی تھیں۔ عدم تشدد کا پرچار کرنے والے مہاتما گاندھی بھی 26 ستمبر 1947ء کو پرارتھنا کی میٹنگ میں تقریر کرتے ہوئے کہا: ''اگر پاکستان اپنی غلطیوں کو تسلیم نہ کرنے کی قسم کھا چکا ہے تو بھارت اعلان جنگ کرنے سے باز نہیں رہ سکتا''۔ ابھی بمشکل پاکستان قائم ہی ہوا تھا ایسے وقت میں بھارتی لیڈروں کی ان دھمکیوں کو پاکستانی کیسے بھول سکتے ہیں۔ ایک طاقت ور ہمسایہ کے راہنما کے ایسے خیالات نے پاکستانیوں کے ذہنوں میں گہری بدگمانی اور خوف پیدا کر دیا جس پر قائداعظمؒ نے شکایت کا اظہار کیا کہ بدقسمتی سے ایسا پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے کہ پاکستان محض ایک عارضی پاگل پن ہے اور یہ ندامت و پشیمانی کے ساتھ انڈین یونین میں مل جائے گا۔ ہم ایک بہت گہری اور اچھی طرح تیار کی ہوئی

Marfat.com

سازش کا شکار ہو گئے ہیں جس کا مقصد نوزائیدہ مملکت پاکستان کو ختم کرنا ہے۔ (سٹیٹسمین: 25 اکتوبر 1947ء)

سرحدوں کا تعین:

خون ریز فرقہ وارانہ فسادات نے پاکستان اور بھارت کی فضا کو زہر آلود کر رکھا تھا کہ 17 اگست 1947ء کو باؤنڈری کمیشن کے فیصلے کا اعلان ہوا جو پاکستان پر بجلی بن کر گرا۔ اس فیصلے کی شرانگیزیوں کے پاک بھارت تعلقات پر تلخ اثرات ابھی تک باقی ہیں۔ 3 جون 1947ء کے منصوبہ کے مطابق پنجاب اور بنگال نے تقسیم ہونے کا فیصلہ کیا۔ تقسیم ہونے والے ان نئے صوبوں کی نئی سرحدیں قائم کرنے کے لیے دو باؤنڈری کمیشن جسٹس دین محمد، جسٹس محمد منیر، جسٹس مہر چند مہاجن اور جسٹس تیجا سنگھ پر مشتمل تھا جبکہ بنگال باؤنڈری کمیشن کے ممبران میں بی کے مکرجی، جسٹس سی سی بسواس، جسٹس صالح محمد اکرم اور جسٹس ایس اے رحمان شامل تھے۔ سرحدوں کے تعین میں کمیشن کے لیے راہنما اصول یہ تھا کہ ملحقہ مسلم اکثریتی علاقے پاکستان کے اور غیر مسلم اکثریتی علاقے بھارت کے حوالے کر دیئے جائیں اور ایسا کرتے وقت دیگر عوامل کا بھی جائزہ لیا جائے۔ ملحقہ اکثریتی علاقے کی اصطلاح واضح نہ تھی کیونکہ اس میں ڈویژن، ضلع، تحصیل یا تھانہ کا ذکر نہ تھا اور دوسرے عوامل کی بھی وضاحت نہیں کی گئی جس سے ممبران میں ابہام پیدا ہو گیا اور متصادم تشریحات نے جنم لیا۔ بعد ازاں ان دونوں راہنما اصولوں سے فائدہ بھارت کو پہنچایا گیا۔ یہ بات بھی پہلے طے کر دی گئی تھی کہ اگر کمیشن کے ارکان میں حد بندی کے مسئلہ پر اتفاق رائے نہ ہو سکا تو چیئرمین کا فیصلہ آخری ہوگا۔ فریقین کے دعاوی میں شدید اختلاف تھا۔ سرحدی کمیشن کے ہندو رکن مہر چند مہاجن اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں کہ میرا اصرار تھا کہ لاہور پاکستان کی بجائے بھارت کے حصے میں آنا چاہئے، تو بحث کے دوران ریڈکلف نے کہا کہ تم لاہور اور کلکتہ دونوں کیسے حاصل کر سکتے ہو، میں پاکستان کو کیا دوں گا۔ میں نے اس پر احتجاج کیا۔ (مہر چند مہاجن: On Look Back, P.114)

اس طرح جب کمیشن کے ممبران اتفاق رائے سے کوئی فیصلہ نہ کر سکے تو اس کے چیئرمین ریڈکلف نے اپنی طرف سے فیصلہ کیا۔ ریڈکلف کے فیصلہ میں پاکستان اور مسلمانوں کے ساتھ شدید ناانصافیاں کی گئیں۔ مشرقی بنگال کے معاملہ میں سب سے پہلی ناانصافی یہ کی گئی کہ کلکتہ کا شہر بھارت کے حوالے کر دیا گیا۔ اگرچہ کلکتہ کے اندر مسلمان اقلیت میں تھے، ہندو بھی وہاں اکثریت میں نہ تھے بلکہ اچھوت اکثریت میں تھے اور ان کے لیڈر کانگرس کی بجائے مسلم لیگ سے اشتراک عمل کرتے تھے۔ اس کے علاوہ دوسرے عوامل بھی پاکستان کے حق میں تھے۔ وہاں صنعت وحرفت اور بندرگاہ کا انحصار مسلم اکثریت کے اضلاع مرشد آباد اور نادیہ وغیرہ پر تھا۔ پاکستان کو ضرورت تھی کہ اس علاقے میں اس کے پاس کم از کم ایک بندرگاہ تو ہو مگر ریڈکلف نے نہ صرف کلکتہ ہی بھارت کے حوالے نہ کیا بلکہ اس کے ساتھ مسلم اکثریت کے اضلاع مرشد آباد کو مکمل اور نادیہ کے بہت سے بڑے حصے کو بھارت کے حوالے کر دیا۔ درحقیقت کلکتہ کو پاکستان سے کاٹنے کا فیصلہ بہت پہلے ہو چکا تھا جیسا کہ بعد میں سردار پٹیل نے ایک بیان میں کہا ہم نے یہ شرط رکھی کہ ہم تقسیم پر صرف اس صورت رضامند ہوں گے کہ جب کہ ہمیں کلکتہ کا نقصان نہ ہو۔ اگر کلکتہ گیا تو بھارت گیا۔

(چوہدری محمد علی: دی ایمرجنس آف پاکستان، صفحہ 208)

پنجاب میں ضلع گورداسپور کی ہندو اکثریتی تحصیل پٹھان کوٹ کے ساتھ ملحقہ مسلم اکثریتی تحصیلیں گورداسپور اور

Marfat.com

بٹالہ بھی بھارت کو دے دی گئیں۔ اگر گورداسپور بھارت کو نہ ملتا تو کشمیر پر قبضہ کرنا اس کے لیے کسی طرح بھی ممکن نہ تھا۔ بھارت سے کشمیر کو جانے والا واحد زمینی راستہ ضلع گورداسپور سے گزرتا ہے۔ ضلع امرتسر میں مسلم اکثریتی تحصیل اجنالہ بھارت کو دے دی گئی، ضلع جالندھر میں مسلم اکثریتی تحصیل نکودر اور جالندھر بھارت کے حوالے کر دی گئیں۔ ضلع فیروز پور میں مسلم اکثریتی تحصیل زیرا اور فیروز پور جو دریائے ستلج کے مشرق میں تھیں، بھارت کو منتقل کر دی گئیں۔ یہ تمام مسلم اکثریتی علاقے مغربی پنجاب سے ملحق تھے۔ اس طرح فیروز پور کا ہیڈ ورکس بھی بھارت کے حوالے کر دیا گیا جس سے نکلنے والی نہریں پاکستان کو سیراب کرتی تھیں۔ ریڈکلف کا یہ فیصلہ غیر منصفانہ تھا اور بقول جسٹس دین محمد بھارت کی طرف داری کے لیے یہ ریڈکلف اور ماؤنٹ بیٹن کی سازش تھی، کیونکہ 3 جون کے پلان میں پنجاب کی عارضی تقسیم کا جو خاکہ شامل کیا گیا تھا (جس کی بنا پر اسمبلیوں کے ممبروں کے دو گروپ بنائے گئے تھے اور دونوں گروپوں کو الگ الگ فیصلوں کا حق دیا گیا تھا) اس میں بھی ضلع گورداسپور پاکستان میں شامل تھا لیکن ماؤنٹ بیٹن نے 3 جون کو ہی تقریر میں اعلان کیا تھا کہ یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ وہ خط مستقیم جو باؤنڈری کمیشن کھینچے گا ہو بہو اس لائن کے مطابق نہ ہوگا جو عارضی تقسیم میں اختیار کی گئی ہے۔ جب ان سے اس کی پریس کانفرنس میں وضاحت طلب کی گئی تو انہوں نے کہا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ضلع گورداسپور میں آبادی کا تناسب اس طرح ہے کہ مسلمان 50.4 فیصد اور غیر مسلم 49.6 فیصد ہیں۔ ان کے درمیان صرف 8. فیصد کا فرق ہے۔ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ بات غیر اغلب ہے کہ سرحدی کمیشن گورداسپور کے پورے ضلع کو مسلم اکثریت کے علاقے میں شامل کر دے گا۔ آبادی کے یہ اعداد و شمار درست نہ تھے کیونکہ 1941ء کی مردم شماری کی رو سے آبادی کا فرق صرف 8. فیصد نہیں بلکہ 2.28 فیصد تھا۔ (ریڈکلف کی ہیرا پھیری: پاکستان ٹائمز 14 اگست 1947ء جسٹس دین محمد)

یہاں ماؤنٹ بیٹن کی دلچسپی یہ تھی کہ گورداسپور کا تین چوتھائی بھارت کے حوالے کر کے اس کو کشمیر تک پہنچنے کا راستہ مہیا کیا گیا۔ اس کے لیے اس نے چیئرمین کو کچھ نصیحت کی تھی۔ ریڈکلف نے پنجاب میں فیروز پور اور زیرا بھی پاکستان کو دے دیے تھے جس کی تصدیق گورنر جنکنز کے چھوڑے ہوئے کاغذات میں سے ایک نقشہ سے ہوئی جو نئے گورنر فرانسس موڈی کے ہاتھ لگا۔ یہ 8 اگست کو جنکنز کی درخواست پر اسے دہلی مہیا کیا گیا تھا تاکہ وہ اس کے مطابق حفاظتی انتظامات کر سکے۔ اس میں فیروز پور اور زیرا کی تحصیلیں پاکستان میں دکھائی گئی تھیں۔ لیکن 8 تا 12 اگست کے درمیان یہ فیصلہ بدلا گیا۔ قائداعظمؒ کی ہدایت پر چوہدری محمد علی نے 10 اگست کو لارڈ اسمے سے بھی اس اندیشہ کا اظہار کیا کہ گورداسپور، امرتسر اور جالندھر کے مسلم علاقوں کو بھارت میں شامل کرنے کی سازش کی جا رہی ہے تو اس نے اس سے بالکل لاعلمی کا اظہار کیا اور جب اسے اس کے کمرے میں لٹکے ہوئے پنجاب کے نقشہ پر پنسل سے بطور سرحد کھینچا ہوا ایسا خط دکھایا گیا تو وہ پریشان ہو کر رہ گیا۔ اس نے گڑبڑا کر کہا کہ ''کون میرے نقشے پر حماقتیں کرتا رہا ہے''۔

(پاک بھارت تعلقات 1947-66 جی ڈبلیو چوہدری)

پنجاب حد بندی کمیشن کا ایوارڈ 8 اگست کو تیار ہو گیا تھا لیکن اس کے اعلان میں پراسرار تاخیر کی گئی یہاں تک کہ تقسیم کی کونسل کے ممبران کو بھی اس سے آگاہ نہ کیا گیا۔ 17 اگست تک ایوارڈ کی تفصیلات کو راز میں کیوں رکھا گیا؟ فلپ زیگلر کے نزدیک یہ التوا اس لیے کیا گیا تاکہ چٹاگانگ کا پہاڑی علاقہ پاکستان کو دینے اور فیروز پور اور گورداسپور بھارت کے لیے ہونے کی بنا پر ان

Marfat.com

کے اثرات سے دونوں مملکتوں کے اندر یوم آزادی کی تقریبات خراب نہ ہوں۔ (چوہدری محمد علی: ایمرجنس آف پاکستان، صفحہ 218)

گورداسپور اور فیروز پور میں ہندو مسلم آبادی تقریباً برابر تھی اس لیے انہیں دیگر عامل کی بنا پر تقسیم کیا گیا۔ فیروز پور بھارت کو واٹر سسٹم کی بنا پر دیا گیا اور جب امرتسر ضلع کو علیحدہ نہ کیا گیا تو گورداسپور بھی بھارت کے لیے ضروری ہو گیا۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ 8 اور 17 اگست کے دوران ایوارڈ کو ریڈکلف نے ماؤنٹ بیٹن کی شہہ پر تبدیل کر دیا۔ ریڈکلف نے خود اس کا اعتراف کیا ہے کہ ''آخری لمحوں میں کچھ تبدیلیاں کی گئیں لیکن وہ معمولی تھیں''۔

(آٹو بائیو گرافی لارڈ ماؤنٹ بیٹن، صفحہ 419)

ماؤنٹ بیٹن کو گورنر جنرل نہ بنائے جانے کا دکھ بھی تھا۔ اس کے علاوہ نہرو نے بھی ایوارڈ کو تبدیل کروانے کے لیے ماؤنٹ بیٹن پر اثر ڈالا تھا اور اثر کیوں نہ ہوتا۔ ماؤنٹ بیٹن کی تقرری بطور وائسرائے نہرو کی وجہ سے تھی اور وہ نہرو کا دوست بن گیا۔ اس ایوارڈ نے کشمیر اور نہری پانی کے تنازعات پیدا کیے جو دونوں ملکوں کے بہتر تعلقات میں زبردست رکاوٹ بنے۔

اثاثوں کی تقسیم:

دونوں ملکوں میں فوجی ساز و سامان اور نقد اثاثہ جات کی غیر منصفانہ تقسیم سے بھی سخت کشیدگی پیدا ہو گئی۔ فوجی ساز و سامان اور اسلحہ کی تقسیم اور نقل و حمل کی ذمہ داری مشترکہ دفاعی کونسل کے سپرد تھی جس میں سپریم کمانڈر اکنلیک، لیاقت علی خان اور بلدیو سنگھ شامل تھے۔ یہ کونسل فوجی ساز و سامان کا ایک تہائی پاکستان کو دینے پر رضامند ہو گئی اور یہ اندازہ لگایا گیا کہ سپریم کمانڈر 31 مارچ 1948ء تک اپنا کام مکمل کر لے گا۔ بھارت پاکستان کو اس کے فوجی ساز و سامان کے حصہ سے محروم رکھنا چاہتا تھا تا کہ وہ دفاعی لحاظ سے کمزور رہے۔

صدر جنرل ایوب خان فرینڈز ناٹ ماسٹرز میں لکھتے ہیں: میرے ذمے جو کام کیا گیا وہ یہ تھا کہ میں پاکستانی فوج کی تشکیل اور اس کی تربیت کے مسئلے کو حل کروں۔ میرا اس کام سے کئی سال تک گہرا تعلق رہا ہے۔ پہلے مشرقی پاکستان میں جنرل آفیسر کمانڈنگ کی حیثیت سے، پھر ایڈجوٹنٹ جنرل اور آخر میں پاکستانی فوج کے کمانڈر ان چیف کی حیثیت سے۔ اس سے پہلے کہ میں اپنے تجربات بیان کروں جو ان عہدوں پر رہ کر مجھے حاصل ہوئے، میں مختصر طور پر بتا دینا چاہتا ہوں کہ تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے فوراً بعد فوج کی کیا حالت تھی۔

برطانوی ہند کی فوج میں ہم مسلمان افسروں کو قائداعظم محمد علی جناحؒ کی اس عظیم جدوجہد سے جو وہ قیام پاکستان کے لیے کر رہے تھے قدرتی طور پر بڑا لگاؤ تھا لیکن اس سیاسی کشمکش میں اور جو لوگ حصہ لے رہے تھے ان کے بارے میں ہمیں کچھ زیادہ علم نہ تھا۔ فوجی تربیت نے ہمیں سکھایا تھا کہ فوجی افسروں کو سیاسیات سے الگ رہنا چاہیے چنانچہ ہم بیشتر سیاست دانوں سے ایسے ہی ناواقف تھے جیسے کہ وہ ہم سے تھے۔

جب آزادی حاصل ہوئی تو ہم نے جانا کہ اب ہم مسلمانوں کا ایک علیحدہ وطن ہو گا۔ چنانچہ قدرتی طور پر فوج کی تقسیم بھی ایک اہم مسئلہ بن گئی۔ گو فوج کی تقسیم سے براہ راست میرا تعلق نہیں تھا لیکن شروع ہی سے یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی تھی کہ پاکستان کے پاس خود اپنی فوج ہونی چاہیے اور فوج بھی اعلیٰ درجے کی جو ہمارے ملک کا بچاؤ کر سکے۔

Marfat.com

جنرل کری آپا نے جو اس وقت فوج میں سینئر انڈین افسر تھے مجھ سے کہا کہ تم اس امر میں میری حمایت کرو کہ فوج کو تقسیم نہ کیا جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں کے لیے ایک ہی فوج ہو۔ مجھے امید ہے کہ تم میرا نقطہ نظر سمجھو گے اور اسے پسند کرو گے۔ میں نے ان سے کہا کہ دو آزاد ملکوں کے لیے ایک ہی فوج کا ہونا قیاس میں بھی نہیں آ سکتا۔ فوج خودمختاری کی علامت اور لوگوں کی پشت پناہ ہوتی ہے۔ لوگوں کے خیال اور ان کی مرضی سے باہر وہ اپنا وجود ہی نہیں رکھتی۔ ہمارے پاس خود اپنی فوج ہونی چاہئے جو ہماری پالیسیوں پر عمل کرے اور ہماری آزادی کی محافظ ہو۔

اس پر مسلم افواج کی تقسیم کے لیے ایک کونسل بنائی گئی۔ ہماری طرف سے رضا، اکبر اور لطیف اس کونسل کے نمائندے مقرر ہوئے۔ مجھے یاد ہے ایک موقع پر اکبر ڈیرہ دون میں مجھ سے آ کر ملے اور کہا کہ دونوں فوجوں کے لیے ایک مشترکہ تربیتی ادارہ بنانے کی تجویز پیش کی گئی ہے۔ میں نے کہا کہ اس سے کام نہیں چلے گا۔ یہ سچ ہے کہ شروع شروع میں پاکستانی فوج کے پاس تربیتی سہولتوں کی کمی ہوگی اور شاید ہمیں درختوں کے سائے تلے کام کرنا پڑے۔ لیکن ہمیں ان کوتاہیوں کو صبر کے ساتھ قبول کر لینا چاہئے اور اپنے ادارے فوراً شروع کر دینے چاہئیں۔ ہماری فوج الگ ہونی چاہئے اور فوج کے تربیتی ادارے اور دوسری سہولتیں بھی الگ ہونی چاہئیں جو فوج کے لیے درکار ہوتی ہیں۔ میرے نزدیک مستقبل کا مسئلہ بالکل صاف تھا۔ دو قومیں وجود میں آ گئی تھیں اور لازمی تھا کہ ان میں سے ہر ایک کے پاس خود اپنا آلۂ قوت موجود ہو۔ کوئی بھی آزاد ملک اپنے وسیلۂ قوت میں کسی دوسرے ملک کو شریک نہیں کر سکتا۔ اس وقت اس قسم کی خیال آرائی بھی کی جا رہی تھی کہ گو ہندوستان اور پاکستان الگ الگ ہو گئے ہیں مگر وہ آپس میں رواداری کے ساتھ مل جل کر رہ سکتے ہیں۔ اس وقت کسی کے ذہن میں یہ بات نہ آئی تھی کہ ہندوستانی لیڈر کچھ اور ہی سوچ رہے تھے۔ مل جل کر رہنا تو ایک طرف، انہوں نے تو پاکستان کے لیے الجھنیں پیدا کرنے کی ٹھان رکھی تھی۔

اس مشورے کے سوا مسلح افواج کی تقسیم سے میرا براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا۔ لیکن فوج کی تقسیم سے جو مسئلے پیدا ہوئے ان کو حل کرنا میرے ذمہ ٹھہرا۔ یہ مسئلے کیا تھے؟ اول یہ کہ برٹش انڈین آرمی میں سرے سے بٹالین کے سائز کا کوئی پورا مسلم یونٹ تھا ہی نہیں حالانکہ ہندو اور گورکھا رجمنٹیں ہر طرح مکمل تھیں۔ جب جاپان سے لڑائی ختم ہوئی اور ملک تقسیم ہوا تو ہمارے آدمی ہندوستان کے یونٹوں سے چھوٹے چھوٹے گروہوں میں پاکستان آنا شروع ہوئے۔ بعض صورتوں میں وہ نہتے ہوتے تھے اور بعض اوقات بمشکل جان بچا کر پہنچتے تھے۔ چنانچہ ہمیں ان چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں سے اپنی فوج اس طرح تیار کرنی پڑی جس طرح تصویری معمے کے مختلف ٹکڑوں سے تصویر تیار کی جاتی ہے۔ مگر اس میں کئی ٹکڑے غائب تھے۔ ہمارے پاس ناتربیت یافتہ، نیم تربیت یافتہ اور اعلیٰ تربیت یافتہ سبھی قسم کے لوگ تھے۔ یہ مختلف یونٹوں اور مختلف علاقوں سے آئے تھے۔ ہمیں ان سب کو ملا کر مختلف قسم کے لڑنے والے یا امدادی دستے، رجمنٹیں اور ڈویژن اور کور بنانے تھے۔

ابھی نہیں اتحادیوں نے ملایا پر چڑھائی کرنے کا جو منصوبہ بنایا تھا اس کا صدر مقام ہندوستان تھا۔ چنانچہ بہت سی فوج کی طرح بہت سے فوجی سٹور اور ساز و سامان جنوبی ہند میں تھا جس میں ہمارا حصہ بھی شامل تھا۔ تقسیم کے معاہدے کے تحت ہم فوجی سامان اور ہتھیاروں سے بھری ہوئی ایک سو ساٹھ ٹرینیں لے جانے کا حق رکھتے تھے لیکن اس میں سے بہت

Marfat.com

ہی تھوڑا حصہ پاکستان پہنچنے پایا اور جب گاڑیاں آئیں بھی تو ان کے ڈبوں میں اینٹ پتھر اور تباہ شدہ سامان بھرا ہوا تھا۔

غرض ہماری فوج کے پاس اسلحہ کی بڑی کمی تھی اور وہ سخت غیر منظم بھی تھی۔ پھر جلد ہی اسے مہاجرین کی حفاظت کے لیے جو لاکھوں کی تعداد میں پاکستان آ رہے تھے، ان کے قافلوں کے ساتھ ساتھ جانا پڑا۔ پھر زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ اسے کشمیر کی لڑائی میں بھی حصہ لینا پڑا۔ اس تمام عرصے میں فوج کے پاس نہ تو کوئی منظم یونٹ تھا نہ کوئی ساز و سامان، اور گولہ بارود بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ حالت اتنی خراب تھی کہ شروع کے چند برسوں میں ہر فوجی کو مشق کے لیے صرف پانچ کارتوس فی سال کی اجازت تھی۔ (فرینڈز ناٹ ماسٹرز: صفحہ 33 تا 35)

سید حسن ریاض نے ''پاکستان ناگزیر تھا'' میں اس حوالے سے لکھا: افواج کی تقسیم کا مسئلہ سخت پیچیدہ تھا۔ جب وائسرائے اور لیڈروں کے درمیان اس مسئلے پر گفتگو ہوئی تو صدر کانگرس مسٹر کرپلانی نے کہا کہ یہ ایسا مسئلہ ہے جس کا قومیت کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے۔ قائداعظم نے اس خیال کی تائید میں فرمایا کہ پاکستان میں کوئی فرقہ وارانہ امتیاز نہیں برتا جائے گا اور جو لوگ وہاں رہتے ہوں گے بلا امتیاز مذہب پاکستان کے پورے پورے شہری ہوں گے۔ اس وقت یہ طے ہوا کہ فواج کی تقسیم حق شہریت کی بنا پر ہو (یعنی یہ کہ جو جہاں کا باشندہ ہو وہ اس علاقے کی فوج میں رہے) مگر اس شرط کے ساتھ کہ ''جن کا فرقہ ہندوستان یا پاکستان میں اقلیت میں ہو وہ اگر چاہیں تو دوسرے حصۂ ملک میں منتقل ہو جائیں''۔ بالآخر پارٹیشن کونسل نے یہ طے کر دیا کہ 15 اگست کے بعد پاکستان اور ہندیونین اپنے اپنے علاقوں میں فوجیں اپنے اپنے زیر کمان رکھیں جن کا غالب حصہ مسلمانوں یا غیر مسلموں پر مشتمل ہو۔

پارٹیشن کونسل کے اس فیصلے کی تعمیل کے لیے یہ ضروری ہوا کہ بحری اور فضائی افواج اور پلٹنوں (پلاٹون) کو توڑا اور تقسیم کیا جائے اور ان کے لیے دو مستقر قائم کیے جائیں، ایک ہندوستان میں اور دوسرا پاکستان میں جہاں 15 اگست کو ان کی کمان لے لی جائے۔ فوج کو اس طرح تقسیم کرنے کے خدمت فیلڈ مارشل آکن لیک کے سپرد ہوئی جو اب تک ہندوستان کی افواج کے کمانڈر انچیف تھے۔ تقسیم کے یہ نئی خدمت سپرد ہونے کے بعد ان کے عہدے کا نام سپریم کمانڈر ہوا۔ وہ یہ کام مشترکہ دفاعی کونسل کے ماتحت انجام دے رہے تھے جس کے ارکان پاکستان اور ہندوستان کے وزرائے دفاع تھے اور چیئرمین لارڈ ماؤنٹ بیٹن۔ مشترکہ دفاعی کونسل دسمبر 1948ء تک قائم رہی لیکن یکم دسمبر 1947ء سے سپریم کمانڈر اس کا رکن نہ رہا اور پھر یہ عہدہ ہی منسوخ کر دیا گیا۔

افواج اور فوجی سامان ایسی بری طرح تقسیم ہوا کہ پاکستان کے حصے میں جو کچھ بحری بیڑے کے نام سے آیا وہ بحری بیڑا نہ تھا اور جو فضائی بیڑے کے نام سے آیا وہ فضائی بیڑا نہ تھا۔ رہی فوج، تو جب وہ مختلف مقامات سے مجتمع ہو کر پاکستان پہنچی تو اس میں آدمی تھے مگر اسلحہ نہ تھا۔ اسلحہ خانے اور فوجی ذخائر ہندوستان میں ہی رہے اور وہ ہندوستان نے کبھی نہیں دیئے۔ رچرڈ سائمنڈس نے یہ سچ لکھا، اگرچہ بڑی نرمی سے لکھا، ''تقسیم کے اداروں میں سب سے کم کامیاب یہی جوائنٹ ڈیفنس کونسل کا ادارہ تھا'' جس کے غیر جانبدار چیئرمین لارڈ ماؤنٹ بیٹن تھے۔ یکم دسمبر کو برطانوی سپریم کمانڈر کا مستقر بند ہوا۔ اس وقت تک پاکستان کے حصے کا فوجی سامان برائے نام آیا تھا۔ بحری بیڑے کے جو جہاز پاکستان پہنچے ان میں تیل کا ایک پیپہ بھی نہیں تھا اور وہ گودی کے قریب اس انتظار میں پڑے رہے کہ ان کے لیے کہیں سے

Marfat.com

ایندھن مہیا کیا جائے''۔

دفاتر کا سامان تقسیم ہوا تھا۔ ٹائپ رائٹر، ریفریجریٹر، موٹر کاریں، میزیں، کرسیاں، الماریاں اس میں سب ہی کچھ تھا۔ جو سامان تقسیم ہونے کے قابل نہ تھا ان کی قیمت ملنی تھی۔ ہر چیز میں پاکستان کا حصہ سوا سترہ فی صدی تھا۔ پاکستان کو کراچی میں نئی مرکزی حکومت قائم کرنی تھی اور اس کے دفاتر کے لیے ہر چیز کی ضرورت تھی۔ مگر واقعی ہوا کیا، ہیکٹر بولیتھو نے اختصار کے ساتھ وہ خوب بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اور اس کھیل میں کہ ایک تجھے اور دو مجھے مسلمان خرابی میں تھے۔ چھوٹے اہل کار اور ہندوستان کے منیجر اور کلرک جو اکثر ہندو تھے، ان کو بڑا کاروباری سلیقہ ہے اور ادنیٰ درجے کا اختیار برتنا وہ خوب جانتے ہیں۔ مسلمانوں کو اس کی سمجھ نہیں ہے۔ جس وقت انہوں نے آزادی کی السناک غنیمت کو کھول کر دیکھا تو اس میں ان کو ایسی کوئی چیز نہ ملی جس سے گورنمنٹ کے دفاتر قائم ہوں۔ بحری جہازوں، طیاروں اور ٹائپ رائٹروں سے زیادہ ضروری چیز ہسپتالوں کے آلات تھے۔ ان میں بھی پاکستان کا حصہ تھا۔ کراچی میں پریشان ڈاکٹروں نے دیکھا کہ آلات جراحی کے ضروری پرزے ہندو نکال کر لے گئے تھے۔ سامان اور تجربے سے نہیں بلکہ صرف جوش اور ولولے سے پاکستانی ڈاکٹروں نے ہسپتالوں کو اس قابل کیا کہ زخمی، اعضائے بریدہ اور لب دم مہاجروں کا معالجہ کریں، جن کے ہجوم چلے آ رہے تھے۔

(''پاکستان ناگزیر تھا'' صفحہ 525, 524, 523)

باؤنڈری کمیشن:

دونوں مملکتوں کی سرحد کے تعین کے لیے 3 جون کے منصوبے کے مطابق دو حد بندی کمیشن قائم کیے گئے، ایک بنگال کی تقسیم اور آسام اور سلہٹ کی علیحدگی کے لیے اور دوسرا پنجاب کی تقسیم کے لیے۔ ہر کمیشن میں چار چار ارکان میں دو دو نمائندے مسلم لیگ کے اور دو دو کانگرس کے تھے۔ فریقین کی رضامندی سے سر سرل ریڈ کلف کو (جو بعد میں لارڈ ہو گئے) چیئرمین مقرر کیا گیا۔ کانگرس اور مسلم لیگ کے ارکان ہائی کورٹ کے جج تھے۔ بنگال کمیشن کے ارکان ابو صالح محمد اکرم، ایس اے رحمٰن، جسٹس سی سی بسواس، بی کے مکرجی اور پنجاب کے دین محمد، محمد منیر، مہر چند مہاجن اور تیج سنگھ تھے۔ ارکان کمیشن کے درمیان سخت اختلاف تھا۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ چیئرمین فیصلہ دے۔ چیئرمین نے جو فیصلہ دیا وہ ہر طرح پاکستان اور شرائط تحقیقات کے خلاف تھا۔ ریڈ کلف کے فیصلے کا پاکستان پر کیا اثر ہوا، اس کا اندازہ پاکستان ٹائمز کر مندرجہ ذیل اقتباس سے کیا جا سکتا ہے۔

''پنجاب میں عارضی تقسیم بھی غیر منصفانہ تھی لیکن آخری فیصلہ تو اس حد سے بھی آگے بڑھ گیا اور اس نے ہمارے بعض نہایت زرخیز قطعات زمین بھی کاٹ کر ڈال دیئے۔ سب سے زیادہ شدید ضرب ضلع گورداسپور پر پڑی ہے، جس کی دو تحصیلیں گورداسپور اور بٹالہ جن میں مسلمان 52.1 فیصدی اور 55.6 فیصدی کی اکثریت میں تھے، پٹھان کوٹ کی تحصیل کے ساتھ ہی ہندوستان میں شامل کر دی گئیں اور پاکستان سے بٹالہ جیسا بہترین مسلم صنعتی شہر چھین لیا گیا۔ ریڈ کلف صاحب نے یہاں تو دیہات وار سرحدی خط کھینچنے کی تکلیف گوارا کر لی لیکن ضلع امرتسر کی تحصیل اجنالہ کو بالکل بھول گئے جس میں ساٹھ فیصدی مسلم

Marfat.com

اکثریت تھی اور اس کا علاقہ بھی ضلع لاہور سے ملحق تھا۔ زیرہ اور فیروز پور کی تحصیلیں بھی، جن میں صاف مسلم اکثریت تھی ''سلسلۂ رسل ورسائل'' میں خلل کے بہانے سے الگ کر دی گئیں''۔

31 اگست کو قائداعظم نے اپنی نشری تقریر میں فرمایا:

''ہندوستان کی تقسیم اب آخری اور قطعی طور پر ہو چکی ہے۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ بلاشبہ اس عظیم اور خود مختار مسلم دولت کی تعمیر میں سخت ناانصافیاں کی گئی ہیں۔ جہاں تک ممکن تھا ہم کو دبایا گیا اور ہمارے رقبے کو کم کیا گیا ہے اور ہم پر جو آخری ضرب لگائی گئی ہے وہ باؤنڈری کمیشن کا فیصلہ ہے۔ یہ ایک غیر منصفانہ، ناقابل فہم بلکہ مکروہ فیصلہ ہے۔ لیکن یہ غلط ہو، غیر منصفانہ ہو، مکروہ ہو، یہ عادلانہ فیصلہ نہ ہو، بلکہ سیاسی فیصلہ ہو، بہرحال ہم اس کی پابندی کا وعدہ کر چکے ہیں۔ لہٰذا اس کی پابندی ہم پر واجب ہے۔ ایک آبرو دار قوم کی طرح ہمیں یہ قبول کر لینا چاہئے۔ یہ ہماری بدقسمتی سہی، لیکن ہمیں چاہئے کہ یہ مزید ضرب بھی ہم ہمت و ثبات اور بہ امید فلاح برداشت کریں۔''

قائداعظم بڑے باوقار شخص تھے اور عہد و پیمان کے نہایت پابند۔ ریڈکلف کی بددیانتی اور ناانصافی سے ان کو سخت صدمہ پہنچا، لیکن حسب وعدہ انہوں نے خود یہ فیصلہ منظور کیا اور پاکستانیوں کو ہدایت کی کہ اس پر صبر کریں۔ صبر کیا گیا مگر ان کے دلوں پر اس سے ایک زخم لگا ہے جو کبھی مندمل نہ ہوگا۔

اس سلسلے میں پاکستانیوں کو بڑے شبہات ہیں۔ ریڈکلف کا فیصلہ 13 اگست کو تیار تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے یہ طے کیا تھا کہ جیسے ہی فیصلہ ملے گا وہ فوراً مسلم لیگ اور کانگرس کے لیڈروں کے حوالے کر دیا جائے گا۔ مگر واقعی وہ حوالے کیا گیا 18 اگست کو۔ یہ صحیح ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن 13 اگست کو اختیار حکومت منتقل کرنے کے لیے کراچی تشریف لائے تھے، مگر حدود کے تعین کا مسئلہ بڑا اہم تھا۔ جیسے ہر معاملے میں وہ آندھی اور زلزلہ تھے اس کا بھی کوئی انتظام کر ہی سکتے تھے کہ فریقین کو فوراً فیصلہ حوالے کیا جائے۔ یہ تاخیر کے تین چار روز بہت تھے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کانگرس کو اس کی اطلاع پہلے نہیں دی گئی تاکہ وہ اس فیصلے کے مطابق اپنے انتظامات درست کر لے اور مسلم لیگ کو اطلاع ہونے تک یہ فیصلہ طے شدہ معاملے کی نوعیت اختیار کر چکے۔

مسٹر آئن اسٹیفن نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ اخباری نمائندوں کی ایک کانفرنس کا ذکر کیا ہے جس میں وہ خود بھی شریک تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

''لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے طرز عمل میں بھی بعض باتیں بڑی پریشان کن تھیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان کی خاص کمزوری ان کی تعلّی ہے۔ جب مسٹر جناح کا یہ فیصلہ ظاہر ہوا کہ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل وہ خود ہی ہونا چاہتے ہیں تو یہ نظر آیا تھا کہ ان (لارڈ ماؤنٹ بیٹن) کے غرور کو صدمہ پہنچا، اگرچہ ہم خوامخواہ یہ سوچ رہے تھے: ''چاہے کوئی کتنا ہی لائق ہو دونوں مملکتوں کا کام ایک ہی شخص کیسے اچھی طرح کر سکتا ہے!''

یہی مسٹر اسٹیفن، جو اُس وقت اسٹیٹسمین کے ایڈیٹر تھے، تقسیم کے دو ماہ بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ہاں کھانے پر مدعو تھے۔ وہ معاملات کے متعلق ان کے یکطرفہ فیصلوں پر متحیر رہ گئے۔ یہ اکتوبر 1947ء کا واقعہ ہے جب کشمیر کے الحاق

Marfat.com

کے لیے مہاراجہ سے سازش ہو رہی تھی۔ مسٹر اسٹیفن نے لکھا:

''معلوم ہوتا ہے کہ لارڈ اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن بالکل ہندوؤں کے طرفدار ہو گئے ہیں۔ اس شب گورنمنٹ ہاؤس کا ماحول بالکل جنگ کا سا تھا (جس میں) پاکستان، مسلم لیگ اور جناح دشمن تھے۔''

بھارت کو کسی قانون کی رو سے یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ پاکستان کو اس کا حصہ نہ دے۔ دراصل بھارت کی شاید یہ کوشش تھی کہ پاکستان مستحکم نہ ہو اور جب یہ مفلوک الحال ہو جائے تو زندہ نہ رہ سکے گا۔ جس سے بھارت اور پاکستان میں شکوک اور دشمنی بڑھنے لگی نیز یہ کہ 1954ء سے قبل پاکستان نے فوجی ساز و سامان دیگر ممالک سے بطور امداد حاصل نہیں کیا۔

جہاں تک نقد اثاثوں کا تعلق ہے تقسیم کے وقت ہند کے پاس کل اثاثہ چار ہزار ملین روپے تھا۔ پاکستان نے اس میں سے صرف ایک چوتھائی یعنی ایک ہزار ملین روپے کا مطالبہ کیا لیکن بھارت رضامند نہ ہوا۔ پہلے پہل یہ رقم بھی ان ہی اثاثوں میں شامل تھی جن کا فیصلہ ثالثوں کے سپرد کیا گیا تھا۔ لیکن دسمبر 1947ء کو بھارت اور پاکستان نے باہمی سمجھوتے کے ذریعے یہ فیصلہ کر لیا کہ پاکستان کو 750 ملین روپیہ ملے گا۔ دو سو ملین روپے کی ایک قسط پاکستان کو عبوری انتظام کے لیے ادا کر دی گئی تھی لیکن بقایا 550 ملین روپے بھارت نے اس بنا پر روک لیے کہ پاکستان اس روپے کو کشمیر کی جنگ میں بھارت کے خلاف استعمال کرے گا۔ بقیہ رقم کے لیے سردار پٹیل نے دھمکی دے دی کہ معاہدہ پر عملدرآمد کا انحصار مسئلہ کشمیر کے تصفیہ پر ہوگا۔ پاکستان کے وزیر خزانہ نے بیان دیا کہ معاہدہ کے لیے بحث و تمحیص کے دوران کہیں بھی مسئلہ کشمیر کا ذکر تک نہیں ہوا حالانکہ جب یہ سمجھوتہ ہوا تھا تو کشمیر کی جنگ جاری تھی۔

(جی ڈبلیو چوہدری: پاک بھارت تعلقات صفحہ 63)

پاکستان نے ان دونوں مسئلوں کو آپس میں جوڑنے سے انکار کر دیا اس طرح پاک بھارت تعلقات میں ایک بحران پیدا ہو گیا۔ مہاتما گاندھی نے بھارتی حکومت کو پاکستان کے نقد بقایا جات واگزار کرنے کے لیے 13 جنوری 1948ء کو مرن برت رکھ لیا۔ بھارتی حکومت گاندھی جی کے اس حربے کے سامنے بے بس ہو گئی اور 17 جنوری 1948ء کو ریزرو بینک آف انڈیا کو ہدایت کی گئی کہ وہ 500 ملین روپے پاکستان کو ادا کر دے لیکن 50 ملین روپیہ تقسیم کے بعد مشترکہ فوجی اخراجات میں سے پاکستان کا واجب الادا حصہ پورا کرنے کے لیے پھر روک لیا گیا۔ پاکستان نے اس کٹوتی کو غلط قرار دیا کیونکہ مالی معاہدہ میں اس کا کوئی ذکر نہ تھا لیکن بھارت نے بقایا جات کی ادائیگی کو اپنی فیاضی قرار دیا۔ لیکن یہ تو پاکستان کا حصہ تھا کوئی بھارت کی امداد اور تحفہ نہ تھا اور شدید تلخی کے بعد ہونے والا منصفانہ اقدام تھا اور ایک انگریزی محاورے کے مطابق انصاف میں تاخیر کرنا انصاف سے محروم کرنے کے مترادف ہے۔

Marfat.com

حیدر آباد اور جونا گڑھ

آزادی کے بعد پیدا ہونے والا نازک ترین مسئلہ جس نے پاکستان اور بھارت کو باقاعدہ جنگ میں الجھا دیا وہ شاہی ریاستوں کا الحاق تھا۔ انتقال اقتدار کے فیصلے میں برصغیر کی تقریباً 565 ریاستوں کا مستقبل مبہم چھوڑ دیا گیا اور قانون آزادی ہند میں ان کے بارے میں صرف اتنا کہا گیا کہ ہندوستانی ریاستوں پر سے ملک معظم کی برتری ختم ہوتی ہے۔ کچھ دن بعد ماؤنٹ بیٹن نے والیانِ ریاست کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے جغرافیائی محل وقوع اور فرقوں کے مفادات کو پیش نظر رکھتے ہوئے پاکستان یا بھارت میں سے کسی ایک ملک کے ساتھ الحاق کر لیں۔ یہ طریقہ بھارت اور پاکستان کی آزادی کے اصول سے ہم آہنگ تھا۔ 25 جولائی کو وائسرائے نے کہا کہ جس طرح آپ اپنی رعایا کی خوشحالی کی ذمہ داری سے روگردانی نہیں کر سکتے اسی طرح اپنی نوآبادیاتی حکومت سے جو آپ کی ہمسایہ ہے، قطع تعلق نہیں کر سکتے۔ 15 اگست سے پہلے ہی تقریباً تمام دیسی ریاستوں نے بھارت یا پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن جونا گڑھ، حیدرآباد اور کشمیر ایسی ریاستیں تھیں جنہوں نے تذبذب سے کام لیا اور بعد میں تینوں ریاستیں بھارتی جارحیت کا یکے بعد دیگرے شکار ہو گئیں۔

جونا گڑھ ایک چھوٹی سی ساحلی ریاست تھی جو کراچی سے 300 میل جانب جنوب واقع تھی۔ اس کا رقبہ 3,377 مربع میل اور آبادی تقریباً 7 لاکھ تھی۔ اس کی آبادی کی اکثریت ہندو تھی لیکن اس کا حکمران مسلمان تھا۔ یہ ریاست پاکستان کے ساتھ بحری راستے سے سلسلہ مواصلات برقرار رکھ سکتی تھی۔ آزادی کے فوراً بعد اس نے پاکستان سے الحاق کرنے کی پیشکش کی۔ جونا گڑھ سے ملحق اور اس سے بھی چھوٹی ریاست مناودار کے حکمران نے بھی پاکستان سے الحاق کر لیا۔ قائداعظم نے 5 ستمبر 1947ء کو ان دونوں ریاستوں کا الحاق منظور کر لیا۔ ہندوستان کی حکومت کو بھی مطلع کر دیا گیا۔ ہندوستان کا ردعمل فوری اور شدید تھا۔ ہندوستان کے گورنر جنرل نے پاکستان کے گورنر جنرل کو تار دیا: ''حکومت ہندوستان کی نگاہ میں پاکستان کا ایسے الحاق کو منظور کرنا ہندوستان کی خودمختاری اور علاقائی سالمیت میں مداخلت کے مترادف ہے اور ان دوستانہ تعلقات کے بھی منافی ہے جو دونوں ڈومینینوں کے مابین قائم رہنے چاہئیں۔ یہ اقدام ان اصولوں کے بھی صریحاً خلاف ہے جن کی بنا پر تقسیم ہند کا تصفیہ اور عملدرآمد ہوا تھا''۔

جن اصولوں کی بنا پر تقسیم ہند کا تصفیہ اور عملدرآمد ہوا تھا، وہ یہ تھے کہ متصلہ مسلم اکثریت کے علاقے متصلہ غیر مسلم اکثریت کے علاقوں سے علیحدہ کر دیئے جائیں تاکہ علی الترتیب پاکستان اور ہندوستان کی دو مملکتوں کا قیام عمل میں آ سکے۔ ہندوستان کا استدلال یہ تھا کہ چونکہ جونا گڑھ ہندو اکثریت کی ریاست ہے اور ہندوستان سے متصل ہے اس لیے اسے

Marfat.com

پاکستان سے الحاق نہیں کرنا چاہئے تھا۔ حکومت ہندوستان اس بات پر مصر تھی کہ الحاق کے سوال کا فیصلہ استصواب کے ذریعے ہونا چاہئے جو ہندوستان اور جونا گڑھ کی حکومتوں کی مشترکہ نگرانی میں ہو لیکن پاکستان کا اس سے کوئی تعلق نہ ہو۔

ان رسمی احتجاجوں کے ساتھ ہی ساتھ حکومت ہندوستان نے اس مسئلے کو دوسرے یعنی حربی ذرائع سے حل کرنے کے لیے بھی اقدام کیے۔ کاٹھیاواڑ کے لیے ایک دفاعی فوج منظم کی گئی اور ہندوستانی فوجوں کے ساتھ مل کر کاٹھیاواڑ کی ان ہندو ریاستوں کی فوجوں نے جونا گڑھ کا محاصرہ کر لیا جو اس کے اردگرد واقع تھیں اور ہندوستان سے الحاق کر چکی تھیں۔ اس علاقے کے ایک سرکردہ ہندو حکمران جام صاحب آف نواں نگر نے حکومتِ ہندوستان پر زور دیا کہ وہ فوری طور پر ایسے موثر اقدامات کرے جن سے کاٹھیاواڑ کی ریاستوں کے تحفظ کی ضمانت مل سکے۔ اس کے نزدیک جونا گڑھ کے پاکستان سے الحاق کے باعث ان ریاستوں کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ جونا گڑھ کا اقتصادی مقاطعہ شروع کر دیا گیا۔ ہندوستان سے ریلوے مواصلات منقطع کر دیئے گئے۔ ان اقدامات کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسٹم اور ریلوے کی مدوں سے جونا گڑھ کے وسائل آمدنی بہت کم ہو گئے اور خوراک کی کمی بھی سنگین صورت اختیار کر گئی۔ بمبئی میں گاندھی کے ایک بھتیجے شمل داس گاندھی کی صدارت میں جونا گڑھ کی ایک عبوری حکومت قائم کر دی گئی۔ ''عبوری حکومت'' نے اپنے صدر دفاتر جونا گڑھ سے قریب تر راج کوٹ میں منتقل کر لیے۔ اس نے رضا کار بھرتی کیے اور جونا گڑھ کی حدود میں حملوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔

ستمبر اور اکتوبر کے دوران میں ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کے مابین جونا گڑھ کے مسئلے پر بہت خط و کتابت ہوئی اور مشترکہ دفاع کونسل کے کئی اجلاسوں میں بھی اس موضوع پر تبادلہ خیالات کیا گیا۔ ایک پیچیدگی یہ تھی کہ جونا گڑھ ریاست کے بعض حصے یا زیرِ اقتدار علاقے مملکتِ ہندوستان سے گھرے ہوئے تھے۔ ان علاقوں کی آئینی حیثیت پر بہت بحث مباحثہ ہوا لیکن پاکستان اس مسئلے پر غیر جانبدارانہ قانونی رائے لینے کے لیے تیار تھا۔ پاکستان اس بات پر بھی رضامند تھا کہ جہاں الحاق متنازعہ فیہ ہو وہاں استصواب کرا لینا چاہیے۔ 23 اکتوبر کو وزیراعظم پاکستان نے وزیراعظم ہندوستان کو یہ تجویز پیش کی کہ دونوں حکومتوں کو شرائط استصواب پر تبادلہ خیالات کر کے انہیں طے کر لینا چاہئے۔ لیکن حکومتِ ہندوستان اس معاملے کو بزورِ طاقت طے کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ محاصرے اور حملوں نے اکتوبر 1947ء کے آخر تک جونا گڑھ میں اتنی افراتفری پیدا کر دی کہ نواب اپنے خاندان کے ساتھ کراچی آنے پر مجبور ہو گیا۔ یکم نومبر کو ہندوستانی فوجوں نے بابریاواد اور منگرول کے گھرے سے ہوئے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ اس سے چند دن پہلے ہندوستان نے مناودار پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ 7 نومبر کو بیس ہزار سپاہیوں کی ایک ''آزاد فوج'' جو بکتر بند گاڑیوں اور جدید ہتھیاروں سے لیس تھی، جونا گڑھ میں داخل ہو گئی۔ یہ فوج بیشتر تربیت یافتہ فوجیوں پر مشتمل تھی جنہیں حکومتِ ہندوستان کے حکم سے منظم اور مسلح کیا گیا تھا۔ دو دن کے بعد ہندوستان نے ساری ریاست کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ اس وقت پاکستان کسی طرح جونا گڑھ کا دفاع نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی افواج تنظیم کے مرحلے سے گزر رہی تھیں۔ بری فوج ان لاتعداد مسائل کے حل میں مصروف تھی جو مہاجرین کی نقل و حرکت سے پیدا ہو گئے تھے۔ بحریہ اور فضائیہ محض ابتدائی شکل میں تھیں۔

حکومتِ ہندوستان کو وزیراعظم ہندوستان کی طرف سے ایک تار موصول ہوا جس میں یہ کہا گیا کہ حکومتِ ہندوستان نے ریاست جونا گڑھ کا انتظام اس کے دیوان کی درخواست پر سنبھال لیا ہے تا کہ بدنظمی اور افراتفری نہ ہو۔ نیز

Marfat.com

یہ کہ وہ الحاق کے بارے میں لوگوں کی خواہشات معلوم کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ وزیراعظم پاکستان نے اس تار کا یہ جواب دیا کہ جوناگڑھ نے چونکہ پاکستان سے باضابطہ طور پر الحاق کر لیا تھا اس لیے اس کے دیوان کو ہندوستان کے ساتھ تصفیہ کرنے کا کوئی اختیار نہیں تھا اور ہندوستان کے اس اقدام سے پاکستان کے علاقے اور بین الاقوامی قانون کی صریح بے حرمتی ہوئی ہے۔ وزیراعظم پاکستان نے مطالبہ کیا کہ حکومت ہندوستان جوناگڑھ سے فی الفور اپنی فوجیں واپس بلا لے اور دونوں مملکتوں کے مابین مذاکرات سے پہلے ریاست کے جائز حکمران کی حکومت بحال کر دے۔ مزید خط و کتابت سے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ چند ماہ بعد حکومت ہندوستان نے اپنے ہی زیراہتمام استصواب کرایا۔ استصواب کا نتیجہ پہلے ہی نظر آ رہا تھا۔ اکثریت نے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے حق میں ووٹ دیئے۔ پاکستان نے، جس کا استصواب سے کوئی بھی واسطہ نہیں تھا، اسے ناجائز قرار دیا۔ ہندوستان کا اب تک جوناگڑھ پر غیر قانونی قبضہ ہے۔ پاکستان نے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل سے جو شکایت کی تھی وہ ابھی تک معلق ہے۔

■■■

حیدرآباد ہندوستان کی سب سے اہم ریاست تھی۔ اس کا رقبہ 82 ہزار مربع میل اور آبادی ایک کروڑ 60 لاکھ تھی۔ اس کی سالانہ آمدنی 26 کروڑ روپے تھی اور اس کی اپنی کرنسی اور ڈاک ٹکٹ تھے۔ اس کی آبادی کی اکثریت ہندو تھی لیکن اس کا حکمران ''نظام'' مسلمان تھا۔ حکمران خاندان کی بنیاد اٹھارھویں صدی کے آغاز میں مغل سلطنت کے ایک امیر کبیر نظام الملک نے رکھی تھی۔ نظام کو ''ہز اکزالٹڈ ہائی نس'' کا امتیازی خطاب حاصل تھا اور اسے ''یارِ وفادار سلطنت انگلیشیہ'' کہا جاتا تھا۔ سلطنتِ مغلیہ کے جاہ و جلال سے پیوستگی کی وجہ سے مسلمانانِ ہند کے دلوں میں حیدرآباد کے لیے ایک خاص مقام تھا۔ اپنے رقبہ، وسائل، اہمیت اور سطوت کے اعتبار سے حیدرآباد کی ریاست اپنے آپ کو ایک آزاد و خودمختار مملکت کی حیثیت کا حق دار سمجھتی تھی۔ 3 جون کے منصوبہ کے اعلان کے بعد نظام نے یہ اعلان کیا کہ وہ نہ ہندوستان سے الحاق کرے گا اور نہ پاکستان سے۔ اسے اپنی ریاست کے لیے ڈومینین کا درجہ حاصل کر لینے کی توقع تھی، چنانچہ اس نے 11 جولائی 1947ء کو ایک وفد وائسرائے کے پاس بھیجا۔ ماؤنٹ بیٹن نے وفد کو بتایا کہ حکومتِ برطانیہ حیدرآباد کو ڈومینین کا درجہ دینے پر آمادہ نہیں ہوگی۔ اس کے برعکس اس نے حیدرآباد پر ہندوستان سے الحاق کرنے کے لیے زور دیا۔ لیکن یہ بات نظام کے لیے قابل قبول نہیں تھی۔ جب وفد کی طرف سے اشارۃً یہ کہا گیا کہ اگر ہندوستان نے نظام پر بہت زیادہ دباؤ ڈالا تو پھر وہ پاکستان سے الحاق کرنے پر بھی غور کر سکتا ہے، تو ماؤنٹ بیٹن نے یہ جواب دیا: ''اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ قانونی طور پر نظام کو یہ حق حاصل ہے لیکن جغرافیائی حقائق کی وجہ سے جو مشکلات درپیش ہیں وہ بہت ٹھوس ہیں''۔ کوئی دھمکی دیئے بغیر اس نے یہ پیشگوئی کی کہ اگر اس کے مشورہ کو قبول نہ کیا گیا تو پانچ یا دس سال کے اندر ریاست کو تباہ کن نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ماؤنٹ بیٹن جن جغرافیائی حقائق کی طرف اشارہ کر رہا تھا وہ یہ تھے کہ حیدرآباد کو سمندر تک کوئی راستہ نہ تھا اور یہ ریاست چاروں طرف سے ہندوستانی علاقے سے گھری ہوئی تھی۔

15 اگست تک کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ ہندوستانی کابینہ نے مزید گفت و شنید کا کام گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے سپرد کر دیا جس نے حیدرآباد کو ہندوستان کا حلقہ بگوش کرنے کے لیے سر توڑ کوشش کی۔ نظام کو الحاق کی مقررہ دستاویز پر

Marfat.com

دستخط کرنا گوارا نہیں تھا، لیکن دفاع، امورِ خارجہ اور مواصلات کے معاملات میں وہ ہندوستان کے ساتھ معاہدۂ اشتراک کر لینے پر آمادہ تھا۔ حکومتِ ہندوستان کے ساتھ مذاکرات میں نظام کا مشیرِ خاص سر والٹر (بعد میں لارڈ) مانکٹن تھا، جو ماؤنٹ بیٹن کا دوست تھا لیکن حکومت ہندوستان نے الحاق پر اصرار کیا اور اس کے سوا کوئی دوسری صورت قبول نہ کی۔

حیدرآباد میں مسلمانوں کی تنظیم اتحادالمسلمین اور اس کے رہنما قاسم رضوی کی طاقت روز بروز بڑھ رہی تھی۔ نومبر 1947ء کے اواخر میں ان کی تائید سے میر لائق علی جو حیدرآباد کے ایک ممتاز مسلمان صنعت کار تھے، وزیرِاعظم بن گئے۔ اگرچہ جب نظام نے اس معاملہ میں قائداعظم سے مشورہ چاہا تھا تو انہوں نے اس تقرر کے خلاف مشورہ دیا تھا۔ ہندوستان کی طرف سے حیدرآباد کو جو مشکلات درپیش تھیں ان کے بارے میں پاکستان کے لیڈروں کو حیدرآباد کے ساتھ پوری ہمدردی تھی لیکن ان کا خیال تھا کہ ہندوستان اور حیدرآباد کے باہمی تعلقات کی نوعیت کو نظام اور اس کی صوابدید پر ہی چھوڑ دینا چاہیے۔

ہندوستان اور حیدرآباد کے درمیان 29 نومبر 1947ء کو ایک اقرارنامہ طے ہوا جس کے تحت ان کے موجودہ روابط سردست برقرار رہنے تھے۔ نظام نے بصیغہ راز ماؤنٹ بیٹن سے یہ وعدہ بھی کیا کہ پاکستان سے الحاق نہیں کرے گا۔ حکومتِ ہندوستان نے یہ دعویٰ کیا کہ اس اقرارنامے کے تحت حیدرآباد کسی غیر ملک کے ساتھ کوئی تعلقات قائم نہیں کر سکتا چنانچہ نظام کی حکومت نے پاکستان کو 20 کروڑ روپے کا جو قرضہ دیا تھا اس پر بڑی لے دے کی گئی۔ اگرچہ حیدرآباد والے یہ عذر پیش کرتے رہے کہ یہ ایک تجارتی معاملہ تھا۔ یہ قرضہ حکومتِ ہند کے تمسکات کی صورت میں تھا۔ ان کی وصولی سے پاکستان کو محروم کرنے کے لیے حکومتِ ہندوستان نے ایک آرڈی نینس جاری کر کے ان تمسکات کو غیر مستعمل کر دیا۔

اقرارنامہ کے تحت سردار پٹیل نے حیدرآباد میں حکومتِ ہندوستان کے ایجنٹ جنرل کے طور پر کے ایم منشی کو منتخب کیا۔ وہ بمبئی کا ایک سابق وزیر اور اکھنڈ بھارت کا سرگرم حامی تھا۔ اس نے اپنا یہ فرض سمجھا کہ ہندوؤں کو اکسا کر یا جس طرح بھی بن پڑے نظام کے اقتدار کو ضعف پہنچایا جائے۔ حیدرآباد پر اقرارنامہ کی خلاف ورزی کرنے کے الزامات لگائے گئے لیکن جب نظام کی حکومت نے اقرارنامہ کی دفعات کے تحت اس معاملے کی ثالثی فیصلہ کروانے کی پیشکش کی تو حکومتِ ہندوستان رضامند نہ ہوئی۔ نظام سے اتحادالمسلمین کو خلاف قانون قرار دینے اور رضاکاروں کی تنظیم ختم کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ جنگ کی دھمکیاں بھی دی گئیں۔ 26 اپریل 1948ء کو بمبئی میں تقریر کرتے ہوئے نہرو نے کہا: ''رضاکاروں کی سرگرمیوں سے اگر حیدرآبادی عوام کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہوا تو حکومتِ ہندوستان لازماً حیدرآباد ریاست میں مداخلت کرے گی''۔ پٹیل حیدرآباد کو جوناگڑھ کا انجام یاد دلاتا تھا۔ الغرض حکومتِ ہندوستان نے نظام کو ہندوستان سے الحاق پر مجبور کرنے کے لیے ہر طرح کا دباؤ ڈالا۔

ماؤنٹ بیٹن اور ہندوستانی لیڈروں کا یہ خیال تھا کہ حیدرآباد کی ساری ہندو آبادی ہندوستان سے الحاق کے حق میں ہے۔ وہ بار بار اس بات پر زور دیتے تھے کہ حیدرآباد کے مسئلے کا فیصلہ عوام پر چھوڑ دینا چاہیے۔ اگست 1947ء میں ماؤنٹ بیٹن نے نظام کو ایک خط میں ''انگریز افسروں کی زیرنگرانی استصواب'' کی پیشکش کی تھی لیکن نظام نے اسے قبول نہیں کیا تھا۔ لیکن جون 1948ء میں میر لائق علی نے ماؤنٹ بیٹن کی تجویز منظور کر لی یعنی غیر جانبدارانہ سرپرستی میں

Marfat.com

آزادانہ استصواب کرالیا جائے کہ آیا ریاست کو ہندوستان کے ساتھ الحاق کرنا چاہیے یا آزاد رہنا چاہیے۔ میر لائق علی کو یہ دیکھ کر سخت تعجب اور رنج ہوا کہ اب حکومتِ ہندوستان کی طرف سے یہ اصرار کیا جا رہا تھا کہ دفاع، امورِ خارجہ اور مواصلات کے معاملات میں ریاست کو ہندوستان سے لازماً الحاق کر لینا چاہیے اور اس کے بعد اگر حکومت حیدرآباد کی خواہش ہو تو وہ اس مسئلہ کی استصواب سے مزید تصدیق کرا سکتی ہے''۔ یہ مطالبہ بھی کیا گیا کہ حیدرآباد میں فوراً ذمہ دار حکومت قائم کی جائے کیونکہ جیسا کہ حکومتِ ہندوستان نے حیدرآباد کے بارے میں اپنے قرطاس ابیض میں کہا: ''ایک ایسی عبوری حکومت کے بغیر جو حیدرآباد کی آبادی کی اکثریت کی نمائندہ ہو اور ان کے لیے اطمینان بخش ہو، استصواب عوام سے محض فریب ہو گا''۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن حیدرآباد کے الحاق سے متعلق اپنی دلی آرزو پوری کیے بغیر 21 جون 1948ء کو ہندوستان سے رخصت ہو گیا۔ حیدرآباد پر دباؤ شدید سے شدید تر ہوتا گیا۔ اقتصادی محاصرہ بھی کیا گیا اور فوجی تیاریاں بھی شروع کر دی گئیں۔ دونوں طرف سے سرحدوں کے آر پار حملوں اور اقرارنامہ کی خلاف ورزیوں کے الزامات لگائے گئے۔ 30 جولائی کو ونسٹن چرچل نے پارلیمنٹ میں بحث کے دوران نہرو کی ایک تقریر کا حوالہ دیا جو اس نے چار دن قبل کی تھی اور جس میں نہرو سے یہ الفاظ منسوب کیے گئے: ''اگر اور جب بھی ہم نے ضروری سمجھا، ہم حیدرآباد کے خلاف فوجی کارروائی شروع کر دیں گے''۔ نہرو نے آگے چل کر یہ بھی کہا تھا کہ ریاست کی حکومت غنڈوں کے ہاتھ میں ہے اور الحاق کا واحد بدل یہ ہے کہ حیدرآباد بطورِ ریاست بالکل معدوم ہو جائے اور اس صورت میں حیدرآباد کے خلاف کارروائی کو جنگ کا نام نہیں دیا جائے گا۔ اس پر چرچل نے یہ رائے زنی کی کہ ''میرے خیال میں ہٹلر نے آسٹریا کو نگل جانے سے پہلے کچھ ایسی ہی بات کی ہو گی''۔

حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ کی اچانک رحلت اور تدفین کے دوسرے دن 13 ستمبر 1948ء کو جب پوری ملت اسلامیہ دکھ اور رنج و غم سے نڈھال تھی، ہندوستان نے بغیر اعلان جنگ کے اچانک حیدرآباد دکن پر 22 مقامات سے حملہ کر دیا۔ رضا کار میدان میں کود پڑے اور ہندوستانی افواج کو دندان شکن جواب دینے لگے۔ جنگ کو شروع ہوئے تین دن ہو چکے تھے۔ حیدرآباد کی باقاعدہ افواج ابھی تک حرکت میں نہیں آئی تھی۔ عجیب گومگوں کا عالم تھا اچانک ہی حیدرآباد کی نشرگاہ سے نظام دکن میر عثمان علی خان کی آواز آئی جو جنگ بندی اور رضا کاروں کی تنظیم کے ختم کرنے کا اعلان تھا اور ساتھ ہی ہندوستانی افواج کو بلارم اور سکندرآباد آنے کی اجازت دے دی گئی۔ اس طرح مملکت حیدرآباد کے فوج کے کمانڈر انچیف احمد العیدروس کی غداری اور اغیار کی سازش 17 ستمبر 1948ء کو ہندوستانی فوج کا قبضہ حیدرآباد دکن پر ہو گیا اور والیٔ حیدرآباد دکن میر عثمان علی خان کے ہاتھوں دکن میں سات سو سال سے زائد قدیم مسلم دور حکومت اور مملکت آصفیہ اسلامیہ کی دو سو پچیس سالہ عظیم الشان حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ سقوط دکن کے اعلان سے اہل دکن پر غم و الم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ مسلمان تو مسلمان، ہندو رہنما یوپی کی گورنر محترمہ سروجنی نائیڈو رو پڑی اور کہا: ''آہ! میرے وطن کی آزادی ختم ہو گئی''۔ اس محب وطن نے اپنے ملک پر ہتھیار ڈالنے پر دکھ کا اظہار کرتے ہوئے رقت انگیز لہجے میں کہا: ''میں ایک

Marfat.com

حیدرآبادی کی حیثیت سے اپنے وطن کی شکست پر ماتم کناں ہوں''۔

ہم بھڑکنے بھی نہ پائے تھے بجھا ڈالے گئے
ولولے ابھرے نہ تھے دل میں دبا ڈالے گئے
نقش خود داری زبردستی مٹا ڈالے گئے
سر ہمارے آہ کیوں جبراً جھکا ڈالے گئے
جنگ میں کھوتے اگر تجھ کو تو کوئی غم نہ تھا
ہار جانا اپنا تجھ کو جیتنے سے کم نہ تھا

وحیدہ نسیم

اگر جنگ ہی مقصود تھی تو اصولاً حکومت کو اپنے پورے وسائل کے ساتھ میدان میں اتنا چاہئے تھا پھر چاہے عروس البلاد حیدرآباد دکن کی اینٹ سے اینٹ ہی کیوں نہ بج جاتی۔ گولکنڈہ سے چار مینار تک کھنڈر ہی کھنڈر ہوتے، فلک نما کی فلک بوس عمارت کا وجود نہ رہتا لیکن قوم تو سر بلند رہتی۔ یا مرتی بھی تو عزت اور غیرت کی موت۔ یا پھر اگر دکن کی باغ و بہار ریاست کو سونے کی کشتی میں لگا کر سردار ولبھ بھائی پٹیل کی خدمت میں پیش کرنا تھا تو لڑائی کا ڈھونگ رچانے کی کیا ضرورت تھی۔ آزاد حیدرآباد کے نعرے لگاتے لگاتے پیاسے رضا کاروں کے ہونٹ خشک ہو گئے۔ وہ اپنے ہی لہو سے اپنے حلق تر کر کے ابدی نیند سو گئے لیکن کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ افواج باقاعدہ تو حرکت میں نہیں آئی اور پولیس کے دستوں کا بال تک بیکا نہ ہوا۔

افسوس! حیدرآباد دکن جب زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا اس کو سب ہی نے بے یار و مددگار چھوڑا، کسی نے بھی مدد نہیں کی۔ نہ اپنوں نے اور نہ بیگانوں نے۔ حیدرآباد کی انگریزی حکومت سے کچھ معاہدات تھے ان معاہدات کی روشنی میں وہ حیدرآباد کی عملی مدد کرنے کے مجاز تھے۔ انگریزی حکومت (برٹش) بھی صرف قرارداد مذمت پاس کرنے تک محدود رہی۔ الغرض حیدرآباد دکن سب دوستوں، محسنوں کی نظروں کے سامنے صفحہ ہستی سے مٹ گیا، سب دیکھتے رہ گئے وہ سب کے سامنے دم توڑ گیا۔

حیدرآباد دکن پر بھارتی حکومت کا تسلط برصغیر ہندوپاک کی اسلامی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ یہ مملکت ہندوستان میں مسلمانوں کے ایک ہزار سال کے عہد اقتدار اور اسلامی تہذیب و ثقافت کی آخری یادگار تھی جس کے آثار و نقوش ایک منظم منصوبے کے تحت مٹائے جا رہے ہیں۔ (تاریخ حیدرآباد دکن اور رضا کار: سید کمال الدین احمد، صفحہ 65-66)

Marfat.com

فلیش پوائنٹ کشمیر

پاک بھارت تعلقات کے تعلقات کے حوالے سے اگر یہ کہا جائے کہ دونوں مما لک کے درمیان سب سے بڑی وجہ عناد کشمیر ہے تو بے جا نہ ہوا۔ آج تک پاکستان اور بھارت کے درمیان تعلقات خوشگوار کرنے کیلئے جتنے بھی اقدامات کئے گئے ان سب کی ناکامی کا صرف اور صرف ایک ہی سبب ہے اور وہ ہے مسئلہ کشمیر!

یہ مسئلہ کیسے پیدا ہوا؟ اس کے محرکات کیا تھے اور اس میں کسی حد تک مسلم لیگ یا بدنیت کانگریس قیادت ذمہ دار ہے۔ آیئے تاریخ کے اوراق میں جھانک کر اس سوال کا جواب تلاش کریں۔ مناسب معلوم ہوگا کہ سب سے پہلے نام نہاد شیر کشمیر شیخ عبداللہ کا نقطہ نظر جان لیا جائے۔ اپنی آپ بیتی ''آتش چنار'' میں شیخ عبداللہ رقمطراز ہے:

''اسی اثناء میں پاکستان اور ہندوستان کی دو مملکتیں وجود میں آ گئی تھیں۔ اور ان کے درمیان روز اول سے ہی کشیدگی تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ فرقہ پرستی کی آگ نے مشرقی پنجاب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جہاں مسلمانوں کو کافی جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ ادھر خبریں آنے لگیں کہ پاکستان کے قبائلی کشمیر پر چڑھائی کے لئے پر تول رہے ہیں۔ کشمیر میں مہاراجہ حالات کے نئے رخ سے پہلے ہی پریشان تھا۔ اس نے اپنے وزیراعظم رام چند کاک کو اس کی ناکام پالیسیوں کی سزا کے طور پر نہایت درشتی کے ساتھ برخواست کر دیا اور 11 اگست 1947ء کو مہاراجہ کے سترے بہترے ماموں جنرل جنگ سنگھ نے قائم مقام وزیراعظم کی حیثیت سے چارج سنبھالا۔ ادھر قبائلیوں کی نقل و حرکت کی خبریں برابر آ رہی تھیں۔ ان خبروں سے مہاراجہ اور اس کے حواریوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے۔ ہندو مہاراجہ ہراساں ہو کر اپنی نجات میری رہائی میں ہی سمجھنے لگا۔ اس کو اب نوشتہ دیوار نظر آ رہا تھا کہ میں ہی آنے والے سیلاب کے آگے بند باندھنے کا کام کر سکتا ہوں۔ مہاراجا پر اندرونی دباؤ بڑھتا گیا اور باہر سے بھی کانگریس کی کوششوں تیزی اور شدت آتی گئی۔ مہاتما گاندھی نے بھی مہاراجا کو یہی مشورہ دیا تھا کہ شیخ محمد عبداللہ ہی ریاست کو بچا سکتا ہے۔ بالآخر مہاراجا نے مجھے رہا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے بھدرواہ سے بادامی باغ ہسپتال منتقل کر دیا گیا۔ وہاں مہاراجا کا برادر نسبتی کنور نسچت چند مجھ سے ملنے کے لئے آیا۔ کئی ملاقاتوں کے بعد طے ہوا کہ مہاراجا کی اور میری ملاقات ہو۔ مجھے شاہی محل پہنچا دیا گیا۔ وہاں جانے سے پہلے مجھے مشورہ دیا گیا کہ ملاقات کے وقت میں خیر سگالی کے طور پر کچھ اشرفیاں مہاراجا کی خدمت میں پیش کروں۔ میں نے جب یہ کہا کہ اشرفیاں تو میرے پاس نہیں ہیں تو پنڈت شام سندر لال در نے اپنی جیب سے کچھ اشرفیاں نکال کر میرے حوالے کیں۔ میں جب مہاراجا کے پاس پہنچا تو وہاں مہاراجا، اس کی رانی اور ہونے والے وزیراعظم مہر چند مہاجن بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اشرفیاں مہاراجا کو پیش کیں۔ میں نے مہاراجا سے کہا کہ آپ کو جو غرض مند لوگ ان شبہات میں مبتلا کرنا چاہتے

Marfat.com

ہیں کہ ریاست کے مسلمان آپ کے یا آپ کے خاندان کے دشمن ہیں وہ غلط فہمی اور غلط گمانی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ کوئی آپ کی گدی چھیننا نہیں چاہتا۔ البتہ ہم ریاست کا نظام حکومت ایک آئینی اور جمہوری طریقے سے چلانا چاہتے ہیں۔ میں نے مہاراجا سے کہا کہ تازہ حالات واقعی بہت گھمبیر ہیں۔ ان کا مقابلہ صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو ریاست کے مسائل پر عبور رکھتا ہو اور جسے اپنے عوام کا اعتماد حاصل ہو۔ میں نے مہر چند مہاجن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ بہت اچھے اور لائق جج تو ہو سکتے ہیں لیکن انہیں کشمیر کے حالات کی پیچیدگی کا کوئی اندازہ نہیں ہے اور نہ ہی لوگ انہیں جانتے پہچانتے ہیں۔ اس لئے ان کو وزیراعظم مقرر کرنا نہ آپ کیلئے سودمند ہوگا اور نہ ہی اس ملک کے لئے فائدہ مند۔ اس لئے میرا مشورہ یہی ہوگا کہ آپ ان کی تقرری سے گریز کیں۔ یہ بات یاد رہے کہ مہاراجا اس مرحلے پر مہر چند مہاجن کو وزیراعظم مقرر کرنے ہی والے تھے۔ مہاجن صاحب سردار پٹیل کی ایما پر کشمیر آئے ہوئے تھے اور اس وقت مہاراجا کے ساتھ اپنی ملازمت کی شرائط طے کر رہے تھے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ مہر چند مہاجن کی بیوی ریاست کی تحصیل میر پور کی رہنے والی تھیں۔ ان کے والد لالہ بندرابن ریاست میں تحصیلدار تھے اور ان کے بھائی اسکردو کے وزیر زراعت۔ اس کے علاوہ انہوں نے کانگریس کی طرف سے اس باؤنڈری کمیشن میں کام کیا تھا جس نے پنجاب اور بنگال کی تقسیم کی حد مقرر کی تھی۔ بہرحال ملاقات ختم ہوگئی۔ میں واپس بادامی باغ آ گیا اور 29 ستمبر 1947ء کو مجھے رہا کر دیا گیا۔ تین سال کی قید کے بدلے مجھے صرف ایک سال چار ماہ اور گیارہ دن کے بعد ہی آزاد کر دیا گیا تھا۔ بعد میں جواہر لال نہرو نے پارلیمنٹ میں کہا کہ حالات نے مہاراجا کو ان کی مرضی کیخلاف شیخ محمد عبداللہ کو رہا کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ سرینگر کے ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں نے میرا پرجوش استقبال کیا۔ چھتہ بل دیرے سے مجھے ایک شاندار دریائی جلوس میں لے جایا گیا۔ میں ایک آبی پرندے میں بیٹھا ہوا تھا۔ جس کو وردی پوش ملاح کھینچ رہے تھے۔ اس کے آگے پیچھے سینکڑوں کشتیاں جا رہی تھیں دریا کے دونوں کناروں پر مردوں، عورتوں اور بچوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے ہوئے تھے۔ جن کے خوش آمدید کے بولوں اور نعروں سے ساری فضا گونج رہی تھی۔ 2 اکتوبر کو حضوری باغ میں ایک بہت بڑا عوامی اجتماع ہوا جس میں خواجہ سعدالدین شال نے سرینگر کے شہریوں کی طرف سے ایک خطبہ استقبالیہ پڑھا۔ میں نے اپنی جوابی تقریر میں کہا ''مجھے نہیں معلوم کہ مجھے کیوں گرفتار کیا گیا تھا اور کیوں رہا کیا گیا۔ میں ایک سال سے زیادہ عرصے تک اپنے عوام سے دور رہا ہوں اور تیزی سے بدلتے ہوئے حالات سے الگ تھلگ۔ جس وقت میں جیل گیا اس وقت برصغیر ایک وحدت تھا۔ آج یہ دو ٹکڑوں میں بٹ چکا ہے۔ کشمیری عوام کو دیکھنا ہے کہ انہوں نے جس خواب کے لئے قربانیاں دی ہیں، وہ کس طرح پورا ہو سکتا ہے۔ ہم وہی راستہ اختیار کریں گے جو کشمیریوں کی آزادی، خوشحالی، نجات اور ترقی کی منزل کی طرف جائے گا۔ غلامی کی صورت میں کوئی فیصلہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا ریاست میں ایک ذمہ دار حکومت فوراً قائم کی جانی چاہئے جو اس نازک سوال پر ریاستی عوام کے حقوق و مفادات کی نگہبانی کے لئے مناسب راہ عمل اختیار کرے۔ ہم الحاق کا فیصلہ اندرونی آزادی حاصل کئے بغیر نہیں کر سکتے۔ اس لئے ہمارا نعرہ یہ ہے کہ ''الحاق سے پہلے آزادی''۔ ایک اور پبلک جلسے میں انہی دنوں میں نے اس سلسلہ میں اپنے خیالات یوں ظاہر کئے:۔

''اس وقت ریاست جموں و کشمیر کے سامنے یہ سوال ہے کہ ہم ہندوستان کے ساتھ الحاق کریں یا پاکستان کے

Marfat.com

ساتھ یا الگ تھلگ رہ کر آزاد رہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ آل انڈیا سٹیٹس پیوپلز کانفرنس کا صدر ہوں۔ جس کی پالیسی بالکل واضح ہے۔ پنڈت جواہر لال میرے بہت قریبی دوست ہیں اور گاندھی جی کی میں عزت کرتا ہوں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس نے ہماری تحریک کی بڑی مدد کی ہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود الحاق کے مسئلے کی سب سے بڑی کسوٹی یہاں کے عوام کے مفادات ہونگے اور میں اس میں حائل نہ ہونگا۔ ہمارا سب سے پہلا فریضہ اس وقت ڈوگرہ تسلط سے آزادی حاصل کرنا ہے۔ اس کے بعد اگر یہاں کے لوگ پاکستان سے الحاق کرنے کا فیصلہ کریں تو میں سب سے پہلا آدمی ہونگا جو اس کو تسلیم کریگا''۔

لیکن میں نے ساتھ ہی اپنے بنیادی عقائد کا اعادہ کرتے ہوئے کہا:

''اگر ہم نے پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کر بھی لیا تو اس دو قومی نظریئے پر ہم کبھی بھی ایمان نہ لا پائیں گے جو آج سارے ملک میں اس درجہ زہر پھیلانے کا ذمہ دار ہے''۔

▪▪▪

میری رہائی کے ساتھ ہی نیشنل کانفرنس کے دوسرے لیڈروں اور کارکنوں کی رہائی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میرے جو ساتھی ریاست سے باہر گئے ہوئے تھے وہ آہستہ آہستہ واپس لوٹنے لگے۔ خواجہ محی الدین قرہ اپنی روپوشی ترک کر کے منظر عام پر آ گئے۔ میں نے دھیرے دھیرے جماعت کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو پھر سے اکٹھا کرنا شروع کیا اور جماعت کو دوبارہ منظم کیا۔ مجاہد منزل تو ہمارا دفتر تھا لیکن ہم نے حالات کی نزاکت کے پیش نظر شہر کے دماغ امیرا کدل کے بڑے چوک میں جو بعد میں لال چوک کہلایا' واقع پلیڈیم سینما میں اپنا کارگزار دفتر قائم کیا۔ چونکہ ریاست کی انتظامیہ کی باگیں ڈھیلی پڑ رہی تھیں اور آنے والے دنوں کے پر آشوب امکانات نے ہمیں اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس لئے ہم نے اندرونی امن و امان اور شہریوں کی عزت و عصمت اور جان و مال کی حفاظت کیلئے ایک رضا کار تنظیم بنانے کی کارروائی بھی شروع کر دی۔ میں نے اس تنظیم کی غرض و غایت خانقاہ معلیٰ کے اس جلسے میں بیان کی جو میری رہائی کی تہنیت میں بلایا گیا تھا۔ دستار بندی کے بعد میں نے اس تنظیم میں عوام کو بلا لحاظ مذہب و ملت میں شامل ہونے کی دعوت دیتے ہوئے اس کے اغراض و مقاصد یوں بیان کئے:

1۔ سلامتی فوج کے سامنے ملک کشمیر کی آزادی اور اس کے ناموس کی حفاظت مقدم ہو گی۔

2۔ سلامتی فوج کے رضا کاروں پر ملک کے لوگوں کی عزت و عصمت کی حفاظت کا فرض لازم ہو گا۔

3۔ رضا کاروں کو مسلم اکثریت پر یہ امر واضح کرنا ہو گا کہ غیر مسلم اقلیت کی حفاظت نہ صرف فرض اولین ہے بلکہ اسلام کے صحیح اصولوں کا حقیقی تقاضا بھی ہے۔

4۔ رضا کاروں کو مستعد رہنا ہو گا کہ فرقہ وارانہ منافرت کا کوئی موقع پیدا نہ ہونے پائے اور باہمی چپقلش اور خلفشار کے رجحانات سر نہ اٹھانے پائیں۔

ادھر سرحد پار سے تشویشناک اطلاعات آ رہی تھیں۔ مغربی اور مشرقی پنجاب میں خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ اس طوفان بے تمیزی میں صرف ہماری ریاست دارالامان کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس لئے ہندو مسلم' سکھ پناہ گزیں ریاست کی

Marfat.com

سرحدوں میں داخل ہو رہے تھے۔ مہاراجا کی حکومت نے ہند اور پاکستان سے موجودہ حالات کو قائم رکھنے کا معاہدہ کرنے کی جو پیش کش کی تھی۔ حکومت ہند نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ کیونکہ اس وقت ہند کے ساتھ کشمیر کا کوئی براہ راست رابطہ نہ تھا۔ لیکن پاکستان کے ساتھ ڈاکخانوں وغیرہ کے سلسلے میں سمجھوتہ ہو گیا تھا۔ اور ڈاک وتار کا سارا نظام پاکستان کے محکمہ ڈاک وتار نے سنبھال رکھا تھا۔ لیکن جب 14 اگست 1947ء کو پاکستان کے قیام پر سرینگر کے ڈاکخانہ پر پاکستان کا سبز ہلالی جھنڈا لہرایا گیا تو قائم مقام وزیراعظم جنرل جنک سنگھ کو یہ بات ناگوار گزری اور انہوں نے یہ جھنڈا نیچے اتارنے کا حکم دیا۔ پاکستان کی طرف سے ایک خاص ایلچی مہاراجا کو پاکستان سے الحاق کرنے پر آمادہ کرنے کیلئے سرینگر آیا لیکن اس کی گفتگو منڈھے نہیں چڑھی۔ حالانکہ اس سے قبل رام چند کاک نے اپنی وزارت عظمیٰ کے زمانے میں نوابزادہ لیاقت علی خان کے ساتھ پاکستان کے ساتھ الحاق کے بارے میں پینگیں بڑھائی تھیں۔ بہر حال پاکستان کو مہاراجا کی روش پسند نہیں آئی اور اس نے ریاست کی درآمدات جن میں نمک، پٹرول اور غذائی اجناس شامل تھیں، راولپنڈی میں روک لیں۔ کشمیر میں امپیریل بینک کی شاخ کو کرنسی نوٹوں اور ریزگاری کی بہم رسائی بھی روک لی گئی۔ ریاست کو ہندوستان کے ساتھ جو راستے ملاتے تھے وہ سب پاکستان سے ہو کر جاتے تھے۔ اس لئے صورت حال گھمبیر ہوتی گئی۔ مہاراجا کی حکومت نے پاکستان کی اس روش پر احتجاج کیا لیکن حالات بگڑتے ہی گئے۔

ادھر پاکستان کے ارباب اقتدار نے دو نمائندے ہم سے بات چیت کے لئے سرینگر روانہ کئے۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر اور شیخ صادق حسن یہ دونوں حضرات کشمیر نژاد تھے۔ ڈاکٹر تاثر لاہور کے ایک امیر کشمیری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اور کچھ عرصہ کے لئے ایس پی کالج سرینگر کے پرنسپل بھی رہ چکے تھے۔ ان دنوں ہماری ان سے کافی راہ رسم بھی پیدا ہو گئی تھی۔ موخرالذکر امرتسر کے ایک معزز کشمیری خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور قالین بنانے کے ایک بڑے کارخانے کے مالک تھے۔ تقسیم کے بعد یہ لاہور میں مقیم ہو گئے اور پنجاب مسلم لیگ کے صوبائی صدر بنادیئے گئے میں ان دونوں اصحاب سے خوب اچھی طرح واقف تھا بلکہ شیخ صادق حسن نے تحریک کی ابتدا میں کشمیر آ کر ہماری ہمت بھی بندھائی تھی۔ چنانچہ میرے گھر صورہ میں ان کی میری اور خواجہ غلام احمد عشائی کے ساتھ ایک مفصل ملاقات ہوئی۔ ادھر ادھر کی باتوں سے فراغت پانے کے بعد میں نے شیخ صادق حسن سے پوچھا کہ بہ حیثیت ایک کشمیری کے ان کا کیا مشورہ ہے کہ ہم کس طرح اپنے مستقبل کا تعین کریں؟ شیخ صاحب نے بڑی صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا کہ بہ حیثیت کشمیری کے وہ یہی پسند کریں گے کہ ہم نہ ہندوستان کے ساتھ رشتہ جوڑیں اور نہ پاکستان کے ساتھ بلکہ ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے رہیں کیونکہ دونوں جانب کے حالات انتہائی خراب ہیں۔ لیکن بہ حیثیت صدر پنجاب مسلم لیگ کے وہ چاہیں گے کہ کشمیر کا رشتہ پاکستان کے ساتھ ہی قائم ہو۔ میں نے جواب میں کہا کہ ہم ابھی ایک شخصی نظام کے غلام ہیں اور غلاموں کا فیصلہ صائب نہیں ہوتا ہمیں پہلے اپنی ریاست میں آزادی ملنی چاہیئے اس کے بعد ہی ہم اس نازک ترین فیصلے کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ ہماری تحریک کے متعلق ماضی میں مسلم لیگ کا جو بھی رویہ رہا وہ ہمارے فیصلے پر اثر انداز نہ ہوگا۔ اسی طرح پنڈت جواہر لال سے دوستی اور کانگریس کی وہ امداد جو اس نے ہماری تحریک کو دی ہے، ہمارے فیصلے پر اثر انداز نہیں ہوگی۔ اگر ہم یہ محسوس کریں کہ چالیس لاکھ کشمیریوں کا مستقبل پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے سے ہی

Marfat.com

روشن ہوسکتا ہے۔تو ہم اس سے گریز نہ کریں گے۔لیکن ہم کسی بھی صورت میں یہ پسند نہیں کریں گے کہ ہم پر کوئی فیصلہ ٹھونسا جائے۔

ڈاکٹر تاثیر نے اپنی گفتگو میں پاکستان سے الحاق کرنے پر سخت زور دیا۔اوراس سلسلے میں ہمیں جلد قدم اٹھانے کی ترغیب دی۔ میں نے انہیں بتایا کہ یہ وقت اس اہم سوال کا فیصلہ کرنے کے لئے موزوں نہیں ہے۔ہم ابھی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ مستقبل میں ہندوستان اور پاکستان میں کس قسم کے نظام کا نقشہ ابھرے گا اور دونوں ممالک میں حالات کیا رخ اختیار کریں گے؟اس وقت آگ کے شعلے ان دونوں مملکتوں کواپنی لپیٹ میں لے چکے ہیں۔دیکھنا یہ ہے کہ یہ آگ بجھانے میں وہ کامیاب بھی ہو سکتے ہیں؟ ایسے حالات میں ہم سے توقع رکھنا کہ ہم فوراًاپنے مستقبل کا تعین کریں' قرین انصاف نہیں ہے۔ہمیں اس وقت تک انتظار کرنا ہوگا جب تک آگ بجھ نہیں جاتی۔ کیونکہ ہم امن وسکون کے ماحول میں ہی اس سوال کومناسب طریقے سے حل کر سکتے ہیں۔یہ فیصلہ صرف ہماری موجودہ نسل پر ہی اثرانداز ہوگا بلکہ آنے والی نسلوں پر بھی اس کا اثر پڑے گا۔دانشمندی کا تقاضا یہی ہے کہ ہم کوابھی مہاراجا کی شخصی حکومت کے چنگل سے آزاد ہونے کا موقع فراہم کیا جائے گا تا کہ بعد میں یہاں کے ہندو' مسلمان' سکھ مل بیٹھ کر فیصلہ کرسکیں کہ وہ ہند سے رشتہ جوڑیں۔ پاکستان سے الحاق کریں یا آزاد رہیں۔اس لئے اس وقت اس سوال کا فیصلہ کرنے کے لئے ہم پر دباؤ ڈالنا زیادتی ہے۔وقت آنے پر یہاں کے لوگ اس سوال کا فیصلہ کریں گے اور دونوں مملکتوں کو یہاں کے عوام کی خواہشات کا احترام کرنا ہوگا۔اس پر ڈاکٹر تاثیر بولے کہ ہم تواس بات کا تہیہ کر چکے ہیں کہ ریاست کشمیر پاکستان کاایک حصہ بن کر رہے گی۔میں نے جواباً کہا کہ کشمیری عوام نے تو یہ حق آپ کونہیں سونپا۔ 1931ء میں جب ہم نے تحریک کشمیر شروع کی تو ہم نے کسی بھی طاقت کو' چاہے وہ مسلم غلبے کی ہو یا ہندو اکثریت کی' یہ اختیار نہیں دیا ہے کہ وہ ہمارے مستقبل کا فیصلہ کرے۔ہم اپنی تقدیر اپنے ہاتھوں سے بنائیں گے کسی دوسرے کے ہاتھوں میں یہ امانت سپرد نہیں کریں گے۔اس پر ڈاکٹر تاثیر بولے کہ آپ اس صورت میں ہمیں تحریری طور پر یقین دلائیں کہ آپ وقت آنے پر ریاست کا الحاق پاکستان کے ساتھ کرنے پر رضامند ہوں گے۔میں نے جواب دیا کہ یہ تو حالات پر منحصر ہوگا اور یہاں کے رہنے والے باشندوں کی آزادانہ رائے اور رضا پر۔میں ان سے یہ حق پہلے سے ہی چھیننے کا نہ حقدار ہوں نہ روادار۔تاثیر صاحب اس پر جھلاہٹ کا شکار ہو گئے اور انہوں نے تحکمانہ لہجے میں' جس میں طاقت کا غرور جھلک رہا تھا' کہا کہ اگر میں ان کا کہنا ماننے پر راضی نہیں تو وہ پھر ''دوسرے ذرائع'' استعمال کریں گے۔مجھے بھی اس پر غصہ آ گیا اور میں نے مضبوط لہجے میں جواب دیا کہ آپ جو چاہیں کریں۔لیکن اگر آپ نے زور زبردستی کا راستہ اختیار کیا تو پھر آپ ہماری لاشوں پر ہی کشمیر حاصل کر سکتے ہیں۔بہرحال شیخ صادق حسن اور عثمانی صاحب نے مداخلت کی اور ہنسی مذاق میں یہ ناخوشگواری دور کرنے کی کوشش کی۔معاملہ وہیں پر ختم ہو گیا۔البتہ دونوں نے مجھے لاہور آنے اور وہاں جناح صاحب سے ملنے اور روبرو گفتگو کرنے کی دعوت دی۔میں نے دعوت تو قبول کر لی لیکن مجھے لاہور جانے سے پہلے دہلی کا رخ اختیار کرنا پڑا۔میری اسیری کے زمانے میں مجھے آل انڈیا اسٹیٹس پیوپلز کانفرنس کا صدر چن لیا گیا تھا۔چونکہ یہ کارروائی میری عدم موجودگی میں عمل میں آئی تھی اس لئے اپنی نئی ذمہ داری سنبھالنے کے لئے وہاں میرا جانا ضروری تھا۔اور پھر ریاستوں کو درپیش اہم ترین معاملات پر غور کرنے کے لئے میں

Marfat.com

نے کانفرنس کی مجلس عاملہ کا ایک اجلاس بھی بلایا تھا۔ مبادا پاکستان کے رہنماؤں کو میرے دہلی جانے سے کوئی غلط فہمی ہو میں نے اپنے اس قصد سفر کی اطلاع پاکستان کے وزیر اعظم کو دیدی اور یہ بھی کہا کہ دہلی سے واپسی پر میں بذات خود ان سے ملنے کے لئے آؤں گا اور اپنا نقطہ نظر ان کے سامنے پیش کروں گا۔ اس کے علاوہ دہلی روانہ ہوتے ہوئے میں نے اپنے ایک معتمد ساتھی خواجہ غلام محمد صادق کو پاکستان کے رہنماؤں کے ساتھ تبادلہ خیالات کے لئے لاہور بھیج دیا۔ میں ہوائی جہاز کے ذریعے دہلی پہنچا۔ جواہر لال کے ساتھ جیل کے باہر یہ میری پہلی ملاقات تھی وہ اب وزیر اعظم بن گئے تھے۔ لیکن وہ دوستوں کے دوست بھی تھے۔ چنانچہ انہوں نے رسوم و آداب کی تمام قیود نظر انداز کر کے بذات خود دہلی کے ہوائی اڈے پر میرا استقبال کیا اور مجھے گارڈ آف آنر کی سلامی بھی پیش کی گئی۔ مجھے دہلی میں وزیر اعظم کے خاص مہمان کی حیثیت سے ان کی ہی رہائش گاہ پر ٹھہرایا گیا اور وہاں میں نے ایک اخباری کانفرنس میں بتایا:

"کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ وہاں کے عوام کسی بیرونی مداخلت کے بغیر اور امن و سکون کی فضا میں کرنا چاہتے ہیں۔ اگر کسی طرف سے ہم پر کوئی زبردستی کا فیصلہ ٹھونسنے کی کوشش کی گئی تو ہم بغاوت کریں گے۔ کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ وہاں کے مہاراجا کو نہیں عوام کو کرنا ہے اور جب تک ان کو اندرونی طور پر آزادی نہیں ملتی وہ کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر ہیں۔"

ایک طرف تو ہندوستانی رہنماؤں کا یہ رویہ تھا جس میں ممکن ہے ان کی دور اندیشی کی مصلحتیں بھی شامل رہی ہوں دوسری طرف پاکستانی حکمرانوں کو عجیب پریشانی نے گھیر رکھا تھا۔ جناح صاحب اور مسلم لیگ نے کشمیر کی تحریک کے تئیں جو معاندانہ اور مخالفانہ روش اختیار کر رکھی تھی اس نے ان میں ایک احساس جرم پیدا کر دیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں محسوس کرتے تھے کہ اگر کشمیریوں سے آزادی کے ساتھ الحاق کے معاملے پر رائے حاصل کر لی گئی تو صوبہ کے برعکس کشمیر میں فیصلہ کیخلاف ہوگا۔ کیونکہ وہ نیشنل کانفرنس کی مقبولیت اور عوامی قوت کا خوب اندازہ کر چکے تھے۔ اسی لئے وہ مہاراجا کو ہی گانٹھ کر کشمیر کو ہڑپ کر لینا چاہتے تھے۔ اور کشمیری عوام اور ان کے نمائندوں سے بات چیت کرنے میں ہتک سمجھتے تھے۔ ادھر مہاراجا نے تذبذب دکھانا شروع کیا اور اس کے دل میں اپنی الگ سلطنت قائم کرنے کا خیال رچ بس گیا۔ چنانچہ جب جون 1947ء میں ماؤنٹ بیٹن کشمیر آیا تو اس نے مہاراجا کو صلاح دی کہ اس کی ریاست کی آبادی کی ترکیب یوں تو پاکستان کے ساتھ الحاق کا تقاضا کرتی ہے۔ لہٰذا وہ اگر راضی ہے تو پاکستان سے الحاق کا اعلان کر دے لیکن مہاراجا نے ہچکچاہٹ دکھائی۔ اس پر ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ پھر ہندوستان کے ساتھ الحاق کر لو پیادہ فوج کا ایک ڈویژن فوراً یہاں بھجوا دوں گا تاکہ کسی کو شرارت کی تو سوجھے لیکن مہاراجا پھر بھی چپ رہا۔ اس کا دماغ اس قدر ماؤف ہو گیا تھا کہ جس وقت ماؤنٹ بیٹن دہلی واپس جانے کے لئے مہاراجا سے ملنے کیلئے آیا تو مہاراجا نے کہلوا بھیجا کہ میرا پیٹ خراب ہے اور ڈاکٹر نے مجھے کسی سے ملنے سے منع کر دیا ہے مہاراجا دراصل اس سیاسی بیماری کی آڑ میں کوئی دوٹوک جواب ٹال رہا تھا۔ پاکستان کے حکمرانوں نے یہ رنگ ڈھنگ دیکھے تو انہوں نے سوچا کہ کہیں ایسا نہ ہو معاملہ استصواب رائے پر آ جائے جس میں پاکستان کی جیت کا امکان نہیں ہے۔ چنانچہ انہوں نے کشمیریوں کو اس حق سے محروم کرنے کے لئے دراز دستی کا راستہ اختیار کرنے کی ٹھان لی۔ صوبہ سرحد کے استصواب سے متعلق یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ وہاں لیگ نے اس لئے جیت حاصل کر لی

Marfat.com

کہ خان عبدالغفار خان کی خدمت گار جماعت نے استصواب میں حصہ نہیں لیا۔ ان کے حصہ نہ لینے کی وجہ تو یہ بھی تھی کہ وہ ہوا کا رخ دیکھ رہے تھے اور کچھ یہ بھی کہ انہیں کانگریسی قیادت کے رویے سے مایوسی' محرومی اور بیزاری کا احساس ہو گیا تھا وہ سمجھتے تھے کہ عمر بھر کانگریس کا ساتھ دینے کے بعد کانگریسیوں نے انہیں اپنی گدی سنبھالتے ہی مگرمچھ کے آگے پھینک دیا ہے۔ اس لئے وہ استصواب میں پاکستان کے مقابلے میں ہندوستان سے الحاق کی تجویز پیش کرنے پر خود بھی آمادہ اور مطمئن نہیں تھے۔ پاکستانی حکمرانوں کے انداز فکر کی ترجمانی کرتے ہوئے پاکستانی حکومت کے ترجمان ''ڈان'' کراچی نے انہی دنوں یہ دھمکی آمیز اداریہ لکھا۔

''وقت آیا ہے کہ مہاراجا کشمیر کو بتایا جائے کہ وہ پاکستان میں شامل ہو جائے۔ اگر اس نے لیت ولعل سے کام لیا تو اس کے نہایت خطرناک نتائج برآمد ہونا ناگزیر ہوں گے''۔

اسی دوران پاکستان کے صوبہ سرحد اور نواحی علاقوں سے جسے قدیم زمانے گاندھارا کے نام سے پکارا جاتا تھا' قبائلیوں کے پرے کے پرے کشمیر کی طرف بڑھنے لگے اور مظفر آباد پہنچ گئے۔ سرینگر میں حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ مہاراجا کے پاس قلیل فوج تھی۔ جو اس نے مختلف علاقوں میں پھیلا دی اور دفاعی تجاویز انتظامات کرنے لگا۔ ادھر پونچھ اور میر پور وغیرہ میں جلسے منعقد ہوئے جن میں تجاویز منظور ہوئیں۔ ان تجاویز کے ذریعے مہاراجا سے استدعا کی گئی کہ وہ ریاست کا الحاق پاکستان سے کرے۔ پونچھ میں جب حالات نے پلٹا کھایا تو مہاراجا کو مشورہ دیا گیا کہ وہ خود پونچھ کا دورہ کرے۔ چنانچہ مہاراجا اپنی فوج کے انگریز چیف آف دی سٹاف جنرل اسکاٹ کے ساتھ وہاں چلا گیا۔ پونچھ پلندری وغیرہ کے اکثر لوگ فوجی ملازمت میں تھے کچھ ریاستی اور کچھ ہندوستانی فوج میں۔ کیونکہ پونچھ فوجی بھرتی کا بڑا زرخیز میدان تھا۔ وہاں کے سابق اور موجودہ فوجیوں نے اپنی وردی میں ملبوس ہو کر اور ان پر اپنے میڈل اور تمغے چمکاتے ہوئے فوجی طریقے پر مہاراجا کا پرجوش استقبال کیا۔ لیکن بدقسمتی سے مہاراجا کی سطح بین نگاہیں تہہ تک نہ جا سکیں اور اس نے رسمی استقبال کا بالکل غلط مفہوم اخذ کیا۔ اس نے ان کی محبت کا جواب غرور اور نخوت سے دیا۔ پاکستان سے الحاق کرنے کا جو مطالبہ انہوں نے کیا تھا مہاراجا نے اس کو گستاخی پر محمول کیا اور انہیں مزہ چکھانے کے لئے اپنی فوج بھیج کر ان پر شدید مظالم توڑے۔ گرفتاریوں کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ گھروں کو آگ لگوا دی گئی اور عورتوں کی بے حرمتی کی گئی۔ کشمیر فوج میں وہاں کے لوگ ملازم تھے ان میں ان واقعات سے بڑی تشویش پھیل گئی۔ ان واقعات کی صدائے بازگشت ہمارے کانوں تک بھی پہنچی۔ ہم نے بھی وہاں حالات کا مشاہدہ کرنے کیلئے اپنے کچھ نمائندے بھیجے۔ یہ نمائندے واپس آئے تو انہوں نے دردناک واقعات کی بڑی دلگداز رپورٹ پیش کی۔ چنانچہ ہم نے بھی ان مظالم کے خلاف زبردست احتجاج کیا اور حکومت کو دراز دستیاں بند کرنے کی صلاح دی۔ میں نے دہلی میں 21 اکتوبر 1947ء کو جب قبائلی حملہ آور مظفر آباد کے نزدیک پہنچ چکے تھے پونچھ کے سوال پر ایک اخباری کانفرنس میں کہا:

''پونچھ میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ مہاراجا کے مظالم کا براہ راست نتیجہ ہے وہاں کے لوگوں کو ان مظالم کے خلاف احتجاج کا پیدائشی حق حاصل ہے۔ اور ان کو اس حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے اپنے حقوق کی بازیافت کے لئے تحریک شروع کر رکھی ہے۔ اور مہاراجا نے ان پر فوجی یلغار کر کے وہاں حالات کو تباہی کے دہانے پر لایا ہے''۔

Marfat.com

میں نے مسلمانانِ کشمیر کو نفسیاتی کیفیت کی تصویر پیش کرتے ہوئے کہا:۔

''پنجاب کی مسلم اکثریت والی ریاست کپورتھلہ میں اب ایک مسلمان نظر نہیں آتا۔ یہی حال الور' بھرتپور وغیرہ ریاستوں کے مسلمانوں کے ساتھ ہوا ہے اس لئے کشمیر میں اگر کچھ لوگ ان اندیشوں میں گرفتار ہیں کہ ان کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوگا تو اس کو ہمدردی سے سمجھنے کی ضرورت ہے''۔

ادھر مہر چند مہاجن اور ان کے نائب رام لال بترہ نے جو ایک پنجابی اور کٹر آریہ سماجی تھا' کشمیری پنڈت رہنماؤں کو بلا کر انہیں بندوقیں اور دوسرے اسلحہ جات کی پیش کش کی تاکہ وہ اپنی حفاظت کر سکیں۔ خدا کا شکر ہے کہ کشمیری پنڈت رہنما مہر چند جی کے اس جھانسے میں نہیں آئے۔ انہوں نے اپنے نادان مہربانوں کو جواب دیا کہ ان کی حفاظت کے لئے ہتھیاروں سے زیادہ اکثریت کی خوشنودی کی ضرورت ہے۔ اس لئے وہ ہتھیاروں کے اس تحفے کو اپنے ہی پاس رہنے دیں۔

حکومت برطانیہ نے ریاستوں کے سربراہوں کو یہ اختیار دیا تھا کہ اگر کسی وجہ سے وہ یوم آزادی یعنی 15 اگست 1947ء تک اپنی ریاستوں کے مستقبل کا فیصلہ نہ کر پائیں انہیں دونوں مملکتوں کے ساتھ کچھ عرصہ کے لئے جوں کا توں معاہدہ (Stand Still Agreement) کر لینا چاہئے۔ تاکہ رسل و رسائل اور ڈاک و تار کا سلسلہ برقرار رکھا جائے۔ جیسا کہ پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ مہاراجا نے پاکستان کے ساتھ تو معاہدہ کر لیا لیکن ہندوستان نے معاہدہ پر دستخط کرنے کے لئے یہ شرط لگائی کہ پہلے مہاراجا کو سیاسی قیدیوں کو رہا کرنا چاہئے۔ مہاراجا اس پر راضی نہ ہوا اس لئے ہندوستان کے ساتھ معاہدہ نہ ہو سکا۔ پاکستان کو اس معاہدہ کی رو سے ڈاک و تار کے شعبے پر بالادستی حاصل ہو گئی۔ چنانچہ سرینگر کے ڈاک خانے اور تار گھروں پر پاکستان کا جھنڈا لہرایا گیا اور ملازموں سے پوچھا گیا کہ وہ ہندوستان میں جانا چاہتے ہیں یا پاکستان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ اکثر مسلمان ملازموں نے جب پاکستان کا سبز ہلالی پرچم لہراتے دیکھا تو وہ سمجھے کہ الحاق کا فیصلہ ہو چکا ہے اور انہوں نے اپنی رضا پاکستان کے حق میں ظاہر کی۔ لیکن معاہدے کی رو سے وہ چھ مہینے کے اندر اندر اپنے اس چناؤ Option کو بدل بھی سکتے تھے۔ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ جب پانسہ پلٹا تو ہندوستان نے ان ملازموں کی رائے جاننے کی پرواہ نہیں کی۔ الٹا ان بے چاروں کو ملازمت سے ہی نکال باہر کر دیا۔ یہ بات بھی شروع ہی سے میرے اور ہندوستان کے درمیان تلخی کی ایک وجہ بن گئی۔

▪▪▪

پنڈت رام چند کاک کا ریاست کی وزارتِ عظمیٰ تک پہنچ جانا کمال کی بات تھی۔ انہوں نے محکمہ آثار قدیمہ میں ایک معمولی عہدہ سے ملازمت شروع کی تھی بعد میں ریاست کے چیف سیکرٹری' وزیر حضور اور وزیر اعظم کے منصب پر فائز ہوئے۔ سر بی این راؤ کے علاوہ جو بھی وزیر اعظم کشمیر آیا وہ زیادہ دیر تک یہاں ٹک نہ سکا۔ سر مہاراج سنگھ آئے اور چند ہی مہینوں میں بستر گول کر کے چلے گئے۔ یہی حال کرنل ہاکسر کا بھی ہوا۔ ان کے بعد رام چند کاک وزیر اعظم بنائے گئے۔ یہ کشمیری بولنے والے پہلے شخص تھے جو ڈوگرہ شاہی میں وزارتِ عظمیٰ کے مرتبے تک پہنچ جانے میں کامیاب ہوئے۔ تھے تو وہ کشمیری پنڈت لیکن اپنے معزز طبقے کی نہ تو ان میں حلیمی تھی نہ نرمی اور نہ انکسار۔ یہ بڑے تند خو اور اکڑفوں کرنے والے جن

Marfat.com

تھے انہی کے زمانہ اقتدار میں بیگ صاحب کو مہاراجے کی حکومت سے استعفیٰ دینے کے سوا کوئی اور چارہ کار نظر نہیں آیا تھا۔ اور انہی نے میاں احمد یار خاں کو ساز باز سے اپنے شیشے میں اتار لیا تھا۔ اور پارٹی کے فیصلے کے خلاف بیگ صاحب کی جگہ سنبھالنے پر تیار کر لیا تھا۔ رام چند کاک کے تعلقات مہاراجا کے ساتھ کس قسم اور نوعیت کے تھے وہ تو میں بتا نہیں سکتا لیکن یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ پاکستان کے ارباب اقتدار کے ساتھ ان کے تعلقات اچھے خاصے تھے۔ غالباً اپنی فہم وفراست اور دور اندیشی کے سبب وہ بھانپ گئے تھے کہ کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور اس کی جغرافیائی حیثیت ایسی ہے کہ یہ پاکستان کے ساتھ آخر کار الحاق پر مجبور ہو جائے گا۔ اس لئے وہ اپنا راستہ ہموار کرنے کی تگ ودو میں لگے ہوئے تھے۔ انہوں نے جناح صاحب اور لیاقت علی خاں سے بھی ملاقاتیں کی تھیں۔ مہاراجا اگرچہ رنگین طبیعت کے مالک تھے لیکن جہاں ان کے ذاتی اور خاندانی مفاد کا سوال آتا تھا' وہ بڑے سخت واقع ہوئے تھے۔ کاک صاحب کے یہ تیور دیکھ کر غالباً انہوں نے کاک کو وزارت عظمیٰ سے چلتا کر دیا۔ 11 اگست 1947ء یعنی پاکستان کے قیام کے صرف چار دن پہلے وہ شیر گڈھی میں اپنے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ مہاراجا کا ایک اے ڈی سی ایک شکار گاہ سے جہاں مہاراجا شکار کھیلنے کے لئے گیا تھا ایک مہر بند لفافہ لایا۔ کاک نے لفافہ کھول کر خط پڑھا تو اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اس میں ان کو فوری طور پر برخواست کرنے کے احکامات درج تھے۔ جب رام چند کاک کو نوشتہ دیوار نظر آیا تو اس نے ہوائی جہاز کے ذریعے ریاست سے بھاگ جانے کی کوشش کی۔ لیکن مہاراجا نے اسے ہوائی اڈے پر ہی گرفتار کروا لیا۔ اور اس کی جگہ جنرل جنک سنگھ کو وزیراعظم بنایا۔ پنڈت رام چند کو سرینگر سنٹرل جیل میں بند رکھا گیا اور ان کے خلاف کچھ مقدمے بھی دائر کر دیئے گئے۔ جنک سنگھ نے اس کے خلاف بعض الزامات کی تحقیقات کے لئے ایک انکوائری بھی بٹھا دی۔ خود مہاراجا کشمیر کے تعلقات آریہ سماج کے ساتھ بہت گہرے تھے۔ اول اول تو مہاراجا کو بہت اعتدال پسند' لبرل اور مذہبی تعصب سے بالاتر سمجھا جاتا تھا۔ ان دنوں اس کا میل جول بھی زیادہ تر مسلمان مصاحبوں اور درباریوں کے ساتھ رہتا تھا۔ جن میں نواب خسرو جنگ' عبدالرحمن آفندی اور صاحبزادہ نور محمد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لیکن جب ہندوستان میں شدھی اور تبلیغ کی تحریکوں کا زور ہوا اور خواجہ حسن نظامی نے اپنے اخبار ''منادی'' میں یہ خبر چھاپ دی کہ ایک بڑی ریاست کا ہندو مہاراجا مذہب اسلام قبول کرنے والا ہے تو ہندوؤں کے ایک بڑے طبقے میں یہ تشویش پھیلی کہ ہو نہ ہو یہ مہاراجا کشمیر ہی ہوگا۔ چنانچہ مہاراجا کے گرد انہوں نے زبردست گھیرا ڈالا ان کے تعلقات آریہ سماج کے ساتھ بڑھتے چلے گئے۔ آریہ سماج کے چالاک ایجنٹوں نے ان کے دل میں مسلمانوں کے خلاف شکوک وشبہات پیدا کیے اور آخر کار انہیں مسلمان دشمن بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ ان حالات میں جب نئے وزیراعظم کی تلاش شروع ہوئی تو ان کی نگاہیں آریہ سماج کی صفوں کو تاکنے لگیں۔ اس پس منظر میں ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت سردار پٹیل نے مہر چند مہاجن اور رام لال بترہ کو کشمیر میں اقتدار کے سنگھاسن پر بٹھوا دیا۔ الحاق کے بارے میں مہاراجا کی دلی خواہش تھی کہ وہ اپنی ریاست کو دونوں نوزائیدہ مملکتوں سے الگ رکھ کے آزاد رکھے۔ چنانچہ اس نے مسودہ الحاق پر دستخط کرنے سے پہلے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو جو خط لکھا اس میں اس بات کا برملا اعتراف کیا کہ کشمیر کے جغرافیائی محل وقوع اور اس کی آبادی کی ہیئت ترکیبی کے پیش نظر اس کی اپنی خواہش آزاد رہنے کی تھی۔ بعد میں پاکستان نے اپنی کوتاہ اندیشی میں حملہ کر کے مہاراجا کے اس خواب کو مسمار کر دیا اور خود اس کے

Marfat.com

الفاظ میں اس کے لئے ''اس بات کے سوا کوئی اور چارہ کار نہ رہا کہ وہ ہندوستان کے ساتھ الحاق کر کے اس سے فوجی معاونت مانگے''۔ لیکن ان صریح واقعات کے باوجود فرقہ پرست ہندو پریس آج تک برابر چلاتا آیا ہے کہ میں کشمیر کا سلطان بننے کا خواب دیکھتا رہا ہوں۔ حالانکہ میں نے ریاست کی آئین ساز اسمبلی کے افتتاحی اجلاس میں الحاق کے مسئلے پر تفصیل کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے لیکن ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا نظر آتا ہے۔ اسی طرح فرقہ پرستی کے یرقان میں مبتلا لوگوں کو ہر چیز پیلی لگتی ہے۔ انہیں حقائق سے تو کوئی مطلب نہیں ہوتا لیکن وہ گوئبلز کے اس فلسفے میں اعتقاد رکھتے کہ ''جھوٹ کہتے جاؤ' کہتے چلو' کچھ نہ کچھ تو چپک جائے گا اور بالآخر لوگ اس کو ماننے لگیں گے''۔

(آتش چنار: صفحہ 385 تا 405)

بھارت کے ساتھ ریاست جموں وکشمیر کے جبری الحاق کا جو ڈرامہ اکتوبر 1947ء میں بھارتی حکمرانوں، ریاست کے ڈوگرہ مہاراجہ ہری سنگھ اور ریاست میں نیشنلزم کے بانی اور علمبردار شیخ عبداللہ کے باہمی گٹھ جوڑ سے رچایا گیا تھا، اس کی نہ کوئی آئینی وقانونی حیثیت تھی نہ اخلاقی' اس کے کئی اسباب ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں۔

یہ الحاق تقسیم کے دوقومی نظریے پر مبنی برصغیر کے اس اصول کے منافی تھا جس کے مطابق یہ طے پایا تھا کہ مسلم اکثریت کے ملحقہ علاقے پاکستان میں شامل ہوں گے اور غیر مسلم اکثریت کے ملحقہ علاقے بھارت میں، اور یہی اصول پانچ سو کے لگ بھگ ان نیم خودمختار ریاستوں کے پاکستان یا بھارت کے ساتھ الحاق کے بارے میں بھی طے پایا تھا جن میں سے ایک غالب مسلم اکثریت کی پاکستان سے ملحقہ ریاست جموں وکشمیر بھی تھی' جسے اس اصول کے مطابق پاکستان میں شامل ہونا چاہئے تھا۔

یہ الحاق ریاست کے عوام کی غالب مسلم اکثریت کی خواہشات کے سراسر منافی تھا۔

ممتاز برطانوی مصنف اور دانشور السٹر لیمب (Alster Lamb) نے اپنے اس انکشاف کے ذریعے پوری دنیا کو چونکا دیا ہے کہ بھارت نے جس نام نہاد ''دستاویز الحاق'' کو بنیاد بنا کر 27 اکتوبر 1947ء کو کشمیر میں اپنی فوجیں اتاری تھیں، اس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے مہاراجا کی طرف سے نہ تو ریاست کے بھارت کے ساتھ الحاق کے لئے کوئی درخواست دی گئی تھی اور نہ بھارتی فوجیں ریاست میں اتارنے کے لئے کہا گیا تھا' بلکہ یہ ساری کی ساری کارروائی جعلی تھی جس کا مقصد دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک کر مسلم اکثریت کی اس ریاست پر غاصبانہ تسلط جمانا تھا۔ اگر السٹر لیمب کی یہ بات صحیح ہے تو پھر کشمیر کے بھارت کے ساتھ جبری الحاق کے بے بنیاد ہونے کے لئے کسی دوسری دلیل کی سرے سے ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس لئے کہ ریاست کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت آل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس اس سے قبل 19 جولائی 1947ء کے اجلاس میں ریاست جموں وکشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کا متفقہ طور پر مطالبہ کر چکی تھی' اس لئے کہ 1946ء میں ریاستی اسمبلی کے جو انتخابات ہوئے تھے ان میں مسلمانوں کیلئے مختص اکیس میں سولہ نشستوں پر کامیابی حاصل کرنے کے بعد مسلم کانفرنس ریاستی مسلمانوں کی غیر سرکاری پارلیمنٹ کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔

یہ الحاق اس لئے بھی غیر قانونی تھا کہ ریاست کا ڈوگرہ مہاراجا ہری سنگھ الحاق کا یہ معاہدہ کرنے کا مجاز ہی نہیں تھا اور اس کے بھی کئی اسباب ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں۔ ہری سنگھ ریاست کا قانونی حکمران تھا ہی نہیں، اس لئے کہ

Marfat.com

1846ء کا بیع نامہ امرتسر جس کے مطابق ہری سنگھ کے دادا مہاراجا گلاب سنگھ نے ریاست کو اس کے باشندوں سمیت پچھتر لاکھ نانک شاہی کے بدلے میں خریدا تھا' خود ایک غیر قانونی اور غیر انسانی معاہدہ تھا۔ لہٰذا اس طرح کے معاہدے کی بنیاد پر معرض وجود میں آنے والی حکومت نہ تو خود قانونی ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس کی طرف سے کئے گئے کسی معاہدے کی کوئی آئینی حیثیت ہی ہو سکتی ہے۔ پھر 27 اکتوبر 1947ء کو جب ہری سنگھ نے کشمیر کے بھارت کے ساتھ الحاق کا معاہدہ کرنے کا ڈرامہ رچایا تھا، اس وقت وہ عملاً بھی ریاست کا حکمران نہیں تھا اس لئے کہ اس سے تین دن پہلے 24 اکتوبر 1947ء کو مجاہدین نے ریاست کے ایک تہائی حصے کو ڈوگرہ سامراج کے پنجہ استبداد سے آزاد کرانے کے بعد وہاں پر آزاد حکومت ریاست جموں و کشمیر کے نام سے ایک باقاعدہ حکومت کا قیام عمل میں لا کر ہری سنگھ کی معزولی کا اعلان کر دیا تھا۔ اور اب مجاہدین پیش قدمی کرتے ہوئے ریاست کے دارالحکومت سرینگر کے قریب پہنچ گئے تھے جس کی وجہ سے ہری سنگھ اپنی موت کے خوف سے راتوں رات سرینگر سے بھاگ کر جموں میں پناہ لے چکا تھا۔ اور اسی حالت فرار میں اس نے بھارت کے ساتھ ریاست کے الحاق کا یہ ڈھونگ رچایا تھا جس کی سرے سے کوئی حیثیت نہیں تھی۔

اس الحاق کے غیر قانونی ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس سے پہلے 15 اگست 1947ء کو مہاراجہ ہری سنگھ اور حکومت پاکستان کے مابین ایک معاہدہ قائمہ طے پا چکا تھا جس سے یہ مراد تھی کہ حکومت ریاست جموں و کشمیر، حکومت پاکستان کے ساتھ اسی طرح کے تعلقات برقرار رکھے گی جس طرح کے تعلقات اس سے پہلے حکومت ریاست جموں و کشمیر اور برطانوی حکومت کے مابین استوار تھے اور اس معاہدہ قائمہ کے ہوتے ہوئے مہاراجا ہری سنگھ کسی دوسرے ملک کے ساتھ کوئی معاہدہ کرنے کا مجاز نہیں تھا۔ ریاست جموں و کشمیر کے بھارت کے ساتھ جبری الحاق کے غیر آئینی و غیر قانونی ہونے کے یہ سارے پہلو اس قدر واضح تھے کہ خود اس وقت کی بھارتی حکومت بھی الحاق کے اس ڈرامے کو غیر آئینی اور غیر قانونی سمجھتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت کے اس وقت کے گورنر جنرل لارڈ مونٹ بیٹن کو خود اس جبری الحاق کو عارضی اور مشروط قرار دیتے ہوئے یہ اعلان کرنا پڑا کہ ریاست کے پاکستان یا بھارت کے ساتھ الحاق کا فیصلہ ریاست کے عوام کی آزادانہ مرضی سے کیا جائیگا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے الفاظ یہ ہیں:

''ہماری اس پالیسی کے تحت اگر کسی ریاست میں الحاق کا مسئلہ متنازعہ ہو تو الحاق کا سوال وہاں کی عوام کی مرضی کے مطابق طے کیا جانا چاہئے' میری حکومت چاہتی ہے کہ جونہی ریاست میں امن عامہ بحال ہو جائے اور کشمیر کی سرزمین ''حملہ آوروں'' سے پاک ہو جائے' تو ریاست کے الحاق کا سوال وہاں کے عوام کی مرضی کے مطابق طے کیا جانا چاہئے''۔

یہاں اس افسوسناک حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ کشمیر کے بھارت کے ساتھ جبری الحاق کی اس سازش میں ریاست میں کشمیری نیشنل ازم کے بانی اور علمبردار شیخ محمد عبداللہ پوری طرح شریک بلکہ پیش پیش بھی تھے۔ چنانچہ یہ بات تاریخ کے ریکارڈ پر موجود ہے کہ 1947ء میں تقسیم برصغیر کے موقع پر جب شیخ عبداللہ ''کشمیر چھوڑ دو'' تحریک کے سلسلے میں جیل میں تھے' تو انہوں نے جیل سے مہاراجا ہری سنگھ کو خط لکھا کہ وہ کشمیر کا پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے کے بجائے اس کا بھارت کے ساتھ الحاق کریں اور جب کشمیر کا دہلی میں بھارت کے ساتھ الحاق کا ڈرامہ رچایا جا رہا تھا تو اس موقع پر شیخ عبداللہ بھی وہاں پر موجود تھے اور الحاق کے اس ڈرامے میں پوری طرح شریک تھے' اور جب الحاق کے اس

Marfat.com

ڈرامے کو بہانہ بنا کر بھارت نے کشمیر پر حملہ کیا تو کشمیری نیشنل ازم کے علمبردار بھارتی فوجیوں کو ہار پہنانے کے لئے ائرپورٹ پر موجود تھے۔ اور پھر جب شیخ عبداللہ کو ان کی ''خدمات'' کے بدلے میں ریاست کا منتظم اعلیٰ اور وزیراعظم بنایا گیا تو ان کے دور اقتدار میں ریاست میں اسلام اور آزادی کے نام لیواؤں پر جو مظالم ڈھائے گئے' ان کی نظیر بعد کے ادوار میں مشکل ہی سے ملے گی۔ چنانچہ اکتوبر اور نومبر 1947ء میں جموں میں پانچ لاکھ مسلمانوں کا قتل عام اور پانچ لاکھ مسلمانوں کا انتہائی بے بسی کے عالم میں اپنے گھربار چھوڑ کر آگ اور خون کے دریا عبور کر کے آزاد کشمیر اور پاکستان کی طرف ہجرت پر مجبور کیا جانا ان کے دور کے ''عظیم کارنامے'' بھی قرار دیئے جا سکتے ہیں اور مسلمانان کشمیر کیلئے کشمیری نیشنلزم کے نظریئے کے خصوصی تحفے بھی۔

یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ کشمیر کے بھارت کے ساتھ جبری الحاق کی اس سازش میں ہندو کانگریس کے ساتھ ساتھ انگریز بھی پوری طرح شریک تھے۔ چنانچہ یہ برصغیر کے انگریز حکمران ہی تھے جنہوں نے اگست 1947ء میں یہاں سے واپسی سے پہلے تقسیم برصغیر کے اصولوں کی صریحاً خلاف ورزی کرتے ہوئے ریڈکلف ایوارڈ کے ذریعے مسلم اکثریت کے ضلع گورداسپور کو بھارت کے حوالے کر دیا اور یوں بھارت کو کشمیر تک پہنچنے کیلئے راستہ مہیا کیا۔ ورنہ بھارت کے لئے کشمیر پر اپنا غاصبانہ تسلط جمانا اور برقرار رکھنا کسی صورت بھی ممکن نہ ہوتا۔ ادھر مجاہدین آزادی جو اب تک ڈوگرہ فوجوں کیخلاف برسرپیکار تھے' حملہ آور بھارتی افواج کے خلاف صف آراء ہو گئے اور کامیابیوں پر کامیابیاں حاصل کرتے چلے گئے۔ ان کی مسلسل کامیابیوں نے بھارت کو اس قدر خوفزدہ کر دیا کہ اسے کشمیر میں اپنی شکست یقینی نظر آنے لگی۔ چنانچہ اس شکست سے بچنے کے لئے اپنی روایتی مکاری سے کام لیتے ہوئے وہ اس مسئلے کو اقوام متحدہ میں لے گیا۔ یہاں یہ مسئلہ ایک عرصے تک بحث وتمحیص کا موضوع بنا رہا۔ اور پھر اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندوپاک کی 13 اگست 1948ء اور 5 جنوری 1949ء کی قراردادوں کے مطابق یہ طے پایا کہ ریاست کے پاکستان یا بھارت کے ساتھ الحاق کا فیصلہ اقوام متحدہ کے زیر اہتمام آزادانہ اور غیر جانبدارانہ رائے شماری سے کیا جائیگا۔ اقوام متحدہ کی ان قراردادوں میں رائے شماری کے مسئلے کو پاکستان یا بھارت کے ساتھ الحاق کے ساتھ قرار دینے کا فیصلہ دراصل تقسیم برصغیر کے اصولوں کی روشنی میں کیا گیا تھا۔ اور انہیں بھارت، پاکستان اور دنیا کی دوسری اقوام کے ساتھ ساتھ کشمیری عوام کی لیڈرشپ نے بھی متفقہ طور پر تسلیم کیا تھا اور انہی کے مطابق 5 جنوری 1949ء کو کشمیر میں فائر بندی ہوئی اور سیز فائر لائن معرض وجود میں آئی۔

کشمیر میں مجاہدین یا قبائلی پٹھان آپ انہیں جو بھی نام دے لیں کی مداخلت اور موجودہ (آزاد کشمیر) پاکستان کے زیر تسلط آنے کی روداد مسئلہ کشمیر کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوگی۔ مرحوم میجر جنرل اکبر خان جنہیں راولپنڈی سازش کیس میں گرفتار کر کے بعد میں ان پر غداری اور ملک سے بغاوت کا مقدمہ بھی چلایا گیا اپنی کتاب Raiders in Kashmir میں اس کا احوال بیان کرتے ہیں۔ اپنی کتاب کا آغاز جنرل اکبر خان مرحوم نے اس سوال سے کیا ہے کہ قبائلی پٹھان کشمیر میں کیوں داخل ہوئے تھے؟ اور اس سوال کا جواب دیتے ہوئے وہ خود ہی کہتے ہیں اس سوال کا جواب بھی ہے اور صرف یہی ہے کہ قبائلی پٹھانوں کو ریاست جموں وکشمیر مسلمانوں کے مسائل' مصائب اور عزائم کے ساتھ گہری

Marfat.com

دلچسپی تھی۔ چار ہی مہینے پہلے 15 اگست 1947ء کے روز برصغیر کو اس صورت میں آزادی ملی تھی کہ ملک تقسیم ہو گیا تھا اور دولت مشترکہ برطانیہ کی دو آزاد اور خود مختار مملکتیں معرض وجود میں آئی تھیں۔ برصغیر میں برطانوی حکومت کی حکمرانی تو اسی روز ختم ہو گئی تھی لیکن دونوں نئی حکومتیں ابھی اپنی اپنی مملکت پر پوری طرح عملداری رائج نہیں کر سکی تھیں کیونکہ چالیس کروڑ آبادی اور 1777438 مربع میل رقبے کے پرانے ہندوستان میں 568 ریاستیں تھیں جنہوں نے ابھی دونوں میں سے کسی ایک مملکت کے ساتھ الحاق نہیں کیا تھا۔

ان ریاستوں کو یہ حق دیا گیا تھا کہ اپنے آزادانہ فیصلے کے تحت کسی ایک مملکت کے ساتھ الحاق کر لیں۔ وہ چونکہ آزاد نہیں رہ سکتی تھیں۔ اس لئے توقع تھی کہ ملک کی تقسیم تک راجے' مہاراجے اور نواب الحاق کا فیصلہ کر لیں گے۔ بعض نے فیصلہ کر بھی لیا تھا۔ باقی جو ریاستیں رہ گئی تھیں وہ جغرافیائی لحاظ سے ایک یا دوسری کے اس قدر قریب تھیں کہ متعلقہ مملکت کے ساتھ الحاق کا فیصلہ محض رسمی حیثیت رکھتا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ اہم ریاست جموں و کشمیر تھی جو دوسری بڑی ریاست تھی۔ جغرافیائی لحاظ سے یہ ریاست تمام تر برصغیر کے لئے اس لئے زیادہ اہمیت کی حامل نہیں تھی کہ یہ ہندوستان اور پاکستان دونوں سے ملحق ہے بلکہ اس لئے کہ شمال میں اس کے اور روس کے درمیان افغانستان کا ذرا سا علاقہ ہے اور اس کی سرحد چین سے مشترکہ ہے۔

جب برطانوی حکومت نے ملک کی تقسیم کا اعلان کیا تو ہمیں توقع تھی کہ اس ریاست کا الحاق پاکستان کے ساتھ ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ کشمیر پاکستان کے بنیادی تصور میں شامل تھا۔ پاکستان کا ''ک'' کشمیر کا ہے' ملک کی تقسیم کی بنیاد یہی تھی کہ مسلم اکثریت کے علاقے پاکستان کہلائیں گے۔ اس بنیاد پر کشمیر کا حصہ ہونا چاہئے تھا کیونکہ اس کی چالیس لاکھ آبادی میں 75 فیصد مسلمان تھے اور اس لئے بھی کہ ہندوستان کے ساتھ اس کی کوئی سڑک' کوئی ریل اور کوئی دریائی راستہ نہیں ملتا تھا نہ اقتصادی طور پر اس کا ہندوستان کے ساتھ کوئی تعلق تھا۔

یہی احوال و کوائف تھے جن کے پیش نظر توقع رکھی گئی تھی کہ کشمیر کے عوام بلا پس و پیش پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کریں گے۔ مگر اس کا فیصلہ ریاست کے غیر مسلم حکمران مہاراجہ کے ہاتھ تھا۔ وہاں جلدی فیصلہ کرنے کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ تقسیم کے اعلان سے چند ہفتے بعد جب کہ ابھی تقسیم ہوئی نہیں تھی' دلی میں قائداعظمؒ سے ایک وفد نے ملاقات کی اور انہیں کشمیر کے متعلق کچھ خدشات سے آگاہ کیا تھا۔ اس وقت قائداعظمؒ پاکستان کے نامزد گورنر جنرل تھے میں آرمڈ فورسز پارٹیشن سب کمیٹی کے ممبروں کے ساتھ وہاں گیا تھا۔ اس خدشے کا اظہار کیا گیا تھا کہ مہاراجہ کے ساتھ الحاق کرنے سے عیاں طور پر گریز کر رہا ہے اور یہ خطرہ بھی ہے کہ کشمیر کا مسلمان شیخ عبداللہ جو آزادی ہند کی تحریک کا ہیرو تھا اور جس نے پاکستان کے تصور کی مخالفت کی تھی، مہاراجہ کے ہاتھ مضبوط کر رہا ہے۔

قائداعظمؒ نے وفد کو یقین دلایا تھا کہ دو افراد کا فیصلہ ساری ریاست کے مستقبل کو مسخ نہیں کر سکتا۔ قائداعظمؒ نے کہا کہ نظریہ پاکستان نے جس طرح سارے ہندوستان کو گرفت میں لے لیا تھا اسی طرح کشمیر کو بھی گرفت میں لئے ہوئے ہے۔ لہٰذا شیخ عبداللہ کی مخالفت کے باوجود کشمیری مسلمان پاکستان کے ساتھ الحاق کرنا چاہیں گے۔ اس کے علاوہ جغرافیائی لحاظ سے کشمیر صرف پاکستان کے ساتھ ہی الحاق کر سکتا ہے۔

Marfat.com

وثوق سے کہا جا رہا تھا کہ مندرجہ بالا وجوہات کی بنا پر کشمیر پاکستان کے ساتھ الحاق کرے مگر اس وثوق کو پہلا دھچکا اس وقت لگا جب ریڈ کلف ایوارڈ نے دونوں ملکوں کی حد بندی کا اعلان کیا۔ اس کے تحت پاکستان سے ملحقہ علاقے کا کچھ ایسا حصہ ہندوستان کو دے دیا گیا تھا جس میں سے کشمیر اور ہندوستان کے درمیان پختہ سڑک بنائی جا سکتی تھی۔ اس وقت کشمیر کا دنیا کے ساتھ رابطہ دو سڑکوں کے ذریعے تھا۔ دونوں پاکستان میں سے گزرتی تھیں۔ لیکن اب ہندوستان کے لئے ایسی صورت پیدا کر دی گئی تھی جس میں جموں سے کٹھوعہ تک جانے والا غیر پختہ راستہ ہندوستان تک پختہ سڑک بنایا جا سکتا تھا۔ اس طرح کشمیر کی ہندوستان کے ساتھ الحاق کم از کم ایک دشواری دور کر لی گئی۔ خیال یہی تھا کہ مہاراجہ نے ہندوستان کے ساتھ گفت و شنید شروع کر دی ہوگی۔ پاکستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق میں کوئی دشواری تھی ہی نہیں۔ جولائی 1947ء تک ہندوستان کے اس وقت کے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مہاراجہ کو یقین دلایا تھا کہ اگر مہاراجہ پاکستان سے الحاق کر لے تو ہندوستان کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ کشمیر کے اندر سے بھی کسی دشواری کے پیدا ہونے کا امکان نہیں تھا کیونکہ دونوں بڑی سیاسی پارٹیوں مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس کے لیڈر جیلوں میں بند تھے۔ اس کے باوجود مہاراجا کوئی فیصلہ نہیں کر رہا تھا اس نے زیادہ سے زیادہ یہ کیا کہ پاکستان کے ساتھ استقرار کار کر لیا یعنی ریاست کی موجودہ حیثیت قائم رہے گی۔ یہ معاہدہ کر کے وہ چوکس ہو کر بیٹھ گیا مگر سمجھ نہ سکا کہ وہ آتش فشاں پہاڑ کے دھانے پر بیٹھ گیا ہے۔

ایک مدت سے انڈین نیشنل کانگرس برصغیر کی آزادی کی جدوجہد کی قیادت کر رہی تھی۔ اس کا مطمع نظر یہ تھا کہ ہندوستان تقسیم نہیں ہوگا اور اس میں اکثریت کا جمہوری راج ہوگا۔ مسلمان لیڈروں کو چونکہ یقین تھا کہ اکثریت غیر مسلم قوم کی ہوگی جو مسلمانوں کو اقلیت سمجھ کر اپنے ماتحت رکھے گی' اس لئے انھوں نے اپنے لئے الگ مملکت کا مطالبہ کیا تھا۔ تقسیم سے ایک سال پہلے فرقہ وارانہ فسادات غیر معمولی طور پر بڑھ گئے اور جب تقسیم ہوگئی تو ایک خوف نے لوگوں کو ہجرت پر مجبور کر دیا۔ اس موقع پر امن و امان تہس نہس ہو گیا۔ لوگوں نے اخلاق اور قانون کی دھجیاں اڑا دیں اور بے دریغ قتل عام ہوا۔ ایسے ردعمل سے کشمیر کس طرح بچا رہ سکتا تھا؟

کشمیر میں اقلیتی قوم یعنی غیر مسلموں پر مسلمانوں کا ڈر سوار تھا اور مسلمان چونکہ نہتے تھے اس لئے مہاراجہ اور اس کی غیر مسلم فوج سے ڈرتے تھے۔ ابھی تک کوئی خونریزی تو نہیں ہوئی تھی' مسلمان صبر و تحمل سے کام لے رہے تھے مگر کب تک؟ مہاراجہ دوسری ریاستوں کے برعکس الحاق کا کوئی فیصلہ نہیں کر رہا تھا بلکہ اس مسئلے کو غیر معینہ مدت کے لیے تعطل میں رکھ رہا تھا۔ نہ ہی عوام کو آئینی حکومت میں شامل کر رہا تھا اور نہ ہی کوئی ایسے آثار نظر آتے تھے کہ وہ سیاسی لیڈروں کو رہا کرے گا۔ ریاست میں اس کے اس رویے کا کچھ نہ کچھ ردعمل تو ہونا ہی تھا۔ اور وہ ردعمل ہو کر رہا۔

ستمبر کے آغاز میں برصغیر کی تقسیم کے دو ہفتے بعد میں چند دنوں کے لئے مری گیا۔ مری میں گرمیاں گزارنے کے لئے جو لوگ آئے تھے جا چکے تھے پھر بھی مری میں بہت سے لوگ تھے۔ یہ کشمیر کے مہاجرین تھے۔ ہر کسی کی زبان پر یہی تھا کہ کشمیر میں فسادات شروع ہو چکے ہیں۔ لوگ اس قسم کی باتیں سناتے تھے کہ صرف غیر مسلم شہری ہی نہیں بلکہ ریاست کی فوج بھی مسلمانوں کا قتل عام اور لوٹ مار کر رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستان کا خونی ڈرامہ ریاست میں بھی شروع ہو چکا تھا۔

Marfat.com

اگر مبالغہ آرائی کو نظر انداز کر دیا جاتا تو بھی اس سے انکار کرنے کی گنجائش نہیں تھی کہ گولیوں کی پہلی باڑ فائر ہو چکی ہے اور کشمیر میں ہنگاموں کی ابتدا ہو گئی ہے۔ مجرم کون تھا کون نہیں تھا' اب یہ سوچنا بیکار تھا۔ اگر بھارت چاہتا تو حالات اس حد تک نہ بگڑتے۔ میں یہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میں مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو کو قابل احترام لیڈر سمجھا کرتا تھا۔ میں ایسی خوش فہمی میں بھی مبتلا تھا کہ یہ دونوں لیڈر فرقہ وارانہ جذبات اور ایسے ننگے عزائم سے بلند ہیں۔ انہوں نے پاکستان کی جو مخالفت کی تھی قابل فہم تھی۔ اب جب کہ پاکستان معرض وجود میں آ چکا تھا' ان کے لئے دانشمندانہ اقدام یہی تھا کہ پاکستان کو قبول کرتے اور ان کے دلوں میں اگر ایسی خواہش ہوتی کہ پاکستان اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے تو اس خواہش کی تکمیل کے لئے وہ مہاراجہ کشمیر کو بتاتے کہ اس کی ریاست کا مستقبل پاکستان سے وابستہ ہے۔

مگر ایسا نہ ہوا۔ دونوں لیڈروں کی سوچ بڑی ہی مختلف ثابت ہوئی۔ اب ہم کم از کم اس مسئلے کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ نہ ہم اپنے کشمیری بھائیوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ سے نگاہیں پھیر سکتے تھے۔ بلکہ خود پاکستانیوں کے تحفظ اور فلاح و بہبود کا تقاضا یہ تھا کہ کشمیر بھارت کی جھولی میں نہ جائے۔ نقشے پر ایک نظر ڈالنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ ہندوستانی فوج کشمیر کی سرحد پر آ کر ڈیرے ڈال دے تو پاکستان کے تحفظ کے لئے کتنا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ کشمیر ہندوستان کے پاس چلے جانے سے یہ خطرہ بھی تھا کہ ہندوستان لاہور سے راولپنڈی تک جانے والی ایک سو اسی میل لمبی سڑک سے چند ہی میل دور فوجی اڈے قائم کرے گا۔ جنگ کی صورت میں ہندوستان کے یہ اڈے ہماری اتنی اہم فوجی اور شہری رابطہ لائن کے لیے بہت بڑا خطرہ بن سکتے تھے۔ اس رابطہ لائن کے دفاع کے لیے ہمیں اپنی فوج کا بہت سا حصہ اس کے ساتھ رکھنا تھا جس سے لاہور فرنٹ کمزور ہونے کا خطرہ تھا اور اگر ہم لاہور فرنٹ کو مضبوط کرتے تو ہندوستان ہماری لائن توڑ کر لاہور، سیالکوٹ، گجرات اور جہلم کو ہمارے فوجی مرکز یعنی راولپنڈی سے کاٹ سکتا تھا۔ کشمیر پر ہندوستانی قبضے کی صورت میں ہندوستان ہزارہ اور مری کو فوراً جنگ کی زد میں لا سکتا تھا۔ جب کہ یہ جگہیں فرنٹ سے دو سو میل دور ہیں۔ یہ تو جنگ کی صورت میں ہوتا۔ امن کی صورت میں بھی یہ خطرات ہماری آزادی پر مسلط رہتے۔

جب ہم اقتصادی لحاظ سے دیکھتے تھے تو بھی ہماری پوزیشن واضح ہو جاتی تھی۔ ہماری زرعی معیشت کا دارومدار ان دریاؤں پر تھا جو کشمیر سے نکلتے ہیں۔ منگلا ہیڈورکس تو تھا ہی کشمیر میں، مرالہ ہیڈورکس سرحد سے ایک ہی میل دور تھا۔ ہم سوچتے تھے کہ کشمیر کے ہندوستان کے ساتھ الحاق سے ہماری معیشت کی کیفیت کیا رہ جائے گی؟ خود کشمیر کی اقتصادیات پاکستان سے وابستہ تھیں۔ کیونکہ اس کی واحد تجارتی شاہراہ جو سارا سال کھلی رہتی تھی' کوہالہ اور مظفر آباد سے پاکستان میں داخل ہوتی تھی۔ چیل اور دیودار کے شہتیر جو کشمیر کی سب سے زیادہ آمدنی کا ذریعہ تھے۔ دریائے جہلم کے راستے پاکستان میں ہی آتے تھے۔ لہٰذا پاکستان کے ساتھ کشمیر کا الحاق محض خواہش نہیں تھی بلکہ ہمارے آزاد اور خود مختار وجود کیلئے ایک ضرورت تھی اور جب ہمیں یہ یقین ہو گیا کہ کشمیریوں کی اکثریت پاکستان کے ساتھ شامل ہونا چاہتی ہے تو ہمارے اس دعوے کی تصدیق ہو گئی کہ کشمیر کا الحاق پاکستان کے ساتھ ہی ہونا چاہئے مگر اب جبکہ کشمیری مسلمانوں کو ہی کشمیر سے دھکیل باہر کیا جا رہا تھا اور کشمیر میں جو مسلمان رہ گئے تھے ان کا الحاق جبراً ہندوستان سے کرایا جا رہا تھا تو ہماری خواہشیں بے معنی اور ہمارا دعویٰ مفلوج ہو کے رہ گیا تھا۔

Marfat.com

میرا ذہن انہیں سوچوں میں اُلجھا ہوا تھا کہ کسی نے میرا تعارف سردار ابراہیم سے کرایا۔ بعد میں سردار ابراہیم آزاد کشمیر کے پہلے صدر بنے تھے۔ اس وقت تک وہ پاکستان میں کوئی زیادہ معروف نہیں تھے۔ مسلم کانفرنس جو پاکستان کی حامی تھی' کے لیڈر ابھی کشمیر کی جیلوں میں بند تھے۔ سردار ابراہیم ان لوگوں میں سے تھے جو کشمیر کے مستقبل کے لئے بہت زیادہ سرگرم تھے۔ وہ پاکستان میں مدد حاصل کرنے کے لئے آئے تھے۔ سردار ابراہیم نے بتایا کہ پرامن بات چیت کا وقت گزر چکا ہے اب احتجاج کو طاقت سے دبایا جا رہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کشمیر کے چند ایک حصوں میں لوگ عملاً بغاوت پر اتر آئے ہیں۔ اپنے تحفظ کیلئے اور مہاراجہ کشمیر کو ہندوستان کے حوالے کرنے سے باز رکھنے کے لئے انہیں ہتھیاروں کی ضرورت ہے۔ سردار ابراہیم کا خیال تھا کہ بغاوت شروع کرنے کے لئے 500 رائفلیں درکار ہیں۔ میرے خیال میں ان کا اندازہ خاصا کم تھا مگر رائفلوں کی اتنی کم تعداد کا حصول بھی ممکن نہیں تھا۔

سب سے اہم سوال تو یہ تھا کہ کیا ہماری حکومت (پاکستان) اس سلسلے میں عملی طور پر کچھ کرے گی؟...... بعد میں پتہ چلا کہ اس سلسلے میں کوئی کارروائی پہلے سے ہی ہو رہی ہے۔ کچھ دنوں بعد مسلم لیگ کے ایک لیڈر میاں افتخار الدین لاہور سے مری آئے۔ انہوں نے بتایا کہ انہیں یہ کام سونپا گیا ہے کہ سرینگر جا کر کشمیری لیڈروں سے ملیں اور جائزہ لیں کہ کشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کے امکانات کتنے کچھ ہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اگر کشمیری عوام کو اپنی قسمت اور مستقبل کا فیصلہ کرنے کے حق سے محروم کیا گیا تو مسلم لیگ جو اس وقت پاکستان کی برسراقتدار پارٹی تھی' کشمیری مسلمانوں کو مدد دینے کے لئے انتظامات کرے گی اور کشمیر کو ہندوستان کی جھولی میں گرنے سے روکے گی۔ میاں افتخار الدین کو کوئی زیادہ امید نہیں تھی کہ وہ اپنے مشن میں کامیاب ہونگے۔ البتہ انہیں یہ امید ضرور تھی کہ وہاں جا کر کم از کم مدد کی ضرورت کے متعلق شکوک رفع ہو جائیں گے۔ میاں صاحب نے مجھے بتایا کہ اگر صورتحال خاطر خواہ نہ ہوئی تو وہ ایک پلان تیار کر کے لاہور لے جائیں گے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ میں پلان تیار کروں۔

اس مجوزہ پلان کا مقصد تو بالکل واضح تھا یعنی کشمیر کا الحاق پاکستان سے کرانا ہے مگر یہ بالکل ہی واضح نہیں تھا کہ مسلم لیگ اس پلان میں کیا مدد دے سکے گی۔ میاں افتخار الدین نے بتایا کہ کچھ رقم دی جا سکتی ہے لیکن یہ معلوم نہیں کہ کتنی دی جا سکتی ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ جو بھی کارروائی کی جائے گی' وہ غیر سرکاری ہوگی۔ پاکستان کی فوج یا افسر اس میں عملاً حصہ نہیں لیں گے۔ ان ناکافی اور غیر واضح حقائق کی روشنی میں میں نے اگلا سارا دن سردار ابراہیم اور ان کے ساتھی لیڈروں کے ساتھ صلاح مشورے میں گزارا اور راولپنڈی جا کر پلان تیار کیا۔

ہتھیاروں میں ہم صرف رائفلیں حاصل کر سکتے تھے۔ سوال یہ نہیں تھا کہ ہمیں ضرورت کتنی رائفلوں کی ہے بلکہ سوال یہ تھا کہ ہم کتنی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس وقت میں جی ایچ کیو میں ہتھیاروں اور جنگی ساز و سامان کا ڈائریکٹر تھا اس لئے مجھے اچھی طرح علم تھا کہ پاکستان آرمی کے پاس ہتھیاروں کی پوزیشن کیا ہے' جو اسلحہ بارود ملک کی تقسیم کے نتیجے میں ہمارے حصے میں آیا تھا' اس کا بیشتر حصہ ابھی ہندوستان میں پڑا تھا۔ اگر یہ سارا اسٹاک پاکستان میں ہوتا تو بھی اس میں سے کشمیر کو کچھ نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اس کے لئے کمانڈر انچیف کو حکومت کے حکم کی ضرورت تھی۔ چونکہ کمانڈر انچیف انگریز تھا۔ اس لئے اسے اعتماد میں نہیں لیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا رائفلیں حاصل کرنے کے لئے کوئی اور طریقہ اختیار کرنے کی ضرورت تھی۔

Marfat.com

خوش قسمتی سے پنجاب پولیس کو چار ہزار رائفلیں دینے کے لئے جی ایچ کیو میں حکومت کی پہلے سے ہی منظوری موجود تھی۔ پولیس ان رائفلوں کا کوئی مطالبہ نہیں کر رہی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ پولیس کو ان رائفلوں کی فوری طور پر ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے جو پلان تیار کیا اس کی بنیاد کم از کم چار ہزار رائفلوں پر رکھی۔ میں نے یہ سوچا تھا کہ پولیس کو حکم دلایا جائے گا کہ وہ اپنی چار ہزار رائفلیں لے لے اور کشمیر کے لئے دے دے۔ پھر میں نے مزید ہتھیاروں کے لئے سوچا کہ جو رقم ملے گی' اس سے درے کا بنا ہوا اور غیر ممالک سے اسلحہ خریدا جائے گا۔ میں نے یہ سراغ بھی لگا لیا کہ ایک آرڈیننس ڈپو میں پرانے ایمونیشن کا سٹاک پڑا ہے جسے بیکار کر دیا گیا ہے۔ یہ سٹاک سرکاری طور پر کراچی لے جا کر سمندر میں پھینک دینے کے لئے الگ رکھا ہوا تھا۔ آرڈیننس ڈپو کے کرنل اعظم خان زادہ نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ ایمونیشن کشمیر میں استعمال کے لئے چوری چھپے دے دیں گے۔ جہاں تک فوج کا تعلق تھا اسے اسی اطلاع سے مطمئن کیا جا سکتا تھا کہ ایمونیشن سمندر میں پھینک دیا گیا ہے۔

اس پلان کے انتظام و اہتمام کے لئے تربیت یافتہ اور تجربہ کار افراد کی ضرورت تھی۔ فوج میں سے کسی افسر کو نہیں لیا جا سکتا تھا۔ پاکستان میں دوسری جنگ عظیم والی ''انڈین نیشنل آرمی'' کے کچھ سینئر سابق فوجی افسر موجود تھے جن کے متعلق توقع تھی کہ وہ اس ذمہ داری کو سنبھال لیں گے۔ فوج سے اسلحہ بارود' مواصلاتی نظام' رضا کاروں اور رہنمائی وغیرہ کی صورت میں بہت سی مدد کی ضرورت تھی مگر یہ مدد کھلے بندوں نہیں مانگی جا سکتی تھی۔ کیونکہ اسے کمانڈر انچیف سے جو انگریز تھا اور دوسرے انگریز افسروں سے پوشیدہ رکھنا تھا۔ اس وقت پاکستان آرمی میں انگریز افسر بھی تھے۔ پاکستان آرمی میں البتہ کچھ افسر ایسے تھے جنہیں اعتماد میں لیا جا سکتا تھا۔ وہ بہت سی مدد کرنے کی پوزیشن میں تھے۔ اس وقت تک صرف مجھے ہی مدد کے لئے کہا گیا تھا۔ میں کم و بیش بیس افسروں سے جونیئر تھا۔ بعد میں صورتحال خاصی خراب ہوئی جس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے ہر ایک بات ہر کسی سے پوشیدہ رکھنی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدد کے سلسلے میں بھی نقصان ہوا اور خیر سگالی بھی ختم ہوئی۔ آگے چل کر مخالفت اور چپقلش بھی پیدا ہوئی۔

آخر کار میں نے ایک پلان تحریر کیا جسے ''کشمیر کے اندر مسلح بغاوت'' کا عنوان دیا چونکہ پاکستان کی طرف سے مداخلت اور جارحیت خارج از امکان تھی' اس لئے ہمیں اپنی سرگرمیاں اور کارروائیاں اس پر مرکوز کرنی تھیں کہ کشمیریوں کو کشمیر کے اندر مضبوط کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان کی طرف سے مسلح شہریوں اور فوجی امداد کو کشمیر میں آنے سے روکنا تھا۔ مہاراجہ کی اپنی فوج کی نفری تقریباً نو ہزار تھی۔ اس میں تقریباً دو ہزار مسلمان تھے۔ ان سے ہمیں یہ توقع تھی کہ وہ بغاوت کے خلاف اپنے آپ کو بے اثر بنائے رکھیں گے یا ضرورت پڑی اور موقع ملا تو وہ ریاستی فوج سے نکل آئیں گے۔

ان کے نکل آنے یا بے اثر رہنے سے مہاراجہ کے پاس سات ہزار نفری رہ جاتی تھی۔ کشمیر ایسا علاقہ ہے کہ اس نفری کو بری طرح بکھر جانا تھا اور ہمیں پوری توقع تھی کہ کشمیری اسے بتدریج ختم کر دیں گے۔ لیکن سب سے زیادہ ضروری اقدام یہ تھا کہ مہاراجہ کو بھارت سے فوجی مدد نہ پہنچ سکے اور اس مقصد کے لئے ان تمام راستوں کو بند کرنا ضروری تھا جن سے مدد آنے کا امکان تھا۔ ایسا ایک راستہ کٹھوعہ سے جموں تک تھا جو چھ موسم میں استعمال ہوتا تھا اور ایسے خراب علاقے سے گزرتا تھا جہاں پر عزم گوریلا دستہ مسلح شہریوں کو گزرنے سے روک سکتا تھا۔ باقاعدہ فوج کو روکنا ذرا مشکل تھا لیکن ابھی

Marfat.com

ہندوستان سے فوج کی آمد کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔ ڈیڑھ ایک ماہ کے بعد بارشوں کی وجہ سے اس راستے کو کیچڑ سے بھر جانا تھا پھر دسمبر میں درہ بانہال میں برف باری سے اس راستے کو بالکل ہی بند ہو جانا تھا۔ کشمیری مسلمانوں کے لئے ممکن نہیں تھا کہ اس راستے کو مستقل طور پر مسدود کر دیتے لیکن بارشوں اور برف باری کی رکاوٹوں سے ہمیں تیاری اور مورچہ بندی کا خاصا وقت مل جاتا تھا۔

ہندوستان سے مدد آنے کا دوسرا راستہ فضائی تھا۔ فوجوں کو طیاروں کے ذریعے لا کر سرینگر میں اتارا جا سکتا تھا۔ خوش قسمتی سے سرینگر کا ہوائی اڈہ شہر سے اتنی دور تھا جہاں طیاروں سے اترتی ہوئی فوج کے تحفظ کا فوری انتظام نہیں ہو سکتا تھا۔ رائفلوں سے مسلح صرف دو سو آدمی طیاروں کو اترتے وقت نقصان پہنچا سکتے تھے اور اس طرح ہندوستان سے آنے والی فوج کے لئے تباہ کن رکاوٹ بن سکتے تھے۔ اس وقت تک راستوں کو بند کرنے کا پروگرام محض کاغذی پلان تھا لیکن اس صورت میں کہ بغاوت سرینگر کی وادی سے شروع کی جائے' راستوں کو بند کرنے سے کامیابی حاصل کی جا سکتی تھی۔ لہٰذا ہم جو چار ہزار رائفلیں حاصل کرنے والے تھے ان کے متعلق میں نے یہ تجویز پیش کی ایک ہزار کٹھوعہ روڈ بند کرنے کے لئے اور دو سو سرینگر کے ہوائی اڈے کے لئے دی جائیں باقی جو دو ہزار آٹھ سو رائفلیں بچیں گی وہ پاکستان کی سرحد کے ساتھ کے علاقوں میں تقسیم کی جائیں۔

میاں افتخار الدین سرینگر سے واپس آئے تو میں نے انہیں اپنے پلان کی بارہ کاپیاں دیں۔ چند دنوں بعد مجھے پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خان سے ملنے اور اس پلان کے متعلق تبادلہ خیالات کرنے کے لئے لاہور بلایا گیا۔ میں لاہور پہنچا تو سیکرٹریٹ میں سردار شوکت حیات خان کے ساتھ ابتدائی بات چیت ہوئی۔ معلوم ہوا کہ اس مسئلے کو پہلے ہی خاصی توجہ دی جا چکی ہے اور ایک اور پلان کا خاکہ تیار کیا گیا ہے۔ کانفرنس میں یہ خامی تھی کہ جس طرح ہم فوج میں دو ٹوک انداز میں بات کرتے ہیں۔ وہاں ایسا انداز ناپید تھا مگر یہ اطمینان ضرور ہوا کہ جو لوگ کانفرنس میں شریک تھے وہ اس مسئلے میں گہری دلچسپی لے رہے تھے اور پر جوش طریقے سے اس کام میں شریک تھے میں نے بعض کے ہاتھوں میں اپنے پلان کی نقلیں دیکھیں مگر کچھ ایسا شک ہوتا تھا جیسے انہوں نے پلان پڑھا نہیں۔ بہرحال اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ سردار شوکت حیات خان کے ذہن میں ایک پلان تھا۔

سردار صاحب اپنا پلان اس بنیاد پر بنا رہے تھے کہ سابقہ ''انڈین نیشنل آرمی'' کے افسروں اور جوانوں کی خدمات حاصل کی جائیں اور انہیں مسٹر زمان کیانی کی کمان میں رکھا جائے۔ یہ لوگ پنجاب کی سرحد پار کر کے جنگی کارروائیاں کریں گے۔ راولپنڈی کے شمال کا سیکٹر مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے ایک کمانڈر میجر خورشید انور کی زیر کمان ہوگا۔ پلان کے مطابق جنگی کارروائیاں دو سیکٹروں میں ہوں گی اور دونوں کی کمان سردار شوکت حیات کریں گے۔

میں نے اس پلان کو اپنی تجویز کے ساتھ ملا دیا اور کٹھوعہ روڈ اور سرینگر کے ہوائی اڈے کی اہمیت پر زور دیا۔ سب نے اس خبر پر خوشی کا اظہار کیا کہ ہمیں چار ہزار رائفلیں مل رہی ہیں۔ اس کانفرنس میں مجھے کہا گیا کہ مجھے شام چھ بجے گورنمنٹ ہاؤس میں وزیر اعظم لیاقت علی خان سے ملنا ہے۔

Marfat.com

میں گیا۔ لیاقت علی خان سے جو کانفرنس ہوئی اس میں کئی اور حضرات کے علاوہ وزیرخزانہ غلام محمد مرحوم، میاں افتخار الدین، زمان کیانی، خورشید انور اور شوکت حیات خان موجود تھے۔ مجھے توقع تھی کہ اس کانفرنس میں مجوزہ کارروائی پر آخری بحث و تمحیص ہوگی اور نہایت اہم امور کے متعلق فیصلے صادر کئے جائیں گے لیکن یہ کانفرنس صبح والی کانفرنس سے جو سردار شوکت حیات خان وغیرہ سے ہوئی تھی' زیادہ ہی بے ضابطہ اور محض رسمی ثابت ہوئی۔ جوش و خروش اور گہری دلچسپی تو یہاں بھی تھی مگر سنجیدگی سے کسی مسئلے پر غور نہ کیا گیا نہ کوئی بحث ہوئی۔ ہوسکتا ہے کہ میرے یہاں آنے سے پہلے ان تمام مسائل پر غور و خوض کیا جا چکا ہو جو در پیش تھے۔ میری موجودگی میں رقم کی تقسیم پر زیادہ توجہ دی گئی اور ادھر ادھر کے کچھ نکات پر ہلکے پھلکے سے انداز میں بات چیت ہوئی۔ جنگی نوعیت کی تجویزوں اور مسائل اور ان کے اچھے اور برے پہلوؤں پر کوئی بات نہ ہوئی۔ وزیر اعظم نے مجھ سے پوچھا کہ میں کیا مدد کرسکتا ہوں' میں نے انہیں یقین دلایا کہ میں ہر وہ مدد دوں گا جو میں نے پلان میں لکھی ہے۔ اس کے علاوہ مجھے جو کچھ کہا جائے گا کروں گا۔

ہنسی خوشی کے ایسے ماحول میں جس پر عجیب قسم کی خود اعتمادی تھی' میں نے کوئی اس قسم کا سنجیدہ مسئلہ پیش کرنے سے گریز کیا کہ ایمونیشن اور مواصلاتی نظام کی ضرورت کس طرح اور کہاں سے پوری کی جائے گی۔ اس کانفرنس کے متعلق افسوسناک حقیقت یہ ہے کہ جنگی آپریشن کی نوعیت اور مسائل کے متعلق کانفرنس میں کوئی ایک بھی فرد نہیں تھا جو کچھ جانتا ہو۔ وہ جنگی امور سے پوری طرح ناآشنا تھے۔

کانفرنس کے کمرے سے باہر نکلے تو خورشید انور مرحوم مجھے ایک طرف لے گئے' انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ سردار شوکت حیات خان کا کوئی بھی حکم ماننے کو تیار نہیں۔ میں نے انہیں یہ ذہن نشین کرانے کی پوری کوشش کی کہ اس وقت مکمل تعاون کی ضرورت ہے اور تعاون کے بغیر حالات بگڑ جائیں گے اس لئے وہ اپنے رویے میں بہتر تبدیلی پیدا کریں۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اس صورت حال کو کیسے سنبھالوں کہ سردار شوکت حیات باہر آئے اور مجھے الگ لے جا کر کہنے لگے کہ انہیں خورشید انور پر ذرہ بھر اعتماد نہیں ہے۔ بداعتمادی کی ایسی فضا کو ختم کرنے کے لئے میں نے سردار شوکت حیات خان سے کہا کہ وہ فوراً لیاقت علی خان سے ملیں اور انہیں کہیں کہ وہ خورشید انور کی جگہ کوئی اور آدمی رکھ لیں مگر سردار شوکت حیات خان بولے کہ خورشید انور انہی کا انتخاب ہے اس لئے اسے تبدیل نہیں کرایا جاسکتا۔ لہٰذا بداعتمادی اپنے تمام تر خطرات کے ساتھ شروع میں ہی پیدا ہوگئی۔ سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ مرکزیت کو نقصان پہنچے گا۔ یہ خطرات مجھے بری طرح پریشان کرنے لگے۔ بہرحال اپنے آپ کو اس امید کا قائل کرنا میرے لئے کوئی مشکل نہیں تھا کہ اس تکدر کے باوجود انجام اچھا ہو گا۔ ہم نے ابھی ابھی انگریز کی صد سالہ غلامی سے نجات حاصل کی اور اپنا وطن بنایا تھا۔ ایک ہی مہینے کے اندر کشمیری مسلمانوں کے اُٹھ کھڑے ہونے کی خبر آئی اور سارے ملک میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ ہر جگہ عوام نے جوش و خروش اور جذبے کا مظاہرہ کیا اور وہ خون کی بو سونگھنے لگے۔ ان حالات میں مجھے بہرحال یہ امید تھی کہ ایک مشترک منزل تک پہنچنے کے لئے چھوٹے چھوٹے ذاتی اختلافات آگے چل کر ختم ہو جائیں گے۔

Marfat.com

وزیراعظم کی اس کانفرنس کے بعد میں راولپنڈی چلا گیا۔ کشمیر میں مسلح بغاوت کی پہلی باڑ فائر کی جا چکی تھی اور یہ تحریک تیزی سے زور پکڑ رہی تھی۔ اس مرحلے پر کشمیر کے متعلق میری کوئی ذمہ داری نہیں تھی لیکن میں نے وعدہ کر رکھا تھا کہ ذاتی طور پر جس قدر مدد دے سکا' دوں گا۔ میں نے جی ایچ کیو میں بریگیڈئر شیر خان کو اعتماد میں لے لیا۔ وہ انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر تھے۔ ان کے تعاون سے مجھے وہ تمام اطلاعات اور معلومات مل جاتی تھیں جو فوج کی انٹیلی جنس کے ذریعے حاصل کی جاتی تھیں۔

آرمرڈ کور کے لیفٹیننٹ کرنل مسعود (بعد میں بریگیڈئر ٹامی مسعود) نے پیش کش کی کہ وہ مجھے اس ایمونیشن کے حصول اور اسے کسی سٹور میں رکھنے کے سلسلے میں مدد دیں گے جسے فوج نے بیکار قرار دے دیا ہے۔ اس ایمونیشن کا تفصیلی ذکر پیچھے کر آیا ہوں۔ بعد میں انہوں نے یہ مدد دی کہ ضرورت کے وقت وہ اس ایمونیشن میں سے زمان کیانی اور خورشید انور کو اتنی مقدار دے دیتے جتنی وہ مانگتے تھے۔ ایئر کموڈر جنجوعہ کی وساطت سے پاکستان ایئر فورس سے بھی مدد ملنے لگی۔ یہ مدد گرم کپڑوں، ایمونیشن اور ہتھیاروں کی صورت میں تھی۔ راولپنڈی کے کمشنر خواجہ عبدالرحیم ایک اور جوشیلے انسان تھے جو چندہ' راشن اور ہتھیار جمع کرنے میں مصروف تھے۔ اس کے علاوہ وہ کشمیر کے لئے رضا کار بھی اکٹھے کیا کرتے تھے۔ شوکت حیات خان اور دوسرے حضرات جب راولپنڈی گئے تو میں انہیں خواجہ عبدالرحیم کے گھر پر ہی ملا تھا۔

پولیس سے چار ہزار رائفلیں حاصل کرنے کے انتظامات مکمل ہو گئے۔ بعد میں انکشاف ہوا کہ رائفلوں کی پوری تعداد ان لوگوں تک نہیں پہنچی تھی جن کے لئے یہ رائفلیں حاصل کی گئی تھیں۔ یہ انکشاف بھی ہوا کہ پنجاب پولیس نے ان فوجی رائفلوں کی جگہ جو انہیں فوج سے ملی تھیں' فرنٹیئر کی بنی ہوئی دیسی رائفلیں بہت ہی گھٹیا قسم کی تھیں جنہیں جلدی ہی بیکار ہو جانا تھا۔ قبائلی علاقے میں جو رائفلیں بنائی جاتی ہیں' بظاہر فوجی رائفلوں کا ہی نمونہ ہوتی ہیں۔ دیکھنے میں کوئی فرق نظر نہیں آتا مگر ان کی نالی بہت تھوڑے عرصے میں خراب ہو جاتی ہے۔ لکڑی اور لوہے کے دیگر حصے بھی کمزور ہوتے ہیں۔ قبائلی پٹھان یہ رائفلیں خود بناتے ہیں لیکن باقاعدہ فوج کے خلاف لڑتے ہیں تو یہ رائفلیں استعمال نہیں کرتے۔ ان کی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ ان دنوں اس رائفل کی قیمت صرف ایک روپیہ تھی۔ اس کی بجائے قبائلی اصلی فوجی رائفل ایک ہزار روپے سے خریدتے تھے۔

درے کی بنی ہوئی یہ رائفلیں جب کشمیر میں استعمال ہوئیں تو تصور کیا جا سکتا ہے کہ نتائج کیا ہوئے ہوں گے۔ مجاہدین کے لڑنے کی اہلیت پر بہت ہی برا اثر پڑا۔ یہ دیسی رائفلیں تیزی سے بیکار ہوتی گئیں۔ ہمارے پاس چونکہ مرمت کا کوئی انتظام نہیں تھا اس لئے جو رائفل ایک بار بگڑ جاتی تھی' وہ ہمیشہ کے لئے بے کار ہو جاتی تھی۔

وزیراعظم لیاقت علی خان نے وعدہ کیا کہ وہ ہمیں اٹلی سے کچھ لائٹ مشین گنیں (برین گنیں) منگوا دیں گے۔ یہ جنگ عظیم کے دور سے کسی گودام میں پڑی تھیں۔ ان مشین گنوں کے لئے بہت سارو پیہ صرف کیا گیا۔ جب اٹلی سے اڑھائی سو لائٹ مشین گنیں آئیں تو ہم نے دیکھا کہ یہ مشین گنیں نہیں بلکہ اٹلی کی بنی ہوئی سٹین گنیں ہیں۔ مشین گن کے مقابلے میں سٹین گن کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہوتی۔ اس کا رینج بمشکل دو سو گز ہوتا ہے یعنی صرف دو سو گز تک مار کر سکتی ہے۔ لہٰذا بہت نقصان اُٹھانا پڑا۔ روپیہ بھی ضائع ہوا اور کام کا ہتھیار بھی نہ ملا۔ کشمیر کی جنگ میں سٹین گن محض بیکار تھی۔

Marfat.com

اس دوران ہندوستان نے کشمیر میں ایک فریق کی حیثیت سے دل چسپی لینی شروع کر دی۔ بھارتی حکومت نے پاکستان پر اس قسم کے الزامات عائد کرنے شروع کر دیئے کہ پاکستان کشمیر پر اقتصادی دباؤ ڈال کر اس معاہدے کی خلاف ورزی کر رہا ہے جو اس کے اور کشمیر کے درمیان ہوا تھا اور یہ بھی کہ پاکستان کشمیر کو اپنے ساتھ الحاق کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔ ہندوستان نے اس الزام کی وضاحت میں کہا کہ پاکستان نے کشمیر کی اقتصادی ناکہ بندی اس طرح کی ہے کہ مٹی کا تیل، پٹرول، اشیائے خورد و نوش اور نمک کشمیر میں لے جانے پر پابندی عائد کر دی ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ مواصلاتی نظام بھی منقطع کر دیا گیا ہے اور سیالکوٹ اور جموں کے درمیان جو ریل چلتی تھی، وہ بھی روک دی گئی ہے۔

پاکستان کے وزیر خارجہ نے ان الزامات کا جواب دیتے ہوئے وضاحت کی کہ پاکستان نے کسی قسم کی ناکہ بندی نہیں کی۔ کشمیر تک جو مال پاکستان کے راستے جاتا تھا' وہ اس لئے نہیں جا رہا کہ ریاست کے اندر کے پُرخطر حالات دیکھتے ہوئے ٹرکوں کے ڈرائیور راولپنڈی سے آگے نہیں جاتے۔ چونکہ اس روٹ پر پرائیویٹ ٹرانسپورٹ چلتی ہے اور کوئی گورنمنٹ ٹرانسپورٹ نہیں ہے اس لئے پاکستان اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ ہندوستان نے اقتصادی ناکہ بندی کے علاوہ یہ الزام بھی لگایا کہ پاکستان کشمیر کے اندر حملے کروا رہا ہے اور مسلح پارٹیوں کو کشمیر میں داخل ہونے کے لئے اجازت اور مدد دے رہا ہے۔

ان الزامات کی تردید ہندوستان کے حامی کشمیری لیڈر شیخ عبداللہ نے کر دی۔ ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا (اے پی آئی) کے مطابق شیخ عبداللہ نے 21 اکتوبر کے روز دلی میں ایک اخباری بیان میں کہا ''اس وقت ہندوستان کی ریاستوں، پٹیالہ، بھرت پور وغیرہ میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے کشمیر کے مسلمانوں کے دلوں میں قدرتی طور پر ڈر پیدا ہو گیا ہے۔ کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ وہ ڈرتے ہیں کہ ریاست کا الحاق ہندوستان سے ہو گیا تو وہ خطرے میں پڑ جائیں گے''۔

شیخ عبداللہ نے اس بیان میں یہ بھی کہا ''پونچھ میں جو ہنگامے برپا ہو گئے ہیں' وہ ریاستی حکومت کی غلط پالیسی کا نتیجہ ہیں۔ پونچھ کے لوگوں نے مقامی حاکم کے ہاتھوں اور مہاراجہ کے ہاتھوں بہت مصائب جھیلے ہیں۔ انہی مصائب سے نجات حاصل کرنے کے لئے پونچھ کے لوگوں نے مسلح تحریک شروع کی ہے۔ اسے فرقہ وارانہ فساد نہیں کہا جا سکتا۔ حکومت نے پونچھ میں فوج بھیجی اس لئے وہاں عوام میں افراتفری مچ گئی۔ پونچھ کے زیادہ تر مسلمان انڈین آرمی کے سابق فوجی ہیں۔ جہلم اور راولپنڈی کے لوگوں کے ساتھ ان کے قریبی تعلقات بھی ہیں۔ وہ اپنے بیوی بچوں کو سرحد پار پاکستان لے گئے تھے۔ انہیں وہاں چھوڑ کر وہاں کے لوگوں سے ہتھیار لے کے ریاست میں واپس آ گئے ہیں۔ کشمیر کی موجودہ صورت حال یہ ہے کہ بعض علاقوں سے ریاست کی فوج کو پسپا کر دیا گیا ہے''۔

اکتوبر 1947ء کے تیسرے ہفتے تک کشمیر کے اندر کی سرگرمیوں کی نوعیت اندرونی بغاوت کی سی تھی جس نے آہستہ آہستہ مگر خاطر خواہ کامیابی اور مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ اس کی کامیابی یہ تھی کہ علاقوں پر علاقے مہاراجہ کی حکمرانی سے نکلتے جا رہے تھے۔ چونکہ شیخ عبداللہ بھی مہاراجہ کو ہی ملزم سمجھ رہا تھا اس لئے یوں معلوم ہوتا ہے کہ مہاراجہ ہندوستان سے الحاق کرنے کا فیصلہ کرنے سے گھبرا رہا تھا اور ہندوستان سے مدد لینے کا بھی کوئی مؤثر بہانہ نہیں مل رہا تھا۔

Marfat.com

اچانک صورتحال بالکل بدل گئی جس کی حیثیت انقلاب کی سی تھی۔ یہ انقلابی تبدیلی قبائلی پٹھانوں سے آئی۔ قبائلی 23 اکتوبر 1947ء کے روز کشمیر میں داخل ہوئے اس سے ایسی ہنگامی صورتحال پیدا ہوگئی کہ مہاراجہ نے چار دنوں میں ہندوستان سے الحاق کا اعلان کر دیا۔

مجھے بالکل علم نہیں کہ قبائلیوں کے حملے کا فیصلہ کب کیا گیا تھا اور یہ فیصلہ کس طرح کیا گیا تھا کہ قبائلیوں کا حملہ اس نوعیت کا ہوگا جس نوعیت کا کیا گیا۔ اس سے پہلے میں اسی قدر رستار ہا تھا کہ خورشید انور قبائلیوں کا لشکر اکٹھا کر رہا ہے۔ بھارت کو قبائلیوں کے حملے کی اطلاع ہماری طرف سے ملی تھی۔ ایک انگریزی کتاب ''مشن وِدمونٹ بیٹن'' کے انکشاف کے مطابق 20 اکتوبر کے روز ہندوستان کے انگریز کمانڈر انچیف کو پاکستان کے انگریز کمانڈر انچیف نے بذریعہ تار اطلاع دی تھی کہ کم وبیش پانچ ہزار قبائلی پٹھانوں نے کشمیر پر حملہ کر دیا ہے اور مظفر آباد اور دومیل پر قبضہ کر لیا ہے۔

اب جب کہ ریاست کا الحاق کشمیر سے ہو چکا تھا اور قبائلیوں نے حملہ بھی کر دیا تھا اس لئے ہندوستان سے مدد اور کمک کا آنا لازمی ہو گیا تھا۔ اس کے دو ہی راستے تھے جن کا میں پیچھے تفصیلی ذکر کر آیا ہوں۔ ایک راستہ تو کٹھوعہ روڈ کا تھا جو غیر پختہ تھا اور دوسرا راستہ فضائی تھا جس کے لئے ہوائی اڈہ سرینگر میں تھا۔ میں نے کٹھوعہ روڈ کو بند کرنے کا انتظام کر رکھا تھا۔ میں نے جلدی جلدی میں مختلف لوگوں سے کہا کہ جا کر دیکھیں کہ جن ایک ہزار آدمیوں کو رائفلیں دے کر کٹھوعہ روڈ کے اردگرد مختلف جگہوں پر پوزیشن لینے کے لئے بھیجا تھا اپنی اپنی جگہ پر موجود ہیں یا نہیں۔ کوئی ایک بھی آدمی وہاں موجود نہیں تھا۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ ان ایک ہزار آدمیوں کو پنجاب پولیس کی دی ہوئی جو دیسی رائفلیں دی گئی تھیں بیکار ہو چکی ہیں اور یہ تمام آدمی پاکستان واپس چلے گئے ہیں اور جو دو سو رائفلیں ان لوگوں کے لئے بھیجی گئی تھیں جنہیں سرینگر کے ہوائی اڈے کے اردگرد پوزیشن لے کر بھارتی طیاروں کو لینڈنگ سے روکنا تھا۔ ان آدمیوں کو خورشید انور نے رائفلیں دی ہی نہیں تھیں۔

میں نے بے حد عجلت میں راولپنڈی کے کمشنر خواجہ عبدالرحیم کی مدد سے ایک سو رضا کار جمع کر لئے۔ وہ سب سابق فوجی تھے۔ راولپنڈی سے انہیں سرینگر ہوائی اڈے پر اترے والے ہندوستانی طیاروں پر فائرنگ کے لئے روانہ کیا گیا۔ ان کا کمانڈر مسلم لیگ نیشنل گارڈ کا لطیف افغانی تھا۔ انہیں دریائے جہلم پار کرنا اور پہاڑی علاقے کی دشواریاں عبور کرنی تھیں۔ دشمن کی فوجوں کی موجودگی سب سے بڑی دشواری تھی مگر وقت گزر چکا تھا۔ ان کا وہاں پہنچنا بروقت نہیں تھا۔ وہ سرینگر پہنچ تو گئے مگر تیس جوانوں کی قربانی دے کر اور پہنچے بھی ایسے وقت جب ہندوستانی فوج کی خاصی نفری اڈے پر اتر چکی تھی اور یہ نفری ہوائی اڈے کے دفاع کے لئے مورچہ بند ہو چکی تھی۔

قبائلیوں کے حملے سے متعلق کچھ پیچیدگیاں تھیں۔ ان سے قطع نظر ان کا حملہ کامیاب تھا۔ اس سے کہیں زیادہ کامیاب جتنا کہ میں سپاہی کی حیثیت سے ممکن سمجھتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ ریاست کی فوج سے مسلمان نکل آئے تھے جس سے قبائلیوں کو فائدہ پہنچا تھا اور قبائلیوں کو اس سے بھی فائدہ پہنچا تھا کہ ڈوگرہ فوج کا مورال گر گیا تھا اور وہ اتنا اچھا نہیں لڑے جتنا ان سے متوقع تھا۔ پھر بھی قبائلیوں نے جن جنگی چالوں اور لڑنے کی جس اہلیت کا مظاہرہ کیا یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کا حملہ توقع سے بڑھ کر کامیاب ہوا۔

Marfat.com

قبائلی کشمیر میں پرائیویٹ بسوں میں آئے تھے اور ان کا واحد ہتھیار رائفل تھی۔ ابتدا میں ان کی نفری دو ہزار تھی۔ بہر حال میں نفری کے صحیح اعداد و شمار پیش نہیں کر سکتا۔ انہیں جگہ جگہ اور مختلف اوقات میں جو لڑائیاں لڑنی پڑیں' ان میں سے ہر ایک جگہ اور ہر ایک وقت اس نفری کے چوتھائی حصے کو ہی لڑنا پڑا۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ لاریوں میں آگے جاتے تھے اور جہاں مزاحمت ہوتی تھی وہ لاریوں کو محفوظ جگہ کر کے جنگ لڑنے لگتے تھے۔ وہ دراصل حملہ کرتے تھے۔ ان کے حملے کا طریقہ اپنا ہی تھا۔ ریاستی فوج ان سے دہشت زدہ تھی۔ ریاست کی کوئی بھی یونٹ ان سے جم کر نہیں لڑتی تھی بلکہ جوں ہی چند ایک ڈوگرے ہلاک یا زخمی ہو جاتے تھے پوری پلٹن پیچھے ہٹ جاتی تھی۔ قبائلی آگے بڑھ کر اپنے مخصوص انداز سے ان پر حملہ کرتے تھے۔ اس طرح ریاست کی فوج اپنے زخمیوں اور لاشوں کو چھوڑتی پیچھے ہٹتی جا رہی تھی اور قبائلی آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے تھے۔

قبائلیوں کے حملے سے دلی میں جو گومگو کی کیفیت تھی وہ ختم ہو گئی۔ حملے کے تیسرے روز ہندوستانی حکمرانوں نے چیف آف سٹاف کو حکم دیا کہ کشمیر میں فوج بھیجنے کا پلان تیار کریں۔ انہیں توقع تھی کہ مہاراجہ کی اپیل آ ہی رہی ہو گی۔ اسی روز ہندوستانی فوج کے تین سٹاف آفیسر بذریعہ طیارہ سرینگر گئے۔ اگلی صبح جب قبائلیوں نے سرینگر سے پینتیس میل دور بارہ مولا بھی فتح کر لیا تو مہاراجہ نے فیصلہ کیا کہ اب وہ اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتا۔ مگر فرنٹ کی طرف نہیں گیا بلکہ بوریا بستر لپیٹ کر اپنے دارالخلافے سے بھاگ گیا۔

وہ دو سو میل کا سفر خیریت سے طے کر کے جموں جا پہنچا۔ وہ اس قدر سہما ہوا اور اس کی اعصاب زدگی اس حد تک پہنچی ہوئی تھی کہ رات سونے سے پہلے اس نے اپنے اے ڈی سی سے کہا کہ اگر صبح تک وی پی مینن ہندوستان سے مدد لے کر نہ پہنچے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم سب کچھ کھو چکے ہیں۔ مہاراجہ نے اپنے اے ڈی سی کو حکم دیا کہ اس صورت میں مجھے سوتے میں گولی مار دینا۔ مہاراجہ کی قسمت میں گولی نہیں لکھی تھی۔ وہ جب اے ڈی سی کو گولی مار دینے کا حکم دے رہا تھا۔ ہندوستان میں ایک سو فوج بردار طیارے اگلے روز ہندوستانی فوج کو کشمیر پہنچانے کے لئے تیار ہو رہے تھے۔

اس کے ساتھ ہی سارے برصغیر پر ہیجانی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس کا اثر دور حیدر آباد دکن کی مسلمان ریاست تک بھی جا پہنچا۔ اسی رات کے تین بجے حیدر آباد کے مسلمانوں کے ہجوم نے جس کی تعداد بیس اور تیس ہزار کے درمیان تھی' اس وفد کے ارکان کے گھروں کو گھیر لیا جو وفد کی صورت میں اس مقصد کے لئے دلی جانے والے تھے کہ ریاست حیدر آباد کا الحاق ہندوستان سے کیا جائے۔ پاکستان میں ہر کسی کی نظریں قبائلیوں کے حملے پر لگی ہوئی تھیں۔ ابھی پاکستان میں کوئی بھی حتمی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ مہاراجہ نے ہندوستان سے الحاق کے کاغذات پر دستخط کر دیئے ہیں یا نہیں۔

27 اکتوبر 1947ء کی صبح پاکستان کے لوگوں نے ریڈیو سے یہ دو اہم خبریں سنیں کہ کشمیر کا الحاق ہندوستان سے ہو گیا ہے اور ہندوستان نے کشمیر میں فوجی مداخلت شروع کر دی ہے۔ یہ خبریں اچھی نہیں تھیں کیونکہ ایسی صورتحال سے پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات کے بگڑنے کا خطرہ اور حالات جو پہلے دگرگوں تھے اور زیادہ خراب ہونے کا امکان پیدا ہو گیا تھا۔ لاکھوں مہاجرین ہجرت کے دوران بے پناہ مصائب کا شکار ہو چکے تھے۔ پاکستان کے حصے کا فوجی سامان

Marfat.com

ہندوستان میں رکا پڑا تھا اور جونا گڑھ نے جونہی پاکستان سے الحاق کیا' ہندوستان نے اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ بہت سے لوگ اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ یہ سلسلہ اب رک جائے گا اور کم از کم کشمیر کے متعلق ہندوستان میں عقل اور ہوش سے کام لیا جائے گا اور کشمیر میں جو مسلح بغاوت شروع ہو چکی ہے یہ متعلقہ حکام کو احساس دلا دے گی کہ ریاست کے مستقبل کا صحیح فیصلہ کرنا کس قدر ضروری ہے۔

صاف ظاہر تھا کہ کشمیر کے عوام صرف اس لئے اپنے حقوق سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں تھے کہ ان کے مہاراجہ نے جسے وہ اپنا نمائندہ نہیں سمجھتے اور جس کے خلاف انہوں نے بغاوت کی ابتدا کر دی ہے' ایک کاغذ پر دستخط کر دیئے ہیں۔ اور یہ بھی صاف ظاہر تھا کہ پاکستان کے لوگ اس مسئلے کے متعلق اپنے احساسات اور جذبات سے دستبردار نہیں ہو سکتے تھے اور نہ ہی وہ اپنے ان فرائض کو فراموش کر سکتے تھے جو ان پر کشمیری بھائیوں کی نجات کے لئے عائد ہوتے تھے اس لئے ہر کوئی شدت سے محسوس کر رہا تھا کہ ہندوستان کشمیر میں فوجی مداخلت کر کے ہمیں جنگ کے دہانے پر لا رہا ہے۔

27 اکتوبر 1947ء کی صبح کی پہلی کرنوں کے ساتھ ہی ہندوستان نے طیاروں کے ذریعے اپنی فوج کی تین سو تیس نفری سرینگر میں اتار دی۔ اس وقت قبائلی پٹھان ابھی بارہ مولا میں تھے۔ باقی سارا دن ہندوستان کی فوج سرینگر میں اترتی رہی اور قبائلیوں کا لشکر جو غالباً اس صورتحال سے بالکل بے خبر تھا بارہ مولا میں بے کار پڑا رہا۔ بارہ مولا کے علاوہ ہر جگہ بھارتی فوج کی آمد کی خبر پھیل گئی۔ اس سے غم و غصہ بھی بڑھا اور ہندوستانی فوج کو روکنے کا عزم بھی پیدا ہوا۔

اسی شام آزاد کشمیر کی پہلی حکومت وجود میں آئی جس کے صدر سردار ابراہیم مقرر ہوئے یہ آزاد حکومت کشمیر کے ان علاقوں پر محیط تھی جو آزاد کرائے جا چکے تھے۔ اس لمحے سے جب آزاد کشمیر حکومت کا اعلان ہوا کشمیر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ نئی حکومت کو جس اولین مسئلے سے سامنا ہوا یہ تھا کہ اب کشمیر کی آزادی کی جنگ ہندوستان کی باقاعدہ فوج کے خلاف لڑی جائے گی اور یہ جنگ طویل ہوگی۔

پاکستان میں اسی شام وزیر اعظم نے کشمیر کے ہندوستان سے الحاق سے اور کشمیر میں ہندوستانی فوج کی مداخلت سے جو صورتحال پیدا ہو گئی تھی اس پر غور کرنے کے لئے لاہور میں ایک غیر سرکاری کانفرنس بلائی۔ اس میں دیگر اصحاب کے علاوہ کرنل سکندر مرزا (بعد میں پاکستان کے گورنر جنرل) چوہدری محمد علی (وزیر اعظم کے سیکرٹری جنرل) صوبہ سرحد کے وزیر اعظم عبدالقیوم خان، پنجاب کے وزیر اعظم نواب ممدوٹ' بریگیڈئر شیر خان اور میں شریک ہوئے۔

میں نے اس کانفرنس میں یہ تجویز پیش کی کہ جموں پر قبضہ کرنے کی کوشش کی جائے تا کہ اس واحد سڑک کو بند نہ کیا جا سکے جس سے ہندوستان کشمیر میں مزید فوج' سپلائی اور کمک بھیجے گا۔ میں نے ایسا مشورہ نہیں دیا کہ پاکستان آرمی کو اس مقصد کے لئے استعمال کیا جائے یا حکومت پاکستان براہ راست اس مہم سے وابستہ ہو جائے۔ میرا مشورہ یہ تھا کہ قبائلیوں کو اجازت دی جائے کہ وہ جموں پر حملہ کر کے اس علاقے پر قبضہ کر سکیں۔ میرا خیال تھا کہ ایک ایک ہزار نفری کے تین لشکر استعمال کئے جائیں تو کافی ہوں گے میں نے یہ پیش کش بھی کہ ان کی قیادت میں خود کروں گا۔

ہندوستان کی فوجی مداخلت سے جموں فوراً ہی نہایت اہم مرکزی نقطہ بن گیا تھا۔ ہندوستان کے لئے کشمیر میں داخل ہونے کا یہی ایک راستہ تھا جو جموں سے گزرتا تھا۔ ہندوستان سے آنے والی تمام تر کمک کو یہاں جمع ہونا تھا۔ اس

Marfat.com

اجتماع گاہ سے کمک کو شمال کی طرف بڑھنا' پھیلنا اور جنگ کو طول دینا تھا اور وہیں سے اس ہندوستانی کمک کو مغرب کی طرف بھی جانا تھا۔ جس کے لئے نوشہرہ سے گزرنے والی سڑک تھی۔ اس سے راجوڑی اور پونچھ کے علاقوں میں آزاد کشمیر کو خطرہ تھا۔ اس وقت یہ علاقے عملاً مجاہدین کشمیر کے قبضے میں تھے۔ اس کے علاوہ پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ چھڑ جانے سے جموں کا فوجی اڈہ جو سیالکوٹ کے سر پر واقع تھا پاکستان کی سلامتی کے لئے شدید خطرہ بن سکتا تھا۔

اگر ہم جموں کی ناکہ بندی کر لیتے تو اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم نے ایک سنگین خطرے کو سر اٹھاتے ہی دبا لیا ہے اور اسے کھلا چھوڑ دینے سے آزاد کشمیر کے مجاہدین کی جنگ آزادی کی مثال اس تالاب کی سی ہوتی جس میں ایک ندی گر رہی ہو اور تالاب کو ایک پیالے سے خالی کیا جا رہا ہو۔ مجھے یہ احساس بھی تھا کہ قبائلیوں کے لئے جموں پر قبضہ کرنے کا امکان کم تھا لیکن مجھے یہ توقع ضرور تھی کہ ان کے حملے سے مہاراجہ کشمیر جس طرح سرینگر سے بھاگ کر جموں میں پناہ گزیں ہوا تھا۔ اسی طرح جموں سے بھی بھاگ جائے گا۔ بہرحال مہاراجہ جموں سے بھاگ جاتا یا وہیں رہتا' البتہ اور بہت سے لوگ قبائلیوں کے حملے سے وہاں سے ضرور بھاگ اٹھتے اور ہندوستان کا رخ کر لیتے۔ اس بھگدڑ سے یہ واحد راستہ تھوڑی سی دیر کے لئے تو ضرور بند ہو جاتا۔ کم از کم ایک دفعہ جموں کے مغرب کے پہاڑی علاقے میں داخل ہو کر قبائلی ہندوستانی فوج کو راجوڑی اور پونچھ کے مرکزی علاقوں تک پہنچنے سے ضرور روک لیتے۔

کانفرنس میں عبدالقیوم خان اور نواب ممدوٹ کے سوا ہر کسی نے میری اس تجویز کی مخالفت کی۔ لہٰذا اسے ترک کر دیا گیا۔ سب یہ خطرہ محسوس کر رہے تھے کہ جموں پر حملے سے ہندوستان مشتعل ہو کر پاکستان پر حملہ کر دے گا۔ ایسا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا۔

کوئی بھی نہیں چاہتا تھا کہ دونوں ملکوں کے درمیان جنگ ہو لیکن ایسی بہت سی وجوہات موجود تھیں جن کی بنا پر ہندوستان حملہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ قبائلی کشمیر کے اندر 80 میل تک پہنچ چکے تھے اور وہ پاکستان سے گئے تھے۔ ہندوستان کو بھی کا یقین تھا (جو بے بنیاد تھا) کہ قبائلیوں نے میرپور' پونچھ' کوٹلی' جھانگر' نوشہرہ اور بھمبر کا محاصرہ کر رکھا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر ہندوستان پاکستان پر حملہ کرنا چاہتا تو اس کے پاس حملے کے لئے معقول بہانے موجود تھے مگر اس نے صرف اس لئے ایسے سنگین اقدام کی نہیں سوچی تھی کہ فوجی لحاظ سے وہ ابھی اتنا طاقتور نہیں تھا۔ اس کی افواج کی تنظیم نو ہو رہی تھی لہٰذا اس کی افواج کھلی جنگ کی تیاری کی حالت میں نہیں تھیں' اس کے علاوہ اسے ملک کے اندر کئی مسائل اور پریشانیوں کا سامنا تھا۔ ہندوستانی حکومت کو اس خطرے کا بھی احساس تھا کہ پاکستان پر حملہ کیا تو قبائلی پٹھان مشرقی پنجاب پر یلغار کر دیں گے۔ مشرقی پنجاب کے عوام میں پہلے بارہ مولا کے متعلق مبالغہ آمیز خبروں نے خوف و ہراس پھیلا رکھا تھا۔ انہیں اس قسم کی خبریں ملی تھیں کہ پٹھانوں نے بارہ مولا پر حملہ کیا تو چودہ ہزار ہندوؤں اور سکھوں میں سے صرف تین ہزار زندہ نکل سکے تھے۔

لاہور میں اس رات جو کانفرنس ہوئی' اس میں سوچ بچار کا رخ ادھر ہی تھا کہ ہندوستان کو پاکستان پر حملہ کرنے کا جواز مہیا نہ کیا جائے۔ یہ پیش بینی تو کوئی بھی نہ کر سکا کہ چند ہی ہفتوں بعد قبائلی اپنے طور پر جموں کے محاذ پر لڑ رہے ہوں گے۔ قبائلیوں نے ایسے ہی کیا مگر کامیابی کا وقت گزر چکا تھا۔ اب حملہ محض بیکار اور نقصان دہ تھا۔ بہرحال کانفرنس میں جن

Marfat.com

لوگوں نے ہندوستان کے حملے کے خطرے کا اظہار کیا تھا انہوں نے دیکھ لیا کہ قبائلیوں کے جموں پر حملے سے ہندوستان نے پاکستان پر حملہ نہیں کیا۔ اور چند ماہ بعد پاک فوج کی کئی ہزار باقاعدہ نفری کی ہندوستانی فوج کے ساتھ کشمیر کے اندر ٹکر ہوئی پھر بھی ہندوستان نے پاکستان پر حملہ نہیں کیا۔ کاش' قبائلیوں کو جموں پر بروقت حملہ کرنے کی اجازت دی دے جاتی تو کشمیر کا نقشہ آج بہت مختلف ہوتا۔

قارئین کے لئے یہ انکشاف جو کشمیر کی جنگ کے چند سال بعد ہوا تھا، یقیناً دل چسپ ہوگا کہ اسی رات جس رات پاکستان کے وزیر اعظم لاہور میں کانفرنس میں جموں پر حملے کی تجویز مسترد کر رہے تھے۔ قائد اعظم نے حکم دے دیا تھا کہ جموں پر حملہ کر دیا جائے۔ یہ انکشاف ایک برطانوی مصنف ایلن کیمبل نے اپنی کتاب ''مشن ود مئونٹ بیٹن'' کے صفحہ 266 پر کیا تھا۔ اس وقت پاکستان آرمی کا کمانڈر انچیف برطانوی جنرل مزروی تھا۔ اس کا عارضی غیر حاضری میں قائمقام کمانڈر انچیف جنرل گریسی تھا۔ ایلن کیمبل نے اپنی کتاب میں قائد اعظم کے حکم کے متعلق لکھا کہ قائد اعظم کا یہ حکم کہ جموں پر حملہ کیا جائے۔ ملٹری سیکرٹری کی معرفت جنرل گریسی کو ملا تھا لیکن جنرل گریسی نے جواب دیا تھا کہ وہ سپریم کمانڈر کی منظوری کے بغیر فوج کو ایسا کوئی حکم نہیں دے سکتا۔ اس وقت فیلڈ مارشل آکنلیک دونوں ملکوں کی فوجوں کا سپریم کمانڈر اور دلی میں مقیم تھا۔ ایلن کیمبل کے یہ الفاظ کچھ غلط فہمی پیدا کرتے ہیں خیال کیا جاتا ہے کہ جنرل گریسی نے قائد اعظم کو یہ حکم واپس لینے پر قائل کر لیا ہوگا اور وجوہات یہ پیش کی ہوں گی کہ پاکستان آرمی ابھی منظم نہیں ہوئی اور یہ کہ ایک غیر جانبدار باؤنڈری فورس ابھی تک پنجاب میں موجود ہے اور یہ بھی کہ اگر دونوں مملکتوں میں جنگ چھڑ گئی تو حکومت برطانیہ تمام برطانوی افسروں کو واپس بلا لے گی۔

وہ تو جو ہوا سو ہوا۔ ہم آج اس کا نتیجہ دیکھ رہے ہیں۔ جموں کو چھوڑ دیا گیا۔ ہم نے تو جموں کو چھوڑ دیا مگر جموں نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔ وہاں سے شمالی کشمیر اور مغربی کشمیر میں دھڑا دھڑ' بلا روک ٹوک ہندوستان کی فوجیں جاتی رہیں۔ ہم نے جموں سے توجہ ہٹا لی اور اس کی جنگی اہمیت کو نظر انداز کر دیا تو اس سے ہندوستان نے یہ فائدہ اٹھایا کہ اپنی فوجیں وہاں جمع کر کے طیاروں کے ذریعے زیادہ سے زیادہ فوج سرینگر پہنچائی اور محاذ مضبوط کر لئے۔

اس وقت سے ہمارے ہاں یہ دلیل دی جا رہی ہے کہ اگر ہم جموں پر حملہ کرتے تو یہ ایک جوا ہوتا اور ہم پاکستان کے وجود کو بازی پر لگا دیتے۔ میں نے کبھی بھی اس دلیل سے اتفاق نہیں کیا۔ یہ ایک خطرہ ضرور تھا لیکن یہ خطرہ ہم سوچ سمجھ کر مول لے سکتے تھے۔ بہر حال یہ خطرہ جوا نہیں تھا۔ فوجی نوعیت کے جوئے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ جیت جاتے ہیں یا ہار جاتے ہیں۔ جیتنے کی صورت میں آپ غیر متوقع حد تک بھی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں اور ہارنے کی صورت میں آپ اتنا زیادہ ہار سکتے ہیں کہ آپ کا نام و نشان ہی مٹ سکتا ہے۔ اسے جواء کہتے ہیں۔ فوج کو ایسا جواء اس وقت تک نہیں کھیلنا چاہئے جب تک اسے یقین نہ ہو جائے کہ صورتحال اس حد تک دگرگوں ہے کہ شکست ہی شکست ہے۔ ایسی صورتحال میں یا تو بازی لگائی جاتی ہے یا دشمن کے آگے ہتھیار ڈالے جاتے ہیں۔

اس کے برعکس سوچ سمجھ کر خطرہ مول لینے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر جیت گئے تو کامیابی توقعات سے بڑھ کر بھی ہو سکتی ہے اور اگر ہار گئے تو چونکہ ہارنے کے متعلق پہلے سے سوچ بچار کی ہوئی ہوتی ہے اس لئے نام و نشان مٹنے کا خطرہ

Marfat.com

نہیں ہوتا۔فوج دوسرا معرکہ لڑنے کے لئے سنبھل سکتی ہے۔اسے کہتے ہیں خطرے کا جائزہ لے کر اسے سوچ سمجھ کر خطرہ مول لینا۔تاریخ کے عظیم کمانڈروں نے ایسے خطرے مول لے کر بڑی بڑی طاقتور فوجوں کو شکست دی ہے۔

ان دلائل کی روشنی میں دیکھتے ہوئے جموں پر ہمارا حملہ جواء نہیں تھا۔اگر ہم جموں پر قبضہ نہ کر سکتے تو بھی کچھ اور فوائد تھے جو ہم حاصل کر لیتے۔ ہمارے ایک حملے سے جو اگر ناکام بھی ہو جاتا' دشمن زیادہ سے زیادہ فوج کو کشمیر کے دوسرے علاقوں میں بھیجنے کی بجائے جموں میں ہی رکھتا کیونکہ اسے ہر وقت ہمارے دوسرے حملے کا خطرہ لگا رہتا۔اس طرح ہم جموں کے لئے ایک مستقل خطرہ بن کر اسکی فوج کی زیادہ تر طاقت کو جموں میں پابند رکھتے۔اس سے ہماری بہت سی سردردی ختم ہو جاتی اور اگر جموں پر حملے کے نتیجے میں پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ چھڑ جاتی تو پاکستان کے مٹ جانے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔یہی ایک دلیل دی جاتی رہی ہے کہ اس وقت ہندوستان کی فوج ہماری فوج سے دگنی تھی مگر یہ دلیل دینے والے تاریخ کو نہیں دیکھتے۔قوموں نے اپنے سے کئی گنا طاقتور فوجوں کو بدترین حالات میں شکست دی ہے۔ ایسی مثالوں سے تاریخ بھری پڑی ہے۔

اگر ہندوستان پاکستان پر حملہ کر ہی دیتا تو وہ پوری فوج کو پاکستان کے خلاف استعمال کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔اسے حیدرآباد دکن میں بھی ایک دشمن فوج کی طرف سے خطرہ تھا۔اگر ہندوستان مشرقی پاکستان کی طرف محاذ کھولتا تو اسے کشمیر سے دستبردار ہونا پڑتا اور ہندوستانی حکمرانوں کو یہ بھی احساس تھا کہ مشرقی پنجاب ہماری زد میں ہے اور ہم کسی بھی وقت مشرقی پنجاب میں دو لاکھ مسلح قبائلی پٹھانوں کا سیلاب چھوڑ سکتے ہیں ہندوستانی حکمرانوں کے لئے اس سیلاب کا تصور ہی ایسا تھا کہ ان کا دفاع مفلوج ہو جاتا تھا۔

باقی رہا اقوام متحدہ یا عالمی رائے کا خطرہ ہمیں ادھر سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ہندوستان پہلے ہی جونا گڑھ پر اس کیفیت میں جارحانہ قبضہ کر چکا تھا۔جب یہ ریاست قانونی طور پر پاکستان سے الحاق کر چکی تھی۔نہ اقوام متحدہ نے کچھ کیا تھا نہ عالمی رائے ہندوستان کا کچھ بگاڑ سکی تھی۔اسی طرح پاکستان اگر کشمیر میں ایسی کارروائی کرتا تو اقوام متحدہ اور عالمی رائے یقیناً خاموش رہتی۔لہٰذا یہ کہنا کہ جموں پر ہمارا حملہ ایک جواء تھا ایک بے بنیاد دلیل ہے۔

بہرحال اس رات وزیراعظم کی کانفرنس میں میری اس تجویز کو مان لیا گیا کہ ایک لبریشن کمیٹی نامزد کی جائے جو کشمیر کی آزادی کی جدوجہد کو منظم کرے۔کانفرنس رات دو بجے ختم ہوئی اور مجھے کہا گیا کہ میں صبح وزیراعظم سے پھر ملوں۔

صبح کے وقت مجھے بتایا گیا کہ میں لبریشن کمیٹی کا فوجی ممبر ہوں گا۔کمیٹی کے فرائض سنبھالنے کے لئے مجھے جی ایچ کیو کی ڈیوٹی سے سبکدوش کر دیا گیا اور وزیراعظم کا فوجی مشیر بنا دیا گیا۔مجھے راولپنڈی میں رہنا تھا اور میرے لئے لازمی یہ تھا کہ کشمیر کے متعلق اپنی تمام تر سرگرمیوں کو فوج کے انگریز افسروں سے پوشیدہ رکھوں۔ابھی جی ایچ کیو کے کسی افسر یا جوان کو کشمیر میں عملاً جنگ میں شریک نہیں ہونا تھا۔لبریشن کمیٹی کے دوسرے ممبر یہ تھے: سردار ابراہیم، خواجہ عبدالرحیم، مسٹر غلام محمد پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کا میجر یوسف جسے قبائلیوں سے وابستہ رہنا تھا۔

میں نے وزیراعظم لیاقت علی خان سے وضاحت چاہی کہ ہمارا فوجی نوعیت کا کام کیا ہوگا۔وزیراعظم نے کہا کہ ان کا مقصد یہ ہے کہ کشمیر میں تین ماہ تک جنگ جاری رکھی جائے۔اس سے ہمیں سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لئے گفت

Marfat.com

وشنید اور دیگر ذرائع بروئے کار لانے کا وقت مل جائے گا۔ مجھے سب سے زیادہ پریشانی ایمونیشن کی تھی۔ ہم چونکہ جموں سے توجہ ہٹا چکے تھے اس لئے ہندوستان وہاں مضبوط فرجی اڈہ اور اسلحہ بارود کا ذخیرہ بنا رہا تھا۔ اب ہمارے مجاہدین کو ہندوستان کی باقاعدہ فوج کے خلاف لڑنا تھا۔ جب کہ اس فوج کے پاس ایمونیشن کی کوئی کمی نہیں تھی۔ باقاعدہ فوج کے ہر جوان کے پاس ایک سوراؤنڈ ایمونیشن ہوتا تھا۔ ایک سوراؤنڈفی جوان بریگیڈ ریزرو میں ہوتا تھا اور ایک سوراؤنڈفی جوان ڈویژن ریزرو میں ہروقت رکھا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں ایمونیشن تیار کرنے والی فیکٹری چل رہی تھی۔

اس کے مقابلے میں اگر ہم قبائلیوں کو ملا کر دس ہزار آدمی جنگ میں بھیجتے اور ہر ایک آدمی کو پورے ایک مہینے کے لئے ایک سوراؤنڈ دیتے تو تین مہینوں کے لئے ہمیں تیس لاکھ راؤنڈ ایمونیشن کی ضرورت تھی۔ اس وقت ہمارے پاس راولپنڈی میں جمع کیا ہوا تقریباً دولاکھ راؤنڈ تھا جس میں سے آدھا وہ قبائلی مانگ رہے تھے جو سرینگر کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے۔ 28 اکتوبر 1947ء کی شام میں بہت جلدی میں یہ دیکھنے کے لئے راولپنڈی پہنچا کہ قبائلیوں نے جو ایمونیشن مانگا تھا وہ انہیں مل گیا ہے یا نہیں۔

اگلی صبح جو 29 اکتوبر کی صبح تھی' میں صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے سرینگر روانہ ہوا۔ میرے ساتھ اخباری نمائندہ علی اختر مرزا بھی تھا۔ سورج غروب ہونے سے ذرا پہلے ہم کوہالہ کے مقام پر کشمیر کی سرحد میں داخل ہوئے۔ دن کے وقت ہمیں کشمیر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی کیونکہ ہندوستانی طیارے دن بھر فضا میں منڈلاتے رہتے تھے ان کی وجہ سے سڑک ویران رہتی تھی۔ ہم شام کو وہاں پہنچے تو لوگ اِدھر اُدھر گھومنے پھرنے لگے تھے مگر سرگرمی ابھی عروج پر نہیں پہنچی تھی۔ بیس میل تک ہم نے سفر خاموشی سے طے کیا۔ دریائے جہلم ہمارے بائیں طرف تھا اور دائیں طرف پہاڑیاں تھیں جن پر شام کا دھندلکا چھاتا چلا جا رہا تھا۔ کوہالہ سے اتنی دور آگے کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ دور دور جھونپڑے نظر آ رہے تھے مگر روشنی کہیں نہیں تھی، کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ ماحول چپ چاپ تھا۔ جنگ کے کوئی آثار نہیں تھے۔ ماحول اور فضا میں پُراسرار امن وامان اور سکوت تھا۔

ہم مظفر آباد پہنچے تو منظر اس طرح یکلخت بدل گیا جیسے کسی نے پردہ اُٹھا دیا ہو۔ قبائلیوں کے قافلے سرینگر کی طرف جا رہے تھے۔ یہ منظر ایسا تھا جیسے کسی نے تاریخ کا بہت پرانا دور ہمارے سامنے رکھ دیا ہو۔ میرا ذہن کئی صدیاں پیچھے چلا گیا جب ہمارے آباؤ اجداد سرحد کے کوہساروں' وادیوں اور درّوں سے گزر کر آیا کرتے تھے۔ 29 اکتوبر 1947ء کی شام مجھے وہی نظر آ رہا تھا۔ ویسی پہاڑیاں تھیں۔ ویسا ہی جذبہ تھا۔ عزم بھی آباؤ اجداد جیسا تھا۔ یہ قبائلی مجھے اپنے آباؤ اجداد کی طرح نظر آ رہے تھے۔ ان کا لباس' ان کا انداز صدیوں پرانا تھا اور وہ اپنے دادا پڑدادا کی طرح اَن دیکھے' اجنبی دیس کی طرف بڑھے چلے جا رہے تھے۔ صدیوں پہلے وہ پیدل چلتے تھے یا گھوڑوں پر آتے تھے۔ اب وہ کنوائے میں جا رہے تھے مگر یہ ایسا کنوائے تھا جسے کسی نے منظم نہیں کیا تھا نہ کوئی اس کا کمانڈر تھا۔ کشمیر کے اندر' مظفر آباد میں بے شمار لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ کیونکہ انہیں کشمیر کے دارالخلافے سرینگر تک جانا تھا جہاں تک صرف ایک سڑک جاتی تھی اور اس کے لئے مظفر آباد جانا ضروری تھا۔

ہندوستان سے کشمیر کے الحاق کا تیسرا دن تھا۔ شمال مغربی سرحدی صوبے کے قبائلیوں نے چھ روز پہلے اسی مقام

Marfat.com

سے کشمیر پر حملے کا آغاز کیا تھا۔ان کے حملے کے چوتھے روز (29 اکتوبر 1947ء) کشمیر کا مہاراجہ دارالخلافے سے بھاگ گیا تھا۔ اگلے ہی روز ہندوستان نے فوجی مداخلت کی تھی اور اس کی فوجیں طیاروں کے ذریعے سرینگر میں اُترنی شروع ہوئی تھیں۔

اب قبائلیوں کی مزید نفری جنگِ آزادی میں شریک ہونے کے لئے سرینگر کی سمت جا رہی تھی۔ لاریاں کھچا کھچ بھری ہُوئی تھیں۔ کسی لاری میں چالیس پٹھان سوار تھے، کسی میں پچاس اور بعض میں تو ستر ستر ٹھنسے ہوئے تھے۔ لاریوں کے باہر بھی آدمی لٹک رہے تھے۔ چھتوں پر بھی بیٹھے تھے اور انجنوں پر بھی، ان میں نوجوان بھی تھے اور سفید داڑھیوں والے بوڑھے بھی۔ ان میں شاید ہی کوئی اچھے کپڑوں میں ملبوس ہو۔ اکثریت پھٹے پرانے کپڑوں میں لپٹی ہوئی تھی اور بعض کے پاؤں میں جوتے بھی نہیں تھے لیکن ان کے چہرے مہرے اور قد وقامت میں جاذبیت تھی۔ وہ خُوبرو تھے اور ان کی آنکھوں میں عزّت کی تڑپ اور چمک تھی۔

ان کے ہتھیار مختلف النوع تھے۔ کسی کے پاس برطانوی رائفلیں تھیں، کسی کے پاس فرانسیسی، بعض کے پاس جرمنی کی بنی ہوئی رائفلیں تھیں اور بہت سے ایسے تھے جو سرحد کی بنی ہُوئی دیسی رائفلیں اُٹھائے ہوئے تھے۔ ایسے بھی تھے جن کے پاس لمبی اور چھوٹی نالی والے پستول تھے اور کچھ شکاری بندوق سے مسلح تھے۔ اور ان میں ایسے افراد بھی تھے جن کے پاس خنجر کے سوا کوئی ہتھیار نہ تھا۔ وہ اسلحہ کے بغیر ہی لڑنے جا رہے تھے۔ کہتے تھے کہ اسلحہ دشمن سے ۔۔ ل گے۔

ان کی ٹرانسپورٹ بھی رنگا رنگ تھی۔ اچھی قسم کی بسیں بھی تھیں، پرانی قسم کی لاریاں بھی اور کوئی بھی چیز جس کے نیچے چار پہیے اور اس سڑک پر لڑھکنے کی طاقت تھی، پٹھان کنوائے میں شامل تھی۔ میں نے اس میکانکی قافلے میں ایک ایسی کار دیکھی جس کی چھت نہیں تھی، بتیاں نہیں تھیں، بریکیں بھی مشکوک تھیں اور یہ ایک کار کی طرح کا ڈھانچہ تھا جو چار پہیوں پر چلا جا رہا تھا۔ اس پر نو آدمی سوار تھے اور اس پر جھنڈا لگا ہُوا تھا۔ اس پرچم بردار کارنمائشے میں سوات کی باقاعدہ فوج کا ہیڈکوارٹر جا رہا تھا اس قافلے کی رفتار بہت سست تھی۔ صدیوں پرانے انجن اپنی طاقت سے کہیں زیادہ بوجھ بڑی ہی مشکل سے گھسیٹ رہے تھے۔ منزل بہت دور تھی جہاں تک اس رفتار اور ایسے قدیم انجنوں سے پہنچنے کے لئے طویل مدت درکار تھی۔ بعض گاڑیوں کے بارے میں تو وثوق سے کہا جا سکتا تھا کہ منزل پر کبھی بھی نہیں پہنچ سکیں گی لیکن ان آدمیوں کو جو اُن میں سوار تھے کوئی پرواہ نہیں تھی کہ گاڑیاں منزل پر پہنچیں نہ پہنچیں۔ انہیں اپنے متعلق اعتماد تھا کہ وہ منزل کو جالیں گے خواہ کیسی بھی ذریعے سے پہنچیں۔ وہ لڑنے آئے تھے۔ ان کی رگوں میں جو خون رواں دواں تھا اس خون میں صدیوں پرانی روایات رَچی بسی ہوئی تھیں۔ حملوں، مہم جوئی اور خطرات سے نبرد آزمائی سے بھرپور روایات وہ منزل پر پہنچنا جانتے تھے۔ دُشواریوں پر غالب آنے کا ڈھنگ جانتے تھے۔ وہ ان دقیانوسی لاریوں کے محتاج اور پابند نہیں تھے۔ ان کا جوش اور جذبہ عروج پر تھا۔ لاریوں کے بے ہنگم شوروغل اور داویلے میں قبائلیوں کے جنگی ترانے گانے اور ڈھول کی تھاپ صاف اور بلند سنائی دے رہی تھی۔ وہ جنگی ترانے گاتے اور ڈھول بجاتے جا رہے تھے۔

کشمیر کی شام جوش وخروش سے مرتعش تھی۔ وہ اُن شاموں میں سے ایک تھی جنہیں تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ کیونکہ ایسی شام کے بطن سے آزادی کے اجالے جنم لیا کرتے ہیں۔ پٹھانوں کا جنگجو قافلہ سرینگر کی بلندیوں کی طرف

Marfat.com

عظمت کی بلندیوں کی سمت چلا جا رہا تھا۔

ہم جلدی میں تھے۔اس کنوائے کی رفتار سے ہم تو نہیں جا سکتے تھے۔سڑک پر کنوائے کا قبضہ تھا۔ہم نے بڑی مشکل سے راستہ بنایا اور کچھ دیر اور دقت کے بعد ہی ہمیں کھلی سڑک ملی۔مظفر آباد سے پچاس میل ڈور اُوڑی کے مقام پر پل ٹوٹا ہوا پایا۔یہ ریاست کشمیر کی فوج نے مظفر آباد سے پسپا ہوتے ہوئے تباہ کیا تھا۔تھوڑے ہی دن پہلے قبائلیوں نے مظفر آباد پر حملہ کیا تھا۔مہاراجہ کی فوج جم نہ سکی اور پسپا ہوگئی۔قبائلی تعاقب میں تھے۔اسی لئے ڈوگروں نے یہ پل توڑ دیا تھا۔وہاں کے مقامی لوگوں نے پٹھانوں کی مدد اس طرح کی کہ پہاڑ کاٹ کر ایک میل لمبا متبادل رستہ بنا دیا تا کہ پٹھان اپنے بھاگتے شکار کو جا لیں۔

ہم نے بل کھاتی سڑک پر مزید تیس میل طے کر لئے اور مظفر آباد سے اسی میل دور چلے گئے۔اب ہم پہاڑیوں سے نکل گئے تھے اور بارہ مولا میں تھے جو وادی کشمیر کا دروازہ ہے۔بارہ مولا باغوں اور سکولوں کا شہر ہوا کرتا تھا۔وہاں بس سٹیشن بھی تھا اور دریائی ٹرانسپورٹ کا سٹیشن بھی۔دکانوں اور چھوٹے بڑے ہوٹلوں نے یہاں نرالی سی رونق بنا رکھی تھی۔بارہ مولا میں ہر وقت گہما گہمی رہتی تھی۔بڑی دل کش اور خوشگوار جگہ تھی۔مگر ہم وہاں پہنچے تو ایسے لگا جیسے ہولناک زلزلے نے اسے تباہ و برباد کر دیا ہو۔یہ تو حسین بارہ مولا کا ڈراؤنا بھوت تھا۔پُر رونق شہر کی بدروح تھی۔دکانیں خالی، ہوٹل ویران، ان کے مالک بھی نہیں تھے۔کھڑکیوں اور دروازوں کے کواڑ غائب، سڑکوں پر اور ہر طرف اینٹیں، پتھر اور کاغذ بکھرے ہوئے تھے۔یہ تباہی دونوں فریقوں نے مچائی تھی۔پہلے مہاراجہ کی فوج نے پسپا ہوتے ہوئے مکانوں اور دکانوں کو بارود اور گولوں سے تباہ کیا تا کہ قبائلیوں کے راستے مسدود ہو جائیں۔پھر قبائلی طوفان کی طرح آئے اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔آخر انڈین ایئر فورس نے شہر پر بموں اور راکٹوں کی بارش برسا کر تباہی مکمل کر دی۔کہیں کہیں آگ لگی ہوئی تھی۔ہم وہاں کا جائزہ لینے کے لئے رک گئے اور ادھر ادھر گھومنے پھرنے لگے۔بڑی سڑک سے ہٹ کر شہر کا جو حصہ تھا وہ زیادہ تباہ نہیں ہوا تھا۔وہاں کے رہنے والے بہت سے لوگ ابھی وہیں تھے۔

قبائلی یہاں 21 اکتوبر کے روز پہنچے تھے۔اس روز تک مہاراجہ نے ریاست کا الحاق کشمیر سے نہیں کیا تھا اور ہندوستان کی فوجیں ابھی آنا شروع نہیں ہوئی تھیں ریاست کی فوج کے حوصلے بالکل ہی ختم ہو گئے تھے۔اسی لئے وہ بڑے ہی غیر منظم طریقے سے پسپا ہوئی تھی۔یہاں سے قبائلیوں کے سامنے پینتیس میل کی مسافت تھی اور ان کے راستے میں دشمن کی کوئی مزاحمت نہیں تھی۔دشمن بھاگ رہا تھا۔قبائلیوں کے سامنے سرینگر تھا۔اس وقت سرینگر کی کیفیت یہ تھی جیسے خوف سے کانپ رہا ہو۔مہاراجہ کا دارالخلافہ قبائلیوں کے رحم و کرم پر تھا مگر قبائلیوں نے نہ اس روز بارہ مولا سے آگے پیش قدمی کی نہ اگلے روز آخر 28 اکتوبر کے روز انہوں نے سرینگر کی سمت کوچ کیا مگر اب ان کے راستے میں ہندوستان کی باقاعدہ فوج حائل ہو چکی تھی جو ایک سو طیاروں پر ایک ہی روز پہلے سرینگر میں اتری تھی۔

ہندوستان کی فوج کے ساتھ قبائلیوں کا پہلا مقابلہ بارہ مولا سے دس میل دور ہوا۔قبائلی ہندوستانیوں پر غالب آ گئے لیکن ایک پورا دن ضائع ہو گیا۔وہ 29 اکتوبر کی شام سرینگر کی طرف پیش قدمی کے قابل ہو سکے۔اب وہ سرینگر تک پہنچ چکے تھے۔ہم چند گھنٹوں میں ان تک پہنچنے والے تھے۔ہمارے پیچھے جو قبائلی آ رہے تھے وہ کمک تھی جو سرینگر جا رہی تھی۔

Marfat.com

میں سوچنے لگا کہ انہوں نے بارہ مولا میں دو دن کیوں ضائع کیے؟ اگر یہ دو دن ضائع نہ کیے جاتے تو آج کشمیر کی کہانی بالکل ہی مختلف ہوتی۔ مجھے اس سوال کا کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ قبائلی خود ہی دو دن بارہ مولا میں گزارنا چاہتے تھے۔شاید زخمیوں کو پیچھے بھیجنے کے لئے وقت درکار ہو لیکن اس کام میں اتنا وقت نہیں لگنا چاہئے تھا۔ یا وہ کمک کے انتظار میں بیٹھے رہے ہوں۔ انہیں یہ تو معلوم تھا کہ اس وقت رفتار کی ضرورت تھی۔ بارہ مولا میں تو ان کے لئے کوئی کشش نہیں تھی۔ جب ان کے سامنے سرینگر جیسا شکار موجود تھا۔ جو کچھ تھا سرینگر تھا اور سرینگر دور بھی نہیں تھا۔ دشمن بھاگ رہا تھا۔ راستہ بھی صاف تھا۔

میرے لئے اور کشمیر کی جنگ آزادی کے لئے یہ سوال بہت اہم تھا۔ میں اس کا جواب ڈھونڈنے لگا۔ بار بار یہ خیال آتا کہ ان قبائلیوں کا کمانڈر میجر خورشید انور تھا۔ اس نے ضرور کسی معقول وجہ کی بنا پر دو دنوں کے لئے تعاقب ملتوی کر دیا ہوگا۔ آخر مجھے جواب مل گیا۔ بارہ مولا کے رہنے والے بہت سے مسلمان وہاں موجود تھے میں نے ان میں سے چند ایک معتبر اور ذمہ دار افراد سے بات کی تو انہوں نے بتایا کہ ان قبائلیوں کا کمانڈر میجر خورشید انور تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ سرینگر پر قبضہ کر لے گا۔ اس نے بارہ مولا پر پیش قدمی روک دی اور کشمیری لیڈروں کو بلا بھیجا۔ وہ ان کے ساتھ طے کرنا چاہتا تھا کہ کشمیر کی حکومت میں اس کی پوزیشن کیا ہوگی۔ وہ یہاں لیڈروں کا انتظار کرتا رہا۔ اس انتظار کے دوران ہندوستانی فوج آ گئی اور سرینگر کے راستے میں باقاعدہ مورچہ بند ہو گئی۔

مجھے بارہ مولا ہی میں آدھی رات ہو گئی۔ فرنٹ تک پہنچنا تھا۔ ہم بارہ مولا سے نکلے سڑک پر کوئی ٹریفک موجود نہیں تھی۔ راستے میں کئی ایک گاؤں آئے۔ بعض میں کچھ آدمی چوروں کی طرح ادھر ادھر آتے جاتے دکھائی دیتے تھے۔ یہ اسی علاقے کے رہنے والے تھے اور خالی مکانوں سے سامان لوٹ رہے تھے۔ ہمیں ابھی تک لڑائی کے کوئی آثار نہیں ملے۔ نہ کوئی فائرنگ تھی اور نہ کوئی جنگی سرگرمی، یہ بھی سراغ نہیں ملتا تھا کہ محاذ کہاں ہے۔ وہاں کوئی بتانے والا ہی نہیں تھا۔ ہمیں اتنا ہی معلوم تھا کہ لڑائی اوپر کے پہاڑی علاقے میں ہو رہی ہے۔ یہ خیال بھی آتا تھا کہ اس سڑک پر دشمن کا ہی قبضہ نہ ہو۔ بہرحال تصدیق یا تردید کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ ان خدشات کے پیش نظر ہم نے اپنی گاڑی کی رفتار کم کر لی اور بتیاں بجھا دیں۔

دس میل آگے گئے تو ایک جگہ الاؤ جلتا دیکھا۔ کچھ قبائلی اس کے گرد سوئے ہوئے تھے۔ پانچ میل اور آگے گئے تو ہمیں سڑک کے ساتھ ساتھ چند ایک انسانوں کے سیاح بت سے چلتے پھرتے نظر آئے۔ ہم ان کے قریب سے گزر گئے۔ ہماری گاڑی کے سوا اور کوئی آواز نہیں تھی۔ کشمیر جنگ کی لپیٹ میں تھا۔ مگر رات بالکل خاموش تھی۔ نصف گھنٹہ گزرا تو دور سے ہمیں سرینگر کی روشنیاں دکھائی دینے لگیں۔ اب ہم محاذ کے قریب تھے۔ ذرا اور آگے گئے تو ہم نے دیکھا کہ زخمیوں کو پیچھے لایا جا رہا تھا۔ دو تین فرلانگ اور آگے گئے تو دیکھا کہ ہندوستانی توپوں کے گولے سڑک پر پھٹ رہے تھے لیکن دوسری فائرنگ کم ہو رہی تھی۔ ظاہر تھا کہ حملہ ابھی ابھی ختم ہوا ہے۔ ہم رک گئے۔ یہ چوتھا سنگ میل تھا یعنی ہم سرینگر سے چار میل دور تھے۔ یہاں سرینگر کے مضافات شروع ہوتے تھے۔

اس سنگ میل پر دشمن نے سڑک مختلف رکاوٹوں سے بند کر رکھی تھی۔ سڑک کے دائیں بائیں کی زمین کٹی پھٹی

Marfat.com

اور نشیب و فراز والی تھی۔ میں نے وہاں سے جو معلومات فراہم کیں ان سے پتہ چلا کہ قبائلی سڑک سے ہٹ کر اور رینگ رینگ کر آگے بڑھے تھے۔ دشمن نے تمام علاقے میں اندھا دھند فائرنگ جاری رکھی جس سے قبائلیوں کا کوئی نقصان نہیں ہوا۔ قبائلی خاموشی سے آگے ہی آگے بڑھتے گئے تھے۔ مگر آخری چند سو گز رہ گئے تو صورتحال بالکل ہی بدل گئی جس سے قبائلی پہلے سے آگاہ نہیں تھے۔ سرینگر سے باہر کے علاقے میں پانی ہی پانی تھا۔ دھان کے کھیت تھے جن میں پانی تھا۔ جھیلیں تھیں۔ بارش کا پانی بھی جگہ جگہ جمع تھا اور دلدل بہت تھی۔ قدرت نے سرینگر کا دفاع مضبوط بنا رکھا تھا۔

قبائلی دشمن کی پوسٹ پر پہلو سے حملہ کرنے کے لئے بڑھ رہے تھے مگر پانی اور دلدل سے بچ بچ کر بڑھنے کی کوشش میں پوسٹ سے ہٹ کر سڑک کے قریب آتے جاتے تھے۔ اب ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ سڑک کے راستے ہی دشمن کی پوسٹ پر سامنے سے ہلہ بول دیں۔ اور سرینگر میں داخل ہونے کے لئے راستہ صاف کریں۔ چنانچہ انہوں نے ایسی ہی دلیرانہ کارروائی کی۔ اگر یہ قبائلی محسودوں اور وزیریوں جیسے تجربہ کار ہوتے تو ایسا حملہ کبھی نہ کرتے۔ وہ مہمند تھے جو اس قسم کی لڑائی کا تجربہ نہیں رکھتے تھے۔ یہ وجہ بھی تھی کہ جس دلیرانہ حملے سے وہ دشمن کو مظفر آباد سے یہاں تک دھکیل لائے تھے۔ اس سے ان میں ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی پیدا ہو گئی ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سرینگر کے دفاع سے ٹکرانے کے صحیح طریقے اور خطرے کو خاطر میں نہ لائے۔ انہوں نے دشمن کی پوسٹ پر سامنے سے ہلہ بولا۔ اور دشمن کی مشین گنوں اور رائفلوں نے انہیں بھون کے رکھ دیا۔ اس فائر میں مارٹر گنوں کا فائر بھی تھا۔ حملہ ناکام ہو گیا۔ رات گزر گئی تھی۔ سحر طلوع ہونے کو تھی۔ اس لئے کوئی مزید کارروائی نہیں کی جا سکتی تھی۔

صبح کے چار بج رہے تھے اور یہ ایسا وقت تھا جب ہمیں چھپنے کی جگہ ڈھونڈنی تھی۔ صبح کا اجالا نکھرتے ہی ہم دشمن کی فوج کو بھی نظر آ سکتے تھے اور ہوا بازوں کو بھی۔ انڈین ائرفورس کے طیارے صبح ہوتے ہی فضا میں آ جاتے تھے۔ جہاں ہم کھڑے تھے وہاں سے ذرا پیچھے ہمیں چنار کے درختوں کا ایک جھنڈ نظر آیا۔ گاڑی اس میں چھپا کر ہم آرام کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن نیند کیلئے کوئی وقت نہیں رہ گیا تھا۔ ذرا ہی دیر بعد صبح طلوع ہوئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے قدرت کے بڑے ہی حسین منظر سے پردہ اٹھ رہا ہو۔ یہ ایک سرد اور شفاف صبح تھی۔ پہاڑیوں کی چوٹیوں پر برف چمک رہی تھی۔ پرندے چہچہا رہے تھے۔ سورج کی پہلی کرنوں کے ساتھ ہی مرغابیوں اور کونجوں کے ہول نہایت اچھی ترتیب میں اڑتے نظر آنے لگے۔ سورج کی کرنوں سے ان کے پروں کے رنگ چمکتے تھے تو قدرت کا حسن اور زیادہ نکھرا ہوا لگتا تھا۔ زمین پر ابھی دھند تھی۔ ہر سو خاموشی تھی سوائے ایک ندی کے بہاؤ کے ہلکے ہلکے مترنم شور جو قریب ہی بہتی جا رہی تھی۔ سورج اور اوپر اٹھا تو کھیتیوں اور چناروں کی ہریالی شفاف نیلے آسمان تلے طلسم طاری کرنے لگی۔ ماحول اس قدر پرسکون تھا کہ یقین نہیں آتا تھا اس روح پرور ماحول میں جنگ لڑی جا رہی ہے۔ چند گھنٹے پہلے کے واقعات ماضی بعید کی واردات معلوم ہوتے تھے۔

مگر یہ سحر اور روح پرور فضا کچھ دیر کی مہمان ثابت ہوئی۔ ایک ہندوستانی لڑاکا طیارہ گرجتا' غراتا زناٹے سے ہمارے اوپر سے گزر گیا۔ وہ تمام علاقے پر کچھ دیر اڑتا رہا پھر اس نے درختوں کا جو بھی جھنڈ دیکھا اس پر یا بم گرایا یا مشین گن فائرنگ کی۔ وہ نظروں سے اوجھل ہوا ہی تھا کہ دوسرا طیارہ آ گیا۔ اس نے بھی کہیں بم گرائے اور کہیں مشین گنیں فائر

Marfat.com

کیں۔ ماحول لرزنے لگا اور کشمیر کا حسن بموں کے مہیب دھماکوں سے سہم گیا۔ یہ طیارہ آگ برسا کر گیا تو ایک اور آ گیا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ یہ سلسلہ دن بھر لگا رہے گا۔ ہواباز بڑے اطمینان سے بمباری اور مشین گن فائرنگ کر رہے تھے۔ نیچے سے ان پر کوئی فائر نہیں کر رہا تھا۔ وہ آسمان اور فضا میں آزاد تھے۔ وہ بہت ہی کم بلندی پر اڑتے تھے اور کبھی کبھی تو وہ درختوں کی بلندی سے بھی نیچے آ جاتے تھے۔

میں نے ٹھنڈے یخ پانی سے ہاتھ منہ دھویا۔ سفری ناشتہ کیا اور چھپ چھپ کر جائزہ لینے لگا کہ سرینگر کا دفاع کیسا ہے۔ دن کی روشنی میں کوئی کارروائی نہیں کی جا سکتی تھی۔ طیاروں کی موجودگی میں جنگی کارروائی ممکن نہیں تھی۔ میری طرح چند اور آدمی ادھر ادھر حرکت کرتے نظر آتے تھے۔ چند ایک آدمی ادھر ادھر چھپ چھپا کر طیاروں کو جل دے سکتے تھے۔ کھلے علاقے میں انسان طیارے کو دیکھ سکتا ہے۔ اور اسے چھپنے کا خاصا وقت مل جاتا ہے اور اگر ہواباز کسی ایک آدمی کو دیکھ بھی لے تو وہ اسے مارنے کے لئے اتنا ایمونیشن ضائع نہیں کرتا۔ اور اگر ہواباز اس آدمی کو مارنا چاہے تو بھی آدمی اس سے صاف بچ سکتا ہے کیونکہ طیارہ سیدھا فائر کرتا ہے۔ اپنی مشین گنوں کو گھما نہیں سکتا۔ پہلے تو حملے کے لئے نیچے آنا ہوتا ہے۔ پھر نشانہ لینا ہوتا ہے۔ اتنی دیر میں آدمی چھپ جاتا ہے۔

میں چند گھنٹے ادھر ادھر پھرتا رہا اور ہندوستانی ہوابازوں کو دھوکا دیتا رہا۔ میرے پاس نقشہ تھا اور دوربین بھی تھی۔ میں نے دونوں کی مدد سے زمین کا جائزہ لے لیا۔ ہماری طرف سے سرینگر میں داخل ہونے والے تمام راستے پانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ یہ پانی کچھ کم ہو گیا تھا۔ پھر بھی سڑک تک یا کسی پگڈنڈی تک یا کسی بند تک پہنچنے کے لئے یہ پانی ابھی دشوار گزار رکاوٹ تھا۔ دشمن کی نظر اور اس کے ہتھیاروں کی زد سے کوئی بھی راستہ محفوظ نہیں تھا۔ میں نے دیکھا کہ دشمن کی پوسٹوں پر حملہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک کہ عقب سے امدادی فائر نہ ملے۔ تاہم سرینگر کی پوزیشن خاصی کمزور تھی۔ ریاستی فوج کے حوصلے پست ہو چکے تھے اور اندر کے مسلمان اس فوج کے دشمن تھے۔ ہندوستانی فوج کی جو نفری اس وقت تک سرینگر میں اتری تھی' بمشکل تین پلٹنیں تھیں۔ سرینگر کے دفاعی پیریمیٹر کے لئے جو کئی میل لمبا اور بے قاعدہ سا تھا' یہ نفری کافی نہیں تھی۔ ان کی پوسٹیں کم تھیں اور اتنی دور دور کہ ایک دوسری کی مدد نہیں کر سکتی تھیں۔ لہٰذا اس روز سرینگر کا دفاع کوئی ایسا مستحکم نہیں تھا کہ توڑا نہ جا سکتا۔ شہر میں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ حالانکہ فضا میں طیارے اڑ رہے تھے اور ہندوستان کی فوج بھی مورچہ بند تھی پھر بھی قبائلی پٹھان ہوائی اڈے کے اردگرد آزادی سے گھوم پھر رہے تھے۔

مجھے صاف نظر آ رہا تھا کہ ایک مرتبہ قبائلی شہر کے اندر چلے جائیں تو انہیں نکالنا مشکل ہو گا۔ شہر والوں کی بھگدڑ اور افراتفری اور فوجوں کی بھاگ دوڑ سے سڑکیں بند ہو جائیں گی۔ ریاستی فوج تو دل چھوڑ بیٹھی تھی۔ اس کا کوئی ڈر نہ تھا۔ جہاں تک ہندوستانی فوجوں کا تعلق تھا انہیں زیادہ تر ہوائی اڈے کا دفاع کرنا تھا کیونکہ انہیں اسی راستے سے ہندوستان کو بھاگنا تھا۔ لیکن سرینگر میں داخل ہونے کی کیا صورت ہو؟

ایک ہی صورت تھی کہ رات کے وقت کشتیوں سے پانی کی گہری رکاوٹیں عبور کی جائیں۔ اور جہاں پانی کم ہو وہاں پیدل چل کر گزرا جائے۔ اس صورت میں وہاں کے رہنے والے لوگوں کی مدد کی ضرورت تھی۔ قبائلی اب یہی طریقہ اختیار کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے مگر جنگ کی وجہ سے اس علاقے کے رہنے والے وہاں سے چلے گئے تھے۔ چنانچہ کشتیوں اور

Marfat.com

گائیڈ کے حصول کے لئے بہت وقت درکار تھا۔ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ کتنا وقت لگ جائے مگر ہر ایک دن جو ضائع ہوتا تھا، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ سرینگر میں اترنے والی ہندوستانی فوج میں اضافہ ہو رہا تھا۔ یہ صورت بہت ہی خطرناک تھی لیکن یہی ایک ترکیب رہ گئی تھی جسے فوری طور پر آزمانا ضروری تھا مگر اس پر انحصار بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔

لہٰذا میں نے پھر توجہ سڑک پر مرکوز کر لی جسے رات کے حملے میں استعمال کیا گیا تھا۔ سڑک کے سامنے دشمن کی دفاعی پوزیشن زیادہ مضبوط نہیں تھی۔ وہاں کنکریٹ کے مورچوں اور بنکروں کے خندقوں یا ناقابل تسخیر رکاوٹوں کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔ نظر یہی آتا تھا کہ خاردار تار ہے یا دشمن کا فائر جو بغیر آڑ کے آدمیوں یا لاریوں کو تو روک سکتا تھا' اس سے مضبوط چیز کو روکنے کے قابل نہیں تھا۔ صرف ایک بکتر بند گاڑی اس رکاوٹ سے بخیر و خوبی گزر سکتی تھی۔ میں نے سوچا کہ دو بکتر گاڑیاں کافی ہوں گی اور دو گاڑیاں پاکستان سے یہاں چوبیس گھنٹوں میں پہنچ جائیں گی۔ اب کرنے والا کام یہ تھا کہ میں جس قدر جلد ممکن ہو سکے واپس جاؤں اور دو بکتر بند گاڑیاں لے آؤں۔

جب سورج غروب ہو گیا اور طیاروں کا خطرہ ٹل گیا تو میں واپسی کے لئے روانہ ہوا۔ ایک تو رات کا وقت تھا اس کے ساتھ بارش' کیچڑ اور قبائلیوں کی ٹریفک نے میری رفتار تیز نہ ہونے دی۔ مجھے بہت کوفت ہو رہی تھی لیکن یہ خیال مجھے مسرور کر رہا تھا کہ ہندوستانی فوج میں اضافے سے پہلے میں دو بکتر بند گاڑیاں لے کے پہنچ جاؤں گا۔ گو مجھے یہ بھی معلوم تھا بکتر بند گاڑیاں حاصل کرنے کے لئے مجھے چند ایک اعتراضات کا جواب دینا پڑے گا۔ مجھے کہا جائے گا کہ پاکستان آرمی کی بکتر بند گاڑیاں استعمال ہوئیں تو ہندوستان اسے پاکستان کی فوجی مداخلت قرار دے گا۔ ہندوستان ہمیں پہلے ہی حملہ آور کہہ رہا تھا۔ اس لئے ہم پر یہ الزام بھی عائد کیا تھا کہ قبائلیوں کو ہم کشمیر میں لائے ہیں مگر میں سوچ رہا تھا کہ ان الزامات کے بعد اگر دو گاڑیاں پاکستان سے آ گئیں تو کیا فرق پڑ جائے گا؟

یہی دلیل دی جاتی تھی کہ دو بکتر بند گاڑیاں بھیجنے سے پاکستان اور ہندوستان میں جنگ چھڑ جائے گی۔ مجھے یقین تھا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ دونوں ملکوں میں سے کوئی بھی جنگ کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس حقیقت سے انکار یا فرار ممکن نہیں تھا کہ ہم کشمیر میں الجھ چکے تھے۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ دونوں ملک جنگ کو پھیلانا نہیں چاہتے۔ دونوں نوزائیدہ مملکتیں تھیں جن کی عمر ابھی تین مہینے ہوئی تھی۔ ابھی تو وہ ٹک کے بیٹھی بھی نہیں تھیں۔ دونوں ملکوں کی جو مشترک فوج تھی ابھی تو وہ بھی پوری طرح تقسیم نہیں ہوئی تھی۔ ایک غیر جانبدار باؤنڈری فورس ابھی تک باقی تھی جس کی کمان ایک انگریز جرنیل کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ دونوں مملکتوں کا ایک مشترک سپریم کمانڈر تھا جس کا حکم ابھی اثر رکھتا تھا۔

ابھی دونوں طرف سے لاکھوں شہریوں کی ہجرت کا سلسلہ جاری تھا۔ ہر روز ناگوار واقعات ہو رہے تھے۔ ابھی دونوں طرف سے الزامات عائد کئے جا رہے تھے کہ فوج اور حکومت خود مہاجرین کا قتل عام کرا رہی ہے۔ ان حالات میں اگر پاکستان کی طرف سے دو بکتر بند گاڑیاں قبائلیوں کی مدد کے لئے سرینگر تک چلی گئیں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ کوئی قیامت نہیں آ جائے گی۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ ہندوستان والے ہم پر ایک اور الزام عائد کر دیں گے۔ کچھ اور شور شرابا کر لیں گے...... میں یہی کچھ سوچتا ہوا انتہائی رفتار سے راولپنڈی جا رہا تھا اور مطمئن تھا کہ مجھے دو بکتر بند گاڑیاں مل جائیں گی۔ میں تو یہی سوچ رہا تھا مگر کشمیر کی قسمت میں کچھ اور لکھا تھا۔ میری سوچیں محض بے معنی اور بے اثر تھیں۔

Marfat.com

میں امیدوں سے دل کو خوش کرتا راولپنڈی پہنچا۔ فوراً کرنل مسعود سے ملا۔ انہوں نے پیش کش کی کہ دو بکتر بند گاڑیوں کی بجائے وہ مجھے بکتر بند گاڑیوں کی پوری رجمنٹ دے دیں گے۔ انہوں نے یہاں تک خطرہ مول لے لیا کہ کہنے لگے کہ رجمنٹ کے افسر اور جوان وردی کی بجائے عام کپڑوں میں جائیں گے اور سرکاری اجازت کے بغیر جائیں گے اور یہ بھی کہ وہ اپنی ذمہ داری پر جائیں گے۔

یہی تو اس صورتحال کی ضرورت تھی جو ایسی فراخدلی سے پوری کی جا رہی تھی۔ بکتر بند رجمنٹ کشمیر کے لئے تیار ہونے لگی۔ میں اس دوران بریگیڈئر شیر خان، لیفٹیننٹ کرنل ارباب اور مرکزی وزیر راجہ غضنفر علی خان سے ملا۔ ان سے مشورہ لینا ضروری تھا۔ بریگیڈئر شیر خان اور راجہ غضنفر علی نے بکتر بند گاڑیاں لے جانے کی مخالفت بڑی شدت سے کی۔ انہوں نے وہی دلائل پیش کئے جو پہلے ہی میرے ذہن میں تھے۔ انہوں نے کہا کہ دونوں ملکوں کے درمیان جنگ چھڑ جائے گی اور حکومت ہمیں کبھی نہیں بخشے گی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ بکتر بند گاڑیاں چلی بھی گئیں تو کامیابی کی توقع بہت کم ہے۔ انہوں نے مجھے یہ بھی کہا کہ میں محاذ کا کمانڈر نہیں ہوں۔ چنانچہ بکتر بند گاڑیوں کی تجویز مسترد کی دی گئی۔

(میجر جنرل اکبر خان: Raiders in Kashmir)

بکتر بند گاڑیاں قبائلیوں کی مدد کو نہ جا سکیں اور قبائلی سرینگر میں داخل ہونے کا کوئی راستہ نہ ڈھونڈ سکے۔ وہ ٹھوس اور مؤثر مدد کے بغیر سرینگر میں داخل ہو ہی نہیں سکتے تھے۔

مسئلہ کشمیر اقوام متحدہ میں بھارتی حکومت کی خواہش پر گیا تھا۔ پاکستان کو تب شاید یہ امید رہی ہو کہ یو این او کم از کم ایک ایسا ادارہ ہے جہاں اقوام عالم کے مسائل کو انصاف کے ترازو پر تولا جاتا ہے اور کشمیر کا کیس تو بالکل واضح تھا لیکن یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس ادارے کا قیام بعض مخصوص طاقتوں کے دنیا پر اپنی مرضی کا نظام قائم رکھنے کے لئے عمل میں لایا گیا تھا۔ اقوام متحدہ میں بھارت کی طرف سے مسئلہ کشمیر کے حوالے سے کیا کیا گل کھلائے گئے اور عالمی شاطروں نے کیا کیا چالیں چلیں اس کی تفصیلات سر ظفر اللہ خان کی زبانی سنئے جو پاکستان کی طرف سے اس کیس کی پیروی کر رہے تھے۔ سر ظفر اللہ خان لکھتے ہیں۔

''ہندوستان کی طرف سے سر گوپالا سوامی آئینگر نے 15 جنوری کو سہ پہر کے اجلاس میں تقریر کی۔ خلاصہ اس کا یہ تھا۔ مہاراجہ کشمیر نے ریاست جموں و کشمیر کا الحاق ہندوستان کے ساتھ برضا و رغبت کیا ہے۔ اس کے خلاف پاکستان کی انگیخت پر اور اس کی مدد کے ساتھ قبائلیوں نے ریاست پر دھاوا کر کے بہت فساد اور خون خرابہ کیا ہے۔ قبائلیوں کی روک تھام کے لیے ہندوستان کو اپنی فوج بھیجنی پڑی۔ موجودہ صورت جنگ کا رنگ اختیار کر گئی ہے پاکستان قبائلیوں کی ہر طرح سے مدد کر رہا ہے۔ بہت سے پاکستانی فوجی اور افسر بھی قبائلیوں کے ساتھ ہیں۔ پاکستان کا یہ رویہ بین الاقوامی قانون کے خلاف ہے۔ پاکستان کو اس سے روکنا لازم ہے۔ پاکستان قبائلیوں کی مدد بند کرے اور انہیں واپس جانے پر آمادہ کرے۔ الحاق کے متعلق ہندوستان کا موقف یہ ہے کہ جہاں فرمانروائے ریاست ایک مذہب کا ہو اور رعایا کی کثرت دوسرے مذہب کی ہو وہاں فرمانروا کا فرض ہے کہ وہ الحاق کا فیصلہ رعایا کی کثرت رائے کے مطابق کرے۔ ہندوستان اس اصول پر پختہ طریق سے کاربند ہے۔ چنانچہ جب ریاست کشمیر میں امن قائم ہو جائے گا تو ہم کشمیر کی رعایا کے منشاء کے مطابق الحاق کے معاملے میں آخری فیصلہ کریں گے۔ ان کی تقریر کے بعد اجلاس دو دن کے لیے ملتوی ہو گیا۔''

Marfat.com

پاکستانی وفد کا جواب:

دوسرے اجلاس میں میں نے جوابی تقریر میں کہا ہندوستان کے نمائندے نے اپنی تقریر میں عمداً اس قضیے کی پیچیدگیوں کو پس پردہ رہنے دیا ہے اور صرف پاکستان کے خلاف الزامی پہلو پر زور دیا ہے۔ ہماری طرف سے اس اہم اور پیچیدہ قضیے کے پس پردہ حالات کو ظاہر کرنا اور ہندوستان کو مجرم کی حیثیت میں دکھانا ضروری ہے۔ اس لیے لازماً بہت سے امور کی وضاحت ناگزیر ہے جن کا بیان ہندوستان کی طرف سے اس لیے نہیں کیا گیا کہ وہ ان کے خلاف جاتے ہیں۔ ان تمام واقعات کا مختصر بیان بھی وقت چاہتا تھا اور مجلس امن کے ایک اجلاس میں تقریر کے لیے صرف سوا دو گھنٹے میسر آتے تھے اس لیے میری تقریر تین اجلاسوں میں مکمل ہوئی۔

چند سالوں کے بعد کولمبیا کے نمائندے نے ایک دفعہ مجھ سے کہا کشمیر کے معاملے میں ہندوستانی نمائندے کی پہلی تقریر سننے کے بعد مجلس امن کے اراکین کی کثرت کا یہ تاثر تھا کہ پاکستان نے آزادی حاصل کرتے ہی فساد کا رستہ اختیار کرلیا ہے اور دنیا کے امن کے لیے ایک خطرے کی صورت پیدا کردی ہے لیکن جب جواب میں تمہاری طرف سے اصل حقیقت کے رخ سے پردہ ہٹایا گیا تو ہم سب نے سمجھ لیا کہ ہندوستان مکاری اور عیاری سے کام لے رہا ہے اور کشمیر کی رعایا پر ظلم ہو رہا ہے اور ہمارا یہ تاثر بعد میں کسی وقت بھی زائل نہیں ہوا۔ دو تین دن بعد میری تقریر کا جواب مسٹر سیتلواڈ نے دیا۔ اپنی تقریر کے شروع میں انہوں نے میرے متعلق کچھ درشت کلامی بھی کی۔ مسٹر سیتلواڈ بڑے قابل وکیل ہیں انہوں نے اپنی قابلیت کا ہر حربہ استعمال کیا لیکن ایک مردہ کیس میں جان ڈالنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ ممکن ہے مجلس کے بعض اراکین نے کچھ اثر قبول کیا ہو۔ کیونکہ ہمارے وفد میں سے سفیر اصفہانی صاحب کچھ پریشان نظر آتے تھے مبادا کوئی رکن مسٹر سیتلواڈ کے فریب میں آجائے۔ مسٹر سیتلواڈ نے ہندوستان کے دامن کو پاک اور بے داغ ثابت کرنے کے لیے یہاں تک کہہ دیا کہ مہاراجہ کشمیر کی الحاق کی درخواست قبول کرتے ہوئے ہم نے خود ان پر واضح کردیا ہے کہ یہ الحاق عارضی ہے اور مستقل تب ہوگا جب کشمیر کی رعایا کی کثرت آزادانہ طور پر اس کی تائید میں اظہار رائے کردے گی۔ اس سے بڑھ کر انصاف پسندی کا ثبوت ہم کیا دے سکتے ہیں؟ وہ بہت سی کھوکھلی اور بے بنیاد باتیں بھی کہہ گئے۔ میرا تاثر یہ تھا کہ انہوں نے ہمارے لیے موقع پیدا کردیا ہے کہ ہم اراکین مجلس پر ثابت کردیں کہ ہندوستان کا دعویٰ کچھ ہے اور عمل بالکل اس کے خلاف ہے۔ میرا یہ بھی تاثر تھا اور اب تک ہے کہ مسٹر سیتلواڈ نے اپنی طرف سے کوئی بات فریب یا بددیانتی سے نہیں کی تھی البتہ بہت سے واقعات کا انہیں علم نہیں تھا اور میری طرف سے ان واقعات کے پیش کیے جانے پر انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ یہ واقعات صحیح ہو سکتے ہیں۔

تیسرے اجلاس میں بعض اراکین مجلس امن اور بہت سے حاضرین کا خیال تھا کہ میں مسٹر سیتلواڈ کی درشت کلامی کے خلاف احتجاج کروں گا اور جواباً ''ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں'' کا تھوڑا بہت ثبوت سیتلواڈ صاحب کی خدمت میں پیش کروں گا۔ لیکن میں ان کی درشت کلامی پر قطعاً برافروختہ نہیں تھا بلکہ مجھے اس خیال سے کچھ اطمینان تھا کہ اراکین مجلس نے اندازہ کرلیا ہوگا کہ اگر مسٹر سیتلواڈ کو درشت کلامی پر اترنا پڑا ہے تو یہ ان کے موقف کی کمزوری کا ثبوت ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں میں نے اپنی جوابی تقریر میں صرف اتنا ہی کہا۔ جناب صدر و اراکین مجلس! پچھلے اجلاس میں میرے فاضل دوست مسٹر سیتلواڈ نے اپنی تقریر میں میرے متعلق کچھ درشت الفاظ استعمال کیے تھے ان کے متعلق مجھے یہ

Marfat.com

کہنا ہے کہ میں مسٹر سیتلواڈ کو عرصہ سے جانتا ہوں جب میں ہندوستان کی فیڈرل کورٹ کا جج تھا تو مجھے بارہا ان کے دلائل سننے کا اتفاق ہوا۔ میری رائے میں مسٹر سیتلواڈ ہندوستان کے قابل ترین وکیل ہیں اور درشت کلامی ان کا شعار نہیں۔ اس موقع پر ان کے موقف کی کمزوری کو جانتے ہوئے میں ان کی مشکلات کا اندازہ کر سکتا ہوں۔ مسٹر سیتلواڈ کی درشت کلامی ایک استثنائی صورت تھی جو قابل اعتناء نہیں۔ اس کے بعد میں نے ان کی تقریر کی طرف توجہ دلائی ان کے دلائل اور واقعات پر مسلسل اور بفضل اللہ موثر تنقید کی۔

اس کے بعد کئی بار مسئلہ کشمیر پر بحث ہوئی ہے لیکن میری موجودگی میں نہ تو کبھی پاکستان کی طرف سے نہ ہی ہندوستان کی طرف سے کبھی درشت کلامی کی گئی ہے۔ اقوام متحدہ میں یہ بات مثال بن گئی کہ باوجود شدید اختلاف کے دونوں فریق کے نمائندے ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے اور واقعات اور دلائل کو مضبوطی سے پیش کرنے کے ساتھ یہ التزام رہتا تھا کہ کلام میں بے جا تلخی نہ ہو۔

مسٹر کرشنا مینن:

لیکن افسوس ہے کہ جب مسٹر کرشنا مینن نے ہندوستان کے نمائندے کے طور پر کشمیر کے مسئلے کی بحث میں حصہ لینا شروع کیا تو ان کی طرف سے یہ معیار قائم نہ رہا۔ لیکن وہ بھی اتنی احتیاط کرتے تھے کہ میری موجودگی میں کوئی بے جا لفظ استعمال نہیں کرتے تھے۔ جن دنوں میں پہلی بار بین الاقوامی عدالت کا رکن تھا تو مجلس امن میں پاکستان کی طرف سے یہ تجویز دہرائی گئی کہ کشمیر کمیشن کی تجاویز کی تعبیر کے متعلق فریقین کے درمیان جو اختلاف ہے اس کے لیے بین الاقوامی عدالت سے استصواب کیا جائے اور کمیشن کی تجاویز کی جو تعبیر عدالت کرے دونوں فریق اسے قبول کریں اور اس کے مطابق عمل کریں۔ مسٹر کرشنا مینن نے ہندوستان کی طرف سے اس تجویز کو رد کرنے کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی کہ وہ ''مذہبی دیوانہ'' (خاکسار) عدالت کا رکن ہے اور اگرچہ وہ اس معاملے میں اجلاس میں شرکت نہیں کرے گا لیکن اس کا رکن ہونا ہی ہمارے لیے بے اطمینانی کا موجب ہوگا۔ بعد میں جب میں اقوام متحدہ میں پاکستان کا مستقل نمائندہ تھا تو میں نے پھر اس تجویز کا اعادہ کیا اور کہا کہ اب تو وہ ''مذہبی دیوانہ'' بین الاقوامی عدالت کا رکن بھی نہیں اب اس تجویز کو مان لینے میں کیا عذر ہے؟ اس پر مسٹر کرشنا مینن نے اپنی نشست پر بیٹھے بیٹھے مڑ کر اپنے ایک سیکرٹری سے دریافت کیا ''کیا میں نے اسے ''مذہبی دیوانہ'' کہا تھا؟'' سیکرٹری نے اثبات میں سر ہلایا۔

مجلس امن کے ایک اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر کرشنا مینن نے فرمایا میرے وزیراعظم نے کشمیر کے متعلق کبھی رائے شماری Plebiscite کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ میں نے جواب میں پنڈت نہرو جی کے بیانات سے دس مثالیں پیش کیں جن میں پنڈت جی نے کشمیر میں Plebiscite کے ذریعے رائے عامہ معلوم کرنے کا اعلان کیا ہوا تھا اور کہا کہ اور بھی بہت سی مثالیں ہیں لیکن جو مثالیں میں نے بیان کی ہیں وہ اراکین مجلس بلکہ خود ہندوستان کے محترم نمائندے کے اطمینان کے لیے کافی ہوں گی کہ ہندوستان کے قابل احترام وزیراعظم نے تنازعہ کشمیر کے متعلق یہ لفظ بڑی کثرت سے استعمال فرمایا ہے۔ جب مسٹر کرشنا مینن کی باری آئی تو انہوں نے اس امر کے متعلق صرف اتنا فرمایا میں اس امر کا اعادہ کرتا ہوں کہ میرے وزیراعظم نے کشمیر کے قضیے کے سلسلے میں کبھی لفظ Plebiscite استعمال نہیں کیا۔ ایسی ڈھٹائی کا کیا علاج؟ م

Marfat.com

سر گوپالا سوامی آئنگر:

اس کے خلاف سر گوپالا سوامی آئنگر اگر چہ اپنی ہٹ کے پکے تھے لیکن واقعات میں ایجاد اور تصرف نہیں کرتے تھے۔ میں نے اپنی پہلی تقریر میں کشمیر میں ڈوگرہ مظالم کی داستان کے سلسلہ میں بیان کیا کہ 1934ء تک ریاست کشمیر میں کسی شخص کا اپنی گائے ذبح کرنا نہ صرف جرم تھا بلکہ اس قدر سنگین جرم کہ اس کی سزا عمر قید تھی۔ 1934ء میں اس تعزیر میں تخفیف ہوئی لیکن اب بھی اس جرم کی سزا غالباً سات سال قید با مشقت ہے۔ اجلاس کے اختتام پر جب ہم کمرے سے باہر نکلے تو سر گوپالا سوامی نے اپنا بازو میرے بازو میں ڈال لیا اور فرمایا ان تفاصیل میں جانے کی کیا ضرورت تھی؟ میں نے کہا ضرورت کا فیصلہ تو مجھ پر رہنے دیجئے لیکن آپ تو ایک عرصہ کشمیر کے وزیر اعظم رہے ہیں آپ ہی فرمائیں کہ اس وقت کشمیر میں گاؤ کشی کی کیا سزا ہے؟ انہوں نے فرمایا بھائی واقعہ تو یہی ہے کہ اب بھی اس جرم کی سزا سات سال نہیں بلکہ 10 سال قید با مشقت ہے۔ لیکن تم یہ بتاؤ تم ملک کی تقسیم پر پاکستان کیوں منتقل ہو گئے۔ تمہارا وطن تو تقسیم کے بعد مشرقی پنجاب میں ہے۔ اگر تم ہندوستان میں رہتے تو ہندوستان کی سپریم کورٹ کے پہلے چیف جسٹس ہوتے۔ میں نے کہا میں جانتا ہوں لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ نام کو تو میں چیف جسٹس ہوتا لیکن عملاً میں نظر بندی میں ہوتا۔ کہنے لگے یہ تمہارا وہم ہے۔

جانبین کی دو دو تقریریں سننے کے بعد مجلس امن نے یہ طے کیا کہ ماہ جنوری کے صدر مجلس پروفیسر لنکن ہوف اور ماہ فروری کے صدر مجلس جنرل میکناٹن فریقین کے نمائندوں کے ساتھ گفتگو کے بعد تصفیہ کی کوئی عملی تجویز مجلس میں پیش کریں۔ مجلس امن کی صدارت ہر ماہ بدلتی ہے۔ جنوری کی صدارت بلجیم کی تھی فروری کی کینیڈا کی۔ چنانچہ فروری کے شروع میں تبادلہ خیالات کے سلسلہ کی ابتداء ہوئی۔ صدر صاحبان فریقین سے علیحدہ علیحدہ بات چیت کرتے تھے۔ فریقین کی تقریروں سے اراکین مجلس نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ اگر چہ یہ مسئلہ نہایت اہم ہے لیکن اس کا سلجھانا چنداں مشکل نہ ہوگا کیونکہ فریقین اس بنیادی بات پر متفق ہیں کہ ریاست کے الحاق کا فیصلہ ریاست کی رعایا کی مرضی کے مطابق ہونا چاہئے۔ مجلس امن پر صرف یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ رعایا کی مرضی معلوم کرنے کا مناسب طریق تجویز کر دے اور اس پر فریقین کا اتفاق ہو جائے۔ اس صورت میں جنگ بندی آسان ہو جائے گی اور قبائلیوں اور رضا کاروں کو ریاست سے واپس جانے پر آمادہ کیا جا سکے گا۔ نیز جب آزاد کشمیر عنصر کو اطمینان ہو جائے گا کہ انہیں پورا حق خود اختیاری حاصل ہو گیا ہے تو وہ بھی لڑنا بند کر دیں گے۔ مجلس امن میں بحث کے دوران میں اور بعد میں صدر صاحبان کے ساتھ گفتگو کے دوران میں جو وقت فارغ ہوتا اس میں چودھری محمد علی صاحب اور میں باری باری تمام اراکین مجلس سے علیحدہ علیحدہ مل کر اپنا موقف ہر معاملے میں واضح کر دیتے تھے اور جو مشکل انہیں نظر آتی اس کا حل بتا دیتے تھے۔ اس غرض سے ہمیں کم سے کم تین چار بار ہر ایک رکن مجلس سے ملنے کا موقع ہوا۔ روس کا موقف اس وقت غیر جانبدارانہ معلوم ہوتا تھا۔ اگر چہ روسی نمائندے پوری دلچسپی لیتے تھے لیکن وہ کسی رائے کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ ان دنوں اقوام متحدہ میں برطانوی نمائندہ تو سر الیگزینڈر کیڈوگن تھے لیکن اس قضیے کی اہمیت کے پیش نظر برطانیہ کے وزیر امور کامن ویلتھ رائٹ آنریبل مسٹر فلپ نوئیل بیکر خود لندن سے برطانیہ کی نمائندگی کے لیے آئے ہوئے تھے۔ امریکی نمائندہ سینیٹر وارن آسٹن تھے۔ یہ دونوں اصحاب پوری توجہ اور انہماک سے کوشاں تھے کہ مجلس امن کوئی ایسا حل تجویز کرے جس کے نتیجہ میں جلد اس قضیے کو پرامن

Marfat.com

تصفیہ ممکن ہو جائے۔ ہم جانتے تھے کہ سلامتی کونسل کے صدر صاحبان ہمارے ساتھ اور ہندوستانی وفد کے ساتھ گفتگو کے علاوہ اراکین مجلس امن کے ساتھ بھی متواتر مشورہ کر رہے ہیں۔ اراکین مجلس کے ساتھ جو بات چیت ہوتی تھی اس سے کچھ مترشح ہوتا رہتا تھا کہ مجلس کا رجحان کس طرف ہے اور یہ بھی پتہ چل جاتا تھا کہ ہندوستانی وفد کس بات پر زور دے رہا ہے۔

چھ اراکین مجلس کی قرارداد اور ہندوستان کی ہٹ دھرمی:

آخری مجلس نے باہمی مشورے کے بعد ایک قرارداد پر اتفاق کیا چھ اراکین مجلس کی طرف سے یہ قرارداد مجلس میں پیش کی گئی اور اس پر اظہار رائے ہونے لگا۔ اس قرارداد کی رو سے جو کچھ ہم چاہتے تھے وہ سب تو میسر نہیں آتا تھا لیکن اصولاً ہمارا مؤقف تسلیم ہو جاتا تھا اس لیے بعض تفصیل کی وضاحت چاہنے اور بعض پر تنقید کرنے کے ساتھ ہم نے اسے قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی لیکن ہندوستان وفد نے قرارداد کی مخالفت کی اور اس کی مرکزی تجویز کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ تجویز یہ تھی کہ رائے شماری کو آزاد اور غیر جانبدار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ریاست کی حکومت کی تشکیل بھی غیر جانبداری کے اصول پر ہو۔ مسٹر نوئیل بیکر قرارداد کی بڑے زور سے حمایت کر رہے تھے اور اس کوشش میں بھی تھے کہ ہندوستانی وفد کو اور ان کی وساطت سے پنڈت جواہر لال صاحب کو قرارداد کو قبول کر لینے پر آمادہ کر لیں لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ ایک ملاقات میں امریکہ کے نمائندہ سینیٹر وارن آسٹن نے بتلایا کہ ہندوستانی وفد اس بات پر زور دے رہا ہے کہ مجلس امن صرف قبائلیوں اور رضا کاروں کو ریاست سے واپس کرانے اور آزاد کشمیر کے لوگوں کی لڑائی سے ہاتھ روکنے کا انتظام کر دے باقی سب کچھ ان پر چھوڑ دیا جائے وہ سب انتظام کر لیں گے۔ سینیٹر نے کہا ہم نے ان پر واضح کر دیا ہے کہ مجلس امن اس قضیے میں اپنے فرائض کو اس رنگ میں نہیں دیکھتی مجلس امن کا فرض ہے کہ وہ اس تمام قضیے کی تہ کو پہنچے اور یہ معلوم کرے کہ آزاد کشمیر کے لوگوں کو ہتھیار بند ہونے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ یہ واضح ہے کہ جب انہوں نے حق خود اختیاری کو زائل ہوتے دیکھا تو وہ ہتھیار بند ہونے پر مجبور ہو گئے۔ اب لڑائی بند کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ان لوگوں کا اطمینان کرا دیا جائے کہ جس حق کے حاصل کرنے کے لیے انہوں نے لڑائی شروع کی تھی وہ حق اب انہیں بغیر لڑائی کے حاصل ہو جائے گا۔ اس کے بغیر جنگ بندی کا اور کوئی طریق نہیں۔

ہندوستان کی طرف سے اجلاس ملتوی کرنے کی درخواست:

آخر تبادلہ خیالات کا سلسلہ ختم ہونے پر مجوزہ قرارداد کے متعلق رائے شماری کا وقت آیا۔ اس وقت تک جتنے اراکین مجلس نے قرارداد کے متعلق اظہار خیال کیا تھا سب نے قرارداد کی تائید کی تھی اور یہی اندازہ تھا کہ قرارداد اگر بالاتفاق نہیں تو گیارہ میں سے دس آراء کی تائید کے ساتھ منظور ہو جائے گی۔ روس کے متعلق خیال کیا جاتا تھا کہ شائد غیر جانبدار رہے عین اس مرحلے پر سر گوپالا سوامی آئینگر نے بولنے کی اجازت چاہی۔ اجازت ملنے پر انہوں نے فرمایا ہمیں اپنی حکومت کی طرف سے ہدایت موصول ہوئی ہے کہ ہم مزید ہدایات کے لیے دلی واپس جائیں اس لیے ہم رخصت کی اجازت چاہتے ہیں اور درخواست کرتے ہیں کہ ہماری واپسی تک اجلاس ملتوی کیا جائے۔ اراکین مجلس اس درخواست پر حیران بھی ہوئے اور آزردہ بھی۔ یہ سب نے سمجھ لیا کہ ہندوستان کی نیت بخیر نہیں۔ اکثر نے تو اتنا ہی کہنے پر اکتفا کیا کہ کشمیر میں جنگ جاری ہے اور جانیں تلف ہو رہی ہیں ضروری ہے کہ اس صورت حال کا جلد کچھ مداوا کیا جائے اور اس امید کا اظہار کیا کہ ہندوستانی

Marfat.com

وفد بہت جلد واپس آ جائے گا تا کہ مجلس اپنی کارروائی کو بغیر غیر ضروری توقف کے جاری رکھ سکے۔ لیکن بعض اراکین نے اپنی آزردگی کا اظہار بھی کیا۔ مثلاً کولمبیا کے مندوب نے کہا۔ صاحب صدر! آپ کو اور اراکین مجلس کو یاد ہوگا کہ ابھی چند دن ہوئے ہندوستان کے فاضل نمائندے نے شکوے کے طور پر کہا تھا کہ کشمیر جل رہا ہے اور مجلس امن ستار بجا رہی ہے۔ کیا میں ہندوستان کے فاضل نمائندے سے دریافت کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ اب کیا کشمیر کو جلانے والی آگ ٹھنڈی ہوگئی ہے؟ اور اگر نہیں تو اب کون ستار بجا رہا ہے؟ سر گوپالا سوامی آئینگر نے اس قسم کی تنقید سے زچ ہو کر کہا مجھے یہ دیکھ کر رنج ہوتا ہے کہ اقوام متحدہ کے ایک معزز رکن کی ایک جائز درخواست پر اس قسم کے تکلیف دہ خیالات کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ مجلس کے اراکین کے ان احساسات کے باوجود مجلس کے لیے سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں تھا کہ اجلاس ملتوی کیا جائے۔

دلی اور لندن میں رابطہ وساز باز:

جب التوا کی مدت کچھ طول پکڑنے لگی تو چودھری محمد علی صاحب نے مجھے کہا۔ ہمارا ہندوستانی وفد کے انتظار میں نیویارک بیٹھے رہنا بے معنی ہے۔ لیکن اگر ہم پاکستان لوٹ جائیں تو اس کا یہ نتیجہ ہوگا کہ التوا مستقل ہو جائے گا اور ممکن ہے قضیہ کشمیر کے متعلق مجلس کے اراکین کی دلچسپی بھی ٹھنڈی پڑ جائے۔ میرا اندازہ ہے کہ اس وقت کشمیر کا مسئلہ دلی اور لندن کے درمیان زیر بحث ہے۔ میری تجویز ہے کہ ہم لندن چلیں اور وہاں کچھ کھوج لگائیں کہ پس پردہ کیا پخت وپز ہو رہی ہے۔ چنانچہ ہم دونوں لندن پہنچے اور وزیر خارجہ مسٹر ارنسٹ بیون اور وزیر اعظم مسٹر اٹیلی سے ملاقات کی درخواست کی۔ وزیر خارجہ نے گیارہ بجے قبل دوپہر کا وقت دیا اور وزیر اعظم نے اسی دن تین بجے بعد دوپہر کا۔ وزیر خارجہ بہت صاف گو انسان تھے اور میرے دل میں ان کا بہت احترام تھا۔ انہوں نے میری بات توجہ سے سنی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ صورت حال سے واقف ہیں چنانچہ انہوں نے فرمایا مجھے تمہارے ساتھ ہمدردی بھی ہے اور اتفاق بھی لیکن ہندوستان کے معاملات میں وزیر اعظم پر کرپس کا بڑا اثر ہے وہ اس معاملے میں وزیر اعظم کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ ان کے الفاظ تھے:

"He has been at him"

میں نے سنا ہے تم آج وزیر اعظم سے مل رہے ہو۔ میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ خدا کرے تمہاری قسمت نیک ہو۔ دوپہر کے کھانے پر میں نے یہ کیفیت چودھری صاحب کی خدمت میں بیان کر دی۔ ہم دونوں کو یہی اندازہ ہوا کہ صورت حالات بگڑ گئی ہے۔ میں تین بجے وزیر اعظم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ صورت ہی سے پشیمان نظر آتے تھے۔ میں یوں تو انہیں بیس سال پہلے سے جانتا تھا جب سائمن کمیشن کے رکن تھے لیکن ہمارے درمیان کسی وقت بھی گہرے مراسم نہیں تھے۔ مجھے یہ بھی یاد تھا کہ انہوں نے آزادی ہند کے قانون کا مسودہ پارلیمنٹ اور پاکستان دونوں ملکوں کا گورنر جنرل بنانے کی تجویز منظور نہ کی۔ لارڈ مونٹ بیٹن جو وزیر اعظم کے منظور نظر تھے اب ہندوستان کے گورنر جنرل تھے اور سر سٹیفورڈ کرپس ہندوستان کی حمایت میں تھے۔ دوسری طرف ان دنوں حکومت برطانیہ میں پاکستان کا حمایتی کوئی نہ تھا مقابلہ بالکل غیر متوازن تھا۔ میں نے قریب پون گھنٹہ ان کی خدمت میں صرف کیا۔ اس عرصے میں انہوں نے ایک بار بھی مجھ سے نظر ملا کر بات نہ کی۔ کبھی ادھر جھانکتے کبھی ادھر۔ یہی کہتے فکر نہ کرو۔ ہندوستانی وفد جلد نیویارک پہنچ جائے گا۔ میں اس کوشش میں تھا کہ انہیں آمادہ کروں کہ ہندوستان کے ساتھ اپنا رسوخ استعمال کر کے انہیں ایفائے عہد پر مائل کریں اور اس میلان کا ثبوت مجلس امن کے

Marfat.com

سامنے پیش شدہ قرارداد کو تسلیم کرنے سے مہیا کریں اور وہ اس طرف آنے کا نام نہ لیتے تھے۔ کہنے لگے تمہیں اس قرارداد پر کیوں اصرار ہے اصل غرض اور طریق سے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ مثلاً اگر یوں کر دیا جائے یا یوں کر دیا جائے یا یوں کر دیا جائے۔ میں ان کی ہر ایک ''یوں'' پر تنقید کرتا گیا لیکن وہ راہ پر نہ آئے۔ میں بے نیل مرام لوٹ آیا اور اپنے رفیق کار سے کیفیت بیان کر دی اور نوابزادہ صاحب کی خدمت میں بھی رپورٹ بھیج دی۔ چودھری محمد علی صاحب اور میں نیو یارک واپس ہوئے۔

منظر بدل گیا:

کچھ دن بعد ہندوستانی وفد کی واپسی پر مجلس امن کے اجلاس پھر شروع ہوئے لیکن اب سماں بدلا ہوا تھا۔ جیسے میں ذکر کر چکا ہوں روس تو اس مرحلے پر غیر جانبدار تھا کہ یہ کامن ویلتھ کا آپس کا معاملہ ہے ہم اس میں دخل نہیں دیتے۔ امریکہ اور برطانیہ پیش پیش تھے۔ مجلس کے باقی اراکین بیشک اپنی اپنی رائے رکھتے تھے لیکن ان دونوں کی رائے کا احترام کرتے تھے۔ امریکہ بہت حد تک کامن ویلتھ کا معاملہ ہونے کی وجہ سے برطانیہ کے مشورے پر چلتا تھا۔ برطانیہ کے نمائندے مسٹر فلپ نوئیل بیکر فریقین کی باہمی مفاہمت سے کسی موثر طریق فیصلہ کے لیے کوشاں تھے لیکن وزیراعظم برطانیہ اب ان کے مشورے پر عمل پیرا ہونے پر تیار نہ تھے۔ لارڈ مونٹ بیٹن اور سر سٹیفورڈ کرپس کا اثر اپنا کام کر چکا تھا۔ ہمارے وفد کے سیکرٹری مسٹر ایوب کو مسٹر نوئیل بیکر کے سیکرٹری نے بتایا کہ وزیراعظم اٹیلی اور مسٹر نوئیل بیکر کے مابین اختلاف اس قدر بڑھ چکا ہے کہ مسٹر بیکر مستعفی ہونے کی سوچ رہے ہیں۔ اس امر کی تصدیق 1951ء میں خود مسٹر نوئیل بیکر نے کی۔ وہ اس وقت وزارت سے علیحدہ ہو چکے تھے۔ میرے ان کے 1933ء سے دوستانہ مراسم تھے۔ 1951ء میں اقوام متحدہ کی اسمبلی کا اجلاس پیرس میں ہو رہا تھا۔ مسٹر نوئیل بیکر کا گزر پیرس سے ہوا تو وہ مجھے ملنے تشریف لائے۔ باتوں باتوں میں کشمیر کا ذکر چھڑ گیا۔ فرمایا میرے لیے یہ امر نہایت تکلیف دہ ہے کہ اس قضیے کے خاطر خواہ تصفیہ کی صورت پیدا ہوئی مگر بات بنتے بنتے بگڑ گئی۔ فرمایا 1948ء میں نیو یارک میں میں نے بڑی کوشش سے سرگوپالا سوامی آئینگر اور باجپائی کو آمادہ کر لیا تھا کہ وہ پنڈت نہرو کو قرارداد منظور کرنے پر رضامند کریں۔ انہوں نے میرے ساتھ وعدہ کیا کہ وہ پوری کوشش کریں گے چنانچہ ہفتہ کے روز دونوں الگ الگ مجھے ملنے کے لیے آئے اور کہا ابھی پختہ اطلاع تو نہیں آئی لیکن ہمارے پیغام کا ردعمل خوشگوار معلوم ہوتا ہے۔ امید ہے دو ایک دن تک واضح ہدایت آ جائے گی اور ہمارا اندازہ ہے کہ سوموار یا منگل وار تک ہم آپ کو پختہ اطلاع دے سکیں گے۔

Then on Monday I received that disastrous telegram Atlee upsetting everything.

''اور پھر سوموار کے دن مجھے اٹیلی کا وہ منحوس تار وصول ہوا جس نے سارے معاملہ کو بگاڑ کے رکھ دیا۔''

میں نے سخت احتجاج کیا لیکن اٹیلی نے میری ایک نہ مانی بلکہ اس بات سے میرے خلاف دل میں گرہ باندھ لی۔ تھوڑے سے عرصے بعد مجھے کامن ویلتھ کی وزارت سے علیحدہ کر کے بجلی اور ایندھن کا وزیر بنا دیا اور کچھ عرصہ بعد وزارت سے ہی الگ کر دیا۔

آخرکار جب مجلس امن میں چینی نمائندے نے جو مارچ کے مہینے میں مجلس کے صدر تھے ایک نئی قرارداد کا مسودہ پیش کیا تو ہمارے سب خدشات صحیح ثابت ہوئے۔ یہ قرارداد ان تجاویز کے مطابق تھی جس کا ذکر وزیراعظم مسٹر اٹیلی نے

Marfat.com

میرے ساتھ لندن میں کیا تھا پہلی قرارداد کے مقابلے میں یہ قرارداد بہت کمزور تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ جب مسٹر نوئیل بیکر سر گوپالا سوامی آئینگر اور سر گرجا شنکر باجپائی کے ذریعے پنڈت جواہر لال نہرو کو پہلی مجوزہ قرارداد منظور کر لینے کی طرف مائل کرنے کی کوشش میں تھے تو پنڈت صاحب لارڈ مونٹ بیٹن اور سر سٹیفورڈ کرپس کے ذریعہ وزیر اعظم اٹیلی پر زور ڈال رہے تھے کہ پہلی مجوزہ قرارداد کے ان حصوں کو ترک کیا جائے جو ہندوستان کے مفاد کے خلاف ہیں۔ وزیر اعظم اٹیلی جو شروع ہی سے تحریک پاکستان کے حق میں نہ تھے اور جو قائد اعظم سے بھی بغض رکھتے تھے نہایت آسانی سے اندر مائل ہو گئے اور اپنی پہلی ہدایات کے خلاف اور اپنے رفیق کار وزیر امور کامن ویلتھ کے مشورے کے خلاف پہلا موقف بدل لیا جس کے نتیجے میں نہ صرف پہلی مجوزہ قرارداد کی بجائے ایک نسبتاً کمزور قرارداد مجلس امن میں پیش کی گئی بلکہ مجلس امن کی ساری فضا ہی بدل گئی اس طرح پنڈت جواہر لال نہرو صاحب کو معلوم ہو گیا کہ مجلس امن کی مساعی کو ریشہ دوانی اور حکمت عملی سے بے اثر بنایا جا سکتا ہے جس طرح فلسطین کا قضیہ صدر ٹرومین کی یہود نواز پالیسی کے نتیجے میں مشرق وسطیٰ کے لیے خصوصاً اور اسلامی دنیا کے لیے عموماً ان گنت مشکلات اور مصائب کا موجب بنا ہوا ہے اسی طرح کشمیر کے قضیہ کی ذمہ داری جس کے نتیجہ میں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جنگ تک نوبت پہنچی اور جو تا حال برا عظم پاک و ہند کے لیے خصوصاً اور سارے مشرق کے لیے عموماً بہت سے خطرات کا بیج اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ مونٹ بیٹن اور بعض اور شخصیتوں کے علاوہ وزیر اعظم اٹیلی کے سر ہے۔ انسانی تاریخ میں ان دو پستہ قد اور بظاہر بے اثر شخصیتوں (ٹرومین اور اٹیلی) کا شمار ان اشخاص میں ہو گا جن کی انصاف کشی نے امن عالم کو تباہ کر دیا۔

یونائیٹڈ نیشن کمیشن برائے انڈیا و پاکستان:

جب نئی قرارداد مجلس امن میں پیش ہوئی تو چودھری محمد علی صاحب نے اور میں نے پھر دن رات اراکین مجلس امن کے ساتھ گفتگو کا سلسلہ شروع کیا اور اس کوشش میں لگ گئے کہ جہاں تک ہو سکے نئی قرارداد کو مضبوط کیا جائے۔ چینی صدر صاحب کے ساتھ متواتر مشورے ہوئے بعض معمولی سی ترامیم اور وضاحتیں انہوں نے تسلیم بھی کیں لیکن قرارداد کا ڈھانچہ وہی رہا جو وزیر اعظم اٹیلی تجویز کرا چکے تھے۔ آخر یہ قرارداد اپریل میں کولمبین مندوب کی صدارت میں منظور ہوئی۔ اسی قرارداد میں یہ تجویز تھی کہ تین اراکین کا ایک کمیشن مقرر کیا جائے جو برعظیم پاکستان و ہند جا کر قرارداد کی مختلف تجاویز کی فریقین کے مشورے اور ان کی رضامندی کے ساتھ عملی جامعہ پہنائے اور کشمیر کے باشندگان کی آزادانہ رائے شماری کا اہتمام کرے۔ کولمبین صدر صاحب کی تجویز پر کمیشن کے اراکین کی تعداد تین سے بڑھا کر پانچ کر دی گئی۔ طے پایا کہ اس کمیشن میں دو رکن مجلس امن نامزد کرے اور وہ دونوں ایک تیسرا رکن نامزد کریں ان کے علاوہ ایک رکن پاکستان اور ایک ہندوستان نامزد کرے۔ مجلس امن نے بیلجیئم اور کولمبیا کو نامزد کیا اور ان دونوں نے ریاستہائے متحدہ امریکہ کو نامزد کیا۔ پاکستان نے ارجنٹائن کو اور ہندوستان نے چیکوسلواکیہ کو نامزد کیا۔ کمیشن کا اصطلاحی نام:

United Nations Commission on India & Pakistan (UNCIP)

قرار پایا کیونکہ کشمیر کے علاوہ جونا گڑھ کا قضیہ اور بعض اور امور بھی جو پاکستان کی طرف سے پیش کیے گئے تھے اس کمیشن کے سپرد تھے لیکن عرف عام میں اس کمیشن کا نام کشمیر کمیشن ہی مشہور ہوا۔

Marfat.com

''کشمیر کا فیصلہ کشمیر میں ہوگا'' قرارداد کے منظور ہونے تک ہندوستان کا یہی موقف تھا کہ مجلس امن لڑائی بند کرانے کا انتظام کردے باقی سب امور وہ خود طے کرلیں گے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ مجلس امن اصل نزاع کا فیصلہ اپنی نگرانی میں کرانے پر مصر ہے تو انہوں نے اپنی فوجی سرگرمیوں کو تیز کرنے کا تہیہ کرلیا۔ جب حکومت ہند کے اس عزم کو بھنک ہمارے کانوں میں پڑی تو ہم ابھی نیویارک ہی میں تھے چنانچہ چودھری صاحب نے اور میں نے اس اقدام کے متعلق مشورہ کیا اور میری یہ پختہ رائے ہوئی کہ ہمیں ہندوستان کے اقدام کی روک تھام کیلیے اپنی فوج محاذ پر بھیج دینی چاہیے اور میں نے ارادہ کیا کہ میں اپنی رائے کی اطلاع وزیراعظم لیاقت علی خان کی خدمت میں بھیج دوں۔ چودھری صاحب کو اگرچہ حالات کے لحاظ سے یہ خدشہ تو محسوس ہوتا تھا کہ ہندوستان جنگی فیصلے کی کوشش کرے گا لیکن انہیں ایسا مشورہ تار کے ذریعے بھیجنے میں تامل تھا ان کے خیال میں Cypher کے ذریعے سے پیغام بھیجنا محفوظ طریق نہ تھا۔ انہیں خدشہ تھا کہ بات ظاہر ہوجائے گی اور ہم مجلس امن کے روبرو بریالزام ہوں گے۔ انہوں نے تجویز کیا کہ وزیراعظم کی خدمت میں پیغام ایک خاص قاصد کے ہاتھوں بھیجا جائے میں نے کہا مرحلہ بہت نازک ہے اور ممکن ہے تاخیر خطرے کا موجب ہو۔ بات نکل جانے میں کوئی حرج نہیں مجلس امن اپنا وقار بہت حد تک کھو چکی ہے اگر انہیں پنڈت جواہر لال نہرو کو کچھ کہنے کی ہمت نہیں تو ہمیں کیا کہہ لیں گے۔ اگر ہم مجلس امن کے خوف سے غافل بیٹھے رہے تو جو نقصان ہمیں پہنچے گا اس کا ازالہ بعد میں نہیں ہو سکے گا۔ ممکن ہے چودھری صاحب مجھ سے متفق نہ ہوئے ہوں لیکن انہوں نے ناچار رضامندی کا اظہار کردیا اور میں نے اس مضمون کا Cypher تار وزیراعظم کی خدمت میں ارسال کردیا کہ ''کشمیر کا فیصلہ کشمیر میں ہوگا'' نیویارک میں نہیں ہوگا لہٰذا ہندوستان کی فوجی تیاری کے پیش نظر لازم ہے کہ ہم اپنی باقاعدہ فوج محاذ پر بھیج دیں۔

کمانڈر انچیف کی رپورٹ کا خلاصہ:

وزیراعظم صاحب نے میرا تار ملنے پر کمانڈر انچیف سر ڈگلس گریسی کو ہدایت دی کہ وہ کشمیر کے محاذ کے متعلق موجودہ حالت کی رپورٹ پیش کریں چنانچہ انہوں نے رپورٹ پیش کی۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندوستانی افواج بڑی مستعدی سے اور بڑے پیمانے پر آگے بڑھنے کی تیاری کر رہی ہیں۔ اس صورت میں آزاد کشمیر کے فوجی دستے ان کا مقابلہ نہیں کرسکیں گے اور نہ صرف آزاد کشمیر کے علاقے بلکہ خود پاکستان کے بعض علاقے خطرے میں پڑ جائیں گے اور ممکن ہے منگلا کے مقام پر نہر کے ہیڈ ورکس بھی ہمارے ہاتھ سے نکل جائیں۔ ان کی بھی یہی رائے تھی کہ اس خدشے کے دفاع کے لیے ہمیں اپنی فوج محاذ پر بھیج دینی چاہیے۔ وزیراعظم صاحب نے جو وزیر دفاع بھی تھے اس رپورٹ کے نتیجے میں پاکستانی فوج کے محاذ پر بھیجے جانے کے احکام صادر فرمادیئے چنانچہ اپریل کے آخری ہفتے اور مئی کے پہلے ہفتے میں پاکستانی افواج نے جنگی کشمکش میں حصہ لینا شروع کردیا۔ پاکستانی افواج کا محاذ پر بھیجا جانا کوئی خفیہ اقدام نہ تھا نہ ہی ایسا اقدام خفیہ رہ سکتا تھا چند ماہ بعد پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی تقریروں میں کہنا شروع کیا کہ پاکستان کا وزیر خارجہ مجلس امن کے سامنے تو کہتا رہا کہ ہماری باقاعدہ فوج جنگ میں شامل نہیں لیکن ہمیں شروع مئی 1948ء میں ثبوت مل گیا کہ پاکستانی فوج جنگ میں حصہ لے رہی ہے اس طرح پاکستان کا وزیر خارجہ مجلس امن کے سامنے صریح غلط بیانی کا مرتکب ہوا لیکن جب ہم نے کمیشن کے آنے پر کمیشن کے روبرو ثبوت مہیا کردیا تو ناچار پاکستان کو تسلیم کرنا پڑا کہ ان کی باقاعدہ فوج محاذ جنگ پر مصروف پیکار ہے مجلس امن میں

Marfat.com

میرا یہ بیان جنوری اور فروری 1948ء میں ہوا تھا اور ہماری باقاعدہ فوج کا محاذ پر بھیجا جانا آخر اپریل یا شروع مئی 1948ء کو کراچی آئے۔ پہلے دن وہ مجھ سے رسمی ملاقات کے لیے میرے ہاں تشریف لائے میں نے اپنے ملاقات کے کمرے میں محاذ کے نقشہ جات لٹکوا دیے تھے۔ چائے اور رسمی گفتگو سے فارغ ہونے کے بعد میں نے انہیں بتایا کہ مجلس امن کی کارروائی ختم ہونے کے بعد ہندوستانی فوج تیاریوں کے پیش نظر پاکستانی افواج کے کمانڈر انچیف کے مشورے کے مطابق ہمیں دفاع کے لیے اپنی فوج کو محاذ پر بھیجنا لازم ہوگیا اور شروع مئی سے ہماری باقاعدہ فوج کے دستے محاذ پر برسرپیکار ہیں۔ نقشوں کی مدد سے میں نے سب تفصیل کمیشن پر واضح کر دی۔ اس سے قبل کمیشن کو اس امر کی اطلاع کسی اور ذریعے سے نہیں پہنچی تھی اور دلی تو ابھی کمیشن کا جانا ہی نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا پنڈت نہرو کا یہ کہنا بھی درست نہیں کہ جب ان کی طرف سے پاکستان افواج کے محاذ پر ہونے کا ثبوت کمیشن کے روبرو پیش کر دیا گیا تو پاکستان کو کمیشن کے روبرو اس امر کو تسلیم کرنے کے سوا چارہ نہ رہا۔ کمیشن کو اس اقدام کی اطلاع ہم نے خود کی تھی اور ان کے کراچی پہنچنے پر پہلی ملاقات میں کر دی تھی۔

اقوام متحدہ کی کشمیر کمیشن کے اراکین کے سپرد جو کام کیا گیا تھا وہ نہایت ہی اہم اور بہت ذمہ داری کا تھا لیکن نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ متعلقہ حکومتوں نے اس کام کی اہمیت کو مناسب وقعت نہ دی اور اپنے نمائندوں کے انتخاب میں نہایت سہل انگاری سے کام لیا کمیشن کے اراکین بلاشبہ شرفاء تھے لیکن سیاسی سوجھ بوجھ ہمت اور حوصلے کے لحاظ سے اس درجہ تک نہیں پہنچے تھے جو ان کے فرائض کی کماحقہ ادائیگی کے لیے ضروری تھا۔ ان میں سے صرف ایک رکن ان خوبیوں کے مناسب حد تک ثابت ہوئے جو ان کے فرائض کی کامیاب ادائیگی کے لیے لازم تھیں۔ وہ چیکوسلواکیہ کے نمائندے ڈاکٹر جوزف کوربیل تھے جنہوں نے کمیشن سے علیحدگی کے بعد کمیشن کی سرگرمیوں کے متعلق ایک کتاب Danger in Kashmir شائع کی اس کتاب کا نیا ایڈیشن 1966ء کے شروع میں شائع ہوا ہے۔ بلجیم کے پہلے نمائندے ایک عمر رسیدہ Baron تھے جنہیں صرف کھانے پینے اور سونے سے سروکار تھا اگر کسی وقت کمیشن کے کام کی طرف توجہ فرماتے تو یہ دیکھنے کے لیے کہ کمیشن کا کوئی اقدام پنڈت جواہر لال نہرو کی طبع نازک پر گراں تو نہیں ہوگا۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے نمائندے کچھ توجہ فرماتے تھے لیکن ان کی شرافت ان کی ہمت پر غالب تھی۔ کولمبیا کے نمائندے ڈاکٹر کوربیل سے دوسرے درجے پر تھے اور انہوں نے اپنی زندگی کا کچھ ثبوت دیا لیکن ان کے لیے بڑی مشکل تھی کہ انگریزی زبان کی واقفیت بہت محدود تھی۔ ارجنٹائن کے نمائندے پرلے درجے کے شریف اور اس درجہ باحیا تھے کہ ان کے لیے بات کرنا دوبھر تھا۔ کمیشن نے جس حد تک اپنے فرائض کو سرانجام دیا اس میں ساٹھ فیصدی ڈاکٹر کوربیل کا حصہ تھا بیس فیصدی امریکی نمائندے کا اور بیس فیصدی کولمبین نمائندے کا۔ ڈاکٹر کوربیل 1949ء کے شروع میں کمیشن سے علیحدہ ہو گئے ان کی علیحدگی کے بعد کمیشن نیم مردہ ہوگئی اور تھوڑے عرصے بعد اس نے دم توڑ دیا۔

ڈاکٹر جوزف کوربیل کمیشن پر تقرری کے وقت چیکوسلواکیہ کے سفیر متعینہ بیلگراڈ تھے۔ چیکوسلواکیہ کو ہندوستان نے کمیشن کا رکن نامزد کیا تھا۔ ان کی رکنیت کے دوران میں چیکوسلواکیہ اشتراکیت کے زیر اثر آنا شروع ہوگیا۔ اپنے وطن کے رجحان سے خائف ہو کر انہوں نے 1949ء کے شروع میں ہی یہ انتظام کیا کہ ان کے بیوی بچے لندن چلے جائیں۔ کمیشن سے مستعفی ہونے پر وہ خود بھی لندن چلے گئے اور وہاں سے بیوی بچوں سمیت امریکہ چلے گئے وہاں ڈینور یونیورسٹی

Marfat.com

کے شعبہ سوشل سائنس فونڈیشن میں پروفیسر ہو گئے اور اب چند سالوں سے فونڈیشن کے ڈائریکٹر اور یونیورسٹی کے شعبہ بین الاقوامی تعلقات کے سربراہ ہیں۔ میرے جو مراسم ان کے ساتھ کمیشن کے سلسلے میں قائم ہوئے تھے وہ ان کے کمیشن سے مستعفی ہونے کے بعد بھی قائم رہے اور بتدریج مضبوط ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ ان مراسم نے گہرا دوستانہ رنگ اختیار کر لیا۔ مجھے کئی بار ان کے توسط سے ڈینور یونیورسٹی میں تقریر کے لیے اور دیگر تقاریب کے سلسلے میں جانے کا اتفاق ہوا ہے اور ہر موقع پر ان کی طرف سے بڑی تواضع اور شفقت کا سلوک ہوا۔ فجز اہ اللہ۔ ایک موقع پر میں ڈینور میں ان کے ہاں گیا ہوا تھا، ان کے بیوی بچوں کے ساتھ بے تکلفی ہو چکی تھی۔ میں نے باتوں باتوں میں ان کے صاحبزادے سے کہا جب تمہارے ابا کمیشن میں پہلے پہل مجھ سے ملے تو یہ مجھے کچھ شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے اور واقعات پر بھی جب تک پورے طور پر اپنا اطمینان نہ کر لیتے تھے میری بات کا انہیں اعتبار نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت ڈاکٹر کوربیل بھی موجود تھے اور یہ بات دراصل میں نے انہیں سنانے کے لیے کہی تھی۔ وہ نہایت سنجیدہ مزاج ہیں میری بات پر مسکرائے اور کہا نہیں یہ بات نہیں کمیشن کے سب اراکین تم سے کچھ خائف تو ضرور تھے لیکن یہ احساس ضرور تھا کہ مسٹر محمد علی اور تم دونوں پنڈت جواہر لال نہرو کی کسی بات کو محض ان کے کہنے پر قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے اور ان کی ہر بات کا تحریر میں ہونا اور واضح الفاظ میں ہونا ضروری سمجھتے تھے۔ اس پر تمہارے اصرار سے ہمیں تعجب بھی ہوتا تھا اور بعض دفعہ ہمیں دقت بھی محسوس ہوتی تھی۔ ہمارے لیے یہ سمجھنا مشکل تھا کہ ایک بلند مرتبت شہرہ آفاق ہستی جس کی عالمی شہرت ایسی نیک تھی اس کے زبانی قول یا وعدے کو قبول کرنے میں تم دونوں کو اس قدر تامل کیوں ہے لیکن یہ کیفیت دیر تک قائم نہ رہی جیسے جیسے ہمارا واسطہ پنڈت نہرو سے پڑتا رہا ہمارے تجربے سے تمہارے موقف کی صحت کی تصدیق ہوتی رہی۔ اگر یہ امر آج تمہارے لیے کسی اطمینان کا باعث ہو سکتا ہے تو مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ جب میں کمیشن سے علیحدہ ہوا اس وقت تک ہم سب کی متفقہ رائے ہو چکی تھی کہ:

"All your suspicions of Pandit Nehru, were more than fully justified"

''پنڈت نہرو کے متعلق تمہارے شکوک بالکل حق بجانب تھے۔''

کمیشن کے اراکین کے متعلق میری رائے صحیح ہو یا غلط لیکن اس میں شک نہیں کہ کمیشن نے کراچی اور دلی کے درمیان آنے جانے میں کوئی سستی نہ دکھائی اور دو تین اراکین سارا وقت محنت سے کام کرتے رہے۔ آخر کمیشن نے اپنی پہلی قرارداد 13 اگست 1948ء کو تیار کر لی۔ حکومت ہند نے اسے قبول کر لیا کیونکہ یہ قرارداد بہت حد تک ان کے موقف کی موید تھی۔ لیکن پاکستان کی حکومت نے اسے قبول نہ کیا جس کی بہت سی وجوہ تھیں۔ سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ قرارداد جنگ بندی اور فوجی انخلاء تک محدود تھی اور اس میں رائے عامہ کے استصواب کے متعلق کوئی تجاویز شامل نہیں تھیں۔ اس پر کمیشن نے اپنی سرگرمی جاری رکھی اور آخر دسمبر 1948ء میں ایک دوسری قرارداد بطور تتمہ کے تیار کی اور دونوں حکومتوں کو پیش کی۔ اس سال اسمبلی کا اجلاس پیرس میں ہو رہا تھا۔ کمیشن بھی پیرس منتقل ہو گیا تھا اور وہیں یہ قرارداد تیار ہوئی۔ دسمبر 1948ء کے آخری ہفتے میں دونوں حکومتوں نے دونوں قراردادوں کو قبول کر لیا۔ اس پر کمیشن نے دونوں کو دعوت دی کہ جب اصل نزاع کے طریق فیصلہ پر اتفاق ہو گیا ہے تو اب جنگ جاری رکھنا بے وجہ نفوس اور اموال کا ضیاع ہے۔ چنانچہ کمیشن کی

Marfat.com

تحریک پر یکم جنوری 1949ء کو جنگ بند ہوگئی۔ کمیشن موقع پر طرفین کی فوجوں کے درمیان حد فاصل قائم کرنے میں بھی کامیاب ہوگئی۔ اب تیرہ اگست کی قرارداد کے مطابق ٹروس ایگریمنٹ Truce Agreement یعنی فوجی انخلاء کے معاہدے کے ترتیب دینے کا مرحلہ درپیش تھا۔ کمیشن نے کراچی میں اس کے متعلق کچھ تبادلہ خیالات کیا اور پھر دلی پہنچ کر طرفین کے فوجی نمائندوں کو طلب کیا کہ وہ 13 اگست کی قرارداد کے مطابق فوجی انخلاء کا منصوبہ تیار کر کے ساتھ لائیں۔ تاریخ مقررہ پر جب طرفین کے نمائندے کمیشن کے روبرو پیش ہوئے تو پاکستانی نمائندوں نے تو حسب ہدایت کمیشن اپنا منصوبہ کمیشن کی خدمت میں پیش کر دیا لیکن ہندوستانی نمائندوں نے کہا کہ ان کا منصوبہ تیار تو ہے لیکن ابھی کمانڈر انچیف اور وزیراعظم اسے ملاحظہ نہیں کر سکے اس لیے کچھ مہلت درکار ہے۔ آخر ہفتہ عشرہ کی تاخیر کے بعد ان کی طرف سے منصوبہ پیش کیا گیا مگر بدیں شرط کہ کمیشن تو اسے ملاحظہ کرے لیکن پاکستان بلکہ مجلس امن کو بھی اس کی اطلاع نہ ہو۔ چنانچہ آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ہندوستان نے کیا منصوبہ پیش کیا تھا۔

فوجی انخلاء کے متعلق قرارداد یہ تھی کہ قبائلیوں اور رضا کاروں کے ریاست کی حدود سے اخراج کے بعد پاکستانی فوج تمام کی تمام اور ہندوستانی فوج کا کثیر حصہ Bulk ریاست سے نکل جائے۔ جنگ بندی کے بعد قبائلی اور رضا کار جو ریاست کے باہر سے لڑائی میں شامل ہوئے تھے ریاست سے چلے گئے اور کمیشن کو قرارداد کے اس حصے کی تعمیل کے متعلق اطمینان ہوگیا۔ اب سوال پیدا ہوا کہ کشمیر میں جو ہندوستانی فوجیں داخل ہوئی تھیں ان کا کثیر حصہ Bulk کیا قرار دیا جائے اس بات پر کمیشن اور ہندوستانی نمائندوں کا اتفاق نہ ہو سکا چنانچہ کمیشن نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ ہم ہندوستان کے پیش کردہ منصوبے پر تو اپنی رپورٹ میں بحث کرنے کے مجاز نہیں کیونکہ ہندوستان کی طرف سے ہم پر یہ شرط عائد کر دی گئی ہے کہ ہم منصوبے کی تفاصیل کا اظہار نہ کریں لیکن منصوبے پر غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کمیت اور کیفیت دونوں لحاظ سے ہندوستان کا پیش کردہ منصوبہ قرارداد کے ساتھ موافقت نہیں رکھتا۔ کمیشن کے الفاظ حسب ذیل تھے:۔

"Neither quantitively nor qualitatively does the plan comply with the terms of the Resolution"

اس مرحلے پر کمیشن نے یہ بھی کہہ دیا کہ جنگ بندی ہو کر حد فاصل مقرر ہو گئی ہے۔ ہماری رائے میں اب مزید کارروائی کی نگرانی کے لیے کمیشن کی بجائے ایک فرد واحد زیادہ موزوں ہوگا۔

سر اوون ڈکسن کا تقرر:

امن نے کمیشن کی یہ سفارش منظور کرتے ہوئے آسٹریلیا کی عدالت عالیہ کے جج سر اوون ڈکسن کو جو بعد میں آسٹریلیا کے چیف جسٹس بھی ہوئے کشمیر کے قضیہ میں اقوام متحدہ کا نمائندہ مقرر کیا۔ انہیں ہدایت کی گئی کہ وہ رائے عامہ کے استصواب کی شرائط طے کرنے کے بعد استصواب کا انصرام کریں یا فریقین کی رضامندی سے اس قضیہ کے طے کرنے کا کوئی اور طریقہ اختیار کریں۔ سر اوون ڈکسن نہایت قابل اور پختہ کار شخص تھے۔ وہ کراچی تشریف لائے اور پھر دلی بھی گئے۔ معلوم ہوتا ہے وہ جلد اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ ہندوستان کے وزیراعظم کوئی ایسی شرائط تسلیم کرنے پر کبھی رضامند نہیں ہوں گے جن کے تحت آزاد اور بے لاگ استصواب رائے کیا جا سکے۔ اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد انہوں نے اس قضیہ کو

Marfat.com

سلجھانے کے لیے کسی اور مناسب اور موثر طریق پر غور کرنا شروع کیا۔ ایک تجویز ان کے ذہن میں آئی جس کے خاکے کا ذکر انہوں نے دلی میں پنڈت جواہر لال نہرو سے کیا اور کہا پیشتر اس کے کہ میں اس تجویز کی تفاصیل تیار کروں میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تفاصیل تیار ہو جانے پر آپ اس تجویز کے متعلق میرے ساتھ اور وزیر اعظم پاکستان کے ساتھ تبادلہ خیالات پر آمادہ ہوں گے یا نہیں۔ بقول سر اوون پنڈت صاحب نے آمادگی ظاہر کی اور سر اوون نے پنڈت صاحب کو کہا کہ وہ اب کراچی جا کر وزیر اعظم پاکستان سے یہی استصواب کریں گے اور اگر وہ بھی تبادلہ خیالات پر رضامند ہو گئے تو وہ تجویز کی تفاصیل تیار کر کے دونوں کو اس تجویز پر تبادلہ خیالات کی دعوت دیں گے۔ چنانچہ سر اوون کراچی تشریف لائے اور میرے اور چودھری محمد علی صاحب کے ساتھ اس کے متعلق گفتگو کی۔ ہم نے کہا کہ تجویز کی تفاصیل ابھی تیار نہیں اگر تفاصیل تیار ہونے پر تبادلہ خیالات کے بعد فریقین میں اتفاق رائے نہ ہو سکا تو کیا صورت ہوگی۔ انہوں نے فرمایا میں یہ واضح کر دوں گا کہ ایسی صورت میں فریقین کے موقف پر کوئی کسی قسم کا اثر نہیں پڑے گا اور کشمیر کمیشن کی دونوں قراردادیں جنہیں دونوں فریق تسلیم کر چکے ہیں بدستور قائم رہیں گی اور فریقین پر ان کی پابندی لازم ہوگی۔ اس شرط پر نوابزادہ لیاقت علی خان صاحب نے بھی سر اوون ڈکسن کی تجویز پر تفاصیل تیار ہونے کے بعد تبادلہ خیالات کرنے پر آمادگی کا اظہار کر دیا۔ سر اوون نے فرمایا یہ ابتدائی مرحلہ تو طے ہو گیا اب میں اپنی تجویز کی تفاصیل تیار کر کے فریقین کو تبادلہ خیالات کی دعوت دوں گا۔ چودھری محمد علی صاحب نے سر اوون سے کہا کہ آپ پنڈت نہرو کو اطلاع کر دیں کہ چونکہ دونوں فریق آپ کی تجویز کی تفاصیل تیار ہونے پر اس پر تبادلہ خیالات پر آمادہ ہیں لہٰذا اب آپ تجویز کی تفاصیل طے کر کے انہیں مطلع کریں گے۔ سر اوون کو ابھی پنڈت جی کے طریق کار کا تجربہ نہ تھا۔ انہوں نے فرمایا اس کی کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ چودھری صاحب پنڈت صاحب کو خوب جانتے تھے اس لیے مصر ہوئے کہ انہیں بذریعہ تار ضرور مطلع کیا جائے۔ ان کے اصرار پر سر اوون تار بھیجنے پر رضامند ہو گئے اور اسی شام سر اوون نے پنڈت جی کو تار دے دیا کہ جس تجویز کے خاکے کا میں نے آپ سے ذکر کیا تھا وزیر اعظم پاکستان بھی آپ کی طرح اس کی تفاصیل تیار ہونے پر اس پر میرے اور آپ کے ساتھ تبادلہ خیالات کے لیے آمادہ ہیں اس لیے میں اب اس تجویز کی تفاصیل تیار کر کے آپ کو مطلع کروں گا۔ دوسرے دن سر اوون تشریف لائے۔ بڑے آزردہ تھے۔ فرمایا تمہیں معلوم ہے پنڈت نہرو نے میرے تار کا کیا حیرت انگیز جواب دیا ہے۔ دریافت کرنے پر فرمایا پنڈت جی نے جواب دیا ہے "مجھے تمہارے تار کی سمجھ نہیں آئی۔ مجھے تمہاری کسی تجویز کا علم نہیں۔ میرے لیے یہ بالکل نیا معاملہ ہے تم دلی آؤ تو اس پر بات چیت کریں گے۔" سر اوون نے فرمایا۔ اس تجویز کے متعلق میری اور پنڈت نہرو کی جو گفتگو ہوئی وہ بالکل واضح تھی اور اس میں کسی قسم کی غلط فہمی کا کوئی امکان نہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ مزید غور کرنے پر وہ اس نتیجے پر پہنچے ہوں کہ میری تجویز پر تبادلہ خیالات کرنا ان کے مفاد کے خلاف ہے اور وہ اب اس پر آمادہ نہیں لیکن ان کا یہ کہنا کہ انہوں نے پہلے کسی ایسی تجویز کا ذکر بھی نہیں سنا اور ان کے لیے یہ ایک بالکل نئی بات ہے خلاف واقعہ ہے بہر صورت اگرچہ میرا دلی جانا بے سود ہے لیکن میں ان کی دعوت کو رد بھی نہیں کر سکتا کہ ایسا کرنا بد خلقی ہوگی۔ لہٰذا میں کل دلی جا رہا ہوں شاید اس معمے کا حل وہاں جا کر معلوم ہو۔ تیسرے دن وہ کراچی واپس آئے اور بتلایا کہ دلی پہنچنے پر سر گرجا شنکر باجپائی ان کی پیشوائی کے لیے مطار پر آئے ہوئے تھے۔ فرمایا جب ہم کار میں بیٹھ گئے تو میں نے ان سے کہا آپ کے

Marfat.com

وزیراعظم کا اپنی رائے بدل لینا تو سمجھ میں آ سکتا ہے لیکن انہوں نے یہ کیسے لکھا کہ انہیں میری کسی تجویز کا علم ہی نہیں اور ان کے لیے یہ بالکل نئی بات ہے اس کے جواب میں سر گرجا شنکر باجپائی نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا:۔

Sir Owen! I conceive the Prime Minister must have suffered an attack of temporary Amnesia"

''سر اوون! میرا خیال ہے میرے وزیراعظم پر شاید عارضی نسیان کا حملہ ہوگیا ہو۔''

سر گرجا شنکر کا یہ فقرہ دہرانے کے بعد سر اوون نے جو کچھ کہا وہ پنڈت جی کی وفات کے بعد ضبط تحریر میں لانا مناسب نہیں۔

ڈاکٹر فرینک گراہم کا تقرر:

سر اوون ڈکس نے اپنی ناکامی کی رپورٹ مجلس امن کو بھیج دی۔ مجلس امن نے فریقین کے بیانات سن کر کینیڈا کے مندوب جنرل میکناٹن سے درخواست کی کہ وہ فریقین کے ساتھ بات چیت کے بعد اس قضیے کے تصفیہ کے لیے کوئی عملی تجویز پیش کریں جنرل میکناٹن نے جو تجویز پیش کی اس کا مقصد بھی عملاً وہی تھا جو سر اوون کی تجویز کا تھا لیکن ہندوستان نے اسے بھی رد کر دیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر فرینک گراہم کشمیر کے معاملے میں اقوام متحدہ کے نمائندے مقرر کیے گئے وہ کئی بار کراچی تشریف لائے اور دلی بھی تشریف لے گئے۔ جنیوا میں فریقین کے ساتھ تبادلہ خیالات کیا۔ ایک چھوڑ چھ رپورٹیں مجلس امن میں پیش کی گئیں۔ ہر رپورٹ میں اس امر پر بحث تھی کہ فوج کے انخلاء کا کیا طریق ہو۔ عموماً یہی ہوا کہ جو طریق بھی انہوں نے تجویز کیا پاکستان اس پر عمل کرنے کو تیار ہو گیا لیکن ہندوستان نے انکار کر دیا۔ مجلس امن کی مساعی بھی ہندوستان کو اپنی ضد ترک کرنے پر آمادہ نہ کر سکیں۔ ایک عرصے تک تو یہی امر زیر بحث رہا کہ ہندوستان اپنی افواج متعینہ کشمیر میں سے کتنی افواج کے انخلاء پر رضامند ہونے کو تیار ہے۔ ہندوستان کی طرف سے ہر نوع کا بہانہ اور عذر ہوتا رہا۔ آخر کار مجلس امن کے ایک اجلاس میں میں نے یہاں تک بھی کہہ دیا۔ صاحب صدر و اراکین مجلس امر زیر تنازعہ یہ ہے کہ 13 اگست 1948ء کی قرارداد کے مطابق ہندوستان اپنی افواج متعینہ کشمیر میں سے کتنی فوج واپس بلانے کا پابند ہے۔ قرارداد کے الفاظ میں Bulk of its forces لکھا ہے بحث اس امر پر ہے کہ Bulk سے کیا مراد لی جائے اس لفظ کی کچھ بھی تعبیر ہو اس سے مراد بہر صورت کثرت ہے یعنی ان افواج کا زیادہ حصہ ریاست سے واپس بلا لیا جائے۔ ہندوستان نے قرارداد کی اس شرط کی تعمیل کی ایک تجویز کمیشن میں پیش کی تھی لیکن کمیشن نے قرار دیا کہ ہندوستان کی یہ تجویز قرارداد کی شرط کو پورا نہیں کرتی۔ یعنی جتنی افواج ہندوستان ریاست سے واپس بلانے پر تیار ہے وہ ہندوستان کی افواج متعینہ ریاست کشمیر کا Bulk قرار نہیں دیا جا سکتا ہندوستان کا یہ کہنا تھا کہ جو حصہ انہوں نے ریاست سے واپس بلانا تجویز کیا ہے وہ ان کے اندازے کے مطابق ان کی افواج متعینہ کشمیر کا Bulk یعنی زیادہ حصہ ہے اور جو حصہ وہ ریاست میں چھوڑنا تجویز کرتے ہیں وہ ان کی افواج متعینہ کشمیر کا کمتر حصہ ہے۔ صاحبان میں آپ کی خدمت میں اور آپ کے توسط سے ہندوستان کے سامنے ایک بہت آسان تجویز پیش کرتا ہوں ہم نہیں جانتے اور آپ بھی نہیں جانتے کہ ہندوستان نے کتنی افواج کا ریاست سے انخلاء تجویز کیا تھا اور کتنی افواج کا کشمیر میں چھوڑنا تجویز کیا تھا لیکن اتنا ہم سمجھتے ہیں کہ جو حصہ انہوں

Marfat.com

نے نکالنا تجویز کیا تھا وہ ان کے اندازے کے مطابق بڑا حصہ تھا اور جو حصہ یہ پیچھے چھوڑنے والے تھے وہ چھوٹا حصہ تھا۔ میری تجویز ہے کہ جو حصہ یہ نکالنے کو تیار تھے اور جو ان کے اندازے کے مطابق بڑا حصہ تھا وہ یہ نہ نکالیں اور اسے پیچھے چھوڑ دیں اور جو حصہ یہ پیچھے چھوڑنے والے تھے جسے یہ تھوڑا حصہ شمار کرتے تھے وہ حصہ یہ ریاست سے نکال لیں۔ انہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے یہ تجویز بھی ہندوستان کو نامنظور ہوئی۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ ہندوستان نے جو تجویز انخلاء افواج کے متعلق کشمیر کمیشن کو پیش کی تھی اس میں صرف قلیل حصہ افواج کا واپس بلوانے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔

کشمیر کو اپنی کالونی بنانے کی پالیسی:

اس اثناء میں حکومت ہند نے ہر طریق سے کشمیر کے عوام کو اپنے حق میں پھسلانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ انہوں نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ جو اسباب پاکستان کے ظہور میں آنے کا موجب ہوئے تھے وہی اسباب کشمیر اور ہندوستان کے اتحاد کے رستے میں روک ہیں بلکہ بعض وجوہ سے کشمیر کے رستے میں یہ روک اور بھی ناقابل عبور ہے۔ برعظیم ہندوپاک میں اگرچہ مسلمانوں کو ہندو ذہنیت کا بہت کچھ تلخ تجربہ ہوا لیکن مسلمانوں پر ہندو ذہنیت کی ''کرم فرمائی'' کے رستے میں برطانوی اقتدار ایک حد تک حائل رہا تھا۔ اس کے برعکس کشمیر میں ڈوگرہ راج ایک سو سال سے مسلم آبادی کو بے دردی سے کچلنے میں بلا روک ٹوک مصروف رہا تھا۔ یہ امید رکھنا کہ ڈوگرہ مظالم کی یاد کشمیر کے مسلمانوں کے دل و دماغ سے محو کی جا سکے گی عبث ہے۔ پھر تقسیم ملک کے بعد خود ہندوستان میں جو سلوک مسلم اقلیت کے ساتھ روا رکھا جا رہا ہے وہ کشمیر کے مسلمانوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔ تیسرے ہندوستانی فوج کی طرف سے جو ظالمانہ اور حیا سوز سلوک کشمیر کی مسلم آبادی کے ساتھ ہو رہا ہے وہ ہندوستان اور کشمیر کے مسلمانوں کے درمیان ایک ناقابل عبور خلیج قائم کرنے والا ہے۔ ہندوستان کی آنکھیں کھولنے کے لیے یہی امر کافی ہونا چاہئے کہ وہی شیر کشمیر شیخ عبداللہ جن کو پنڈت نہرو بڑے فخر سے کشمیر کے متعلق اپنے موقف کی تائید میں پیش کیا کرتے تھے آخر کار ہندوستان کے سلوک اور پنڈت صاحب کی وعدہ خلافیوں سے سبق حاصل کر کے کشمیر کے حق خود اختیاری کی تائید میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ جس کی پاداش میں پنڈت جی نے انہیں بغیر مقدمہ چلائے بارہ سال تک جیل میں رکھا۔ اس طویل حراست سے رہا ہونے کے بعد وہ پھر اس حق کے حصول کے لیے انتہائی جدوجہد کر رہے ہیں۔ حال ہی میں شیخ صاحب نے کشمیری عوام کی کنونشن میں تقریر کرتے ہوئے صاف صاف الفاظ میں اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے پنڈت جی کے وعدوں پر اعتبار کرنے میں غلطی کی اور الزام لگایا ہے کہ پنڈت جی نے نہ صرف ان سے کیے گئے وعدوں سے انحراف کیا بلکہ اقوام متحدہ کی مجلس امن میں جو کچھ انہوں نے منظور کیا اس سے بھی منحرف ہو گئے اور کشمیر کو ہندوستان کی کالونی بنانے کی پالیسی اختیار کر لی۔

ہندوستان نے جو اقدام کشمیر کا الحاق اپنے ساتھ کرنے کے سلسلے میں کیے ان میں سے ایک کشمیر میں آئین ساز مجلس کا قیام تھا۔ جونہی اس کے متعلق ہندوستان کی طرف سے ابتدائی اعلان ہوا پاکستان نے مجلس امن میں اس کے خلاف احتجاج کیا۔ اس احتجاج کے جواب میں سربی۔ این۔ راؤ نے جو اس زمانے میں اقوام متحدہ میں ہندوستان کے مستقل نمائندہ تھے حکومت ہند کی طرف سے ایک بیان مجلس امن کے روبرو پڑھ کر سنایا جس میں کہا گیا تھا کہ ہندوستان مجوزہ مجلس آئین ساز کو الحاق کے مسئلے پر اظہار رائے کرنے سے روک نہیں سکتا لیکن چونکہ یہ مسئلہ مجوزہ مجلس کے اختیار سے باہر ہو گا

Marfat.com

اس لیے اگر وہ مجلس اس مسئلے پر کسی رائے کا اظہار کرے تو اس کا کوئی اثر اس قضیے پر نہیں ہوگا جو مجلس امن کے سامنے ہے لیکن حکومت ہند کے اس اعلان اور اقرار کا بھی وہی حشر ہوا جو ان کے باقی معاہدوں کا ہوتا رہا ہے۔ اور بالآخر ہندوستان نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ چونکہ کشمیر کی نام نہاد مجلس آئین ساز ہندوستان کے ساتھ الحاق کی تائید کر چکی ہے اس لیے اب اس مسئلے پر کسی استصواب رائے عامہ کی ضرورت نہیں رہی۔

مجلس امن میں کشمیر کے معاملے پر ہندوستان کی نمائندگی جب مسٹر کرشنا مینن کرنے لگے تو انہوں نے سرے سے ہندوستان کی تمام ذمہ داری سے ہی انکار کر دیا۔ اول تو کہا کہ ریاست کا الحاق ہندوستان کے ساتھ پہلے دن سے ہی غیر مشروط، پختہ اور مستقل ہے اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی کی گنجائش ہی نہیں۔ دوسرے کمیشن کی قرارداد کی رو سے ہندوستانی افواج کا انخلاء اسی صورت میں لازم آتا ہے جب پاکستان کی تمام افواج آزاد کشمیر سے واپس ہو جائیں چونکہ پاکستان نے اس تمام عرصے میں اپنی اس ذمہ داری کو پورا نہیں کیا اس لیے ہندوستان اپنی ذمہ داری سے آزاد ہو چکا ہے تیسرے چونکہ اس تمام عرصے میں حالات بہت حد تک بدل چکے ہیں اس لیے ہندوستان اب قراردادوں کا پابند نہیں رہا۔ چوتھے چونکہ اب ہندوستان نے آئینی طور پر ریاست کو ہندوستان کا جزو قرار دے دیا ہے اس لیے کشمیر کا قضیہ حل ہو گیا ہے اور کوئی تنازعہ باقی نہیں رہا جس پر مجلس امن یا کسی اور ادارے کو کچھ کہنے یا کرنے کا حق ہو۔ ان سب باتوں کا کافی وشافی جواب دیا گیا لیکن مسٹر مینن اپنی کج بحثی پر قائم رہے مجلس امن تو فروری 1948ء میں ہی مسٹر اٹیلی کے افسوسناک اقدام کے نتیجے میں اپنی بے بسی کا اظہار کر چکی تھی۔ مسٹر کرشنا مینن کی موشگافیوں کو مجلس کے اراکین حیرانی سے سنتے تھے اور مسکرا دیتے تھے۔ متعدد بار پاکستان کی طرف سے کہا گیا کہ ایک فریق یکطرفہ طور پر ایک بین الاقوامی قضیے کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اگر مسٹر کرشنا مینن یا حکومت ہند واقعہ میں ان ڈھکوسلوں کو جو ہندوستان کی طرف سے پیش کیے جاتے ہیں درست سمجھتی ہے تو ان تمام امور کے متعلق بین الاقوامی عدالت کی رائے طلب کی جاسکتی ہے۔ عدالت سے درخواست کی جائے کہ وہ فریقین کے تمام عذرات اور دلائل پر غور کر کے اس امر پر رائے دے کہ کمیشن کی 13 اگست 1948ء اور 4 جنوری 1949ء کی قراردادوں کے ماتحت فریقین کی کیا ذمہ داریاں ہیں اور دونوں فریقین عدالت کی رائے کے مطابق اپنی اپنی ذمہ داری کو پورا کریں لیکن ہندوستان کو یہ بھی منظور نہ ہوا۔ غرض اگر کسی وقت حکومت ہند کو اپنے قول وقرار کا کوئی پاس تھا بھی تو رفتہ رفتہ اس کے نمائندوں نے اپنے اعلانات اور معاہدات کو خیرباد کہہ دیا اور آخر کار یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہم نے تو قضیہ کشمیر کو ختم کر دیا ہے اور جموں اور کشمیر کے علاقے مملکت ہند کا جزو لاینفک بن چکے ہیں۔ (تحدیث نعمت: مسٹر ظفر اللہ خان صفحہ 545 تا 563 سے انتخاب)

سری نگر پر قابض ہوتے ہی بھارتی افواج نے ڈوگرہ افواج کی معاونت سے مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ اب مجاہدین کو ڈوگرہ افواج کے ساتھ ساتھ بھارتی افواج سے بھی نبرد آزما ہونا تھا لیکن ڈوگرہ اور بھارتی افواج کی مشترکہ قوت کے باوجود مجاہدین کی کامیاب پیش قدمی جاری رہی اور انہیں قلت تعداد و وسائل کے باوجود دشمن کی مشترکہ قوت کے مقابلے میں کامیابی پر کامیابی حاصل ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ مجاہدین ریاست کے ایک تہائی سے زیادہ حصہ بھارتی سامراج کے پنجہ استبداد سے آزاد کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ بھارتی افواج کے خلاف مجاہدین کی مسلسل کامیابیوں سے بھارتی حکومت کو یقین ہو گیا کہ اگر یہ جنگ جاری رہی تو کشمیر کی آزادی میں کچھ زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ لہٰذا اس نے اپنی

Marfat.com

روایتی مکاری سے کام لیتے ہوئے اس مسئلے کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح جنوری 1947ء میں مسئلہ کشمیر خود بھارتی حکومت کی طرف سے اس عالمی ادارے کے سامنے پیش کیا گیا، اس موقع پر سلامتی کونسل میں بھارتی حکومت کے نمائندے نے اس مسئلے کے حل کے لیے اپنے ملک کا موقف پیش کرتے ہوئے اعلان کیا تھا:

''یہ سوال کہ ریاست جموں وکشمیر کا الحاق ہندوستان سے ہو یا پاکستان سے، اور یا پھر یہ آزاد رہے، اس بارے میں ہم اپنے ہمسایوں کو بھی یقین دلاتے ہیں اور پوری دنیا کو بھی کہ ان امور کے بارے میں ہم نے یہ طے کر رکھا ہے کہ اس کا انحصار کشمیری عوام کے آزادانہ فیصلے پر ہوگا جس کا موقع انہیں ریاست میں حالات معمول پر آتے ہی فراہم کیا جائے گا۔''

بھارت کے بانی وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے ملک کے اس موقف کو اس سے بھی زیادہ دوٹوک انداز میں بیان کرتے ہوئے کہا: خواہ کچھ بھی ہو، بھارت نے پہلے دن ہی سے اپنے اس اصول کی پابندی کا عہد کیا ہے کہ ریاست کے بارے میں آخری فیصلہ خود کشمیری عوام کو کرنا ہے ہم اپنے عہد سے کسی صورت بھی پیچھے نہیں ہٹیں گے، یہی وجہ ہے کہ ہم نے اکتوبر 1947ء میں کشمیر کے بھارت کے ساتھ الحاق کو عارضی اور مشروط طور پر منظور کیا تھا۔ الحاق کے بارے میں حتمی فیصلہ کشمیری عوام کو اپنی آزادانہ مرضی سے کرنا ہے اور یہ فیصلہ ابھی ہونا ہے۔''

مسئلہ کشمیر کے سلامتی کونسل میں پیش ہونے کے بعد بھارتی حکومت کی طرف سے دعویٰ اور حکومت پاکستان کی طرف سے جواب دعویٰ پیش کیا گیا اور یوں اس مسئلے پر بحث وتمحیص کے ایک طویل سلسلے کا آغاز ہوگیا۔

مسئلہ کشمیر کے سلسلے میں سلامتی کونسل کی پہلی قرارداد (نمبر 1948/38ء) میں جنگ بندی کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس کے بعد 20 جنوری 1948ء کو ایک دوسری قرارداد (نمبر 1949/39ء) کے ذریعے سے اس معاملے میں فریقین کے ساتھ گفت وشنید اور افہام وتفہیم کے لیے ایک کمیشن کی تشکیل کی سفارش کی گئی۔

21 اپریل 1948ء کو اس سلسلے میں ایک اور قرارداد (1948/47ء) پاس کی گئی جس میں مسئلہ کشمیر کے حل کے سلسلے میں اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندوپاک کے تقرر کی توثیق کی گئی اور پاکستان اور بھارت کی حکومتوں سے کہا گیا کہ وہ اس خطے میں امن کے قیام اور ریاست کے مستقبل کے تعین کے لیے رائے شماری کے انعقاد کے سلسلے میں کمیشن سے تعاون کریں۔ تاکہ آزادانہ اور غیر جانبدارانہ رائے شماری کے انعقاد کے ذریعے ریاست کے پاکستان یا بھارت کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کیا جا سکے۔ اس قرارداد میں جنگ بندی پر عمل درآمد اور رائے شماری کے انعقاد کے طریقے کار کا بھی تفصیل سے ذکر کیا گیا تھا۔

اس کے بعد 13 اگست 1948ء کو اقوام متحدہ کمیشن برائے ہندوپاک کی طرف سے ریاست میں جنگ بندی پر عملدرآمد کرانے اور ریاست کے مستقبل کے تعین کے لیے رائے شماری کرانے کے بارے میں قرارداد سامنے آئی۔ اس قرارداد میں حکومت پاکستان اور حکومت ہند، دونوں سے فوری جنگ بندی کا مطالبہ کرتے ہوئے ایسے اقدامات کی سفارش کی گئی تھی جن کے ذریعے سے ریاست میں رائے شماری کے لیے سازگار فضا پیدا ہوتی کہ ریاست کے مستقبل کے تعین کے لیے آزادانہ اور غیر جانبدارانہ رائے شماری کا انعقاد کیا جا سکے۔

دسمبر 1948ء کے اواخر میں کمیشن کو حکومت پاکستان اور حکومت ہند کی طرف سے ریاست میں جنگ بندی پر عملدرآمد اور رائے شماری کے انعقاد پر رضامندی کی اطلاعات موصول ہوئیں تو 5 جنوری 1949ء کو کمیشن کی طرف سے ایک

Marfat.com

اور قرارداد سامنے آئی اس قرارداد میں جنگ بندی پر عمل درآمد اور رائے شماری کے انعقاد کے طریق کار کا واضح طور پر تعین کر دیا گیا اور کہا گیا کہ یہ رائے شماری اقوام متحدہ کی نگرانی میں آزادانہ اور غیر جانبدارانہ فضا میں ہوگی اور اس کے ذریعے کشمیری عوام کو یہ موقع مہیا کیا جائے گا کہ وہ پاکستان اور ہندوستان دونوں میں سے جس کے ساتھ چاہیں، الحاق کریں۔

ملاحظہ ہو اقوام متحدہ کی قرارداد نمبر 1948/47ء مورخہ 21 اپریل 1948ء شق ب 11 اور اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندو پاک کی قرارداد مورخہ 5 جنوری 1949ء شق (ا) البتہ اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندو پاک کی قرارداد مورخہ 13 اگست 1948ء میں اس بات کی واضح طور پر صراحت نہیں کی گئی ہے لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس سیاق وسباق میں اس قرارداد کا مفہوم کچھ اور نہیں ہوسکتا ہے اور اگر کوئی شخص اس قرارداد سے کوئی اور مفہوم مراد لے رہا ہے تو یا تو اس کی نظر اس سیاق وسباق پر نہیں ہے اور یا وہ ایسا اپنے بعض مخصوص مقاصد کے لیے کر رہا ہے۔

30 مارچ 1951ء کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں اپنی قرارداد نمبر 1951/91ء میں ایک بار پھر اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندو پاک نے 13 اگست 1948ء اور 5 جنوری 1949ء کی قراردادوں کے مطابق ریاست کے مستقبل کے تعین کے لیے آزادانہ اور غیر جانبدارانہ رائے شماری کے انعقاد پر زور دیا۔

اس کے بعد 24 جنوری 1957ء کو سلامتی کونسل میں ایک بار پھر اپنی قرارداد نمبر 1957/122ء میں پاکستان اور بھارتی حکومتوں پر زور دیا کہ وہ مسئلہ کشمیر کے بارے میں سلامتی کونسل اور اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندو پاک کی اب تک کی قراردادوں کی روشنی میں ریاست میں آزادانہ اور غیر جانبدارانہ رائے شماری کے انعقاد کا اہتمام کریں۔

بھارتی حکومت سلامتی کونسل اور اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندو پاک کی ان قراردادوں کو نہ صرف تسلیم کرتی ہے بلکہ ان قراردادوں پر عملدرآمد اور ان کے مطابق کشمیر میں غیر جانبدارانہ رائے شماری کے لیے مسلسل یقین دہانیاں کراتی رہی، قومی سطح پر بھی اور بین الاقوامی سطح پر بھی، یہ یقین دہانیاں اس تواتر اور اس قدر پر زور انداز میں کرائی جاتی رہیں کہ کوئی آدمی یہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ بھارت اپنے ان وعدوں اور یقین دہانیوں سے مکر بھی سکتا ہے ہم یہاں اس سلسلے میں محض نمونے کے طور پر بھارتی قائدین کے بعض بیانات سے اقتباسات پیش کر رہے ہیں:

بھارت کے بانی وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو اقوام متحدہ کے مندوب برائے ہندو پاک کے نام اپنے ٹیلی گرام مورخہ 16 اگست 1950ء میں ریاست میں رائے شماری کے انعقاد کے بارے میں اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عملدرآمد کے بارے میں یقین دہانی کراتے ہوئے کہتے ہیں:

''ہم نے کبھی بھی اس بات سے انکار نہیں کیا ہے کہ ہم ریاست کے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرانے کے لیے اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عملدرآمد نہیں کرائیں گے۔''

16 جنوری 1951ء کو پنڈت نہرو لندن میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے اپنی اس یقین دہانی کو ان الفاظ میں دہراتے ہیں:

''ہم پہلے دن سے اس موقف کے علمبردار رہے ہیں کہ کشمیری عوام کو اس بات کا حق ملنا چاہئے کہ وہ استصواب رائے کے ذریعے خود اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کریں۔'' (بحوالہ روزنامہ The Statesman نیو دہلی مورخہ 18 جنوری 1951ء)

Marfat.com

12 فروری 1951ء کو وہ بھارتی پارلیمنٹ سے اپنے خطاب کے دوران میں ایک بار پھر کہتے ہیں۔
''ہم نے کشمیری عوام سے بھی یہ عہد کر رکھا ہے اور اقوام متحدہ کے پلیٹ فارم سے عالمی برادری سے بھی، کہ کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ کشمیری عوام کو کرنا ہے ہم اس سے پہلے بھی اپنے اس عہد پر قائم چلے آ رہے ہیں اور آئندہ بھی قائم رہیں گے۔''
6 جولائی 1951ء کو آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے پنڈت جی ایک بار پھر یقین دہانی کراتے ہیں:

''یوں معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ اس حقیقت کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ کشمیر کوئی خرید و فروخت کی چیز نہیں ہے۔ بلکہ اس کا اپنا ایک وجود اور تشخص ہے لہٰذا اس کے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حتمی حق صرف اور صرف کشمیری عوام کو حاصل ہے۔

یکم جنوری 1954ء کو کلکتہ میں ایک جلسہ عام سے خطاب کے دوران پنڈت نہرو کشمیر میں رائے شماری کے انعقاد سے متعلق اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عملدرآمد کے بارے میں اپنے عزم کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:
''ہم نے مسئلہ کشمیر کو خود اقوام متحدہ کے سامنے پیش کیا ہے اور اس کو پرامن طور پر حل کرنے کے لیے اپنا قول دیا ہے اور ایک عظیم قوم کی حیثیت سے ہم اپنے اس قول سے پھر نہیں سکتے ہیں ہم نے یہ مسئلہ اب کشمیری عوام پر چھوڑ دیا ہے، لہٰذا اس بارے میں کشمیری عوام جو فیصلہ بھی کریں گے ہم اس کے پابند رہیں گے۔ (بحوالہ امرت بازار پتریکا کلکتہ مورخہ 6 جنوری 1952ء)
26 جون 1952ء کو بھارتی پارلیمنٹ میں بیان دیتے ہوئے پنڈت نہرو ایک بار پھر کہتے ہیں۔
''اگر رائے شماری کے نتیجے میں کشمیری عوام اس بات کا فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ نہیں رہنا چاہتے ہیں تو بھی ہم ان کے اس فیصلے کو تسلیم کرنے کے پابند ہیں چاہے ہمیں اس سے کتنا ہی دکھ کیوں نہ ہو۔''
7 اگست 9152ء کو انہوں نے بھارتی پارلیمنٹ میں جو بیان دیا اس میں وہ اپنے اس موقف کو زیادہ واضح انداز میں پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''میں اپنی اس یقین دہانی کو ایک بار پھر دہرانا چاہتا ہوں کہ کشمیر کے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق صرف کشمیری عوام کو حاصل ہے میں یہ اس لیے نہیں کہتا ہوں کہ ہم نے کشمیری عوام سے اس کا عہد کر رکھا ہے یا اقوام متحدہ میں اس بات کی یقین دہانی کرر کھی ہے۔ بلکہ میں یہ اس لیے بھی کہتا ہوں کہ یہ ہماری اس پالیسی کا ایک لازمی تقاضا ہے جو ہم نے نہ صرف مسئلہ کشمیر بلکہ دیگر مسائل کے بارے میں بھی اختیار کر رکھی ہے۔
یکم مئی 1954ء کو ممتاز بھارتی جریدہ "The Statesman" کو انٹرویو دیتے ہوئے پنڈت نہرو ایک بار پھر کہتے ہیں۔
''جہاں تک مسئلہ کشمیر کا تعلق ہے وہ اب بھی اقوام متحدہ کے ایجنڈے پر موجود ہے اس لیے ہم اس کے بارے میں اپنے طور پر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے ہیں، اور نہ اقدام کرنے کے مجاز ہیں۔''
20 اگست 1953ء کو نئی دہلی میں پاکستان اور بھارت کے وزرائے اعظم کی ملاقات کے بعد منعقدہ ایک مشترکہ پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے پنڈت نہرو کہتے ہیں:

Marfat.com

''کشمیری عوام کی رائے معلوم کرنے کا سب سے اور کامیاب طریقہ صاف ستھری اور غیر جانبدارانہ استصواب رائے کا انعقاد ہے۔''

18 مئی 1954ء کو پنڈت نہرو ہندوستانی ریاستوں کے سربراہوں کی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے مسئلہ کشمیر کے بارے میں اپنے اس موقف کا اعادہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''جہاں تک بھارت کا تعلق ہے۔ وہ مسئلہ کشمیر کے بارے میں اپنی بین الاقوامی یقین دہانیوں اور معاہدوں پر عملدرآمد کا اب بھی پوری طرح پابند ہے اس طرح 31 مارچ 1955ء کو بھارتی پارلیمنٹ میں بیان دیتے ہوئے پنڈت نہرو ایک بار پھر کہتے ہیں:

''کشمیر کوئی ایسی چیز نہیں جسے بھارت یا پاکستان میں سے کوئی ملک ہڑپ کر لے، بلکہ کشمیر کا اپنا ایک وجود ہے اور اپنی ایک روح ہے، اس لیے کشمیر کے مستقبل کے بارے میں کشمیری عوام کی رائے کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔''

مسئلہ کشمیر کے حل کے سلسلے میں اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عملدرآمد کے بارے میں بھارت کی طرف سے یقین دہانیاں کرانے والا یہ شخص بھارت کا کوئی عام شہری نہیں تھا بلکہ یہ اس ملک کا بانی وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو تھا۔ جسے دنیا میں جمہوریت اور امن و آشتی کا بہت بڑا علمبردار سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے بجا طور پر پوری دنیا یہ سمجھتی تھی اور کشمیری عوام بھی، کہ پنڈت جی اپنے ان بین الاقوامی وعدوں اور یقین دہانیوں کو ہر قیمت پر عملی جامع پہنائیں گے اور ایک بڑی قوم کے بڑے لیڈر کی حیثیت سے وہ کبھی اور کسی صور میں کوئی ایسا قدم نہیں اٹھائیں گے جن سے ان کے ان وعدوں اور یقین دہانیوں پر زد پڑے، لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ کشمیر پر ان کے غاصبانہ تسلط کو استحکام حاصل ہو گیا ہے وہ اپنے ان بین الاقوامی وعدوں اور یقین دہانیوں سے مکر گئے بین الاقوامی سطح پر عہد شکنی اور وعدہ خلافی کی اتنی بڑی اور شرمناک مثال دنیا کی پوری تاریخ میں شاید ہی ملے۔ کاش! بھارتی لیڈر اور عوام کبھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا کرتے کہ ایسا کر کے انہوں نے اپنے لیے کتنی بڑی ذلت اور رسوائی مول لی ہے۔ اور تاریخ میں اپنے لیے کس قدر بدنامی کا سامان فراہم کیا ہے لیکن شاید بھارتی حکمرانوں کے نزدیک ایسا کرنا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔

بھارت نے اپنی عہد شکنی اور عالمی معاہدوں سے انحراف کے لیے جو بہانے تراشے ہیں، وہ بڑے ہی عجیب و غریب ہیں، یوں معلوم ہوتا ہے کہ بھارت کے حکمران یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے پروپیگنڈہ کے زور پر پوری دنیا سے اپنے جھوٹ کو سچ تسلیم کرالیں گے بھارتی حکمرانوں کے ان حیلوں بہانوں کا مختصر سا تجزیہ مسئلہ کشمیر سے متعلق اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عملدرآمد کے بارے میں اپنے وعدوں اور یقین دہانیوں سے انحراف کے لیے پیش ہے:

مسئلہ کشمیر کے بارے میں اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عملدرآمد کرنے اور کشمیر میں اقوام متحدہ کی زیر نگرانی آزادانہ اور غیر جانبدارانہ رائے شماری کرانے کے بارے میں اپنے بین الاقوامی وعدوں اور یقین دہانیوں سے انحراف کے لیے بھارتی حکمرانوں نے جو سب سے پہلا عذر پیش کیا وہ یہ تھا کہ پاکستان چونکہ نیٹو کا رکن بن گیا ہے، اس لیے اب صورت حال بدل گئی ہے۔ لہٰذا کشمیری عوام کو ان کا بنیادی حق یعنی حق خودارادیت نہیں دیا جا سکتا ہے۔ بھارتی حکمرانوں سے دریافت کیا جا سکتا ہے کہ آخر یہ کہاں کا انصاف ہے اور کہاں کی منطق کہ نیٹو میں شرکت کا ''گناہ'' تو پاکستان کرتا ہے، لیکن اس کی سزا کشمیری عوام

Marfat.com

کودی جاتی ہے، کیا ایسا کرنا دنیا کے کسی قانون، کسی اصول اور کسی ضابطے کی رو سے جائز ہے؟ یہ تو وہی بات ہوئی کہ اگر پھانسی کا یہ پھندا اصل مجرم کے گلے میں فٹ نہیں آتا ہے تو جس شخص کے گلے میں بھی یہ فٹ آئے اسے پھانسی پر چڑھا دیا جائے۔

اس سلسلے میں بھارت کی طرف سے جو دوسرا بہانہ تراشا گیا، یہ تھا کہ چونکہ مقبوضہ کشمیر کی کٹھ پتلی اسمبلی کشمیر کے بھارت کے ساتھ الحاق کی توثیق کر چکی ہے، اس لیے اب کشمیر کے مستقبل کے تعین کے لیے اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق رائے شماری کرانے کی کوئی ضرورت نہیں رہ جاتی ہے بھارت کی یہ دلیل اس کی پہلی دلیل سے بھی زیادہ غلط اور بے بنیاد ہے اس لیے کہ بھارت نے عالمی برادری سے وعدہ تو یہ کر رکھا ہے کہ کشمیر کے مستقبل کا تعین کرنے کے لیے کشمیر میں اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق اور اقوام متحدہ کی زیر نگرانی آزادانہ اور غیر جانبدارانہ رائے شماری کرائی جائے گی اور اب یہ کہ بھارتی فوجوں کی سنگینوں کے سائے تلے منعقد ہونے والے انتخابات کے نتیجے میں معرض وجود میں آنے والی اسمبلی کی طرف سے بھارت سے الحاق کی توثیق سے یہ ضرورت پوری ہوگئی ہے کیا اس سے زیادہ مہمل بات کوئی اور ہو سکتی ہے، کیا بھارتی فوج کی سنگینیوں کے سائے تلے انتخابات کے نتیجے میں بننے والی اسمبلی کی طرف سے بھارت کے ساتھ کشمیر کے جبری الحاق کی توثیق کو اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق اور اقوام متحدہ کی زیر نگرانی آزادانہ اور غیر جانبدارانہ رائے شماری کا متبادل قرار دیا جا سکتا ہے؟ پھر اس کا ایک انتہائی اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اس اسمبلی کے انتخابات کے موقع پر یہ سوال تو سرے سے زیر بحث تھا ہی نہیں کہ اسے کشمیر کے پاکستان یا بھارت کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کرنا ہے تاکہ عوام اس کے مطابق سوچ سمجھ کر اپنے ووٹ کا استعمال کرتے، اس کے برعکس بھارتی حکمرانوں کی طرف سے واضح طور پر کشمیری عوام سے بھی یہ کہا گیا تھا اور پوری دنیا سے بھی کہ اس اسمبلی کا کام صرف اور صرف مقبوضہ کشمیر کے انتظامی امور چلانے کے لیے قانون سازی کرنے تک محدود ہوگا، اسے ریاست کے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہوگا اور ایک اور انتہائی اہم بات یہ کہ اس اسمبلی کا حلقہ انتخاب صرف مقبوضہ کشمیر تک محدود تھا اس کے قیام کے لیے آزاد کشمیر کے عوام اور پاکستان میں مقیم مہاجرین کی رائے شامل نہیں تھی لہذا صرف ایک حصے کے عوام کے ووٹوں سے بننے والی اسمبلی کے فیصلے کو پوری ریاست کے تمام عوام کی رائے کا نمائندہ نہیں قرار دیا جا سکتا، بھارت کی اس دلیل کے ناقص اور بے بنیاد ہونے کے یہ پہلو واضح ہیں چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس اسمبلی کے انتخابات کے موقع پر جب پاکستان نے اپنے اس خدشے کا اظہار کیا عین ممکن ہے کہ ان انتخابات کے نتیجے میں معرض وجود میں آنے والی کٹھ پتلی اسمبلی کو بھارت کشمیر کے جبری الحاق کی توثیق کے لیے ''ربڑ سٹمپ'' کے طور پر استعمال کرے۔ تو بھارتی حکمرانوں کی طرف سے دوٹوک انداز میں یقین دہانی کرائی گئی کہ اس اسمبلی کا دائرہ کار صرف اور صرف مقبوضہ کشمیر کے انتظامی امور چلانے کے لیے قانون سازی کرنے تک محدود ہوگا۔ کشمیر کے مستقبل کے بارے میں فیصلہ اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق آزادانہ اور غیر جانبدارانہ رائے شماری کے ذریعے سے ہوگا، بھارتی حکمرانوں کی طرف سے یہ یقین دہانی حکومت پاکستان کو بھی کرائی گئی تھی اور اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے پلیٹ فارم سے پوری عالمی برادری کو بھی۔ شروع شروع میں تو بھارتی حکمرانوں نے انہی دو بہانوں کو بنیاد بنا کر اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق کشمیر میں رائے شماری کرانے سے انکار کرنا شروع کیا، اور ایک مدت تک وہ انہی دو بہانوں کی بنیاد پر اپنی ہٹ دھرمی قائم رہے لیکن پھر 1972ء میں معاہدہ شملہ کے بعد انہیں اس سلسلے میں ایک اور بہانہ ہاتھ آ

Marfat.com

گیا اور اس نے کہنا شروع کر دیا کہ معاہدہ شملہ کے بعد مسئلہ کشمیر کے بارے میں اقوام متحدہ کی قراردادیں خود بخود ختم ہو گئیں۔

اصل بات یہ ہے کہ بھارت کا یہ بہانہ اس کے پہلے دو بہانوں سے بھی زیادہ بے بنیاد ہے۔ اس لیے کہ معاہدہ شملہ کی پہلی شق میں کہا گیا ہے:

''بھارت اور پاکستان کے مابین تمام معاملات اقوام متحدہ کے چارٹر کے مطابق طے ہوں گے۔''

(ملاحظہ ہو معاہدہ شملہ دفعہ (1) ذیلی دفعہ (الف)

''اور اقوام متحدہ کے چارٹر میں یہ واضح طور پر کہا گیا ہے کہ اگر دو ملکوں کے مابین کبھی کوئی ایسا معاہدہ ہو جائے جو اقوام متحدہ کی کسی قرارداد کے منافی ہو، تو وہ معاہدہ از خود کالعدم متصور رہے گا۔'' (ملاحظہ ہو اقوام متحدہ کے چارٹر کی دفعہ 103)

اس اعتبار سے اگر اس معاہدے میں کہیں کوئی ایسی بات ہے جو بھارتی حکمرانوں نے نزدیک مسئلہ کشمیر کے کسی دوسرے حل کی طرف اشارہ کرتی ہے، تو وہ خود بخود غیر موثر ہو کر رہ جاتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس معاہدے میں کہیں کوئی ایسی بات نہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ مسئلہ کشمیر کے بارے میں اقوام متحدہ کی قراردادیں ختم یا غیر موثر ہو گئی ہیں۔

جہاں تک معاہدہ شملہ کی دفعہ (ا) کی ذیلی دفعہ (ب) میں بیان کردہ اس شرط کا تعلق ہے کہ دونوں ملک باہمی تنازعات بات چیت کے ذریعے سے پرامن طور پر حل کریں گے، تو اس سے بھی یہ کہیں نہیں ثابت ہوتا کہ اس سے مسئلہ کشمیر کے بارے میں اقوام متحدہ کی قراردادوں کی نفی ہو جاتی ہے اس لیے کہ اس دفعہ کی ذیلی دفعہ (الف) میں یہ شرط پہلے سے موجود ہے کہ دونوں ملکوں کے باہمی تنازعات اقوام متحدہ کی قراردادوں کے عین مطابق طے ہوں گے لہٰذا دفعہ (ا) کی ذیلی دفعات (ذیلی دفعہ الف) اور ذیلی دفعہ (ب) کو ملا کر پڑھنے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ دونوں ملک مسئلہ کشمیر کے بارے میں اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عملدرآمد کے لیے بات چیت اور مذاکرات کا دوبارہ آغاز کریں گے، لیکن ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ بھارت نے معاہدے کی اس شق پر عملدرآمد کرنے کی بجائے اسے الٹے معنی پہنانے شروع کر دیئے۔ بھارتی حکمران مسئلہ کشمیر کے بارے میں اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عمل درآمد کرنے اور کشمیر میں رائے شماری کرنے سے متعلق عالمی وعدوں اور یقین دہانیوں سے انحراف کے لیے جو بہانے بھی پیش کر رہے ہیں ان کی سرے سے کوئی حیثیت نہیں اور ان کا مقصد صرف اور صرف دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک کر مقبوضہ کشمیر پر اپنے غاصبانہ تسلط کو برقرار رکھنے کے لیے جواز پیدا کرنا ہے۔ کشمیر پر بھارت کے غاصبانہ تسلط کے خلاف اب وہاں مسلح تحریک آزادی پورے زور و شور سے جاری ہے۔ بھارت کی طرف سے مسلسل ایک ہی رٹ لگائی جا رہی ہے کہ مقبوضہ کشمیر میں جاری تحریک آزادی کا محرک پاکستان ہے۔ بھارتی حکومت کا کہنا ہے کہ مجاہدین کو پاکستان میں ٹریننگ دے کر مقبوضہ کشمیر میں داخل کیا جاتا ہے بھارت اس کو Cross Border Terrorism ''سرحد پار دہشت گردی'' کا نام دیتا ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ بھارت کا دعویٰ سچ ہے یا جھوٹ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ دونوں ممالک کے درمیان دو بڑی اور تین چار چھوٹی لڑائیاں اس مسئلے پر لڑی جا چکی ہیں گو کہ 2002ء کے بعد سے کنٹرول لائن پر کچھ امن ہو گیا ہے ورنہ تو روزانہ ایک دوسرے کے مورچوں اور بھارت کی طرف سے پاکستان آزاد کشمیر کے کشمیریوں پر گولہ باری معمول بن کر رہ گئی تھی۔

Marfat.com

پاکستان کوصحرا بنانے کی سازش

حیدر آباد، جونا گڑھ اور کشمیر کی طرح پانی کا تنازعہ بھی قیامِ پاکستان کے فوراً بعد بھارت کی طرف سے کھڑا کر دیا گیا۔ خیال رہے کہ دریائے سندھ اپنے پانچ بڑے معاون دریاؤں کے ساتھ دنیا کے عظیم دریائی نظاموں میں سے ایک تسلیم کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں سندھ کے طاس میں پانی فراہم کرنے والی تمام نہریں ایک مربوط نظام کی شکل میں کام کرتی تھیں لیکن سرحدوں کا تعین کرتے وقت علاقہ کی معیشت کا خیال نہ رکھا گیا اور پنجاب کے خط مستقیم نے طاس سندھ کے دریاؤں اور نہروں کو آر پار کاٹ دیا جس کے نتیجہ میں تین دریاؤں، ستلج، بیاس اور راوی کے بالائی حصے اور بہت سے نہری ہیڈ ورکس بھارت کے حصے میں چلے گئے مثلاً راوی کا مادھو پور ہیڈ ورکس اور ستلج کا فیروز پور ہیڈ ورکس بھارت کے علاقے میں رہ گئے جب کہ ان سے نکلنے والی نہریں اپر باری دوآب لاہور کے علاقے اور نہر دیپال پور ساہیوال اور بہاولپور کے علاقوں کو سیراب کرتی تھیں۔ جب بھارت نے کشمیر پر قبضہ کرلیا تو پاکستان کا خطرہ مزید بڑھ گیا کیونکہ جہلم اور چناب بھی مقبوضہ کشمیر سے نکلتے ہیں۔ اس تقسیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان کی زرعی معیشت بھارت کی محتاج ہوگئی کیونکہ اس کا ہیڈ ورکس پر کنٹرول تھا۔ پنجاب کی تقسیم کرنے والے باؤنڈری کمیشن کے سربراہ نے اپنے فیصلے میں لکھا کہ مجھے یقین ہے کہ نہری پانی کے سلسلہ میں دونوں حکومتیں جو بھی معاہدہ کریں گی اس میں اس امر کو ملحوظ خاطر نہیں رکھا جائے گا کہ نہروں کے ہیڈ ورکس کس کس علاقے میں واقع ہیں۔ پانی کے مسئلے پر جو ثالثی ٹریبونل دونوں ملکوں کے درمیان قائم ہوا تھا اس کے صدر سر پیٹرک سپنسر سابق چیف جسٹس ہندوستان تھے۔ ثالثی عدالت نے اپنا کام 31 مارچ 1948ء کو ختم کر دیا اور دوسرے دن یعنی یکم اپریل کو مشرقی پنجاب کی حکومت نے پاکستان میں جانے والی تمام نہروں کا پانی جو بھارتی علاقے سے گزرتی تھیں بند کرنا شروع کر دیا حالانکہ اس ٹریبونل کے صدر لارڈ سپنسر کے بیان کے مطابق ٹریبونل کو یقین دلایا گیا تھا کہ پانی بند نہیں کیا جائے گا۔ پانی بند کرنے کی ابتداء اپر باری دوآب اور نہر دیپالپور سے ہوئی جہاں خریف کا پانی روک دیا گیا۔ متعلقہ علاقوں کے کسان سخت پریشان ہو گئے اس صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے چودھری محمد علی مرحوم اپنی کتاب Emerging Pakistan میں لکھتے ہیں۔

''طاس سندھ کے تنازعہ آب نے تقسیم پنجاب کی کوکھ سے جنم لیا اور منظر عام پر اس وقت آیا جب یکم اپریل 1948ء کو ہندوستان کے صوبہ مشرقی پنجاب نے پاکستان کے صوبہ مغربی پنجاب کو آنے والی نہروں کا پانی روک لیا۔ مغربی پاکستان کی زمین زرخیز ہے لیکن اس کی آب و ہوا گرم اور خشک ہے۔ بارش ناکافی ہوتی ہے اور اس پر انحصار نہیں کیا جاسکتا۔ نصف سے زیادہ علاقے میں بارش کی سالانہ اوسط دس انچ سے بھی کم ہے اور باقی میں بیس انچ سے کم۔ معیشت کا بیشتر

Marfat.com

دارومدار زراعت پر ہے اور اس کا تقریباً تمام تر انحصار نہروں سے آبپاشی پر ہے، جو دریائے سندھ اور اس کے پانچ معاون دریاؤں سے نکالی گئی ہیں۔ تین مغربی دریا، سندھ، جہلم اور چناب ریاست جموں وکشمیر سے پاکستان میں داخل ہوتے ہیں اور تین مشرقی دریا راوی، بیاس اور ستلج ہندوستان سے پاکستان کی طرف بہتے ہیں۔ فی الحقیقت سندھ کا دریائی نظام ہی مغربی پاکستان کے لیے آب حیات ہے۔ اس کی زندگی بخش پانی کے بغیر مغربی پاکستان اپنی ساڑھے چار کروڑ آبادی کے عشر عشیر کا بھی کفیل نہیں ہوسکتا۔ اس کے برعکس ہندوستان میں کئی دریائی نظام ہیں، جو بڑی حد تک کسی استفادہ کے بغیر سمندر میں جا گرتے ہیں، مزید براں اس کے بیشتر علاقے میں اس قدر بارش ہو جاتی ہے کہ آبپاشی کے بغیر بھی زرعی ضروریات پوری ہو جاتی ہیں۔

قدیم زمانے سے طاس سندھ طغیانی کے پانی اور سیلابی نہروں سے سیراب ہوتا رہا ہے۔ پچھلی ایک صدی میں انگریز انجینئر وں کی رہنمائی میں دریاؤں پر ہیڈ ورکس کی تعمیر اور نہروں کا جال بچھا دینے سے آبپاشی میں بڑی توسیع ہوئی۔ خوشحال نو آبادیاں قائم ہوگئیں۔ کپاس، گندم، چاول اور گنے کی کاشت دور دور تک پھیل گئی۔ نئے شہر آباد ہو گئے باغات اور لہلہاتے ہوئے کھیت ہر طرف نظر آنے لگے دنیا بھر میں کسی دریائی نظام سے اتنی زمین سیراب نہیں ہوتی جتنی سندھ کے دریائی سلسلے میں ہوتی ہے۔

تقسیم سے پہلے تقریباً 3 کروڑ 70 لاکھ ایکڑ رقبہ سندھ کے دریائی سلسلے سے سیراب کیا جاتا تھا۔ اس میں سے 3 کروڑ 10 لاکھ ایکڑ رقبہ پاکستان میں ہے اس کے علاوہ مغربی پاکستان میں کم از کم 5 کروڑ 50 لاکھ ایکڑ اراضی پر مشتمل ایسے صحرائی علاقے ہیں جن کے لیے اگر حسب مراد پانی مل جائے تو انہیں زیر کاشت لایا جاسکتا ہے۔ دریاؤں میں رواں پانی یعنی وہ پانی جو بند تعمیر کیے بغیر دریاؤں سے میسر آسکتا ہے۔ تقریباً سارے کا سارا آبپاشی کی ان سکیموں میں استعمال کرلیا گیا تھا جو تقسیم ہند سے پہلے مکمل ہو چکی تھیں یا پلان کی جا چکی تھیں۔ پورے موسم سرما کے دوران میں، اور بہار اور خزاں کے اہم دنوں میں جب ربیع اور خریف کی فصلوں کو پانی کی بیک وقت ضرورت ہوتی ہے موجودہ نہروں کے ذریعے دریاؤں کا سارا بہاؤ صرف ہو جاتا تھا اے، ایم، پر مانیگ نے بطور چیف انجینئر 1946ء میں اپنی رپورٹ میں لکھا تھا ''سال کے بیشتر حصوں میں پنجاب کے لیے میسر پانی کا ایک ایک قطرہ فصلوں کو سیراب کرنے کے لیے دریاؤں سے لے لیا جاتا ہے'' چونکہ سال بہ سال دریاؤں کے بہاؤ میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے سالوں میں کئی ایک نہروں میں پانی کی شدید کمی ہوتی ہے۔

جولائی اور اگست میں برسات کے دوران میں دریا طغیانی میں ہوتے ہیں اور پانی کی بے پایاں مقدار سمندر میں گر جاتی ہے۔ موسم گرما کے ان سیلابوں سے استفادہ کے لیے بڑے بڑے بند درکار ہیں ایسے منصوبوں پر بہت زیادہ لاگت آتی ہے۔ ان کی تکمیل میں کئی سال لگتے ہیں اور وہ صرف موزوں مقامات پر ہی تعمیر ہوسکتے ہیں۔ تقسیم سے پہلے اس نوعیت کا صرف ایک ہی منصوبہ تھا وہ مشرقی پنجاب میں دریائے ستلج پر بھاکڑہ ڈیم تھا اس میں پانی کے ذخیرہ کی گنجائش 40 لاکھ ایکڑ فٹ تھی۔ لیکن اس کی منظوری سے قبل زیریں دریا صوبہ سندھ نے یہ شکایت کی تھی کہ بھاکڑہ ڈیم کی تعمیر سے اس کی سیلابی نہروں کی آبپاشی میں کمی واقع ہو جائے گی۔

طاس سندھ کے پانی پر مختلف صوبوں اور ریاستوں کے حقوق کا تعین کرنے کے لیے حکومت ہند نے سر بی۔ این

Marfat.com

راؤ کی صدارت میں جو بعد میں بین الاقوامی عدالت کا جج بھی بنا ایک کمیشن قائم کیا۔ راؤ کمیشن نے فریقین کے متعلقہ حقوق کے سلسلے میں ''منصفانہ حصہ داری'' کا اصول وضع کیا۔ یہ اصول ایک مشترک طاس والے دریا کے ملکوں کے حقوق کے تعین میں بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ ہے اس اصول میں یہ قاعدہ بھی شامل ہے کہ بالائی حصہ دریا والا ملک کسی ایسے اقدام کا مجاز نہیں جو زیریں حصے کے موجودہ نظام آبپاشی میں خلل اندازی کرے۔

پنجاب کے خط تقسیم نے طاس سندھ کے دریاؤں اور نہروں کو آر پار کاٹ دیا تھا اور ہندوستان کو بالائی حصہ اور پاکستان کو زریں حصہ بنا دیا تھا۔ تقسیم پنجاب سے پیدا ہونے والے مسائل طے کرنے کے لیے جو متعدد سرکاری کمیٹیاں قائم کی گئی تھیں ان میں ''بی'' کمیٹی بھی شامل تھی۔ یہ کمیٹی مشرقی پنجاب اور مغربی پنجاب کے مساوی تعداد میں افسروں پر مشتمل تھیں۔ اسے مشترکہ املاک کے آئندہ انتظام اور دوسری املاک کی تقسیم اور ان کی مالیت ک مسائل طے کرنے تھے ''بی'' کمیٹی نے اپنی رپورٹ کے پندرھویں پیرا میں اپنے ارکان کی متفقہ رائے سے یہ لکھا کہ ''کمیٹی'' اس امر پر متفق ہے کہ دونوں صوبوں اور مختلف نہروں میں پانی کی منظور شدہ مقدار میں کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔'' اس طرح کمیٹی نے آبی وسائل کی اس تقسیم کو برقرار رکھنے پر اتفاق کیا جو تقسیم ہند سے پہلے تھی۔ لیکن کمیٹی میں ان نہروں کی مالیت پر اتفاق رائے نہ ہو سکا جن کے ذریعے پانی تقسیم کیا جاتا تھا اور نہ ہی کمیٹی ان سرکاری بنجر زمینوں کی مالیت پر متفق ہو سکی جو سیراب کی گئی تھیں۔

''بی'' کمیٹی کی رپورٹ پنجاب تقسیم کمیٹی کے سامنے پیش ہوئی جس کا صدر گورنر تھا اور جو مشرقی پنجاب اور مغربی پنجاب کے وزارتی نمائندوں پر مشتمل تھی۔ تقسیم کمیٹی نے وہ معاملات قبول کر لیے جن پر ''بی'' کمیٹی میں اتفاق رائے ہو گیا تھا۔ یعنی کہ نہری پانی کے مشرقی پنجاب اور مغربی پنجاب کے قبل از تقسیم حصوں کو برقرار رکھا جائے۔ اس نے ''بی'' کمیٹی کے دو ارکان کو پندرھویں پیرا کی دفعات پر عملدرآمد کے لیے مامور کر دیا۔ ان دفعات کا تعلق ہر علاقے اور نہر میں پانی کی بہم رسائی برقرار رکھنے سے تھا۔ لیکن تقسیم کمیٹی میں بھی ''بی'' کمیٹی کی طرح نہری نظام کی مالیت پر اتفاق رائے نہ ہو سکا اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ سرکاری بنجر زمینوں کی مالیت کے متعلقہ مسئلہ کی طرح یہ مسئلہ بھی ثالثی ٹریبونل کے سامنے پیش کر دیا جائے یہ سب کچھ 15 اگست 1947ء سے قبل تقسیم کے ایام میں ہوا۔ چونکہ ہندوستان اور پاکستان کے مشترک دریاؤں سے حاصل شدہ نہری پانی کی تقسیم پر کوئی اختلاف رائے نہیں تھا لہٰذا یہ مسئلہ ثالثی ٹریبونل کے سامنے پیش نہیں کیا گیا۔

(اردو ترجمہ ظہور پاکستان چودھری محمد علی صفحہ 375 تا 378)

17 اگست 1947ء کو جب سرحدوں کے بارے میں ثالثی فیصلہ کا اعلان کیا گیا تو یہ معلوم ہوا کہ ریڈکلف نے نہ صرف مسلم اکثریت کے بہت بڑے علاقے ہندوستان کو بخش دیئے ہیں بلکہ سرحدی خط اس طرح کھینچا ہے کہ دریائے راوی پر مادھو پور ہیڈ ورکس اور دریائے ستلج پر فیروز پور ہیڈ ورکس دونوں ہی ہندوستان کی جانب رہ گئے ہیں۔ اول الذکر سے اپر باری دوآب کے سلسلہ انہار کو کنٹرول کیا جاتا تھا اور مغربی پنجاب کی سنٹرل باری دوآب کی نہریں اسی سلسلہ کی کڑیاں تھیں۔ موخر الذکر مغربی پنجاب کی دیپالپور نہر اور ریاست بہاولپور کے ایک حصہ کو سیراب کرنے والی ایسٹرن گرے نہر کو کنٹرول کرتا تھا۔ سرحد پنجاب سے متعلق اپنے ثالثی فیصلہ میں ریڈکلف نے لکھا:

''اس علاقے میں سرحد کے تعین کے کام میں نہری نظام کی موجودگی سے مزید پیچیدگی پیدا ہوگئی تھی۔ یہ نہری نظام

Marfat.com

پنجاب کی زندگی کے لیے از حد اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن اس کی تعمیر و ترقی ایک واحد حکومت کے تصور کے تحت ہوئی ہے میں سمجھتا ہوں کہ میں پورے اعتماد کے ساتھ یہ فرض کر لینے میں حق بجانب ہوں کہ ان نہروں کے پانی میں حصہ داری کے یا کوئی دوسرے معاہدے ہوں گے، ان کا ہر وہ حکومت احترام کرے گی جسے بعدازیں متعلقہ ہیڈورکس پر اختیار حاصل ہوگا۔''

باوجود اس کے کہ ریڈکلف ایوارڈ نے پاکستان کے لیے از حد اہم ہیڈ ورکس کا کنٹرول ہندوستان کے ہاتھوں میں دے دیا تھا۔ کمیٹی ''بی'' اور پنجاب تقسیم کونسل میں جو سمجھوتا ہوا تھا، اس پر مغربی پنجاب کی حکومت یہ اطمینان محسوس کرتی رہی کہ تقسیم سے قبل ملنے والے پانی کے حصوں میں تغیر و تبدل نہیں کیا جائے گا۔ نہری پانی میں مشرقی پنجاب اور مغربی پنجاب کے ٹھیک حصوں کے تعین کے لیے کوئی باقاعدہ دستاویز مرتب نہیں کی گئی جس پر فریقین کے دستخط ثبت ہوتے۔ مغربی پنجاب کے وزیروں اور ان کے افسروں کو مشرقی پنجاب کے وزیروں اور افسروں کے مکروہ اعلانات پر پورا اعتماد تھا کہ نہری پانی کے قبل از تقسیم انتظامات میں تبدیلی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ثالثی ٹریبونل کے سامنے جب نہری نظام کی مالیت کا مسئلہ پیش ہوا تو وہاں بھی مشرقی پنجاب کے نمائندوں نے ایسے ہی اعلانات کیے۔ درحقیقت، جیسا کہ بعد میں واقعات سے ظاہر ہوا؟ مشرقی پنجاب کے وزیر اور افسر پاکستان پر مہلک ترین وار کرنے کی تدبیر سوچ رہے تھے اور شیریں بیانی سے حکومت مغربی پنجاب کو نیند کی آغوش میں ڈالنے کے لیے لوریاں سنا رہے تھے۔ وہ اس دن کا انتظار کر رہے تھے جب 31 مارچ 1948ء کو ثالثی ٹریبونل کی معیاد ختم ہو جائے گی۔ مشرقی پنجاب والوں نے شاطرانہ فریب کی چال چلی اور مغربی پنجاب والوں نے اپنے فرض سے غفلت برتی، سہل انگاری سے کام لیا اور حزم و احتیاط کے فقدان کا مظاہرہ کیا۔ اس کے نتائج پاکستان کے لیے تباہ کن ثابت ہوئے۔

یکم اپریل 1948ء کو جب ایک دن پہلے ثالثی ٹریبونل کا وجود ختم ہو چکا تھا حکومت مشرقی پنجاب نے پاکستان میں آنے والی ہر نہر میں پانی کی رسد منقطع کر دی۔ اس اقدام سے سنٹرل باری دوآب کا نہری نظام، دیپالپور کا نہری نظام اور ریاست بہاولپور کی نہری شاخ متاثر ہوئیں۔ سر پیٹرک سپنس نے جو ثالثی ٹریبونل کا صدر تھا 23 فروری 1955ء کو ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن اور اوور سیز لیگ کے مشترکہ اجلاس منعقدہ لندن میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

''مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ کیا پانی کی مسلسل بہم رسائی کے بارے میں کسی حکم کا اجراء مناسب نہیں ہوگا؟ لیکن (ہندوستان اور پاکستان) دونوں کے اٹارنی جنرلوں نے ہمیں اس بناء پر فیصلہ کرنے کے لیے کہا کہ پانی کی موجودہ بہم رسائی میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جائے گی۔ چنانچہ میرے ساتھی ججوں نے جو ثالثی فیصلہ کیا، اور جس میں میرا کوئی حصہ نہ تھا، وہ انہوں نے اسی اساس پر کیا۔ ہمارے ثالثی فیصلے مارچ 1948ء کے اواخر میں شائع کر دیئے گئے میں اس ضمن میں کچھ اور نہیں کہوں گا، سوائے اس کے کہ مجھے اس بات سے سخت صدمہ پہنچا کہ ہمارے ثالثی فیصلے کے بعد ایک یا دو دن کے اندر ہی اس اساس کی شدید خلاف ورزی کی گئی، جس پر ہمارے ثالثی فیصلے صادر کیے گئے تھے۔''

صورت حال کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ثالثی ٹریبونل نے اپنے فیصلہ میں ہندوستان کے اس دعویٰ کو اصولاً قبول کر لیا کہ سرکاری حساب کتاب میں نہری نظام کی جو قیمت درج ہے۔ اس کی بناء پر پاکستان کے حصے کا تعین نہیں ہونا چاہئے بلکہ اس سے کہیں زیادہ رقم پاکستان کے ذمے ڈالنی چاہئے۔ ٹریبونل نے یہ فیصلہ اس بناء پر کیا تھا کہ پانی کی تقسیم میں

Marfat.com

موجودہ حصوں کا احترام کیا جائے گا کیونکہ پانی کے بغیر نہریں محض خشک کھائیاں ہوں گی۔ جو قیمتی اثاثہ نہیں بلکہ اس کے برعکس معیشت پر بار ہوں گی۔ ٹربیونل نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ چونکہ نہروں کی بدولت سرکاری بنجر اراضی کی قیمت بڑھ گئی ہے اس لیے ہندوستان کے ساتھ حساب فہمی میں یہ بڑھی ہوئی قیمت پاکستان کے ذمے لگائی جائے گی۔

جونہی ثالثی ٹربیونل کا وجود ختم ہوا۔ ہندوستان کے نمائندہ نے اس کے سامنے جو وعدے کیے تھے کہ ''پانی کی موجودہ بہم رسائی میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جائے گی'' وہ سب کے سب بھلا دیئے گئے اور پاکستان کی نہروں سے پانی کی رسد روک لی گئی ان نہروں سے ساڑھے سولہ لاکھ ایکڑ اراضی سیراب کی جاتی تھی۔ مشرقی پنجاب نے اب یہ دعویٰ کیا کہ دریاؤں اور نہروں کے پانی پر پاکستان کا کوئی حق نہیں ہے اور نہروں کو دوبارہ کھولنے کے لیے حقوق مالکانہ کی قیمت ادا کرنے کی شرط عائد کر دی۔ پاکستان پر سخت مصیبت آ پڑی جو روز بروز زیادہ ناقابل برداشت ہوتی گئی۔ کئی وسیع علاقوں میں جہاں زیر زمین پانی کھاری ہے وہاں پینے کے لیے بھی پانی نہیں ملتا تھا۔ لاکھوں انسان اپنی فصلوں کی بربادی، مویشیوں کے اتلاف اور پانی کی قلت کے باعث ہلاکت کے خطرے سے دوچار ہو گئے۔

پریشانی کے اس عالم میں اس مسئلہ کا حل تلاش کرنے کے لیے پاکستان سے ایک وفد مئی 1948ء میں دہلی گیا۔ اس وفد کے قائد پاکستان کے وزیر خزانہ غلام محمد تھے اور اس میں مغربی پنجاب کے دو وزیر شوکت حیات خان اور ممتاز دولتانہ شامل تھے۔ دہلی میں مذاکرات کے دوران میں مشرقی پنجاب کے نمائندوں نے اس بات پر اصرار کیا کہ جب تک مغربی پنجاب اس بات کو تسلیم نہیں کرے گا کہ اس کا پانی میں کوئی حق نہیں ہے وہ نہروں میں پانی بحال کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔ مغربی پنجاب کے نمائندے اسے منظور نہیں کر سکتے تھے۔ پاکستان کی طرف سے یہ تجویز پیش کی گئی کہ دونوں حکومتیں اپنے اختلافات ثالثی فیصلہ کے لیے بین الاقوامی عدالت کے سامنے پیش کر دیں۔ ہندوستان نے یہ تجویز منظور نہ کی۔ معاملہ لاینحل ہوتا نظر آیا۔ غلام محمد نے مونٹ بیٹن سے استدعا کی جس نے نہرو سے مشورہ کیا۔ اس کے بعد غلام محمد کے سامنے ایک بیان رکھ دیا گیا کہ وہ کسی لفظ یا شوشہ کو تبدیل کیے بغیر اس پر دستخط کر دیں۔ پانی کی بحالی اس سے مشروط تھی۔

4 مئی 1948ء کو اس بیان پر دستخط کر دیئے گئے۔ پاکستان کی طرف سے غلام محمد اور مغربی پنجاب کے دو وزیروں نے دستخط کیے اور ہندوستان کی طرف سے نہرو اور مشرقی پنجاب کے دو وزیروں نے اس بیان میں کہا گیا کہ متعلقہ قانونی مسائل سے قطع نظر دونوں حکومتیں خواہاں ہیں کہ اس قضیے کو عملی انداز سے طے کیا جائے۔ مشرقی پنجاب کی حکومت مغربی پنجاب کی سنٹرل باری دوآب اور دیپالپور نہروں میں پانی کی رسد بتدریج کم کرے گی تا کہ حکومت مغربی پنجاب کو متبادل وسائل سے استفادہ کیلیے معقول مہلت مل جائے۔ بیان میں یہ اعلان بھی کیا گیا کہ ان نہروں میں پانی بحال کیا جا رہا ہے اور مغربی پنجاب بعض متنازعہ فیہ ادائیگیوں کے لیے بطور پیشگی اتنی رقم علی الحساب جمع کرا دے گا جس کا تعین وزیر اعظم ہندوستان کرے گا۔'' اور یہ کہ ہر فریق کی طرف سے اس مسئلہ کے قانونی اور دوسرے پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد مزید مذاکرات کیے جائیں گے۔ آخر میں دونوں حکومتوں نے یہ امید ظاہر کی کہ اس مسئلہ کو دوستانہ طور پر حل کر لیا جائے گا۔

اگرچہ ہندوستان نے دیپالپور نہر اور سنٹرل باری دوآب کی اہم شاخوں میں پانی کی رسد بحال کر دی لیکن ریاست بہاولپور کی ایک چھوٹی نہر اور سنٹرل باری دوآب نظام کی نو چھوٹی شاخوں کو پانی سے محروم رکھا۔ آخر کار ریاست

Marfat.com

بہاولپور میں کافی علاقے پھر بے آباد صحرا بن کر رہ گئے۔ پاکستان نے اس بندوبست کو بہ امر مجبوری قبول کیا تھا لیکن پھر بھی پاکستان نے اپنا فرض ادا کیا۔ اور وزیراعظم ہندوستان نے جن رقوم کا تعین کیا انہیں جمع کرا دیا۔ بعد میں نہرو نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے اس بات کی تردید کی کہ اس معاملہ میں جبر کیا گیا تھا۔ ستمبر 1950ء کے بیان کو پاکستان نے ''جبر کے تحت'' قبول کیا تھا اس بات سے مجھے بہت تعجب اور رنج ہوا ہے میں تصور بھی نہیں کرسکتا کہ ان حالات میں جبر روا رکھنے کا کوئی سوال پیدا ہوسکتا تھا۔ اس وقت پانی روکنے کے بارے میں کسی قسم کی دھمکی بلکہ تجویز تک بھی نہیں تھی۔''

(پنڈت نہرو کا بیان: پریس کانفرنس 28 جنوری 1951ء)

4 مئی کے بیان میں دونوں ملکوں کی حکومتوں کے مابین جو مزید مذاکرات پیش نظر تھے ان کے سلسلے میں ایک مجلس جولائی 1948ء میں لاہور میں منعقد ہوئی۔ اس مجلس میں ہندوستان نے پھر یہ موقف اختیار کرلیا کہ ''مشرقی پنجاب میں دریاؤں پر مالکانہ حقوق تمام تر حکومت مشرقی پنجاب کو حاصل ہیں'' اور یہ تجویز پیش کی کہ اس بات کو ایک حتمی معاہدہ میں شامل کردیا جائے جو ہر دو فریق کے قانونی حقوق اور واجبات کا قائم مقام ہوگا۔ ظاہر ہے اس بنیاد پر کوئی اتفاق رائے نہیں ہوسکتا تھا۔ دونوں وزرائے اعظم کے مابین خط و کتاب سے مفاہمت کی منزل قریب نہ آسکی۔ 18 اکتوبر 1948ء کو نہرو نے ایک تار بھیجا جس میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ 4 مئی کے بندوبست کی یوں تعبیر کی جائے کہ ''حکومت مشرقی پنجاب کو مغربی پنجاب کے لیے پانی کی رسد میں بتدریج کمی کرنے کا حق حاصل ہے'' تار میں مزید کہا گیا تھا کہ ''دونوں حکومتوں کے نمائندوں کے مابین مزید مذاکرات مغربی پنجاب کی طرف سے اس حق کو تسلیم کرلینے کی بناء پر ہوں گے'' نہرو نے انتباہ کیا کہ اگر کسی ایک فریق نے اس معاملے میں ناواجب تاخیر روا رکھی تو دوسرا فریق معقول نوٹس دے کر موجودہ بندوبست کو ختم کردینے کا مجاز ہوگا'' دوسرے الفاظ میں اگر پاکستان نے جلد ہی ہندوستان کے دعویٰ کو قبول نہ کیا تو ہندوستان اس بندوبست کو ختم کردے گا اور ایک مرتبہ پھر پانی کی رسد منقطع کردے گا۔ پاکستان کی طرف سے ہندوستان کی تعبیر قبول کرنے کا معنی یہ ہوتا کہ پاکستان ہمیشہ کے لیے اپنے قانونی حقوق سے دستبردار ہوگیا ہے پاکستان نے اس تنازع کے قانونی نکات کو بین الاقوامی عدالت میں پیش کرنے کی پیشکش کی لیکن ہندوستان نے انکار کردیا۔

دونوں حکومتوں میں براہ راست بات چیت سے بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ اگست 1949ء میں ایک کانفرنس میں صرف اس امر پر اتفاق رائے ہوا کہ ایک اور کانفرنس منعقد کرنی چاہئے چنانچہ مارچ 1950ء کے اواخر میں ہندوستان اور پاکستان کے نمائندوں کی کراچی میں ملاقات ہوئی میں اس کانفرنس میں پاکستانی وفد کے قائد کی حیثیت میں شامل ہوا۔ میں نے تنازعہ کے تصفیہ کے لیے خالصتاً عملی بنیاد تلاش کرنے کی کوشش کی میں نے یہ تجویز پیش کی کہ پانی کی موجودہ ضروریات کو موجودہ ذرائع سے پورا کیا جائے اور نئی رسد کا انتظام ستلج، بیاس، راوی اور چناب پر بندوں کی تعمیر سے سیلاب کے اس پانی کو روک کر کیا جائے جو اب سمندر میں جا گرتا ہے۔ ان بندوں کی تعمیر کے اخراجات کا حصہ اس نسبت سے ادا کیا جائے گا جس تناسب سے فوائد اٹھائے جائیں گے اور متعلقہ حقائق کی روشنی میں پانی کی نئی رسد کی منصفانہ تقسیم کی جائے گی۔ ہندوستان کے وفد میں اے، این کھوسلہ بھی شامل تھا۔ وہ برقی طاقت، انہار اور جہاز رانی کے مرکزی کمیشن کا صدر تھا اس نے یہ تجویز پیش کی کہ ستلج کا پانی، جس پر بھاکڑا ڈیم تعمیر کیا جارہا تھا، تمام تر ہندوستانی علاقوں میں استعمال کیا جائے

Marfat.com

لیکن بیاس، راوی اور چناب کے پانی کو ہندوستان کے حق میں بعض جزوی تبدیلیوں کے ساتھ پاکستان میں موجودہ آبپاشی کو برقرار رکھنے کے لیے استعمال کیا جائے۔

پاکستانی نہروں میں پانی کی رسد میں اگر کوئی کمی ہو، تو اس کی تلافی دریائے چناب سے رابطہ نہر (لنک) کے ذریعہ کرلی جائے۔ چناب کا سارا پانی پاکستان کو میسر رہے گا۔ اگر ضرورت محسوس ہوتو دریائے چناب پر بند تعمیر کرنے سے کمی کو پورا کیا جاسکتا ہے بلکہ آبپاشی میں توسیع بھی کی جاسکتی ہے۔ اس امر پر اتفاق ہوگیا کہ دونوں ملکوں کے انجینئر دونوں تجویزوں کا جائزہ لیں گے۔ اور بعدازاں مئی 1950ء میں ایک اور کانفرنس دہلی میں ہوگی مارچ کی کانفرنس کے آخر میں مجھے معقول سمجھوتے کی کچھ امید ہوگئی تھی۔ ہندوستانی نمائندے اب ان خطوط پر آگے بڑھنے کو آمادہ نہیں تھے۔ انہوں نے کہا کہ وہ نہ صرف دریائے ستلج کے تمام قابل استعمال پانی کو اپنے کام میں لائیں گے بلکہ بیاس اور راوی کے پانی کو بھی، اور اس کے علاوہ مارو کے مقام پر بند تعمیر کر کے دریائے چناب سے بھی دس ہزار کیوسک پانی لے لیں گے۔ دوسرے الفاظ میں ہندوستان وہ تمام پانی لینا چاہتا تھا جو وہ ممکن طور پر لے سکتا تھا اور پاکستان کو اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ ستلج، بیاس اور راوی سے مدت مدید سے مغربی پاکستان میں 56 لاکھ ایکڑ سیراب ہوتے رہتے تھے جن پر 50 لاکھ سے زائد آبادی کا انحصار تھا۔ ہندوستان اب ان لوگوں کو ہلاکت کے خطرے سے دوچار کر رہا تھا۔ میں نے نہرو سے ملاقات کی اور اس کی حکومت کے اندر فکر سے جو نتائج پیدا ہونے والے تھے وہ اس کے سامنے بیان کیے اس کے ہاں وہ روح پرور جذبات تو فراواں تھے جن سے بیگانہ لوگ اتنے متاثر ہوجاتے ہیں اور انسان نواز حل کے لیے بھی اس نے بڑی خواہش ظاہر کی لیکن مسئلہ زیر بحث میں میں اس کا دل بدل نہ سکا۔

یہ ظاہر ہوگیا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کے مابین مذاکرات سے پانی کی تقسیم پر کوئی مفاہمت نہیں ہوسکے گی۔ قانونی حقوق کا مسئلہ حل کرنا اور بھی مشکل تھا۔ پاکستان نے کئی بار ہندوستان سے یہ کہا تھا کہ یہ مسئلہ ثالثی کے لیے عالمی عدالت کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ ہندوستان نے ہر بار انکار کر دیا تھا۔ 4 مئی 1948ء کا عارضی بندوبست سمجھونے کی راہ صاف کرنے کی بجائے سدراہ بن گیا تھا۔ 1950ء میں جب ہندوستان نے اسے معاہدہ نمبر 794 کے طور پر اقوام متحدہ میں درج کرایا تو پاکستان نے اقوام متحدہ پر اس کی حقیقی ماہیت واضح کردی اور اس امر کی تصدیق کردی کہ یہ بندوبست ختم کیا جاچکا ہے۔

اقوام متحدہ کے منشور کے تحت فریقین کو قانونی تنازعات میں بالعموم بین الاقوامی عدالت سے رجوع کرنا چاہیے۔ پاکستان نے یہ تنازعہ عالمی عدالت میں کیوں پیش نہ کیا؟ اس کی مختصر اوضاحت ضروری ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ہند جمعیت الاقوام کا رکن بن گیا تھا اور اس نے بھی برطانوی دولت مشترکہ کے دوسرے ملکوں کی طرح بین الاقوامی عدالت کے لازمی اختیار قانونی کو تسلیم کرلیا تھا، سوائے ان تنازعات کے جو دولت مشترکہ کے ارکان کے مابین ہوں گے۔ یہ فرض کرلیا گیا تھا کہ دولت مشترکہ جن اقوام پر مشتمل ہے ان کی اپنی برادری میں ہی باہمی تنازعات کا تصفیہ ہوجایا کرے گا۔ جب برصغیر کو دو آزاد و خودمختار ملکوں میں تقسیم کیا گیا تو ہندوستان کی ڈومینین نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ اس سیاسی ہستی کا جانشین ہے جو قبل ازیں ہند سے موسوم تھا۔ اس کے نتیجہ میں وہ غیر منقسم ہند کے بین الاقوامی حقوق اور ذمہ داریوں کا وارث بن گیا۔ ان میں دولت مشترکہ کے ارکان کے باہمی تنازعات کے سوا بین الاقوامی عدالت کا لازمی اختیار قانونی بھی شامل

Marfat.com

تھا۔ اگر چہ دولت مشترکہ کے ارکان کے مابین تنازعات کا تصفیہ کرانے میں اپنی بے بسی ظاہر کر دی تھی لیکن اس پرانے استثنا کے باعث جب تک ہندوستان رضامند نہ ہوتا پاکستان نہری پانی کے تنازعہ کو بین الاقوامی عدالت میں نہیں لے جا سکتا تھا۔ چونکہ ہندوستان کو معلوم تھا کہ بین الاقوامی قانون کی رو سے اس کا موقف ناجائز ہے اس لیے وہ رضامند نہیں ہوتا تھا۔

بالآخر 1950ء میں حکومت ہندوستان نے قانونی مسائل کو عدالتی فیصلے کے سپرد کر دینا منظور کر لیا لیکن عالمی عدالت یا کسی اور غیر جانب دار ادارہ کے ذریعے نہیں بلکہ ایک ایسی عدالت کے ذریعہ، جو دو ہندوستانی اور دو پاکستانی ججوں پر مشتمل ہوگی جب وزیراعظم پاکستان نے اس عدالت کے لیے غیر جانبدار صدر مقرر کرنے کی تجویز پیش کی، تو اس کے جواب میں نہرو نے کہا ''ابتدا ہی تیسرے فریق کے بارے میں سوچنے کا مطلب دوسروں پر مسلسل انحصار کا اعتراف ہوگا۔ یہ بات کسی طرح باوقار اور خوددار اقوام کے شایان شان نہیں۔'' نہرو اس بات کے لیے بھی آمادہ نہیں تھا کہ جن مسائل پر پہلی عدالت میں اتفاق نہیں ہوگا ان کے بارے میں کسی اور عدالت سے رجوع کیا جا سکے گا۔ جس کا صدر غیر جانبدار ہوگا۔ صاف ظاہر تھا کہ ہندوستان کا مقصد اس وقت تک گفت وشنید کو طول دیتے جانا تھا۔ جب تک بھاکڑہ ڈیم، راجستھان نہر اور دوسری تعمیرات پر کام پایہ تکمیل تک نہ پہنچ جاتا اور پاکستان اپنے اہم آب رسانی کے وسائل سے محروم ہو جاتا۔

اس اثناء میں پاکستان کو محروم کر کے ہندوستان پانی میں اپنے حصے کو بالجبر بڑھاتا جا رہا تھا۔ پاکستانی نہروں میں پانی کی رسد ان نازک اوقات میں کم کر دی جاتی تھی، جب فصلیں کاشت کی جاتی تھیں یا پکنے والی ہوتی تھیں۔ ستلج اور بیاس کے سنگم پر یکے میں ایک ہیڈ ورکس تعمیر کیا جا رہا تھا اور اس کے ذریعے ہندوستان کے مزید علاقے سیراب کیے جاتے تھے۔ بھاکڑہ ڈیم کی بلندی اور ذخیرہ کی گنجائش قبل از تقسیم منصوبے سے بدرجہا زیادہ بڑھا دی گئی تاکہ سیلاب کے دنوں میں دریائے ستلج کے سارے پانی کا ذخیرہ کیا جا سکے۔ بھاکڑہ ڈیم بہ ہیئت موجودہ دنیا کا سب سے اونچا بند ہے۔ اس کی بلندی 740 فٹ ہے۔ جو امریکہ کے مشہور زمانہ ہوور ڈیم سے بھی 14 فٹ زیادہ ہے۔ اس میں 80 لاکھ ایکڑ فٹ پانی کا ذخیرہ کیا جا سکتا ہے۔ ابتدائی منصوبہ میں 40 لاکھ ایکڑ فٹ کا اہتمام کیا گیا تھا۔

ہندوستان کی طرف سے پانی کی رسد منقطع کر دینے کی مسلسل دھمکیوں سے محفوظ ہونے اور مختلف نو آباد علاقوں میں آبپاشی کا یکساں اہتمام کرنے کے لیے پاکستان نے اپنے خرچ سے چند رابطہ نہریں مثلاً بلو کی سلیمانکی لنک بنائیں لیکن ان رابطہ نہروں سے مسئلہ پوری طرح حل نہیں ہو سکتا تھا۔ بند تعمیر کرنے کے لیے موزوں مقامات کی تلاش از حد ضروری تھی۔ ہندوستان کی طرف سے نہری پانی کی بندی کے فوراً بعد میں نے مغربی پنجاب کے انجینئروں سے کہا کہ وہ جہلم اور سندھ دریاؤں پر بند تعمیر کرنے کی جگہوں کا جائزہ لیں۔ ان میں جہلم پر منگلا کا مقام بہت امید افزا تھا۔ دریائے سندھ پر پہلے دربند کا مقام پسند کیا گیا لیکن بعد کی تحقیق سے معلوا ہوا کہ تربیلا زیادہ موزوں جگہ ہوگی۔ حکومت پاکستان نے منگلا ڈیم کی منظوری دے دی، اور اس کے ڈیزائن اور تعمیر کا کام شروع کر دیا گیا۔ اگر چہ جب تک ہندوستان سے جھگڑے کا تصفیہ نہ ہو جاتا، کوئی غیر ملکی امداد نہیں مل سکتی تھی۔

1951ء میں امریکہ کی ٹینیسی ویلی اتھارٹی کے سابق سربراہ ڈیوڈ ملین تھال نے ہندوستان اور پاکستان دونوں کا دورہ کیا اور اپنے تاثرات ایک مضمون کی صورت میں مرتب کیے جو اگست 1951ء میں جریدہ کولیرز میں شائع ہوا۔ اس۔

Marfat.com

نے نہری پانی کے تنازعہ کو "خالص ڈائنامائیٹ پنجاب کا بارود دان قرار دیا اور یہ انتباہ کیا کہ "جب تک یہ آتشگیر مواد موجود ہے۔ برصغیر ہندوستان و پاکستان میں امن کی توقع عبث ہے" اس نے آگے چل کر لکھا:

"آبپاشی کے لیے پانی نہ ملنے سے مغربی پاکستان ریگستان بن جائے گا۔ 2 کروڑ ایکڑ اراضی ایک ہفتے کے اندر خشک ہو جائے گا اور کروڑوں انسان فاقوں مر جائیں گے جن نہروں سے پاکستان کے کھیت اور لوگ زندگی پاتے ہیں اگر ہندوستان ان کے سرچشمے مستقل طور پر بند کر دے تو فقط اس ترکیب سے پاکستان کی سرزمین اس طرح تباہ و برباد ہو جائے گی کہ کوئی فوج بموں اور توپوں کی گولہ باری سے بھی اتنی غارت گری نہیں کر سکتی۔" لیلین تھال نے اپنے مضمون کے آخر میں ایک تعمیری تجویز پیش کی۔

"نکتہ آغاز پاکستان کے ان خدشات کا ازالہ ہوگا کہ اسے پانی سے محروم کر کے پھر سے ریگستان نہیں بنا دیا جائے گا۔ پاکستان اس وقت جس قدر پانی استعمال کرتا ہے۔ ہندوستان کو اس کی توثیق کر دینی چاہئے بشرطیکہ وہ ہندوستان کے ساتھ تعاون کرے (اور مجھے امید ہے کہ پاکستان تعاون کرے گا) تا کہ اس واقعتاً بین الاقوامی دریائی طاس کو انجینئرنگ کی بناء پر مشترکہ طور پر کام میں لایا جا سکے اور جیسا کہ حقائق سے واضح ہے اس بناء پر ہندوستان کی آئندہ ضروریات بھی پوری ہو سکیں گی۔ اس نے یہ تجویز پیش کی کہ نئی تعمیرات میں سرمایہ مشترکہ طور پر لگایا جائے" شاید عالمی بنک کی مدد سے۔"

عالمی بینک کے صدر یوجین بلیک کو یہ خیال پسند آیا اس نے ستمبر 1951ء میں ہندوستان اور پاکستان کے وزرائے اعظم کو خط لکھے کہ اگر ان کی حکومتیں بھی لیلین تھال کی تجویز کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہیں تو بنک کی خدمات حاضر ہیں اپنے خط میں اس نے لیلین تھال کی تجویز کے متعلق لکھا کہ:

"بندوں اور دوسرے وسائل کو امداد باہمی سے تعمیر کرنے اور بروئے کار لانے سے دونوں ملکوں میں وسیع تر آبپاشی کی ضروریات کو پورا کرنا اس کا مقصود ہے ان کاموں کے لیے سرمایہ کا کچھ حصہ شاید عالمی بنک کو فراہم کرنا ہوگا میرے نزدیک اس کی تجویز کا لب لباب یہ ہے کہ سندھ کے آبی وسائل کو انجینئرنگ کی اساس پر ترقی دینی چاہئے دونوں ملکوں کا دورہ کرنے اور حکومتوں کی اعلیٰ ترین شخصیتوں سے تبادلہ خیالات کے بعد لیلین تھال کو پختہ یقین ہو گیا ہے کہ آبی ترقیات کا ایسا مشترکہ منصوبہ بروئے کار لایا جا سکتا ہے جس کی نوعیت عملی ہوگی۔ سیاسی نہیں، اور جس پر پاکستان اور ہندوستان کے پیش آمدہ سیاسی مسائل سے علیحدہ ہو کر عمل درآمد کیا جا سکتا ہے۔"

دونوں حکومتوں نے صدر ملیک کی پیشکش کو قبول کر لیا اور فریقین نے اس بات سے بھی اتفاق کیا کہ جب تک عالمی بنک کے ساتھ مل کر یہ کار مشترک جاری رہے گا وہ کوئی ایسا اقدام نہیں کریں گے۔ جس سے دوسرے فریق کے لیے موجودہ استعمال کے پانی میں کمی واقع ہو جائے۔ اس بات کو بھی تسلیم کر لیا گیا کہ فریقین کے قانونی حقوق متاثر نہیں ہوں گے۔

ہندوستان نے پانی میں کمی نہ کرنے کا عہد کرنے کے باوجود پاکستانی نہروں میں پانی روکنے اور اپنے ہاں آبپاشی میں توسیع کرنے کا سلسلہ جاری رکھا اکتوبر اور نومبر 1952ء میں پنجاب میں گندم کاشت کرنے کے اہم موقع پر پاکستان کو اپنے جائز حصے کا صرف 40 فیصد پانی ملا۔ فروری 1953ء میں پاکستان کو اپنے حصے کا صرف 8 فیصد پانی ملا۔ ہندوستان نے اپنے پورے حصے کے علاوہ پاکستان کے حصے کا بیشتر پانی بھی استعمال کر لیا ہندوستان نے اپر باری دوآب نہر

Marfat.com

سے نئی شاخیں نکالنے کا اعلان کیا جن سے ایک لاکھ آٹھ ہزار ایکڑ رقبہ سیراب کیا جاتا تھا، جو پہلے نہری نہیں تھا۔ 1953ء میں خشک سالی کے باعث دریاؤں میں پانی بہت کم تھا اور مغربی پنجاب میں پانی کی قلت سے فصلیں سوکھ رہی تھیں لیکن مشرقی پنجاب میں زراعت کے نقطہ نظر سے یہ بہترین سال تھا۔ پاکستان تو قحط سالی سے دوچار تھا اور مشرقی پنجاب کا گورنر اعلان کر رہا تھا کہ ''خوراک کی صورت حال بہت اچھی ہے'' اور اناج کی برآمد کے اعداد و شمار پیش کر رہا تھا۔ حالانکہ تقسیم سے قبل مشرقی پنجاب خوراک کے لحاظ سے کمی کا علاقہ ہوتا تھا۔

پاکستان نے جب اس کیفیت سے عالمی بنک کو مطلع کیا تو صدر بلیک نے یہ تجویز پیش کی کہ پانی کی بہم رسانی کے متعلق اطلاعات کی تصدیق کے لیے ایک کمیشن قائم کیا جائے، جو عالمی بنک، ہندوستان اور پاکستان کے ایک ایک انجینئر پر مشتمل ہو۔ پاکستان نے یہ تجویز منظور کر لی۔ لیکن ہندوستان نے مسترد کر دی۔ صدر بلیک نے یہ متبادل تجویز پیش کی کہ عالمی بنک اپنے انجینئر نامزد کر دے گا جو ہندوستان میں ہندوستانی انجینئروں کے ساتھ مل کر کام کریں گے تاکہ ہر دو فریق کو مصدقہ اعداد و شمار میسر کیے جا سکیں۔ پاکستان نے یہ تجویز بھی منظور کر لی لیکن ہندوستان نے اسے بھی مسترد کر دیا ہندوستان نے جس طرز عمل کا مظاہرہ تنازعہ کشمیر میں کیا تھا اب اس کا اعادہ نہری پانی کے قضیے میں کر رہا تھا، اسی طرز عمل کی مطابقت میں نہرو نے 20 فروری 1953ء کو اعلان کیا ''ہم نے دیدہ دانستہ پاکستان کو نہری پانی سے محروم نہیں کیا اور نہ ہی ہمارا ایسا ارادہ ہے''۔ (ہندوستان ٹائمز، دہلی)

عالمی بنک اور پاکستان و ہندوستان کی حکومتوں کے درمیان سالہا سال تک جو طویل مذاکرات ہوتے رہے ان کی تاریخ اس کتاب کے موضوع سے باہر ہے عالمی بنک کے زیر اہتمام مصالحتی مساعی میں جو تین اہم مراحل آئے ان کا مختصر سا خاکہ ہی کافی ہوگا۔ منصوبہ طاس سندھ کے کارکنندگان ہندوستان اور پاکستان کے مقرر شدہ انجینئر اور ان کے مشیر تھے جنہوں نے عالمی بنک کے نمائندہ اور مشاورین کے ساتھ کم و بیش دو سال تک کام کیا تاکہ سندھ کے دریائی نظام سے استفادہ کا ایک جامع منصوبہ مرتب کیا جا سکے لیکن کوئی مشترک راستہ نہ ملا۔ ہندوستان نے ستلج بیاس اور راوی دریاؤں کے سارے پانی اور دریائے چناب کے پانی کے ایک حصے کا دعویٰ کیا۔ وہ پانی کی اس مزید رسد کو طاس سندھ کے باہر وسیع علاقوں کو سیراب کرنے کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ یہ نئے علاقے دریائے جمنا سے بخوبی سیراب کیے جا سکتے تھے۔ لیکن اس طرح پاکستان کو حیات بخش پانی سے محروم کرنے کا مقصد پورا نہیں ہوتا تھا۔ پاکستان نے یہ تجویز پیش کی کہ موجودہ استعمال کو برقرار رکھا جائے اور غیر مستعملہ فاضل پانی کے دونوں ملکوں میں منصفانہ بنیاد پر حصے مقرر کر دیے جائیں۔ بعد میں جو مذاکرات ہوئے ان سے کچھ مراعات بھی سامنے آئیں لیکن کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔

5 فروری 1954ء کو دونوں فریقوں کے غور و غوض کے لیے عالمی بنک نے اپنی تجویز پیش کی بنک نے بڑی صاف گوئی سے تسلیم کیا کہ ''طاس کی ضروریات پوری کرنے کے لیے پانی کی رسد اور ذخیرہ اندوزی کے امکانات ناکافی ہیں'' بنک کی تجویز میں بتایا گیا کہ اگرچہ ماہرین کی جماعت ایک ہی اقتصادی وحدت کی اساس پر طاس سندھ کی ترقی کا منصوبہ مرتب کر رہی ہے لیکن اس کا کام کا تعلق دو آزاد خود مختار مملکتوں سے ہے اور جب معاملہ دو آزاد و خود مختار حکومتوں سے متعلق ہو تو پھر وسائل سے بہترین استفادہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن بنک کے خیال میں سب سے اشد دشواری ہندوستان

Marfat.com

اور پاکستان کے "نقطہ نظر میں بنیادی اختلاف" سے پیدا ہو رہی تھی۔

بنک کا منصوبہ تھا:

"مغربی دریاؤں (سندھ، جہلم اور چناب) کا سارا پانی صرف پاکستان کے استعمال اور استفادہ کے لیے میسر ہو گا اور پاکستان ان آبی وسائل کو ترقی دے سکے گا ماسوا دریائے جہلم کے پانی کی اس بہت تھوڑی مقدار کے، جو اس وقت کشمیر میں استعمال کی جاتی ہے۔ مشرقی دریاؤں، راوی، بیاس اور ستلج کا سارا پانی صرف ہندوستان کے استعمال اور استفادہ کے لیے میسر ہو گا اور ہندوستان ہی ان آبی وسائل کو ترقی دے سکے گا۔ ماسوا ایک متعینہ عبوری مدت کے، جس میں ہندوستان ایک متفق علیہ پروگرام کے مطابق ان دریاؤں سے پاکستان کو اس قدر پانی بہم پہنچاتا رہے گا جتنا کہ ماضی میں وہ حاصل کرتا رہا ہے"۔

بنک کے پلان میں:

"عبوری مدت کی اجازت دی گئی تھی تا کہ اس دوران میں پاکستان رابطہ نہریں بنا سکے، جن کے ذریعے ہندوستان سے آنے والے پانی کا متبادل انتظام کیا جا سکے گا، ان رابطہ نہروں کی لاگت ہندوستان بھی اس حد تک برداشت کرے گا جس حد تک وہ ان نہروں سے مستفید ہو گا۔"

عبوری مدت کے لیے تقریباً پانچ سال کا اندازہ لگایا گیا تھا۔

بنک کے منصوبے میں کسی بند کی تجویز شامل نہیں تھی، ماسوا بھاکڑہ ڈیم کے، جو ہندوستان میں زیر تعمیر تھا اور جس کی تعمیر صرف ہندوستان کے مقاصد کے لیے ہی تھی۔ اس منصوبے میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ "بندوں کی تعمیر کے بغیر بھی پاکستان اس قدر پانی حاصل کر سکے گا جو ماضی میں وہ حاصل کرتا رہا ہے۔ اور بیشتر ستلج ویلی نہروں میں منظور شدہ مقدار تک بہم رسانی کا انتظام مغربی دریاؤں سے کر سکے گا۔ بنک کے منصوبے کا مقصد ان پیچیدگیوں سے بچنا تھا، جو دریاؤں کے پانی میں دو ملکوں کی شراکت سے پیدا ہو جاتی ہیں۔

ہندوستان نے بلا تامل بنک کا منصوبہ منظور کر لیا۔ اس منصوبے میں وہ سب کچھ تسلیم کر لیا گیا تھا جو ہندوستان مانگ رہا تھا۔ ماسوا اس کے کہ اسے چناب کے پانی میں کوئی مداخلت نہیں کرنی چاہیے بنک کے منصوبہ کے مطابق ہندوستان نے پاکستان میں رابطہ نہروں کی لاگت کا ایک حصہ ادا کرنا تھا لیکن پانی کی بہت قیمتی بہم رسائی کا یہ بہت ہی معمولی معاوضہ تھا۔ جب ساری معیشت کا انحصار پانی پر ہو تو روپیہ اس کا بدل نہیں بن سکتا۔

بنک نے پاکستان کو ایک ناقابل برداشت صورت حال سے دوچار کر دیا۔ بنک پر بہت پرزور طریقے سے یہ واضح کیا گیا کہ مشرقی دریاؤں کا پانی جہاں استعمال ہوتا رہا ہے ان ضروریات کے لیے مغربی دریاؤں میں رواں پانی قطعاً ناکافی ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے بندوں کی تعمیر لازمی ہے لیکن یہ نہ صرف گراں بہا ہوں گے بلکہ ان کے لیے طویل معیاد بھی درکار ہو گی لیکن بنک کے منصوبہ میں ان کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا تھا۔ اگر ایسا اہتمام بھی کر دیا جاتا تو بھی پاکستان میں ذخیرہ آب کی جو بہت محدود گنجائش تھی وہ صرف موجودہ صورت حال کو برقرار رکھنے میں صرف ہو جاتی اور اسے بڑھتی ہوئی آبادی کے فروغ پذیر ضروریات کے لیے استعمال نہ کیا جا سکتا۔ روایتی سرزمین عجائب کی ایلس کی طرح پاکستان حتی الوسع سعی تو کرے گا لیکن عملاً اسی مقام پر ہی رہے گا جہاں وہ تھا۔

Marfat.com

چودھری محمد علی لکھتے ہیں:

''پاکستان کی فرمائش پر ڈینورا کولوریڈو۔ امریکہ، کے ایک مشاورتی انجینئر آر جے ٹپٹان نے بنک کے منصوبہ کا انجینئرنگ کے نقطہ نظر سے غیر جانبدارانہ جائزہ لیا۔ اس کے جائزہ سے معلوم ہوا کہ بین الاقوامی قانون کے تحت جو عادلانہ معیار ضروری ہوتا ہے بنک کی تجویز اس پر پوری نہیں اترتی اور طاس سندھ کے پانی کی منصفانہ تقسیم نہیں کرتی اور مزید برآں یہ تجویز آبی وسائل کو بہترین طریق سے ترقی دینے کے اصول کے منافی ہے۔ ٹپٹان کے جائزوں سے یہ بھی انکشاف ہوا کہ بنک کے منصوبے سے پاکستان کو شدید نقصان پہنچے گا۔ پاکستان کے بعض حصے مستقل طور پر پانی سے محروم ہوجائیں گے۔ ماضی میں پانی کی جو مقدار دریاؤں سے حاصل کی جاتی رہی ہے اسے برقرار نہیں رکھا جاسکے گا۔ تقسیم ہند سے قبل پانی کو استعمال کرنے کے جو منصوبے بنائے گئے تھے۔ ان میں خلل پڑ جائے گا اور پاکستان کی آئندہ ترقی کی استعداد بہت گھٹ جائے گی۔

اگلا مرحلہ اس وقت آیا جب اٹھاہ ماہ تک اپنے مشاورین کی مزید تحقیق کے بعد بنک ان نتائج پر پہنچا جنہیں اس نے اپنی 21 مئی 1956ء کی یادداشت میں پیش کیا۔ اس یادداشت میں یہ اعتراف کیا گیا کہ ''ربیع میں مستقل کمی رہے گی' جو گاہے گاہے اواخر ستمبر میں شروع ہوگی اور اوایل اپریل تک جاری رہے گی۔ یہ کمی اس درجہ، معیاد اور کثرت وقوع کی ہوگی کہ بنک کا زمرہ ماہرین اسے ''قابل برداشت'' تصور نہیں کرسکتا'' اس لیے بنک نے محسوس کیا کہ ''اس کی طرف سے فروری 1954ء میں جو تجویز پیش کی گئی تھی اس کی ترمیم ضروری ہے۔ یہ ترمیم ایسی ہونی چاہئے کہ جس سے بنک کی رائے میں پاکستان کو مذکورہ بالا کمی کو رفع کرنے کے لیے کافی پانی ہر وقت ملتے رہنے کا اطمینان ہوجائے''۔

اس ترمیم کے لیے یہ صورت بھی اختیار کی جاسکتی تھی کہ مشرقی دریاؤں سے ''بروقت'' پانی کی مسلسل بہم رسانی ہوتی رہے یا ہندوستان کی لاگت پر مغربی دریاؤں پر بند تعمیر کیے جائیں۔ بنک نے موخرالذکر طریقہ کو ترجیح دی اور اس مقصد کے لیے یہ تجویز پیش کی کہ ''مغربی دریاؤں (سندھ، جہلم اور چناب کے رواں پانی سے حتی الوسع زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا جائے اور ذخیرہ آب کی جو محدود گنجائش پاکستان کی دسترس میں ہے اس میں کم از کم مداخلت کی جائے۔'' الغرض تقریباً دو سال کے بحث مباحثے اور تفتیش و تحقیق کے بعد بنک نے اس حقیقت کا احساس کرلیا کہ مشرقی دریاؤں کے پانی کی محرومی سے جو نقصان ہوگا مغربی دریاؤں میں رواں پانی سے اس کی تلافی نہیں کی جاسکے۔ بنک کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ اپنے اس غلط مفروضے کی تصحیح کے لیے تیار ہوگیا جس کی بناء پر اس کی ابتدائی تجویز مرتب ہوئی تھی۔ یہ تصحیح مشرقی دریاؤں سے پانی لے کر نہ سہی، مغربی دریاؤں پر ہندوستان کے خرچ سے بند تعمیر کر کے ہی سہی بہر صورت تصحیح تھی۔

چنانچہ عالمی بنک نے اپنے 30 جولائی 1956ء کے مکتوب، میں یہ سفارش کی کہ دونوں حکومتوں کو بنک کی 5 فروری 1954ء کی تجویز اور 21 مئی 1956ء کی یادداشت کی اساس پر بنک کی اعانت کے ساتھ تعمیری کام کو جاری رکھنے پر رضامند ہوجانا چاہئے دونوں حکومتوں نے اس سے اتفاق کرلیا۔ اس کے بعد بھی ایک معین حل کی تلاش میں چار سال تک مذاکرات ہوتے رہے۔ مشکل محض یہ نہیں تھی کہ ہندوستان اور پاکستان کے زاویہ ہائے نگاہ مختلف تھے سرمایہ کی فراہمی کے بہت بڑے مسائل درپیش تھے یہ بات روز روشن کی طرح ظاہر ہوگئی تھی کہ عالمی بنک کی تجویز کے خطوط پر تصفیہ کے لیے جن تعمیرات کی ضرورت ہے ان کی لاگت ہندوستان اور پاکستان کے بس سے باہر ہے۔ بالآخر عالمی بنک کے صدر بلیک کی

Marfat.com

مستقل مزاجی اور بقول اس کے ''اقتصادی سیاست گری'' سے اور امریکہ، برطانیہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، اور مغربی جرمنی کی دوستانہ امداد سے سمجھوتہ ہو ہی گیا۔

معاہدہ طاس سندھ پر 19 ستمبر 1960ء کو کراچی میں ہندوستان، پاکستان اور عالمی بنک کے نمائندوں نے دستخط کیے۔ معاہدہ پر دستخط ہونے کے ساتھ ہی ساتھ آسٹریلیا، کینیڈا، مغربی جرمنی، نیوزی لینڈ، پاکستان، برطانیہ، اور امریکہ کی حکومتوں اور عالمی بنک کے نمائندوں نے ایک بین الاقوامی مالیاتی اقرار نامہ پر مہر ثبت کردی۔ اس اقرار نامے کے تحت پاکستان میں آبپاشی اور دوسری تعمیرات کی مالی ضروریات پوری کرنے کے لیے تقریباً 90 کروڑ ڈالر کا طاس سندھ تعمیراتی فنڈ قائم ہو گیا۔ اس فنڈ کے لیے 64 کروڑ ڈالر کے عطیات امداد کرنے والی حکومتوں نے دینے تھے۔ ہندوستان نے معاہدہ طاس سندھ کے تحت 17 کروڑ 40 لاکھ ڈالر ادا کرنے تھے اور عالمی بنک کی طرف سے پاکستان کو 8 کروڑ ڈالر کا قرضہ بھی اس فنڈ میں شامل ہونا تھا۔ تعمیرات کے پروگرام میں پاکستان میں 8 رابطہ نہریں شامل ہیں جو تقریباً 400 میل لمبی ہوں گی اور ان سے مغربی دریاؤں کا پانی ان علاقوں تک لے جایا جائے گا جو قبل ازیں مشرقی دریاؤں سے سیراب ہوتے تھے۔ دو بند تعمیر ہونے ہیں ایک جہلم پر اور دوسرا سندھ پر۔ علاوہ ازیں کئی بجلی گھر، 25 ٹیوب ویل اور سارے دریائی اور نہری نظام میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے دوسرے تعمیرات بھی اس پروگرام کا حصہ ہیں۔ طاس سندھ کے سمجھوتے میں ہندوستان میں دریائے بیاس پر ایک بند کی تعمیر بھی پیش نظر رکھی گئی ہے اس کی اور ستلج پر بھاکڑہ ڈیم کی مدد سے اور راجستھان نہر کے ذریعے ہندوستان میں بڑے وسیع نئے علاقوں کو سیراب کیا جائے گا۔

معاہدہ میں دس سال کی عبوری معیاد کا اہتمام کیا گیا ہے۔ جس میں مزید تین سال کا اضافہ کیا جا سکتا ہے اس دوران میں ہندوستان مشرقی دریاؤں سے پاکستان کو پانی بہم پہچاتا رہے گا۔ اگر ضرورت پیش آئے تو معاہدہ کے تحت ایک غیر جانبدار ماہر مقرر کیا جا سکتا ہے جو فنی مسائل پر حتمی فیصلہ صادر کرنے کا مجاز ہوگا۔ علاوہ ازیں خاص ثالثی عدالت سے بھی رجوع کیا جا سکتا ہے۔

ایک مدت کے بعد ہی پتہ چلے گا کہ اس معاہدہ میں جن نہروں اور بندوں کی تعمیر پیش نظر ہے وہ پایہ تکمیل تک پہنچنے کے بعد اس سے وابستہ توقعات کو پوری کرتی ہیں یا نہیں؟ بنیادی طور پر اس معاہدہ کا مقصد پاکستان میں آبپاشی کے موجودہ نظام کو برقرار رکھنا ہے لیکن اس سے ترقی کی امید بھی کی جا سکتی ہے کہ یہ روز افزوں آبادی کے معیار زندگی کو بہتر بنانے کے کام آئے گا۔ مگر بعض لوگوں کو اس کی سودمندی میں بہت شک ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ گاروالے دریاؤں پر بندوں کی عمر زیادہ نہیں ہوتی۔ نیز یہ کہ بڑی بڑی رابطہ نہروں کی مرمت اور نگہداشت پر خرچ اور جو قرضے پاکستان کو لینے پڑے ہیں ان کی ادائیگی کا بار نظام آبپاشی کی پیداواری استعداد سے بہت زیادہ ہوگا۔ دریائے سندھ پر تربیلا بند کی تعمیر کے سلسلے میں جو حیص بیص ہو رہی ہے وہ اس سے بھی زیادہ تشویش کا باعث ہے کیونکہ اس بند کے بغیر ترقیات کی تمام امیدیں نقش برآب ثابت ہوں گی اور واجبات کی گرانباریاں فوائد سے کہیں زیادہ ہوں گی۔ تاہم ابھی حتمی رائے قائم کرنے کا وقت نہیں آیا۔ (ترجمہ انگریزی کتاب Emerging Pakistan ''ظہور پاکستان'' چودھری محمد علی صفحہ 390 تا 392)

Marfat.com

پاک بھارت خارجہ پالیسی کی ترجیحات

کسی بھی ملک کی خارجہ پالیسی معروضی حالات کی مرہون منت ہوتی ہے اور اسے متعلقہ ملک کی تاریخ، جغرافیہ، محل وقوع مروجہ اور عالمی سیاسیات اور اپنے قومی مفادات کی بنیاد پر تشکیل دیا جاتا ہے چونکہ کسی بھی ملک کی خارجہ پالیسی اس کے اندر اور باہر کی دنیا میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کی مرہون منت رہتی ہے۔ اس لئے کچھ بنیادی اصول تو ایسے طے پا سکتے ہیں جنہیں خارجہ پالیسی کی بنیاد کہا جائے لیکن متعلقہ ملک کی خارجہ پالیسی ہمیشہ تغیر پذیر رہتی ہے اور عالمی صورتحال کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلی بھی آتی رہتی ہے۔ یہ صرف کہنے کی بات ہے کہ کسی ملک کی خارجہ پالیسی ہمیشہ ایک جیسی رہی ہے۔

خارجہ پالیسی کوئی حسابی کلیہ تو ہے نہیں کہ جس کے استعمال سے تمام مقاصد حل کر لئے جائیں بلکہ یہ ایک نہایت ہی پیچیدہ فن ہے یہی وجہ ہے کہ کسی ملک کی خارجہ پالیسی ہمیشہ ایک جیسی نہیں رہتی لیکن ان سب باتوں کے باوجود اس ملک کے بنیادی نظریات اور مفادات تبدیل نہیں ہوتے یا یوں کہہ لیجئے کہ خارجہ پالیسی، خارجہ حالات کے تابع ہوتی ہے اور کبھی کبھی تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک ملک کی خارجہ پالیسی اس کے ہمسایہ ملکوں کے فیصلوں کے نتیجے میں مرتب ہوئی ہے اس کا اندازہ خود ہمارے ملک کے ابتدائی حالات سے ہی لگایا جا سکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ پاکستان نے ابتدا میں بھارت اور افغانستان سے دوستی قائم کرنے کی ہر امکانی کوشش کی لیکن اسے ناکامی ہوئی اور دشمن ہمسائیوں کے خطرناک عزائم کے پیش نظر پاکستان کو بالآخر دو بڑے عالمی بلاکوں میں سے ایک بلاک سے قربت پیدا کرنا پڑی یہاں تک کہ فوجی معاہدے کئے گئے اور مخالفوں کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ پاکستان مغربی بلاک کا طفیلی ملک بن گیا ہے حالانکہ یہ ایک مضحکہ خیز بیان ہے۔

پاکستان نے بہرحال اپنی بنیادی اساس یعنی نظریہ پاکستان کو ہی ہمیشہ اپنی پالیسی کی بنیاد بنایا ہے جبکہ بھارت کا معاملہ اس سے بالکل برعکس ہے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ دونوں ممالک نے آزادی کے فوراً بعد ایک دوسرے کے بالکل برعکس اپنی خارجہ پالیسی کی ترجیحات طے کی تھیں اس لئے دونوں روز اول سے ایک دوسرے کو ملامت کرتے آرہے ہیں۔ بھارت، پاکستان کی مذمت اس لیے کرتا ہے کیونکہ اس کے خیال میں پاکستان نے برصغیر میں بیرونی مداخلت کے مواقع فراہم کئے ہیں اور پاکستان کے نزدیک بھارت کی خارجہ پالیسی کا مقصد اس علاقہ میں اپنی بالادستی قائم کرنا ہے۔

آزادی کے بعد بھارت نے غیر جانبدارانہ خارجہ پالیسی اختیار کی جو دراصل ایشیا اور افریقہ کے ممالک کی قیادت حاصل کرنے کے لئے تھی۔ بھارتی خارجہ پالیسی میں توسیع پسندی کے سارے عناصر کارفرما ہیں جبکہ پاکستان پُرامن بقائے باہمی اور اقوام متحدہ کے اصولوں کی پیروی میں بھارت سے تعلقات استوار کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا بھارت نے پاکستان کو اس کی ایشیائی قیادت کے لئے ایک چیلنج سمجھا اور اپنی خارجہ پالیسی کی بیناد اس اصول کو قرار دیا کہ پاکستان اس کا اصل دشمن اور

Marfat.com

رقیب ہے اور اس کی خارجہ پالیسی کا ایک مقصد پاکستان کو کمزور اور تنہا کرنا ہے۔ آر ایس پٹیل نے خارجہ پالیسی کی اس سوچ کی یوں ترجمانی کی ہے۔

''تخلیق پاکستان بھارت کی سلامتی کو سب سے بڑا خطرہ ہے۔ اُس کا جغرافیائی اتحاد ٹوٹ گیا۔ اس غیر فطری فیصلے سے جس نے ہندوستانی قوم کی بنیاد بگاڑ کے رکھ دی ہے۔ جس نے بھارت کو شدید کمزور کر دیا ہے اور اس سے اس کی آزادی کو بھی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے اور اس تقسیم کو ختم کرنے کی مساعی تعمیری ڈپلومیسی کا تقاضا کرتی ہے۔ صرف اس وقت بھارت ایک عظیم طاقت کی حیثیت سے ابھر سکتا ہے۔ فوجی، عسکری، اقتصادی، تاریخی اور جغرافیائی لحاظ سے اس قوم کا دوبارہ ایک ہونا لازمی ہے۔ (آر ایس پٹیل India's Foreign Policy / P29)

بھارتی حکومت کے نزدیک پاکستان بھارت کے لئے نظریاتی خطرہ بھی ہے کیونکہ پاکستان مذہبی (مسلم اکثریت) بنیاد پر کشمیر کا دعویٰ کرتا ہے اور یہ بھارت کے سیکولر ڈھانچہ کے لئے نقصان دہ ہے نیز پاکستان کے مغربی ایشیا کی اسلامی ریاستوں سے تعلقات اس علاقہ میں بھارت کو پریشان کرنے کے لئے ہے۔ مغرب کے خلافتی نظام میں پاکستان کی شمولیت اور چین سے اس کے اسٹریٹیجک اور ملٹری روابط بھارت کے لئے خطرہ ہیں۔ اس سے سرد جنگ برصغیر تک پہنچ گئی ہے اور پاکستان کے ہتھیاروں کے اصول سے بھارت کی برتری کو خطرہ لاحق ہے۔ اس کثیر جہتی نوعیت (علاقائی، نظریاتی، سیاسی، دفاعی) کے خطرات کی بنا پر ہی پاکستان کو بھارتی خارجہ پالیسی میں اولین حیثیت حاصل ہے۔

(India's National Security & Foreign Policy, P. 152)

اپنے اصل مقاصد کے لئے بھارت غیر جانبداری کی پالیسی پر استقلال سے چلتا رہا اور پاکستان کے ساتھ کشیدہ تعلقات کی بنا پر اس کی یہ پالیسی ہرگز تبدیل نہیں ہوئی البتہ دوسرے ملکوں مثلاً امریکہ، برطانیہ، روس، چین، عرب ممالک، یورپی ممالک کے ساتھ تعلقات پر اثرات ضرور مرتب ہوئے۔ حیرت کی بات ہے کہ دن رات اپنی غیر جانبداری کا راگ الاپنے والے بھارت کے وزیر اعظم نہرو نے بھارت چین جنگ کے فوراً بعد امریکہ سے رجوع کیا اس طرح ان کی سپتری مسز اندرا گاندھی نے روس سے دفاعی معاہدہ بھی کیا اس معاہدے نے پاکستان کو دولخت کرنے میں اہم کردار ادا کیا کیونکہ ان دنوں دنیا کی دو بڑی سپر پاورز میں سے ایک کو بھارت نے اپنا ہم خیال ہی نہیں بلکہ ہمسفر بھی بنا لیا تھا۔ ان تلخ حقائق کے باوجود اس زمینی سچائی سے انکار ممکن نہیں کہ بھارت نے کبھی بھی اپنی غیر جانبداری کا راگ الاپنا بند نہیں کیا اور ہمیشہ پاکستان پر الزام لگایا کہ غیر ملکی طاقتوں کو پاکستان کی وجہ سے برصغیر میں قدم جمانے کا موقع ملا۔ قبل اس کے کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی کا جائزہ لیں۔ آیئے بھارت کے غیر جانبداری کے دعوے پر ایک نظر ڈالیں۔

معروف محقق ڈاکٹر محمد جہانگیر تمیمی کہتے ہیں:

دوسری جنگ عظیم کے بعد دو عالمی قوتوں روس اور امریکہ کی باہمی آویزش اور سرد جنگ میں مبتلا دونوں دھڑوں کے مابین، بھارت کو اس کے بیچوں بیچ، اپنا مقام بنانے اور راہ پانے کا واقعاتی موقع اور محل میسر آیا جس سے جواہر لعل نہرو کے خود اپنے آدرش اور عندیے کی علاقائی قیادت Regional Leadership اور ایشیائی سیادت کا رستہ اور آسان ہوتا چلا گیا۔ یہی سبب ہے کہ وہ اس دائرہ خیال کی راہ پر نو آزاد اور چھوٹے افریقی اور ایشیائی ممالک کا دائرہ پھیلنے اور

Marfat.com

بڑھانے پر تُلت گئے۔

دہلی یونیورسٹی میں چینی اور جاپانی زبان کے پروفیسر وی پی دت نے بھارت کی خارجہ حکمت عملی نظم و بست میں علاقائی جغرافیائی اہمیت باور کراتے ہوئے لکھا ہے:

Thus history and recent experience were powerful factors making for a strong independent foreign policy to take shape over the year and for the foreign policy to be mainly anchored to the Asian African community of the developing countries. The decades of the geography too were obvious.

غالباً یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے دیگر ایشیائی زعماء اور معاصر رہنماؤں عوامی جمہوریہ چین کے وزیر اعظم چواین لائی، ہند چینی (ویت نام) کے ہوچی منہہ اور انڈونیشیا کے صدر احمد سوئیکارنو کے روبرو بلکہ دوبدو آنے لگے، یہاں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان سامراج دشمن رہنماؤں کے مقابل آنے کے لئے انہیں روس اور امریکہ سمیت دیگر کئی مغربی ممالک کی سیاسی شہ سے بھی ہوا ملی۔ چنانچہ افریشیائی اتحاد کا نعرہ لئے وہ انڈونیشیا کے شہر بنڈونگ میں منعقدہ افریشیائی کانفرنس جا پہنچے وہاں پر انڈونیشیا کے احمد سوئیکارو اور عوامی جمہوریہ چین کے وزیر اعظم چواین لائی کے آگے دال نہ گلی اور جواہر لال نہرو کی ایک نہ چلی تو ان کا افریشیائی اتحاد کا ڈھونگ احمد سوئیکارنو کی مجوزہ بنڈونگ سربراہ کانفرنس کے مرحلہ پر دم توڑ گیا۔ یہ جتن بھی بیکار نکلا روسی ایما اور امریکی اشارے پر غیر جانبدار تحریک کے سرخیل ہو گئے۔ صاف کہنا چاہئے کہ الہ آباد (بھارت) کے گھاٹ سے بلغراد (یوگوسلاویہ) کے پاٹ تک ہی جواہر لعل نہرو کے قائدانہ عزائم کا تلاطم برپا رہا۔ جس کے درمیان مصر کے جمال عبدالناصر کا دریائے نیل بھی ''شریک فتنہ کونین'' تھا۔ گویا نہرو کی قیادت اور یوگوسلاویہ کے مارشل ٹیٹو اور مصر کے جمال عبدالناصر کی بظاہر امریکہ مخالف بغاوت غیر جانبدار تحریک کی سیادت اور قیادت بن گئی۔ یہی غیر جانبداریت کا کمال یا کمائی ہے جس پر بھارت کی خارجہ حکمت عملی روبہ عمل یا کارفرما بتائی جاتی ہے اور اس غیر جانبداریت ہی کو بھارت کے مفاد و مصالح یا قومی مفادات کے عین مطابق اور مفید گردانا جاتا رہا۔ بلکہ اس ضمن میں بھارت کے سابق وزیر خارجہ جسونت سنگھ نے پنڈت جواہر لعل نہرو کی خارجہ پالیسی کے بنیادی نقطہ کو چھونے کے لئے بھارت کے سابق سیکرٹری خارجہ جگت مہتہ کے استفسار کے بعد لکھا ہے کہ:

In the early phase of independence the principle foreign policy challenge was that of given conceptual definition to India's foreign policy.

اسے بھارت کی دانشورانہ اور ترقی پسندانہ سوچ کے دائرے پر بھی بہایا جاتا ہے جو بظاہر گداز الفاظ کا چناؤ ہے، یعنی امن، شانتی، بقائے باہمی کے اشارے دے کر عالمی آویزش کے دو دھڑوں یا دو بڑوں (تب روس اور امریکہ) کے درمیان چھوٹے چھوٹے ممالک کے بڑے بڑے قائدین کے قائد کے طور پر بھی بھارت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل

Marfat.com

نہرو کیا تھے؟ متلاطم عالمی بہاؤ میں بھارت کی قدیم اور ہندوآنہ تحریک میں گویا بگلہ بھگت تھے جو ایک ٹانگ پر کھڑا محوِ دعا رہا کہ الٰہی بھیج کہیں سے کوئی شکار......! کہ یہی مقصودِ بگلہ بھگت ہے۔ ایک ٹانگ پر کھڑا یہ پاپی بگلہ، اصل میں تو بگلہ بھگت ہے، بے سکت و جامد......! یہ مصروف عبادت ہے......! اس کو گرد و پیش سے بظاہر کیا سروکار؟ بس ایک ذرا سی جنبش ہو اور کوئی چھوٹا موٹا شکار نظر آئے تو......! پھر پل پڑنے کا انداز ے جارحیت ملاحظہ کرنے کا مرحلہ ہوگا۔ بس یہی ہندویت (ہندوازم) کا روایتی بگلہ بھگت ہے اور یہی بھارتی غیر جانبداریت کا سفارتی انداز بلکہ محاذ ہے کہ دیگر ممالک کو بے عمل اور بے سکت کرنے کیلئے، مگر خود حد درجہ چوکس اور چوکنا! اسلحہ کی تیاری اور خریداری تک......امریکہ ہو کہ روس، برطانیہ ہو کہ اٹلی، کینیڈا ہو کہ جرمنی...... جہاں سے، جیسے اور جس بھاؤ ملے، لے لینا، بلکہ لے اڑنا اور پھر غیر جانبداریت رہی کہ نہ پگھلتی ہے نہ ڈھلتی ہے، بلکہ جامد ہے۔ ہلتی تک نہیں، گویا غیر جانبداریت بھی ایک نیا بھگوان اور اس کا جامد بُت تھا کہ پجاری تھے کہ بچھے جا رہے تھے، جھکے جا رہے تھے۔ یہ بگلہ بھگت تو دراصل ایک تمثیل ہے۔ البتہ ہندو بھگت کا حقیقی بھگوان تو سراسر طاقت ہی ہے جس کا حصول اس کا منتہائے حصول ہے۔ اسلحہ کی تیاری اور اسلحہ کی خریداری اور امن کی دیوی طاقت کے بت کا پجاری ہے! حرفِ عام میں ''بغل میں چھری اور منہ میں رام رام'' بھی کہتے ہیں اور یہی تو غیر جانبداری ہے، یعنی طاقت کے آگے جھکنا اور کمزور پر پل پڑنا ہی تو ہندو کی مت (Mentality) ہے یا ہندویت (ہندوازم) ہے ان ہی عزائم اور ارادوں کو لے کر اپنے قومی مقاصد اور مفادات کے حصول کا مشن لئے، بھارت غیر جانبدار تحریک میں متحرک ہو گیا۔ (ڈاکٹر محمد جہانگیر تمیمی ندائے ملت صفحہ 21 شمارہ 16 تا 22 جون 2005ء)

بھارت کے سابق وزیر خارجہ اور بھارتی ایوان بالا (راجیہ سبھا) میں جنتا پارٹی کے قائد مسٹر جسونت سنگھ بھی تائید کرتے ہیں کہ بھارت کا عالمی تناظر میں بہترین مقام اور کام غیر جانبداریت تھی، وہ لکھتے ہیں:

India's answer to global bipolarity was the principle of non-alignment and appropriate response which gave India the needed flexibility. It provided the correct policy platform for and assertion of the sovereignty of a newly independent India in international relations; it echoed accurately the sentiments of the emergent, post-colonialism third world; and it adequately subserved India's national interests.

اصلاً یہ غیر جانبداریت ہے کیا خود غیر جانبدار تحریک **Non-aligned Movement- NAM** کا بھی صاف اور ظاہری المیہ یہ رہا ہے کہ اس کے اکثر ارکان روسی بلاک سے پیوستہ اور بعض ارکان امریکی بلاک سے وابستہ تھے۔ نتیجہ یہ کہ گزشتہ 55 برسوں سے غیر جانبدار تحریک اپنے سربراہوں کے اجلاس کے انعقاد اور ممبر ممالک کی تعداد میں اضافے کے باوجود وقت اور صلاحیتوں کا صریحاً ضیاع ثابت ہوئی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس کا نظریہ فی الحقیقت دانشورانہ عیاشی کے سوا کچھ اور نہ تھا۔ جس تحریک کے اکثر و بیشتر ارکان دونوں عالمی دھڑوں کے ذیلی یا طفیلی بلکہ حاشیہ بردار ہوں، وہاں سرد جنگ

Marfat.com

(Cold War) کی لہروں میں "ٹھٹھرے اور ٹھنڈے" اجلاسوں کا بظاہر ماحول گرم کرنا ایک طرح کی خود فریبی تھی یہاں تک کہ روس کی حالیہ شکست وریخت کے بعد اس تحریک کے اولین علمبردار بھارت کا عندیہ اور واضح اشارہ یہ ہوا کہ "غیر جانبدار تحریک میں اب رکھا ہی کیا ہے" گویا بھارتی خارجہ حکمت عملی میں خود غیر جانبداریت پر عملاً اس کا اصلی شعور یا شعور ہی یہ کہ اٹھے، کہ "لیلیٰ تھک چکی ہے، مجنوں جا سکتے ہیں" اور اس رخ سے ہی بھارتی غیر جانبداریت کا مفہوم مطلب جاننے میں عقل کی زیادہ مقدار درکار نہ ہوگی حد تو یہ ہے کہ بھارت نے اس بارے میں دوہرے معیار اور عقل عیار کی حد کئے رکھی۔ اگر یہ الفاظ عملی نہ ہوں تو صحافتی زبان میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ بھارت ایک طرف روس کا "دم چھلا" بنا رہا اور ہر بین الاقوامی اجلاس کانفرنس اور پلیٹ فارم پر اس کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا تو دوسری جانب غیر جانبداریت کا سرخیل بھی بنا رہا۔ یہی کھیل بالآخر 70ء کی دہائی میں روس...... بھارت معاہدہ دوستی کی شکل میں ظاہر ہوا۔

ممتاز بھارتی صحافی کلدیپ نیئر نے انکشاف کیا ہے کہ پاک بھارت جنگ 1971ء سے کچھ پہلے ماسکو میں سابق بھارتی سفیر مسٹر ڈی پی دھر نے مسز اندرا گاندھی کے ایما پر ماسکو کے کئی خفیہ دورے کئے اور بھارت...... روس دفاعی معاہدے کو حتمی شکل دی اس معاہدے کی تفصیلات کو اس قدر رازداری سے پروان چڑھایا گیا مسز اندرا گاندھی نے اپنے سینئر ساتھیوں بابو جگ، جیون رام، مسٹر ایس بی چوہان تک کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔ یہاں تک کہ وزیراعظم اندرا گاندھی نے اپنی کابینہ تک کو 9 اگست 71ء کی صبح مطلع کرنا مناسب سمجھا جبکہ دنیا بھر کی خبر رساں ایجنسیاں اس دفاعی معاہدے کی تمام تر تفصیلات جاری کر چکی تھیں۔ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

And after the Bangladesh crisis, the fear that China and Pakistan might join hands to attack, was so widespread that any action to strengthen defence will be welcome by the people, D.P. Dhar, the former ambassador to USSR, was sent to Moscow to revive the treaty proposal. His discussion and every thing about the treaty were kept secret instead of coded cables. couriers were sent between New Delhi and Moscow to finalize the term of the treaty. Mrs. Gandhi took like Jagjivanram and S.B. Chavan into confidence only after the draft had been finalized in Moscow. The cabinet was told about it only in the morning of 9th August 1971. By that time, News Agencies had put the story on their wire.

اس کی تائید و تصدیق ممتاز مصنف اور بنگالی ہندو نژاد سی چودھری نے بھی کی ہے۔ "لندن ٹائمز" میں اپنے ایک مضمون میں وہ لکھتے ہیں:

"1947ء سے 1970ء تک پاکستان کو نشیب و فراز سے بھرپور زندگی میں بھارت کی مسلسل معاندانہ پالیسی کا

Marfat.com

سامنا کرنا پڑا۔ یہی پالیسی 1970ء کے انتخابات کے بعد اپنی انتہا کو پہنچ گئی اس کے بعد بھارت عملی اقدامات کے لئے مناسب حالات کی تلاش میں تھا جو روسی امداد کی شہ ملتے ہی اسے میسر آ گئے اور بھارت نے پاکستان پر فیصلہ کن وار کرنے میں دیر نہ کی۔

امر واقع یہ ہے کہ بھارت نے مشرقی پاکستان کو بزور جنگ بنگلہ دیش بنانے سے پہلے جارحانہ سفارتی مہم اور مشرقی پاکستان پر جارحیت کا ارتکاب کرنے سے قبل روس سے دفاعی معاہدہ کر کے ایک طرف روسی چھتری اور دوسری طرف امریکی آشیرباد حاصل کر لی تھی۔ یہی سبب ہے کہ سقوط ڈھاکہ پر مسز اندرا گاندھی بھارتی پارلیمنٹ کے ایوان زیریں (لوک سبھا) میں فتح و شادمانی کے نشے میں چور ہو کر چلا اٹھیں کہ: ہم نے مسلمانوں سے ایک ہزار سال کا انتقام لے لیا ہے۔ ہم نے دو قومی نظریہ کو خلیج بنگال میں غرق کر دیا ہے۔ آج ایک ہزار سال کے (ہندوؤں کے) دکھ یاد آ رہے ہیں۔

(بھارتی جارحیت۔ روزنامہ امروز۔ لاہور 13 جنوری 1978ء)

یہ دفاعی معاہدہ بظاہر بھارت عوامی جمہوریہ چین سے خطرے کے مقابلے کے نام پر ہوا تھا مگر عملاً یہ پاکستان جیسے نظریاتی ملک کو دولخت کرنے کے علانیہ بھارتی عزائم کا پیش خیمہ تھا جو وقت نے ثابت کر دکھایا مگر یہ تو 70ء کے عشرے کی بات تھی جبکہ دس سال قبل 60ء کے عشرے میں نیفا کے محاذ پر بھی چین سے بھارت کے تصادم 62ء میں خود جواہر لعل نہرو غیر جانبداریت کے علمبردار تحریک کا دھرم اور بھرم دونوں کھولے دیتے ہیں، اس کے احوال واقعی نے سرد جنگ کے دورانیہ میں بھارتی غیر جانبداریت کو عملاً ترکاری میں تیز پات بلکہ "کڑی پتے کے تڑکے" کا کام دے کر اسے منطقی انجام تک پہنچا دیا ہے کہ بھارت کے داخلی دفاع اور فضا میں کنٹرول کا براہ راست ذمہ امریکی فضائی بیڑے کے ذمے لگانے کی استدعا کی گئی تھی اور یہی بھارتی غیر جانبداریت کا اصلی مفہوم بن کر بھارتی غیر جانبداری کا واقعاتی تجزیہ بن گیا ہے۔ اسے خارجہ حکمت عملی کی مروجہ زبان میں یوٹرن کہتے ہیں۔ یوٹرن تو علی الاعلان ہوتا ہے جبکہ بھارتی غیر جانبداری میں واقعاتی عنصر Situational Factor عملاً ساز باز کے زمرے میں آتا ہے کہ "ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ" کا سماں صاف ظاہر ہے۔ تاہم اس کی تہہ کو پانے کے لئے پہلے اس کے پس منظر میں جھانکنے کی ضرورت ہے۔

▪▪▪

دونوں عالمی جنگوں کی کوکھ اور راکھ سے ابھرنے والے عالمی نظام World Politics کو اگر مقہور قوموں، جرمن و جاپان، کے تاراج کا منظر نامہ کہیں تو بات حقیقت کے قریب تر ہوگی جبکہ اس کے نتیجے کے طور پر امریکہ اور روس کی بالادست قوتیں بھی نکھر کر سامنے آئیں جنہوں نے 1995 / 1945ء کے پچاس برسوں میں باہمی آویزش اور اپنی برتری کے نشہ و خمار سے عالمی سطح پر سرد جنگ کا تناؤ تانے رکھا اور عسکری دباؤ بڑھائے رکھا۔ اس سے پوری کائنات ارضی کے انسان اور ممالک ہر دو عالمی طاقتوں میں کسی نہ کسی کے ساتھ اور پاس رہ کر اپنے لئے امن و سلامتی کا مصنوعی ماحول بلکہ سانس لینے کے لئے آکسیجن ٹینٹ کی صورتحال دوسری جنگ عظیم کے بعد کا عالمی منظر بن کر رہ گیا۔ اس باہمی کشمکش اور دو عالمی دھڑوں اور بڑوں میں مشرقی یورپ کے کمیونسٹ ممالک اور اس کی تنظیم Comecon جبکہ یورپ کے امریکی ساتھی اور پہلی جنگ عظیم کے پہلے دو عالمی سامراج برطانیہ اور فرانس بھی مسلسل شریک فتنہ کونین رہے ہیں امریکہ برطانیہ اور فرانس نے مل کر عالمی سطح پر قوموں اور ملکوں کے باہمی تعلقات اور اقدامات کا تانا بانا بنایا۔ سلامتی کونسل میں ویٹو پاور کے منصب و

Marfat.com

مقام نے اقوام متحدہ کے انتظام اور چارٹر کے پیغام کے باوجود نئے عالمی نظام (نیو ورلڈ آرڈر) کا ڈھکا چھپا اور کھلا بلکہ واضح مطلب و مقصد یہی باور کرایا کہ اس نظام میں بظاہر کوئی سا غلبہ و استیلا یعنی نو آبادیات Colonialism کا رنگ ڈھنگ قطعاً نہیں ہے اور نہ ہی پہلی جنگ عظیم سے پہلے والی عالمی صورتحال میں برطانوی، فرانسیسی یا پرتگالی، ولندیزی سامراجیت Imperialism ہے۔ البتہ عملی طور پر طریقے معاشی اور اقتصادی امداد بلکہ احتیاج سے مغرب کے اقتصادی غلبہ اور عسکری برتری کو بڑھایا گیا اس سے نو آزاد ممالک میں سیاسی معاشی اور تہذیبی غلامی کو سرعت رفتاری سے رواج ملا جو فی الواقعہ دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا کے نقشے پر ابھرنے والے نو آزاد ممالک کی معروضی مجبوری بن گیا یہی ممالک یا اقوام عملاً تیسری دنیا (تھرڈ ورلڈ) بھی کہلائی، جس کی ظاہری پہچان اور تعارف ہی یہی تھا کہ یہ وہ ممالک ہیں جو برطانوی، فرانسیسی انتداب کے بعد نو آزاد تو ہیں، مگر معاشی طور پر مجبور اور معذور، جن کی مدد کی جانی چاہئے۔ ان ممالک میں واحد ملک افغانستان تھا جو کبھی بھی کسی سامراج کی نو آبادی تو نہ رہا تھا البتہ اس کے معاشی منظر نامے کے باعث اسے بھی تیسری دنیا یعنی معاشی حالات سے تنگ دست ممالک کی فہرست میں شامل کیا جاتا رہا ہے۔ نتیجتاً گزشتہ 65 برس کے اس عالمی منظر نامہ اور سرد جنگ کے ماحول میں اقوام متحدہ کا ادارہ گویا قوموں کے اجتماع یا جمگھٹے کی کہکشاں کہہ لیں جو معاشی و سیاسی یا ذہنی تناؤ کے ماحول اور سرد جنگ کے مدھم اجالوں کی آماجگاہ بن گیا اس لئے لیگ آف نیشنز کا دوسرا جنم اگر اقوام متحدہ یو این او بنی تو یہی وقت کا فیصلہ اور دانش کا ظاہری انجام بلکہ اقدام بھی تھا۔ تاہم بھارت نے اپنے قومی مفاد و مصالح کے حصول کی خاطر غیر جانبداریت کا روپ سروپ اختیار کر کے اپنے لئے عالمی حالات میں راہ بنائی۔ سرجیت مان سنگھ نے بھارتی خارجہ حکمت عملی میں غیر جانبداریت کے تذکرے میں کہا:

> **As an approach to international politics, non-alignment arose from Indian history and culture. In the circumstances of the post-World War 2, it also serve to advance India's natoinal interests as perceived by it's leadership.**

(انڈین فارن پالیسی صفحہ 178)

اقوام متحدہ کی تشکیل کے بعد عالمی سطح پر دوسری بڑی تنظیم غیر جانبدار تحریک Non Alignment Movement بنی جو فی الواقعہ دوسری جنگ عظیم کے بعد نو آزاد ایشیائی اور افریقی ممالک کی عوامی امنگوں کا عکس اور آزادی کے نقش کا پھریرا لئے دو عالمی دھڑوں کی باہمی آویزش Rivalry اور سرد جنگ کے بیچوں بیچ ایک ردعمل اور موزوں حکمت عملی کے نام پر شاہراہ ترقی و امن کا دوسرا پلیٹ فارم ٹھہرایا پھر نو آزاد ممالک کے جوشیلے قائدین کو یکجا ہو کر اپنے آپ کو منوانے کا عالمی بندوبست قرار پایا۔ دوسرے الفاظ میں نو آزاد ممالک یا معاشی یا دفاعی اعتبار سے مجبور اور مقہور قوموں کے خوف کو یکجا ہونے یا اجتماعی قوت بننے کا سہارا ملا۔ ۸

جنوبی ایشیا میں اپنی جغرافیائی حیثیت کے باعث بھارت نے غیر جانبدار تحریک کو اختیار کیا ایس ایس بندرا نے بھارت کے خطے میں اہمیت کو عالمی تناظر میں پیش کرتے ہوئے لکھا:

Marfat.com

The strategic location of India has helped her to acquire a central position in Asian and World politics.

All the major sea and air routes of the world pass through India and the Indian Ocean are indispensable link in world trade and commercial intercourse. (Indian Policies Towards Peace, P. 294)

تاہم دو عالمی دھڑوں کی باہمی کشمکش کے میدان میں غیر جانبدار تحریک کا قیام جن مقاصد اور عزائم کے تحت عمل میں آیا وہ اس کی تاریخ اور تحریک دونوں کے علمی محاکے اور تجزیے سے ہی واضح ہوگا۔

اپریل 1955ء میں اس کا پہلا اجلاس انڈونیشیا کے شہر بنڈونگ میں منعقد ہوا جس میں افریقہ اور ایشیا کے 29 نو آزاد ممالک نے شرکت کی جبکہ بھارت، یوگوسلاویہ، کیوبا اور مصر کے علاوہ انڈونیشیا اس کے بانی و پرچارک اور سرگرم موید اور مبلغ ممالک تھے جہاں تک ان ممالک میں بھارت، یوگوسلاویہ، کیوبا اور مصر کا تعلق ہے وہ صریحاً اور واضح طور پر روس کی وابستگی پر نازاں تھے جو عالمی بساط (ورلڈ پولیٹکس) میں روسی بلاک کے زیر اثر ہی نہیں وابستہ اور پیوستہ قرار دیئے جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ غیر جانبدار تحریک کے ارکان کی تعداد بڑھتی چلی گئی اور اس میں وسعت آنے کے ساتھ 145 ممالک جو اس کے باقاعدہ رکن بنے ان میں سے بڑی تعداد ایسے ممالک کی تھی جن کا واضح جھکاؤ امریکہ کی طرف تھا البتہ غیر جانبدار تحریک کا بڑا مقصد سرد جنگ کے عالمی ماحول اور دھڑے بندی (پاور بیک) کے ارکان میں ہر دو دھڑوں سے گریز کے علاوہ اولاً اقوام متحدہ کے چارٹر کی پاسداری اور ثانیاً بنیادی انسانی حقوق کی علمبرداری کے نام پر امن عالم کے لئے کوشاں ہونے کے بظاہر حسین پیکر کا دوسرا نام غیر جانبدار تحریک کہلایا مگر انجام کار یہ کہ ایک عالمی دھڑے یعنی روس کی داخلی شکست و ریخت کے بعد جیسے اپنا آپ ہی کھو بیٹھی جس کے نتیجے میں یہ عالمی تحریک اپنے منطقی انجام اور معنوی مقام تک آ پہنچی ہے۔ یوگوسلاویہ کے خود اپنے حصے بخرے ہو گئے ہیں کہ جس پر روسی اثرات اور نوازشات کا براہ راست اثر تھا اور چھاپ بھی۔ بھارت نے حسب روایت اب امریکہ سے دفاعی دوستی Strategic Partnership شروع کی ہے۔ سرد جنگ کا خاتمہ کیا ہوا کہ خود غیر جانبدار تحریک بھی اپنی موت آپ مرنے لگی۔ (ایضاً 22 تا 23 ڈاکٹر محمد جہانگیر تیمی)

پاکستان کی خارجہ پالیسی کا تعین اس کے عدم استحکام اور عدم تحفظ کے پیش نظر کیا جاتا رہا ہے۔ پاکستان کو اپنے وجود میں آنے کے فوراً بعد ہی بھارت کے ساتھ ایک محدود نوعیت کی جنگ لڑنا پڑی جس سے پاکستان کو اندازہ ہو گیا کہ اسے اپنا دفاع اور اپنی معاشی حالت مضبوط بنانی چاہئے۔ پاکستان ایسے زمانے میں وجود میں آیا تھا جب دنیا دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

پاکستان کی خارجہ پالیسی سازوں کے پیش نظر اس وقت دو اہم مقاصد تھے۔ پہلا مقصد تو یہی تھا کہ پاکستان کی جغرافیائی حدود کا تحفظ کیا جائے اور دوسرا مقصد تھا کہ بین الاقوامی برادری میں پاکستان کا مناسب مقام بنایا جائے۔ جب پاکستان وجود میں آیا تو یہ دنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک ہونے کے ساتھ ساتھ آبادی کے لحاظ سے بھی دنیا کا پانچواں بڑا ملک تھا۔ مشرقی پاکستان کے علیحدہ ہو جانے کے بعد یہ عظیم ترین اسلامی ملک تو نہیں رہا پھر بھی دنیا کے زیادہ آبادی والے

Marfat.com

ممالک میں سے ایک ملک اب بھی ہے۔ 1971ء کا حادثہ اس کی سیاسی اور جغرافیائی اہمیت میں کوئی کمی نہیں کر سکا کیونکہ یہ ملک ایک ایسے علاقے میں واقع ہے جو متعدد جنگوں اور بیرونی حملہ آوروں کی آماجگاہ رہا ہے۔ پاکستان کو خلیج کے گرم پانیوں تک رسائی حاصل ہے اور یہ ملک ایک معتدل رویہ رکھنے والی مسلم مملکت کے طور پر شہرت رکھتا ہے۔ پاکستان کی تاریخ کے ڈرامائی واقعات نے اس کی خارجہ پالیسی پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں اور اسے ہمیشہ سے فوجی معاہدے اور اقتصادی تعاون کے اشتراک پر مجبور کیے رکھا ہے۔

پاکستان کی خارجہ پالیسی کا سب سے اہم مقصد اپنی سالمیت اور دفاع کا تحفظ رہا ہے اور خارجہ پالیسی کی ترجیحات میں بھارتی جارحانہ طرزِ عمل کے خلاف مدافعت کو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی کا آغاز و اختتام پاکستان کی سرحدات کا تحفظ رہا ہے خصوصاً وہ سرحدیں جو بھارت سے ملتی ہیں اور پاکستان کی خارجہ پالیسی بنیادی طور پر دفاعی نوعیت کی رہی ہے اس لئے اس سے مشکل ہی سے ایک پرسکون راہ کی توقع ہو سکتی تھی چنانچہ پاکستان کی خارجہ پالیسی سیدھی کی بجائے زگ زیگ طریقے سے چلتی رہی ہے۔ بھارت کے خلاف اپنے دفاع کو موثر بنانے کے لئے پاکستان کو امریکہ کی طرف جھکنا پڑا۔ اس سے دفاعی ہتھیار اور طیارے حاصل کئے بلکہ پاکستان سیٹو اور سینٹو جیسے دفاعی معاہدوں کا رکن بن گیا۔

کچھ وقت بعد مغرب کی فوجی سٹرٹیجی میں تبدیلی سے معاہدوں کی اہمیت ختم ہو گئی۔ دوستوں نے جب نظر انداز کر دیا تو پاکستان بھی آہستہ آہستہ ان معاہدوں سے لاتعلق ہو گیا۔ امریکہ بھارت کی جسامت کو نظر انداز نہیں کر سکتا جس کی ضرورت اس لئے تھی کہ وہ چین کو گھیرے میں رکھنا چاہتا تھا۔ امریکہ کی اس پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب 1965ء میں بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا تو پاکستان نے امریکہ کے ساتھ 59ء میں جو معاہدہ کیا تھا وہ کسی کام نہ آیا۔ بعد میں امریکہ نے روس کے ساتھ پرامن بقائے باہمی کی راہ اختیار کر لی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سنٹو ممالک کی اہمیت ختم ہو گئی اور بھارت کی اہمیت بڑھ گئی کیونکہ وہ چین کا حریف تھا۔ اس وقت سے جب مغرب کو روس کے چیلنج کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ واشنگٹن ہر قیمت پر بھارت کو روس کی گود میں گرنے سے روکنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پاکستان کے لئے مغرب کی امداد میں بہت کمی ہو گئی کیونکہ امریکہ دہلی کو ناراض کرنے پر آمادہ نہیں لہٰذا پاکستان کو ایک ایسے بھارت کا سامنا رہا جو سوویت یونین سے منسلک ہے اور اسے مغرب کی بھی حمایت و امداد حاصل ہے۔ اس پس منظر میں پاکستان کو چین کی دوستی یا اسلامی اتحاد کی شکل میں جو امداد حاصل رہی وہ اس کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں جو بھارت کو روس اور مغرب کی طرف سے مل رہی ہے۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی میں یہ دھما کہ خیز ہمتیں بھارت سے کشیدہ تعلقات ہی کے باعث ہیں۔

کسی ملک کی خارجہ پالیسی اس کے ضمیر کی عکاس اور عزائم کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ قومیں واضح اور مستحکم اصولوں کے سہارے اقوام عالم میں عزت اور وقعت پاتی ہیں معاملہ بندی اور مرنجان مرنجی سے نہیں خارجہ پالیسی کا انحصار ملکی وسعت، جغرافیائی محلِ وقوع اور اقتصادی ترقی پر بھی ہوتا ہے۔ خارجہ پالیسی کے اہم مقاصد میں ملکی سرحدوں کا تحفظ، علاقائی امن، اقتصادی بہبود اور دوسرے ملکوں کے ساتھ ایسے روابط کا قیام شامل ہوتا ہے جو مصلحتوں کے تابع نہ ہوں بلکہ اصولوں کے پابند ہوں۔ خارجہ پالیسی جذبات سے طے نہیں ہوتی بلکہ یہ ان مسائل سے تعلق رکھتی ہے جو کسی قوم کی ضروریات، اس کی مصلحتوں اور ان حقیقتوں سے حل ہوتے ہیں جو انہیں درپیش ہوتے ہیں۔ خارجہ پالیسی کے مقاصد کے

Marfat.com

حصول کیلئے گردونواح میں ابھرنے والی حقیقتوں کو بھی پیش نظر رکھا جاتا ہے اور ان کے تناظر میں اسے ٹھوس بنیادوں پر استوار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ خارجہ پالیسی کے اہم مقاصد میں قوم کی ذہنی صلاحیتوں کو بیدار کر کے ملک میں ایک پُر اعتماد اور صحت مند فضا تیار کرنا بھی شامل ہے۔ کسی ایک طرف بہت زیادہ جھکاؤ کی پالیسی اختیار کرنے سے مقاصد کا حصول نہ صرف مشکل ہو جاتا ہے بلکہ اقوام عالم میں متعلقہ ملک کی عظمت اور وقار بھی مٹی میں مل جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ متعلقہ ملک وہ کچھ حاصل نہیں کرسکتا جو وہ آزاد اور باوقار خارجہ پالیسی کو بنیادی اصول بنا کر حاصل کرتا ہے۔

خارجہ پالیسی میں دوطرفہ تعلقات کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے بشرطیکہ دونوں طرف خلوص پایا جاتا ہو۔ یوں تو ملک کی ترقی، سلامتی اور دفاع میں خارجہ تعلقات کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے تاہم ہر ملک ملکی سالمیت کو ہی سب سے زیادہ ترجیح دیتا ہے اور پاکستان نے بھی اس بین الاقوامی اصول کو ہی اپنایا ہے۔ دیگر ممالک کی طرح پاکستان کی خارجہ پالیسی کا بنیادی عنصر بھی سالمیت اور یکجہتی ہے لیکن حصول آزادی سے لے کر آج تک پاکستان کے دو ہمسایہ ممالک نے اسے مختلف اوقات میں مختلف مسائل میں الجھائے رکھا یہی وجہ ہے کہ جب وزیراعظم پاکستان نوابزادہ لیاقت علی خان 1950ء میں امریکہ کے دورے پر گئے تو انہوں نے 4 مئی کو پاکستان کی سالمیت کو اہمیت دیتے ہوئے امریکی نیشنل پریس کلب میں یہ فرمایا تھا۔

''ہمارے اہم مقاصد میں سب سے پہلے پاکستان کی سالمیت ہے۔ ہمارا ملک بڑی جدوجہد اور کاوشوں کے بعد معرض وجود میں آیا ہے اس کے حصول کیلئے مسلمانوں کو ایسی قوتوں سے دوچار ہونا پڑا جن کیلئے پاکستان کا تصور بے معنی اور ضرر رساں تھا لیکن ہمارے لئے یہ سوال زندگی اور موت کا تھا۔ اس تکلیف، کوششوں اور جدوجہد کے بعد پاکستانی کسی حالت میں بھی پاکستان کی حدود میں کسی قسم کی مداخلت یا پاکستان کی حدود کو کہیں سے بھی کم کرنے کی کوشش کو برداشت نہیں کریں گے''۔ (پریس کانفرنس امریکی نیشنل پریس کلب۔ واشنگٹن۔ 4 مئی 1950)

پاکستان کے پہلے وزیراعظم کا یہ بیان کس قدر حقیقت پر مبنی تھا اس کا اندازہ پاکستان کے عوام نے اپنے ان دو ہمسایہ ممالک کے رویے سے ہی بخوبی لگا لیا ہوگا جن کی وجہ سے آج پاکستان وہ مقام حاصل نہیں کر پایا جو اسے حاصل کرنا چاہئے تھا۔ تاہم پاکستان نے اپنے قیام سے ہی اپنی سالمیت کو برقرار رکھنے اور ان دو ہمسایہ ممالک کی ریشہ دوانیوں اور ان کے عزائم کو ناکام بنانے کے لئے اپنی دفاعی صلاحیتوں کو جدید تقاضوں اور نئی جنگی عملیوں سے ہم آہنگ کرنے کی خاطر تگ و دو جاری رکھی حالانکہ پاکستان کا ہدف ابتدا ہی سے نہ تو توسیع پسندانہ تھا اور نہ ہی جارحانہ اسے تو ہر لحظہ اپنی سالمیت درکار تھی لہٰذا اسے اپنی سالمیت کو برقرار رکھنے کے لئے ہر سال اپنے دفاعی بجٹ میں اس کے باوجود اضافہ کرنا پڑا کہ اسے تو اپنے ملک کے عوام کی غربت، جہالت، افلاس کو دور کرنا تھا۔ ظاہر ہے کہ پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک کو جس کے ذرائع انتہائی محدود ہوں اور جسے دشمنوں نے اپنے عزائم کی تکمیل کے لئے نشانہ بنا رکھا ہے یہ ناممکن ہے کہ وہ دشمنوں کے وسائل کی مناسبت سے فوج اور جنگی ساز و سامان حاصل کرتا رہے لیکن اپنی سالمیت کو برقرار رکھنے کے لئے اسے سب کچھ کرنا پڑا یہی وجہ ہے کہ پاکستانی عوام نے بھی اس مقصد کے حصول کے لئے کسی آڑے وقت میں انتہائی قربانی سے بھی دریغ نہ کیا۔ جس روز پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو ایک طرف افغانستان نے نسلی اور لسانی بنیادوں پر پاکستانی علاقے پر دعویٰ کر دیا تو دوسری طرف بھارت نے پاکستان کو کشمیر اور نہری پانی اثاثوں کی تقسیم اور مالی مشکلات جیسے مسائل میں الجھا دیا۔ ان حالات میں

Marfat.com

پاکستان کو ایک طرف 1800 کلو میٹر طویل سرحد کی اور دوسری طرف 2250 کلو میٹر لمبی سرحد کی نگرانی کرنا پڑی جبکہ اس کے وسائل انتہائی محدود تھے تاہم اسے ملکی سرحدوں کی دوسرے ممالک کی نسبت کہیں زیادہ حفاظت کرنا پڑی اور اپنی آزادی اور یکجہتی کی حفاظت کے مسائل سے کہیں زیادہ نمٹنا پڑا نیز اپنے عوام کو غیر یقینی اور مایوسی کی ملی جلی صورتحال سے نکالنے کے لئے ہر سال اپنے بجٹ میں اضافہ کرنا پڑا اور اب تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ دفاع کے لئے ہر سال اربوں روپے مختص کئے جا رہے ہیں حالانکہ پاکستان جدید ترین اور مہنگے سے مہنگا اسلحہ خریدنے کا کسی صورت میں بھی متحمل نہیں ہو سکتا اور فی الوقت بھی یہ اس کی حیثیت اور اہلیت سے کہیں زیادہ ہے اس ضمن میں پاکستانی عوام کو بھی ہر آڑے وقت پر قربانیاں دینا پڑیں پاکستان کو سیٹو اور سینٹو جیسے معاہدوں میں شریک ہونا پڑا جو اس کے لئے نقصان دہ ثابت ہوئے۔

پاکستان کو سب سے زیادہ خطرہ بھارت سے ہے جو اس وقت خطے کا پولیس مین بننے پر تلا ہے۔ پاکستان نے متعدد بار بھارت کو ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنے کے لئے تجاویز پیش کیں لیکن اس نے کسی تجویز پر بھی عمل نہ کیا۔ اس نے ایٹمی دھماکہ (1974ء) کیا اور اس وقت سے اس نے پاکستان کی سلامتی کو خطرے میں ڈال رکھا تھا۔ پاکستان نے جب اپنی سالمیت کے تحفظ کے لئے کسی ملک سے اسلحہ یا جنگی طیارے خریدنے کی بات کی۔ بھارت دوسرے خطرات کی بات شروع کر دیتا ہے تاکہ پاکستان جدید قسم کے جنگی ہتھیار وغیرہ خریدنے کی بجائے بات چیت میں ہی الجھا رہے۔ پاکستان نے جب بھی امریکی ہتھیاروں کی بات کی تو بھارت نے دنیا بھر میں پروپیگنڈا کرنا شروع کر دیا کہ یہ ہتھیار اس کے خلاف استعمال ہوں گے اور اس طرح وہ فرانس روس اور امریکہ اور دیگر ممالک سے اسلحہ حاصل کرنے میں ہمیشہ کامیاب رہا۔ بھارت چونکہ ہمیشہ سے ہی نہ صرف جنوبی ایشیا بلکہ بحر ہند کی بڑی طاقت بننے کا خواب دیکھتا رہا ہے اس کے صنعت کار اور ساہوکار بھی ہمیشہ نئی منڈیوں کی تلاش میں رہے ہیں اور اپنی ملکی منڈی کی بجائے ان کی نظر پاکستان پر رہی غرض کہ بھارت پاکستان کے قیام سے لے کر اب تک ہر لمحہ پر اس کے خلاف سازشوں کا جال بچھاتا رہا ہے اور اس نے پاکستان کو معاشی طور پر تباہ کرنے کیلئے کوئی لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔

پاکستان کی خارجہ پالیسی کے حوالے سے صدر جنرل ایوب خان نے ''فرینڈز ناٹ ماسٹرز'' میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے انہیں پڑھنے سے اندازہ ہوگا کہ بھارت کی بدنیتی اور پاکستان دشمنی نے ہمارے ارباب اختیار کو شروع دن ہی سے خارجہ پالیسی میں کچھ ترجیحات کے تعین پر مجبور کئے رکھا۔

صدر ایوب لکھتے ہیں:

''آزادی مفت ہاتھ نہیں آتی اس کے لئے لڑنا پڑتا ہے۔ کوئی کسی کے لئے نہیں لڑتا ہر ایک کو اپنی لڑائی خود لڑنی پڑتی ہے۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی میں گہری اخلاقی اقدار مضمر ہیں۔ اس کی بنیاد میں یہ شعور کارفرما ہے کہ سب قومیں آپس میں برابر ہیں اور ہر قوم کو حق حاصل ہے کہ اس کی حکومت اپنے ہاتھ میں ہو اور اس کے اپنے نصب العین کے مطابق ہو۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی کے بڑے بڑے مقاصد سلامتی اور ترقی ہیں۔ سلامتی کے مفہوم میں ملک کا دفاع اور نصب العین کی بقا دونوں شامل ہیں۔ دفاع کی ضروریات کو اس حقیقت نے پیچیدہ بنا دیا ہے کہ ہم دو حصوں میں بٹے ہوئے ہیں جن کو ایک ہزار میل سے زیادہ لمبے علاقے نے جدا کر رکھا ہے اور یہ علاقہ غیر ہے چنانچہ ہر ایک حصے کی حفاظت مجموعی دفاع کے نقشے

Marfat.com

کے مطابق کرنی لازم ہے۔ اس جغرافیائی علیحدگی نے اس امر کی اور بھی زیادہ ضرورت پیدا کر دی ہے کہ ان دونوں حصوں کے لوگ آپس میں مل کر ایک ہو جائیں۔ بالکل ایک اور ناقابل تفریق جب تک مکمل اتحاد نہ ہوگا ملکی کی سلامتی کو خطرہ درپیش رہے گا اور چونکہ ہم مختلف نظریوں کی دنیا میں رہتے ہیں اس لئے ہمیں اپنے نصب العین کو جو ہماری قومی زندگی کی بنیاد ہے پائندہ رکھنے کے لئے جدوجہد کرنی ہوگی ترقی کا مسئلہ اس لئے ضروری ہے کہ اس کے بغیر بقا ممکن نہیں بقا بجائے خود کچھ معنی نہیں رکھتی اس کا کچھ نہ کچھ مقصد ہونا چاہئے۔ ہمارا مقصد اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ ہمارے عوام اپنے عقیدے کی سلامتی میں خوشی کی زندگی گزاریں اور ترقی کریں مگر یہ مقاصد امن کی فضا ہی میں پروان چڑھ سکتے ہیں چنانچہ عالمی امن خصوصاً اس خطے کے امن و امان کے ساتھ ہمارا گہرا مفاد وابستہ ہے۔

ہمارے پاس اپنے مقصد کے حصول کے لئے نہ تو لامحدود وسائل ہیں اور نہ لامحدود وقت۔ ہمیں تو جو وقت اور جو وسائل بھی میسر ہیں انہیں کو احتیاط اور خوش تدبیری سے کام میں لانا ہوگا کہ فائدے زیادہ سے زیادہ حاصل ہوں اور نقصان کم سے کم۔ ہمیں قومی انداز فکر پیدا کرنا اور قومی حکمت عملی مرتب کرنا ہوگا۔ آج کل ''آزاد'' خارجہ پالیسی کی بڑی رٹ لگائی جا رہی ہے۔ ''آزاد'' سے مراد ہے اپنے سوا باقی ہر ایک پر نکتہ چینی کرنے اور اسے برا بھلا کہنے کی آزادی لیکن ہم محض اس دکھاوے کے لئے کہ ہماری خارجہ پالیسی ''آزاد'' ہے دوسروں پر ناحق نکتہ چینیاں کرنا نہیں چاہتے۔ ہماری خارجہ پالیسی کو قومی پالیسی ہونا چاہئے جس میں ہمارے اپنے فائدوں پر نظر رکھی جائے اور ان کے مطابق قدم اٹھایا جائے۔ ہمیں ظاہر داری اور اداکاری کی ضرورت نہیں سکون اور سنجیدگی سے کام لینا ہے۔

دنیا آج مساوات کے لئے لڑ رہی ہے افراد کے درمیان مساوات، اقوام کے درمیان مساوات خواہ وہ بڑی ہوں یا چھوٹی۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ تمام دنیا صاف صاف اس بات کو تسلیم کر لے کہ ہر قوم مساویانہ حقوق اور مواقع کی مستحق ہے۔ دنیا کے ملکوں کی آزادی اور خود مختاری کی ان کے رقبے یا وسائل کی بنیاد پر درجہ بندی نہیں کی جا سکتی یہ بڑی صاف سی بات ہے اور کوئی بھی اس سے انکار کی جرات نہ کرے گا لیکن اس اصول کو دنیا میں نافذ کرانے کے کوئی ذرائع نہیں ہیں۔ یہ دنیا بڑوں ہی بڑوں کی دنیا ہے خواہ دو بڑے ہوں یا تین بڑے یا چار یا اور بھی زیادہ۔ یہی دنیا کی تقدیر کا فیصلہ کرتے اور اس کی راہیں متعین کرتے ہیں چھوٹے چھوٹے ملک خصوصاً وہ جو ابھی صنعتی ترقی کی ابتدائی منزلیں طے کر رہے ہیں ان کا وجود ادنیٰ درجے سے تعلق رکھتا ہے۔ انہوں نے غلامی کا جوا تو اتار پھینکا ہے لیکن ابھی ان میں سے اکثر اپنی فضا کو پرانے سامراجی اثرات سے پاک صاف کر کے اپنے انفرادی وجود اور تصورات کو ابھار نہیں سکے۔ ہمیں بھی اپنی انفرادیت کو تسلیم کرانا اور ایک مساوی اور باوقار حیثیت حاصل کرنے کے لئے لڑنا ہے۔

تاریخ نے ہمیں بڑی بڑی حکومتوں کے متضاد مفادات کی راہ میں لا کھڑا کیا ہے۔ ہمارے محل وقوع کی وجہ سے ہمیں جنوب مشرقی ایشیا میں نیز اور مشرق وسطیٰ میں بھی بڑی جنگی اہمیت حاصل ہے۔ لیکن ہماری مشکل یہ ہے کہ ہندوستان ہمارے وجود کو ایک آزاد اور خود مختار مملکت کی حیثیت سے تسلیم کرنے پر خود کو آمادہ نہیں کر سکا، جس کی وجہ سے کئی مسئلے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ ہندوستان کے اس رویے کو سوائے مریضانہ ذہنیت کے اور کسی طرح تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستانی لیڈر مسلمانوں سے گہری نفرت رکھتے ہیں اور چونکہ انہیں اپنے اس جذبے سے ہمیشہ انکار کرنا پڑتا ہے اس لئے وہ ایک

Marfat.com

مسلسل ذہنی کشمکش کا شکار رہتے ہیں۔ ہندوستان نے شروع ہی سے ہماری راہ میں مشکلیں پیدا کرنے کی ٹھان رکھی تھی ہندوستان نے ہمارے لئے پناہ گیروں کی بحالی کا زبردست مسئلہ اسی لئے پیدا کیا تھا کہ ہماری معیشت مفلوج ہو کر رہ جائے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ہمیں وہ ساز وسامان دینے سے بھی انکار کر دیا جس میں ملک کی تقسیم سے پہلے ہمارا حصہ تھا۔ اس نے ہمیں ان دریاؤں کے بہاؤ کا رخ بدل دینے اور ان کا پانی روک دینے کی دھمکی دی جو ہمارے ملک میں بہتے ہیں۔ پھر اس نے تمام معاہدوں اور اصولوں کے خلاف جموں اور کشمیر کی ریاست کے ایک بڑے حصے پر بزور قبضہ کر لیا اور اپنی فوجیں وہاں جمع کر کے ہمارے ملک کی سلامتی کے لئے ایک مستقل خطرہ پیدا کر دیا۔ ان سب باتوں کی تہ میں ہندوستان کی یہ ہوس کارفرما تھی کہ وہ یا تو پاکستان کو اپنے میں جذب کر لے یا اسے اپنا حاشیہ نشین بنا لے۔ ہندوستانی لیڈروں نے اپنے ارادوں کو ڈھکا چھپا نہیں رکھا تھا۔ آچاریہ کرپلانی نے جو 1947ء میں انڈین نیشنل کانگرس کے صدر تھے بالا علان کہا کہ "نہ تو کانگرس اور نہ قوم اکھنڈ ہندوستان کے دعوے سے دستبردار ہوئی ہے"۔ اس زمانے میں سردار ولبھ بھائی پٹیل نے جو پہلے انڈین ہوم منسٹر تھے اور کانگرس پارٹی کے "مرد آہن" کہلاتے تھے، یہ کہا تھا: "بہت دیر نہ گزرے گی کہ ہم دوبارہ ایک ہو کر اپنے ملک کی اطاعت گزاری میں باہم شریک ہو جائیں گے"۔ آزادی کے روز ہی سے پاکستان اپنے وجود اور اپنی سلامتی کو قائم رکھنے کی تلخ اور طویل جدوجہد میں مصروف ہو گیا تھا۔ سن 1954ء میں پاکستان کو اپنی سلامتی کی خاطر مجبوراً مغربی طاقتوں سے ناتا جوڑنا پڑا۔ وہ معاہدۂ بغداد اور جنوب مشرقی ایشیا کے دفاعی معاہدے سیٹو کا ممبر بن گیا۔ یہ دونوں معاہدے اشتراکی دنیا میں شک وشبہ کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔

سن 1954ء میں جب میں نے پریذیڈنٹ کی حیثیت سے ملک کے معاملات اپنے ہاتھ میں لئے، تو مغربی طاقتوں سے پاکستان کا سیاسی اتحاد مکمل ہو چکا تھا۔ پاکستان افواج کے کمانڈر انچیف کی حیثیت میں معاہدہ بغداد سے جو عراق کے انقلاب کے بعد سینٹو کے نام سے یاد کیا جانے لگا میرا بھی تعلق رہا تھا لیکن میری دلچسپی محض اپنے ملک کے دفاع کی حد تک تھی۔ میں اس انتظام سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر پاکستان کی دفاعی افواج کی تعمیر کرنا چاہتا تھا سیٹو سے براہ راست میرا کبھی واسطہ نہ رہا۔ درحقیقت پاکستانی افواج کو اس معاہدے کی خبر اس وقت دی گئی تھی جب پاکستان نے اس ادارے کا ممبر بنا منظور کر لیا تھا۔ میں اس کا ذکر آگے چل کر کروں گا کہ یہ معاہدات کیوں کر وجود میں آئے۔

اکتوبر 1954ء میں انقلاب کے وقت میں نے ملک کو کس احوال میں پایا، میں یہاں اس کا ٹھیک نقشہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ہندوستان نے سوویٹ یونین اور ساتھ ہی ساتھ بعض مغربی طاقتوں سے اسلحہ حاصل کر کے اپنی فوجی طاقت بے اندازہ بڑھالی تھی۔ اس نے جموں اور کشمیر کے مقبوضہ علاقے میں خوف اور دہشت کی حکومت قائم کر کے اپنے قبضے کو بہت مضبوط بنا لیا تھا۔ بیشتر کشمیری لیڈر جیل خانوں میں پڑے سڑ رہے تھے، اور تمام شہری آزادیاں سلب کر لی گئی تھیں اقوام متحدہ کو اپنی قراردادوں پر عملدرآمد کرانے سے کوئی دلچسپی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ یہ قراردادیں جموں اور کشمیر کے لوگوں کو اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرنے کا آزادانہ اور منصفانہ موقع دلانے کے بارے میں تھیں، اور ہندوستان اور پاکستان دونوں نے ان پر عمل کرنے کا اقرار کیا تھا۔ (فرینڈز ناٹ ماسٹرز 188 تا 192)

Marfat.com

قیام پاکستان کے بعد اہم مذاکرات کا پہلا دور
1947ء تا 1960ء

قیام پاکستان سے پہلے ہی کانگرس کی مہا سبھائی لیڈر شپ نے تخریب پاکستان مہم کا آغاز کر دیا تھا جس کی تفصیلات گزشتہ صفحات میں آ چکی ہیں۔ یہ تاریخ کی ستم ظریفی تھی یا پھر ہندو کی روایتی مکاری کہ کانگرس کی پاکستان دشمن لیڈر شپ کی طرف سے ہونے والی سازشیوں کے برعکس قائداعظم نے کبھی منفی سوچ کا مظاہرہ نہیں کیا اور ہمیشہ تصویر کے مثبت رخ پر ہی نظر رکھی۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد بھارت میں رہ جانے والے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا بلکہ مسلمان تو ایک طرف سکھوں کو جو ہندو کے آلہ کار بن کر مسلمانوں کے خلاف صف آراء ہو چکے تھے اور خصوصاً مشرقی پنجاب میں جنھوں نے مسلمانوں کے خون سے جی بھر کے ہولی کھیلی ان کا اسباب لوٹا، عزتیں نیلام ہوئیں اور بیس ہزار مسلمانوں عورتوں کو زبردستی سکھ بنا کر ان سے شادیاں رچائیں۔ اپنی وفادار قوم کو بھی قیام پاکستان کے فوراً بعد دوسرے درجے کی جرائم پیشہ قوم بنا کر رکھ دیا۔ سکھوں کے پہلے آئی سی ایس سردار کپور سنگھ اپنی مشہور زمانہ کتاب ''ساچی ساکھی'' میں سکھوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا رونا روتے ہوئے اس سرکاری حکم کی نقل شامل کرتے ہیں جس میں یہ حکامات جاری ہوئے۔ اکالی دل کو قیام بھارت کے بعد کانگرس کی طرف سے جو پہلا انعام موصول ہوا اس کا حال بیان کرتے ہوئے سردار کپور سنگھ لکھتے ہیں:

''ڈپٹی پرائم منسٹر اور وزیر داخلہ سردار پٹیل اور پرائم منسٹر شری نہرو کی اجازت اور مرضی سے پنجاب کے گورنر چندو لال ترویدی نے مشرقی پنجاب کے تمام ڈپٹی کمشنروں کو پنجاب کے وزیر داخلہ سردار سورن سنگھ کی مرضی سے بڑی چال بازی سے کام لے کر یہ ہدایت جاری کروائیں کہ مغربی پنجاب سے اجڑ کر آنے والے اور مشرقی پنجاب میں رہنے والے سکھوں کو جرائم پیشہ قوم تسلیم کیا جائے اور ان پر سختی کی جائے، ضرورت پڑنے پر گولی بھی چلائی جائے، ان کی مارکٹائی کی جائے سرکاری سطح پر بغیر قانون اور انصاف کو مدنظر رکھے ایسی سختی کی جائے کہ سکھوں کو ہوش آ جائے کہ راجہ کون ہے اور رعایا کون؟ اُن دنوں پنجاب میں صرف دو ڈپٹی کمشنر تھے، ایک کانگڑہ میں اور دوسرا گڑگاؤں میں، اور کسی نے تو کیا حیل وحجت کرنی تھی میں نے ایک سخت ''روس پتر'' (غصے بھرا خط) ترویدی کو لکھا اور اُسے احساس دلایا کہ سکھوں کو 'لٹیرے اور غیروں کی بہو بیٹیوں پر ہاتھ ڈالنے والے' کہنے والوں کی اپنی قوم کا کیا حال ہے''۔ (ساچی ساکھی گورمکھی زبان دوسرا ایڈیشن 72 اور ضمیمہ)

جب سردار کپور سنگھ کے اس رویے کی اطلاع پنڈت نہرو کو ہوئی تو وہ سیخ پا ہوئے اور انہوں نے ایک چٹھی گورنر پنجاب اور چیف منتری پنجاب گوپی چند بھارگو کو لکھی، جس میں لکھا:۔

Marfat.com

Why is not something being done about this man (ساچی ساکھی)

سردار صاحب کہتے ہیں ''میں نے یہ چٹھیاں اپنے خلاف کی گئی محکمانہ پڑتال میں شہادت کے طور پر طلب کی تھیں۔مگر میری درخواست نامناسب طور پر اور قانون کی مرضی کے خلاف ٹھکرادی گئی۔ یہ کہہ کر کہ ''یہ غیر ضروری ہے''۔
(ساچی ساکھی ایڈیشن دوم صفحہ 6)

اکالی لیڈر سردار حکم سنگھ کا بیان ہے:

''دہلی سے آواز اُٹھی، سکھ ڈاکو ہیں، چور اور شرابی ہیں۔اس کی گونج پنجاب سرکار نے سُنی اور ایک پالیسی لیٹر 10 اکتوبر 1947ء کو جاری کیا گیا اور تمام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو تاکید کی گئی کہ سکھ جرائم پیشہ قوم ہیں۔یہ امن پسند ہندوؤں کو دکھ دیں گے۔ان کو سختی اور مضبوطی سے دبایا جائے''۔(پردھانگی ایڈریس اکالی کانفرنس 1951ء)

سردار کپور سنگھ کہتے ہیں:

''بطور اکالی ممبر پارلیمنٹ سردار حکم سنگھ نے اس بہیمانہ سلوک کے خلاف لوک سبھا میں Call Attention نوٹس دیا تھا۔مگر انہی دنوں سردار حکم سنگھ کا ستارہ چمکا اور وہ ڈپٹی سپیکر بنا دیئے گئے۔اس لئے نوٹس درمیان میں لٹکتا رہ گیا۔(ساچی ساکھی صفحہ 5)

جب اپنے بازوئے شمشیر زن کے ساتھ ہندو یہ سلوک کر رہے تھے تو مسلمانوں اور پاکستان کے ساتھ ان کا سلوک کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔اس کے برعکس قائداعظمؒ کا طرز عمل ملاحظہ فرمایئے۔11 اگست 1947ء کو پاکستان کی مجلس دستور ساز سے خطاب کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں:

''آپ سب کو بلا امتیاز رنگ ونسل اور مذہب کے اس جذبہ کے ساتھ کام کرنا چاہئے کہ آپ اوّل الذکر اس مملکت کے شہری ہیں اور آپ سب کو مساوی حقوق اور مراعات حاصل ہیں''۔

''گلوب'' رائٹرز کے نمائندے کو 25 اکتوبر 1942ء کو انٹرویو دیتے ہوئے آپ کہتے ہیں:

''میں بار بار کہہ چکا ہوں اور اب پھر کہتا ہوں کہ ہندوستان کی تقسیم باضابطہ معاہدے کی رُو سے ہوئی ہے اس لئے ہمیں ماضی کی تلخیوں کو بھلا کر آپس میں عہد کرنا چاہئے کہ ہم دوستوں کی طرح مل جل کر رہیں گے کتنی ہی ایسی چیزیں ہیں جو ہم پڑوسی کی حیثیت میں ایک دوسرے سے ضرورت پڑنے پر مانگ سکتے ہیں مادی طور پر بھی اور سیاسی طور پر بھی یوں اقوام عالم میں دونوں مملکتوں کا مرتبہ اور وقار بڑھا سکتے ہیں''۔

بھارت ومغربی پاکستان کے لاکھوں انسانوں کو فسادات کی وجہ سے ہجرت کرنا پڑی بے پناہ بغض وعناد اور ظلم و تشدد کا مظاہرہ کیا گیا اور قتل وغارت گری کا بازار گرم ہوا۔یہ ہولناک واقعات پاکستان اور بھارت کے درمیان ایک خلیج پیدا کرتے چلے گئے۔پاکستان ابھی مہاجرین کی آبادکاری کے مسئلے میں الجھا ہوا تھا کہ دیگر کئی مسائل کھڑے کر دیئے گئے۔ بھارتی گورنر جنرل لارڈ مونٹ بیٹن نے ریڈکلف ایوارڈ کے تحت بھارت سے گٹھ جوڑ کر کے مسلم اکثریت کے علاقوں کو بھارت میں شامل کر دیا۔ریڈکلف ایوارڈ نے 17 اگست 1947ء کو اپنے فیصلے کا اعلان کیا۔دریں اثناء مصالحتی ٹریبونل نے چار ہزار ملین روپے کے اثاثوں میں سے 750 ملین روپے پاکستان کو دینے کا فیصلہ کیا تھا اور صرف دو ملین کی ادائیگی کرنے

Marfat.com

کے بعد کہا کہ بقایا رقم مسئلہ کشمیر کے تصفیہ کے بعد دی جائے گی۔ پاکستان کو فوجی ساز و سامان کی 1760 گاڑیاں ملنی تھیں اور اس میں سے بھی بہت کم سامان پاکستان کو دیا گیا۔

دونوں ملکوں کے درمیان جوں کے توں معاہدے کے باوجود دسمبر 1947ء میں پاکستان جانے والی پٹ سن کی مصنوعات پر کسٹم ڈیوٹی عائد کر دی گئی بھارتی فوجوں نے 1948ء میں جونا گڑھ، مانا وار اور حیدر آباد دکن پر قبضہ کر لیا حالانکہ جونا گڑھ اور مانا وار کی ریاستیں 15 ستمبر 1947ء کو پاکستان کے ساتھ الحاق بھی کر چکی تھیں۔ 27 اکتوبر 1947ء کو بھارتی ہوائی جہازوں کے ذریعے کشمیر میں فوجیں اتار دی گئیں اور آزاد کشمیر کے خلاف باقاعدہ فوجی کارروائی شروع کر کے کشمیر کا مسئلہ پیدا کر دیا گیا۔

قائداعظمؒ کو اطلاع ملی کہ مہاراجہ ہری سنگھ نے بھارت کے ساتھ الحاق کر لیا ہے اور بھارتی افواج کشمیر میں داخل ہو چکی ہیں تو انہوں نے بھارتی طرز عمل پر سخت ردعمل کا اظہار کیا۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ گورنر جنرل پاکستان نے پاکستانی مسلح افواج کے قائم مقام کمانڈر انچیف جنرل ڈگلس ڈی گریسی کو حکم دیا کہ وہ پاکستانی افواج کو کشمیر بھیجنے کا حکم دیں۔ جنرل گریسی نے قائداعظمؒ کے احکامات پر عملدر آمد کے بجائے دونوں ممالک کی افواج کے فیلڈ مارشل سر کلاڈ آکنلیک سے منظوری حاصل کرنے کا بہانہ کیا اور یوں جنرل آکنلیک کو صورتحال سے آگاہ کر دیا۔ جنرل آکنلیک فوراً لاہور پہنچا اور قائداعظم محمد علی جناحؒ کو مجبور کیا کہ وہ اپنا فیصلہ واپس لیں۔ (محمد یوسف صراف Kashmir Fight For Freedom 1105)

جنرل آکنلیک نے یقین دہانی کروائی کہ مسئلہ کشمیر مذاکرات کے ذریعے حل کیا جائے گا۔ یوں قائداعظمؒ نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا اور ماؤنٹ بیٹن اور بھارتی وزیراعظم پنڈت نہرو کو لاہور آنے کی دعوت دی تاکہ مذاکرات کے ذریعے اس مسئلے کو حل کیا جا سکے۔ ماؤنٹ بیٹن اور نہرو نے وعدہ کیا کہ 29 اکتوبر 1948ء کو لاہور پہنچ جائیں گے۔ مگر 29 اکتوبر کو نہرو نے بیماری کی وجہ سے لاہور آنے سے معذرت کر دی اس لئے ماؤنٹ بیٹن کو اکیلے لاہور آنا پڑا۔ دونوں گورنر جنرل کے درمیان یکم نومبر 1948ء کو لاہور میں ساڑھے تین گھنٹے طویل مذاکرات ہوئے مگر مذاکرات کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے کیونکہ بحیثیت گورنر ماؤنٹ بیٹن کے اختیارات محدود تھے قائداعظمؒ نے مسئلہ کے حل کیلئے تین نکاتی فارمولا پیش کیا۔ تین نکات یہ تھے:

1: جنگ بندی

2: بیرونی افواج کی واپسی

3: رائے شماری

ماؤنٹ بیٹن نے قائداعظمؒ کی تجاویز کے بارے میں کہا کہ میں اپنی حکومت کے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہیں اُٹھا سکتا۔ اس موقع پر ماؤنٹ بیٹن نے تجویز پیش کی کہ اقوام متحدہ کی نگرانی میں رائے شماری کروائی جائے مگر قائداعظمؒ نے اس تجویز کو رد کرتے ہوئے کہا کہ دونوں گورنر جنرل اس کام کو بہتر طور پر سرانجام دے سکتے ہیں۔ 2 نومبر کو بھارتی وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے ریڈیو سے خطاب کرتے ہوئے ماؤنٹ بیٹن کی پیشکش کو دہرایا اور کہا کہ ”اقوام متحدہ کی نگرانی میں رائے شماری کروائی جائے“۔

Marfat.com

اس کے بعد تقریباً دس دن تک دونوں ممالک کے وزرائے اعظم کے درمیان بذریعہ ٹیلی گرام مذاکرات ہوتے رہے جن میں دونوں ممالک اپنا اپنا نقطہ نظر ایک دوسرے کو سمجھانے کی کوشش کرتے رہے۔ 16 نومبر کو پاکستانی وزیراعظم لیاقت علی خان نے ایک اخباری بیان جاری کیا جس میں انہوں نے نہرو کی تجویز تسلیم کر لی کہ مسئلہ کشمیر کو اقوام متحدہ میں پیش کیا جائے۔

لیاقت علی خان کے اعلان کا متن یہ تھا:

''اقوام متحدہ کے چارٹر کا بنیادی اصول یہ ہے کہ حق کے حصول کیلئے قوموں کو طاقت کے استعمال سے روکا جائے اور پورے مقدمہ کو بین الاقوامی رائے عامہ کے سامنے پیش کیا جائے۔ ہم اقوام متحدہ سے درخواست کرنے کو تیار ہیں کہ وہ جموں وکشمیر میں اپنے نمائندوں کو نامزد کر کے جلد از جلد رائے شماری کروائے تا کہ ریاست کے مسلم عوام کو ہلاکت سے بچایا جائے۔ ریاست سے غیر ملکی افواج کا انخلاء ممکن ہو اور ایک ایسے انتظامی ڈھانچے کو تشکیل دیا جائے جس کے زیر اثر لوگوں کو آزادانہ رائے شماری میں حصہ لینے کا موقع مل سکے۔ (کشمیر خطرات کی گود میں صفحہ 89 جوزف کاربل)

لیاقت علی خان کی تجویز کے جواب میں پانچ دن کی خاموشی کے بعد 21 نومبر کو نہرو نے ان تجاویز سے اختلاف کرتے ہوئے کہا:

''چونکہ اقوام متحدہ کے پاس ایسی قوت نہیں جو کہ جنگ بندی کو کامیابی سے لاگو کر سکے اور مسلمانوں کے نام نہاد قتل عام کو روک سکے۔ یہ کام صرف ایک مضبوط فوج ہی کے ذریعے ہو سکتا ہے اور ہماری فوج پہلے ہی سے یہ کام کر رہی ہے۔ جنگ بندی بھی اس وقت ہو جائے گی جب حملہ آوروں کو کشمیر کی سرحدوں سے باہر دھکیل دیا جائے گا۔ ہماری گزارش حکومت پاکستان سے اتنی سی ہے کہ وہ حملہ آوروں کو اپنے علاقے میں پناہ نہ دے اور ان کی دستگیری سے باز آ جائے۔

میں نہیں سمجھتا کہ ان حالات میں جن سے کشمیر اس وقت گزر رہا ہے اقوام متحدہ کی مداخلت موثر ثابت ہو سکتی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ کشمیر میں شیخ عبداللہ کی حکومت ایک عوامی حکومت ہے چنانچہ یہ ایک غیر جانبدار حکومت ہے۔ صرف وہی شخص جو کشمیر جائے اور اپنی آنکھوں سے اس حکومت کے اقدامات دیکھے اس حکومت کی غیر جانبداری پر ایمان لا سکتا ہے۔ مزید برآں میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب تک ہماری افواج کشمیر میں موجود ہیں تمام قومیتوں کی سلامتی ان کا مقدس فریضہ ہے اور اس فریضے کی ادائیگی کسی خوف یا جانبداری کے بغیر کی جائے گی''۔

''میں نے بار بار اس بات پر زور دیا ہے کہ جونہی حملہ آوروں کو ریاست سے نکال دیا جائے گا یا وہ خود رضا کارانہ طور پر نکل جائیں گے اور ریاست میں مکمل امن وامان کی فضا پیدا ہو جائے گی۔ عوام کو حق دیا جائے گا کہ وہ رائے شماری یا ریفرنڈم کے ذریعے اپنے مستقبل کا فیصلہ کریں اور یہ حق ان کو اقوام متحدہ کی زیر نگرانی دیا جائے گا۔ یہ بات صاف ظاہر ہے کہ ہم یہ حق عوام کو ایسے وقت میں نہیں دے سکتے جس وقت حملہ آوران کے گھروں میں گھس کر فوجی کارروائیاں کر رہے ہیں۔ میں اپنے اس وعدے پر قائم ہوں''۔

12 دسمبر 1947ء کو نہرو نے ایک اور تار کراچی بھیجا جس میں کہا گیا تھا کہ:

''ہم نے بہت ہی سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ اقوام متحدہ کے مبصروں کو دعوت دی جائے تا کہ وہ اس مسئلے

Marfat.com

پر ہمیں کوئی تجاویز پیش کریں جیسا کہ ہم تیار ہیں کہ اقوام متحدہ کے مبصروں کو دعوت دی جائے اور رائے شماری کے ضمن میں ان سے صلاح لی جائے میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ اور کون سے امور ہیں جن پر ان صلاح ومشورہ کیا جاسکتا ہے۔ تاہم مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میرے ذہن میں اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں آتی۔ یعنی اقوام متحدہ سے درخواست کی جائے کہ وہ غیر جانبدار مبصرین کو رائے شماری کے ضمن میں بھیجے''۔

بھارت کے ان وعدوں کو حکومت پاکستان اچھی طرح سمجھتی تھی اس لئے وزیراعظم لیاقت علی خان نے برطانوی وزیراعظم سی آر ایلیٹ کے نام 24 نومبر کو ٹیلی گرام دیا تھا جس میں لیاقت علی خان نے لکھا:

''بھارتی حکومت اور پنڈت نہرو کشمیر میں رائے شماری کا جو بار بار وعدہ کر رہے ہیں وہ محض دنیا کو دھوکہ دینے کیلئے ہے۔ دراصل بھارت وقت حاصل کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ کشمیر پر اپنا قبضہ مضبوطی کے ساتھ جما سکے''۔

بھارتی حکومت نے مجاہدین کی مسلسل کامیابیوں سے گھبرا کر یکم جنوری 1948ء کو سلامتی کونسل میں مسئلہ کشمیر پیش کیا اور الزام لگایا کہ پاکستان بھارتی علاقے میں مداخلت کر رہا ہے۔ پاکستان نے جوابی مقدمہ پیش کیا اور کہا کہ بھارت نے مسلم ریاست جموں وکشمیر پر زبردستی قبضہ کیا ہے۔ سلامتی کونسل نے 20 جنوری 1948ء کو ایک قرارداد منظور کی اور ایک کمشن اقوام متحدہ کا کمشن برائے ہندو پاکستان UNCIP کے نام سے قائم کیا۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے دیگر ممالک کی رضامندی سے امریکی شہری ایڈمرل نمٹز کو ناظم رائے شماری مقرر کیا۔ اپریل 1948ء کو اقوام متحدہ نے ایک دوسری قرارداد منظور کی اس قرارداد کے دو حصے تھے۔ حصہ ''الف'' ریاست میں امن وامان کی بحالی اور فوجوں کے انخلا سے متعلق ہے جبکہ حصہ ''ب'' رائے شماری سے متعلق ہے۔ اقوام متحدہ کے کمشن نے 13 اگست 1948ء کو فائر بندی عارضی صلح اور رائے شماری کے متعلق ایک تفصیلی قرارداد منظور کی۔ یہ قرارداد تین نکات پر مشتمل تھی۔

اول: دونوں حکومتیں طے شدہ تاریخ پر جنگ بندی کریں۔

دوئم: ریاست سے فوجی انخلاء کیا جائے۔

سوئم: کشمیر کا مستقبل ریاستی عوام کے حق خودارادیت کی بنا پر آزادانہ رائے شماری سے طے کیا جائے۔

پاکستان اور بھارت دونوں ہی نے اس سہ نکاتی فارمولے کو قبول کیا۔ سلامتی کونسل نے 17 دسمبر 1949ء کو میکناٹن Mcnaughton کو خصوصی ایلچی برائے پاک و ہند مقرر کیا۔ میکناٹن نے دونوں ممالک کے ساتھ مذاکرات کے بعد اقوام متحدہ کا منتظم برائے رائے شماری کے طور پر اپنا کام شروع کر دیا اور سلامتی کونسل نے 16 مارچ 1950ء کو میکناٹن کی تجاویز منظور کر لیں اور دونوں ممالک کو ہدایت کی کہ پانچ ماہ کے اندر ان تجاویز پر عمل کریں۔ مگر بھارت نے اپنے روایتی حیلے بہانوں سے ان تجاویز کو مسترد کر دیا۔ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے اور بھارت مکمل ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اب ان قراردادوں سے انکار کر چکا ہے اور مقبوضہ کشمیر میں ہونے والے نام نہاد الیکشنوں کو ہی استصواب رائے کا نام دیکر دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کر رہا ہے۔

▪▪▪

پاکستان اور بھارت کے درمیان تعلقات کا پہلا دور 1947ء سے 1960ء پر محیط ہے اس زمانے میں پاکستان

Marfat.com

اپنے وجود کے ابتدائی تعمیراتی دور سے گزر رہا تھا جبکہ بین الاقوامی سیاسی رجحانات و معاملات آہستہ آہستہ شدید اختلافات کی لپیٹ میں آ رہے تھے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور روس سپر پاورز بنے ہوئے تھے اور دنیا کو سرمایہ دار اور سوشلسٹ بلاکوں میں تقسیم کرنے میں اہم رول ادا کر رہے تھے۔ بین الاقوامی سیاست کا انحصار نظریات پر تھا۔ اس کے برعکس پاکستان نیا نیا وجود میں آیا تھا اور معاشی و عسکری اعتبار سے نہایت کمزور تھا۔ پاکستان کو ورثہ میں نہ تو کوئی ادارے ملے تھے اور نہ ہی کوئی انفراسٹرکچر اس کے حصہ میں آیا ایسی صورتحال میں کشمیر کے مسئلے پر بھارت نے اسے جنگ لڑنے پر بھی مجبور کر دیا تھا۔ جنگ بندی اقوام متحدہ کی مداخلت کے ذریعے وجود میں آئی تھی مگر کشمیر کے مسئلے نے پاکستان کی دفاعی اہمیت کو واضح کر دیا تھا اور پاکستان مجبور ہو گیا کہ وہ اپنے دفاع کو بہتر بنانے کے لئے بیرونی طاقتوں سے رجوع کرے۔ 1954ء میں جو باہمی تعاون کا معاہدہ عمل میں آیا تھا اس نے جلد ہی پاکستان کے سیٹو اور سینٹو کے معاہدوں میں داخلے کی راہ ہموار کر دی۔ یہ تینوں فوجی معاہدے تھے۔ سینٹو میں امریکہ شاید اس لئے شامل نہیں تھا کہ اس معاہدے کے اراکین میں سے ہر ایک کے ساتھ امریکہ کا امدادی پیکٹ موجود تھا۔ ان معاہدوں کی وجہ سے پاکستان کی فوجی قوت میں کچھ اضافہ ہوا تھا۔ بقول مورس جیمس کے تین سال پہلے کی صورتحال کے بالکل برعکس ایوب خان اب چار انفنٹری ڈویژن اور ڈیڑھ آرمڈ ڈویژن کو جدید امریکی اسلحے سے لیس ہونے کی توقع رکھتے تھے کہ جدید طرز کے ٹینک، بندوقیں، ٹرک، جیپ انجینئرنگ اور سگنل ایکوپمنٹ بغیر کسی معاوضے کے فوج کو دیا جانا تھا اس کے ساتھ ساتھ جدید لڑاکا طیارے اور ٹرانسپورٹ طیارے پاکستانی فضائیہ کو دیئے جانے تھے اور جدید جنگی جہاز پاکستانی بحریہ کو ملنا تھے۔ یہ تمام چیزیں صرف ایک بار نہیں ملنا تھیں بلکہ امریکہ کی طرف سے وعدہ کیا گیا تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس جنگی ساز و سامان کو جدید تر بنا کر دیا جائے گا۔ اگر کوئی سامان خراب ہو جائے گا یا پرانا ہو جائے گا تو اس سامان کو نئے جدید طرز کے سامان سے تبدیل کر دیا جائے گا۔

پاکستان امریکہ کی طرف کیوں جھک گیا تھا؟ اس نے کسی بھی کمیونسٹ پیش قدمی کو روکنے کے لئے بحر اوقیانوس سے بحر پیسفک تک ایک رکاوٹ کھڑی کرنے میں امریکہ کی مدد کی تھی؟ اور پھر اس حصار کا ایک لازمی حصہ بن کر امریکہ کو اپنی سرزمین پر خفیہ معلومات جمع کرنے کا اجازت نامہ کس لئے پیش کیا تھا؟ ان سوالوں کے جوابات کئی طرح سے دیئے جا سکتے ہیں۔

پہلا جواب تو یہی ہے کہ پاکستان کو فوری طور پر بھارتی حملے کے خطرے کا مقابلہ کرنا تھا دوسری بات کہ روس اپنی توسیع پسند پالیسی پر عمل پیرا تھا اور اس نے مشرقی یورپ میں اور جنوب مشرقی ایشیا ممالک میں پیش قدمی شروع کر دی تھی۔ تیسری بات کہ امریکہ 1930ء کی دہائی میں معاشرتی بحران سے کامیابی کے ساتھ باہر نکل آیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے پاس ایک بڑا فوجی منصوبہ بھی تھا۔ پھر یہ حقیقت بھی تھی کہ امریکہ دوسرے ممالک کی نسبت تکنیکی لحاظ سے بہت زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ ان حالات میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ پاکستان کے ابتدائی برسوں میں خارجہ پالیسی بنانے والوں نے اپنا مقصد حاصل کر لیا تھا۔ یعنی ایک بہتر دفاعی نظام اور معاشی سماجی حالات میں ترقی کا امکان پا لیا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ اس قیمت پر ہوا تھا کہ پاکستان مغربی بلاک کا بہت واضح حلیف بن گیا تھا۔ پاکستان کے اول دس برسوں میں لیاقت علی خان کے بعد خواجہ ناظم الدین، محمد علی بوگرا، چودھری محمد علی، سہروردی، آئی آئی چندریگر اور فیروز خان نون کی حکمرانی رہی پہلے دس

Marfat.com

برسوں میں پاکستانی خارجہ پالیسی کا مقصد تمام ممالک کے ساتھ خاص طور پر امریکہ اور مسلم ممالک کے ساتھ باہمی تعلقات کا قیام اور ان کی بہتری کی کوشش کرنا تھا۔ فیروز خان نون کے مسلم ملکوں کے دورے مسلم امہ سے پاکستانی یکجہتی کے ارادے کا اظہار تھے۔ اس کے ساتھ ہی ابتدائی دس برسوں میں تمام وزرائے اعظم نے مغربی ممالک کے ساتھ تعلقات کو بہتر بنانے اور استوار کرنے میں سخت جدوجہد کی۔ محمد علی بوگرا نے اگست 1953ء میں بھارتی رہنماؤں سے مذاکرات شروع کئے تھے وہ بھارتی وزیر اعظم سے ملنے دہلی بھی گئے تھے اور ایک پریس اعلامیہ جاری کیا گیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ کشمیر کا مسئلہ حل کرنے کے لئے ایک منصفانہ استصواب رائے ہی بہترین حل ہے جس کے ذریعے کشمیر کے عوام کی مرضی معلوم کی جا سکے۔ اس اعلامیہ کو پاکستان کی ڈپلومیسی کامیابی کہا گیا کیونکہ بعد میں بھارت کو اپنے عہد روگردانی کرنا پڑی تھی مگر یہ معاہدہ بھارت اور پاکستان کے درمیانی تعلقات میں دوسرا معاہدہ تھا۔ پہلا معاہدہ 1954ء میں جنگی بندی کا سمجھوتہ تھا اس کے بعد اقوام متحدہ کے فوجی مبصرین کا تقرر کر دیا گیا۔ آزاد کشمیر تو پاکستان کے کنٹرول میں رہا مگر جموں کشمیر کی وادیاں بھارت کے قبضے میں رہیں۔ اس وقت سے دونوں ملکوں کے درمیان کنٹرول لائن قائم ہے جو بین الاقوامی سرحد نہیں ہے۔ پانی کے جھگڑے کے بارے میں مئی 1948ء کا معاہدہ پاکستان کی ڈپلومیسی کے لئے ایک چیلنج تھا۔ دونوں ملکوں کو متبادل پانی کے ذرائع کو ترقی دینا تھی چونکہ اس معاہدے کے دوفریق متبادل ذرائع کے بارے میں متفق نہیں ہو سکے تھے اس لئے پاکستان نے اس معاہدے کی قانونی حیثیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن بھارت نے معاہدے کو تسلیم کرتے ہوئے بھاکڑا ننگل پراجیکٹ پر کام جاری رکھا تھا۔ سکیم کے ذریعے دریائے ستلج کا پانی راجستھان کے علاقے میں منتقل کیا جا رہا تھا۔ جو بین الاقوامی قانون کی صریحاً خلاف ورزی تھی اس کارروائی کے سنگین نتائج کا احساس کرتے ہوئے اور یہ خیال کرتے ہوئے کہ اس جھگڑے کی وجہ سے دونوں ممالک کے درمیان نفرت کی مستقل بنیاد پڑ جائے گی۔ پاکستان نے اس مسئلے کو بین الاقوامی حیثیت دیدی اور عالمی بنک کے صدر یوجین بلیک نے اس معاہدے میں ثالثی کا کردار ادا کیا ان کی کوششوں کے نتیجے میں سندھ طاس کا معاہدہ عمل میں آیا۔ اس معاہدے پر کراچی میں جنرل ایوب اور نہرو نے دستخط کئے۔ اس معاہدے میں یہ بات شامل تھی کہ دریائے جہلم پر منگلا کے مقام پر پانی ذخیرہ کیا جائے گا اور دریائے سندھ پر تربیلا کے مقام پر ڈیم بنایا جائے گا۔ بھارت دریائے ستلج پر بھاکڑہ کے مقام پر پانی ذخیرہ کرتا تھا اس معاہدہ نے بھارت اور پاکستان کے درمیان کا یہ تنازعہ ہمیشہ کے لئے حل کر دیا اور بجلی اور آبپاشی کے نئے وسائل پیدا کرنے کا موقع بھی فراہم کیا۔ امریکہ، برطانیہ، مغربی جرمنی، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کو اس بات پر راغب کیا گیا کہ وہ ایک بلین ڈالر (جو اس منصوبے کا دو تہائی خرچ تھا) برداشت کریں کیونکہ جنوبی ایشیا کے یہ دونوں ملک یہ خرچ برداشت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے۔

1948ء میں دونوں مملکتوں کے درمیان بھارتی ہٹ دھرمی جن میں نہری پانی کا قضیہ پاکستان کے حصے میں آیا ہوا فوجی ساز و سامان شامل تھا پیدا کر دیئے گئے۔ 1949ء میں صورتحال کچھ بہتر ہوئی اقلیتوں میں اتحاد بحالی اور کشمیر کی جنگ بند ہوگئی لیکن متروکہ املاک اور کشمیر کے سمجھوتے کے بارے میں شدید اختلاف باقی رہا۔
ستمبر 1949ء میں بھارت نے روپے کی قیمت کم کر دی لیکن پاکستان نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا دسمبر

Marfat.com

1949ء میں جب بھارت نے پاکستان کو کوئلے کی بہم رسانی بند کردی تو چین نے پاکستان کو کوئلہ مہیا کیا۔ پاکستانی ریلوے لائنوں پر پھر سے انجنوں کی چہل پہل شروع ہوگئی۔

1950ء کے آغاز میں بھارت کے مختلف علاقوں میں پھر فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے اس کا اثر مغربی بنگال (اب بنگلہ دیش) پر بھی پڑا لیکن صوبائی اور مرکزی حکومت کے سخت اقدام کی بدولت جلد صورتحال پر قابو پالیا گیا کیونکہ دونوں علاقوں کے عوام کے اندر خوف و ہراس پیدا ہو چکا تھا اور 1947ء کی طرح بڑے پیمانے پر ہجرت شروع ہوگئی کلکتہ کے اخبارات نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ پاکستان کے خلاف اعلان جنگ کر کے دونوں بنگالوں کو جبریہ طور پر متحد کر دیا جائے۔ جنوری 1950ء میں بھارت کے وزیر اعظم پنڈت نہرو نے تجویز پیش کی کہ دونوں حکومتوں کو مشترکہ طور پر اعلان کر دینا چاہئے کہ ہم اپنے باہمی اختلافات کے تصفیہ کے لئے ایک دوسرے کے خلاف جنگ نہیں کریں گے۔ لیکن پاکستان نے کہا کہ مسئلہ کشمیر حل کرنے کے بعد یہ معاہدہ ہوسکتا ہے۔ 8 اپریل 1950ء کو دونوں ملکوں کے مابین اقلیتوں کا معاہدہ طے پایا۔ فروری 1950ء میں پاکستان کے وزیر اعظم مسٹر لیاقت علی خان نے بھارت کو جنگ نہ کرنے کے بارے میں ایک مشترکہ اعلان کے لئے ٹھوس تجاویز روانہ کی تھیں۔ تجاویز یہ تھیں:

1: گفت وشنید کے ذریعے مسائل کو حل کرنے کے لئے دو ماہ کی مدت مقرر کی جائے۔

2: اگر اس مدت کے اختتام پر گفت وشنید کے ذریعہ تنازعات حل کرنے میں ناکامی ہو تو مصالحت کا طریقہ اختیار کیا جائے اور مزید دو ماہ اس کے لئے مقرر کئے جائیں۔

3: اگر مصالحت اور گفت وشنید کے ذریعہ بھی چار ماہ کی معینہ مدت میں ناکامی ہو تو خود بخود اس مسئلہ کو کسی ثالث کے سپرد کر دیا جائے یا کسی بین الاقوامی ادارے کو ثالث بنایا جائے جس کے فیصلہ کی پابندی دونوں ملکوں کے لئے ضروری ہو۔ لیکن بھارت نے پاکستان کی اس پیش کش کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ صرف جنگ کی مذمت کی جائے اور اعلان کیا جائے کہ بھارت اور پاکستان کے درمیان جو بھی اختلافات پیدا ہوں گے ان کو پرامن ذرائع سے حل کیا جائے گا بھارت صرف اس مفہوم کو کافی سمجھتا ہے۔ 28 ستمبر 1950ء کو وزیر اعظم لیاقت علی خان نے بھارت سے جنگ نہ کرنے کے لئے وزیر اعظم ہند پنڈت نہرو کو ایک خط لکھا۔

27 جون 1950ء کو نئی دہلی میں متروکہ جائیدادوں کے سوال پر غور کرنے کے لئے دونوں ملکوں کے نمائندوں کی ایک ابتدائی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں خواجہ شہاب الدین وزیر مہاجرین نے پاکستان کی اور مسٹر اجیب پرشادا جین وزیر بحالیات ہندوستان اور مسٹر گوپال سوامی آئینگر وزیر حمل ونقل بھارت نے نمائندگی کی۔ کانفرنس میں متروکہ جائیداد منقولہ وغیرہ کے تمام پہلوؤں پر بحث کی گئی۔ دونوں ملکوں کے مابین 28 جون 1950ء کو تارکین وطن کی منقولہ جائیدادوں کے متعلق مکمل سمجھوتہ طے پا گیا اس سمجھوتے کے تحت تارکین وطن کو کسٹوڈین سے پرمٹ لیے بغیر ہی اپنی منقولہ جائیداد الاٹ کی گئی تھی یا جسے حکومتوں نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا اس کی مالیت کا اندازہ لگانے یا معاوضہ ادا کرنے کے بارے میں بھی ایک طریق پر اتفاق ہوگیا۔

26 اپریل 1950ء کو پنڈت جواہر لال نہرو پاکستان کے دورے پر آئے اور انہوں نے پاکستانی حکام کے

Marfat.com

ساتھ دونوں ملکوں کے مابین اختلافی مسائل کو باضابطہ طور پر ختم کرنے کے لئے مذاکرات کئے لیکن توقع کے مطابق کامیابی نہ ہوئی البتہ دونوں ملکوں کے تعلقات میں بہتری ضرور پیدا ہوئی۔

18 ستمبر 1950ء کو آل انڈیا نیشنل کانگریس کی مجلس عاملہ نے لیاقت نہرو معاہدے کی توثیق کر دی اس ضمن میں دو قراردادوں پر مسلسل تین گھنٹے تک بحث و مباحثہ کرنے کے بعد انہیں منظور کر لیا گیا۔

پہلی قرارداد بھارت و پاکستان کے درمیان اقلیتی معاہدہ کے متعلق ہے اور دوسری کا متن تارکین وطن کی جائیدادوں سے ہے۔ اقلیتی معاہدے کے بارے میں مجلس عاملہ نے کہا کہ یہ معاہدہ ایک دشوار ترین مسئلہ کا نہایت پُرامن اور موثر حل ہے اور کانگریس کی روایات اور حکمت عملی کے عین مطابق ہے۔ قرارداد میں حکومت بھارت پر زور دیا گیا کہ وہ بھارت کی اقلیتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرے تاکہ وہ اپنے آپ کو محفوظ اور مامون تصور کریں۔ 1951ء میں جب بھارت نے پاکستان کو مرعوب کرنے کے لئے اپنی تمام فوجیں پاکستان کی سرحد پر لا کر جمع کر دیں تو اس موقع پر وزیراعظم پاکستان خان لیاقت علی خان نے کہا کہ ''ہم بھارت سے جنگ نہیں کرنا چاہتے ہم کسی دوسرے ملک سے بھی لڑنا نہیں چاہتے ہم کو ہمارے اسلام نے سچائی اور امن کا راستہ سکھایا ہے ہم امن پر برابر چلنا چاہتے ہیں اور چلتے رہیں گے مگر امن کی خاطر ہم اپنی آزادی کو بھینٹ چڑھانے کے لئے تیار نہیں شاید آپ کو معلوم ہوگا کہ اس دوران میرے اور پنڈت نہرو کے درمیان برابر خط و کتابت ہوتی رہی دنیا جانتی ہے کہ میں نے انتہائی کوشش کی کہ ہمارے جو اختلافات ہیں ان کو پرامن طریقے سے طے کرنے کا راستہ نکالا جائے۔ (روزنامہ پاکستان ٹائمز۔ 16 جنوری 1951)

وزیراعظم لیاقت علی خان نے اس موقع پر بھارت کو یہ پانچ نکات پیش کئے تھے:

1: بھارتی فوجیں پاکستان کی سرحدوں سے پیچھے ہٹائی جائیں تو پاکستانی فوجیں بھی ان مقامات سے جہاں یہ موجود ہیں ہٹا دی جائیں گی۔

2: کشمیر کے مسئلے کے متعلق اقوام متحدہ کی 13 اگست 1948ء اور 5 جنوری 1949ء کی قرارداد پر جنہیں پاکستان اور بھارت دونوں منظور کر چکے ہیں؟ دونوں ملک عمل کریں گے اگر ان تجاویز سے متعلق ان کے مضمون کے متعلق کوئی اختلاف رائے ہو تو اسے کسی ثالث کے سامنے پیش کر دیا جائے نیز کشمیری باشندوں کا حق خود ارادیت جو انہیں حاصل ہے پورا کرنے کے لئے انہیں آزاد طریقے سے رائے شماری کرنے دی جائے تاکہ وہ یہ فیصلہ کر سکیں کہ وہ پاکستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا بھارت میں۔

3: دونوں ملکوں کے اختلافات خواہ وہ نہری پانی سے متعلق ہوں یا مہاجرین کی جائیدادوں کے بارے میں یا روپے کے سلسلے میں پہلے باہمی مشورے سے اور اگر اس میں کامیابی نہ ہو تو ثالث کی امداد سے طے کئے جائیں۔

4: دونوں ملک ایک دوسرے کے خلاف زہریلا پراپیگنڈہ بند کر دیں اور اس معاہدہ پر جو 8 اپریل 1950ء کو ہوا تھا پورے طور سے عمل کیا جائے۔

5: کسی مسئلے کا حل جنگ نہیں اور نہ ہی ایک دوسرے کے خلاف ہتھیار اٹھانا ہے۔

لیکن بھارت نے قائد ملت کے ان پانچ نکات میں سے کسی ایک پر بھی عمل نہ کیا بلکہ اس کے برعکس سرحدوں پر

Marfat.com

90 فیصد فوجیں جمع کر دیں۔نوابزادہ لیاقت علی خان نے انتہائی صبر وتحمل سے حالات کا مقابلہ کیا اور کراچی کے جلسہ عام میں مکہ بنا کر دایاں ہاتھ اونچا کیا اور کہا جس طرح یہ انگلیاں مل کر مکہ بن جاتی ہیں اس طرح تمام پاکستانی عوام متحد ہو جائیں یہی اتحاد ہمارا ایٹم بم ہے جس کی بدولت ہم دنیا کی ہر طاقت کو شکست دے سکتے ہیں چنانچہ ان کا مکہ قومی اتحاد کا مظہر بن گیا جس کے نتیجے میں بھارتی فوجیں کچھ عرصہ کے بعد سرحدوں سے پیچھے ہٹالی گئیں۔دونوں ملکوں میں مسئلہ کشمیر کی وجہ سے بڑی کشیدگی پائی جاتی تھی اسے کم کرنے کے لئے وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو سے بات چیت کی۔بات چیت کے نتیجے میں دونوں رہنما کشمیر میں استصواب پر رضامند ہو گئے تاہم بھارت نے خود ہی اس کی خلاف ورزی کی اور اس طرح مسئلہ کشمیر ایک بار پھر کھٹائی میں پڑ گیا حالانکہ پاکستان کی کوششوں میں کسی وقت بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔

1954ء کو پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں نے نئی دہلی میں ایک دوسرے کے ملکوں میں دو دو اسسٹنٹ ہائی کمشنر مقرر کرنے کا فیصلہ کیا۔پاکستان کے اسسٹنٹ ہائی کمشنروں کا تقرر بمبئی اور شیلانگ میں جب کہ ہندوستان کے اسسٹنٹ ہائی کمشنروں کا تقرر حیدرآباد اور راجشاہی میں کیا گیا لیکن اس کے باوجود دونوں ملکوں کے تعلقات میں بہتری پیدا نہ ہو سکی۔

پاکستان کے قیام کو سات سال گزر جانے کے باوجود ہندوستان نے پاکستان کے حصے کا فوجی سامان نہیں دیا اس ضمن میں پاکستان میں مقیم ہندوستان کے ہائی کمشنر نے 25 جنوری 1954ء کو کہا:

حقیقت یہ ہے کہ تقسیم کے وقت برعظیم میں جو فوجی سٹورز اور دوسرا سامان تھا وہ برطانوی حکومت کی ملکیت تھا لہٰذا ہندوستان اور پاکستان میں سے کوئی بھی ادائیگی کئے بغیر ان کا مطالبہ نہیں کر سکتا تھا۔تقسیم کے بعد برطانیہ، ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کے درمیان یہ طے پایا تھا کہ حکومت ہند برطانیہ کو اس سامان کی قیمت ادا کر دے گی اور حکومت پاکستان حکومت ہند کو قیمت ادا کرنے کے بعد اپنے حصہ کا فوجی سامان اور سٹورز حاصل کرے گی۔اس سمجھوتے کے مطابق ہندوستان نے برطانیہ کو اس سارے سامان کی قیمت ادا کر دی اور پاکستان کو 15 اگست 1947ء اور اواخر جولائی 1948ء تک بھیجے گئے سٹورز اور سامان کے لئے پاکستان سے قیمت طلب کی لیکن پاکستان نے ادائیگی سے انکار کر دیا اور اس طرح اس نے اصل معاہدہ کی خلاف ورزی کی یہ مسئلہ دسمبر 1948ء میں پھر ایک بین المملکتی کانفرنس میں پیش ہوا اور پاکستان نے فوراً ادائیگی کرنا منظور کر لیا لیکن بعد میں اس نے پھر معاہدے سے انحراف کرتے ہوئے کوئی ادائیگی نہ کی ان حالات میں ہندوستان مجبور ہو گیا کہ وہ پاکستان کو مزید سامان نہ دے جونہی پاکستان سٹورز اور فوجی سامان کی قیمت ادا کر دے گا ہندوستان اسے بخوشی باقی ماندہ سامان بھیج دے گا۔

26 جنوری 1954ء کو پاکستانی اور بھارتی پنجاب کی سرحدی پولیس کے کمانڈروں کا ایک اجلاس واہگہ کی سرحد پر ہوا جس میں پانچ گھنٹے تک گورداسپور اور فیروز پور کے دو سرحدی تنازعات پر غور کیا گیا۔

31 جنوری 1954ء کو پاکستانی اور بھارتی پنجاب کے فنانشل کمشنروں کی کانفرنس منعقدہ نئی دہلی میں فیصلہ کیا گیا کہ دونوں پنجابوں کے درمیان حدیں قائم کرنے کا سوال متعلقہ حکومتوں کے سامنے پیش کیا جائے۔کانفرنس نے حد بندی کی تجویزوں پر بھی غور کیا۔

Marfat.com

5 فروری 1954ء کو پاکستان کی وزارت دفاع نے فوجی اثاثوں کی تقسیم کے بارے میں ہندوستان کے ہائی کمشنر کے بیان کی تردید کی اور کہا کہ ہندوستان نے پاکستان کے حصے کا بہت سا فوجی سامان روک کر تقسیم کے معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تقسیم کے وقت دو قسم کا فوجی سامان تھا متحدہ ہندوستان کا اپنا اور برطانیہ کا اپنا۔ پاکستان پہلی قسم کے سامان میں نقد قیمت ادا کئے بغیر ایک تہائی کا حقدار تھا اور دوسری قسم میں سے نقد ادائیگی پر ایک تہائی کا دونوں قسم کا سامان ایک ہی طرح کا تھا۔ اس میں پاکستان کو 1,60,000 ٹن سامان اور 1780 گاڑیاں ملنی تھیں لیکن اسے صرف 22 ہزار ٹن سامان اور 74 گاڑیاں ملیں یہ مقدار متحدہ ہندوستان کے سامان میں سے پاکستان کے حصے کے برابر بھی نہیں ہندوستان کو برطانوی سامان کی قیمت دے کر مزید سامان حاصل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہندوستان نے پاکستان کو گولہ بارود بالکل نہیں بھیجا اس لئے ہندوستان نے برطانوی سامان کی قیمت کے سلسلے میں پندرہ کروڑ روپے کے جس مطالبے کا ذکر کیا ہے وہ غیر منصفانہ اور سمجھوتے کے خلاف ہے۔

20 فروری 1954ء کو بھاکڑا ننگل اور منڈی ہائیڈرو الیکٹرک پراجیکٹ سے پاک پنجاب کو بجلی مہیا کرنے کے بارے میں دونوں صوبوں کے نمائندوں کی بات چیت چندی گڑھ میں شروع ہوگئی دو تجویزیں زیر بحث آئیں:

1: بھاکڑا ننگل پراجیکٹ سے بجلی کی سپلائی کے لئے طویل المیعاد سمجھوتہ کیا جائے۔

2: منڈی پراجیکٹ سے بجلی کی سپلائی جاری رکھنے کے لئے ایک سال کا سمجھوتہ کیا جائے۔

21 فروری 1954ء کو پاک پنجاب اور مشرقی پنجاب کے نمائندوں کے مابین ایک معاہدہ طے پایا جس کے تحت پاک پنجاب کے لئے جوگیندر نگر ہائیڈرو الیکٹرک پراجیکٹ سے بجلی کی سپلائی کے معاہدہ کی تجدید ہوگئی تاہم بھاکڑا ننگل پراجیکٹ سے بجلی کی بہم رسانی کے طویل المیعاد معاہدے کی دفعات بھی زیر بحث آئیں۔ اس معاہدے کے تحت پاک پنجاب کو آئندہ سال سے پانچ ہزار کلوواٹ بجلی دینے کا وعدہ کیا گیا۔

26 فروری 1955ء کو پاکستان اور بھارت کی رہبر کمیٹیوں کا سہ روزہ اجلاس کراچی میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں دونوں ملکوں کے نزاعی مسائل کی جانچ پڑتال کی گئی اور ان کی ترتیب وار فہرست مرتب کی گئی۔ کمیٹیوں نے دونوں ملکوں کو براہ راست بات چیت کرنے کو کہا اور اس کے لئے 11 مارچ کی تاریخ مقرر کی گئی۔

12 مارچ 1955ء کو نئی دہلی میں دونوں ملکوں کی رہبر کمیٹیوں کا اجلاس ختم ہوگیا کمیٹیوں کے اجلاس میں جو تنازعات زیر بحث آئے ان میں سے تین چوتھائی مسائل پر اتفاق رائے ہوگیا۔ مجموعی طور پر 12 امور پر غور کیا گیا جن امور پر سمجھوتہ طے پایا ان کا تعلق مشرقی اور مغربی سرحدوں کے تعین اور معمولی وعادی کی ادائیگیوں سے تھا۔ دریں اثنا کراچی میں متروکہ املاک اور بینکنگ کے معاہدوں کے متعلق بھارت اور پاکستان کے درمیان یکم مارچ 1955ء کو شروع ہونے والی بات چیت 12 مارچ کو مکمل ہوگئی اور 13 مارچ کو سمجھوتہ طے پا گیا۔

12 اپریل 1955ء کو دونوں ملکوں نے پاسپورٹ اور ویزا کی پابندیاں نرم کرنے پر اتفاق کیا اور ان اُمور پر مذاکرات ہوئے۔

1: ایک ملک سے دوسرے ملک میں ترک وطن

Marfat.com

2: ریلوے مواصلات کے سلسلے میں اضافہ
3: دونوں ملکوں کے درمیان آمدورفت کی مزید سہولتیں
4: مشرقی پاکستان سے اقلیتی فرقہ کی بھارت کو روانگی ۔

15 مئی 1955ء کو پاکستان اور بھارت کے وزرائے داخلہ میجر جنرل سکندر مرزا اور پنڈت گوبند ولبھ پنت کے مابین نئی دہلی میں تین خصوصی مسائل پر سمجھوتہ طے پایا۔ پہلا مسئلہ سرحدی حادثات کی روک تھام کے متعلق تھا دوسرا مسئلہ مقدس مقامات کی حفاظت اور تیسرا مسئلہ دونوں ملکوں کے مابین سفر کی مزید سہولتوں سے متعلق تھا۔ دونوں ملکوں نے سرحدی دستوں میں بھی تخفیف کا اعلان کیا۔ اکتوبر 1958ء میں ملک میں فوجی انقلاب آیا تو پاکستان نے مسئلہ کشمیر کو پھر زندہ کر دیا۔

19 جنوری 1958ء کو بھارت کی بجلی مہیا کرنے کے سوال پر بھارت اور پاکستان کے مابین پشاور میں الیکٹریکل انجینئروں کی دوروزہ بات چیت ختم ہوگئی جس کے نتیجے میں فریقین میں سمجھوتہ طے پایا۔ معاہدے کا پس منظر یہ تھا کہ گزشتہ دس برس میں مغربی پاکستان کو مشرقی پنجاب سے بجلی کی فراہمی کے لئے سال بسال معاہدہ ہوتا رہا۔ مارچ 1957ء میں سنٹرل زون کے محکمہ بجلی کے ایڈیشنل چیف انجینئر مسٹر اے ایچ خان 1957/58ء کے معاہدے کی بات چیت کے لئے چنڈی گڑھ گئے لیکن اس وقت کی حکومت نے چھ ماہ کا معاہدہ کیا جس کی مدت 31 اکتوبر 1957ء کو ختم ہونی تھی تاہم بھارتی افسروں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس سلسلے میں اکتوبر میں بات چیت کریں گے چنانچہ بھارتی انجینئروں کی ایک جماعت اکتوبر 1957ء میں لاہور آئی اور اس نے یہ تجویز پیش کی کہ نومبر 1957ء سے مارچ 1958ء تک پاکستان اڑھائی سوکلوواٹ کی بجائے پندرہ سوکلوواٹ بجلی حاصل کرے۔ مغربی پاکستان کے محکمہ بجلی کے چیف انجینئر نے اس بنا پر اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ اتنی بجلی مغربی پاکستان گرڈ سے حاصل کی جا سکتی ہے بشرطیکہ اس کے کنڈنسر شالیمار سب سٹیشن میں لگا دیئے جائیں۔

بھارتی انجینئروں کی ایک ٹیم 17 جنوری کو لاہور اور وہاں سے پشاور گئی جہاں دونوں حکومتوں کے مابین معاہدہ طے پایا۔ 23 جنوری 1958ء کو پاکستان نے بھارت سے بجلی کی خریداری بند کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ بھارت نے یہ شرط لگائی تھی کہ پاکستان ساڑھے تیرہ پائی فی یونٹ کی شرح سے بجلی کے اخراجات برداشت کرے۔ پاکستان نے بھارت کے ساتھ امن کے ساتھ رہنے کے لئے متعدد پیشکشیں کیں اس ضمن میں 11 جنوری 1958ء کو وزیراعظم پاکستان مسٹر فیروز خان نے بھارت سے جنگ نہ کرنے کی پیشکش کی اور کہا کہ اگر ایک بار بھارت کشمیر اور نہری پانی کے تنازعات طے کر لے تو پاکستان جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرنے کو تیار ہے۔ 11 ستمبر 1958ء کو بھارت کے ساتھ وزیراعظم فیروز خان نون نے مشرقی پاکستان اور بھارت کی سرحدوں کے تعین کے سلسلے میں چند اصول طے کئے اور معاہدہ طے پایا جسے نون نہرو معاہدے کا نام دیا گیا۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان 17 اپریل 1959ء کو نہری پانی سے متعلق عبوری سمجھوتے پر دستخط ہوئے۔ اس کے تحت بھارت کو راوی، بیاس اور ستلج سے مقررہ مقدار میں پانی حاصل کرنے کا حق دیا گیا اس بین المملکتی سمجھوتہ میں

Marfat.com

یکم اپریل 1959ء سے 31 مارچ 1960ء تک کے لئے عارضی انتظامات کئے گئے اور مغربی دریاؤں سے پانی کی کمی کو دور کرنے کے متعلق پاکستان کی اہلیت کا لحاظ رکھتے ہوئے سمجھوتے کے دوران میں تینوں مشرقی دریاؤں یعنی راوی، بیاس اور ستلج سے بھارت کے لئے پانی کی مزید مقدار معین کر دی گئی۔ اس سمجھوتہ پر واشنگٹن میں دستخط ہوئے پاکستان کی جانب سے امریکہ میں پاکستان کے سفیر مسٹر عزیز احمد نے اور بھارت کی جانب سے ایڈیشنل سیکرٹری آبپاشی مسٹر این ڈی گلہاٹی نے دستخط کئے۔

1959ء میں بھارت کا ایک کینبرا جیٹ طیارہ پاکستان کے فوجی ٹھکانوں کے تصاویر لینے کے لئے انتہائی قابل اعتراض مشن پر پاکستان آیا اور اس نے پاکستان کی فضائی سرحدوں میں تجاوز کیا جب بھارتی طیارہ نے کسی انتباہ پر بھی توجہ نہ دی اور پاکستانی سیبر جیٹ کی زد سے باہر نکلنے کے لئے اپنا رخ بلندی کی جانب کر لیا تو پاکستانی ہواباز کو مجبوراً گولی چلانا پڑی جس سے بھارتی طیارہ گر کر تباہ ہو گیا۔ اس پر بھارتی حکومت نے پاکستان سے معاوضہ طلب کیا جسے 15 مئی 1959ء کو حکومت پاکستان نے مسترد کر دیا کیونکہ پاکستان کے علاوہ بین الاقوامی رائے عامہ نے بھی پاکستان کے موقف کو درست تسلیم کر لیا تھا۔

15 اکتوبر 1959ء کو کراچی اور دہلی میں بھارت اور پاکستان کے درمیان مالی امور اور سرحدی امور سے متعلق بات چیت شروع ہوئی۔ 17 اکتوبر کو دونوں ملکوں کے نمائندوں کے مابین سرحدی جھگڑوں کے بارے میں پہلا دور ختم ہو گیا۔

18 اکتوبر کو مالی امور پر مذاکرات کے سلسلے میں جو مشترکہ اعلان جاری ہوا اس میں بتایا گیا کہ دونوں ملکوں کے مابین تصفیہ طلب امور کافی حد تک طے پا گئے ہیں۔ 20 اکتوبر کو دونوں ملکوں کے درمیان سرحدی امور کے متعلق سمجھوتہ طے پا گیا۔ نیز دونوں ملکوں کی سرحدی فوجوں اور سول افسروں کے درمیان رابطہ قائم رکھنے کے لئے جو طریق کار اختیار کیا گیا اس پر بھی سمجھوتہ ہوا۔ لیکن بھارت نے 1958ء کے سرحدی معاہدے پر بھی عمل نہ کیا اسی معاہدے کے تحت مشرقی پاکستان میں بیڑو باڑی یونین کا علاقہ پاکستان کو ملنا تھا لیکن وہ بھی نہ دیا گیا۔ صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے بھارت کے ساتھ مصالحانہ روش اختیار کرتے ہوئے 2 مارچ 1959ء کو جنگ کو دونوں ملکوں کے لئے انتہائی نقصان دہ قرار دیا اور کہا کہ دونوں ملکوں کے مابین متنازعہ امور اقوام متحدہ کے اصولوں کی روشنی میں منصفانہ طور پر حل کرنے چاہئیں۔

1959ء میں جب چین نے بھارت سے ملحقہ سرحدی علاقے تبت پر قبضہ کیا تو تبت کے سربراہ نے بھارت میں پناہ لی۔ اس بنا پر دونوں ملکوں کے حالات کشیدہ ہو گئے جس کے نتیجے میں دونوں ملکوں کے مابین سرحدی جھڑپوں کا آغاز ہوا۔ صدر ایوب نے بھارتی وزیراعظم پنڈت نہرو کو جنگ نہ کرنے کی پیشکش کی تاکہ روس اور چین کی طرف سے انہیں جو خطرات نظر آ رہے تھے اس سے محفوظ رہا جا سکے لیکن صدر ایوب نے اس کے ساتھ ساتھ یہ شرط بھی عائد کی کہ کشمیر سمیت تمام متنازعہ امور کا تصفیہ ہونے کے بعد ہی جنگ نہ کرنے کا معاہدہ ہو سکتا ہے۔

صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے برسر اقتدار تنازعات کو طے کرنے کا آغاز کیا جس کے نتیجے میں 1959ء میں صدر ایوب اور وزیراعظم بھارت مسٹر جواہر لال نہرو کے درمیان نئی دہلی میں ملاقات ہوئی اس ملاقات میں یہ طے پایا

Marfat.com

کہ دونوں ملکوں کے مابین وزارتی سطح پر بات چیت کی جائے چنانچہ اکتوبر 1959ء میں سردار سورن سنگھ اور امور داخلہ کے پاکستانی وزیر جنرل کے ایم شیخ کے مابین مذاکرات ہوئے۔ مذاکرات میں مشرقی پاکستان (اب بنگلہ دیش) اور بھارت کی سرحدات کے تنازعات کے فیصلے کے علاوہ یہ بھی طے پایا کہ مغربی پاکستان اور بھارت کے تنازعات سرحدی کا فیصلہ کرنے کے لئے ایک اور کانفرنس بلائی جائے اس فیصلے کی روشنی میں جنوری 1960ء میں لاہور، راولپنڈی اور بعد ازاں نئی دہلی میں وزارتی سطح پر بات چیت ہوئی جس کے نتیجے میں پاکستان اور بھارت کے پانچ سرحدی تنازعات کا جائزہ لیا گیا۔ یہ تنازعات چک لدھیکے، سرجامرجا، حسینی والا، سلیمانکی ہیڈورکس اور رن کچھ سرحد سے متعلق تھے۔ رن کچھ کے سوا اول الذکر چاروں ریڈکلف ایوارڈ کے نتیجے میں کھڑے ہوئے تھے۔ چنانچہ دونوں ملکوں کی بات چیت کے ضمن میں مندرجہ ذیل اُمور طے پائے:

1: پاکستان چک لدھیکے پر اپنے دعویٰ سے دستبردار ہو گیا اور بھارت نے سرجامرجا، رکھ ہردیت سنگھ اور پٹھانکے پر اپنا دعویٰ چھوڑ دیا۔

2: حسینی والا ہیڈورکس ضلع لاہور اور ضلع فیروز پور کے درمیان بھارت اور پاکستان کی سرحدی لائن قرار پایا۔

3: دونوں ملکوں کے نمائندوں نے تنازعہ رن کچھ پر بعد میں بات چیت کرنے پر رضامندی کا اظہار کیا۔

4: مغربی پاکستان اور بھارت کی سرحدوں کے بارے میں بنیادی ضوابط پر بھی 6 جنوری 1960ء کو باہمی سمجھوتہ طے پایا اس سمجھوتہ کی تکمیل کیلئے مشرقی پنجاب اور مغربی پاکستان کی 325 میل لمبی سرحد کا سروے کیا گیا جو 17 جنوری 1960ء کو مکمل ہوا۔

17:5 جنوری 1961ء کو معاہدہ کے مطابق مشرقی پنجاب کا پچاس ہزار ایکڑ رقبہ مغربی پاکستان کے حوالے کیا گیا اور مغربی پاکستان کا 35 ہزار ایکڑ رقبہ مشرقی پنجاب کو ملا۔ علاقوں کا یہ تبادلہ پاکستان اور بھارت کی سرحد پر ایک خاص تقریب میں عمل میں آیا۔ سرحد کو واضح کرنے کیلئے 4455 برجیاں بھی نصب کی گئیں۔

19 ستمبر 1960ء سے 23 ستمبر 1960ء تک بھارت کے وزیر اعظم پنڈت نہرو نہری پانی کے سمجھوتے کے سلسلے میں پاکستان کے دورے پر آئے انہوں نے اسی روز اس پر دستخط کئے۔ دونوں رہنماؤں نے پاکستان اور بھارت کے تعلقات سے متعلقہ امور پر گفتگو کی اور غیر رسمی طور پر بین الاقوامی مسائل پر بھی تبادلہ خیال کیا۔ دونوں نے مسئلہ کشمیر پر بھی بات چیت کی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ ایک مشکل مسئلہ ہے جس کا تقاضا ہے کہ تمام پہلوؤں کا نہایت احتیاط سے مطالعہ کیا جائے۔ بھارتی وزیر اعظم نے 23 ستمبر کو ایک پریس کانفرنس سے لاہور میں خطاب کیا جو پاکستان میں ان کی پہلی پریس کانفرنس تھی۔ پاک بھارت تعلقات کے اس پہلے دور میں سب سے اہم معاہدہ سندھ طاس تھا جس کے نتائج ہم آج بھگت رہے ہیں جن دنوں معاہدہ ہوا تب ہمارے حکمران کیا سوچ رہے تھے؟ صدر جنرل ایوب خان کہتے ہیں۔

"پاکستان اور ہندوستان میں دریائے سندھ کے طاس کے پانی پر جو جھگڑا ہے وہ بہت پرانا ہے اور اس نے کئی رنگ بدلے ہیں۔ کشمیر کا مسئلہ تو بنیادی طور پر ایک سیاسی مسئلہ ہے لیکن نہروں کے پانی کا مسئلہ ایک فنی اور اقتصادی مسئلہ ہے جس نے ہندوستان کے غیر مصالحانہ رویے کی وجہ سے ایک تلخ دیرینہ عداوت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ پاکستان میں

Marfat.com

یکے بعد دیگرے جو حکومتیں برسر اقتدار آئیں ان کی کمزور اور پس وپیش کی پالیسی بھی اس جھگڑے کے بڑھنے کا باعث ہوئی ہے۔ مارشل لا جاری ہونے کے جلد ہی بعد میں نے کراچی کی ایک پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ اگر کشمیر اور نہروں کے پانی کے مسئلے صلح صفائی سے طے ہو جائیں تو نئی حکومت کوئی ایسی تدبیر سوچنے کے قابل ہوگی کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں امن چین کے ساتھ رہ سکیں۔ میں نے حقیقت پسندانہ جذبے کے ساتھ ان دونوں مسئلوں کو حل کرنے کی ٹھان لی۔

دریائے سندھ اپنے پانچ بڑے معاونوں کے ساتھ دنیا کے عظیم دریائی نظاموں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے پانی کا سالانہ بہاؤ دریائے نیل سے دگنا اور دجلہ وفرات کے مجموعی بہاؤ سے تگنا ہے۔ اس کی مقدار تقریباً سترہ کروڑ ایکڑ فیٹ ہے یا یوں کہئے کہ اتنا پانی جس سے فرانس یا امریکی ریاست ٹیکساس کا پورا رقبہ ایک فٹ گہرائی میں ڈوب جائے۔ ان دریاؤں کے آبپاشی کے نظام سے جس کی ترقی پچھلے سو برس کی کوششوں کا نتیجہ ہے، پاکستان کے چار کروڑ اور ہندوستان کے ایک کروڑ باشندے یا یوں سمجھئے کہ دونوں ملکوں کی مجموعی آبادی کا تقریباً دسواں حصہ اپنی روزی حاصل کرتا ہے۔ دریائے سندھ کے طاس کی آب پاشی کا نظام دنیا میں سب سے بڑا نظام ہے۔ یہ تین کروڑ ایکڑ زمین کو سیراب کرتا ہے۔ یہ مصر اور سوڈان کے اس رقبے سے بڑا ہے جسے نیل سیراب کرتا ہے۔

جب 1947ء میں ملک تقسیم ہوا تو ہمارے آبپاشی کے چند بڑے بڑے نظاموں کے ہیڈ ورکس ہندوستانی علاقے ہی میں رہ گئے۔ مرکزی باری دوآب کی تمام نہریں اور وادی ستلج کے پروجیکٹ، پانی کی بہم رسانی کے لئے ان ہیڈ ورکس اور ان دریاؤں کے محتاج تھے، جن پر ہندوستان کا قبضہ تھا۔ دریائے ستلج دریائے بیاس اور دریائے راوی جن کا پانی ان نہروں میں آتا تھا ان کے منبعے ہندوستان میں تھے اور وہ پاکستان میں داخل ہونے سے پہلے ہندوستانی علاقے کے لمبے لمبے فاصلے طے کرتے تھے۔

تقسیم کے تھوڑے ہی دن بعد ہندوستان کو ہماری نہروں کے پانی کی سپلائی روک دینے کی سوجھی۔ اس کے اس شدید اقدام نے ہمارے لئے بڑی نازک صورتحال پیدا کر دی۔ آخر چند شرائط کے تحت پانی کھول دیا گیا۔ ہمارے لئے ان شرائط کو مان لینے کے سوا چارہ نہ تھا۔ کیونکہ دوسری صورت میں ہمارے وسیع زرخیز علاقے تباہ وبرباد ہو جاتے۔ یہ مسئلہ اس بات سے اور بھی پیچیدہ ہو گیا کہ اس وقت تک سندھ کے طاس کا آبپاشی کا نظام پانی کے جمع شدہ ذخیروں پر نہیں بلکہ مطلقاً دریا کے بہاؤ پر قائم تھا۔ پانی کی بہم رسانی موسمی تبدیلیوں ہی پر موقوف نہ تھی بلکہ سال بہ سال بدلتی رہتی تھی کیونکہ اس کا دارومدار ہمالیہ کے بالائی سلسلوں میں ہونے والی بارشوں پر تھا۔

ہندوستان ستلج، بیاس اور راوی کے سارے پانی اور غالباً چناب کے کچھ پانی کو اپنے استعمال کے لئے ہتھیانے کی فکر میں تھا چونکہ ان دریاؤں کا پانی اس کے علاقے سے ہو کر پاکستان آتا تھا، اس لئے ہمیں اس سے محروم کر دینا اس کے اختیار میں تھا۔ پانی کے اس طرح بہ آسانی دستیاب ہو جانے کی توقع میں اس نے سوچا کہ سارا پانی ہی فوری اقتصادی ترقی کے لئے استعمال کرے۔ چنانچہ اس نے انجینئری کی بھاری تعمیرات کا کام شروع کر دیا جس کا صرف ایک ہی نتیجہ ہو سکتا تھا، وہ یہ کہ پاکستان کے لمبے چوڑے علاقے پورے کے پورے ویران ہو جائیں۔

دریائے سندھ کے نظام کے پانی کی حصہ داری برسوں سے جھگڑے کا سبب بنی ہوئی ہے۔ تقسیم سے پہلے سندھ

Marfat.com

اور پنجاب کے صوبوں میں پانی کے حق میں ہمیشہ اختلاف رہا کرتا تھا۔ تقسیم کے وقت پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جو حد کھینچی گئی وہ سندھ کے نظام کے عین بیچ میں سے ہو کر گزرتی تھی۔ دریاؤں کا زیریں حصہ پاکستان کو ملا اور اس کی آبپاشی کی بڑی بڑی نہروں میں سے دو کے ہیڈ ورکس سرحد کے اس پار ہندوستان میں رہ گئے اس طرح پانی کے استعمال کی شراکت ایک بین الاقوامی مسئلہ بن گئی۔ یہ 1900ء یا 1906ء کی بات ہے۔ میں اس وقت کمانڈر انچیف تھا ان دنوں اخبارات میں دریائے سندھ کے طاس کے جھگڑے کا بڑا چرچا ہو رہا تھا۔ ہندوستان والے ہماری نہروں کا پانی بند کر دینے پر تلے ہوئے نظر آتے تھے۔ اگر پانی بند ہو جاتا تو عجب نہ تھا کہ پاکستان اور ہندوستان میں جنگ چھڑ جاتی۔ مجھے اس مسئلے کا کچھ زیادہ علم نہ تھا اور پوری واقفیت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس پر مغربی پاکستان کی حکومت نے اپنے دو انجینئر میرے پاس بھیجے جنھوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ اس معاملے کو مجھ پر واضح کر دیا۔

مجھے سب سے زیادہ پریشانی پاکستان کے غیر محفوظ ہونے کی تھی۔ ہمارے دریاؤں کے ہیڈ ورکس بھی ہندوستان میں تھے اور منبعے بھی۔ ہندوستان نے پانی کا رخ بدل دینے کے انتظامات کر رکھے تھے، اور ہندوستانی فوج ہماری فوج سے تگنی تھی۔ میں نے دل میں کہا اگر ہندوستان کے ساتھ ہماری بات چیت کا سلسلہ ٹوٹ جائے اور ہندوستان والے دریاؤں کا رخ بدلنے کا فیصلہ کر لیں تو ہمیں جنگ کا سامنا کرنا ہو گا۔ ہر بات ہمارے خلاف پڑتی تھی اس لئے مصلحت اسی میں تھی کہ ہندوستان سے سمجھوتہ کر لیا جائے خواہ اس میں ہمیں کچھ خسارہ ہی کیوں نہ اٹھانا پڑے۔ اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو ممکن ہے کہ اپنا سب کچھ کھو بیٹھیں۔

اکتوبر 1908ء میں انقلاب کے فوراً بعد میں نے اس مسئلے کا بڑے غور سے مطالعہ کیا اور اس کے تمام پہلوؤں سے آگاہی حاصل کی پھر میں نے بڑے مضبوط ارادے کے ساتھ چند قطعی فیصلے کئے۔ مئی 1909ء تک اس مسئلے کے تمام پہلو روشن اور اہم نکات واضح ہو چکے تھے۔ عالمی بینک ایک ایسے مرحلے پر پہنچ گیا تھا کہ وہ قطعی طور پر کوئی پیشکش کر سکے۔ اس نے اصول تلاش کر لئے تھے جن پر نہری پانی کے معاہدے کی بنیاد رکھی جا سکتی تھی۔ عالمی بینک نے نئے بند وغیرہ تعمیر کرنے کے بارے میں ہمارا مطالبہ منظور کر لیا تھا۔ یہ اس سمجھوتے کا ایک جزو تھا جس کی رو سے ہندوستان کو ہمیں مالی امداد دینی تھی۔ عالمی بینک کے وفد نے جس کے سربراہ اس بنک کے صدر یوجین بلیک تھے، ہمیں منگلا بند کی تعمیر نیز بعض ہیڈ ورکس اور متبادل سمتوں کو جانے اور دریاؤں کے سلسلے کو ملانے والی نہروں کی پیشکش کی۔ انہوں نے جہلم کے قریب رہتاس کے مقام پر ایک اور بند بنانے کی پیشکش بھی کی۔ اس عظیم تعمیری کام کے اخراجات کا بار زیادہ تر دوست ممالک مثلاً ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو اٹھانا تھا اور کچھ ہندوستان اور کچھ پاکستان کو۔ لیکن یوجین بلیک سے اپنی گفت و شنید کی کیفیت قلم بند کرنے سے پہلے میں اپنے فنی ماہروں اور منتظموں کی مخالفت کا حال بیان کر دینا چاہتا ہوں جس سے مجھے دوچار ہونا پڑا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ انہیں صورتحال کی نزاکت کا پورا پورا احساس نہیں ہے اور ایسی صورت میں کہ ہماری حالت ہر لحاظ سے کمزور ہے، وہ انہونی باتوں کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ وہ بزور اپنی پالیسی منوانے کی بھی کوشش کر رہے تھے اور معاملے کو اس کی انتہائی حد تک لے جانا چاہتے تھے۔ تقریباً تیس، چالیس آدمی لاہور کے گورنمنٹ ہاؤس میں جمع ہوئے جہاں میں نے ان سے خطاب کیا۔ میں نے کہا:

Marfat.com

''صاحبو! یہ مسئلہ ہمارے لئے بڑے دوررس نتائج کا حامل ہے۔ میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہر بات پاکستان کے خلاف پڑتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمیں اپنے حقوق سے دست بردار ہو جانا چاہئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ اگر ہم کوئی ایسا حل تلاش کرلیں جس کے ذریعے ہم زندہ رہ سکیں، تو ایسے حل کو منظور نہ کرنا سخت بے وقوفی کی بات ہوگی۔ یہ بات میں آپ لوگوں سے نہیں بلکہ حقیقت میں اپنے آپ سے کہہ رہا ہوں، کیونکہ اس حل کی ذمہ داری مجھے لینی ہوگی۔

''چونکہ آپ میں سے کسی پر بھی اس کی ذمہ داری نہیں ہوگی، اس لئے میں صاف صاف بتلا دینا چاہتا ہوں کہ پالیسی بھی میری ہی ہوگی فنی تفصیلات کے سلسلے میں جب کبھی مجھے کوئی شک ہوگا تو میں آپ حضرات سے مشورہ طلب کروں گا، لیکن اگر آپ میں سے کسی نے میری پالیسی میں دخل دیا، تو میں خود اس سے سمجھ لوں گا اگر اس مسئلے کو سمجھ بوجھ کے ساتھ حل نہ کیا گیا، تو عجب نہیں کہ ملک ہی کا خاتمہ ہو جائے۔ میں نے جو کچھ کہا ہے اس کا ایک ایک لفظ صحیح ہے، اس لئے اس کے بارے میں آپ میں سے کسی کو کوئی غلط فہمی نہیں رہنی چاہئے''۔

میرا خیال ہے کہ وہ میرا مطلب سمجھ گئے۔

یوجین بلیک کی پیشکش ساٹھ کروڑ ڈالر کے لگ بھگ تھی۔ اس پر میں نے اپنے فنی مشیروں سے صلاح مشورہ کیا۔ ان سب کی یہ پختہ رائے تھی کہ منگلا کے مقام پر دریائے جہلم پر بند تعمیر کرنے کے علاوہ ہمیں تربیلا کے مقام پر بھی بند بنانے کی ضرورت ہوگی تاکہ اس میں دریائے سندھ کا فالتو پانی جمع کیا جا سکے۔ اس سے نہ صرف نئے انتظامات کے لئے پانی مہیا ہوگا بلکہ ترقی کے کاموں کے لئے بھی کچھ پانی مل سکے گا، خصوصاً سندھ کی نہروں کے لئے چنانچہ رہتا اس میں بند کی تعمیر سے ہماری مشکل حل نہ ہوتی تھی۔ اس طرح تعمیر کی لاگت بقدر بیس کروڑ ڈالر بڑھ جاتی تھی۔ یہ بڑی خطیر رقم تھی۔ میں جانتا تھا کہ یوجین بلیک جب سنیں گے تو بھنا جائیں گے۔ ہوا بھی یہی، لیکن میں نے یہ الفاظ ان سے کہے جو مجھے اب تک یاد ہیں:

''میں نے ان علاقوں کا دورہ کیا ہے جن پر ہندوستان کے پانی روکنے کا اثر پڑنے کو ہے۔ ان علاقوں کے لوگوں نے مجھ سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ اگر ہمیں بھوک اور پیاس سے مرنا ہے تو اس سے کہیں بہتر ہے کہ ہم میدان جنگ میں جان دیں۔ ان لوگوں کو توقع ہے کہ میں انہیں اس کا موقع ضرور دوں گا۔ ہمارے فوجی جوان اور دوسرے سب لوگ بھی اسی خیال کے ہیں چنانچہ اگر تم نے دست گیری نہ کی تو سارے ملک میں اس سرے سے لے کر اس سرے تک آگ لگ جائے گی۔ یہ انسانی ہمدردی کا ایک سنگین مسئلہ ہے جس سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔

''ہم سے جو سودا کیا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ ہماری نہروں میں جو پانی قدرتی طور پر بہہ کر آتا ہے ہم اس سے ہاتھ دھو بیٹھیں، اور اس کے بدلے میں پانی کے ذخیرے پر قناعت کریں اور پانی کے بند کی یہ کیفیت ہے کہ جیسے ہی وہ بن کر تیار ہوتا ہے اس میں گار جمنی شروع ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں ہمیں ان بندوں اور سلسلہ ملانے والی نہروں کی تعمیر میں دس یا اس سے بھی زیادہ برس لگ جائیں گے اور اتنے ہی عرصے کے لئے ہم اپنی ترقی کی راہ میں پیچھے رہ جائیں گے۔ جتنی محنت اس کام میں صرف ہوگی اسے ہم دوسرے تعمیری کاموں میں لگا سکتے ہیں۔ چنانچہ درحقیقت ہم بڑی قربانیاں کر رہے ہیں۔

''میں جانتا ہوں کہ بعض ممالک بہ کمال مہربانی ہماری امداد کر رہے ہیں۔ لیکن جب تک ہمیں نئے انتظامات کی

Marfat.com

ضرورتوں کے علاوہ دوسری ضرورتوں کیلئے پانی نہیں ملے گا' ملک میں ابتری پھیل جائے گی۔ اس لئے تربیلا ڈیم کی تعمیر ہمارے لئے اشد ضروری ہے۔''

یوجین بلیک نے کہا، آپ نے میرے کام کو سخت مشکل بنا دیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں امداد دینے والی حکومتوں کو بیس کروڑ ڈالر کی مزید رقم دینے پر کس طرح رضامند کر سکوں گا۔ آپ مجھے سوچنے کیلئے کچھ وقت دیں۔ میں نے کہا: ''جو بات ایسی صاف اور کھلی ہو' اس پر سوچنے کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے۔'' غرض ہم ہر پھر کر بار بار اس مسئلے پر بحث کرتے رہے۔ آخر کار وہ ہمارے مطالبے کی حمایت پر تیار ہو گئے۔ انہوں نے کہا: میں امداد دینے والے ملکوں سے زائد رقم کی درخواست کروں گا جو رہتاس کے بجائے تربیلا ڈیم کے بنانے میں خرچ کرنی ہو گی۔ انجام کار ہم سے چوہتر (74) کروڑ ڈالر سے زائد رقم کا وعدہ ہو گیا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس سے پہلے چودھری محمد علی دس سے لے کر پندرہ کروڑ ڈالر پر قبضہ کرنے کو تیار تھے اور یہ رقم بھی انہیں قرض کی صورت میں ملتی۔

ہمیں دوست ممالک اور یوجین بلیک کا شکر گزار ہونا چاہئے' جنہوں نے اس کام میں ہماری مدد کی۔ بعد ازاں انہوں نے لاگت بڑھ جانے کی وجہ سے تربیلا کی تعمیر کیلئے پینتیس (35) کروڑ ڈالر یا اس کے برابر رقم اور دینے کا وعدہ کیا۔ اس رقم کے دلانے کا سہرا جارج ووڈز کے سر ہے' جو یوجین بلیک کے بعد عالمی بینک کے صدر مقرر ہوئے تھے۔

سندھ کے معاہدہ آب کی بنیاد دریاؤں کی تقسیم پر رکھی گئی ہے۔ اس معاہدے کے رو سے دس برس کی عبوری مدت کے بعد جو پاکستان کی درخواست پر تین برس تک اور بڑھائی جا سکتی ہے' تین مشرقی دریا...... راوی، بیاس اور ستلج، بلاشرکت غیرے ہندوستان کے حصے میں چلے جائیں گے۔ اس کے برعکس تین مغربی دریاؤں...... سندھ، جہلم اور چناب، کا پانی بلاشرکت غیرے پاکستان کو مل سکے گا۔ البتہ ہندوستان کو اجازت ہو گی کہ وہ اسے مقبوضہ کشمیر، مشرقی پنجاب اور ہماچل پردیش کے منبع کی طرف کے علاقوں میں محدود طور پر استعمال کر سکے۔ اس عبوری مدت میں پاکستان آبیاری کا ایک نیا نظام تعمیر کرے گا' جس سے مغربی دریاؤں کا پانی اس نہری آب پاشی کیلئے استعمال کیا جا سکے گا' جو اب تک مشرقی دریاؤں کے پانی سے ہوتی تھی۔

سندھ کے نظام آبیاری کا پروگرام دنیا میں اپنی قسم کا سب سے بڑا پروگرام ہو گا۔ اس پر ایک ارب سات کروڑ ڈالر لاگت آئے گی۔ جس میں سے ستاسی کروڑ ڈالر پاکستان میں خرچ کئے جائیں گے۔ اس نظام میں دو بڑے بند پانی جمع کرنے کیلئے بنائے جائیں گے۔ ایک دریائے جہلم پر جس کے پانی کے ذخیرے کی مقدار سینتالیس لاکھ پچاس ہزار ایکڑ فٹ ہو گی۔ دوسرا بالائی سندھ پر جس کے پانی کے ذخیرے کی مقدار بیالیس لاکھ ایکڑ فٹ ہو گی۔ علاوہ ازیں پانچ بند اور آٹھ سلسلہ ملانے والی نہریں ہوں گی' جن کی مجموعی لمبائی تقریباً چار سو میل ہو گی۔ ان نہروں کے ذریعے مغربی دریاؤں کا پانی ان علاقوں میں پہنچ سکے گا جنہیں پہلے مشرقی دریا سیراب کیا کرتے تھے۔ یعنی یہ نہریں مرکزی باری دوآب اور وادی ستلج کی نہروں کے بجائے انہی کے علاقوں میں پانی بہم پہنچائیں گی۔ جہلم ڈیم پر پاور اسٹیشن قائم کئے جائیں گے جو آٹھ لاکھ کلوواٹ سے زیادہ بجلی پیدا کر سکیں گے۔ ان کے علاوہ ٹیوب ویل لگائے جائیں گے اور پانی کی نکاسی کا بندوبست کیا جائے گا تاکہ آب پاشی کے علاقے میں جس کا رقبہ پچیس لاکھ ایکڑ ہے' سیم اور تھور کا تدارک ہو سکے۔ جب تک اس نظام کی

Marfat.com

تعمیر کا کام جاری رہے گا' ہندوستان طے شدہ پروگرام کے تحت مشرقی دریاؤں کا پانی دیتا رہے گا۔ اس پروگرام میں پاکستان کی بعض ترقیاتی ضرورتوں کو بھی پیش نظر رکھا جائے گا۔

ان طویل مذاکرات کے دوران میں یہ بات ظاہر ہوگئی کہ پاکستان اور ہندوستان میں آبیاری کے اس نظام پر جس کو دونوں حکومتوں نے باہمی سمجھوتے کے تحت منظور کرلیا ہے' اس قدر زیادہ لاگت آئے گی کہ وہ ان دونوں ملکوں کی بساط سے کہیں باہر ہوگی۔ اس پر عالمی بینک نے اس سارے پروگرام پر روپیہ لگانے کیلئے ''طاس سندھ کی ترقیات کا فنڈ'' کے نام سے ایک فنڈ قائم کیا۔ ہندوستان نے اس فنڈ میں سترہ کروڑ چالیس لاکھ ڈالر دینے کا ذمہ لیا۔ پاکستان میں اس نئے نظام آبپاشی کی تعمیر پر جو لاگت آئے گی وہ اس طاس سندھ کے فنڈ سے دی جائے گی۔

اس معاہدے کی تفصیلات سے ظاہر ہے کہ سندھ کے نظام آبیاری کے مجموعی پانی میں سے اسی (80) فیصدی پاکستان کو ملے گا اور بیس فیصدی ہندوستان کو۔ اس معاہدے پر 19 ستمبر 1960ء کو کراچی میں' میں نے' مسٹر نہرو نے اور عالمی بینک کے وائس پریذیڈنٹ آئلف نے دستخط کئے۔

جیسا کہ میں نے اس معاہدے پر دستخط کرنے کے وقت اپنی قوم سے بیان کیا تھا' یہ حل جسے انجام کار ہم نے منظور کرلیا' ایسا تو نہ تھا جسے مثالی کہا جاسکتا' لیکن موجودہ حالات میں اس سے بہتر بھی ممکن نہ تھا۔ یہ نہ بھولئے کہ اس جھگڑے نے ایسی نازک صورت اختیار کرلی تھی کہ اس پر برصغیر میں جنگ چھڑ جانے میں کوئی کسر باقی نہ رہ گئی تھی۔ چنانچہ اس خطرے نے 1951ء میں عالمی بینک کو ہمارے جھگڑے میں ثالث بننے پر مجبور کردیا تھا۔ ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا کہ ہم سچے دل اور پکے ارادے کے ساتھ اس جھگڑے کا، جو دو ملکوں کے امن کو ملیا میٹ کیا چاہتا تھا، معقول حل تلاش کرنے میں عالمی بینک کا ہاتھ بٹائیں، کوئی ایسا حل جو ہم کو زندہ رکھ سکے، جو ہمارے لئے مالی اور فنی وسائل مہیا کردے، جن سے کام لے کر ہم مغربی دریاؤں کا پانی اپنی نہروں میں لانے کا انتظام کرسکیں اور ہماری نہریں مشرقی دریاؤں کی محتاج نہ رہیں۔

سال ہا سال کی نہایت پیچیدہ گفت وشنید، صبر آزما ردوکد اور لیت ولعل، اور آئے دن کے تعطل کے بعد' ہمیں ایک ایسا حل مل گیا تھا، جو میرے خیال میں مناسب تھا۔ ہرچند اس معاہدے پر دستخط ہوجانا کوئی ایسی بات تو نہ تھی جس پر خوشی کے شادیانے بجائے جاتے' تاہم یہ احساس بھی کچھ کم موجب اطمینان نہ تھا کہ ایک نہایت بھیانک صورتحال ٹل گئی۔

جب انسان اس قسم کے نازک مسئلے سے دوچار ہوتا ہے تو اسے حقیقت پسند بننا اور صورت حال پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا ہی پڑتا ہے تاکہ وہ اس کے حل کی کوئی معقول صورت نکل سکے۔ اکثر اوقات سارے کی طلب میں انسان آدھے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ ہم نے مثالی حل کی جستجو ترک کردی، حالات پر مجموعی حیثیت سے نظر ڈالی' حقیقت پسندانہ غوروخوض کیا، اور حل کو اچھا سمجھ کر قبول کرلیا۔ اگر ہم ایسا نہ کرتے تو ممکن تھا کہ ہم ایک ایسے وقت جنگ میں الجھ جاتے جبکہ حالات کسی لحاظ سے ہمارے لئے سازگار نہ تھے۔ چنانچہ جہاں تک ہمارا تعلق تھا، اس عہدنامے کی بنیاد حقیقت پسندی اور عملی اصول پر رکھی گئی تھی۔ جذبات کو اس میں دخل نہ تھا' اور نہ ہوسکتا تھا کیونکہ اس حل سے لاکھوں انسانوں کا مستقبل اور عافیت وابستہ تھی۔ میں پریذیڈنٹ بلیک، وائس پریذیڈنٹ آئلف اور عالمی بینک کے فنی ماہروں کی جماعت کی کوششوں کو،

Marfat.com

جس کے سربراہ جنرل وہلر تھے، سراہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ انہوں نے اس جھگڑے کو ایک فنی اور انسانی مسئلے کی صورت بخش دی اور اس کا درجہ سیاسی نزاع کی سطح سے بلند کر دیا۔" (فرینڈز ناٹ ماسٹرز صفحہ 177 تا 186)

اس دور میں مسئلہ کشمیر کے حوالے سے جو پیشرفت سامنے آتی ہے اس سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ بھارت نے سوائے اس مسئلے کو لمبا کھینچنے اور حیل و حجت کرنے کے اور کوئی کارہائے نمایاں انجام نہیں دیا۔ اقوام متحدہ میں مسئلہ کشمیر 1953ء تک زیر بحث رہا...... لیکن معاملات گفتند' نشستند' برخاستند سے آگے نہ جا سکے۔ 1953ء میں محمد علی بوگرہ نے پاکستان کی وزارت عظمیٰ کا قلمدان سنبھالتے ہی کہا کہ دونوں ممالک کے درمیان تعلقات کی بہتری بہت ضروری ہے تاکہ تنازعات حل کئے جا سکیں بھارت نے پاکستانی وزیراعظم کے نقطہ نظر سے اتفاق کیا۔

جون 1953ء میں لندن میں دولت مشترکہ کی کانفرنس ہوئی اس موقع پر دونوں ممالک کے وزراء اعظم نے مسئلہ کشمیر کے حل کیلئے باہمی مذاکرات کئے اور اقوام متحدہ کے کمیشن برائے پاک و ہند کے اختلافات کا تصفیہ کرنے کیلئے مذاکرات جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے بعد دونوں ممالک کے وزرائے اعظم کے درمیان دوسری ملاقات 25 تا 27 جولائی 53ء کو کراچی میں ہوئی۔ بھارتی وزیراعظم پنڈت نہرو کراچی کے دورے پر آئے تھے۔ اس ملاقات میں بھی مسئلہ کشمیر پر گفتگو ہوئی۔ (تنازعہ جموں کشمیر قرطاس ابیض وزارت خارجہ جنوری 1977ء ص 230)

8 اگست 1953ء کو مقبوضہ جموں و کشمیر کے وزیراعظم شیخ محمد عبداللہ کو ڈرامائی انداز میں برطرف کر کے ان کی جگہ بخشی غلام محمد کو وزیراعظم مقرر کیا گیا اس کے نتیجے میں وادی کشمیر میں بھارت کے خلاف شدید ردعمل ہوا بھارتی حکومت نے عوامی احتجاج کی لہر کو اندھا دھند گولیاں چلا کر روکنے کی کوشش کی۔ شیخ عبداللہ کی گرفتاری نے بھارت کی اخلاقی پوزیشن کو بُری طرح متاثر کیا، کیونکہ پنڈت جواہر لال نہرو کا کہنا تھا کہ شیخ عبداللہ "کشمیری عوام کی آواز ہے" نہرو یہ بات اس بنیاد پر کہتے تھے کہ شیخ عبداللہ نے الحاق بھارت کو تسلیم کر لیا تھا لہٰذا اب استصواب رائے کی کوئی ضرورت نہیں ہے شیخ عبداللہ کی گرفتاری پر پاکستان نے سخت الفاظ میں احتجاج کیا۔ پاکستانی وزیراعظم محمد علی بوگرہ نے پنڈت نہرو سے فوری ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ 17 تا 20 اگست 1953ء کو دونوں وزراء اعظم کے درمیان دہلی میں ملاقات ہوئی' چار روزہ مذاکرات کے بعد ایک مشترکہ اعلامیہ جاری کیا گیا' اعلامیے میں کہا گیا تمام مسائل کو پرامن ذرائع سے حل کیا جائے گا۔" کشمیر کے متعلق اعلامیہ میں کہا گیا کہ "مسئلہ کشمیر پر تفصیل کیساتھ بات چیت ہوئی"۔ دونوں وزراء اعظم کا خیال ہے کہ مسئلہ کشمیر کو کشمیری عوام کی خواہشات کے مطابق حل کیا جائے گا عوام کی خواہشات کو جانچنے کا سادہ اور آسان طریقہ آزادانہ اور غیر جانبدارانہ رائے شماری ہے۔ اس نوع کی رائے شماری کے انعقاد کا فیصلہ چند سال پیشتر کیا گیا تھا مگر اس ضمن میں کوئی خاص پیش رفت نہ ہو سکی جس کی بنیادی وجہ دونوں حکومتوں کے درمیان رائے شماری کے طریقہ کار پر اختلافات کا پایا جانا تھا۔

دونوں وزرائے اعظم نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ ان بنیادی اختلافات پر قابو پانے کیلئے تجاویز پر براہ راست غور کریں گے تاکہ اس مسئلے کو جلد از جلد نمٹایا جا سکے۔ بنیادی امور پر اتفاق رائے کے بعد فوری طور پر منتظم رائے شماری کی

Marfat.com

تقرری کردی جائے گی رائے شماری کے منتظم کی تقرری ہماری توقع کے مطابق اپریل 1954ء تک عمل میں آجائے گی مگر اس سے پہلے دونوں وزرائے اعظم بنیادی اختلافات طے کرنے کے بعد رائے شماری کے ضمن میں ایک مشترکہ لائحہ عمل ترتیب دیں گے ان بنیادی امور کو طے کرنے کیلئے فوجی اور سیاسی امور کے ماہرین کی ایک کمیٹی تشکیل دی جائے گی جو دونوں وزراءاعظم کی معاونت کرے گی۔

منتظم رائے شماری اپنی تقرری کے بعد پوری ریاست کی صورت حال کا جائزہ لے کر دونوں حکومتوں کو رائے شماری کے سلسلے میں تجاویز پیش کرے گا تا کہ ریاست جموں وکشمیر میں آزادانہ اور غیر جانبدارانہ رائے شماری کا انعقاد ممکن ہو۔ (قرطاس ابیض ص 30-31)

مذاکرات کی بات ہوئی حالانکہ مسئلہ کشمیر اقوام متحدہ کے ایجنڈے پر موجود تھا۔

اس اعلامیے کے بعد یہ امید پیدا ہوئی تھی کہ اب شاید یہ مسئلہ حل ہو جائے کیونکہ اعلامیے میں دونوں ممالک نے کشمیریوں کو حق خودارادیت دینے کے وعدے کی تجدید کی تھی۔

پاکستان میں ان مذاکرات اور اعلامیے پر دلچسپ صورت حال پیدا ہوئی پاکستانی ذرائع ابلاغ نے ان مذاکرات کے خلاف سخت تنقید کی دوسری طرف آزاد کشمیر کے سیاسی راہنماؤں نے کراچی میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''بھارت اپنے حقیقی عزائم پر پردہ ڈالنے کیلئے تاخیری حربوں سے کام لے رہا ہے ہمیں نہایت ہی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ دہلی کی حکومت نے اس اعلامیہ کے ذریعے اپنے حقیقی عزائم پر پردہ ڈال دیا ہے اس کے سوا اس اعلامیہ کی اور کچھ افادیت نہیں کہ رائے شماری کے وعدے کو مزید طول دیا گیا ہے۔''

گو کہ ان مذاکرات میں دونوں حکومتوں نے اقوام متحدہ کے کردار کو مکمل طور پر نظر انداز کیا مگر اسکے باوجود اقوام متحدہ نے امید ظاہر کی کہ دونوں ممالک کشمیر کو باہمی مذاکرات کے ذریعے پرامن طریقے سے حل کرلیں گے۔

وزیراعظم بوگرہ اس اعلامیہ کو مسئلہ کے حل کی جانب بڑا اہم قدم قرار دیتے تھے انہوں نے مذاکرات کے بعد نئی دہلی میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''بڑے بھائی بہت فراخدل'' ثابت ہوئے اگرچہ بوگرہ کی یہ کامیابی محض جزوی تھی لیکن انہوں نے زبردست جوش وخروش کا مظاہرہ کرتے ہوئے بھارتی عوام سے اپیل کی کہ وہ ''ماضی کو بھول جائیں'' انہوں نے کشمیر میں جہاد کی باتیں کرنے والوں کو غیر ذمہ دار قرار دیا۔ حتیٰ کہ بوگرہ نے دفاع اور خارجہ امور میں مشترکہ پالیسیوں کی تشکیل کا بھی تذکرہ کیا۔''

دوسری طرف اسی دوران بھارت شیخ عبداللہ کی گرفتاری سے پیدا ہونے والی بے چینی کو معمول پر لانے میں کامیاب ہوگیا۔ وزیراعظم محمد علی بوگرہ نے واپس پاکستان آ کر 21 اگست کو کابینہ کے اجلاس میں انکشاف کیا کہ نہرو کسی امریکی یا روسی باشندے کو ناظم رائے شماری کے طور پر مقرر کرنے کے سخت خلاف ہیں۔ وہ کشمیر میں اتنی فوج رکھنا چاہتے ہیں تا کہ تبت کی طرف سے کسی مداخلت کو روکا جا سکے۔ وہ رائے شماری سے قبل کسی بھی مہاجر کی ریاست میں واپسی کو برداشت نہیں کریں گے۔

Marfat.com

ان مذاکرات کے بعد دونوں وزرائے اعظم کے درمیان ایک طویل مراسلت شروع ہوئی بھارتی وزیراعظم نے اپنے پہلے خط میں لکھا کہ ''کشمیر کے معاملے میں کوئی بدروح ہمارا پیچھا کر رہی ہے۔'' صرف 12 دن گزرنے کے بعد نہرو نے اپنے وعدوں سے پھرنے کے بہانے تراشنے شروع کردیئے بالآخر وہ استصواب رائے کے وعدے سے منحرف ہوگئے۔ 3 ستمبر 1953ء کو نہرو نے وزیراعظم پاکستان کو لکھا:

''بھارت میں ہم نے عالمی امور کے بارے میں ایک واضح اور ٹھوس رویہ اختیار کیا ہے ہم نے ان تنازعات میں خود کو ملوث کرنے یا کسی بڑی طاقت یا کسی بلاک سے اپنے ملک کو وابستہ کرنے سے مسلسل انکار کیا ہے۔ اگر کشمیر کو بڑی طاقتوں کے درمیان تنازعہ کا اکھاڑہ بنایا گیا تو نہ صرف بھارت اور پاکستان بلکہ خود کشمیر کے باشندے بھی صرف ثانوی کردار ادا کریں گے۔ مجھے نہیں معلوم کہ پاکستان اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے درمیان فوجی معاہدہ یا امداد کے بارے میں موجودہ پوزیشن کیا ہے لیکن ذمہ دار اخبارات کا کہنا ہے کہ امریکہ پاکستان کو بڑے پیمانے پر فوجی امداد' سازوسامان' اسلحہ اور ٹریننگ دے گا۔ یہ بھی بتایا گیا ہے (نیویارک ٹائمز کا کہنا ہے) کہ پاکستان میں اس طرح دس لاکھ فوج کو ٹریننگ دی جائے گی۔ بلاشبہ امریکہ کا خیال ہے کہ ان فوجوں کو کمیونسٹ ملکوں کے خلاف کسی بھی ممکنہ جنگ میں استعمال کیا جاسکے گا۔ بہرحال منشا خواہ کچھ بھی ہو یہ حقیقت ہے کہ پاکستان میں بڑے پیمانہ پر اسلحہ بندی اور فوجی توسیع کی جارہی ہے جو یقیناً بھارت میں ردعمل کا باعث بنے گا۔ دونوں ملکوں کے درمیان نفسیاتی ماحول اور زیادہ خراب ہوجائے گا اور ہمارے درمیان ہر فیصلہ طلب معاملہ اس سے متاثر ہوگا۔ یہ معاملہ اتنی زیادہ اہمیت اور دوررس نتائج کا حامل ہے کہ اس باضابطہ رابطہ کے علاوہ (جو آپ سے قائم کرنے کیلئے ہم نے کراچی میں متعین اپنے ہائی کمشنر کو ہدایات کی ہے)، میں ایک مرتبہ پھر اس بارے میں آپ کو لکھ رہا ہوں۔ لازماً ہمارے درمیان زیرغور مسائل خصوصاً مسئلہ کشمیر پر اس کا اثر پڑے گا۔ ہم ریاست کشمیر سے فوجیں ہٹانے کے سوال پر عرصہ دراز سے تبادلہ خیالات کرتے رہے ہیں۔ اب اگر خود پاکستان میں بھاری اور تیز رفتار فوجی تیاریاں ہونے لگیں تو اس طرح پورے مسئلہ کی ہیئت ہی بدل جائے گی درحقیقت فوجیں ہٹانے کی یہ تمام گفتگو احمقانہ ہوجائے گی اگر امریکہ کی مدد سے پاکستان اس کے برعکس سمت بڑھتا رہا۔ (قرطاس ابیض ص 13)

مسٹر نہرو کے پیش کردہ مسئلہ کا مناسب طریقہ سے سامنا کرنے اور فوراً ان کے دلائل کی تردید کرنے کے بجائے وزیراعظم مسٹر بوگرہ نے 17 دسمبر 1953ء جوابی خط میں لکھا:

''ان خبروں میں کوئی صداقت نہیں کہ پاکستان امریکہ کے ساتھ فوجی معاہدہ کرنے والا ہے یا یہ کہ امریکہ پاکستان میں اپنے فوجی اڈے قائم کر رہا ہے۔ واقعہ صرف یہ ہے کہ پاکستان کو فوجی سازوسامان دینے کے بارے میں کچھ غیر رسمی گفت وشنید ہوئی ہے۔'' (قرطاس ابیض ص 25)

مسٹر نہرو نے 21 دسمبر کو جواب دیا:

''یہ واقعہ بین الاقوامی توجہ کا باعث بنا ہے کہ پاکستان کو فوجی امداد دینے کے متعلق کچھ گفت وشنید ہوئی ہے۔ ایسا کیوں ہے میں چاہتا ہوں کہ آپ اس پر غور کریں یقیناً ایسی کوئی غیرمعمولی بات ہے جس کا یہ نتیجہ نکلا ہے۔ اس قسم کی فوجی امداد لازمی طور پر جنوبی ایشیا کی صورت حال میں عظیم تبدیلی پیدا کرتی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ فوجی لحاظ سے پاکستان

Marfat.com

امریکہ سے منسلک ہے اور طاقتوں کے ایک گروپ سے اس کی وابستگی ہے اس سے مشرق وسطیٰ کی صورت حال بھی متاثر ہوئی ہے اور آپ نے دیکھا ہوگا کہ مشرق وسطیٰ کے ممالک میں اس پر کیا شدید ردعمل ظاہر ہوا ہے۔ یقیناً بھارت کو تو اس سے اور بھی گہری دلچسپی ہے کیونکہ اس سے ایک قطعاً نئی صورت حال پیدا ہونے کا امکان ہے اس قسم کی نئی صورت حال میں پاکستان کو موصول ہونے والی فوجی امداد کی مقدار پر اتنی منحصر نہیں ہوتی جتنی امداد کی اس آزادانہ حیثیت پر۔ اس سے موجودہ صورت حال میں تبدیلی ہوئی ہے۔ لہٰذا یہ امر بھارت و پاکستان کے تعلقات خصوصاً مسئلہ کشمیر کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس نئی صورت حال پر از سر نو اور مختلف بنیاد پر غور وخوض کرنا ہوگا۔ میں آپ کے اس خیال سے اتفاق کرتا ہوں کہ ہم نے اب تک جو بھی کامیابی حاصل کی ہے اس پر پانی پھر جانے کا خطرہ ہے۔ لیکن میں آپ کو اس بات پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہوں کہ اس کا ذمہ دار کون ہے یہ افسوسناک صورت حال پاکستان کو فوجی امداد دینے کیلئے امریکی تجویز کا براہ راست نتیجہ ہے۔''

اس مرحلہ پر وزیراعظم بوگرہ نے نہرو کو مطمئن کرنے کی کوشش میں ایڈمرل نمٹز کی جگہ (جو 3 ستمبر 1953ء کو مستعفی ہو چکے تھے) ایک نئے ناظم رائے شماری کے تقرر پر رضامندی ظاہر کی۔ مسٹر بوگرہ کے روانہ کردہ 24 فروری 1954ء کے خط میں یہ دلیل پیش کی گئی:

''آپ نے ایک غیر متعلقہ مسئلہ یعنی فوجی ساز و سامان کے متعلق امریکہ و پاکستان کی گفت وشنید کو تنازعہ کشمیر کے حل سے منسلک کیا ہے اور میری جانب سے دی جانے والی تمام یقین دہانیوں اور وضاحتوں کے باوجود آپ یہ کہتے ہیں کہ جس پس منظر کے ساتھ مسئلہ کشمیر حل کیا جانا تھا اس پورے پس منظر میں اس گفت وشنید اور اس کے نتیجہ میں پاکستان کو امریکہ کی طرف سے امداد ملنے کے امکانات کی وجہ سے تبدیلی آگئی ہے میرے خیال میں یہ ایک بالکل غیر معمولی پوزیشن ہے کہ ایسے اقدامات کو جن کا مقصد محض پاکستان کا دفاع مضبوط کرنا ہے آپ ایک خطرناک صورت حال سے تعبیر کرتے ہیں۔ بہر حال مجھے یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوا کہ مذکورہ امر پر پاکستان و امریکہ کی گفت وشنید کو بھارت و پاکستان کے اختلافات کے تصفیہ کی راہ میں ایک اور رکاوٹ بنایا گیا ہے۔''

یوں مسئلہ کشمیر حل کرنے کی کوئی بھی گفت وشنید بے وقعت ہوگی نہرو نے یکم مارچ 1954ء کو بھارتی پارلیمنٹ میں ایک بیان دیا: (قرطاس ابیض ص 34-35)

''پاکستان کو دی جانے والی یہ امریکی امداد بھارت میں ہم لوگوں کیلئے اور افروایشیائی ممالک کیلئے ایک سنگین صورت حال پیدا کرتی ہے۔ اس سے ہمارے درمیان کشیدگیوں میں اضافہ ہوتا ہے اس سے بھارت اور پاکستان کے مابین مسائل کو حل کرنا اور بھی دشوار ہوگا بلکہ درحقیقت ماضی میں بھی دیگر ملکوں کے معاملات میں اس قسم کی مداخلت ہی ان کی تصفیہ کی راہ میں حائل رہی ہے۔ حال ہی میں بھارت اور پاکستان کے درمیان ایک نئی اور مزید دوستانہ فضا قائم ہونے لگی تھی اور دونوں وزراء اعظم کے مابین براہ راست تبادلہ خیالات سے مسائل کو حل کرنے کی طرف خاصا آگے بڑھا جارہا تھا لیکن اب آگے بڑھنے کی یہ رفتار رک گئی ہے اور نئی مشکلات پیدا ہوگئی ہیں۔ پاکستان کو دی جانے والی امریکی امداد ان مسائل میں ایک قسم کی مداخلت ہے جس کے اثرات ماضی میں کی جانیوالی دیگر اقسام کی مداخلت سے کہیں زیادہ دوررس

Marfat.com

نتائج کے حامل ہو سکتے ہیں۔''

5 مارچ 1954ء کو وزیر اعظم پاکستان کو مسٹر نہرو نے خط میں کہا:

''گزشتہ طویل عرصہ سے دونوں ممالک ان ضروری ابتدائی کارروائیوں کے بارے میں گفت وشنید کرتے رہے ہیں جن کے بغیر رائے شماری کی طرف کوئی قدم بڑھایا نہیں جا سکتا تھا۔ یہ ابتدائی کارروائیاں منجملہ دیگر امور کے کشمیر میں رکھی جانے والی فوجوں کی تعداد سے بھی متعلق تھیں لیکن اب جب کہ اسلحہ کے دباؤ نے گزشتہ پرامن اور باہمی تعاون کے رویہ کی جگہ لے لی ہے اور امریکہ سے پاکستان کو کثیر مقدار میں فوجی امداد حاصل ہو رہی ہے' فوجوں کی تعداد کے بارے میں اس سے قبل کی ہماری گفتگو اب کوئی مناسبت نہیں رکھتی۔ اب ہم ایسا کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے جس کا اس سے قبل ہم سامنا کرنے کو تیار نہ تھے۔ ہمیں ریاست کشمیر میں ایسی افواج اور ساز وسامان رکھنے کی مکمل آزادی دینا چاہئے جو ہم اپنے اس خطرہ کے پیش نظر ضروری سمجھتے ہیں۔ میں آپ سے پھر کہتا ہوں کہ امریکی فوجی امداد قبول کرنے کے پاکستانی فیصلہ نے تنازعہ کشمیر اور ایشیا میں صورت حال کو بالکل نیا رنگ دے دیا ہے۔''

یہ آخری خط مسئلہ کشمیر پر بھارتی پالیسی کا نیا سنگ میل تھا اس دوران بھارت نے طے کر لیا تھا کہ اقوام متحدہ یا براہ راست مذاکرات اور مراسلت سے جان چھڑا کر کشمیر کو بھارت کا ''اٹوٹ انگ'' بنا لیا جائے۔

پنڈت جواہر لال نہرو جو بظاہر سیکولر کبھی کمیونسٹ اور کبھی عجیب وغریب آزاد خیالی کے دعوے کرتے تھے اصل میں پکے براہمن تھے۔ جنرل ایوب خاں ان سے اس دور کے مذاکرات کے حوالے سے کہتے ہیں:

''ہمارے طرز عمل کو اس قسم کی غیر جانبداری کے ساتھ بڑی آسانی سے گڈمڈ کیا جا سکتا ہے، جسے ہندوستان نے پچھلی دہائی کے ابتدائی سالوں میں اپنا شعار بنا رکھا تھا' اور جو آخر میں دھڑام سے زمین پر آ رہی۔ اس میں اور ہمارے اس طرز عمل میں بنیادی فرق یہ ہے کہ وہ تو غیر جانب داری کا محض ایک انداز تھا جس کا بہتر سے بہتر مفہوم یہ تھا کہ کس طرح دونوں فریقوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے اور بدتر معنی میں اسے ریاکاری، منافقت اور حیلہ سازی کہا جا سکتا ہے۔ کچھ عرصے تک ہندوستان اپنی وسعت اور ایشیا میں اپنی جنگی اہمیت کے باعث' یہ ڈھونگ کامیابی سے رچائے رہا۔ اسکی غیر جانب داری اپنے کو بڑا ظاہر کرنے کی ایک کوشش اور اپنے اثر کو پھیلانے کا ایک حیلہ تھی۔ لیکن ہمارے دل میں ایسے مغالطے راہ نہیں پاتے۔ ہمارا مقصود تو بس یہ ہے کہ اپنے وسائل کو کفایت سے کام میں لائیں اور الجھاوؤں سے بچیں۔''

ہندوستان نے خود کو روشنی کے ایک مینار کے طور پر پیش کیا تھا جس کی روشنی بھٹکی ہوئی انسانیت کی ہدایت کیلئے دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ جب تک امریکہ اور سوویت یونین میں کشیدگی باقی تھی' وہ اپنا یہ بہروپ قائم رکھ سکتا تھا، اور دونوں کے درمیان ایک پل کا کام بھی دے سکتا تھا۔ چونکہ بڑی طاقتیں اپنی باہمی جدوجہد میں مصروف تھیں اور چین پر ابھی ہندوستانی ذہنیت کا انکشاف نہیں ہوا تھا' اس لئے ہندوستان لیڈروں کیلئے یہ ممکن تھا کہ فلسفے کا درس دیتے رہیں' اور اپنے چھوٹے چھوٹے ہمسایوں کے خلاف ہندوستان کے عزائم کی اعانت کریں۔ میرے خیال میں وہ اس کام میں حد سے بڑھ گئے اور خود فریبی میں آ گئے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا ان کے قول اور فعل میں زیادہ سے زیادہ تضاد پیدا ہوتا گیا اور اس کی تاویل کرنا مشکل سے مشکل تر ہو گیا۔

Marfat.com

عالمی طاقتوں اور اپنے ہمسایوں کے ساتھ ہمارا طرزِ عمل اس احساس پر مبنی ہے کہ ہماری بساط محدود ہے۔ ہمیں نہ تو اس کی خواہش ہے نہ مقدور کہ ہم ان کے جھگڑوں میں خود کو پھنسا لیں۔ ہم اس حیثیت میں نہیں ہیں کہ ان کے فیصلوں پر اثر ڈال سکیں یا ان کے مسائل کو سلجھا سکیں۔ چنانچہ ہماری خارجہ پالیسی کی بنیاد یہ ہے کہ ہم سیاسی اور اقتصادی لحاظ سے چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاتے ہیں۔ بس ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تاکہ ہم اپنے اندرونی معاملوں کو سلجھائیں، اپنی قوم میں زیادہ سے زیادہ اتحاد پیدا کریں۔ ان کی بھلائی کیلئے کوشاں ہوں اور اپنی سیاسی اور نظریاتی انفرادیت کو برقرار رکھ سکیں۔ اسی مفاہمت کے دائرے کے اندر رہ کر ہم دوسرے ملکوں کی امداد کے جویا ہیں۔ ہم ان سے ایسے مطالبات نہیں کرنا چاہتے، جن کا ماننا ان کیلئے مشکل ہو یا ان کے مقدور ہی میں نہ ہو۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ جلد اس حیثیت میں آ جائیں جہاں ہمیں زیادہ امداد کی ضرورت نہ رہے اور ہمارے مطالبات کم سے کم ہوتے چلے جائیں۔ نام نہاد غیر جانب داری کا مقصد ہے ایسی حیثیت اختیار کرنا جہاں زیادہ سے زیادہ سودے بازی کی جا سکے۔ ہمارا تصور دوسرے ملکوں سے باہمی تعلقات کی بابت یہ ہے کہ اپنے وسائل اور حیثیت کو دیکھ کر اور اپنی حدود میں رہ کر نیز دوسرے ملک کے وسائل اور مشکلات کا لحاظ کرتے ہوئے باہمی رابطہ قائم کیا جائے۔ ہم دوسروں سے سودے بازی کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ ہم ان سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ حتی المقدور ہماری مدد کریں گے اور اس کے بدلے میں ہم حتی المقدور ان کی مدد کریں گے۔

مجھ سے کہا گیا ہے کہ اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ بڑی طاقتوں اور خصوصاً اپنے ہمسایوں کے ساتھ ہمارے تعلقات محض سرسری سے ہوں گے اور اگر کل کلاں کو پاکستان پر کوئی مصیبت آئی تو کوئی اس کی مدد کو نہ پہنچے گا۔ میں اس بات کو مانتا ہوں لیکن ہمیں یہ ہرگز نہ بھولنا چاہئے کہ پاکستان کی حفاظت بہر صورت خود ہمیں کو کرنی ہے۔ کسی دوسرے ملک سے اس کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر ہمیں اپنی دفاعی تیاری اور دوسرے اقدامات کرنے ہوں گے۔ بڑی طاقتوں کے خود اپنے مسائل ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ حالات کے ساتھ ان کی پالیسیاں بھی بدل جائیں، اور انجام کار ہم خود کو بے یار و مددگار پائیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں خداوند تعالیٰ پر ہمارا بھروسہ ہماری آس بندھاتا ہے کیونکہ:

"دشمن اگر قوی ست نگہبان قوی تر است"

دو قوموں کے درمیان جو جنگ و جدال ہوتے ہیں اس سے دوسری قومیں الگ تھلگ نہیں رہ سکتیں۔ اگر کبھی ہندوستان اور پاکستان میں جنگ چھڑ جائے تو لامحالہ دوسری طاقتیں بھی اس میں کھنچ آئیں گی۔ مگر ہمیں اس بات سے بے نیاز ہو کر کہ دوسری قومیں کیا کریں گی اور کیا نہیں کریں گی، دشمن کے مقابلے کیلئے اپنی طاقت کو بڑھانا اور اپنے عزم کو مضبوط بنانا چاہئے۔

خارجہ پالیسی کے عام اصول بیان کر دینے کے بعد اب میں دوسرے ملکوں سے پاکستان کے روابط پر روشنی ڈالوں گا، اور بتاؤں گا کہ یہ روابط کب اور کیسے شروع ہوئے، ان کی نوعیت کیا ہے اور ان کو قائم کرنے میں ہمیں کن کن مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ سب سے پہلے میں ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کا ذکر کروں گا۔ آزادی کے بعد سے لے کر اب تک ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کی جو کیفیت رہی ہے وہ کسی سے چھپی ہوئی نہیں۔ پچھلے اٹھارہ برس میں

Marfat.com

پاکستان نے بہتیرا چاہا کہ ہندوستان سے اچھے ہمسایوں کا سا رشتہ قائم ہو جائے مگر کامیابی نہ ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ انقلاب سے پہلے پاکستانی رہنماؤں نے ہندوستان سے کوئی نہ کوئی سمجھوتہ کر لینے کیلئے بڑا زور لگایا تھا۔ مگر ہندوستان کی طرف سے کچھ اس قسم کی حجتیں پیش کی جاتی رہیں:

''آؤ ہم اپنے جھگڑوں کو بھلا دیں۔ آؤ ہم جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرلیں۔ آؤ ہم اپنی تجارت کو بڑھائیں۔ دونوں ملکوں میں آمدورفت کھل جائے اور دونوں طرف کے ثقافتی وفد آئیں جائیں۔ اس طرح فریقین کے جذبات میں گداز پیدا ہو جائے گا۔ بس ایک مرتبہ دونوں طرف خیر سگالی اور مفاہمت کی فضا پیدا ہوگئی تو پھر سب مسئلے آپ ہی آپ حل ہو جائیں گے۔''

ہندوستانیوں کو اپنا یہ استدلال بڑا معقول معلوم ہوتا ہے اور وہ اکثر چوٹ کھائی ہوئی معصومیت کے انداز میں کہا کرتے ہیں کہ ہم نے تو بڑے خلوص اور سچے دل سے کوششیں کر دیکھیں، مگر پاکستان سے ان کا تشفی بخش جواب نہ ملا۔ پاکستان کی پوزیشن کیا ہے؟ پاکستان یہ سوال کرتا ہے کہ جب تک بنیادی اختلاف اور جھگڑے باقی رہیں' خیر سگالی اور مفاہمت کی فضا کیسے پیدا ہو سکتی ہے۔ اگر ہندوستان پاکستان کے ساتھ جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرنا چاہتا ہے' تو وہ جنگ کی اتنی زبردست تیاری کیوں کر رہا ہے؟ ہندوستان والے جواب میں کہیں گے کہ یہ جنگی تیاری چین کے حملے کو روکنے کیلئے ہے۔ لیکن اس کی کیا وجہ ہے کہ جو جنگی مشین وہ تیار کر رہے ہیں وہ دراصل میدانی علاقوں ہی میں کام دے سکتی ہے۔ پاکستان اس حقیقت کو کیسے نظر انداز کر سکتا ہے کہ ہندوستان اپنی موجودہ پوزیشن میں چند گھنٹے کے اندر اندر پاکستان کے خلاف بھاری فوجیں میدان میں اتار سکتا ہے؟ دفاعی معاملوں میں ملک اپنی پالیسیاں دوسروں کے ارادوں کی بنیاد پر نہیں بنایا کرتے، ان کو دوسروں کی جنگی استعداد پر نظر رکھی پڑتی ہے۔ اگر ہندوستان جیسا بڑا ملک پاکستان پر حملہ کرنے کی استعداد رکھتا ہے، تو ارادے ہمیشہ بدل سکتے ہیں خواہ کوئی معاہدہ ہو یا نہ ہو۔ ''جنگ نہ کرنے کا معاہدہ'' اس وقت تک کچھ معنی نہیں رکھتا جب تک کہ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ معاہدہ نہ ہو کہ فریقین کتنی کتنی تعداد میں فوج رکھ سکتے ہیں۔

ہمیں اس بات پر بھی غور کرنا چاہئے کہ جنگ نہ کرنے کے معاہدے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ یہ اس لئے پیش آئی کہ دونوں ملکوں میں ایسے جھگڑے موجود ہیں' جن کی وجہ سے جنگ چھڑ سکتی ہے۔ اب اگر ان جھگڑوں کو منصفانہ اور آبرومندانہ طور پر حل کرنے کی کوشش نہ کی جائے تو محض جنگ نہ کرنے کا معاہدہ جنگ کے خطرے کو ٹال نہیں سکتا۔ یہ معاہدہ جبھی بامعنی ہو سکتا ہے کہ ان جھگڑوں کے آبرومندانہ تصفیے کیلئے کم از کم ایک معقول مشینری بھی قائم کرے۔ اس قسم کی مشینری کو دونوں ملکوں کا اعتماد اور دونوں ملکوں کی حمایت حاصل ہونی چاہئے اور یہ بندوبست بھی ہونا چاہئے کہ اگر دونوں فریقوں میں اتفاق نہ ہو سکے تو اس معاملے کو کس طرح پرامن طریق سے حل کیا جائے گا۔ فوج میں کمی کئے بغیر اور مسائل کو حل کرنے کیلئے کوئی مشینری بنائے بغیر، جنگ نہ کرنے کے معاہدے کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک خاص وقت پر نیک ارادوں کا اظہار کر دیا جائے اور بس۔ اس قسم کا خالی خولی معاہدہ یقیناً دنیا کی نظروں میں ہندوستان کے اس دعوے کو تقویت پہنچائے گا کہ اس کے ارادے پرامن ہیں۔ اس سے یقیناً پاکستان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا' کیونکہ وہ پہلے سے جانتا ہے کہ یہ ارادے کسی لمحے بھی بدلے جا سکتے ہیں۔

Marfat.com

اب رہی یہ بات کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ جھگڑے آپ ہی آپ حل ہو جائیں گے' تو یہ بھی کہنے کی بات ہے۔ بنیادی جھگڑوں کو جن کے ساتھ لوگوں کی زندگی اور آزادی وابستہ ہو، بالائے طاق نہیں رکھا جا سکتا اور نہ انہیں وقت کی دھول میں دفن کیا جا سکتا ہے۔ یہ مسئلے پھٹ پڑتے ہیں۔ کیونکہ بنی نوع انسان کو ابدی غلامی میں نہیں جکڑا جا سکتا۔

یہ وہ نکتہ ہے جسے جموں و کشمیر کے مسئلے پر غور کرتے وقت ہندوستان کو بلکہ ساری دنیا کو نظر کے سامنے رکھنا چاہئے۔ یہ مسئلہ ریاست کے عوام کا مسئلہ ہے جو اپنا حق خود ارادیت منوانے کیلئے زندگی و موت کی کش مکش میں مبتلا ہیں اور جب ہندوستان کہتا ہے کہ خیر سگالی پیدا ہونے دو' مسئلے آپ ہی آپ حل ہو جائیں گے تو وہ اس بات کی بھی ضمانت نہیں دیتا کہ اس اثنا میں مسئلوں کو جوں کا توں رہنے دیا جائے گا۔ تمام شواہد سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان والے ان مسئلوں کو اپنے حسب منشا حل کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ انہوں نے ریاست جموں و کشمیر کے ایک بڑے حصے پر طاقت کے بل پر قبضہ کر رکھا ہے، وہ اس قبضے کو مضبوط بنا رہے ہیں۔ وہ ریاست کی آبادی کی نوعیت کو بدل رہے ہیں۔ ان کے اس قول کا کہ "خیر سگالی پیدا ہونے دو" اگر کچھ مطلب ہے تو یہ کہ "ہمیں من مانی کرنے دو۔"

پھر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان متعدد معاملوں پر جو معاہدے ہوئے ان سب کا ریکارڈ موجود ہے۔ ان پر ایک نظر ڈالنے سے عیاں ہو جاتا ہے کہ ہندوستان نے کس صورت میں اور کس حد تک ان معاہدوں کی پابندی کی۔ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ آزادی کے موقع پر پاکستان کو کس طرح اپنے حصے کا ساز و سامان، روپیہ پیسہ، اسٹور اور گولہ بارود دینے سے انکار کیا گیا تھا، حالانکہ ان میں سے ہر ایک مد کے بارے میں باقاعدہ معاہدے ہو چکے تھے جن کی پابندی کرنے کا دونوں مملکتوں نے اقرار کیا تھا۔ اقوام متحدہ نے ہندوستان و پاکستان کی قرارداد پر عمل کرانے کیلئے اپنا ایک کمیشن مقرر کر رکھا ہے۔ یہ قرارداد جموں و کشمیر کے تنازعے کے بارے میں ہے' جس میں ہندوستان و پاکستان دو فریقوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن جب بھی اس قرارداد پر عمل کرانے کی کوشش کی جاتی ہے ہندوستان ہر دفعہ کوئی نہ کوئی بہانہ تراش کر اس کوشش کو رد کر دیتا ہے۔ پہلے تو یہ کہتا رہا کہ جموں و کشمیر کے حالات کو معمول پر آ جانے دو اس کے بعد وہاں لوگوں کو اپنا حق خود ارادیت استعمال کرنے کا موقع دیا جا سکے گا۔ اور جب حالات معمول پر آ گئے تو اس نے کہنا شروع کر دیا کہ اب چونکہ حالات پر سکون ہو گئے ہیں اس لئے لوگوں کی رائے کا ذکر نہ چھیڑا جائے کیونکہ اس سے معاملات پھر بگڑ جائیں گے۔ غرض شروع سے لے کر آخر تک ہندوستان کی پالیسی کا یہی انداز رہا ہے۔ یعنی کبھی تو یہ کہ "پہلے حالات کو معمول پر آ جانے دو' اس کے بعد ہم اس مسئلے کو حل کریں گے" اور کبھی یوں کہ: "اب حالات معمول پر آ گئے ہیں تو گڑے مردے کیوں اکھاڑے جائیں۔"

پنڈت جواہر لال نہرو سے میری دو ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ ایک تو یکم ستمبر 1960ء کو نئی دہلی میں پالم کے ہوائی اڈے پر' اور دوسری 19 اور 23 ستمبر 1960ء کے درمیان جب وہ دریائے سندھ کے معاہدہ آب پر دستخط کرنے پاکستان آئے تھے۔ پالم کی ملاقات تقریباً دو گھنٹے تک رہی۔ اسکے آخر میں ہم نے ایک مشترک بیان جاری کیا جس میں ہم نے اپنے تعلقات کو ایک معقول اور سوچی سمجھی بنیاد پر قائم کرنے کی ضرورت پر زور دیا تھا۔ ہم نے اس امر پر بھی اتفاق کیا تھا کہ ہمیں اپنے بڑے بڑے معاملوں اور مسئلوں کو انصاف' دیانت داری' دوستی' تعاون اور ہمسایہ داری کے نیک جذبے کے

Marfat.com

ساتھ حل کرنا چاہئے۔ بعد میں میں نے اخباری نمائندوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ: ''ضرورت ہے معاملات کو دوبارہ جانچنے کی، بھول جانے اور معاف کردینے کی' اور ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ حقیقت پسندانہ، عاقلانہ اور ہوشمندانہ رشتہ قائم کرنے کی۔''

مجھے یہ تو محسوس نہیں ہوا کہ پنڈت نہرو کو مجھ سے مل کر کوئی غیر معمولی خوشی ہوئی، لیکن وہ میرے بعض مشوروں سے کافی متاثر ہوئے تھے۔ وہ مجھے ایک تھکے ہوئے انسان معلوم ہوئے گو ابھی تک ان میں لڑائی کا دم خم اور سیاسی سوجھ بوجھ موجود تھی۔ وہ تصوریت یا افلاکی نظر جو اکثر ان سے منسوب کی جاتی ہے، مجھے ان میں نظر نہ آئی۔ میں نے انہیں بتایا کہ میری رائے میں ہندوستان و پاکستان کے باہمی تعلقات بے راہ روی کا نتیجہ ہیں' تدبر کو اس میں دخل نہیں۔ اس کا سبب میرے خیال میں یہ ہے کہ فریقین میں سے کسی نے بھی ہمسائیگی کے تعلقات قائم کرنے کا کوئی منصوبہ نہیں بنایا۔ دونوں طرف کے لوگ کہا کرتے تھے کہ ساری سماجی اور اقتصادی برائیاں برطانیہ کے دم قدم سے ہیں' جیسے ہی برطانیہ کا قدم یہاں سے ہٹا ہر چیز پر بہار آ جائے گی۔ واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ انکا یہ خیال پورے طور پر درست نہ تھا۔ گو ہماری بہت سی مصیبتیں برطانوی راج ہی کی وجہ سے تھیں۔ دونوں ملکوں میں بہت سی مصیبتیں لائی گئیں' بہت نفرت و حقارت پیدا کی گئی اور لوگ یہ سمجھنے لگے کہ آئندہ ہمیں ایک دوسرے سے کچھ سروکار نہ رکھنا ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں ابھی موقع ہے کہ عاقلانہ اور ہوشمندانہ بنیادوں پر باہمی تعلقات استوار کرنے کا منصوبہ بنالیا جائے۔

پنڈت نہرو نے جنگ نہ کرنے کے اعلان کا ذکر کیا۔ میں نے کہا کہ اس قسم کا اعلان کرنے سے بہتر ہوگا کہ پہلے ہم اپنے بڑے بڑے مسائل کو حل کرنے کیلئے ایک مشینری قائم کرنے کا فیصلہ کریں۔ نیز جنگ نہ کرنے کے اعلان کو موثر بنانے کیلئے یہ بھی ضروری ہوگا کہ ہم ایک دوسرے کے مقابل میں اور اسی نسبت سے خود کو غیر مسلح کرلیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ فوجی نقطہ نظر سے استعداد بڑا خطرناک عنصر ہوتی ہے۔ اگر کوئی ملک فیصلہ کن فوجی استعداد رکھتا ہے' تو وہ جب چاہے اپنے ارادے کو بدل سکتا اور حملہ آور ہو سکتا ہے۔ میں نے انہیں یاد دلایا کہ ہندوستان نے دو مرتبہ' ایک دفعہ 1950ء میں اور دوسری دفعہ 1951ء میں' پاکستان کے خلاف اپنی فوجیں جمع کرلی تھیں، حالانکہ فوجی لحاظ سے اس کا کوئی جواز نہ تھا۔

اس کے بعد میں نے کشمیر کا مسئلہ اٹھایا۔ میں نے انہیں بتایا کہ اس مسئلے میں صرف اہل کشمیر ہی فیصلہ کن رائے دے سکتے ہیں۔ اس لئے ایسا ماحول تلاش کرنا لازمی ہے' جو جموں و کشمیر کے لوگوں کو مطمئن کرسکے۔ مسٹر نہرو نے میرے خیالات سے اختلاف تو نہ کیا' مگر دونوں ملکوں کے درمیان مفاہمت کی فضا پیدا کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ انہوں نے کہا کہ اس کی ابتدا یوں ہو کہ سرحد پر جھڑپیں اور فائرنگ بند ہو جائے۔

ہماری دوسری ملاقات 21 ستمبر 1960ء کو مری میں ہوئی۔ ہم نے پہلی ملاقات میں بات چیت کا سلسلہ جہاں چھوڑا تھا وہیں سے آگے شروع کیا۔ میں نے پھر کشمیر کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ میں نے کہا کہ یہ اس جھگڑے کو چکانے اور ہندوستان و پاکستان میں امن و امان قائم کرنے کا بڑا مبارک موقع ہے۔ آپ ہندوستان کے تسلیم شدہ لیڈر ہیں اور شاید پاکستان کے لوگ میری بات بھی سننے کو تیار ہو جائیں۔ ایسا اتفاق شاید پھر مدتوں نہ ہو۔ چنانچہ اس موقع کو ہاتھ سے گنوا دینا' بڑے ہی افسوس کی بات ہوگی۔ یہ خیال کہ وقت گزرنے کے ساتھ پاکستان مسئلہ جموں و کشمیر کے آبرومندانہ اور منصفانہ حل

Marfat.com

کی ضرورت کو بھول جائے گا' بڑا ہی غیر حقیقت پسندانہ ہوگا۔ ملک کا بچہ بچہ اس معاملے میں یک دل و یک زبان ہے' اور پاکستان کی کوئی حکومت بھی اس مسئلے کو پس پشت نہیں ڈال سکتی۔

میں نے انہیں کشمیر اور مغربی پاکستان کا ایک نقشہ دکھایا' اور بتایا کہ کس طرح ہماری تمام ریلوں اور سڑکوں کے سلسلے کٹ گئے اور نہروں کے ہیڈ ورکس کس طرح باہر رہ گئے ہیں۔ پاکستان کی سلامتی کا تقاضا ہے کہ اس مسئلے کو منصفانہ طور پر حل کیا جائے۔ اب اس کی ایک اور اقتصادی وجہ بھی پیدا ہوگئی ہے' کیونکہ مغربی پاکستان کو صرف تین ہی دریاؤں کے پانی پر گزارا کرنا ہوگا پاکستان کو ان دریاؤں کے ایک ایک قطرے کو جمع کرنا ہوگا اور یہ صرف کشمیر کے پہاڑی علاقوں ہی میں ہوسکتا ہے۔ اسی طرح پاکستان کو مزید بجلی کی ضرورت ہوگی۔ یہ ضرورت بھی صرف ان ہی علاقوں کے ہائیڈرو الیکٹرک اسٹیشنوں سے پوری ہوسکے گی۔ اگر ہندوستان و پاکستان کو دو اچھے ہمسایوں کی طرح مل جل کر رہنا ہے' تو اس مسئلے کو ایک نہ ایک دن حل کرنا لازمی ہوگا۔ اگر یہ مسئلہ صلح صفائی اور عزت آبرو کے ساتھ اور دونوں حکومتوں کے قول و قرار کے مطابق حل ہو جائے تو دونوں کو بے اندازہ فائدے حاصل ہوں گے اور اس طرح ہندوستان اس قابل ہو سکے گا کہ اپنی فوج آدھی کر دے' اور ہم بھی اپنے فوجی اخراجات میں اسی تناسب سے تخفیف کر سکیں گے۔

اس موقع پر پنڈت نہرو نے بہت رک رک کر اور سوچ سوچ کر میری باتوں کا جواب دینا شروع کیا۔ انہوں نے کہا کہ وقت گزرنے کے ساتھ کشمیر کا مسئلہ بڑا پیچیدہ ہوگیا ہے۔ فریقین اپنی اپنی بات پر سختی سے اڑ گئے ہیں اور اس سے ٹلنے کو تیار نہیں۔ کشمیر میں دو ''انتخابات'' ہو چکے ہیں اور تیسرا ہونے کو ہے۔ ہندوستان نے فوجی اخراجات سے قطع نظر' کشمیر کو ترقی دینے پر بے اندازہ روپیہ خرچ کیا ہے۔ پھر ہندوستان میں کثیر مسلم اقلیت کا بھی معاملہ ہے۔ یہ مسلم اقلیت ہندوستانی معاشرے میں گھل مل رہی ہے۔ اگر کشمیر کے معاملے میں کسی قسم کی جلد بازی کی گئی تو اس کا اس عمل پر الٹا اثر پڑے گا۔ ہندوستان اپنے عوام کی قوت تعمیری کاموں میں لگانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اگر کشمیر کی موجودہ حالت میں کوئی تبدیلی ہوئی تو عوام کی قوت تخریبی کاموں میں لگ جائے گی۔

میں نے انہیں بتایا کہ یہ تو آپ بخوبی جانتے ہیں کہ ریاست میں شہری آزادیوں کے نہ ہونے کی صورت میں وہاں کسی قسم کے ''انتخابات'' ہوئے ہوں گے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جموں و کشمیر کے عوام اپنی ریاست پر ہندوستانی فوج کے مسلسل قبضے سے سخت ملول ہیں۔ رہا ہندوستان کی مسلم اقلیت کا معاملہ تو انہیں یرغمال کے طور پر تو رکھا نہیں جاسکتا اور نہ ان کے مستقبل کو جموں و کشمیر کے مسئلہ سے منسلک کیا جاسکتا ہے۔ جب تک کشمیر کے سلسلے میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کوئی تصفیہ نہیں ہو جاتا ہندوستانی مسلمانوں کے ہندوستانی معاشرے میں گھل مل جانے کا عمل کامیاب نہیں ہوسکتا۔ باقی رہا عوام کی قوت کو تعمیری کاموں میں لگانے کا سوال' تو یہ جبھی ممکن ہے کہ معاشرے کا کوئی نصب العین ہو۔ غرض ہم میں دیر تک اس مسئلے پر بحث ہوتی رہی۔

آخر میں پنڈت نہرو نے مجھ سے پوچھا: مان لیا کہ دونوں ملکوں میں امن قائم کرنے کی ضرورت ہے، اور یہ بھی کہ مسئلہ کشمیر کے تصفیے میں ردوکد کی کم ہی گنجائش ہے' تو اس صورت میں آپ کے خیال میں پہلا قدم کیا اٹھانا چاہئے۔ میں نے کہا کہ اس کا انحصار اس مقصد پر ہوگا جو ہم حاصل کرنا چاہیں گے۔ ایک دفعہ مقصد متعین ہو جائے تو پھر اس کے حصول

Marfat.com

کیلئے ایک عملی نظام قائم کیا جاسکتا ہے۔

مسٹر نہرو نے کہا کہ مجھے پیشتر ہی سے ایسا نظر آ رہا ہے کہ میرے ملک کے سیاسی حلقے اس کی سخت مخالفت کریں گے۔ انہوں نے بیان کیا کہ ہندوستان کی رائے عامہ نے ''ہندوستانی علاقے'' پر چینیوں کے ''قبضے'' پر سخت غم و غصہ کا اظہار کیا ہے۔ مجھے یہ بات کچھ بے جوڑ سی معلوم ہوئی کیونکہ کشمیر کبھی ہندوستانی علاقہ نہ تھا۔ یہ تو ایک بین الاقوامی تنازعے کا موضوع تھا جس کو دونوں ملکوں نے اقوام متحدہ کی قرارداد کے مطابق طے کرنے کا اقرار کیا تھا۔

مجھے اس بات کا یقین پیدا نہ ہو سکا کہ پنڈت نہرو واقعی مسئلے کا کوئی مستقل حل نکالنا چاہتے ہیں۔ وہ اس گفت و شنید میں تو مضائقہ نہیں سمجھتے تھے جو اس وقت ہو رہی تھی' مگر دونوں ملکوں کے درمیان ایک خوشگوار مستقبل کا خیال ان کے ذہن میں نہیں تھا' اگر واقعی انہیں اس کا خیال ہوتا تو وہ میری تجاویز پر زیادہ دھیان دیتے۔ مثلاً مشترک دفاع کی بابت جو تجاویز میں نے 1959ء میں کی تھیں۔ انہوں نے نہ جانے کیوں اسے ہندوستان کی سالمیت اور خودداری پر حملہ تصور کیا۔ اس تجویز میں کسی فتور نیت کو دخل نہ تھا اور نہ اسے پیش کرنے والا میں پہلا شخص تھا۔ قائداعظمؒ نے پاکستان اور ہندوستان کیلئے' بہ حیثیت دو آزاد اور خودمختار مملکتوں کے' اس بات کو اشد ضروری تصور کیا تھا کہ یہ دونوں زمین پر اور سمندر میں اپنی سرحدوں کو دشمن کے حملے سے محفوظ رکھنے کیلئے دوستانہ طور پر تعاون کریں نیوزیور کرزیتونگ اخبار کے نامہ نگار خصوصی ڈاکٹر ایرک سٹرائف نے قائداعظمؒ سے پوچھا تھا: ''کیا پاکستان اور ہندوستان اپنے اندرونی معاملات میں مل جل کر کام کریں گے۔ نیز کیا وہ زمین پر اور سمندر میں اپنی سرحدوں کی حفاظت کیلئے دست تعاون بڑھائیں گے۔ اور بیرونی حملے کا مل کر مقابلہ کریں گے؟'' قائداعظمؒ نے جواب دیا:

''ذاتی طور پر میرے دل میں ذرا بھی شک و شبہ نہیں کہ ہمارے نہایت اہم مفادات کا تقاضا یہ ہے کہ پاکستان کی ڈومینین اور ہندوستان کی ڈومینین کو ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک عمل کرنا چاہئے تا کہ انہیں بین الاقوامی معاملات میں اور آئندہ رونما ہونے والے واقعات میں پورا پورا دخل حاصل ہو۔ علاوہ ازیں پاکستان اور ہندوستان کیلئے' بہ حیثیت دو آزاد و خودمختار مملکتوں کے' یہ بھی اشد ضروری ہے کہ وہ دوستانہ طور پر اور مل جل کر زمین اور سمندر میں اپنی سرحدوں کو دشمن کے حملے سے بچائیں۔ لیکن اس کا انحصار کلیتہً اس بات پر ہے کہ پاکستان اور ہندوستان پہلے خود اپنے اختلافات دور کر سکتے ہیں یا نہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم بین الاقوامی معاملات میں اسی وقت نمایاں حصہ لے سکتے ہیں کہ پہلے اپنے اندرونی معاملات کو سدھار لیں۔''

اپریل 1953ء میں محمد علی بوگرا نے جو اس وقت پاکستان کے وزیراعظم تھے' اعلان کیا تھا کہ ایک دفعہ دونوں ملکوں کے آپس کے بڑے بڑے جھگڑے طے پا جائیں اور سازگار فضا پیدا ہو جائے' تو ہندوستان اور پاکستان اپنے مشترکہ دفاع پر غور کر سکتے ہیں' جس میں دونوں کا فائدہ ہے۔'' انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ مشترک دفاع کی بدولت ''دونوں ملک اپنے دفاعی اخراجات میں سے ایک خطیر رقم بچا سکتے ہیں جسے قومی بھلائی اور عوام کے معیار زندگی کو بلند کرنے کے کام میں صرف کیا جاسکتا ہے۔''

میں نے 24 اپریل 1959ء کو کہا تھا کہ بیرونی حملے کی صورت میں ہندوستان اور پاکستان دونوں کو آپس میں

Marfat.com

قریب آ جانا چاہئے اور مل جل کر اس برصغیر کا دفاع کرنا چاہئے۔ ہندوستانی لیڈروں نے خیال کیا کہ میں کسی قسم کے دفاعی معاہدے کی بات کر رہا ہوں اور اس سے ان کے دلوں میں خوف اور بدگمانی پیدا ہوئی۔ اس کے چند روز بعد میں نے کوئٹہ میں اپنی اس تجویز کی وضاحت کی۔ میں نے کہا' اس کا مطلب کوئی خاص معاہدہ نہیں ہے جو ہندوستان کی پریشانی کا موجب ہو۔ میں تو بس یہ چاہتا تھا کہ دونوں ملکوں میں امن وامان کی خاطر عمومی سمجھوتہ ہو جائے۔ میں نے اس بات پر زور دیا کہ اس قسم کی مفاہمت کی اولیں شرط یہ ہے کہ کشمیر اور نہری پانی جیسے بڑے بڑے مسئلے حل ہو جائیں۔ ایک دفعہ ان معاملوں کا تصفیہ ہو جائے تو پھر دونوں ملک اپنی اپنی فوجوں کو فارغ کر کے ایسی سرحدوں پر بھیج سکتے ہیں جہاں حملے کا خطرہ ہو۔ بس یہی مشترک دفاع کی غرض وغایت ہے یعنی ہم ایک دوسرے کے خوف سے آزاد ہو کر اطمینان کے ساتھ اپنی اپنی سرحدوں کی حفاظت کر سکیں۔

مسٹر نہرو نے جان بوجھ کر اس تجویز کا غلط مطلب سمجھا اور 4 مئی کو لوک سبھا میں اعلان کیا: ''خواہ کچھ بھی ہو ہم کسی ملک کے ساتھ فوجی اشتراک کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔'' اس کی تشریح انہوں نے یوں کی: ''میں پاکستان کے ساتھ اپنے جھگڑے مٹانے اور امن' دوستی اور ہمسایہ داری کے جذبے کے تحت زندگی گزارنے کا دل سے خواہاں ہوں لیکن ہم کوئی مشترک دفاعی پالیسی اختیار کرنا نہیں چاہتے جو گویا ایک قسم کے فوجی معاہدے کے مترادف ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب لوگ مشترک دفاعی پالیسیوں کی بات کرتے ہیں تو ان کا حریف کون ہوتا ہے۔ کیا ہم کو بغداد پیکٹ' سیٹو یا ایسے ہی کسی اور معاہدے کا ممبر بنا ہے؟'' بعد ازاں جنوری 1960ء میں مسٹر نہرو نے بنگلور میں کانگرس پارٹی کے سالانہ اجلاس کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے سوال کیا: ''فوجی معاہدے کا کیا مطلب ہے؟ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ فوجیں ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مارچ کر سکتی ہیں؟'' اس کے بعد انہوں نے کسی قدر جوش میں آ کر کہا: ''چاہے ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے' ہندوستان غیر ملکی فوجوں کو اپنی دھرتی پر قدم رکھنے کی اجازت کبھی نہ دے گا' خواہ یہ فوجیں اس کی حفاظت ہی کیلئے کیوں نہ آئی ہوں''

جو بات مسٹر نہرو مطلق نہیں سمجھے' یہ تھی کہ میں نہ تو دونوں ملکوں کی خارجہ پالیسیوں میں کسی قسم کی تبدیلی کا مشورہ دے رہا تھا' اور نہ کوئی باضابطہ دفاعی انتظام تجویز کر رہا تھا۔ انہوں نے جو یہ نقشہ کھینچا تھا کہ پاکستانی فوجیں ہندوستانی سرحدوں کی حفاظت کے بہانے ہندوستان کی دھرتی پر مارچ کرتی چلی آ رہی ہیں' اس سے دراصل ان کا مقصد یہ تھا کہ عوام کی توجہ اصل مسئلے سے ہٹ جائے۔ اور اصل مسئلہ یہ تھا کہ ہندوستان اور پاکستان اپنے آپس کے بڑے بڑے جھگڑوں کے بارے میں کوئی سمجھوتہ کر لیں' تاکہ دونوں ملکوں کے عوام امن چین سے زندگی بسر کر سکیں۔ میں بار بار اس تجویز کا ذکر کرتا اور اس کی زیادہ سے زیادہ وضاحت کرتا رہا' تاکہ ہندوستان کے لوگوں پر اس کی معقولیت ظاہر ہو جائے۔ میں نے پہلے ہندوستانی لیڈروں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس تجویز سے ان کی ''ناطرفداری'' کی پالیسی پر جس کا وہ پرچار کرتے رہے ہیں کوئی زد نہیں پڑتی۔ میں نے سیدھے سادے الفاظ میں بیان کیا کہ اس تجویز کا اہم نکتہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ ہندوستان اور پاکستان کے اختلافات دور ہو جائیں' تو پھر دونوں ملک اپنی اپنی فوجوں کو جو اس وقت آمنے سامنے ڈٹی ہوئی ہیں' ادھر سے فارغ کر کے اپنے اپنے علاقے کی حفاظت پر لگا سکیں گے۔ لیکن ہندوستان کے وزیراعظم کو پاکستان سے

Marfat.com

اپنے جھگڑے طے کرنے یا اس کے ساتھ امن چین سے رہنے میں کوئی خوبی دکھائی نہ دی۔ جب سے دونوں ملک آزاد ہوئے تھے ان کے آپس کے اختلاف نے انہیں ایک دوسرے سے دست و گریباں کر رکھا تھا' اور ان کی فوجیں کشمیر میں اور دونوں ملکوں کے درمیان بین الاقوامی سرحدوں پر آمنے سامنے ڈٹی ہوئی تھیں۔ میری تجویز کا مقصد اس حقیقت کو واضح کرنا تھا کہ یہ فوجیں غلط مقام پر کھڑی ہیں اور اگر ایک دفعہ یہ جھگڑے سلجھ جائیں تو وہ اپنے صحیح مقام پر جا سکتی ہیں' نیز یہ کہ ہندوستان اور پاکستان کے عوام کو ایک دوسرے کے خوف سے نجات مل سکتی ہے۔ اس تجویز میں دونوں ملکوں کے درمیان اس قسم کے سمجھوتے کا بھی امکان موجود تھا کہ اگر کوئی تیسری طاقت ان دونوں میں سے کسی ایک پر حملہ کرے تو اسے یہ خدشہ نہ رہے گا کہ دوسرا اس کی پیٹھ میں خنجر گھونپ سکتا ہے۔

اس تجویز کا غلط مطلب نکالنے والوں میں ہندوستان کے وزیر اعظم کے علاوہ پاکستان کے کچھ لوگ بھی شامل تھے' جو یہ سمجھے کہ اس سے شاید ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ایک قسم کا نیم وفاق قائم ہو جائے گا۔ وہ اس نتیجے پر کس طرح پہنچے' یہ میں نہیں سمجھ سکا۔ اس طرف تو انہی لوگوں کا خیال جا سکتا ہے جو نہ تاریخ کا علم رکھتے ہوں نہ اس کی سمجھ بوجھ۔ اگر اس قسم کے نظام کو زبردستی رائج بھی کر دیا جائے، تب بھی ہندوستان و پاکستان اس نیم وفاق میں مل جل کر کام نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ بڑی سادہ ہے۔ ہندوستان کی قومیت کی بنیاد ہندو دھرم پر ہے اور پاکستان کی اسلام پر۔ یہ دونوں فلسفے بنیادی طور پر ایک دوسرے سے جداگانہ ہیں۔ ان دونوں کو ملایا نہیں جا سکتا' لیکن یہ صلح اور امن کے ساتھ ایک دوسرے کے قریب رہ سکتے ہیں۔ یہی ہندوستان کے بارے میں ہماری خارجہ پالیسی کا مدعا ہے۔ جو لوگ نیم وفاق کا ذکر کرتے ہیں وہ گزشتہ تاریخ' دونوں قوموں کی افتاد مزاج، ان کے نصب العین اور فلسفے کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔

جب 1964ء میں شیخ عبداللہ اور مرزا افضل بیگ پاکستان آئے' تو وہ بھی ہندوستان پاکستان اور کشمیر کے نیم وفاق ہی کی بے معنی تجویز لائے تھے۔ میں نے ان سے صاف صاف کہہ دیا کہ ہم اس سے کچھ سروکار نہیں رکھنا چاہتے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ ہم تو کشمیریوں کو غلامی سے نجات دلانے کی جدوجہد میں مصروف ہیں' اور ان کی زبان سے ایسی تجویز کہلوائی جا رہی ہے جس پر اگر عمل کیا جائے تو وہ خود ہماری غلامی کا موجب بن سکتی ہے۔ یہ ظاہر تھا کہ مسٹر نہرو نے انہیں یہی بات کہنے کیلئے یہاں بھیجا تھا۔ میں انہیں الزام نہیں دیتا کیونکہ انہیں حالات نے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ لیکن ان سے ملاقات کے بعد میرے دل میں ذرا شک و شبہ نہ رہا کہ ان کا مستقبل پاکستان ہی سے وابستہ ہے۔

میرے خیال میں مسٹر نہرو اور ان کی قوم کو یقین نہ آیا کہ میں نے یہ تجویز بڑے خلوص کے ساتھ پیش کی تھی۔ انہوں نے شاید یہ سمجھا کہ میں مسئلہ کشمیر کو بڑے سستے داموں طے کرانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ وہ یہ نہ سمجھے کہ میں دونوں ملکوں کے درمیان طویل المیعاد بنیادوں پر امن قائم کرنے کی فکر میں ہوں۔ بیشک میں جموں و کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ وہاں کے لوگوں کی خواہشات کے مطابق کرانا چاہتا تھا' لیکن میں اس کا بھی متمنی تھا کہ ہندوستان نے پاکستان کے خلاف جو جارحانہ اور دشمنانہ رویہ اختیار کر رکھا ہے وہ تبدیل ہو جائے۔ میری کوشش یہ تھی کہ دونوں ملک زندہ رہو اور زندہ رہنے دو کے اصول پر کاربند ہوں' بے فکری کا سانس لیں' اور ایک دوسرے کی بات کو سنیں اور سمجھیں۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ قدرت نے ہندوستان و پاکستان کو ایک عظیم موقع بخشا تھا' مگر اس سے فائدہ نہ اٹھایا جا سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندو لیڈر اس بات سے

Marfat.com

بے نیاز ہو کر کہ وہ اپنے عوام پر کس درجہ تباہ کن بوجھ ڈال رہے ہیں' اپنے آپ کو مسلح کئے جا رہے تھے۔ انہوں نے ایک چھوڑ دو دو فوجیں تیار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ایک چین سے جنگ و جدال کیلئے' اور دوسری پاکستان اور دوسرے چھوٹے چھوٹے ہمسایوں کو ڈرانے دھمکانے کے لئے۔ چنانچہ دونوں ملکوں کے روابط بجائے اس کے کہ کسی سطح پر مستحکم ہو جاتے' پر اضطراب اور تشدد آمیز مستقبل کا پیش خیمہ بن گئے۔'' (فرینڈز ناٹ ماسٹرز صفحہ 198 تا 212)

▪▪▪▪

پاکستان مئی 1954ء میں مغربی طاقتوں کا حلیف بنا تھا جب کہ اس نے امریکہ کے ساتھ مشترکہ دفاعی امداد کے معاہدے پر دستخط کئے تھے۔ بعدازاں اسی سال وہ امریکہ' برطانیہ' فرانس' تھائی لینڈ' فلپائن' آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے ساتھ ''سیٹو'' کا ممبر بن گیا تھا۔ اس کے ایک سال بعد معاہدہ بغداد میں شریک ہو گیا۔ یہ بھی ایک مشترکہ دفاعی تنظیم تھی جس میں برطانیہ' ترکی' ایران اور عراق بھی شامل تھے۔ امریکہ اس تنظیم میں خود شامل نہ ہوا۔ لیکن اس کے ساتھ شروع ہی سے اس کا گہرا تعلق رہا۔ 1958ء میں جب عراق اس معاہدے سے الگ ہو گیا' تو اسے معاہدہ بغداد کے بجائے ''سینٹو'' (سنٹرل ٹریٹی آرگنائزیشن) کے نام سے موسوم کیا جانے لگا۔ ترکی' ایران اور پاکستان بطور علاقائی ممبروں کے بدستور اس میں شریک رہے۔ 1959ء کے اوائل میں پاکستان نے امریکہ کے ساتھ دوطرفہ تعاون کے معاہدے پر دستخط کئے۔ ایسے ہی معاہدے ترکی اور ایران نے بھی کئے اس معاہدے کا مدعا سینٹو کے دفاعی مقاصد کو مزید تقویت دینا تھا۔ اس طرح ایک چھوڑ چار چار مشترکہ دفاعی تنظیموں کے تحت پاکستان کے روابط امریکہ کے ساتھ قائم ہو گئے۔ اس لحاظ سے بعض دفعہ پاکستان کو ایشیا میں امریکہ کا سب سے بڑا حلیف یا ''سب سے زیادہ مضبوط اتحادی'' کہا جاتا۔ ایشیا میں پاکستان ہی وہ واحد ملک ہے جو سیٹو اور سینٹو دونوں کا ممبر بنا۔

پاکستان جب ان معاہدوں میں شریک ہوا تو بھارت کی طرف سے اس پر بڑی لے دے ہوئی۔ بھارت نے اس پر الزام لگایا کہ اس کارروائی سے ''پاکستان سرد جنگ کو برصغیر تک لے آیا ہے۔'' تاہم جوں جوں وقت گزرتا گیا' بھارت کے اس واویلا کا اصلی مقصد کھلتا گیا۔ خصوصاً اس وقت جب 1959ء میں پاکستان نے امریکہ کے ساتھ دوطرفہ تعاون کے معاہدے پر دستخط کئے۔ اس معاہدے کے تحت امریکہ کیلئے بعض حالات میں یہ لازمی ہو گیا تھا کہ اگر پاکستان کسی حملے کا شکار ہو تو امریکہ اس کی مدد کرے۔ ہندوستان نے امریکہ سے اس کی وضاحت طلب کی' اور بقول مسٹر نہرو واشنگٹن کی حکومت نے خاص طور پر یقین دلایا کہ یہ معاہدہ ''ہندوستان کے خلاف بروئے کار نہ آئے گا۔'' صاف لفظوں میں اس مطالبے کا مقصد امریکہ سے اس امر کی ضمانت طلب کرنا تھا کہ اگر ہندوستان پاکستان پر حملہ کر دے تو امریکہ اس معاہدے کے تحت پاکستان کی مدد نہ کر سکے۔ پاکستان کی طرف ہندوستان کے روایتی متعصب رویے کی اس سے بہتر مثال نہیں مل سکتی۔

ہندوستان نے اس رویے سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ وہ اب تک پاکستان کی فوجی امداد کی مخالفت کیوں کرتا آیا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ پاکستان سے ڈرتا تھا' کیونکہ وہ پاکستان سے پانچ گنا بڑا ملک اور ہندوستانی فوجیں پاکستانی فوجوں سے پانچ گنا زیادہ ہیں اور پھر پاکستان کو ملنے والی فوجی امداد کا مقصد بھی تو اتنا ہی تھا کہ وہ محض اپنی

Marfat.com

مدافعت کر سکے۔ چنانچہ ہندوستان کو پاکستان سے خطرے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔

بھارت نے پاکستان کو اس اتحاد سے روکنے کیلئے اس پر براہ راست دباؤ ڈالنے کی کوشش بھی کی تھی۔ اگست 1953ء میں اس دوطرفہ گفت وشنید میں کچھ مہینے صرف ہو چکے تھے تو نہرو اور محمد علی بوگرہ نے جو اس وقت پاکستان کے وزیراعظم تھے کشمیر پر ایک مشترک سرکاری بیان جاری کیا۔ اس میں دونوں نے اس امر پر اتفاق ظاہر کیا تھا کہ "ہماری یہ پختہ رائے ہے کہ یہ (مسئلہ کشمیر) اس ریاست کے لوگوں کی خواہشات کے مطابق حل ہونا چاہئے۔ لوگوں کی خواہشات معلوم کرنے کا سب سے زیادہ قابل عمل ذریعہ آزادانہ رائے شماری ہے۔" علاوہ ازیں یہ فیصلہ کیا گیا کہ اپریل 1954ء کے آخر تک ناظم رائے شماری مقرر کر دیا جائے۔ ناظم ایسی تجاویز پیش کرے جنہیں وہ ساری ریاست میں منصفانہ اور غیر جانب دارانہ رائے شماری کرانے کے سلسلے میں ضروری سمجھتا ہو۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد نہرو کو کہیں سے یہ سن گن مل گئی کہ پاکستان امریکہ سے اتحاد کرنے اور اس سے فوجی امداد لینے والا ہے۔ پھر کیا تھا انہوں نے ایک طویل خط میں بڑے پرزور الفاظ میں یہ بات جتائی کہ اگر پاکستان اس ارادے سے باز نہ آیا تو ہندوستان اور پاکستان میں کشمیر پر جو معاہدہ ہوا تھا وہ ختم ہو جائے گا۔ (نہرو کا خط بنام وزیراعظم پاکستان 21 دسمبر 1953ء)

پاکستانی وزیراعظم محمد علی بوگرہ نے جواب میں لکھا کہ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ پاکستان کو امریکہ سے محض دفاعی مقاصد کیلئے جو فوجی امداد ملے اس سے مسئلہ کشمیر کو حل کرنے اور ہندوستان و پاکستان کے تعلقات کو بہتر بنانے کی ضرورت کس طرح کم ہو جاتی ہے۔ اور پھر یہ بات تو سمجھ میں آنی اور بھی مشکل ہے کہ پاکستان کے امریکہ کے ساتھ کسی فوجی معاہدے میں شامل ہو جانے سے کشمیر کے لوگ اپنے اس حق سے کیونکر محروم ہو جائیں گے کہ وہ چاہیں تو ہندوستان میں شامل ہوں اور چاہیں تو پاکستان میں۔ کشمیر کے لوگوں کے اس حق کا اعتراف اقوام متحدہ ہندوستان اور پاکستان تینوں کر چکے ہیں۔

دسمبر 1953ء میں ہر چند اس وقت تک پاکستان نے نہ تو امریکہ کے ساتھ کوئی معاہدہ کیا تھا، اور نہ اسے کسی قسم کی فوجی امداد ملی تھی مسٹر نہرو نے اعلان کر دیا کہ کشمیر کے متعلق مشترک سرکاری بیان میں جو معاہدے کئے گئے تھے ان کی پابندی نہیں کی جائے گی کیونکہ "اگر امریکہ سے فوجی امداد (پاکستان کو) ملی تو وہ صورت حالات بدل جائے گی جس کے تحت یہ معاہدے کئے گئے تھے۔" (بھارتی پارلیمنٹ میں نہرو کی تقریر 23 دسمبر 1953ء)

ظاہر ہے کہ پاکستان مسٹر نہرو کو یہ اجازت کیسے دے سکتا تھا کہ وہ اپنے حسب منشا پاکستان کی خارجہ پالیسی وضع کرائیں۔ مئی 1954ء میں پاکستان نے امریکہ کے ساتھ مشترکہ دفاعی امداد کے معاہدے پر دستخط کر دیئے۔ اسی کے ساتھ یہ امر یقینی ہو گیا کہ وزیراعظم ہندوستان کشمیر کے بارے میں مشترک سرکاری بیان کو مسترد کر دیں گے۔ پاکستان نے بہتیرا چاہا کہ یہ صورت حال پیدا نہ ہو مگر جب مئی 1955ء میں دونوں ملکوں کے وزرائے اعظم آخری مرتبہ ملے تو کشمیر کے بارے میں ان کا باہمی سمجھوتہ ملیامیٹ ہو گیا۔

اسی سال پاکستان پر امریکہ کے ساتھ اپنے اس اتحاد کے باعث اور بھی زیادہ دباؤ پڑا۔ 1955ء میں جب پاکستان معاہدہ بغداد میں شریک ہوا تو سوویت یونین کو یہ بات ناگوار گزری۔ اس وقت تک سوویت یونین کا رویہ کشمیر کے

Marfat.com

جھگڑے کے سلسلے میں غیر جانبدارانہ رہا تھا۔ جب کبھی سلامتی کونسل میں یہ مسئلہ پیش ہوتا تو اس کے نمائندے ووٹ دینے سے احتراز کرتے۔ مگر اب سوویت یونین نے پاکستان پر الزام لگایا کہ وہ معاہدہ بغداد میں شامل ہو کر ایک ''جارحانہ مغربی تنظیم'' کا رکن بن گیا ہے۔ اور کشمیر کے بارے میں اس کا رویہ یکسر بدل گیا۔ اب اس نے ہندوستان کی ہاں میں ہاں ملانی شروع کر دی کہ کشمیر میں نہ تو کوئی رائے شماری ممکن ہے اور نہ اس کی ضرورت ہے' نیز یہ کہ کشمیر ہندوستان کا ''اٹوٹ انگ'' ہے۔

جنرل ایوب خاں لکھتے ہیں:

''ادھر پچھلے دس برس میں امریکہ کی پالیسیوں میں ایسی تبدیلیاں پیدا ہوئیں جو ہندوستان کے بالمقابل امریکہ کے اتحادی پاکستان کے لئے متواتر نقصان کا باعث ہوتی ہیں۔ جب ہم نے پہلے پہل امریکہ کے ساتھ اتحاد کیا تھا تو اس غیر جانبداری کو جسے ہندوستان ''ناطرفداری'' کے نام سے موسوم کرنا زیادہ پسند کرتا تھا' امریکہ میں شک وشبہ کی نظر سے دیکھا جاتا تھا' بلکہ درحقیقت ''غیر اخلاقی'' سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ اس کا مطلب تھا دونوں فریقوں کو بے وقوف بنا کر اپنا الو سیدھا کرنا۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا' امریکیوں کی نظروں میں ہندوستان کے اس طرز عمل کا احترام پیدا ہوتا گیا۔ پچھلی دہائی کے آخری سالوں میں تو یہاں تک نوبت پہنچ چکی تھی کہ امریکہ بعض اوقات سوویت یونین سے بازی لے جانے کی کوشش میں اس کی عملی حمایت بھی کرنے لگا تھا۔ مزید براں امریکہ کے بااثر حلقے ہندوستان کو بھاری امداد دینے کی سفارش بھی کرنے لگے تھے۔

اسی زمانے میں امریکہ کے اتحادیوں میں جن میں صرف پاکستان ہی شامل نہ تھا' یہ احساس پیدا ہونا شروع ہوا کہ امریکہ کے طرز عمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہماری حمایت کو روز بروز ایک امر مسلمہ سمجھنے لگا ہے جس کی چنداں پروا کرنا ضروری نہیں۔ رفتہ رفتہ امریکی پالیسی کی تبدیلی کے باعث' امریکہ سے اقتصادی امداد حاصل کرنے والوں میں غیر جانب دار ہندوستان کا نمبر سب سے زیادہ بڑھ گیا حالانکہ ہندوستان اقوام متحدہ کے اندر اور باہر امریکہ کو بے روک ٹوک لتاڑتا رہا۔ پاکستان امریکی خارجہ پالیسی کی اس کایا پلٹ کو بڑھتے ہوئے استعجاب اور آزردگی کے ساتھ دیکھتا رہا۔ ہماری تشویش کا باعث نہ تھا کہ ہندوستان کی فوجی تیاریوں کا رخ زیادہ تر پاکستان ہی کی طرف تھا۔ ہندوستانی لیڈروں کی نعرہ بازیاں اور پاکستانی سرحدوں پر ہندوستانی فوجوں کا مسلسل ہجوم اس کا کھلا ثبوت تھا۔ (فرینڈز ناٹ ماسٹرز صفحہ 218 تا 219)

بہر صورت 1962ء تک امریکی پالیسی غیر جانبدار ہندوستان اور امریکہ کے اتحادی پاکستان کے درمیان مناسب تفریق ملحوظ رکھتی رہی۔ یوں تو مشترکہ دفاعی امداد کے معاہدے کے تحت' جس پر 1951ء میں دستخط ہوئے تھے اور جس کی تجدید 1958ء میں کی گئی تھی' ہندوستان کو بھی امریکہ سے فوجی امداد مل رہی تھی' حالانکہ اس نے کوئی پابندی قبول نہ کی تھی جو اتحادی کی حیثیت سے عموماً لازم آتی ہے۔ تاہم امریکہ براہ راست فوجی امداد کے معاملے میں ایک اتحادی اور ایک غیر جانب دار ملک کے مابین امتیاز رکھتا رہا لیکن جب 1962ء میں ہندوستان اور چین کے درمیان سرحدی معاملے پر جنگ چھڑ گئی تو امریکہ نے یہ امتیاز یکسر اٹھا دیا۔

Marfat.com

پاکستان میں مارشل لاء کا نفاذ

اس عشرے کا اہم ترین واقعہ پاکستان میں آنے والا جنرل ایوب خاں کا مارشل لاء تھا۔ پاکستان میں فوجی انقلاب کا منصوبہ ستمبر 1958ء کے وسط میں مکمل ہو چکا تھا۔ فوج کے کمانڈر ان چیف جنرل (حال فیلڈ مارشل) محمد ایوب خاں نے جنہوں نے اس انقلاب کی قیادت کی' اپنے ذہن میں جو منصوبہ قائم کیا اس میں صدر سکندر مرزا کو صدارت کے عہدے پر قائم رکھنے کی تجویز شامل تھی بشرطیکہ وہ مجوزہ اقدامات کا ساتھ دینے کو تیار ہوں۔ اس نکتے پر خود قائد انقلاب نے 10 اکتوبر 1958ء کو ایک اخباری بیان میں روشنی ڈالی۔ ایک خبر رساں ایجنسی کے نمائندے کے ساتھ ملاقات میں آپ نے کہا: ''انجام کار یہ ذمہ داری ہمیشہ فوج ہی پر عائد ہوتی ہے کہ وہ عوام کے حقوق کی حفاظت کرے۔ میں نے صدر سے دریافت کیا کہ کیا آپ کوئی قدم اٹھانے کو تیار ہیں یا نہیں؟ حالات میں تبدیلی لانے کی ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے۔ خدانخواستہ آپ نے ایسا نہ کیا تو ہم حالات میں ایسی تبدیلی لے آئیں گے۔'' صدر سکندر مرزا انقلاب کا ساتھ دینے کو تیار ہو گئے تو فوج کی نقل و حرکت ستمبر کے تیسرے ہفتے میں شروع ہو گئی۔ انقلاب کی تاریخ سے دو ہفتے قبل ایک بریگیڈ کراچی پہنچ چکی تھی۔ فوج کو آخری احکام 7 اکتوبر کو دیئے گئے۔ اسی دن کمانڈر انچیف محمد ایوب خاں کراچی پہنچے اور یہ طے کیا گیا کہ فوجی دستے شام کے ساڑھے نو بجے تک کراچی کے اہم مقامات' قصرِ صدارت' ریلوے سٹیشن' ریڈیو سٹیشن وغیرہ اپنی حفاظت میں لے لیں۔ یہی انتظامات دوسرے بڑے شہروں میں کئے گئے۔ مشرقی پاکستان میں فوج کے دستے سمگلنگ کی روک تھام کے سلسلے میں بکھرے ہوئے تھے۔ نئے مقصد کیلئے ان کی ترتیب اور نقل و حرکت اور اس اثناء میں مکمل رازداری کا انتظام خاصا مشکل مسئلہ تھا۔ اس مسئلے کی تفاصیل جنرل مراد خان کے حسن تدبر کے ذریعے طے ہوئیں۔

7 اکتوبر کی شام کو چند مرکزی وزیر قصر صدارت میں جمع تھے اور وہسکی کے ساتھ شغل فرما رہے تھے۔ صدر سکندر مرزا ان کا ساتھ بھی دے رہے تھے اور بار بار گھڑی کی جانب دیکھ رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ تھوڑی دیر میں فوجی دستے اپنے اپنے مقام سنبھالنے کیلئے روانہ ہونے والے ہیں۔ خدا خدا کر کے یہ مہمان آٹھ بجے کے قریب رخصت ہوئے۔ ساڑھے آٹھ بجے کے قریب فوجی دستوں کا مارچ شروع ہوا اور ایک گھنٹے کے اندر انہوں نے اپنے اپنے مقررہ مقام سنبھال لئے۔ بارہ بجے شب سے تھوڑی دیر بعد صدر سکندر مرزا کی جانب سے آئین کی منسوخی' مارشل لاء کے نفاذ اور مارشل لاء کے ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے جنرل محمد ایوب خاں کے تقرر کا اعلان ہو گیا اور وزارتیں اور اسمبلیاں حرف غلط کی طرح مٹ گئیں۔

اگلی صبح کو سرکاری دفتروں عدالتوں' بازاروں اور پبلک اداروں میں معمول کے مطابق کام ہوتے رہے۔ عوام

Marfat.com

نے اس تبدیلی کا کھلے دل سے غیر مقدم کیا۔ وہ وزارتوں اور ان کے ماتحت بڑھتی ہوئی ہر قسم کی بدعنوانیوں اور نااہلیوں سے تنگ آ چکے تھے۔ انہیں بہتر حالات کی امید پیدا ہوئی۔ ایک دو دن کے اندر یہ بات واضح ہو گئی کہ مارشل لاء کے ضوابط کے تحت سابقہ آئین میں ضروری ترامیم کے علاوہ عدالتی کام اسی آئین کے مطابق ہوتے رہیں گے۔ اور فوجی حکومت سول محکموں ہی کے ذریعے حکومتی کاروبار چلائے گی۔ لیکن ایک بات اکثر لوگوں کو حیران کرتی رہی اگر یہ انقلاب ملک کو سابقہ سیاسی سازشوں اور سیاسی لیڈروں کی بدعنوانیوں سے نجات دلانے آیا تھا تو اس انقلاب کے بعد سکندر مرزا کی صحیح جگہ کہاں تھی؟ مسند صدارت پر یا ملزموں کے کٹہرے میں؟ کیا ری پبلکن پارٹی کے جنم داتا اور حقیقی لیڈر سکندر مرزا نہ تھے؟ کیا ملک کے سیاسی عدم استحکام اور وزارتوں کی اکھاڑ پچھاڑ کیلئے سب سے زیادہ ذمہ داری انہی پر عائد ہوتی تھی؟ کیا نئے انتظام کے تحت پالیسیاں مرتب کرنے میں انہیں پھر دخل حاصل ہو گیا تھا؟ بظاہر نئی انقلابی حکومت کی صورت یہی تھی۔ یہ صدر سکندر مرزا اور جنرل محمد ایوب خاں کی مشترکہ حکومت تھی۔ 10 اکتوبر کو کراچی میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے جنرل ایوب خاں نے کہا کہ مارشل لاء اب بھی صدر سکندر مرزا کے ماتحت ہے اور سکندر مرزا آئین کی تنسیخ کے بعد بھی صدر مملکت ہیں۔ اس قانونی پوزیشن کے متعلق چیف جسٹس محمد منیر سے مشورہ لیا جا چکا تھا۔ ایک اور موقع پر جنرل ایوب نے کہا کہ ''نئی حکومت کا طریق کار یہ ہے کہ صدر سکندر مرزا اور میں باہمی مشورے سے ایسی پالیسی مرتب کرتے ہیں اور پھر اس پالیسی کو عملی جامہ پہنانا میری ذمہ داری ہے'' لیکن یہ صورت حال پاکستان کے اکثر لوگوں کے نزدیک ادھورے انقلاب کے مترادف تھی۔ جلد ہی یہ بات بھی ظاہر ہونے لگی کہ اس ردوعمل کے دونوں حاکموں کے درمیان ذہنی ہم آہنگی نہیں تھی۔

مارشل لاء کے نفاذ کے فوراً بعد صدر سکندر مرزا نے ایک مشاورتی کونسل نامزد کی تھی جو سیکرٹریٹ کے اعلیٰ افسروں پر مشتمل تھی۔ یہ صدر کی مشاورتی کونسل کہلاتی تھی۔ اور اس کے جلسوں پر صدر یا مارشل لاء کے ناظم اعلیٰ صدارت کرتے تھے۔ 15 اکتوبر کو صدر سکندر مرزا نے ایک اور اعلان کیا جس میں انہوں نے انقلابی حکومت کو ایک ''قومی کونسل'' میں تبدیل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ آپ نے کہا کہ ''ملک میں مارشل لاء کم سے کم مدت تک جاری رکھا جائے گا۔ اس کے بعد بارہ سے پندرہ ارکان پر مشتمل ایک قومی کونسل تشکیل کی جائے گی۔ جو نیا آئین بننے تک ملک کا نظم ونسق چلائے گی۔ جونہی قومی کونسل کی تشکیل عمل میں آئی موجودہ مشاورتی کونسل ختم کر دی جائے گی۔'' صدر مرزا نے اپنے ذاتی دوستوں کو بتایا کہ وہ مارشل لاء ایک مہینے کے قریب جاری رکھنا چاہتے تھے۔ گویا ان کے ذہن میں یہ پروگرام تھا کہ ایک مہینے کے بعد مارشل لاء ختم اور قومی کونسل کے صدر کی حیثیت سے ان کے اپنے ہاتھ میں عملاً مکمل اختیارات۔ لیکن ان کے اعلان سے جو تاثر پیدا ہوتا تھا اسے اگلے دن جنرل ایوب خاں کے ایک اعلان نے ختم کر دیا۔ مارشل لاء کے ناظم اعلیٰ نے بتایا کہ ملک کو روبصحت کرنے کیلئے چند اصلاحات نافذ کرنا ضروری ہے۔ یہ کام مارشل لاء کے زیر سایہ مکمل کیا جائے گا۔ بے شک مارشل لاء ضروری عرصے سے ایک دن بھی زیادہ قائم نہ رکھا جائے گا۔ اس کے علاوہ صدر کی مجوزہ ''قومی کونسل'' کے بجائے جو انتظام بروئے کار لایا گیا وہ یہ تھا کہ جنرل محمد ایوب خاں کو افواج کے سپریم کمانڈر اور مارشل لاء کے ناظم اعلیٰ کے عہدوں کے علاوہ ایک تیسرا عہدہ وزیر اعظم کا دے دیا گیا۔ جو اپنی کابینہ مرتب کرنے کے وہی اختیار رکھتا تھا جو وزیر اعظم کو حاصل ہوتے ہیں۔ وزیر اعظم کی حیثیت سے جنرل ایوب نے بارہ ارکان کی ایک کابینہ کا اعلان کر دیا۔ جن میں خود ان کے علاوہ صرف

Marfat.com

تین فوجی جرنیل شامل تھے۔ باقی آٹھ ممبر غیر فوجی تھے۔ اس کابینہ کا اعلان 24 اکتوبر کو ہوا۔

بہرصورت سکندر مرزا کو صدارت کے عہدے پر فائز رکھنے کا تجربہ بیس دن کے اندر ترک کرنا پڑا۔ 27 اکتوبر کی شام کو آٹھ بجے کے قریب جنرل ایوب خاں نے اپنی کابینہ کے تین فوجی ارکان' جنرل اعظم' جنرل شیخ اور جنرل برکی کے ذریعے ایک مختصر پیغام صدر سکندر مرزا کو بھیجا۔ تینوں جرنیلوں نے قصر صدارت میں سکندر مرزا سے ملاقات کی۔ جنرل محمد ایوب خاں نے خود یہ تمام واقعہ 30 اکتوبر کو چند غیر ملکی اخبار نویسوں کو بتایا۔

''ہمیں ملک بھر سے یہ اطلاعات موصول ہو رہی تھیں کہ لوگ اس بات پر مضطرب تھے کہ اگر تمام اختیارات دو افراد کے پاس رہے تو پالیسی میں ابہام کا امکان پیدا ہوتا رہے گا اور اس امر کا احتمال بھی تھا کہ یہ پالیسی سمجھوتوں اور مفاہمتوں کی مظہر بن جائے گی۔ علاوہ ازیں جنرل مرزا نے ان سیاستدانوں سے بہت زیادہ ربط وضبط بڑھا رکھا تھا جو ملک کو موجودہ حالات تک پہنچانے کے ذمہ دار تھے اور ملک میں یہ عام احساس تھا کہ جنرل مرزا سیاسی ابتری کے اسی طرح ذمہ دار تھے جس طرح کوئی دوسرا شخص۔ ان حالات میں یہ ضروری معلوم ہوتا تھا کہ ماضی سے قطع تعلق کر کے حالات کی نئی طرح ڈالی جائے۔''

ان اخبار نویسوں نے پوچھا: ''کیا آپ نے کسی خاص اطلاع کی بناء پر کارروائی کی؟'' جنرل ایوب کا جواب یہ تھا: ''بعض چیزیں میرے نوٹس میں لائی گئیں جنہیں بتانا میں پسند نہیں کرتا۔'' (روزنامہ پاکستان ٹائمز۔ 31 اکتوبر 1958ء)

سکندر مرزا نے جنرل ایوب خاں کے نمائندوں کی گفتگو کا رجحان دیکھتے ہی استعفیٰ دینے کی پیش کش کر دی۔ انہیں یہ بتایا گیا کہ استعفے کے بعد ان کا دارالحکومت یا ملک میں رہنا مناسب نہ ہوگا۔ ملنے ملانے والے اور سوال پوچھنے والے خود ان کیلئے دردسر بن جائیں گے۔ انہوں نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور انگلستان چلے جانے کی خواہش ظاہر کی۔ اس کیلئے انتظامات کی تکمیل تک انہوں نے اپنا وقت کراچی کی بجائے کوئٹہ میں گزارنا منظور کیا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے استعفے کے اعلان پر دستخط کر دیئے اور 28 اکتوبر کو علی الصبح اپنی بیگم ناہید مرزا کے ہمراہ ہوائی اڈے کو روانہ ہو گئے اور وہاں سے ہوائی جہاز میں بیٹھ کر کوئٹہ پہنچ گئے۔ ان کیلئے بیرونی زرمبادلہ اور پنشن وغیرہ کی ادائیگی کے انتظامات مکمل ہوتے ہی سکندر مرزا کراچی کے راستے انگلستان روانہ ہو گئے۔

سکندر مرزا نے اپنے استعفے کا اعلان ان الفاظ میں کیا: ''تین ہفتے ہوئے میں نے پاکستان میں مارشل لاء نافذ کیا اور جنرل محمد ایوب خاں کو مسلح افواج کا سپریم کمانڈر اور مارشل لاء کا ناظم مقرر کیا۔ خدا کے فضل سے میرے اس اقدام کی جو میں نے اپنے محبوب ملک کے مفاد میں کیا تھا۔ ملک کے عوام نے اور بیرون ملک ہمارے دوستوں نے بے انتہا تعریف و تحسین کی۔ میں نے مارشل لاء کے نفاذ کے بعد جنرل ایوب خاں اور ان کی انتظامیہ کو مزید ابتری کو روکنے اور بدنظمی اور انتشار کو ختم کر کے نظم وضبط قائم کرنے میں پوری مدد دی۔ ہم نے ملک کے آئندہ نظم وضبط کیلئے موثر ڈھانچہ قائم کرنے کی جو مساعی کیں اور گزشتہ تین ہفتوں میں ہمیں جو تجربہ حاصل ہوا اس کی بنیاد پر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ (1) اس انتہائی اہم نوعیت کی مہم کی موثر تکمیل کیلئے دوہرے کنٹرول سے زیادہ نقصان دہ کوئی چیز نہیں ہو سکتی اور (2) ملک کے اندر اور باہر بہت سے لوگوں کے دلوں میں یہ تاثر موجود ہے کہ میں اور جنرل ایوب خاں ہمیشہ باہم تعاون نہ کر سکیں گے۔ مجھے یہ شدید

Marfat.com

احساس ہے کہ اگر اس قسم کے تاثر کو باقی رہنے دیا گیا تو اس سے ہمارے مقصد کو انتہائی نقصان پہنچے گا۔ اس لئے میں نے الگ ہو جانے اور تمام اختیارات جنرل ایوب خاں کو سپرد کر دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں جنرل ایوب خاں اور ان کے ساتھیوں کی بہترین کامیابی کیلئے دعا مانگتا ہوں۔ پاکستان زندہ باد۔''

اسی رات کو جنرل ایوب خاں نے صدر کا عہدہ سنبھال لیا۔ وزیراعظم کا عہدہ ختم کر دیا گیا اور اگلے دن وزیراعظم کی کابینہ کے ممبروں نے صدر ایوب کی وزارتی کونسل کے ارکان کی حیثیت سے از سر نو عہدے کا حلف اٹھایا۔ اس کے بعد مارشل لاء کی میعاد تک صدر ایوب کی ذات میں تین عہدے جمع رہے۔ (1) صدر مملکت کا عہدہ (2) افواج کے سپریم کمانڈر کا عہدہ اور (3) مارشل لاء کے ناظم اعلیٰ کا عہدہ

پاکستان میں مارشل لاء کے نفاذ نے ہماری خارجہ پالیسی پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ گو کہ سرد جنگ کا دور تھا لیکن عالمی سطح پر ہماری حیثیت ایک جمہوری ملک سے ''ڈکٹیٹر شپ'' کی ہوگئی اور بھارت کو پاکستان پر ایک اخلاقی برتری بھی اس لحاظ سے حاصل ہوگئی۔

مارشل لاء کے حوالے سے اس کے محرک فیلڈ مارشل جنرل ایوب خاں کا بیان ہے:

''نقارے پر چوٹ پڑ چکی تھی۔ وہ لمحہ جس کا مدت سے انتظار تھا آخر کار آ پہنچا تھا۔ اب ذمہ داری سے جان چرانا ممکن نہ رہا تھا۔ یہ 4 اکتوبر 1958ء کا دن تھا۔ اور جب میں اپنے ریلوے سیلون میں سوار ہوا' تو میں جانتا تھا کہ اب یہ دور ختم ہونے کو ہے۔ میں کراچی جا رہا تھا۔ جہاں ایک سیاسی سوانگ ایک لمبے عرصے سے کھیلا جا رہا تھا اور اب اس کے ختم ہونے کا وقت آ پہنچا تھا۔ اس سے چند روز پہلے صدر سکندر مرزا نے مجھے بتایا تھا کہ صورت حال ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہے اور میں نے اقدام کا فیصلہ کر لیا ہے۔

برسوں سے ہم سب لوگ یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ ملک کے سیاسی رہنماؤں کو اپنی اہم ذمہ داریوں کا احساس ہوگا۔ ان میں وطن دوست بھی تھے' اور لائق اور نالائق لوگ بھی۔ کچھ ایسے تھے جنہیں قائداعظمؒ سے گہرا واسطہ رہا تھا اور دیکھ چکے تھے کہ انہوں نے پاکستان کی جدوجہد کی کس بصیرت' تدبر' حوصلے اور عزم کے ساتھ رہنمائی کی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے یہ بھی ارادے کے ساتھ حکومت کے سفینے کو بھنور سے نکالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے اقتدار کی رسی کو جھپٹ کر پکڑ لیا تھا اور ایک آن کیلئے اُجالے میں آ کر جوڑ توڑ اور نااہلی کے اندھیرے میں جا پڑا تھا۔ میں 5 اکتوبر کو کراچی پہنچا۔ یحییٰ' حمید اور دو ایک اور افسر مجھ سے پہلے وہاں پہنچ چکے تھے۔ میں جنرل سکندر مرزا سے ملنے گیا۔ وہ لان میں بیٹھے تھے۔ سوچ میں ڈوبے ہوئے' چہرے سے ملال اور مایوسی ٹپکتی ہوئی۔ میں نے ان سے پوچھا۔ ''کیا آپ نے اچھی طرح سوچ سمجھ لیا ہے؟''

''کیا آپ کے خیال میں یہ مطلقاً ضروری ہے؟''

''ہاں۔ یہ مطلقاً ضروری ہے۔'' انہوں نے مضبوط ارادے کے ساتھ کہا۔

میں اس کو بڑی بدقسمتی کی بات سمجھتا تھا کہ وقت کی نزاکت ہمیں ایسا سخت قدم اٹھانے پر مجبور کر دے اور پھر خود کو اس کارروائی میں شریک دیکھنا بھی تو کوئی خوش گوار بات نہ تھی۔ مگر اس کے سوا کوئی اور چارہ کار بھی نہ تھا۔ ملک کو بچانے کا یہ

Marfat.com

آخری موقع تھا۔

اس سے چند روز پہلے سات وزیر جن میں چار سرکاری وزیر تھے' مرکزی کابینہ میں اپنے عہدے کا حلف اٹھا چکے تھے۔ ان کو ملا کر وزیروں کی کل تعداد چھبیس تک پہنچ گئی تھی۔ یہ قدم ری پبلکن اور عوامی لیگ کی ملی جلی حکومت کو جس کے سربراہ ملک فیروز خان نون تھے' سنبھالا دینے کیلئے اٹھایا گیا تھا' کیونکہ وہ بری طرح ڈول رہی تھی۔ اس کے بعد عہدوں کی تقسیم پر بڑی تو تو میں میں ہوئی۔ 7 اکتوبر کو دن کے ایک بجے عہدے ازسرنو تقسیم کئے گئے۔ اس پر عوامی لیگ نے جھٹ استعفیٰ دے دیا۔ شام کو سات بجے عہدوں کی تازہ تقسیم کا اعلان کیا گیا۔ مگر اس وقت تک مرکزی اقتدار کی عمارت ڈھے چکی تھی۔ شام کو آٹھ بجے سکندر مرزا نے بڑے ڈرامائی انداز میں آئین کو منسوخ کر دیا۔ سارے پاکستان میں مارشل لاء کا اعلان کر دیا۔ مرکزی اور صوبائی حکومتوں' قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کو منسوخ کر دیا اور مجھے مارشل لاء کا منتظم اعلیٰ مقرر کر دیا۔

اس گھڑی کے بعد کی کارروائیوں میں جذباتی باتوں کا کچھ دخل نہ رہا۔ جب ایک کام کرنا ہی ہے تو اسے اچھی طرح سے کیا جائے۔ ایک سیدھا سادہ طریق کار سوچا گیا اور اس پر عملدرآمد شروع ہو گیا۔ میں نے جنرل سکندر مرزا کو مشورہ دیا ''بہتر ہو گا کہ آپ اپنے وزیراعظم کو اس صورت حال کی اطلاع دے دیں۔'' لیکن ان کا خیال تھا کہ اس کی ضرورت نہیں' کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ کارروائی قانونی طور پر بالکل صحیح ہے۔

میں نے کہا۔ ''میں آپ سے دو باتیں تحریری صورت میں چاہتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ آپ مارشل لاء کا انتظام میرے سپرد کرتے ہیں اور دوسری یہ کہ آپ وزیراعظم کو خط لکھیں کہ یہ فیصلہ آپ نے کیا ہے۔ آپ نے حکومت کو برطرف کیا ہے' آئین کو منسوخ کیا ہے' مارشل لاء کا اعلان کیا ہے' اور مجھے مارشل لاء کا منتظم مقرر کیا ہے۔''

انہوں نے ملک فیروز خاں نون کو خط تو بغیر حیل و حجت کے لکھ دیا' مگر وہ مجھے مارشل لاء کے انتظام کا تحریری اختیار دینے پر آمادہ نظر نہ آتے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ وزیراعظم کو خط لکھ دیں تاکہ اپنے اس فیصلے کی پوری ذمہ داری ان پر عائد ہو۔ وہ حکومت کے آئینی سربراہ کی حیثیت سے اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ملک کا انتظام آئینی طور پر ممکن نہیں رہا۔

میں نے کہا ''آخر آپ نے کوئی قدم تو اٹھایا ہی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ صحیح قدم اٹھایا ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ کا فیصلہ تحریری صورت میں میرے پاس موجود ہو۔''

وہ ٹال مٹول کرنے لگے لیکن آخر کار انہوں نے دو تین دن کے بعد یہ خط لکھ کر دینا منظور کر لیا۔ انقلاب کیلئے بہت پہلے سے تیاریاں کرنی پڑتی ہیں' لمبے چوڑے منصوبے بنائے جاتے ہیں' خفیہ جلسے ہوتے ہیں' اور ملک بھر میں فوج کی نقل و حرکت ہوتی ہے۔ ہمارے معاملے میں ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس کو ایک فوجی کارروائی کے طور پر انجام دیا گیا۔ بس اتنا ہوا کہ ایک بریگیڈ کو حرکت میں لایا گیا۔ دراصل عام طور پر کراچی میں دو بریگیڈ' ایک انفنٹری اور ایک آرٹلری بریگیڈ تو متعین رہتے ہی ہیں۔ چنانچہ اگر مارشل لاء جاری کر دینے کے بعد کچھ گڑبڑ ہوتی تو اس پر قابو پانے کیلئے ہمارے پاس کافی فوج موجود تھی۔ لیکن ہم نے احتیاط کے طور پر ایک اور بریگیڈ کوئٹہ سے بلوا کر کراچی سے باہر جنگ شاہی میں ٹھہرا لیا۔ بس یہ تھی ہماری فوجی تیاری۔ فوج کو ہر قسم کی غیر متوقع صورت حال کیلئے ہر وقت تیار رہنا پڑتا ہے۔ اس قسم کی کارروائی

Marfat.com

میں ناکامی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کہیں مارشل لاء کے خلاف آواز اٹھائی جاتی' خواہ لمحہ بھر کیلئے ہی سہی' تو اس سے بڑی خطرناک صورت حال پیدا ہو جاتی۔ جنگ شاہی میں بریگیڈ کو ٹھہرانے میں اسی احتیاط کو مدنظر رکھا گیا تھا۔

انقلاب کی رات کو ہم نے کمانڈر زان چیف اور تمام مقامی کمانڈروں کو اس صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔ اور ان سے کہا تھا کہ ہر صورت میں امن امان قائم رکھیں۔ بس یہ تھی کل کارروائی۔ اس کے بعد ہم مارشل لاء کے منتظمین کے درجہ بدرجہ تقرر میں مصروف ہو گئے۔ ان لوگوں کو ان کے فرائض سے آگاہ کیا گیا۔ رفتہ رفتہ سول حکام اور فوج کے درمیان رابطہ پیدا ہونا شروع ہو گیا۔

ہم نے اس بات کا تو پورے طور پر اطمینان کر لیا تھا کہ یہ کارروائی کامیاب رہے گی۔ اب سوال یہ تھا کہ اس کارروائی کو کن حدود میں رکھا جائے۔ میرا اپنا خیال یہ تھا کہ اگر کہیں مزاحمت ہوئی بھی تو وہ برائے نام ہی ہوگی۔ اور ہم اس پر آسانی سے قابو پا لیں گے۔ چنانچہ طاقت کے استعمال کا موقع ہی نہیں آئے گا۔ لوگ ملک کے حالات سے بہت بیزار ہو چکے ہیں اور تبدیلی کے سخت خواہش مند ہیں۔ اور پھر ان کے دل میں فوج کا بے حد احترام بھی ہے۔

اس دوران میں یہ ذکر بھی آیا کہ یہاں بھی مارشل لاء کا وہی ضابطہ نافذ کیا جائے جو 1953ء میں لاہور میں پہلے مارشل لاء کے موقع پر جاری کیا گیا تھا' اور جس کی رو سے ان لوگوں کے خلاف کارروائی کی جا سکتی تھی جو ملک میں نظم و ضبط کی بربادی کے ذمہ دار تھے۔ انقلاب کے موقع پر ہم نے سب سے پہلے اس قاعدے پر عمل کرنے کی ٹھانی تھی۔ اس سے ہمیں ان سیاست دانوں کے خلاف اقدام کرنے کا اختیار مل جاتا جو ملک کو تباہی کے غار پر پہنچانے کا باعث ہوئے تھے لیکن میں نے کہا: ''ہمیں یہ خیال ترک کر دینا چاہیے۔'' میں چاہتا تھا کہ لوگ جلد اپنی اپنی جگہ پر جم جائیں اور ملک کی تعمیر نو اور معاشرے کی بحالی کے کاموں میں مصروف ہو جائیں۔ ان کا بخار جلد سے جلد اتر جائے۔ مارشل لاء ایسی آسانی سے جاری ہو گیا جیسے کوئی بجلی کا بٹن دبا دے۔ حالات آپ سے آپ سدھرنے شروع ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے لوگ بنیادی طور پر بڑے باشعور تھے اور ہماری سول ملازمتوں میں اچھے لوگ موجود تھے۔ ایک سبب یہ بھی تھا کہ میں نے مارشل لاء کو لوگوں کی پچھلی حرکتوں پر سزا دینے کا ذریعہ نہیں بنایا۔ اگر ایسا کیا جاتا تو ہمارے اقدام کی تعمیری نوعیت کے خلاف ہوتا۔

ملک کو ترقی کرنے اور خود کو ایک پختہ اور بڑھتی ہوئی طاقت میں ڈھالنے کیلئے' صحیح قسم کی جدوجہد کی ضرورت تھی۔ ہمارے پاس کام کے آدمی ویسے ہی کم تھے' ان کو تعمیری کاموں میں لگانے کی بجائے ملک میں خوف و ہراس کی فضا پیدا کرنا اور لوگوں کو جبر کا نشانہ بنانا بے فائدہ تھا۔ عقل کی بات یہ تھی کہ اپنے آدمیوں سے اچھے کام لئے جائیں۔ میرے ذہن میں یہ بات واضح تھی کہ اگر مارشل لاء سے کوئی فائدہ اٹھانا ہے تو یہی کہ حکومت کی مشینری کو پھر سے استوار کر دیا جائے تاکہ وہ اپنا کام شروع کر دے۔

مارشل لاء جاری ہونے کے بعد اگلی صبح کو میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مرکزی حکومت کے تمام سیکرٹریوں کی ایک میٹنگ بلوائی۔ میں نے ان کو صورت حال سے آگاہ کیا اور بتایا کہ ان کا کام کیا ہوگا۔ میں نے پالیسی کا ایک خاکہ بھی ان کے سامنے پیش کیا۔ میں نے دیکھا کہ ان میں سے دو ایک سیکرٹری کچھ روٹھے ہوئے سے معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے ان کی مزاج پرسی مارشل لاء کے دوران میں ایک مرتبہ میں نے اخباری نمائندوں سے کہا تھا: ''میری کیفیت اس شخص کی

Marfat.com

سی ہے جو جلدی میں ہو۔ کام بہت زیادہ ہیں اور وقت بہت تھوڑا۔'' میرا مقصد یہ نہ تھا کہ لوگ ہر بات میں مجھ پر انحصار کریں اور سارا اختیار میرے ہی ہاتھ میں ہو بلکہ خود کام کریں۔ وہ جتنی جلدی اپنے آپ کام کرنا سیکھ جائیں اتنا ہی بہتر ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ میں جلد سے جلد مارشل لاء کو ختم کرنا اور آئینی حکومت قائم کرنا چاہتا تھا۔ ملک کو بعض بڑی بڑی اصلاحات کی سخت ضرورت تھی۔ مارشل لاء تو بس ان اصلاحات کا نقطہ آغاز تھا۔ بلاشبہ اگر کوئی ان اصلاحات میں مزاحم ہوتا تو اس کے خلاف سخت کارروائی کی جاتی۔ لیکن خوش قسمتی سے ایسا کوئی موقع ہی نہیں آیا۔

مثال کے طور پر یہ دیکھیے کہ لوگوں نے اپنی چھپی ہوئی دولت کا جس پر انہوں نے ٹیکس نہیں دیا تھا' کس قدر عجلت سے اعلان کر دیا۔ انہوں نے ایک ارب ستر کروڑ روپے کی رقم کا اعلان کیا تھا۔ میں نے ایک تاجر سے پوچھا ''تم نے ایسا کیوں کیا؟''

اس نے جواب دیا: ''میں نے آپ کا ایک فوٹو دیکھا جس میں آپ اپنی انگلی سے یوں اشارہ کر رہے تھے۔ اور آپ اپنے ہونٹ یوں سکیڑے ہوئے تھے۔ میں نے دل میں کہا' بابا یہ آدمی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ اگر ہم نے اس کی بات نہ مانی تو ہماری شامت آ جائے گی۔ ہم سب نے مل کر فیصلہ کیا کہ اس کی بات مان ہی لو۔ اور پھر ہمیں انکم ٹیکس بھی تو 75 فیصد کے بجائے 33 فیصد دینا تھا۔ اسلئے ہم نے سوچا کہ چلو سستے چھوٹے!''

آخر میں اس نے کہا: ''آپ نے خود کو چھنگلی تک نہ اٹھائی' مگر وہ فوٹو کام کر گیا۔''

مارشل لاء کے فوری مقاصد بھی تھے اور طویل المیعاد مقاصد بھی۔ ایک فوری مقصد نہ تھا کہ حکومت کے سول اور آئینی اداروں کو بحال کیا جائے۔ یہ ادارے غلط اور خود غرضانہ استعمال کے باعث ناکارہ اور بے جان ہو چکے تھے۔ ان کو مارشل لاء کی نگرانی کی ضرورت تھی تاکہ وہ آئین کے تحت پھر سے اپنے اپنے اصلی کاموں میں مصروف ہو جائیں۔

اس زمانے میں فوج کو بعض اہم مقاموں پر متعین کیا گیا تھا' جہاں سے اس کو ضرورت کے وقت بلایا جا سکتا تھا۔ انقلاب کے ابتدائی دنوں میں جب لوگوں کو فوج کہیں نظر نہ آئی تو ان کو کچھ حیرانی سی ہوئی۔ لفظ ''انقلاب'' کا مطلب ہے سول کی جگہ فوج کا یا کم از کم ایک ''خاص'' اقتدار کا عمل دخل ہو جانا۔ یہ تبدیلی درحقیقت رونما تو ہو چکی تھی' مگر میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کا مظاہرہ ہو۔ لازم تھا کہ فوج کو پس منظر میں رکھا جائے' کیونکہ ملک کی عام زندگی میں فوج کا اصلی مقام وہی ہے۔ اگر فوج کا براہ راست سول انتظام میں دخل ہو جاتا تو اس سے سول اقتدار کی حالت اور پتلی ہو جاتی' اور وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔ علاوہ ازیں فوج کو شہری زندگی سے واپس بلانے میں بھی بڑی دشواری پیش آتی۔ مجھے تو اس امر میں بھی شک نہیں کہ اگر فوج سول انتظام کے چلانے میں کچھ زیادہ مشغول ہو جاتی' یا اسے ملک کے اقتصادی' سماجی یا سیاسی معاملات میں کچھ زیادہ الجھ جاتی' تو اس کی اپنی افادیت غارت ہو جاتی۔ (فرینڈز ناٹ ماسٹرز صفحہ 307 تا 312)

▀▄▀

مارشل لاء کے حوالے سے صدر ایوب خاں کے خیالات ان کے ذاتی خیالات تو ہو سکتے ہیں لیکن زمینی سچائیوں سے ان کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ اس حقیقت سے انکار کوئی عقل کا اندھا ہی کر سکتا ہے کہ عالمی منظر نامے میں ایک ڈکٹیٹر شپ گورنمنٹ اور ایک آزاد جمہوری ملک کے درمیان کیا فرق روا رکھا جاتا ہے۔ مارشل لائی حکومتوں کو سپر پاورز اپنے مقاصد

Marfat.com

کیلئے سازگار پانے کی وجہ سے اپنے لئے استعمال ضرور کرتی رہتی ہیں لیکن انہیں عالمی سیاست میں کبھی وہ مقام حاصل نہیں ہوتا جو ایک جمہوری حکمران کو حاصل ہے۔ پاک بھارت تعلقات اور مذاکرات میں اس بنیادی سچائی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

16 نومبر 1948ء کو لیاقت علی خان نے مسئلہ کشمیر کو اقوام متحدہ میں پیش کرنے کی نہرو کی تجویز مان لی۔ 20 جولائی 1950ء کو دونوں ممالک کے وزرائے اعظم کی کانفرنس دہلی میں ہوئی جس میں وزیر داخلہ سردار پٹیل کے منفی کردار کی وجہ سے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوسکا۔ یہ کانفرنس اقوام متحدہ کے نمائندے کی نگرانی میں ہوئی تھی' جو بار آور نہ ہوسکی۔ 1953ء میں جب محمد علی بوگرہ پاکستان کے وزیر بنے تو مسئلہ کشمیر کے حوالے سے دونوں ممالک کے درمیان پیدا ہونے والی تلخی کو کم کرنے کی خواہش دونوں اطراف سے ظاہر کی گئی اور جون 1953ء میں لندن میں ہونے والی دولت مشترکہ کانفرنس میں پاکستانی وزیراعظم محمد علی بوگرہ اور پنڈت جواہر لال نہرو کے درمیان لندن میں مذاکرات ہوئے' جہاں فیصلہ کیا گیا کہ اقوام متحدہ کے کمیشن برائے پاک و ہند کے اختلافات کا تصفیہ کرنے کیلئے مذاکرات کا سلسلہ دونوں ممالک کے درمیان جاری رہنا چاہئے۔ یہ دونوں ممالک کے وزرائے اعظم کے درمیان ہونے والی اس سلسلہ کی دوسری ملاقات تھی' جو کراچی میں 25 جولائی سے 27 جولائی 1953ء تک جاری رہی' لیکن اس ملاقات کا بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

مئی 1954ء میں پاکستان مغربی طاقتوں کا اتحادی بنا تو بھارت نے اس مسئلے کو بڑی سنجیدگی سے لینا شروع کردیا۔ اس دوران پاکستان اور مغربی ممالک کے درمیان کچھ معاہدے بھی ہوئے۔ 1954ء میں پاکستان سینٹو کے بعد سیٹو کا بھی ممبر بن گیا' اس مشترکہ دفاعی تنظیم میں برطانیہ، ترکی، ایران اور عراق بھی شامل تھے۔ اس صورت حال نے بھارتی حکومت کو پریشان کردیا تو انہیں پھر پاکستان کے ساتھ مذاکرات کی ضرورت پیش آئی اور 17 تا 20 اگست 1953ء میں پھر دونوں ممالک کے وزرائے اعظم کے درمیان سربراہی مذاکرات دہلی میں ہوئے' جن میں یہ مشترکہ اعلامیہ جاری کیا گیا کہ دونوں ممالک اس بات پر متفق ہیں کہ مسئلہ کشمیر ریاست کے عوام کی خواہشات کے مطابق حل ہونا چاہئے اور لوگوں کی خواہشات معلوم کرنے کا بہترین طریقہ ''رائے شماری'' قرار دیا گیا۔ دونوں ممالک کے وزرائے اعظم نے اس بات پر اتفاق کیا کہ اپریل 1954ء تک رائے شماری کیلئے ایڈمنسٹریٹر مقرر کردیا جائے گا' بہ ظاہر یہ بڑی کامیابی تھی اور اس سے پاکستان اور کشمیری عوام کو امید ہو چلی تھی کہ اب یہ معاہدہ ہوجائے گا لیکن اچانک بھارتی وزیراعظم پنڈت جواہر لعل نہرو نے اسے ختم کرنے کی عجیب وغریب توجیہ تلاش کرلی' انہیں اس بات کی شکایت پیدا ہوئی کہ پاکستان نے امریکہ سے فوجی معاہدہ کیوں کرلیا ہے؟

نہرو نے پاکستانی وزیراعظم کو خط لکھا کہ اس دفاعی معاہدے کا اثر ہمارے مذاکرات پر بھی پڑے گا اور کشمیر میں صورت حال خراب ہوجائے گی' جس پر محمد علی بوگرہ نے انہیں کہا کہ پاکستان اور امریکہ کے درمیان معاہدے سے مسئلہ کشمیر کا متاثر ہونا بڑی عجیب منطق ہے اور انہیں سمجھ نہیں آتی کہ اس معاہدے کا کشمیری عوام کے حق خودارادیت سے کیا تعلق ہے؟ لیکن پنڈت نہرو اس جواب سے مطمئن نہ ہوئے' اس دوران دونوں وزرائے اعظم کے درمیان خط وکتابت کا سلسلہ جاری رہا' ایک مرحلے پر محمد علی بوگرہ نے نہرو کو مطمئن کرنے کیلئے 3 ستمبر 1953ء کو مستعفی ہونے والے ناظم رائے شماری

Marfat.com

ایڈمرل نمز کی جگہ نئے ناظم رائے شماری کے تقرر پر رضا مندی بھی ظاہر کی۔ 24 فروری 1954 کو انہوں نے نہرو کو خط لکھ کر مطمئن کرنے کی کوشش کی لیکن پنڈت نہرو نے یکم مارچ 1954ء کو بھارتی پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کو ملنے والی امریکی امداد سے ایشیائی ممالک کیلئے سنگین خطرات لاحق ہو گئے ہیں اور اس سے پاکستان اور بھارت کے درمیان طے پانے والے مذاکرات کی حیثیت بھی متاثر ہو سکتی ہے۔

5 مارچ 1954ء میں انہوں نے پاکستانی وزیر اعظم محمد علی بوگرہ کو خط لکھا کہ اندریں حالات وہ بھارتی فوج کی جموں و کشمیر میں موجودگی ضروری سمجھتے ہیں' کیونکہ پاکستان نے امریکی فوجی امداد قبول کر کے کشمیر کے تنازعے کو نیا رنگ دے دیا ہے۔ پنڈت نہرو کی اس عجیب و غریب دلیل کے ساتھ ہی بھارتی خارجہ پالیسی نے اچانک نیا موڑ لیا اور انہوں نے یو این او یا کسی اور ذریعے سے کشمیر پر مذاکرات کے تمام راستے بند کرتے ہوئے کشمیر کو بھارت کا اٹوٹ انگ قرار دے دیا۔ اس دوران بھارتی حکومت نے شیخ عبداللہ کی کشمیر میں گرفتاری کے بعد سے پیدا شدہ بحران پر بھی کافی حد تک قابو پالیا تھا اور مقبوضہ کشمیر کے نئے وزیر اعظم بخشی غلام محمد نے اپنے قدم مضبوط کر لئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی بھارتی صدر نے مقبوضہ کشمیر کا دورہ کیا اور بھارتی آئین کی دفعہ 370 کے ذریعے مقبوضہ کشمیر کو مرکزی الیکشن کمیشن کے دائرہ کار میں شامل کرتے ہوئے کشمیر ہائی کورٹ کو بھارت کے دیگر ہائی کورٹس کے ساتھ شامل کر دیا' اس کے ساتھ پنڈت نہرو نے ایک دوسری تجویز پیش کر دی کہ کشمیر میں جغرافیائی اور مذہبی بنیادوں پر حلقہ بندیاں بنا کر استصواب رائے کروایا جائے اور یہ بھی گوہر افشانی کی کہ جو کشمیری پاکستان ہجرت کر گئے ہیں' انہیں رائے شماری میں حصہ لینے کی اجازت نہیں ہوگی۔ اس طرح انہوں نے 1949ء میں یو این او میں پیش کردہ ریزولیشن کو خود ہی غلط قرار دے دیا۔

مئی 1954ء میں وادی سندھ کے پانی کی تقسیم پر پاکستان کی عالمی بنک کے ساتھ الجھنیں پیدا ہونا شروع ہو گئی تھیں اور اس بات کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ اس مسئلے کا کوئی باقاعدہ حل نکالا جائے' کیونکہ پاکستان اور بھارت کے درمیان پانی کی تقسیم کا مسئلہ کسی بھی وقت سنگین صورت اختیار کر سکتا ہے۔ اس دوران 24 اپریل 1959ء کو پاکستانی صدر فیلڈ مارشل ایوب خاں نے اچانک بھارت اور پاکستان کے مشترکہ دفاع کی تجویز پیش کر دی' جس کا بھارت میں بہت غلط مطلب لیا گیا۔ پنڈت نہرو نے 4 مئی 1959ء کو لوک سبھا سے خطاب میں کہا کہ ہم ہرگز کسی بھی ملک سے فوجی اشتراک نہیں کریں گے خواہ حالات کیسے بھی خراب ہو جائیں۔

پانی کے مسئلے پر مذاکرات کرنے کیلئے صدر ایوب یکم ستمبر 1960ء کو نئی دہلی گئے اور 19 ستمبر تا 23 ستمبر 1960ء پنڈت نہرو نے پاکستان کا دورہ کیا۔ 21 ستمبر کو مری میں صدر ایوب اور پنڈت نہرو کے درمیان مذاکرات کا آغاز ہوا' جس کے نتیجے میں "معاہدہ سندھ طاس" عمل میں آیا' جس کو آج بھی ایک متنازع حیثیت حاصل ہے اور پاکستان میں اس منصوبے نے قحط سالی کی بنیاد رکھی۔

Marfat.com

دوسرا دور

1961ء تا 1971ء

بھارت پاکستان تعلقات اور مذاکرات کا دوسرا دور 1961 تا 1971 پر محیط ہے۔ اس دور میں پاکستان کو تاریخ کے تین نمایاں ترین واقعات یا حادثات جو بعد میں سانحات کی شکل اختیار کر گئے پیش آئے۔ پہلا اہم واقعہ پاکستان میں مارشل لا کا نفاذ تھا، دوسرا 1965ء کی جنگ جس نے بالآخر پاکستان دولخت کر دیا اور تب سے آج تک ہم مسلسل ''کمپرومائز'' کرتے چلے آ رہے ہیں۔ یہ سارا دور صدر جنرل ایوب خان کی حکومت پر محیط ہے۔ گذشتہ ابواب میں مرحوم جنرل ایوب خان نے اس مارشل لا کے اسباب اور اپنا ''انقلابی نقطہ نظر'' بیان کر دیا ہے۔ کاش وہ اس تباہی کا اندازہ کر سکتے جس نے اس مارشل لا کے بطن سے جنم لیا اور اس کے بعد سے ہم مسلسل مارشل لاؤں کا شکار ہو رہے ہیں۔

ایوب دور حکومت میں امریکہ کے ساتھ منافقانہ تعلقات کے باوجود ہمارا جھکاؤ چین کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اس کا بظاہر ایک ہی اہم سبب دکھائی دیتا ہے کہ پاکستان امریکہ کی طرف سے پابندی عائد ہونے کے بعد امریکی اسلحے کے حصول سے ناامید ہو گیا تھا اور پاکستان کو اس تلخ حقیقت کا بھی شدت سے احساس ہونے لگا تھا کہ امریکہ کی قیمت پر روس کی ناراضگی مول لینا بڑا مہنگا سودا تھا لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

اس وقت خارجہ پالیسی کو بہت سی مشکلات کا سامنا تھا۔ بھارت کے جنگی عزائم کا سامنا کرنا، اپنے دفاع کے لیے اقدامات کرنا، اپنی دفاعی پالیسی کی تشکیل نو کرنا، نہری پانی کا جھگڑا طے کرنا، چین اور پاکستان کی سرحد کا مسئلہ حل کرنا، بھارت اور پاکستان کی جنگ، اسلحہ پر پابندی اور تاشقند کا سمجھوتہ جیسے مسائل پاکستان کے سامنے کھڑے تھے۔ 1960ء میں بھارت اور پاکستان کی مذاکراتی ٹیموں نے مغربی پاکستان اور بھارت کے درمیان سرحد کے مسائل پر بات چیت کی۔ رن آف کچھ کے جھگڑے کے علاوہ باقی تمام معاملات طے پا گئے مگر رن آف کچھ کے مسئلے پر اختلافات میں اضافہ ہوتا گیا یہاں تک کہ اس جھگڑے کو طے کرنے کے لیے ثالثی کا اصول تسلیم کیا گیا اور اس کا شمالی نصف حصہ پاکستان کو دے دیا گیا۔ برطانیہ نے اس مسئلے میں ثالثی کا کردار ادا کرتے ہوئے معاہدہ کرایا۔ اس معاہدے سے پتہ چلتا ہے کہ برطانیہ نے پاکستانی دفاعی تقاضوں کو اور قانونی حق کو سامنے رکھا تھا۔ اس معاہدے سے بین الاقوامی ثالثی کی ایک اور کامیاب مثال کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اس کے باوجود سرحد کے دونوں طرف لوگوں نے ناراضگی اور احتجاج کا اظہار کیا تھا۔ یہ احتجاج ریڈکلف اور رن آف کچھ ایوارڈ میں فرق کی وجہ سے کیا گیا تھا مگر ان لوگوں نے یہ نہیں سوچا کہ ریڈکلف ایوارڈ کی وجہ سے ہی کشمیر کا اور نہری پانی کا جھگڑا شروع ہوا تھا۔

ایوب خان کے دو[illegible] دونوں ممالک نے کوشش کی تھی کہ کشمیر کا مسئلہ بات چیت کے ذریعے پرامن طور پر حل

Marfat.com

کر لیا جائے۔ برطانیہ اور امریکا نے کوشش کی کہ بھارت کو مذاکرات پر آمادہ کیا جائے۔ دونوں ممالک معاملات پر نظر رکھے ہوئے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ مذاکرات ناکام ہو جائیں۔ پانچ مہینوں کے دوران وزیروں کی سطح پر گفتگو کے پانچ دور ہوئے۔ مذاکرات کا پہلا دور راولپنڈی میں ہو رہا تھا جہاں سے بھارتی مندوب اس بیان پر ناراض ہو کر واپس چلے گئے جو ایک دن پہلے جاری کیا گیا تھا اور جس میں کہا گیا تھا کہ چین اور پاکستان ایک مشترکہ سرحد پر رضامند ہو گئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ چین نے آزاد کشمیر پر پاکستان کے حق کو تسلیم کر لیا تھا۔ بھارت کی ناراضگی کی وجہ بھی تھی کہ پاکستان کشمیر میں استصواب رائے کا مطالبہ کر رہا تھا مگر اس اعلان کا مقصد کوئی بدمزگی پیدا کرنا نہیں تھا۔ دو ہفتوں کے بعد دونوں کی ملاقات پھر دہلی میں ہوئی۔ طرفین نے فیصلہ کیا کہ دونوں علاقوں کے درمیان بین الاقوامی سرحد کھینچنے کا مسئلہ اور اس علاقے سے اور اس کے آس پاس سے مسلح افواج کے ہٹانے کا مسئلہ بھی کشمیر کے تصفیے میں شامل کر لیا جائے۔ بات چیت کے اختتام پر طرفین نے کامیابی کا دعویٰ کیا لیکن 24 جنوری کو محمد علی بوگرا کا انتقال ہو گیا اور بھٹو کو وزیر خارجہ بنا دیا گیا۔ اس کے بعد مذاکرات کے تیسرے، چوتھے اور پانچویں دور میں کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی۔ کیونکہ دونوں کے نقطہ نظر میں بڑا فرق آ چکا تھا۔ بھارت نے تجویز پیش کی کہ سیز فائر لائن کو ہی سرحد بنا لیا جائے لیکن پاکستان نے اسے تسلیم نہیں کیا کیونکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ پاکستان استصواب رائے کے مطالبے سے دستبردار ہو گیا ہے۔ ان تینوں ادوار میں دونوں حریف اپنے اپنے مؤقف پر سختی کے ساتھ کاربند بھی رہے اور برابر مذاکرات بھی کرتے رہے۔ شاید امریکا اور برطانیہ کے ڈر سے! مذاکرات کے آخری راؤنڈ میں پاکستان نے یہ تجویز پیش کی کہ چھ ماہ کے لیے وادیٔ کشمیر کو بین الاقوامی نگرانی میں دے دیا جائے اور اس کے بعد وہاں استصواب رائے کرایا جائے۔ بھارت نے اس پاکستانی تجویز کو رد کر دیا اور مذاکرات تعطل کا شکار ہو کر ختم ہو گئے۔ مذاکرات تو ناکام ہو گئے مگر ان سے ایک بات تو ظاہر ہوئی کہ دونوں پارٹیاں ایک دوسرے سے مذاکرات تو کرنا چاہتی تھیں لیکن بھارت کی بدنیتی ہمیشہ آڑے آتی رہی۔ اس دوران بھارت نے پاکستان کے داخلی معاملات میں باقاعدہ مداخلت شروع کر دی تھی اور چانکیہ کے اس فلسفہ سیاست پر کہ ''ہمسایے کو دشمن اور اُس کے دشمن کو اپنا دوست رکھ'' پر عمل شروع کر دیا۔ انگریزوں نے برصغیر اور افغانستان کی تقسیم کے لیے ڈیورنڈ لائن قائم کی تھی۔ قیام پاکستان کی مخالفت میں پیش پیش افغان حکومت نے ہندو کی شہہ پر اچانک ڈیورنڈ لائن کا مسئلہ کھڑا کر دیا اور دریائے اٹک تک افغانستان کا دعویٰ کرنے لگے۔ اس مرحلے پر بھارتی حکومت نے نہایت چالاکی سے افغانستان کی ہاں میں ہاں ملانا شروع کر دی۔ 20 جولائی 1961ء کو پنڈت نہرو نے ایک پریس کانفرنس میں کہا تھا بھارت ابھی طویل عرصے تک پاکستان کو اپنا دشمن ہی سمجھے گا اور اس پریس کانفرنس میں افغان حکومت کے ''اصولی موقف'' کی حمایت کا اعلان بھی کر دیا۔

17 ستمبر 1961ء کو پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے ڈیورنڈ لائن سے متعلق کہا:

> ''مجھے علم نہیں کہ ڈیورنڈ لائن سے متعلق اب بھارت کا موقف کیا ہے۔ یا اسے کیا ہونا چاہیے۔ کیونکہ بہت سی نئی باتیں سامنے آنے لگی ہیں اور یہ ایک پیچیدہ مسئلہ بن گیا ہے''۔ (روزنامہ سٹیٹسمین: کلکتہ 18 ستمبر 1961ء)

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اپنے بیان کے ابتدائی حصے میں پنڈت جی نے فرمایا تھا کہ ''پاکستان اپنے قیام کے

Marfat.com

ساتھ ہی اُن تمام مفادات کا وارث بن گیا ہے جو اس وقت کی سرحد سے متعلق ہندوستان حکومت سے طے پائے تھے۔ یہی موقف اصل میں صحیح موقف تھا کیونکہ جون 1947ء میں ہندوستان کی عبوری حکومت کے وزیراعظم نے ڈیورنڈ لائن سے متعلق کہا تھا کہ قیام پاکستان کے بعد بھی اُس کی وہی حیثیت رہے گی جو اس سے پہلے تھی اور جس کا فیصلہ برٹش گورنمنٹ نے کیا تھا۔

چین اور بھارت کے درمیان اکتوبر 1959ء میں مخاصمت کا آغاز ہو چکا تھا اور لداخ میں چین اور بھارتی افواج کے درمیان جھڑپیں بھی ہونے لگی تھیں۔ یہ سرحدی تنازع تین سال تک چلتا رہا۔ 20 اکتوبر 1962ء کو نہرو نے بھارتی افواج کو لداخ کے متنازع علاقے چینی افواج سے خالی کروانے کا حکم جاری کر کے باقاعدہ جنگ کا آغاز کر دیا۔ اس جنگ کا نتیجہ بھارت کی شکست کی صورت میں ہی سامنے آنا تھا، لیکن خارجہ سطح پر بھارت کے لیے یہ جنگ ''ٹرمپ کارڈ'' ثابت ہوئی جس نے مغربی ممالک، خصوصاً امریکا اور برطانیہ کی بے تحاشہ جنگی اور مالی امداد کے دروازے بھارت پر کھول دیئے گئے جب کہ پاکستان کی غیر جانبداری پاکستان کا جرم قرار دی جانے لگی۔

نومبر 1962ء میں برطانیہ اور امریکا کا مشترکہ وفد پاکستان آیا جس میں امریکی سیکرٹری آف سٹیٹ نورل پریمن اور برطانیہ کی طرف سے دولت مشترکہ کے سیکرٹری ڈنکن سنڈیز شامل تھے۔ دونوں نے پاکستانی صدر سے ملاقات کی اور 29 نومبر 1962ء کو صدر پاکستان اور بھارتی وزیراعظم کی طرف سے ایک مشترکہ اعلامیہ جاری ہوا جس کے مطابق دونوں ممالک نے اپنے باہمی اختلافات کو گفت وشنید کے ذریعے طے کرنے کا فیصلہ کیا اور کہا کہ اس سلسلے میں باقاعدہ مذاکرات کا آغاز کریں گے۔ یہ مذاکرات وزارتی سطح کے ہوں گے جن میں کسی مرحلے پر صدر ایوب خان اور پنڈت نہرو بھی شامل ہو جائیں گے۔

صدر ایوب سے دستخط کروانے کے بعد ڈنکن سنڈیز نے اس بیان پر دہلی جا کر پنڈت نہرو کے دستخط بھی کروائے اور لندن روانہ ہو گئے۔ اگلے ہی روز نہرو نے اپنے پارلیمنٹ سے خطاب میں اس مشترکہ اعلامیہ کے متعلق کہا کہ حالات کی نزاکت کے پیش نظر ہم نے یہ رسمی سی کارروائی کی ہے جس کا بھارت کے کشمیر سے متعلق موقف پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

اس اعلان کا پاکستان میں شدید ردعمل ہوا۔ کشمیری لیڈر چودھری غلام عباس، جماعت اسلامی کے مولانا مودودی اور عوامی لیگ کے حسین شہید سہروردی نے اس پر حکومت کے لتے لیے اور اسے امریکی مفادات کے تابع قرار دے کر نہرو کو ناقابل اعتبار قرار دیا جس پر تب کے وزیر صنعت ذوالفقار علی بھٹو نے حکومت کی طرف سے جواب دیتے ہوئے کہا کہ کم ازکم اس اعلامیہ پر دستخط سے مسئلہ کشمیر پر تکلیف دہ تعطل تو ختم ہوگا۔ اس مرحلے پر بھارتی وزیراعظم نے 15 دسمبر 1962ء کو حیرت انگیز بیان جاری کیا۔ لندن میں بی بی سی سے انٹرویو میں پنڈت نہرو نے کہا: جب تک بھارت اور چین کا سرحدی تنازع طے نہیں ہو جاتا، مسئلہ کشمیر پر پاکستان کے ساتھ کسی سمجھوتے کا امکان ہی نہیں۔

15 دسمبر کو صدر ایوب خان نے راولپنڈی میں بیان دیا کہ مسئلہ کشمیر کا حل تو استصواب رائے ہی ہے لیکن بھارت کے پاس کوئی بہتر حل موجود ہے تو ہم اس پر غور کے لیے تیار ہیں۔ اسی طرح پہلی مرتبہ پاکستان نے استصواب

Marfat.com

رائے سے ہٹ کر کسی حل کے متعلق سوچنا شروع کر دیا۔

اسی دوران مغربی وفود کے مشترکہ اعلامیے کی روشنی میں راولپنڈی میں وزرائے خارجہ کی سطح پر دونوں ممالک کے درمیان مذاکرات کا آغاز ہو گیا۔ بھارتی وفد کی قیادت سورن سنگھ اور پاکستانی وفد کی بھٹو مرحوم نے کی۔ یہ مذاکرات 27 سے 30 دسمبر 1962ء تک جاری رہے جن میں بھارتی وفد نے چار نکاتی اعلامیہ جاری کیا جس کے مطابق مسئلے کے حل کے لیے خیر سگالی کی فضا کا قیام، بقائے باہمی کا معاہدہ، بنیادی اختلافات کے خاتمے کے لیے حقیقت پسندانہ اقدام اٹھانا، عملی تعاون کے راہیں استوار کرنا شامل تھا۔ مسٹر بھٹو نے مذاکرات کو خوش آئند قرار دیا اور مذاکرات کا اگلا دور 16 جنوری 1963ء کو بھارت میں ہونا طے پایا۔ ان چار روزہ مذاکرات میں جو مشترکہ اعلامیہ جاری ہوا اس میں ذرائع ابلاغ سے اپیل کی گئی کہ مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے بہتر فضا پیدا کرنے میں دونوں حکومتوں کی مدد کریں۔

16 جنوری 1963ء کو تین ہفتوں بعد مذاکرات کا اگلا دور دہلی میں شروع ہوا جہاں 19 جنوری کو پاکستانی وفد نے اپنے اصولی مؤقف یعنی ''استصواب رائے'' کے برعکس متبادل طریق کار پر عمل پیرا ہو کر مسئلہ حل کرنے کا اشارہ دیا جب کہ بھارت تقسیم کشمیر اور جنگ نہ کرنے کے معاہدے کا خواہاں تھا۔ جب پاکستانی وفد نے اس پر آمادگی ظاہر کی تو بھارتیوں نے پینترہ بدلا اور ''دیگر معاملات'' پر مذاکرات کا تقاضا کرنے لگے۔

اس صورت حال اور بھارتی ہٹ دھرمی نے مغربی ممالک کو بھی ایک مرتبہ تو بوکھلا کر رکھ دیا اور اس سے پہلے کہ پاکستانی وفد واپس آ جائے، مغربی ممالک نے سفارتی دباؤ کے ذریعے مذاکرات جاری رکھنے پر دونوں کو رضامند کر لیا۔ امریکی صدر جان ایف کینیڈی نے 26 جنوری 1963ء کو صدر ایوب کے نام خط میں مطالبہ کیا کہ پاکستان اپنے مؤقف مزید لچک پیدا کرے۔

7 فروری 1963ء کو صدر ایوب نے جان کینیڈی کے نام خط میں بھارت سے مزید مذاکرات پر رضامندی ظاہر کر دی۔ ان مذاکرات میں کسی دوسرے حل پر غور شروع ہوا اور ''کراچی کانفرنس'' کے حوالے سے پاکستانی خبر رساں ایجنسی (پی پی آئی) نے خبر دی کہ پاکستان بعض شرائط کے تحت تقسیم کشمیر کی تجویز قبول کرنے پر تیار ہے، اس ضمن میں 3 شرائط پیش کی گئیں۔

1. دوران تقسیم مسلمانوں کی اکثریت کو آبادی میں اہمیت دی جائے گی۔
2. مغربی ممالک پاکستان کے دفاعی اور اقتصادی مفادات کا خیال رکھیں گے۔
3. تقسیم کا منصوبہ ایسا ہو جس میں کشمیری لیڈر شپ کی رضامندی بھی شامل ہو۔

اس مرحلے پر پاکستانی حکومت نے کچھ زیادہ ہی جوش و خروش کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر بھارت وادی کا علاقہ پاکستان کے حوالے کر دے تو پاکستان غیر تحریری معاہدے کے تحت چین کے خلاف جنگ میں اس کی مدد کرے گا اور بھارت کو وادی کے راستے لداخ تک جانے کا راستہ دے دے گا۔ پاکستان کے اس ''بے پناہ جذبۂ خیر سگالی'' کو بھی بھارت نے ٹھکرا دیا۔

مذاکرات کا اگلا دور 8 تا 11 فروری 1963ء کو کراچی میں ہوا جس میں دونوں کے درمیان بُعد المشرقین سے

Marfat.com

10 فروری کو بھی مذاکرات ختم ہوتے دکھائی دیئے۔ لیکن سورن سنگھ اور ذوالفقار علی بھٹو کی ون ٹو ون میٹنگ کے بعد اعلان ہوا کہ مذاکرات کا اگلا دور دہلی میں ہوگا۔

12 تا 14 مارچ 1963ء کو بھارت کے صوبہ مغربی بنگال کے شہر کلکتہ میں اگلا دور ہوا جہاں بھارتی وفد نے باقی معاملات ایک طرف رکھ کر پاکستان اور چین کے درمیان 2 مارچ 1963ء کو طے پانے والے سرحدی معاہدے پر بحث شروع کر دی جس کا ایجنڈے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس مرحلے پر بھٹو مرحوم نے آسام اور تری پورہ کے مسلمانوں کو زبردستی مشرقی پاکستان میں دھکیلنے کے خلاف بھارت سے احتجاج کیا اور طے پایا کہ آسامی مسلمانوں کے مسائل پر دونوں ممالک کے درمیان جلدی مذاکرات ہوں گے اور مشرقی پاکستان اور بھارت کے درمیان سرحدی تنازعات پر بھی وزارتی سطح کے مذاکرات میں بات ہوگی۔ اس طرح مسئلہ کشمیر کو ایجنڈے سے خارج کر دیا گیا۔

22 تا 25 اپریل 1963ء کو ان وزارتی مذاکرات کا پانچواں دور کراچی میں ہوا جس میں مسٹر بھٹو نے بھارت کو پیش کش کی کہ اگر وہ وادیٔ کشمیر اور چناب پر پاکستان کا حق تسلیم کر لے تو پاکستان بھارت کو وادی سے لداخ تک کا راستہ دینے کو تیار ہے۔ بھارتی وفد نے اس پیشکش کو دوبارہ ٹھکرا دیا۔ مذاکرات کا یہ سلسلہ ٹوٹ گیا، پھر برطانوی اور امریکی سفیروں نے مسٹر بھٹو سے ملاقاتیں کیں اور مسٹر بھٹو نے مذاکرات کے چھٹے دور پر رضامندی بادل نخواستہ ظاہر کر دی۔ مذاکرات کا چھٹا دور مئی 1963ء میں دہلی میں ہوا جس میں بھارت نے امریکا اور برطانیہ کی طرف سے ''ثالثی'' کی تجویز مسترد کر دی اور پاکستان نے اپنے تحفظات کا اظہار کیا۔ چھ ماہ کے اس طویل مذاکراتی دور کا اختتام 16 مئی 1963ء کو اس اعلان کے ساتھ ہوا کہ مذاکرات ناکام ہو گئے ہیں اس لیے پنڈت نہرو اور صدر ایوب کے درمیان بات چیت نہیں ہوگی۔

اس دوران مقبوضہ کشمیر میں بھارتی الحاق کے خلاف تحریک کا آغاز ہو چکا تھا اور بھارت کی طرف سے اس کا ذمہ دار پاکستان کو ٹھہرایا جا رہا تھا۔ مارچ 1965ء میں بھارتی پارلیمنٹ نے ریاست جموں و کشمیر کے الحاق کی منظوری کا بل پاس کر دیا۔ اس طرح کشمیر کو دستوری طور پر بھارت کا حصہ بنایا گیا۔ مقبوضہ کشمیر میں تحریک آزادی نے شدت اختیار کر لی اور بھارت نے پاکستان پر کمانڈوز وادی میں داخل کرنے کا الزام لگایا۔ 25 اگست کو بھارتی افواج نے کشمیر میں دو مقامات پر جنگ بندی لائن عبور کی۔ اس سے پہلے راجستھان میں دونوں ممالک کی افواج کے درمیان شدید لڑائی میں پاکستان کا پلہ بھاری رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی پاکستانی افواج نے کشمیر محاذ پر کامیابیاں حاصل کرنا شروع کیں تو صورت حال سے بوکھلا کر بھارت نے 6 ستمبر کو پاکستان پر all out حملہ کر دیا۔ یہ جنگ 23 ستمبر کو سلامتی کونسل کی کوششوں سے بند ہوئی۔

▪▪▪

عالمی سطح پر بھارتی حکومت کو بلیک میلنگ کی پوزیشن میں لانے کے لیے بہترین کردار 1962ء کی چین بھارت جھڑپ نے ادا کیا تھا۔ یہ لڑائی جسے بھارت کی طرف سے ہونے والی ''زبردستی کی جھڑپ'' کا نام ہی دیا جا سکتا ہے، لڑائی سے زیادہ بھارت کی اقوام عالم کے خلاف ایک سازش تھی جس کے لیے اُس نے باقاعدہ منصوبے کے تحت کام کیا۔ بھارت کو ایک ہی وقت میں امریکہ اور روس کو بے وقوف بنانے کے لیے خود کو ''مظلوم'' ظاہر کرنا ناگزیر تھا لیکن قیام پاکستان کے فوراً ہی بعد جونا گڑھ، حیدر آباد دکن اور مقبوضہ کشمیر پر بھارتی تصفیے کے بعد عالمی سطح پر بھارت کی حیثیت ایک جارح

Marfat.com

ملک کی سی ہو کر رہ گئی تھی۔اقوام متحدہ میں بھارت نے جو گل کھلائے تھے اُس وقت کی قدرے مہذب دنیا میں اس سے بھارت کا تاثر بگڑ کر رہ گیا تھا۔اب ضرورت تھی کہ وہ مظلومیت کا روپ دھارے جس کے لیے بھارت کو اپنے سوشلسٹ ہمسایے چین سے پنگا لینا لازم تھا اور اُس نے ایسا ہی کیا۔

12 اکتوبر 1962ء کو مسٹر نہرو نے اعلان کیا کہ میں نے ہندوستانی فوج کو ہدایت دے دی ہے کہ وہ متنازعہ فیہ علاقوں سے ''چینیوں کو نکال باہر کریں''۔اس اعلان کو نیویارک کے اخبار ''ہیرلڈ ٹریبیون'' (15 اکتوبر 1962ء) نے ''باضابطہ اعلانِ جنگ کے مترادف'' قرار دیا۔ادھر برطانوی اخبار ''گارڈین'' نے اسے ''الٹی میٹم'' کے نام سے تعبیر کیا۔یہ بات کہ پہلی گولی ہندوستانیوں نے چلائی، ''نیویارک ٹائمز'' نے بعد کو 19 اپریل 1963ء کی ایک رپورٹ میں بتائی۔اس رپورٹ میں لکھا تھا کہ ''جنرل میکسویل ڈی ٹیلر چیئرمین جوائنٹ چیف آف سٹاف نے کانگرس کے ایک خفیہ بیان میں جسے آج مشتہر کیا جا رہا ہے، اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ہو سکتا ہے کمیونسٹ چین کے ساتھ سرحدی لڑائی ہندوستان نے شروع کی ہو''۔20 اکتوبر 1962ء کو لداخ (کشمیر) کی متنازعہ فیہ سرحد کے متعدد مقامات پر اور نارتھ ایسٹ فرنٹیئر ایجنسی (نیفا) کے اس علاقے میں جو ریاست بھوٹان کے مشرق میں واقع ہے، ہندوستان اور چین میں زبردست معرکے شروع ہو گئے۔اس کے بعد چین سے ہندوستان کے دو مختصر معرکے ہوئے۔پہلا اکتوبر میں اور دوسرا نومبر میں جن میں ہندوستانی فوج کو شدید نقصان اٹھانا پڑا۔20 نومبر تک ہندوستان لداخ کے متنازعہ علاقے میں مزید دو ہزار مربع میل رقبے سے دستبردار ہو گیا اور اس طرح پندرہ ہزار مربع میل رقبے کا وہ قریب قریب سارا علاقہ جو کشمیر کے اس حصے میں تھا اور جن پر چینیوں کو ملکیت کا دعویٰ تھا، ان کے قبضے میں چلا گیا۔نیفا کے علاقے میں ہندوستانی فوجوں کو اور بھی زیادہ ہزیمت اٹھانی پڑی۔

20 نومبر تک نہ صرف نیفا کا سارا متنازعہ فیہ علاقہ بلکہ آسام تک چین کی بڑھتی ہوئی فوجوں کے قبضے میں جاتا ہوا نظر آنے لگا۔اس کے بعد اچانک 21 نومبر کو چینیوں نے جنگ بند کرنے کا اعلان کر دیا اور یکطرفہ طور پر یہ مان لیا کہ وہ اس سارے علاقے کو چھوڑ کر، جو انہوں نے فتح کر لیا ہے، خط میک موہن کی پچھلی چوکیوں پر واپس چلے جائیں گے۔چینیوں نے اپنے اس قول کو پوری طرح نبھایا اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے ہندوستان کو صلح و آشتی کے ساتھ سرحدی جھگڑوں پر بات چیت کرنے کی دعوت بھی دی۔اس کے بعد اس ساری متنازعہ فیہ سرحد کے کسی حصے میں بھی کوئی قابل ذکر فوجی واقعہ پیش نہیں آیا۔

29 دسمبر 1962ء کو جب ہندوستان اور چین کی سرحد پر جنگ بند ہوئے کافی عرصہ گزر چکا تھا تو ناساؤ کے مقام پر امریکہ اور برطانیہ نے ہنگامی حالات کی بنیاد پر ہندوستان کی فوجی امداد جاری رکھنے کا فیصلہ کیا اور بارہ کروڑ ڈالر کی مالیت کے سامان کا اقرار بھی کر لیا۔فوجی امداد کے اس پروگرام میں مختلف قسم کا اسلحہ شامل تھا مگر اس پروگرام کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ چھ ہندوستانی ڈویژنوں کو پہاڑی لڑائی کے لیے مسلح کیا جائے گا۔ناساؤ کے فیصلے کے تحت امریکا، برطانیہ اور کینیڈا کا ایک مشترک فضائی مشن اس بات کی پڑتال کرنے ہندوستان بھیجا گیا کہ اگر چین ہندوستان پر دوبارہ حملہ کر دے تو ہندوستان کو کس قدر ہوائی امداد کی ضرورت ہوگی۔اس کے بعد ایک اور امریکی مشن یہ دیکھنے کے لیے ہندوستان پہنچا کہ

Marfat.com

ہندوستان کی اسلحہ سازی کی پیداوار کو کس طرح بڑھایا جاسکتا ہے۔ ناساؤ میں ہندوستان کو جس قدر فوجی امداد دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا، اس سے قطع نظر 30 جون 1963ء کو برچ گرود کے مقام پر بھی امریکہ اور برطانیہ نے ہندوستان کو مزید بھاری فوجی امداد دینے کا پروگرام بنایا اور زیادہ ہتھیار مہیا کرنے کے علاوہ اس پروگرام میں راڈار کے وسیع تر انتظامات، ہوائی بار برداری اور تربیتی سہولتیں بہم پہنچانا بھی شامل تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ امریکہ اور برطانیہ نے ہندوستان کی خود اپنی اسلحہ سازی کی پیداوار کو وسیع پیمانے پر بڑھانے میں مدد دینے کا بھی فیصلہ کیا۔

ہندوستان کو اس بات کا بھی اطمینان دلایا گیا کہ اسے چین کی خلاف فوجی امداد حاصل کرنے کے لیے مغربی طاقتوں کے ساتھ کسی قسم کا معاہدہ کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اس سے یہ کہا گیا کہ یہ بات خود مغربی طاقتوں کے مفاد میں ہے کہ ہندوستان اپنی ''ناطرف داری'' کی پالیسی پر بدستور کاربند رہے اور سوویت یونین سے بھی فوجی امداد حاصل کرتا رہے۔ ہندوستان نے مغربی طاقتوں کے اس حوصلہ افزا رویئے سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور جلد سے جلد اپنی مستقل فوج کے گیارہ ڈویژنوں کے بجائے بائیس ڈویژن بنانے اور اپنی ہوائی اور سمندری فوج میں بھاری اضافہ کرنے کی ٹھان لی۔ یہ سب کچھ بظاہر چین کے خلاف استعمال کرنے کے لیے کیا گیا۔ یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ ہندوستان کو اس قدر وسیع پیمانے پر مسلح کرنا کیوں ضروری سمجھا گیا تھا۔ امریکا اور برطانیہ نے ہندوستان کو فوجی امداد دینے کا پروگرام دراصل اس وقت بنایا تھا جب ان مغربی طاقتوں کو یہ فکر دامن گیر تھی کہ کہیں ہندوستان اور چین کی چپقلش بڑھ کر بڑی جنگ کی صورت اختیار نہ کرلے۔ جب یہ لڑائی شروع ہوئی تھی تو ماہرین حرب وضرب نے اسی وقت اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ ایک سرحدی جھڑپ کے سوا اور کچھ نہیں۔ ہندوستان اور چین کی پہلی جھڑپ کے بعد صدر ایوب نے 5 نومبر 1962ء کو ایک بیان دیا جس میں انہوں نے یہی بات کہی۔ انہوں نے اس امر پر بھی تشویش ظاہر کی تھی کہ مغربی طاقتوں نے یہ فرض کر کے کہ ہندوستان چین کے ساتھ ایک بڑی جنگ سے دوچار ہے، تیزی کے ساتھ وسیع پیمانے پر امداد دینے کا فیصلہ کرلیا ہے حالانکہ ایسا فرض کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ صدر ایوب نے کہا فوجی اعتبار سے یہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں کہ چین ہمالیہ کے پہاڑوں پر عین سردی کے زمانے میں ہندوستان پر حملے کی ٹھان لے۔ اس سے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ چین کسی بڑی جنگ کا خواہش مند نہ تھا۔ بعدازاں یہ ثابت ہوگیا کہ تبت کی سرحد پر چین اور ہندوستان کی جھڑپ محض ہندوستانی فوجوں کی چھیڑ خانیوں کا نتیجہ تھی۔ آخر ایک وقت ایسا آیا کہ چین کے وزیراعظم اور چیف آف سٹاف کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور انہوں نے جوابی کارروائی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کے بعد جو واقعات پیش آئے، انہوں نے ثابت کردیا کہ چین نے ہندوستان پر کوئی بڑا حملہ کرنے کا منصوبہ نہیں باندھا تھا۔ اس کے بعد چینیوں نے اس جھگڑے کو صلح صفائی کے ساتھ ختم کرنے کی خواہش بھی اچھی طرح ظاہر کردی۔ ادھر ہندوستانی بھی چین سے اور زیادہ لڑائی سے بچنا چاہتے تھے اور پرامن تصفیے کے لیے کوشش کر رہے تھے مگر ساتھ ہی ہندوستان اور زیادہ فوجی امداد کا مطالبہ بھی کر رہا تھا اور یہ اسے ملتی ہی چلی جارہی تھی۔ اس وقت ہندوستان نے تین روپ دھار رکھے تھے۔ اس کا ایک روپ تو مغربی طاقتوں کے لیے تھا جس کے مطابق وہ بڑی شدومد کے ساتھ چین کے خلاف جنگ کے منصوبے باندھ رہا تھا۔ دوسرا روپ سوویت یونین کے لیے تھا جس میں وہ اپنے اس عزم پر مضبوطی کے ساتھ قائم معلوم ہوتا تھا کہ اپنی ''ناطرف داری'' کی پالیسی ترک نہیں کرے گا۔ اور تیسرا روپ چین کے

Marfat.com

لیے تھا جس کے تحت وہ غیر جانبدار سفیروں کے ذریعے خفیہ نامہ و پیام سے پرامن تصفیہ کے لیے جدوجہد کر رہا تھا۔ اُن دنوں عسکری ماہرین کا کہنا تھا کہ اگر جنگ ہو بھی جائے تو اس کوہستانی محاذ میں ہندوستان چین کے خلاف تین چار ڈویژنوں سے زیادہ فوج استعمال نہیں کر سکتا۔ اس پر قدرتاً سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیوں اپنی فوج کو دُگنا یعنی بائیس ڈویژنوں تک بڑھا دینا چاہتا تھا؟ اگر ریزرو فوج کی گنجائش رکھ لی جائے تو پھر بھی اس کے پاس بہت سے ڈویژن بچ رہتے تھے۔ آخر وہ ان کو کس کے خلاف استعمال کرنا چاہتا تھا؟ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان اپنے اسلحہ کے مطالبے پر مغربی طاقتوں کو رضامند پا کر اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ وہ ایک چھوڑ دو دو فوجیں تیار کرنے کے منصوبے باندھ رہا تھا۔ ایک فوج چین کے مقابلے کے لیے اور دوسری اپنے سامراجی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے، پاکستان اور اپنے دوسرے چھوٹے ہمسایوں کے خلاف۔ جو فوج چین کے خلاف تیار کی جاتی وہ لازمی طور پر اس طرح متعین کی جاتی کہ وقت آنے پر اس کا رخ فوراً مشرقی پاکستان کی طرف موڑ کر ادھر حملہ کیا جا سکے۔ اس طرح ان دونوں فوجوں سے پاکستان کو سخت خطرہ لاحق ہو جاتا۔

بھارت کی یہ پالیسی کامیاب رہی اور اُس نے اپنی چانکیائی ڈپلومیسی کے ذریعے ایک ہی وقت میں روس اور امریکہ کو جی بھر کے بے وقوف بنایا۔ (اگر اسے فقرہ معترضہ نہ سمجھا جائے تو مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔)

* * *

ہماری خصوصی فوجی اور کسی حد تک سیاسی قیادت کی یہ بدقسمتی رہی ہے کہ ہم نے بھارت کے ساتھ اپنے تعلقات کے ضمن میں ہمیشہ امریکہ کو ''ماموں جان'' بنانے کی کوشش کی ہے اور اس سے ایسی توقعات وابستہ کیں جنہیں سوائے ''دیوانے کے خواب'' کے اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ جس صورت حال سے ہم آج دوچار ہیں ماضی میں بھی ہمارا حال اس سے کچھ مختلف نہیں تھا۔ پہلے مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل ایوب خان نے 16 جولائی 1961ء کو امریکی کانگرس کے ایک مشترکہ اجلاس سے خطاب کیا اور تفصیل سے انہیں برصغیر کی تقسیم کے پس منظر اور بھارتی عزائم سے خبردار کرتے ہوئے بتایا کہ ہم نے پاکستان کسی تعصب یا عدم رواداری کی بنا پر حاصل نہیں کیا۔ نہ ہی ہم یہاں ملا ازم نافذ کرنے والے ہیں۔ ہمارے متعلق جنونیت کے حوالے سے کوئی رائے قائم کرنا زیادتی ہوگی۔ جنرل ایوب خان کہتے ہیں: جب میں نے یہ کہا کہ ''جو لوگ آپ کا ساتھ دیں گے وہ پاکستان ہی کے لوگ ہوں گے'' تو اس پر بڑی تالیاں بجائی گئیں۔ لیکن ابھی ان تالیوں کا شور تھمنے نہ پایا تھا کہ میں نے اتنا اور بڑھا دیا: ''بشرطیکہ...... بشرطیکہ آپ بھی پاکستان کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔ چنانچہ میں چاہتا ہوں کہ آپ یہ بات یاد رکھیں کہ آپ کی مصلحت کے تقاضے کچھ بھی ہوں، آپ کوئی ایسا قدم نہیں اٹھائیں گے جو ہمارے مسائل کو مشکل بنا دے یا ہماری سلامتی کو کسی قسم کے خطرے میں ڈال دے۔ جب تک آپ اس بات کو یاد رکھیں گے ہماری دوستی مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جائے گی''۔

امریکہ کے اس دورے میں میں نے بار بار کشمیر کے جھگڑے کے منصفانہ اور آبرومندانہ تصفیے کی ضرورت پر زور دیا۔ جس کے بغیر اس برصغیر میں امن چین ممکن ہی نہیں۔ میں نے امریکی حکومت سے درخواست کی کہ وہ ہندوستان پر اپنے

Marfat.com

بڑھتے ہوئے اثر کو کام میں لا کر ہندوستانی لیڈروں کو سمجھائے کہ پاکستان کے ساتھ صلح صفائی سے رہنے میں کیا فائدے ہیں۔ مجھ سے ایک اخباری نمائندے نے پوچھا کہ: ''صدر کینیڈی مسٹر نہرو کو مسئلہ کشمیر کے حل پر آمادہ کرنے میں کس حد تک بڑھ سکتے ہیں؟'' میں نے جواب دیا: ''یہی تو ہم بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ صدر کینیڈی کتنی دور تک بڑھ سکتے ہیں''۔

اس سے چند روز پہلے مجھے واشنگٹن میں نیشنل پریس کلب کے ایک لنچ کے جلسے میں مدعو کیا گیا تھا۔ اس موقع پر مجھ سے جو سوالات کیے گئے، ان میں سے ایک سوال یہ بھی تھا کہ: ''اگر ہندوستان کو اسلحہ کی امداد دی گئی تو اس پر پاکستان کا ردعمل کیا ہوگا؟''

میں نے کہا: ''ہم نے امریکہ بلکہ ساری دنیا پر اپنی پوزیشن واضح کر دی ہے۔ ہم ہندوستان کے ساتھ صلح صفائی سے رہنا چاہتے ہیں۔ کشمیر پر ہماری بات بگڑ گئی ہے۔ کشمیر کا مسئلہ کشمیر کے لوگوں کے جذبات و خواہشات سے وابستہ ہے۔ یہ مسئلہ ہندوستان کی پاکستان دشمنی کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ علاوہ ازیں کچھ اقتصادی اور کچھ ہماری سلامتی کے امور بھی غور طلب ہیں۔ ہندوستان پاکستان کے ساتھ صلح صفائی کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتا۔ ہندوستان کی مسلح افواج ہمارے مسلح افواج سے تگنی ہیں۔ ان افواج کا صرف پندرہ فی صد حصہ چین کے مقابلے کے لیے ہے۔ باقی پاکستان کی تاک میں ہے۔ اس قسم کی صورت حال میں اگر ہندوستان کو اسلحہ کی امداد دی گئی تو پاکستان خود کو غیر محفوظ خیال کرے گا اور پاکستان کی رائے عامہ لازمی طور پر امداد دینے والے ملک کے خلاف ہو جائے گی۔ چنانچہ اس کا امریکہ کے ساتھ ہماری دوستی پر بھی زبردست اثر پڑے گا''۔

صدر کینیڈی سے میری جو ملاقاتیں ہوئیں، ان میں میں نے یہ بات ان کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی کہ جب تک ہندوستان اور پاکستان میں کشمیر کے مسئلے پر تنازعہ رہے گا اس برصغیر میں حالات معمول پر نہیں آئیں گے۔ میں نے انہیں یہ بات سمجھائی کہ امریکی انتظامیہ ایسی فیصلہ کن حیثیت میں ہے کہ وہ اس معاملے میں ہندوستان پر خوشگوار اثر ڈال سکتی ہے، نیز یہ کہ جب تک اس برصغیر میں امن امان قائم نہ ہوگا امریکی پالیسی کے مقاصد پورے نہ ہو سکیں گے۔

امریکی پالیسی میں غیر جانبدار ملکوں کے بارے میں جو تبدیلی پیدا ہو گئی تھی، میں نے اس کا ذکر بھی چھیڑا۔ میں نے پوچھا کہ اس تبدیلی کا ''سینٹو'' اور ''سیٹو'' جیسے معاہدوں پر کیا اثر پڑے گا۔ میں نے کہا کہ امریکی رویئے کی اس تبدیلی کی بنا پر علاقائی ممبروں کو ان معاہدوں سے وابستہ رہنے کا جواز پیش کرنا مشکل ہو جائے گا۔ صدر کینیڈی نے مجھے ڈھارس دیتے ہوئے کہا: ''مجھے اجتماعی سلامتی کی ضرورت کا بڑا شدید احساس ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ''غیر جانب دار'' ممالک کی امداد کے معاملے میں میری پوزیشن کو صحیح طور پر نہیں سمجھا گیا۔ یہ دوستوں کو ترک کرنے اور غیر جانب داروں کو گلے لگانے کی بات نہیں ہے۔ میرا کہنا تو بس یہ ہے کہ غیر جانب داروں کو دشمن نہ سمجھا جائے''۔ صدر کینیڈی خاص طور پر یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ ''سیٹو'' اور ''سینٹو'' کو کس طرح مضبوط بنایا جا سکتا ہے اور ہندوستان و پاکستان کے باہمی جھگڑوں کو چکانے میں امریکہ کیا مدد دے سکتا ہے۔

میں نے ان سے یہ بھی پوچھا کہ مشترکہ سلامتی کے قانون کی توسیع کے بارے میں امریکی انتظامیہ کا کیا ارادہ ہے؟ کیا وہ اس میں غیر جانب دار ملکوں کو بھی شامل کرنا چاہتا ہے؟ کیا اس کا مطلب ہندوستان کو اسلحہ کی امداد دینا ہوگا؟ میں

Marfat.com

نے انہیں صاف صاف بتا دیا کہ اس قسم کے اقدام سے پاکستان کی رائے عامہ پر بہت برا اثر پڑے گا۔ اب تو پاکستان ہی نہیں، کوریا سے لے کر ترکی تک کے عوام نے اس بات پر تعجب کرنا شروع کر دیا ہے کہ کیا امریکہ ''دوستوں'' اور ''غیروں'' میں تمیز نہیں کر سکتا!

مجھے اس امر کا یقین دلایا گیا کہ کوئی ایسی کارروائی نہیں کی جائے گی جو ہمارے لیے مشکلات پیدا کر دے۔ نیز یہ کہ اس ترمیم شدہ قانون کے تحت غیر جانب دار ملکوں کو کسی قسم کی امداد دینے سے پہلے ہم سے مشورہ کر لیا جائے گا۔

میں نے صدر کینیڈی سے تنازعہ کشمیر کا پس منظر ذرا تفصیل سے بیان کیا۔ میں نے کہا جب تک ہندوستان اور پاکستان کی فوجیں آمنے سامنے بھری بندوقیں لیے کھڑی رہیں گی، دونوں ملکوں کی ترقی کے سارے ضروری کام رکے رہیں گے۔ اگر یہ جھگڑا مٹ جائے تو اس سے اس خطے ہی کا نہیں بلکہ ساری دنیا کا بھلا ہوگا۔ میں نے ان سے، نہرو کے ساتھ اپنی ایک ملاقات کا ذکر بھی کیا جو مئی 1960ء میں لندن میں ہوئی تھی۔ میں نے کہا جب میں نے نہرو سے مسئلہ کشمیر کا ذکر چھیڑا تو انہوں نے اس کو حل کرنے پر کچھ زیادہ دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ میں نے اس وقت مسٹر نہرو سے کہا تھا کہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ کشمیر کے بارے میں آپ کا رویہ بعض جذباتی وجوہ کے تابع ہے۔ انہوں نے جواب دیا: اگر ایسا ہوتا تو وادیٔ کشمیر ایک قسم کا سوئٹزرلینڈ بنائی جا سکتی تھی جہاں میں جب چاہتا آیا جایا کرتا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ میری والدہ لاہور کی رہنے والی تھیں، لیکن اس کے باوجود مجھے اس شہر سے کوئی جذباتی لگاؤ نہیں ہے۔

میں نے صدر کینیڈی سے کہا: ظاہر ہے کہ نہرو نے جموں و کشمیر کے ایک بڑے حصے پر طاقت کے بل پر جو قبضہ کر رکھا ہے، اس کا وہ ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی دانست میں معاملے کو ختم کر بیٹھے ہیں۔ میں یہ امر صدر کینیڈی کے ذہن نشین کرنا چاہتا تھا کہ اگر ہندوستان کو اسلحہ کی امداد دی گئی تو اس سے اس کا حوصلہ بڑھے گا اور وہ ان علاقوں پر جو اس کی ملکیت نہیں ہیں، بدستور اپنا قبضہ جمائے رکھے گا اور اس طرح اس جھگڑے کی منصفانہ تصفیے کا کوئی امکان باقی نہ رہے گا۔

صدر کینیڈی نے اس بارے میں مجھ سے اتفاق کیا کہ کشمیر کے مسئلے کے حل کی اشد ضرورت ہے۔ لیکن وہ سمجھتے تھے کہ ان کی پوزیشن ایسی نہیں کہ اس معاملے میں عملی طور پر یا براہ راست دخل دے سکیں۔ ان سے مل کر مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے ان کے دماغ میں تفکرات کا ہجوم ہو اور وہ خود کو تنہا محسوس کرتے ہوں۔ انہیں صدر کا عہدہ سنبھالے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ان کے ذہن پر بڑا بار ہے۔ شاید اس وجہ سے کہ ''بے آف پگز'' والا معاملہ ٹائیں ٹائیں فش ہو کے رہ گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انہیں معاملات پر پوری گرفت حاصل نہ ہو اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ ان کو بہت زیادہ نظریہ بازوں نے گھیر رکھا ہے۔ یہ لوگ بڑے مفید ہوتے ہیں لیکن بعض دفعہ انسان کو صحیح عملی راہ سے بھٹکا بھی دیتے ہیں۔ انسان کو ٹھوس دماغ والے، حقیقت پسند اور تجربہ کار لوگوں کو اپنے قریب رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے، خاص کر کسی بحران کے موقع پر۔ صدر کینیڈی نے مجھ سے کہا میں تم سے آدھ گھنٹہ تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں، وہ میرا بازو تھام کر مجھے وائٹ ہاؤس کے لان میں لے گئے جہاں ہم ایک درخت کے سائے میں ایک نشست گاہ پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے برلن کی صورت حال کا ذکر کرنا شروع کیا اور مجھ سے پوچھا کہ تم ان حالات میں کیا کرتے۔ ظاہر ہے کہ وہ مجھ سے اس مسئلے کو حل کرنے کی توقع نہ رکھتے تھے، بس وہ تو اس معاملے پر جوان کے لیے بڑی پریشانی کا موجب بنا ہوا تھا، ذرا دل کا بخار نکالنا چاہتے

Marfat.com

تھے۔ جب میں وہاں سے چلا تو ان کے بارے میں میرا تاثر یہ تھا کہ ان کے دماغ پر سخت بوجھ ہے اور وہ دل لگا کر کسی سے ہمکلام نہیں ہو سکتے۔ (فرینڈز ناٹ ماسٹر: صفحہ 227 تا 230)

تبت میں چینی حکام نے جولائی 1959ء میں ایک حکم جاری کیا، جس کی رو سے ہندوستانی اور تبتی دونوں سکے ناجائز قرار دے دیئے گئے۔ ہندوستانی قومیت والوں کو ہدایت کی گئی کہ اگر جان کی خیریت چاہتے ہوں تو تبت کا رخ نہ کریں۔ اگست 1959ء میں ایک چینی فوج نے آسام اور تبت کی سرحد پر لانگ جو کی سرحدی چوکی پر قبضہ کر لیا اور لداخ میں بھی ایک چوکی اپنے قبضے میں لے لی۔ اس پر ہندوستان اور چین نے ایک دوسرے کو احتجاجی مراسلے بھیجے۔

نومبر 1959ء میں نہرو نے اعلان کیا کہ: "میں لوگوں کے دماغ سے اس قسم کے شبہات نکال دینا چاہتا ہوں کہ اگر چینیوں نے ہم پر حملہ کیا تو ہم اپنی سالمیت کی حفاظت نہ کر سکیں گے۔ ہمیں اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی طاقت اور اپنے عزم پر پورا بھروسا ہے اور ہم پوری طاقت کے ساتھ اس کا مقابلہ کریں گے"۔ (پارلیمنٹ سے خطاب)

مسٹر چواین لائی نے مسٹر نہرو کو مشورہ دیا کہ دونوں فریق اپنی اپنی فوجیں تمام ڈھائی ہزار میل لمبی سرحد سے بیس بیس کلومیٹر پیچھے ہٹا لیں اور اس طرح پچیس میل چوڑے علاقے کو غیر فوجی قرار دے دیا جائے، تاوقتیکہ "سرحد کے مسئلے پر آپس میں دوستانہ تصفیہ نہ ہو جائے"۔ مسٹر نہرو نے اس تجویز کو رد کر دیا تاہم چینی حکومت نے اپنے سرحدی دستوں کو گشت کرنے سے روک دیا تا کہ فوجوں میں جھڑپ نہ ہونے پائے۔

اپریل 1960ء میں نئی دہلی میں مسٹر نہرو اور مسٹر چواین لائی میں گفت وشنید ہوئی مگر اختلافات نہ مٹ سکے۔ اس کے بعد سرکاری سطح پر کئی بات بات چیت ہوئی۔ مارچ 1961ء میں چینی قومیت والے بعض افراد کو ہندوستان سے نکل جانے کا حکم دے دیا گیا۔ 1961ء کے سارے سال میں چین اور ہندوستان کے تعلقات سخت کشیدہ رہے۔ نہرو نے جنگجویانہ رویہ اختیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ دونوں فریق اپنے اپنے علاقے میں فضائی اور زمینی خلاف ورزیوں کی شکایتیں کرتے رہے۔ مسٹر کرشنا مینن نے جو وزیر دفاع تھے، 11 اپریل 1961ء کو لوک سبھا میں بیان دیتے ہوئے کہا کہ حکومت ہندوستان نے ہمالیہ کی سرحدوں کی حفاظت کے لیے "تمام ضروری اقدامات کر لیے ہیں"۔ کیمونسٹ حملہ آور "جب چاہیں ہم سے دو دو ہاتھ کر لیں"۔ (پریس کانفرنس: دہلی)

جولائی 1962ء میں سرحد پر دو واردتیں ہوئیں۔ ستمبر 1962ء میں چین نے ایک بار پھر یہ تجویز پیش کی کہ: "کشیدگی دور کرنے کے لیے دونوں طرف کی مسلح فوجوں کو سارے محاذ سے بیس بیس کلومیٹر پیچھے ہٹ جانا چاہئے"۔ ہندوستان نے اب کے پھر اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ ستمبر 1962ء کے وسط میں ہمالیہ کی سرحد کے مشرقی سرے پر مزید جھڑپیں ہوئیں۔ نیفا کی سرحد پر 10 اکتوبر تک تو خاموشی رہی مگر اس دن میک موہن لائن کے انتہائی مغربی سرے پر ہندوستانی اور چینی فوجوں میں سخت معرکہ ہوا۔ 13 اکتوبر کو چینیوں نے ایک مرتبہ پھر مسٹر نہرو کو تنبیہ کی کہ: "وہ خطرے کی غار کے دھانے سے پیچھے ہٹ جائیں" کیونکہ چینیوں کے قول کے مطابق چین "ہندوستان کے ساتھ ہرگز آمادۂ پیکار" نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس کے ایک ہفتے بعد لداخ میں بڑے زور شور کی لڑائی ہوئی۔ چینی فوجوں نے لداخ میں اس علاقے تک، جس کی ملکیت کا ان کو دعویٰ تھا، پیش قدمی کی اور پھر وہ تھم گئیں۔ نیفا میں چینیوں نے دو چوکیوں پر قابو پا لیا۔ اس کے

Marfat.com

بعد ان کے حملے نے میک موہن لائن کے دونوں سروں پر ایک عام دھاوے کی صورت اختیار کر لی۔ تین دن کے اندر چینی فوجیں تقریباً نوے میل تک آگے بڑھ آئیں اور انہوں نے درۂ سیلا اور بوم دیلا پر قبضہ کر لیا۔

21 نومبر 1962ء کو چینی حکومت نے یکطرفہ طور پر جنگ بندی کا اعلان کر دیا اور اپنی فوجوں کو پیچھے ہٹنے کا حکم دے دیا۔ چینی فوجیں ہٹتے ہٹتے اس لائن سے بھی بیس کلومیٹر پیچھے ہٹ آئیں جو سات نومبر 1959ء تک سرحد کا کام دیتی رہی تھی۔

28 نومبر 1962ء کو صدر کینیڈی نے صدر ایوب کو خط لکھا اس میں انہوں نے اس صورت حال پر تشویش ظاہر کی جو چین و ہند کی لڑائی سے پیدا ہو گئی تھی۔ انہوں نے مطلع کیا کہ امریکہ ہندوستان کی فوری ضرورتوں کے لیے اُسے مقدور بھر مدد دینا چاہتا ہے اور اس بات کا ضرور اطمینان کر لے گا کہ وہ ہندوستان کو جو کچھ بھی مدد دے گا، اسے صرف چینیوں کے خلاف استعمال کیا جائے گا۔ انہوں نے کہا: ''پاکستان اس وقت ایسی پوزیشن میں ہے کہ وہ ایک ضروری اقدام کر سکتا ہے اور یہ اقدام بقول ان کے صرف پاکستان ہی کر سکتا تھا یعنی پاکستان ہندوستان کو خاموشی سے مگر مؤثر طریقے سے اس بات کا اشارہ کر دے کہ اسے پاکستان کی طرف سے جو تشویش ہے اور جسے خود صدر کینیڈی قطعی طور پر ناواجب سمجھتے ہیں، مگر جس کی وجہ سے ہندوستان کو اپنی فوج کے ایک بہت بڑے حصے کو پاکستانی سرحدوں پر متعین کرنا پڑا ہے، اسے اپنے دل سے نکال دے۔ صدر کینیڈی نے کہا: شاید اس کا مؤثر طریقہ یہ ہو کہ صدر ایوب مسٹر نہرو کو ایک نجی پیغام کے ذریعے یہ اطمینان دلا دیں کہ پاکستان اپنی سرحدوں پر کوئی ایسی کارروائی نہیں کرے گا جس سے ہندوستان کو تشویش لاحق ہو۔ صدر کینیڈی نے یہ بات زور دے کر کہی کہ ہندوستان کو باہر سے خواہ کتنی ہی امداد کیوں نہ ملے وہ چینیوں کا مقابلہ کرنے میں اتنی مؤثر ثابت نہ ہو گی جتنی کہ ان کی اپنی فوجوں کی آزادانہ نقل و حرکت۔

صدر کینیڈی نے کہا کہ میں کشمیر کی تاریخ سے واقف ہوں اور یہ تجویز بے سوچے سمجھے پیش نہیں کر رہا ہوں کہ ہندوستان اپنی موجودہ مصیبت سے سبق حاصل کرے گا اور اس کو احساس ہو گا کہ سارے برصغیر کو شمال کی طرف سے جو خطرہ درپیش ہے، وہ اس خطے کی اندرونی جھگڑوں سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ انہوں نے پاکستان کو یقین دلایا کہ برصغیر کے وسیع تر مفادات کے لیے جو اقدامات کریں گے ان سے آگے چل کر پاکستان اور ہندوستان کے باہمی جھگڑوں کے مناسب تصفیے میں جو مدد ملے گی، کسی اور بات سے نہیں مل سکتی۔

صدر ایوب خان کی طرف سے 5 نومبر 1962ء کو صدر کینیڈی کے نام جوابی خط لکھا گیا:

ڈیئر مسٹر پریذیڈنٹ!

آپ کے سفیر کے ذریعے 28 اکتوبر 1962ء کو مجھے آپ کا جو التفات آمیز پیغام ملا اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔

ہندوستان نے پچھلے پندرہ برس سے ہم پر ایک بہت بڑا فوجی خطرہ مسلط کر رکھا ہے۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ محض امریکی اور برطانوی ساز و سامان کی بدولت اس نے اپنی فوجوں کو ہماری فوجوں سے تگنا چوگنا کر لیا ہے اور وہ کھلے بندوں کہہ رہا ہے کہ پاکستان اس کا دشمن نمبر ایک ہے۔

Marfat.com

اس کی 80 فیصد یا اس سے بھی زیادہ مسلح افواج ہمارے خلاف کارروائی کے لیے مخصوص کی جا چکی ہیں، ان میں سے بیشتر ہماری سرحدوں پر متعین ہیں اور دس دن کے نوٹس پر حملہ آور ہونے کے لیے پورے طور پر تیار ہیں۔ ہم ان تمام برسوں میں محض اس وجہ سے ہندوستان کے ان جارحانہ ارادوں کا شکار رہے ہیں کہ وزیر اعظم ہندوستان اپنے وعدوں کو پورا کرنے کے لیے تیار نہیں، خاص طور پر وہ وعدہ جو کشمیر کے تصفیے کے بارے میں کیا گیا تھا اور جس میں ہم اپنی معیشت اور سلامتی کی بنا پر انتہائی دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں پچھلے کم وبیش پندرہ برس میں اپنی فوجوں کو ہر وقت چوکس رکھنا پڑا ہے۔ چین اور ہندوستان میں جو معرکہ ہوا ہے، اس نے ہمارے لیے اور بھی گہری تشویش کے حالات پیدا کر دیئے ہیں۔ تاہم اس سلسلے میں ہمیں جو تھوڑی بہت اطلاعات ملی ہیں، ان سے ہم یہ یقین کرنے پر مجبور ہیں کہ چینیوں کا ارادہ صرف اسی علاقے پر قبضہ کرنے کا ہے جو ان کے خیال کے مطابق ان کی ملکیت ہے اور جو دراصل چین اور ہندوستان کی جنگ کا سبب بنا۔ 1954ء میں خود مسٹر نہرو نے ہندوستانی پارلیمنٹ میں تبت میں چینیوں کی حیثیت کا ذکر کرتے ہوئے، اپنی فراست کے مطابق یہ اعلان کرنا مناسب سمجھا تھا کہ میرے علم میں پچھلی چند صدیوں میں کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جب کسی بیرونی ملک نے چین کی فرماں روائی کو، یا اسے بالادستی ہی کہیے، جھٹلایا ہو۔ اس تمام عرصے میں چین خواہ کمزور تھا یا طاقت ور اور خواہ اس کی کوئی سی بھی حکومت رہی ہو اس نے تبت پر اپنی حاکمیت کے دعوے کو ہمیشہ قائم رکھا...... سلطنت برطانیہ نے لارڈ کرزن کے زمانے میں اپنا تسلط تبت تک وسیع کر لیا، اور وہاں کئی قسم کے تصفیے کیے، اب ہمارے لیے ان میں سے کسی تصفیے کو برقرار رکھنا ناممکن اور نامناسب ہے...... یہ نقشے اور معاہدے برطانوی سامراجیوں نے تیار کیے تھے۔ ان معاہدوں اور نقشوں کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ ہم بھی وہی کارروائی کریں جو انہوں نے کی تھی۔

تاہم فوجی اعتبار سے ہم یقین نہیں کرتے کہ چین فیصلہ کن نتائج حاصل کرنے کے لیے، اپنی بڑی افواج ہمالیہ کے کٹھن پہاڑی علاقے سے ہندوستان کے خلاف اتار سکتا ہے۔ اور اگر اس کا ایسا ارادہ ہو تو اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ برما کے راستے ہندوستان کے بازو سے حملہ کرے۔ ہماری رائے میں یہ طریقہ آسان بھی ہے اور کم خرچ بھی۔ اگر چینیوں کے ارادے محدود حملے کے نہیں بلکہ بڑے حملے کے ہیں، اور ان کی نیت آسام پر قبضہ جمانے کی ہے، تو اس صورت میں ہمارے لیے بھی یہ حملہ ایسا ہی باعث تشویش ہوگا جیسا کہ ہندوستان کے لیے۔ کیونکہ اس کا اثر براہ راست مشرقی پاکستان پر پڑے گا۔ صورت حال کا یہ اندازہ ہم نے بہت سوچ سمجھ کر لگایا ہے۔

اس برصغیر میں اور ہندوستان کے ارد گرد یہ صورت حال کیوں کر پیدا ہوئی؟ ہمارے خیال میں یہ مسٹر نہرو اور ان کے رفقا کی کج فہمی، حیلہ جوئی اور ان کے بے اصولی خارجہ پالیسی کا براہ راست نتیجہ ہے۔ یہ خارجہ پالیسی مندرجہ ذیل اجزا پر مبنی ہے:

الف: کمیونزم کی رضا جوئی کے لیے سر تسلیم خم کرنا۔

ب: غیر جانبداری کا سفید پھریرا لہرا کر کمیونزم کی خوشنودی حاصل کرنا، اور متذبذب اقوام کو اپنے ساتھ ملا۔ اور اس طرح خود کو ساری دنیا کے لیے باعث فساد بنانا۔

ج: پاکستان کو ڈرانا اور دھمکانا، تا کہ وہ سیاسی طور پر بے یار و مددگار رہ جائے۔ اور اقتصادی طور پر کمزور رہ جائے۔

Marfat.com

د: مغربی طاقتوں کو خصوصاً ریاستہائے متحدہ امریکا کو موقع بے موقع بُرا بھلا کہنا۔

واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ اس وقت مسٹر نہرو پر جو کچھ گزر رہی ہے، وہ اسی کج فہمی کا نتیجہ ہے۔ ہم اس سارے عرصے میں یہی بات سمجھاتے اور اس بات سے خبردار کرتے رہے ہیں۔

مسٹر پریذیڈنٹ! اب آپ ہم سے اس بات کے خواہاں ہیں کہ ہم مسٹر نہرو کو گویا اس بات کا اطمینان دلا دیں کہ وہ اپنی اُن فوجوں سے کسی اور جگہ کام لے سکتے ہیں جو انہوں نے اس وقت ہمارے خلاف چڑھا رکھی ہیں۔ مجھے تعجب ہے کہ ہم سے اس قسم کی درخواست کی جا رہی ہے، حالانکہ ہم نے جو کچھ کیا، وہ اس خطرے کی روک تھام کے سوا اور کچھ نہیں جو ہمیں ہندوستان کی طرف سے درپیش رہا ہے۔ کیا فطرت انسانی کا تقاضا یہی ہونا چاہئے کہ ہم اپنے بچاؤ کے لیے جو تدابیر اختیار کرنے پر مجبور ہیں، اُنہیں ترک کر دیں؟ کیا ہماری اپنی قوم اس صورت حال کو منظور کرلے گی؟

ہماری اطلاع کے مطابق ہندوستان نے ہماری سرحد سے اپنا ایک پورا اور ایک آدھا ڈویژن ہٹا لیا ہے۔ لیکن اس امر کے قطعی آثار پائے جاتے ہیں کہ وہ اس کے بجائے اپنی محفوظ بکتر بند فوج کا ایک ڈویژن اور ایک بریگیڈ ہمارے خلاف مورچوں پر پہنچا رہا ہے۔ اسی طرح اب اس نے ایک کور ہیڈ کوارٹرز قائم کیا ہے تاکہ ان فوجوں کی نگرانی کی جائے جو مشرقی پاکستان کے خلاف صف آرا ہیں۔ اس کے بحریہ کے جہاز دو چھوٹے جہازوں کو چھوڑ کر سب کے سب بمبئی کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہیں۔ بظاہر اس کی وجہ مرمت بتائی جاتی ہے لیکن دراصل انہیں ہمارے لیے خطرے پیدا کرنے کے لیے وہاں جمع کیا گیا ہے۔

مسٹر پریذیڈنٹ! ان اقدامات کو کسی صورت میں بھی ہمارے متعلق ہندوستان کے پرامن ارادوں سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ پھر ہم اس قسم کی صورت حال میں اس سے اپنی دوستی کا اظہار کیسے کر سکتے ہیں؟

جی نہیں مسٹر پریذیڈنٹ، اس مسئلے کا حل کچھ اور ہے۔ اس کا حل ایسی صورت حال پیدا کرنا ہے کہ ہم ہندوستان کے خطرے سے اور وہ ہمارے خطرے سے آزاد ہو سکے۔ یہ جبھی ممکن ہے کہ مسئلہ کشمیر کا تصفیہ ہو جائے۔ بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ یہ مسئلہ حل ہونا مشکل ہے۔ مجھے اس بات سے اتفاق نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہندوستان اپنا رویہ بدل لے تو اس مسئلے کا ایک منصفانہ اور آبرومندانہ حل تلاش کر لینا کچھ دشوار نہیں۔

ہمارا مقصد امن سے رہنا ہے، خاص طور پر اپنے ہمسایوں کے ساتھ۔ میں آپ کی اس یقین دہانی کے لیے شکرگزار ہوں کہ آپ ہندوستان کو جو اسلحہ مہیا کر رہے ہیں اُسے ہمارے خلاف استعمال نہیں کیا جائے گا۔ یہ آپ کی بڑی عنایت ہے۔ لیکن جن لوگوں سے آپ کو واسطہ پڑ رہا ہے، ان کو اوران کی تاریخ کو جو پیاں شکنیوں کی ایک مسلسل داستان ہے، جانتے ہوئے، میں آپ جیسے دوست کو یہ رائے نہ دوں گا کہ خود کو ایک دشوار صورت حال میں مبتلا کریں۔ جوناگڑھ، مانگرول، حیدرآباد، کشمیر اور گوا کا جو حشر ہوا، اس سے آپ بخوبی واقف ہوں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہندوستان آج آپ سے جو اسلحہ چین کے خلاف استعمال کرنے کے لیے حاصل کر رہا ہے، وہ بلاشبہ پہلا ہی موقع آنے پر ہمارے خلاف استعمال کرے گا۔ تاہم اس وعدے کو نظر میں رکھتے ہوئے، جو آپ نے بکمال مہربانی ہم سے کیا تھا اور جو یہ تھا کہ آپ ہندوستان کو کسی قسم کی فوجی امداد دینے سے پہلے ہم سے مشورہ کر لیا کریں گے، ہم یہ توقع کرتے تھے کہ ہم سے مشورہ کیا

Marfat.com

جائے گا نیز ہمیں اس امر سے بھی مطلع کیا جائے گا کہ جو اسلحہ اور ساز و سامان ہندوستان کو مہیا کیا جا رہا ہے، وہ کس قسم کا ہے اور اس کی مقدار کیا ہے۔ افسوس ہے کہ ان میں سے کسی بات پر بھی عمل نہیں کیا گیا۔

میں آپ کی توجہ اس امر کی طرف بھی مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ اگرچہ اس وقت ہندوستان خود کو ستم رسیدہ اور مظلوم ظاہر کر رہا ہے، لیکن حقیقت میں وہ مستقل طور پر اپنے آس پاس کے ہمسایوں کو ڈراتا دھمکاتا رہا ہے، کسی کو کم کسی کو زیادہ۔ آپ یقین جانئے کہ ایشیا کے بہت سے لوگ ہندوستان کے ارادوں کو شبہ کی نظروں سے دیکھتے ہیں اور ہندوستان کے امن پسند قوم ہونے کا تصور کبھی کا زائل ہو چکا ہے۔

مسٹر پریذیڈنٹ! آپ نے پاکستانی اخبارات کے تبصروں کا ذکر کیا ہے۔ ہر چند کہ ہم نے اپنے اخبارات کو انتہا پسند خیالات کے اظہار سے روکنے کی کوشش کی ہے لیکن ان کی آزادی میں مداخلت کرنا ممکن نہیں، کیونکہ یہ قوم کے خیالات کے آئینہ ہیں۔ اس امر کو بھی دھیان میں رکھیے کہ ہندوستان کو اسلحہ کی امداد دینے سے جو نئی صورت حال پیدا ہوئی ہے، اس نے رائے عامہ پر برا اثر ڈالا ہے۔ اس وجہ سے اور بھی کہ ہندوستان ہماری سلامتی کے لیے بدستور خطرہ بنا ہوا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ہماری حکومت کے لیے رائے عامہ کو نظر انداز کرنا انتہائی مشکل ہوگا۔

پرخلوص جذبات کے ساتھ
آپ کا مخلص
دستخط
محمد ایوب خان

(فرینڈز ناٹ ماسٹرز: صفحہ 236 تا 239)

نیو یارک ٹائمز نے اپنی 31 اکتوبر 1962ء کی اشاعت میں ایک نامہ نگار کا مراسلہ شائع کیا۔ یہ اس مراسلے کے بارے میں تھا جو صدر ایوب کے نام صدر کینیڈی نے لکھا تھا۔ اس میں بتایا گیا کہ صدر کینیڈی نے صدر ایوب کے خط کے ساتھ مسٹر نہرو سے ''چین کے ساتھ ان کے ملک کی جنگ پر امریکہ کی ہمدردی ظاہر کی تھی''۔ یہ بھی کہا گیا تھا کہ ''سنا ہے امریکی حکام پاکستان کے ان خدشات سے بخوبی واقف ہیں جو ہندوستان کو مزید فوجی ساز و سامان دیئے جانے پر اسے پیدا ہوں گے۔ لیکن واشنگٹن میں یہ امید ظاہر کی جا رہی ہے کہ مارشل ایوب کی حکومت امریکی فوجی امداد کی غرض و غایت کو سمجھ پائے گی۔ یہاں یہ امید بھی ظاہر کی جا رہی ہے کہ اہل پاکستان کشمیر پر ہندوستان سے اپنے دیرینہ جھگڑے کے سلسلے میں اب کوئی نیا قدم نہیں اٹھائیں گے''۔

اسی روز واشنگٹن پوسٹ نے اپنے اداریے میں لکھا:

''ہر چند اس واقعے نے ہندوستان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ مگر یہ بات ابھی تک واضح نہیں ہوئی کہ ایشیا کی یہ عظیم طاقت خطرے سے پوری طرح چوکس ہے۔ گو ہندوستان چین کے مقابلے کے لیے فوجی وسائل کی جستجو کر رہا ہے، لیکن ابھی ہندوستان نے خود کو ایسی خطرناک صورت میں نہیں پایا کہ اسے اپنی ساری فوجی طاقت استعمال کرنی پڑ جائے۔ ہندوستان کی جو فوجیں چینیوں کا مقابلہ کر رہی ہیں ان کو پیچھے ہٹنا پڑ رہا ہے، کیونکہ ایک تو وہ تعداد میں کم ہیں دوسرے ان کے پاس عمدہ قسم کا جنگی سامان نہیں ہے۔ ہندوستان کی بیشتر طاقتور

Marfat.com

ترین فوجیں تو وہ ہیں جو پاکستان کی سرحد پر بے کار بندھی کھڑی ہیں اور کوئی نقل و حرکت نہیں کر سکتیں......
مغربی دنیا اس برصغیر کو خواہ کتنی ہی امداد کیوں نہ دے وہ اتنی مفید ثابت نہیں ہو سکتی جتنی وہ مدد جو ہندوستان اور پاکستان اپنے جھگڑے (کشمیر) کا تصفیہ کر کے ایک دوسرے کو دے سکتے ہیں......''

(واشنگٹن پوسٹ: 31 اکتوبر 1962)

امریکی اخبارات کے ایک حصے نے امریکی انتظامیہ کو اس خطرے سے آگاہ کیا جو ہندوستان کو اندھا دھند فوجی امداد پہنچانے میں تھا۔ ''فلیڈلفیا انکوائرر'' نے اپنے 30 اکتوبر 1962ء کے اداریے میں لکھا: ''تاہم اس بات کی معقول وجہ موجود ہے کہ اندھا دھند کارروائی نہ کی جائے اور ایسی مالی امداد نہ مہیا کی جائے جو ہماری استطاعت سے باہر ہو، یا ایسے اسلحہ جات دوسروں کے حوالے نہ کیے جائیں جو عجب نہیں کہ کل آزاد دنیا ہی کے خلاف استعمال ہونے لگیں۔ یہ ملک اربوں ڈالر کی مالیت کی اقتصادی امداد ہندوستان کو دے چکا ہے اور اس ملک کی یہ حالت ہے کہ اس نے 1947ء میں جوناگڑھ اور کشمیر کو اپنی فوجی طاقت کا نشانہ بنایا، اس کے بعد کمزور قوموں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ گوا کی فتح اس سلسلے کا تازہ ترین کارنامہ ہے۔ ان معاملوں میں سے کسی میں بھی نہ تو اقوام متحدہ سے رجوع کیا گیا اور نہ ان علاقوں کے لوگوں کو رائے شماری کے ذریعے اپنی خواہشات کے اظہار کا موقع دیا گیا۔ پاکستان کے لیے جو ہندوستانی پالیسی کا ایک شکار ہے، اپنے ہندوستان کو اس قدر وسیع پیمانے پر فوجی امداد کا ملنا بجا طور پر باعث تشویش ہے......وزیر اعظم نہرو کی اس خواہش کا بڑا چرچا ہے کہ وہ ''اسلحہ کی قیمت ادا کرنا چاہتے ہیں'' ان کی اس خواہش کی حوصلہ افزائی اس صورت میں ضرور کی جانی چاہئے کہ یہ ناطرفداری یا نام نہاد غیر جانبداری کے نام پر ان کی جارحانہ کارروائیوں کا صرف ایک بہانہ نہ ہو۔

2 اکتوبر 1962ء کو امریکہ میں پاکستانی سفیر کی ملاقات اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے ایک عہدہ دار سے ہوئی۔ پاکستانی سفیر نے دریافت کیا کہ ہندوستان نے امریکہ سے کس قسم کی فوجی امداد مانگی ہے۔ اس کو بتایا گیا کہ ہندوستان نے ابھی اپنی فوری ضروریات کی تشریح نہیں کی ہے۔ البتہ مسٹر نہرو نے نئی دہلی میں اسی روز صبح کو امریکی سفیر گالبریتھ سے ملاقات کی تھی اور چین کے خلاف استعمال کرنے کے لیے امریکی اسلحہ مانگا تھا۔ سفیر گالبریتھ نے اپنی حکومت کی جانب سے مسٹر نہرو کو بتایا تھا کہ حکومت ہندوستان کو فوجی امداد دے گی، البتہ مسٹر نہرو کو اپنی ضروریات خود ہی بتانی ہوں گی۔ ہندوستان نے کینیڈا والوں سے ''کاری بو'' بار برداری کے ہوائی جہازوں کے لیے جو درخواست کر رکھی ہے امریکہ نے اس معاملے میں اپنی مقدم مانگ سے دستبردار ہونا پہلے ہی منظور کر لیا ہے۔

پاکستانی سفیر نے صدر کینیڈی کی اس یقین دہانی کا ذکر کیا جو انہوں نے ایوب خان سے کی تھی اور جو یہ تھی کہ ہندوستان کو اسلحہ دینے کا فیصلہ کرنے سے پہلے پاکستان سے مشورہ کر لیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ امریکی حکومت نے دو بہت اہم باتوں کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اول تو انہوں نے پاکستان سے مشورہ کیے بغیر ہی ہندوستان کو اسلحہ کی امداد دینے کا فیصلہ کر لیا تھا، دوسرے اس امر کی اطلاع پاکستان کو دینے سے پہلے ہندوستان کو دے دی تھی۔ ہمارے سفیر نے یہ امید ظاہر کی کہ آئندہ ہندوستان کو دیئے جانے والے اسلحہ کی مقدار، نوعیت اور ان شرائط کے بارے میں جن پر یہ اسلحہ دیا جائے گا کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے پاکستان س مشورہ لے لیا جائے گا۔ ہمارے سفیر کو بتایا گیا کہ ممکن ہے ہندوستان کو یہ امداد یا تو اُدھار

Marfat.com

پٹے پر دی جائے اور مقامی سکے میں ادائیگی ہو، یا پھر التوائی ادائیگی کی بنیاد پر۔

پاکستانی سفیر کو بتلایا گیا کہ امریکہ ذرا بھی وقت ضائع کیے بغیر عمل کرنے کے لیے مضطرب ہے۔ امریکہ چینیوں کے اس اقدام کو کوریا کے بعد کا سب سے بڑا اقدام تصور کرتا ہے۔ کوریا کے معاملے میں امریکہ نے انتہائی سرعت کے ساتھ یہ فیصلہ کیا تھا۔ موجودہ صورت حال میں بھی اسی قدر تیزی سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ہندوستانیوں کو چینی خطرے سے آگاہ ہونے میں پانچ سال لگ گئے لیکن اب ان کی آنکھیں کھل گئی ہیں۔ امریکہ ہندوستان کو پوری پوری امداد دینے کا خواہش مند ہے، ہاں اس بات کی مناسب ضمانت ضرور ہونی چاہئے کہ اس کے دیئے ہوئے اسلحہ کو صرف چین کے خلاف استعمال کیا جائے گا۔ (فرینڈز ناٹ ماسٹرز: صفحہ 224)

اگلے روز اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی ایک اور ملاقات میں پاکستانی سفیر کو بتلایا گیا کہ مسٹر نہرو کی جانب سے فوجی ساز و سامان کی امداد کے سلسلے میں ایک تفصیلی درخواست موصول ہوئی ہے۔ یہ درخواست دو فہرستوں پر مشتمل ہے۔ ایک فہرست کی اشیا کی وصولی کے لیے ایک سو بیس دن کی میعاد مقرر کی گئی ہے اور دوسری فہرست میں ایسی اشیا ہیں جن کی فوری طور پر ضرورت ہے اور جن کو بذریعہ ہوائی جہاز بھیجنا ہوگا۔ یہ سامان ہندوستان کو روپوں کے بدلے دیا جائے گا جو ایک فنڈ میں جمع کیے جائیں گے اور ان کو پی ایل 480 والے پروگرام کی طرح استعمال کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں اس رعایت پر بھی غور ہو رہا ہے کہ پہلی کھیپ کے دام معاف کر دیئے جائیں۔ ہندوستانیوں نے جو ساز و سامان مانگا تھا وہ اس خاص جنگی صورت سے نمٹنے اور اسی نسبت سے محفوظ ذخائر رکھنے کے لیے تھا۔ امریکا کا مقصد اس سامان کو فوری طور پر مہیا کرنے سے یہ تھا کہ ہندوستان کی لڑنے کی صلاحیت کو تقویت دی جا سکے۔ پاکستانی سفیر کو بتایا گیا کہ ہندوستان امریکہ کا یہ اسلحہ پاکستان کے خلاف استعمال نہیں کرے گا نیز یہ کہ اس بارے میں پاکستانی سفیر کو "امریکہ کے قول پر اعتماد کرنا چاہئے"۔ پاکستانی سفیر کو یہ بھی بتایا گیا کہ ہندوستان کو جنگی ساز و سامان بہم پہنچانے سے برصغیر میں طاقت کے توازن میں جو ناہمواری پیدا ہوگی پاکستان کو اس کی طرف سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ سفیر کو مشورہ دیا گیا کہ پاکستان کو پرانی باتیں بھول جانی چاہئیں اور ہندوستان کی طرف خیر سگالی اور تعاون کا ہاتھ بڑھانا چاہئے۔ اس کے اس اقدام سے ہندوستان پر زبردست اثر پڑے گا اور یقیناً پاکستان کی طرف اس کا رویہ نرم ہو جائے گا اور پھر کیا عجب کہ اس سے مسئلہ کشمیر کے اطمینان بخش حل کی بھی کوئی راہ نکل آئے۔

امریکا نے ہندوستان کو ہنگامی طور پر مدد دینے کے علاوہ طویل المیعاد بنیاد پر بھی جنگی سامان دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ بھی ظاہر ہو گیا تھا کہ ہر چند امریکہ ہندوستان و پاکستان کے تنازعہ کشمیر کے پرامن حل کا خواہشمند ہے مگر وہ اس سلسلے میں براہ راست ہندوستان پر اپنا پورا اثر ڈالنے کے لیے تیار نہیں کہ کہیں ہندوستان یہ نہ سمجھ لے کہ اس پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔ درحقیقت امریکا کا رویہ یہ تھا کہ ہندوستان سے تو ہر طرح ہمدردی ظاہر کی جائے اور اس کی مدد اور حمایت کی جائے اور پاکستان کو مشورہ دیا جائے کہ وہ اس کام میں روڑے نہ اٹکائے۔

مسٹر نہرو نے 27 اکتوبر 1962ء کو صدر ایوب کو ایک خط لکھا جس میں انہوں نے ہند و چین کی سرحدی نشان بندی کے سلسلے میں پیدا ہونے والے جھگڑے کے بارے میں اپنا بیان رقم کیا۔ صدر ایوب نے 5 نومبر کو انہیں جواب بھیجا:

Marfat.com

''ہمارے لیے یہ بڑے افسوس کا مقام ہے کہ یہ جھگڑا سخت فوجی کارروائیوں کی صورت اختیار کر لے، اور جنگ کے نئے نئے امکانات پیدا کر دے، اور اس خطے کے امن اور استحکام کو خطرے میں ڈال دے جس سے پاکستان کا گہرا تعلق ہے۔

مجھے آپ کے اس بیان سے پورا پورا اتفاق ہے کہ بین الاقوامی تعلقات میں دھوکا دہی اور طاقت آزمائی کے ازالے میں کوئی کوشش اٹھا نہ رکھنی چاہئے۔ میں اس سلسلے میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہندوستان و پاکستان کے آپس کے بڑے بڑے جھگڑوں کو بھی صلح صفائی کے ساتھ حل کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ حکومت ہند خلوص اور عزم کے ساتھ ان اصولوں پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لے۔ ہم پاکستان والوں نے اپنے تمام ہمسایوں کے ساتھ اور خاص کر ہندوستان کے ساتھ پرامن اور دوستانہ تعلقات کی پالیسی اختیار کرنے کا عہد کر رکھا ہے۔ ہم نے یہ راہ اس لیے اختیار کی ہے کہ ہمارے خیال میں یہی وہ واحد ذریعہ ہے جس سے ہم اپنے اقتصادی و صنعتی ترقی کے عظیم کاموں کو انجام دے سکتے ہیں جن سے عوام کی خوش حالی اور بھلائی وابستہ ہے''۔

25 اکتوبر 1962ء کو مسٹر ہیرلڈ میکملن نے اپنے ہائی کمشنر کے ذریعے صدر ایوب کو ایک پیغام بھیجا۔ اس کے چند روز بعد اسی قسم کا پیغام انہیں آسٹریلیا کے وزیراعظم مسٹر آر۔ جی مینز یز کی طرف سے بھی ملا۔ ایوب خان نے ان دونوں کو بھی قریب قریب وہی باتیں لکھیں جو مسٹر کینیڈی کے خط کے جواب میں لکھی تھیں۔ اس میں انہوں نے اپنے اس مدلل یقین کو دہرایا تھا کہ چینی ہندوستان پر بھرپور فوجی حملہ نہیں کرنا چاہتے۔ انہیں امید تھی کہ مغربی طاقتیں ہندوستان کو وسیع پیمانے پر جنگی سازوسامان دیتے وقت پاکستانی نقطہ نگاہ کو پیش نظر رکھیں گی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مغربی طاقتیں ہندوستان کو جلد سے جلد اسلحہ اور گولہ بارود پہنچانے کی خواہش میں نہ تو ہماری بات سننے کو تیار تھیں اور نہ انہیں اس امر کا کوئی خیال تھا کہ ان کی اس کارروائی سے آگے چل کر برصغیر میں طاقت کے توازن میں سخت ناہمواری پیدا ہو جائے گی۔

بھارتیوں کے دل میں یہ بات بٹھا کر انہیں خوفزدہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ ان پر چینی برما کے راستے یا تبت سے پچیس تیس ڈویژنوں کے ساتھ حملہ کرنے والے ہیں۔ مسٹر نہرو نے، جو چین کے ساتھ ایک ''طویل جنگ'' کی باتیں کرنے لگے تھے، یہ یقین کر لیا تھا کہ چینیوں کا حملہ لازمی ہے۔ اس قسم کے امکان کا چرچا کرنا ان کے حق میں مفید تھا۔

جنرل کول جو شمال مشرقی محاذ پر ہندوستانی فوج کی کمان کر رہے تھے، سپلائی اور ٹرانسپورٹ کے افسر تھے اور کسی بڑی لڑائی کا تجربہ نہ رکھتے تھے۔ ایک ہندوستانی بریگیڈ کو ٹھیک ''درۂ سیلا'' کی اگلی ڈھلوانوں پر متعین کیا گیا، جہاں چینی فوجیں عین سامنے تھیں۔ اس قسم کی کارروائی کسی بھی تجربہ کار کمانڈر سے سرزد نہ ہوتی۔ چینیوں نے پہلے اس بریگیڈ کو سامنے سے للکارا اور پھر پہلو سے جا کر اس کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ کول کے چھکے چھوٹ گئے۔ اس نے پچھلے بریگیڈ کو مدد کے لیے آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ جب یہ کارروائی عمل میں آئی تو چینیوں نے پیچھے سے جا کر دوسرا حصار باندھ لیا اور ان خندقوں کو جا لیا جو پچھلے بریگیڈ نے خالی کی تھیں۔ جب پچھلے بریگیڈ نے دیکھا کہ چینی فوجوں نے اگلے بریگیڈ پر جو گھیرا ڈال رکھا ہے اس کو توڑ نہیں جا سکتا تو اُس نے لوٹ جانے کی کوشش کی۔ وہاں چینیوں نے ان کی خندقوں پر پہلے ہی قبضہ کر رکھا تھا۔ یہ دیکھ کر سپاہیوں کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی اور وہ جان بچانے کے لیے تتر بتر ہو گئے۔ اس اثنا میں چینی فوجوں نے ایک اور حصار باندھنے کے

Marfat.com

لیے نقل وحرکت کی اور آسام کے میدانوں میں داخل ہو گئیں۔ اس سے وہاں کی شہری آبادی میں بھگدڑ مچ گئی۔ ادھر خود ہندوستانی فوج سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ رہی تھی اور اس میں لڑنے کا ذرا دم نہ رہا تھا۔ اگر اس کی فوجی قیادت بہتر ہوتی، دستوں کی صف بندی صحیح ہوتی اور بازوؤں پر جوابی حملے کے لیے ریزرو فوج رکھی جاتی، تو شاید نتائج ایسے تباہ کن نہ نکلتے۔

چینی فوجیں نہایت ذہین کمانڈروں کے تحت بڑی ہوشیاری سے لڑیں۔ یوں بھی یہ لوگ ہندوستانیوں سے کہیں زیادہ جفاکش ہیں، اور اس قسم کی آب وہوا میں لڑنے کے عادی ہیں۔ تبت میں تقریباً اٹھارہ ہزار فیٹ کی بلندی پر رہنا، یہی بات اُن کی برتری کے لیے کافی ہے۔ اب خیال کیجیے کہ ہندوستانیوں اور امریکیوں کا تصور تو یہ تھا کہ چینی اپنے پچیس تیس ڈویژن جنگ میں لا اتاریں گے، مگر حقیقت صرف اتنی ہے کہ اس سارے علاقے میں چینی فوج کی تعداد چھ سات ہلکے ڈویژنوں سے زیادہ نہ تھی۔ اور نیفا کے محدود علاقے میں تو وہ انڈین آرمی کے خلاف کسی بھی حصے میں ایک یا ڈیڑھ ڈویژن سے زیادہ فوج مقابلے میں نہیں لائے تھے۔ اتنی کم فوج کے باوجود وہ اتنی ہوشیاری و ہنرمندی سے لڑے کہ ہندوستانی فوجوں کے گرد گھیرے پر گھیرے ڈال دیئے۔ اور جنرل بی ایم کول منہ دیکھتا رہ گیا۔

ہندوستانیوں کو یقین تھا کہ انہیں عنقریب چین کے ایک بھرپور حملے کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ان کے دل میں یہ بات بٹھانے میں امریکہ بھی شریک تھا۔ چنانچہ ہندوستان کو بے اندازہ جنگی سازوسامان ملنے لگا۔ جہاں تک امریکہ اور پاکستان کے باہمی اتحاد اور معاہدوں کا تعلق تھا، امریکہ نے بس اتنا ہی ضروری سمجھا کہ پاکستان کو یقین دہانی کرا دی جائے کہ یہ جنگی سازوسامان اس کے خلاف استعمال نہیں کیا جائے گا اور کشمیر کے مسئلے کو سلجھانے کے لیے ہندوستان و پاکستان میں براہ راست گفت وشنید کی راہ ہموار کی جائے گی۔

17 نومبر 1962ء کو اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے یہ یقین دہانی ایک بیان کی صورت میں جاری ہوئی:

''اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے ان مراسلات کے متن کو شائع کر دیا ہے جو حکومت امریکہ اور حکومت ہند نے ایک دوسرے کو بھیجے اور جو حکومت امریکہ کی حکومت ہند کو دی جانے والی دفاعی امداد کے متعلق ہیں۔ ان مراسلات میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ امداد ہندوستان کو چینی کمیونسٹوں کے حملے سے بچاؤ کے لیے دی جا رہی ہے جس سے اس وقت ہندوستان دوچار ہے۔

1954ء میں جب ریاستہائے متحدہ امریکہ نے پاکستان کو فوجی امداد دینے کا فیصلہ کیا تھا تو حکومت ہندوستان کو یقین دلایا گیا تھا کہ اگر کوئی بھی ملک جس میں پاکستان شامل ہے ہماری امداد کا غلط استعمال کرے گا یا کسی دوسرے ملک کے خلاف حملہ کرنے میں اس سے کام لے گا تو حکومت ریاستہائے متحدہ امریکہ اپنے آئینی اختیار کے تحت فی الفور اقوام متحدہ کے اندر اور باہر ایسے حملے کو روکنے کے لیے مناسب کارروائی کرے گی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ یقین دلاتے وقت امریکہ کو پورا یقین تھا کہ یہ دونوں ملک جن کو امریکہ کی مدد مل رہی ہے ایک دوسرے کے خلاف جارحانہ ارادے نہیں رکھتے''۔

(امریکن سٹیٹ سیکرٹری کا بیان)

Marfat.com

صدر کینیڈی نے خود بھی 2 نومبر 1962ء کو ایک بیان جاری کیا:

''ہندوستان کو فوجی امداد دیتے وقت ہمیں پاکستان کے ساتھ اپنے اتحاد کا پورا پورا خیال ہے۔ ہماری اس امداد کا مقصد محض چینی کیونسٹوں کی تخریبی کارروائی کو شکست دینا ہے۔ ہماری اس امداد سے جو ہندوستان کو دی جا رہی ہے نہ تو پاکستان کے ساتھ ہمارے معاہدوں کی اہمیت کم ہوتی ہے اور نہ اس میں کسی قسم کا فرق آتا ہے۔ ہم نے یہ امر دونوں حکومتوں پر واضح کر دیا ہے''۔

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان براہ راست گفت وشنید کا انتظام کرانے میں مسٹر ڈنکن سینڈیز جو اس وقت برطانیہ میں وزیر تعلقات دولت مشترکہ کے عہدے پر فائز تھے اور مسٹر ایورل ہیری مین امریکی اسسٹنٹ سیکرٹری آف سٹیٹ برائے امور مشرق بعید نے بڑا نمایاں حصہ لیا۔ ذیل میں وہ بیان درج کیا جاتا ہے جو ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں نے 29 نومبر 1962ء کو مشترکہ طور پر جاری کیا تھا اور جس پر نہرو اور صدر ایوب خان نے دستخط کیے تھے:

''صدر پاکستان اور وزیراعظم ہندوستان نے اس امر پر اتفاق کیا ہے کہ ان دونوں ملکوں کے درمیان کشمیر اور دوسرے متعلقہ معاملات میں جو بڑے بڑے اختلافات موجود ہیں ان کے تصفیے کی ازسرنو کوشش کی جائے تاکہ ہندوستان اور پاکستان ایک دوسرے کے ساتھ امن اور دوستی سے رہ سکیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے بہت جلد مذاکرات کرنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ ایک آبرومندانہ اور منصفانہ سمجھوتا ہو سکے۔ یہ مذاکرات ابتدا میں وزارتی سطح پر ہوں گے۔ مناسب موقع آنے پر مسٹر نہرو اور صدر ایوب میں براہ راست بات چیت ہوگی۔

دستخط	دستخط
ایم اے خان	جے ایل نہرو
الیف۔ایم	29.11.62
29.11.62	7:10 شام

اس مشترکہ بیان پر ابھی دستخطوں کی سیاہی بھی سوکھنے نہ پائی تھی کہ مسٹر نہرو نے لوک سبھا میں ایک بیان داغ دیا۔ مسئلہ کشمیر کے مفید اور تعمیری مذاکرات کے متعلق مسٹر نہرو کی نیت پر پاکستان میں پہلے ہی سے شبہ کیا جا رہا تھا۔ ان کے اس بیان نے اس شبہ کو قوی تر بنا دیا۔ 30 نومبر کو مسٹر ڈنکن سینڈیز نئی دہلی سے لندن لوٹتے ہوئے کراچی پہنچے۔ جب انہیں نہرو کے بیان کے متن دکھایا گیا تو وہ ایسے متعجب ہوئے کہ انہوں نے اس معاملے کو صاف کرنے کے لیے واپس دہلی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ دہلی کے ہوائی اڈے سے وہ سیدھے وزیراعظم کی کوٹھی پر پہنچے۔ نہرو سونے کی تیاری کر رہے تھے کہ مسٹر سینڈیز نے انہیں جا لیا۔

نہرو نے پہلے پہل یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی جیسے ان کی سمجھ ہی میں نہ آ رہا ہو کہ یہ واویلا کس لیے مچایا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے یہ بیان حسب عادت بغیر تیار شدہ متن میں دیا تھا۔ میں نے جو رائیں ظاہر کی تھیں وہ ایک سوال کی جواب میں تھیں، جس کے لیے ان کو پہلے سے کوئی نوٹس نہیں دیا گیا تھا۔ یہ سوال بی بی سی کی ایک افواہ کے بارے میں تھا، جس میں کہا گیا تھا کہ کشمیر کی تقسیم کا خیال زیر بحث ہے۔ مسٹر نہرو نے کہا کہ ان کے بعض الفاظ کو ضرورت سے زیادہ

Marfat.com

معنی پہنانا درست نہ ہوگا۔انہوں نے اس سلسلے میں کوئی بیان دینے کے خیال کو اس لیے پسند نہ کیا کہ کہیں اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ وہ اپنے بیان سے منحرف ہو گئے ہیں۔تاہم مسٹر ڈنکن سینڈیز کے اس مشورے کو انہوں نے قبول کر لیا کہ کوئی اس قسم کا بیان سوچ لیا جائے جس کا مطلب یہ تو نہ ہو کہ وہ اپنی بات سے پلٹ رہے ہیں، مگر ساتھ ہی ان الفاظ کی اس طرح وضاحت کی جائے کہ لوک سبھا والے بیان سے جو شبہات پیدا ہو گئی ہیں، دور ہو سکیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں یکم دسمبر 1962ء کو مسٹر نہرو نے جو بیان دیا وہ یہ ہے:

''دونوں حکومتیں جو مذاکرات شروع کرنے والی ہیں ان کی حدود پہلے سے مقرر کر لینے یا پیشگی شرطیں عائد کرنے کا کبھی کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوا۔جیسا کہ کل میں نے لوک سبھا میں اشارہ کیا تھا، کشمیر کا مسئلہ پیچیدہ اور مشکل ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر دونوں فریقوں نے خیر سگالی سے کام لیا تو اس کا اور دوسرے مسئلوں کا آبرومندانہ اور منصفانہ حل تلاش کر لینا ناممکن نہ ہوگا''۔(پاکستان ٹائمز۔2دسمبر 1962ء)

اس اثنا میں نہرو امریکہ کو فوجی امداد کے لیے ایک اور تاکیدی درخواست بھیج چکے تھے۔20 نومبر 1962ء کو امریکہ نے فوجی بار برداری کے بارہ سی۔130 قسم کے ہوائی جہاز بھیجے۔اس کے بعد مزید امداد کے طور پر پہاڑی لڑائی کے مطلب کا ساز و سامان بھیجا گیا۔ان ہوائی جہازوں کو ہندوستانی علاقے کے اندر رسد پہنچانے کے لیے استعمال کیا جانا تھا۔علاوہ ازیں ان کو نیفا کے علاقے میں فوجی مورچے سنبھالنے کے سلسلے میں ''فوری کام'' انجام دینے تھے۔

اس وقت ہندوستانیوں کے نقطۂ نظر سے فوجی صورت حال بڑی مایوس کن نظر آتی تھی۔چینی فوجیں نیفا کے علاقے میں وادی کے دونوں سروں پر بڑی تیزی سے نقل و حرکت کر رہی تھیں۔نیفا کے علاقے میں ہندوستانی فوجوں کے بڑے بڑے حصے ایک سے لے کر ڈیڑھ ڈویژن تک، بے کار کر دیئے گئے تھے۔ایسا نظر آتا تھا کہ چینی شاید تیز پور، جورہاٹ اور ڈگبوئی پر قبضہ کر لیں گے۔نومبر کے تیسرے ہفتے میں ایک اونچے درجے کی جماعت جو پینٹاگون اور سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے افسروں اور وائٹ ہاؤس کے ایک نمائندے پر مشتمل تھی، اس مقصد کے لیے ہندوستان آئی کہ ''ہندوستان کی ضرورتوں کا اندازہ لگانے میں'' وہاں کے امریکی سفارت خانے کی امداد کرے، اور ''متعلقہ پالیسی کے امور'' پر مشورہ دے۔اس وقت امریکیوں کا اندازہ یہ تھا کہ اگر چینی فوجیں متنازعہ فیہ علاقے سے آگے بڑھ گئیں تو یہ جنگ ''صرف ہندوستان کا معاملہ'' نہ رہے گی بلکہ ''اس سے کچھ سوا'' ہو جائے گی۔

غرض یہ تھی وہ صورت حال جب نہرو نے مشترکہ بیان پر دستخط کیے تھے، جس کے تحت ہندوستان اور پاکستان کو مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے ازسرنو جدوجہد کرنی تھی۔چینیوں کے جنگ بند کرنے کے یکطرفہ اعلان کو ابھی چند ہی ہفتے گزرے تھے کہ ہندوستانیوں کا رویہ بالکل بدل گیا اور وہ مذاکرات جن کی کامیابی کے پہلے ہی کچھ آثار نظر نہ آتے تھے، ضابطے کی بابت اختلاف اور لفظی بحثوں میں پھنس کر رہ گئے۔

صدر کینیڈی اور وزیر اعظم میکمیلن نے حکومت پاکستان کو مطلع کیا کہ وہ کس حد تک ہندوستان کو اسلحہ مہیا کر رہے ہیں۔صدر پاکستان جنرل ایوب خان نے 2 جنوری 1963ء کو صدر کینیڈی کو لکھا:

''کشمیر کا فوری اور منصفانہ تصفیہ ہی اس بات کی ضمانت دے سکتا ہے کہ ہندوستان کو دی جانے والی بڑھتی ہوئی

Marfat.com

فوجی امداد آئندہ پاکستان کے خلاف استعمال نہ کی جائے گی۔ مجھے اس امر میں آپ کی رائے سے پورا پورا اتفاق ہے کہ کوئی بھی اقدام اس برصغیر کی سلامتی کے لیے اتنا کارآمد ثابت نہیں ہوسکتا جتنا کہ مسئلہ کشمیر کا حل کیا جانا۔ اس موضوع پر مسٹر نہرو کے حوصلہ شکن اور اشتعال انگیز بیانات کے باوجود ہم اس مسئلے کے ایک ایسے تصفیے کے لیے ہندوستان سے گفت وشنید کرنے کی پرخلوص کوشش کیے جا رہے ہیں، جس سے تین ضرورتیں پوری ہوسکیں: جموں اور کشمیر کے لوگوں کی خواہشات کا احترام، پاکستان کے اہم مفادات کی حفاظت، اور ہندوستان کے جائز مطالبات کا مناسب لحاظ۔ اس سلسلے میں صحیح فیصلہ جبھی ہوسکے گا کہ ان تینوں بنیادی باتوں کا پورا پورا خیال رکھا جائے۔ لیکن اگر ہندوستان نے صرف اپنے ہی فائدے پر نظر رکھی یا تصفیے میں رکاوٹ پیدا کی جیسا کہ آثار سے معلوم ہوتا ہے، تو ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکیں گے۔ وزیراعظم ہیرلڈ میکمیلن کو بھی میں نے اسی دن خط لکھا: ''میں آپ کے 24 دسمبر کے پیغام کے لیے شکر گزار ہوں۔ سر موری جیمس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ آپ نے اور صدر کینیڈی نے اپنی ناساؤ کی ملاقات کے موقعے پر ہندوستان کو کس حد تک فوجی امداد دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ کشمیر کے تصفیے کے بغیر ہندوستان کو برطانیہ اور امریکہ کے اس حد تک فوجی امداد دینے سے ہمیں تشویش پیدا ہوگئی ہے۔ ناساؤ کے فیصلے کے مطابق جس کی بنیاد آپ کے فوجی ماہرین کے اندازے پر رکھی گئی ہے، جو امداد دی جائے گی وہ آپ کی حکمت عملی کے نقطہ نگاہ سے شاید کم سے کم معلوم ہو، جس کی نیفا اور لداخ کی راہ سے ہونے والے حصے سے بچنے کے لیے ہندوستان کو ضرورت ہوگی، لیکن اس کے برعکس ہمارے لیے یہ یقین کر لینا مشکل ہے کہ ان راستوں سے کوئی حملہ ہونے والا ہے۔ چنانچہ آپ جو فوجی امداد ہندوستان کو دے رہے ہیں وہ مقدار اور اقسام کے لحاظ سے اتنی زیادہ ہے کہ اس سے اس برصغیر میں فوجی طاقت کا موجودہ توازن بگڑ جائے گا، اور اس طرح پاکستان کی سلامتی کو خطرہ پیدا ہو جائے گا۔

میرا ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے کہ اس برصغیر کی سلامتی کو برقرار رکھنے کا سب سے مؤثر طریقہ یہ ہے کہ دونوں ملکوں کی مسلح افواج کو ایک دوسرے کے خلاف صف آرائی سے روک دیا جائے۔ دونوں طرف کی یہ صف آرائی کشمیر کے تصفیے ہی سے ہٹائی جاسکتی ہے۔ لیکن کسی تصفیے کے بغیر ہندوستان کو بھاری فوجی امداد دیئے جانے سے اس امر کا امکان ہے کہ اسے ہندوستان کے شمال مشرقی خطے یا ہندوستان اور چین کی سرحد کے مغربی حصوں کی حفاظت کے لیے نہیں بلکہ پاکستان کے خلاف استعمال کیا جاسکتا ہے۔

چند روز ہوئے راولپنڈی میں ہندوستان اور پاکستان میں وزارتی سطح پر جو گفت وشنید ہوئی تھی، ہم نے اس سے برطانوی ہائی کمشنر کو آگاہ رکھا ہے۔ یہ ملاقات محض ابتدائی جانچ پڑتال کرنے کے لیے تھی۔ کشمیر کے بارے میں ہندوستان کے ارادوں کا حال اس وقت کھلے گا جب نئی دہلی میں جنوری کے وسط تک دونوں ملکوں میں اگلی وزارتی میٹنگ ہوگی۔ پاکستان کا رویہ سخت گیرانہ نہ ہوگا۔ میں نے اپنے وفد کو ہدایت کی ہے کہ وہ تصفیے کا امکانی حل تلاش کرنے میں تین اصولوں کی پیروی کرے:

1. کیا یہ حل جموں اور کشمیر کے لوگوں کے لیے قابل قبول ہوسکتا ہے۔
2. کیا یہ پاکستان کے عام مفادات کی حفاظت کرتا ہے، اور
3. کیا یہ ہندوستان کے جائز مطالبات کو پورا کرتا ہے۔

Marfat.com

مجھے اس بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہے کہ ایسا فارمولا جو یہ تینوں شرطیں پوری کرتا ہو، آسانی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر ہندوستان سچے دل سے اس جھگڑے کو ختم کرنے کا خواہاں ہو اور دونوں فریق خیر سگالی کا اظہار کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ برطانیہ اور امریکہ کی مدد سے ایک یا دو مہینے کے اندر دونوں ملک اس مسئلے کا ایک منصفانہ اور آبرومندانہ حل تلاش نہ کر لیں۔

پاکستان میں رائے عامہ کی کیفیت یہ ہے کہ گو میں صبر و استقلال سے کام لینے پر آمادہ ہوں لیکن اگر مذاکرات کے سلسلے ایک کے بعد ایک یونہی ناکام ہوتے رہے اور تصفیے کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی تو میرے لیے اپنے عوام کو صبر و استقلال کی تلقین کرنا محال ہو جائے گا۔

مجھے یقین ہے کہ منصفانہ اور پرامن سمجھوتے کی کلید آپ کے اور صدر کینیڈی کے ہاتھ میں ہے۔ اگر اسلحہ اس قرینے سے مہیا کیا جائے کہ ہندوستان معقولیت کی طرف مائل ہو سکے تو ہونے والے مذاکرات سے ضرور اچھے نتائج نکل سکیں گے۔

نئے سال کے موقع پر آپ کی صحت اور خرمی و خوش حالی کی نیک خواہشات کے ساتھ۔

آپ کا مخلص

دستخط

محمد ایوب خان

ہندوستان اور پاکستان میں جو گفت و شنید ہوئی اس کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ وہی پرانا قصہ تھا۔ ہندوستانی ٹال مٹول کرتے رہے۔ انہوں نے مغربی طاقتوں سے بے اندازہ جنگی سامان حاصل کر لیا تھا۔ اس کے عوض کشمیر پر مذاکرات کے لیے مشترکہ بیان جاری کر دینا کچھ مہنگا سودا نہ تھا۔ پاکستانی خوب جانتے تھے کہ جب تک امریکا اس معاملے میں براہ راست دلچسپی نہ لے، ہندوستان ٹس سے مس نہ ہوگا۔ لیکن امریکا کا خیال تھا کہ ان حالات میں اس کا مذاکرات میں حصہ لینا نتیجہ خیز ثابت نہ ہوگا۔ چنانچہ قدرت نے جموں اور کشمیر کے مسئلے کے تصفیے کا جو یہ نادر موقع بخشا تھا وہ ہاتھ سے جاتا رہا، جب امریکا اور دوسرے مغربی طاقتوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ ہندوستان کو دی جانے والی جنگی امداد کو مسئلہ کشمیر کے تصفیے سے مشروط نہ کیا جائے گا، تو ہندوستانیوں کو پاکستانیوں کے ساتھ اس مسئلے پر سنجیدگی سے بات چیت کرنے کی کوئی ضرورت باقی نہ رہی۔

1965ء کی جنگ کی بنیاد بھی مسئلہ کشمیر ہی تھی۔ مقبوضہ کشمیر میں حق خود ارادیت کا مطالبہ روز بروز بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ 1963ء کے آخر میں بھارت نے جموں و کشمیر کو انڈین یونین میں ضم کرنے اور بھارتی آئین کی دفعہ 370 کے تحت اس کی خصوصی حیثیت کو بتدریج ختم کرنے کا بھی اعلان کر دیا گیا۔ اسی اثنا میں ایک اور ہنگامہ خیز واقعہ پیش آیا۔ دسمبر 1963ء میں کشمیر میں جب حضرت بل کی درگاہ سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا موئے مبارک چوری ہو گیا (جو 3 جنوری 1964ء کو چپکے سے واپس بھی رکھ دیا گیا تھا)۔ یہ درگاہ کا انمول اور انتہائی مقدس سرمایہ تھا اور اس کی زیارت کے لیے عقیدت مند دور دور سے آیا کرتے تھے۔ اس واردات سے پورے کشمیر کی مسلم اکثریت میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی اور ہنگامے شروع ہو گئے۔ وہاں یہ عام خیال تھا کہ یہ کام خود حکومت کے ایما اور ہدایت پر ہوا ہے۔ ہندوؤں نے اسے ایک

Marfat.com

مذہبی تحریک سمجھا لیکن واضح طور پر یہ ایک سیاسی تحریک کی شکل اختیار کر گئی تھی جس کا مطالبہ رائے شماری کا تھا اور وہ پاکستان کے حق میں دکھائی دے رہی تھی۔ اسی دوران مسئلہ کشمیر پاکستان کی استدعا پر پھر سلامتی کونسل میں زیر بحث آیا۔ کشمیر پر یہ بحث فروری 1964ء میں شروع ہوئی تھی اور 18 مئی تک رہ سکی۔ اس دفعہ بڑی طاقتوں نے اس مسئلہ پر کوئی خاص توجہ نہ دی کیونکہ امریکہ اور روس دونوں ہی چاہتے تھے کہ یہ معاملہ کسی ایسے فیصلے پر پہنچے بغیر رک جائے کہ جس پر بھارت یا پاکستان میں سے کسی ایک کی بھی دل آزاری نہ ہو، لہٰذا اسے ایک بار پھر غیر معینہ عرصہ کے لیے ملتوی کر دیا جائے۔ ایک طرف تو روس اور امریکہ میں سے کسی کو بھی یہ منظور نہ تھا کہ پاکستان زچ ہو کر بالکل چین کی آغوش میں چلا جائے اور دوسری طرف وہ کسی بھی صورت میں بھارت کی ناراضگی مول لینے پر تیار نہ تھے چنانچہ بھارت اور پاکستان دونوں ہی کو یہ مشورہ دیا گیا کہ جہاں تک بھی ممکن ہو وہ یہ مسئلہ خود دوطرفہ مذاکرات کی بنا پر حل کرنے کی کوشش کریں۔ ساتھ ہی انہیں یہ بھی بتا دیا گیا کہ بیرونی عناصر (بشمول اقوام متحدہ) کی مداخلت معاملہ کو محض پیچیدہ تر بنا سکتی ہے۔ امریکا کی طرف سے یہ پہلا واضح اشارہ تھا کہ اُس نے مقبوضہ کشمیر پر بھارتی قبضے کو تسلیم کر لیا ہے اور اب وہ صورت حال کو جوں کا توں رکھنا ہی بہتر سمجھتا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ کشمیر میں جھڑپیں اور بھارت کی طرف سے پاکستان کو اشتعال انگیز دھمکیاں اور بیانات آنے بھی شروع ہو گئے۔ بھارت کے وزیر دفاع وائی بی چوان نے ایک موقع پر یہاں تک کہہ دیا کہ ہم بھارت کو پاکستان کا قبرستان بنا دیں گے۔ بھارت کے ایک اور وزیر تعمیرات مسٹر کھنہ نے صاف صاف پاکستان کو بھارت کے اولین دشمن کا خطاب دیا اور ساتھ دھمکی دی کہ پاکستان کی طرف سے خطرے کا بھرپور مقابلہ کیا جائے گا۔

(پاک بھارت تعلقات: 1947 تا 1966، جی ڈبلیو چوہدری صفحہ 178)

رائے شماری کے حق میں تحریک کا زور توڑنے کے لیے بھارتی حکومت نے شیخ عبداللہ کو رہا کر دیا۔ محسوس ہوتا تھا کہ بھارتی حکومت مسئلہ کشمیر حل کرنے پر آمادہ ہو گئی ہے۔ شیخ عبداللہ کو پاکستان کا دورہ کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ شیخ صاحب 25 مئی 1964ء کو راولپنڈی پہنچے جہاں پر ان کا والہانہ استقبال کیا گیا۔ سب سے پہلے وہ صدر ایوب سے ملے اور ان سے مذاکرات کے بعد انہوں نے 26 مئی کو یہ اعلان کیا کہ آئندہ ماہ جون میں نئی دہلی میں صدر ایوب وزیر اعظم نہرو سے ملاقات کریں گے تاکہ مسئلہ کشمیر کا کوئی مناسب حل نکل آئے۔ یہ دورہ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا کہ 27 مئی کو مسٹر نہرو کی موت پر انہیں واپس جانا پڑا۔ اور بقول صدر ایوب خان، شیخ عبداللہ اور مرزا افضل بیگ پاکستان بھارت اور کشمیر کے نیم وفاق کی بے معنی تجویز لائے تھے۔ میں نے انہیں صاف کہہ دیا کہ ہم اس سے کچھ سروکار نہیں رکھنا چاہتے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ ہم تو کشمیریوں کو غلامی سے نجات دلانے کی جدوجہد میں مصروف ہیں اور ان کی زبان سے ایسی تجویز کہلائی جا رہی ہے جس پر اگر عمل کیا جائے تو وہ خود ہماری غلامی کا موجب بن سکتی ہے۔ دراصل مسٹر نہرو نے انہیں اس مشن پر پاکستان بھیجا تھا۔ مسئلہ کشمیر کے حل کے سلسلہ میں جو بھی پیش رفت ہو رہی تھی وہ نہرو کی اچانک موت کی وجہ سے وہیں رک گئی۔ اسی سال 12 اکتوبر کو بھارت کے وزیر اعظم لال بہادر شاستری نے قاہرہ جاتے ہوئے چند گھنٹے کراچی میں قیام کیا۔ صدر ایوب نے ان کا استقبال کیا اور مذاکرات کے بعد ایک مشترکہ بیان جاری کیا گیا اور اس میں تمام پرانے پیچیدہ مسائل کو جلد از جلد حل کرنے کا عزم دہرایا گیا اور اس سلسلہ میں باہمی رابطہ قائم رکھنے کی ضرورت کا اعتراف اور اس پر اتفاق کیا گیا۔ مگر یہ سب

Marfat.com

کچھ زبانی جمع خرچ نکلا اور وزیراعظم شاستری نے جلد ہی ایسا طرز عمل اختیار کیا جو باہمی دوستانہ تعلقات کے بالکل منافی تھا۔ دسمبر 1964ء میں شاستری نے اپنے ایک بیان میں پاکستان سے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ان تعلقات میں کشمیر کی نوعیت محض ایک ثانوی مسئلہ ہے۔ اور ساتھ ہی بھارت کے آئین کے تحت کشمیر کو جو خصوصی حیثیت حاصل تھی اور جس کی وجہ سے کم از کم اس کی داخلی خودمختاری بڑی حد تک قائم تھی اسے ختم کرنے کے لیے بھرپور کارروائی کا آغاز کر دیا۔ 21 دسمبر 1964ء کو بھارتی صدر نے ایک بیان میں بھارتی دستور کی دفعہ 357-356 کو کشمیر پر لاگو کر دیا جس کے تحت اس نے کشمیر میں انتظامیہ اور قانون سازی کے اختیارات وفرائض سنبھال لیے اور ایک دوسرے اعلان کے مطابق ریاست جموں وکشمیر کی بھارت یونین میں شمولیت مکمل، حتمی اور اٹل ہے۔ اس اقدام کا مقصد پاکستان کو اشتعال دلانا اور اقوام متحدہ کا منہ چڑانے کے مترادف تھا لیکن امریکن اب بھارت کے لیے بہت سافٹ کارنر رکھتے تھے اور بھارت نے اس کا فائدہ اٹھایا۔ پاکستان کا ردعمل بڑا تلخ تھا۔ حکومت پاکستان نے احتجاج کیا کہ بھارت کا یہ اقدام غیرقانونی ہے اور بین الاقوامی فرائض سے کنارہ کشی کر کے کشمیر کو ضم کرنے کی ایسی کوششوں کے نتائج تباہ کن ہوں گے۔ پورے کشمیر میں ہنگاموں کی آگ بھڑک اٹھی اور عوام نے بھارت کے خلاف بغاوت کر دی اور بھارتی حکومت نے اسے دبانے کے لیے سخت اقدامات کیے۔ پاکستان اور بھارت میں فضا سخت کشیدہ ہوگئی۔

جنوری 1965ء کو رن کچھ میں پاکستان اور بھارتی فوجوں کے درمیان لڑائی چھڑ گئی۔ عجیب معاملہ تھا کہ لڑائی کا اصل محرک اگرچہ مسئلہ کشمیر تھا مگر اس کا آغاز رن آف کچھ سے ہوا۔ بقول ہربرٹ فیلڈمین دونوں اطراف نے ایک دوسرے کی قوت آزمانے کے لیے ایک باہمی تجربے کا انعقاد کیا تھا کہ ہر کوئی فوجی دستوں کے تصادم میں بین الاقوامی سرحدوں سے کتنا آگے جا سکتا ہے۔ (فرام کرائسس ٹو کرائسس پاکستان: 69-1962، صفحہ 134، ہربرٹ فیلڈمین)

امریکہ کی فوجی امداد اور جدید ہتھیاروں نے پاکستان کے احساس خوداعتمادی میں خاطر خواہ اضافہ کیا تھا بلکہ وہ احساس برتری میں مبتلا ہوگیا تھا اور بھارت کی چین کے ہاتھوں شکست سے پاکستانی افواج نے سوچنا شروع کر دیا کہ اگرچہ وہ تعداد میں کم ہیں لیکن وہ بھارت کو شکست دے سکتے ہیں۔ دوسری طرف بھارت چین کے ہاتھوں اپنی مجروح شدہ عسکری آن اور عزت کو فوراً بحال کرنا چاہتا تھا اس کا واحد حل یہی تھا کہ وہ کسی اور محاذ پر جنگ کرے اور فتحیاب ہو۔ اس لیے وہ پاکستان سے جنگ پر آمادہ ہوگیا اور اس نے پہلے سندھ کے ایک بنجر علاقے رن کچھ میں چھیڑ چھاڑ شروع کی۔

(فرام کرائسس ٹو کرائسس پاکستان: 69-1962، صفحہ 135، ہربرٹ فیلڈمین)

رن کچھ کا سرحدی تنازعہ کوئی نیا نہیں تھا بلکہ کئی دوسرے سرحدی تنازعات کی طرح یہ جھگڑا بھی پاکستان اور بھارت کو ورثے میں ملا تھا۔ سات ہزار مربع میل کا یہ علاقہ برصغیر کی آزادی سے قبل ہی حکومت سندھ اور (سابق) ریاست کچھ کے درمیان متنازعہ فیہ تھا۔ جب برصغیر کی تقسیم ہوئی تو ریاست کچھ بھارت میں شامل ہوئی اور صوبہ سندھ پاکستان کے حصے میں آیا اور آزادی کے بعد بھارت پورے علاقے پر اپنا حق جتانے لگا اور اس نے دعویٰ کیا کہ سرحد رن کچھ کے شمالی کنارے سے گزرتی ہے۔ جب کہ پاکستان کا مؤقف تھا کہ بھارت اور پاکستان کی سرحد رن کچھ کے درمیان سے گزرتی ہے۔ اس طرح پاکستانی دعویٰ شمالی کچھ کے 3500 میل پر تھا لہٰذا دونوں میں کشیدگی پیدا ہوگئی۔ 1956ء میں

Marfat.com

بھارت نے چھڈ بیٹ پر قبضہ کرنے کی ناکام کوشش کی۔ 1959ء اور 1960ء میں پاکستان اور بھارت کے مابین سرحدوں کی نشاندہی پر مذاکرات ہوئے جس میں رن کچھ کے متعلق کوئی فیصلہ نہ ہوسکا۔ جنوری 1965ء میں بھارتی فوج نے کانجر کوٹ کے مقام پر پاکستانی فوجی دستوں پر اور چار اپریل کی رات کو پاکستان کی ایک فوجی چوکی پر حملہ کردیا۔

(انٹرویو لیفٹیننٹ جنرل کے ایم اظہر: روزنامہ نوائے وقت 6 ستمبر 1984ء)

14 اپریل 1965ء کو غیر ملکی امداد کے نشے میں بھارتی وزیراعظم نے اعلان کیا کہ پاکستان کی حیثیت کیا ہے، ہم تو چین کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔ 21 اپریل کو پاکستان نے اپنی فوج اس علاقے میں بھیج دی۔ بھارت نے بھی مزید فوج اتار دی اور بیار بیٹ کے نزدیک پاکستانی چوکیوں پر یلغار کردی۔ اس محاذ پر بھارت کا مقابلہ بریگیڈیر کے ایم اظہر سے ہوا۔ بھارت کو شرمناک ہزیمت اٹھانا پڑی اور پاکستان نے بیار بیٹ اور دیگر علاقے آزاد کرا لیے۔ 30 اپریل کو کچھ میں فائر بندی ہوئی اور دونوں ملکوں نے برطانوی وزیراعظم کی مساعی سے ایک سمجھوتے پر دستخط کیے جس کی ایک اہم شق یہ تھی کہ اگر رن کچھ کی حد بندی کے سلسلہ میں فریقین کے درمیان مفاہمت نہ ہوسکے تو یہ تنازعہ سہ رکنی بین الاقوامی ٹرائی بیونل کے سپرد کردیا جائے۔

ستمبر 1965ء میں دونوں ملکوں میں کشمیر کے مسئلہ پر پھر جنگ چھڑ گئی جس کے سبب ان کے مابین رن کچھ کے تنازعہ پر بات چیت نہ ہوسکی اور اسے سہ رکنی ٹربیونل کے سپرد کردیا گیا۔ 19 فروری 1968ء کو ٹربیونل نے فیصلہ صادر کیا جس کے مطابق کانجر کوٹ اور رحیم کی بازار کے جنوب کا 350 مربع میل کا علاقہ پاکستان کی ملکیت قرار دیا گیا اور یہ علاقہ ضلع تھرپارکر (سندھ) میں شامل ہے۔ پاکستان کے ہاتھوں ہزیمت بھارت کو ہضم نہ ہوئی اور پاکستان کے خلاف انتقامی کارروائی کو ناگزیر سمجھ لیا گیا۔ بھارت کے اس عزم کا بلا تامل اظہار کرتے ہوئے رن کچھ میں رسوائی کے فوراً بعد بھارتی وزیراعظم شاستری نے پاکستان کو دھمکی دی کہ اگر اب کے کہیں پاکستان نے کوئی کارروائی کی تو بھارتی افواج آئندہ محاذ کی جگہ اور وقت کا چناؤ خود کریں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ محاذ کشمیر ہی ہوسکتا تھا جہاں خط متارکہ جنگ کی خلاف ورزیوں میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا اور بھارت کی کشمیر کو ضم کرنے کی کارروائیوں سے مقبوضہ کشمیر کے عوام میں سخت اضطراب تھا۔

22 فروری 1965ء سے شیخ عبداللہ غیر ملکی دورے پر روانہ ہوئے تو انہوں نے ساری دنیا کو کشمیریوں کے موقف اور بھارت کی وعدہ خلافیوں سے آگاہ کیا لہٰذا سعودی عرب کے دورہ کے بعد انہیں واپسی کے لیے مجبور کیا گیا اور حج سے واپس آتے ہی 8 مئی کو انہیں جیل میں ڈال دیا گیا۔ جب شیخ عبداللہ کشمیر سے باہر تھے تو 30 مارچ 1965ء کو کشمیر کی قانون ساز اسمبلی نے دستور میں ایک ترمیم کی کہ صدر ریاست کی جگہ اب گورنر ہوگا اور اسمبلی کی بجائے بھارتی صدر اس کی تقرری کرے گا اور وزیراعظم کی جگہ وزیراعلیٰ ہوگا۔ جیسا کہ بھارت میں ہے اس طرح ظاہری طور پر کشمیر کو بھارت کا ایک صوبہ بنا دیا گیا۔ کشمیری موئے مبارک کی چوری کے وقت سے ہی سخت پریشان تھا ان حالات میں وہ خاموش نہ رہ سکے اور اس بات کا احساس کرنے لگے کہ اب مسئلہ کے پرامن حل کی کوئی راہ باقی نہیں رہی ہے لہٰذا 5 جون 1965ء کو نو مختلف مذہبی اور سیاسی تنظیموں کے اشتراک سے ایک مجلس عمل کا قیام عمل میں لایا گیا اور پرامن سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوگئی اور مطالبہ کیا گیا کہ شیخ عبداللہ کو رہا کرو اور بھارت کشمیر کے بارے میں پاکستان اور بھارت کے درمیان عہد کو پورا کرے۔

Marfat.com

بھارت نے کشمیریوں کو دبانے کے لیے بڑے پیمانے پر فوجی کارروائی شروع کر دی جس سے پوری ریاست احتجاجی مظاہروں کی لپیٹ میں آ گئی۔ آزاد کشمیر سے بھی کچھ تعداد تحریک آزادی میں حصہ لینے کے لیے جنگ بندی لائن عبور کر کے اس جنگ میں شریک ہوگئی جس پر بھارت نے الزام لگایا کہ پاکستانی بھارتی مقبوضہ کشمیر میں گڑبڑ پھیلا رہے ہیں۔ صدر پاکستان نے کہا ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں کر رہے جس کا ہم وعدہ کر چکے ہیں اور وہ یہ کہ کشمیری عوام کے حق خودارادیت کے حصول کی جدوجہد میں ان کی حمایت کریں گے۔ یکم جولائی کو بھارت کے وزیر داخلہ نے اعلان کیا کہ کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہونے کی حیثیت سے ایک طے شدہ حقیقت ہے جو کسی بحث یا مذاکرے کا موضوع نہیں بنائی جا سکتی اور حق خوداختیاری کی باتیں بے معنی اور غیر متعلق ہیں۔ (قرطاس ابیض: وزارت خارجہ، صفحہ 59)

یہ وہ صورت حال تھی جس سے اگست 1965ء میں کشمیری عوام برسرپیکار ہونے پر مجبور ہو گئے اور پاک فوج کے باضابطہ عملے کے ارکان ان حریت پسندوں کی جدوجہد میں شامل ہو گئے اور انہوں نے مقبوضہ کشمیر میں داخل ہو کر بھارتی فوجی چوکیوں، سپلائی اڈوں اور فوجی قافلوں وغیرہ کے خلاف تیزی سے انقلابی چھاپہ مار کارروائیاں منظم کرنا شروع کر دیں۔ اس کے ردعمل میں بھارتی فوجوں نے جنگ بندی لائن عبور کر کے آزاد کشمیر کی ایک دفاعی چوکی ''کارگل'' پر 18 اگست 1965ء کو قبضہ کر لیا اور اس کے ساتھ ہی درہ حاجی پیر اور اُوڑی پونچھ کے علاقے کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ بھارت پاکستان کی ان چوکیوں پر حملہ کرنا چاہتا تھا جہاں سے اُس کے خیال کے مطابق پاکستانی مسلح افراد کو ریاست میں تخریبی سرگرمیوں کے لیے بھیجا جا رہا ہے۔ 25 اگست 1965ء کو بھارتی فوجوں نے پاکستانی کشمیر میں دو اہم فوجی چوکیوں ٹیٹوال اور حاجی پیر پر قبضہ کر لیا۔ یکم ستمبر 1965ء کو پاک فوج نے چھمب جوڑیاں سیکٹر میں اکھنور کی طرف کامیاب جارحانہ حملہ کیا۔ مقصد یہ تھا کہ بھارت سے آنے والا واحد راستہ کاٹ دیا جائے۔ اب پاک فوج بھارت کی واحد سپلائی لائن کے سرے پر کھڑی تھی اور کسی وقت بھی کشمیر پر پاکستان کا کنٹرول ہو سکتا تھا۔ یہ صورتحال بھارت کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ اس نے پاکستان کی کشمیر کی طرف پیشقدمی کو کم کرنے کے لیے 6 ستمبر 1965ء کو بین الاقوامی سرحدوں کو عبور کرتے ہوئے مغربی پاکستان میں لاہور پر تین اطراف سے حملہ کر دیا۔ دو تین دن بعد بھارت نے سیالکوٹ اور راجستھان کے دو محاذ اور کھول دیئے اس طرح آزادی کے بعد پہلی مرتبہ کشمیر میں جنگ بندی لائن اور بھارت مغربی پاکستان پر جنگ پھیل گئی۔ سترہ روز تک جنگ جاری رہی جس میں دونوں ملکوں کی فضائی افواج نے بھی حصہ لیا لیکن مشرقی پاکستان اور بھارت کی سرحد پر جنگ نہیں ہوئی۔ اس دوران امریکہ اور برطانیہ نے دونوں ملکوں کو اسلحہ کی ترسیل بند کر دی اور جب پاکستان اور بھارت کے وسائل ختم ہونا شروع ہوئے تو انہوں نے ہفتہ بعد ہی جنگ بندی کا سوچنا شروع کر دیا۔ چین کے بھارت کو الٹی میٹم نے بھی تصادم کو ختم کرنے میں تیزی کا عنصر پیدا کر دیا۔ 16 ستمبر کو چین نے بھارت کو آگاہ کیا'' کہ حکومت چین مسلسل اس نظریے کی حامی رہی ہے کہ مسئلہ کشمیر کو کشمیری عوام کے حق خودارادیت کے احترام کی بنیادوں پر حل ہونا چاہئے جس کا وعدہ بھارت اور پاکستان نے ان سے کر رکھا ہے۔ بھارت اور پاکستان کے تنازعے میں چین کی عدم مداخلت کا یہی مفہوم ہے لیکن عدم مداخلت کا ہرگز یہ مفہوم نہیں کہ حق اور ناحق میں فرق نہ کیا جائے اور کشمیریوں کو ان کے حق سے محروم کر دینے کی چین ہرگز اجازت نہیں دے سکتا اور نہ ہی کشمیر کے بہانے بھارت کی پاکستان کے خلاف جارحیت کو چین منظور کر سکتا ہے۔ حکومت

Marfat.com

چین مطالبہ کرتی ہے کہ بھارتی حکومت ان تمام فوجی تنصیبات کو جو اس نے چین سکم سرحد کی طرف یا خود اپنی سرحد پر جارحانہ طور پر قائم کر رکھی ہے، اس نوٹ کی وصولی کے تین روز کے اندر اندر گرا دے اور ہند چینی سرحد پر اور سکم چین سرحد پر اپنی دراندازیوں کو فوری طور پر بند کر دے۔ چین کا پاکستان کے لیے یہ ناقابل فراموش دوستی کا نذرانہ تھا جس نے بھارت کی سوچ کا دھارا بدل کر رکھ دیا۔

روس نے پاک بھارت تصادم کی بنیاد یعنی مسئلہ کشمیر پر مکمل غیر جانبداری اختیار کر لی تھی۔ روسی حکومت کو اپنی سرحدوں کے قریب اس تصادم پر گہری تشویش بھی تھی اسے ڈر تھا کہ چین پاکستان کی سرحد سے مداخلت کر کے حالات سے فائدہ اٹھائے گا۔ روس اس بات سے بھی آگاہ تھا کہ اگر چین نے بھارت پر حملہ کیا تو بھارت امریکہ سے فوجی امداد کے لیے مجبور ہو جائے گا جس سے جنوبی ایشیا میں سوویت مفادات متاثر ہوں گے اور بھارت روس تعلقات کشیدہ ہو جائیں گے۔
(رگھوناتھ راون: صفحہ 141 :Societ Policy Toward Pakistan)

جونہی سلامتی کونسل نے جنگ بندی کی قرارداد پیش کی ماسکو ریڈیو نے دونوں ممالک کے سربراہوں کی ملاقات پر زور دیا اور مزید کہا کہ وہ صرف روس کی نگرانی میں ہی مل سکتے ہیں کیونکہ مغرب برصغیر میں امن قائم کرنے میں ناکام ہو گیا ہے اور ہمیشہ ایشیا اور افریقہ کے لوگوں کی خونریزی کا باعث بنا ہے۔ (ایضاً......149)

آخر کار روسی وزیراعظم کی مساعی سے صدر ایوب اور وزیراعظم شاستری کے درمیان جنوری 1966ء کو تاشقند میں مذاکرات ہوئے جس میں کوسجن نے بھی حصہ لیا۔ دونوں ملکوں میں ایجنڈا پر ہی سخت اختلاف پیدا ہو گیا۔ پاکستان چاہتا تھا کہ مسئلہ کشمیر سرفہرست ہو لیکن بھارت اس پر گفت و شنید کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ مجموعی تعلقات پر زور دیتا تھا۔ ہفتہ بھر بحث مباحثہ میں کئی دفعہ تعطل اور بحران پیدا ہوا۔ آخر 8 جنوری 1966ء کو دونوں لیڈر ایک مشترکہ اعلان پر دستخط کرنے پر رضامند ہو گئے۔ دونوں لیڈروں نے اقوام متحدہ کے منشور کا پابند رہنے کا عہد کیا جس کے تحت باہمی جھگڑے طاقت کے بل بوتے پر نہیں بلکہ پرامن طریقوں سے حل ہونے چاہئیں۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ دونوں ملکوں کی افواج 5 اگست 1965ء کی پوزیشن پر واپس چلی جائیں گی۔ دونوں اس پر رضامند ہو گئے کہ باہمی تعلقات اس اصول پر استوار کیے جائیں گے کہ ایک دوسرے کے معاملات میں مداخلت نہیں کی جائے گی۔ (دیکھیے ضمیمہ جات)

اس معاہدہ میں اگرچہ اصولی طور پر لڑائی کے وجود یعنی کشمیر کو تسلیم کیا گیا جو پاک بھارت کشیدگی کے پیچھے کارفرما تھے اور جو جنگ 1965ء کا باعث بنے مگر مسئلہ کشمیر کے بارے میں صرف اتنا ہے کہ کشیدگی کے اس پس منظر میں جو دونوں ممالک کے مابین چلی آ رہی ہے، جموں و کشمیر زیر بحث آیا اور اس بارے میں فریقین نے اپنے اپنے موقف کو دہرایا۔ لیکن اس مسئلہ کے حل میں کوئی عملی پیش رفت نہ ہوئی۔ یہ سخت مایوس کن کیفیت تھی لہٰذا پاکستان و بھارت کے درمیان تعلقات کشیدہ ہی رہے اور اعلان تاشقند سے محض فوجیں 5 اگست کی پوزیشن پر واپس چلی گئیں اور ان کے تعلقات 5 اگست کی سطح تک بھی بحال نہ ہوئے۔

اس جنگ میں فریقین میں سے کوئی بھی قابل ذکر کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ اس کی بڑی وجہ دونوں کے محدود فوجی

Marfat.com

وسائل تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دونوں طرف کے افسران ایک جیسی تربیت کے حامل ہونے کی بنا پر ایک جیسے فوجی حربے استعمال کرتے رہے۔ تاہم بھارت اس جنگ کے نتیجہ میں کشمیر کو پاکستان کے ہاتھوں میں جانے سے روکنے میں کامیاب ہوگیا۔ دوسری طرف پاکستان نے بھی اپنے علاقے پر بھارتی قبضہ کے منصوبے کو ناکام بنالیا۔ اس کے علاوہ مسئلہ کشمیر کا فوجی حل تلاش نہ کیا جاسکا۔ اس جنگ سے دونوں ملکوں کو یہ احساس ہوا کہ دوسرا فریق اتنا کمزور نہیں ہے جتنا کہ وہ سمجھے ہوئے تھے۔ اس جنگ کا ایک یہ نتیجہ بھی برآمد ہوا کہ ہتھیاروں کا حصول ایک جنونی شکل اختیار کر گیا لیکن دوسری طرف امریکہ نے پاکستان اور بھارت کی فوجی امداد بند کردی۔ پاکستان نے ہتھیاروں کی سپلائی کے لیے ترکی، ایران اور چین کا رخ کیا جبکہ بھارت نے روس اور مشرقی یورپ کی طرف منہ موڑا۔ دونوں ممالک کی خارجہ پالیسیوں کی ترجیحات بدلنے لگیں۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان 23 ستمبر کو فائر بندی ہوئی تھی۔ اس جنگ میں بھارت کے نو ہزار پانچ سو فوجی اور افسر ہلاک ہوئے۔ زخمیوں کی تعداد گیارہ سو سے زائد تھی۔ سترہ سولا پتہ ہوگئے جنہیں بھارت نے بعد میں مردہ تسلیم کر لیا۔ بھارت کے 475 ٹینک اور 110 طیارے تباہ ہوئے۔ پاکستان کے 1032 جوان اور افسر شہید ہوئے۔ زخمیوں کی تعداد 2170 تھی۔ 165 ٹینک اور 14 طیارے تباہ ہوئے۔ (پاکستانی جنرل ہیڈ کوارٹر کے جاری کردہ اعداد و شمار بحوالہ جان فریکر)

بھارتی حکومت کی اطلاعات کے مطابق اُس کے 1333 افسر اور جوان مارے گئے جبکہ پاکستان کے 4802 افسر اور جوان کام آئے۔ پاکستان کے 475 ٹینک جبکہ بھارت کے 128 ٹینک ضائع ہوئے۔ بھارت کے 35 اور پاکستان کے 73 طیارے تباہ ہوئے۔ بھارت نے پاکستان کے 740 مربع میل جبکہ پاکستان بھارت کے 210 مربع میل علاقے پر قبضہ کیا۔ (Kashmir Contemporary Archives, 1965-66. P.2108)

ہمارا موضوع چونکہ کسی کے دعوے کو غلط یا صحیح ثابت کرنا نہیں لیکن یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ 1965ء کی جنگ کے حوالے سے دنیا میں جتنے بھی غیر جانبدار تجزیے اور رپورٹیں لکھی گئیں اُن میں بھارتی دعووں کو باطل اور پاکستان کو حقیقت کے نزدیک تر قرار دیا گیا۔ ڈیلی ٹائمز کے نمائندے نے 28 ستمبر کو اپنی رپورٹ میں بھارتی دعووں کا سارا بھید کھول دیا۔

14 اگست 1947ء کو معرض وجود میں آنے والے پاکستان کے دونوں حصوں کے درمیان ایک ہزار میل سے زائد کا فاصلہ تھا اور سوائے اسلام کے مقدس رشتے کے اور کوئی بھی قدر مشترک دونوں کے درمیان نہیں تھی۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ قیام پاکستان کے بعد قائم ہونے والی حکومتوں نے مغربی پاکستان کو مشرقی پاکستان پر اہمیت دی اور وقت کے ساتھ ساتھ مشرقی پاکستان میں احساس محرومی بڑھنے لگا۔ اس احساس محرومی کو بڑھانے میں اہم کردار بھارتی حکومت کا تھا جس نے قیام پاکستان کے روز اول ہی سے پاکستان کے دونوں حصوں کے ساتھ الگ الگ پالیسی اپنائی۔
مشرقی پاکستان کی طرف وہ دوستی کا ہاتھ بڑھاتا لیکن مغربی پاکستان کے لیے اس کا رویہ ہمیشہ معاندانہ اور جارحانہ رہا۔ نقل آبادی کے بارے میں 1947ء کا لیاقت-نہرو معاہدہ مشرقی پاکستان میں نافذ نہیں کیا گیا۔ دونوں ملکوں

Marfat.com

نے بعد میں متروکہ جائیداد کے جو قوانین بنائے وہ بھی مشرقی پاکستان میں نافذ نہیں ہوئے۔ان اقدامات کا نتیجہ یہ نکلا کہ 1947ء کے بعد مغربی پاکستان کی دولت مسلمانوں کے ہاتھوں میں رہی جبکہ مشرقی پاکستان کی 80 فیصد دولت جس میں صنعت وتجارت اور ضروری شعبے شامل ہیں ہندو اقلیت کے قبضہ میں رہی حالانکہ ان کے خاندان بھارت ہجرت کر گئے تھے اور انہوں نے اپنے بیشتر اثاثوں کو بھی منتقل کر دیا تھا۔ یہ ساری دولت بھارت کے کام آئی۔اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ 1965ء میں ڈھاکہ کی دو ٹیکسٹائل ملوں کے پاس اتنی رقم نہیں تھی کہ وہ اپنے ملازموں کو پراویڈنٹ فنڈ بھی ادا کرسکتیں۔مل کی قیمتوں سے زیادہ وہ بنکوں کے قرضے لے چکے تھے۔ان کے مقابلہ میں سہگل 1947ء میں کلکتہ سے مغربی پاکستان آئے انہوں نے لائل پور میں ایک ٹیکسٹائل مل قائم کی اور پھر منافع کو متواتر دوسری صنعتوں میں لگاتے رہے یہاں تک کہ ملک کے امیر ترین گھرانوں میں ان کا شمار ہونے لگا۔دوسرے دولت مند گھرانے بھی اس طرح کاروباری ترقی کر کے اپنی موجودہ پوزیشن تک پہنچے۔

مشرقی پاکستان میں موجود ہندو سرمایہ دار روز اول ہی سے بھارتی پالیسی پر گامزن تھے۔انہوں نے مشرقی پاکستان میں کمائی دولت بھارتی بنکوں میں محفوظ کرنا شروع کر دی۔مسلم عوام کی زبوں حالی برقرار رہی۔ہندوؤں نے گندم چاول وغیرہ مغربی بنگال سمگل کر کے مشرقی پاکستان میں خورک کی قلت پیدا کر دی جس کے نتیجہ میں قیمتوں میں ہوشربا اضافہ ہو گیا۔ہندوؤں نے ایک طرف اس صوبہ میں قحط کی سی کیفیت پیدا کیے رکھی اور دوسری طرف یہ پروپیگنڈا کرتے رہے کہ مغربی پاکستان میں اشیاء خوردنی کی قیمتیں بہت کم ہیں۔اس طرح وہ یہ تاثر دینے میں کامیاب رہے کہ حکومت میں مغربی پاکستانیوں کا عمل دخل زیادہ ہے اور وہ مشرقی پاکستان کو ایک نوآبادی سمجھ کر اس کا استحصال کر رہے ہیں۔جس سے مشرقی پاکستان کی اکثریت یہ سمجھنے لگی کہ ان کے مصائب کا ذمہ دار مغربی پاکستان ہے۔کاروبار، سیاست اور ملازمتوں میں اس کو بالادستی حاصل ہے۔یہ احساس ناخواندہ لوگوں کا ہی نہیں تھا، تعلیم یافتہ لوگ بھی یہی سمجھتے تھے کہ مغربی پاکستان مشرقی پاکستان کو لوٹ رہا ہے۔مشرقی پاکستان کی لیڈرشپ نے اپنی تقاریر میں ایسے فقرے کہنے شروع کیے جن کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں تھا۔بھارتی حکومت نے کلکتہ میں تحقیقی مراکز قائم کر رکھے تھے۔ان میں مشرقی پاکستان کی پٹ سن سے حاصل ہونے والے زرمبادلہ، مجموعی قومی پیداوار، فی کس آمدن، مشرقی پاکستان میں صنعت کی رفتار، ملازمتوں میں مشرقی پاکستان کے حصہ کے بارے میں گمراہ کن اعداد وشمار تیار کیے جاتے اور پھر انہیں پمفلٹوں کی صورت میں شائع کر کے مشرقی پاکستان میں تقسیم کیا جاتا۔ہندو پروفیسر اور کمیونسٹ ان اعداد وشمار کو اپنے پروپیگنڈہ میں استعمال کرتے۔حکومت سے ناراض مشرقی پاکستانی سیاست دان اور سیاسی کارکن بھی دانستہ یا نادانستہ طور پر پروپیگنڈا کی اس مہم میں شریک ہو جاتے۔

''عوامی لیگ'' میں بھارتی انٹیلی جنس ایجنسیوں نے اپنے تنخواہ دار ایجنٹ پہلے ہی سے رکھے ہوئے تھے۔اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ایوب خان نے پاکستان کے دونوں بازوؤں میں اقتصادی تفاوت کو دور کرنے کے لیے پوری سنجیدگی سے کوششیں کیں۔ولیم رشبروک لکھتا ہے کہ میرا مشاہدہ یہ ہے کہ مشرقی پاکستان نے قیام پاکستان کے بعد 25 برس میں جتنی ترقی کی ہے اس کی مثال پچھلی تاریخ کے کسی دور میں نہیں ملتی۔(ایسٹ پاکستان ٹریجڈی: صفحہ 22)

بھارتی حکومت نے مشرقی پاکستان میں یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ مغربی پاکستان آئین کی آڑ میں مشرقی

Marfat.com

پاکستان کو مستقل طور پر اپنی گرفت میں رکھنا چاہتا ہے۔نوجوان ہنگامی نسل کو بطور خاص گمراہ کیا گیا۔ بنگالیوں کو یہ شکایت تھی کہ مسلح افواج میں ان کو برابر کی نمائندگی نہیں ملی۔فوج جیسے قومی ادارے میں اگرچہ مشرقی پاکستانیوں کی نمائندگی ہمیشہ نہ ہونے کے برابر رہی ہے لیکن اس میں پاکستانی حکومت قصوروار نہیں تھی بلکہ یہ پالیسی برطانوی حکومت سے ورثے میں حاصل کی گئی تھی۔ مشرقی پاکستان میں فوجی تربیت کا کوئی ادارہ تقسیم برصغیر کے وقت موجود نہ تھا۔ انگریز یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کے جنوب مشرقی علاقوں میں آباد نسلیں بنگالی اور مدراسی فوجی خطرات اور سپاہیانہ خدمات کے ذوق وشوق سے فطرتاً محروم ہیں۔ چنانچہ وہ پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبے سے ہی زیادہ تر سپاہی بھرتی کرتے رہے۔ تقسیم کے وقت مسلح افواج میں بنگالیوں کا حصہ صرف ایک فیصد تھا تاہم آہستہ آہستہ اس حصہ میں اضافہ کی کوشش جاری رہی۔ ایوب خان نے اس پر خصوصی توجہ دی۔ 1968ء تک چار ایسی رجمنٹیں قائم ہو چکی تھی جو خالص بنگالیوں پر مشتمل تھیں۔ یہ مقصد مشرقی پاکستان کے امیدواروں کے سلسلہ میں بھرتی کے جسمانی معیار میں کمی کر کے حاصل کیا گیا لیکن اس کے باوجود آبادی کے اعتبار سے مشرقی پاکستان کی فوج میں نمائندگی بہت معمولی رہی۔ اس کمی کی ایک وجہ خود بنگالیوں کا رحجان تھا کہ وہ فوج کے پیشے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے اور احتجاج کی سیاست کے زیادہ شوقین تھا۔ بنگالی والدین ایسے لڑکوں کو اپنی لڑکی دینا پسند نہیں کرتے تھے جو فوج میں ملازمت کرتے ہوں۔ یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان اس قدر وسیع جغرافیائی فاصلہ کے باوجود پاکستان کی دفاعی منصوبہ سازوں نے مشرقی پاکستان کے لیے اپنا الگ دفاعی نظام مرتب کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ ان کا خیال تھا کہ بھارت کبھی دو محاذوں پر بیک وقت حملہ آور نہ ہوگا۔ یہ عجیب و غریب منطق گھڑی گئی کہ مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی محاذ سے کیا جائے گا۔

1965ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد قومی یکجہتی کی ناکامی کا عمل تیز ہو گیا۔ اس سترہ روزہ جنگ میں بھارت اور پاکستان میں سے کوئی بھی فتح یا شکست کا اعتراف نہ کر سکتا تھا۔ پاکستان نے بھارت کی نسبت کہیں کم بری بحری اور فضائی قوت کے باوجود 1965ء میں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ لیکن اس جنگ نے مشرقی اور مغربی پاکستان کے مابین قومی رابطے اور تعلق کو بری طرح مجروح کیا۔ جنگ شروع ہونے کے ایک گھنٹہ کے اندر اندر مشرقی پاکستان نہ صرف مغربی پاکستان بلکہ ساری دنیا سے کٹ کر رہ گیا۔ پاکستان کے وزیر خارجہ نے جب قومی اسمبلی میں فخریہ اعلان کیا کہ مشرقی پاکستان کی حفاظت چین نے کی ہے تو اس پر بنگالیوں نے سوچنا شروع کر دیا کہ اگر معاملہ ایسا ہی ہے تو انہیں اپنے سفارتی اور خارجہ تعلقات کا فیصلہ خود کرنا چاہیے۔ مغربی پاکستان پر تکیہ کرنے کا کیا فائدہ جو مشرقی پاکستان کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ ''مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان کے محاذ سے'' والا نظریہ دم توڑ گیا۔ اس پر بھارت نے بڑی ہوشیاری سے مزید سفارتی ضرب لگائی اور بنگالیوں کو یاد دلایا کہ بھارت کا جھگڑا تو مغربی پاکستان اور اس کی فوجی قیادت سے ہے، بنگالیوں کو اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بڑا موثر اور کارگر پراپیگنڈہ تھا جس نے اپنا اثر دکھایا۔

مشرقی پاکستان میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر دوسری مرتبہ جنگ ہوئی تو یہاں کے دفاع کا کیا بنے گا۔ جبکہ فوج مغربی محاذ پر مصروف ہوگی۔ عدم تحفظ اور محرومیوں کے اس احساس نے فروری 1966ء میں مجیب الرحمٰن کے چھ نکات کو جنم دیا جو دراصل ''را'' کے شہ دماغوں نے بنائے تھے۔ اس کا مسودہ کلکتہ میں تیار کیا گیا تھا اور دہلی کے حکمرانوں کی منظوری

Marfat.com

حاصل کرنے کے بعد اسے بروئے کار لانے کی ذمہ داری شیخ مجیب کے سپرد کی گئی تھی۔ تیاری کا عمل جنوری 1966ء میں شروع ہوا تھا۔

پاکستان کے دشمن عناصر کے ساتھ بھارت کی ریشہ دوانیاں پہلی بار 1967ء میں منظر عام پر آئیں جب اگرتلہ سازش کیس کا انکشاف ہوا۔ وعدہ معاف گواہوں نے حلفاً بیان کیا کہ شیخ مجیب الرحمٰن اس سازش میں ستمبر 1964ء میں ملوث ہو چکے تھے جب مشرقی پاکستان کو باقی ملک سے الگ کرنے کے لیے ایک انقلابی تنظیم قائم کی گئی تھی۔ اگرتلہ سازش کا اہم منصوبہ یہ تھا کہ اسلحہ خانوں پر قبضہ کر کے فوجی یونٹ مفلوج و معطل کر دیے جائیں۔ انڈین سپریم انٹیلی جنس ایجنسی ''را'' نے جو تیزی سے متحرک ہو رہی تھی اپنے سربراہ شنکرن کی قیادت میں کام شروع کر دیا تھا۔ علیحدگی پسندوں اور بھارت کے نمائندوں کا اجلاس اگرتلہ میں 12 جولائی 1967ء کو ہوا۔ ان سازشیوں کو دسمبر 1967ء میں گرفتار کر لیا گیا۔ ان میں مجیب الرحمٰن بھی شامل تھا۔ ان میں سے ایک نے انکشاف کیا کہ بھارت نے ہتھیار اور مالی امداد فراہم کرنے کے علاوہ مشرقی پاکستان میں بغاوت منظم کرنے کا بھی وعدہ کیا تھا۔ بھارت نے کہا تھا کہ وہ مشرقی پاکستان میں مسلح بغاوت کے موقع پر مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے ملانے والے بحری اور فضائی راستے بند کر دے گا۔

(ایسٹ پاکستان کرائسس اینڈ انڈیا: حسن زمان، صفحہ 905)

بھارتی اخبارات نے اگرتلہ سازش کے بارے میں تسلسل کے ساتھ گمراہ کن اور بے بنیاد خبریں شائع کیں اور اس سازش کو مغربی پاکستان کی طرف سے مشرقی پاکستان کو کچلنے کا منصوبہ قرار دیا۔ درحقیقت اگرتلہ سازش کیس حقائق پر مبنی تھا اور بقول جی ڈبلیو چوہدری انہیں مجیب کے وکیل مسٹر عبدالسلام نے ایک بار بتایا کہ: مجھے اگرتلہ سازش کیس میں بھارتی حکومت کے عمل دخل سے انکار نہیں لیکن پاکستان کے اندر اگرتلہ سازش کیس کو جس بھونڈے طریقے سے چلایا گیا اس پر مشرقی پاکستان کے عوام نے محسوس کیا کہ مجیب الرحمٰن کو اس لیے مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کیا گیا ہے کہ وہ مشرقی پاکستان کی سیاسی محرومیوں اور اقتصادی ناہمواریوں کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں مجیب نے وہاں کی اکثریت کے لیے قومی ہیرو کا مقام حاصل کر لیا۔ یہ ''را'' کی بڑی کامیابی تھی۔

''را'' نے بھارت کے علاقائی سپر پاور بننے کی کوشش اور چودھریانہ منصوبوں کو تقویت دینے میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ ''را'' کو جو پہلا مشن سونپا گیا، وہ تھا پاکستان کو دولخت کرنا، جیسا کہ اشوک رائنا نے اپنی کتاب ''ان سائیڈ را'' میں انکشاف کیا ہے کہ آئی بی نے ''مجیب کے گروہ'' کے ساتھ رابطے استوار کر لیے تھے اور 63-1962ء کے دوران آئی بی کے فارن آپریٹوز بشمول شنکرن نائر (بعد میں را کے چیف) اور مجیب کے گروہ کے درمیان اگرتلہ میں ایک میٹنگ ہوئی تھی۔ اس میٹنگ میں تیار کی جانے والی سازش کے تحت مشرقی پاکستان رائفلز کے اسلحہ ڈپوؤں پہ حملہ کرنا اور مسلح بغاوت کا آغاز کرنا تھا جو آخر کار مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر منتج ہوتا۔ یہ سازش ناکام ہو گئی لیکن اس نے علیحدگی پسند عناصر کو منظر عام پر لا کھڑا کیا اور اس بھارتی پروپیگنڈے کو تقویت دی جس کے ذریعے یہ الزام لگایا جا رہا تھا کہ پاکستان مظالم ڈھا رہا ہے اور مشرقی پاکستان کی معیشت ہڑپ کر رہا ہے۔

1969ء میں ''را'' نے زیر زمین نیٹ ورک بچھا لیا اور اگلے دو برسوں کے دوران ایک لاکھ سے زائد جنگجوؤں کو

Marfat.com

مسلح کیا اور تربیت دی۔ اشوک رائنا کے انکشاف کے مطابق ''را'' کے ایجنٹ باغی قوتوں کو مربوط کرنے کے لیے مشرقی پاکستان کے ہر گلی کوچے میں سرایت کر گئے۔ اپریل 1971ء میں آرمی ایکشن شروع ہونے سے فوراً پہلے عوامی لیگ کے ممتاز سیاسی اور طالب علم رہنماؤں کو ''را'' والے کلکتہ لے گئے جہاں انہوں نے جلاوطن حکومت قائم کر لی۔ پاکستان آرمی کے بنگالی افسروں نے مکتی باہنی کے گوریلوں کی قیادت کی اور انڈین آرمی کے کمانڈوز پاکستانی افواج کو شکست دے کر ڈھاکہ پر چڑھ دوڑے۔ بنگلہ دیش کی قسمت پر مہر لگا دی گئی۔ تاریخ کے اس سیاہ باب پر جمی گرداب قریباً صاف ہو چکی ہے اور ساری دنیا ''را'' کے گھناؤنے کردار سے آگاہ ہو گئی لیکن حیرت اور شرم کی بات ہے کہ بھارتی اسے ''را'' کا کریڈٹ خیال کرتے ہیں۔ (RAW: طارق اسمٰعیل ساگر، صفحہ 137)

1965ء کی جنگ کے خاتمے پر بھارت کو عالمی سطح پر جو ذلت اٹھانا پڑی اُس نے بھارتیوں کو کبھی چین کی نیند نہ سونے دیا۔ انہوں نے پاکستان کو دولخت کرنے کے لیے اپنی تمام تر توانائیاں مختص کر دیں۔ بھارتی عزائم کو بڑی تقویت پاکستان کی سیاسی انارکی نے فراہم کی۔ جنرل ایوب خان جو مارشل لا کے ذریعے پاکستان پر مسلط ہوئے تھے، جاتے جاتے پاکستان کو مارشل لا کی بھٹی میں جھونک گئے۔ صدر ایوب خان مرحوم کے سیکرٹری الطاف گوہر مرحوم بتاتے ہیں:

''25 مارچ 1969ء کی شام راولپنڈی میں بڑے زور کا طوفان آیا۔ درخت جڑوں سے اکھڑ کر سڑکوں کے آر پار آ گرے۔ راستے بند ہو گئے، بتیاں گل ہو گئیں، ایوب خان نے صدارت سے دستبرداری کا اعلان ریکارڈ کروا دیا تھا اور وہ ریڈیو سے نشر ہونے والا تھا۔ وہ شخص جو ایوب خان کی تقریر کی صاف کاپی بنا رہا تھا جب اس جملے پر پہنچا جہاں ایوب خان قوم اور ملک سے رخصت ہوتے ہیں، تو بے اختیار رونے لگا۔ سارا ملک گوش برآواز تھا۔ مجھے جی ایچ کیو بلایا گیا۔ جب میں کمانڈر انچیف کے کمرے کے قریب موٹر سے اترا تو بے تحاشا بارش ہو رہی تھی۔ اس افراتفری میں ایک سپاہی مجھے سی ان سی کے ملٹری سیکرٹری کے کمرے میں لے گیا۔ میز پر ایک ریڈیو رکھا تھا۔

ایوب خان کی آواز لہروں کے زیر و بم کے ساتھ کبھی ابھرتی، کبھی ڈوب جاتی۔ میز کے گرد چار اشخاص ریڈیو سے کان لگائے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی سنبھل کر پیچھے ہٹ گئے۔ مجھے یوں لگا جیسے چوروں کی منڈلی ہو۔ وہ بھی یوں محسوس کر رہے تھے جیسے میں نے انہیں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہو۔ یہ تھے پاکستان کے نئے حکمران یحییٰ خان، حمید، پیرزادہ اور اسحاق۔ یحییٰ خاں کے چلنے پھرنے کا انداز بڑا عاجلانہ تھا۔ ایوب خان کی تقریب تو انہوں نے ریکارڈ ہوتے وقت ہی سن لی تھی۔ اب تو وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھے لوٹ کے مال کا اندازہ لگا رہے تھے۔ فوراً ہی یہ لوگ اٹھے اور سی ان سی کے کمرے میں آ گئے جہاں یحییٰ خاں کی 26 مارچ کی تقریر کی ریکارڈنگ کا انتظام کیا گیا تھا۔ حمید، پیرزادہ، گل حسن اور دو ایک اور فوجی کمرے کی دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کرنل صدیقی دروازے کے قریب دست بستہ کھڑے تھے۔ یحییٰ خاں کی نظر ان پر پڑی تو بولے: ''بچو تو کرنل ہو گیا ہے''۔ تقریر کی ریکارڈنگ ختم ہو چکی تو یحییٰ خاں نے کہا: ''کہاں ہے میری وسکی؟'' ان کے ساتھی یہ سن کر بہت پریشان ہوئے۔

پیرزادہ نے کہا: ''ابھی آ رہی ہے سر!'' اصل میں وہ لوگ چاہتے تھے کہ اطلاعات اور ریڈیو کا عملہ چلا جائے تو پھر محفل جمے اور یحییٰ خاں سب کے سامنے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی اصلیت کا مظاہرہ کرنا چاہتے تھے۔ جب شراب پہنچے

Marfat.com

میں دیر ہوئی تو یحییٰ خاں نے اپنی مخصوص آدھی ہنسی اور آدھی کھانسی دار آواز میں کہا: ''مجھے نہیں معلوم کوئی اور ہے یا نہیں، مگر میں آج شراب کا مستحق ضرور ہوں''۔

وہی مجیب الرحمٰن جن کی غداری کا یحییٰ خاں کے پاس فول پروف ثبوت تھا، اب ان کے دست راست بن گئے۔ خود یحییٰ خاں نے ڈھاکے میں یہ اعلان کیا کہ مجیب الرحمٰن پاکستان کی سالمیت کے حامی ہیں۔ ڈرامے کا پہلا ایکٹ ختم ہو چکا تھا۔ یحییٰ خاں اقتدار پر غاصبانہ قبضہ جما چکے تھے۔ مجیب کو حب الوطنی اور پاکستان دوستی کا سرٹیفکیٹ مل چکا تھا۔ مغربی پاکستان کی پرانی سیاسی جماعتیں یحییٰ خاں کے اشاروں پر ناچ رہی تھیں۔ کئی صحافی یحییٰ خاں اور اس کے نافذ کردہ مارشل لا کے گن گا رہے تھے۔ وہ ایک ایک کر کے مختلف قومی اداروں کی بنیادیں ہلا رہا تھا اور پڑھے لکھے لوگ اپنی ذاتی رنجشوں اور دشمنیوں کی بنا پر اس کے ہر ظالمانہ اور غیر منصفانہ اقدام کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہے تھے۔

آزادی، انصاف اور اسلامی انقلاب کی تحریک یحییٰ خاں کے مارشل لا کا روپ دھار چکی تھی اور تاثر یہ دیا جا رہا تھا کہ عوام کو ان کے حقوق مل گئے۔ مجیب الرحمٰن نے یحییٰ خاں کو قصر صدارت تک پہنچا دیا تھا اب اس کی باری تھی۔ یحییٰ خاں نے اعلان کیا: مارشل لا تو ایک عارضی سی بات ہے۔ جونہی حالات سدھرنے لگیں گے مارشل لا اٹھا لیا جائے گا۔ ان کی حکومت تو محض ریل کو پٹڑیوں پر چڑھانے کے لیے آئی ہے۔ پٹڑی کی مرمت ہو جائے اور دوبارہ ریل کے پہیے اس پر جما دیے جائیں تو ریل چلانے کا انتظام عوام کے نمائندوں کے سپرد کر دیا جائے گا۔ مجیب الرحمٰن نے مغربی پاکستان سے اپنے تمام رشتے منقطع کر لیے۔ مغربی پاکستان کا جو شخص انہیں ملتا وہ اسے مشرقی پاکستان کی بدحالی کے قصے سناتے اور یہ تاثر دیتے کہ مشرقی پاکستان کے لوگ اپنے جائز حقوق چاہتے ہیں۔ مغربی پاکستان سے علیحدگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آخر سب سے بڑے صوبے کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ حکومت کا حق چھوڑ کر فیڈریشن سے علیحدہ ہو جائے؟

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں ایوب خان نے اور عوامی مطالبات تو تسلیم کر لیے تھے مگر دو باتوں پر وہ کسی قسم کی مصالحت کے لیے تیار نہ ہوئے:

الف: مغربی اور مشرقی پاکستان میں پیریٹی برقرار رہے گی، اور

ب: ون یونٹ میں انتظامی تبدیلیاں تو کی جاسکتی ہیں اسے توڑا نہیں جا سکتا۔

انہوں نے مغربی پاکستان کے سیاسی لیڈروں سے کہا کہ ایک دفعہ پیریٹی کا اصول ترک کر دیا گیا اور صوبوں کو آبادی کے مطابق نمائندگی دے دی گئی تو ملک انتشار کی نذر ہو جائے گا اور پیریٹی کے اصول کے لیے یہ لازمی ہے کہ ون یونٹ قائم رکھا جائے۔ پنجاب کے سب سیاست دان ان سے اتفاق کرتے تھے مگر اپنی مصلحتوں کی بنا پر ان کی حمایت میں کچھ کہنے کو تیار نہ تھے۔ انہی مصلحتوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے یحییٰ خاں نے پیریٹی اور ون یونٹ دونوں بیک جنبش قلم منسوخ کر دیے۔ مشرقی پاکستان، سندھ، فرنٹیئر اور بلوچستان میں یحییٰ خاں راتوں رات ایک عظیم لیڈر بن کر ابھرے۔

ان کے حواریوں نے کہنا شروع کیا کہ صاحب ذاتی کمزوریاں تو سب میں ہوتی ہیں، مگر قائداعظمؒ کے بعد اگر کسی نے پاکستان کو استحکام بخشا ہے تو وہ یحییٰ خاں ہیں۔ بین الاقوامی سطح پر یحییٰ خاں اپنے رنگیلے پن کی وجہ سے بڑی شہرت پا رہے تھے۔ رباط کانفرنس میں دن بھر ہندوستان کے ایک سردار جی کے ساتھ بیٹھے رہے۔ بعد میں کہنے لگے: ''مجھے کیا

Marfat.com

معلوم تھا کہ وہ ہندوستان کا کوئی نمائندہ ہے۔ میں سمجھا کوئی مولوی ہے''۔ایران کے جشن میں کھانے کی میز سے لت پت اٹھائے گئے۔امریکہ میں ایک پریس کانفرنس میں اپنے فارن سیکرٹری سے مخاطب ہوئے:''کہاں ہے میرا چمچہ؟''

(Stooge)

ایک اخباری نمائندے نے پوچھا:''جناب صدر، بحر ہند (Indian Ocean) میں جو بین الاقوامی صورت پیدا ہو رہی ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟'' بولے:''میرا خیال، میرا کیا خیال ہے۔انڈین اوشن ہے تو انڈیا سے پوچھو، میں کسی کے معاملے میں دخل نہیں دیتا''۔امریکہ کی کاسہ لیسی شروع کی تو ہنری کسنجر کی ڈرائیوری تک قبول کر لی اور کسنجر کے خفیہ چینی مشن کے بارے میں حکومت کی طرف سے ایک غلط پریس نوٹ مشتہر کرنے پر یہ سمجھنے لگے کہ چین اور امریکہ میں دوستی انہی کی کوششوں سے ہوئی۔ملکی معیشت کی ریڑھ مار کر رکھ دی۔انتظامیہ مفلوج ہو گئی، عدلیہ کو پریشان اور ذلیل کیا، صحافت کی رہی سہی ناموس مٹا دی۔عام آدمی کے لیے ملک چھوڑ کر جانا ایک نعمت بن گئی۔رات کے اندھیرے میں صدر اور ان کے ساتھی کیا کیا گل نہ کھلاتے۔کبھی جیپ میں بیٹھ کر کسی ریڈیو آرٹسٹ کے ہاں پہنچے اور اس کا دروازہ پیٹنے لگے۔کبھی گویئے جمع کرتے، کبھی مسخرے۔مصاحبین کہتے:''حضور! وہ جو آپ نے امریکہ میں اندرا گاندھی کا حلیہ بگاڑا تھا، وہ ضرور سنایئے''۔صدر یحییٰ فرماتے:''کون سا بچو، وہ دیٹ وومن (That woman) والا۔ہاں میں نے تو کہہ دیا دیٹ وومن''۔اس پر جام لنڈھائے جاتے۔

مجیب الرحمٰن اب کھلے بندوں اپنے پیغام کا پرچار کر رہے تھے۔حکومت کے بالائی طبقے میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جو مشرقی پاکستان کے حالات سے واقف ہو۔کسی کو یہ تک معلوم نہ تھا کہ مجیب الرحمٰن اپنی تقریروں میں کیا کہہ رہے ہیں۔ہجوم کے سامنے آتے ہی مجیب پر ایک جنون کی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔وہ سننے والوں کو ان کے دکھ درد، ان کی مصیبتوں اور ان کی ناداری کے قصے کچھ اس طرح سناتے کہ مجمع پر گہری افسردگی چھا جاتی۔پھر وہ انہیں اس آزادی اور عظمت کی جھلک دکھاتے جس سے سننے والوں کی آنکھوں میں چمک آ جاتی اور وہ بے اختیار نعرے لگانے لگتے۔وہ امید کے دریچے کھولتے اور پھر اپنی بے بسی کا ذکر کرتے:''کاش! آپ لوگوں کے دکھ کا مداوا میرے ہاتھ میں ہوتا! مگر جنہوں نے دکھ دیا ہے اور جو اس کا علاج کر سکتے ہیں وہ تو ہزار ہا میل دور اپنے محلوں میں بیٹھے راج کر رہے ہیں۔

1954ء میں آپ لوگوں نے اپنی رائے کا کھل کر اظہار کیا اور عوامی لیگ کی حکومت برسر اقتدار آئی مگر ظالموں نے اس کا تختہ الٹ دیا اور اس کی جگہ نئے میر جعفر گدی پر بٹھائے گئے۔ہر شہر، ہر قصبہ، ہر گاؤں مجیب کی گرجدار آواز کی گونج بن گیا۔

مغربی پاکستان میں پرانی سیاسی پارٹیاں اپنی روایتی ڈگر پر چل رہی تھیں۔حکومت سے ساز باز بھی جاری تھی اور آپس میں جوڑ توڑ بھی۔کہیں نمائندوں پر سودا بازی ہو رہی ہے، کہیں عوام کو فریب دینے کی چالیں سوچی جا رہی ہیں۔افواہ سازی اور الزام تراشی سب سے محبوب سیاسی مشغلہ تھا البتہ پیپلز پارٹی اپنا اقتصادی پروگرام لے کر عوام کے پاس جا رہی تھی۔اس کی مقبولیت کی لہر بڑھتے بڑھتے ایک طوفان کی شکل اختیار کر گئی۔

یحییٰ خاں، پیرزادہ اور ان کے ساتھی اس پر تکیہ کیے بیٹھے تھے کہ یہ ممکن ہی نہیں کسی جماعت کو واضح اکثریت

Marfat.com

حاصل ہو سکے۔ بہت سے امیدوار بکاؤ مال ہیں، لہٰذا آئندہ حکومت اسی طرح کی بنے گی جو یحییٰ خاں پسند فرمائیں گے۔
احتیاط کے طور پر یحییٰ خاں نے لیگل فریم ورک آرڈر سے دو چیزیں حذف کر دی تھیں:

الف: اس مدت کا تعین نہ کیا گیا جس میں نومنتخب اسمبلی کا اجلاس بلایا جانا لازمی ہوتا

ب: آئین سازی کے لیے ووٹنگ کا طریق کار طے نہ کیا گیا

جب لیگل فریم ورک آرڈر میں یہاں تک کہہ دیا گیا کہ اسمبلی کو ایک سو بیس دن کے اندر اندر آئین بنانا ہوگا تو پھر اجلاس بلائے جانے کی مدت کا تعین نہ کرنا ایک سی فروگذاشت تھی جو بدنیتی کی غماز تھی اور اس بات کا تو ہرگز کوئی جواب نہ تھا کہ آئین کی منظوری کے لیے یہ نہ بتایا گیا کہ اکثریت سادہ ہوگی، دو تہائی ہوگی یا تین چوتھائی۔ جی ڈبلیو چودھری صاحب نے لیگل فریم ورک آرڈر کی تیاری میں اپنی کاوشوں کا ذکر کیا ہے۔ جی ڈبلیو چودھری صاحب نہ قانون دان تھے نہ انہیں آئین سازی کا کوئی تجربہ تھا اور نہ عمر بھر انہوں نے کوئی انتظامی ذمہ داری سنبھالی تھی۔ انگریزی زبان پر انہیں جو دسترس حاصل تھی، وہ اس خط سے ظاہر ہے جو انہوں نے لیگل فریم ورک آرڈر کے سلسلے میں یحییٰ خاں کو لکھا اور جس کا چربہ ان کی کتاب میں شامل ہے۔ مرکزی حکومت میں کوئی کلرک بھی ایسی خوشامدانہ اور بابو مارکہ تحریر کا گناہ گار نہ ہوتا۔

میں نے اس زمانے میں ان دونوں نکات کا ذکر محمود ہارون سے کیا جو یحییٰ خاں کی حکومت میں وزیر خوراک تھے۔ انہوں نے کہا یہ دونوں چیزیں دانستہ طور پر حذف کی گئی ہیں۔ پہلی بات تو یحییٰ خاں کے اصرار پر اور دوسری اس بنا پر کہ اکثریت کی تعداد مقرر کرنے سے کہیں مجیب الرحمٰن خفا نہ ہو جائیں اور مشرقی پاکستان میں یہ تحریک شروع نہ ہو جائے کہ آبادی کے تناسب کا فارمولا سادہ اکثریت کی تعداد مقرر کر کے بے اثر کیا جا رہا ہے۔

الیکشن ہوئے، حکومت نے ہزار کوشش کی، اس کی مداخلت بے کار ثابت ہوئی، مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ اور مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی عوام کی کامیاب ترین ترجمان بن کر سامنے آئی۔ مجیب کی سو فیصد کامیابی میں اگر کسی کمی کا امکان تھا بھی تو الیکشن سے پہلے سیلاب کے زمانے میں یحییٰ خاں کی حکومت کی بدعملی سے وہ ختم ہوگیا۔ انتخابات کے نتائج کا اعلان ہوا، قوم میں مسرت کی لہر دوڑ گئی، یحییٰ خاں کی بدکرداری اور بدنیتی کے باوجود ملک بھر میں انتخابات غیر جانبدارانہ قرار دیئے گئے۔ دنیا والوں نے یہ سمجھا کہ پاکستان اب ترقی و کامرانی کی شاہراہ پر گامزن ہوگا۔ جمہوریت کے لیے دو عوامی پارٹیاں قائم ہوگئی تھیں مگر یہ صورت حال یحییٰ خاں کو کسی طرح قبول نہ تھی۔ وہ تو عمر بھر کے لیے صدر رہنا چاہتے تھے اور فوج کے کمانڈر انچیف بھی۔

مجھے یاد ہے کہ اقتدار غصب کرنے کے بعد جب وہ سرکاری افسروں کی پہلی میٹنگ سے خطاب کرنے آئے تو قدرے گھبرائے ہوئے تھے۔ کرسی پر بیٹھے تو پیچھے کی طرف لڑھک گئے، پریشانی میں سگریٹ سلگانے لگے اور بولے:
''میرے سر پر تین ٹوپیاں ہیں تین...... ایک، دو، تین، صدر کی، چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی اور کمانڈر انچیف کی، مگر جو ٹوپی مجھے پسند ہے وہ کمانڈر انچیف کی ہے''۔

انتخابات کے نتائج کا اعلان ہوتے ہی یحییٰ خاں اتنے غصیل ہوگئے کہ ان کے ساتھی پاگلوں کی طرح مارے مارے پھرتے رہے۔ کوئی کہتا: ''الیکشن بے ضابطہ قرار دیئے جائیں''۔ کوئی کہتا: ''یہ سب سازش ہے ہمیں صحیح حالات

Marfat.com

سے بے خبر رکھا گیا ہے''۔ اڑتالیس گھنٹے کے بعد یحییٰ خاں سطح پر ابھرے۔ کامیاب امیدواروں کو مبارکباد کا پیغام بھیجا اور یہ توقع بھی ظاہر کی کہ وہ اپنی نمائندہ حیثیت کو ملک اور قوم کی بہبود اور استحکام کے لیے وقف کر دیں گے۔ وہ مکروفن کے بادشاہ تھے، انہوں نے دو دن کی سوچ بچار کے بعد ایک نیا منصوبہ بنا لیا تھا۔ اب انہیں تھوڑا سا وقت چاہئے تھا۔ یہ وقت حاصل کرنے کے لیے انہوں نے لیگل فریم ورک آرڈر کے پہلے سقم کا فائدہ اٹھایا۔ منتخب نمائندے بیٹھے ہیں اور یحییٰ خاں آئین ساز اسمبلی کا اجلاس بلانے میں پس و پیش کر رہے ہیں۔

انتخابات کے بعد یحییٰ خاں کا آئینی رول بالکل واضح تھا، ان کا فرض تھا کہ وہ اسمبلی کا اجلاس بلاتے اور قومی نمائندوں کو 120 دن کے اندر آزادانہ بحث کرنے اور آئین بنانے کی آزادی دیتے، مگر انہوں نے تکونی مشاورت کا ایک طویل سلسلہ شروع کر دیا۔ ڈھاکہ گئے اور مجیب کو مستقبل کا وزیراعظم نامزد کر آئے۔ وہاں سے سیدھے لاڑکانہ پہنچے اور سارے ملک میں بے اطمینانی اور بدگمانی اور ریشہ دوانی کے عفریت چھوڑ دیئے۔ ان دنوں ورلڈ بنک کے ایک فرانسیسی نژاد افسر مجھ سے ملنے آئے۔ وہ ڈھاکہ سے آ رہے تھے اور مجیب الرحمٰن سے بھی ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ ساری شام وہ مختلف طریقوں سے یہی بات دہراتے رہے کہ یحییٰ خاں کو قومی اسمبلی کا اجلاس بلانے پر قانونی نقطہ نظر سے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے پوچھا: ''مجیب سے ان کی ملاقات کیسی رہی؟'' کہنے لگے: ''پریشان بھی تھا اور ہنس بھی رہا تھا۔ کہتا تھا یہ پاکستان ہے امریکہ نہیں کہ انتخابات میں جو کامیاب ہو وہ حکومت بھی بنائے، ابھی دیکھئے کیا ہوتا ہے''۔

اس عرصے میں یحییٰ خاں نے مشرقی اور مغربی پاکستان کے نمائندوں میں ہر طرح کی غلط فہمیاں پیدا کیں، مغربی پاکستان کے نمائندوں سے کہتے مجیب اس ملک کو ختم کرنے پر تلا ہوا ہے۔ مجیب کو پیغام بھیجتے: ''ذرا صبر کرو تم جو چاہتے ہو اس سے زیادہ مل جائے گا''۔ مجیب سے اسمبلی بلانے کی ایک تاریخ طے کرتے، مغربی پاکستان والوں سے دوسری تاریخ ان کے کارندے مشرقی پاکستان میں اکا دکا فسادات کرانے میں بھی کامیاب ہو گئے۔ مشرقی پاکستان میں جیسے آگ لگ گئی۔ مغربی پاکستان اور بہار کے جو لوگ سالہا سال سے مشرقی پاکستان میں رہتے تھے، گھربار چھوڑ کر بھاگے۔ ہر طرف قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار گرم ہو گیا۔ انتظامیہ کو مجیب الرحمٰن نے مفلوج کر دیا تھا۔ یحییٰ سمجھ رہے تھے کہ ان کا منصوبہ کامیاب ہو رہا ہے اور سرحد کے پار صیاد مطمئن تھا کہ انتخابات کی مدد سے مغربی اور مشرقی پاکستان میں جس دائمی اشتراک کے مواقع پیدا ہو گئے تھے، وہ جاتے رہے۔ مجیب الرحمٰن اب اس حیثیت میں تھا کہ پاکستان کا آئین اس کی مرضی کے بغیر بن ہی نہ سکتا تھا۔ اب یا تو آئینی علیحدگی ہو گی یا جبری، چت بھی میری ہے پٹ بھی میری ہے۔

25 مارچ 1971ء کو جب یحییٰ خاں نے اپنے انتظامات مکمل کر لیے تو انہوں نے سیاست دانوں کو ایک جہاز میں بھر کر کراچی بھجوا دیا اور خود احکامات دینے کے فوراً بعد چوروں کی طرح بھیس بدل کر ڈھاکے سے مفرور ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے پھر ادھر کا رخ نہ کیا۔ انہیں اپنی جان اتنی عزیز تھی کہ ہزاروں جانیں تلف ہو جانے کے باوجود انہیں یہ توفیق نہ ہوئی کہ وہ مشرقی پاکستان جا کر یہ دیکھتے کہ آخر کیا ہو رہا ہے۔ وہ مشرقی پاکستان کو زیر نگیں رکھنا یا جبری طور پر ختم کر دینا چاہتے تھے۔

مجیب الرحمٰن گرفتار کر لیے گئے، جانے کس مصلحت کی بنا پر انہیں بڑے پراسرار طریقے سے مغربی پاکستان لایا

Marfat.com

گیا۔ نہ انہیں غداری کی سزا دی گئی نہ کوئی سیاسی مصالحت ہی کی کوشش کی گئی۔ دس مہینے تک پاکستان میں مسلمانوں کا خون بہتا رہا۔ دس مہینے تک ہر اسلامی حکم کی توہین ہوتی رہی، بچیاں بکتی رہیں، بیٹیاں تباہ ہوتی رہیں، مائیں روتی رہیں۔ دنیا بھر چلا اٹھی مگر یحییٰ خاں نے تباہی کا جو راستہ اختیار کیا تھا اس پر گامزن رہے۔ جب ہندوستان کو یقین ہو گیا کہ اب اس کی جارحانہ مداخلت فیصلہ کن ثابت ہو گی تو اس نے مشرقی پاکستان پر بھر پور حملہ کر دیا۔ جس وقت پاکستان کا سرتن سے جدا ہو رہا تھا، یحییٰ خاں نے اعلان کیا: ''لوکل کمانڈروں نے آپس میں یہ طے کیا ہے کہ ہندوستانی فوجوں کو ڈھاکے میں داخل ہونے سے روک دیا جائے''۔

یہ جملے سنتے ہی میرے بدن میں آگ لگ گئی۔ کیا کوئی انسان اس قدر بے حس، ظالم اور خود غرض ہو سکتا ہے کہ ہزاروں نوجوان ایک سفاک دشمن کے پاؤں تلے روندے جا رہے ہوں اور وہ کہے کہ یہ سب کچھ ایک مقامی سمجھوتے کے مطابق ہو رہا ہے۔ یحییٰ خاں اپنا کام کر گئے، ملک کا ایک حصہ دشمن کے قبضے میں چلا گیا، برصغیر کی تاریخ میں ایک مجاہدانہ تحریک نے اسلام کی سربلندی کے لیے جس مملکت کی تعمیر کی تھی، وہ مملکت سازش اور غداری کا شکار ہو گئی۔ تاریخ نے کروٹ بدلی اور چوبیس برس میں جو عمارت بنی تھی وہ راکھ ہو کر اس کے پہلو تلے دب گئی۔

مجیب الرحمٰن بھی اپنا کام کر گئے، ہندوستان کی غلامی ہی میں سہی بنگلہ دیش نے آزادی تو حاصل کر لی۔ وہ راولپنڈی سے رہا ہوئے تو پہلے فاتح کو خراج پیش کرنے دلی حاضر ہوئے۔ ڈھاکہ پہنچتے ہی انہوں نے لاکھوں انسانوں کے سامنے یہ اقبال کیا کہ میں کئی سال سے بنگلہ دیش کو ایک آزاد مملکت بنانے کی کوشش کر رہا تھا، آج میری کوشش کامیاب ہوئی۔

''آزادی'' ملی تو مشرقی پاکستان کے رہنے والوں پر یہ کھلا کہ ان کے ساتھ کیا ظلم ہوا ہے۔ جنگ کی تباہ کاریوں سے جو کچھ بچا تھا وہ ہندوستانی اٹھا کر لے گئے۔ معیشت پر مارواڑیوں کا قبضہ ہو گیا۔ سارا نظام ہندوستان کے اشاروں پر چلنے لگا۔ بنگالی مسلمانوں کی وہ صد سالہ جدوجہد جو 1947ء میں تکمیل پذیر ہوئی تھی سب کی سب رائیگاں گئی۔ وہ جنگ جو مغربی پاکستان کے خلاف آزادی کے نام پر لڑی گئی تھی ہمیشہ کے لیے ہندوستان کی غلامی کی صورت اختیار کر گئی۔ بنگلہ بندھو نے پہلے پاکستان سے غداری کی اور پھر ان لوگوں سے جن کی محبت کا تذکرہ کرتے وہ نہ تھکتے تھے، ہندوستان کے اشارے پر انہوں نے آزادی، جمہوریت اور عدل و انصاف کا ادارہ مسمار کیا اور سیاسی اقتدار کو ذاتی جاگیر بنا لیا۔ اور پھر وہ دن آیا کہ ایک فوجی گروہ نے بنگلہ بندھو کے گھر کا محاصرہ کر لیا اور جب وہ انہیں تنبیہ کرنے کے لیے گھر سے باہر نکلے تو انہیں سیڑھیوں ہی پر ڈھیر کر دیا گیا، ان کی پھٹی پھٹی آنکھیں انتہائی کرب اور حیرت سے آسمان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

پاکستان دولخت ہو گیا۔

مشرقی پاکستان ہندوستان کی غلامی میں چلا گیا۔

دو غدار اپنے منصوبوں کو عملی شکل دینے میں کامیاب ہو گئے اور اسلام اور پاکستان کے نام لیوا اپنی خوش فہمیوں، باہمی رقابتوں اور اقتدار کے جھمیلوں میں پڑے رہے۔ (بشکریہ ماہنامہ اردو ڈائجسٹ، لاہور)

پاکستان کو دولخت کرنے میں بھارت کا بھیانک کردار ہمیشہ سوالیہ نشان بنا رہے گا۔ بھارتی حکومت کے اس

Marfat.com

اقدام نے دونوں ممالک کے درمیان مستقل دشمنی کی بنیاد رکھ دی۔ کسی ایک وفاقی اکائی کی مرکز کے خلاف بغاوت میں باغیوں کا ساتھ دے کر بھارت نے اقوام متحدہ کے چارٹر، 1950ء اور 1966ء کے پاک بھارت معاہدوں کی کھلی خلاف ورزی کی جن میں ایک دوسرے کے معاملات میں مداخلت نہ کرنے کا عہد کیا گیا ہے۔ اس قرارداد میں بھارت نے دنیا بھر کی حکومتوں سے پاکستان کے داخلی معاملے میں مداخلت کرنے کی اپیل کی اور اندرا گاندھی نے کہا کہ ہماری سرحدوں کے قریب جو ہیبت ناک المیہ رونما ہو رہا ہے بھارت غیر جانبدار نہیں رہ سکتا اور پاکستان کی طرف سے بھارت کی مداخلت اور جارحیت کے خطرے پر پے در پے احتجاجات کو بھارت نے نظر انداز کر دیا اور اپنے گھناؤنے مشن پر گامزن رہتے ہوئے مشرقی پاکستان میں ''مکتی باہنی'' قائم کر دی۔

مشرقی پاکستان کے بحران کے دوران 27 مارچ 1971ء سے 18 دسمبر 1971ء کے عرصہ میں بھارت کی راجیہ سبھا کے 80 دن تک اجلاس منعقد ہوئے جس کے دوران 67 دن تک مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) کے بحران پر بحث ہوئی اور اس عرصہ میں 222 مرتبہ سوالات و جوابات کی صورت میں اس مسئلہ پر اظہار خیال کیا گیا۔ اس طرح اس عرصہ میں بھارت کی لوک سبھا کے 92 دن تک اجلاس منعقد ہوئے اور اس کے دوران 73 دن تک مشرقی پاکستان کے بحران پر بحث کی گئی۔ اس کے علاوہ سوالات و جوابات اور بیانات کی صورت میں 296 مرتبہ لوک سبھا میں اس مسئلہ پر اظہار خیال کیا گیا۔ (کرائسس آف ایسٹ پاکستان: صفحہ 203)

بھارت کی پشت پناہی پر ہی 10 اپریل 1971ء کو کلکتہ میں بنگلہ دیش کی جلاوطن حکومت کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ بھارت نے بارڈر سیکورٹی فورس کے ذریعے مکتی باہنی کی تربیت اسلحہ کی سپلائی اور اپنی سرزمین کو مشرقی پاکستان پر حملوں کے لیے چھاؤنی بنانے کی اجازت دی۔ سفارتی جارحیت کے ذریعے جمہوریت اور انسانی ہمدردی کے نام پر بھارت نے بنگلہ دیش کے متعلق اپنی پالیسی کے عالمی رائے عامہ سے حمایت حاصل کر لی۔ اس دلیل کے ذریعے دنیا میں پاکستان کے لیے نفرت پھیلائی گئی کہ مجیب ایک منتخب بنگالی راہنما ہے، اسے گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اس کی قوم پرست تحریک کو فوج نے سختی سے کچل ڈالا ہے۔ یہ کہا گیا کہ فوج نے پرامن شہریوں کو ٹینکوں سے بھون کر رکھ دیا ہے۔ ڈھاکہ کے پورے پڑھے لکھے اور دانشور طبقے، مصنفین، فنکاروں، پروفیسروں اور طلبہ کو ختم کرنے کی مہم جاری ہے۔ عوامی لیگی باغیوں کے ذریعے یہ کہانیاں آل انڈیا ریڈیو کے نیوز ایڈیٹروں تک پہنچتیں اور پھر انہیں ساری دنیا تک پھیلا دیا جاتا۔ ان خبروں نے غیر ملکوں میں رہنے والے بنگالیوں کو اپنے رشتہ داروں کی زندگی کے بارے میں پریشان کر دیا اور انہوں نے پاکستان کے خلاف مہم شروع کر دی۔ ڈھاکہ اور باقی مشرقی پاکستان کے درمیان سلسلہ مواصلات عوامی لیگ کی غاصب سول حکومت نے اس طرح معطل کر دیا تھا کہ کہیں سے کوئی خبر نہ پہنچ رہی تھی۔ پاکستان کی افواج باغیوں کے مزاحمت توڑتی، سڑکوں سے رکاوٹیں صاف کرتی، ٹوٹے پل بناتی، دور افتادہ علاقوں میں پہنچیں تو وہاں قتل عام کے انسانیت سوز مظالم دیکھنے میں آئے۔ اجتماعی قبرستانوں اور گڑھوں میں سے کتے لاشیں نکال کر نوچ رہے تھے۔ کمرے چھت تک انسانی خون سے آلودہ ہیبت ناک منظر پیش کر رہے تھے۔ خون لتھڑے کھلونے اپنے معصوم مالکوں کی داستان الم سنا رہے تھے۔ ایسٹ بنگال رجمنٹ اور ایسٹ بنگال رائفلز نے اپنے غیر بنگالی افسروں کو اور ان کے بال بچوں کو مار ڈالا تھا۔ واقعات کی ترتیب صاف بتاتی ہے کہ

Marfat.com

لوگ فوج سے نہیں، عوامی لیگی قاتلوں سے اپنی جانیں بچانے کے لیے بھارت کی سرحدوں کی طرف بھاگے۔ فوج کی قتل و غارت کی جو خبریں پھیلائی گئیں ان میں کوئی صداقت نہیں تھی۔ ان خبروں کے نتیجہ میں لوگوں میں خوف و ہراس پیدا ہو گیا۔ فوج نے چند ہفتوں کے اندر اندر بغاوت پر قابو پا لیا۔ عوامی لیگیوں نے غیر بنگالیوں کے خون سے جس طرح ہولی کھیلی، حکومت پاکستان نے اسے خوف سے پردہ راز میں رکھا کہ مغربی پاکستان میں رہنے والے مشرقی پاکستانیوں کی جانیں خطرے میں نہ پڑ جائیں۔ اس طرح بلاشبہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئی مگر دنیا میں پاکستان کا امیج بالکل تباہ ہو کر رہ گیا کیونکہ فوجی کارروائی کی جو اقتدار اعلیٰ کے احترام اور قانونی زندگی بحال کرنے کے لیے کی گئی تھی، ''نسل کشی'' معلوم ہونے لگی۔ (بنگلہ دیش اور پاکستان: آغا مسعود حسین، صفحہ 28)

بھارت نے مشرقی پاکستان سے بھاگ کر اس کی سرحدوں میں پناہ لینے والوں کے مسئلہ کو دنیا میں بڑھا چڑھا کر بیان کیا حالانکہ ابتدائی دنوں میں لوگ عوامی لیگی غنڈوں سے جان بچانے کے لیے بھارت چلے گئے تھے جو بعد میں پناہ گزین پہنچے وہ زیادہ تر بھارتی پروپیگنڈہ کا نتیجہ تھے۔ بھارتی ایجنٹ مشرقی پاکستان کے بارڈر ڈسٹرکٹ پر گھوم گھوم کر لاؤڈ سپیکر لے کر پروپیگنڈا کر رہے تھے کہ آپ لوگ بارڈر کے اس پار چلے جائیں ورنہ پاکستانی فوج آپ کو تہ تیغ کر دے گی۔ خوف و ہراس پھیلایا گیا، نقد پیسے تقسیم کیے گئے، ٹرانسپورٹ کا انتظام کیا گیا۔ ہندوؤں کے گھر جا جا کر انہیں ڈرایا گیا کہ جان کی خیر چاہتے ہو تو فوراً بھارت پہنچو۔

بھارت نے باغی گروپ کو اپنی زمین پر جلاوطن حکومت قائم کرنے کی اجازت دی۔ ایک جدید ترین ریڈیو سٹیشن اور ہر قسم کی ضروری سہولیات مہیا کیں اور باغیوں کی مکتی باہنی ترتیب دے کر اسے جدید اسلحہ سے لیس کیا۔ بھارت کی حکومت نے 21 اپریل کو اعلان کیا کہ خانہ جنگی کے چار ہفتوں میں 25834 مہاجر مشرقی پاکستان سے بھارت پہنچے ہیں اور بھارت کی معیشت پر اتنا بھاری بوجھ اس کی سلامتی، عوام کی ترقی و خوشحالی نیز غربت کے خاتمے کی مہم کو ناکام بنانے کی ایک سوچی سمجھی چال ہے۔ (حسن زمان: صفحہ 131)

ہنری کسنجر لکھتے ہیں: بھارت پناہ گزینوں کے سیل رواں سے عاجز آنے کا شور تو مچا رہا تھا مگر عملی طور پر اس کی تمام خواہش اور کوشش یہ تھی کہ یہ سلسلہ رکنے نہ پائے۔ ظاہر ہے کہ چھاپہ مار دستوں کو تربیت دے کر مشرقی پاکستان بھیجنے کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ وہاں پر امن و امان تہ و بالا رہے اور لوگ چین سے نہ بیٹھ سکیں۔ یحییٰ خاں نے عام معافی کا اعلان کیا تو بھی بھارت کے بے خانماں لوگوں سے گلو خلاصی حاصل کرنے کی بجائے ان کی واپسی میں رکاوٹیں کھڑی کیں اور سیاسی حل کی شرط لگا دی اور سیاسی حل بھی اپنی پسند کا جو بذات خود ایک پڑوسی ملک کی آزادی و خود مختاری میں دخل اندازی کے مترادف تھا۔ اس سیاسی حل کی مزید تشریح کرتے ہوئے وسط جون میں بھارتی وزیراعظم نے واضح طور پر یہ کہہ دیا کہ ان کا ملک بنگلہ دیش کی موت ہرگز قبول نہ کرے گا گویا صاف لفظوں میں بھارت آدھے پاکستان کی بھینٹ مانگ رہا تھا۔ (وائٹ پیپر آن ویسٹ پاکستان: صفحہ 53)

یوں تو امریکہ نے کبھی پاکستان کے ساتھ دوستی کا حق نہیں نبھایا اور عموماً پاکستانی حکومتوں کو اپنے مقاصد کے لیے آلہ کار بنائے رکھا لیکن حیرت انگیز طور پر مشرقی پاکستان میں خانہ جنگی کے آغاز کے ساتھ ہی امریکہ نے تمام نئے لائسنس

Marfat.com

منسوخ کر دیئے۔اس سے پاکستان کو 35 ملین ڈالر کے امریکی اسلحہ کی ترسیل روک دی گئی اور صرف 5 ملین ڈالر کے ہتھیار ملتے رہے۔ پاکستان کو صرف وہی ہتھیار ملتے رہے جو تجارتی بنیادوں پر جاری ہونے والے پرانے لائسنسوں کے تحت آتے تھے اور یہ سب سپیئر پارٹس تھے۔کوئی مہلک یا بھاری ہتھیار پاکستان کو نہیں دیا گیا۔امریکہ نے ٹکا خان کی جگہ بنگالی اے ایم مالک کا تقرر بطور سول گورنر کرایا۔اس کے علاوہ عام عفو نامہ کا اعلان ہوا لیکن جب اکتوبر نومبر میں امریکہ کو یقین ہو گیا کہ بنگلہ دیش کا قیام اب ناگزیر ہے تو امریکہ کے نزدیک اہم بات یہ تھی کہ تبدیلی کیونکر عمل میں آتی ہے۔امریکہ چاہتا تھا کہ یہ مقصد لڑے بھڑے بغیر حاصل ہو جائے جبکہ بھارت مشرقی بنگال کو صبر وسکون کے ساتھ آزادی سے ہمکنار ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بھارتی حملے سے دو روز قبل یحییٰ خاں نے صدر نکسن کی تجویز قبول کر لی تھی کہ وہ مشرقی پاکستان کے مسئلہ کے سیاسی حل کے لیے کلکتہ میں مقیم جلاوطن عوامی لیگی راہنماؤں سے مذاکرات کریں اور انہوں نے دسمبر میں مشرقی پاکستان میں سول حکومت بحال کرنے کا وعدہ بھی کر لیا تھا اور بھارت کو ہر مرحلے ان واقعات سے باخبر رکھا گیا۔لیکن جیسے ہی بھارت کو اس کی اطلاع ملی اس نے کوئی وقت ضائع کیے بغیر مشرقی پاکستان پر حملہ کر کے سیاسی حل کے تمام امکانات پر پانی پھیر دیا کیونکہ اصلاح احوال کی یہ تمام کوششیں بھارتی عزائم سے متصادم تھیں۔ بھارت یہ جانتا تھا کہ تاریخ کے اس نازک موڑ پر چین لن پیاؤ ٹولے کی وجہ سے داخلی خلفشار کا شکار ہے۔امریکہ ویت نام میں الجھا ہوا ہے اور خود اسے روس کی حمایت حاصل ہے، اس لیے پاکستان پر ضرب لگانے کا بہترین موقع تھا۔اندرا گاندھی مشرقی پاکستان کے معاملے میں لیت ولعل کی قائل نہ تھیں، بنگلہ دیش کے قیام سے مرتب ہونے والے نتائج بھی ان کے سامنے تھے۔مغربی بنگال اس کا فوری اثر قبول کرتا جو پہلے ہی بھارت کے لیے دردسر بنا ہوا تھا اور وہاں سے علیحدگی پسندی کی لہر دور دور تک پھیل سکتی تھی۔آزاد بنگلہ دیش پاکستان سے مفاہمت کر لیتا اور یہ بھی ممکن تھا کہ خود بھارتی مسلمان ایک آدھ اور پاکستان کا مطالبہ کر بیٹھتے۔نئی دہلی کے منصوبہ سازوں نے اس کا تریاق یہ سوچا کہ بنگلہ دیش کا قیام بھارت کی عسکری قوت کے بل بوتے پر ہونا چاہیے تاکہ برصغیر میں اس کی دھاک بیٹھ جائے اور اس علاقے میں پھر کسی کو دم مارنے کی جرأت نہ ہو سکے۔ یہی عزائم تھے جنہیں بروئے کار لانے کے لیے 21 نومبر 1971ء کو بھارتی فوجوں نے مکتی باہنی کی مدد سے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا۔

انتہائی نامساعدہ حالات میں پاکستانی فوج کے لیے اس حملے کا مقابلہ کرنا بظاہر ممکن نہیں تھا لیکن ہمارے بڑھکیں مارنے والے جرنیل ٹائیگر نیازی نے جس برق رفتاری سے شکست کی ذلت اپنے ماتھے پر سجائی وہ ہماری تاریخ کا شرمناک باب ہے۔ بھارت نے پاکستان کے خلاف کھلی جارحیت کا مظاہرہ کر کے پاکستان کی مستقبل کی حکومتوں کو یہ سبق سکھا دیا کہ وہ کبھی کسی معاملے میں بھارت پر اعتماد نہ کریں اور یہ بھی کہ جب کبھی بھارت کو موقعہ ملا وہ مشرقی پاکستان کی تحریک ضرور دہرائے گا۔

Marfat.com

تاریخ سے مکالمہ

بھارت نے پاکستان سے اچھے ہمسایوں کی طرح ایک دوسرے کے تعلقات قائم کرنے کے بجائے ہمیشہ یہی کوششیں کی کہ اپنے اصلی ایجنڈے یعنی اکھنڈ بھارت پر کام جاری رکھے۔ 1971ء کا المیہ اس ایجنڈے سے متعلق بھارتی پالیسیوں کا شاخسانہ تھا۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ جس مشرقی پاکستان کے لیڈروں نے اپنے لوگوں سے غداری کر کے بھارتی غلامی اختیار کی وہ کس انجام سے دوچار ہوئے؟ کیا بھارت نے ان کے ساتھ کئے وعدوں کو پورا کیا؟ کیا بھارت کی طرف سے بنگلہ دیش کی ''جلاوطن حکومت'' کے ساتھ ہونے والے معاہدے کا مطلب بنگلہ دیش کی آزادی تھی؟

یہ اور ایسے کئی اہم سوالات کے جوابات بھی 1995ء میں بنگلہ دیش میں شائع ہونے والی زین العابدین کی مشہور زمانہ تصنیف Raw and Bangladesh میں ملتے ہیں۔

محمد زین العابدین بنگلہ دیش سابقہ مشرقی پاکستان کے ضلع نواکھلی کے رہنے والے ہیں ان کا شمار عوامی لیگ سٹوڈنٹس فرنٹ کے ممتاز لیڈروں میں ہوتا ہے۔ 1970ء میں وہ نواکھلی گورنمنٹ کالج سٹوڈنٹس یونین کے نائب صدر منتخب ہوئے۔ 1968ء اور 1969ء میں وہ ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت نظر بند بھی رہے۔

1971ء میں شیخ مجیب الرحمان کا زبردست حمایتی ہونے کی بنا پر انہوں نے نام نہاد ''جنگ آزادی'' میں بھرپور حصہ لیا اور بی ایل ایف (مجیب باہنی) کے مقامی کمانڈر کی حیثیت سے پاکستانی افواج کے خلاف مسلح جنگ میں حصہ لیا۔ ''را'' نے انہیں آسام کے ,,ہاف لانگ،، کیمپ میں ٹریننگ دی۔

پاکستانی فوج کے خلاف ان کے ڈرامے ''اک ندی رکھتا'' (خون کا دریا) نے بڑی شہرت پائی جس کے ذریعے پاکستان کے خلاف زہریلا پروپیگنڈا کیا گیا تھا اس طرح انہوں نے بنگلہ دیش کی جنگِ آزادی میں ایک ہیرو کا کردار ادا کیا۔

''آزادی'' کے بعد 1973ء میں جب انہیں چانکیہ کے چیلے چانٹوں کی سازش سمجھ آ گئی تو انہوں نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ 1972ء سے آج تک زین العابدین فری لانسر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں اسی دوران انہوں نے بنگلہ دیش کے تمام ممتاز اخبارات اور جرائد میں سینکڑوں مضامین بھی لکھے Raw and Bangladesh ان کی ایسی چشم کشا تصنیف ہے جس نے ساری دنیا کے سامنے بھارتی انٹیلی جنس ایجنسی ''را'' کو ننگا کر کے رکھ دیا۔ اسی کتاب میں انہوں نے بعض ایسے تاریخی حقائق بے نقاب کئے ہیں جو واقعی چونکا دینے والے ہیں۔ تاریخ کے طالب علم کے لئے یہ کتاب انتہائی خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔

بھارتی حکومتوں نے پاکستان سے تعلقات قائم کرنے کی بجائے پاکستان کو توڑنے کے جس گھناؤنے مشن کا

Marfat.com

آغاز قیام پاکستان کے ساتھ ہی کر دیا تھا۔ اس پر یہ کتاب ایک دلیل کی حیثیت رکھتی ہے۔ زین العابدین ''را'' اینڈ بنگلہ دیش'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''1971ء کی دلخراش یادیں ابھی تک میرے دل و دماغ میں تازہ ہیں۔ گو کہ اس حادثے کو 25 سال بیت گئے لیکن ابھی تک یہ مکمل جزئیات سمیت میری یادوں میں محفوظ ہے۔ یوں تو 1971ء کی اس ''جنگ'' سے میری بے شمار یادیں وابستہ ہیں لیکن ایک واقعہ جس نے بعد میں میری سوچوں اور زندگی کی کا رخ بدل دیا ہمیشہ خلش کی طرح میرے ضمیر کو کچوکے دیتا رہا اور یہی واقعہ دراصل میرے موجودہ خیالات میں انقلابی تبدیلی کی بنیاد بھی بنا۔ اپریل 1971ء کی بات ہے گو کہ پاکستانی فوج نے اپنے آپریشن کا آغاز ڈھاکہ میں اس سے پہلے کر دیا تھا لیکن ابھی تک میرے علاقہ ''نواکھلی'' اس سے محفوظ تھا یہاں پاکستانی فوج نہیں آئی تھی جبکہ 25 مارچ کو ڈھاکہ میں وہ اپنا آپریشن شروع کر چکے تھے۔

بنگلہ دیش کی جنگ آزادی کے ایک مقامی رہنما اور موئید ہونے کی وجہ سے میں اپنا فرض بڑی سرگرمی سے انجام دے رہا تھا۔ ہمیں اپنے مقامی ساتھیوں کے ساتھ پاکستانی فوج کی ممکنہ آمد اور مزاحمت کیلئے تیار رہنے کا حکم ملا تھا اور میری کمان میں میرے ساتھی ''مزاحمت'' کیلئے رضا کاروں کو متحد اور منظم کرنے میں سرگرم تھے۔ سٹوڈنٹس لیڈر کی حیثیت سے میں ایک عرصہ سے یہاں شیخ مجیب الرحمان کے چھ نکات کا پرچار کرتا آ رہا تھا اور اس حوالے سے میری خاصی شہرت بھی تھی جب مسلح جدوجہد کا آغاز ہوا تو اپنے علاقہ کی ذمہ داریاں مجھے ہی سونپی گئیں جنہیں میں نے اپنی بساط بھر کوشش کے ساتھ ادا کیا۔ ہم نے پہلے پہل مقامی اور قریبی دیہاتوں کے نوجوانوں کو پاکستان کے خلاف سرگرم عمل کیا اور اب صورتحال یہ تھی کہ دور دراز کے دیہاتوں سے بھی نوجوان اپنے ہتھیاروں سمیت جن میں اکثر کے پاس بانس اور تیر کمان وغیرہ تھے نواکھلی میں جمع ہو چکے تھے تا کہ اس طرف آنے والی پاکستانی فوج کے ساتھ جنگ کی جا سکے مجھے اپنے علاقے میں سیاسی مضبوطی عطا کرنے میں میرے ایک ہمسائے کا اہم کردار تھا۔ جودر میانی عمر کے ایک معزز شہری تھے جن کے علم و کمال سے ہم سب بہت متاثر ہوتے تھے۔ مجھے آج بھی اس بات کا اقرار کرنے میں کوئی جھجک مانع نہیں کہ ان کی مشاورت، مدبر اور بے پناہ خلوص کے بغیر میں کبھی اپنی سیاسی حیثیت یہاں نہ بنا سکتا۔ دورِ ایوبی میں انہوں نے ہر مشکل مرحلے پر میرا ساتھ دیا اور اب انہیں میرے نزدیک ایک رہنما کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ ہم لوگ فوج کی آمد سے پہلے پہلے اپنے گھروں سے غائب ہو کر ان کیمپوں اور خفیہ پناہ گاہوں میں منتقل ہو رہے تھے جہاں ہم پاکستانی فوج سے محفوظ رہ کر ان کے خلاف ایک جنگ جاری رکھ سکتے تھے۔

میں نوجوانوں کو ان مقامات تک پہنچانے کا ذمہ دار تھا۔ اس مرحلے پر جبکہ شہر میں پاکستانی فوج کی آمد سے خوف و ہراس کی فضا پھیلی ہوئی تھی اور لوگ خود کو غیر محفوظ خیال کرتے تھے میں نے اپنے اس محسن سے کہا کہ وہ میرے ساتھ چلیں تا کہ انہیں بھی اپنے ایک کیمپ میں خفیہ اور محفوظ مقام تک پہنچا سکوں۔ میں نے محسوس کیا کہ اس مرحلے پر وہ اضطراب میں مبتلا دکھائی دے رہے تھے۔ پہلے پہل تو میں نے اسے ان کی قدرتی گھبراہٹ پر معمول کیا لیکن بعد میں مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ہماری مسلح جدوجہد سے شاید نالاں ہیں یا پھر ذہنی طور پر قبول نہیں کر رہے۔ میرے محسن کا یہ رویہ میرے لئے ناقابل سمجھ اور پریشان کن تھا۔ سمجھ نہیں آتی تھی کہ مجھے اس مقام تک پہنچانے والے میرے اس محسن کو اب کیا ہو گیا ہے جبکہ آزادی اور بنگلہ دیش کا قیام اب زیادہ دور دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

Marfat.com

بہر حال میں انہیں اپنے ساتھیوں کی حفاظت میں سونپ کر خود پاکستانی فوج کے خلاف جنگ میں جُت گیا جب ہم نے یہاں سے پاکستانی فوج کے خلاف کامیابی حاصل کر لی اور فوج اپنا آپریشن کر کے چلی گئی تو سب سے پہلے میں اپنے اس محسن کے پاس مبارک باد دینے پہنچا۔

یہ بڑی کامیابی تھی اور میں سمجھتا تھا کہ جب میں انہیں خبر دوں گا کہ ہم نے یہاں پاکستانی فوج کا حملہ ناکام کر کے اسے واپس لوٹنے پر مجبور کر دیا ہے تو وہ بہت خوش ہوں گے۔ میں قریباً بھاگتا ہوا اپنے محسن تک پہنچا اور بے اختیار ان سے بغلگیر ہو کر انہیں خوشخبری سنائی کہ ہم نے معرکہ مار لیا ہے لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ بالکل خاموش رہے اور پاکستانی فوج کے خلاف ایک لفظ بھی ان کے منہ سے نہ نکلا البتہ ان کی آنکھوں میں آنسو ضرور آ گئے۔ میں نے تب یہی سوچا تھا کہ شاید وہ فوج کا حملہ ٹل جانے کی خوشی کا اظہار آنسوؤں کی خاموش زبان سے کر رہے ہیں کیونکہ بنیادی طور پر وہ ایک شریف اور ٹھنڈے دل و دماغ والے آدمی تھے۔

انہوں نے آہستگی سے مجھے خود سے الگ کیا اور میرے ہاتھ میں ہاتھ دے کر بازار میں ایک نزدیکی ٹی سٹال کی طرف چل دیئے شاید وہ یہاں موجود دوسرے لوگوں کے سامنے کوئی بات نہیں کرنا چاہتے تھے میں ان کے ساتھ چلا آیا اور یہی گمان کیا کہ اب وہ کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔

چائے آ گئی......

میرے محسن نے چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے مجھے تقسیم ہندوستان کا پس منظر تاریخی تناظر میں بتانا شروع کیا اور کافی دیر تک مجھے ہندو کی نفسیات سمجھاتے ہوئے یہ بتاتے رہے کہ ہندو تعصب اور مسلم دشمنی دو ایسی بنیادیں ہیں جو ہندوستان کی تقسیم پر منتج ہوئیں۔ انہوں نے مجھے تفصیل سے ہندو کے ان تمام مظالم سے آگاہ کیا جن کے بعد محمد علی جناح نے علیحدہ مسلم ملک پاکستان بنانے کا فیصلہ کیا تھا اور بتایا کہ کس طرح ایک طویل جنگ لڑنے کے بعد ان کے بزرگوں نے ہندوستان سے علیحدگی اختیار کر کے اپنا الگ ملک پاکستان بنایا تھا۔ انہوں نے کہا کہ اپنے حقوق کی جدوجہد اور اپنے ملک کو توڑنا دو الگ الگ باتیں ہیں۔ وہ بنگالیوں کی اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کے بالکل خلاف نہیں لیکن پاکستان توڑنے کو گناہ سمجھتے ہیں اور بتایا کہ ان کا تجربہ اور زندگی بھر کی تحقیق نے انہیں بتایا ہے کہ ہندو کبھی کسی کا دوست نہیں ہو سکتا اور جس ملک کا نام بھارت ہے اس کی حکومت کبھی کسی مسلمان کی حمایت نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کے پس پردہ کوئی خطرناک عزائم نہ رکھتی ہو...... اپنی گفتگو کے خاتمے پر انہوں نے بے قرار ہو کر میرا ہاتھ تھام لیا اور آنسو بھری آنکھوں اور رندھی ہوئی آواز سے کہا:

Are you again going to make us the slaves of Hindus.

''کیا تم دوبارہ ہمیں ہندوستان کا غلام بنانا چاہتے ہو۔''

مجھے ایمانداری سے اس بات کا اقرار کرنا ہے کہ تب ان کی اس بات کا میں نے کوئی اثر نہیں لیا تھا میں نوجوان تھا اور اس جنگ میں پوری طرح ملوث ہو چکا تھا۔ میرا مقصد صرف اپنے لیڈر شیخ مجیب الرحمان کے احکامات کی تعمیل اور بنگلہ دیش کی مکمل آزادی اور بنگالی مسلمانوں کے لئے الگ ملک کا قیام تھا۔ میرے پاس تب ایسی فضول باتیں سوچنے کے لئے وقت ہی نہیں تھا اور یہ بھی سچ ہے کہ مجھے تاریخ کا اتنا شعور بھی کب تھا، بہر حال میں نے انہیں کچھ نہ کہا البتہ آئندہ ان سے

Marfat.com

مشاورت نہ لینے کا ارادہ ضرور کر لیا اور اس پر عمل بھی کیا۔ اس کے بعد میں نے ایک طرح اپنے اس محسن سے علیحدگی ہی اختیار کر لی گو کہ میں دوبارہ ان سے نہیں ملا لیکن کبھی کبھی ان کا یہ سوال مجھے ضرور بے چین کر دیتا تھا جو انہوں نے آخری لمحات میں مجھ سے کیا تھا۔ شاید میرے لاشعور کے کسی کونے میں ان کے یہ الفاظ نقش ہو گئے تھے۔ بعد میں سرحد عبور کر کے میں بھارتی فوج سے پاکستان کے خلاف جنگ کی تربیت لینے گیا۔ یہاں سے اپنی ہائی کمان کی طرف سے ''مجیب باہنی'' تیار کرنے کا حکم ملا تھا اور ہم زور و شور سے اپنے ساتھیوں کو دن رات جنگی تربیت دیکر ''مجیب باہنی'' کو منظم کرنے لگے۔

یہاں پہنچ کر سب سے پہلے جس تلخ حقیقت نے مجھے بے چین اور سوچنے پر مجبور کیا وہ ہمارے بھارتی ''ہینڈلرز'' کا رویہ تھا عجیب اور پریشان کن بات یہ تھی کہ وہ لوگ ہمیں ''فریڈم فائٹرز'' کا رتبہ دینے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھے۔ وہ ہمیں Friends کے بجائے Agents سمجھ رہے تھے اور ان کا رویہ ہمارے ساتھ حاکمانہ تھا۔

اور...... آپ یقین کیجئے میں نے تب بھی کوئی بدگمانی اپنے دل میں نہ آنے دی اور یہی گمان کیا کہ یہ انٹیلی جنس کے لوگ ہیں جن کی تربیت ایک خاص نہج پر کی جاتی ہے اور وہ اپنے کیمپوں میں آنے والے ہر غیر ملکی کو ایجنٹ ہی سمجھتے ہیں جبکہ سیاسی سطح پر ایسا نہیں ہوگا۔ بنگلہ دیش کی آزادی تک میں اپنے خیالات اور نظریات پر بڑی استقامت سے قائم رہا لیکن جب میں نے قیام بنگلہ دیش کے فوراً بعد بھارتی فوج کو اپنے ملک میں لوٹ مار کرتے دیکھا تو بے اختیار اپنے محسن کی بات یاد آ گئی اور میرے نظریات میں پہلی دراڑ تب ہی آئی۔ اب بھارتی فوج کا اصلی چہرہ میرے سامنے تھا۔

میں نے دیکھا کہ پاکستانی فوج کے ہتھیار ڈالتے ہی ہزاروں کی تعداد میں بھارتی فوجیوں نے چاروں طرف لوٹ مار مچادی۔ بھارتی فوجی ''مرہٹہ کیولری'' کے جدید روپ میں نمودار ہوئے جو اس صدی کے درمیانی عرصہ میں بنگال کو تہ تیغ کرنے میں خاصی بدنامی تاریخی طور پر کما چکی تھی۔ میں نے یہی جانا کہ تاریخ خود کو دہرا رہی ہے۔

بھارتی فوجیوں کے ہاتھ جو بھی لگا بلا تخصیص انہوں نے اٹھایا اور بھارت لے گئے۔ تب ہمارے لوگوں کو یوں لگا جیسے بھارتی اس وقت کا صدیوں سے انتظار کر رہے تھے اور جب یہ موقعہ ان کے ہاتھ لگا تو وہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اپنے کام میں جت گئے بھارتی فوج نے ہمارے شہروں، انڈسٹریل ایریا، بندرگاہوں، کنٹونمنٹ، کمرشل سنٹرز، اِلّا یہ کہ رہائشی آبادیوں میں بھی کرفیو نافذ کر کے بنگلہ دیشی شہریوں کو گھروں میں بند کر دیا اور خود لوٹ مار میں لگ گئے انہوں نے بجلی کے پنکھوں سے معمولی کیل کانٹے اور سوت کی انٹی سے پانی کی ربڑ پائپ تک ہر چیز سمیٹ لی۔ اس لوٹ کے مال کو بھارت منتقل کرنے کے لئے ہزاروں کی تعداد میں آرمی کے بڑے بڑے ٹرک یہاں پہنچا دیئے گئے تھے۔

تاریخ نے بے بس انسانوں کو وحشیوں کے ہاتھوں اس طرح لٹنے کے کم ہی مناظر اس سے پہلے دیکھے ہوں گے کوئی بنگلہ دیشی یہ ماننے کیلئے تیار نہیں کہ اس لوٹ مار میں بھارت کی اعلیٰ قیادت شامل نہیں تھی۔ ان کے آشیرواد کے بغیر یہ گھناؤنا قدم بھارتی فوج اٹھا ہی نہیں سکتی۔

حالات و واقعات نے ثابت کر دیا کہ بھارتی فوج نے بنگلہ دیش کو ایک کالونی کی حیثیت دی اور ہمارے ساتھ ایک دوست کے بجائے فاتح جیسا سلوک کیا یہ وہ وقت تھا جب میرے محسن کے سوال نے میرے لاشعور سے نکل کر میرے ضمیر پر دستک دی اور ایک خلش بن کر رہ گیا۔ میں نے تب بھی دعا کی کہ یہ بات غلط ثابت ہو کیونکہ ابھی اس تلخ سچائی کو

Marfat.com

تسلیم کرنے کا حوصلہ مجھ میں نہیں تھا۔ میں منتظر تھا کہ تاریخ کروٹ بدلے اور میرے محسن کی بات جھوٹ ہو جائے۔ اس نے ہندو اور بھارت سے متعلق جن خدشات کا اظہار کیا تھا وہ غلط ثابت ہوں اور میں ضمیر کی اس اذیت سے نجات پا لوں۔

لیکن...... تاریخ کی ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیں کہ پے در پے ہونے والے واقعات نے میرے محسن کو سچا ثابت کر دیا اور مجھے اپنے ضمیر کی عدالت میں لا کھڑا کیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جب سے میں نے بھارتی عزائم اور اپنی تاریخی غلطیوں کو بتانے کی مہم کا آغاز کیا اور بھارتیوں کے گھناؤنے روپ سے پردہ ہٹایا ہے میں اکثر تنقید کی زد میں رہا ہوں۔ مختلف حلقوں کی طرف سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ جس ملک سے میں نے تربیت حاصل کی جن کے زیر سایہ آزادی حاصل کی میں ان ہی کے خلاف کیوں ہو گیا۔ میرا جواب بالکل واضح ہے کہ میں آج بھی ایک ''فریڈم فائٹرز'' کی ذمہ داری ادا کر رہا ہوں۔

میں اپنے مادر وطن کے خلاف ہونے والی زیادتیوں پر کب تک خاموش تماشائی بنا رہتا؟ اپنے نام نہاد محسنوں کے ہاتھوں کب تک اپنے لوگوں کی لوٹ مار کا تماشہ دیکھتا رہتا؟ بھارت اگر بنگلہ دیش سے مخلص رہتا تو ہم اسے سر آنکھوں پر بٹھاتے، کسی کو اس کے خلاف ایک لفظ کہنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

لیکن...... بھارت نے اپنے گھٹیا ہتھکنڈوں کے ساتھ اپنے گھناؤنے عزائم کو خود ہی بے نقاب کر دیا اور ثابت کیا کہ وہ کبھی ہمارا دوست نہیں تھا...... البتہ آستین کا سانپ ضرور ثابت ہوا ہے۔ بھارت نے بنگلہ دیش کی آزادی اور حاکمیت اعلیٰ کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ ہمارے وجود کے لئے چیلنج بن چکا ہے۔ اس صورتحال نے مجھے ایک ''فریڈم فائٹرز'' کا رول ادا کرنے پر مجبور کر دیا اور اب میرا فرض بنتا ہے کہ میں بنگلہ دیش کے دشمنوں کے خلاف جو کچھ بھی اپنی حیثیت میں کر سکتا ہوں کر گزاروں۔ خواہ اس کی کچھ بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔

آج یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ بھارت نے بنگلہ دیش کو ایک علیحدہ مملکت کی حیثیت دلانے کیلئے آزاد نہیں کروایا تھا بلکہ یہ تو مشرقی پاکستان کو بھارت میں ضم کرنے کی طرف ایک اہم قدم تھا۔ بنگلہ دیش کے قیام کے ساتھ ہی بھارت نے اپنی تمام شیطانی قوتوں کے ساتھ بنگلہ دیش کی سالمیت پر حملہ کر دیا اور اپنی تمام توانائیاں ''اکھنڈ بھارت'' کے براہمنی خواب کو حقیقت کا روپ دینے پر لگا دی ہیں۔ ان شیطانی قوتوں میں سے جو بنگلہ دیش پر حملہ آور ہوئی ہیں سب سے بڑی اور دہشت پہلو بلا بھارت کی بدنام انٹیلی جنس ایجنسی ''ریسرچ اینڈ انیلسز ونگ'' ہے جسے مہذب دنیا ''را'' RAW کے نام سے جانتی ہے۔

1968ء میں ''را'' کا قیام عمل میں آیا تو اس کے اغراض و مقاصد میں بھارتی فارن پالیسی میں مدد اور موثر کرنا شامل تھا لیکن یہ محض آئی واش تھا۔ اپنے قیام کے ساتھ ہی ''را'' نے مشرقی پاکستان کو اپنی مذموم سرگرمیوں کا گڑھ بنا لیا اور بالآخر پاکستان ٹوٹ گیا۔

قیام بنگلہ دیش پر بھارت کو یہاں خاصی دشواری پیش نہیں آئی ''را'' کا سیٹ اپ تو پہلے ہی سے موجود تھا۔ آزاد بنگلہ دیش میں انہوں نے اس پرانے نیٹ ورک کو اس طرح تیزی کے ساتھ پھیلایا کہ اب بنگلہ دیش میں کچھ بھی ان کی دسترس سے محفوظ نہیں رہا۔

''را'' کا نیٹ ورک بنگلہ دیش کے جسد ملی میں کینسر کی طرح پھیل چکا ہے۔ بہر حال اس خطرے کی نشاندہی

Marfat.com

خوف اور طمع کے مارے قومی سطح پر تو کوئی کرنے کی جرات نہیں کرتا البتہ کبھی کبھی اخبارات میں اس حوالے سے ضرور خبریں وغیرہ آ جایا کرتی ہیں۔ اس ضمن میں کوئی باقاعدہ کام نہ تو کسی نے کیا اور نہ ہی سامنے لایا گیا میں نے 1994/95ء میں ہفت روزہ مسلم جہاں میں ''را'' کے کالے کرتوت پر ایک مضامین کا سلسلہ شروع کیا تھا جسے محب وطن حلقوں میں سراہا گیا اور دوستوں کا تقاضہ تھا کہ اس ضمن میں کوئی باقاعدہ کام کتابی شکل میں سامنے لایا جائے۔ جواب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

دیباچہ (RAW and Bangladesh, P-1-TO-4)

تاریخ کا ریکارڈ درست رکھنے کیلئے میں زین العابدین کی اس کتاب کا باب نمبر: 4 RAW'S Objectives من وعن پیش کر رہا ہوں جس میں بھارتی ڈپلومیسی، خارجہ پالیسی اور خصوصاً ہمسایوں سے تعلقات جیسے کئی سوالات کا جواب موجود ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

RAW'S OBJECTIVES

A section of people in Bangladesh preaches that menace of India is a baseless and communalistic propaganda. They argue, why should India over-burden herself by swallowing a problematic and poverty-stricken country? For their kind information I can note that India has already set several examples of swallowing weak and tiny territories. The world is well aware how treacherously India annexed Hyderabad, Manvadhar, Goa, Dumn, Deue, Kashmir etc. How can one forget the illegal and conspiratial annexation of Sikkim, a tiny and rocky mountainous kingdom of the Himalayas. Thus how can one be naive enough to believe that India is not interested in capturing a strategically important like Bangladesh.

Merging Bangladesh with India is RAW's ultimate goal. It is considered necessary to suppress the ongoing liberating Bangladesh . Thus constant efforts are being made on multiple fronts to weaken and cripple Bangladesh to facilitate its swallowing. RAW's policy makers have taken . It as their historical responsibility to materialise the dream of Nehru and other leaders for a United India i.e 'Ram Raj' It may be mentioned that the Hindu leaders had accepted partition of India in the hope that one day it would be undone. An independent and sovereign Bangladesh remains a thorn in the eyes of Indian leaders which has to be uprooted at the earliest.

Marfat.com

People of the then East Bengal (Today's Bangladesh) had struggled for establishment of an independent Muslim State to get rid of communal mentality and master-like attitude of the Hindu leaders. Muslims apprehended that their interests and even existence may be in jeopardy in Hindu majority India. This led to wide scale popularity of Two Nation. Theory which became the basis for creation of a separate homeland for the Muslims of East Bengal.

It is to be noted that the then Muslim leaders had tried their utmost to avoid partition of Bengal and to form an independent unified Bengal state outside the framework of India and Pakistan . Muhammad Ali Jinnah, the undisputed Muslim leader of that time was in favour of undivided independent Bengal, but Hindu leaders, specially, Jawaharlal Nehru and his followers opposed the idea. Nehru's motive for dividing Bengal and Panjab was to expedite the annulment of partition of India as explaind in his letter to Mr. Ashraf-ud-Din, a Congress leader from comilla.

"The Congress has stood for the union of India and still stand for it. But we have previously stated that we are not going to compel any part against its will. If that unfortunately leads to a dicision then we accept it. Butinevitably such a division must mean a division also of Bengal and Punjab. that is the only way to have a united India soon after. If we can have a united India straight way without such division, that will of course be very welcome.

The objective of Indian assistance to the Bangladesh during the war of liberation of 1971 was to boost the process of reuniting India, a cherished dream of Nehru and other Hindu leaders. An impartial view of the treaty signed during 1971 war of liberation by India and the Provisional Government of Bangladesh, make it evidently clear that India actually wanted a crippled Bangladesh, which should not be able to come out of the claws of Indian grasp.

The 7-point secret treaty which our provisional Government was

Marfat.com

compelled to sign in October 1971 states:--

(a): After establishment of Bangladesh, the administrative officers who actively participated in the war of liberation would remain in their posts. The rest would be terminated and vacant posts would be filled up by the Indian adminstrative officers.

(b): After the liberation of Bangladesh, the required number of Indian soldiers would remain in Bangladesh (No time limit was laid down).

(c): Bangladesh would not form and maintain any formal and regular Armed Forces.

(d): To maintain internal security and law and order a militia would be formed comprising of the freedom fighters.

(e): The chief of staff of the indian Armed Forces would lead the probable war with Pakistan. The Mukti Bahini (freedom fighters) would work under the command of Indian Armed Forces.

Extract from Mr. Nehru's letter. (see appendix)

(f): Trade transaction between the two countries would be free and open. The volume of trade would be calculated once in a year and the price would be paid in pound-sterlings.

(g): The Foreign Ministry of Bangladesh would maintain a close liaison with External Affairs of Ministry of India and the latter would assist the former as far as possible.

Mr. Humayun Rashid Chowdhury, who was the Chief of Mission of the Provisional Government of Bangladesh in New Delhi disclosed during the interview that late Syed Nazrul Islam, the Acting president of Provisional Bangladesh Government fainted after signing the accord. It is intriguing that the text of this treaty has lnot been published till today neither by the Government of Bangladesh nor by that of India.

In pursuance of above accord, provisional Government of Bangladesh had to agree to the following arrangments:

(a): Lt .General Jagjit Singh Arrora was appointed as the Commander-in-Chief of the Allied Force instead of Genral Ataul

Marfat.com

Ghani Osmani.

(b): Surrender of Pakistani Soldiers to Lt. General Arora.

(c): Arrival of Indian civil servants in Dhaka to take over the responsibility of civil administration.

(d): Continued stay of Indian soldiers in Bangladesh even after surrender of Pak Army on December 16, 1971.

(e): Formation of Rakkhi Bahini.

India intended to keep its troops in Bangladesh for an indefinite period but it was forced to withdraw the troops due to return of Sheikh Mujibur Rahman on January 10, 1972, who publically asked India to withdraw its troops from Bangladesh. Ex-President of India Late Zail Singh exposed Indian plans during an interview. Mr Singh said that the decision of withdrawing Indian troops was not judicious as it hampered India's Interests.

The original RAW plan to keep indian troops permanently in Bangladesh having failed, efforts were initiatedon other fronts to cripple sovereignty of the new state . RAW policy makers were that it was no longer easy to swallow a country by force. The traditional method of occupying a country is neither appreciable nor practicable. Now-a-days no occupation army gets world recognition. Rather it has to face world-wide condemnation and defamation.

But it does not mean that an expansionist bully will leave its aggressive zeal in the New World Order . Now to over run a country an aggressor cripples its citizens psychologically and reduces its economy to shambles to create such a situation that its citizens no longer possess mental strength and inspiration to be self- reliant.That country becomes a market of foreign goods having failed to develop its own resources. And ultimately the country becomes bankrupt and overburdened with foreign debt. The spontaneity, vigour and vitality of the people are wiped out and they loose their spirit to resist an invader. Though the country seems to be independent outwardly but psychologically and culturally its

Marfat.com

people are made subservient. They become imitative. Their cultural indentity and exclusiveness and their spirit of nationalism gradually die down. A day then comes when they fail to perceive the significance and necessity of protecting independence and sovereignty. RAW relentlessly has been endeavouring to create such a situation in Bangladesh.

With this end in view India wants to turn Bangladesh into a desert by withdrawing water of forty international rivers. The chakmas are instigated to snatch away Chttagong hill Tracts, the soul of Bangladesh . Efforts are made to infiltrate Indian secret agents under the cover of made to infiltrate Indian secret agent under the cover of 'Bangladesh' and push back. Educational institutions are made to cease work in order to drive away students to Indian educational institutions. Agents are engaged to help close the local mills and factories in the name of trade union movements. To create psychological insecurity Talpatti, Muhurichar, Nirmal Char and many other areas of Bangladesh territoty have already been taken away illegally and forcibly. BSF and indian killers are infiltrated into Bangladesh to hijach or kill Bangladesh citizens and plunder their belongings. Above all cultural and religious identity of 90% people of bangladesh is being eroded out by systematic attacks on Islamic values.

RAW side by side creates political instability and unrest through its agents .In such a situation people become reluctant, disgusted and disrespectful to the leadership of the country as they fail to ascertain the real friend and foe of the country. When this situation goes from bad to worse and the national leaders fail to ensure the security of life and property of the common people they themselves may invite foreign power on their soil as their saviour. Sikkim a Himalayan kingdom, went under the domination India through this process.

RAW is applying above technique in bangladesh more aggressively and systematically. RAW plans to throw bangladesh to the brink of such uncertainty and destruction by wiping out its cultural

Marfat.com

identity, crippling its economy, creating political impasse and instability so that the demand for indian intervention should rise from within bangladesh. To respond to such a so-called invitation India has prepared before hand the legal ground by compelling bangladesh to sign the 25 years peace and Friendship Treaty. In the meantime, RAW agents like Taslima Nasreen are propagating to wipe out the border of Bangladesh in order to merge with India. Indian intellectuals also do not feel ashamed to plead for re-unification of bangladesh is a test case to materialise its blue print of United India.

(ایضاً صفحہ 15 تا 21)

بھارت نے 6 دسمبر 1971ء کو بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا تھا۔ 16 دسمبر کو پاکستانی فوج نے ہتھیار ڈال دیے اور ایک محتاط اندازے کے مطابق 90 ہزار پاکستانی فوجی نیم فوجی اور سویلین بھارت کی قید میں چلے گئے اس ذلت آمیز شکست نے فوج میں بددلی پیدا کر دی تھی۔ مغربی پاکستان میں موجود فوجیوں اور نوجوان افسروں میں بغاوت کی سی کیفیت جنم لینے لگی تھی اور وہ اپنے شکست کے ذمہ دار جرنیلوں کے خلاف سراپا احتجاج ہو گئے۔ اس صورتحال کی کچھ تفصیلات لیفٹیننٹ جنرل گل حسن خان مرحوم نے اپنی آپ بیتی ''آخری کمانڈر انچیف'' میں بیان کی ہیں۔ جنرل گل حسن لکھتے ہیں:

''جب تک میری ذہنی صلاحیتیں وقت کے ساتھ مدھم نہیں پڑ جاتیں 19 دسمبر کا دن میری یادداشت میں ہمیشہ تازہ رہے گا۔ راولپنڈی میں وہ ایک روشن دن تھا مگر موسم ہماری اس افتاد میں شریک ہونے پر مائل نہیں تھا جو ہماری اپنی پیدا کی ہوئی تھی۔ اس روز جی ایچ کیو کی طرف گاڑی لے کر جانے کی خواہش اتنا مجبور کرنے والی نہ تھی جتنی کہ اچھے وقتوں میں ہوتی تھی۔ جو کچھ ہم نے اپنے ساتھ برتاؤ کیا تھا میں اس سے بری طرح افسردہ اور بددل ہو چکا تھا۔ دفتر میں پڑی جنگ بندی کی ناگزیر خلاف ورزیوں کی ان گنت فائلوں پر غور کرنا ہوگا۔ اس کی بنیاد 1965ء کی جنگ کے میرے تجربے کے نتیجے پر مبنی تھی لڑائی کے دوران غلط رپورٹیں ارسال کرنے کے باعث بھارتی، اپنے پہلے والے غلط دعوؤں کو ثابت کرنے کی خاطر، کھوئی ہوئی زمین کو حاصل کرنے کیلئے خطرناک حد تک حملے کریں گے۔ اس کے علاوہ ان فارمیشنوں کی طرف سے، جو ابھی تک لڑائی کی اپنی پوزیشنوں میں موجود تھیں، کثرت سے مطالبے موصول ہوں گے۔ کار کے اس تھوڑے سے سفر کے دوران میرے خیالات میں ہمارے جنگی قیدیوں کی قسمت کے بارے میں تشویش پیدا ہو گئی تھی۔ میں حد درجہ افسردہ تھا۔ اپنے ذہن میں ایسے خیالات کے ہجوم کے ساتھ میں نے غور کیا کہ چند لوگ جی ایچ کیو کی طرف جاتی کاروں کو صاف طور پر توہین آمیز نظروں سے دیکھ رہے تھے مجھے اپنے آپ پر ترس آ گیا۔

اپنے دفتر میں داخل ہوتے ہی میرے سٹاف آفیسر نے اطلاع دی کہ ابھی کچھ دیر بعد راولپنڈی گیریژن کے تمام آفیسروں کو سی او ایس خطاب کرے گا۔ اس خطاب کے پیش نظر کیا مقصد تھا مجھے معلوم نہ ہو سکا لیکن ایک پہلو جس پر مجھے کوئی شک نہ تھا کہ یہ کوئی آسان کام نہیں ہوگا جس کا جنرل حمید نے ابھی تک بیڑا اٹھایا تھا۔

Marfat.com

مقررہ وقت پر میں لیکچر ہال کی طرف چلا گیا جہاں میں نے ایک کھلے ہوئے دروازے میں سے آفیسروں کے مجمع کو خاموشی سے بیٹھے دیکھا، لیکن انہیں بے تابی سے سی او ایس کا منتظر پایا۔ میں نے اس کی آمد پر استقبال کیا اور اسے تقریر کرنے والے سٹینڈ تک پہنچا کر اگلی قطار میں ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا جو کچھ جنرل حمید نے کہا اس کا ایک لفظ بھی میں یاد نہیں کر سکتا۔ میں نے توجہ نہ دی کیونکہ جذباتی طور پر میں بہت پریشان تھا۔ دوسرے سامعین اسے بار بار ٹوک رہے تھے۔ مجمع تقریباً باغی ہو گیا تھا ایک دو مرتبہ سی او ایس نے شور کے باعث سٹیج چھوڑ دیا اور باہر اپنے حواس درست کرنے چلا گیا اور واپس آ کر پھر اپنا خطاب شروع کیا۔ میں نے منظم لوگوں کی کسی جماعت کی طرف سے ایسی کارکردگی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی لیکن میں نے انہیں ملامت نہ کیا، کیونکہ وہ بھی اضطرابی کیفیت میں مبتلا تھے۔ سامعین کا ایک مسلسل مطالبہ جو مبہم طور پر میں یاد کرتا ہوں یہ تھا کہ تمام آفیسر میسوں سے شراب کو ختم کر دینا چاہیے۔ اپنی مضطرب حالت میں، میں یہ سمجھ نہ سکا کہ شراب کی بندش ہماری گومگو کی صورتحال کو کیسے حل کرنے میں مدد دے گی، یا کسی ایسی مستقبل کی صورتحال میں جو ہماری اپنی پیدا کی ہوئی ہو۔ میرے خیالات آزادی سے قبل کے دنوں کی طرف چلے گئے۔ میرا خیال نہیں کہ جونہی انگریزوں نے اس برصغیر کی سرزمین پر قدم رکھا انہوں نے شراب پینا ترک کر دیا۔ وہ اپنے معاشرتی طور طریقوں پر کاربند رہے لیکن ملک کے بندوبست کو اپنی بہترین صلاحیت سے چلانے میں انہیں حائل نہیں ہونے دیا۔ اپنے دائرہ اختیار میں دور دراز دیہاتوں میں کیمپ لگا کر اور لوگوں کی شکایات صبر سے سن کر وہ انصاف کو لوگوں تک لے گئے۔ انہوں نے اپنے انتظامی علاقے کے لوگوں کی زبان سیکھنے کی زحمت گوارا کی تا کہ ان کی ضروریات کو بہتر طور پر سمجھا جا سکے۔

دوسری طرف ہم نے اس قسم کا کوئی کام مشرقی پاکستان میں نہیں کیا تھا۔ کسی بھی سول حاکم کو جو وہاں تعینات ہو گیا اسے بنگالی سیکھنے کی رائے دینا اس کے زیادتی کے مترادف تھا۔ ان سے گاؤں میں کیمپ لگانے کی توقع کرنا ان کی شان و شوکت کے خلاف تھا۔ حقیقت میں انہوں نے استعمار پسند نوآبادکاروں کی طرح کا انداز اختیار کر لیا تھا۔ مشرقی پاکستان میں سب سے پہلے چیف سیکرٹریوں میں یہ ایک سینئر سول آفیسر عزیز احمد تھا۔ اس نے ہمیشہ خود کو "دیسی لوگوں" Natives سے دور رکھنے کی کوشش کی۔ ہر دفعہ جب کسی بنگالی وزیر کو اس سے کسی مسئلے پر گفتگو کرنے کی ضرورت پیش آتی تو وزیر کو خود اس کے پاس جانا پڑتا تھا بجائے اس کے کہ وہ ملنے جاتا اور پھر وزیر پر یہ رعب ڈالنے کے لئے کہ وہ ایک دیو پیکر مجسمے کو ملنے آ رہا تھا، میٹنگ کا وقت پہلے سے مقرر ہونے کے باوجود بھی اسے انتظار کروایا جاتا تھا۔ ایک اور سابقہ چیف سیکرٹری، جس کا تعلق مغربی پاکستان سے تھا، مشرقی پاکستان میں افراتفری کے دوران تقریباً وسط جولائی میں مجھے ملنے آیا۔ اس کے ایک قریبی رشتے دار کو باغیوں نے قتل کر دیا تھا چونکہ مشرقی بازو سے کافی تعداد میں ہندو بھارت بھاگ گئے تھے اس لئے اس نے خواہش ظاہر کی کہ کسی ہندو کی کچھ جائیداد اس کے مرحوم رشتہ دار کے خاندان کو تقسیم کر دی جائے۔

میں ابھی تک اپنے سابقہ مشرقی پاکستان کے لوگوں کے ساتھ اپنی مجموعی بے اعتنائی پر غور کر رہا تھا جب مجھے اچانک احساس ہوا کہ سی او ایس کا خطاب خاتمے پر تھا۔ میں کھڑا ہو گیا اور اس کی کار تک اس کے ساتھ گیا اور پھر اس سے زیادہ الجھن میں مبتلا اپنی کار میں بیٹھ کر جی ایچ کیو واپس آ گیا۔ بعد دوپہر مجھے بتایا گیا کہ کرنل علیم آفریدی مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ وہ ایک اچھا افسر تھا اور 1965ء کی جنگ میں ہیڈ کوارٹر 4 کور آرٹلری میں بریگیڈ میجر کی حیثیت سے اس کی کارکردگی

Marfat.com

قابل داد تھی۔ جلد ہی اس کے ساتھ فون پر رابطہ قائم ہو گیا اور اس نے مجھے بتایا کہ گوجرانوالہ میں پروپس مشرقی پاکستان کے کھو جانے پر شدید طور پر بھڑک اٹھے تھے اور ان کا مطالبہ تھا کہ میں بذریعہ ہوائی جہاز وہاں پہنچ کر ان کی تسلی کروں۔ میں نے جواب دیا کہ میں جی ایچ کیو چھوڑ کر نہیں جا سکتا لہٰذا وہ اگر چاہے تو مجھے ملنے کے لئے آ جائے حالانکہ میں جانتا تھا کہ اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس دوران میں نے معلوم کیا کہ کرنل آفریدی آرمی کے شمالی ریزرو کا کرنل سٹاف تھا جس میں چھ آرمرڈ ڈویژن بھی ہمارے شمالی ریزرو میں شامل تھا۔

ایک گھنٹے یا اس سے تھوڑی دیر بعد آفریدی کو ایک آرمرڈ کور آفیسر کے ہمراہ، جو کرنل سٹاف آرمرڈ ڈویژن تھا، میرے دفتر میں لایا گیا۔ آفریدی نے یہ بھی بتایا کہ ٹروپس کی خواہش تھی کہ جنرل یحییٰ کو اقتدار سے دست بردار ہو جانا چاہئے۔ اس نے دوبارہ درخواست کی کہ میں گوجرانوالہ کا دورہ کروں میں نے آفریدی کو بتایا کہ گوجرانوالہ جانے کا میرا کوئی ارادہ نہ تھا لیکن میں دونوں ڈویژن کمانڈروں سے بات کروں گا۔ میں صرف میجر جنرل ایم آئی کریم، ایک مشرقی پاکستانی، سے ہی رابطہ قائم کر سکا جو 6 آرمرڈ ڈویژن بھی ہمارے شمالی ریزرو میں شامل تھا۔ اس نے تصدیق کی کہ ٹروپس مشرقی پاکستان کے کھو جانے سے رنجیدہ تھے اور ان میں بڑی بے چینی دکھائی دیتی تھی۔ پھر میں نے آفریدی کو مخاطب کر کے کہا کہ میں صدر کے پاس جا کر اس سے گفتگو کرنے کے لئے تیار تھا لیکن اس سے پہلے ہی صدر نے اقتدار سے دست بردار ہونے کی خواہش کا اظہار کر دیا تھا۔ مگر آفریدی اپنے شکوک میں مبتلا تھا میں خود گومگو کی حالت میں تھا اس لئے میں نے سوچا کہ میں ائیر مارشل رحیم خان کمانڈر انچیف پاکستان ائیر فورس کی رائے حاصل کروں گا۔ میری حالت زار کا سن کر وہ خود چلا آیا اور میں نے آفریدی کو کہا کہ وہ اسے حالات سے آگاہ کرے۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ چونکہ مسئلہ ایک سنجیدہ نوعیت کا تھا اس لئے صدر کو ضرور اس سے آگاہ کرنا چاہئے لیکن پہلے سی او ایس کو اعتماد میں لینا چاہئے اس لئے ہم سی او ایس کے گھر چلے گئے اور جو کچھ ہوا تھا میں نے اسے بتا دیا۔ اس نے چند سوال پوچھے اور بتایا کہ صدر سے ملاقات کے بارے میں ہمیں اس کے فون کا انتظار کرنا چاہئے۔ فون آ گیا اور ہم صدر کے پاس پانچ بجے شام پہنچ گئے۔ توقع کے مطابق سی او ایس پہلے ہی سے ہاں موجود تھا۔ میں نے صدر کو بعد دوپہر والے تمام واقعات تفصیل سے بیان کر دیئے۔ آخر میں اس نے مجھے یقین دلایا کہ جتنی جلدی اس کے لئے ممکن ہوا وہ اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کے سپرد کر دے گا اور یہ کہ اس نے اس کا اظہار پہلے ہی انگنت موقعوں پر کیا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ ٹروپس کی تسلی کیلئے ایک اور اعلان کرنے میں کوئی حرج نہیں ہوگا اس پر وہ جلد ہی مان گیا اور مجھے کہا کہ انفارمیشن سیکرٹری کو فون کر کے یہ بتا دیا جائے کہ وہ یہ خبر ریڈیو پر فوری طور پر مشتہر کرنے کا انتظام کرے۔

میں نے صدر کے قریب رکھے فون کو اٹھایا اور سیکرٹری سے رابطہ قائم کر کے اسے پیغام دیا۔ یہ سن کر اس نے پوچھا کہ میں کس جگہ سے بول رہا ہوں۔ اسے تسلی دینے کے لئے میں نے صدر سے درخواست کی کہ وہ اس سے بات کرے۔ جنرل یحییٰ خان نے فون لیا اور سیکرٹری کو بتایا ''میں نے گل کو بتایا ہے کہ فوری طور پر کیا اعلان کیا جائے۔ وہ تمہیں بتا دے گا''۔ میں نے اس پر عمل کیا۔ اعلان چند منٹوں میں نشر کر دیا گیا ہے۔ جبکہ ہم ابھی تک صدر کے ساتھ ہی تھے۔ ائیر فورس چیف اور میں اجازت لیکر چلے آئے۔ وہ اپنے ہیڈ کوارٹر چلا گیا اور میں اپنے دفتر آ گیا۔

میں نے دونوں کرنیلوں کو بلایا اور پوچھا کہ انہوں نے ریڈیو پر خصوصی اعلان سنا تھا۔ کرنل آفریدی نے جواب

Marfat.com

دیا کہ اس نے سنا تھا، لیکن یہ کافی نہ تھا اور یہ کہ مجھے بریگیڈیئر ایف بی علی کو فون کرنا چاہئے۔ میں نے پوچھا کہ وہ کیا بلا ہے۔ آفریدی نے جواب دیا کہ وہ کمانڈر آرٹلری تھا۔ میں نے اسے زور دیکر بتایا کہ مجھے ڈویژن کمانڈروں سے بات کرنا تھی اور اسے دفتر سے باہر نکل جانے کو کہا۔ اس پر وہ کچھ ہچکچایا لیکن جب اس نے محسوس کر لیا کہ میں مزید کسی قسم کی بیہودگی برداشت نہیں کروں گا تو اس نے فیصلہ کیا کہ اس کے حق میں بہتر یہی ہوگا کہ چلا جائے اور بغیر کسی رسمی آداب ولحاظ کے چلا گیا۔

سارا دن سوہان روح بنا رہا۔ دونوں کرنیلوں کی روانگی کے بعد میں نے مستقبل کی طرف کچھ اطمینان اور کام کرنے پر دھیان دیا۔ رات دس بجے ڈی ایم آئی نے مجھے گوجرانوالہ سے فون کیا۔ وہ ڈائریکٹر جنرل انٹر سروسز انٹیلی جنس کے ساتھ سی او ایس کی طرف سے وہاں بھیجا گیا تھا یہ معلوم کرنے کے لئے کہ وہاں دراصل کیا کچھ ہو رہا تھا۔ اس نے مجھے خبردار کیا کہ مجھے وہیں ٹھہرنا چاہئے جہاں میں تھا کیونکہ کچھ پراسرار قسم کی حرکات رونما ہو رہی تھیں۔ میں نے اس کی بے چینی دور کرتے ہوئے کہا کہ میرا ارادہ کہیں بھی جانے کا نہ تھا۔

رات تقریباً گیارہ بجے کام ختم کر کے میں جانے والا تھا کہ مجھے اطلاع دی گئی کہ بریگیڈیئر غلام محمد مجھ سے فوراً ملنا چاہتا ہے۔ میں غلام محمد کو کئی سالوں سے جانتا تھا۔ وہ ایک اچھا اور سچا انسان تھا اور ایک سولجر بھی۔ وہ اس وقت، کمانڈوز کی طرز پر ہمارے سپیشل سروسز گروپ (SSG) کو کمانڈ کر رہا تھا۔ وہ ہمیشہ ہشاش بشاش رہتا تھا لیکن جب وہ اندر آیا تو میں سمجھ گیا کہ وہ اپنے معمول کے انداز میں نہ تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے اسے سگریٹ یا چائے کی پیشکش کی البتہ ایسے مسائل پر گفتگو شروع کر دی جو میں نے سوچا اسے کچھ سکون دیں گے۔ جب وہ کسی قدر پرسکون ہو گیا تو میں نے اس سے پوچھا کہ اسے کونسی بات پریشان کر رہی تھی اس نے ایک حیرت انگیز انکشاف کیا جس پر میں آسانی سے یقین نہ کرتا اگر اسے بتانے والا غلام محمد نہ ہوتا۔ اس نے بتایا کہ ''کوئی ایک گھنٹہ قبل مجھے کوارٹر ماسٹر جنرل، جنرل مٹھا نے بلا بھیجا تھا۔ وہ میرے جوانوں کے ٹھکانے معلوم کرنے کیلئے بے قرار تھا اور جب میں نے ان کی نشاندہی کر دی تو جنگ کے دوران ان کی کارکردگی کے بارے میں اس نے اچھے تاثرات کا اظہار کیا اور پھر کہا کہ اس کی خواہش ہے کہ صدر، سی او ایس اور جی ایچ کیو کی حفاظت کے لئے جتنی جلدی ہو سکے ایس ایس جی کی ایک کمپنی کو راولپنڈی بھیج دیا جائے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ آیا ان کی آمد کے بارے میں سی جی ایس سے اجازت حاصل کی گئی تھی۔ (ایس ایس جی براہ راست سی جی ایس کے ماتحت آتی تھی)۔ اس نے جواب دیا کہ وہ وقت کے ساتھ حاصل کر لی جائے گی اور کسی قسم کا مسئلہ کھڑا نہیں ہوگا۔ پھر اس نے سرسری طور پر ذکر کیا کہ سی او ایس اس مسئلے کے بارے میں باخبر تھا اور اس کی فوری اہمیت کو تسلیم کرتا تھا۔ اس لئے ہدایات حاصل کرنے کے لئے کمپنی کمانڈر کو اس کے پاس بھیجنا چاہئے میں نے اظہار افسوس کیا کہ جب تک سی جی ایس کی طرف سے منظوری نہیں دی جاتی ایس ایس جی کا کوئی جوان بھیجا نہیں جا سکتا۔ اس نے میری طرف غصے بھری نگاہ ڈالی اور میں نے فیصلہ کیا کہ اس سے پہلے کہ کوئی بدمزگی رونما ہو جائے مجھے وہاں سے چلے جانا چاہئے''۔

میں نے غلام محمد کو کہا کہ اس نے وہی کچھ کیا تھا جو میں نے کیا ہوتا اگر میں اس کی جگہ ہوتا اول سی جی ایس کی حیثیت میں مجھے اس کی ضرورت کے بارے میں کوئی علم نہ تھا دوسرے مجھے ایس ایس جی کے استعمال کی متذکرہ شخصیات کی حفاظت کی خاطر ضرورت نظر نہیں آتی تھی اس لئے کہ ان کی حفاظت مناسب طور پر کی جا رہی تھی جبکہ جی ایچ کیو کو اس خاص

Marfat.com

قسم کی اعلیٰ طرز کی سکیورٹی کی ضرورت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اگر اسے اس قسم کا کوئی اور حکم ملتا ہے تو اسے پہلے میرے پاس آنا چاہئے اس پر غلام محمد کسی قدر مطمئن ہو کر میرے دفتر سے چلا گیا۔

پچاس کی دہائی میں جب ہمیں امریکی ملٹری امداد ملنی شروع ہوئی تو جنرل مٹھا ایس ایس جی کو وجود میں لایا تھا وہ خود کو اس یونٹ کا باپ تصور کرتا تھا۔ غلام محمد نے اس کے زیر کمانڈ سروس کی تھی۔ مٹھا ایک ہوشیار آدمی تھا۔ اہم جگہوں پر فائز افسروں کے ساتھ قریبی رابطے قائم رکھنے میں وہ ماہر تھا۔ وہ جنرل حمید کے ساتھ قریبی تعلقات رکھتا تھا اور اکثر اسے ''حم'' (HAM یعنی نام کا اول نصف) پکار کر ذکر کیا کرتا تھا۔ یہ ذکر کرنا مناسب ہوگا کہ جب مارچ 1971ء میں ڈھاکہ میں فوجی کارروائی شروع کی گئی تو سی او ایس کی ہدایت کے مطابق اسے وہاں بھیجا گیا تھا۔

اس شام صدر سے ہماری میٹنگ کے کچھ بعد، جیسا کہ اس کا معمول تھا، سی او ایس نے اپنے ہم نشینوں سے ملاقات کی جبکہ اس مجلس کا اہم ترین رکن مٹھا تھا۔ یہ عالی شان اجتماع باخبر تھا کہ ایک شدید قسم کی تبدیلی رونما ہونے والی تھی۔ اقوام متحدہ میں اپنے مشن کی تکمیل کے بعد بھٹو روم پہنچ گیا تھا جہاں سے اس نے مصطفیٰ کھر، بعد میں گورنر پنجاب، سے فون پر گفتگو کی اور پوچھا آیا اس کیلئے پاکستان واپس آنا خوف وخطرے سے خالی تھا۔ کھر نے ایئر مارشل رحیم خان سے رابطہ قائم کیا تھا جس نے وہ پیغام صدر کو پہنچا دیا۔ صدر نے اسے ہدایت کی کہ پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز کا ایک طیارہ بھٹو کو لانے کے لئے بھیجا جائے۔ یہ صورتحال سی او ایس کو معلوم تھی لیکن مجھے ایئر مارشل کی وساطت سے اس کے بارے میں چند روز بعد معلوم ہوا۔ مجھے معلوم نہیں کہ راولپنڈی میں ایس ایس جی سے کس قسم کے رول کی توقع رکھی گئی تھی لیکن میں صاف صاف بیان کر سکتا ہوں کہ ایک مقصد جس کی ایس ایس جی متحمل نہ تھی، وہ بھٹو کے لئے گارڈ آف آنر مہیا کرنا تھا اگر وہ ڈرامہ اسٹیج کر دیا جاتا تو اس نے ڈھاکہ میں ہمارے ملٹری ایکشن کی مہک کو پھر سے تازہ کر دیا ہوتا۔ آیا صدر اس منصوبے میں شامل تھا، میں اس کے بارے میں کچھ بتانے کی حیثیت میں نہیں۔

جنرل مٹھا اپنے زبردست اثر ورسوخ کے باعث اس سازش کو چلانے کیلئے خاص طور پر چنا گیا تھا کیونکہ وہ سی او ایس کا ہمراز تھا اور ایس ایس جی کے ساتھ اس کے ماضی کے تعلق کے باعث پُر اُمید طور پر سوچا گیا تھا کہ سی جی ایس کو جھانسا دیا جا سکے گا۔ بہر حال، جو کچھ بھی تیار کیا گیا تھا اس کا رخ پھیر دیا گیا تھا کیونکہ غلام محمد دھمکی سے مرعوب نہیں ہوا تھا۔

19 دسمبر 1971ء ایک ایسا دن تھا جسے میں کبھی بھی نہیں بھولوں گا۔ اپنی تمام سروس کے دوران یہ بدترین دن تھا جس کا میں نے تجربہ کیا تھا۔ آرمی کا ڈسپلن اچانک ٹوٹنے کے قریب تھا اور لاقانونیت کی ناگوار بو ہوا میں محسوس کی جا سکتی تھی۔ ماحول پہلے سے ہی خوف سے بھرپور تھا اور اگر یہ لاقانونیت نمودار ہو جاتی تو ابتری کو روکنے کیلئے کوئی بھی اتھارٹی نہ تھی۔ مصیبت میں مدد کا مخیرانہ رول ادا کرنے کیلئے اگر ایس ایس جی کی کمپنی کو استعمال میں لایا جاتا تو ہر حوالے سے یہ ایک عاقبت نا اندیشانہ کارروائی ہوتی، جس نے ملک کو گمنامی کے اندھیروں کی طرف دھکیل دینا تھا۔ یہ اندرا گاندھی کیلئے ایک انتہائی موزوں موقع ہوتا کہ وہ اپنے آخری منظر ''ساری خوشیاں پنڈت نہرو کے دل کیلئے'' کی تکمیل کر لیتی۔ (آخری کمانڈر انچیف صفحہ 406 تا 412)

Marfat.com

1972 تا 1978

یہ تھے وہ حالات جن میں ذوالفقار علی بھٹو نے زمامِ اقتدار سنبھالی وہ جنوری 1972ء میں کئی ممالک کے دورے پر نکلے اس دورے کا ایک ہی مقصد تھا کہ دنیا کے دیگر ممالک کو بنگلہ دیش کو ایک آزاد اور خودمختار ملک قبول کرنے سے روکا جائے کیونکہ بھارت کے اثر ورسوخ سے اب اور ملکوں نے بھی بنگلہ دیش کو تسلیم کرنا شروع کر دیا تھا۔ پاکستان اور بھارت کے سفارتی تعلقات اور روابط ختم ہو چکے تھے۔ بھارت کو اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ اگر پاکستان نے بنگلہ دیش کو تسلیم نہ کیا تو بھارت کی حیثیت ہمیشہ ایک مداخلت کار گھس بیٹھے جارح کی رہے گی صرف ایک ہی صورت تھی کہ پاکستان کے 90 ہزار قیدیوں کے مسئلے پر پاکستان کو بلیک میل کیا جائے بھارت نے فوراً ان جنگی قیدیوں کو بنگلہ دیش بھارت کی مشترکہ کمان سے منسلک کر کے انہیں بھارت منتقل کرنا شروع کر دیا تھا۔

دسمبر 1971ء کی جنگ میں مغربی پاکستان کے محاذ پر بھی بھارت کو پاکستان پر سبقت حاصل رہی خصوصاً بھارت نے آزاد کشمیر کے قریباً 391 مربع میل علاقے پر قبضہ کرلیا جبکہ پاکستان نے مقبوضہ کشمیر کے صرف قریباً 59 مربع میل علاقے پر قبضہ کیا تھا۔ 21 دسمبر 1971ء کو بھارتی وزیر خارجہ سورن سنگھ نے اعلان کیا کہ بھارت کشمیر میں جنگ بندی لائن کے دونوں اطراف کچھ ''معقولانہ تبدیلیوں'' کا خواہشمند ہے جبکہ یو این او کی 21 دسمبر کی قرارداد میں واضح کیا گیا تھا کہ دونوں ممالک کی افواج لڑائی سے پہلے زمانہ امن کی پوزیشنوں پر واپس آئیں گی بھارت یہ موقع ہاتھ سے کیسے جانے دیتا اس نے پاکستان پر دباؤ بڑھا کر مسئلہ کشمیر سے یو این او کے کردار کا ہمیشہ کیلئے خاتمہ کرنے کا منصوبہ بنالیا تھا اور یہ موقف اختیار کیا کہ 1949ء میں جنگ بندی لائن ختم ہو چکی ہے۔

▪▪▪▪

صاف دکھائی دے رہا تھا کہ بھارتی حکومت اس تاریخی موقعہ سے جو اُسے شومئی حالات سے میسر آ گیا ہے پورا پورا فائدہ اٹھانے اور ہمیشہ کے لئے مسئلہ کشمیر کو ختم کرنے کے درپے ہے۔ بھارتی وزیر دفاع جگ جیون رام کی طرف سے کنٹرول لائن کو بین الاقوامی سرحد قرار دینے کے بیان پر صدر بھٹو 14 مارچ 1972ء کو اپنے انٹرویو میں واضح کہا کہ کشمیریوں کو حق خودارادیت پاکستان یا بھارت نہیں بلکہ یو این او نے دیا ہے اور وہ کوئی ان سے واپس نہیں لے سکتا۔ انہوں نے جگ جیون رام کی طرف سے کنٹرول لائن کو مستقل سرحد بنانے کی تجویز رد کر دی۔

(روزنامہ ڈان 16 اپریل 1972ء بھٹو کا انٹرویو)

ابھی تک دونوں ممالک کے درمیان سفارتی تعلقات منقطع تھے البتہ دونوں اطراف سے بات چیت کی خواہش ظاہر کی جا رہی تھی اس مرحلے پر پاکستان میں موجود روسی سفارت خانے نے اہم کردار ادا کیا اور روسی سفارتخانے کے ذریعے پاکستان نے مصالحتی گفتگو کا آغاز کیا۔ (Pakistan Horizon Vol. XXXV, P. No.132)

Marfat.com

14اپریل 1972ء کو بھارتی وزیراعظم مسز اندرا گاندھی نے راجیہ سبھا سے خطاب میں کہا کہ پاکستان سے ان کا رابطہ قائم ہے اور بحالی تعلقات کا عمل بذریعہ گفتگو شروع ہو چکا ہے۔ 6اپریل 1972ء کو صدر بھٹو نے سرکاری طور پر اعلان کیا کہ انہیں مسز اندرا گاندھی کا دعوت نامہ مل گیا ہے اور بھارت حکومت پیشگی شرائط کے بغیر بات چیت کے لئے تیار ہے۔ 20اپریل کو پاکستانی دفتر خارجہ کے ترجمان نے بیان دیا کہ 26اپریل 1972ء کو پاک بھارت مذاکرات کا ایجنڈا طے کرنے کے لئے دونوں ممالک کے نمائندے ملاقات کر رہے ہیں۔

(Pakistan Horizon Vol XXV No.2.1972. P-90, 92)

26اپریل کو بھارتی وفد نے ڈی پی دھر جو بھارتی وزارت خارجہ کی پالیسی ساز کمیٹی کے چیئرمین تھے کی قیادت میں مری میں پاکستانی وفد جس کی سربراہی وزارت خارجہ کے سیکرٹری جنرل عزیز احمد کر رہے تھے سے مذاکرات شروع کیے۔ پاکستان کی خواہش تھی کہ جنگی قیدیوں کا معاملہ مسئلہ کشمیر پہلے زیر بحث لائے جائیں جبکہ بھارت جو اس وقت بلیک میلنگ کے موڈ میں تھا دونوں مسائل بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے سے مربوط کر رہا تھا۔ عین اس مرحلے پر جب بھارتی وفد واپس جانے کی تیاریاں کر رہا تھا صدر بھٹو کی مداخلت سے خطرہ ٹل گیا۔ صدر بھٹو نے عندیہ دیا کہ وہ مسئلہ کشمیر پر بھی بات چیت کریں گے مشترکہ اعلامیہ جاری ہوا جس کی عبارت بڑی مبہم سی تھی اس سے کچھ کھل کر سامنے نہیں آ رہا تھا بس اتنا علم ہوا کہ دونوں ممالک کے درمیان مئی کے آخر یا جون کے آغاز میں مذاکرات ہوں گے لیکن مسٹر بھٹو کے 29 مئی سے شروع ہونے والا تیرہ روزہ دورہ مشرق وسطیٰ اور افریقہ اور مسز اندرا گاندھی کے 13 جون سے شروع ہونے والے سویڈن، چیکوسلواکیہ اور ہنگری کے دوروں کے باعث مذاکرات کا آغاز 28 جون کو بھارت کے سرمائی مقام شملہ میں ہوا۔ بھارت کی حتی الوسع یہی کوشش رہی کہ صورتحال کو اپنے حق میں استعمال کرتے ہوئے اس مرحلے پر مسئلہ کشمیر کا ٹنٹنا ہمیشہ کیلئے ختم کر دے۔ بھارت نے 1949ء کی جنگ بندی لائن کو غلط قرار دیا اور دسمبر 1971ء میں جموں کشمیر کے جن علاقوں پر قابض ہوا تھا انہیں سرحد قرار دینے پر اصرار کرنے لگا۔ خیال رہے کہ بھارت ڈی پی دھر کے ذریعے صدر بھٹو کو یہ پیغام پہنچا چکا تھا کہ اگر وہ اپنے قیدیوں کی رہائی اور پائیدار امن چاہتا ہے تو کشمیر کو بھول جائے۔

(India's Policy Towords Pakistan -57 اس تاداکرجی صفحہ)

مذاکرات کی تاریخ کا تعین ہو چکا تھا جب بھارتی فوج نے کشمیر محاذ پر ایک اہم سٹریٹجک پوائنٹ پر قبضہ کرنے کیلئے ٹیٹوال سیکٹر میں پاکستان پر حملہ کیا لیکن جوابی حملے میں بھارت اپنی دو اہم پوسٹیں گنوا بیٹھا اور 6 مئی کو وادی لیپا سے پاکستان نے بھارتی فوجوں کو نکال باہر کیا۔ حالات کشیدہ ہو گئے۔ پاکستانی فوجی غصے میں بھرے تھے اور 1971ء کی ہزیمت کا بدلہ چکانے کی کوئی بھی قیمت ادا کرنے پر تلے ہوئے تھے لیکن حکومت نے اس صورتحال کو بڑی دانشمندی سے کنٹرول کر لیا۔ بھارت نے حسب معمول "کچھ شرارتی عناصر" کا واویلا کیا جو پاک بھارت تعلقات میں بہتری نہیں چاہتے۔ صدر بھٹو نے اس مرحلے پر پاکستان کے تمام اپوزیشن لیڈروں، مختلف طبقہ ہائے زندگی کی اہم شخصیات سے مذاکرات کئے اور حسب روایت ایک پُر جوش تقریر کر کے عازم شملہ ہوئے انہوں نے روانگی پر اپنی تقریر میں قوم کو اعتماد دلایا کہ وہ پاکستان کی سالمیت کی قیمت پر کوئی سمجھوتہ نہیں کریں گے اور صرف اصولوں کی بنیاد پر ہی بات چیت ہوگی اس

Marfat.com

لئے ساتھ ہی انہوں نے مغربی پاکستان میں گرفتار بھارتی جنگی قیدیوں کو رہا کرنے کی پیشکش کر دی۔ 13 جون کو مسز اندرا گاندھی نے اس سربراہ کانفرنس سے بہتر توقعات وابستہ کرنے کی خواہش کا اظہار کیا اور 26 جون کو کہا کہ وہ ایک ''فاتح'' کی حیثیت سے پاکستانی صدر سے مذاکرات نہیں کر رہیں۔ انہوں نے امید ظاہر کی کہ سربراہی مذاکرات سے پاکستان اور بھارت کے تعلقات میں بہتری آئے گی اور یہ ایک اچھا آغاز ہوگا۔ (ٹائمز آف انڈیا۔ 27 جون 1972ء)

28 جون 1972ء کو پاکستانی صدر ذوالفقار علی بھٹو اور بھارتی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے درمیان مذاکرات کا آغاز شملہ میں ہوا ان مذاکرات میں پاکستانی صدر کی حیثیت بہر طور ایک ہارے ہوئے ملک کے سربراہ کی سی تھی جبکہ مسز اندرا گاندھی فتح کے نشے سے سرشار اور دو قومی نظریے کو بحیرہ ہند میں ڈبونے کی دعوے دار بن کر مذاکرات میں شرکت کر رہی تھیں۔ بھارت کا رویہ 16 دسمبر کے بعد سے بہت متکبرانہ ہو گیا تھا وہ پاکستان کو ایک شکست خوردہ ملک سے زیادہ حیثیت دینے کیلئے تیار نہیں تھا۔

پاکستانی وفد کی نفسیاتی حالت بھی کچھ ڈھکی چھپی نہیں تھی کتنے ہی مضبوط اعصاب کے لوگ ہوں لیکن وہ ایک ایسے ملک کی نمائندگی کرنے جا رہے تھے جس کے 90 ہزار قیدی بھارت میں موجود تھے اور جنہوں نے دنیا کا سب سے بڑا سرنڈر کیا تھا۔ یہ تھے وہ حالات جن میں دونوں ممالک کے وفود ایک دوسرے سے مذاکرات کرنے جا رہے تھے۔ بھارت جو آج تک ''پہلے چھوٹے مسائل'' کا راگ الاپتا رہا تھا، پہلی مرتبہ مسئلہ کشمیر کی بات کی تھی۔

پاکستان چاہتا تھا کہ ایک ایک قدم آگے بڑھا جائے اور کشمیر کے مسئلہ سے پہلے علاقوں سے فوجوں کے انخلا اور جنگی قیدیوں کی واپسی کے مسائل حل کئے جائیں۔ فریقین اسی قضیئے میں اُلجھ کر رہ گئے۔ وہ اپنے اپنے موقف پر جمے رہے اور کانفرنس میں تعطل پیدا ہو گیا۔ ان طویل، سرگرم اور پیچیدہ مذاکرات میں کشمیر، جنگی قیدیوں، سرحدوں سے فوجوں کی واپسی، بنگلہ دیش، سفارتی اور تجارتی تعلقات پر کھل کر بحث ہوئی۔ یکم جولائی کو مسز اندرا گاندھی نے بھی یہ خدشہ ظاہر کر دیا کہ وہ اس کانفرنس کے نتائج کے بارے میں پر امید نہیں۔ جب دونوں وفود میں روایتی بات چیت ناکام ہو گئی تو 2 جولائی کو بھٹو نے پریس کانفرنس میں کہا کہ بدقسمتی سے ڈیڈ لاک ہے۔ لیکن اسے دور کرنے کے لئے آخری لمحے پر کوشش جاری ہے۔ ہم کامیاب نہیں ہوئے لیکن ہم ناکام بھی نہیں رہے۔ پاکستان گفت و شنید کا دروازہ بند نہیں کرے گا۔

(اسی تا وا مکر جی صفحہ 6)

اسی روز آخری لمحے حسب دستور جب خدا حافظ کہنے کی رسم کے لئے دونوں سربراہ اکٹھے ہوئے تو بقول صدر بھٹو انہوں نے اندرا گاندھی سے کہا ''اگر ہم ناکام ہو گئے تو دنیا ہمارے بارے میں کیا سوچے گی۔ تاریخ ہمارے متعلق کیا فیصلہ دے گی۔ ہم گزشتہ 25 برس سے باہم لڑ جھگڑ رہے ہیں۔ ہم میدان جنگ میں لڑے ہیں۔ ہم اقوام متحدہ میں ایک دوسرے سے دست و گریبان ہوئے ہیں۔ ہم ہر میدان میں جھگڑے اور اپنے ذرائع تشہیر میں انہیں اچھالتے رہے۔ دنیا کب تک ہمیں ایک دوسرے پر وار کرتے دیکھنا برداشت کرے گی۔ کسنجر پیکنگ کا دورہ کر سکتے ہیں۔ وہ ماسکو میں جا سکتے ہیں اور سالٹ مذاکرات ہو سکتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ہم کتنے ہی محدود دائرے میں کیوں نہ ہوں، کوئی سمجھوتہ، تفصیلات میں جائے

Marfat.com

بغیر کیوں اختیار نہیں کر سکتے۔کیا ہم میں وہ عقل، خواہش اور دور اندیشی نہیں جو یہ اعلان کرنے کے لئے ضروری ہوتی ہے کہ ہم اپنے مسائل کو حل کرنا چاہتے ہیں اور اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ہمیں اپنے اس دعوے کو پیش نظر رکھنا ہوگا کہ ہم ایک عظیم تہذیب کے وارث ہیں، ہماری بالا قامت شخصیتوں میں اشوک، اکبر اور اورنگزیب جیسے لوگ ہیں۔ موہنجوداڑو ہے اور ہڑپہ ہے۔ان سب باتوں کے پس منظر میں ہمیں اس عمل کو یاد رکھنا چاہئے کہ ہمارا طرز عمل وحشیانہ ہے۔ہمیں اس بات پر اتفاق کر کے چلنا چاہئے کہ ہم متفق نہیں۔اگر ہم سرکاری طور پر اعلان کر دیں گے کہ ہم اپنی اپنی موجودہ پوزیشن کو متاثر کئے بغیر مذاکرات کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو اس دائرے میں کسی طور نہ کوئی آپ کو نقصان پہنچ سکتا ہے اور نہ ہی ہمیں کوئی فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔اگر ہم کنکر اور گرد کے ہر ذرے کے پیچھے بھاگتے رہے تو ہم ہوا کو اس وقت اس حد تک صاف نہیں کر سکتے جس حد تک ہم اسے صاف کرنا چاہتے ہیں۔ جب تک ہم سانس بند کر کے اس میں چھلانگ نہ لگا دیں۔ بہر حال صورتحال تو یہی ہے کہ جب ہم سانس لیتے ہیں ملاوٹ کا کچھ نہ کچھ حصہ ہمارے اندر جاتا ہے۔ بین الاقوامی معاملات میں بھی تاریخ میں کئی بار ہمیں نقصان کا کوئی نہ کوئی احتمال تو قبول کرنا ہی پڑتا ہے اور ان چھوٹے موٹے اختلافات کو زیادہ اہمیت والے سمجھوتوں پر اثر انداز ہونے سے بچانے کے لئے اپنے موقف میں تبدیلی کرنی پڑتی ہے اگر دونوں میں کوئی فریق بھی آگے پیچھے یا دائیں بائیں ہٹنا نہ چاہے تو پھر مذاکرات کس لئے۔اگر ہم اپنے تعلقات میں معقول تبدیلی لانے کی خواہش مند ہیں تو آیئے ہم دنیا پر واضح کر دیں کہ ہم ایک عمومی سمجھوتہ کرنے کی طرف پہلے سے مائل ہیں۔(فارن پالیسی ان ریسکیو: بینظیر بھٹو صفحہ 41)

بھٹو نے اندرا گاندھی پر زور دیا کہ اگر وہ برصغیر میں دیرپا امن قائم کرنے میں کامیاب ہوگئیں تو وہ عالمی مدبر کے طور پر ابھریں گی اور ان کا شمار علاقائی سے بڑھ کر عالمی شخصیات میں ہوگا۔تاریخی پس منظر میں قائم کردہ اس منطق سے مسز اندرا گاندھی بہت متاثر ہوئیں چنانچہ دونوں لیڈروں نے الوداعی ضیافت کے بعد بات چیت پھر شروع کی۔یہ بات چیت بھٹو اور مسز اندرا گاندھی میں علیحدگی میں اور قریباً چلتے ہوئے کی تھی۔ان کی یہ آخری کوشش کامیاب ثابت ہوئی اور آئندہ تعلقات کے بارے میں 2 جولائی کو صدر بھٹو اور وزیراعظم اندرا گاندھی کے مابین سمجھوتہ ہو گیا۔مسز اندرا گاندھی اور بھٹو رات گئے تک اپنے اپنے مشیروں سمیت سمجھوتہ کی تفصیلات کو آخری شکل دینے کیلئے مشورہ کرتے رہے اور بعد از اں دونوں رہنماؤں نے ایک ساتھ اس پر دستخط کر دیئے جبکہ قریب قریب ہر شخص کو سربراہ کانفرنس کی ناکامی کا یقین ہو چکا تھا۔ سمجھوتہ اتنی تاخیر سے اور اتنا اچانک ہوا کہ معاہدے کی تصحیح شدہ نقل تیار کرنے کیلئے کوئی ٹائپ رائٹر موجود نہ تھا۔حکومت پاکستان کی مہر بھی موجود نہ تھی کیونکہ اسے ایسے تمام سامان کے ساتھ چنڈی گڑھ بھیجا جا چکا تھا جسے شملہ سے ہیلی کاپٹر پر ساتھ لے جانا مطلوب نہ تھا چونکہ اس معاہدے پر حکومت پاکستان کی مہر نہ لگائی جا سکی اس لئے بھارت نے بھی اپنی مہر نہ لگائی۔

شملہ معاہدہ ایک ابتدائیہ، تین حصوں اور تیرہ شقوں پر مشتمل ہے۔

Marfat.com

شملہ معاہدہ (2 جولائی 1972ء):

بھارت اور پاکستان کی حکومتیں یہ فیصلہ کرتی ہیں کہ دونوں ممالک اس تصادم اور محاذ آرائی کو ختم کر دیں گے جس کی وجہ سے ان کے تعلقات خراب رہے ہیں اور آپس میں دوستانہ اور خوشگوار تعلقات کو فروغ دینے اور برصغیر میں پائیدار امن قائم کرنے کیلئے کام کریں گے تاکہ دونوں ملک آئندہ اپنے وسائل اور توانائیاں اپنے عوام کی صلاح و بہبود کے اشد ضروری کاموں پر صرف کر سکیں۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے بھارت اور پاکستان کی حکومتیں اس بات پر رضامند ہوگئی ہیں کہ:

1: دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات منشور اقوام متحدہ کے اصولوں اور مقاصد کی روشنی میں استوار ہوں گے۔

2: دونوں ملک یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے باہمی اختلافات گفت وشنید یا کسی ایسے پُرامن طریقے سے جس پر ان کے درمیان اتفاق رائے ہو گیا ہو۔ پُرامن طور پر طے کریں گے۔ دونوں ملکوں کے درمیان تنازعات کا آخری تصفیہ ہونے سے قبل کوئی بھی فریق یکطرفہ طور پر صورتحال کو تبدیل نہیں کرے گا اور دونوں فریق کسی ایسے اقدام کی تنظیم، اعانت یا حوصلہ افزائی کا سدباب کریں گے جس کا پُرامن اور خوشگوار تعلقات برقرار رکھنے پر مضر اثر پڑ سکتا ہے۔

3: دونوں ملکوں کے درمیان مصالحت، اچھے ہمسایوں کے سے تعلقات اور پائیدار امن کی بنیادی شرط پر دونوں فریقین کا یہ عہد ہے کہ وہ پُرامن بقائے باہمی، ایک دوسرے کی علاقائی سالمیت اور خودمختاری کے احترام اور برابری اور باہمی مفاد کی بنیاد پر ایک دوسرے کے معاملات میں عدم مداخلت کے اصولوں کی پابندی کریں گے۔

4: ان بنیادی تنازعات اور تصادم کے اسباب جن کی وجہ سے دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات گزشتہ 25 سال سے خراب ہیں، پُرامن طریقوں سے طے کیا جائے گا۔

5: ایک دوسرے کے قومی اتحاد، علاقائی، سالمیت، سیاسی آزادی اور خودمختارانہ برابری کا احترام کریں گے۔

6: منشور اقوام متحدہ کے مطابق ایک دوسرے کی علاقائی سالمیت یا سیاسی آزادی کے خلاف طاقت کے استعمال کی دھمکی سے پرہیز کریں گے۔

دونوں حکومتیں ایک دوسرے کے خلاف معاندانہ پروپیگنڈا روکنے کی ہر ممکن کوشش کریں گی اور ایسی معلومات کی ترویج کی حوصلہ افزائی کریں گی جس سے دونوں ملکوں کے درمیان دوستانہ تعلقات کو فروغ حاصل ہو۔

دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات کو بتدریج بحال کرنے اور معمول پر لانے کے لئے یہ طے پایا کہ:

1: مواصلات، ڈاک وتار، بحری اور خشکی کے راستے سفر، جن میں سرحدی چوکیاں بھی شامل ہیں اور فضائی پروازیں، جن میں ایک دوسرے کے علاقے کے اوپر سے گزر کر جانا بھی شامل ہے، بحال کرنے کے لئے اقدامات کئے جائیں گے۔

2: دوسرے ملک کے باشندوں کے لئے سفر کی سہولتوں کو فروغ دینے کے مقصد سے مناسب قدم اٹھائے جائیں گے۔

3: جہاں تک ممکن ہوگا تجارت اقتصادی اور دوسرے متفقہ میدانوں میں تعاون بحال کیا جائے گا۔

4: سائنس اور ثقافت کے میدانوں میں تبادلوں کو فروغ دیا جائے گا۔

Marfat.com

اس سلسلے میں ضروری تفصیلات طے کرنے کیلئے دونوں ملکوں کے وفود وقتاً فوقتاً ملاقاتیں کریں گے۔

پائیدار امن کے قیام کے عمل کو شروع کرنے کیلئے دونوں حکومتیں اس بات سے اتفاق کرتی ہیں کہ:

1: بھارتی اور پاکستانی فوجیں بین الاقوامی سرحد پر اپنے اپنے علاقوں میں واپس چلی جائیں گی۔

2: جموں وکشمیر میں 17 دسمبر 1971ء کی جنگ بندی کے نتیجے میں جو کنٹرول لائن وجود میں آئی ہے۔ دونوں فریق اپنے مسلمہ موقف کے باوجود اس کا احترام کریں گے۔ کوئی فریق اپنے اختلافات اور قانونی توضیحات میں فرق کے باوجود اسے یکطرفہ طور پر تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ دونوں فریق یہ بھی عہد کرتے ہیں کہ وہ اس کنٹرول لائن کی خلاف ورزی میں طاقت کے استعمال یا اس کے استعمال کی دھمکی سے پرہیز کریں گے۔

3: اس معاہدے کے نافذ العمل ہوتے ہی فوجوں کی واپسی کا سلسلہ شروع ہو جائے گا اور اس کے بعد کوئی تیس دن کے اندر مکمل ہو جائے گا۔

دونوں ملک اپنے اپنے آئینی طریق کار کے مطابق اس معاہدے کی توثیق کریں گے اور یہ معاہدہ اس تاریخ سے نافذ العمل ہو جائے گا جس تاریخ کو اس کی توثیق کی دستاویزات کا تبادلہ عمل میں آ جائے گا۔

دونوں حکومتیں اس بات سے اتفاق کرتی ہیں کہ ان کے سربراہ مستقبل میں مناسب وقت پر پھر ملیں گے اور دریں اثنا فریقین کے نمائندے پائیدار امن کے قیام، تعلقات کو معمول پر لانے جس میں جنگی قیدیوں اور زیر حراست شہریوں کی واپسی بھی شامل ہے۔ جموں وکشمیر کے آخری تصفیے اور سفارتی تعلقات کی بحالی کے سوالات پر غور وخوض کرنے کیلئے ملاقات کریں گے۔

دستخط (ذوالفقار علی بھٹو)
صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان
دستخط (اندرا گاندھی)
وزیر اعظم جمہوریہ بھارت

یہ طے شدہ بات ہے کہ پاکستان نے اس معاہدے میں کم از کم اپنا ایک ٹارگٹ حاصل کر لیا تھا اور اسے امید تھی کہ جلد ہی بھارت پر جنگی قیدی رہا کرنے کیلئے دباؤ آئے گا جو اسے رہا کرنے پڑیں گے۔ پاکستان میں اس پر ملا جلا ردعمل ہوا۔

پاکستان کے بعض قومی حلقوں کی طرف سے یہ کہا گیا کہ یہ معاہدہ اعلان تاشقند سے بدتر ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ پاک بھارت معاہدہ اعلان تاشقند کا چربہ ہے۔ اعلانِ تاشقند کے مطابق ایک نئی جنگ بندی لائن کو مستقل پوزیشن دے دی گئی ہے۔ اس طرح جنگی قیدیوں کا مسئلہ بھی زیر بحث نہیں لایا گیا۔ شملہ معاہدہ آج تک متنازعہ سمجھا جاتا ہے۔ بھارت نے پاکستان سے یہ بھی تسلیم کرا لیا کہ باہمی تنازعات کسی اور پارٹی کی مداخلت کے بغیر دوطرفہ طور پر طے کئے جائیں گے۔ یہ بھی معاہدہ تاشقند سے بہتر صورت تھی کیونکہ معاہدہ تاشقند تو روسی قائدین کی عدم موجودگی میں عالم وجود میں ہی نہ آتا۔ بہرحال جس حالت میں پاکستانی وفد بھارت گیا اس میں یہ معاہدہ غنیمت تھا۔ بھارت میں سوائے جن سنگھ اور کمیونسٹ

Marfat.com

پارٹی کے ایک گروپ کے باقی تمام جماعتوں نے شملہ معاہدہ کی حمایت کی۔

شملہ معاہدہ ہماری ملّی تاریخ کا ایک انتہائی متنازعہ موضوع ہے۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو نے دراصل اس معاہدے کے ذریعے کشمیر کی موجودہ سرحدوں کو بین الاقوامی سرحدیں تسلیم کر لیا ہے جبکہ صورت حال ذرا مختلف ہے۔ شملہ معاہدے کے نتیجے میں پاکستان کے 93 ہزار جنگی قیدی رہا ہو گئے اور وقتی طور پر پاکستان کو یہ فائدہ ہوا کہ جنگ سے تباہ شدہ ملک کی تعمیر نو کا وقت حاصل ہو گیا البتہ اس معاہدے کے مسئلہ کشمیر پر نہایت منفی اثرات مرتب ہوئے۔ بھارت نے معاہدہ کے فوراً بعد ہی عالمی سطح پر یہ تاثر دینا شروع کر دیا کہ اس معاہدے کے نتیجہ میں مسئلہ کشمیر کی بین الاقوامی حیثیت ختم ہو گئی ہے اور اب یہ ایک علاقائی تنازعہ ہے۔ کیونکہ معاہدے کی پہلی شق ہی یہ واضح کرتی ہے کہ اب دونوں ممالک تصادم اور محاذ آرائی کو دور کر کے دوستانہ تعلقات قائم کریں گے اور اپنے وسائل اور توانائیاں عوام کی فلاح و بہبود پر خرچ کریں گے۔

1948ء میں جنگ بندی کے بعد دونوں ممالک کے درمیان اقوام متحدہ کی قراردادوں کی روشنی میں سیز فائر لائن طے کی گئی تھی۔ مگر اس معاہدے میں سیز فائر لائن کا تذکرہ ہی نہیں کیا گیا بلکہ کنٹرول لائن کی نئی اصطلاح متعارف کروائی گئی۔ سیز فائر کے الفاظ کشمیریوں کی جنگِ آزادی میں، حالت جنگ کی عارضی عدم موجودگی کی نشاندہی کرتے تھے جبکہ کنٹرول لائن کا مطلب یہ ہوا کہ فی الحال بھارتی قبضے کو تسلیم کر لیا جائے۔ لہٰذا یہ صرف نام ہی کی تبدیلی نہیں تھی بلکہ بھارت کے پروپیگنڈے کے ذریعے کنٹرول لائن عملاً دونوں ممالک کے درمیان بین الاقوامی سرحد بن گئی۔ اس معاہدے میں پاک بھارت تنازعے کے اصل فریق کشمیریوں کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا۔ حالانکہ اقوام متحدہ اپنی قراردادوں میں کشمیریوں کو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق دے چکی ہے۔ یہاں کشمیریوں کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق دونوں ممالک کے سربراہان حکومت کو دے دیا گیا اسی لئے کشمیریوں کی قیادت نے اس معاہدے کو یکسر مسترد کر دیا۔ معاہدے کے تحت دونوں ممالک کو پابند کیا گیا کہ وہ باہمی تنازعات کو دوطرفہ مذاکرات کے ذریعے حل کریں گے اور انہیں کسی بین الاقوامی فورم پر نہیں لے جائیں گے۔

اس معاہدے میں طے کیا گیا ہے کہ دونوں ممالک کے ذرائع ابلاغ ایک دوسرے کی خلاف پروپیگنڈا نہیں کریں گے۔ اس معاہدے سے بھارت کو اسٹریٹجی کے نقطہ نظر سے کچھ فوائد ضرور حاصل ہوئے۔ مشرقی پاکستان کا الگ ہو جانا پاکستان کیلئے ہی نہیں عالم اسلام کے لئے بھی ایک بڑا سانحہ تھا۔ پاکستانی افواج نے 1965ء کی لڑائی میں عالم اسلام میں اپنا ایک زبردست امیج بنا لیا تھا اور عالمی سطح پر بھی پاکستان کی عسکری قوت کو تسلیم کیا جانے لگا تھا۔ تجزیہ نگار اس نکتہ پر قریباً متفق دکھائی دیتے ہیں کہ 1965ء کی جنگ پاکستانی فوج نے اسلحہ نہیں بلکہ جذبہ ایمانی کے بل پر جیتی تھی۔ پاکستانی عوام نے کبھی یہ تصور بھی نہیں کیا تھا کہ بھارت مشرقی پاکستان پر اتنی آسانی سے قابض ہو جائے گا لیکن تاریخ کا پہیہ چل گیا تھا ہماری سیاسی اور عسکری بداعمالیاں رنگ لے آئی تھیں اور قائداعظم کا پاکستان دولخت ہو چکا تھا۔

مسز اندرا گاندھی نے ''نظریہ پاکستان'' کو سمندر میں غرق کرنے کی بڑ ہانک دی تھی اور ساری قوم ایک جذباتی صدمے سے گزر رہی تھی۔ اس شکست نے ہماری خارجہ پالیسی پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ بیرونی دنیا میں ہمارے وقار کو

Marfat.com

ٹھیس لگی۔ متعدد ممالک کے ساتھ پاکستان کے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ پاکستان دنیا میں سب سے زیادہ پٹ سن پیداوار کرنے والا ملک سمجھا جاتا تھا جس کے ذریعے ہمیں خاصا زرمبادلہ بھی ملا کرتا تھا۔ مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بن جانے کی وجہ سے پاکستان اس سے محروم ہو گیا اور اس طرح اس کی اقتصادی حالت پر بُرا اثر پڑا۔ آبادی کے لحاظ سے پاکستان کا شمار (اسلامی دنیا میں) پہلے نمبر پر ہوتا تھا لیکن اس کی علیحدگی کی وجہ سے اسلامی دنیا میں اس کا شمار انڈونیشیا اور بنگلہ دیش کے بعد تیسرے نمبر پر ہونے لگا۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد حکومت پاکستان نے مشرق اور جنوب مشرقی ایشیا کے علاقے کے ساتھ تعلقات اور خارجہ پالیسی میں انقلابی تبدیلیاں کیں کیونکہ ایسا کرنا ناگزیر تھا وگرنہ اس کے دوسرے حصے کی سلامتی بھی خطرے میں تھی۔ پاکستان نے سیٹو اور سنٹو سے علیحدگی اختیار کر لی اور عوامی جمہوریہ شمالی ویت نام، عوامی جمہوریہ کوریا اور کمبوڈیا کی نیشنل یونین کی حکومتوں کو تسلیم کر لیا اور دولت مشترکہ سے علیٰحدگی اختیار کر لی۔ پاکستان نے روس کے ساتھ بہتر تعلقات قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ نیپال اور برما پاکستان کے قریبی ہمسایہ ملک تھے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد وہ پاکستان کے ہمسائے نہ رہے اور اس طرح جغرافیائی اعتبار سے پاکستان دو ہمسایوں کی حمایت سے محروم ہو گیا۔ افریقہ کے ساتھ پاکستان کے رابطوں کا دائرہ وسیع کرنے کیلئے حکومت پاکستان نے نئے سفارتخانے قائم کئے یہ سفارت خانے کوناکری (گنی) کنشاسا (زائرے) اور ماپوتو (موزنبیق) میں کھولے گئے۔ پاکستان اور چین کے مابین تعلقات کو مزید مستحکم بنانے کیلئے شاہراہ ریشم کی تعمیر عمل میں لائی گئی۔ مشرقی پاکستان کی علیٰحدگی کے بعد پاکستان خود کو بھارت کے مقابلے میں کمزور محسوس کرنے لگا۔ چنانچہ اس نے اپنے دفاع کیلئے مزید اقدامات کئے۔ مشرقی پاکستان کی علیٰحدگی کے باعث پاکستان کے 93000 فوجی اور سویلین بھارت میں جنگی قیدی بنا لئے گئے۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کی وجہ سے پاکستان کا اربوں روپے کا سرمایہ مشرقی پاکستان میں ہی رہ گیا جس سے پاکستان کی معیشت بُری طرح متاثر ہوئی۔ نیوزی لینڈ، آسٹریلیا اور برطانیہ نے 30 جنوری 1972ء کو بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا چونکہ یہ ممالک دولت مشترکہ کے بانی رکن تھے اس لئے احتجاج کے طور پر پاکستان نے دولت مشترکہ سے علیٰحدگی اختیار کر لی۔ 1971ء کے بحران میں جس کے نتیجہ میں پاکستان تقسیم ہوا ان ملکوں نے پاکستان کے ساتھ جو ہمدردی کی اس کی وجہ سے پاکستان کا دوسرا بازو محفوظ ہو گیا۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کی وجہ سے پاکستان کے دوستوں اور دشمنوں میں تمیز کرنا کچھ مشکل نہ رہا۔ پاکستان نے سقوطِ مشرقی پاکستان کی وجہ سے رونما ہونے والے واقعات کے نتیجے میں بھارت سے شملہ میں فوری مذاکرات کئے جس کے نتیجے میں مغربی پاکستان کے محاذ سے دونوں ملک دسمبر 1972ء تک اپنی فوجیں بین الاقوامی سرحدوں پر لے آئے اور ایک دوسرے کے مقبوضہ علاقے خالی کرا دیئے۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کی وجہ سے پاکستان کی ساکھ جو مغربی دنیا میں بطورِ خاص آمرانہ حکومت کے مجنونانہ اور غیر ذمہ دارانہ اقدامات کی وجہ سے بُری طرح مجروح ہوئی تھی اُسے بحال کرنے کیلئے کوششیں کی گئیں اور اس ضمن میں پاکستان کو نمایاں کامیابی بھی ہوئی۔ چین نے پاکستان کی گرتی ہوئی معیشت کو سنبھالا دینے کیلئے کروڑوں روپے کے قرضوں کو گرانٹس میں تبدیل کر دیا نیز اقوام متحدہ میں بھی چین نے بنگلہ دیش سے متعلق پاکستانی موقف کی نہ صرف پُرزور حمایت کی بلکہ بنگلہ دیش کو اس وقت تک اقوام متحدہ کا رکن نہ بننے دیا جب تک کہ پاکستان نے بنگلہ دیش کو تسلیم نہ کر لیا۔ مشرقی پاکستان کی علیٰحدگی کے بعد جہاں ہمیں مادی نقطہ نظر سے خارجہ پالیسی پر مرتب ہونے والے اثرات کا جائزہ لینا

Marfat.com

ہوگا وہاں اُس سے کہیں زیادہ یہ بھی ضروری ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ مملکت پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کو کمزور کرنے کی خاطر کیا کیا حربے اختیار کئے گئے اور ان ہتھیاروں کو استعمال کرنے والے کون لوگ تھے چنانچہ یہ جاننے کیلئے مندرجہ ذیل اقتباسات کا مطالعہ بغور کرنا ہوگا جس سے ہمیں یہ اندازہ ہو سکے گا کہ اس نظریاتی مملکت کی سرحدوں کو مستحکم کرنے کیلئے خارجہ پالیسی کے سلسلے میں کن کن عوامل کو پیش نظر رکھنا کس قدر ضروری ہے۔ یہ اقتباس مسز اندرا گاندھی کی ایک تقریر سے لیا گیا ہے۔

یہ کامیابی نہ ہماری فوجوں کی کامیابی ہے نہ ہی حکومت کی کامیابی ہے حق پر مبنی نظریہ کی کامیابی ہے اس نظریہ کے خلاف جو باطل پر مبنی ہے مسلمانوں نے تحریک پاکستان کی بنیاد ایک باطل نظریہ پر رکھی تھی ہم انہیں بار بار سمجھاتے رہے کہ ان کا نظریہ غلط ہے۔ یہ کامیاب نہیں ہو سکتا انہوں نے نہ مانا اور اپنی ضد پر قائم رہے اب 25 سال کے تجربے نے بتا دیا کہ جو کچھ ہم کہتے تھے وہ حق تھا اور ان کا نظریہ باطل تھا یہ ان کے باطل نظریہ کی شکست ہے۔

(اندرا گاندھی کا خطاب۔ 6 جنوری 1972ء)

14 جولائی 1972ء کو پاکستان کی قومی اسمبلی نے معاہدہ شملہ کی توثیق کر دی جبکہ بھارتی صدر وی وی گری نے 18 جولائی کو معاہدے پر مہر تصدیق ثبت کی لیکن یہ دستاویزات حکومت پاکستان کو 4 اگست کو موصول ہوئیں۔ بھارتی حکومت نے اپنی چانکیائی ذہنیت کے مطابق پاکستانی قیدیوں کو رہا کرنے کے بجائے پہلے مغربی محاذ سے گرفتار قیدیوں کی رہائی اور کشمیر میں سرحدوں کے از سر نو تعین کا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ اس سلسلے میں دونوں ممالک کی آرمی چیف آف سٹاف کے نمائندوں کی پہلی میٹنگ بھارتی سرحدی علاقے میں سیالکوٹ سے آٹھ میل کے فاصلے پر واقع مقام سچیت گڑھ میں ہوئی جو تسلی بخش نہیں تھی۔ بھارت نے جس طرح سرحدی لکیر بنائی تھی وہ پاکستان کیلئے قابل قبول نہیں تھی۔ جونیئر کمانڈروں کے بعد سینئر کمانڈرز نے آپس میں مذاکرات کئے جو نتیجہ خیز نہ ثابت ہو سکے۔ خیال رہے کہ معاہدہ شملہ میں 30 دنوں کے اندر اندر دونوں ممالک کی فوجوں کی بین الاقوامی سرحدوں پر جہاں وہ زمانہ امن میں موجود ہیں واپسی کی شق درج تھی لیکن بھارتی حکام نے کمال ڈھٹائی سے فوجوں کی واپسی کو نئی سرحد بندی سے مشروط کر دیا جس پر مذاکرات تعطل کا شکار ہو گئے۔ 25 تا 29 اگست کو دونوں ممالک کے اعلیٰ افسران کے درمیان دہلی میں بات چیت ہوئی۔ پاکستانی وفد میں وزیر خارجہ عزیز احمد، صدر کے خصوصی معاون رفیع رضا اور سیکرٹری وزارت خارجہ عبدالستار جبکہ بھارتی وفد میں پی این ہکسر، ٹی این کول، ایس کے بینرجی اور اے ایس چھپ شامل تھے۔

معاہدہ دہلی:

شملہ معاہدہ پر عملدرآمد کے سلسلے میں پاکستانی وفد مسٹر عزیز احمد کی قیادت میں 17 اگست 1973ء کو نئی دہلی پہنچا۔ 18 اگست کو بھارتی وفد کے قائد پی این ہکسر نے مسٹر عزیز احمد سے پاکستانی جنگی قیدیوں کی واپسی کے سلسلے میں مذاکرات کئے۔ 25 اگست کو مذاکرات میں تعطل پیدا ہو گیا۔ تاہم پھر بات چیت شروع کی گئی جو 28 اگست 1973ء کو معاہدہ دہلی پر منتج ہوئی۔ معاہدے پر پاکستان کی طرف سے مسٹر عزیز احمد اور بھارت کی طرف سے مسٹر پی این ہکسر نے

Marfat.com

دستخط کیے۔ معاہدے کے بعد مسٹر پی این ہکسر نے بتایا کہ یہ معاہدہ انسانی مسائل کے حل کے علاوہ برصغیر میں مستحکم امن اور اچھی ہمسائیگی کا ڈھانچہ بھی تعمیر کرے گا۔

معاہدہ دہلی کا متن یہ ہے:

i: انسانی ہمدردی کے ان مسائل کے سلسلے میں فوری عملدرآمد سے جو شق نمبر VI اور شق نمبر VII میں متذکرہ 195 پاکستانی جنگی قیدیوں کے سلسلے میں ضروری ہوگا فریقین کی حیثیتوں پر کوئی ناگوار اثر نہیں پڑے گا۔

ii: شق نمبر 1 کے تحت تمام پاکستانی جنگی قیدیوں کی واپسی ضروری انتظامات کی تکمیل کے فوراً بعد شروع ہو جائے گی اور اس سلسلے میں تاریخ کا تعین باہمی اتفاق رائے سے کیا جائے گا۔

iii: اس کے ساتھ ہی ساتھ پاکستان میں موجود تمام بنگالیوں اور بنگلہ دیش میں موجود تمام پاکستانیوں کی اپنے اپنے وطن کو واپسی بھی جس کا ذکر شق VIII میں ہے اور جو درج ذیل ہے شروع کر دی جائے گی۔

iv: تمام قسم کے افراد کی واپسی کے سلسلے میں یہ اصول زیر عمل ہوگا کہ ان کی واپسی بیک وقت عمل میں آئے اور یہ عمل لگاتار جاری رہے۔

v: ان غیر بنگالیوں کے سلسلے میں جو پاکستان منتقل ہونا چاہتے ہیں بنگلہ دیش اور پاکستان کی حیثیتوں میں کوئی فرق آئے بغیر حکومت پاکستان نے انسانی ہمدردی کے تحت یہ منظور کر لیا ہے کہ ابتدا میں ان کی خاصی تعداد کو پاکستان میں داخلہ کی اجازت دے دی جائے گی مزید یہ بھی طے پایا کہ وزیراعظم پاکستان اور وزیراعظم بنگلہ دیش یا ان کے مقرر کردہ نمائندوں کا بعد میں اجلاس ہوگا جس میں یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ جو غیر بنگالی پاکستان جانا چاہتے ہیں ان میں سے کتنے غیر بنگالیوں کو قبول کیا جا سکے گا بنگلہ دیش نے یہ وضاحت کر دی ہے کہ ایسے اجلاس میں بنگلہ دیش کے وزیراعظم یا ان کے نمائندے صرف اس شرط پر شرکت کر سکیں گے کہ بنگلہ دیش کی خودمختاری اور پاکستان کے ساتھ مساویانہ حیثیت تسلیم کر لی جائے۔

vi: بنگلہ دیش نے تسلیم کر لیا ہے کہ قیدیوں اور باشندوں کے تبادلے کے دوران 195 پاکستانی جنگی قیدیوں کے خلاف مقدمات نہیں چلائے جائیں گے اور مندرجہ ذیل شق نمبر VII کے تحت یہ 195 جنگی قیدی باہمی سمجھوتہ ہونے تک بدستور بھارت میں رہیں گے۔

vii: بھارت میں محبوس پاکستانی جنگی اور سویلین قیدیوں پاکستان میں مقیم بنگالیوں اور بنگلہ دیش میں موجود غیر بنگالیوں کی واپسی کے بعد جیسا کہ شق نمبر V میں کہا گیا ہے یا اگر ممکن ہو تو اس سے بھی پہلے بنگلہ دیش بھارت اور پاکستان آپس میں گفت وشنید سے 195 پاکستانی جنگی قیدیوں کے خلاف مقدمات چلانے کے مسئلے کا فیصلہ کریں گے۔ بنگلہ دیش ایسے سہ ملکی اجلاس میں صرف اس شرط پر شرکت کرنے کی وضاحت کر چکا ہے کہ اس کے خودمختارانہ اور مساویانہ حیثیت کو تسلیم کر لیا جائے۔ دونوں ملکوں کے خاص نمائندوں کو اس امر کا یقین ہے کہ اس سمجھوتے میں ایک دوسرے کے باشندوں کی واپسی کے کام کی تکمیل سے برصغیر میں افہام وتفہیم اور مصالحت کی فضا قائم ہو جائے گی اور ایسا ماحول پیدا ہو جائے گا جس میں تینوں ملکوں کے آئندہ مذاکرات مفید اور تعمیری ثابت ہو سکیں۔

Marfat.com

viii: بھارت میں مقید پاکستانی جنگی قیدیوں اور شہری نظر بندوں کی واپسی۔ پاکستان سے بنگالیوں کی واپسی اور شق نمبر V میں متذکرہ بنگلہ دیش میں موجود پاکستانیوں کی واپسی کا پروگرام بھارت بنگلہ دیش اور پاکستان کے ساتھ گفت وشنید کے بعد طے کیا جائے گا۔ پاکستان سے بنگالیوں کی واپسی کے سلسلے میں حکومت پاکستان کو یہ انتظامات کرنا ہوں گے کہ انہیں کس جگہ سے رخصت کیا جائے گا۔ بنگلہ دیش حکومت کو ان مقررہ مقامات سے انہیں بنگلہ دیش پہنچانے کے تمام انتظامات کرنا ہوں گے اس طرح حکومت بنگلہ دیش اپنے علاقے سے پاکستان جانے والوں کو وہاں سے رخصت کرنے کیلئے مقامات کا تعین کرے گی اور حکومت پاکستان انہیں پاکستان لانے کا انتظام کرے گی یہ مقامات طے کرنے کے لئے دونوں حکومتیں انسانی ہمدردی کے بین الاقوامی اداروں اور دوسری تنظیموں کی مدد حاصل کر سکتی ہیں۔

ix: ایک دوسرے کے باشندوں کی واپسی کے اس سمجھوتے کے سلسلے میں سوئٹزرلینڈ کی وفاقی حکومت کو اور دیگر انسانی ہمدردی کے اداروں کے نمائندوں کو بروقت بنگلہ دیش اور پاکستان میں واپسی کے اس پروگرام کا جائزہ لینے کی عام اور کھلی اجازت ہوگی اور بنگلہ دیش اور پاکستان کی حکومتیں انہیں ہر سہولت بہم پہنچائیں گی اور اس کی نشرو اشاعت بھی کریں گے جس سے واپس ہونے والوں کے لیے آسانیاں پیدا ہو سکیں۔

x: اس سمجھوتے کے تحت اپنے اپنے ملک کو واپس جانے والوں کے ساتھ حسن سلوک روا رکھا جائے گا حکومت بھارت اور حکومت پاکستان نے اس سمجھوتے سے اتفاق کرلیا ہے۔ وزیر اعظم بھارت کے خاص نمائندے نے بنگلہ دیش حکومت سے صلاح مشورہ کرلیا ہے اور بنگلہ دیش حکومت کی طرف سے بھی اس کی توثیق کا اعلان کر دیا گیا ہے۔

صدر بھٹو نے 21 دسمبر 1972ء کو وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے نام ایک خط ارسال کیا جس میں واضح کیا گیا تھا کہ اب برصغیر میں حالات معمول پر لانے اور معاہدہ شملہ کے دیگر اقدامات پر عملدر آمد کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ جنگی قیدیوں کا مسئلہ ہے۔ اس کے بعد خیر سگالی کا مظاہرہ کرتے ہوئے 27 دسمبر کو مسٹر بھٹو نے تمام بھارتی جنگی قیدیوں کی یکطرفہ رہائی کا اعلان کر دیا اس طرح پاکستان نے جنیوا کنونشن کے تحت اپنی ذمہ داریوں کی تکمیل کر دی۔ بھارت نے بھی اگرچہ مغربی محاذ سے پکڑے جانے والے 540 پاکستانی قیدیوں کو رہا کر دیا لیکن اس نے مشرقی پاکستان سے بنائے جانے والے تقریباً 93 ہزار جنگی قیدیوں کو رہا نہ کیا۔ جنگی قیدیوں کے متعلق جنیوا کنونشن کی دفعہ 118 کے باوجود کہ جنگی قیدیوں کا یہ ناقابل تنسیخ حق ہے کہ انہیں جنگ ختم ہونے کے فوراً بعد رہا کیا جائے لیکن بھارت نے یہ موقف اختیار کیا کہ جنگی قیدی بھارت اور بنگلہ دیش دونوں کے مشترکہ قیدی ہیں اور وہ بنگلہ دیش کی رضامندی کے بغیر رہا نہیں کیے جاسکتے۔ دوسری طرف بنگلہ دیش یہ چاہتا تھا کہ پاکستان پہلے اسے تسلیم کرے اس کے بعد پاکستان کے ساتھ اس مسئلہ پر بات چیت ہوگی۔ یہ مسئلہ مزید پیچیدہ ہو گیا جب مجیب الرحمان نے 2 جنوری 1973ء کو کچھ قیدیوں پر جنگی جرائم کے سلسلہ میں مقدمہ چلانے کے اعلان کا اعادہ کیا اور کہا کہ وہ اس بارے میں کسی دباؤ کو قبول نہیں کرے گا۔ ابتدا میں پانچ ہزار پر مقدمہ چلایا جانا تھا 18 مارچ 1972ء کو ڈھاکہ سے اعلان کیا گیا کہ حکومت نے 1500 جنگی مجرموں کی لسٹ تیار کی ہے اور پھر معاہدہ دہلی کے بعد یہ 195 رہ گئے۔ (Pakistan Horizon Vol. XXV P/82)

Marfat.com

یہ جنیوا کنونشن کی صریح خلاف ورزی تھی۔ بھارت پر جنگی قیدیوں کی واپسی دو طرح سے فرض تھی ایک تو بھارت 1949ء میں جنیوا کنونشن پر دستخط کرنے والوں میں شامل ہے اور اس کنونشن کی دفعہ 118 میں ہے کہ جنگ کے خاتمہ کے بعد قیدیوں کو فوراً رہا کر دیا جائے۔ دوسرے 21 دسمبر 1971ء کو سلامتی کونسل کی قرارداد نمبر 307 میں فریقین کو انسانی جانوں کی حفاظت اور 1949ء کے جنیوا کنونشن پر عملدرآمد کے لئے کہا گیا تھا اور اقوام متحدہ کے چارٹر کی دفعہ 25 کے مطابق اقوام متحدہ کے تمام ممبران سلامتی کونسل کے فیصلوں کے پابند ہیں۔ بھارت نے نا صرف اقوام متحدہ کی قرارداد کو نظر انداز کر دیا بلکہ جنیوا کنونشن کی بھی خلاف ورزی کی اور جنیوا کنونشن کی دفعہ 118 کی مختلف تاویل کر کے اسے مبہم کرنے کی کوشش کی بھارت نے یہ دلیل دی کہ جنگی قیدیوں کی واپسی کا فرض، قیام امن سے وابستہ ہے۔ حالانکہ کے اقوام متحدہ اور ریڈ کراس کے مطابق جنگ بند ہونے پر جنگی قیدیوں کی واپسی ان کا ایسا حق ہے جسے کسی اور بات سے گڈمڈ نہیں کیا جا سکتا اور 24 اگست 1972ء کو قانون دانوں کے عالمی کمیشن کے اعلان کے مطابق حقیقی جنگ بندی اور شملہ معاہدہ کے بعد پاکستان اور بھارت میں عملی جنگی کی حالت نہیں ہے۔ لہٰذا جنگی قیدیوں کی واپسی بھارت کا یکطرفہ اور غیر مشروط فرض تھا اس کا انحصار معاہدہ امن کے نتائج پر منحصر نہیں۔ بھارت اس ذمہ داری سے اس بناء پر دستبردار نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ مشترکہ کمان کے قیدی ہیں۔

پاکستان کی تشویش اس وقت بہت بڑھ گئی جب بھارت میں قیدیوں پر تشدد اور ان کے ظالمانہ قتل کی خبریں آنے لگیں پاکستان کی وزارت خارجہ کے مطابق 30 نومبر 1972ء تک بھارت کے مختلف کیمپوں میں 32 قیدی قتل اور پچاس زخمی کر دیئے تھے۔ جن پر حکومت پاکستان نے گہرے غم وغصہ کا اظہار کیا اور بھارتی حکومت سے احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کے جنگی قیدیوں اور شہری نظر بندوں سے جنیوا کنونشن کے معیار کے مطابق انسانی سلوک نہیں ہو رہا۔ صرف اکتوبر کے مہینے میں مختلف کیمپوں میں چھ واقعات ہوئے جن میں اٹھارہ پاکستانی قتل اور 37 زخمی ہوئے۔ ایسے سنگین واقعات کی تیزی کیمپوں میں جنگی قیدیوں کی غیر تسلی بخش حالت کو ظاہر کرتی ہے۔ بھارت نے اس کی یہ وضاحت کی کہ یہ پاکستان فرار ہونے کی کوشش کرتے ہیں اس لئے یہ واقعات جنم لیتے ہیں حالانکہ ریڈ کراس کی رپورٹ کے مطابق 13 اکتوبر کو الہ آباد کے کیمپ میں ہلاک ہونے والے چھ فوجیوں میں سے کم از کم تین یا دو فرار کی کوششوں میں نہیں بلکہ ظالمانہ قتل کا نشانہ بنے۔ ریڈ کراس کی اس رپورٹ پر دہلی میں اس کے سینئر نمائندے مسٹر ہوفس کو بھارت سے نکال دیا گیا۔

(Pakistan Horizon Vol. XXV 157)

جنیوا کنونشن کی دفعہ 92 میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اگر کوئی قیدی مفرور ہوتا ہوا پکڑا جائے تو اسے صرف ڈسپلنری سزا دی جائے جو بہت معمولی مشقت ہے اور اگر کوئی قیدی بار بار ایسا کرے تو اس کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوگا اور دفعہ 93 تو اسے سنگین واقعہ ماننے سے ہی انکاری ہے۔

یکم دسمبر 1972ء کو پھر حکومت پاکستان نے بھارت سے ایک اور پاکستانی کے قتل پر سخت احتجاج کیا کہ بھارتی سورے 33 افراد کو قتل اور 50 سے زائد زخمی کر چکے ہیں۔ بھارتی حکومت اس خونریزی کو ختم کرنے کیلئے موثر اقدامات کرے۔ پاکستان نے بھارت کو یاد دلایا کہ اب تک پاکستان میں بھارت کے جنگی قیدیوں سے مثالی سلوک کیا گیا ہے جو

Marfat.com

جنیوا کنونشن کے معیار سے بھی بڑھ کر تھا۔ یہاں ایک بھی ناگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔

دوسری طرف بھارت میں پاکستانی جنگی قیدیوں سے غیر انسانی سلوک، کیمپوں کی غیر صحت مند صورتحال، ناقص علاج، ناکافی خوراک، ہولناک خونریزی نے کئی افسروں اور جوانوں کو تپ دق، فالج ناسور اور سرطان جیسی مہلک بیماریوں میں مبتلا کر دیا۔ جسمانی عارضوں سے جو لوگ محفوظ تھے ان میں سے کئی ایک کو فقدان نیند، پریشان خیالی، غیر حاضر دماغی اور پاگل پن جیسی نفسیاتی بیماریاں لگ گئیں۔ (ہمہ یاراں دوزخ 13واں باب صدیق سالک)

21 فروری 1973ء کو پاکستان نے بھارت کی حکومت سے پھر سخت احتجاج کیا کہ وہ جنیوا کنونشن کی شدید خلاف ورزی کر رہی ہے کیونکہ پاکستان کو پتہ چلا ہے کہ اس نے نئی دہلی کے تہاڑ جیل کے کیمپ نمبر 22 کو پاکستان کے فوجی جوانوں کی برین واشنگ کا مرکز بنایا ہوا ہے یہاں پاکستان کے قیدیوں سے طویل سوالات پوچھے جاتے ہیں۔ انہیں قید تنہائی اور بجلی کے جھٹکے دیئے جاتے ہیں۔ انہیں مخبوط الحواس لوگوں کے ساتھ بند کر دیا جاتا ہے اور تشدد کے دوسرے طریقے استعمال کر کے ان سے فوجی معلومات حاصل کی جاتی ہیں۔ کیمپ نمبر 22 کے دو پاکستانی قیدی کیپٹن مظہر عباس رضوی اور میجر پرویز جنہیں مغربی محاذ سے قیدی بنایا گیا تھا اور جو کہ واپس آ چکے ہیں کیپٹن رضوی کو 24 دن قید تنہائی میں رکھا گیا پھر اسے پاگل آدمی کے ساتھ بند کر دیا گیا جس کی چیخ و پکار سے وہ سو بھی نہ سکتے تھے اس دوران چھ مرتبہ ان سے سوالات پوچھے گئے۔ میجر پرویز سے بھی یہی سلوک کیا گیا حکومت پاکستان کو یہ اطلاعات بھی ملیں کہ انکے قیدی افسران کو سات اور آٹھ مہینوں تک قید تنہائی میں رکھ کر انہیں بجلی کے جھٹکے دیئے جاتے ہیں۔ پاکستانی حکومت نے اپنے نوٹ میں کہا کہ اس کے قیدیوں سے بھارت کا یہ سلوک جنیوا کنونشن کی دفعہ 17 کی خلاف ورزی ہے کیونکہ اس میں معلومات حاصل کرنے کے لئے ایسے جسمانی اور ذہنی تشدد کی ممانعت ہے اور دفعہ 12 میں ہے کہ جنگی قیدیوں سے ہر وقت انسانی سلوک کیا جائے دفعہ 21 میں قید تنہائی کی ممانعت ہے۔ پاکستان نے بھارت کی طرف سے کنونشن کی ان دفعات کی خلاف ورزیوں کی غیر جانبدارانہ تحقیقات پر زور دیا اور یہ کہ تحقیقات کے طریق کار کو طے کرنے کے لئے پاکستان اور بھارتی حکومت کے متعلقہ اہلکاروں کی فوری ملاقات ہونی چاہئے۔

بھارت کے وزیر دفاع جگ جیون رام نے 19 اپریل 1973ء کو پارلیمنٹ میں بتایا کہ 47 پاکستانی قیدی جیلوں میں بیماری سے مر گئے ہیں اور 149 کے خلاف ضابطے کی کارروائی کی گئی ہے کیونکہ وہ فرار ہونے کے لئے سرنگیں کھود رہے تھے۔ حکومت پاکستان کے سرکاری ترجمان کے مطابق 120 قیدی بیماری سے مر گئے ہیں جبکہ 45 کو بھارتی محافظوں نے اذیتیں دے دے کر شہید کر دیا۔ (روزنامہ ڈان 22 اپریل 1973ء)

7 فروری 1973ء اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کرٹ والڈ ہیم تین روزہ دورہ کے لئے پاکستان آئے تو ان سے اپیل میں کہا گیا کہ بھارت پر دباؤ ڈالا جائے کہ جنگی قیدیوں کی رہائی ایک انسانی سوال ہے جبکہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنا یا نہ کرنا ایک سیاسی مسئلہ ہے۔ اپیل میں یہ کہا گیا کہ بھارت کے اس وقت کے چیف آف سٹاف جنرل مانک شا نے مشرقی پاکستان میں برسر پیکار پاکستانی فوج سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اگر لڑائی بند کر دیں تو انہیں مغربی پاکستان بھیج دیا جائیگا۔ تو پھر بھارت کا یہ موقف کیونکر تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ پاکستانی فوج نے بھارت اور بنگلہ دیش کی مشترکہ کمان کے آگے ہتھیار ڈالے

Marfat.com

تھے۔اپیل میں سیکرٹری جنرل سے انصاف اور انسانیت کا واسطہ دے کر کہا کہ بھارت کو پاکستانی جنگی قیدی کو فوراً اور غیر مشروط طور پر رہا کرنے کے لئے آمادہ کریں یہ انسانی مسئلہ ہے۔(ہفت روزہ جمہوریت لاہور 4 تا 20 مئی 1974ء صفحہ نمبر 65)

بنگلہ دیش پر دباؤ ڈالنے کے لئے پاکستان نے اس کی اقوام متحدہ میں رکنیت کے التوا کی کوشش کی جو کامیاب رہی۔ بھٹو نے بنگلہ دیش سے کہا کہ اگر وہ خیال کرتا ہے کہ ہمارے جنگی قیدیوں کی رہائی پر وہ ایک قسم کا ویٹو کر سکتا ہے تو ہم بھی ویٹو رکھتے ہیں۔ انہوں نے 10 اگست کو راولپنڈی میں اعلان کر دیا کہ بنگلہ دیش کے اقوام متحدہ میں داخلے پر چین ویٹو کر دے گا۔ انہوں نے بعد میں اس بات کی تصدیق کی کہ پاکستان نے چین سے درخواست کی تھی کہ ہمارا دوست ہوتے ہوئے بنگلہ دیش کے خلاف سلامتی کونسل میں ویٹو استعمال کرے۔ جب موسم گرما 1972ء میں بنگلہ دیش نے اقوام متحدہ کی رکنیت کے لئے درخواست دی تو پاکستان اور چین نے زور دیا کہ بنگلہ دیش کی رکنیت کے سوال کو اس وقت تک ملتوی رکھا جائے جب تک کہ وہ پچھلے سال جنرل اسمبلی کی سات اور سلامتی کونسل کی 21 دسمبر کی قرارداد کی تعمیل نہیں کرتا۔ چین نے 25 اگست 1972ء کو سلامتی کونسل میں اپنا ویٹو استعمال کر کے بنگلہ دیش کے عالمی ادارے میں داخلہ کو رکوا دیا اور کہا کہ بنگلہ دیش نے اقوام متحدہ کے اصولوں کی کھلی تحقیر کی ہے اور اس کی قرارداد کو ماننے سے انکار کر دیا۔ 29 نومبر 1972ء کو جنرل اسمبلی نے بغیر بحث کے دو قراردادیں منظور کیں کہ بنگلہ دیش کو اقوام متحدہ کی رکنیت دے دی جائے گی لیکن وہ 21 دسمبر 1971ء کی سلامتی کونسل کی قرارداد نمبر 307 پر بھی عملدرآمد کرے تاکہ جنیوا کنونشن کے مطابق جنگی قیدیوں کی واپسی مکمل ہو جائے جس کی علاقہ میں قیام امن کے لئے بڑی اہمیت ہے۔ اس طرح جنرل اسمبلی نے بنگلہ دیش کے یو این او میں داخلہ کو جنگی قیدیوں کی رہائی سے منسلک کر دیا اس کے علاوہ جہاں پاکستان کے جنگی قیدی اور شہری بھارت کے کیمپوں میں نظر بندی کی صعوبتیں برداشت کر رہے تھے وہاں پاکستان میں رکے ہوئے تین لاکھ کے قریب بنگالی بھی بنگلہ دیش جانے کے لئے بے قرار تھے۔ ان بنگالیوں کے لاکھوں رشتہ دار بنگلہ دیش میں بے چینی کے عالم میں تھے وہ بنگلہ دیش کی حکومت اور غیر ملکی سفارتی نمائندوں پر بنگالیوں کو وطن لانے کے لئے دباؤ ڈال رہے تھے۔ مختلف عالمی انسانی تنظیمیں، کئی ممالک اور اخبارات بھارت پر جنگی قیدیوں کی واپسی کے لئے دباؤ ڈال رہے تھے اور اس وقت تک بھارت اور بنگلہ دیش پر یہ بھی واضح ہو گیا تھا کہ پاکستان پر دباؤ ڈال کر بنگلہ دیش تسلیم نہیں کروایا جا سکتا اور بحالی تعلقات میں تعطل جنگی قیدیوں کی رہائی سے ہی دور ہو سکتا ہے۔ اس سے پہلے کہ بنگلہ دیش کی حکومت کسی فیصلے پر پہنچے بھارتی حکام نے اپنی دانست میں بڑی چالاکی دکھائی اور عجیب و غریب بیان جاری کر دیا۔

17 اپریل 1973ء کو بھارت اور بنگلہ دیش نے اس تعطل کو دور کرنے کے لئے ایک مشترکہ اعلان جاری کیا جس میں یہ بیان کیا گیا کہ دونوں حکومتیں اس انسانی مسئلہ کا اس طرح حل تلاش کرنے کے لئے تیار ہیں کہ تمام پاکستانی جنگی قیدی اور فوجی نظر بندوں اور غیر فوجی نظر بندوں کی سوائے ان کے جن پر عوامی جمہوریہ بنگلہ دیش کی حکومت کو جنگی جرائم کی پاداش میں مقدمہ چلانے کی ضرورت ہے اور پاکستان میں مقیم تمام بنگالیوں اور بنگلہ دیش میں غیر بنگالیوں (جنہوں نے پاکستان کی شہریت منتخب کی ہے) کی ایک ساتھ واپسی عمل میں لائی جائے۔

30 اپریل 1973ء کو حکومت پاکستان نے ایک بیان میں بنگلہ دیش کے کام کے جنگی قیدیوں میں سے کسی پر بھی

Marfat.com

مقدمہ چلانے سے انکار کر دیا کیونکہ مبینہ طور پر جو مجرمانہ فعل ہوئے تھے وہ پاکستان کے حصے میں پاکستان کے شہریوں نے کئے تھے اور بین الاقوامی قانون کے مطابق ان پر کسی پاکستانی بااختیار ٹربیونل میں ہی مقدمہ چلایا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ بیان میں واضح کیا گیا کہ اگر ڈھاکہ کے حکام نے مقدمہ چلانے کی کوشش کی تو پاکستانی حکام کے لئے یہ ناممکن ہو جائے گا کہ وہ ان بنگالیوں پر مقدمہ چلانے سے باز رہیں جو پاکستان میں ہیں اور ان کے خلاف جاسوسی تخریب کاری، غداری کے ثبوت ہیں۔ البتہ حکومت پاکستان نے بات چیت کے دروازے کھلے رکھے اور بھارتی حکومت کے نمائندے کو اسلام آباد میں بات چیت کی دعوت دی تا کہ اس تجویز کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کی جا سکے اور شملہ معاہدہ کے مزید اقدامات پر عملدرآمد کے امکانات پر غور کیا جا سکے لیکن بھارتی حکومت نے 17 اپریل کے بیان پر مزید بحث کے لئے پاکستان کی دعوت مسترد کر دی اور پاکستان سے کہا کہ وہ پہلے بھارت بنگلہ دیش تجویز قبول کر لے اور اس کے بعد اس تجویز پر عملدرآمد کے لئے مذاکرات ہو سکتے ہیں۔ بھارت بنگلہ دیش پیشکش میں پہلی بار انسانی مسائل (جنگی قیدیوں) اور سیاسی مسئلہ (بنگلہ دیش کا تسلیم کرنا) کو الگ الگ کر دیا اور پاکستان میں بنگالیوں کی قسمت کو پاکستان کے جنگی قیدیوں اور بنگلہ دیش میں غیر بنگالیوں سے منسلک کر دیا لیکن ساتھ ہی بنگلہ دیش کے حکام اصرار کر رہے تھے کہ پاکستانی جنگی قیدیوں پر بنگلہ دیش کے جج مقدمہ چلائیں گے جس دن بھارت اور بنگلہ دیش نے تین طرفہ نظر بندوں کی واپسی کی تجویز پیش کی۔ ڈھاکہ میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ اگلے ماہ 195 جنگی قیدیوں کو جنگی جرائم کے سلسلہ میں خاص ٹربیونل کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ البتہ اب جنگی جرائم کے حامل قیدیوں کی تعداد 13 سو سے 195 ہو گئی ہے۔

11 مئی 1973ء کو حکومت پاکستان نے بھارت کو یہ جنگی قیدی بنگلہ دیش منتقل کرنے سے باز رکھنے کے لئے ہیگ کی بین الاقوامی عدالت میں درخواست دائر کر دی کہ نسل کشی کے جرائم کے الزامات پر سزا کے لئے جنیوا کنونشن کی دفعہ 2 کے مطابق 195 افراد پر مقدمہ چلانا صرف پاکستان کا اختیار ہے۔ درخواست میں کہا گیا کہ بھارت کو بنگلہ دیش میں قیدی منتقل کرنے سے منع کیا جائے۔ پاکستان نے عدالت سے یہ بھی کہا وہ فیصلہ دے کہ نسل کشی کے تحت اگر کوئی مقدمہ چلایا بھی جائے تو ایسا کرنے کا حق صرف اور صرف پاکستان کو ہے اور عدالت کا فیصلہ ہونے تک ان قیدیوں کے تحفظ کے لئے عبوری اقدامات کئے جائیں۔ 11 مئی کو ہی عدالت نے بھارت کو بذریعہ تار اور خط پاکستان کی درخواست سے مطلع کر دیا اور یہ بھی کہا کہ 17 مئی تک بھارت اس بارے میں اپنے موقف سے عدالت کو آگاہ کرے۔ بھارت ٹربیونل کے سامنے پیش تو نہ ہوا لیکن اس نے 23 مئی کو ایک خط لکھا کہ جھگڑے کے تمام فریقوں کی رضامندی کے بغیر اس عدالت کو پاکستان کے مقدمہ پر غور کرنے کا اختیار ہی نہیں تھا۔ 28 مئی کو مسز اندرا گاندھی نے ایک انٹرویو میں کہا کہ پاکستان نے عالمی عدالت میں مقدمہ کر کے شملہ معاہدہ کی خلاف ورزی کی ہے کیونکہ اس معاہدہ میں یہ طے ہوا تھا کہ دونوں فریق مسائل کو دو طرفہ بات چیت سے حل کریں گے۔ (ڈان 29 مئی 1973ء)

11 جولائی کو حکومت پاکستان نے بین الاقوامی عدالت کو مطلع کیا کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان اس مسئلہ پر جلد بات چیت ہونے کا امکان ہے اس لئے مقدمہ کی سماعت کو عبوری وقت کے لئے ملتوی کر دیا جائے۔

12 جولائی کو ایک سرکاری بیان میں کہا گیا کہ بھارت اور پاکستان کے نمائندے 1971ء کی جنگ سے پیدا

Marfat.com

ہونے والے مسائل پر 24 جولائی کو اسلام آباد میں بات چیت کریں گے۔ بھارت کے پاکستان کے ساتھ گفتگو پر آمادہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بنگلہ دیش اور بھارت نے کسی معقول نتیجہ پر پہنچنے کے لئے پاکستان کے موقف کو قبول کر لیا ہے۔ پاکستان نے واضح کر دیا تھا کہ جنگی قیدیوں پر مقدمات کے خاتمے اور انکی رہائی سے قبل وہ بنگلہ دیش کو ہر گز قبول نہیں کرے گا۔

24 جولائی کو راولپنڈی میں بات چیت شروع ہوئی۔ پاکستانی وفد کے سربراہ امور خارجہ کے وزیر مملکت عزیز احمد تھے اور بھارتی وفد کے قائد اعظم کے خصوصی ایلچی مسٹر ہسکر تھے۔ 31 جولائی کو ایک مشترکہ بیان جاری کیا گیا بات چیت کے دوران ایسے مسائل ابھر آئے ہیں جس پر دونوں طرف سے مزید غور و خوض کی ضرورت ہے اور اس لئے اس بات پر رضامندی کا اظہار کیا گیا ہے کہ اب بات چیت دوبارہ 18 اگست کو دہلی میں منعقد ہوگی۔ غیر سرکاری ذرائع کے مطابق کسی سمجھوتے پر نہ پہنچنے کی اصل رکاوٹ غیر بنگالیوں کا مستقبل تھا کیونکہ پاکستان صرف ان مغربی پاکستانیوں کو قبول کرنے کے لئے تیار تھا جو کہ 1971ء کی جنگ میں مشرقی پاکستان میں تھے اور چالیس ہزار اس کے علاوہ جو حکومت پاکستان کے ملازم رہ چکے تھے یا جن کے مغربی پاکستان میں خاندانی رشتے تھے۔ دوسری رکاوٹ یہ تھی کہ مجیب اس وقت یورپ اور کینیڈا کے دورے پر تھا اور اس سے رابطہ رکھنا ضروری تھا اس لئے بھارتی وفد نے بات چیت کو تھوڑے عرصے کے لئے ملتوی کر دیا تا کہ وہ مشورہ کر سکے۔ 18 اگست کو دہلی میں دوبارہ بات چیت شروع ہوئی اور یہ مذاکرات 28 اگست 1973ء تک جاری رہے اور معاہدہ دہلی میں طے پایا جس کے اہم نکات یہ تھے۔

☆ تمام پاکستانی جنگی قیدیوں اور غیر فوجی نظر بندوں، پاکستان میں مقیم تمام بنگالیوں اور بنگلہ دیش سے کافی تعداد میں بہاریوں کی ایک ساتھ واپسی ہوگی۔

☆ واپسی کا یہ مرحلہ مکمل ہونے تک پاکستان کے 195 جنگی قیدیوں پر مقدمہ نہیں چلایا جائے گا اور مسائل کے تصفیہ تک یہ جنگی قیدی بھارت میں ہی رہیں گے۔

☆ واپسی کی تکمیل پر یا اگر اس سے پہلے اتفاق رائے ہو جائے تو بنگلہ دیش بھارت اور پاکستان 195 جنگی قیدیوں کے مسئلہ پر تبادلہ خیال کریں گے۔ بنگلہ دیش نے اس قسم کے مذاکرات میں آزاد مملکت کی حیثیت سے برابری کی بنیاد پر شریک ہونے کی شرط منوائی تھی۔

☆ ابتدا میں پاکستان بنگلہ دیش سے ان غیر بنگالیوں کی کافی بڑی تعداد قبول کر لے گا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے پاکستان آنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ابتدائی واپسی مکمل ہونے کے بعد پاکستان اور بنگلہ دیش کے وزرائے اعظم یا ان کے نامزد نمائندوں کی ملاقات ہوگی جس میں فیصلہ کیا جائے گا کہ پاکستان آنے کے متمنی اور کتنے افراد کو منتقلی کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ یہ معاہدہ پاکستان کے موقف سے ہم آہنگ تھا کیونکہ جنگی قیدیوں کی واپسی کے متعلق متعدد غیر متعلق شرائط پر اصرار کرنے کی بجائے بھارت نے 90 ہزار پاکستانیوں کی رہائی منظور کر لی۔ پاکستان نے اس معاہدہ کی خاطر غیر بنگالیوں کی مخصوص تعداد کو ضرور قبول کر لیا۔ مگر یہ رعایت انسانی نکتہ نظر سے دی گئی۔ یہ رعایت اس لئے بھی ضروری تھی کہ اس کے بغیر جنگی قیدیوں کی اسیری کا زمانہ مختصر نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ

Marfat.com

بھارت نے جنگی قیدیوں کی رہائی پر بنگلہ دیش کو ویٹو کا حق دے کر اس معاملہ کو پیچیدہ بنا دیا تھا اور بنگلہ دیش کو اصرار تھا کہ وہ کم از کم 195 جنگی قیدیوں پر مقدمات ضرور چلائے گا۔ یہ فہرست ابتدا میں خاصی طویل تھی۔ بھارت اعلان کر چکا تھا کہ بنگلہ دیش کی حکومت کو اس مقصد کے لئے جو قیدی مطلوب ہوں گے وہ اس کے حوالے کر دے گا۔ دونوں ملکوں کی یہ پالیسی مصالحت کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ تھی اس وجہ سے پاکستان کو عالمی عدالت کی طرف رجوع کرنا پڑا تھا۔ تاہم اس معاہدہ کے ذریعہ یہ گتھی بڑی حد تک سلجھ گئی اور بھارت نے یقین دلایا کہ وہ 195 جنگی قیدی بنگلہ دیش کے حوالے نہیں کرے گا اور ان کے بارے میں فیصلہ تینوں ملکوں کے باہمی مذاکرات کے ذریعے ہوگا۔
اس طرح بنگلہ دیش نے پاکستان سے اپنی آزاد حیثیت کو تسلیم کرا لیا لیکن اس معاہدے کے رو سے جنگی قیدیوں کی واپسی کا آغاز ہونے کے ساتھ 195 جنگی قیدیوں کے معاملہ میں پاکستان کو بھی ایک ایسے فریق کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی جس کی مرضی اور رضامندی کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھایا جا سکتا تھا۔ مختصراً معاہدہ دہلی کے بعد متنازعہ مسائل کو حل کرنے کی ذمہ داری زیادہ تر پاکستان اور بنگلہ دیش کے کندھوں پر آ گئی۔ 28 ستمبر 1973ء کو قیدیوں کے تبادلے شروع ہو گئے۔

***

یوں تو سہ فریقی مذاکرات میں شمولیت سے بنگلہ دیش نے اپنی الگ حیثیت پاکستان سے تسلیم کروالی تھی لیکن اب 195 پاکستانی فوجی افسروں کو اپنے پاس رکھ کر بھارتی اور بنگلہ دیشی حکومت نے پاکستان کو یہ پیغام بہرحال پہنچا دیا تھا کہ جب تک پاکستان بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کرے گا یہ افسر رہا نہیں ہوں گے۔ پاکستان نے اس ہٹ دھرمی کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا۔

پاکستانی قومی اسمبلی سپریم کورٹ کی رائے معلوم کرنے کے بعد 10 جولائی 1973ء کو وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کو یہ اختیار دے چکی تھی کہ وہ جب چاہیں بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیں قبل ازیں ذوالفقار علی بھٹو کے برسراقتدار آتے ہی پاکستان میں گرفتار شیخ مجیب الرحمٰن کو بلا کسی شرط رہا کر دیا تھا جو لندن کے راستے دہلی اور پھر ڈھاکہ چلے گئے تھے۔
بھٹو حکومت نے مجیب سے براہ راست بات کر کے اس مسئلے کو جب بھی سلجھانے کی کوشش کی بھارت کوئی نہ کوئی اڑچن کھڑی کر کے معاملہ بگاڑ دیتا۔ فروری 1974ء کے معاہدہ دلی کے تحت 99 ہزار بنگالی پاکستان سے بنگلہ دیش میں 53 ہزار سویلین پاکستان اور 60 ہزار جنگی قیدی بھارت سے پاکستان آ چکے تھے۔
پاکستان میں موجود ان فوجی افسران کے کنبوں کی طرف سے حکومت پر مسلسل دباؤ ڈالا جا رہا تھا کہ وہ 195 افسران کو واپس لائے۔ پاکستان عالمی سطح پر ہر ممکن اخلاقی دباؤ بڑھا رہا تھا لیکن جب کبھی بنگلہ دیش کی حکومت کچھ نرمی دکھاتی بھارتی انہیں قابو کر کے پھر پہلی پوزیشن پر لے آتے۔

***

Marfat.com

اسلامی سربراہی کانفرنس

امریکہ اکتوبر 1973ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد مسلمانوں میں اُمت واحدہ کا نظریہ تیزی سے جڑ پکڑنے لگا تھا اور شدت سے مسلمانوں کے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونے کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ اس مرحلے پر ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی بہترین قائدانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے پاکستان میں اسلامی سربراہی کانفرنس کا اعلان کردیا جو 22 فروری 1974ء کو لاہور میں منعقد ہوئی۔ 38 اسلامی ممالک کے سربراہان نے اس تاریخ ساز کانفرنس میں شرکت کی۔ انڈونیشیا' مصر' سعودی عرب اور الجزائر نے بنگلہ دیش کو ایک مسلم ملک ہونے کے ناطے کانفرنس میں لانا ضروری سمجھا اور دیگر اسلامی ممالک نے برادر اسلامی ملکوں کے جھگڑے کو عالمی سطح پر تماشا بنانے کے بجائے آپس میں طے کرنے کیلئے بنگلہ دیش کو شمولیت پر راضی کرلیا اور اس تاریخی موقع پر اسلامی اخوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے پاکستان نے بنگلہ دیش کو ایک آزاد اور الگ ملک کی حیثیت سے تسلیم کرلیا اس مرحلے پر آہنی اعصاب کے مالک ذوالفقار علی بھٹو نے بنگلہ دیش کی حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے بیان کے آخر میں کہا۔

''مسئلے دو طرح کے ہوتے ہیں' غلط اور صحیح۔ کبھی کبھی صحیح فیصلے بھی بد دلی سے کرنے پڑتے ہیں۔ قوموں کی زندگی میں ایسے لمحات بھی آتے ہیں جب انہیں بادل نخواستہ سیاسی تلخ زمینی حقائق کو قبول کرنا پڑتا ہے۔ میں نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ فیصلہ ٹھیک ہے لیکن میں اس فیصلے سے ہرگز خوش نہیں ہوں''۔ (پاکستان ٹائمز 23 فروری 1974ء)

بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے اعلان کے ساتھ ہی شیخ مجیب الرحمٰن اسلامی کانفرنس میں شرکت کرنے لاہور آگئے اور 24 فروری کو انہوں نے ایک بیان میں کہا۔

''بنگلہ دیش اور پاکستان کے درمیان اب تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہونے جارہا ہے۔

(روزنامہ امروز۔ 25 فروری 1974ء)

پاکستانی جنگی قیدیوں کی رہائی کے سلسلے میں دہلی میں 4 اپریل 1974ء کو سہ فریقی کانفرنس ہوئی جس میں بنگلہ دیش سے کمال الدین' بھارت سے سورن سنگھ اور پاکستان سے عزیز احمد نے شرکت کی۔ 5 اپریل کو بات چیت شروع ہوئی۔ 9 اپریل کو بالآخر 195 جنگی قیدیوں کو بھی دوسرے قیدیوں کے ساتھ رہا کرنے کا فیصلہ ہوگیا۔ اس معاہدے میں کہا گیا:

2 جولائی 1972ء کے شملہ معاہدے کی روح کے مطابق دونوں ممالک نے دوطرفہ مذاکرات کے ذریعے اپنے مسائل حل کرنے پر اتفاق کیا تھا۔ بنگلہ دیش نے اس معاہدے کا خیر مقدم کیا اور برصغیر میں پائیدار امن

Marfat.com

کیلئے اس کی حمایت کی۔ 17 اپریل 1973ء کو بھارت اور بنگلہ دیش نے تعطل ختم کرنے کیلئے جنگی قیدیوں کی رہائی کا اعلان کیا تھا جس کے بعد 28 اگست کو بھارت پاکستان کے درمیان سمجھوتہ ہوا جس میں بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کی منظوری بھی حاصل کی گئی تھی۔ جس کے بعد 19 دسمبر 1973ء کو قیدیوں کا تبادلہ شروع ہوا۔ فروری 1974ء میں بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے سے دلی میں سہ فریقی مذاکرات کی راہ ہموار ہوئی۔ 5 سے 9 اپریل تک ملاقاتیں کرنے کے بعد تینوں وزرائے خارجہ نے معاملات پر غور اور اس امر پر اطمینان کا اظہار کیا گیا کہ تینوں ممالک کے بیشتر قیدی اور نظر بند اپنے ملکوں میں جا چکے ہیں۔

پاکستان کی جانب سے کہا گیا کہ پاکستان سے بنگلہ دیش کے باشندوں کی واپسی کا کام مکمل ہونے کو ہے۔ پاکستان میں موجود بنگلہ دیش کے باقی ماندہ باشندوں کی واپسی کا کام بھی کسی تامل یا رکاوٹ کے بغیر مکمل ہو جائے گا۔ بنگلہ دیش میں موجود غیر بنگالیوں کے سلسلہ میں پاکستان کی جانب سے بتایا گیا کہ حکومت پاکستان پہلے ہی ان غیر بنگالیوں کو پاکستان آنے کے حق میں اجازت نامے جاری کر چکی ہے جو سابق مغربی پاکستان کا ڈومیسائل رکھتے تھے یا جو مرکزی حکومت کے ملازمین تھے یا ان ملازمین کے افراد خاندان جو بٹے ہوئے خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں، خواہ ان کا اصل ڈومیسائل کہیں کا بھی ہو۔ ایسے پچیس ہزار افراد کو اجازت ناموں کا اجراء بھی جاری کیا گیا ہے جن کو بنگلہ دیش میں مشکلات درپیش ہیں۔ پاکستان نے ایک بار پھر اس عزم کا اظہار کیا کہ اول الذکر تین زمروں میں آنے والے غیر بنگالیوں کو کسی حد کے بغیر (تمام کو) قبول کیا جائے گا۔ ایسے افراد کے سلسلہ میں جن کی درخواستیں مسترد کر دی گئی ہیں پاکستان دوبارہ درخواست پر بتائے گا کہ کس درخواست کو کن بنیادوں پر مسترد کیا گیا ہے۔ اگر کسی درخواست گزار کو شکایت ہو تو وہ کسی بھی وقت اپنی درخواست پر نظر ثانی کیلئے کہہ سکتا ہے لیکن اس کیلئے ایسے حقائق حکومت پاکستان کو فراہم کرنا پڑیں گے جس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ اول الذکر تین زمروں میں یا مشکلات میں گھرے ہوئے افراد کے زمرے میں آتا ہے۔ ایسے افراد کے دعوے کیلئے وقت کی کوئی قید نہیں۔ کسی معاملے پر نظر ثانی کے بعد معاملہ الجھ جانے کی صورت میں حکومت پاکستان اور حکومت بنگلہ دیش باہمی صلاح و مشورہ سے اسے طے کرنے کی کوشش کریں گے۔ برصغیر میں مصالحت، امن اور دوستی کیلئے تین حکومتوں کے درمیان جو خواہش موجود ہے اس کے پیش نظر 195 پاکستانی جنگی قیدیوں کے مسئلہ پر تبادلہ خیال کیا گیا۔ بنگلہ دیش کے وزیر خارجہ نے کہا کہ ان جنگی قیدیوں نے جو زیادتیاں اور مختلف جرائم کئے ہیں وہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی قراردادوں اور بین الاقوامی قانون کی متعلقہ دفعات کے مطابق انسانیت کے خلاف جرائم اور نسل کشی کے مترادف ہیں۔ عالمی رائے یہ ہے کہ ایسے افراد کو جن پر ایسے جرائم کے الزامات لگائے گئے ہوں جیسے کہ 195 جنگی قیدیوں پر لگائے گئے ہیں ان کا محاسبہ کیا جانا چاہئے اور قانون کے مطابق ان کے خلاف کارروائی کی جانی چاہئے۔ حکومت پاکستان کے وزیر مملکت برائے دفاع و امور خارجہ نے کہا کہ جو جرائم ہوئے ہیں میری حکومت ان کی مذمت اور گہرے افسوس کا اظہار کرتی ہے۔

اس سلسلہ میں تینوں وزراء نے کہا کہ اس معاملہ کا تینوں ملکوں کے اس عزم کی روشنی میں جائزہ لینا چاہئے کہ وہ مصالحت کی فضا ہموار کرنے کیلئے اپنی کوششیں جاری رکھیں گے۔ وزراء نے مزید کہا کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے بعد

Marfat.com

پاکستان کے وزیراعظم نے اعلان کیا تھا کہ وہ بنگلہ دیش کے وزیراعظم کی دعوت پر بنگلہ دیش کا دورہ کریں گے اور بنگلہ دیش کے عوام سے اپیل کریں گے کہ وہ ماضی کی غلطیوں کو بھلا دیں اور درگزر سے کام لیں تاکہ مصالحت کو فروغ دیا جا سکے۔ اس طرح بنگلہ دیش کے وزیراعظم نے 1971ء میں بنگلہ دیش میں کیئے جانے والے مظالم اور تباہی کی کارروائیوں کا حوالہ دیتے ہوئے اعلان کیا وہ چاہتے ہیں کہ عوام ماضی کو بھول جائیں اور نئے سرے سے آغاز کریں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ بنگلہ دیش کے عوام معاف کرنا جانتے ہیں۔ مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں خاص طور پر پاکستان کے وزیراعظم کی بنگلہ دیش کے عوام سے اس اپیل پر کہ وہ ماضی کی غلطیوں کو بھول جائیں اور درگزر سے کام لیں۔ بنگلہ دیش کے وزیر خارجہ نے کہا کہ حکومت بنگلہ دیش نے رحم دلی کے جذبہ کے تحت مقدمات نہ چلانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس امر پر اتفاق کیا گیا کہ 195 جنگی قیدیوں کو ان دوسرے جنگی قیدیوں کے ہمراہ پاکستان واپس بھیج دیا جائے گا جن کی واپسی دہلی سمجھوتہ کے تحت اس وقت جاری ہے۔ وزرائے خارجہ نے اپنے اس یقین کا اظہار کیا کہ مذکورہ سمجھوتہ 1971ء کی جنگ سے پیدا شدہ انسانی مسائل کو حل کرنے کیلئے مضبوط بنیاد فراہم کرے گا۔ انہوں نے اس یقین دہانی کا بھی اعادہ کیا کہ برصغیر کے تینوں ملکوں کے ستر کروڑ عوام کو سب سے زیادہ امن اور ترقی میں دلچسپی ہے۔ وزرائے خارجہ نے اپنی حکومت کے اس عزم کو دہرایا کہ وہ برصغیر میں پائیدار امن قائم کرنے اور تعلقات کو معمول پر لانے کیلئے کام کرتے رہیں گے۔"

19 اپریل 1974ء کو امور خارجہ کے عزیز احمد، سردار سورن سنگھ اور ڈاکٹر کمال حسین نے اس معاہدہ کی تین اصل کاپیوں پر دستخط کئے۔ (Pakistan Horizon Vol VII p-128-130)

اس کے ساتھ ہی اسی روز پاکستان اور بھارت کے درمیان دوطرفہ بنیاد پر علیحدہ سمجھوتہ ہوا جس کی رو سے پاکستان و بھارت نے فیصلہ کیا کہ ایسے تمام لوگوں کو جو جنگ 1971ء سے پہلے کسی بھی الزام میں ماخوذ کر کے ایک دوسرے کے ملک میں روک لئے گئے تھے انہیں جلد از جلد وطن واپس بھیج دیا جائے اور نارمل تعلقات کی بحالی کے سلسلہ میں شملہ سمجھوتہ کے دوسرے حصہ میں درج امور ڈاک و تار کے نظام کی بحالی، بری، بحری و فضائی مواصلات کا احیاء، آمد و رفت میں آسانیاں، تجارت اور معاشی دائرے میں تعاون، سائنس اور ثقافتی تبادلے کیلئے جلد بات چیت کا آغاز کیا جائے گا۔ اس سہ فریقی معاہدہ کے نتیجہ میں پاکستان کے جنگی جرائم میں ماخوذ 195 جنگی قیدی بھی رہا کر دیئے گئے اور 30 اپریل کو پاکستانی اسیران جنگ کا آخری قافلہ وطن واپس پہنچ گیا۔

بھارت کا ایٹمی دھماکہ:

شملہ معاہدہ کی دیگر شقوں پر عمل درآمد کیلئے سہ فریقی معاہدہ سے فضا خوشگوار ہو گئی تھی کہ 18 مئی 1974ء کو بھارت کے ایٹمی دھماکہ نے تعلقات کو معمول پر لانے کے عمل کو نقصان پہنچایا کیونکہ اس سے خاص طور پر ماضی کی تاریخ میں دونوں ممالک کے تنازعات اور ٹکراؤ کی روشنی میں پاکستان کو بلیک میل کرنے کیلئے نیوکلیائی دھمکی استعمال کرنے کا امکان پیدا ہو گیا تھا۔ بھارت کے ایٹمی دھماکہ کا جو فوری ردعمل ہوا وہ یہ کہ دونوں ملکوں کے درمیان جون 1974ء کو مواصلات کی بحالی کے بارے میں جو مذاکرات ہونے والے تھے اس وقت تک ملتوی کر دیئے گئے جب تک مثبت نتائج کیلئے حالات زیادہ موافق نہ ہوں۔ بھارت نے اپنے مراسلہ میں پاکستان کو یقین دلایا کہ وہ ایٹمی استعداد کو پرامن مقاصد

Marfat.com

کیلئے استعمال کرے گا اور وہ شملہ معاہدہ پر مکمل عمل کرے گا۔ پاکستان کے اگر چہ اس یقین دہانی سے ایٹمی بلیک میلنگ کے تمام خدشات دور نہ ہو سکے۔ تاہم پاکستان کی حکومت نے تحمل مزاجی کا مظاہرہ کیا اور 16 ستمبر 1974ء کو پوسٹل ٹیلی مواصلات اور سفری سہولت کے سلسلے میں بھارت سے مذاکرات کئے جن کے نتیجہ میں ان مسائل پر دونوں ممالک کے معاہدے وجود میں آئے اور اس کے بعد ایک دوسرے کے علاقے سے فضائی پرواز اور رابطے پر 22 نومبر 1974ء کو اسلام آباد میں مذاکرات ہوئے لیکن کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا کیونکہ بھارت 1971ء کے ایک دوسرے کے علاقوں پر پرواز کا کیس آئی سی او سے واپس لینے پر اصرار کر رہا تھا۔ پاکستان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ تصفیہ کے بعد کیس واپس لیا جائے۔ شہری پرواز پر مذاکرات میں تعطل کے باعث حالات کو معمول پر لانے کے عمل پر کوئی اثر نہ پڑا۔ نومبر 1974ء کے آخر میں دہلی میں تجارتی مذاکرات ہوئے اور 1965ء کی جنگ کے بعد تجارت پر جو پابندیاں عائد تھیں اسے اٹھانے کے سلسلے میں ایک معاہدہ پر دستخط ہوئے۔ 23 جنوری 1975ء میں پھر بھارت سے تجارت اور جہاز رانی کا ایک معاہدہ طے پایا۔ 14 مئی 1974ء کو اسلام آباد میں دونوں ملکوں کے درمیان شہری ہوابازی کے رابطوں اور سفارتی تعلقات کی بحالی کے معاہدہ پر دستخط ہوئے اور 28 جون 1976ء کو ریل ٹریفک کی بحالی کا معاہدہ طے پایا لیکن دونوں ملکوں کے درمیان ان تجارتی' سفارتی اور مواصلاتی تعلقات کی بحالی اور ان کی بہتری کیلئے کوششوں سے کوئی خاطر خواہ نتائج سامنے نہیں آئے کیونکہ دونوں ممالک اپنے بنیادی تنازعات ختم کئے بغیر تعاون کی کوشش کرتے رہے اور دونوں ملکوں میں سیاسی مسائل کے حل کیلئے کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ شملہ معاہدے اور پھر دلی مذاکرات کے نتیجے میں پاکستان آنے والے مسلح افواج کے افسران اور جوانوں کی تعداد یہ تھی۔

پاک فوج	1633	جونیئر کمیشنڈ افسر	2138
فضائیہ	76	دیگر عہدیدار اور جوان	51897
بحریہ	75	بحریہ کے ارکان	1319
سول مسلح افواج	2	ایئر مین	722
دفاعی مد سے تنخواہ پانے والے شہری	882	رینجرز پولیس کے اہلکار	20722

لیفٹیننٹ جنرل امیر عبداللہ خاں نیازی آخری جنگی قیدی تھے جنہوں نے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ 3 مئی 1974ء کو پاکستان بھر میں جنگی قیدیوں کی بھارت سے مکمل واپسی پر ملک بھر میں یوم تشکر منایا گیا۔

شملہ سمجھوتے میں بھارت نے یہ واضح طور پر تسلیم کر لیا تھا کہ ریاست جموں وکشمیر بدستور متنازعہ علاقہ ہے اور جنوبی ایشیا میں پائیدار امن کے قیام کیلئے اس معاملے کا قطعی تصفیہ ضروری ہے۔ بھارت نے شملہ میں اس بات سے بھی اتفاق کیا تھا کہ جب تک اس معاملے کا تصفیہ نہیں ہو جاتا دونوں میں سے کوئی بھی فریق صورت حال کو تبدیل کرنے کی یکطرفہ طور پر کوشش نہ کرے گا۔

چنانچہ اسی کے مطابق حکومت پاکستان نے اس بات کی وضاحت کردی کہ وہ اندرا گاندھی اور شیخ عبداللہ مفاہمت کو تسلیم نہیں کر سکتی اور نہ ہی بھارت اور کسی فرد یا پارٹی کے درمیان ایسا کوئی سمجھوتہ حق خود ارادی کے اصول کے

Marfat.com

مطابق ریاست کے مستقبل کا حل متصور ہوگا کیونکہ حق خودارادی مسلمہ بین الاقوامی حقیقت ہے جس کا واضح ذکر اقوام متحدہ کی قراردادوں میں کیا گیا ہے اور جنہیں بھارت اور پاکستان دونوں قبول کر چکے ہیں۔ اس اصولی موقف کی بنیاد پر وزیراعظم مسٹر بھٹو نے 24 فروری 1975ء کو ایک بیان جاری کیا جس میں اندرا عبداللہ سمجھوتے پر افسوس ظاہر کیا گیا تھا اور یہ بات کہی گئی تھی کہ جموں و کشمیر کے عوام کے حق ارادی کو کوئی چیز کمزور نہیں بنا سکتی اسے ختم کر دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

کشمیرا کارڈ:

بھارتی وزیراعظم مسز اندرا گاندھی اور مقبوضہ کشمیر کے کاغذی شیر شیخ عبداللہ کے درمیان 13 نومبر 1974ء کو ایک معاہدہ جسے کشمیرا کارڈ کیا جاتا ہے طے پا گیا اور دونوں نے سمجھ لیا کہ اب مسئلہ ختم ہوا پاکستان کے اس معاہدے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اس کا ایک تاریخی اور سیاسی پس منظر تھا۔ بھارت کے ساتھ جب ڈوگرہ مہاراجہ نے کشمیر کا الحاق کیا تو اس وقت وہ صرف تین معاملات۔ فوج' امور خارجہ اور مواصلات تک محدود تھا۔ اس کے بعد جب بھارت کا آئین مرتب ہوا تو شیخ عبداللہ کی کوششوں سے بھارتی دستور میں ریاست کی پوزیشن کیلئے دفعہ 370 تشکیل دی گئی۔ اس کا مقصد کشمیر کی کم از کم اتنی خودمختاری کو قائم رکھنا تھا جو ڈوگرہ راج کی ایک صدی میں ریاست جموں و کشمیر کو حاصل تھی۔ بھارت سے الحاق کرنے والی دوسری ریاستوں سے کشمیر کو زیادہ جموں و کشمیر کو حاصل تھی۔ بھارت سے الحاق کرنے والی دوسری ریاستوں سے کشمیر کو زیادہ اختیارات اس لئے دیئے گئے کیونکہ کشمیر بھارت یونین میں شامل ہونے والی ایسی واحد ریاست تھی جس کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی اور تین اطراف سے پاکستانی علاقہ سے گھری ہوئی تھی۔ پاکستان اس پر اپنا دعویٰ جتا رہا تھا اور یہ معاملہ اقوام متحدہ میں زیر بحث تھا اور بھارت نے رائے شماری کی ہامی بھر لی تھی۔ دفعہ 370 کے تحت ریاست جموں و کشمیر کو ہند یونین کے اندر خصوصی حیثیت حاصل ہے۔ دفاع' امور خارجہ اور رسل و رسائل کو چھوڑ کر دوسرے معاملات میں ریاست کو خودمختاری دی گئی۔ اس دفعہ کے تحت بھارتی دستور میں ایسے معاملات جو یونین لسٹ اور متفقہ فہرست میں درج ہیں پر بھارتی پارلیمنٹ کے اختیارات محدود کر دیئے گئے۔ اسی طرح بھارتی دستور کی دفعہ 239 جو سابقہ ریاستوں سے تعلق رکھتی ہے ریاست جموں و کشمیر میں نافذ نہ کی گئی اس دفعہ کے مطابق جموں و کشمیر کا بھارت کا حصہ ہونے کے باوجود الگ دستور ہوگا۔ الگ جھنڈا ہوگا اور الگ صدر ہوگا۔ اس دفعہ میں واضح طور پر کہا گیا تھا کہ ریاست جموں و کشمیر پر بھارت کی پارلیمنٹ کا بنایا ہوا قانون صرف اس وقت نافذ ہوگا جبکہ ریاست کا سربراہ جو آئین منظور ہوتے وقت مہاراجہ تھا اور بعد میں ''صدر ریاست'' تھا اپنی کونسل آف منسٹر اور اسمبلی سے مشورہ کر کے اس کی اجازت دے۔ لیکن بھارتی لیڈروں کی خواہش تھی کہ وہ کشمیر کو باقی ریاستوں کی سطح پر لے آئیں اور اس کی انفرادیت کو ختم کر دیا جائے ان کا اندازہ تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ریاست جموں و کشمیر بھی اس قسم کے ادغام پر تیار ہو جائے گی جو باقی ریاستوں میں عمل میں آ چکا ہے۔ کشمیر کی دستور ساز اسمبلی کے 1951ء میں انتخابات ہوئے تو بھارتی لیڈروں نے کہا کہ کشمیر کا آئین صرف مسودہ الحاق کی بنیاد پر مرتب کرنا ہی کافی نہیں کیونکہ دستاویز الحاق بہت سے امور میں تشنہ اور نامکمل تھی۔ نہرو نے کہا کہ کشمیر کی دستور ساز اسمبلی سے کوئی ایسا کام نہ ہو جائے جو بھارتی دستور کے مطابق نہ ہو یا اس کے کسی حصہ سے متصادم ہو۔ لہٰذا نہرو

Marfat.com

اور شیخ عبداللہ میں کشمیر اور بھارت کے تعلقات کیلئے کچھ عام اصولوں پر 14 جولائی 1952ء کو ایک سمجھوتہ ہو گیا جسے معاہدہ دہلی (دہلی ایگریمنٹ) کہتے ہیں۔اس میں کہا گیا۔

1- الحاق کی دستاویز کے مطابق مرکزی حکومت کے پاس دفاع، امور خارجہ اور مواصلات کے اختیارات ہوں گے۔ باقی ماندہ اختیارات دوسری ریاستوں کے برعکس حکومت کشمیر کے پاس ہوں گے۔

2- سربراہ ریاست کی سفارش ریاستی مقننہ کرے گی لیکن اس کی منظوری بھارتی صدر دے گا۔

3- جموں وکشمیر کے رہائشی بھارت کے شہری ہوں گے لیکن ریاستی مقننہ کو اختیار حاصل ہوگا کہ مستقل رہائشیوں کے حقوق ومراعات خاص کر غیر منقولہ جائیداد کا حصول اور ملازمتوں وغیرہ کا تعین کرے۔

4- حکومت نے بھارت کے جھنڈے کو سپریم تسلیم کر لیا اور ساتھ ہی ساتھ ریاستی جھنڈے کو بھی برقرار رکھا۔

5- معافی یا سزائے موت بدلنے کا اختیار بھارتی صدر کو ہوگا۔

6- معاہدہ دہلی کی سب سے اہم دفعہ کا تعلق بھارتی صدر کے ایمرجنسی کے اختیارات سے ہے۔

دستور ہند کی دفعہ 352 کے تحت صدر بیرونی حملہ، بیرونی خطرے یا داخلی ابتری کی صورت میں ہنگامی حالت نافذ کر سکتا ہے لیکن معاہدہ دہلی کی رو سے صدر ہند ریاست جموں وکشمیر پر کوئی ایسا فرمان اس وقت جاری کر سکتا ہے جب اسے ریاستی حکومت کی طرف سے استدعا کی جائے یا اس کی منظوری حاصل ہو۔

(جواہر لال نہرو۔مصنف سروپالی گوپال ص200 تا201)

یہ صورت 1953ء تک برقرار رہی۔مارچ 1948ء میں جب شیخ عبداللہ کو وزیراعظم مقرر کیا گیا تو وہ کشمیر کے بھارت سے الحاق کے حامی تھے۔لیکن معاہدہ دہلی کے بعد شیخ عبداللہ کے بھارت کی مرکزی حکومت کے ساتھ ریاست جموں وکشمیر کی خودمختاری پر اختلافات بڑھنے لگے۔مئی 1953ء میں نہرو نے شیخ عبداللہ سے کہا کہ وہ دستور ساز اسمبلی کا اجلاس بلا کر بھارت کے ساتھ کشمیر کے الحاق کی توثیق کرا دے تو اس کے بعد ان پر ہندوؤں کی ذہنیت آشکارا ہو گئی اور انہیں معلوم ہو گیا کہ اس طرح کشمیر پر عملاً ہندوؤں کا قبضہ ہو جائے گا۔لہٰذا انہوں نے ریاست جموں وکشمیر کو ایک آزاد ریاست کی حیثیت دینے کیلئے رائے شماری کا مطالبہ شروع کر دیا تاکہ کشمیری اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کر سکیں۔اس پر انہیں گرفتار کر لیا گیا اور وزارت عظمیٰ سے الگ کر کے جیل بھیج دیا اور پھر 1964ء میں گیارہ سال بعد بھارت نے انہیں اس امید پر رہا کیا کہ وہ اس سے مفاہمت کریں گے۔اس دوران حکومت کشمیر کے مختلف سربراہوں بخشی غلام محمد، جی ایم صادق وغیرہ نے کشمیر کے بھارت سے الحاق کی توثیق کر دی۔26 جنوری 1957ء کو جموں وکشمیر کا اپنا دستور بھی نافذ ہو گیا لیکن حکومت بھارت نے اپنے حامیوں کے ذریعے بھارتی آئین کی بعض دفعات کو بھی لاگو کرا لیا۔

1962ء میں ریاستی اسمبلی سے صدر اور وزیراعظم کے عہدے بھی تبدیل کرا دیئے۔صدر کی جگہ گورنر اور وزیراعظم کی جگہ وزیراعلیٰ کر دیا گیا۔اس کے بعد بھارتی سپریم کورٹ اور الیکشن کمیشن کا دائرہ کار بھی ریاست جموں تک بڑھا دیا گیا اس طرح کشمیر کے بارے میں بھارت کے آئین کی دفعہ 370 کو بالکل کھوکھلا کر دیا گیا۔اس دفعہ میں اب تک 2 ترمیمیں ہو چکی ہیں۔بھارت نے اب کشمیر کا کسٹم کا محکمہ بھی ختم کر دیا ہے۔(دی مسلم۔13 مئی 1986ء)

Marfat.com

اپنے مطالبات کے اصرار پر شیخ عبداللہ کو 1965ء میں پھر گرفتار کر لیا گیا اور اس مرتبہ وہ 1968ء میں رہا ہوئے۔ جنوری 1971ء میں وہ کشمیر بدر کر دیئے گئے۔ جون 1972ء میں انہیں دوبارہ وطن داخلہ کی اجازت دی گئی اب ان کے موقف میں پھر تبدیلی آ گئی تھی کہ وہ کشمیر کی مکمل آزادی کی بجائے انڈین یونین میں اس کو خصوصی درجہ دینے کے حامی تھے۔

شملہ معاہدہ کا ذکر کرتے ہوئے شیخ عبداللہ نے کہا بھارت نے کشمیریوں کو حق خودارادیت نہ دیا تو کشمیر دوسرا بنگلہ دیش بن جائے گا۔ پاکستان اور بھارت کو آپس میں کشمیر بانٹ لینے کا کوئی اخلاقی حق نہیں۔ کشمیر کی تقدیر کے مالک خود کشمیری عوام ہیں۔ ہم باہر والوں کو ہرگز یہ اجازت نہ دیں گے کہ ہمارے وطن کو آپس میں تقسیم کر لیں۔ انہوں نے اپنے 19 سال سے دہرائے جانے والے اس بیان کا اعادہ کیا کہ کشمیر نے بھارت سے الحاق اس لئے کیا تھا کہ ہم مذہبی حکومت کی بجائے سیکولر نظام کے حامی تھے اور کشمیری اس لئے بھارت کی طرف جھک گئے تھے کہ بھارت ان کی جدوجہد آزادی کی حمایت کرتا تھا لیکن جب بھارت اپنے اس کردار سے ہٹ گیا اور پاکستان نے کشمیریوں کی آزادی کا مسلک اختیار کر لیا تو وہ پاکستان اور چین کی جانب جھک گئے اگر بھارت اب بھی کشمیریوں کو اپنے باشندے دیکھنا چاہتا ہے تو وہ انہیں ان کا حق خودارادیت دے۔ مجھے پاکستان اور بھارت سے ایک سی محبت ہے لیکن میں اہل کشمیر کی آزادی اور آبرو کیلئے اپنی ہزار جانیں تک نچھاور کر دوں گا۔ (روزنامہ جنگ 25 دسمبر 1984ء مضمون نگار نذیر انجم)

دس مارچ 1972ء کو لندن ٹائمنر کے پیٹر ہیزل ہیرسٹ سے انٹرویو میں انہوں نے کہا کہ بھارتی حکومت سے ہمارا جھگڑا ریاست کے الحاق کا نہیں بلکہ ریاست کی خودمختاری کی مقدار کا ہے۔ (ٹائمنر لندن 10 مارچ 1972ء)

شیخ عبداللہ نے اپنے بھارتی دوستوں سے کہا کہ میرا بھارت سے الحاق کی واقعیت پر اختلاف نہیں البتہ الحاق کی حدود پر ضرور ان کے اور میرے درمیان اختلاف رائے ہے۔ ہم نے 1947ء میں الحاق کی حدود طے کر کے اسے آپسی معاملات کی رو سے جس طرح دفعہ 370 کی شکل میں طے کیا تھا۔ بھارتی راہنماؤں نے زبردستی اور غیر آئینی طور پر اس کو من مانی کرتے ہوئے مسخ کر لیا۔ یہی امر ہمارے راستے جدا ہونے کی بنیاد بنا۔ اب اگر ان حدود کو پھر سے بحال کیا جائے تو ہمارے آپس کے اختلافات رفع ہو سکتے ہیں۔ ان بنیادوں پر اگر مسز اندرا گاندھی مجھ سے گفتگو کرنا چاہتی ہیں تو میں اپنی طرف سے رضامند ہوں۔

اندرا گاندھی کو بھی یہ یقین تھا کہ شیخ عبداللہ کشمیری مسلمانوں کا ایسا نمائندہ ہے جس پر وہ بہت اعتماد کرتے ہیں۔ وہ اور ان کے ساتھ اگر جیل میں رہیں تو کشمیر میں استحکام پیدا نہیں ہو سکتا۔ کشمیر کے اس وقت کے وزیراعلیٰ میر قاسم نے بھی ریاست میں سیاسی بے چینی کو ختم کرنے کیلئے یہ سوچ لیا تھا کہ بھارت کے دستوری ڈھانچے میں جموں و کشمیر کی خصوصی حیثیت کی ضمانت دینے کے ساتھ شیخ عبداللہ کو اس کے ابتدائی مرتبہ پر بحال کر دینا چاہئے۔ شیخ عبداللہ کو 9 اگست 1953ء کو برطرف کیا گیا تھا۔ وہ 8 اگست 1953ء کی پوزیشن کی بنیاد پر اپنا عہدہ سنبھالنے کو تیار تھا اور انہوں نے اندرا گاندھی سے اس کا تقاضا بھی کیا تھا کہ وزیراعلیٰ کی بجائے وزیراعظم کا عہدہ ریاست میں بحال کیا جائے لیکن اندرا گاندھی نے اسے اپنے خط میں لکھا کہ جہلم اور دوسرے دریاؤں سے بہت سا پانی بہہ چکا ہے اور گھڑی کی سوئیوں کو اب پیچھے کی طرف نہیں

Marfat.com

گھمایا جا سکتا۔ (روزنامہ مشرق 17 دسمبر 1986ء۔ سہیل ظفر)

شیخ عبداللہ کا نمائندہ افضل بیگ اور بھارتی وزیراعظم کا ایلچی مسٹر جی پارتھا سارتھی طویل عرصہ مذاکرات کرتے رہے۔ جس کے نتیجہ میں نئی دہلی میں 13 نومبر 1974ء کو ایک معاہدہ پر دستخط کئے گئے جس کا متن باضابطہ طور پر 25 جنوری 1975ء کو جاری کیا گیا جس کے چند اہم نکات یہ ہیں:

1- ریاست جموں وکشمیر کو جو کہ انڈین یونین کا کانسٹی چوانٹ یونٹ ہے دستور ہند کی دفعہ 370 کے مطابق اس کی یہ حیثیت برقرار رہے گی۔

2- باقی ماندہ اختیارات قانون سازی ریاست کے پاس ہوں گے یعنی پارلیمنٹ مقبوضہ کشمیر کے جن امور کے بارے میں قانون سازی نہیں کرتی ان پر ریاستی اسمبلی کو قانون بنانے کا اختیار ہوگا۔ البتہ ملک سے غداری' امتناعی نظربندی بھارتی دستور' جھنڈے اور قومی ترانے کی توہین کے بارے میں قانون پہلے کی طرح صرف بھارتی پارلیمنٹ ہی بنائے گی۔

3- اگر بھارتی صدر نے آئین کی کسی دفعہ کو تبدیل کر کے مقبوضہ کشمیر پر نافذ کر دیا ہے تو ریاستی اسمبلی اس پر نظرثانی کر سکتی ہے بھارتی پارلیمنٹ اس کی سفارش کی روشنی میں کارروائی کر سکے گی۔ مقبوضہ کشمیر کے متعلق آئین کی جن دفعات میں صدر نے کوئی ترمیم نہیں کی وہ جوں کی توں نافذ رہیں گی۔

4- اگر نئی ریاستی حکومت 1953ء کے بعد نافذ شدہ متفقہ فہرست میں شامل بعض قوانین مثلاً سوشل ویلفیئر' کلچرل معاملات' سوشل سیکورٹی' پرسنل قوانین اور ان سے ملتے جلتے دوسرے قوانین تبدیل کرنا چاہے تو مرکز اس خواہش پر ہمدردانہ غور کرے گا۔

5- الیکشن کمیشن کے کنٹرول اور ریاستی گورنر کے اختیارات جیسے معاملات کے متعلق ریاستی آئین میں لائی گئی کوئی تبدیلی اس صورت میں نافذ العمل ہوگی جب ایسے مسودہ قانون پر صدر ہند کے دستخط ثبت ہوں گے یعنی اگر حکومت ہند' کشمیر میں صدر راج نافذ کرنا چاہے تو کشمیر اسمبلی کی منظوری کی ضرورت نہیں ہے اور الیکشن کمیشن کے اختیارات وسیع ہیں وہ کشمیر کے علاقے میں جب چاہیں الیکشن کرانے کے مجاز ہوں گے اور ریاست کے سربراہوں کے منصب گورنر اور وزیراعلیٰ برقرار رہیں گے۔ (روزنامہ نوائے وقت 7 مارچ 1975ء)

بھارتی پارلیمنٹ اور مقبوضہ کشمیر اسمبلی میں اندرا عبداللہ معاہدہ پر بحث کے دوران مسز اندرا گاندھی' سردار سورن سنگھ اور شیخ عبداللہ تینوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ یہ سمجھوتہ بھارت کا داخلی معاملہ ہے اور یہ معاہدہ اس بنیاد پر کیا گیا ہے کہ کشمیر کا بھارت سے الحاق قطعی ہے۔ اس معاہدے سے مرکز اور ریاست کے درمیان جو ناچاقی 1953ء سے آ رہی تھی وہ ختم ہوگئی ہے۔ مرکز سے مذاکرات شروع ہونے کے بعد محاذ رائے شماری توڑ دیا گیا تھا اور اب وہاں رائے شماری اور خود ارادیت کا سوال ہی ختم ہوگیا ہے اور کشمیر کا بھارت سے الحاق پھر قانون طور پر مضبوط اور مکمل ہوگیا۔ حقیقت یہ ہے مقبوضہ کشمیر کو بھارت میں ضم کرنے کیلئے قانونی اور عملی اقدامات کا یہ کام بھارت نے 1954ء میں مکمل کر لیا تھا اور اب اندرا۔ عبداللہ معاہدہ سے دنیا کو محض یہ بتانا مقصود تھا کہ شیخ عبداللہ کے واسطے سے انہیں کشمیری عوام کی حمایت حاصل ہوگئی ہے 26

Marfat.com

فروری 1975ء کو شیخ عبداللہ کو ریاست کا وزیراعلیٰ بنادیا گیا جس پر وہ اپنے آخری وقت ستمبر 1982ء تک فائز رہے۔

اس گھناؤنے منصوبے کے خلاف پاکستان کا ردعمل فطری تھا۔ 21 دسمبر 1974ء کو وزیراعظم بھٹو نے غیرملکی نامہ نگاروں سے ایک ملاقات میں کہا تھا کہ اندرا گاندھی اور شیخ عبداللہ میں جو گٹھ جوڑ ہو رہا ہے اس کے نتیجے میں کشمیر کے بارے میں جو یک طرفہ فیصلے کئے جائیں گے وہ پاکستان کیلئے ہرگز قابل قبول نہ ہوں گے۔ (روزنامہ نوائے وقت 22 دسمبر 1974ء)

24 فروری 1975ء کو وزیراعظم بھٹو نے بھارتی مقبوضہ کشمیر، آزاد کشمیر اور بیرونی دنیا میں رہنے والے سارے کشمیریوں اور پاکستانی عوام سے اندرا-عبداللہ معاہدہ کے خلاف 28 فروری 1975ء کو عام ہڑتال کی اپیل کی۔ انہوں نے اپنے بیان میں کہا'' کہ یہ معاہدہ اچانک نہیں ہوا۔ اندرا عبداللہ مذاکرات بالواسطہ طور پر دوسال سے جاری تھے اور ان خفیہ مذاکرات کا بھی ہمیں اندازہ تھا کہ بھارتی حکومت ایک سیاسی گروپ اور اس کے لیڈر کو چند مراعات دینے کے سبب عوام کے حقوق ختم کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ پاکستانی موقف کے مطابق اس سودے سے ریاست جموں وکشمیر کی متنازعہ حیثیت پر ذرا بھر بھی اثر نہیں پڑے گا۔ اقوام متحدہ، پاکستان اور بھارت نے کشمیری عوام سے حق خودارادیت کا عہد کر رکھا ہے کہ ریاست جموں وکشمیر کے بھارت یا پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ آزادانہ اور غیر جانبدارانہ رائے شماری سے ہوگا۔ بھارتی حکومت نے ماضی میں بھی جموں وکشمیر کے عوام کے حق کو مقبوضہ جموں وکشمیر کی نام نہاد دستور ساز اسمبلی کے الحاق کے فیصلے کے ذریعے ختم کرنے کی کوشش کی ہے لیکن سلامتی کونسل نے 30 مارچ 1951ء اور 27 جنوری 1957ء کی قراردادوں کے ذریعے یہ اعلان کیا کہ ریاست جموں وکشمیر یا اس کے کسی حصہ کے مستقبل کی صورت کے تعین کیلئے عوام کی غیر جانبدار رائے شماری کے بغیر کوئی انتظام واقدام ریاست کے حق خودارادیت کے اصول سے انحراف ہوگا اور اس طرح بھارتی حکومت، ریاست جموں وکشمیر کے ایک یا چند افراد کے درمیان کوئی معاہدہ یہ مسئلہ حل نہیں کر سکتا نہ ہی ایسے اقدامات سے عالمی رائے عامہ کو گمراہ کیا جاسکتا ہے۔ (پاکستان ٹائمز...... 25 فروری 1975ء)

اندرا-عبداللہ معاہدہ کے خلاف وزیراعظم پاکستان کی اپیل پر 28 فروری 1975ء کو پاکستانی عوام اور دنیا بھر کے کشمیریوں نے ایک مکمل اور ہمہ گیر ہڑتال کی۔ مختلف مظاہروں میں اندرا-عبداللہ معاہدہ کی سخت مذمت کی گئی کہ یہ کشمیر کے مستقبل پر کسی طرح بھی اثر انداز نہیں ہوسکتا اور کشمیری عوام اپنے حق خودارادیت کے اٹل اور جائز مطالبے سے کسی طرح طرح بھی دستبردار ہونے کو تیار نہیں۔ یکم مارچ کو اقوام متحدہ میں پاکستان کے مستقل مندوب اقبال اخوند نے سیکرٹری جنرل کرٹ والڈہیم اور سلامتی کونسل کے صدر کو انگ ہوا سے کشمیر کے بارے میں اندرا-عبداللہ معاہدہ پر شدید احتجاج کیا۔ انہوں نے کہا کہ ان کا ملک اقوام متحدہ کے منشور اور اس کی قراردادوں کے مطابق اپنی تمام ذمہ داریاں پوری کرنے پر تیار ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ کسی اور کو بھی ان کی خلاف ورزی کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔ انہوں نے واضح کیا کہ بھارتی حکومت نے شیخ عبداللہ کو رائے شماری کے مطالبہ سے دستبردار ہونے اور اپنی جماعت محاذ رائے شماری ختم کرنے کے صلہ میں دوبارہ اقتدار دیا ہے۔ بھارت کا یہ اقدام شملہ معاہدہ کی روح کے منافی ہے اور اس سے تعلقات کو معمول پر لانے کی کوششوں کو نقصان پہنچا ہے۔ (روزنامہ مساوات لاہور 2 مارچ 1975ء)

17 مارچ کو پاکستان، آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر میں حق خودارادیت منایا گیا۔ جلسے اور جلوسوں میں اندرا-

Marfat.com

عبداللہ گٹھ جوڑ کی شدید مذمت کی گئی۔ پاکستان کے وزیر داخلہ خان قیوم نے کہا کہ شیخ عبداللہ نے اسلام اور کشمیری مسلمانوں سے غداری کی ہے۔ 10 مارچ 75ء کو پاکستان کے وزیر اعظم بھٹو نے اندرا گاندھی سے ایک مراسلے میں شیخ عبداللہ سے اس کے غیر قانونی اور غیر دستوری معاہدے پر احتجاج کیا اور اسے تجویز کیا کہ مسئلہ کشمیر کو شملہ معاہدہ کے ڈھانچے میں حل کیا جائے۔ 20 مارچ کو اندرا گاندھی نے اس خط کا جواب دیتے ہوئے لکھا کہ یہ معاہدہ بھارت کا داخلی معاملہ ہے مسز گاندھی نے ریڈیو پاکستان سے بھارت کے خلاف پروپیگنڈہ پر احتجاج کیا۔ 28 اپریل کو بھٹو نے اپنے جواب میں ایک دوسرے کے خلاف معاندانہ پروپیگنڈہ بند کرنے پر رضامندی کا اظہار کیا اور کشمیر کے تصفیہ کے متعلق اپنی تجاویز کو دھرایا۔(Kessing's Contemporary Archives p-27845)

اس سمجھوتے کے خلاف حکومت پاکستان پر قومی اسمبلی کے ارکان نے زور دیا کہ وہ یہ مسئلہ اقوام متحدہ میں اٹھائے تو وفاقی وزیر مملکت برائے امور خارجہ و دفاع عزیز احمد نے قومی اسمبلی میں اس مسئلہ کے متعلق ایک تحریک التواپر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اگر معاہدہ شملہ کے تحت پاکستان اور بھارت کے درمیان دوطرفہ مذاکرات سے کشمیر کا تنازعہ حل نہ ہوا تو پاکستان مناسب وقت پر اس مسئلہ کو اقوام متحدہ میں پیش کرے گا۔ انہوں نے کہا کہ اندرا عبداللہ معاہدہ سے مسئلہ کشمیر کی حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑا۔ بھارتی حکومت' اس کے لیڈر یا مقبوضہ کشمیر کے لیڈر کشمیریوں کا حق خودارادیت ختم نہیں کر سکتے۔ کشمیر کو بھارت کا حصہ بنانے کا معاملہ ایک پرانی کہانی ہے۔ کشمیر بھارت کا اس وقت بھی حصہ نہ بن سکا جب شیخ عبداللہ وزیر اعظم تھا۔ اب تو وہ وزیر اعلیٰ ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ کشمیریوں کا یہ حق سلامتی کونسل کی قرارداد 1949ء میں پاکستان اور بھارت دونوں نے متفقہ تسلیم کیا ہوا ہے کہ کشمیر میں آزادانہ' منصفانہ استصواب کے ذریعے کشمیری عوام اپنے سیاسی مستقبل کا فیصلہ خود کریں گے۔ یہ قرارداد اب بھی موجود ہے اور بعد میں کئی دفعہ کنفرم ہو چکی ہے۔ اس لئے بھارتی حکومت کوئی بھی اقدام کرتی رہے کہ ریاست جموں و کشمیر پہلے ہی اس سے الحاق کر چکی ہے' سلامتی کونسل کیلئے لائق توجہ نہیں۔ (نیشنل اسمبلی آف پاکستان تقاریر 31 مارچ 1975ء ص 385)

وزیر اعظم بھٹو نے 12 اپریل کو بیان دیا '' اگر دوطرفہ مذاکرات میں بھارت حق خودارادیت کے اصول کو تسلیم کرنے سے گریز کرے گا تو پاکستان اس مسئلہ پر بہتر فضا میں اقوام متحدہ کا رخ کر سکے گا۔ انہوں نے کہا کہ تنازعہ کشمیر ماضی میں بیسیوں دفعہ اقوام متحدہ میں پیش ہوتا رہا لیکن ہر بار روس کی طرف سے ویٹو ہو جانے کے باعث اس کا کوئی حتمی اور قطعی فیصلہ نہ ہو سکا۔ اس وقت چونکہ عالمی طاقتوں کے حلقہ ہائے اثر اور ان کے بین الاقوامی تعلقات کی نوعیت کم وبیش وہی ہے جو ماضی میں تھی اس لئے تنازعہ کشمیر کے بارے میں اب بھی اقوام متحدہ میں بعض طاقتوں کا رویہ وہی ہوگا جو ماضی میں رہا۔ اس وقت اس تنازعہ کو اقوام متحدہ میں پیش کرنے سے بعض طاقتوں کے تضادات کو بھی ہوا مل سکتی ہے۔ چنانچہ تنازعہ کشمیر کو اقوام متحدہ میں پیش کرنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ معاصر بین الاقوامی صورت حال میں اقوام متحدہ قضیہ کشمیر میں کوئی موثر کردار ادا بھی کر سکتی ہے یا نہیں اور اگر اقوام متحدہ آج بھی اس تنازعے کو ماضی کی طرح درمیان میں چھوڑ دینے کی پوزیشن میں ہو تو پھر پاکستان کو پہلے بین الاقوامی سطح پر ایسے اقدامات کرنے چاہئیں جس سے اقوام متحدہ کے پلیٹ فارم سے اس تنازعہ کے حل کے امکانات روشن ہو سکیں۔ (روزنامہ مساوات لاہور 13 اپریل 1975ء)

Marfat.com

واشنگٹن پوسٹ سے وزیراعظم بھٹو نے ایک انٹرویو میں کہا کہ پاکستان کشمیر کے تنازعہ کو طے کرنے کیلئے بھارت سے بات چیت کیلئے تیار ہے۔ بھارت شملہ معاہدہ کے تحت بات چیت کا پابند ہے اگر بھارت نے مسئلہ کشمیر کے پرامن تصفیہ کی کوششیں رد کر دیں تو کشمیر کے مسئلہ پر جنگ ہو سکتی ہے ہم نے جنگ نہ کرنے کے معاہدہ پر دستخط نہیں کئے۔ (روزنامہ نوائے وقت 8 مارچ 1975ء) بھارتی وزیراعظم نے ایک امریکی خبر رساں ایجنسی کو انٹرویو دیتے ہوئے پاکستان پر الزام لگایا کہ اس نے کشمیر کے ایک حصہ (یعنی آزاد کشمیر) پر غیر قانونی قبضہ کر رکھا ہے جو بھارت کا اٹوٹ انگ ہے۔

(نوائے وقت لاہور 30 اپریل 1975ء)

یہ صورت حال اس امر کی غماز تھی کہ بھارتی حکومت شکست خوردہ پاکستان اور بین الاقوامی سطح پر ہونے والے کسی بھی معاہدے کو کوئی اہمیت دینے کیلئے تیار نہیں ہے اور پاکستان اب کوئی نئی جنگ لڑنے کی پوزیشن میں نہیں رہا تھا۔ پاکستان کی طرف سے وقتاً فوقتاً مختلف فورمز پر یہ مسئلہ اٹھایا گیا لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ یکم جولائی 1976ء کو وزیراعظم پاکستان مسٹر بھٹو نے کہا۔

"اہل کشمیر کا حق خود ارادیت پاکستان کے عوام کے ایمان اور عقیدے کا حصہ ہے جس سے اہل پاکستان کبھی کسی حال میں بھی دستبردار نہیں ہو سکتے کیونکہ کشمیری عوام جو جدوجہد کر رہے ہیں وہ دراصل قیام پاکستان کی جدوجہد کا حصہ ہے۔ کشمیریوں کا فیصلہ ایک ہی ہو سکتا ہے کیونکہ اہل پاکستان اور کشمیریوں کی تاریخ' مذہب' ثقافت ورثہ اور جغرافیہ ایک ہے۔ اس کے برعکس بھارت کے ساتھ ان کی کوئی ایسی بات مشترک نہیں"۔ (روزنامہ مشرق 17 اگست 1976ء)

مئی 1976ء میں پاکستان کے بھارت کے ساتھ فنی نوعیت (تجارت اور فضائی رابطوں کی بحالی) کے مسائل بھی حل ہو گئے جن میں بعض پر پاکستان نے بھارت سے بہتر تعلقات کیلئے کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر سمجھوتہ کر لیا۔ پاکستان نے فضائی رابطوں کی بحالی کیلئے بھارت کے اصرار پر شہری ہوابازی کی بین الاقوامی تنظیم سے اپنا کیس واپس لے لیا۔ کشمیر کی موجودہ حیثیت "سٹیٹس کو" کو مستقل سرحد بنا کر اس مسئلہ کو حل کرنے کی تجویز کے بارے میں وزیراعظم پاکستان نے اعلان کیا کہ پاکستان بھارت کے ساتھ تعلقات معمول پر لانے کیلئے تنازعہ کشمیر پر سودے بازی نہیں کرے گا۔ کشمیر کے مسئلہ کا تصفیہ ہوگا تو حق خود ارادیت کی بنیاد پر۔ چھوٹے معاملات پر کچھ لو اور کچھ دو کی بنا پر مفاہمت ہو سکتی ہے لیکن بنیادی سیاسی مسائل پر یہ طریق ممکن نہیں۔

لاہور میں منعقدہ اسلامی سربراہ کانفرنس کے بعد پاکستان عرب دنیا کے بہت قریب ہو گیا۔ عالم اسلام محسوس کرنے لگا اگر پاکستان پھر بھارت یا کسی دوسری طاقت کی جارحیت کا شکار ہو گیا تو یہ جارحیت براہ راست ان ملکوں پر جارحیت ہوگی کیونکہ پاکستان کے نہ ہونے کی صورت میں جارحیت کا یہ سلسلہ اسلامی دنیا تک پھیل جائے گا۔ جدید دور میں اسرائیل ہی ایک ایسی طاقت نہیں ہے جو مسلمانوں کے خلاف سامراجی عزائم رکھتی ہے بلکہ بھارت بھی مسلمان ملکوں کے خلاف ایسے ہی عزائم رکھتا ہے۔ دوسری طرف بھارت یہ چاہتا تھا کہ اسلامی اتحاد کو منظم نہ ہونے دیا جائے اور پاکستان کو اسلامی دنیا سے الگ تھلگ رکھا جائے اور اس طرح اسے اپنے حلقہ اثر میں لے لیا جائے لیکن اسلامی سربراہ کانفرنس نے

Marfat.com

بھارت کے ان عزائم کو ناکام بنا دیا۔لہٰذا اس نے اس سربراہ کانفرنس کے جنوبی ایشیا پر اثرات زائل کرنے اور مغربی ایشیا اور جنوبی ایشیاء میں اپنی بظاہر بالادستی کی خاطر مئی 1974ء میں ایٹمی دھماکہ کر دیا تاکہ مسلم ممالک کے نزدیک اس کی اہمیت بڑھے۔

امریکہ ابھی تک جنوبی ایشیاء میں دھیمی اور مدہم پالیسی پر عمل پیرا تھا لیکن اپریل 1972ء میں پاکستان کو وہ غیر مہلک اور فالتو پرزوں کی ترسیل پر آمادہ ہو گیا تھا جن کی سپلائی 1971ء کی پاک بھارت جنگ میں امریکہ نے معطل کر دی تھی۔ستمبر 1973ء میں وزیراعظم پاکستان نے امریکہ کا دورہ کیا تو صدر نکسن نے بھٹو کو یقین دلایا کہ پاکستان کی سالمیت اور علاقائی یکجہتی کا تحفظ امریکی خارجہ پالیسی کا سنگ میل ہے۔(20 ستمبر 1973ء پاک امریکہ مشترکہ بیان)

وزیراعظم بھٹو امریکہ کی ہتھیاروں کی پالیسی سے مطمئن نہ تھے۔اپنے دورہ امریکہ میں انہوں نے کہا کہ ہمیں محض فالتو پرزوں میں دلچسپی نہیں بلکہ ہم خود اسلحہ تیار کرنا چاہتے ہیں۔ بھارت کے ایٹمی دھماکہ کے بعد پاکستان کو اپنی سلامتی کے بارے میں سخت تشویش تھی۔ بھارت کی اپنی آرڈیننس فیکٹریاں تھیں۔اسے روس سے اور باقی دنیا سے بھی اسلحہ مل رہا تھا صرف پاکستان پر ہی پابندی تھی۔بھٹو نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا کہ اگر امریکہ پاکستان کو روایتی ہتھیاروں کی بحالی شروع کر دے تو وہ اپنی سلامتی کے بارے میں مطمئن ہو جائے گا اور پاکستانی قوم کی ایٹمی پروگرام کی خواہش ماند پڑ جائے گی۔پاکستان جیسی غریب قوم اپنے محدود معاشی وسائل کو ایٹمی پروگرام پر ضائع نہیں کرنا چاہتی۔ہتھیاروں پر پابندی میں پاکستان سے امتیازی سلوک ہوا ہے۔(بھٹو سے انٹرویو۔نیویارک ٹائمز 9 اکتوبر 1974ء)

فروری 1975ء میں بھٹو نے دوبارہ امریکہ کا دورہ کیا تو انہوں نے امریکہ کو پاکستان کیلئے اسلحہ کی فروخت کی ترغیب دلاتے ہوئے یہ جواز پیش کیا کہ بنگلہ دیش کے قیام سے بھارت کی توسیع پسندی رک نہیں گئی۔وہ پاکستان کے مزید ٹکڑے کرنا چاہتا ہے اور طاقت کے ذریعے کشمیر کا تصفیہ ٹھونسنا چاہتا ہے۔انہوں نے ایٹمی دھماکے اور سکم کو بھارت میں شامل کرنے کا بھی حوالہ دیا جو بھارت کی توسیع پسندی کا ثبوت تھے امریکہ کے انڈر سیکرٹری آف سٹیٹ جوزف سسکو نے 23 فروری کو ایک بیان میں کہا کہ امریکہ پاکستان پر ہتھیاروں کی پابندی ختم کر دے گا۔یہ ایسی بے قاعدہ صورت حال تھی جہاں بھارت روس سے اسلحہ لے رہا ہے اور خود بھی تیار کر رہا ہے جبکہ دوسری طرف پاکستان امریکہ سے اسلحہ حاصل نہیں کر سکتا۔ مجھے امید ہے کہ ہتھیاروں پر پابندی کے خاتمہ سے امریکہ بھارت تعلقات کو نقصان نہیں پہنچے گا۔

(ASIAN RECORDER 9 APRIL 1975)

مارچ 1975ء میں امریکی صدر فورڈ نے بھارت اور پاکستان کو مہلک ہتھیاروں کی فروخت پر لگی پابندی اٹھا لی۔یہ پابندی 1965ء کی پاک بھارت جنگ میں لگائی گئی تھی اس پابندی کا زیادہ نقصان پاکستان کو ہوا تھا کیونکہ ایک تو اس کے دفاعی نظام کا زیادہ تر انحصار امریکہ پر تھا دوسرے پاکستان کی ملکی دفاعی پیداوار اس کی ضروریات سے بہت کم تھی۔ پابندی ختم ہونے سے پاکستان کو اپنے پرانے ہتھیاروں کو نئے فوجی ساز و سامان سے بدلنے کا موقع ملا لیکن امریکہ میں بھارت کے سفیر ٹی این کول نے 24 فروری 1975ء کو پریس کانفرنس میں بھارت کی پوزیشن بیان کی کہ اب تک برصغیر میں امریکہ پالیسی یہ تھی کہ اسلحہ کی سپلائی سے توازن قوت برقرار رکھا جائے۔اگرچہ یہ پالیسی برصغیر اور اس کے ملحقہ علاقوں میں

Marfat.com

ناکام ہوچکی ہے۔ اسلحہ پر پابندی نے برصغیر کی کشیدگی میں کمی اور تعلقات کی بحالی کے عمل میں مدد کی تھی۔ انہوں نے امریکہ کی اس تکرار کو مسترد کر دیا کہ پاکستان پر ہتھیاروں کی پابندی اٹھانے سے اسلحہ کی دوڑ شروع نہیں ہوگی انہوں نے کہا کہ پچھلے دو عشروں میں برصغیر میں تین خونریز جنگیں ہوئیں جن میں امریکی یقین دہانی کے باوجود امریکی اسلحہ بھارت کے خلاف استعمال کیا گیا۔ (ایشین ریکارڈر 15 اپریل 1975ء) دو روز بعد بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی نے کہا کہ پاکستان کو امریکی اسلحہ کی بحالی نے پرانے زخم پھر تازہ کر دیئے ہیں۔ اندرا گاندھی نے کہا کہ بھارت کی پرامن ایٹمی تحقیقات سے پاکستان کو خطرہ نہیں ہوسکتا۔ یہ بے بنیاد بات ہے۔

بھارت کے اس ردعمل کے جواب میں وزیراعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو نے 10 مارچ 1975ء کو اپنے ایک بیان میں کہا کہ ہتھیاروں پر پابندی کا خاتمہ کوئی اہم واقعہ نہیں بلکہ ایک بے قاعدگی دور کی گئی ہے۔ امریکہ کے ساتھ ہمارے 1954ء اور 1959ء کے دوطرفہ معاہدے ہیں جن کے تحت امریکہ قانونی طور پر پاکستان کو اسلحہ مہیا کرنے کا پابند ہے اور یہ معاہدے منسوخ نہیں ہوئے...... امریکہ نے اگرچہ پابندی اٹھالی ہے لیکن صرف پاکستان سے نہیں بلکہ پاکستان اور بھارت دونوں سے اٹھائی ہے اور صرف اسلحہ کی فروخت پر سے پابندی اٹھائی گئی ہے حالانکہ معاہدہ میں پاکستان کو بلامعاوضہ فوجی امداد بہم پہنچانے کا ذکر بھی موجود ہے لیکن اب مفت نہیں بلکہ پاکستان کو نقد ادائیگی پر ہتھیار فروخت ہوں گے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بھارت میں اس فیصلہ کو بہت زیادہ اہمیت کیوں دی جارہی ہے۔

(PAKISTAN HORIZONE Vol. XXVIII 1975 P-K)

بھارت نے عالمی سطح پر واویلا شروع کر رکھا تھا کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد پاکستان کی دفاعی ضروریات کم ہوگئی ہیں لیکن اس کے دفاعی اخراجات اور افواج کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے۔ 73-1972ء اور 77-1976ء کے دوران پاکستان کے دفاعی اخراجات 443 کروڑ روپے سے 812 کروڑ روپے ہوگئے ہیں۔ بھٹو دور حکومت میں پاکستان کی دفاعی افواج میں 70 فیصد اضافہ ہوا اور دو بلین ڈالر کے ہتھیار خریدے گئے۔ پاکستان نے 1974ء میں بھارت سے لوٹنے والے نوے ہزار قیدیوں میں سے اکثر کو فوج میں لڑنے کیلئے شامل کرلیا ہے اور یہ اضافہ اس کی موجودہ ضروریات سے زیادہ ہے۔ بھارت میں یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ پاکستان میں تینوں افواج کے افسران سے یہ حلف لیا جاتا ہے کہ وہ ہر حالت میں بھارت سے 1971ء کی شکست کا بدلہ لیں گے۔ (انڈین فارن پالیسی۔ وی پی دت ص 168)

عددی حوالہ سے بھارت پاکستان سے آبادی میں سات گنا اور رقبہ میں چار گناہ بڑا ہے۔ دوسرے ممالک سے ملنے والی امداد اس کے علاوہ ہے۔ 1974ء میں سعودی عرب کی پاکستان کو 1.1 بلین ڈالر امداد میں سے 500 ملین ڈالر مسلح افواج کو جدید بنانے کیلئے تھے۔ پاکستان امریکہ سے 1959ء کے معاہدے کی بدولت اسلحہ حاصل کرتا ہے۔ اس کے علاوہ غیر کمیونسٹ دنیا میں پاکستان چین کی فوجی امداد حاصل کرنے والا سب سے بڑا ملک ہے۔ (Pakistan and Asian Peace P.114)

امریکہ اسلحہ بندی اور تخفیف اسلحہ کی ایجنسی (U.S. Arms Control and Disarmament Agency) کے مطابق 1976ء میں بھارت کے فوجی اخراجات تیس ہزار ملین ڈالر تھے جبکہ پاکستان کے دفاعی اخراجات چھ سو پچیس ملین ڈالر تھے۔ بھارت کی مسلح افواج چودہ لاکھ چالیس ہزار جبکہ پاکستان کی چھ لاکھ چار ہزار تھی نیز بھارت نے

Marfat.com

1976ء میں دوسو چون ملین ڈالر کا اسلحہ درآمد کیا جبکہ پاکستان نے ایک سو بیالیس ملین ڈالر کا اسلحہ درآمد کیا۔

(World Military Expenditure and Arms Transfer by US Arms Control and Disarmament Agency 1967-76, p.47,57)

4 مئی 1974ء کو بھارت نے ایٹمی دھماکہ کر کے پاکستان کے لئے بڑی خطرناک صورت حال پیدا کر دی تھی۔ وزیر اعظم بھٹو نے قومی اسمبلی سے خطاب میں کہا ''بھارت کے ایٹمی دھماکہ سے برصغیر کی صورت حال میں بڑی نمایاں تبدیلی پیدا ہوگئی ہے۔ ماضی میں بھارت اور پاکستان میں جب بھی تصادم ہوا محض روایتی ہتھیار استعمال کئے گئے لیکن اب بھارت ایٹمی فوج بھی تیار کرے گا اور یہ سوچنا حماقت ہوگی کہ وہ پاکستان کے ساتھ جنگ کی صورت میں ایٹمی ہتھیار استعمال نہیں کرے گا۔ ایٹمی ہتھیار پاس ہوں تو سیاسی میدان میں بھی دوسروں پر دھونس جمانے کو جی چاہتا ہے۔ بھارت کے ایٹمی طاقت بننے کا مقصد ہی پاکستان کو مرعوب کرنا ہے۔ بھارت کے سابقہ ریکارڈ اور اس کے ماضی کے رویہ کے پیش نظر ایٹم بم کے استعمال کے امکان کو خارج از امکان بھی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ بھارت کے ایٹمی دھماکہ سے برصغیر میں حالات معمول پر لانے اور قیام امن کی کوششوں کو سخت دھچکا لگا ہے۔ بھارت کا ایٹمی دھماکہ امن کیلئے سخت خطرہ ہے۔ اسے پاکستان کے خلاف سیاسی مراعات حاصل کرنے کیلئے استعمال بھی کیا جائے گا...... بھارت اس ایٹمی تلوار کے ذریعے پاکستان سے سیاسی مراعات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ورنہ اسے کیا ضرورت تھی کہ وہ اس ایٹمی دھماکہ پر کروڑوں ڈالر خرچ کرتا جبکہ اس کی اقتصادی حالت انتہائی ابتر ہے۔'' (پاکستان ٹائمز 10 جولائی 1974ء)

بھارت نے دھماکہ تو 1974ء میں کیا لیکن وہ 1954ء سے اس مشن پر گامزن تھا جبکہ بھارت نے اگست 1948ء میں ایٹمی توانائی کمیشن قائم کرلیا تھا اور بھارت کی اہم شخصیات نے کبھی جوہری توانائی کے ممکنہ فوجی استعمال کو نظرانداز نہیں کیا۔ یہاں تک کہ وزیر اعظم نہرو جو اس بات کے سخت مخالف تھے کہ بھارت ایٹمی ہتھیار بنائے۔ لوک سبھا میں کہا کہ ہم عہد کئے ہوئے ہیں کہ ہم ایٹم بم نہیں بنائیں گے لیکن ہم اس نئی قوت کے استعمال میں کسی سے پیچھے بھی نہیں رہیں گے۔ بھارت کا اٹامک انرجی کمیشن براہ راست وزیر اعظم سے منسلک تھا۔ ڈاکٹر بھابھا کو اس کا چیئرمین بنایا گیا تھا۔ 1960ء میں ری ایکٹر بنالینے کے بعد بھارت نے ری پراسسنگ پلانٹ خود تیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ ری ایکٹر کی رسم افتتاح پر تقریر کرتے ہوئے نہرو نے کہا تھا کہ بھارت بم بنا سکتا ہے مگر ابھی نہیں بنائے گا۔ بھابھا نے مژدہ سنایا تھا کہ اس کا ملک اٹھارہ مہینے کے اندر بم تیار کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ 1965ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد پارلیمنٹ کے سو سے زیادہ ممبران نے حکومت سے ایٹم بم بنانے کا مطالبہ کیا تھا۔ بھارتی نیول چیف نے 1972ء میں کہا تھا کہ اگر 1971ء میں ہمارے پاس ایٹمی ہتھیار ہوتے تو ہم خلیج بنگال میں انٹر پرائز کو تباہ کر دیتے۔ اس طرح 1974ء میں اندرا گاندھی نے ایٹمی دھماکہ کرنے کی اجازت دے دی۔ (Nuclear Proliferation Today-Leonard Specter p-23)

بھارت کے ایٹمی عزائم عیاں تھے۔ دراصل وہ کسی بھی طریقے سے پاکستان کو یہ احساس دلانے پر تلا ہوا تھا کہ پاکستان کی حیثیت اس کے دیگر ہمسایہ ملک مثلاً نیپال، سری لنکا، مالدیپ وغیرہ سے زیادہ نہیں جبکہ پاکستانی حکومت اپنا

Marfat.com

آدھا ملک گنوانے کے بعد بھی بھارت سے برابری کی سطح پر معاملات طے کرنے کے منصوبے پر کاربند تھی۔ بھارت کی ایٹمی بلیک میلنگ کا سامنا کرنے کیلئے پاکستان نے سہ جہتی حکمت عملی اپنائی جو کچھ اس طرح تھی۔

1- بھارت سے ایٹمی تحفظ کیلئے مضبوط ضمانت کی تلاش۔

2- جنوبی ایشیاء کو ایٹمی ہتھیاروں سے پاک خطہ قرار دینے کی مہم کا آغاز۔

3- پاکستان کے نیوکلیئر پروگرام کا آغاز۔

1- ایٹمی تحفظ کی ضمانت:

اس مقصد کے حصول کیلئے پاکستانی وزارت خارجہ کے سیکرٹری آغا شاہی کو وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے عالمی دورے پر روانہ کیا۔ آغا شاہی نے امریکہ' چین' برطانیہ' فرانس' جرمنی اور دیگر یورپی ممالک کا دورہ کیا اور انہیں باور کروایا کہ بھارت کے ایٹمی طاقت بننے سے صرف جنوبی ایشیا ہی ہیں خلیج فارس، بحر ہند کیساتھ واقع ممالک بھی بھارتی جوہری خطرے کی زد میں آ گئے ہیں۔ آغا شاہی نے مڈل ایسٹ اور ایران کا دورہ کر کے انہیں بھارتی خطرے سے آگاہ کیا جس کا مثبت نتیجہ نکلا۔ کوالالمپور میں منعقدہ مسلم وزرائے خارجہ کانفرنس میں غیر ایٹمی قوتوں کو تحفظ دینے سے متعلق پاکستانی قرارداد کی زبردست حمایت کی گئی۔ چین نے اعلان کیا وہ ایٹمی بلیک میلنگ کے ذریعے کمزور ممالک خصوصاً ہمسایہ ممالک کو دبانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ چینی حکومت کی طرف سے بھارتی ایٹمی خطرے پر تشویش کا اظہار بھی کیا گیا۔

2- جنوبی ایشیاء کو ایٹمی ہتھیاروں سے پاک رکھنے کی مہم:

پاکستان نے یو این او کی جنرل اسمبلی میں 1974ء کے اجلاس میں جنوبی ایشیاء کو ایٹمی ہتھیاروں سے پاک رکھنے کا خطہ قرار دینے کی تجویز پیش کی تھی۔ 9 دسمبر 1974ء کو جنرل اسمبلی نے اکثریت سے پاکستانی تجویز منظور کر لی۔ صرف بھوٹان اور بھارت نے مخالفت میں جبکہ 96 ووٹ پاکستانی تجویز کی حمایت میں آئے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ پاکستان کافی عرصہ تک جنوبی ایشیاء کو ایٹم سے پاک خطہ قرار دینے کی قرارداد پیش کرتا آیا ہے اصولی طور پر جنرل اسمبلی نے اسے منظور بھی کر لیا لیکن بھارت مخالفت پر ڈٹا رہا اور پاکستانی قرارداد کو سبوتاژ کرنے کیلئے اس نے ایک اور قرارداد پیش کر دی جسے جنرل اسمبلی نے 1974/1975ء میں منظور کر لیا۔ اس قرارداد میں کہا گیا تھا کہ جنوبی ایشیاء کے ممالک اپنے خطے کو ایٹم سے پاک علاقہ قرار دینے کا فیصلہ آپس میں مل بیٹھ کر کریں گویا اس مسئلے کو بین الاقوامی کے بجائے علاقائی بنا دیا جائے۔ اس مرحلے پر چین اور دیگر دوست ممالک نے پاکستان کی بہت مدد کی بالآخر 1976ء کو جنرل اسمبلی کے اجلاس میں عالمی سلامتی کمیٹی نے پاکستان کی ابتدائی تجویز کی توثیق کر دی جس پر پھر بھی عمل نہیں ہو سکا۔ (ڈان کراچی 6 دسمبر 1976ء)

اس اجلاس میں بھارتی مندوبین نے پاکستان کے خلاف کھل کر دل کی بھڑاس نکالی۔ بھارت کے خارجہ سیکرٹری کیول سنگھ نے کمیٹی کے روبرو بحث کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان نے یہ تجویز جلدی میں پیش کی ہے اور جنوبی ایشیاء کو ایٹمی ہتھیاروں سے پاک خطہ قرار دیتے وقت دنیا کے مختلف علاقوں کی خصوصیات کو سامنے نہیں رکھا۔ افریقہ اور لاطینی امریکہ سیاسی اور جغرافیائی طور پر بالکل الگ اور واضح علاقے ہیں۔ اس اعتبار سے جنوبی ایشیا کو الگ خطہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ایشیا میں واقع مختلف ممالک کئی فوجی طاقتوں سے وابستہ ہیں اور اس طرح نیوکلیر طاقتیں ایٹمی ہتھیاروں سے پاک خطے کی بقا پر

Marfat.com

زبردست اثرانداز ہوں گی کے سبرامنیم کے نزدیک پاکستان نے مجوزہ خطہ کی مصنوعی حد بندی کی ہے اور اگر پاکستان جنوبی ایشیا اور جنوب مغربی ایشیا کا ملک ہے تو صرف جنوبی ایشیا کو نیوکلیر فری زون بنانے کا کیا جواز ہے۔ اس نے مزید کہا کہ کسی علاقے کو ایٹمی ہتھیاروں سے پاک خطہ قرار دینے سے پہلے اس میں شامل تمام ریاستوں سے مشورہ اور ان کی رضامندی لینا ضروری ہے۔ کیول سنگھ نے مزید اس بات پر زور دیا کہ اس عالمی تنظیم اور اس کے سیکرٹری جنرل کو خود ایٹمی ہتھیاروں سے پاک خطے کی سرپرستی نہیں کرنی چاہئے اور یو این او میں مباحثے سے قبل اس پر صلاح مشورہ کرنا چاہئے۔ بھارتی وفد کے ایک اور رکن بی۔ سی مشرا نے کہا کہ اس مسئلہ کا عملی پہلو بھی بھارتی نقطہ نظر کے خلاف ہے کیونکہ کسی ایسے معائنہ اور تصدیق کے نظام سے ہمارا متفق ہونا ناممکن ہے جس کا اطلاق صرف غیر ایٹمی ہتھیاروں والی ریاستوں کی پرامن سرگرمیوں سے ہو یا کم از کم تمام ریاستوں کی پرامن سرگرمیوں سے ہو جبکہ ایٹمی ہتھیاروں والی ریاستوں کی سرگرمیوں کو کھلا چھوڑ دیا جائے۔ آخر میں مسٹر مشرا نے یہ دلیل دی کہ جنوبی ایشیا براعظم ایشیا کا ایک حصہ ہے جو ایٹمی طاقتوں اور غیر ملکی فوجی اڈوں میں گھرا ہوا ہے۔ بھارت نے جنوبی ایشیا کو ایٹمی ہتھیاروں سے پاک خطہ قرار دینے کی مخالفت کی ہے اور بھارت کے سٹریٹیجک سٹڈی کمیشن کے چیئرمین نے پاکستان کی جنوبی ایشیاء کو ایٹمی ہتھیاروں سے پاک خطہ کی تجویز پر ردعمل دیا کہ یہ چین کے مقابلہ میں بھارت کو غیر مسلح کرنا ہے۔ (ڈان کراچی 17 نومبر 1974ء انٹرویو۔ کے سبرامنیم)

جنرل اسمبلی کے 1974ء کے ہی اجلاس میں پاکستانی وفد کے سربراہ آغا شاہی نے بھارتی موقف کے جواب میں کہا:
جنوبی ایشیا بھی ان علاقوں کی طرح سیاسی اور جغرافیائی طور پر ایک الگ علاقہ ہے جنہیں ایٹمی ہتھیاروں سے پاک خطہ قرار دیا گیا ہے یا دیا جا رہا ہے البتہ آغا شاہی نے واضح کیا کہ پاکستان کو مجوزہ خطے کی حدود کو ایشیا کے ممکن الحصول علاقوں تک وسیع کرنے پر کوئی اعتراض نہیں۔ اس علاقے میں بعض ریاستوں کی فوجی طاقتوں میں شمولیت اور ایٹمی طاقتوں کی قربت جنوبی ایشیا کو ایٹمی ہتھیاروں سے پاک خطہ بنانے سے نہیں روک سکتی۔ انہوں نے کہا کہ بڑی طاقتوں کے ساتھ معاہدے اور عہد نامے دوسرے علاقوں میں ایسے خطوں کی تشکیل میں رکاوٹ نہیں بن سکتے اور نہ ہی ایٹمی طاقتوں کی قربت مانع ہوئی ہے۔ ایٹمی طاقتوں کی قربت اس تجویز کے خلاف نہیں جاتی بلکہ اس وجہ سے ایٹمی ہتھیاروں سے پاک خطہ بنانا چاہئے ان اقدامات سے ہی چھوٹی طاقتوں کی سلامتی کو یقینی بنایا جا سکتا ہے۔ جنوبی ایشیا کی تمام ریاستیں بنگلہ دیش، بھوٹان، بھارت، نیپال، پاکستان اور سری لنکا پہلے ہی یک طرفہ طور پر جنوبی ایشیا میں ایٹمی ہتھیاروں کی مخالفت کر چکی ہیں اس لئے اب جنوبی ایشیا کو مجوزہ خطہ بنانے کا بہترین موقع ہے۔

آغا شاہی نے بھارت کے اس موقف کو مسترد کر دیا کہ مجوزہ خطہ پر اسمبلی میں بحث سے قبل علاقے کی ریاستوں سے صلاح مشورہ کیا جائے۔ انہوں نے افریقہ کی مثال دی کہ جنرل اسمبلی نے نائیجیریا کی تحریک پر اسے ایٹمی ہتھیاروں سے پاک علاقہ قرار دیا تھا اور اس سے قبل متعلقہ ریاستوں سے مشورہ نہیں لیا گیا تھا۔ البتہ انہوں نے تجویز کیا کہ ایٹمی تنصیبات کے معائنہ اور توثیق کیلئے ایک مساوی اور غیر امتیازی نظام کو عملی شکل دینے سے قبل ان سے مشورہ کر لینا چاہئے۔ (پاکستان ٹائمز راولپنڈی 17 نومبر 1974ء)

Marfat.com

پاکستان کا نیوکلیئر پروگرام

پاکستان نے ایٹمی ٹیکنالوجی کے حصول کیلئے تحقیق کا آغاز 1950ء میں کیا۔ معدنی ایندھن اور پن بجلی کے وسائل کی کمیابی کی بناء پر اس نے ایک پرامن' شفاف اور محض توانائی کی پیداوار کے اغراض کیلئے مخصوص پروگرام شروع کیا۔ اس کے چھوٹے تحقیقاتی تعامل گر (ری ایکٹر) اور 1972ء میں کینیڈا کے تعاون سے کراچی میں قائم جوہری توانائی سے بجلی پیدا کرنے والے پلانٹ کو بین الاقوامی ایجنسی برائے جوہری توانائی کے تحفظات اور نگرانی میں رکھا گیا۔ بلاشبہ کچھ پاکستانی تجزیہ کاروں نے (جنوبی ایشیا کی) غیر متوازن جوہری صورت حال کے تناظر میں پاکستان کے جوہری استحصال (بلیک میل ہونے) کے احتمالات کے پیش نظر بھارت کے پروگرام کو تشویش کی نگاہ سے دیکھا لیکن حکومت نے توانائی اور دفاع کے دوہرے مقاصد کیلئے استعمال ہونے والے پلانٹ لگانے کیلئے بھی وسائل فراہم نہیں کئے۔ حالانکہ اس وقت بیرونی مداخلت اور معائنہ کے بغیر ایسا کیا جا سکتا تھا کیونکہ صنعتی ممالک نے اس وقت تک جوہری تفقیے کی برآمد کے خلاف موثر اقدامات نہیں کئے تھے۔ فی الواقع پاکستان نے 1960ء میں فرانس کی ایک کمپنی کی طرف سے پلوٹونیم کو علیحدہ کرنے والا پلانٹ مہیا کرنے کی پیش کش ٹھکرا دی تھی۔ حتیٰ کہ 1968ء میں پاکستان این پی ٹی میں شامل ہونے پر بھی آمادہ ہو گیا تھا بشرطیکہ بھارت بھی ایسا ہی کرتا۔

پاکستان نے بھارتی خطرے کے مقابلے کیلئے 1971ء کے بعد اس وقت جوہری اسلحہ بنانے کی صلاحیت حاصل کرنے کی کوششیں شروع کیں جب بھارت نے فوجی طاقت کے ذریعے مشرقی پاکستان کو علیحدہ کر کے بنگلہ دیش بنا دیا اور پاکستان کو اپنی علاقائی سلامتی کے تحفظ کیلئے روایتی اسلحہ تک محدود دفاعی صلاحیت کے ناکافی ہونے کا احساس ہوا۔ 1972ء کے اوائل میں وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے مبینہ طور پر پاکستانی سائنسدانوں سے جوہری صلاحیت حاصل کرنے کے امکانات پر غور کرنے کیلئے ملاقات کی۔ (ٹیرو السمان ہربرٹ کرونی The Islamic Bomb-180)

بھارت کے جوہری دھماکہ کے بعد بھٹو نے کہا: ''میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہم یہ تہیہ کئے ہوئے ہیں کہ ہمیں اس خطرے سے دھمکایا نہیں جا سکے گا۔'' 1976ء میں پاکستان نے فرانس سے پلوٹونیم کی کشید کیلئے ''ری پراسسنگ پلانٹ'' حاصل کرنے کا معاہدہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی پاکستان نے داخلی طور پر یورینیم کی افزودگی کا پروگرام بھی شروع کر دیا۔ بھارت جوہری توانائی میں ترقی کو تکنیکی اور اقتصادی شعبوں میں ترقی کیلئے ضروری قرار دیتا رہا ہے' لیکن بھارتی لیڈروں نے 1948ء میں وزیر اعظم جواہر لال نہرو کی طرف سے اعلان کردہ جوہری توانائی کے ''دیگر مقاصد'' کو بھی پیش نظر رکھا۔ کھلے عام تو جوہری توانائی کے پرامن استعمال پر زور دیا جاتا رہا' لیکن عملاً ہتھیاروں کے حصول ہی کو ترجیح دی جاتی

Marfat.com

رہی۔ بھارت بجلی پیدا کرنے کے اپنے پہلے جوہری پلانٹ کی تعمیر و تنصیب سے بھی کئی سال قبل' 60ء کی دہائی کے اوائل میں' استعمال شدہ ایندھن سے پلوٹونیم کی کشید کیلئے تصفیہ جوہری نو تعامل (ری پراسسنگ پلانٹ) قائم کر چکا تھا۔ اس سے قبل وہ کینیڈا سے نام نہاد ری ایکٹر حاصل کر چکا تھا جو مکمل طور پر ہتھیار بنانے کے قابل پلوٹونیم تیار کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

بھارت نے عالمی سطح پر جوہری ہتھیاروں کے خاتمہ کا ڈھنڈورا تو بہت پیٹا مگر اسلحہ کے عدم پھیلاؤ کی ہر تجویز کو یہ بہانہ بنا کر رد کرتا رہا کہ یہ امتیازی ہے۔ قطع نظر اس کے کہ بھارت کی اس پالیسی کا مقصد اپنے اصل عزائم کی پردہ پوشی تھا یا کچھ اور؟ یہ بات ریکارڈ سے ثابت ہے کہ بھارت مکمل طور پر اپنے ہی زیر انتظام' جوہری ہتھیاروں کی تیاری کے متعین مقصد کے ساتھ' نیوکلیائی ایندھن کی تیاری کے ایک کامل سلسلہ (cycle) کو ترقی دینے اور اپنے اس انتخاب کو برقرار رکھنے کے منصوبے پر مسلسل عمل پیرا رہا۔ بھارت میں جوہری حیثیت کو بڑی طاقت کے مقام کے حصول کا ذریعہ سمجھا جاتا رہا ہے جس کی خواہش بھارتی رہنما ایک عرصے سے کرتے آرہے ہیں۔ (انسائیکلو پیڈیا آف کانگریس ص 506)

آزادی سے بھی پیشتر نہرو' جو بھارت کے دفاعی نظام و خارجہ پالیسی کی ہیئت حاکمہ (establishment) کے گورو اور اتالیق تھے' بھارت کو دنیا کی چار بڑی طاقتوں میں سے ایک اور مغربی' جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا میں ایسی ''مرکزی'' اہمیت کا حامل دیکھنا چاہتے تھے جسے مانرو ضابطہ (Monroe Doctrine) نافذ کرنے کا حق حاصل ہو۔

(بھارت مغربی جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیائی کور۔ نہرو حصہ سوم ص 133)

بھارت کی جوہری پالیسی گو کئی سال پہلے ہی تشکیل پا چکی تھی لیکن 1962ء میں چین کے ساتھ سرحدی جھڑپ...... جس میں بھارت نے محسوس کیا کہ اس کی سبکی ہوئی ہے...... اور چین کی طرف سے 1964ء میں جوہری دھماکہ کرنے کے بعد اس نے جوہری ہتھیار بنانے کی صلاحیت کے حصول کیلئے کوششیں تیز کر دیں۔ بھارت نے آخر کار مئی 1974ء میں نام نہاد ''پرامن دھماکہ'' کر کے اپنی ان کوششوں میں کامیابی کا مظاہرہ کیا۔ اس دھماکہ میں استعمال ہونے والی پلوٹونیم کینیڈا سے درآمد کردہ ری ایکٹر سے حاصل کی گئی تھی جس میں امریکہ کا فراہم کردہ بھاری پانی استعمال ہوا۔

دھماکہ بھارت نے کیا لیکن سزا پاکستان نے بھگتی۔ بھارت کی جانب سے اپنے اعتماد کو ٹھیس پہنچائے جانے پر بھنائے ہوئے کینیڈا نے فوری طور پر پاکستان کے ساتھ بھی جوہری تعاون ختم کر دیا حالانکہ پاکستان کی طرف سے اشتعال کی کوئی وجہ فراہم نہیں کی گئی تھی۔ کراچی کے بجلی پیدا کرنے والے ری ایکٹر کیلئے ایندھن کی فراہمی تک روک لی گئی۔ دوسرے صنعتی ممالک کی طرف سے بھی (جوہری) تکنیکی منتقلی کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ چنانچہ جوہری توانائی کے پرامن استعمال کا پاکستانی پروگرام تقریباً رک گیا۔ جب پاکستان نے جوہری صلاحیت حاصل کرنے کی کوششیں شروع کیں تو اس کو سخت سزاؤں کا نشانہ بنایا گیا۔ امریکہ نے فرانس پر دباؤ ڈالا کہ وہ پاکستان میں پلوٹونیم کی کشید کے پلانٹ کی تعمیر رکوا دے۔ امریکہ نے 1976ء اور 1977ء میں ایسے قوانین بھی بنائے جن کے تحت پاکستان کی اقتصادی امداد بھی اس وقت ختم کر دی گئی جب اس نے یورینیم کی افزودگی کے پلانٹ کی تعمیر شروع کی۔ چونکہ سمنگٹن اور گلن ترامیم کا اطلاق ماضی میں (یعنی ان ترامیم کی تنفیذ سے قبل کے زمانے میں) جوہری ہتھیاروں کے حصول کی کوششیں کرنے والے ممالک پر نہیں کیا گیا۔ اس لئے ان میں بھارت اور اسرائیل کو امداد کی معطلی/خاتمہ سے چھوٹ مل گئی۔ البتہ یہ بات ناقابل فہم ہے کہ بھارت

Marfat.com

نے 80 کی دہائی میں یورینیم افزودہ کرنا شروع کیا تو بھی اس کی امداد ختم کرنے کیلئے اس پر ان قوانین کا اطلاق نہیں کیا گیا۔مزید برآں واشنگٹن (انتظامیہ) نے فرانس کو بھارت کے' تارا پور میں واقع امریکہ کے فراہم کردہ' بجلی کی پیداوار کے پلانٹ کیلئے افزودہ یورینیم مہیا کرنے پر آمادہ کر کے' 1978ء کے جوہری عدم پھیلاؤ کے اپنے ہی قانون سے چشم پوشی کی۔ یہ قانون دیگر امور کے علاوہ ان ممالک کو جوہری مواد کی فراہمی پر بھی پابندی لگاتا ہے جو اپنی جوہری تنصیبات پر جوہری توانائی کے عالمی ادارہ (IAEA) کی نگرانی قبول نہیں کرتے۔

بھارت، جو اپنے لئے تو جوہری ہتھیار بنانے کا راستہ کھلا رکھنا چاہتا تھا، پاکستان کے لئے یہ راستہ بند کرنے کی کوششوں میں شریک ہوگیا۔اپنی سفارتی برتری اور پروپیگنڈہ (مشینری) کو بروئے کار لاتے ہوئے اس نے پاکستان کو (جوہری) پلانٹ کی منتقلی کے خلاف مہم شروع کی۔اس نے پاکستان کے جوہری پروگرام کو' اسلامی بم' بنانے کے منصوبہ کے طور پر پیش کرنا شروع کیا تاکہ اسلام کے خلاف اہل مغرب کے سینوں میں دفن صدیوں کے تعصب اور کینہ کو از سر نو ابھارا جاسکے۔ 80ء کی دہائی کے اوائل میں بھارتی فوجی کمان نے کہوٹہ میں نصب یورینیم کی افزودگی کے پلانٹ پر حملہ کر کے اسے تباہ کرنے کے ایک منصوبہ پر بھی غور و خوض کیا۔(بحوالہ انٹرویو جنرل (ر) حمید گل نوائے وقت۔18 ستمبر 1995ء)

رکاوٹوں اور امتیازی دباؤ کا مقابلہ کرتے ہوئے پاکستان یورینیم کی افزودگی کا پلانٹ تیار کرنے اور جوہری دھماکہ کرنے کا تقنیہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔اب پاکستان یہ تو تسلیم کرتا ہے کہ اس نے جوہری صلاحیت حاصل کرلی ہے لیکن فعلاً جوہری ہتھیار بنانے کی تردید کرتا ہے۔اندازہ ہے کہ 1990ء تک پاکستان کے پاس 10 سے زائد مہلک ہتھیار بنانے کیلئے درکار مقدار میں افزودہ یورینیم موجود تھی۔دوسری جانب بھارت نے ہیروشیما پر گرائے جانے والے جوہری بم جیسے ایک سو بموں کیلئے درکار پلوٹونیم ذخیرہ کرلی ہے۔خیال کیا جاتا ہے کہ صرف کینیڈا سے حاصل کردہ 40 میگاواٹ کے تعامل گر (ری ایکٹر) میں اس مقصد (ایک سو جوہری بموں) کیلئے درکار 500 کلوگرام پلوٹونیم میں سے 400 کلوگرام تیار کی گئی جبکہ باقی سو کلوگرام پلوٹونیم 100 میگاواٹ کے دھروا (Dhruva) ری ایکٹر سے حاصل کی گئی۔ بھارت نے یورینیم افزودہ کرنے کا عمل بھی شروع کردیا ہے۔جس کو ''حراری جوہری'' (Thermonuclear) ہتھیار بنانے میں پلوٹونیم کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔بھارت کی طرف سے ماضی میں پیش کی جانے والی یہ وضاحت کہ وہ پلوٹونیم کو ایندھن کے طور پر استعمال کرنا چاہتا ہے' ہمیشہ سے مشکوک رہی ہے۔کیونکہ ہتھیاروں کیلئے مخصوص پلوٹونیم' جو وہ جمع کرتا رہا ہے انتہائی زہریلی اور ایندھن کے طور پر استعمال کیلئے بہت مہنگی ہے۔پلوٹونیم کا وہ بریڈر ری ایکٹر جس کے بارے میں بھارت کہتا تھا کہ وہ اس میں پلوٹونیم استعمال کرنا چاہتا ہے' تکنیکی لحاظ سے نقائص کا حامل (problematic) تھا۔اگر بھارت پلوٹونیم کو ایندھن کیلئے ہی استعمال کرنا چاہتا ہے تو اسے ہتھیاروں میں ناقابل استعمال اس پلوٹونیم سے استفادہ کرنا چاہئے جو اسے اپنے متعدد بجلی پیدا کرنے والے ری ایکٹروں سے حاصل ہوسکتی تھی۔

پاکستان نے جوہری صلاحیت حاصل کرنے کے دوران میں بین الاقوامی قانون کے تحت عائد التزامات میں سے کسی کی بھی خلاف ورزی نہیں کی۔اس نے پرامن مقاصد کیلئے اسے فراہم کئے جانے والے پلانٹوں سے حاصل کردہ مواد کو بھی دوسرے مقاصد کیلئے استعمال نہیں کیا۔اس کے علاوہ پاکستان نے تجرباتی دھماکہ سے گریز کر کے عالمی رائے عامہ کے

Marfat.com

احترام کا بھی مظاہرہ کیا۔ پاکستان نے جوہری مواد اور تقنیہ کی منتقلی کے بارے میں بھی این پی ٹی کی ہدایات پر رضا کارانہ طور پر عمل درآمد کیا۔ اس ''حسن سلوک'' کے باوجود صرف پاکستان کو ہی مسلسل امریکہ کی طرف سے تعزیری اقدامات کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔

سلال بند کا تنازعہ:

مسئلہ کشمیر کی طرح سلال بند کا مسئلہ بھی پاکستان کیلئے ایک عرصہ تک دردسر بنا رہا کیونکہ بھارت کی یہ پالیسی رہی ہے کہ اگر ایک مسئلہ حل ہوگیا تو پھر دوسرا شروع کر دیا جائے' اسی طرح بھارت نے 1970ء میں پاکستان کو یہ تجویز پیش کی کہ وہ دریائے چناب پر سلال بند بنا رہا ہے کیونکہ پاکستان کو اس کی تعمیر سے آبپاشی کے نظام کو شدید خطرہ لاحق تھا اس لئے حکومت پاکستان نے 13 اکتوبر 1974ء کو بھارتی حکومت سے احتجاج کرتے ہوئے اس یکطرفہ کارروائی کو سندھ طاس معاہدے کی خلاف ورزی قرار دیا۔ 1960ء کے سندھ طاس معاہدے میں پاکستان کو اس بات کا تحفظ دیا گیا تھا کہ بھارت جب بھی مغربی دریاؤں چناب' جہلم اور سندھ پر پن بجلی کے منصوبے تعمیر کرے گا تو ان کا ڈیزائن اس انداز میں بنایا جائے گا کہ پاکستان کو ان دریاؤں سے پانی کی ترسیل متاثر نہ ہو۔ حکومت پاکستان نے اس مسئلے کو حل کرنے کیلئے بھارت کو مذاکرات کی پیش کش کی چنانچہ فنی سطح پر مذاکرات کا آغاز مئی 1975ء میں اسلام آباد سے ہوا۔ 18 اگست 1975ء کو پھر اسلام آباد میں مذاکرات منعقد ہوئے 29 ستمبر کو پاکستان نے یہ تجویز پیش کی کہ دریائے چناب پر بند کی تعمیر کے مسئلے میں ایک غیر جانبدار ماہر مقرر کیا جائے۔

چنانچہ 14 اکتوبر 1976ء کو سلال بند کے بارے میں پاکستان اور بھارت کے درمیان مذاکرات کے دو دور نئی دہلی میں ہوئے۔ پاکستانی وفد کی قیادت سیکرٹری وزارت خارجہ آغا شاہی نے جب کہ بھارتی وفد کی قیادت سیکرٹری خارجہ مسٹر جگت مہتہ نے کی۔ سلال بند سے متعلق مذاکرات چار روز تک جاری رہے' بات چیت کے نتیجے میں یہ اعلان کیا گیا کہ دونوں فریقوں نے سلال بند کے تنازعہ کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی غور کیا جس کے نتیجے میں اختلافات کم ہوگئے تاہم سلال بند کے ڈیزائن پر اتفاق نہ ہوسکا۔ آئندہ مذاکرات کیلئے 19 اکتوبر 1976ء کی تاریخ مقرر کی گئی۔ 19 اکتوبر کو اسلام آباد میں پھر مذاکرات ہوئے تفصیلی مذاکرات میں بعض اہم نکات پر طرفین میں مفاہمت ہوگئی جب کہ بعض امور پر مزید سوچ بچار کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ بات چیت نامکمل تھی کہ 5 جولائی 1977ء کو پاکستان میں مارشل لاء نافذ ہوگیا۔ اس کے بعد بھی اس مسئلے پر بات چیت ہوئی بالآخر 14 اپریل 1978ء کو دونوں ملکوں کے درمیان سمجھوتہ طے پا گیا۔ سمجھوتے پر پاکستان کی طرف سے مسٹر آغا شاہی اور بھارت کی طرف سے اٹل بہاری باجپائی نے دستخط کئے۔ معاہدے کے تحت بھارت اور پاکستان کی مرضی کے بغیر اس کے ڈیزائن میں تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔

معاہدے کے اہم نکات یہ تھے:

دفعہ نمبر 1: سلال بند کے ذخیرہ آب کی سطح 1600 فٹ سے زیادہ بلند نہیں ہوگی اور اس کی سطح کو مستقل طور پر قائم رکھا جائے گا ذخیرہ آب کی گنجائش 230302 ایکڑ فٹ سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اسپل وے کے بارہ دروازے ہوں گے جو پچاس فٹ چوڑے اور تیس فٹ اونچے ہوں گے۔ بجلی پیدا کرنے کیلئے ذخیرہ آب پوری سطح سے 27,5

Marfat.com

فٹ کم سے کم نیچی ہوگی۔ پانی کی نکاسی کے چھ راستے ہوں گے۔ سطح 1365 فٹ سے کم نہ ہوگی۔

دفعہ نمبر 2: بھارت دفعہ (ا) میں بیان کردہ پلانٹ کے ڈیزائن کی خصوصیات میں باہمی سمجھوتے کے بغیر کوئی مزید ردوبدل نہیں کرے گا۔

دفعہ نمبر 3: اگر اس سمجھوتے کی تشریح یا اس کے اطلاق کے بارے میں فریقین کے درمیان کوئی سوال پیدا ہوا یا اگر کسی ایسی حقیقت کی موجودگی ثابت ہوئی جس سے اس سمجھوتے کی خلاف ورزی ہوتی ہو تو معاہدہ سندھ طاس کی دفعہ (ا) کی شقوں کے تحت اس سے نمٹا جائے گا۔

4- اس سمجھوتے میں جو امور واضح نہیں کئے گئے وہ سندھ طاس معاہدے کے تحت انجام پائیں گے۔

5- سمجھوتے میں جو اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں ان کا وہی مفہوم لیا جائے جو سندھ طاس معاہدے میں لیا گیا تھا۔

6- فریقین کے دستخط ہونے پر یہ سمجھوتہ نافذ ہوگا۔ جس پر آج 14 اپریل 1978ء کو اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں دستخط ہوئے۔ تینوں زبانوں کے متن یکساں اور مصدقہ ہیں لیکن کسی شک کی صورت میں انگریزی متن صحیح تصور کیا جائے گا۔

دستخط	دستخط
اے بی واجپائی وزیر خارجہ بھارت	آغا شاہی مشیر امور خارجہ پاکستان

Marfat.com

1978ء تا 1988ء

5 جولائی 1977ء کو پاکستان میں چیف آف آرمی سٹاف جنرل ضیاء الحق نے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کا تختہ اُلٹ کر مارشل لاء نافذ کر دیا۔ وزیراعظم بھٹو اور قریباً تمام اپوزیشن سیاسی راہنماؤں کو ''حفاظتی اقدامات'' کی آڑ میں ریسٹ ہاؤسز میں پہنچا کر جنرل ضیاء الحق نوے دنوں کیلئے سرپر آرائے تخت ہو گئے۔ یہ نوے دن پھر قریباً گیارہ سال پر محیط ہوئے اور جنرل ضیاء الحق مرحوم کی رخصتی سی 130 طیارے کے ہولناک حادثے میں ہوئی۔ جس نے نہ صرف صدر پاکستان اور چیف آف آرمی سٹاف بلکہ ان کے ساتھ کئی اور آرمی کے شہ دماغوں اور امریکی سفیر کو بھی نگل لیا۔ بلاشبہ یہ پاکستان کی تاریخ کا ایک سانحہ تھا۔ کسی بھی ملک پر اس ملک کی فوج کا قابض ہونا ہمارے نزدیک تو اب ''معمول کی کارروائی'' بن چکی ہے لیکن مہذب دنیا میں اس کا بہت سخت نوٹس لیا جاتا ہے۔ جس ملک پر مارشل لاء مسلط ہو جائے اس کی خارجہ پالیسی اور عالمی تعلقات کو بھی زبردست دھچکا لگتا ہے۔ ضد اور انا کو ایک طرف رکھ کر اگر ایمانداری سے پاکستان کی مارشل لاء حکومتوں کا تجزیہ کیا جائے تو سوائے اس کے اور کچھ دکھائی نہیں دے گا کہ ان حکومتوں کو امریکہ نے اپنے مخصوص مقاصد کیلئے استعمال کیا وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو اپنے دورِ حکومت کے آخری ایام میں بھارت سے سلال ڈیم کے معاملات نمٹا رہے تھے۔ سلال ڈیم پر باقاعدہ معاہدہ جنرل ضیاء الحق کے مارشل لائی دور میں ہوا۔

مارچ 1977ء میں بھارت میں انتخابات کے بعد جنتا پارٹی کی حکومت قائم ہوئی جس کے وزیراعظم مرار جی ڈیسائی اور وزیر خارجہ اٹل بہاری واجپائی تھے۔ مسٹر واجپائی نے ہی سلال ڈیم کا معاہدہ کیا تھا۔ 4 اپریل 1977ء کو انہوں نے بھارتی راجیہ سبھا میں تقریر کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ پاکستان اور بھارت کو آپس میں جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کر لینا چاہئے۔ اس بیان کے ردعمل میں اگلے ہی روز 8 اپریل کو پاکستانی وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے کہا کہ پاکستان ایک پرامن ملک ہے اور رہے گا بھی ہمسائے سے جنگ کا متحمل نہیں ہو سکتا اگر بھارت کی طرف سے مسئلہ کشمیر کے تصفیہ کیلئے کسی بھی ثالثی کی یقین دہانی کروا دی جائے تو انہیں جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرنے میں کوئی اعتراض نہیں بصورت دیگر ایسا معاہدہ کرنے سے یہ تاثر قائم ہو گا کہ پاکستان مسئلہ کشمیر کی موجودہ صورت کو تسلیم کر لیا ہے۔

(Keesing's Contemporary Archives, 1978 P, 29018)

پاکستان میں مارشل لاء نافذ ہوا تو صدر ضیاء الحق کو بھارت سے دوستی کا شوق چرایا اور آپ نے سرکاری سطح پر بھارتی حکومت کو مطلع کیا کہ پاکستانی حکومت دونوں ممالک کے درمیان معاہدات کا احترام کرے گی۔ اس بیان کا جنتا سرکار نے خیر مقدم کیا اور وزیر خارجہ واجپائی نے پاکستان کا دورہ کیا۔ یہ دورہ سلال بند معاہدے کے حوالے سے تھا۔ مسٹر واجپائی نے پاکستان سے روانگی کے بعد بھارتی سرزمین پر قدم رکھتے ہی جو بیان داغا اس میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے۔ (ڈان 30 ... 1977ء)

Marfat.com

اس بیان نے جنرل ضیاء الحق کو سمجھا دیا کہ بھارت کو کوئی بھی پیشکش کرنے سے پہلے کئی مرتبہ غور کرنا ضروری ہے جنرل ضیاء الحق نے یکم جنوری 1978ء کو ایک پریس کانفرنس میں کشمیر کے حوالے سے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ کشمیر کو نظر انداز کرنا پاکستان کیلئے ہرگز ممکن نہیں' نہ ہی کشمیر کو بھارت کا اٹوٹ انگ تسلیم کرتے ہیں۔

(صدر پاکستان ضیاء الحق کی تقاریر حصہ دوم ص 43)

6 فروری 1978ء بھارت کے سابق وزیر خارجہ سورن سنگھ 1966ء کے قریباً گیارہ سال بعد خیر سگالی دورے پر پاکستان آئے بھارتی وزیر خارجہ اٹل بہاری واجپائی ان کے ہمراہ تھے اپریل 1978ء میں پاکستان کے وزیر خارجہ آغا شاہی نے بھارت کا دورہ کیا اور سلال ڈیم کا معاہدہ طے پایا۔ پاکستان کی اشک شوئی کیلئے بھارت نے کشمیر پر بھی مذاکرات کئے لیکن اس مسئلے پر کوئی با مقصد اور با قاعدہ گفتگو نہیں کی گئی۔ (Pakistan 1977-78 Official Handbook P-143)

بھارت کیلئے جہاں 14 اگست 1947ء کے فوراً بعد پاکستان کا قیام نا قابل برداشت ہوگیا تھا اسی طرح اس کیلئے 1962ء کے بعد سے پاکستان اور چین کے بڑھتے ہوئے تعلقات بھی آج تک مسئلہ بنے رہے ہیں۔ بھارت کی ہمیشہ کوشش رہی ہے پاکستان اور چین کی دوستی کے حوالے سے کوئی نہ کوئی مسئلہ ضرور کھڑا کرے۔ پاکستان اور چین کی سرحدیں جس جگہ ملتی ہیں بھارت کی طرف سے یہ عجیب وغریب اور انتہائی فضول قسم کی بڑہانکی جاتی ہے کہ وہ بھی کشمیر کا حصہ ہے اور خصوصاً پاکستان اور چین کے درمیان قائم شاہراہ ریشم یعنی قراقرم کو بھارت متنازعہ بنانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔

28 جون 1978ء کو بھارت نے شاہراہ قراقرم کی تعمیر پر واویلا شروع کردیا کہ یہ علاقہ بھارت کے نام نہاد اٹوٹ انگ کشمیر کا حصہ ہے اسلئے اس شاہراہ کی تعمیر غیر قانونی ہے اور پاکستان کو اس کا کوئی حق نہیں ہے۔ اگلے ہی روز 29 جون کو پاکستان نے احتجاج مسترد کردیا کیونکہ یہ علاقہ متنازعہ نہیں بلکہ پاکستان کا حصہ تھا اور اس میں ترقیاتی کاموں (شاہراہ قراقرم) پر بھارت کو اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ 4 اکتوبر 1978ء کو اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد کے سربراہ اور صدر کے مشیر امور خارجہ آغا شاہی نے دوسری باتوں کے علاوہ اقوام متحدہ کی قراردادوں کی بنیاد پر مسئلہ کشمیر کو حل کرنے پر زور دیا۔ جنتا پارٹی کے دور میں اگرچہ بھارت کا پاکستان کی طرف عمومی رویہ خیر سگالی کا رہا لیکن اس نے کشمیر کے بارے میں اپنا موقف نہ بدلا۔ 6 دسمبر 78ء کو بھارتی وزیر خارجہ اٹل بہاری واجپائی نے کشمیریوں کے حق خودارادیت کے مسئلہ کو پاکستان کی طرف سے بار بار اٹھانے پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کشمیر کا نام لے کر آگے سے نہ کھیلے۔ کشمیر کا مستقبل بھارت سے وابستہ ہے۔ • (Pakistan Horizone Vol. XXXII P.809)

17 مئی 1980ء کو اسلامی وزرائے خارجہ کی گیارہویں کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے جنرل ضیاء الحق نے کہا کہ ریاست جموں وکشمیر کا پرانا اور اہم مسئلہ ابھی طے نہیں ہوا اور اس کے عوام نے ابھی اپنے حق خودارادیت کا استعمال کرنا ہے۔ اس مسئلہ کا تصفیہ پاک بھارت تعلقات کی بہتری میں اہم کردار ادا کرے گا جو علاقے میں امن واستحکام کیلئے ناگزیر ہے۔ ہم اس مسئلہ کو شملہ معاہدہ اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق حل کرنے کا عہد کئے ہوئے ہیں۔ یکم اکتوبر

Marfat.com

1980ء کو اسلامی ممالک کے نمائندہ کی حیثیت سے جنرل ضیاء الحق نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے مسئلہ افغانستان فلسطین اور مسئلہ کشمیر کے حل پر زور دیا۔ انہوں نے معاہدہ شملہ کے تحت بحالی تعلقات کے عمل کی ترقی کا ذکر کیا اور کہا کہ اس میں مزید اضافہ مسئلہ کشمیر کے پرامن حل سے ہو سکتا ہے اور اس مسئلہ پر پاکستانی موقف بین الاقوامی تسلیم شدہ اصولوں پر مبنی ہے۔ (روزنامہ نوائے وقت 2 اکتوبر 1980ء)

اقوام متحدہ میں بھارتی وزیر خارجہ نرسیما راؤ نے کہا کہ کشمیر کے بارے میں اب اس کے فیصلے زائد المیعاد اور غیر موثر ہو چکے ہیں اور پاکستانی لیڈروں کے بیان معاہدہ شملہ کے خلاف ہیں اور کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے۔ اس کے جواب میں پاکستانی مندوب ڈاکٹر مقبول بھٹی نے کہا کہ بھارتی وزیر خارجہ کے ریمارکس ان معاہدوں کے بالکل برعکس ہیں شاید انہیں معاملات کا صحیح ادراک نہیں ہے۔ پاکستان اور بھارت دوطرفہ معاہدوں، سمجھوتوں اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کے پابند ہیں۔ نرسیما راؤ نے جو کچھ کہا وہ جموں کشمیر کے تنازعے کی صحیح عکاسی نہیں کرتا۔

(اداریہ نوائے وقت...... 4 نومبر 1980ء)

تاریخ کروٹ بدل رہی تھی۔ پاکستان میں مارشل لاء حکومت کے قیام کے ساتھ ہی عالمی شاطر امریکہ نے اس خطے میں نئے مہرے سجا دیئے تھے اور اب وہ ساری دنیا پر حکمرانی کے اپنے خواب کی تعبیر تلاش کرنے کے جتن کر رہا تھا۔ افغانستان میں شورش کا آغاز ہو چکا تھا اور پاکستان پر افغان مہاجرین کا دباؤ بڑھنے لگا تھا۔ روسی افواج سی آئی اے کی چال کا شکار ہو کر افغانستان میں گھس آئی تھیں اور افغان روزانہ ہزاروں کی تعداد میں سرحد عبور کر کے پاکستان میں داخل ہو رہے تھے۔ پاکستان اور افغانستان کی حکومتوں کے درمیان تو کبھی مثالی تعلقات نہیں رہے لیکن سرحد کے آر پار رہنے والے پٹھانوں کے درمیان صدیوں سے قائم روابط اور رشتہ داریاں حکومتی تعلقات کی محتاج نہیں رہیں یہی وجہ تھی کہ افغان مہاجرین پاکستان کو اپنا ہی برادر ملک جان کر پاکستان میں داخل ہو رہے تھے۔ اس صورت حال پر پاکستان حکومت کی سلامتی کو بہر حال خطرات لاحق تھے اور طے شدہ منصوبے کے مطابق پاکستان کی مارشل لاء حکومت نے اس خطرے کے تدارک کیلئے امریکہ کا رخ کیا امریکہ اور پاکستان کے درمیان ہتھیاروں کی خرید و فروخت کا پانچ سالہ منصوبہ طے پا گیا امریکہ نے پاکستان کو 3 ارب ڈالر کی امداد دینے کا اعلان کیا جس میں جدید ترین ایف۔16 طیارے بھی شامل تھے۔ بھارت نے حسب روایت اس پر واویلا شروع کر دیا اور خدشہ ظاہر کیا کہ اس طرح برصغیر میں طاقت کا توازن بگڑ جائے گا۔ (بھارت یہ سمجھتا ہے کہ طاقت کا توازن صرف اس طرح قائم رہ سکتا ہے کہ وہ اسلحہ کے ڈھیر لگاتا رہے اور ہمسایہ ملک منہ دیکھتے رہیں) تاریخ کا پہیہ اچانک الٹا گھومنے لگا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے بھارت کی طرف سے جنگ نہ کرنے کے معاہدے سے بھٹو حکومت نے اس لئے انکار کر دیا تھا کہ جب تک کشمیر کا مسئلہ حل ہونے کی یقین دہانی نہ ملے ایسا معاہدہ غلط فہمی پیدا کرے گا اور یہ سمجھا جائے گا کہ پاکستان اپنے دیرینہ موقف سے دستبردار ہو گیا ہے لیکن اب اس کے بالکل برعکس صورت حال پیدا ہوئی اور نومبر 1981ء میں پاکستان نے بھارت کو معاہدہ عدم جارحیت کی پیشکش کر کے بھارتی حکومت کو بھی چونکا دیا۔

Marfat.com

1949ء میں پہلی مرتبہ جواہر لال نہرو نے لیاقت علی خان کو جنگ نہ کرنے کے معاہدے کی پیشکش کی تھی بعد ازاں کئی مرتبہ اسے دہرایا گیا اور 1977ء میں جنتا سرکار کی طرف سے بھی پاکستان کو یہ پیشکش کی گئی تھی جسے اصولی بنیاد پر بھٹو حکومت نے ٹھکرا دیا تھا اور کہا تھا کہ قضیہ کشمیر طے ہوئے بغیر ایسا معاہدہ کرنا موجودہ سرحدوں کو مستقل تسلیم کرنے کے مترادف ہوگا۔

1981ء میں پاکستان اپنے اس اصولی موقف سے دستبردار ہوگیا اور جنگ نہ کرنے کے معاہدے کو معاہدہ کشمیر سے الگ کر دیا گیا۔ یہ سعادت بھی مارشل لاء حکومت کے حصے میں آئی۔ بہر حال پاکستان نے کشمیر پر اپنا ''اصولی موقف'' برقرار رکھا۔ البتہ اپنے رویے میں لچک پیدا کر لی۔ حیرت انگیز طور پر پاکستان نے اس مرحلے پر مسئلہ کشمیر کا ذکر کرنا بھی ضروری نہ سمجھا کیونکہ ایسی کوئی بھی کوشش جنگ بند کرنے کے معاہدے کو مزید التواء میں ڈال سکتی تھی جو جنرل ضیاء الحق شاید پسند نہیں کرتے تھے۔

اکتوبر 81ء میں بھارتی وزیر خارجہ نرسیماراؤ نے اس بات کی تصدیق کر دی تھی کہ بھارت اپنی 1949ء کی جنگ نہ کرنے کے معاہدہ کی پیشکش پر قائم ہے اور پاکستان نے ہماری اس ابتدائی پیشکش کو اس واسطے رد کر دیا تھا کہ پہلے مسئلہ کشمیر حل کیا جائے۔ اس نے مزید دعویٰ کیا کہ پاکستان نے ابھی تک اپنی پوزیشن میں کوئی تبدیلی نہیں کی ہے۔ جیسا کہ آغا شاہی کے 21 ستمبر کے نیویارک کے بیان سے واضح ہے کہ ہماری آخری پیشکش 1949ء کی پوزیشن سے متصادم نہیں کہ جنگ نہ کرنے کے معاہدے کے ساتھ کشمیر کا تنازعہ حل کیا جائے۔ (Pak-Horizone Vol. XXXIV 1981, P-8)

ان حالات میں جب پاکستان نے سرکاری طور پر 22 نومبر 1981ء کو بھارت کو جنگ نہ کرنے کے معاہدہ کی پیشکش کی تو کشمیر کے بارے میں اپنی پوزیشن کی وضاحت کی کوشش نہ کی حالانکہ اس سے قبل معاہدہ عدم جارحیت کے بارے میں پاکستانی موقف میں کشمیر کو مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ اب پاکستان کی مشکل واضح تھی کہ مسئلہ کشمیر پر وہ اپنے موقف سے دستبردار نہیں ہوسکتا تھا۔ حکومت پاکستان کی اس مسئلہ پر خاموشی دونوں ملکوں میں فضا کو بہتر کیے بغیر پیشکش کے باقی رہنے میں مدد دے سکتی تھی۔ ابتداء میں بھارت نے پاکستان کی پیشکش کو ایک پھندا قرار دیا کہ یہ جنگی کارروائیوں کو چھپانے کی ایک چال ہے اور ایک منفی پیشکش ہے۔ بالآخر بھارت نے پاکستان کی پیشکش میں سنجیدگی کو تسلیم کر لیا اور جنوری 1982ء میں نئی دہلی میں وزرائے خارجہ کی ملاقات ہوئی تو مسز اندرا گاندھی نے پاکستانی پیشکش مثبت بنانے کیلئے معاہدہ دوستی اور مشترکہ کمیشن کی تجاویز پیش کر دیں۔ ان مذاکرات میں کمیشن کی تشکیل پر رضامندی کا اظہار کیا گیا جو بات چیت جاری رکھے گا۔ لیکن مسئلہ کشمیر نے غیر متوقع طور پر جلد ہی پاک بھارت تعلقات کو پھر متاثر کیا۔ معاہدہ عدم جارحیت مذاکرات کا دوسرا دور یکم مارچ 1982ء کو اسلام آباد میں ہونا تھا کہ بھارت نے اپنے خارجہ سیکرٹری آر ڈی ساٹھے کا دورہ پاکستان مسئلہ کشمیر کا جواز بنا کر غیر معینہ مدت کیلئے ملتوی کر دیا اور الزام لگایا کہ جنیوا میں انسانی حقوق کے کمیشن کے اجلاس میں پاکستانی مندوب نے جموں و کشمیر کے بارے میں ''قابل اعتراض بیان'' دے کر فضا کو مکدر کر دیا ہے۔ بھارت کا کہنا تھا کہ پاکستان کے نمائندے آغا ہلالی نے مسئلہ کشمیر کیلئے اقوام متحدہ کی قراردادوں کا حوالہ دیا ہے۔ انہوں نے مسئلہ کشمیر کو

Marfat.com

فلسطین اور نمیبیا کے مساوی قرار دیا ہے اور بھارتی مقبوضہ کشمیر میں یکے بعد دیگرے انتخابات کے بارے میں کہا کہ غیر ملکی فوجوں کی موجودگی میں ہونے والے انتخابات سے حق خود ارادیت کا حقیقی اظہار نہیں ہوسکتا۔ وزیر خارجہ نرسیما راؤ نے پاکستان پر یہ الزام بھی لگایا کہ وہ شملہ معاہدہ کی خلاف ورزی کر رہا ہے کیونکہ اس میں پاک بھارت تعلقات دوطرفہ طریقہ سے حل کرنے کا عہد کیا گیا ہے جبکہ پاکستان دوطرفہ مسائل کو عالمی سطح پر اٹھاتا ہے۔ اس نے مزید الزام لگایا ہے کہ پاکستان کشمیر کے ایک حصے پر زبردستی اور غیر قانونی قبضہ کیے ہوئے ہے۔

(Keesing's Contemporary Archieves P. 32746)

25 فروری کو پاکستان کے دفتر خارجہ نے بھارت کے اس دعوے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ معاہدہ شملہ تنازعات کے تصفیہ کیلئے صرف دوطرفہ طریقہ تجویز کرتا ہے اور آغا ہلالی نے مسئلہ کشمیر پر پاکستان کے نہ صرف عام موقف کو ہی دہرایا ہے۔ جسے پاکستان اور بھارت شملہ معاہدہ میں تسلیم کر چکے ہیں اور کئی عالمی فورم پر اس کی توثیق بھی ہو چکی ہے۔ اس طرح یہ خاردار مسئلہ نہ صرف معاہدہ عدم جارحیت کی پیش رفت میں ایک اہم رکاوٹ ہے بلکہ بھارت پاکستان معمول کے تعلقات کی بحالی میں بھی اکثر حائل رہا ہے۔

پاک بھارت تعلقات میں پہلے تعطل اس واسطے رہتا تھا کہ پاکستان نے جنگ نہ کرنے کے معاہدہ کو مسئلہ کشمیر سے منسلک کر رکھا تھا۔ اب اگرچہ پاکستان نے اپنے رویہ میں بڑی لچک پیدا کر لی اور وہ غیر مشروط طور پر جنگ نہ کرنے کے معاہدہ کیلئے تیار ہو گیا لیکن بھارت اب پاکستان کی طرف سے مسئلہ کشمیر کا ذکر تک برداشت نہیں کر سکتا۔ بھارت نے نئی دہلی میں پاکستان کے سفیر سے اس پر احتجاج کیا اور اس سے دھمکی آمیز لہجے میں یہ پوچھا کہ وہ آزاد کشمیر کب خالی کر رہے ہیں۔ (روزنامہ مشرق لاہور۔ 6 مارچ 1982ء)

نومبر 1982ء میں نئی دہلی میں جنرل ضیاء الحق اور اندرا گاندھی نے دوطرفہ تعلقات کو بہتر بنانے کے عمل کی روانی کو جاری رکھنے کیلئے اپنے افسروں کو ہدایت کی کہ دسمبر 1982ء میں مشترکہ کمیشن کے قیام کے سمجھوتے کا مسودہ تیار کریں۔ مارچ 1983ء میں غیر جانبدار ملکوں کی سربراہ کانفرنس میں شرکت کیلئے صدر پاکستان دہلی گئے تو اس موقع پر دونوں وزرائے خارجہ نے 10 مارچ 1983ء کو مشترکہ کمیشن قائم کرنے کے سمجھوتہ پر دستخط کر دیئے۔ پاکستان نے مسئلہ کشمیر کو جنگ نہ کرنے کے معاہدہ سے الگ تو کر دیا لیکن اس نے کشمیریوں کے حق خود ارادیت پر اپنا موقف نہیں بدلا۔ غیر جانبدار ملکوں کی سربراہ کانفرنس کے اجلاس میں صدر ضیاء نے اپنی تقریر میں مسئلہ کشمیر کا ذکر کیا اور کہا کہ ہمیں مساوی حاکمیت، قومی آزادی اور باہمی بھلائی کے جذبے کے تحت جموں و کشمیر کے مسئلے کا منصفانہ حل تلاش کرنا چاہیے۔

(ڈان کراچی۔ 11 مارچ 1983ء)

بھارتی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے 27 اکتوبر 1981ء کو پاکستان کی جانب سے معاہدہ عدم جارحیت پر تبصرہ کرتے ہوئے نئی دہلی میں کہا کہ صدر محمد ضیاء الحق نے عدم جارحیت کے سلسلے میں جو تجویز پیش کی ہے میں نے اس کی وضاحت مانگی ہے تاہم پاکستان بھارت سے جنگ نہ کرنے کے معاہدے کی بات ایک ایسے وقت پر کر رہا ہے جب متعدد ممالک سے دھڑا دھڑ اسلحہ اکٹھا کر رہا ہے۔ نیز وہ بھارت کے خلاف پروپیگنڈے میں مصروف ہے اس کے باوجود معاہدہ

Marfat.com

عدم جارحیت کی پیشکش کو مسترد کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (روزنامہ ڈان ۔28 اکتوبر 1981ء)

31 اکتوبر 1981ء کو پاکستان کے سیکرٹری خارجہ جناب ریاض پراچہ نے نئی دہلی میں کہا کہ پاکستان نے معاہدہ عدم جارحیت کی باضابطہ تجویز بھارت کے سپرد کر دی ہے۔ اس معاہدے میں یہ پیشکش کی گئی تھی کہ دونوں ملکوں میں سے کسی ایک پر بھی اگر کوئی تیسری طاقت حملہ کرے تو وہ (بھارت اور پاکستان) مل کر حملہ آور کا مقابلہ کریں گے۔ پاکستان کی یہ پیشکش بھارت کو 22 نومبر 1981ء کو موصول ہوئی۔ 25 نومبر 1981ء کو بھارتی وزیر خارجہ نرسیما راؤ نے پاکستان کی تجویز (معاہدہ عدم جارحیت) کو پروپیگنڈہ قرار دیا اور کہا کہ پاکستان کی تجویز سے اس کا اشارہ ملتا ہے کہ وہ پہلی بار بھارت کی اس تجویز کو قبول کرنے کیلئے تیار ہے جو بھارت نے بار بار پیش کی اور جسے پاکستان کئی بار مسترد کر چکا ہے۔ انہوں نے کہا کہ بھارت پاکستان سے اس مسئلے پر بات چیت کرنے کو تیار ہے لیکن بات چیت بھارت کی طرف سے 1949ء میں پیش کی گئی تجاویز کی بنیاد پر ہونی چاہئے۔ پاکستان کے وزیر خارجہ آغا شاہی نے اسلام آباد میں 3 دسمبر 1981ء کو کہا کہ پاکستان عدم جارحیت کے معاہدے پر بھارت سے فوری مذاکرات کیلئے تیار ہے۔ اس معاہدے کی پیشکش ہماری کوئی سفارتی چال نہیں بلکہ اخلاص پر مبنی سنجیدہ تجویز ہے دونوں ممالک موجودہ اور آئندہ تنازعات پر امن طور پر حل کرنے کا عہد کریں۔ جنرل ضیاء الحق نے وزیر آباد میں صحافیوں سے باتیں کرتے ہوئے کہا معاہدہ عدم جارحیت سے امن و آشتی کا ابدی دور شروع ہوگا۔ بھارت پاکستان کی طرف سے دوستی کی پیشکش کا جواب دے۔

10 دسمبر 1981ء کو لوک سبھا میں وزیر خارجہ نرسیما راؤ نے بیان دیتے ہوئے کہا کہ بھارت اپنی شرائط پر عدم جارحیت کا معاہدہ کرے گا۔ مذاکرات سے قبل بھارتی حکومت نے 24 دسمبر کو حکومت پاکستان سے چند وضاحتیں طلب کیں اس ضمن میں حکومت پاکستان نے 26 دسمبر کو اعلان کیا کہ حکومت جلد ہی اپنا جواب بھارت کو ارسال کر دے گی۔ اس کے ساتھ ہی بھارت کی طرف سے معاہدہ عدم جارحیت کیلئے دس نکات پیش کئے کچھ نکات یہ ہیں:

1- دونوں ملک ایک دوسرے کے خلاف طاقت کے استعمال سے گریز کریں گے۔
2- دونوں ملک یہ ضمانت بھی دیں گے کہ وہ اپنی سرزمین پر کسی غیر ملکی طاقت کو فوجی اڈے مہیا نہیں کریں گے۔
3- بھارت پاکستان سے ایٹمی ہتھیار تیار نہ کرنے کے سلسلے میں ضمانت حاصل کرے گا
4- دونوں ممالک اپنی جائز دفاعی ضروریات سے زیادہ مہلک ہتھیار حاصل کرنے کی دوڑ میں شریک نہیں ہوں گے۔
5- دونوں ممالک علاقے میں امن و استحکام کی فضا قائم کرنے کا عہد کریں گے۔ 30 جنوری 1982ء کو بھارتی وزیر خارجہ اور پاکستانی وزیر خارجہ مسٹر نرسیما راؤ اور مسٹر آغا شاہی کے مابین معاہدہ عدم جارحیت پر مذاکرات شروع ہوگئے۔ بات چیت کے پہلے دور میں ان شبہات اور غلط فہمیوں کی وضاحت کی گئی جو اس سلسلے میں ظاہر کی گئی تھیں لیکن معاملات گفتند نشستند برخاستند تک محدود رہے۔

30 جنوری 1982ء کو بھارتی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے کہا کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان عدم جارحیت کا ایک اور معاہدہ (معاہدہ شملہ) موجود ہے لہٰذا نیا معاہدہ دوستی کا معاہدہ ہونا چاہئے۔ 31 جنوری کو بھارتی وزیر اعظم نے پاکستان اور بھارت کے معاملات کو طے کرنے کیلئے دو طرفہ معاملات کا مشترکہ کمیشن قائم کرنے پر زور دیا۔

Marfat.com

یکم فروری 1982ء کو ایک مشترکہ بیان میں دونوں ملکوں کے وزراء خارجہ نے کہا کہ معاہدہ عدم جارحیت کے کئی بنیادی نکات پر مفاہمت ہوگئی ہے نیز رابطہ جاری رکھنے پر بھی اتفاق رائے ہوا۔ بعدازاں بات چیت میں تعطل پیدا ہوگیا اور اواخر اپریل تک کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔

30 اپریل کو وزیر خارجہ بھارت مسٹر نرسیما راؤ نے کہا کہ بھارت نے عدم جارحیت کے معاہدے پر بات چیت پھر شروع کرنے کیلئے پاکستان سے وضاحت چاہی ہے۔ وزیر خارجہ نے صدر پاکستان کے ان جملوں پر اعتراض کیا جو انہوں نے ایک بھارتی صحافی کے ساتھ ایک انٹرویو میں کہے تھے کہ گلگت' ہنزہ اور سکردو جو ریاست جموں وکشمیر میں واقع ہیں پاکستان کا حصہ ہیں بھارت کا یہ موقف کہ قانونی اور آئینی طور پر یہ علاقے جموں وکشمیر کا حصہ ہیں۔ نئی دہلی میں اس امر کے بارے میں پاکستان کے ناظم الامور کو بتا دیا گیا تھا۔ لہٰذا پاکستان جب اس معاملے کے بارے میں اپنا موقف واضح کر دے گا۔ تب ہی بھارت کو معلوم ہو سکے گا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ 2 مئی کو بھارتی وزیر خارجہ نے کہا کہ معاہدہ عدم جارحیت پر مذاکرات میں عارضی تعطل اس وجہ سے پیدا ہو گیا ہے کہ پاکستان نے مختلف مواقع پر عالمی سطح پر مسئلہ کشمیر کو اٹھایا ہے جس کی وجہ سے فضا خراب ہوگئی ہے۔

14 مئی 1982ء کو وزیر خارجہ پاکستان نے کہا کہ معاہدہ عدم جارحیت سے پہلے دوستی کا سمجھوتہ نہیں ہو سکتا کیونکہ بھارت نے باضابطہ سرکاری طور پر دوستی کے معاہدے کی تجویز پیش نہیں کی۔ بھارتی وزیراعظم نے 16 مئی کو ایک جلسہ عام میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ معاہدہ عدم جارحیت کا کوئی امکان نہیں۔ یکم جون کو بھارتی حکومت نے جنگ نہ کرنے کے معاہدے کی پاکستانی تجویز پر مذاکرات دوبارہ شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا اعلان اسلام آباد میں بھارت کے سیکرٹری خارجہ کنور نٹور سنگھ اور پاکستان کی وزارت خارجہ کے سیکرٹری جنرل ایس شاہنواز کے درمیان ملاقات کے نتیجے میں کیا گیا۔

25 جون کو وزیر خارجہ نرسیما راؤ نے کہا کہ معاہدہ عدم جارحیت پر پاک بھارت مذاکرات اگست 1982ء میں اسلام آباد میں ہوں گے۔

11 اگست 1982ء کو پاکستان اور بھارت کے خارجہ سیکرٹریوں کے مابین عدم جارحیت کے مجوزہ سمجھوتے کی پاکستانی تجویز دوستی کے معاہدے پر مشترکہ کمیشن کے قیام سے متعلق بات چیت کے دوسرے دور کا آغاز اسلام آباد میں ہوا۔ دونوں ملکوں کی جانب سے وفود نے اپنا اپنا نقطہ نظر پیش کیا۔ بھارتی وفد کی قیادت مسٹر مہاراج کرشن رسگوترا سیکرٹری خارجہ اور پاکستانی وفد کی قیادت نیاز اے نائیک سیکرٹری خارجہ نے کی۔ دونوں راہنماؤں نے پاکستان کی جانب سے جنگ نہ کرنے کے معاہدہ کی پیشکش اور بھارت کی جانب سے مشترکہ اقتصادی وثقافتی کمیشن کی تجویز اور دوسرے امور پر تبادلہ خیال کیا۔

13 اگست 1982ء کو ایک مشترکہ بیان میں دونوں ملکوں کے خارجہ سیکرٹریوں نے کہا کہ بات چیت میں زیادہ تر دوطرفہ نوعیت کے معاملات زیر بحث آئے جن میں عدم جارحیت کے سمجھوتے کے بارے میں پاکستان کی تجویز اور مشترکہ کمیشن کے قیام کی بھارتی تجویز شامل ہے۔ یہ دور بھی ناکام رہا۔

17 جنوری 1983ء کو اسلام آباد میں عدم جارحیت کے معاہدے کا تیسرا دور ہوا بھارتی سیکرٹری خارجہ نے کہا

Marfat.com

کہ پاکستان کی جانب سے معاہدہ عدم جارحیت اور بھارت کی جانب سے امن دوستی اور تعاون کے معاہدے کی پیشکش کو منظور کئے جانے میں دو اہم نکات پر اختلافات دور نہیں ہو سکے۔ یہ دو اہم نکات غیر ملکی فوجی اڈے اور تنازعات طے کرنے کے سلسلے میں باہمی دوطرفہ روابط کی تشریح ہیں۔

تقریباً دو سال کے بعد 30 جولائی 1985ء کو نئی دہلی میں پھر پاکستان کے سیکرٹری خارجہ نیاز اے نائیک اور بھارت کے سیکرٹری خارجہ رمیش بھنڈاری کے مابین عدم جارحیت کے معاہدے پر مذاکرات ہوئے مذاکرات کے نتیجے میں جو مشترکہ اعلان جاری کیا گیا اس میں کہا گیا تھا کہ دونوں ملک ایک جامع معاہدہ طے کرنے کی کوشش جاری رکھیں گے۔ ازاں بعد 15 اپریل 1986ء کو دونوں ملکوں کے وزراء خارجہ کے مابین اس مسئلے پر مذاکرات ہوئے اور دونوں حکومتوں نے اس بات کا عزم کیا کہ وہ شملہ معاہدے پر کاربند رہنے کا عزم کرتے رہیں گے۔

مشترکہ وزارتی کمیشن:

نومبر 1982ء میں جنرل ضیاءالحق جب تھائی لینڈ کے دورے سے وطن واپس آ رہے تھے تو انہوں نے راستے میں بھارتی وزیراعظم مسز اندرا گاندھی کے ساتھ مذاکرات کئے جن کے نتیجے میں دونوں ملکوں نے مشترکہ وزارتی کمیشن کے قیام پر اتفاق کیا۔ اس ضمن میں 23 دسمبر 1982ء کو نئی دہلی میں یہ سمجھوتہ طے پایا۔ پاکستان کی طرف سے سیکرٹری خارجہ نیاز اے نائیک اور بھارت کی طرف سے سیکرٹری خارجہ رسگوترہ نے دستخط کئے کمیشن کا قیام پانچ سال کیلئے عمل میں آیا لیکن اس پر باضابطہ دستخط 10-11 مارچ 1983ء کو ہوئے۔

1- پاکستان بھارت مشترکہ کمیشن' تجارت' صنعت' تعلیم' صحت' ثقافت' سیاحت' سفر' اطلاعات سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں باہمی مفاد کی خاطر دوطرفہ مفاہمت اور تعاون کے فروغ کیلئے قائم کیا گیا ہے۔

2- کمیشن اپنے دائرہ کار کے مطابق باہمی طور پر متفقہ رپورٹیں اور سفارشات دونوں حکومتوں کے مجاز حکام کو پیش کرے گا حکومتیں ایسے قانونی اور انتظامی اقدامات پر غور کریں گی جس سے مشترکہ کمیشن کو سونپے جانے والے کمیشن کے کام کی انجام دہی میں آسانی پیدا ہو۔

3- مشترکہ کمیشن تعاون کے مخصوص شعبوں سے عہدا برا ہونے کیلئے ضروری سمجھے تو وہ سب کمیشن قائم کر سکے گا سب کمیشن اپنے کام کے بارے میں رپورٹیں ہر اجلاس میں مشترکہ کمیشن کو پیش کریں گے۔

4- مشترکہ کمیشن کا عام طور پر سال میں ایک بار باری باری دونوں ملکوں کے دارالحکومتوں میں اجلاس ہوگا۔ دونوں وفود کی قیادت وزراء خارجہ کیا کریں گے اور ان میں دونوں حکومتوں کے مقرر کردہ دیگر نمائندے بھی ہوں گے۔

5- سب کمیشنوں کے اجلاس باہمی رضامندی سے جتنے بھی طے پائیں گے اور فریقین کی رضامندی سے سرکاری یا غیر سرکاری ماہرین اور مشیروں کو ان اجلاسوں میں شرکت کی دعوت دے سکیں گے۔

6- مشترکہ کمیشن اور اس کے سب کمیشن سمجھوتے کی شقوں کے مطابق کام کی انجام دہی کیلئے ضروری قواعد اور طریق کار اختیار کر سکیں گے۔

7- مشترکہ کمیشن کے فیصلے یا ان کے اخذ کردہ نتائج رپورٹوں یا متفقہ کارروائی کی شکل میں ہوں گے۔

Marfat.com

8- کمیشن کے ہر اجلاس کیلئے ایجنڈا سفارتی ذریعے سے تجاویز کے تبادلے کے بعد ہوگا اور یہ کام زیادہ سے زیادہ اجلاس شروع ہونے والے ماہ سے پہلے ماہ کے دوران طے پا جائے گا۔ ایجنڈے کی منظوری اجلاس کے اختتامی روز دی جائے گی۔

9- سمجھوتہ پانچ سال کی مدت کیلئے ہوگا۔ آئندہ پانچ سال کیلئے اس کی تجدید ہوگی بشرطیکہ کوئی فریق اسے منسوخ کرنے کیلئے اس وقت سے چھ ماہ قبل دوسرے فریق کو تحریری نوٹس نہ دے جب وہ اسے منسوخ کرنے کا خواہاں ہو تو باہمی رضامندی سے سمجھوتے میں ردوبدل کیا جاسکے گا۔

یکم جون 1983ء کو دونوں ملکوں کے وزراء خارجہ نے عدم جارحیت کے سمجھوتے کی پاکستانی تجویز اور دوستی امن اور تعاون کے سمجھوتے کی بھارتی تجویز پر دوستانہ ماحول میں اسلام آباد میں بات چیت کی۔ دونوں وزراء خارجہ صاحب زادہ یعقوب خاں اور پی وی نرسیماراؤ نے مشترکہ کمیشن کے سمجھوتے کی توثیق شدہ دستاویزات کا تبادلہ کیا کمیشن کے اجلاس میں نئے رشتوں کو فروغ دینے اور باہمی تعاون کو بڑھانے کا عہد کیا گیا۔ نیز اسی روز چار ذیلی کمیشنوں کے اجلاس بھی منعقد ہوئے۔ پہلے ذیلی کمیشن جس کا تعلق اقتصادی امور سے ہے دو مختلف ورکنگ گروہوں میں تقسیم کیا گیا۔ دوسرے ذیلی کمیشن نے خاص معاملات اور تجارت کو توسیع دینے کیلئے مختلف معاملات پر غور کیا تیسرے نے کھیلوں، اطلاعات، ثقافت اور تعلیم کے شعبوں میں جب کہ چوتھے نے تاجروں کیلئے ویزے جاری کرنے کے معاملات پر غور کیا۔

دوسرے روز کے اجلاس میں کمیشن نے کئی اقدامات کی سفارش کی جن میں سے ڈاک کی شرح میں کمی، دوہرے ٹیکسوں سے گریز، ٹرین کے ذریعے سفر کرنے والے مسافروں کو دونوں ملکوں کے شہروں تک جانے کیلئے براہ راست ٹکٹ خریدنے کی سہولت شامل ہیں۔

صنعتوں سے متعلق کمیشن نے فیصلہ کیا کہ دونوں فریق مخصوص شعبوں میں مشترکہ صنعتی منصوبوں پر تجاویز کا تبادلہ کریں۔ پاک بھارت مشترکہ کمیشن نے باہمی مفاہمت و تعاون کے فروغ کیلئے 4 جون کو متعدد سفارشات کی منظوری دی۔ ان میں سفر کی سہولتوں میں اضافہ، سویلین قیدیوں کی واپسی کے علاوہ صنعت، زراعت، مواصلات، صحت، ٹیکنالوجی اور بہت سے دوسرے شعبوں کی سفارشات شامل ہیں۔ پاکستان اور بھارت میں ڈاک کی شرح میں کمی کی تجویز بھی شامل تھی۔

15 جنوری 1984ء کو پاکستان اور بھارت کے مشترکہ وزارتی کمیشن کے مقرر کردہ سب کمشنر برائے تجارت اور اقتصادی امور کا ایک اجلاس اسلام آباد میں ہوا۔ بھارتی وفد کی قیادت وزارت جہاز رانی اور ٹرانسپورٹ کے جوائنٹ سیکرٹری مسٹر یشونت سنہا نے جب کہ پاکستانی وفد کی قیادت سائنس و ٹیکنالوجی کے جوائنٹ سیکرٹری جناب حسن نواب نے کی۔ دونوں ملکوں کے وفود نے منظور شدہ شعبوں میں دونوں ملکوں کے درمیان تعاون کو فروغ دینے کیلئے مختلف تجاویز پر بالکل کاروباری انداز میں بات کی تجارت سے متعلق ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔

17 جنوری 1984ء کو اقتصادی امور اور تجارت سے متعلق ذیلی کمیشن نے دونوں ممالک میں اقتصادی تعاون کیلئے تجاویز مرتب کرنے کی غرض سے ایک ورکنگ گروپ تشکیل دیا تجارت سے متعلق ذیلی کمیشن نے دونوں ملکوں کے

Marfat.com

درمیان بڑے پیمانے پر تجارت کیلئے اشیاء کی نشاندہی بھی کی۔ ورکنگ گروپ میں دونوں ممالک کی منصوبہ بندی کے سیکرٹریوں اور منصوبہ بندی کمیشن کے دو دو سینئر حکام شامل کئے گئے۔ ذیلی کمیشن نے سات بڑے شعبوں زراعت' ریلوے' صنعت' جہاز رانی' ٹیلی مواصلات' ڈاک اور سائنس وٹیکنالوجی میں تعاون کے سلسلے میں اہم فیصلے کئے فریقین نے زرعی شعبے میں تعاون کیلئے دونوں ملکوں کی زرعی تحقیقی کونسلوں نے مسودوں کو تبادلہ کیا ریلوے کے شعبے میں فریقین نے سات مقررہ ریلوے اسٹیشنوں پر دوہری بکنگ شروع کرنے پر اتفاق کیا صحت کے شعبے میں دونوں وفود کے تبادلوں کا فیصلہ کیا گیا ٹیلی مواصلات میں لاہور اور امرتسر کے درمیان ٹیلی فون لائن کی تنصیب شامل ہے۔ دونوں ملکوں نے 21 جنوری 1984ء کو گروپ ٹورازم کے فروغ کے سمجھوتے کو بھی آخری شکل دی۔ یہ مذاکرات نئی دہلی میں ہوئے۔

5 اپریل 1985ء کو اسلام آباد میں پاکستان اور بھارت کے خارجہ سیکرٹریوں کی باقاعدہ بات چیت شروع ہوئی بھارتی سیکرٹری خارجہ رمیش بھنڈاری اور پاکستانی خارجہ سیکرٹری نیاز اے نائیک نے بات چیت میں حصہ لیا۔ خارجہ سیکرٹریوں نے پاکستان اور بھارت کے باہمی مسائل کے علاوہ عالمی مسائل پر بھی تبادلہ خیالات کیا۔

2 جولائی 1985ء کو صدر ضیاء الحق نے راجیو گاندھی کو شملہ معاہدہ کی 13 ویں سالگرہ پر مبارکباد کا پیغام دیا۔ نیز پاکستان اور بھارت نے نئی دہلی میں اقتصادی سائنسی ثقافتی شعبوں میں مفاہمت اور تعاون کو فروغ دینے پر اتفاق رائے کرتے ہوئے تعلقات کو معمول پر لانے کی جانب ایک اور قدم بڑھایا۔ دونوں ملکوں کے چار ذیلی کمیشنوں نے علیحدہ علیحدہ ملاقاتوں میں یونیورسٹی کے طلباء کے تبادلے' دونوں ملکوں میں متعین ایک دوسرے کے صحافیوں کی تعداد میں اضافے اور ذرائع ابلاغ کے شعبے میں اخبارات اور جرائد کے تبادلے میں اضافہ کرنے پر اتفاق کیا اجلاسوں میں دیگر امور پر بھی غور ہوا۔ نیز پاکستان اور بھارت منشیات کی غیر قانونی نقل وحمل روکنے کیلئے بھی تعاون پر رضامند ہوگئے دوسرے ملک میں قیام کے دوران شہریوں کو تھانوں میں رپورٹ نہیں کرنے پڑے گی فلموں کا باہمی تبادلہ بھی ہوگا۔

Marfat.com

سیاچن کا مسئلہ

جنرل ضیاء الحق کا دور حکومت گیارہ سال اور چوالیس دنوں پر مشتمل ہے اس دور میں ہونے والے اہم واقعات تاریخ کا دھارا موڑنے اور پاک بھارت تعلقات میں خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ پہلا واقعہ بھارتی فوج کی طرف سے سیاچن کے پاکستانی علاقے پر بڑی خاموشی سے قابض ہونا اور ہماری حکومت کا اس واقعہ کو عوام الناس کی نظروں سے اوجھل رکھنا ہے جب عالمی پریس نے اس سانحے کی خبر دی تو چیف آف آرمی سٹاف جنرل ضیاء الحق نے فرمایا ''سیاچن پر تو گھاس کی پتی بھی نہیں اگتی۔''

انہوں نے یہ کہہ کر شاید پاکستانی عوام کو مطمئن کرنے کی کوشش کی ہوگی لیکن پاکستانی قوم اپنے دفاعی معاملات پر 1971ء کی عبرت ناک شکست کے بعد اتنی حساس ہو چکی ہے کہ اس سے کچھ چھپانا اب ممکن ہی نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ جیسے ہی یہ خبر باہر نکلی پاکستان میں بے چینی پھیل گئی اور پریس پر شدید تر تنقید کے باوجود سیاسی سرگرمیوں پر پابندیوں کے باوجود عوام سراپا احتجاج ہو گئے۔ خیال رہے کہ بھارت نے 1982ء میں سیاچن کی خصوصی اہمیت کے پیش نظر اس پر قابض ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا اور جنرل ضیاء الحق مرحوم جس ارض مقدس پر ایسا بے رحمانہ تبصرہ فرما رہے تھے اسے پاکستان کے دفاعی معاملات میں خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ 1983ء میں بھارت کی کماؤں رجمنٹ نے خصوصی تیاریوں کے بعد یہاں قبضہ کیا۔

سیاچن پاکستان کیلئے عظیم حکمت عملی کا علاقہ ہے اور اسے پاکستانی کی سلامتی اور استحکام میں اہم مقام حاصل ہے یہ پاکستان کو مختلف دریاؤں کے ذریعے پانی کی بہم رسانی میں ممد و معاون ثابت ہوا ہے سیاچن کے مسئلہ کا بھارت کی دفاعی تیاریوں سے گہرا تعلق ہے اسی لئے بھارت نے اسے اپنی دفاعی حکمت عملی کا حصہ بنا رکھا ہے۔ بھارت چاہتا ہے کہ سیاچن گلیشئر پر قبضہ کر کے وہ پاک چین دوستی میں رکاوٹ ڈال سکتا ہے کیونکہ شاہراہ ریشم کو سیاچن گلیشئر کنٹرول کرتا ہے۔ فوجی اہمیت کے اس اہم گلیشئر سے شمالی کشمیر کے علاقے میں بھارت کی فوج کا مغرب کی جانب سے تحفظ ہوتا ہے۔ یہ گلیشئر پاکستان کیلئے بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا بھارت کیلئے، یہی وجہ تھی کہ بھارت نے اس پر قبضہ کر کے بظاہر اپنا مغربی محاذ محفوظ کرنے کی کوشش کی۔

سیاچن بلتستان میں واقع ہے اس کا رقبہ 3500 مربع کلومیٹر اور طول 75,67 اور عرض 3,22 تا 10 کلومیٹر ہے سطح بحر سے اس کی بلندی 6000 میٹر یا 19680 فٹ ہے۔ شاہراہ قراقرم سے 225 کلومیٹر یا 140 میل کی دوری پر واقع ہے۔ کے ٹو کی پہاڑی چوٹی سے بذریعہ فضائی سروس 56 کلومیٹر سکردو سے 144 کلومیٹر اور سرینگر سے 250 کلومیٹر

Marfat.com

کا فاصلہ بنتا ہے۔ بلتستان (شمالی علاقہ) میں واقع اس گلیشئر تک پہنچنے کیلئے دو ہی راستے ہیں ایک لداخ کی طرف سے جو اس وقت مقبوضہ کشمیر میں ہے اور دوسرا بلتستان کی طرف سے جو اس وقت پاکستان میں ہے۔ اس کا شمار دنیا کے طویل ترین پہاڑی گلیشئروں میں ہوتا ہے اور ایشیا میں دوسرا بڑا گلیشئر ہے یہ چین کی سرحد کے قریب پاکستان کی مشہور ترین چوٹی کے ٹو کے جنوب مشرق میں ہے۔ دریائے شیوک کی ایک شاخ دریائے نبرا یا نوبرا اسی گلیشئر سے نکلتی ہے اس کے قریب ہی ہڈن پیک (8068 میٹر) تیرام کانگڑی (7464 میٹر) بالتورو کانگڑی (7312 میٹر) کندوس گلیشئر اپر بالتورو اور شردی کانگڑی کی پہاڑی چوٹیاں آسمان سے باتیں کرتی ہوئی نظر آتی ہیں یہ تمام چوٹیاں اور گلیشئر پاکستان کے شمالی علاقوں میں واقع ہیں۔ مقامی زبان میں سیاچن کا مطلب ہے جنگلی گلاب اس کے نام اور محل وقوع کے اعتبار سے بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ بلتی علاقہ میں واقع ہے جو بھارت کا اٹوٹ انگ نہیں ہو سکتا۔ اس کی دفاعی اہمیت میں حالیہ برسوں میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا ہے اور اس کی اہمیت عالمی سطح پر بہت بڑھ گئی ہے۔

1949ء کے معاہدہ جنگ بندی اور 1972ء کے شملہ معاہدے کے مطابق NJ980420 سے آگے لائن آف کنٹرول کی نشان دہی دونوں ملکوں کے فوجی نمائندوں کے باہمی صلاح و مشورہ سے ابھی ہونا باقی تھا۔ حکومت ہندوستان چاہتی ہے تو وہ ان معاہدوں کی روشنی میں حکومت پاکستان سے مذاکرات کر سکتی تھی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ 1972ء کے بعد اپنی فوجی طاقت میں بے پناہ اضافے کے باعث ہندوستان جنوبی ایشیاء میں اپنے آپ کو علاقے کے اہم طاقت کی حیثیت سے منوانا چاہتا تھا۔ وہ مسائل کا حل برابری کی سطح اور طے شدہ معاہدوں کی بنیاد پر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ عددی اور مادی برتری کا زعم اسے علاقے کے چھوٹے ملکوں پر اپنی مرضی کا فیصلہ تھوپنے کی ترغیب دے رہا تھا۔ وہ سیاچن گلیشئر کے مسئلے کو 27 جولائی 1949ء کے معاہدہ جنگ کے مطابق طے کرنے کی بجائے پاکستان پر اپنی مرضی کا فیصلہ تھوپنا چاہتا تھا۔ ہندوستانی 1962ء میں چین کے ہاتھوں NEFA میں ذلت آمیز شکست کو ابھی تک نہیں بھولے تھے۔ 1962ء میں NEFA میں شکست کے بعد ہندوستانی فوج نے گلیشیائی اور اونچے محاذوں پر ٹریننگ کو بڑی اہمیت دی تھی اور ایسی جنگ کیلئے اپنے پہاڑی ڈویژنوں کو خاص طور پر مسلح کیا تھا۔ سیاچن اس لحاظ سے ایک ایسا علاقہ تھا جو ہندوستانی فوجوں کو 1962ء کی جنگ کے حریف چین کی سرحد کے قریب گلیشیائی اور اونچی پہاڑی چوٹیوں پر جنگ لڑنے کی نئی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے کا موقع فراہم کر سکتا تھا۔ طاقت کے نشے میں چُور ہندوستان شاید یہ بھی سمجھ بیٹھا تھا کہ ایسے دُشوار گزار اور مشکل علاقے میں پاکستانی افواج اس کی پہاڑی ڈویژنوں کا مقابلہ نہیں کر سکیں گی اس طرح ایک ہی وار سے وہ چین اور پاکستان دونوں کو سبق سکھا دے گا۔ ایسا فیصلہ کرتے ہوئے ہندوستان کی فوج نے گو مسئلہ کے تمام دوسرے پہلوؤں کو مدنظر رکھا ہو گا لیکن شاید ایک اہم نکتہ ہندوستانی فوجی اور سیاسی منصوبہ بندی کے ماہروں کے ذہن میں نہیں آیا۔ ہندوستانی شاید یہ بات بھول گئے تھے کہ پاک فوج کی طاقت کو صرف اسلحے توپوں میزائلوں سپاہ کی تعداد اور دوسرے مادی پیمانوں سے نہیں ناپا جا سکتا۔ مادی وسائل کے ساتھ ساتھ افواج پاکستان کی سب سے بڑی طاقت ایمان، تقویٰ اور جہاد فی سبیل اللہ کا ناقابل شکست جذبہ ہے۔ سیاچن میں اپنی طاقت کا استعمال کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے ہندوستانیوں نے پاک فوج کی اس ایمانی قوت کو نظر انداز کر دیا تھا۔

Marfat.com

1949ء سے 1984ء تک سیاچن گلیشئر کے علاقے پر پاکستان کا مکمل کنٹرول رہا اور اس تمام عرصے کے دوران متعدد غیر ملکی کوہ پیما جماعتوں نے سیاچن گلیشئر اور اس کے مشرق میں واقع بہت سی چوٹیوں کو حکومت پاکستان کی اجازت سے سر کیا۔ مشرقی قراقرم کے اس حصے پر اپنے مکمل کنٹرول کے باوجود پاکستان نے یہاں اپنی فوج کو کبھی بھی ملوث نہیں کیا۔ سیاچن گلیشئر کا علاقہ ہمیشہ سے امن و آشتی کی آماجگاہ رہا تھا۔ سطح سمندر سے 17000 سے 24000 فٹ بلند اس علاقے میں انسان کو زندہ رکھنے کیلئے بھی خصوصی انتظامات کرنے پڑتے ہیں۔ ایسے علاقے میں جہاں انسان عام حالات میں زندہ بھی نہیں رہ سکتا پاکستان کسی جنگ یا لڑائی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ پاکستان نے ہمیشہ سے دوسرے ملکوں خصوصاً اپنے ہمسایوں کے ساتھ کئے گئے معاہدوں کا احترام کیا ہے اور خلوص دل سے ان معاہدوں پر عمل کیا ہے۔ اس کے برعکس ہندوستان کی تاریخ معاہدہ شکنی کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ وادی کشمیر میں کشمیری عوام کے ساتھ رائے شماری کا وعدہ ہندوستان نے اب تک پورا نہیں کیا۔ 1949ء سے 1984ء تک ہندوستان نے NJ980420 سے آگے لائن آف کنٹرول کی نشان دہی کی کبھی بات نہیں کی۔ اپریل 1984ء میں اس معاملے کو دونوں ملکوں کے درمیان طے شدہ معاہدوں کے مطابق حل کرنے کی بجائے ہندوستان نے اپنی مرضی کا فیصلہ طاقت کے ذریعے پاکستان پر مسلط کرنے کے ارادے سے سیاچن میں اپنی فوجیں اتار دیں۔

بھارت نے 1978ء میں سیاچن گلیشئر میں مداخلت کا آغاز کیا۔ اس سال بھارت کے (HAWS) High Altitude Warfare School کے کرنل نریندر کمار کی سرکردگی میں ایک بھارتی فوجی کوہ پیما جماعت سیاچن گلیشئر کے شمال مغرب میں (تیرم گنگری II)(Teram Gangri II) کے علاقے میں اگست سے اکتوبر تک رہی۔ حکومت پاکستان کے ردعمل کا جائزہ لینے کیلئے اس مہم کی کارروائی کو بڑے غیر اہم طریقے سے ہمالین جرنل 1979-80ء اور Illustrated Weekly of India Himalayan Journal کے 31-23 مئی کے شمارے میں شائع کیا گیا۔ ہندوستانی کوہ پیماؤں کی اس جماعت نے تقریباً 70 کلومیٹر تک پاکستان کے زیر کنٹرول علاقے میں مداخلت کی۔ کرنل نریندر کمار کی ہی قیادت میں ہندوستان نے ستمبر 1980ء میں دوسری جماعت بھیجی۔ یہ جماعت 14 افسروں اور 40 جوانوں پر مشتمل تھی۔ یہ افسر اور جوان ہندوستان کے High Altitude Warfare School میں زیر تربیت تھے۔ یہ جماعت گنگری اور سلتورو گنگری تک گئی جو پاکستان کے زیر کنٹرول علاقے میں واقع ہیں اور جون سے ستمبر 1980ء تک اس علاقے میں رہی۔ کرنل نریندر کمار نے ہمالین جرنل 80-1979ء میں شائع ہونے والی اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ اس کوہ پیما جماعت کو ہندوستانی ایئر فورس کی بھی مدد حاصل تھی۔ اس کوہ پیما جماعت نے تقریباً 90 کلو میٹر تک پاکستان کے زیر کنٹرول علاقے میں مداخلت کی۔ ستمبر 1980ء میں ہندوستانی فوج کے بریگیڈئر کے این تھیڈانی کی قیادت میں دو ہندوستانی کوہ پیما جماعتیں APSARASAS نامی 23390 فٹ اونچی چوٹی تک پاکستان کے زیر کنٹرول علاقے میں داخل ہوئیں۔ امریکن الپائن کلب جرنل نے 1981ء کے شمارے میں اس ہندوستانی مداخلت کے بارے میں یہ خبر شائع کی۔

مئی۔ جون 1981ء میں کچھ ہندوستانی فوجی اور سول افراد کی وادی سلتورو میں گوئما اور چولونگ نامی گاؤں تک

Marfat.com

آنے کی اطلاعات ملی ہیں۔ سکردو پولیس کے اس وقت کے سپرنٹنڈنٹ پولیس نے اگست 1981ء میں ان علاقوں کا دورہ کیا اور مقامی لوگوں سے ہندوستانی فوجیوں کے چھوڑے ہوئے لداخ سکاؤٹس کے جوانوں کی ٹوپی کے بیج اور کچھ ہندوستانی کرنسی نوٹ حاصل کئے۔ سیاچن گلیشئر میں ہندوستانی فوج کی ان سرگرمیوں سے صاف ظاہر تھا کہ ہندوستانی آہستہ آہستہ پاکستانی کنٹرول والے علاقے میں اپنے قدم جمانے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ 29 مارچ 1982ء کو پاکستان کی وزارت خارجہ نے اسلام آباد میں ہندوستانی سفارت خانے اور دہلی میں ہندوستانی وزارت خارجہ کو پاکستان کے زیر کنٹرول علاقے میں ہندوستانی فوج کی ان خلاف ورزیوں کے خلاف احتجاجی نوٹ بھیجے۔

سیاچن گلیشئر میں ہندوستانی فوج کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے کیلئے جولائی 1983ء میں پاک فوج نے دیکھ بھال کی غرض سے ایک دستہ سیاچن گلیشئر' بلافون لا اور سیالا کے علاقے میں بھیجا۔ 16 اگست 1983ء کو اس دستے نے سیاچن گلیشئر کے علاقے میں لداخ سکاؤٹس کے ہندوستانی فوجی دستوں کو دیکھا۔ جب یہ جماعت ہندوستانی فوجی دستوں کے نزدیک پہنچی تو ہندوستانی فوجی وادی نوابرہ کی طرف چلے گئے۔ اس واقعے میں کسی قسم کی فائرنگ کا تبادلہ نہیں ہوا۔ سیاچن گلیشئر کے علاقے میں ہندوستانی جارحانہ عزائم اب کھل کر سامنے آ گئے تھے۔ پاکستانی فوجی دستہ صرف معلومات حاصل کرنے کی غرض سے گیا تھا چنانچہ اپنے مشن کی تکمیل کے بعد واپس آ گیا۔ پاکستان کے ارادے پرامن تھے۔ وہ سیاچن گلیشئر کو میدان جنگ نہیں بنانا چاہتا تھا اس کے برعکس ہندوستان سیاچن میں ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت جارحیت پر تلا ہوا تھا۔ اسی لئے پاکستان کے دیکھ بھال کے دستوں کی واپسی کے بعد وہ سیاچن میں اپنی سپاہ لے آیا۔

15 اپریل 1984ء کو پاک آرمی کے ایک ہیلی کاپٹر پر جو سیاچن گلیشئر کے علاقے پر دیکھ بھال کی غرض سے پرواز کر رہا تھا ہندوستانی فوج کے دستوں نے فائرنگ کی۔ اس وقت ہندوستانی کوہ سلتورو کے دو دروں ''بلافون لا'' اور ''سیالا'' پر اپنی فوج اتار چکے تھے۔ پاکستان کے پاس اب ہندوستان کی فوجی مداخلت کو روکنے کیلئے فوجی کارروائی کرنے کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ چنانچہ پاک فوج کے دستوں کو فوری طور پر ''سیالا'' اور ''بلافون لا'' کے علاقوں میں ہندوستانی فوج کی مزید پیش قدمی کو روکنے کیلئے بھیجا گیا۔ یوں سیاچن گلیشئر میں ہندوستان نے فوجی مداخلت اور بین الاقوامی معاہدوں کی خلاف ورزی کر کے پاکستان پر ایک بے سود اور احمقانہ جنگ مسلط کر دی۔

1978ء سے 1984ء تک کے واقعات کے جائزے سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ ہندوستان نے سیاچن گلیشئر کے علاقے پر فوجی کارروائی کے ذریعے قبضہ کرنے کا فیصلہ 1978ء میں ہی کر لیا تھا۔ ہندوستان نے اپنے ہمسایہ ملک پاکستان کے ساتھ پہلی دفعہ ایسا نہیں کیا۔ 1947ء میں قیام پاکستان کے بعد 1948ء' 1965ء اور 1971ء کی جنگیں ہندوستان نے ہی پاکستان پر مسلط کی تھیں۔ ہندوستان کے ان جارحانہ عزائم اور کارروائیوں کے برعکس پاکستان نے ہمیشہ امن و دوستی اور مسائل کو گفت و شنید کے ذریعے حل کرنے کی پالیسی اپنائی لیکن پاکستان کی امن پسند پالیسی کا ہندوستان نے ہمیشہ غلط مطلب لیا۔ سیاچن گلیشئر میں ہندوستانی مداخلت کے جواب میں پاکستان نے ہر مرحلے پر اس مسئلے کو جنگ کی بنیاد بننے سے روکنے کیلئے پرامن طریقے استعمال کئے۔ اگست 1983ء میں پاکستانی فوج کے دیکھ بھال کرنے والے دستوں سے مڈبھیڑ کے نتیجے میں ہندوستانی فوجی دستوں کے سیاچن سے پس قدمی کرنے کے بعد پاکستان

Marfat.com

گلیشئر پر اپنی فوج متعین کر سکتا تھا لیکن پاکستان نے علاقے میں امن کے فروغ کی خاطر ایسا قدم نہیں اٹھایا۔ ہندوستان نے پاکستان کے امن پسندانہ رویئے کا غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے اپریل 1984ء میں اپنی فوجیں ہیلی کاپٹروں اور ہوائی جہازوں کے ذریعے سیالا اور بلافون لا میں اتار کر کھلی جارحیت کا ارتکاب کیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پاک فوج کی شدید مزاحمت نے ہندوستان پر یہ بات واضح کر دی ہے کہ سیاچن میں احمقانہ مداخلت سے اسے ہزیمت اور شکست کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ پاک فوج اللہ کی مدد اور پاکستانی عوام کی تائید سے اپنی سرحدوں کے دفاع کی پوری پوری صلاحیتیں رکھتی ہے۔ ہندوستان کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ پاکستان ہندوستان کی بالادستی کسی قیمت پر قبول نہیں کرے گا۔

سیاچن گلیشئر کے مسئلے پر پاکستان کا موقف حق وانصاف کے اصولوں پر مبنی ہے۔ 27 جولائی 1949ء کو معاہدہ کراچی یا معاہدہ جنگ بندی کی رو سے وادی شیوق میں NJ980420 سے شمال کی طرف گلیشئر تک اس لائن کا تعین دونوں ملکوں کے فوجی کمانڈروں کے باہمی صلاح مشورے سے ہونا تھا۔ NJ980420 سے شمال کی طرف واقع گلیشئروں تک لائن آف کنٹرول کے تعین سے مراد نقطے سے قریب ترین گلیشئر تک اس لائن کا تعین کرنا تھا کیونکہ اس نقطے کے شمال میں گلیشیئروں کا سلسلہ شمال میں پاک چین سرحد تک پھیلا ہوا ہے۔ ہندوستانی اپنے مقاصد کی تکمیل کیلئے NJ980420 سے آگے لائن آف کنٹرول کو اس نقطے سے نزدیک ترین گلیشئر کی بجائے شمال میں چینی سرحد تک واقع آخری گلیشئر تک بڑھانا چاہتے ہیں۔ ایسا کرنا چین کے داخلی معاملے میں مداخلت کے مترادف ہے کیونکہ 1963ء میں پاکستان اور چین کے درمیان طے پانے والے سرحدی معاہدے کے مطابق پاک چین سرحد کی آخری حد قراقرم پاس قرار پائی تھی اس لئے NJ980420 سے لائن آف کنٹرول کو اس نقطے اور قراقرم پاس سے ملانے والی لائن سے آگے بڑھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لائن سے شمال کے علاقے پر 1949ء سے 1984ء تک سیاچن میں ہندوستانی مداخلت تک حکومت پاکستان کے مکمل اور DEFACTO کنٹرول کو بین الاقوامی طور پر تسلیم کیا گیا۔ اس علاقے میں تمام غیر ملکی سیاح اور کوہ پیما حکومت پاکستان کی ہی اجازت سے سیاحت اور کوہ پیمائی کیلئے جاتے رہے ہیں جس کی تفصیل پہلے بیان کی جا چکی ہے۔ سیاچن کے مسئلے پر پاکستانی موقف کے بنیادی نکات درج ذیل ہیں:

☆ اپریل 1984ء میں ہندوستان نے سیاچن گلیشئر میں اپنی فوجیں داخل کر کے پاکستان اور ہندوستان کے درمیان طے شدہ معاہدہ جنگ بندی اور شملہ معاہدے کی خلاف ورزی کی۔ حکومت ہندوستان کے پاس سیاچن میں فوجی کارروائی کا کوئی جواز نہ تھا۔ حکومت پاکستان نے سیاچن گلیشئر اور ملحقہ علاقے میں ہندوستانی فوجی کوہ پیما جماعتوں اور فوجی دستوں کی مداخلت اور اپریل 1984ء میں ہندوستان کی فوجی کارروائی کے خلاف مارچ 1982ء، دسمبر 1983ء، اپریل 1984ء اور جون 1985ء میں احتجاج کیا۔ کیونکہ ان علاقوں پر شروع سے ہی پاکستان کا انتظامی کنٹرول رہا ہے۔

سیاچن گلیشئر کے علاقے پر پاکستان کے عملی اور انتظامی کنٹرول کو تسلیم کرتے ہوئے چین نے پاکستان کے ساتھ اس علاقے میں سرحدی معاہدے پر دستخط کئے تھے۔ نتیجتاً پاک چین سرحد کی آخری حد قراقرم پاس مقرر ہوئی جو

Marfat.com

سیاچن گلیشئر کے شمال مشرق میں واقع ہے۔

1957ء سے 1984ء تک بیس سے زیادہ غیر ملکی کوہ پیا ٹیموں نے حکومت پاکستان کی اجازت سے سیاچن گلیشئر کے علاقے میں قراقرم پاس کے جنوب میں واقع مشہور چوٹیوں کو سر کیا یا سر کرنے کی کوشش کی۔ ان غیر ملکی کوہ پیا جماعتوں کا حکومت پاکستان کی اجازت سے سیاچن گلیشئر کے علاقے میں جانا اس بات کا بین ثبوت ہے کہ بین الاقوامی طور پر بھی اس علاقے پر پاکستان کے کنٹرول کو تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔ ان کوہ پیا جماعتوں کے ساتھ پاکستانی نمائندوں کے علاوہ پاکستانی گائیڈ اور رپورٹر بھی جاتے رہے ہیں جنہیں غیر ملکی کوہ پیا ٹیمیں پاکستانی سکے میں معاوضہ ادا کرتی رہی ہیں۔ پاکستانی کنٹرول کے حق میں دنیا کے مشہور معروف نقشوں، اٹلسوں اور کتابوں میں سیاچن گلیشئر کے علاقے قراقرم پاس کو ہی لائن آف کنٹرول کی شمال مشرقی حد دکھایا گیا ہے۔

سیاچن گلیشئر کے علاقے میں ہندوستانی مداخلت شملہ معاہدے کے پیرا 1(ii) کی بھی خلاف ورزی ہے کیونکہ شملہ معاہدے کی اس شق کے مطابق:۔

"Pending the final settlement of any problem between the two countries neither side shall unilaterally alter the situation and both sides shall prevent organisation, assistance or encouragement of any act detrimental to the maintenance of peaceful and harmonious relations."

"دونوں ملکوں کے درمیان کسی مسئلے کے بھی حتمی فیصلے تک کوئی بھی فریق نہ تو یکطرفہ طور پر صورت حال کو بدلے گا اور نہ کوئی کسی ایسی کارروائی کی تنظیم، مدد یا حوصلہ افزائی کرے گا جو امن اور دوستانہ تعلقات کے خلاف ہو۔"

NJ980420 سے قراقرم پاس کو ملانے والی لائن کو بین الاقوامی طور پر اس علاقے میں پاکستانی کنٹرول کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ اس لئے سیاچن مسئلے کے تصفیے کیلئے ہندوستان کو یہ نکتہ ذہن میں رکھنا ہوگا۔

27 جولائی 1949ء کے معاہدہ جنگ بندی 1965ء اور 1971ء کی پاک بھارت جنگوں اور خصوصاً 1971ء کی جنگ کے بعد جس میں ہندوستان کا پلہ واضح طور پر بھاری تھا NJ980420 سے آگے لائن کی نشان دہی کیلئے ہندوستان نے کبھی کوئی آواز نہ اٹھائی۔ ہندوستان 1978ء تک بالکل خاموش رہا اور اس علاقے میں پاکستان کے کنٹرول کو تسلیم کرتا رہا۔ 1978ء میں ہندوستان نے سیاچن میں مداخلت کا آغاز کیا۔ یہ وہ سال تھا جب پاکستان اور چین کو ملانے والی بین الاقوامی شہرت کی قراقرم ہائی وے تکمیل کے مراحل میں تھی گویا 1978ء سیاچن میں ہندوستانی مداخلت کے آغاز اور قراقرم ہائی وے کی تکمیل کا سال تھا۔ کچھ مبصرین کے خیال میں قراقرم ہائی وے کی تعمیر اور سیاچن گلیشئر میں پاک چین سرحد کے وجود سے لداخ کے ہندوستانی مقبوضہ علاقے کی طرف چین اور پاکستان کی مشترکہ فوجی کارروائی کے امکانات

Marfat.com

بڑھ گئے ہیں۔ ان مبصرین کی رائے میں اس خطرے کے پیش نظر ہندوستان نے سیاچن گلیشئر میں مداخلت کی تاکہ ترکستان لا اور قراقرم پاس کی طرف سے لداخ کی طرف کسی ممکنہ حملے کا دفاع کیا جاسکے۔ سیاچن گلیشئر میں ہندوستانی مداخلت کے سلسلے میں مبصرین کی یہ منطق بالکل بے سروپا ہے کیونکہ قراقرم ہائی وے سیاچن گلیشئر سے تقریباً 150 میل دور واقع ہے اور 150 میل کا یہ سارا علاقہ دشوار گزار گلیشئروں اور 20000 سے 25000 فٹ بلند پہاڑوں پر مشتمل ہے۔ اس لئے لداخ کی طرف ممکنہ پیش قدمی کا قراقرم ہائی وے کی تعمیر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ خود ہندوستان سیاچن گلیشئر کی سمت سے قراقرم ہائی وے کیلئے خطرہ پیدا کرنا چاہتا تھا اس لئے اس نے سیاچن میں مداخلت کی یہ مفروضہ بھی پہلے خیال کی طرح لغو اور قطعاً بے بنیاد ہے۔

اب رہا سیاچن گلیشئر سے وادی نوابرہ کے راستے لداخ کی طرف کسی پاکستانی حملے کا امکان' تو یہ سوچ بھی کسی دیوانے کے خواب سے مختلف نہیں۔ سیاچن گلیشئر میں 19000 فٹ کی بلندی پر انتہائی دشوار گزار گلیشیائی برفستان سے گزر کر لداخ کی طرف پیش قدمی کرنے کا خیال صرف ایک تصور ہی ہوسکتا ہے۔ لداخ کی طرف پیش قدمی کے جب بہت سے دوسرے راستے موجود ہیں تو کوئی دیوانہ ہی سیاچن گلیشئر کی طرف سے لداخ کی طرف جانے کا سوچے گا۔ کچھ لوگ سیاچن میں ہندوستانی مداخلت کو ''داخان'' میں روسی افواج کی موجودگی' قراقرم ہائی وے کی تعمیر اور سیاچن گلیشئر کی دفاعی اہمیت سے منسلک کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس مکتبہ فکر کے حضرات کا خیال ہے کہ چین اور پاکستان کی طرف سے ہندوستانی مقبوضہ کشمیر میں کسی مشترکہ کارروائی کی صورت میں روس داخان کی طرف سے اور ہندوستان سیاچن کی طرف سے مشترکہ کارروائی کر سکتے ہیں۔ یہ خیال بھی لغو اور بے بنیاد ہے۔

اگر مندرجہ بالا تمام نظریات درست نہیں تو پھر ہندوستان نے 1949ء سے 1978ء تک خاموش رہنے کے بعد سیاچن میں مداخلت کا آغاز کیوں کیا؟...... حالات وواقعات اور ہندوستانی اندازفکر ونظریات میں اس سوال کا جواب واضح طور پر موجود ہے...... 1978ء کے بعد حکومت ہندوستان نے اپنی فوجی قوت میں اس قدر اضافہ کرلیا تھا کہ وہ جنوبی ایشیاء کے ملکوں پر اپنی برتری اور طاقت کا عملی طور پر رعب جمانا چاہتا تھا۔ ہندوستان جانتا تھا کہ قانونی' تاریخی اور دونوں ملکوں کے درمیان معاہدوں کی بنیاد پر سیاچن کے علاقے پر اس کا کوئی حق نہیں بنتا۔ ہندوستان کا خیال تھا کہ وہ اپنی طاقت کے بل پر جب چاہیں گے سیاچن میں خدانخواستہ پاک فوج کو زیر کرکے پاکستان پر اپنی مرضی کا فیصلہ تھونپ دیں گے۔ ہندوستان نے صرف اسی نظریئے کے پیش نظر سیاچن میں مداخلت کی تھی لیکن حالات وواقعات نے یہ بات روز روشن کی طرح واضح کردی ہے کہ ہندوستان پاکستان پر اپنی مرضی کے فیصلے نہیں تھونپ سکتا۔ پاکستان ہندوستان کی بالادستی کو ہرگز ہرگز قبول نہیں کرے گا۔ سیاچن میں پاک فوج کی مزاحمت نے ہندوستان کو اب برابری کی بنیاد پر اس مسئلے کے حل کیلئے مذاکرات پر مجبور کردیا ہے۔

(زیر مطالعہ کتاب کے ص سے ص تک کی بیشتر معلومات کرنل محمد ذاکر کی کتاب ''سیاچن دنیا کا بلند ترین محاذ جنگ'' سے حاصل کی گئی ہیں)

Marfat.com

سیاچن پر پاکستانی فوج کے افسروں اور جوانوں نے شجاعت اور انسانی ہمت وعظمت کی جو عظیم تاریخ رقم کی ہے وہ پاکستان آرمی کیلئے ہی نہیں ہر پاکستانی کیلئے قابل فخر ہے۔

دونوں ملکوں کے فوجی کمانڈروں نے 16 اکتوبر 1985ء کو اس مسئلے کو حل کرنے کیلئے باہمی مذاکرات کئے لیکن کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ ادھر بھارت نے پاکستان پر الزام لگایا کہ اس علاقے میں چینی فضائیہ نے بھی کارروائی کی ہے لیکن بھارت اس بے سروپا الزام کا کوئی ثبوت فراہم نہ کر سکا۔ پاکستان چونکہ امن پسند ملک ہے اور اس کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ اپنے ہمسایہ ممالک سے اچھے تعلقات رکھے اور باہمی معاملات کو افہام وتفہیم کے جذبے کے تحت حل کرنے کی کوشش کرے اسی لئے پاکستان نے کبھی بھی اشتعال انگیزی سے کام نہیں لیا۔ اسی جذبے کے تحت پاکستان نے یہ کوشش کی کہ بھارت سے یہ علاقہ مذاکرات کے ذریعے خالی کرالے۔ پاکستان نے ابتداء میں سفارتی سطح پر بات چیت کی لیکن پھر صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے 17 دسمبر 1985ء کو نئی دہلی میں بھارتی وزیراعظم مسٹر راجیو گاندھی سے ملاقات کی صدر پاکستان نے بھارتی وزیراعظم کو باور کرایا کہ پاکستان جارحانہ عزائم نہیں رکھتا اس لئے یہ مسئلہ بات چیت کے ذریعے ہی حل کیا جانا چاہیے۔ چنانچہ بھارتی وزیراعظم نے اس پر آمادگی کا اظہار کیا۔ دونوں ممالک کے سربراہوں کی بات چیت کی روشنی میں جنوری 1986ء میں دونوں ملکوں کے ڈیفنس کے سیکرٹریوں کے مابین اس مسئلے پر مذاکرات ہوئے۔ اگرچہ یہ نتیجہ خیز تو ثابت نہ ہوئے تاہم دونوں ملکوں نے مذکورہ تنازعہ کے بارے میں اپنے اپنے موقف سے ایک دوسرے کو آگاہ کیا اور اس عزم کا اظہار کیا کہ سیاچن کے مسئلے کو شملہ معاہدہ کی روح کے مطابق پرامن اور بات چیت کے ذریعے طے کیا جائے گا۔ 5 مارچ 1986ء کو حکومت پاکستان نے سیاچن پر بھارت کا دعویٰ مسترد کرتے ہوئے کہا کہ سیاچن ہمیشہ پاکستان کے کنٹرول میں رہا ہے۔ اپریل 1986ء میں دونوں ملکوں کے مابین اس مسئلہ پر پھر بات چیت ہوئی بات چیت میں پاکستان کے سیکرٹری دفاع اجلال حیدر زیدی اور بھارت کے سیکرٹری دفاع ایس کے بھٹ ناگر نے حصہ لیا۔ یہ بات چیت بھی نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی۔ جون 1986ء میں دونوں ملکوں کے سیکرٹریوں کے مابین مذاکرات کا تیسرا دور شروع ہوا۔ مذاکرات کے اختتام پر جو مشترکہ اعلان جاری کیا گیا اس میں اس بات کا بطور خاص ذکر کیا گیا تھا کہ مذاکرات تعمیری تھے اور دوستانہ ماحول میں ہوئے۔ فریقین نے اس مسئلے کو معاہدہ شملہ کی روشنی میں طے کرنے کا فیصلہ کیا۔ 3 جون 1986ء کو وزیراعظم محمد خان جونیجو نے پارلیمنٹ میں سوالوں کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ حکومت پاکستان نے گلیشئر کے ایک حصے پر بھارتی قبضے کا سختی سے نوٹس لیا ہے۔ پاکستان اپنی مقدس سرزمین کے ایک انچ پر بھی کسی دوسرے کو قبضہ کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔ 27 جولائی 1986ء کو بھارتی فوج کے سربراہ اے ایس ودھیا نے دعویٰ کیا کہ ہم سیاچن گلیشئر کے چاروں کلیدی دروں پر بھی قابض ہیں' ہانگ کانگ سے شائع ہونے والے ایک جریدے میں کہا گیا کہ سیاچن کے دروں پر قبضے کیلئے گزشتہ دنوں پاکستان اور بھارتی افواج میں لڑائی ہوئی تھی۔

ستمبر 1987ء میں دونوں ملکوں کے مابین سیاچن گلیشئر پر شدید جھڑپیں ہوئیں اور ان جھڑپوں میں پاکستان نے بھارت سے قائد پوسٹ واپس لے لی جس پر بھارت نے قبل ازیں قبضہ کرلیا تھا۔

فروری 1988ء میں راجیو گاندھی نے سیاچن گلیشئر کا دورہ کیا اور پاکستان کو 24 گھنٹے کے اندر تین بار دھمکیاں

Marfat.com

دیں اور کہا کہ سیاچن گلیشیر بھارت کا اٹوٹ انگ اور پاکستان اس کے کسی حصے پر قبضہ کرنے سے باز رہے ورنہ اس کے سنگین نتائج برآمد ہونگے۔

16 فروری 1988ء کو سیاچن کے علاقے میں پاکستان اور بھارت کی افواج کا خونریز تصادم ہوا اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ گزشتہ دو سال سے اس کی شدت میں کچھ کمی ضرور آ گئی ہے۔

جون 1984ء میں بھارتی افواج سکھوں کے مطالبہ خالصتان سے زچ ہو کر سکھوں کے مذہبی راہنما سنت جرنیل سنگھ بھنڈرانوالہ اور ان کے ساتھیوں کو مارنے اور اس شورش کو ختم کرنے کیلئے دربار صاحب امرتسر جو سکھوں کا متبرک ترین مقام ہے میں داخل ہوگئی۔ یہاں گھمسان کا رن پڑا اور تین دن تک خونریز لڑائی کے بعد بالآخر جب تمام سکھ جنگجو مارے گئے تو بھارتی فوج نے دربار صاحب پر قبضہ کرلیا۔

دربار صاحب پر بھارتی فوج کے حملے نے ساری دنیا میں موجود سکھوں کے دلوں میں آگ لگا دی اور سکھوں نے مشرقی پنجاب میں حکومت کے خلاف بغاوت کر کے مسلح جدوجہد کا آغاز کر دیا۔ بالآخر مسز اندرا گاندھی کو بھی سکھوں پر ڈھائے اس قہر کی قیمت اپنی جان کے نذرانے کی صورت میں ادا کرنی پڑی۔ سکھوں کی اس شورش نے بھارتی حکومت کو ناکوں چنے چبادیئے اور حسب روایت بھارتی حکومت نے اس کا الزام پاکستان کے سرتھوپ دیا کہ وہ سکھ حریت پسندوں کو تربیت دے کر بھارت میں دھکیل رہا ہے۔

بھارت نے پاکستان پر یہ الزام بھی لگایا کہ وہ منشیات کی سمگلنگ میں بھی ملوث ہے حالانکہ صورت حال اسکے بالکل برعکس تھی اور بھارت اپنے اس الزام پر پردہ ڈالنے کیلئے کہ اس نے پاکستان پر حملہ کرنے کیلئے سرحدوں پر بھارتی فوجیں جمع کر رکھی ہیں۔ پاکستان پر اس قسم کے الزامات لگا رہا تھا چنانچہ وزیراعظم محمد خاں جونیجو جب نومبر 1986ء میں بنگلور میں منعقدہ سارک کانفرنس میں حصہ لینے کیلئے گئے تو انہوں نے بھارتی وزیراعظم سے پاکستانی سرحدوں پر بھارتی افواج کے اجتماع کا بھی ذکر کیا۔ اس کے جواب میں بھارتی وزیراعظم نے کہا کہ تشویش کی کوئی بات نہیں لیکن اس کے برعکس جب وزیراعظم پاکستان نے انہیں یقین دلایا کہ پاکستان نہ تو دہشت گردوں کو تربیت دے کر بھارت بھیجتا ہے اور نہ ہی منشیات کی سمگلنگ میں ملوث ہے تو بھارتی وزیراعظم نے وزیراعظم محمد خاں جونیجو کی اس یقین دہانی کو بھی تسلیم نہ کیا تاہم دونوں سربراہوں کے مابین یہ طے پایا کہ شکوک وشبہات دور کرنے کیلئے دونوں ملکوں کے مابین داخلہ سیکرٹریوں کی سطح پر بات چیت کی جائے چنانچہ بھارت کے سیکرٹری داخلہ سی جی سومیا پاکستان کے تین روزہ دورے پر اسلام آباد آئے اور انہوں نے 20 دسمبر 1986ء کو لاہور میں پاکستان کے سیکرٹری داخلہ مسٹر ایس کے مسعود سے مذاکرات شروع کئے مذاکرات کے نتیجے میں 21 دسمبر کو دونوں ملکوں کے مابین یہ معاہدہ طے پایا اس کے اہم نکات یہ ہیں۔

1- دونوں حکومتوں نے اس عزم کا اعادہ کیا کہ وہ پرامن بقائے باہمی' ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں عدم مداخلت' علاقائی یکجہتی کے احترام اور انصاف کے اصولوں کی بنیاد پر اچھے ہمسایوں جیسے اور تعاون پر مبنی تعلقات قائم کریں گے۔

Marfat.com

-2 حکومت پاکستان نے اس امر کا اعادہ کیا کہ وہ بھارت کے خلاف دہشت گردوں کی سرگرمیوں کی نہ تو حمایت کرتی ہے اور نہ ہی حمایت کرے گی بھارت نے بھی پاکستان کو اسی قسم کی یقین دہانی کرائی۔

-3 فریقین نے مشترکہ سرحد پر غیر قانونی نقل و حرکت اور اس کے تدارک کے مخصوص اقدامات پر غور کیا۔ ان اقدامات میں سرحد کی مشترکہ نگرانی اور ایک ایسا طریق کار شامل ہے جس کے تحت داخلی امن، استحکام اور علاقائی یک جہتی کو نقصان پہنچانے کی سرگرمیوں کیلئے کوئی فریق اپنی سرزمین استعمال کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔

-4 فریقین نے اس بات کو بھی تسلیم کیا کہ سرحدوں پر غیر قانونی نقل و حرکت اور دہشت گردی کے درمیان گہرا تعلق ہے ان معاملات پر مزید بات چیت پر اتفاق کرتے ہوئے فریقین نے فوری اقدام کے طور پر سرحدوں پر غیر قانونی نقل و حرکت کو کنٹرول کرنے اور دونوں ملکوں کے بارڈر سیکورٹی فورسز کے درمیان تعاون مستحکم کرنے کا فیصلہ کیا جس میں دونوں ملکوں کی خارجہ اور داخلہ وزارتوں، ڈائریکٹر جنرل بارڈر فورسز (بھارت) اور ڈائریکٹر جنرل پاکستان رینجرز کے نمائندے شامل ہوں گے۔ یہ کمیٹی گراؤنڈ رولز میں ترمیم کے بارے میں دونوں ملکوں کی جانب سے 1981-82ء میں پیش کی گئی تجاویز پر غور کرے گی۔

رنجیت ساگر اور وولر ڈیم:

بھارت نے مقبوضہ کشمیر میں مادھوپور ہیڈ ورکس سے 16 میل اوپر تحصیل پٹھانکوٹ میں دریائے راوی کے پانی کو استعمال کرنے اور اس سے بجلی حاصل کرنے کیلئے منگلا بند کی طرز پر رنجیت ساگر ڈیم تعمیر کیا۔ مارچ 1986ء میں بھارت نے اس ڈیم کی تعمیر کا کام تیز کر دیا بھارت کا مقصد یہ تھا کہ گرمیوں میں دریائے راوی کے پانی کو اس ڈیم کے ذریعے ذخیرہ کر لیا جائے اور سردیوں میں اسے آبپاشی کیلئے استعمال کیا جائے مادھوپور ہیڈ ورکس جو انگریزوں نے بنایا تھا اس کے ذریعے اپر باری دوآب اور لوئر باری دوآب کی نہروں کے ذریعے دوآب سے آبپاشی کی جاتی تھی تقسیم کے بعد بھارت نے پاکستانی علاقوں کا پانی روک لیا جس پر دونوں ملکوں کے مابین نہری پانی کا تنازعہ کھڑا ہو گیا جو سندھ طاس معاہدے پر منتج ہوا۔

اکتوبر 1986ء میں پانی کا رخ موڑنے سے دریائے راوی مکمل طور پر بھارت کے کنٹرول میں چلا گیا اس ڈیم میں 30 لاکھ ایکڑ فٹ پانی کی گنجائش رکھی گئی ہے اس ڈیم سے پیدا ہونے والی بجلی ہماچل پردیش اور مقبوضہ کشمیر کو فراہم کرنے کا پروگرام بنایا گیا ہے اس ڈیم کی تعمیر سے اب برساتی پانی بھی پاکستان میں داخل نہیں ہو سکے گا۔ اسی طرح بھارت نے وولر جھیل کے پانی کو روک کر وولر ڈیم بنانے کا منصوبہ بھی بنایا۔

حکومت پاکستان کے احتجاج پر اس کی تعمیر کا کام روک دیا گیا تاہم 14 جنوری 1988ء کو پاکستان نے اعلان کیا کہ اگر بھارت نے وولر بیراج کی تعمیر شروع کی تو پاکستان ثالث مقرر کرے گا۔ وولر بیراج کی تعمیر روکنے کا فیصلہ سیکرٹریوں کی سطح پر کیا گیا تھا اس سلسلے میں ہونے والا سمجھوتہ 31 دسمبر 1987ء تک موثر تھا۔ پاکستانی دباؤ پر وولر بیراج کی تعمیر بھارت نے وقتی طور پر روک دی۔

Marfat.com

آپریشن Brass Tacks

جنرل ضیاء الحق کے دور حکومت میں بھارت کی طرف سے برصغیر کی سب سے بڑی جنگی جارحیت اس وقت کی گئی جب بھارتی حکومت نے فوجی مشقوں کی آڑ میں جسے بھارت کی آرمی کی کتابوں میں "Trident Brass Tacks" کا نام دیا گیا ہے، فروری 1987ء میں پہلے گلگت اور پھر سکردو پر حملہ کر کے پاکستان کے شمالی علاقہ جات پر قابض ہونے کا گھناؤنا منصوبہ بنایا تھا۔ یہ منصوبہ بھارتی وزیراعظم اور بھارتی چیف آف آرمی سٹاف جنرل سندر جی نے مل کر تیار کیا تھا۔ راجیو گاندھی جن کی پوجیہ ماتا جی سکھوں کے ہاتھوں سورگباش ہوئی تھیں۔ بھارت میں جاری سکھوں کی شورش کیلئے پاکستان کو ذمہ دار گردانتے اور اس منصوبے کے ذریعے اسے سبق سکھانے پر تلے ہوئے تھے۔ اگر خدانخواستہ بھارتی حکومت کا یہ منصوبہ کامیاب ہو جاتا تو پاکستان کو خاکم بدہن 1971ء سے بڑا سانحہ دیکھنا پڑتا لیکن پاکستانی فوج کی شاندار جوابی حکمت عملی نے جنرل سندر جی کے چھکے چھڑا دیئے اور انہیں یہ آپریشن ختم کرنا پڑا۔

آپریشن براس ٹیک پر معروف بھارتی مصنف جنہیں عسکری معاملات پر اتھارٹی سمجھا جاتا ہے Ravi Rikhye نے مشہور زمانہ کتاب "The War That Never Was" لکھی تھی۔ اس کتاب نے طویل عرصے تک بھارتی دفاعی حلقوں میں کہرام مچائے رکھا۔ آپریشن Brass Tacks کو ایک بھارتی مصنف کے نکتہ نظر سے دیکھنا ہی زیادہ مناسب دکھائی دیتا ہے۔ آیئے روی ریکھی کی زبانی اس کا احوال جانئے۔

روی ریکھی کہتے ہیں:

''قبل اس کے کہ اس پس منظر کی تفصیل میں جائیں جو 1986/87ء کے بحران کی وجہ بنا ضروری ہے کہ کچھ بنیادی نکات کا جائزہ لیا جائے۔ داخلی پالیسی کے نتیجہ میں پائی جانے والی صورت حال کے نتیجہ میں یہ ضروری ہو گیا تھا کہ پاکستان کے ساتھ جھگڑا کیا جائے تا کہ ملک کے اندر کے معاملات سے عوام کی توجہ ہٹائی جا سکے اور یہ جھگڑا پاکستان کے ساتھ ہی کیا جا سکتا تھا کیونکہ چین کے ساتھ کسی طرح کی کارروائی کرنے سے ہم بہت زیادہ خوفزدہ ہیں۔ ہم نے جھگڑے کا ماحول پیدا کیا لیکن جب اس کا وقت آیا تو ہم نے پاکستان کو سبقت لے جانے کا موقع دے دیا اور خود پیٹھ دکھا دی۔ اس پسپائی سے ہماری بزدلی اور کمزوری کا اظہار ہوا باوجود اس کے کہ پاکستان کی نسبت ہماری فوجی طاقت زیادہ مضبوط تھی اور ہم چالیس سال سے ایسا ہی کر رہے ہیں۔ اس تجزیہ کیلئے ہم اس واقعہ کو آپریشن "TRIDENT BRASS TACKS" کا نام دیتے ہیں۔

''تین سروں والا نیزہ۔ ترشول'' فروری 1987ء کو 30-4 بجے گلگت پر پہلے اور پھر سکردو پر حملے کے منصوبہ کا

Marfat.com

نام ہے۔توقع تھی کہ اس حملہ کی تکمیل دو ہفتے میں ہو جاتی اور اس کے نتیجہ میں 1947ء سے پاکستان کے زیر قبضہ شمالی علاقہ جات کو واپس لے لیا جاتا۔اگر پاکستان لڑائی کو صرف شمالی علاقہ تک ہی محدود رکھنا پسند کرتا تو یہ ہند کیلئے خوب تھا لیکن فرض کریں پاکستان جوابی کارروائی کر کے اس دائرے کو بڑھا کر مثلاً پنجاب پر حملہ کر دیتا اس وقت Brass Tacks (یعنی اصل اور حقیقی معاملہ) جو بنیادی طور پر ایک عظیم حربی منصوبہ کے طور پر تیار کیا گیا تھا اور جس کے تحت شمالی علاقوں میں پاکستان کو ابھار کر سندھ سے اس کی توجہ و طاقت کو مرکوز کرتا تھا زیر عمل لایا جاتا اور اس کے تحت تین دن کے اندر میر پور خاص اور پھر سات دن کے اندر حیدر آباد سندھ پر قبضہ کر لیا جاتا۔قاری کے علم کیلئے بتایا جانا ضروری ہے کہ دسمبر 1986ء اور فروری 1987ء کے درمیان بھارتی فوج نے مختلف علاقوں کیلئے بہت سارے حربی منصوبے تیار کئے جو حالات میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ یا تو ختم کر دیئے گئے یا پھر ان میں تبدیلیاں کی جاتی رہیں۔اس لئے اگر کسی نے یہ سنا ہوا ہے کہ فلاں منصوبہ حتمی طور پر تیار کیا گیا تھا تو یہ درست نہیں ہے۔اسوقت بہت سے منصوبے زیر غور تھے لیکن ہماری اطلاعات "Trident Brass Tacks" کے مشترکہ منصوبہ کے بارے میں یہ اہم نہیں ہے کہ اصل حربی تدبیر کیا تھی کیونکہ کسی بھی حکمت کے ذریعہ جلدی فتح حاصل کرنا ممکن نہیں تھا۔"Trident Brass Tacks" کے بارے میں ہمارا تفصیلی تجزیہ ہمارے پیش کردہ موقف کیلئے مناسب ہے۔بہرطور "Trident Brass Tacks" ایک مہلک اور حتمی وار ہوتا۔اب اگر اس بحث و مباحثہ کے نتیجہ میں یہ ظاہر ہو کہ بہانہ کافی تھا تو یہ سوچنا درست ہے کیونکہ واقعی حالات ایسے تھے اور صاحب اختیار ہر قیمت پر جنگ چاہتے تھے۔پھر یہ کہ ہم اس پہلو پر یہ توجہ کیوں مرکوز نہیں کر رہے ہیں جس سے کئی لوگ زیادہ دلچسپ کہانیاں پیش کر سکتے جواب یہ ہے کہ اس لئے کیونکہ مجھے یہ سب کچھ قطعی دلچسپ محسوس نہیں ہوا اور میں ایک کتاب لکھ رہا ہوں۔میرا مؤقف یہ ہے کہ ہمیں جنگ کرنی چاہئے تھی اور اس کا رنج ہے کہ ایسا نہیں ہوا ہے لہٰذا جنگ کی باتیں کرنے والے ہمارے لیڈروں کے رویے ور جحان کا مجھے تردد نہیں ہے میری دلی خواہش ہے کہ ہمارے پاس جنرل سندر جی اور ارون سنگھ جیسے لیڈر اور بھی ہوتے۔کیا کہوٹہ کے ایٹمی پلانٹ پر بھارت کے حملے کا بھی کوئی منصوبہ تھا؟ اس بارے میں ایسے لگتا ہے کہ دسمبر 1986ء میں کہوٹہ پر حملے کا منصوبہ تھا جو پھر منسوخ کر دیا گیا۔میں نے اپنی کتاب ''دی فورتھ راؤنڈ'' میں آغاز جنگ کیلئے کہوٹہ پر بھارتی حملے کو مفروضہ بنایا تھا اس کے مطابق پاکستان کشمیر اور شمالی علاقوں میں برتری حاصل کرتا اور بھارت بجائے سندھ کے ملتان پر حملہ آور ہوتا جو کہ حقیقی منصوبہ بھی تھا۔

کوئی اپنے افسانوی مفروضے کے اصل اور حقیقی منصوبہ سے مشابہ ہو جانے پر بے شک اترائے لیکن مجھے ایسی خوشی یا فخر نہیں ہے کیونکہ مجھے یقین نہیں کہ حکومت کا یہ منصوبہ کامیاب یا کارگر ثابت ہوتا۔ظاہر ہے گورنمنٹ پر اگر کتاب کا کس طرح اثر پڑا بھی تو بھی منصوبہ بندی کرنے والوں نے یہ کتاب سے نہیں پڑھا وہ یہ جان لیں گے کہ کیوں بھارت دو ہفتوں یا مختصر جنگ میں فتح حاصل نہیں کر سکتا اور کیوں سندھ جنگ کیلئے مناسب محاذ ہے۔البتہ میں شمالی علاقوں کے بارے میں منصوبہ سے متاثر ہوں گو کہ اس سے بھی کام نہیں چلنا تھا۔

یہ سمجھنے کیلئے کہ 1986/87ء کے موسم سرما میں کیا ہوا' ہمیں اب آزادی کے ساتھ ان دیکھے اور ناقابل اعتبار پانی میں غوطے لگانے کی ضرورت ہے مہذب اور اچھے افراد جن میں پہلے ہی بڑی تعداد میں وہ ایڈیٹر صاحبان شامل ہیں

Marfat.com

جنہوں نے یہ کتاب شائع کرنے سے انکار کیا یہ چاہیں گے کہ ہم یہ غوطہ زنی نہ کریں بلکہ وہ مزید حقائق کا انتظار کریں گے یہ لوگ اعتراف کریں گے کہ ہمارے اس مضمون میں وزن اور حقیقت ہے لیکن کچھ حقائق کے بارے میں ان کا خیال ہوگا کہ شاید یہ خیالی باتیں ہیں اور یہ کہ ہمیں مزید تفصیلات کے منظر عام پر آنے کا انتظار کرنا چاہئے لیکن یہی وہ بات ہے جو مندرجہ ذیل وجوہ سے ہمیں نہیں کرنا۔

1- ہم پہلے ہی اشاعت کو مارچ 87ء سے نومبر 87ء تک یعنی 8 ماہ کی مدت تک ملتوی کر چکے ہیں، جو کوئی عقلمندی نہیں ہوتی ہے سوائے اس کے کہ کچھ معمولی حقائق مزید شامل ہو سکتے۔ لیکن ہم سو سال بیٹھ کر بھی اصل موضوع میں تبدیلی لائے بغیر مزید چند اور معمولی حقائق کا ہی اضافہ کر سکتے تھے۔ جو فروری 87ء میں تھے۔ بعد کے واقعات گزرے واقعات کی نسبت عوام الناس کے ذہن پر زیادہ اثر پذیر ہوتے ہیں چاہے گزرے واقعات کتنے ہی اہم کیوں نہ ہوں۔ مصنف کو اگر اپنے قارئین کی توجہ حاصل کرنی ہے تو پھر اسے گرم لوہے پر ضرب لگانے والی مثال پر عمل کرنا چاہئے مثال کے طور پر کیا آپ اب 1971ء کی جنگ کے بارے میں تجزیہ کو پڑھنا چاہیں گے کہ ہند نے اعلیٰ حکمت عملی پر عمل کر کے پہلے حملہ کیا اور بھارت کو مغرب کی طرف کارروائی سے روکا لیکن مشرقی پاکستان کے واقعات کا ذکر نہ ہو۔ وغیرہ کے بارے میں مضمون میں دلچسپی لیں گے۔ ممکن ہے کچھ لوگ دلچسپی لیں لیکن اکثریت کیلئے یہ تاریخ ماضی ہے اور اس کے پڑھنے سے انہیں مزا کم اور جمائیاں زیادہ آئیں گی۔ مزید یہ کہ واقعات کے چھوٹے بڑے حصوں کے افشائے راز کی بنا پر اہمیت ویسے بھی کم ہو چکی ہے 1972ء میں اس واقعہ کی اشاعت سے آج کی نسبت لوگ زیادہ فائدہ اٹھاتے۔

جب بھی کسی منصوبہ کو عملی جامہ پہنایا جاتا ہے مثال کے طور پر جیسے 1971ء میں اندرا کا پاکستان پر حملہ تو اس وقت کئی راز ہائے پنہاں اور واقعات تسلسل چھپانے کی کوشش کے باوجود افشا ہوتے ہیں البتہ ایسے منصوبے (جو 1986-87ء کے منصوبہ کی طرح بنائے جائیں اور پھر منسوخ کر دیئے جائیں) کے بارے میں چاہئے کتنا انتظار کیا جائے سچ کے قریب پہنچنا مشکل ہوتا ہے۔ یہ اس لئے بھی ہوتا ہے کہ اس وقت کی صورت حال کے پیش نظر لوگ مختلف قسم کی کہانیاں ترتیب دے لیتے ہیں جیسا کہ 1971ء میں ہمارے سیاست دانوں اور جرنیلوں کے بارے میں ہوا۔

اگر حکومت فراخدلی اور بے تکلفی سے 1986-87ء کے واقعات کے بارے میں مناسب وقت کے اندر کچھ بتا دے تو پھر مزید تفصیلات کا انتظار کرنا سودمند ہے لیکن بھارتی حکومت کبھی فراخدلی کا مظاہرہ نہیں کرتی نہ ہی جنرل سندرجی یا ارون سنگھ ہی آئندہ چند سال میں اپنی یادداشتیں لکھ کر ہمیں بتائیں گے کہ انہوں نے کیا منصوبہ بندی کی تھی خاص طور پر جبکہ وہ کچھ بھی کرنے میں ناکام رہے۔ آئندہ پچیس تیس سال تک ایسی منصوبہ بندی و ترمیمات وغیرہ کے بارے میں کسی دستاویز کے شائع ہونے کی توقع نہیں ہے۔

Brass Tacks کا پس منظر:

1984ء میں بھارتی فوج نے ایک نرالا معرکہ مارا۔ فوج نے پنجاب اور ہریانہ میں سات ڈویژن فوج بھیجی پاکستان سے لڑنے کیلئے نہیں بلکہ گولڈن ٹیمپل میں سکھ انتہا پسندوں کا صفایا کرنے کیلئے 250 سے زائد افسران اور جوان اس میں مارے گئے اور اس سے دوگنی تعداد میں زخمی ہوئے۔ پاکستان سے لڑنے کیلئے یہ جارحانہ فوج تیار نہ رکھی گئی تھی بلکہ

Marfat.com

بھارتی شہریوں سے لڑنے کیلئے تعینات کی گئی۔ بعد میں جبکہ اندرا گاندھی کے قتل کے بعد شمال مغربی بھارت کا بڑا حصہ فرقہ وارانہ فسادات کی لپیٹ میں آ گیا تو فوج کی ایک تہائی طاقت کو اندرونی سلامتی پر مامور کر دیا گیا۔ البتہ فسادات کی بنا پر سارے کے سارے گیارہ ڈویژن وہاں نہیں تھے۔ دو ڈویژن معمول کے معاملات کیلئے شمال مشرق میں موجود تھے جب کہ کچھ فوج جموں کشمیر کی اندرونی سلامتی کیلئے موجود تھی۔

دہلی میں بھی تقریباً تین ڈویژن فوج تعینات کی گئی تھی اس نامور و شاندار شہر کے شہریوں کو وسطی ہند میں مقیم BMP-1 انفنٹری ڈویژن کی بکتر بند اور دوسری گاڑیوں کو بجائے پاکستانی فوج سے محاذ پر نبرد آزمائی کے اپنے شہر کی گلیوں اور جمنا کے پار فسادیوں کا پیچھا کرتے دیکھا گیا ان صاف اعداد و شمار کا تقابلی جائزہ پیش کیا جانا حالات کے معلوم کرنے میں اضافہ کرتا ہے۔ لیفٹیننٹ جنرل اجیت سنگھ اروڑہ نے سات ڈویژن فوج کے ذریعہ مشرقی پاکستان پر قبضہ کیا جبکہ تیرہ س ال بعد اتنی ہی فوج کے ذریعہ پنجاب اور ہریانہ میں اپریشن بلیو سٹار کیلئے استعمال ہوئی 1962ء میں چین سے ہونے والی جنگ سے پہلے فوج کے دس ڈویژن تھے مغربی کمان نے 1965ء میں پاکستان کے چھمب اکنور سیکٹر پر حملہ کے جواب میں سیالکوٹ پر حملہ کیلئے تین ڈویژن فوج کو جھونکا جبکہ 1984ء میں دہلی میں امن قائم کرنے کیلئے بھی اتنی ہی فوج استعمال کی گئی۔ بھنڈرانوالہ کی کہانی اور گولڈن ٹیمپل پر حملہ کے واقعات و اسباب کا سب کو اچھی طرح علم ہے۔ جب بھنڈرانوالہ نے پنجاب میں نفرت پھیلانی شروع کی تو پاکستان نے ہند پر اپنا دباؤ بڑھانے کیلئے یہ موقع غنیمت جانا اور انہوں نے سکھ انتہا پسندوں کو (جو محدودے چند تھے) سنجیدگی سے تربیت دینی شروع کر دی اور بعد میں ہزاروں نوجوان سکھوں نے پاکستان کی طرف بھاگنا شروع کر دیا اس طرح انہوں نے زیادہ تعداد میں انہیں تربیت دی لیکن یہ تعداد بھی مختصر تھی۔ اندر ملہوترہ جیسے پاکستان دشمن صحافی نے بھی یہ تعداد تقریباً 200 بتائی ہے۔ پاکستانیوں نے ہمیشہ کی طرح چالاکی اور عقل سے کام لیتے ہوئے 1965ء کی جنگ سے قبل کشمیر میں بغاوت پیدا کرنے کی تباہ کن کوشش سے سبق سیکھا اور انہوں نے اس دفعہ بجائے تعداد کے قابلیت و صلاحیت کے نظریہ کو مدنظر رکھا علیحدگی پسندوں کی کامیابی کے بارے میں کسی خوش فہمی یا فریب نظر کے بجائے انہوں نے محض دباؤ ڈالنے کی حد تک سوچا۔

بھارت کے ریسرچ اور تجزیہ کرنے والے شعبہ را کی طرف سے پاکستان میں تخریب کاری کی تربیت گاہوں میں داخلہ کی کوشش تقریباً ناکام ہوئیں پاکستانیوں نے بھارت کے سکھوں کے بھیس میں جاسوسوں کو چھان کر نکال دیا۔ پاکستانیوں کا طریقہ کار اذیت ناک لیکن کارگر تھا جب ایسے نام نہاد بھگوڑوں جن پر ذرا سا بھی شک ہو کہ ہفتوں اور مہینوں منظم طور پر مارا پیٹا اور اذیت دی جائے تو پھر بہت ہی کم ایجنٹ اس امتحان پر پورا اتر سکتے ہیں۔ ایک سوال ہے کہ پاکستان بھارتی پنجاب میں شورش و ہیجان کو کیوں مزید بھڑکانا چاہے گا؟ اس کا جواب ہے کہ کچھ عرصہ پہلے تک بھارت سندھ میں علیحدگی پسندوں کی امداد کرتا رہا ہے۔ 1983ء میں جب کہ سندھ میں احتجاجی تحریک زوروں پر تھی ہمارے وزیراعظم نے تو یہاں تک بیان دے دیا تھا کہ سندھ عنقریب آزاد ہو جائے گا۔ یہ ایک غیر معمولی بیان تھا کیونکہ یہ صورت حال ایسی نہ تھی جیسی 1971ء میں مشرقی پاکستان میں تھی بہت سارے ایسے گھس بیٹھیے پاکستانی جیلوں میں ظلم و اذیت کا نشانہ بن کر گھل رہے ہیں۔ سرکاری طور پر ان لوگوں کا کوئی وجود نہیں ہے سرکاری طور پر ہم اتنے سچے صاف اور کھرے ہیں کہ ہم نے سندھ

Marfat.com

میں پاکستان کو تباہ کرنے کیلئے کوئی ایجنٹ نہیں بھیجا ہے۔ غیر سرکاری طور پر بھی بھارتی حکومت ان ایجنٹوں کو بھول جانا ہی مناسب خیال کرتی ہے۔ ان میں سے کچھ تو خاص طور پر کوئی قیمتی سرمایہ نہیں ہیں۔ یہ قاتلوں' جرائم پیشہ افراد اور ان سمگلروں پر مشتمل ہیں جو پاکستان اور ہند کے سرحدی علاقہ کے قریب رہتے ہیں لیکن پھر بھی چاہے ان کا شجرہ رنگ نسل اور کرتوت کیسے ہی ہوں وہ بہر حال اپنے ملک کیلئے لڑے ہیں اور صلہ میں محب وطن ہندوستانیوں کی طرف سے ظلم واذیت پایا ہے جبکہ غدار امیر سے امیر تر اور فربہ ہو کر پھل پھول رہے ہیں۔

سندھ میں پکڑے جانے والے بھارتی تخریب کار ایجنٹوں کو جو بھیانک سزا پاکستان نے دی وہ یقیناً صرف پاکستان کی ہی خصوصیت نہ تھی بلکہ ہم بھی بھارت میں پکڑے جانے والے پاکستانیوں کے ساتھ یہ ہی کرتے ہیں امرتسر تفتیشی سنٹر میں بھیجے جانے والے وہاں یقیناً آرام کیلئے نہیں جاتے لیکن وہ بھارتی شہری جنہیں غداری کے الزام میں لال قلعہ لے جایا جاتا ہے کا حشر بہت ہی برا ہوتا ہے۔

پاکستان پنجاب میں اپنے آدمی بھیجتا رہا ہے جبکہ ہم سندھ میں بھیجتے رہے اور بھیج رہے ہیں۔ ہم سندھ میں آدمی اس لئے بھیجتے ہیں کیونکہ پاکستان کشمیر میں آدمی بھیجتا ہے پاکستان کشمیر میں اس لئے ایجنٹ بھیجتا ہے کیونکہ ہم بلوچستان اور سرحد کے علیحدگی پسندوں کی امداد کرتے ہیں اس سلسلہ میں ہمارا کابل کا سفارتخانہ شکریہ کا مستحق ہے جو دیگر سفارت خانوں کے الٹ کچھ کام کر رہا ہے ہم سرحد اور بلوچستان میں آدمی اس لئے بھیجتے ہیں کیونکہ ایک بار پھر پاکستان میں گڑبڑ کراتا ہے اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ یہ قوموں کے درمیان کھیل کا حصہ ہے۔ یہ کتنا ہی اذیت ناک ہو لیکن بہر حال قوموں کے وجود کے ساتھ ساتھ یہ چلتا رہا ہے اور چلتا رہے گا۔ جب تک قومیں باقی ہیں یہاں ہم کسی ایک طرف کو مورد الزام نہیں ٹھہراتے۔ ہم محض یہ بتانا چاہتے ہیں کہ موجودہ بحران کا آغاز پاکستان کی سکھ علیحدگی پسندوں کی امداد کی بنا پر ہوا۔ لیکن یقیناً دوسو علیحدگی پسند سکھ بھارت کیلئے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتے۔ ریاست پنجاب ایک کروڑ تیس لاکھ افراد کا علاقہ ہے جو دنیا کے گنجان ترین علاقوں میں شمار ہوتا ہے کیا دوسو افراد اس کا کچھ بگاڑ سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔ چاہے تمام اخبارات روزانہ پنجاب میں تشدد سے مرنے والوں کی فہرستیں چھاپئیں ہمیں ٹھنڈے دل سے دو باتیں ذہن میں رکھنی چاہئیں ایک یہ کہ قتل ہونے والوں میں سے بہت سے ایسے ہیں جو روزمرہ کے حوادث کا شکار ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو جرائم کی وجہ سے اور کچھ مذہبی جنون کے نتیجہ میں حادثہ کے شکار ہوتے ہیں دوسرا یہ پنجاب خاص طور پر اور اس کے ساتھ کے علاقے راجھستان' یوپی' بہار' مدھیہ پردیش ویسے بھی تشدد کا شکار ہیں۔ بہت ہی معمولی باتوں پر وہاں قتل ہو جاتا ہے اور پھر اس کی لپیٹ میں آ کر عورتیں بچے بوڑھے دادا پر دادا لولے لنگڑے غرض کہ پورے پورے خاندان بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ پنجاب کی طرف توجہ دار الحکومت کے نزدیک اس کی اہمیت کی آئینہ دار ہے اور یہ کہ یہاں انسان مر رہے ہیں کیونکہ یہ پنجابی ہیں۔ بہار میں روزانہ قتل عام ہوتے ہیں لیکن وہ قابل ذکر نہیں کیونکہ جیسا کہ ہر کوئی جانتا ہے کہ بہار میں نچلی قوموں کے لوگ لیتے ہیں جو انسانوں میں شمار نہیں ہوتے اور اگر ہم تھوڑی نرمی سے سوچیں تو یہ کہ وہ پورے جانور بھی نہیں ہیں۔ ذہن میں رکھنے کے قابل ایک تقابلی جائزہ پیش ہے کہ پنجاب میں تین سال میں قتل ہونے والوں کی تعداد سے آسام میں نیلاتی کے قاتلوں کے ہاتھوں معمول کے مطابق روزانہ قتل کی تعداد زیادہ ہے۔

Marfat.com

اس لئے نیلاتی کے منظر عام پر آنے پر ہم نے محض جمائیاں لی ہیں اور روزنامہ انڈیا ٹوڈے میں بچوں کے چاک شدہ پیٹ دیکھ کر گندی زبان استعمال کی تو پھر پاکستان اور 200 علیحدگی پسندوں کے بارے میں اتنے فکر مند کیوں ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ: کیونکہ ہمیں پاکستانیوں سے متعلق ہر معاملہ پر پیٹ میں درد ہونے لگتا ہے۔ مختصر یہ کہ پاکستان کی علیحدگی پسندوں کیلئے امداد کیونکہ بہت بے ترتیب و محدود ہے اس لئے ہند کیلئے اس سے نمٹنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ آپ اسرائیلیوں کے فلسطین کے خلاف کئے جانے والے بھرپور حملوں جیسا وار نہیں کر سکتے۔ نہ ہی آپ گلیلی جیسا امن حملہ کر سکتے ہیں کیونکہ یہاں ایسا کوئی سبب ہی نہیں جو جنگ کا جواز بن سکے۔ اس طرح ہم ان کے ساتھ وہی کر رہے ہیں جو وہ ہمارے ساتھ کر رہے ہیں۔

درست یہ ہوتا کہ ہم دانت پیستے کھسیانی ہنسی ہنستے اور خاموشی سے اسے برداشت کرتے اور ان میں اپنے جاسوسوں کو مزید داخل کرتے رہتے لیکن...... چونکہ پاکستان بہت چھوٹا ہے اس لئے ہم دانت پیستے ہوئے اس کی اشتعال انگیزیوں کو برداشت نہیں کر سکتے۔

1986-87ء کے موسم سرما میں بھارتی فوج نے اپنی سہ سالہ مشقیں کرنا تھیں جنکا نام اس دفعہ انہوں نے (Exercise Brass Tacks) مشقیں رکھا تھا 1986ء کے وسط تک اس معاملہ میں فیصلہ کرنیوالوں کے ذہنوں میں یہ خیال کھلبلانے لگا کہ کیوں نہ اس دفعہ یہ مشقیں پہلے سے زیادہ بڑے پیمانے پر کی جائیں اور کیوں نہ ایسی سوچی سمجھی مبہم اور غیر واضح پالیسی لائی جائے جس سے پاکستان کو پسینہ آ جائے۔ (Brass Tacks) جیسی مشقیں درمیان میں کم اور محدود ہونی چاہئیں۔ بھارتی فوج نے ایک فوج کی حیثیت سے نہیں بلکہ عسکری تربیت کو قائم و برقرار رکھنے کیلئے پرانے طرز کی پالیسی و پابندی اپنا رکھی ہے۔

1986-87ء کی مشقوں نے بھارت کو یہ بے مثال موقع فراہم کیا کہ وہ پاکستان کو یہ یاد دلانے کیلئے دباؤ ڈال سکیں کہ پاکستان بھارت کی عسکری طاقت کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے اور اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ علیحدگی پسندی کے متعلق اپنی پالیسی تبدیل کرے لیکن یہ دباؤ اب پاکستان کو اشتعال دلانے لگا تھا اس امید کے ساتھ کہ وہ بھارت پر حملہ کرے اور جنگ شروع ہو جائے۔

ایک حکمت عملی کا گھڑ لینا کوئی مشکل نہیں ہے لیکن انوکھی بات ہے کہ تینوں میں سے کوئی اداکار یہ کام کرنے کا اہل نظر نہیں آیا۔ اس کی بڑی وجہ وہ خوف و گھبراہٹ تھی جس میں خارجہ پالیسی ترتیب دی گئی۔ کوئی بھی بیل کو سینگوں سے پکڑنے کو تیار نہ تھا۔ کیونکہ تین بڑے اداکاروں میں کوئی ہم آہنگی نہیں تھی۔ ان کی مثال ان چوروں کی تھی جو امیر آدمی کے گھر کے گرد لوٹنے کیلئے منڈلا رہے تھے لیکن نہ ان میں اندر جانے کا حوصلہ تھا اور نہ ہی لالچ انہیں اس ارادے کو ترک کرنے دے رہی تھی ان حالات میں اختلاف و تردید سے نہیں بچا جا سکتا۔

غالباً ہم آہنگی کے فقدان کی بنا پر ہی ارون سنگھ اور جنرل سندر جی نے بحریہ اور فضائیہ کو اعتماد میں نہیں لیا جو کہ اعتماد اور بھروسہ پیدا کرنے میں مشکلات کا باعث ہوا اور ہر طرف سے عدم اعتماد نے جنگ شروع کئے جانے کے امکانات کو مفلوج کر دیا۔ اس بچگانہ طرز عمل کا اندرا گاندھی کے ماہرانہ اور پیشہ وارانہ طریق سے تقابل کیجئے۔ مشرقی پاکستان کی

Marfat.com

بغاوت میں بھارتی ہاتھ کے ذکر کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ اگر بھارت نے مشرقی پاکستان کے لوگوں کی دیرینہ مشکلات اور پریشانیوں کی آڑ میں فائدہ اٹھایا تو اس میں کسی شکوہ یا گلہ کی گنجائش نہیں ہے بلکہ اس پر مبارک باد دی جانی چاہئے۔ خانہ جنگی کی بنا پر وہاں سے انخلا یا ہجرت ناگزیر تھی مسز اندرا گاندھی نے نہایت چالاکی سے ہندو ہجرت کا نام دیا جبکہ درحقیقت یہ خروج محض سرحدی علاقہ میں رہنے والے غریب لوگوں کا تھا۔ تقریباً چالیس لاکھ افراد جو آبادی کا محض 6 فیصد بنتے تھے ہندوستان آئے۔ (ان کا تقابل افغانستان وطن چھوڑ کر آنے والوں سے کیا جائے تو؟) لیکن مسز اندرا گاندھی نے کیمپوں تک رسائی کو اپنے کنٹرول میں رکھ کر یہ واویلا شروع کر دیا کہ ہندوستان میں مہاجرین کا سیلاب آ گیا ہے اور یہ کہ دو کروڑ مہاجرین ہندوستان میں آ چکے ہیں جو کہ تاریخ کی سب سے بڑی ہجرت ہے اندرا گاندھی نے بھارتیوں اور عالمی رائے عامہ کو بڑی خوش اسلوبی سے مغربی پاکستان کی بربریت اور بھارتی مظلومیت اور دکھ کے قصہ کہانیوں سے گمراہ کیا۔ انہوں نے تواتر کے ساتھ سرحدی جھڑپیں کرائیں جس سے ہندوستانی عوام میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ یقیناً ان پر حملہ ہو رہا ہے۔ اندرا گاندھی نے مسلسل پاکستان کو سخت سے سخت ردعمل کیلئے مشتعل کیا۔

پاکستان پر حملہ کرنے سے پہلے انہوں نے عالمی دورہ کیا اور عالمی رائے عامہ کو اپنے حق میں کرنے کیلئے اپنی حالت اور اپنے نقطہ نظر کا پرچار کیا۔ ان کی حکمت عملی اتنی مکمل جامع اور شاندار تھی کہ انہوں نے ہر قدم اور ہر موقع پر صدر نکسن اور اس کے شاطر وزیر خارجہ کنگر کو چاروں شانے چت کر دیا۔ آخر میں گو کہ کوئی اتنا احمق نہ تھا کہ سمجھ سکتا کہ کیا ہو رہا ہے لیکن اندرا نے اپنا کام اس مہارت سے کیا کہ جب وقت آیا تو پاکستان پر بھارتی حملہ پر کسی نے انگلی تک نہ اٹھائی۔

مسز اندرا گاندھی نے اپنے حکمت عملی کے ارتقاء اور عمل پذیری میں وقت کا انتظار کیا۔ اس کی حکمت عملی کے پورے آٹھ ماہ گزرنے کے بعد مشرقی پاکستان میں وہ ایسی آگ بھڑکانے میں کامیاب ہوئی جس کے نتیجہ میں 22 نومبر 1971ء کو بھارتی فوجوں نے مشرقی پاکستان کی سرحدیں عبور کیں۔ اندرا کے علم میں تھا کہ جو کچھ ان کا خیال تھا اور جو کچھ وہ چاہتی تھیں وہ انہیں مل گیا ہے۔ یہاں یہ امر کہ انہوں نے ساتھ ہی آزاد کشمیر پر چڑھائی کر کے اس قضیہ کو بھی کیوں ختم نہ کر دیا ان کیلئے تعریف کو کم نہیں کرتا...... خاص طور پر اس ناکارہ طریقہ کار کو خود دیکھتے ہوئے جو موجودہ حکمرانوں نے ان معاملات میں اختیار کیا۔ حیرت انگیز طور پر 1987ء میں پاکستان اور بھارت کے حکمرانوں نے 1971ء سے الٹ حکمت عملی کا مظاہرہ کیا۔ 1971ء میں ذہین مشیروں کی جماعت کی امداد سے اندرا گاندھی نے سیاسی طور پر ناکارہ اور سادہ لوح فیلڈ مارشل یحیٰی خان کو اپنی انگلیوں پر نچایا جبکہ 87-1986ء میں زیرک اور چالاک جنرل ضیاء نے پاکستان کی تاریخ کے کچھ بہترین مشیروں کی امداد سے ہمارے حکمرانوں کو اپنی بانسری پر تگنی کا ناچ نچا دیا۔

جنرل ضیاء ایک آہنی قوت اور قوت ارادی کے مالک تھے۔ انہوں نے ہمارے وزیراعظم سے ہر ہتک آمیز رویہ کے جواب میں مسکراہٹ صبر اور خوش مزاجی کا اظہار کیا۔ انہیں اپنے مخالف کی طاقت کا اندازہ ہے اور وہ ایک ماہر مچھیرے کی طرح ایک طاقتور شارک کو قابو میں کرنے کا انداز اختیار کئے ہوئے تھے۔ ایک غلط چال شارک مچھیرے کو تباہی سے دوچار کر سکتی ہے لیکن چالاکی' مکاری اور بھرپور اخلاقی قوت کی مدد سے مچھیرا شارک کو شکست دے سکتا ہے اور بالکل یہی جنرل ضیاالحق نے کیا۔ ایک کمزور ملک ہونے کی بنا پر پاکستان کیلئے صرف ایک ہی موقعہ ہو سکتا ہے کہ وہ پہلے حملہ کرے اور

Marfat.com

پھر فوراً بین الاقوامی مداخلت کی امید کرے کہ بھارت کے جوابی حملہ سے بچا جائے وہ یہ توقع نہیں رکھ سکتا کہ بھارت کا پہلا حملہ برداشت کر کے پھر خود حملہ کرے کیونکہ بھارتی حملہ اتنا بھرپور ہوگا کہ پھر جوابی حملہ کا وہ شاید کبھی موقع ہی نہ آئے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ بیرونی مداخلت سے جنگ رکوانے کی امداد پر پہلے حملہ کر کے بیرونی رکاوٹ نہ ہونے کی بنا پر بھی تباہی ہے۔ جنرل ضیاء کو کسی دوستانہ مداخلت کی امید نہیں تھی۔ تاریخ یہ ہے کہ وقت پر پاکستان کے بہی خواہوں اور اتحادیوں نے اسے ہمیشہ دھوکہ ہی دیا ہے۔ جنرل سندرجی کی اشتعال انگیزیوں میں سے ایک یہ تھی کہ وہ دسمبر کے آخر تک اپنی جنگی مشقوں کے مقاصد بتانے سے انکار کرتا رہا یہ انکار نہ صرف پاکستان کی طرف سے وضاحت طلب کرنے پر ہوا بلکہ دہلی میں موجود تمام سفارت خانوں کو بھی یہ بتانے سے انکار کر دیا گیا کہ کیا ہو رہا ہے دیگر اشتعال انگیزیوں میں زیادہ سے زیادہ فوجوں کو حالت جنگ کی صورت میں تیار فوجی دستوں کی ایسے انداز میں تعیناتی جیسے پاکستان کی طرف سے حملہ متوقع ہوا اور پھر آخر میں یقیناً جنوری کے شروع میں پریس کو یہ خبر دی کہ پاکستان کے ارادے خطرناک ہیں۔ مسئلہ یہ تھا کہ پاکستانی آسانی سے مشتعل نہ ہو رہے تھے وہ اپنی جنگی مشقوں میں مصروف اور متحرک تھے۔ جنرل سندرجی اور ارون سنگھ جنگی ہراس کا ماحول پیدا کرنے کی پہلی کوشش میں ناکام رہے۔ 18 دسمبر کو فوج کے آپریشن روم میں ایڈیٹروں اور اطلاعات عام کے دیگر ذرائع سے متعلق افراد کی ایک بڑی تعداد کو حالات سے آگاہی کیلئے جمع کیا گیا۔ اس آگاہی کا نچوڑ یہ تھا کہ گو کہ بھارت اپنی مشقیں ختم کر چکا ہے لیکن پاکستانی افواج پھر بھی متحرک ہیں اور وہ بھی ایسی صورت میں جبکہ بڑی حد تک پاکستان خود بھی مشقیں ختم کر چکا ہے۔ اس لئے پاکستان کے ارادے مشکوک ہیں اور ملک کو کسی بھی بدترین صورت حال کیلئے تیار رہنا چاہئے۔ اس آگاہی پر وزارت خارجہ اور دوسری دونوں سروسز (نیوی اور فضائیہ) نے زبردست احتجاج کیا کہ انہیں حالات سے کیوں باخبر نہیں رکھا گیا۔ وزارت خارجہ خاص طور پر بہت ناراض تھی کیونکہ سرکاری طور پر دونوں ملک پرامن حالت میں تھے اور دونوں ملک ایک دوسرے کے علم میں اور ایک دوسرے سے باخبر ہو کر قانون اور قاعدہ کے تحت اپنی مشقیں کر رہے تھے۔ وزارت خارجہ کے سامنے کشیدگی پیدا کرنے والے اس احمقانہ فعل کا کوئی جواز نہیں تھا ان کا یہ سوچنا درست تھا کیونکہ انہیں اصل صورت حال کا علم ہی نہیں تھا لیکن اس وزارت کو البتہ ایسی بات کا علم تھا جس پر دوسروں کو غور کرنے کا خیال نہیں آیا۔ دونوں بڑی طاقتیں بھارت کی طرف سے کسی بھی مہم جوئی کے سختی سے مخالف تھیں۔ امریکہ کی مخالفت زیادہ سنجیدہ اور سخت تھی۔ افغانستان کے مسئلہ کے پیش نظر گزشتہ جنگوں کی طرح اس مرتبہ امریکہ پاک بھارت جنگ میں لاتعلق نہیں رہ سکتا تھا لیکن زیادہ بدترین روسی مخالفت تھی۔ ماسکو افغانستان معاملہ حل کرنے کیلئے پاکستان کو شامل کرنے اور امریکہ چین سے اسے ہٹا کر اپنی طرف مائل کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ روسی کسی طرح بھی افغانستان میں حالات کے بہتر ہونے کے عمل اور پاکستان سے تعلقات خراب ہوتا نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ بھارت روس کیلئے اہمیت رکھتا ہے لیکن روس نے بھارت کو اس علاقہ میں اپنی خارجہ پالیسی ٹھونسنے کی کبھی اجازت نہیں دی۔

پاکستان نے اس دباؤ کے جواب میں اپنے جنوبی آرمرڈ ڈویژن نمبر 1 اور 37 ویں ڈویژن جو رحیم یار خان کے قریب مشقوں میں مصروف تھا کو پنجاب کے محاذ پر جمع کرنا شروع کر دیا۔ پاکستانی عزائم اس بارے میں صاف ہیں وہ سرے سے کسی جنگ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اگر جنگ ہو جائے تو اسے پتہ ہے کہ وہاں بھارتی حربی صلاحیت و حملہ سے سندھ

Marfat.com

میں اس کے پاؤں اکھڑ جائیں گے اور سندھ میں بھارت کے اندر آنے کی صورت کو مدنظر رکھ کر اسے تیار رہ کر پنجاب پر اپنی کارروائی کیلئے اپنی قوت بچا کر رکھنی ہے۔ پاکستان نے اپنی فوجوں کی دستہ بندی میں کسی جلد بازی سے کام نہیں لیا تقریباً بارہ دنوں میں 500 کلومیٹر کے فاصلہ پر ایک کور کے برابر فوج کو دوبارہ تعینات کیا گیا۔ اس کی جنوبی ریزرو فوج البتہ پہلے ہی محاذ جنگ کے قریب موجود تھی۔ جبکہ چھٹا آرمرڈ ڈویژن اور 17 واں ڈویژن کھاریاں میں ہے۔ یہ کہ جنرل سندر جی پہلے سے ہی اس صورت حال سے انٹیلی جنس جس میں RAW، BST اور فضائیہ کی خفیہ شامل ہے اور اپنے ذرائع سے باخبر تھا۔ جنرل سندر جی یہ شیخی بگھارنے میں کافی حد تک حق بجانب تھا کہ اسے پاکستانی فوج کی ایک ایک یونٹ کی نقل و حرکت اور ہر ٹرین میں فوجوں کی تعداد کے بارے میں علم ہے لیکن وہ پاکستانی فوجوں کی نقل و حرکت کے بارے میں 17 دن تک خاموش رہا۔ 22 جنوری کو اس نے حکومت کو اس بارے میں آگاہ کیا اور 23 جنوری کو کابینہ کا اجلاس RAW جس میں ہیبت وخوف کے بٹن پر انگلی رکھ کر اگلے روز سے فوجوں کی حرکت اور جنگ کی تیاری کا حکم دے دیا گیا۔

ہم ایک ایسے معمہ میں الجھے ہیں جس کی وضاحت ہم نہیں کر سکتے ہیں۔ یہ کہ ارون سنگھ اور جنرل سندر جی ایسی معلومات واطلاعات کی فراہمی روک دیں گے جس سے ہمارے نقطہ نظر و نظریہ کی تائید ہوتی ہو لیکن RAW پاکستان کے بارے میں کثیر تعداد میں خفیہ معلومات فراہم کرتی ہے اور وہ یہ رپورٹیں وزیر اعظم کو دیتی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ RAW کے علم میں 50000 سے زائد فوج کی شمال طرف پیش قدمی نہ آئی ہو یا یہ کہ اس بارے میں اس نے وزیر اعظم کو اطلاع نہ دی ہو لہٰذا پھر اہل اقتدار میں ہراس کیوں پھیلا جیسا کہ ایک اچھی حکمت عملی کا قوی امکان تھا۔ اس سوال کے جواب کو ایسے وقت تک کیلئے ملتوی کر دیں جبکہ ہمیں مزید معلومات حاصل ہو جائیں۔

فوجوں کی نقل و حرکت کے بارے میں گفتگو میں کچھ امور کو خفیہ رکھا گیا جنرل سندر جی Brass Tacks کے بہانے پہلے ہی ہندوستانی فوج کا تقریباً سب مال اسباب جنگی علاقہ میں بھیج چکا تھا۔ نقل و حرکت میں ہیڈ کوارٹر تین کور اور 57 ڈویژن کو شمال مشرق سے پنجاب اور 24 ڈویژن کو بیکانیر سے فیروز پور کے علاقہ میں اور 54 ڈویژن کے اجزا کو سکندر آباد و حیدر آباد سے صحرا میں لگ بھگ 9 ڈویژن فوج پہلے ہی پنجاب کیلئے مختص ہے اور 23 اور 57 ڈویژن کو اندرونی حفظ عامہ کی ضروریات کے پیش نظر لایا جب کہ حقیقی فوج بندی کے مخصوص مقاصد کیلئے صرف 26 ڈویژن ہی متحرک ہوا اور اس میں بھی صرف سات فیصد کے قریب فوج سرحدی علاقہ کے قریب متعین ہوئی۔

اس طرح نقل و حرکت محض نام ہی کی تھی۔ اب کیونکہ حکومت و فوج میں دہشت وخوف پھیل گیا تھا اس لئے فضائیہ اور بحریہ نے پوری طرح جنگ کی تیاری شروع کر دی جو کسی بھی وقت متوقع تھی خاص طور پر کہ پاکستان ممکنہ طور پر پہلے حملہ کر دینے کو ترجیح دیدے اب حکمت عملی کے ذریعہ اشتعال دلانا بہت آسان تھا۔ آخر پاکستان اب فاضلکہ ابوہر اور گورداسپور پٹھانکوٹ کے محاذ پر بالمقابل محاذ آرا تھا۔ اب وہ عملی طور پر پہلے حملہ کر کے پٹھانکوٹ کی پٹی کو کاٹ کر جموں و کشمیر کو باقی ہندوستان سے الگ کر دینے اور ساتھ ہی سنسنی خیز حرکت کرتے ہوئے پنجاب اپنے قبضہ میں لے لینے کی پوزیشن میں تھا۔ ایسی سنگین صورت حال میں کسی سیانے کی موجودگی کے بغیر ہی ہم آسانی سے پہلے حملہ کر سکتے تھے لیکن قطعی

Marfat.com

طور پر کچھ نہ ہوا۔ بجائے جنگ کے فوجوں کے ہٹانے کی باتیں شروع ہو گئیں اور پھر سیکٹر وار فوجیں ہٹالی گئیں۔

جنگ کیوں نہ ہوئی اس سوال کے تین وجوہ ہیں۔ اول چونکہ (Brass Tacks) دراصل جزوی طور پر جنگ کی بجائے جنگ کا دھوکہ دینے کی حکمت عملی تھی اس لئے (Trident) یعنی شمال میں حملہ فوری طور پر متحرک نہ کیا جاسکا۔ دوم بھارتی حالات میں شکستگی و کمزوری۔ سوم جواب میں پاکستان کی پنجاب کے محاذ پر صف بندی اور نقل و حرکت۔ ہم یقیناً یہ خیال کر رہے کہ (Trident) شروع ہی سے اس پورے ڈرامہ کا ایک باب تھا اور یہ نہیں کہ (Brass Tacks) بنیادی منصوبہ تھا اور اس کے ناکام ہو جانے پر (Trident) کو متحرک کیا گیا بہر حال دونوں صورتوں میں ہمارے ان دلائل پر اثر نہیں پڑتا کہ ہندوستان کے پاس گو سب کچھ تھا لیکن پھر بھی وہ پاکستان کو ختم کرنے کیلئے جنگ کا آغاز نہ کر سکا۔ (Trident) کا بنیادی مقصد کشمیر اور شمالی علاقوں پر دوبارہ قبضہ کرنا تھا۔ ان علاقوں میں اگر پہلے سے حملے کی اطلاع مل جائے تو پھر طاقت میں برتری حاصل کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ یہ خطہ ایسا ہے جہاں دونوں ملکوں کیلئے زیادہ تعداد میں فوجی دستہ تعینات کرنا دشوار ہے اس لئے اگر پاکستان کو حملہ کی اطلاع تھی تو انہوں نے ہمارے حملہ کو روکنے اور ناکام بنانے کے انتظامات کر لئے ہوں گے۔ اگر Trident کو کامیاب بنانا تھا تو پہلے ہمیں بالکل آخری لمحے میں اپنی فوجیں شمالی کشمیر کی کنٹرول لائن پر لانی چاہئیں تھیں۔ یہ فوجیں نقل و حرکت کا بحران پیدا ہونے کے وقت اپنی جگہ پر نہ تھیں اس لئے Trident کی مہم جوئی نہیں کی جاسکتی تھی۔ لیکن یہ ایک سوال ہے کہ پاکستان کو موقعہ دیتے ہوئے بھارت جنگ کیوں نہ کر سکا؟ شمالی کنٹرول لائن پر فوری کمک کو لا کر پاکستان کو تمام محاذوں پر ایک مضبوط جنگ میں الجھانا زیادہ آسان تھا اور اس طرح اس کے پاس سوچنے کی راہیں بہت ہی محدود ہو جاتیں کیونکہ اس کے محفوظ ذرائع پھر ان علاقوں کیلئے پابند ہو جاتے۔ بعد میں ہم یہ بتائیں گے کہ دراصل Trident کے کامیابی کے امکانات زیادہ تھے۔ بہر حال پھر بھی نکتہ یہ ہے کہ بھارت کی حکمت عملی کے معاملہ میں اور بھی مسائل تھے۔

راجیو حکومت کو عوام کا قطعی طور پر کوئی اعتماد حاصل نہیں تھا۔ 1971ء میں جس طرح اندرا گاندھی کو مشرقی پاکستان میں داخل ہونے سے قبل اپنی پبلک کا اعتماد تھا جنوری 1987ء میں اس کے بالکل برعکس صورت حال تھی۔ عوام کے ساتھ جنگ کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا' نہ ہی انہیں پاکستان کی طرف سے کوئی خطرہ نظر آ رہا تھا۔ جنگ کی صورت میں عوامی ردعمل کو کسی طرح الگ نہیں کیا جاسکتا اور ایسی صورت میں محض چند لوگ ہی بھارت کو معصوم سمجھتے۔ عام حالات میں ایک مضبوط حکمران کے ہاں یہ امور کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ وہ جو بھی درست سمجھتا ہے کر گزرتا ہے لیکن بھارت میں ہمارے پاس ایسے حکمران نہیں ہیں۔ صورت حال اس لئے پیدا ہوئی کہ بنیادی طور جنگ کرنے پر اتفاق رائے ہی نہیں تھا جب کہ جنگ سامنے نظر آ رہی تھی اور جنرل سندر جی اور ارون سنگھ اپنی جگہ مگن تھے تو دوسری طرف وزیراعظم اور دیگر حکمران طبقہ نہایت ہی پریشان و ہراس میں مبتلا ہو کر جنگ کے امڈتے ہوئے الاؤ کو سرد کرنے کی کوشش میں تھے۔

پریس کے سامنے راجیو کی کمزور ساکھ کو مزید دھچکا لگا کیونکہ وزارت دفاع بحران کے بارے میں اپنی پہلی آگاہی کانفرنس میں کوئی واضح جواز بتانے میں ناکام رہی تھی۔ اس وقت تک پریس کو M.E.A اور دوسری ایجنسیوں کے

Marfat.com

احتجاجات وشکایت کا علم ہو چکا تھا۔ ونکٹ سوارن کے معاملہ نے راجیو کی ساکھ کو مزید نقصان پہنچایا اور غالباً فوجی نقل و حرکت کے اعلان کے سلسلہ میں وی۔ پی سنگھ کو دفاع سے ہٹا کر خزانے کا چارج دینا تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا۔ گو کہ بعد میں لوگوں نے کہا تھا کہ راجیو نقل وحرکت کے بہانے وی پی سنگھ کو ہٹانے کا منصوبہ بناتے لیکن اس وقت بہر حال اس اعلان نے ایسی افواہوں کا طوفان کھڑا کر دیا۔ ساتھ ہی اب پریس کو بیوقوف بنانا اتنا آسان نہیں تھا جتنا کہ پندرہ سال پہلے ممکن تھا۔

پاکستان کے معاملہ میں جنرل سندرجی کا اپنے انٹیلی جنس اور فوجی ساتھیوں کو اعتماد حاصل کرنے میں ناکام رہنا تباہ کن ثابت ہوا۔ ایک اعتبار سے ایک طرف فوج کے اندر اور دوسری طرف بحریہ اور فضائیہ کے درمیان اعتماد اور بھروسہ کی کمی امکانی جنگ کے اہتمام کیلئے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی کیونکہ فضائیہ کو خصوصیت سے ایسی کوئی اطلاع دینے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ مشقوں کی وجہ سے پہلے ہی پوری طرح تیار تھی۔ اسے محض اپنے اگلے امدادی یونٹوں کو متحرک کرنا تھا جس کیلئے ایک گھنٹہ بھی کافی تھا۔ اس طرح بحریہ بھی تقریباً مکمل تیاری میں تھی کیونکہ وہ بڑی بحری مشقوں میں مصروف تھی۔ البتہ بھارتی فضائیہ سے خوشی خوشی اس منصوبہ کے عمل میں شریک ہو جانے کی توقع رکھنا درست نہیں اس صورت میں جبکہ اسے معاملہ سے لاعلم رکھا گیا ہو۔ جہاں تک نیوی کا سوال ہے جنرل سندرجی نے اسے اپنے منصوبہ میں کسی برابر سلوک کیلئے ضروری ہی نہیں سمجھا۔

جب ایک طرف فوج میں باہمی ہم آہنگی کا وجود ہی نہیں تھا اور دوسری طرف وزیر اعظم پہلے ہی اپنے مقاصد حاصل کر چکا تھا ایسی صورت میں جنگ کرنا ناممکن ہو گیا۔ جہاں تک وزیر اعظم کا تعلق ہے ملک کی توجہ ہٹادی گئی تھی۔ اب بغیر کسی ہلکے سے اعتراض کے دفاعی بجٹ میں زبردست اضافہ کیا جا سکتا تھا اور مکروہ خونخوار شکاری وی پی سنگھ بھی وزارت خزانہ کی بجائے وزارت دفاع میں تھا جہاں سے وہ وزیر اعظم کیلئے کسی طرح کا خطرہ بن سکتا۔

روسیوں نے تعاون سے انکار کر دیا۔ جب انہیں سیارے کے ذریعہ پاکستان کی تنصیبات کے فوٹو مہیا کرنے کیلئے کہا گیا تو انہوں نے ایسا کر دیا کیونکہ وہ معاہدہ کے تحت پابند تھے لیکن ساتھ انہوں نے یہ بھی واضح کر دیا کہ وہ کسی بھی مہم جوئی میں دلچسپی نہیں رکھتے۔ ایسی حکومت جو اپنے بڑے بھائی کی شفقت ومضبوط تعاون کے بغیر کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتی تھی کیلئے روس کا یہ انداز فکر تباہ کن ثابت ہو سکتا تھا چاہے وزیر اعظم ایسی مہم جوئی کے قابل بھی ہوتا۔

اگر بالفرض بھارت روس کا پیغام نہ سمجھتا تو روس کیلئے جواز تھا کہ وہ مگ 25 طیاروں اور نگرانی کرنے والے طیاروں کے سکواڈرن 105 کیلئے استعمال ہونے والا پٹرول بند کر دیتا۔ یہ ایندھن کلی طور پر درآمد کیا جاتا ہے اور اس ایندھن کی سپلائی رک جانے پر مگ 25 اور نگرانی کرنے والے یونٹ کو استعمال میں نہیں لایا جا سکتا تھا۔ حواس باختہ بھارتی فضائیہ ایسے میں پرانے کینبرا طیارے کام میں لاتی لیکن وہ بہر حال فاکس بیٹ (مگ 25) جو کہ پاکستان اور تبت کے کسی بھی کونے تک رسائی رکھتے ہیں کا نعم البدل نہیں ہیں فاکس بیٹ طیاروں کے بارے میں یہ پتہ نہیں چلا سکتے تھے کہ پاکستان اور تبت کے اندرون کیا ہو رہا ہے جو جنگ کی پیشرفت وتنظیم کو مشکل بنا سکتا تھا۔ کسی کے پاس ایسی جنگ کر کے کچھ حاصل کرنے کا کوئی ٹھوس استدلال نہیں تھا۔

Marfat.com

ہم پر ایک ایسا وزیر اعظم حکومت کر رہا ہے جو ہندوستان کی سرزمین کو اپنے نظریات وفرمودات کے پرچار کیلئے بہت محدود خیال کرتا ہے اس کے برعکس اس نے عالمی سطح پر اپنا کردار ادا کرنے کو مناسب سمجھا ہے۔ وہ اپنے آپ کو حقیقی معنوں میں ایک عالمی لیڈر خیال کرتا ہے جو بین الاقوامی معاملات پر اثر انداز ہو کر دنیا کو آنے والے شاندار کل کی طرف لے جانا چاہتا ہے اس مرحلہ پر جنگ شروع کر دینا یا جنگ کا اشتعال دلا دینا اس کے پراپیگنڈہ کردہ نظریات وخیالات کو عالمی سطح پر سخت دھچکا لگاتا۔ ایک افسوسناک بین الاقوامی اصول یہ ہے کہ جنگ جو آپ شروع کرتے ہیں وہ ہمیشہ انصاف کے مطابق اور صحیح ہوتی ہے جبکہ وہ جنگ جو دوسروں کی طرف سے شروع ہو ہمیشہ غیر ضروری اور ناانصافی پر مبنی ایک ناجائز حرکت ہوتی ہے۔

[redacted] 309 ناکارہ ترجمہ ردی ریکھی

اگر اب بھی حکومت کو جنگ کی خواہش تھی تو بھی پاکستان کی پنجاب کے محاذ پر صف آرائی نے دہلی کو ہراساں کر کے پاکستان کو یقین دلانے پر مجبور کر دیا کہ بھارت کا جنگ کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اس کو سمجھنے کیلئے ہمیں RAW را کی یہ سوچ اور پیشگوئی سامنے رکھنی ہے کہ RAW کے مطابق 26 جنوری 1987ء کو گولڈن ٹیمپل سے خالصتان کے قیام کا اعلان ہونا ہے اور ایسے حالات میں پاکستان کا پنجاب پر کتنے بھی محدود پیمانے پر حملہ خالصان کے حقیقی طور پر وجود میں آ جانے کا سبب بن سکتا تھا۔

ہمارے لئے یہ تصور یا وہم باعث تردد نہیں ہے یہ کہنا ہی کافی ہے کہ حکومت اس خیال کو قبول کرتی ہے اور اس کے مطابق ردعمل کا اظہار کرتی ہے۔ اس لئے ہی پاکستان سے لڑنے کی بجائے 23 واں ڈویژن امرتسر اور 57 واں ڈویژن پنجاب کے کسی اور علاقے میں چلا گیا۔ دہلی میں یہ حقیقی خطرہ موجود تھا کہ پنجاب پر پاکستان کے حملہ اور ساتھ ہی سکھوں کے بغاوت کر دینے اور اصل فوج کے دور صحرا میں ہونے کی صورت میں پاکستانیوں کا دارالخلافہ تک پہنچنا ایک ممکن امر تھا۔ اگر پاکستان بہت زیادہ خطرہ محسوس کر کے پہلے بھارت پر حملہ کر دیتا تو جنرل سندر جی کا مقصد پورا ہو جاتا لیکن پاکستان نے اپنے محدود وسائل کے ساتھ تحفظ ودفاع کے تمام اقدامات کرنے کے ساتھ ساتھ یہ انتظار کرنا مناسب خیال کیا کہ بھارت کیا کرتا ہے۔

ان کی بھارت کے بارے میں خفیہ اطلاعات ہمیشہ بہترین رہی ہیں اس لئے یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ جہاں وہ فوجوں کی نقل وحرکت سے پریشان تھے وہاں انہیں جنگ کے بارے میں دوسری برسراقتدار وصاحب اقتدار شعبہ نقل وحرکت کا بحران بھارت کیلئے بے انتہا تباہ کن ثابت ہوا کیونکہ اس انتہائی خطرناک پس پردہ مکہ بازی میں پاکستان جیت گیا۔ یہ جو کہ 1987ء کی جنگ ہوئی اور اپنی شرائط پر ہوئی بغیر ایک گولی چلائے ہار دی گئی۔ البتہ ارون سنگھ اور جنرل سندر جی کے سر پر یہ سہرا ہے کہ اس بحران ودہشت کے بعد بھی وہ حکومت کے معاملات سے متاثر ہوئے بغیر اپنے مشن پر ڈٹے رہے اور Trident منصوبہ کو حرکت میں لے آئے لیکن آخری لحہ مختلف وجوہات جن کا ہم ذکر کریں گے وہ شکست کھا گئے۔

کسی بھی طرح اب پاکستانیوں نے اپنی عزت اور مدبر حیثیت کا تصور پیدا کر لیا۔ انہوں نے یہ کہا (اور درست کہا) کہ گو کہ یہ بحران انہوں نے پیدا نہیں کیا پھر بھی وہ اس بحران کو ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنے پر تیار ہیں یہاں تک

Marfat.com

کہ وہ اسے بھی اپنی انا کا مسئلہ نہیں بناتے چونکہ بحران بھارت نے شروع کیا ہے لہٰذا وہ ہی اسے ختم کرے اور پاکستان کچھ نہ کرے۔ بات چیت کا پہلا دور فروری 1987ء کے پہلے ہفتہ میں مکمل طور پر خفیہ طریقے سے ہوا۔ رازداری بھارت کی منشا پر رکھی گئی پاکستان کیلئے اس کی اہمیت ہی نہیں۔ یہ بذات خود ایک ثبوت ہے کہ بھارت حقائق کو اپنے عوام سے چھپانا چاہتا ہے۔ اگر بات چیت میں ہمیں کوئی سفارتی فتح ہونے کی امید ہوتی تو بھارت یقیناً اس کی بڑے پیمانے پر تشہیر چاہتا۔ خاموشی کا مطلب یہی ہے کہ بھارت کو اہم معاملات پر اپنی کوتاہی اور ذمہ داری کا اعتراف کرنا ہے اس طرح وہ بات چیت کو خفیہ رکھ کر شرمندگی سے بچنا چاہتا تھا۔

وہ اہم ترین معاملہ جس پر بھارت کو سمجھوتہ کرنا پڑا براس ٹریک نمبر 4 تھا جس کے مطابق فوجی کمی (جو تھوڑی بہت ظاہر کی گئی) کی جانی تھی۔ یہ بظاہر اہم نہ سہی لیکن بکتر بند ڈویژن 1 اور 24واں ڈویژن کو ایک انفنٹری ڈویژن کے ساتھ شمال کی طرف روانگی نے مشقوں کی اہمیت وافادیت کو بہت متاثر کیا۔ چونکہ بھارت پورے پیمانے پر مشقیں کر رہا تھا اس لئے وہ عالمی رائے عامہ کو اس انداز میں مشقیں جاری رکھ کر باور کرا سکتا تھا کہ اس کا منصوبہ محض مشقیں ہی تھیں۔ لیکن پھر حقیقت میں اصل منصوبہ سے 30 فیصد کم فوج کو بجائے مشرق مغرب سمت کے شمال جنوب سمت میں لایا گیا اور نہ کوئی زمینی دستے اتارے گئے۔ پھر دنیا میں اپنی ساکھ بڑھانے کیلئے پاکستان سمیت دنیا کے دیگر ممالک کو مشقوں میں شرکت کی دعوت دی گئی اس سے اسلام آباد کو مزید یقین دہانی ہوگئی کہ بھارت کی نیت بری نہیں ہے۔ پاکستان کلی طور پر مشقوں میں ابتری پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہوتا لیکن انہوں نے اپنے لئے یہ یقین دہانی حاصل کر لی ہے کہ ان کے خلاف کوئی جارحیت نہ ہوگی جس کیلئے بھارت کو ہر طرح کی یقین دہانیاں کرانی پڑیں۔ بین الاقوامی برادری کو شامل کر لیا گیا۔ اب بھارتی وزیراعظم و بھارتی عوام کو اپنے وعدے کا پاس رکھنا ہے۔ اب حکومت مشکل سے ہی دوغلی پالیسی اختیار کر کے پاکستان پر حملہ کر سکتی ہے۔

بدترین یہ ہوا کہ حقیقی طور پر فوجیں بھارتی طرف اکھنور اور پٹھان کوٹ اور پاکستانی جانب سے مرالہ اور نارووال سے ہٹائی گئیں حسب معمول پاکستان سے معاملہ میں ہم بدترین سے ہی دوچار ہوتے ہیں۔ اس صورت حال میں بھارت نے چھٹا پہاڑی ڈویژن واپس بریلی سے باہر بھیجا جو بہت فاصلہ تھا جب کہ پاکستان کی عام حالات میں افواج کی تعیناتی ان علاقوں میں ہی رہتی ہے اور اس نے اپنے چھٹا بکتر ڈویژن اور 17 واں پیدل ڈویژن کھاریاں' گوجرانوالہ چھاؤنیوں میں بھیجا جو محاذ سے چند گھنٹوں کا خوشگوار سفر ہے۔

پاکستان میں بات چیت کے بعد مارچ 1987ء میں صحرائی سیکٹر اور Brass Tacks سے متعلق فوجیں آہستہ آہستہ اپنی چھاؤنیوں میں پہنچنی شروع ہوگئی ہیں۔ لیکن فوجیں ہٹائے جانے کا عمل مکمل نہیں ہوا ہے اور ایک دوسرے پر کڑی نظر رکھی جا رہی ہے۔ آخر میں پنجاب سیکٹر کا نمبر تھا۔ مارچ کے آخری ہفتہ تک پنجاب کے محاذ پر بھارتی فوجیں پوری طرح چوکس تھیں لیکن پھر شمال میں چین کے۔ ساتھ بحران کی وجہ سے نقل و حرکت کی ضرورت کی بنا پر پنجاب کیلئے سوچنے کا کسی کے پاس وقت ہی نہ رہا۔

فوجوں کی علیحدگی کا کام مکمل ہونے پر ہر کوئی اپنے اپنے گھر چلا گیا اور پاکستان نے اطمینان کا سانس لیا اور اب ہر

Marfat.com

چیز معمول کے مطابق ہے۔ عوام کو اس معاملہ سے اب دلچسپی نہیں رہی ہے کیونکہ کئی دوسرے اہم معاملات جیسے بوفرز سکینڈل اور چین کا خطرہ وغیرہ سامنے آئے ہیں۔ یہاں تک کہ پریس اور شعبہ اطلاعات عام میں بھی اس معاملے سے متعلق سوالات شکوک اور متبادل مفروضات کے بارے میں دلچسپی چھوڑ دی ہے کہ یہ ان کے سامنے اس سے زیادہ دلچسپ موضوعات آ گئے ہیں۔ صرف کوئی ایک آدھ فرد ہی اس معاملہ کے بارے میں متفکر ہو کر گہرائی میں جانے کی کوشش میں مصروف رہے گا لیکن آخر کار وہ بھی اس کو چھوڑ کر دوسرے معاملات کی طرف توجہ پلٹ لے گا۔ بعد میں اگر پوری سچائی سامنے آ بھی جائے تو بھی کوئی خصوصیت سے اس بارے میں متفکر نہیں ہوگا کیونکہ یہ واقعہ ماضی بعید کا حصہ ہوگا جیسا کہ کسی کو پرواہ نہیں کہ بھارت 1947,1949,1962,1965ء اور 1971ء کی جنگیں ہار گیا اس طرح کس کو یہ پرواہ بھی نہیں ہوگی کہ بھارت 1987ء کی وہ جنگ میں ہار گیا جو ہوئی ہی نہیں تھی۔ پچھلی جنگوں میں کم از کم حکومت نے جیتنے کی کوشش کی لیکن اس آخری جنگ میں سوائے اعلیٰ ترین حکمرانوں کے کسی کو آزمایا ہی نہیں گیا اور یہ اعلیٰ حکمران البتہ بری طرح ناکام ہوئے۔

قاری کیلئے Brass Tacks پر نظر ڈالنا دلچسپی کا باعث ہوگا۔ دراصل Brass Tacks چھ ڈویژن فوج اور دو کوروں کی مشقوں کا نام تھا۔ اس طرح یہ ایک بہت بڑی مشق تھی جس کا تقابل مرکزی یورپ کی عظیم حربی مشنری سے کیا جا سکتا ہے۔ سنٹرل یورپ میں بعض اوقات چھ ڈویژن اور دو کوروں میں سے کچھ یونٹ مشقوں میں حصہ لیتے ہیں لیکن یہاں یونٹوں کی بجائے خود پورے چھ ڈویژن اور دو کوریں حصہ لے رہی تھیں (گو) اس پیمانے پر فوجی مشقوں کی ضرورت غیر معمولی جواز تھا۔

آزاد بھارت میں کسی بھی کمانڈر نے دو یا اس سے زائد کور کی اکٹھے ایک ہی کمانڈ میں مشق نہ کی تھی۔ 1965ء کی جنگ میں لیفٹیننٹ جنرل ہربخش نے تین کوروں (1,15 اور 11) کی کمانڈ کی۔ 1971ء میں لیفٹیننٹ جنرل نے پی کنیڈتھ کے زیر کمان کوریں تھیں البتہ دونوں موقعوں پر تمام کوروں نے ایک درے سے علیحدہ الگ الگ اپنے اپنے فرائض انجام دیئے تھے۔ تین مختلف کوریں تین مختلف مقاصد کیلئے مختلف جگہوں پر لڑی تھیں۔ لیفٹیننٹ جنرل جے ایس اروڑہ نے کور 2,33 اور 4 کی کمان کی جن کا ایک ہی مقصد تھا یعنی ڈھاکہ کا حصول گو کہ یہ تینوں بھی الگ الگ اپنی اپنی جنگ لڑ رہی تھیں۔ Brass Tacks قسم کی مشقیں دو یا زائد کور ہائے کو اکٹھے استعمال کرنے کا تصور نیا ہے اور جس کا ابھی تجربہ نہیں کیا گیا ہے۔ جیسے اس لئے بھی کہ نقل و حرکت کے انتظامات اتنے دشوار ہیں کہ صرف بڑے پیمانے پر تجربات ہی مطلوبہ مہارت مہیا کر سکتے ہیں۔ لہٰذا مشق کا ٹھوس جواز موجود تھا اور پاکستان کو کسی بھی طرح کی تنبیہ دینے کیلئے یہ کافی تھا۔ چھ ڈویژن فوج جن میں تین بکتر بند ڈویژن شامل ہو کر ایک جگہ لا کر کھڑا کرنا ایسا تھا جس کا پاکستان کے پاس کوئی جواب نہ تھا یہ ایک خوفناک اجتماع ہے اور اس کا سندھ کے مقابل کھڑا کرنا سخت سے سخت پاکستانی کا پتہ پانی کرنے کیلئے کافی ہے۔

مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ چین کی سرحد پر موجود فوج اور 9 ویں 23 ویں اور 54 ویں ڈویژن کو چھوڑ کر باقی ساری فوج کو بارڈر پر منتقل کر دیا گیا۔ ڈویژن وار تعیناتی کا دیگر مناسب باب میں مفصل ذکر کیا جائے گا۔ یہاں یہ جاننا کافی ہے کہ فوج کے کل 35 ڈویژن اور ایک عارضی بکتر بند ڈویژن ہیں اس طرح کل 36 ڈویژن فوج ہے۔ ان میں سے نو ڈویژن (جن میں 23 واں ڈویژن شامل ہے) عام طور پر مشرق میں رہتے ہیں۔ باقی میں سے دو کو چھوڑ کر باقی سب کو جنوری

Marfat.com

1987ء تک مغرب میں لا کر ڈال دیا گیا تھا اور باقی دو میں سے کچھ حصہ مشقوں میں شامل کئے گئے تھے۔ آخری ڈویژن نمبر 9 میسور میں ہے۔ جہاں سے اسے تیزی سے محاذ جنگ پر لایا جا سکتا ہے۔

اب آپ اندازہ کریں کہ جب آپ اپنے پاس تقریباً سب کچھ تین چار کی سخت محنت سے لا کر بارڈر پر کھڑا کر دیں تو ظاہر ہے کہ محض مشق نہیں تھی خاص طور پر جب کہ اصل گولہ بارود اور تمام گاڑیاں اور ٹینک بھی لا کر محاذ پر جھونک دیا گیا تو پھر مقاصد محض مشقوں سے یقیناً زیادہ ہی تھا۔

جب آپ کی اس بڑے پیمانے پر نقل و حرکت کے جواب میں مخاطب متحرک ہوتا ہے اور آپ اس صورت میں اپنی فضائیہ اور بحریہ وغیرہ کو شامل کئے بغیر بحران کی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور بجائے عوام کو بتانے کے اپنے مخالف کے اعداد و شمار پر توجہ دلانے کی کوشش کرتے ہیں تو اس سے آپ مشقوں کے بارے میں عزائم چھپے نہیں رہتے۔

اتفاق سے جوائنٹ چیف آف سٹاف ان دنوں ایڈمرل رام تلہسانی تھا جسے وزیر دفاع اور چیف آف آرمی سٹاف نے نظر انداز کیا۔ کیوں؟ کیا انہیں دونوں سروسز اور وزارت داخلہ کے بارے میں شبہات تھے کہ وہ اس اشتعال انگیزی کے ذریعہ پیدا کئے جانیوالے بحران میں ساتھ نہ دیں گے کیونکہ حکومت نے وزارت امور داخلہ کے بارے میں سچ سے آگاہ نہ کیا سچ کا کچھ حصہ بتانا درحقیقت گمراہ کرنے کے مترادف ہوتا ہے اور عام طور پر یہ بدنیتی پر مبنی ہوتا ہے۔

Brass Tacks اور اس سے مربوط دوسری مشقوں میں بارہ ڈویژن اور اس کے علاوہ فضائی حملہ آور ڈویژن نے حصہ لینا تھا۔ اس طرح مناسب وقت پر کل تیرہ ڈویژن ہونے تھے جیسا کہ ہم یقین کر سکتے ہیں تقریباً دو کو جن کے بارے میں فوج کہتی ہے کہ (اور جن میں کم از کم آٹھ ڈویژن فوج تھی) نے حملہ کرنے والے فوج تھی۔ کے شمال کی طرف بٹھنڈہ سے 10 ویں کور شامل ہوئی تھی اور بھوج کی طرف سے نئی جنوبی کور کمانڈ (جسے پانچویں کور ہم کہتے ہیں) نے متحرک ہونا تھا۔ اندازہ ہے کہ غالباً یہ دونوں کوریں Brass Tacks میں پوری طرح شامل نہ تھیں اور غالباً انہیں کوئی دوسرا کوڈ نام دیا گیا تھا اور غالباً انہیں محض چوکس رہنے کو کہا گیا تھا۔ لیکن اگر آپ کی 13 ڈویژن فوج فاضل کا محاذ کے ارد گرد منڈلا رہی ہو اور آپ ذکر یہ کر رہے ہوں کہ محض 2 کور اور چھ ڈویژن فوج مشقیں کر رہی ہو جبکہ آپ سارا ذخیرہ بارود اور سامان حرب محاذ پر لے آئے ہوں تو ایسے میں اور سب کو تو بے وقوف بنایا جا سکتا ہے لیکن اسے نہیں جسے آپ بے وقوف بنانا چاہتے ہیں یعنی پاکستان کو......!

ذرا ایک لمحہ کیلئے NATO کی سالانہ مشقوں کے بارے میں سوچیں۔ یہ درحقیقت چھ سات مشقوں کا ایک سلسلہ ہوتا ہے جو ہفتوں ناروے سے ترکی تک پھیلا ہوتا ہے اور اس میں تقریباً ایک لاکھ بیس ہزار سے زائد فوجی حصہ لیتے ہیں۔ اب اگر ہم Brass Tacks پر نظر ڈالیں جس پر تقریباً تین لاکھ فوجیوں کو شامل کیا گیا تو یہ پورے NATO کی مشقوں سے بہت بڑی مشق نظر آتی ہے۔ اس کے ساتھ تمام حالات کی پنجاب اور جموں کشمیر کی مشقوں جن میں تقریباً پانچ لاکھ فوجی شامل ہوں گے تو واضح ہوگا کہ مشقیں 1939ء کے بعد دنیا میں یہ سب سے بڑا فوجی اجتماع تھا۔

یہ قابل غور ہے کہ بھارتی فوجی تقریباً 75 فیصد ڈویژن اس میں شامل تھے NATO کے پاس کل 25 لاکھ فوجی نقل و حرکت سے پہلے ہیں اور نقل و حرکت کے بعد اس سے دوگنا۔ اگر ہم اسے کل سمجھ لیں تو بھی اگر NATO جنرل سندر

Marfat.com

کی طرز پر مشق کرنا چاہئے تو اسے چودہ ملکوں کی تیرہ چودہ لاکھ فوج کے ذریعہ مشق کرنی ہوگی' اس طرح وارسیا...... پیکٹ کو بھی اتنی ہی تعداد استعمال کرنی ہوگی۔ کہیں بھی کوئی اس طرح کی ظاہری مشقوں کو محض معمول کی کارروائی تسلیم کریگا جیسا کہ بھارتی حکومت نے ظاہر کرنے کی کوشش کی اوران مشقوں کو محض معمول کی کارروائی کہنا نہ صرف عالمی بلکہ بھارتی عوام کی ذہانت کی تذلیل ہے۔

یہ دعویٰ کہ ہم سب جنگیں ہار گئے ناقابل یقین محسوس ہوگا۔ ہرکوئی جانتا ہے کہ 48-1947ء کی جنگ ایک فائدہ مند معاملہ تھا1962ء میں نقصان ہوا1965ء میں بھی مفید نتائج نکلے جبکہ 1971ء ایک مکمل فتح تھی۔

مسئلہ یہ ہے کہ ہم جیت یا فتح کی کیا تعریف کرتے ہیں۔ کیا یہ دشمن کے زیادہ ہلاک شدہ سپاہیوں کی تعداد ہوتی ہے۔ اگر یوں ہے تو پھر امریکہ ویتنام میں جیت گیا کیونکہ انہوں نے اپنے ہلاک ہونے والوں سے دس گنا زیادہ ویتناموں کو ہلاک کیا۔ پھر کیا جیت دشمن کے زیادہ ساز وسامان کو تباہ کرنے کا نام ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر جرمن کو دوسری جنگ عظیم کا فاتح ہونا چاہئے تھا کیونکہ انہوں نے اپنے سے زیادہ اتحادیوں کے ٹینک جہاز اور دوسرا اسلحہ تباہ کیا۔

پھر کیا جیت یا فتح زیادہ علاقہ فتح کرلینے کو کہتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو پھر عرب 1973ء کی جنگ ہار گئے تھے کیونکہ اسرائیل نے مصر کے ہاتھوں کھوئے جانے والے علاقہ سے زیادہ علاقہ شام اور نہر کے پار حاصل کرلیا تھا۔

ظاہر ہے کہ یہ تینوں صورتیں صحیح نہیں ہیں کیونکہ امریکہ ویتنام میں' جرمن جنگ عظیم میں اور اسرائیل عرب جنگ 1973ء میں شکست کھا گئے تھے۔ لہٰذا فتح کی زیادہ علاقہ ہتھیانے یا دشمن کے زیادہ سپاہی ہلاک کرنے کے نظریہ سے تعریف نہیں کی جاسکتی بلکہ اس کے مفید حکمت عملی کے ساتھ اچھے نتائج حاصل ہونے کو فتح کہا جاسکتا ہے۔ جہاں ایسا نتیجہ برآمد نہ ہو وہاں بظاہر فتح بھی دراصل شکست ہے۔

48-1947ء کی جنگ کو پہلے دیکھیں۔ بھارت کا کیا مقصد و مصلحت جنگ تھا؟ بظاہر کوئی مقصد نہ تھا۔ لیکن ایک مصلحت و حکمت آمیز مقصد یقیناً جموں وکشمیر کا کھویا ہوا علاقہ واپس لینا اور پاکستان کے خطرہ کو ختم کرنا ہوگا۔ جنگ شروع ہونے سے قبل ہمارے پاس سارا جموں کشمیر تھا ہمیں بتایا گیا ہے کہ جموں کشمیر کے قانونی حکمران مہاراجہ ہری سنگھ نے ایک معاہدہ کے تحت بھارت سے الحاق کرایا تھا۔ یہاں ہمیں ان چھوٹے چھوٹے امور جیسا کہ کیا مہاراجہ نے واقعی دستخط کیے تھے یا یہ کاغذات جعلی تھے؟ یا کیا اس نے اپنی عرضی اپنے مشیروں اور اپنے باشندوں کے مشورہ کے بعد سے دستخط کیے تھے یا یہ کہ عین انصاف اور تمیز یہ رہا کہ وہاں کے باشندوں سے رائے لے لی تھی وغیرہ کے بارے میں پریشان نہیں ہونا چاہئے۔ متحدہ ہندوستان کو شمال مغرب میں سندھ سے پار بیٹھے دشمن سے بچانا مشکل کام تھا پھر جب وہ دشمن چناب یا راوی کے کنارے بیٹھا تو اس سے دفاع مزید مشکل بالکل ناممکن ہو جاتا ہے۔ نہرو کا تقسیم ہند کو قبول کرلینا غلط تھا لیکن اسکا یہ خیال بہرحال درست تھا کہ کشمیر بھارت میں ہرحال میں شامل رہے۔

میرے نقاد اکثر یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ میرا اس نظریہ کے پیچھے کہ پاکستان کو واپس بھارت میں شامل کرلینا چاہئے جذبہ بے قراری مغربی پنجاب کا کھو جانا ہے جہاں سے میرا خاندان تھا اس کا جواب یہ ہے کہ جب میں نے مغربی پنجاب چھوڑا اسوقت میری عمر آٹھ ماہ تھی لہٰذا یہ کہنا دشوار ہوگا کہ میں کس چیز کیلئے بے قرار تھا۔ میرا سوال یہ ہے کہ ہم کشمیر

Marfat.com

میں نہرو خاندان کی سلطنت قائم کرنے کیلئے کیوں نہیں سوچ سکتے جوان کا مادر وطن ہے؟ کشمیر کیلئے مرنا کیوں معقول ہے اور پنجاب سندھ سرحد بلوچستان کیلئے ایسا کرنے کا معقول استدلال موجود نہیں ہے؟ شاید اگر بھارت کا پہلا وزیر اعظم کوئی پنجابی ہوتا تو وہ کشمیر کو چھوڑ کر مغربی پنجاب نام رکھ لیتا شاید پہلا وزیر اعظم اگر جنوبی علاقوں کا ہوتا تو وہ کشمیر و پنجاب دونوں دے دیتا اور کون بتا سکتا ہے)۔

جنگ سے قبل سارا کشمیر ہمارے ساتھ الحاق کر چکا تھا لیکن جب جنگ 13 دسمبر 48ء کو ختم ہوئی تو ہمارے پاس دو تہائی سرینگر اور ایک تہائی شمالی علاقے رہ گئے یہ کامیابی نہیں بلکہ شکست ہے۔ البتہ جبکہ رات کو چور سے واسطہ پڑ جانے کے بعد اسے یہ کہا جائے کہ میں نے اپنا سارا سونا بچا لیا ہے اور چاندی بھی کافی ساری بچالی ہے جبکہ تم میری تین بیٹیوں میں سے دو کی آبروریزی کر لی ہے لہٰذا میرے خیال میں ہم دونوں نے کچھ حاصل نہیں کیا ہے!'' بجائے اس کے کہ پاکستانی خطرہ کو صفحۂ ہستی سے مٹایا جاتا' الٹا پاکستان نے کشمیر کا کافی علاقہ ہم سے چھین لیا اور ساتھ ہی اتنی طاقت بھی حاصل کر لی کہ آئندہ چالیس سال تک ہم سے لڑ بھی رہا ہے ہماری یہ کوئی کامیابی نہیں ہے۔

1962ء کے بارے میں کوئی تنازعہ نہیں ہے ہم اس میں ہار گئے تھے اور بس۔ تقریباً ایک تہائی لداخ چین کے قبضہ میں چلا گیا۔ چین نے ہمارے 400 فوجی قیدی بنا لئے جن میں سے زیادہ تر 4 انفنٹری ڈویژن سے تعلق رکھتے تھے۔ چینیوں نے بھارتی سپاہیوں کو میدانوں کی طرف بھگا دیا اور پھر فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود ہی پیچھے ہٹ کر بھارتیوں کو دنیا کی نظر میں نااہل اور احمقوں کے ٹولے کی حیثیت میں پیش کر دیا مزید براں یہ کہ شمال مشرقی علاقہ حاصل کرنے کیلئے انہیں چینیوں کے سامنے کاسہ گدائی پھیلا دیا۔ 1965ء کامیابی کی ایک معقول مثال لگتا ہے اگر پاکستان نے کچھ پیش قدمی کھیم کرن میں کر لی تھی تو ہم نے اتنی ہی پیشقدمی سیالکوٹ سیکٹر میں کی۔ میں بعد میں اس کی وضاحت کروں گا کہ میں 1965ء کی جنگ کو بھی کیوں شکست گردانتا ہوں اور پھر قارئین خود ہی فیصلہ کر لیں گے۔

یقیناً 1971ء ایک عظیم فتح تھی لیکن کیا واقعی یہ فتح تھی؟! ذرا 1971ء کی جنگ کے بعد کے تسلسل حالات پر غور کیجئے ہم نے یقیناً مشرقی پاکستان میں پاکستانی فوج کو شکست دی اور ان کے 93 ہزار فوجی قیدی بنا لئے جو جنگ عظیم دوم کے بعد کسی ایک ہی معرکہ میں سب سے زیادہ تعداد ہے لیکن کیا اس طرح ہم پاکستان کو کسی بھی طرح کمزور کر سکے؟ نہیں۔ بلکہ ہم نے اس طرح پاکستان کو سرکش مشرقی حصہ سے نجات دلائی۔ جس نے خود ہی ایک دن الگ ہو جانا تھا۔ ایک...... لخت پاکستان ایک ٹکڑے کی صورت میں زیادہ مضبوط اور اپنی شناخت کے بارے میں مزید پراعتماد ہو گیا اور اپنے تشخص کیلئے محض مذہبی بنیاد پر ترتیب کی بجائے مضبوط جغرافیائی حدود کی بنا پر زیادہ طاقتور ہو گیا۔

بنگلہ دیش کے بحران کے وقت دانشوروں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر مغربی پاکستان کے مشرقی حصہ کی دولت پر پلنے اور لوٹ مار کرنے کی داستانیں خواص و عام تک پہنچائیں۔ لیکن اگر اس حساب سے دیکھا جائے تو پھر اب مشرقی حصہ بنگلہ دیش میں دولت کی ریل پیل ہونی چاہئے اور مغربی حصہ کو نہ صرف بھوکوں مرنا چاہئے۔ بلکہ اپنے محفوظ ذخائر اور زرمبادلہ کے بحران کا شکار بھی ہونا چاہئے! جبکہ ایسا نہیں اور صورت حال قطعی مختلف ہے۔ مشرقی حصہ بین الاقوامی سطح پر ایک گداگر کی حیثیت اختیار کر گیا ہے جبکہ مغربی حصہ یعنی پاکستان میں اس قدر خوشحالی آ گئی ہے کہ کراچی اور بعض دوسرے

Marfat.com

علاقوں میں نوکر 800 روپیہ مہینہ پر ملتا ہے یہاں تک کہ پاکستانی روپیہ بین الاقوامی منڈی میں اس طرح بلیک ہوتا ہے جیسے بھارتی روپیہ لہٰذا یہ 800 روپے حقیقی ہیں وہ نہیں جو حکومت کہتی ہے۔ پاکستان کو پھر بھی ایک خطرہ کی صورت اختیار نہیں کرنی چاہئے تھی لیکن بہرحال ایسا ہوا اور 1973ء میں برتری وہ تناسب جو جنگ سے پہلے تھا مٹا دیا گیا۔ یقیناً بھارت نے یہ تناسب پھر حاصل کر لیا ہے لیکن اس کیلئے اسے دفاع پر بہت سارا مال خرچ کرنا پڑا ہے۔

پاکستان 1971ء کے بعد 16 سال تک نہ صرف بچا رہا بلکہ پھل پھول رہا ہے اور جلد ہی وہ جب ایٹم بم بنا لے گا تو آئندہ پچاس سال تک اس کا وجود یقینی ہو جائے گا۔ بنگلہ دیش کی صورت میں ہمارے ساتھ خوشگوار پڑوسی ہونا چاہئے تھا۔ لیکن اس کے برعکس اس نئی مملکت کی دشمنی اگر زیادہ نہیں تو اتنی ہی موجود ہے جو اس کی پاکستان سے تھی۔ اس وقت بنگالیوں کی نفرت کا نشانہ مغربی پنجابی تھے اب سارے بھارتی ہیں۔

1971ء کی خانہ جنگی بھڑک اٹھنے سے مشرقی پاکستان میں چار بریگیڈ پاکستانی فوج پر مشتمل ایک ڈویژن فوج تھی محض اس حد تک ہی ہمیں خطرے کا مقابلہ کرنا تھا جبکہ اب مشرقی پاکستان کے پاس بھارت کے خلاف پانچ ڈویژن اور چودہ بریگیڈ فوج موجود ہے۔ 1971ء میں پاکستان کی تقسیم سے قبل مشرق کی سیاست مغرب کی سیاست سے منسلک تھی۔ اب جبکہ مشرق بھی ایک آزاد کھلاڑی ہے اس کی صورت میں ہمیں برصغیر میں اس مزید مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑ گیا ہے۔ یہ بہرحال وہ پورا نقصان نہیں جو بھارت کو ہوا ہے۔ پہلے امریکہ اور چین کو صرف ایک موقع ملتا تھا کہ وہ پاکستان پر اپنا اثر رکھیں اب انہیں دو مواقع ملتے ہیں کیونکہ اب ایک کی بجائے دو پاکستان ہیں۔ ایسی صورت میں کیا اسے جیت قرار دیا جا سکتا ہے؟!

ہم نے سات کروڑ بنگالیوں کو رہا کرا کے انہیں ایک علیحدہ وطن دیا لیکن ہم نے ایک بھی بھارتی ہندو کو پاکستان سے آزاد نہیں کرایا اور نہ ایک مربع میل علاقہ چین کے تسلط سے واپس حاصل کیا۔ اس طرح یہ ایک کھلی شکست ہے جس پر بحث کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ نہ ہی ہم اپنے آپ اس موشگافی کے ذریعہ یہ تسلی دے سکتے ہیں کہ ہم یہ چاہتے تھے اور نہیں چاہتے تھے جنگ میں جو چیز اہم ہے وہ نتائج ہیں جو آپ حاصل کرتے ہیں۔ آپ کے عزائم اپنے کو خوشحال زندہ اور پرہیز گار رکھنا ہے جبکہ حقیقت میں آپ ہار چکے ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا کہ ہم کشمیر کو آزاد نہیں کرانا چاہتے تھے۔ ایک سفید جھوٹ ہے۔ 1971ء میں جنرل کے پی کینڈتھ نے مغربی محاذ پر جو کچھ کیا اس سے سوائے اس کے کوئی اور نتیجہ اخذ ہی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اس کا ارادہ پاکستانی مقبوضہ کشمیر کو آزاد کرانا تھا۔ جنرل کینڈتھ اور جنرل اروڑہ کے ساتھ کیا ہوا اس کا فرق سادا سا ہے جنرل اروڑہ کے کام کے سلسلہ میں امریکہ کو کوئی دلچسپی نہ تھی کہ مشرقی حصہ بچتا ہے یا نہیں اور چین کے پاس اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ اسلام آباد کی مدد کر سکتا جب کہ جنرل کینڈتھ کے معاملہ میں بھارتی حکومت میں اتنا حوصلہ ہی نہ تھا کہ وہ پاکستانی مقبوضہ کشمیر کو آزاد کرانے کے امریکہ کے مقابل کھڑا ہو جاتا۔ ایک جنرل کو حکومت کی آشیرباد حاصل تھی کیونکہ اس میں کوئی بڑا خطرہ نہ تھا جبکہ دوسرے جنرل کو حکومت کے پست حوصلہ نے ذلیل کرایا۔

(اس باب کا تمام تفصیلی مواد لفظ بہ لفظ ترجمہ کے ذریعے روی ریکھی
کی کتاب The War that never was سے لیا گیا ہے)

Marfat.com

1989ءتا1999ء

17 اگست 1988ء کو جنرل ضیاالحق سی۔130 جہاز کے حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ اس طیارے میں ان کے ساتھ چیئر مین جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی جنرل اختر عبدالرحمٰن' چیف آف جنرل سٹاف لیفٹیننٹ جنرل محمد افضال اور ان کے گیارہ سینئر فوجی ساتھی پاکستان میں امریکی سفیر آرنلڈ رافیل اور ان کے ایک ساتھی اور طیارے کے عملے کے چودہ ارکان بھی جاں بحق ہوئے۔ یہ بہت بڑا قومی سانحہ تھا۔ جنرل ضیاالحق نے بھارت کے ساتھ کبھی براہ راست ٹکراؤ کی پالیسی نہیں اپنائی اس کی اہم وجہ شاید ان کی افغانستان محاذ پر مصروفیت تھی اور وہ ایک ہی وقت میں دو محاذوں پر لڑنے کے متحمل نہیں تھے۔ ان دنوں چونکہ امریکہ بھی افغانستان میں پوری طرح دھنسا ہوا تھا اور اس جنگ میں پاکستان کی حیثیت ایک فرنٹ لائن سٹیٹ کی تھی اس لئے امریکہ نے بھی شاید بھارت کو پاکستان کے خلاف کسی ممکنہ جارحانہ کارروائی سے باز رکھنے میں اہم کردار ادا کیا گو کہ بھارت کی طرف سے پاکستان کو لڑائی میں الجھانے کیلئے دو بڑی کوششیں جن میں بھارت کا آپریشن سیاچن اور براس ٹیک کے نام سے ہونے والی جنگی مشقیں شامل ہیں کی گئیں لیکن دونوں مرتبہ جنرل ضیاالحق بھارت کو طرح دے گئے۔

جنرل ضیاالحق مرحوم کے دور حکومت ہی میں بھارت میں دو اہم تحریکوں نے جنم لیا۔ ایک تو پہلے سے جاری تحریک آزادی کشمیر تھی جس نے اب جہادی شکل اختیار کر لی اور دوسری تحریک خالصتان تھی جسے سکھوں کی طرف سے اپنے الگ وطن کے حصول کیلئے جاری تحریک کہا جا سکتا ہے۔ اس تحریک کے روح رواں سنت جرنیل سنگھ بھنڈرانوالہ نامی ایک سکھ مذہبی لیڈر تھے جو کبھی کانگریس صدر گیانی ذیل سنگھ کے قریبی ساتھی سمجھے جاتے تھے لیکن بعد میں بھارتی حکومت کی طرف سے سکھوں کے خلاف ہونے والی مسلسل زیادتیوں اور سکھوں کی مذہبی' سیاسی جماعت اکالی دل کے لیڈروں کی اپنی قوم کے تئیں حد سے بڑھتی بے حسی کے سبب نہ صرف حکومت کے مخالف ہو گئے بلکہ مرکزی حکومت کے خلاف ریٹائرڈ بھارتی جرنیلوں اور سکھ نوجوانوں کی تنظیم سکھ سٹوڈنٹس فیڈریشن کے ساتھ مل کر مسلح جدوجہد بھی شروع کر دی۔ اس لڑائی میں سکھوں کی دیگر مذہبی جماعتوں دَل خالصہ' ببر خالصہ وغیرہ نے ان کا بھرپور ساتھ دیا۔

6 جون 1984ء کو نوبت یہاں تک پہنچی کہ بھارتی فوجیں سکھوں کے مقدس ترین مقام گوردوارہ دربار صاحب امرتسر میں داخل ہو گئیں انہوں نے ''ہرمندر صاحب'' (سکھوں کا متبرک ترین مقام) کو گولہ باری سے مسمار کر دیا اور سنت جرنیل سنگھ بھنڈرانوالہ اور ان کے تمام ساتھیوں کے علاوہ پنجاب کے قریباً سترہ گوردواروں' شہروں اور دیہاتوں میں موجود قریباً تیس ہزار سکھوں کو مار ڈالا۔

(ہیومن رائٹس کمیشن رپورٹس 1985۔ امریکہ' لندن' کینیڈا میں سکھوں کی طرف سے جاری کردہ مختلف رپورٹس)۔

بھارت کی طرف سے سکھوں کی اس شورش کا ذمہ دار بھی پاکستان کو قرار دیا گیا اور الزام عائد کیا جاتا رہا کہ

Marfat.com

پاکستان کی خفیہ ایجنسی آئی ایس آئی سکھ باغیوں کی پشت پناہی کر رہی ہے۔ یہ الزام آج تک دھرایا جا رہا ہے اور 2006ء میں بھی بھارتی حکومت نے مفرور سکھ لیڈروں کی ایک لسٹ پاکستان کو دے کران کی گرفتاری کا تقاضا کیا ہے جبکہ پاکستان نے کبھی اس الزام کو تسلیم نہیں کیا۔

جنرل ضیاالحق کے دور اقتدار میں افغان جہاد نے بھارت کے مظلوم مسلمانوں کو بہر حال کچھ حوصلہ دیا اور وہ یہ سمجھنے لگے کہ افغانستان کے جہاد کے ثمرات ان تک بھی ضرور پہنچیں گے اور شاید اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہونے جا رہا ہے۔ مقبوضہ کشمیر کے مسلمان ان میں پیش پیش تھے جنہوں نے 1930ء سے آزادی کی جدوجہد شروع کی اور ابھی تک بدترین غلامی سے دوچار تھے۔ 1989ء کے آغاز میں مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں نے بھارت کے خلاف باقاعدہ مسلح جدوجہد شروع کر دی گو کہ 1987ء سے یہ سلسلہ جاری تھا لیکن 1989ء میں اس میں خاصی تیزی آ گئی۔ 1990ء میں ہزاروں کشمیری نوجوان بھارتی قابض افواج کے خلاف بغاوت کا اعلان کر کے زیر زمین چلے گئے۔

جنوری 1990ء میں مجاہدین کی عسکری کارروائیوں میں بے پناہ شدت آ ئی مقبوضہ کشمیر کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ تحریک آزادی کو کچلنے میں مکمل طور پر ناکام ہو گئے اور مجاہدین کے خوف اور حالات پر کنٹرول کھونے کے بعد 19 جنوری 1990ء کو فاروق عبداللہ نے وزارت اعلیٰ سے استعفیٰ دے دیا۔ بھارتی حکومت نے نامزد گورنر جگ موہن کے ذریعہ اسمبلی معطل کر کے کشمیر پر گورنر راج نافذ کر دیا اس کے ساتھ ہی پیراملٹری دستوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا۔ بھارت نے پاکستان پر الزام لگایا کہ وہ جموں وکشمیر میں ''علیحدگی پسندوں'' کی مدد کر رہا ہے چنانچہ پاکستان کو دھمکی دی کہ اگر اس نے جموں وکشمیر میں ''علیحدگی پسندوں'' کی مدد جاری رکھی تو وہ خاموش تماشائی نہیں بنا رہے گا بلکہ انتہائی قدم اٹھانے سے بھی گریز نہیں کرے گا۔ (نوائے وقت 20 جنوری 1990ء)

بھارت کی شمالی کمان کے آفیسر کمانڈنگ جنرل گوریندر سنگھ نے کہا کہ پاکستان مجاہدین کی مدد کر رہا ہے انہوں نے کہا کہ پاکستانی مسلح افواج مسئلہ کشمیر کو زندہ رکھنے کیلئے بلا اشتعال کنٹرول لائن پر مسلسل فائرنگ کر رہی ہیں۔

(روزنامہ جنگ 16 جنوری 1990۔ راولپنڈی)

مجاہدین کی کارروائیوں نے بھارتی فوج کو زچ کر کے رکھ دیا تھا اور بھارتی حکومت پاکستان پر مسلسل الزام تراشی کر رہی تھی۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کے صدر کے ایل ایڈوانی نے بھارتی حکومت پر زور دیا کہ اسے آزاد کشمیر میں قائم کشمیریوں کے تربیتی کیمپوں پر حملہ کرنا چاہئے کیونکہ ان کے بقول پاکستان کشمیر میں مداخلت کر رہا تھا۔

(روزنامہ جنگ 4 جنوری 1990ء)

اس دوران بھارت نے کشمیر میں بڑے پیانے پر عوامی قتل عام بھی جاری رکھا' ہزاروں نوجوانوں کو گرفتار اور شہید کیا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ بھارت نے پاکستان کی سرحدوں پر اپنی افواج کی تعداد میں اضافہ کر دیا۔ اپریل 1990ء کے آخر میں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ کسی بھی وقت جنگ کا طبل بج سکتا ہے۔ ایسا معلوم ہونے لگا تھا کہ بھارت پاکستان پر جنگ ٹھونسنے کا عزم کئے ہوئے ہے۔ دونوں ممالک نے سرحدوں پر مورچہ بندی کر لی تھی۔ پاکستان نے بھارت کو مذاکرات کی تجویز پیش کی کہ دونوں ممالک اپنی فوجوں کو زمانہ امن کی پوزیشن پر لے جائیں اور کشیدگی کے خاتمے

Marfat.com

اور اعتماد کی بحالی کیلئے مذاکرات کریں۔ بھارت نے اس موقع پر کہا کہ جب تک پاکستان کشمیر اور پنجاب میں دہشت گردوں کی مدد بند نہیں کرتا مذاکرات ممکن نہیں ہیں۔ مئی 1990ء میں امریکی صدر جارج بش نے اپنے خصوصی ایلچی رابرٹ گیٹس کو دونوں ممالک کے دورے پر بھیجا' گیٹس نے پاکستان اور بھارت کی قیادت کو بتایا کہ امریکہ دونوں ممالک کے درمیان جنگ کی اجازت نہیں دے گا کیونکہ امریکی صدر کو معلوم تھا کہ دونوں ممالک ایٹمی قوت کے مالک ہیں اس لئے یہ روایتی جنگ ایٹمی جنگ میں بھی تبدیل ہو سکتی ہے اس لئے دونوں ممالک مذاکرات سے اپنے معاملات طے کریں کہا جاتا ہے کہ ایسا ہی پیغام روسی صدر نے بھی دونوں ممالک کو دیا۔ بھارت عالمی دباؤ اور تحریک مزاحمت کی شدت کی وجہ سے مجبور ہوا کہ وہ مذاکرات کا راستہ اختیار کرے یوں بالآخر دونوں ممالک کے درمیان جولائی میں مذاکرات ہونا طے پائے۔ 18 اور 19 جولائی 1990ء کو اسلام آباد میں پاکستان اور بھارت کے درمیان خارجہ سیکرٹریوں کی سطح پر مذاکرات کا آغاز ہوا۔ مذاکرات میں بھارت کی جانب سے سیکرٹری خارجہ مچکند ے دوبے اور پاکستان کی جانب سے تنویر احمد خان نے شرکت کی دونوں ملکوں کے درمیان حسب ذیل امور زیر بحث آئے:

☆ اعتماد کی بحالی

☆ سرحدی کشیدگی بالخصوص کنٹرول لائن پر ہونے والی جھڑپیں

☆ مسئلہ کشمیر

اس موقع پر بھارتی وفد کے سربراہ سیکرٹری خارجہ مچکند ے دوبے نے صدر غلام اسحاق خان' وزیراعظم محترمہ بینظیر بھٹو' وزیر خارجہ صاحبزادہ یعقوب علی خان سے بھی ملاقاتیں کیں۔ مذاکرات پر تبصرہ کرتے ہوئے پاکستانی وزارت خارجہ کے ترجمان نے کہا کہ ''بڑی جامع اور حوصلہ افزاء گفتگو ہوئی'' دونوں ممالک کے سیکرٹری خارجہ نے بات چیت کو مفید قرار دیا اور اعلان کیا کہ مذاکرات کا دوسرا دور 10 اور 11 اگست کو دہلی میں ہوگا۔ (روزنامہ جنگ کراچی 20 جولائی 1990ء)

پاکستان میں اپوزیشن جماعتوں اور آزاد کشمیر کے سیاستدانوں نے ان مذاکرات کو لاحاصل اور تحریک آزادی کے خلاف سازش قرار دیا۔ جبکہ مذاکرات کے صرف ایک دن بعد بھارتی وزیراعظم وی پی سنگھ نے کشمیریوں کے مطالبہ آزادی کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ رائے شماری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا انہوں نے حالیہ مذاکرات کو ابتدائی نوعیت کی بات چیت قرار دیا اور کہا کہ مذاکرات سے غیر معمولی نتائج کی توقع کرنا غلطی ہوگی۔

مذاکرات کا دوسرا دور 10 اور 11 اگست 1990ء کو بھارت میں ہوا۔ دہلی میں منعقد ہونے والے ان مذاکرات میں مسئلہ کشمیر پر کوئی گفتگو نہیں ہوئی بلکہ زیادہ وقت (Military Confidence Building Measures) پر مذاکرات ہوتے رہے۔ بھارت نے یقین دہانی کروائی کہ وہ پاکستان کے خلاف کوئی جنگی عزائم نہیں رکھتا ہے لیکن پاکستان نے کنٹرول لائن پر بھارتی فوج کی تعداد میں اضافے پر گہری تشویش کا اظہار کیا۔ پاکستان نے الزام لگایا کہ بھارتی افواج کنٹرول لائن کی خلاف ورزیاں کر رہی ہیں۔ یہ مذاکرات پاکستانی سیکرٹری خارجہ تنویر احمد خان اور ان کے بھارتی ہم منصب مچکند ے دوبے کے درمیان اسلام آباد میں ہوئے۔ (دی نیوز اسلام آباد۔ 12 اگست 1990ء)

مذاکرات کا یہ دور بھی ناکام رہا اور گفتگو ایک دوسرے پر الزامات سے آگے نہ بڑھ سکی۔ تیسرا دور 18 تا 20 دسمبر

Marfat.com

1990ء کو پاکستان اسلام آباد میں ہوا بھارت کی جانب سے سیکرٹری مچکند ے دو بے جبکہ پاکستانی وفد کی قیادت سیکرٹری خارجہ شہر یار خان نے کی مذاکرات میں "No-attack" Nuclear Treaty پر دستخط کئے گئے۔ دونوں ممالک نے اتفاق کیا کہ وہ افواج کی نقل وحرکت اور تعیناتی کے بارے میں ہفتہ وار ایک دوسرے کو آگاہ رکھیں گے۔

(روزنامہ جنگ راولپنڈی 21 دسمبر 1990ء)

مذاکرات کے اختتام پر پاکستانی سیکرٹری خارجہ شہر یار خان نے کہا کہ پاکستان نے تجویز پیش کی ہے کہ نیوکلیئر کے مسئلے کو علاقائی سطح پر حل کیا جائے لیکن بھارت اس مسئلے کو عالمی سطح پر حل کروانا چاہتا ہے۔ شہر یار خان نے مزید کہا کہ ہمارا مؤقف ہے کہ بھارت کشمیریوں کو حق خود ارادیت دے مگر بھارت اٹوٹ انگ کی تکرار جاری رکھے ہوئے ہے۔

کشمیر پر مذاکرات کا چوتھا دور 4 تا 6 اپریل 1991ء ہوا۔ سیکرٹری خارجہ کی سطح پر ہونے والے مذاکرات کا چوتھا دور دہلی میں شروع ہوا۔ پاکستان کی طرف سے شہر یار خان اور بھارت کی طرف سے مچکند ے دو بے مذاکرات میں شریک تھے ان مذاکرات کا بنیادی ایجنڈہ بھی Confidence-Building Measures تھا۔ 6 اپریل کو دونوں ممالک نے ایک معاہدے پر دستخط کئے جس کے مطابق:

☆ دونوں ممالک ایک دوسرے کی فضائی حدود کی خلاف ورزیاں نہیں کریں گے۔

☆ دونوں ممالک فوجی مشقوں اور فوجی نقل وحرکت سے ایک دوسرے کو آگاہ رکھیں گے۔

یہ معاہدہ دراصل دونوں ممالک کے عسکری ماہرین نے ان مذاکرات سے پہلے تیار کیا تھا مشترکہ اعلامیے میں کہا گیا کہ دونوں ممالک اصولی طور پر تنازعہ سیاچن پر مذاکرات سے متفق ہیں۔ دونوں ممالک کے سیکرٹریوں نے وولر بیراج اور سر کریک کے مسائل پر بھی گفتگو کی پاکستانی سیکرٹری خارجہ شہر یار خان نے بھارتی وزیراعظم چندر شیکھر سے بھی تفصیلی ملاقات کی۔ بھارت کے ساتھ اس معاہدے کی باقاعدہ منظوری 10 اگست 1990ء کو پاکستان کی وفاقی کابینہ نے دی۔

مذاکرات کے اس چوتھے دور سے کچھ امید ضرور قائم ہوئی لیکن بھارتی رویہ غیر مبہم اور ہٹ دھرمی کا آئینہ دار تھا۔ پانچویں دور کا آغاز 30 اکتوبر 1991ء کو ہوا اور 31 اکتوبر کو ختم ہو گیا۔

اسلام آباد کے نزدیک تفریحی مقام مری میں سیکرٹری خارجہ کی سطح پر مذاکرات کا پانچواں دور ہوا۔ ان مذاکرات میں دونوں ممالک نے اتفاق کیا کہ جنوری 1992ء سے پہلے پہلے دونوں ممالک ایک دوسرے کو اپنی نیوکلیئر تنصیبات سے آگاہ کریں گے۔ اس معاہدے سے پہلے دونوں ممالک کے اعلیٰ عہدے دار 28,27 اکتوبر کو اسلام آباد میں اس معاہدے کی تفصیلات طے کر چکے تھے ان مذاکرات میں سر کریک کے تنازعے پر بھی تبادلہ خیال کیا گیا۔

چھٹا دور 17 تا 19 اگست 1992ء پر مشتمل ہے۔ دونوں ممالک کے درمیان مذاکرات کا چھٹا دور دہلی میں ہوا یہ مذاکرات اس سے چند ماہ قبل 26 مئی کو ہونے تھے۔ اسوقت یہ مذاکرات اس لئے منسوخ کرنے پڑے تھے کہ پاکستان نے دو بھارتی سفارت کاروں کو مختلف الزامات کے جرم میں پاکستان سے نکل جانے کا حکم دیا تھا۔ جواباً بھارت نے بھی پاکستانی سفارت کاروں کو نکال دیا تھا۔ اسی لئے ان مذاکرات میں بھارت کی جانب سے جے این ڈکشٹ شریک ہوئے جب کہ پاکستان کی جانب سے شہر یار خان۔ ان مذاکرات میں جو دو معاہدے کئے گئے۔ ان میں ایک سفارتی نمائندوں

Marfat.com

کے بارے میں Code of Conduct پر مشتمل تھا جب کہ دوسرا معاہدہ ایک دوسرے کے خلاف کیمیکل ہتھیاروں کے عدم استعمال سے متعلق تھا۔ان مذاکرات پر تبصرہ کرتے ہوئے پاکستانی سیکرٹری خارجہ شہریار خان نے کہا کہ بہت ہی مفید مذاکرات ہوئے۔ 19 اگست کو شہریار خان نے اخبار نویسوں کو بتایا کہ دونوں ممالک نے اتفاق کیا ہے کہ وہ مسئلہ کشمیر پر گفتگو کریں گے۔ یہ آگے بڑھنے کیلئے پہلا قدم ہے جب کہ بھارتی وزارت خارجہ کے ترجمان نے کہا کہ ''ہم آہستہ آہستہ خوشگوار تعلقات کی جانب بڑھ رہے ہیں'' بھارتی حکومت نے مذاکرات کے بارے میں ایک ہینڈ آؤٹ جاری کیا جس میں مسئلہ کشمیر کا کوئی تذکرہ نہیں تھا۔(انڈیا ٹوڈے شمارہ ستمبر 1992ء)

گو کہ یہ مذاکرات کشمیر میں جاری تحریک مزاحمت کا نتیجہ تھے مگر اس کے باوجود بھارتی وفد نے مسئلہ کشمیر پر کوئی سنجیدہ بات نہیں کی بلکہ سارا وقت دیگر چھوٹے چھوٹے معاملات پر صرف ہوتا رہا۔ان مذاکرات کا مقصد دراصل تحریک مزاحمت کو کچلنے کا وقت حاصل کرنا تھا دوسری طرف مہذب دنیا کا دستور ہے کہ جب دو ممالک آپس میں مذاکرات کر رہے ہوں تو وہ خاموشی سے غیر جانبداری برقرار رکھتے ہیں۔اس قائدے کا بھارت کو یہ فائدہ ہوا کہ کشمیر میں سیکورٹی فورسز کے بے پناہ مظالم پر عالمی رائے عامہ نے خاموشی اختیار کئے رکھی ان مذاکرات کی آڑ میں بھارت مقبوضہ کشمیر میں اپنی مسلح افواج کی تعداد میں اضافہ کرتا رہا جو اب تک سات لاکھ پر پہنچ چکی تھی۔

1993ء تک مقبوضہ کشمیر میں موجود بھارتی افواج کے خلاف مجاہدین کی جدوجہد اپنے نقطہ عروج کو چھونے لگی تھی۔اسی صورتحال پر بھارت کے سابقہ جنرل آفیسر کمانڈنگ آف دی انڈین Peace-Keeping فورسز ان سری لنکا اور بھارتی چیفس آف سٹاف کمیٹی میجر جنرل اشوک۔کے۔مہتہ نے بھارتی ہفت روزہ Sunday میں ایک اہم مضمون بھارتی فوج کے خلاف مجاہدین (ملی ٹنٹ) کی جدوجہد اور بھارتی انٹیلی جنس ایجنسی ''را'' کے حوالے سے لکھا جس سے اس دور کی صورت حال کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔جنرل اشوک مہتہ لکھتے ہیں۔

"The infiltration of militants into the Valley continues unabated, mainly through the Kupwara sector towards Sopore, the Hizbul stronghold. Sopore is situated close to both the Jhelum river and the Wular lake, making it relatively easy for the militants to sneak into the town.

"Until February we were right on top and over the hill" claimed a divisional commander in Baramulla, "but once Rajesh Pilot tried to implement his plans, everything went haywire." the concept of a "unified command" fell flat simply because there was no coordination between the various security forces operating in the Valley. Also, there was a

Marfat.com

communication gap between New Delhi and Srinagar. The result was a hodgepodge that blurs the role of the civil administration. The obvious question that was being asked in Kashmir was: is the army there to help the civil authority or otherwise? One battalion commander in the Valley said that he was not sure whether there was a competent civil authority in his area. He said that his tasks included:

* Apprehend/kill militants.
* Sanitise designated area of responsibility.
* Win the hearts and minds of the people.

But his brief says nothing about aiding the civil authority in Kashmir. However, a three-star general doing duty in the Valley was quick to point out that in "downtown Srinagar" the army is there to help the civil administration, suggesting that the rules of engagement and civil-military interaction are ad hoc and vary from sector to sector.

At the heart of the current operational imbroglio is a flawed strategy thrust on thesecurity forces. Instead of first clearing the population centres and built-up areas, then the LoC, and, later, fanning out into the rural areas, the forces did just the reverse.

The number of security personnel in the Valley is awesome: more than twice the size of the British army. It is time to exercise political will and break the strategic conundrum. PrimeMinister Narsimha Rao's belated call to the security forces on Independence Day to stop infiltration of terrorists at all costs and the new chief of army staff telling his commanders a month earlier that the Indian Army reserves the right to "conventionalise" the proxy war at a time and place of its choosing are not rhetoric but declarations of intent.

India's options in Kashmir are limited. They range from medium cost, low-risk operation deterring infiltration to doing a low cost,

Marfat.com

high-risk surgical strike at militant sanctuaries in POK. The first option should contain militancy in six months time with the help of two additional divisions and permit the initiation of the political process in the troubled state. RAW is reportedly chewing the cud over the second option. The third option dares India to call Pakistan's nuclear bluff. Sanity and discretion recommend options one, especially after a bumper cherry crop in the Valley this season."

(Sunday. 12-18 Sep 1993)

مسئلہ کشمیر پر ابھی تک پاکستان کا اصولی مؤقف اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق رائے شماری اور کشمیری عوام کا اپنا قسمت کے متعلق فیصلہ بھی رہا تھا لیکن 18 فروری 1992ء کو او۔ آئی۔ سی کی اقتصادی تعاون کی تنظیم کے سربراہی اجلاس منعقدہ تہران میں وزیراعظم نواز شریف نے بی بی سی کو مسئلہ کشمیر کے حوالے سے انٹرویو دیتے ہوئے پہلی مرتبہ تھرڈ آپشن کی بات بھی کردی۔ وزیراعظم نواز شریف نے کہا کہ کشمیر کا مسئلہ کشمیری عوام کی خواہشات کے مطابق حل ہونا چاہئے انہیں ہی اپنے مستقبل کے فیصلے کرنے کا حق پہنچتا ہے۔ میں یہ بات واضح کر چکا ہوں کہ حق خودارادیت کا مطلب یہ ہے کہ کشمیری عوام خود فیصلہ کریں کہ وہ پاکستان یا بھارت میں سے کسی ایک کے ساتھ الحاق کرنا چاہتے ہیں یا ایک خودمختار ریاست چاہتے ہیں۔ (بی بی سی۔ 18 فروری 1992ء)

بھارت نے اسلامی ممالک کی تنظیم کی کانفرنس میں کشمیر کے حوالے سے قرارداد کی منظوری پر زبردست احتجاج کیا اور کہا کہ پاکستان نے شملہ معاہدے کی صریحاً خلاف ورزی کی ہے جس کے مطابق فریقین اس مسئلے کو کسی بھی بین الاقوامی فورم پر نہیں اٹھا سکتے۔ (ٹائمز آف انڈیا 19 فروری 1992ء)

مارچ 1994ء میں بھارت نے پاکستان کو بمبئے میں اپنا قونصلیٹ بند کرنے کیلئے پاکستانی قونصل جنرل شہریار راشد کو وزارت خارجہ میں طلب کر کے آگاہ کردیا۔ یہ دراصل ردعمل تھا یا پاکستان کی طرف سے کراچی میں بھارتی قونصلیٹ کی سرگرمیاں محدود کرنے کا جو بھارتی انٹیلی جنس ایجنسی ''را'' پاکستان میں کوارٹر بن چکا تھا۔ جس کا اعتراف اس دور کے وزیر داخلہ جنرل (ر) نصیر اللہ بابر نے کیا۔ انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا:

''کراچی میں بھارت کے مداخلت واضح ہے۔ مفرور دہشت گرد جاوید لنگڑا بھارت میں اپنے ماموں کے پاس رہتا ہے جو بی جے پی کا لیڈر ہے۔ بھارت نے ''گومتی'' کے پاس دہشت گردی کیمپ بنا رکھا ہے۔

(نوائے وقت سنڈے میگزین 4 اگست 1995ء)

بھارت نے کشمیر اور خالصتان کی جدوجہد آزادی کا ذمہ دار پاکستان کو ٹھہراتے ہوئے پاکستان کے خلاف زبردست تخریبی مہم کا آغاز کردیا اور خصوصاً سندھ میں اس کی مداخلت روز بروز بڑھتی چلی جارہی تھی۔ مقبوضہ کشمیر میں مئی 1995ء میں مقبوضہ کشمیر کی ضلع بڈگام میں ''چرار شریف'' پر مجاہدین کے قبضے کی خبروں نے بھارتی فوج کے بین الاقوامی امیج

Marfat.com

کو بری طرح متاثر کیا۔ اس حملے کی قیادت میجر مست گل کر رہا تھا۔ ضلع بڈگام میں واقع چرار شریف کا گزشتہ دو ماہ سے بھارتی فوج نے محاصرہ کر رکھا تھا جہاں مٹھی بھر مجاہدین میجر مست گل کی کمان میں مورچہ بند تھے۔ تین ہزار آبادی والے اس علاقے میں شیخ نور الدینؒ کی درگاہ مرجع خلائق ہے۔ یہاں مسلمان ہی نہیں ہندو بھی بڑی عقیدت سے آتے ہیں اور یہ مقبوضہ کشمیر کا واحد علاقہ ایسا تھا جہاں کبھی کسی ہندو کو تنگ کرنے کی شکایت بھی سامنے نہیں آئی تھی۔ بھارتی فوج نے دو ماہ پہلے اس علاقے کو اس الزام کے تحت اپنے گھیرے میں لیا تھا کہ مجاہدین چرار شریف میں داخل ہو چکے ہیں لیکن 13 اپریل کو بھارتی صحافیوں کی جس ٹیم نے چرار شریف کا دورہ کیا اسے مجاہدین نے پیشکش کی تھی کہ وہ خود جا کر دیکھ لیں درگاہ کے اندر کوئی ''دہشت گرد'' نہیں ہے البتہ چرار شریف کے اردگرد مجاہدین نے ضرور مورچہ بندیاں کر رکھی ہیں۔

دو ماہ تک بھارتی فوج مجاہدین کے صبر اور صلاحیت کا امتحان لیتی رہی۔ اس درمیان اکا دکا جھڑپوں کی اطلاعات بھی ملتی رہیں جس میں عموماً بھارتی فوج کا ہی نقصان ہوتا رہا۔ بھارتیوں کی طرف سے دو ماہ سے یہ پراپیگنڈہ بھی ساتھ ساتھ جاری رہا کہ ''گھس بیٹھیے'' پاکستانی ہیں اور آئی ایس آئی ان کی پشت پناہی کر رہی ہے جبکہ دو ماہ میں کوئی ایسا ثبوت بین الاقوامی پریس کے سامنے نہیں لایا جا سکا جس سے بھارتیوں کا یہ دعویٰ سچا ثابت ہو سکے۔

اس دوران غیر ملکی اور بھارتی صحافیوں کے متعدد وفود نے میجر مست گل سے ملاقاتیں کیں جس کا کہنا تھا کہ ہم کشمیر میں اللہ کا نظام نافذ کرنے آئے ہیں اور اپنے مشن کو پورا کئے بغیر واپس نہیں جائیں گے۔ میجر مست گل نے بھارتی فوج سے ٹکرانے کے ایک سوال کے جواب میں کہا تھا کہ وہ بھارتیوں سے جنگ نہیں چاہتے لیکن بھارتی فوج اگر ایسا چاہتی ہے تو انہیں تیار پائے گی۔ میجر مست گل نے کہا تھا ان کے پاس ایک سال تک لڑنے کا سامان موجود ہے اور وہ بھارتی فوج کو ایسا سبق سکھائیں گے جو وہ کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔

اس مرد خدا مست نے جو کہا وہ کر کے بھی دکھایا۔ بی بی سی اور غیر ملکی ذرائع ابلاغ کی ابتدائی اطلاعات کے مطابق بدھ کی صبح یعنی عیدالاضحیٰ کے روز سینکڑوں بھارتیوں کی لاشیں بھی دیکھنے میں آئی تھیں اور سینکڑوں زخمیوں کو انہوں نے بھارتی فوج کے ٹرکوں اور ہیلی کاپٹروں میں لے جاتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ لڑائی ابھی جاری تھی۔

بھارتی فوج نے دو ماہ میں اندازہ کر لیا تھا کہ معاملات قابو میں آنے والے نہیں اور یہاں اینٹ کا جواب پتھر سے ہی ملے گا۔ ایک منصوبے کے تحت اسی درمیان قصبے کی بجلی اور پانی کی سپلائی بند کی گئی اور جب شبیر شاہ اور عبدالغنی لون نے چرار شریف میں پانی اور ادویات پہنچانے کی کوشش کی تو انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ اس درمیان بھارتی فوج نے انسانی حقوق کی کسی بھی تنظیم کو چرار شریف تک جہاں زائرین کو بیماریاں لاحق ہو رہی تھیں ادویات نہیں پہنچانے دیں لیکن عوام کا پیمانہ صبر لبریز نہیں ہوا اور انہوں نے ان حالات میں بھی مجاہدین کا ساتھ چھوڑنے سے انکار کر دیا۔

یہ صورت حال بھارت کیلئے بڑی پریشان کن تھی اب بھارت کی طرف سے پاکستان کو ''کشمیر یا کراچی؟'' کا چیلنج دیا جا رہا تھا۔ اس صورت حال پر میں نے 9 جولائی 1995ء کو روزنامہ نوائے وقت کے سنڈے ایڈیشن میں ایک مضمون ''را'' کا سندھ پر حملہ..... لکھا ملاحظہ فرمائیں۔

''نومبر 84ء میں مسز اندرا گاندھی کی اپنے سکھ گارڈز کے ہاتھوں ہلاکت کے بعد بھارت کی سپریم انٹیلی جنس

Marfat.com

ایجنسی ''را'' نے بھارتی وزیراعظم مسٹر راجیو گاندھی کے دل و دماغ میں یہ بات واضح کر دی تھی کہ ان کی پوجیا ماتا جی کو آئی ایس آئی نے ایک خطرناک سازش کے ذریعے ہلاک کر دیا ہے اور اس ''معصومانہ آپریشن'' کو اتنی ہوشیاری سے ترتیب دیا ہے کہ پاکستانی انٹیلی جنس ایجنسی کی براہ راست شمولیت کا کوئی ثبوت ہی باقی نہ رہے اور یہ سمجھا جائے کہ یہ قتل ان دونوں سکھوں کا ذاتی فعل تھا۔

''را'' کی تعمیر اور تکمیل میں چونکہ مسز اندرا گاندھی کی ذاتی کوششوں کو زیادہ عمل دخل رہا ہے۔ اس سے پہلے بھارتی انٹیلی جنس ایجنسی آئی بی کے کرتا دھرتا بی این ملک کو جواہر لال نہرو کی مکمل آشیرباد حاصل رہی تھی۔ اس طرح بھارت کے انٹیلی جنس نیٹ ورک کو بنانے اور اس سے خصوصی تعلقات استوار کرنے کے حوالے سے نہرو خاندان کو خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے۔

''را'' کے پہلے ڈائریکٹر جنرل آر این کاؤ مسز اندرا گاندھی سے اپنے خصوصی تعلقات کیلئے شہرت رکھتے تھے یہی وجہ تھی کہ کانگرس سے ''را'' کے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے جبکہ مرار جی ڈیسائی کے زمانے میں ''را'' کی سرگرمیاں کافی دب گئیں۔ کیونکہ انہوں نے ''را'' کو شتر بے مہار کی طرح اپنے ہمسایہ ممالک کی سلامتی سے کھیلنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا جبکہ مسز گاندھی کے دوبارہ برسر اقتدار آتے ہی ''را'' کے گویا پھر سے تن مردہ میں جان پیدا ہو گئی۔

مسز اندرا گاندھی کے اسی دور حکومت میں ''را'' نے مشرقی پنجاب میں شورش برپا کر کے سکھوں کو اشتعال دلایا اور دربار صاحب پر بھارتی فوج کے حملے کا جواز پیدا کر دیا تاکہ کانگرس کی جھولی میں ہندو ووٹ پکے ہوئے پھل کی طرح گر پڑے۔

''را'' کی یہ سازش کامیاب رہی لیکن مسز اندرا گاندھی کو دوبارہ اقتدار کے بجائے موت نصیب ہوئی اور ان کی اس بھینٹ کا سارا فائدہ ان کے صاحبزادے نے اٹھایا جو سیاست میں نووارد ہونے کے باوجود ملک کے سب سے بڑے منصب پر فائز ہو گئے۔

''را'' کے پاس ماضی میں مرار جی ڈیسائی کا بھیانک تجربہ موجود تھا اس خطرے کو ذہن میں رکھتے ہوئے انہوں نے مسز اندرا گاندھی کے صاحبزادے کو شروع ہی سے قابو کر لیا اور ان کے ذہن میں پاکستان دشمنی راسخ ہوتی گئی۔ راجیو گاندھی چونکہ ائر لائن میں پائلٹ رہے تھے ان کی طبیعت یوں بھی ایڈونچر پسند تھی اور وہ اپنی آنجہانی ماتا کی طرح کوئی بڑا کارنامہ انجام دینا چاہتے تھے۔ ان کی ماتا جی نے تو مشرقی پاکستان کو منتخب کیا تھا۔ بیٹا ماں سے دو ہاتھ آگے نکلا اور اس کی نگاہ انتخاب پاکستان کی اقتصادی شہ رگ سندھ پر پڑی۔

راجیو گاندھی نے ''را'' کو سندھ میں مداخلت کیلئے ''فری ہینڈ'' دیدیا۔ جس نے اپنی مذموم کارروائیوں کے ذریعے سندھو دیش' سندھ رائزز' سندھ سوجھاگ' سانا' سنگت اور باگولی کے نام سے لٹریچر اور ریڈیائی پراپیگنڈے کا آغاز کر دیا۔

ہزاروں کی تعداد میں سندھ میں پمفلٹ' کتابیں اور رسالے تقسیم ہونے لگے اور اس ضمن میں 1987ء سے 1989ء تک پہلے دہلی اور پھر گجرات میں شاہ لطیف کانفرنس اور سندھی سمیلن نام کی دو کانفرنسیں کی گئیں جن میں سے پہلی

Marfat.com

میں جی ایس سید نے بہ نفس نفیس اور دوسری میں ان کے رفقا نے بھرپور شرکت کی یہاں بڑی شدت سے سندھو دیش کا پروپیگنڈہ کیا گیا۔

سپیشل سروس بیورو (ایس ایس بی) تشکیل دیا گیا اور باوثوق ذرائع سے ملنے والی اطلاعات کے مطابق ''ایس ایس بی'' نے پاکستان سے ملنے والی راجستھان کی سرحد پر 8 تربیتی کیمپ کنگا نگر' جے پور' اودھم پور' کشن گڑھ' بارمر' جیسلمیر اور چندی گڑھ میں قائم کئے ہوئے ہیں جبکہ ''را'' نے بھارت کے مختلف صوبوں میں تخریب کاروں کی تربیت کیلئے 36 تربیتی کیمپ بنائے ہوئے ہیں۔

راجستھان کی سرحد پر واقع ان تخریبی کیمپوں میں سارا سال دہشت گردوں کی تربیت جاری رہتی ہے گزشتہ تین سال کے اعداد و شمار کے مطابق ان کیمپوں سے فارغ ہونے والے تخریب کاروں نے 150 سے زیادہ وارداتوں میں 300 سے زائد سیاسی ورکروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

ان ہی کیمپوں سے فارغ ہونے والے تخریب کاروں نے پاکستان کے انتہائی حساس نوعیت کے مقامات پر بھی دھماکے کئے گئے۔ جن میں سوئی پائپ لائن' آئل ریفائنری' ٹرینیں' سویلین اور آرمی کے جہاز بھی شامل ہیں۔ 1986ء سے 1990ء تک ''را'' کی سندھ میں تخریبی سرگرمیاں اپنے نقطہ عروج کو چھو رہی تھیں کیونکہ اس درمیان ''را'' کو افغان انٹیلی جنس ایجنسی ''خاد'' اور ''کے جی بی'' کی مدد بھی حاصل تھی اور اس درمیان بیشتر تخریب کاری آپریشن مشترک تھے اسی دوران 1600 بم دھماکے کئے گئے جن میں ایک ہزار سے زائد بیگناہوں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے اور 3800 سے زیادہ شہری زخمی اور معذور ہو گئے۔

''را'' نے بعض معاملات میں تو سی آئی اے کو بھی مات دیدی ہے۔ امریکی آئین کے مطابق امریکہ کے اندرونی معاملات ایف بی آئی اور بیرونی معاملات سے سی آئی اے منسلک ہے جبکہ ''را'' کو اس معاملے میں مکمل آزادی حاصل ہے اور وہ اندرون و بیرون بھارت اپنے بل بوتے پر کچھ بھی کر گزرتی ہے۔ بھارتی آئین کے مطابق پارلیمنٹ کو ''را'' کی سرگرمیوں کو زیر بحث لانے کی اجازت نہیں۔

''را'' کو ماضی کی ''کے جی بی'' سے بھی زیادہ اختیارات حاصل ہیں دراصل پاکستان میں بیک وقت تین بھارتی انٹیلی جنس ایجنسیاں کام کرتی ہیں۔ ڈائریکٹوریٹ آف ملٹری انٹیلی جنس' ڈی بی آئی' ''را'' بارڈر سیکورٹی فورسز انٹیلی جنس بی ایس ایف' ایک لحاظ سے ڈی بی آئی سے بی ایس ایف زیادہ بہتر نتائج حاصل کرتی ہے کیونکہ اس کی 50 بٹالین نفری پاکستانی سرحدوں کے ساتھ ساتھ مورچہ بند ہے اور دن رات اس کا واسطہ سرحدی معاملات ہی سے رہتا ہے لیکن ''را'' کو ان دونوں پر برتری حاصل ہے کیونکہ وہ پاکستان کے سیاسی' معاشی' دفاعی' سماجی' لسانی' سائنسی اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں مداخلت کرتی ہے اور اس نے ہر جگہ اپنے جاسوسوں کا جال بچھا رکھا ہے۔ اپنے ہزاروں ایجنٹوں کو پاکستانی خصوصاً سندھ میں داخل کرنا اس کا معمول بن چکا ہے۔

گزشتہ عشرے سے ''را'' نے بھارتی حکومت پر مسلسل دباؤ ڈالا ہوا ہے کہ وہ سندھ پر براہ راست حملہ کر کے مشرقی پنجاب میں پاکستان کی نام نہاد مداخلت کا بدلہ چکائے اور مسز اندرا گاندھی کی موت کا بدلہ ہے۔ ''را'' کی پاکستان

Marfat.com

دشمنی کا یہ عالم ہے کہ وہ اب تک پاکستان انٹیلی جنس ایجنسی آئی ایس آئی کو نہ صرف پنجاب میں شورش اور مسز اندرا گاندھی کے قتل کا ذمہ دار گردانتی ہے بلکہ 2 اکتوبر 1986ء کو مسٹر راجیو گاندھی کے تامل ٹائیگرز کے ہاتھوں ہونے والے قتل کا ''ماسٹر مائنڈ'' بھی آئی ایس آئی کو سمجھتی ہے۔

''را'' کی اس ڈس انفارمیشن مہم نے راجیو گاندھی کو اتنا برانگیختہ کیا کہ 1983ء میں اس نے سندھ میں ایک بڑے اور تباہ کن آپریشن کی اجازت دیدی اور راجستھان کی سرحدوں پر حالت جنگ میں فوجوں کو لا کھڑا کر دیا تھا۔ اسی طرح 87-1986ء میں ''براس ٹیک'' جنگی مشقوں کی آڑ میں بھی دراصل پاکستان کے خلاف جارحانہ حملے کی مکمل تیاری ہو چکی تھی یہ الگ بات کہ پاکستان کی دفاعی حکمت عملی نے بھارتی جرنیلوں کے ارمانوں پر اوس ڈال دی اور انہیں بالآخر دنیا کی سب سے بڑی جنگی مشق ''نتائج کے حصول'' کے بغیر ہی ختم کرنی پڑی۔

سندھ کے معاملے پر اپنی حکومت کو اشتعال دلاتے رہنا اب ''را'' کی مجبوری بن چکی ہیں کیونکہ اس نے ہزاروں تخریب کاروں کو دہشت گردوں ڈاکوؤں اور جاسوسوں کے روپ میں پاکستان کے اس صوبے میں بڑی محنت سے داخل کیا ہے جبکہ نتائج اس کی مرضی کے مطابق حاصل نہیں ہو رہے۔ ''را'' نے اپنے تئیں دراصل یہ مفروضہ قائم کر لیا ہے کہ اندرون سندھ علیحدگی پسند قوتوں نے اپنے ایجنٹوں اور بھارتی حکومت کے چھوٹے سے فوجی حملے کے ساتھ وہ پاکستان کی اس اقتصادی شہ رگ کو کاٹ کر الگ کر دے گی جس کے بعد اس کا سارا جسم خود ہی اپنی موت مر جائے گا۔

1983ء میں ''را'' نے ''سندھ'' میں لسانی فسادات کا بھرپور آغاز کیا تھا اور یہ سلسلہ ہنوز کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے۔ راجیو گاندھی کی طرف سے ''را'' کو یہ فریضہ سونپا گیا تھا کہ وہ سندھ میں فسادات کی ہنڈیا کو گرم رکھیں تاکہ جب بھی کوئی بین الاقوامی صورت حال بھارت کے حق میں ہو سندھ کے اندر موجود علیحدگی پسند تخریب کار قوتیں بھارتی فوج کی پشت پناہی سے انقلاب لائیں اور بنگلہ دیش کی طرح سندھ کو بھی علیحدہ ملک بنا دیا جائے۔ اس مقصد کیلئے ''را'' نے ہزاروں ایجنٹوں کو پاکستان میں داخل کیا جن میں سے کئی مارے گئے اور سینکڑوں اب بھی پاکستانی جیلوں میں سزائیں بھگت رہے ہیں۔

اس صورت حال پر مشہور بھارتی مصنف روی راکھی نے اپنی کتاب "The war that never was" میں برملا اقرار کیا ہے۔

''ہم نے ان لوگوں کی حفاظت سے منہ موڑ لیا جو بھارت ماتا کیلئے لڑ رہے تھے۔ سینکڑوں کی تعداد میں ''را'' کے بھیجے ہوئے بھارتی نژاد ایجنٹ جو سندھ میں تخریب کاری کے ذریعے آزاد ملک کے قیام کیلئے کوشاں تھے آج پاکستانی جیلوں میں ایڑیاں رگڑ رہے ہیں اور بھارتی حکومت کو ان کی بالکل پرواہ نہیں۔''

''را'' اور بھارت کی دیگر انٹیلی جنس ایجنسیوں کے نزدیک سندھ کی حیثیت نرم گوشت کی سی ہے جسے وہ آسانی سے ہڑپ کر سکتی ہیں۔ سندھ خصوصاً کراچی اور حیدرآباد میں لاء اینڈ آرڈر کی تباہ کن صورت حال کو بھارتی انٹیلی جنس ایجنسیاں للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی ہیں۔ ان کی رال ٹپک رہی ہے۔ سندھ کی موجودہ صورت حال میں بھارتی پراپیگنڈہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ آل انڈیا ریڈیو کی سندھی سروسز کا دائرہ کار بڑی کامیابی سے سندھ کے کم تعلیم یافتہ اور ان پڑھ طبقے میں ملک دشمنی کے زہریلے جراثیم پھیلا رہا ہے۔ ریڈیو پاکستان کے مذہبی پروگراموں کے مقابلے میں آل

Marfat.com

انڈیا ریڈیو کے رنگ برنگے پروگراموں کے سامعین کی تعداد بہت زیادہ ہے بدقسمتی سے آج کا پاکستانی نوجوان اور کسی حد تک خواتین بھی بھارتی گانوں اور فلموں کے فوبیا میں بری طرح مبتلا ہو چکے ہیں۔ مصدقہ اطلاع کے مطابق اس وقت قریباً 50 ہزار ''را'' کے ایجنٹ سندھ میں سرگرم عمل ہیں' ان ایجنٹوں کو پیسہ' تربیت' ہتھیار' وائرلیس سیٹوں اور بھارتی وہسکی سے مسلح کر کے میدان میں اتارا گیا ہے۔ سندھ کے دیہی علاقے آج ڈاکوؤں' اغوا کاروں' ڈرگ اور اسلحہ مافیا کی گرفت میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں کو ''را'' کی تربیت کے ساتھ ساتھ مقامی وڈیروں اور جرائم پیشہ سرداروں کی پشت پناہی بھی حاصل ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ لاڑکانہ سے پی آئی اے کے مسافروں کی ویگن اغوا کرتے ہیں اور تعاقب پر بھی کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ کیا ان لوگوں کو زمین نگل جاتی ہے یا آسمان اچک لیتا ہے؟ افسوس ایسا کچھ نہیں۔ مقامی کارندے ان کے مددگار ہیں اور انہیں ہر دو کلومیٹر کے فاصلے پر چھپنے کیلئے جگہ میسر ہے۔

گزشتہ سیکرٹریوں کی میٹنگ میں حکومت پاکستان نے بھارتی حکومت کو اس کے ڈپلومیٹس کی کراچی میں تخریبی سرگرمیوں کے ثبوت فراہم کئے ہیں لیکن بھارتی حکومت کے کان پر جوں تک نہیں رینگی جس پر حکومت کو بادل نخواستہ انڈین ہائی کمیشن بند کرانا پڑا۔ ''را'' نے پاکستان کی اس جائز حفاظتی اقدام کو بھی اپنے حق میں استعمال کیا اور کراچی اور حیدر آباد کے مہاجر بھائیوں میں یہ زہریلا پراپیگنڈہ کیا گیا کہ محض ان کیلئے مشکلات پیدا کرنے اور انہیں بھارت میں موجود اپنے رشتہ داروں سے ملاقات سے روکنے کیلئے پاکستان نے کراچی قونصلیٹ بند کیا ہے۔

پاکستانی حکومت عالمی برادری کو راجستھان کے 7 یوپی کے 5 اور بھارت کے دیگر علاقوں میں 11 تخریب کار تربیتی کیمپوں کے ثبوت فراہم کر چکا ہے۔ پاکستانی حکومت کی اطلاعات کے مطابق 5 جولائی 1987ء سے 25 جولائی 1991ء تک ''را'' کے تربیت یافتہ تخریب کاروں کے ہاتھوں سندھ میں 174 بیگناہ مارے گئے اور 866 زخمی ہوئے تھے۔ پاکستانی حکومت کا دعویٰ ہے کہ کراچی اور اسلام آباد میں بھارتی ڈپلومیٹس کا ان تخریب کاروں سے براہ راست رابطہ رہتا ہے۔ اس ضمن میں کراچی میں بھارتی قونصلیٹ کے پی ڈی شرما کو پاکستان ائرفورس کے ایک کارپورل کے ساتھ معاملات طے کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں گرفتار کیا گیا۔ شرما کی بے دخلی کے بعد کراچی کے قونصلیٹ آئی کے رینا نے اس کی جگہ سنبھالی اور شرما کے ''لنکس'' سے ناطہ جوڑا۔

''را'' کے تربیتی کیمپوں کو چلانے کی ذمہ داری ''ایس ایس بی'' کی ہے۔ جوان کیمپوں کیلئے نفری سندھ کے لسانی اور طبقاتی گروہوں سے حاصل کرتی ہے اور بھارتی شہریوں سے عموماً گائیڈ اور کوریئر کا کام لیا جاتا ہے۔ (نوائے وقت سنڈے میگزین 9 جولائی 1995ء مصنف۔ طارق اسمٰعیل ساگر)

16 جون 1995ء کو پاکستانی معاملات میں روز بروز بڑھتی بھارتی مداخلت خصوصاً کراچی اور اندرون سندھ میں بگڑتی صورت حال کے حوالے سے میں نے نوائے وقت سنڈے میگزین میں ایک تجزیہ پیش کیا۔ ملاحظہ فرمائیں۔ اس تجزیے میں بھارتی مداخلت اور اس کو حاصل امریکی آشیرباد کو موضوع بنایا گیا تھا۔

''یہ زیادہ پرانی بات نہیں جب بھارتی ذمہ دار حلقوں کی طرف سے کشمیر یا کراچی کا نعرہ بلند ہوا تھا اور مقبوضہ کشمیر میں جدوجہد آزادی کے زور پکڑتے ہی بھارتی قیادت کی طرف سے یہ بات کہی جانے لگی تھی کہ وہ پاکستان کو اسی پوزیشن

Marfat.com

میں لے آئیں گے جہاں اسے خدانخواستہ کراچی یا کشمیر سے ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ ملکی اور غیر ملکی ذرائع ابلاغ کے حوالے سے ملنے والی خبروں کا اگر بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو یہ بات اب کوئی ڈھکی چھپی نہیں رہ گئی کہ کراچی کے حالات اتنے خطرناک ہو چکے ہیں کہ بھارتی حکمران اپنی زبان سے کچھ کہیں یا نہ کہیں صورت حال ایسی ہی ہوگئی ہے جس میں پاکستان کو مجبور کر دیا گیا ہے کہ وہ مقبوضہ کشمیر میں مجاہدین کی اخلاقی حمایت سے ہاتھ اٹھالے۔ بین الاقوامی فورموں پر کشمیریوں کی حمایت بند کر دے اور اس مسئلے کو جسے ہزاروں کشمیریوں نے اپنے خون کی لالی سے زندہ کیا ہے پھر سرد خانے میں ڈال کر گہری نیند سلا دے تاکہ گزشتہ 40 سال کی طویل غلامی کے بعد اب جب مقہور و مجبور کشمیریوں نے آزادی یا موت کا نعرہ مستانہ بلند کیا ہے تو انہیں ایسا خاموش کروایا جائے کہ وہ دوبارہ سر نہ اٹھا سکیں۔

حال ہی میں ایک تقریب میں وزیر اعظم بے نظیر بھٹو صاحبہ کے میڈیا ایڈوائزر جناب حسین حقانی نے بھی اس خدشے کا اظہار برملا فرمایا ہے کہ بھارت نے دو "ک" کے درمیان مسئلہ رکھ دیا ہے اور پاکستان کو سیدھا میسج دیا ہے کہ وہ یا تو کشمیر سے ہاتھ اٹھالے یا پھر کراچی سے ہاتھ دھونے کیلئے تیار ہو جائے۔ بین الاقوامی سطح پر ہماری خارجہ پالیسی کا یہ حال ہے کہ وہ امریکہ جس کی حمایت میں ہم مرے جاتے ہیں وہ جس کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے ہم نے اپنی عزت نفس کو داؤ پر لگا دیا ہے اسی نے ہمیں ہمارے خرید کردہ ایف سولہ طیارے دینے سے انکار کر دیا ہے اور ڈیفنس کے معاملات میں بھی ہمارے بجائے بھارت کے ساتھ پینگیں بڑھا رہا ہے۔ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق امریکہ نے بھارت میں بحری اڈے بنانے کیلئے مذاکرات شروع کر دیئے ہیں۔ اس ضمن میں "بمبئی" کو چین جس میں بھارتی اسلحہ بھی شامل تھا۔ لیکن یہ معاملہ کسی رسمی معاہدے کی رو سے نہیں ہوا۔

دراصل 1985ء میں ہی امریکہ اور بھارت کے درمیان دفاعی معاملات کے بارے میں بعض نئی راہیں تلاش کی گئیں۔ ریگن انتظامیہ کے دوران ایک بھارتی نژاد امریکی سید احمد میر کو نئی دہلی میں امریکی سفارتخانے میں صرف اس کام پر مامور کیا گیا کہ وہ دونوں ممالک کے درمیان سائنسی اور تکنیکی مہم کاری کو فروغ دینے کی کوششیں شروع کرے۔ 1987ء میں 13 ہزار سے زائد بھارتی امریکہ کی یونیورسٹیوں میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے جبکہ پاکستانی طلبہ کو ان شعبوں میں داخلہ دینے سے انکار کیا گیا۔ دفاع کے سیکرٹری وائن برگر نے 1987ء میں کانگرس کو بتایا کہ پینٹا گان نے اعلیٰ تکنیکی ساز و سامان کے حصول کے بارے میں بھارت کی تین ہزار درخواستوں پر نظر ثانی کی ہے جن میں 92 فیصد منظور کی گئی ہیں۔ کانگرس کو کہا گیا کہ یو ایس نے 2-1 بلین ڈالر کا اعلیٰ تکنیکی ساز و سامان بھارت کو فروخت کیا کہ 1975ء میں یو ایس نے بھارت کو اقتصادی تعاون بحال کرتے ہوئے اس کو 75 ملین ڈالر ادا کئے۔ 1976ء میں اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے نیوکلیئر کو اپریٹو دفاعی تحقیق اور پیداوار کی مزید کارروائیوں کی وسعت اور گنجائش پر کام کرے گا جبکہ پاکستان کا ایسا کوئی معاہدہ امریکہ کے ساتھ نہیں ہے اور پریسلر ترمیم کی رو سے اسلحہ کی فروخت اور دونوں ممالک کے درمیان اسلحہ کی مشترکہ پیداوار پر پابندی ہے۔ بھارت اور امریکہ کے درمیان پہلے سے بھارت کے لائٹ کمبیٹ ائرکرافٹ کو ترقی دینے کے بارے میں کافی حد تک تعاون واشتراک ہو رہا ہے اور جوائنٹ ٹیکنیکل گروپ امریکہ کی دفاعی ٹیکنالوجی کے بھارت پہنچنے کا راستہ ہموار کرے گا اور اس طرح بھارت کا سوویت سسٹم پر مبنی اسلحہ کا نظام بڑی حد تک ترقی کرے گا۔ یہ بات بھی

Marfat.com

قابل ذکر ہے کہ امریکی سی آئی اے کے ڈائریکٹر کے بقول پرتھوی اور اگنی میزائلوں کا خالق ڈاکٹر عبدالکلام ورجینا میں واپس جزائر کے راکٹ سنٹر میں ہی تربیت پا چکا ہے۔

جون 1995ء میں بھارت کی طرف سے 2 ارب ڈالر کی امریکن 155-ایم رائفلیں خریدنے کا عندیہ بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ بھارت کی ڈھٹائی کا یہ عالم ہے کہ حال ہی میں بھارتی صدر شنکر دیال شرما نے پاکستان سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ آزاد کشمیر سے اپنا قبضہ ختم کردے کیونکہ آزاد کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ وہ یہ قبضہ ختم کروا کر ہی دم لیں گے جبکہ خود بھارت کے مقبوضہ کشمیر کا یہ حال ہے کہ چرار شریف کی بھارتی فوج کے ہاتھوں تباہی' ہزاروں کشمیری مسلمانوں کی شہادت کے بعد بھی نرسیمارا ؤ مقبوضہ کشمیر میں الیکشن کروانے پر بضد تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ اب بھارتی الیکشن کمشنر مسٹر ٹی این سیشن جب مقبوضہ کشمیر میں الیکشن کی تیاریوں کی صورت حال کا جائزہ لینے گئے تو ان کا ایسا ''شاندار'' دفاعی معاہدوں کا ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ دونوں ممالک کے درمیان فوری طور پر صلاح و مشورہ شروع کیا جائے گا تاکہ مخصوص معلومات کے تحفظ کیلئے ایک دوطرفہ معاہدہ اتفاق رائے پیدا کیا جا سکے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بھارت اور امریکہ کے درمیان رسمی طور پر انٹیلی جنس کے تعلقات قائم ہو جائیں گے۔ اگرچہ اس سلسلہ میں غیر رسمی طور پر پہلے ہی دونوں کے درمیان شراکت موجود ہے۔ اب باضابطہ دونوں جگہوں کے انٹیلی جنس آفیسرز ایک دوسرے کے ممالک کا دورہ کریں گے۔ ان حالات میں امریکہ سے پاکستان کی امیدیں کیا رنگ لائیں گی یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی۔ جہاں تک امریکہ کے اس دعوے کا تعلق ہے کہ وہ پاکستان اور بھارت سے یکساں اور برادری کی سطح پر تعلقات قائم کرنا چاہتا ہے' تو اس مساویانہ سلوک کا بھانڈا ابھی بیچ چوراہے میں پھوٹ چکا ہے۔ امریکہ نے بھارت سے باقاعدہ دفاعی معاہدہ کیا ہے جس میں بھارت کو اسلحہ کی تیاری میں مدد دینے کا وعدہ بھی شامل ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ امریکہ نے بھارت کو آج تک اپنا ایٹمی پروگرام کیپ کرنے کا پابند بھی کسی معاہدے میں نہیں کیا۔ اس کا بھارت کے ساتھ ایک ارب 40 کروڑ ڈالر کا تجارتی معاہدہ موجود ہے جبکہ ہمارے سر پر ابھی تک پریسلر ترمیم کی تلوار لٹک رہی ہے۔ (ندائے ملت۔ روزنامہ نوائے وقت۔ لاہور)

مسئلہ کشمیر کے حوالے سے دونوں ممالک کے درمیان خارجہ سیکرٹریوں کی سطح پر مذاکرات کا آغاز جنوری 1992ء میں ہوا۔

اگست 1992ء میں سیکرٹری خارجہ کی سطح پر مذاکرات کا چھٹا دور ہوا تھا۔ مذاکرات کے ان چھ ادوار میں مسئلہ کشمیر پر کوئی گفتگو نہیں ہوئی تھی۔ پاکستان میں محترمہ بے نظیر بھٹو نے اکتوبر 1993ء میں دوبارہ اقتدار سنبھالا' بھارتی وزیراعظم نرسیمارا ؤ نے بے نظیر بھٹو کے نام ایک تہنیتی پیغام میں کہا کہ ''ہم جموں و کشمیر کے متعلقہ امور پر بحث کیلئے تیار ہیں۔'' بھارتی وزیراعظم کے کشمیر پر مذاکرات کے عندیے کو اسلام آباد کے پالیسی سازوں نے بہت اہمیت دی۔ نرسیمارا ؤ سے پہلے بھارتی وزیر مملکت برائے خارجہ امور دینش سنگھ بھی کہہ چکے تھے کہ ''ہم کشمیر پر اوسلو ٹائپ مذاکرات کیلئے تیار ہیں۔'' (دی نیوز راولپنڈی 19 اکتوبر 1993ء)

مذاکرات کی اس پیشکش کو درحقیقت بھارت نے الجھاؤ پیدا کرنے کیلئے استعمال کیا۔ اسی طرح بھارتی سیکرٹری خارجہ ڈکشٹ نے جب مذاکرات سے پہلے اقوام متحدہ کی قراردادوں کا غلطی سے تذکرہ کر دیا تو دوسرے روز بھارتی ترجمان

Marfat.com

نے تردید کی اور وزیر مملکت سلمان خورشید نے اعلان کیا:

''کشمیر ہمارا اٹوٹ انگ ہے''

اس دوران نرسیما راؤ نے کہا کہ ''پاکستان اگر کشمیر کو ہمارا حصہ تسلیم کرے تو تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔''

(دی نیوز۔19 اکتوبر 1993ء)

ان مذاکرات کا سرکاری سطح پر کوئی باقاعدہ ایجنڈا جاری نہیں کیا گیا البتہ ملکی اور غیر ملکی ذرائع ابلاغ نے جو تفصیلات جاری کیں ان کے مطابق دونوں ممالک امریکہ کے تیار کردہ کسی مصالحتی فارمولے پر معاہدے کیلئے تیار ہو گئے تھے۔

مذاکرات کا پس منظر یہ تھا کہ 15 اکتوبر 1993ء کو بھارتی فوج نے سری نگر میں مسلمانوں کے مقدس مقام حضرت بل کا محاصرہ کیا' فورسز کا دعویٰ تھا کہ حضرت بل میں بڑی تعداد میں مجاہدین اور اسلحہ موجود ہے۔ تقریباً ایک ماہ تک یہ محاصرہ جاری رہا' اس دوران پوری دنیا اور بالخصوص مسلم دنیا نے بھارت کی زبردست مذمت کی کہ وہ ایک (بابری مسجد 6 دسمبر 1992ء) کے بعد دوسری مسجد کو شہید کرنے کی مذموم کوشش کر رہا ہے۔ سفارتی دباؤ کے علاوہ عالمی ذرائع ابلاغ نے بھی بھارت کے فرقہ وارانہ چہرے کو بے نقاب کیا۔ اسی اثناء میں پاکستان نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں کشمیر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزی پر قرارداد پیش کر رکھی تھی۔ پاکستان کا مطالبہ تھا کہ مقبوضہ کشمیر میں بھارت تحریک آزادی کو کچلنے کیلئے غیر انسانی حربے استعمال کر رہا ہے وہ بے گناہ عوام کا قتل عام کر رہا ہے۔ اس لئے جنرل اسمبلی ''حقائق معلوم کرنے کا مشن'' کشمیر روانہ کرے تاکہ وہ صورت حال کا جائزہ لے سکے۔ جس پر بظاہر پاکستان کو تائید ملنے کے کافی روشن امکانات تھے اگر یہ قرارداد پاس ہو جاتی تو پھر مسئلہ کشمیر کو عالمی سطح پر زبردست پذیرائی ملتی۔ پاکستان کے وزیر خارجہ کے بقول دوست ممالک نے ان سے کہا کہ قرارداد واپس لے کر بھارت سے مذاکرات کریں ان مغربی اور امریکی دوستوں نے پاکستان کو یقین دہانی کروائی کہ اس طرح مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دونوں ممالک کے قائدین نے مذاکرات سے پہلے ہی مذاکرات کو عملاً بے معنی بنانے کی کوششیں شروع کر رکھی تھیں۔ پاکستانی وزیر خارجہ آصف احمد علی نے کہا:

''جہاں تک مذاکرات کا تعلق ہے ان کے بارے میں قطعی پرامید نہیں ہوں ایسے میں جب بھارتی فوج مقبوضہ کشمیر میں بدستور ظالمانہ کارروائیاں کر رہی ہے مذاکرات کے بارے میں کون پرامید ہو سکتا ہے۔''

(دی نیوز 27 دسمبر 1993ء)

یکم جنوری کو بھارتی وفد سیکرٹری خارجہ جے این ڈکشٹ کی قیادت میں پاکستان پہنچا اسلام آباد ایئرپورٹ پر اخبار نویسوں کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے ڈکشٹ نے کہا:

''کشمیر ایک متنازعہ مسئلہ ہے جو کوئی یہ کہتا ہے کہ ایسا نہیں ہے تو وہ حقائق کو نہیں دیکھ رہا شملہ سمجھوتے کی شق نمبر (4) کے تحت بھی اسے ایک متنازعہ مسئلہ تسلیم کیا گیا ہے۔'' (نوائے وقت 2 جنوری 1994ء)

انہوں نے ایک اور سوال کے جواب میں کہا:

Marfat.com

''اختلافات اور فاصلوں کو کم کرنے کیلئے بات چیت اور دلائل سے کام لیا جانا چاہئے اور اس بارے میں کوشش کی جائے گی۔''

بھارتی وفد کی آمد سے پہلے ہی پاکستانی وزارت خارجہ کے ذمہ دار ذرائع نے بتایا کہ مذاکرات کے کل چار دور ہوں گے۔ جن میں سے تین مسئلہ کشمیر کیلئے مختص کئے جائیں گے جب کہ ایک دور میں سیاچن' سمندری سرحدوں سرکریک' وولر بیراج اور دونوں ممالک کے تعلقات میں اعتماد کی فضا بحال کرنے کی تجاویز پر غور کیا جائے گا۔ ان ذرائع کا کہنا تھا کہ دونوں ممالک کی ترجیحات میں نمایاں اختلاف رائے ہے۔ بھارت سیاچن گلیشیئر' سرکریک اور وولر بیراج جیسے مسائل پر ترجیحی بنیادوں پر بات چیت کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے مسئلہ کشمیر پر ابتدائی نوعیت کے مذاکرات کرنے پر اصرار کر رہا ہے جب کہ پاکستان مسئلہ کشمیر کو مذاکرات کا مرکزی نقطہ بنانا چاہتا ہے۔ درحقیقت بھارت جنرل اسمبلی کی قرارداد سے بچنا چاہتا تھا اس لئے اس نے اس موقع کو مناسب سمجھا کہ اس دوران مذاکرات کئے جائیں۔

مذاکرات شروع ہونے سے پہلے بھارتی وفد نے صدر پاکستان سردار فاروق احمد خان لغاری سے ملاقات کی صدر نے وفد پر زور دیا:

''وہ مذاکرات کو نتیجہ خیز بنانے کیلئے کشمیر میں صورت حال کو تبدیل کرنے کیلئے فوری اقدامات کریں۔ صدر نے وفد سے یہ بھی کہا کہ جنوبی ایشیا میں امن کے قیام اور جنگ کے خطرہ سے بچنے کیلئے ضروری ہے کہ مسئلہ کشمیر کو حل کیا جائے' اور بھارت اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق مسئلہ حل کرے اور کشمیریوں کو ان کا حق خودارادیت دینے کیلئے استصواب رائے کروائے۔'' (روزنامہ جنگ یکم جنوری 1994ء)

2 جنوری کو مذاکرات کے دو ابتدائی دور ہوئے مذاکراتی ٹیموں کے ارکان نے پریس کے نمائندوں کو بتایا کہ مسئلہ کشمیر پر دونوں ملکوں کے مؤقف میں شدید اختلافات موجود ہیں اور مذاکرات کے اس ساتویں دور میں مسئلہ کے حل کی جانب کسی ڈرامائی پیش رفت کی توقع نہیں ہے۔ مذاکرات میں پاکستانی وفد نے اپنا تاریخی مؤقف دوٹوک انداز میں پیش کیا جب کہ بھارت نے بھی اپنے پرانے مؤقف پر ہی اصرار کیا۔ دونوں ملکوں کے نقطہ نظر اور تصورات میں شدید اختلافات کے باوجود کئی گھنٹوں کے مذاکرات کے بعد پاکستان اور بھارت کے سیکرٹری خارجہ شہریار خان اور ڈکشٹ کے بقول ''صرف ایک عنصر مشترک تھا کہ دونوں وفود سنجیدگی کے ساتھ بات چیت کر رہے ہیں۔'' ان مذاکرات میں بھارتی وفد نے مسئلہ کشمیر اور دیگر متنازعہ مسائل کو مرحلہ وار حل کرنے کی تجویز پیش کی جسے پاکستان نے مسترد کر دیا۔

پاک بھارت خارجہ سیکرٹریوں کے مذاکرات کے پہلے دور کی ابتداء میزبان ملک پاکستان کے سیکرٹری خارجہ شہر یار خان کے خیر مقدمی کلمات سے ہوئی سیکرٹری خارجہ شہر یار خان نے دفتر خارجہ میں بھارت کے سیکرٹری خارجہ جے این ڈکشٹ اور ان کے وفد کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا: ''ہمیں خوشی ہے بھارت مسئلہ کشمیر پر مرحلہ وار نہیں بلکہ کلی انداز سے بات چیت کرنے کی خواہش کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ان مذاکرات میں کلیدی مسئلہ کے حل کے سلسلے میں پیش رفت ہوگی سیکرٹری خارجہ شہر یار خان کے خیر مقدمی کلمات کے بعد بھارت کے سیکرٹری خارجہ جے این ڈکشٹ نے پاکستان کی طرف سے بھارتی وفد کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مذاکرات کے نتائج کے بارے میں نیک

Marfat.com

تمناؤں کا اظہار کیا۔ روایت کے مطابق مذاکرات کے پہلے دور میں مہمان ملک کے خارجہ سیکرٹری کو مسئلہ کشمیر کے بارے میں اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کا موقع دیا گیا۔ بھارت کے سیکرٹری خارجہ جے این ڈکشٹ نے ماضی کی تلخیوں کا ذکر کرتے ہوئے اس تمنا کا اظہار کیا کہ مسئلہ کشمیر پر کھلے دل کے ساتھ بات چیت کی جائے گی۔ بھارت کے سیکرٹری خارجہ نے کہا کہ ہم کشمیر کے تمام پہلوؤں پر بات چیت کیلئے تیار ہیں۔ شملہ معاہدہ کے ذریعہ کشمیر کو تصفیہ طلب معاملہ قرار دے کر اسے دوطرفہ مذاکرات کے ذریعہ حل کرنے پر اتفاق ہوا تھا اگر ہم گزشتہ بیس سالوں میں یہ کام نہیں کر سکے تو اب ہمیں مذاکرات کے ذریعہ معاملہ کو حل کرنے کی کوشش کری چاہئے بھارت کے سیکرٹری خارجہ نے مذاکرات کے دوران کشمیر کے بارے میں اپنے مئوقف کی وضاحت کرتے ہوئے پاکستان پر بعض الزامات بھی عائد کئے اور کہا کہ کشمیر کے بارے میں ہمیں اپنے اختلافات کو دلائل کے ذریعہ دور کرنا چاہئے۔

بھارت کے سیکرٹری خارجہ کے بعد پاکستان کے سیکرٹری خارجہ شہر یار خان نے مسئلہ کشمیر کے بارے میں پاکستان کا مئوقف بڑی تفصیل سے پیش کیا۔ سیکرٹری خارجہ شہر یار خان نے ان مذاکرات کے دوران کہا کہ:

''مسئلہ کشمیر پر پاک بھارت مذاکرات کو نتیجہ خیز بنانے کیلئے ضروری ہے کہ مذاکرات کیلئے سازگار ماحول پیدا کیا جائے اور مذاکرات کیلئے ماحول کو سازگار بنانے کی ذمہ داری بھارت پر عائد ہوتی ہے۔'' پاکستان کی مذاکراتی ٹیم کے سربراہ نے کہا کہ بلاشبہ ہمیں مسئلہ کشمیر پر مذاکرات کیلئے بھارت کی رضامندی پر خوشی ہوئی ہے مگر ایسے ماحول میں جبکہ مقبوضہ کشمیر سے جبر و تشدد کی اطلاعات آ رہی ہیں۔ انسانی حقوق کی پامالی کی باتیں ہر طرف کی جارہی ہیں مسئلہ کشمیر پر ایک دوسرے کی بات کو سمجھنے کا ماحول بالکل ہمارے سامنے نہیں ہے۔ ہم ایک دوسرے کی بات کو سمجھنے کا ماحول بالکل ہمارے سامنے نہیں ہے۔ ہم ایک دوسرے کی بات کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ مذاکرات کے سابقہ چھ ادوار میں ہم ایک دوسرے کا مئوقف سنتے رہے ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ بھارت کشمیر میں جبر و تشدد بند کرے مقبوضہ کشمیر میں اپنی افواج کی تعداد کم کرے اور کشمیری لیڈروں کی رہائی جیسے اقدامات کے ذریعہ دوطرفہ مذاکرات کو نتیجہ خیز بنانے کیلئے ماحول کو سازگار کرے۔

بھارت نے اقوام متحدہ میں انسانی حقوق کی قرارداد کی واپسی سے پہلے یہ وعدہ کیا تھا' کہ پاک بھارت مذاکرات کے ساتویں دور سے پہلے مذاکرات کیلئے ماحول سازگار بنانے کیلئے مقبوضہ کشمیر میں اہم نظر آنے والے اقدامات عمل میں لائے جائیں گے' مگر ہم اس وعدہ پر عملدرآمد کے منتظر ہیں ہم مسئلہ کشمیر کو تمام مسائل کی بنیاد سمجھتے ہیں۔ مسئلہ کشمیر کو حل کئے بغیر نہ ہی دیگر متنازعہ مسائل پر نتیجہ خیز بات چیت ہو سکتی ہے اور نہ ہی علاقائی امن کے مستقبل کو یقینی بنایا جا سکتا ہے پاکستان علاقے کی سلامتی کو درپیش مستقل اور بنیادی مسئلہ کو مذاکرات کی میز پر بیٹھ کر پرامن انداز میں حل کرنا چاہتا ہے تاہم مذاکرات کیلئے ماحول سازگار بنانے کیلئے کشمیر میں فیصلہ کن اقدامات عمل میں لانے کے حوالے سے ''گیند بھارت کی کورٹ میں ہے۔'' (دی مسلم اسلام آباد 3 جنوری 1994ء)

خارجہ سیکرٹریوں کے درمیان مسئلہ کشمیر پر مذاکرات کا پہلا دور ایک گھنٹہ پینتیس منٹ جاری رہا مذاکرات کے اس دور میں دونوں ممالک کے خارجہ سیکرٹریوں نے گزشتہ چند دنوں کے دوران اہم امور پر بات بھارت اور پاکستان کے بعض لیڈروں کے بیانات کے پس منظر کی وضاحت کی' اور ایک دوسرے کو مسئلہ کشمیر کے حل کے بارے میں اپنے اپنے

Marfat.com

ملک کے مؤقف سے آگاہ کیا' مذاکرات کے پہلے دور کے بارے میں پاکستان کی مذاکراتی ٹیم کے ایک رکن سے ایک صحافی نے پوچھا کہ کیا اس دور کو مثبت قرار دیا جائے یا منفی تو انہوں نے کہا کہ مذاکرات کے پہلے دور ہی کو مثبت یا منفی قرار دینا درست نہیں ہوگا۔ مذاکرات کے اس دور کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مذاکرات کا پہلا دور ہوا ہے اور اس میں دونوں ملکوں نے مسئلہ کشمیر کے حل کے بارے میں اپنی اپنی پوزیشن واضح کی ہے۔ مذاکرات کے پہلے دور کے بارے میں ایک بھارتی سفارت کار نے کہا کہ اس دور میں کشمیر کے بارے میں ایک دوسرے کے مؤقف کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

2 جنوری کو شام کی اردو نشریات میں بی بی سی نے ان مذاکرات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

''مذاکرات کے حوالے سے جو صورت حال سامنے آئی ہے اسے دیکھتے ہوئے اس دو روزہ بات چیت سے زیادہ امیدیں وابستہ نہیں کی جاسکتیں۔ دونوں ممالک کی جانب سے اب تک ایسا کوئی اشارہ نہیں ملا جس سے یہ محسوس ہو کہ انہوں نے اپنے مؤقف میں کوئی لچک دکھائی ہو لہٰذا اگر اس دور کے بعد دونوں فریق دوطرفہ بات چیت کا سلسلہ جاری رکھنے پر رضامند رہتے ہیں تو یہ بھی ایک بڑی کامیابی ہوگی۔''

پاک بھارت مذاکرات کے دوسرے باقاعدہ دور میں 2 جنوری کی شام بھارت کے سیکرٹری خارجہ جے این ڈکشٹ نے مسئلہ کشمیر اور دیگر متنازعہ مسائل کو مرحلہ وار حل کرنے کیلئے تمام مسائل کے متعلقہ پہلوؤں پر الگ الگ غور کرنے کی تجویز ایک مرتبہ پھر پیش کر دی۔ بھارتی سیکرٹری خارجہ نے پاکستان کے سیکرٹری خارجہ کو مقبوضہ کشمیر میں فوری طور پر وہ اقدامات عمل میں لانے کے بھارتی فیصلے سے آگاہ کیا جن کا وعدہ بھارت کے وزیر خارجہ دینش سنگھ نے پاکستان کے وزیر خارجہ سردار آصف احمد علی کے ساتھ کیا تھا۔ ذرائع نے بتایا کہ بھارت کے سیکرٹری خارجہ نے مذاکرات کے دوران اس مؤقف کا اظہار کیا کہ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ تمام مسائل باہم مربوط ہیں اگر سیاچن کے معاملہ پر بات چیت کے ذریعہ متعلقہ معاہدہ کو حتمی شکل دیدی جائے تو اس طرح دیگر مسائل کو حل کرنے میں مدد ملے گی۔ مذاکرات کے دوسرے دور میں مسائل کو مرحلہ وار حل کرنے سے متعلق بھارتی تجاویز پر پاکستان کے سیکرٹری خارجہ نے اس مؤقف کا اظہار کیا کہ متنازعہ مسائل کو مرحلہ وار حل کرنے کی تھیوری عملاً ناکام ہو چکی ہے۔ پاکستان اور بھارت کے خارجہ سیکرٹریوں کے درمیان مذاکرات کے گزشتہ چھ ادوار میں متنازعہ مسائل کو مرحلہ وار حل کرنے کا کوئی دیگر مرحلہ کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔ پاکستانی وفد نے بھارتی وفد کو یاد دلایا کہ 1989ء میں پاکستان اور بھارت سیاچن پر معاہدہ کے قریب پہنچ گئے تھے مگر اس وقت کشمیر سے متعلقہ مصلحتیں بھارت کے آڑے آ گئیں اور معاہدہ نہ ہو سکا۔ اگر دیگر مسائل پر بھی مرحلہ وار اپروچ اپنائی گئی اور مسئلہ کشمیر کو مکمل طور پر حل کرنے کی کوشش نہ کی گئی تو مرحلہ وار کوششیں سیاچن معاہدہ کی طرح ناکام رہیں گی۔

(ڈان۔4 جنوری 1994ء)

مذاکرات کے دوسرے روز یعنی 2 جنوری کو شام کراچی میں بھارتی وفد نے پاکستان کی وزیر اعظم بے نظیر بھٹو سے بھی ملاقات کی۔ وزیر اعظم نے بھارتی وفد کے سامنے اپنا اصولی مؤقف پیش کیا اور کہا:

''وہ کشمیر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں بند کریں۔'' (ایضاً)

Marfat.com

جے این ڈکشٹ نے بھارتی وزیر اعظم نرسیماراؤ کی نیک خواہشات پاکستانی وزیر اعظم تک پہنچائیں اور کہا کہ وہ توقع رکھتے ہیں کہ مذاکرات کے مثبت نتائج نکلیں گے۔

بھارتی وفد کی بدنیتی اور وقت ضائع کرو پالیسی کی وجہ سے یہ مذاکرات بھی ناکام ہو گئے۔ دونوں ممالک نے تسلیم کیا کہ مذاکرات کے خاتمے پر ان کی پوزیشن اور مؤقف میں رتی بھر تبدیلی یا لچک نہیں آئی ہے۔ مذاکرات کے بعد جاری کئے گئے مشترکہ اعلامیہ میں بھی یہ تسلیم کیا گیا:

''دونوں ممالک کے درمیان اصل اور بنیادی تنازعہ حل کرنے میں کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی۔''

(ڈان۔ کراچی 4 جنوری 1994ء)

بھارتی وفد کا دعویٰ تھا کہ اقوام متحدہ کی قراردادیں غیر متعلق ہو چکی ہیں۔ اقوام متحدہ کی قراردادوں کے حوالے سے ایک سوال پر بھارتی وفد کے سربراہ ڈکشٹ نے ایک اخبار نویس کو انتہائی درشت لہجہ میں جواب دیا کہ ''آپ کا سوال غیر متعلقہ اور نامناسب ہے۔''

پاکستانی وفد نے آئندہ مذاکرات کیلئے اپنی پانچ شرائط پیش کیں۔

☆ مقبوضہ کشمیر سے بھارتی فوج واپس بلائی جائے۔

☆ درگاہ حضرت بل کا محاصرہ ختم کر کے اسے عبادت کیلئے کھولا جائے۔

☆ مقبوضہ کشمیر میں انسانی حقوق کی صورت حال کو بہتر بنایا جائے۔

☆ نظر بند کشمیری رہنماؤں کو فوری طور پر رہا کیا جائے۔

☆ کشمیر میں ذرائع ابلاغ' بین الاقوامی اداروں کے نمائندوں اور سفارت کاروں کو جانے کی اجازت دی جائے۔

مذاکرات کے آغاز سے پہلے پاکستانی صدر' وزیر اعظم اور وزیر خارجہ کھلے عام یہ کہہ چکے تھے کہ ہمیں ان مذاکرات سے کسی فیصلہ کن پیش رفت کی توقع نہیں ہے لیکن اس کے باوجود مذاکرات کا راستہ اس لئے اختیار کیا گیا کہ بقول وزیر خارجہ آصف احمد علی ''دوستوں'' کے کہنے پر یہ مذاکرات کر رہے ہیں۔ ان مذاکرات پر پاکستان اور بھارت میں ملا جلا ردعمل سامنے آیا۔ دونوں ممالک کے سیاستدانوں اور دانشوروں کے تجزیوں کے ساتھ ساتھ عالمی ذرائع ابلاغ نے بھی بڑے دلچسپ اور چبھتے ہوئے تبصرے کئے۔

بی بی سی نے اپنی ایک رپورٹ میں دعویٰ کیا:

''یہ مذاکرات چین کی وجہ سے ناکام ہوئے ہیں چین نے دونوں ملکوں میں اعلیٰ سطحی وفود بھیجے تھے اور خیال ہے کہ ان وفود نے کشمیر سے متعلق چین کے مؤقف سے دونوں ملکوں کو آگاہ کیا کشمیر کے متعلق چین کی تشویش یہ ہے کہ امریکہ اس کے حل کی تلاش میں اتنا سرگرم کیوں ہے غالباً امریکہ کی جانب سے یہ تجویز کیا گیا تھا کہ ریاست کو مکمل آزادی یا محدود خود مختاری دی جائے۔ چین کا خیال ہے کہ کشمیر کی خود مختاری میں اس کے سیاسی مفادات کو نقصان پہنچ سکتا ہے مثلاً تبت اور چین کے مغربی علاقے (سنکیانگ) میں کشیدگی بڑھ سکتی ہے کیونکہ اس مغربی سرحدی صوبے میں بھی اسلامی تحریک کے آثار ملتے ہیں اور پھر امریکی کوششوں سے آزاد ہونے والے کشمیر میں امریکی اثر بھی زیادہ ہوگا۔''

Marfat.com

(بحوالہ اداریہ نوائے وقت 4 جنوری 1994ء)

ان مذاکرات کے خاتمے پر امریکی ترجمان مائیکل کیمن نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

"دونوں ملکوں کو حساس مسائل کا سامنا ہے' مشکلات حائل ہیں اور مشکل فیصلے کرنا اور ٹھوس اقدامات کرنے ہوں گے جو کہ دونوں ملکوں میں سے کسی کیلئے بھی آسان نہیں۔" (روزنامہ جنگ۔لاہور 5 جنوری 1994ء)

اسلام آباد میں امریکی سفارتکار پاک بھارت مذاکرات کے بارے میں تبصرہ کرنے سے گریز کرتے ہوئے اس مؤقف کا اظہار کرتے رہے کہ امریکہ کا تبصرہ امریکی محکمہ خارجہ سے آئے گا تاہم ایک سفارتکار نے کہا کہ امریکہ بھارت کے اس مؤقف سے متفق نہیں ہے کہ مسئلہ کشمیر کے حل کے سلسلے میں اقوام متحدہ کی قراردادیں غیر متعلق ہو چکی ہیں۔ امریکہ کی نظر میں اقوام متحدہ کی ان قراردادوں کے مطابق شملہ معاہدہ کے تحت مذاکرات کے ذریعہ تلاش کرنے کی کوشش کی جانی چاہئے۔"

بھارت کے معروف صحافی کلدیپ نیر نے کہا:

"پاکستان اور بھارت کے خارجہ سیکرٹریوں کے حالیہ مذاکرات کو ناکام نہیں کہا جا سکتا ان کے مشترکہ بیان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کچھ نہ کچھ ہوا ہے جو ابھی ظاہر نہیں ہوا۔ بھارتی عوام اب یہ چاہتے ہیں کہ کشمیر کا کوئی نہ کوئی فیصلہ کیا جائے لیکن اس سے زیادہ اس کے ساتھ آپس کے تعلقات کے بارے میں بھی سوچا جائے مجھے چالیس برس لکھتے ہوئے ہو گئے ہیں اور میں نے بہت برسوں کے بعد یہ نظارہ دیکھا ہے اور پہلے ایسی فضا کبھی نہیں دیکھی۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ راولپنڈی 5 جنوری 1994ء)

یہ کہا جا رہا ہے کہ بات چیت کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے لیکن ایسا ابھی لگتا نہیں ہے کیونکہ دونوں ملکوں کا کہنا ہے کہ وہ ابھی آپس میں کچھ دستاویزات کا تبادلہ کریں گے اور بھارتی خارجہ سیکرٹری نے تو یہ بھی کہا ہے کہ انہوں نے ابھی کچھ تجاویز سیاچن گلیشر کے بارے میں بھی بھیجی ہیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو پھر بھارت میں پاکستان سے بات چیت کیلئے دباؤ بڑھ جائے گا۔ ایک سوال پر کلدیپ نیر نے کہا کہ پاکستان کے سیکرٹری خارجہ شہر یار خان کی جانب سے یہ مطالبہ کرنا کہ بھارت مذاکرات سے پہلے مقبوضہ کشمیر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں بند کرے اور حالات کو معمول پر لائے ایک بہت بڑی بات ہے اور اگر یہ ہو جائے تو پاکستان کو اس پر کافی تسلی ہو گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب بھارت کی ذمہ داری ہے کہ کشمیر میں انسانی حقوق کے بارے میں سنجیدہ ہو کیونکہ اس پر یہی ایک بڑا دباؤ ہے۔" (ایضا)

روزنامہ جنگ نے مذاکرات کے حوالے سے لکھا:

"کشمیری حریت پسند تنظیمیں پاک بھارت خارجہ سیکرٹریوں کی سطح کے مذاکرات کی ناکامی پر خوش ہوئی ہیں درحقیقت پاکستانی عوام ان مذاکرات سے پر امید نہیں تھے۔ کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مسئلہ کشمیر پر مذاکرات کیلئے امریکہ کی طرف سے بھارت اور پاکستان پر دباؤ تھا اور دونوں ملک ازخود ان مذاکرات کیلئے تیار نہیں تھے لیکن دونوں راضی ہو گئے جس کے بعد امید یہی تھی کہ بات آگے نہیں بڑھے گی اور یہی ہوا کہ کوئی بات آگے نہیں بڑھ سکتی۔" (5 جنوری 1994ء)

صدر پاکستان فاروق احمد خان لغاری نے کراچی میں اخبار نویسوں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا:

Marfat.com

''گو کہ بات چیت حسب توقع کامیاب نہیں ہوئی لیکن اس لحاظ سے قدم آگے کی طرف بڑھے ہیں کہ بھارت پہلی بار کشمیر پر ایجنڈے کے علیحدہ آئٹم کے طور پر مذاکرات پر آمادہ ہوا ہے۔درحقیقت یہ پاکستان کی بڑی کامیابی ہے۔''

(نوائے وقت کراچی 21 جنوری 1994ء)

پاکستان میں سیاسی اور عوامی سطح پر مذاکرات کے بارے میں سخت مخالفانہ ردعمل سامنے آیا۔مختلف سیاسی جماعتوں کے زیر اہتمام مذاکرات کے خلاف احتجاجی مظاہرے ہوئے جن میں مطالبہ کیا گیا کہ کشمیری عوام پر بھارتی مظالم بند ہونے تک مذاکرات نہ کئے جائیں۔

مقبوضہ کشمیر کی تیس سے زیادہ سیاسی' مذہبی اور سماجی جماعتوں پر مشتمل سیاسی اتحاد آل پارٹیز حریت کانفرنس نے بھی ان مذاکرات پر اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا:''جب تک بھارت حالات کی بہتری کیلئے واضح اقدامات نہیں کرے گا کشمیریوں کی رائے عامہ یہ اجازت نہیں دے گی کہ کسی نوعیت کی گفت وشنید ہو۔حریت کانفرنس نے مطالبہ کیا:

☆ مذاکرات میں کشمیریوں کے نمائندوں کو بھی شامل کیا جائے

☆ مذاکرات کا بنیادی مقصد اقوام متحدہ کی قراردادوں یا کسی غیر جانبدار فورم کے ذریعے مسئلہ کو حل کرنا ہو''۔

(روزنامہ دی مسلم اسلام آباد یکم جنوری 1994ء)

ان مذاکرات میں مسئلہ کشمیر کے حل کے سلسلے میں کوئی قابل ذکر پیش رفت نہیں ہو سکی' پاکستان کے ساتھ بھارت نے وعدہ کیا تھا کہ کشمیر میں حالات کو نارمل کرے گا مگر نہ تو سیاسی قیدیوں کو رہا کیا گیا اور نہ فوجی آپریشن میں کمی کی گئی بلکہ ان مذاکرات کے دوران سوپور پر بہت بڑا حملہ کیا گیا۔کنٹرول لائن پر مسلسل فائرنگ کی جاتی رہی۔دراصل بھارت مذاکرات کو حسب معمول عالمی دباؤ ختم کرنے اور وقت حاصل کرنے کیلئے کر رہا تھا اس لئے ان مذاکرات کے کوئی نتائج برآمد نہیں ہوئے اور پہلے سے موجود مایوسی میں اضافہ ہونے لگا۔خارجہ سیکرٹریوں کی سطح پر مذاکرات کی ناکامی سے ایک بات تو صاف ظاہر تھی کہ بھارتی حکومت اپنے طے شدہ ایجنڈے پر کام کر رہی ہے اور وہ کشمیر کو اپنا ''اٹوٹ انگ'' بنانے پر تل گئی ہے۔بھارت نے ان مذاکرات کی ناکامی کا الزام بھی پاکستان پر عائد کر دیا۔

مقبوضہ کشمیر میں جہادی سرگرمیاں بھارت کیلئے مستقل دردسر بن چکی تھیں آئے روز بھارتی افواج کی مجاہدین کے ہاتھوں ہزیمت کی خبروں نے بھارتی فوج کا مورال ڈاؤن کر دیا تھا۔افسر اور جوان چھٹیاں لے کر اور چھٹیاں نہ ملنے پر ''مفرور'' ہو کر فوج سے جان چھڑا رہے تھے۔اس مرحلے پر بھارتی حکومت نے ایک اور چانکیائی چال چلی جولائی 1995ء میں بھارتی منسٹر بھونیش ترویدی نے ایک بیان میں کشمیری مجاہدین کی تمام جماعتوں کو غیر مشروط مذاکرات کی پیشکش کر دی جبکہ اس سے پہلے بھارتی حکومت کا یہ اصرار تھا کہ مجاہدین پہلے ہتھیار ڈالیں پھر مذاکرات ہوں گے۔یہ چال بھارتی حکومت نے مجاہدین میں انتشار ڈالنے کیلئے چلی تھی جس میں بہر حال اسے کامیابی حاصل ہوئی گو کہ وہ کوئی قابل ذکر کامیابی نہیں تھی لیکن بھارت مجاہدین کی سیسہ پلائی دیوار میں چھوٹا سا سوراخ کرنے میں ضرور کامیاب ہو گیا اور ''کوکہ پرے'' نام کے ایک باغی گروپ نے جنم لے لیا جو بھارتی فوج کی آشیرواد سے مجاہدین کے خلاف لڑائی کرنے لگا۔بھارت کی اس پیشکش پر مسلم جانباز فورس' البرق' مسلم مجاہدین اور حزب المجاہدین کے ایک گروپ نے بات چیت پر آمادگی ظاہر

Marfat.com

کردی۔اس صورت حال پر بھارتی ہفت روزہ نشیمن نے ایک شذرہ لکھا جس سے بھارتی حکومت کی اس دور کی کیفیات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ملاحظہ فرمائیں جریدہ لکھتا ہے:

''جب سے کشمیر کی چار شدت پسند تنظیموں مسلم جانباز فورس، البرق، مسلم مجاہدین، حزب المجاہدین کے سابق کمانڈروں یعنی بابر بدر، بلال لودھی، عمران راہی اور غلام محی الدین نے حکومت ہند کو مسئلہ کشمیر پر مشروط بات چیت کی پیشکش کی ہے دہلی اور جموں وکشمیر میں ایک ہلچل سی مچ گئی ہے اور اس پیشکش نے پورے معاملے ہی کو پلٹ کر رکھ دیا ہے خود پاکستان میں اس بات پر حیرانی ہے کہ یہ سب کیسے ہوگیا کیونکہ آئی ایس آئی اور پاکستان پردے ہی سے غائب ہو گئے ہیں۔ چنانچہ پہلے یہ خبر آئی کہ آئی ایس آئی نے اپنے تمام ایجنٹوں کو پیغام دیا ہے کہ اول فرصت میں ان لوگوں کو ختم کر دیا جائے۔ پھر بتایا کہ حزب المجاہدین کے سربراہ نے ان چاروں لیڈروں کو حکم دیا ہے کہ وہ فوراً صفائی پیش کرنے کے لیے حاضر ہوں۔ آل پارٹی حریت کانفرنس کی طرف سے بیان دیا گیا ہے کہ بات چیت کی پیشکش وغیرہ میں ان کا کوئی ہاتھ نہیں۔ان چار لیڈروں نے جو پیشکش کی ہے وہ کشمیری عوام کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کے مترادف ہے۔حکومت ہند کو اس بات پر خوشی تو ہے کہ بات چیت کی پیشکش دوسری جانب سے آئی ہے لیکن وہ چاہتی ہے کہ شدت پسند تنظیمیں اپنی کارروائی بند کریں۔اس کے بعد ایجنڈا طے ہو لیکن پیشکش کرنے والوں کی مشکل یہ ہے کہ وہ دوسروں کو کارروائی بند کرنے کیلئے کہہ نہیں سکتے۔ کیونکہ وہ اور ان کے ساتھی اکیلے ہیں۔کہا جاتا ہے کہ ان لیڈروں نے بات چیت کی پیشکش اس لئے کی کیونکہ وہ امن چاہتے ہیں۔خون خرابے اور تباہی وبربادی سے تنگ آ گئے ہیں۔ ہندوستانی فوج کا گھیرا تنگ ہونے کی وجہ سے اور کارروائی بند ہونے کی وجہ سے کارروائی مشکل ہوگئی ہے۔اب تک دس ہزار سے زیادہ نوجوان ہلاک ہو چکے ہیں' کئی ہزار جیلوں میں بند ہیں کئی ہزار لاپتہ ہیں اور ریاست کی اقتصادی حالت تباہ ہو چکی ہے۔ ہر طرف ویرانی اور حیرانی چھائی ہوئی ہے لوگوں کی غربت' بھوک اور بے روزگاری دیکھی نہیں جاسکتی اور یہ بات صاف نظر آ رہی ہے کہ پاکستان یا عالمی برادری ان کیلئے کچھ نہیں کر رہی ہے۔لہٰذا وہ خود اس معاملے میں پہل کرنا چاہتے ہیں اور یہ امید رکھتے ہیں کہ حکومت ہند اس معاملے کو آگے بڑھائے گی اور ابتداء میں فوجی کارروائی بند کردے گی اس کے بعد یہ لیڈر عوام کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔شبیر شاہ' یسٰین ملک اور اعظم انقلابی نے بات چیت کی پیشکش کی حمایت ضرور کی ہے اور چاہتے ہیں کہ بات آگے بڑھے اور کچھ ضرور ہو۔اسی لئے کہ تحریک ان لیڈروں کے ہاتھوں سے نکل کر دوسروں کے ہاتھوں میں چلی جانے والی ہے۔ چنانچہ حریت کانفرنس والوں نے حکومت ہند کو خبردار کیا ہے کہ وہ جذباتی لوگوں کی باتوں میں نہ آئیں اور کوئی ایسی حرکت نہ کریں جس سے آگے چل کر کشمیر دوسرا افغانستان نہ بن جائے۔حکومت ہند کیلئے بہتر یہی ہے کہ وہ سنجیدہ عوام کی حمایت رکھنے والے اور تجربہ کار لیڈروں سے رابطہ رکھے اور یہ مت سمجھے کہ چند لوگوں کے بیان سے حالات بدل جائیں گے۔خود حکومت ہند بھی کوئی فیصلہ نہیں کر پارہی ہے کہ کیا کرے۔حالانکہ وہ کہتی رہی ہے کہ کشمیر میں حالات الیکشن کیلئے سازگار ہیں مگر سوال یہ ہے کہ الیکشن لوک سبھا کے الیکشن کے ساتھ ہو یا اس سے پہلے اسمبلی کا الیکشن پہلے ہو یا لوک سبھا کا۔حکومت کو جو سرکاری رپورٹیں ملی ہیں ان میں بتایا گیا ہے کہ کشمیر میں الیکشن کسی بھی وقت ہو مگر وہ پرامن اور آسان نہیں ہوگا۔حالات قابو سے باہر بھی ہو سکتے ہیں اور معاملہ بگڑ بھی سکتا ہے لہٰذا سیاسی طور پر کوئی فارمولہ کشمیری لیڈروں کے ساتھ

Marfat.com

بات چیت کے بعد طے کر کے الیکشن کرایا جائے۔اب دیکھنا یہ ہے کہ کشمیر کا یہ اُونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔

(ہفت روزہ نشیمن بنگلور۔25 فروری 1996ء)

بھارت نے مجاہدین کو غیر مشروط مذاکرات کی پیشکش کیوں کی تھی؟اس جریدے نے اپنے اسی شمارے میں اس حوالے سے بی بی سی کے ایک تجزیے کو رپورٹ کیا ہے۔اخبار لکھتا ہے۔

''بی بی سی نے آرمی میڈیکل کور کے حوالے سے یہ سنسنی خیز خبر نشر کی ہے کہ ہندوستانی فوج کے 18 تا 20 اعلیٰ عہدہ دار جو لیفٹیننٹ جنرل اور میجر جنرل ہیں اور ہندوستان کے مختلف علاقوں میں فوج کی کمان کر رہے ہیں وہ دل کے کئی قسم کے امراض میں مبتلا ہیں۔آرمی میڈیکل کور نے جو رپورٹ فوجی ہیڈکوارٹر کو روانہ کی ہے اس میں بتایا ہے کہ 7 لیفٹیننٹ جنرل' 11 میجر جنرل دل کے مریض ہیں۔بریگیڈئر سے اوپر کے 62 عہدیداروں کو بھی دل کا مرض ہے کئی ایک کو ہارٹ اٹیک ہو چکا ہے یا جنہوں نے بائی پاس سرجری کرائی ہوئی ہے بہت سے افسروں نے اپنے مرض کو خفیہ رکھا ہے۔فوج میں امراض قلب کی یہ وباء شراب نوشی اور تمباکو نوشی کی کثرت کی وجہ سے پھیلی ہوئی ہے۔سوال جو اٹھ کھڑا ہوا ہے اور بے حد تشویشناک بھی ہے وہ یہ کہ ان لوگوں نے دل کا مرض ہوتے ہوئے بھی ترقی کیسے پائی ان کے مرض کا اندراج ان کی پرسنل رپورٹ میں کیوں نہیں کیا گیا۔اس لئے کہ آرمی کا میڈیکل ٹیسٹ بے حد سخت ہوتا ہے اور انہیں لوگوں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کرنے کیلئے کلیئر کیا جاتا ہے جو ہر طرح کے مرض سے پاک ہوں۔جن کے دل و دماغ کی حالت بہت ہی اچھی ہو۔ہیڈ کوارٹر سے جب آرمی میڈیکل کور سے پوچھا گیا کہ اعلیٰ فوجی عہدیداروں سے میڈیکل کے محکمے والے یا تو ڈرتے ہیں یا ان کی گہری دوستی ہوتی ہے جس کے سبب وہ بہت سی باتیں چھپا دیتے ہیں اور اعلیٰ عہدوں کیلئے سفارش کر دیتے ہیں۔ایسے وقت جبکہ مشرقی ہندوستان کی پہاڑی ریاستوں سے لے کر آسام تک شمال میں نیفا سے لے کر اقصائے چین تک شمال مغرب میں کشمیر سے گجرات تک اور پاکستان کی سرحدوں پر خطرہ منڈلا رہا ہے تو ایسے فوجی جنرل جو دل کے مریض ہوں اور خود کو سنبھالنے میں لگے ہوں وہ محاذ کو کیسے سنبھالیں گے۔(ہفت روزہ نشیمن بنگلور۔25 فروری 1996ء)

بھارتی حکومت کو عالمی سطح پر زبردست سبکی کا سامنا تھا کیونکہ کافی عرصہ سے مقبوضہ کشمیر میں نام نہاد الیکشن نہیں ہو رہے تھے۔بھارتی حکومت نے اچانک مقبوضہ کشمیر میں انتخابات کا اعلان کر دیا جس کا مجاہدین تنظیموں کی طرف سے بہت شدت سے جواب دیا گیا۔اس صورت حال پر پندرہ روزہ ''جہاد کشمیر'' نے رپورٹ دی۔

''مقبوضہ ریاست کے انتخابات کے اعلان کے بعد سے بھارتی فوج کے نئے دستے وادی کشمیر اور جموں میں پہنچنے لگے ہیں۔یوں لگتا ہے قابض حکمران ہر کشمیری کے سر پر ایک فوجی کو کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ریاست کے گورنر کا کہنا ہے کہ اب کشمیر میں ان کی اجازت کے بغیر کوئی پتہ بھی نہیں ہلے گا،مگر مجاہدین نے بیلٹ کا جواب ایک بار پھر بلٹ سے دینے کا فیصلہ کیا ہے۔مجاہدین نے گزشتہ پندرہ دنوں میں بھارتی فوج پر درجنوں کامیاب حملے کئے' جن میں اعلیٰ افسروں کے ساتھ فوجیوں کی بڑی تعداد بھی ہلاک ہوگئی۔ذبحن شوپیاں کے بلند و بالا پہاڑوں میں حزب مجاہدین کے جانبازوں اور فوج کے ساتھ یکم اگست کو خونریز معرکہ آرائی ہوئی۔یہ لڑائی فجر کے وقت سے شام تک جاری رہی اور عالمی ذرائع ابلاغ میں اس کا

Marfat.com

بہت چرچا ہوا۔ جنوبی کشمیر کے اس علاقے میں مشہور سیر گاہیں ہیں۔ اس پرفضا علاقے سے دس کلومیٹر دور مغرب کی طرف واقع ایک بڑا چشمہ بہت مشہور ہے' لوگ دور دور سے آ کر اس میں نہاتے ہیں کہا جاتا ہے اس کے پانی میں نہانے سے خارش اور خشکی دور ہوتی ہے۔ پہاڑوں کے دامن میں ہرے پورہ کا علاقہ ہے جہاں بہت بڑا آرمی کیمپ ہے۔ تاریخی مغل روڈ یہاں سے ہی گزرتی ہے۔ ہرے پورہ تک سڑک پختہ ہے اس کے بعد بلند و بالا پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ مجاہدین آجکل بستیوں کے بجائے پہاڑوں میں ہی رہتے ہیں۔ حزب کے شاہین ان ہی پہاڑوں کی بلندی پر قیام پذیر تھے۔ قابض بھارتی فوج کو ان کی موجودگی کا پتہ چل گیا تو ہزاروں فوجیوں نے اس علاقے کا گھیراؤ کیا۔ بھارتی فوج کو اطلاع ملی تھی کہ سینکڑوں کی تعداد میں مجاہدین موجود ہیں' اس لئے وہ بھاری تیاریوں سے آئے تھے۔ مجاہدین کیلئے چاروں طرف سے امڈتے ہوئے لشکر سے بچ نکلنا ممکن نہ رہا تو انہوں نے مقابلے کی تیاری کر لی۔ چونکہ ان کی کمین گاہ ہموار زمین پر تھی اس لئے مقابلہ کرنے کیلئے بلندی پر مورچہ بنا لیا گیا۔ زبردست معرکہ ہوا۔ طویل اور مسلسل جنگ میں دس فوجی ہلاک ہوئے۔ بی بی سی نے اپنے نمائندے کے حوالے سے بتایا کہ اس کارروائی میں سترہ فوجی مارے گئے' مگر حزب کے ذرائع نے دس کی تصدیق کی۔ چار جانباز مجاہد شہید ہوئے۔ یہ بٹالین ایڈمنسٹریٹر فاروق احمد عرف سیف اللہ منظور احمد عرف ضیاء الرحمان' مشتاق احمد عرف فاروق احمد اور محمد شفیق گنائی عرف عبدالباسط تھے۔ بکریاں چرانے اور گھاس کاٹنے والے تین عام شہری مشتاق احمد چک' محمد صادق اور بشیر احمد گنائی بھی فوج کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ لوگوں کی بڑی تعداد نے جانبازوں کے جنازے میں شرکت کی اور انہیں اپنے آبائی علاقوں میں سپرد خاک کیا گیا۔

اسی طرح اڑی کے سرحدی علاقے میں 24 جولائی کو قابض فوج کو مجاہدین کے ہاتھوں شدید دھچکا لگا۔ یہ مقام جنگ بندی لائن کے بالکل قریب ہے۔ 1990ء سے پہلے بھی یہاں فوج کی بڑی بڑی چھاؤنیاں تھیں اب تو قابض فوج کی تعداد میں بے پناہ اضافہ ہو چکا ہے۔ فوج مقامی آبادی سے کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ عسکری لحاظ سے اہمیت کا حامل درہ حاجی پیر اسی علاقے میں واقع ہے۔ مجاہدین نے یہاں بھارتی فوج کے ایک کیمپ کو راکٹ حملے کا نشانہ بنایا جس کے نتیجے میں میجر شنکر دت سمیت سات فوجی ہلاک ہو گئے۔ شنکر دت کی ہلاکت کی خبر مقامی اخبارات میں 28 جولائی کو جلی حروف میں شائع ہوئی ہے اور بین الاقوامی ذرائع خصوصاً ''وائس آف امریکہ'' نے بھی اسے نشر کیا۔ اڑی جیسے علاقے میں جہاں ہر مربع میٹر میں فوجی موجود ہیں' مجاہدین نے یہ کارنامہ انجام دے کر ناممکن کو ممکن بنا دیا ہے۔

3 اگست کو ڈولی پورہ ترہ گام میں بھی مجاہدین اور فوج کے درمیان زبردست مڈبھیڑ ہوئی۔ یہاں بھی حزب المجاہدین کی ایک کمین گاہ پر فوج نے چھاپہ مارنے کی کوشش کی تھی۔ ڈولی پورہ کا علاقہ پہاڑ اور در و دیوار کے اونچے اونچے درختوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ یہاں پہاڑ کی ترائی کے ہموار علاقے میں مجاہدین کے ٹھکانے ہیں۔ بھارتی فوج نے اچانک حملہ کر کے حزب کے شاہینوں کے آشیانے کو تباہ کرنے اور وہاں موجود مٹھی بھر مجاہدین کو پکڑنے کی کوشش کی۔ اپنی تنظیمی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے مجاہدین نے جوابی کارروائی کی۔ گھمسان کے مقابلے میں میجر تیواڑی سمیت سات فوجی ہلاک ہوئے۔ حزب کے چار مجاہد داد شجاعت دیتے ہوئے شہید ہو گئے۔ اسی طرح جموں میں اکھنور کے مقام پر جونیئر کمیشنڈ افسر سمیت چھ فوجیوں کو مجاہدین نے موت کے گھاٹ اتارا۔ مجاہدین کی کامیاب کارروائیوں کے یہ محض چند نمونے ہیں۔

Marfat.com

رنہ کارروائیاں ہر روز مقامات پر ہوتی ہیں۔ مجاہدین نے اپنی کارروائیاں تیز کر کے بھارتی حکومت' کشمیر کی کٹھ پتلی انتظامیہ اور خود بھارتی فوج کو یہ پیغام دیا ہے کہ نام نہاد انتخابات تحریک آزادی کو نہیں روک سکتے۔ جب سے ریموٹ کنٹرول کے ذریعے بارودی سرنگوں کا استعمال شروع کیا گیا ہے' بھارتی فوجیوں کی ہلاکتوں میں اضافہ ہوا ہے۔ بھارتی وزیر اعظم دیوگوڑا نے پارلیمنٹ میں دو اگست کو کشمیر پر بیان دیتے ہوئے اعتراف کیا کہ مجاہدین کی کاروائیاں تیز ہوگئی ہیں اور کشمیر کی صورت حال تشویشناک ہے۔ مجاہدین کی ان سرگرمیوں کے نتیجے میں بھارت نواز پارٹیاں انتخابات میں حصہ نہ لینے کا اعلان کر رہے ہیں۔

امریکی سفیر سری نگر میں:

بھارت میں امریکہ کے سفیر فرینک وزنر جنہوں نے اُن دنوں امریکی اداروں کی نقاب کشائی کر کے بڑی شہرت پائی تھی، یکم اگست کو سری نگر پہنچے۔ پاکستان کے دورے کے دوران ان کے بیانات نے کئی متنازعہ امور چھیڑے۔ کشمیر آئے تو یہ افواہ گرم ہوئی کہ وہ مسئلہ کشمیر کے حل کیلئے کوئی منصوبہ لے کر آئے ہیں۔ پاکستان میں موصوف نے کہا تھا کہ پاکستان کو کشمیر میں ہونے والے ریاستی انتخابات کی مخالفت نہیں کرنی چاہئے۔ مگر حریت پسند کشمیری عوام کا موڈ دیکھ کر امریکی سفیر کی زبان میں روانی دکھائی نہیں دی' انہوں نے الفاظ کا استعمال بہت محتاط انداز میں کیا۔ فرینک وزنر کو اس وقت سخت خفت اٹھانی پڑی جب کل جماعتی حریت کانفرس نے ان سے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا۔ کانفرنس کے قائدین نے انکار کی وجہ یہ بتائی کہ سفیر موصوف نے دورہ پاکستان کے دوران اسلام آباد میں حریت کانفرنس کے خلاف ڈس انفارمیشن مہم چلائی اور کہا حریت کانفرنس کے لیڈر بھارت کے ساتھ خفیہ مذاکرات کر رہے ہیں' جبکہ حرزیت کانفرنس کا واضح موقف ہے کہ بھارت کے ساتھ اس وقت تک کوئی بات چیت خفیہ یا اعلانیہ نہیں ہوسکتی جب تک وہ کشمیر کو متنازعہ علاقہ تسلیم نہیں کرتا۔ امریکی حکام اور سفیر وزنر کے متضاد بیانات کو بھی حریت کانفرنس نے تنقید کا نشانہ بنایا اور کہا کہ حریت کانفرنس کے منشور میں منافقت اور گومگو کی پالیسی کی کوئی گنجائش نہیں۔ اہل کشمیر کا موقف واضح ہے کہ رائے شماری کے ذریعے کشمیری عوام کی رائے معلوم کی جائے۔ اس کے علاوہ کسی ڈھونگ کو ہم تسلیم اور قبول نہیں کرتے۔ حریت کانفرنس نے سخت ناراضی کا اظہار کیا اور جناب شبیر احمد شاہ سے اس بارے میں استفسار کیا گیا۔ ان کے بجائے ان کے نمائندے نے وضاحت پیش کرتے ہوئے کہا...... دراصل جناب شبیر شاہ امریکی سفیر پر یہ واضح کرنا چاہتے تھے کہ جموں و کشمیر کے لوگوں نے حق خود ارادیت کیلئے 47ء سے آج تک لڑائی لڑی ہے۔ پچاس ہزار نوجوانوں کا نذرانہ پیش کیا اور اب الیکشن کا ڈھول بھارت نے یہاں بجا دیا ہے وہ اس مسئلے کا حل نہیں' یہاں زیادتی اور ظلم ہو رہے ہیں' جبکہ بھارت انتخابات کروا رہا ہے۔ یہ تو ہمارے زخموں پر نمک پاشی کے برابر ہے۔

جناب شبیر شاہ کہتے ہیں کہ انہوں نے امریکی سفیر سے کہا الیکشن مسئلہ کشمیر کا حل نہیں ہے۔ اگر الیکشن مسئلہ کشمیر کا حل ہوتے تو بھارت سرکار یہ عمل کئی بار دہرا چکی ہے۔ جناب شاہ کے ترجمان نعیم احمد خان نے ملاقات کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے کہا' پہلے سے طے شدہ ملاقات کو منسوخ کرنا بد اخلاقی ہوتی' تاہم شاہ صاحب نے یہ ملاقات کر کے افواہ سازوں کی پھیلائی ہوئی باتوں کو تقویت دی ہے کہ اندر ہی اندر کچھ معاملات چلائے جا رہے ہیں۔ دوسری طرف

Marfat.com

حریت کانفرنس نے اس ملاقات کو ڈسپلن کی خلاف ورزی قرار دیتے ہوئے شبیر شاہ کی رکنیت کو معطل کر دیا ہے اور شبیر شاہ سے وضاحت طلب کی ہے۔

مسٹر وزنر نے نامہ نگاروں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا' کشمیر میں اس وقت تک امن قائم نہیں ہو سکتا جب تک بھارت اور پاکستان کے درمیان مفاہمت نہ ہو اور کشمیری عوام کی خواہشات کو پیش نظر نہ رکھا جائے۔ انہوں نے کہا امریکہ کو اس بات پر خوشی ہوگی اگر بات چیت کے ذریعے یہ تنازعہ پرامن طور پر حل ہو جائے۔ امریکہ چاہتا ہے کہ خیر سگالی کے جذبے کے حامل تمام لوگ سیاسی عمل میں شامل ہوں' تاہم ریاستی اسمبلی کے مجوزہ انتخابات کے بارے میں مسٹر وزنر نے کھل کر کوئی بات نہیں کی' جس طرح اسلام آباد کے دورے کے دوران کی تھی۔ انتخابات کو انہوں نے بھارت کا اندرونی معاملہ قرار دیا اور بقول ان کے انتخابات کو سیاسی عمل میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

امریکی سفیر نے فاروق عبداللہ' گورنر راؤ اور دیگر عہدیداروں سے بھی ملاقات کی۔ فوجی افسروں اور پولیس اہلکاروں سے امریکی سفیر کی ملاقات پر بھارتی پارلیمنٹ میں ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ بھارتیہ جنتا پارٹی نے کہا افواج' پولیس اور شدت پسند رہنماؤں سے مسٹر وزنر کی ملاقاتوں سے لگ رہا ہے کہ ملک کی سلامتی کے بارے میں سمجھوتہ کیا جا رہا ہے' تاہم وزیر خارجہ اندر کمار گجرال نے کہا کہ امریکی سفیر نے دورہ کشمیر کے دوران کوئی غلط بات نہیں کی۔

بھارتی ٹاسک فورس میں ٹوٹ پھوٹ:

بھارت کی بغل بچہ عوامی لیگ (بھارتی ایجنٹوں کے سیاسی ونگ) کے چار سرکردہ افراد جاوید شاہ' میر نیازی' این کے تکو اور عبدالرشید مگر نے 30 جولائی کو سری نگر میں اخباری کانفرنس میں بتایا کہ آئندہ ان کی جماعت کسی الیکشن میں حصہ نہیں لے گی' کیونکہ بقول ان کے یہ نہ تو آزادانہ ہوں گے اور نہ منصفانہ۔ انہوں نے کہا کہ ریاست میں علیحدگی کی تحریک (آزادی کی تحریک) جاری ہے' قابض انتظامیہ کے افسر دولت جمع کرنے میں لگے ہوئے ہیں کیونکہ جواب دہی کا عمل نہ ہونے کے برابر ہے۔ جاوید شاہ پارلیمانی چناؤ میں عوامی لیگ کے امیدوار تھے مگر اس گروپ کے تینوں ارکان بری طرح سے شکست کھا گئے تھے۔ اسلام آباد میں ووٹنگ کے دوران ان کے پانچ افراد کو فوج نے ہلاک کر دیا تھا اور پارلیمانی چناؤ کے موقع پر دہلی سرکار نے ان کو جو سبز باغ دکھائے تھے وہ پورے نہیں ہوئے۔ ان ضمیر فروشوں کو احساس ہو رہا ہے کہ بھارت انہیں استعمال کرنے اور مقصد پورا کرنے کے بعد ٹشو پیپر کی طرح پھینک دے گا۔ ان کے اس فیصلے سے بھارت کے انتخابی منصوبے کو شدید دھچکہ لگا ہے کیونکہ نیشنل کانفرنس نے بھی ابھی چناؤ میں شرکت کرنے کا حتمی فیصلہ نہیں کیا۔

نیشنل کانفرنس کے سرکردہ لیڈر سیف الدین سوز' محمد شفیع آف اڑی اور عبدالرحیم راتھر نے واشگاف الفاظ میں کہا ہے کہ بھارت اندرونی خودمختاری دے یا نہ دے ہم الیکشن میں حصہ نہیں لیں گے۔ فاروق عبداللہ اس اعلان سے مشکل میں پھنس گیا ہے۔ بھارتی حکومت ان کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کے حق میں تھی لیکن اس کے کارندے ماننے کیلئے تیار نہیں۔ اب صاف نظر آ رہا ہے کہ غداروں کی ٹولی نیشنل کانفرنس مزید انتشار کا شکار ہو کر کئی اور حصوں میں بٹ جائے گی۔

ادھر مفتی محمد سعید نے جو بھارت کے وزیر داخلہ رہ چکے ہیں اور جنتا دل کے مرکزی لیڈروں میں شمار ہوتے تھے' گوڑا سرکاری کی کشمیر پالیسی سے اختلاف کر کے راجیہ سبھا کی ممبری اور پارٹی کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ مفتی سعید

Marfat.com

نے کہا کہ بھارتی حکومت فاروق عبداللہ پر انحصار کرتی ہے حالانکہ قوم نے اسے مسترد کر دیا ہے۔ انہوں نے کہا حریت کانفرنس کے ساتھ بات چیت ہونی چاہئے۔ وی پی سنگھ جناب شبیر شاہ سے ملے تو اس میں کیا حرج ہے۔

گوڑا حکومت کی خصوصی رشوت:

کشمیر میں صدر راج کی مدت اٹھارہ جولائی کو ختم ہو گئی تھی۔ بھارتی آئین کے مطابق تین سال سے زیادہ کسی علاقے پر صدارتی راج نافذ نہیں رہ سکتا۔ مگر ایک بے آئین قوم کیلئے اپنے آئین سے مذاق کیا مشکل ہے۔ چنانچہ ایک بار پھر صدر راج میں توسیع کر لی گئی۔ اس کے ساتھ ہی دہلی سرکار نے کشمیر کیلئے خصوصی پیکیج کا اعلان کیا جس کے مطابق چھوٹے تاجروں کو پچاس ہزار روپے تک کے قرضے معاف کر دیئے جائیں اور پچاس ہزار سے زائد کے قرضوں کی ادائیگی کے بارے میں نیا اوقات نامہ جاری کیا جائے گا۔ جموں شہر کو بی کلاس کا درجہ دیا جائے گا جبکہ کرگل میں ہوائی اڈہ قائم کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ بھارتی وزیراعظم دیوگوڑا نے پارلیمنٹ میں کہا' ان کی حکومت کشمیر کیلئے ایک کروڑ سولہ لاکھ امریکی ڈالر کے برابر خصوصی رقم جاری کریگی جو اس تیس کروڑ ڈالر کے علاوہ ہو گی جس کو کشمیر میں ترقیاتی کاموں کیلئے مختص کیا گیا ہے۔ ادھم پور سے بارہ مولہ تک ریلوے لائن بچھانے کا اعلان بھی کیا گیا۔ اس طرح بھارتی حکومت عوامی ہمدردی حاصل کرنے کی خاطر خصوصی رشوت پیش کر رہی ہے تاکہ ستمبر میں ہونے والے مجوزہ انتخابات میں لوگوں کو ووٹ ڈالنے پر راضی کیا جا سکے۔ بھارتی وزیراعظم نے اس سلسلے میں 8 اگست کو جموں اور لداخ کا مختصر دورہ بھی کیا۔ آئین چونکہ صدر راج میں توسیع کی اجازت نہیں دیتا' اس لئے بھارت سرکاری انتخابات کا ڈرامہ رچانے کی کوشش کر رہی ہے' یا پھر اسے آئین میں ترمیم کرنی پڑے گی' لیکن پارلیمنٹ میں اس طرح کا کوئی مسودہ اب تک پیش نہیں کیا جا سکا۔

بھارتی الیکشن کمشنر نے ریاست کی 87 نشستوں کیلئے چار مرحلوں میں پولنگ کرانے کا جو اعلان کیا ہے، اس کیلئے مزید فورس بھی بھیجی جا رہی ہے۔ اہل کشمیر نے حسب سابق اس بار بھی ان انتخابات کا بائیکاٹ کرنے کا اعلان کیا ہے۔ سات اگست کو الیکشن کمشنر نے نئی دہلی میں ایک پریس کانفرنس کے دوران ریاست جموں وکشمیر میں چار مرحلوں میں پولنگ کرانے کیلئے سات' سولہ' اکیس اور تیس تاریخیں مقرر کیں۔ ستمبر کی سات تاریخ کو کپواڑہ' بارہ مولہ' لسیہہ' کرگل' راجوری اور پونچھ' 16 ستمبر کو پلوامہ' اسلام آباد' کٹھوعہ اور جموں' 21 ستمبر کو سری نگر' بڈگام اور ادھم پور میں اور 30 ستمبر کو ڈوڈہ میں ووٹ ڈالنے کا ڈرامہ سٹیج کیا جائے گا۔ سات' سولہ' اور اکیس تاریخ کو جن حلقوں میں ووٹ ڈالے جائیں گے' ان کی گنتی اکتوبر کی پہلی تاریخ کو کی جائے گی اور ڈوڈہ کی بعد میں اور آٹھ اکتوبر کو چناؤ کے حتمی اعلانات کئے جائیں گے۔

اس اعلان کے بعد حریت کانفرنس کے ترجمان پروفیسر عبدالغنی نے نامہ نگاروں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا "جموں وکشمیر میں کئی انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کے ہونے اور نہ ہونے سے تحریک اور حریت والوں کے عزم پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ اب بھی اگر ہو بھی جائے تو جھگڑا وہیں رہے گا اور وہ لوگ جو حریت پسند ہیں وہ اپنے مؤقف سے کسی طور بھی دستبردار نہیں ہوں گے۔"

نامہ نگاروں نے حریت کانفرنس کی نمائندہ حیثیت کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا:

"ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ یاسر عرفات کو لوگوں نے نہیں چنا تھا' نیلسن منڈیلا کو بھی کسی نے نہیں چنا تھا۔

Marfat.com

یہاں بھی عوام کی قیادت کیلئے انتخاب کرانے کی شرط بے معنی ہے۔" (روزنامہ پرتاب جالندھر۔5 اگست 1996ء)

سینیٹر براؤن کا دورہ کشمیر:

امریکہ کے معروف سینیٹر اور اسٹینڈنگ کمیٹی برائے جنوبی ایشیا کے اسسٹنٹ سیکرٹری ہینک براؤن نے 6 اگست کو راج باغ میں حریت کانفرنس کے مرکزی دفتر میں قائدین حریت سے ملاقات کی' ملاقات کی تفصیل ایک پریس کانفرنس میں بیان کرتے ہوئے انہوں نے کہا مسئلہ کشمیر ہر جگہ کے آزاد لوگوں کا مسئلہ ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ امریکہ کو دنیا بھر میں آزادی کے مسائل پر تشویش ہے۔ انہوں نے اپنی ملاقات کو مفید قرار دیا اور کہا کہ دورے میں مختلف تنظیموں کے ساتھ جو ملاقاتیں ہوئیں' اس میں مختلف نقطہ ہائے نظر سامنے آئے اور اس سے مسئلہ کشمیر سمجھنے میں بڑی مدد ملی ہے۔ انہوں نے اس مسئلے کو بھارت اور پاکستان کے باہمی تنازعات کی جڑ قرار دیا اور حریت کانفرنس کا شکریہ ادا کیا کہ اس کے لیڈروں نے انہیں اس مسئلے کے پس منظر کے بارے میں آگاہی فراہم کی۔ اسمبلی انتخابات کے بارے میں جب ان سے سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا' اس میں کلیدی بات یہ ہے کہ آیا یہ انتخابات منصفانہ اور آزادانہ ہونگے۔ ایک سوال کے جواب میں کہ آیا انہیں کشمیر کے مسئلے کا کوئی حل نظر آ رہا ہے' انہوں نے کہا کہ کاش ایسا ہوتا۔ انہوں نے کہا کہ ہم پر امید ہیں۔ بھارت اور پاکستان کے وزرائے اعظم کے درمیان براہ راست گفتگو کی بات ہو رہی ہے۔ امید ہے براہ راست گفتگو بار آور ثابت ہو سکتی ہے۔

گزشتہ دنوں کشمیر ہائی کورٹ نے ریاست کے ان لاپتہ نوجوانوں کے بارے میں فوری تحقیقات کا حکم دیا جو بھارتی فوج نے گرفتار کئے اور بعد میں حراست میں لاپتہ ہو گئے۔ جسٹس بوانی سنگھ نے 21 جولائی کو اس سلسلے میں ایک حکم نامہ جاری کیا اور کہا' ایسے واقعات کی مکمل تحقیقات کی رپورٹ دو ماہ کے اندر عدالت کے سامنے پیش کی جائے۔ ایک مقدمے میں اسلام آباد کے مشتاق احمد بٹ نامی نوجوان کے والدین نے شکایت کی تھی کہ ان کا لڑکا جون 1992ء میں سنٹرل ریزرو پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہوا' لیکن اس کے بعد اس کا کوئی پتہ نہیں چلا۔

ایک اور معاملے کی سماعت کے دوران عدالت کو معلوم ہوا کہ اسلام آباد کے تین نوجوان محمد شفیع' بشیر احمد اور طارق کو فوجیوں نے فروری 1992ء میں گرفتار کر لیا تھا اور اس کے بعد سے ان کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی۔ ایک اور مقدمے کے بارے میں بتایا گیا کہ سری نگر کے ایک طالب علم شیخ محمد ایوب کو فوجیوں نے گزشتہ سال 14 اگست کو گرفتار کر لیا' اس کے بعد قابض حکام نے اس کی گرفتاری سے انکار کر دیا۔ اسی طرح سری نگر میں بٹ مالو کی بستی میں ساٹھ سالہ حاجی غلام قادر دوازہ کو اس سال فروری میں گرفتار کئے جانے کے بعد اس کے اہل خانہ برابر اس کی تلاش میں ہیں۔ بارہ مولہ قصبے میں 2 اگست کو غم کی لہر دوڑ گئی جب یہ افسوس ناک خبر قصبے میں پھیلی کہ پانچ نوجوان عاشق حسین شاہ' آزاد احمد گنائی' مشتاق احمد میر' فیاض احمد میر اور اسحاق بٹ لاپتہ ہو گئے ہیں۔ انہیں گزشتہ نومبر میں گرفتار کیا گیا تھا۔ ان کے رشتہ دار انٹروگیشن سنٹروں میں دربدر کی ٹھوکریں کھا رہے تھے۔ لاپتہ ہونے والے نوجوانوں کے والدین نے نامہ نگاروں کو بتایا کہ انہیں اس سال نو دنوں تک نظر بندوں سے ملنے کی اجازت دی گئی۔ انہیں سوپور کے واڑرہ کالج میں رکھا گیا تھا۔ لیکن اس کے بعد سے انہیں اپنے بیٹوں کے بارے میں کوئی علم نہیں۔ انہوں نے کہا کہ بھارتی فوج نے انہیں کیمپ میں بتایا تھا کہ پانچوں نوجوانوں کو بارہ مولہ کے جوائنٹ انٹروگیشن سنٹر میں رکھا گیا ہے۔ لیکن بعد میں یہ اطلاع بھی غلط ثابت ہوئی۔

Marfat.com

سوپور میں ڈانگر پورہ سے کچھ عرصہ قبل دو نوجوانوں محمد اکبر حجام اور محمد رمضان راتھر کو گرفتار کئے جانے کے بعد غائب کر دیا گیا۔ ان کے والدین نے مقامی عدالت میں یہ خدشہ ظاہر کیا ہے کہ ان کے بیٹوں کو غالباً حراست میں قتل کیا گیا ہے۔ انسانی حقوق کے عالمی ادارے ایمنسٹی انٹرنیشنل کی ایک رپورٹ کے مطابق گرفتار کئے جانے کے بعد اب تک کم و بیش پانچ سو کشمیری نوجوانوں کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔

بھارتی اخبارات کا تجزیہ:

راجیہ سبھا میں 16 جولائی کو وزیر داخلہ اندر جیت گپتا نے اعتراف کیا کہ جموں و کشمیر میں حالیہ پارلیمانی انتخابات میں دھاندلی ہوئی ہے۔ اس پر کانگرس اور بی جے پی کے ممبروں نے زبردست ہنگامہ کیا۔ کانگرس نے اس لئے کہ انتخابات اس کی حکومت کے زیر اہتمام کرائے گئے تھے اور بی جے پی نے اس لئے کہ کشمیر کے بارے میں کوئی سچ سننا نہیں چاہتی۔ دھاندلی کی بات کہنے سے وزیر داخلہ کا مقصد یہ تھا کہ اس صورت حال میں کوئی پارٹی کشمیری عوام کے ووٹ کس طرح حاصل کر سکتی ہے اور ان کے اندر کیونکر اعتماد پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اپوزیشن ممبروں کا کہنا تھا کہ اس بیان سے کشمیر کے سلسلے میں بین الاقوامی برادری کو غلط اشارے ملیں گے اور الیکشن اسٹاف کی دیانت داری پر بھی حرف آئے گا۔ زبردست ہنگامے کے پیش نظر اگرچہ وزیر داخلہ نے بعد میں بات بدلنے کی کوشش کی اور کہا کہ میں نے دھاندلی کا لفظ استعمال نہیں کیا' تاہم ان کی زبان سے ایک سچ نکل چکا تھا اور سچ کو بدلا نہیں جا سکتا۔ جو لوگ کشمیر کی صورت حال پر نظر رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کشمیری عوام کو دیگر شکایات کے علاوہ یہ شکایت بھی ہے کہ وادی میں صاف ستھرے انتخابات نہیں ہوتے۔

وزارت داخلہ کے وزیر مملکت مسٹر محمد مقبول ڈار نے اپنے حالیہ دورہ سری نگر کے دوران جو بیانات دیئے تھے ان پر راجیہ سبھا میں بی جے پی کے ممبروں نے سخت تنقید کی۔ وقفہ سوالات کے دوران بی جے پی کے ممبر مسٹر ٹی این چترویدی نے سری نگر میں چھ سیاحوں کی ہلاکت کا تذکرہ کرتے ہوئے مسٹر مقبول ڈار کے اس بیان پر اعتراض کیا کہ کشمیر میں فوجیوں کو بارکوں میں واپس بھیج دیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ مقبول ڈار نے کس بنیاد پر یہ بیان دیا ہے جبکہ وادی کی صورت حال بدستور سنگین ہے۔ بی جے پی کے ایک اور ممبر مسٹر کے آر ملکانی نے کہا کہ مسٹر ڈار مضحکہ خیز بیانات دے رہے ہیں۔ انہوں نے کہا اب تک کشمیر میں 40 ہزار افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔ انہوں نے سوال کیا کہ کیا وزارت داخلہ سے وابستہ وزیر کو اس قسم کے بیان دینے چاہئیں......؟ (جہاد کشمیر 16 اگست 1996ء مصنف۔ علی محمد ہمدانی)

یوں تو بھارت اور اسرائیل کے درمیان 1965ء کے بعد سے ہی قریبی خفیہ تعلقات قائم ہو چکے تھے اور خصوصاً اسرائیل کی طرف سے بھارت کو اپنے مشترکہ دشمن پاکستان کے خلاف ہر ممکن اعانت حاصل ہو گئی تھی لیکن مقبوضہ کشمیر میں جہادی تحریک کے بعد سے ''را'' اور ''موساد'' کے تعلقات میں بہت شدت آ گئی۔ ''موساد'' نے بھارتی حکومت کی درخواست پر مقبوضہ کشمیر کی صورت حال کے حوالے سے ایک اہم ریسرچ کی تھی 26 مئی 1995ء کو بھارتی حکومت کو ''موساد'' نے یہ رپورٹ پیش کی اس رپورٹ کے حوالے سے میں نے ایک اہم مضمون نوائے وقت کے سنڈے میگزین میں لکھا تھا اس کا عنوان تھا۔

Marfat.com

پاک بھارت تجارت

موساد کی تجویز اور بھارتی منصوبہ

''منزل ہی وہ طاقت ہے جو سمندر پر اڑتے پرندے کو پانی میں گرنے سے بچاتی ہے۔جس پرندے کی کوئی منزل نہ ہو وہ کیسے بچے گا؟'' یہ الفاظ اس رپورٹ کے دیباچے میں کہے گئے جو اسرائیلی خفیہ ادارے موساد کے ڈائریکٹر پلاننگ ڈیوڈ گولڈ فیلڈ نے مقبوضہ کشمیر کے دو سالہ مشاہدے کے بعد تحریر کی۔

''کشمیر کا حل'' نامی یہ رپورٹ 26 مئی 1995ء کو بھارتی منصوبہ سازوں کے حوالے کی گئی ڈیوڈ نے رپورٹ میں مقبوضہ کشمیر کی تحریک آزادی کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد انگریزی کے 8 حروف ''پاکستان'' کو تحریک کی اصل اساس قرار دیا اور کہا جب تک اس ایک لفظ کی حرمت کشمیریوں کے دلوں میں قائم ہے ان کے حوصلہ باقی رہیں گے۔ڈیوڈ کا کہنا ہے کہ جب بھی ڈوڈہ سری نگر یا اننت ناگ کے ''محاذ'' پر لڑتے کسی مجاہد سے پوچھا جائے کہ تم کیوں لڑ رہے ہو؟ تو وہ کہتا ہے ''تاکہ اپنے پاکستانی بھائیوں سے مل کر آزادی کا لطف اٹھا سکوں'' لہٰذا پاکستان ہی وہ منزل ہے جو سمندر پر اڑتے پرندے کو گرنے سے بچا رہی ہے۔ڈیوڈ نے بھارتی منصوبہ سازوں کو مشورہ دیا کہ اگر وہ کشمیریوں کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو جائیں کہ پاکستان کو کشمیر میں کوئی دلچسپی نہیں تو پچاس برس سے جاری آزادی کشمیر کی لہر ایک ہفتے میں سرد ہو جائے گی۔یہ کیسے ممکن ہے؟ بھارتی منصوبہ ساز سر جوڑ کر بیٹھے گئے پھر ایک کمیٹی بیٹھی اعداد و شمار کا انبار لگا اقتصادی ماہر آئے دہلی سیکرٹریٹ میں سولہ سولہ گھنٹے کی میٹنگیں چلیں اور اگست 1995ء میں بھارتی حکومت نے ایک نئی فائل کی منظوری دے دی جس کا عنوان تھا ''کشمیر کا حل...... پاک بھارت تجارت''۔

1947ء میں اشیاء صرف کے 90 فیصد کارخانے بھارت کے حصے آئے جبکہ خام مال کی زیادہ تر دکانیں پاکستان میں تھیں لہٰذا بھارت کو اپنے کارخانے چلانے کیلئے پاکستان سے تجارتی معاہدہ کرنا پڑا۔پاکستان بھی اس کیلئے مجبور تھا کیونکہ اسے اپنے شہریوں کیلئے کپڑے' شکر' گھی اور صابن کی ضرورت تھی۔1947ء سے 1949ء تک دونوں ممالک کی باہمی تجارت 58 فیصد تھی ہم یہاں سے خام مال بھیج کر بھارت سے تیار اشیاء خریدتے تھے۔اس دوران بھارت چپکے چپکے اپنے وسائل بڑھاتا رہا۔دو برس بعد اسے پاکستان کے خام مال کی قطعاً ضرورت نہ رہی لیکن بدقسمتی سے پاکستان اپنی داخلی صورت حال کے باعث کارخانوں میں اضافہ نہ کر سکا اور دو برس بعد بھی اشیائے صرف کیلئے بدستور بھارت کا محتاج رہا۔بھارت اس صورت حال سے آگاہ تھا چنانچہ اس نے پاکستان کو اقتصادی دھچکا لگانے کیلئے اچانک اپنی کرنسی کی قیمت میں کمی کر دی اور پاکستان کو روپے کی قیمت کرنے کیلئے مجبور کرنے لگا۔ان دنوں ہماری کپاس اور پٹ سن امریکہ اور یورپ کی منڈیوں میں پذیرائی حاصل کر رہی تھی لہٰذا پاکستان نے کرنسی کی قیمت کم کرنے سے انکار کر دیا۔بھارت نے پاکستان سے

Marfat.com

تجارتی تعلقات منقطع کر دیئے اور بھارت سے کوئلہ آنا بند ہو گیا۔ پاکستان کی ٹرینیں پٹڑیوں پر ساکت ہو گئیں اور اشیائے صرف کی قلت ہو گئی یہ سلسلہ دو برس تک جاری رہا۔ 51ء میں بھارتی سرمایہ کاروں کو پاکستانی روئی اور پٹ سن کی ضرورت پڑی اور بھارت نے دوبارہ پاکستان کی طرف تجارتی ہاتھ بڑھا دیا ہم منتظر تھے فوراً ہندو بنیئے سے بغل گیر ہو گئے۔ بارڈر ٹریڈ ایگری منٹ ہوا اور پٹ سن خریدنے کیلئے تاجروں کے روپ میں بھارتی ایجنٹ ڈھاکہ میں داخل ہو گئے۔ راجی شاہی' چٹا گانگ اور ڈھاکہ میں بھارتی دہشت گردوں کے اڈے قائم ہوئے اور آزاد بنگلہ دیش کی تعمیر کی مہم کا آغاز ہو گیا۔

صدر ایوب کے مارشل لاء کے بعد پاک بھارت تجارت دوبارہ سرد مہری کا شکار ہو گئی کیونکہ بھارت پاکستان کی فوجی حکومت کی معاشی اصلاحات سے ناخوش تھا چنانچہ اس نے اپنا غصہ تجارتی محاذ پر نکالنا شروع کر دیا۔ بارڈر ایگری منٹ ختم ہو گیا اور باضابطہ تجارت بند ہو گئی۔ اشیا صرف کے تبادلے کا گراف گرتا چلا گیا لہٰذا 1965ء تک تجارت صرف 2 فیصد رہ گئی جو پاک بھارت جنگ کے بعد صفر ہو گئی۔

1996ء میں بھارت نے ایسی ہی اقتصادی محاذ آرائی کا آغاز کیا اور سرکاری سرپرستی میں سمگلنگ شروع ہو گئی۔ مشرقی پاکستان کی سرحدیں غیر قانونی اشیاء کی منڈی بن گئے اور آرمی کے ٹرکوں میں سمگلنگ ہونے لگی۔ فوجی پہروں میں سمگلر سرحدیں پار کرنے لگے۔ یہ سلسلہ 1971ء میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی تک جاری رہا۔ 1974ء میں جب ذوالفقار علی بھٹو نے بنگلہ دیش کو تسلیم کیا تو پاکستان اور بھارت کے درمیان دوبارہ تجارتی پروٹوکول طے ہوا۔ پاکستان نے بھارت سے رکشے خرید کر تجارتی تعلقات کا ازسرنو آغاز کیا جو ضیاالحق کے مارشل لاء تک جاری رہا۔ 1978ء میں فوجی حکومت کے باعث یہ تجارت پھر بند ہو گئی اور بھارت نے سمگلنگ کا ہتھیار استعمال کرنا شروع کر دیا لیکن اس بار پاکستان میں فوجی حکومت اور سرحدوں پر کڑے پہرے کی وجہ سے بھارت کامیاب نہ ہو سکا اور 1982ء میں ہندو بنیا باضابطہ تجارت پر مجبور ہو گیا۔

ابتداء 42 اشیا کی تجارت کا سمجھوتہ ہوا۔ حکومت پاکستان نے بھارتی تجارت پر نظر رکھنے کیلئے ٹریڈ کارپوریشن آف پاکستان تشکیل دی۔ پہلے پہل تمام تر تجارت اس ادارے کے ذریعے ہوتی لیکن بعد ازاں پالیسیاں نرم ہوئیں اور چند پرائیویٹ ادارے بھی تجارت میں شامل ہو گئے۔ 1983ء میں پاک بھارت بزنس کمیشن قائم ہوا جس سے تجارت میں اضافہ ہوا۔ ہر سال تجارتی اشیا بڑھتی رہیں یہاں تک کہ 1988ء میں اشیا کی فہرست 578 تک پہنچ گئی۔ 1992ء تک پاکستان نے بھارت سے 1125 کروڑ کا سامان خریدا جبکہ ہم نے 1505 کا مال بھارت کو فروخت کیا اس طرح پاکستان کو 381 کروڑ روپے کا فائدہ ہوا لیکن 1992ء کے بعد یہ صورت حال بدل گئی اور پاکستان کو ہونے والا نفع خسارے میں تبدیل ہو گیا۔ 1992ء سے 1995ء کے درمیان پاکستان نے بھارت سے 584 کروڑ جبکہ بھارت نے پاکستان سے 474 کروڑ کا مال خریدا۔ اس طرح پاکستان کو 110 کروڑ کا نقصان پہنچا اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ بھارت نے پچھلے تین برسوں کے دوران داخلی سطح پر وہ کمی پوری کر لی جس کے باعث وہ پاکستان سے اشیاء درآمد کرنے پر مجبور تھا جبکہ ہماری منڈی بدستور بھارتی اشیا کی محتاج رہی۔

پاکستان اور بھارت سے خام لوہا' مشینری' سیمنٹ' پرزے' روغنی بیج' مصنوعی رنگ' کیمیائی اجزاء' بنیادی

Marfat.com

دھاتیں، ویڈیو کیسٹیں، کھیلوں کا سامان اور چائے درآمد کرتا رہا جبکہ بھارت چینی، روئی، خام پٹرول، چمڑا، دھاگہ، معدنی نمک، اون، سوتی کپڑا اور بعض پھل پاکستان سے خریدتا رہا۔

پاکستان ایکسپورٹ پروموشن بیورو کے ریکارڈ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ سابق ادوار میں پاکستان کی درآمدات برآمدات میں بھارت کا حصہ اوسطاً ایک فیصد سے بھی کم رہا جبکہ پاکستان بھارت تعلقات کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ بھارتی ہماری طرف اسی وقت متوجہ ہوئے جب انہیں پاکستانی اشیا کی شدید ضرورت محسوس ہوئی یا پاکستان کی اقتصادی و سیاسی تباہی کیلئے ارض پاک میں سازش کا کوئی نیا بیج بونا مقصود تھا۔ بھارت ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن سیفٹا اور سافٹا کی آڑ میں ایک بار پھر پاکستان کی طرف تجارتی ہاتھ بڑھا رہا ہے۔ پاکستان بھارتی بننے سے بغل گیر ہونے کیلئے اتنا بیتاب کیوں ہے؟ ان سوالوں کے جواب تلاش کرنے سے قبل مندرجہ بالا عالمی اور علاقائی تجارتی معاہدوں کا اجمالی جائزہ ضروری ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد مختلف ممالک کے درمیان تجارتی تنازعات کے حل اور محصولات پر اتفاق رائے کیلئے گیٹ کے نام سے ایک عمومی معاہدہ طے ہوا۔ گیٹ پوری دنیا کیلئے 50 برس تک تجارتی خدمات سرانجام دیتا رہا لیکن دنیا میں صنعتی انقلاب، اشیائے میں صرف پیدا ہونے والے صارفین میں اضافے اور عالمی اقتصادی مسائل کے باعث گیٹ کی افادیت سمٹتی گئی چنانچہ 1987ء میں دنیا کے بڑوں نے گیٹ سے زیادہ جامع، پر اثر اور وسیع تر تجارتی معاہدے کا فیصلہ کیا۔ 1988ء میں اس سلسلے میں مذاکرات شروع ہوئے اور سات برس کے طویل مذاکرات یوراگوئے راؤنڈ میں 130 ممالک بین الاقوامی تجارت کے فروغ کیلئے عالمی تجارتی تنظیم (ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن) کے قیام پر متفق ہو گئے۔ یکم جنوری 1995ء میں ڈبلیو ٹی او کے تحت تمام رکن ممالک چھ سے دس برس کے دوران عالمی تجارت کے راستے میں حائل تمام رکاوٹیں دور کرنے کے پابند ہیں۔ رکن ممالک کو تجارتی پابندیاں نرم کرنا ہوں گی۔ صنعتی اشیا پر درآمدی ٹیکس میں چالیس فیصد تک کمی کرنا ہو گی۔ ڈبلیو ٹی او نے اقتصادی خدشات کے پیش نظر ترقی پذیر ممالک کو عملدرآمد کیلئے 2005ء تک وقت دیا ہے۔ مزید برآں عالمی تجارتی تنظیم رکن ممالک کو تنظیم کی شرائط پر فوری عمل کی بجائے تجارتی پابندیاں نرم کرنے کی رعایت بھی دیتی ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب دنیا کے بڑے تجارتی ''جن'' بھی ابھی تک ڈبلیو ٹی او پر عملدرآمد میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کر رہے ہیں تو بھارت عالمی تجارتی تنظیم کی اصلاحات پر فوری اطلاق کا مطالبہ کیوں کر رہا ہے؟

عالمی تجارتی تنظیم کے علاوہ سارک ممالک میں بعض تجارتی اشیا کی باہمی درآمد برآمد کیلئے دو ترجیحاتی تجارتی معاہدے سیفٹا اور سیفٹا ہوئے۔ سیفٹا کے تحت 226 اشیا کی تجارت ہو گی اس سلسلے میں بھارت نے 106، پاکستان نے 35، سری لنکا نے 31، مالدیپ 17، نیپال 14، بنگلہ دیش 12 اور بھوٹان نے 11 اشیا کی رعایتی درآمد کی اجازت دی۔ سیفٹا کے تحت رکن ممالک ایک دوسرے سے تعاون کریں گے جبکہ پاکستان بھارت کو انتہائی پسندیدہ ملک قرار دینے کا پابند ہو گا۔ اس معاہدے پر 7 دسمبر 1995ء سے عملدرآمد شروع ہو گیا۔ سیفٹا کے تحت پاکستان سے بھارت سے رنگین مچھلیاں، ریڈ کورل، ناریل، کالی مرچ، مونگ، مسور کی دال، جائفل جو بڑی الائچی، خشک ادرک، سبزیوں کے بیج، جڑی بوٹیاں، بانس، پان، سرمہ، المونیم آکسائیڈ، المونیم ہائیڈرو آکسائیڈ، المونیم فلورائیڈ، بائیڈروکس فورمیتھائل، پینن فور، چھوٹے جانوروں کی کھالیں،

Marfat.com

بھیڑ اور مینا کی کھال' بکری کی کھال' لکڑی کے شہتیر' کاغذ اور گتے' بروشر اور کتابیں' خام پٹ سن' ہارڈ ورلڈ سریئے' دوسرے سریئے' کولڈ فارمڈ سریئے' لوہے اور سٹیل کے کنٹینر خریدے گا۔ سیپٹا معاہدے کی تجویز 1991ء میں کولمبو کانفرنس کے دوران پیش کی گئی اور پانچ برس کے غور و فکر کے بعد اس کی منظوری دے دی گئی۔ سیپٹا معاہدے کا سب سے زیادہ فائدہ بھارت کو ہوگا کیونکہ سارک ممالک میں بھارت واحد ملک ہے جو تمام ممالک کے درمیان ہے لہٰذا ایک ملک کی دوسرے ملک جانے والی تمام مصنوعات کو بھارت سے گزر کر جانا ہوگا اور بھارت سارک ممالک کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھائے گا۔ دوسری طرف بھارت نے پاکستان سے بنگلہ دیش' سری لنکا' نیپال اور بھوٹان کیلئے ٹرانزٹ روٹ کے بدلے وسط ایشیائی ریاستوں کا روٹ طلب کیا ہے۔ پاکستان کی آمادگی کے بعد وسط ایشیا کا سونا لوٹنے کی بھارتی خواہش پوری ہو جائے گی۔ پاکستان اور بھارت کے مابین ''کچن آئمٹز'' کی درآمد برآمد کے ایک منصوبے پر عملدرآمد شروع ہو چکا ہے جس کے تحت پاکستان باورچی خانہ میں استعمال ہونے والی 19 اشیا میں سے کوئی بھی جنس صرف ٹیلی فون پر چند گھنٹوں کے نوٹس پر ہزاروں ٹن کے حساب سے منگوا سکتا ہے۔ بھارت میں لیبر بہت سستی ہے۔ صنعتی قرضے پر شرح سود پاکستان سے 8 فیصد کم ہے زیادہ تر مشینیں اور پرزے مقامی طور پر بنتے ہیں۔ بجلی اور ٹرانسپورٹ کے زیادہ تر شیئر سرمایہ کاروں کے پاس ہیں لہٰذا وہ بنکوں کے ذریعے بڑی آسانی سے تجارت پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ پچھلے دنوں بھارتی بنکوں نے پاکستان سے تجارت کرنے والے ہندو تاجروں پر ایل سی کیلئے پچاس فیصد رقم پہلے جمع کرنے کی شرط عائد کر کے پاک بھارت تجارت مشکل بنا دی۔ سرمایہ کاروں کو لوکل کی بجائے بیرونی منڈیوں میں پذیرائی حاصل کرنے والی مصنوعات کی تیاری کیلئے کم شرح سود پر قرضے فراہم کئے جاتے ہیں' بھارتی صنعت خود کفالت پر عمل پیرا ہے عام گھریلو استعمال کی چیز سے لے کر ہوائی جہاز تک بھارتی کارخانوں میں بن رہے ہیں۔ ہمسایہ ممالک میں اشیائے ضروریہ کی سمگلنگ کو سرکاری سرپرستی حاصل ہے لہٰذا بھارتی مصنوعات بہت سستی ہیں۔ رہی سہی کسر پاکستان کے مقابلے میں کم قیمت بھارتی روپے نے پوری کر دی ان حالات میں جوں ہی بھارتی مصنوعات اور خام مال کو پاکستان کی منڈیاں ملیں گی پاکستان کی مارکیٹ تباہ ہو جائے گی۔ ہماری مصنوعات مٹ جائیں گی اور صنعتکار کنگال ہو جائے گا۔ بھارت ''ڈمپنگ'' میں بہت بدنام ہے۔ بھارتی حکومت اپنے صنعتکاروں کو ایسی مصنوعات بنانے کیلئے زیادہ سہولتیں فراہم کرتی ہے جن کی اندرون ملک مانگ نہ ہونے کے برابر ہے جبکہ یہی مصنوعات بیرونی منڈیوں میں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ بھارت اپنے تاجروں کو ٹیکسوں کی چھوٹ دے کر بھاری مقدار میں یہ مصنوعات پڑوسی ممالک کی مارکیٹوں میں ڈمپ کر دیتا ہے جس کے بعد اس ملک کی مقامی مصنوعات کا وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ اس سلسلے میں بنگلہ دیش' سری لنکا' بھوٹان' مالدیپ' برما اور خلیجی ریاستوں کی مثال دی جاسکتی ہے جہاں بھارتی سوئی سے لے کر طیاروں کے پرزہ جات تک انتہائی ارزاں قیمت پر دستیاب ہیں۔ ڈمپنگ کے سلسلے میں بھارت کسی قسم کی پابندی خاطر میں نہیں لاتا جہاں سے تجارت کا موقع نہیں دیا جاتا وہاں وہ سمگلنگ کو بطور ہتھیار استعمال کرتا ہے۔

اس ضمن میں لاہور کی مثال دی جاسکتی ہے جہاں تمام مارکیٹوں میں بھارتی مصنوعات عام دستیاب ہیں جبکہ پاک بھارت تجارت عملاً بند ہے۔ ایک سروے کے مطابق اس سلسلے میں نہ صرف سرحد پار کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے بلکہ

Marfat.com

یہ اشیائے صرف سمگلروں کو بازار سے بہت کم ریٹ پر فراہم کی جاتی ہیں۔ جب بھارتی سیمنٹ مارکیٹ میں 90 روپے بوری مل رہا ہو تو پاکستان کا 160 روپے کا سیمنٹ کون خریدے گا۔ جب سائیکل چودہ سو روپے میں مل رہا ہو تو 2200 روپے میں سہراب کی مارکیٹ ویلیو کیا ہوگی۔ لکس صابن کی قیمت 7 روپے ہوگی صارف 15 روپے کیوں دے گا تو پھر پاکستانی صنعتکار کارخانے کیوں چلائے گا؟ جب پاکستان میں کم قیمت پر بھارتی اناج دستیاب ہوگا تو پاکستان کسان آلو پیاز گندم دالوں اور چاولوں کی بجائے زیادہ قیمت پانے والی فصلیں بوئے گا مثلاً وہ پیاز کی بجائے تمباکو یا بانس کی کاشت کو ترجیح دے گا۔ چنانچہ ہم اناج کیلئے بھارت کے محتاج ہو جائیں گے اور یہی بھارتی منصوبہ ہے کہ وہ جب چاہے گا آلو پیاز بند کر کے پاکستانی عوام کو حکومت کے خلاف سڑکوں پہ آنے پر مجبور کر دے گا۔ بھارت یہی سب کچھ سری لنکا' بنگلہ دیش اور نیپال میں عرصے سے کر رہا ہے۔ سامان خورد و نوش دنیا کی سب سے بڑی تجارت ہے۔ گھی' چینی' آٹا' نمک' مرچ' آلو' پیاز اور ادرک کون سا خطہ ہے جہاں کے مسئلے نہیں اور وہ کون لوگ ہیں جو ان کے خریدار نہیں؟ آپ کو کپڑے نہ ملیں تو آپ پرانے کپڑے پہن لیں گے' جوتے نہ ہوں پھٹے جوتے استعمال ہو جاتے ہیں' گھر پختہ نہ ہو تو کچے گھروں میں رہا جا سکتا ہے لیکن کیا آٹے کے بغیر رہنا ممکن ہو؟ نہیں اور بھارت انسان کی اس کمزوری سے پوری طرح آگاہ ہے اسی لئے بھارت نے تجارت کا آغاز کچھ آلو سے کیا۔ پاکستان میں آلو ختم ہو گئے تو دوسرے ہی روز امرتسر سے دو ہزار ٹن آلو لاہور آ گئے۔ پیاز کی قیمتوں نے سر اٹھایا تو بھارت نے پیاز کی پیشکش کر دی۔ اب گندم ختم ہوگی تو ہماری وزارت صنعت و تجارت کا ایک ڈپٹی سیکرٹری بھارتی سفارتخانے کے کامرس اتاشی کو صرف ایک فون کال کرے گا اور گورداسپور سے آٹے سے بھرے ٹرک واہگہ بارڈر پر پہنچ جائیں گے۔

بھارت ایسا کیوں کرے گا؟ جبکہ اس کی زرعی ترقی پاکستان کے مقابلے میں تین گنا کم ہے۔ پاکستان 4.5 فیصد اور بھارت 1.6 فیصد ہے۔ پاکستان کی ایک سرحد چین سے ملتی ہے جس کی صنعت نہ صرف اپنی ضرورت پوری کرتی ہے بلکہ اس کی مصنوعات سستی اور معیاری ہونے کے باعث پوری دنیا میں تیزی سے جگہ بنا رہی ہیں۔ ہماری دوسری سرحد ایران جیسے قدرتی وسائل سے مالا مال ملک سے ملتی ہے جہاں کا گھی' پھل اور تیل دنیا کے دیگر ممالک سے کہیں سستا ہے جبکہ تھوڑی سی دوری پر وسط ایشیا کی وہ تمام ریاستیں پاکستان کا راستہ دیکھ رہی ہیں جہاں کی خوراک' قدرتی گیس اور حیواناتی ذرائع پوری دنیا کی ضرورت پوری کر سکتے ہیں۔ دنیا کا کون سا خطہ ایسا ہوگا جہاں پھل' سبزیاں' اناج' گوشت' انڈے' تیل' گیس اور بجلی مفت ہوگی سوائے وسط ایشیا کے لیکن چین' ایران اور وسط ایشیا کی ریاستوں کو ''موسٹ فیورڈ نیشن'' قرار کیوں نہیں دے رہا جبکہ بھارت خود ایشیا کی طرف للچائی نظروں سے دیکھ رہا ہے؟ اس کی بڑی وجوہات ہیں اول امریکہ چین اور ایران کو پسند نہیں کرتا۔ چین میں بنیادی حقوق کیلئے تازہ ترین اصلاحات کے باوجود چینی سوشلزم سرمایہ دارانہ دماغ میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہے لہٰذا چین کی اقتصادی نسل بندی کا عمل جاری ہے۔ دوسری طرف امریکہ ایران آویزش بھی ڈھکی چھپی بات نہیں جبکہ پاکستان امریکہ کو ناراض کر کے چین اور ایران کو انتہائی پسندیدہ اقوام قرار نہیں دے سکتا۔ رہی بات وسط ایشیا کی تو بھارت افغانستان کی ربانی حکومت کی مدد کر کے افغانستان کی داخلی صورت حال کو بہتر نہیں ہونے دے رہا۔ ضرورت ترقی کی کتاب کا پہلا باب ہے جب ملک میں آلو ختم ہو جاتا ہے تو تھوڑی بہت تکلیف ضرور ہوتی ہے لیکن

Marfat.com

اگلے سال ملک میں آلو سب سے کم قیمت ہوتا ہے کیونکہ کسان نفع کی خواہش میں اپنی زرخیز زمین آلو کیلئے وقف کر دیتا ہے۔لہٰذا تنگی فروانی کا آغاز ہوتی ہے اس ضمن میں 49ء کی مثال دی جاسکتی ہے جب بھارت نے پاکستان کو کوئلہ فروخت کرنے سے انکار کر دیا تو ساری ٹرینیں پٹڑیوں پر رک گئیں دو تین ماہ قوم نے بڑی مشکل سے گزارے لیکن اسی دوران ہم نے کینیڈا سے ڈیزل انجن حاصل کر لئے بجلی پر ٹرین چلانے کا انتظام ہوگیا اور ہمارا ریلوے نظام جدید دور میں داخل ہو گیا جبکہ برما' بنگلہ دیش' سری لنکا اور خود بھارت میں جہاں بھارتی کوئلہ پہنچتا ہے آج بھی اسی فیصد ٹرینیں کوئلہ سے چل رہی ہیں اس طرح جب بھارت نے ہمارا پانی بند کیا تو ہم نے ملک میں آبپاشی کا جدید نظام نافذ کر دیا۔نہریں کھودیں' ڈیم بنے اور پاکستان میں زرعی خوشحالی کا دور شروع ہو گیا۔تنگی کشادگی کا دیباچہ ہوتی ہے جو قومیں تنگی سے گھبرا گئیں وہ کبھی ترقی نہیں پا سکتیں لیکن حیرت ہے ''گھاس کھالیں گے لیکن ایٹم بم بنانے والے'' لوگ آلوؤں کی کمی برداشت نہیں کر سکے؟ جنوبی ایشیا پر نظر ڈالی جائے تو پاکستان ہی ایسا ملک نظر آتا ہے جو پچھلے پچاس برس سے بھارتی دباؤ کا مقابلہ کر رہا ہے جبکہ برصغیر کے دیگر ممالک بری طرح بھارتی شکنجے میں کسے جا چکے ہیں۔بنگلہ دیش بھارت سے 30 فیصد' نیپال 70 فیصد' سری لنکا 50 فیصد اور بھوٹان 80 فیصد اشیا درآمد کرتا ہے۔یہ ممالک بھارت کی اقتصادی منڈیاں بن چکے ہیں۔ہندو انگلی کی معمولی جنبش کے ساتھ ہی ان ممالک کی داخلی و خارجی صورت حال میں طوفان آجاتے ہیں اور اب پاکستان جو تجارت کے ساتھ ہی وہ تمام جنگیں منڈیوں اور بازاروں میں ہار جائے گا جو اس نے محاذوں پر لڑیں۔

(ندائے ملت-روزنامہ نوائے وقت 19 اپریل 1996ء)

اس دوران بھارت نے مقبوضہ کشمیر میں نام نہاد الیکشن بھی کروالئے۔ان انتخابات پر عجیب و غریب منظر دیکھنے کو ملا۔پولنگ سٹیشنوں کے سامنے مجاہدین کی طرف سے اشتہار لگائے گئے کہ ''ووٹ ڈالنے والے کو وی سی آر ٹی وی (اور دوسرے انعامات) انعام دیا جائے گا۔ہمت ہے تو ووٹ ڈال لو...... پولنگ سٹیشن ویران رہے۔عالمی ابلاغ عامہ نے ٹرن آؤٹ بمشکل تین فیصد بتایا بھارت نے 13 تا 26 فیصد بتایا۔اس صورت حال پر میں نے کشمیر کو یاد رکھئے کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جو اس دور کے حالات کی نشاندہی کر رہا ہے۔

''آزاد کشمیر میں انتخابات کا معرکہ بھی بالآخر پیپلز پارٹی نے سر کر لیا اور اب وہاں اپنی حکومت بنالی ہے گو کہ ان انتخابات سے پہلے اور بعد میں بہت کچھ کہا سنا گیا لیکن موجودہ حکومت نے شروع ہی سے اپنی ایک پالیسی بنالی ہے کہ کبھی اپوزیشن کی کسی بات پر توجہ نہیں دینی اور وہی کرنا ہے جو وہ خود ٹھیک اور بہتر سمجھیں۔اپوزیشن میں حکومت نے غیر جانبدار پریس کو بھی شامل کیا ہوا ہے اور وہ ادارہ اور شخص بھی اس کا ممبر ہے جو کسی بھی حکومتی اقدام سے مختلف رائے کا اظہار کرنے کی جرات کرے مثلاً سپریم کورٹ اگر حکومت کے خلاف قانون کی حرکت کا نوٹس لے تو اسے کار سرکار میں مداخلت اور بقول وزیراعظم اپوزیشن کی طرف سے عدلیہ کو استعمال کرنے کی کوشش قرار دیا جاتا ہے۔بعینہ جب آزاد کشمیر کے انتخابات سے پہلے سردار عبدالقیوم اور پھر مختلف حلقوں کی طرف سے اس خدشے کا اظہار کیا گیا کہ انتخابات میں مداخلت اور دھاندلی کا خطرہ ہے بلکہ سردار قیوم نے تو صدر پاکستان سے یہ اپیل بھی کر دی کہ وہ فوج کی زیرنگرانی انتخابات کروائیں اور ہر شعبہ

Marfat.com

زندگی کی طرف سے حکومت کہا گیا کہ ان انتخابات میں اگر پاکستانی حکومت نے کوئی مداخلت کی تو اس کا اثر دوسری طرف قطعاً خوشگوار نہیں ہوگا لیکن حسب روایت وزیراعظم نے بیان جاری فرما دیا کہ وہ نہ تو کشمیر کے الیکشن میں خود مداخلت کریں گی اور نہ کسی کو کرنے دیں گی۔ ابھی اس بیان کی سیاہی ختم نہ ہوئی تھی کہ لاہور میں ویگنوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہوگئی اور اگلے روز تاریخی دھاندلی کے بعد پیپلز پارٹی نے الیکشن جیت لیا اب ان نتائج کو کشمیری قبول کرتے ہیں یا نہیں یہ ہمیشہ کی طرح حکومت کا معاملہ نہیں نہ ہی وہ اس سر درد میں پڑے گی۔

صورت حال یہ ہے کہ کشمیر میں ہونے والے ان ''غیر جانبدار انتخابات'' سے ساری دنیا میں پاکستانی حکومت پر زبردست تنقید جاری ہے اور بین الاقوامی سطح پر ہمارا کیس کمزور ہو رہا ہے۔ خود بھارتی حکومت نے اس مرتبہ بڑا عجیب طریقہ واردات اپنایا ہے اور وہ کانگرس کی طرح بندوق سے نہیں ''چھل کپٹ'' سے کشمیریوں کو فتح کرنے چلے ہیں۔ کانگرس سرکار نے جیسے تیسے الیکشن مقبوضہ کشمیر میں کروا دیئے تھے اور موجودہ حکومت نے بھی اس منصوبے پر کامیابی سے عملدرآمد شروع کیا ہے جنتا دل کے لیڈر کشمیری لیڈرشپ کو ان کی مرضی کے عین مطابق بیانات دے کر ورغلا رہے ہیں اور عین ممکن ہے کہ وہاں صوبائی انتخابات بھی جلد ہی کروا دیئے جائیں۔

جوں جوں تحریک آزادی کشمیر اپنے آخری مراحل میں داخل ہوتی جا رہی ہے کچھ دیدہ نادیدہ قوتیں بھی بڑی تیزی سے اپنا اثر ورسوخ حاصل کرتی جا رہی ہے۔ ان کے پس پردہ کون سی قوتیں کام کر رہی ہے اس بارے میں مختلف آراء پائی جاتی ہیں لیکن ایک بات بہر حال طے ہے کہ بین الاقوامی حالات کے تناظر میں ان قوتوں کے کردار کو مستقبل قریب میں اور بھی زیادہ اہمیت حاصل ہو جائے گی۔

اس سلسلہ میں میں گزشتہ سال کے دوران اہم واقعہ پاک بھارت فورم برائے امن اور جمہوریت کا سامنے آنا تھا۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے (مسئلہ کشمیر کے پس منظر میں) یو ایس انسٹی ٹیوٹ آف پیس کے بعد یہ دوسرا بڑا فورم تھا جو اس تیزی سے منظر عام پر آیا ہے۔ فورم پاکستان اور بھارت کے لبرل دانشوروں پر مشتمل ہے جو ''امن'' اور ''ترقی'' کو فروغ دینے کا نعرہ لے کر اٹھے ہیں اور برصغیر میں دوستی کے ماحول کا قیام جن کا ''مقصد'' ہے۔ گزشتہ سال کے دوران فورم نے دو سیمینار منعقد کئے جن میں دونوں اطراف کے تقریباً 200 کے لگ بھگ دانشور شریک ہوئے۔ اس سلسلہ کا پہلا سیمینار 25,24 فروری 95ء کو دہلی میں منعقد ہوا جس میں دونوں ملکوں پر الزام لگایا گیا کہ مسئلہ کے حل میں قطعاً دلچسپی نہیں لے رہے ہیں جس سے جنوبی ایشیا کے امن کو شدید خطرہ لاحق ہے۔ فورم نے مسئلہ کشمیر کو متنازعہ مسئلہ قرار دیتے ہوئے دونوں ملکوں پر زور دیا کہ وہ کشمیری عوام کے ساتھ مل کر مسئلہ کا کوئی حل تلاش کریں۔

1995ء نومبر کے دوسرے عشرے میں فورم نے لاہور میں منعقدہ اپنے دوسرے سیمینار میں مسئلے پر دوبارہ غور و خوص کیا اور چند دوسری نئی تجاویز بھی پیش کیں جن میں تین سال کے اندر مشترکہ طور پر کشمیر کی سرحدوں پر تعینات افواج میں 25 فیصد کی کمی کی تجویز بھی شامل تھی۔ علاوہ ازیں مشترکہ نصابی کتابوں کے اجراء اور ثقافتی تعاون کے فروغ کی تجاویز کو بھی سیمینار کے ایجنڈہ میں بنیادی اہمیت حاصل رہی۔ فورم کی سیمینار میں پیش کردہ تجاویز اور مشوروں کا جائزہ لیا جائے تو یہ تحریک مخالف قوتوں کی بازی گری کا کھلا نمونہ ہے۔ جس کی ہر تجویز اور اپیل میں جارح اور مفتوح کو ایک ہی صف میں کھڑا کیا

Marfat.com

گیا ہے جبکہ دوسری طرف ''جمہوریت'' کے غم میں ہلکان ہوئے جانے والے یہ نام نہاد دانشور اتنی بھی وسعت قلبی یا جمہوریت نوازی کا مظاہرہ نہ کر سکے کہ سیمینار میں کم از کم کسی ایک ہی کشمیری دانشور کو بھی مدعو کر دیتے۔ جو لوگ پاکستان اور بھارت پر ایک ہی سانس میں الزام لگا رہے ہیں کہ وہ مذاکرات میں کشمیری عوام کو نمائندگی نہ دے کر ہٹ دھرمی اور عدم رواداری کا مظاہرہ کر رہی ہیں جب وہ خود ہی اس اصول یا نظریہ کو نظر انداز کر کے اکیلے ہی کشمیر کے مستقبل کی صورت گری کرنے چل پڑیں تو اسے پتلی تماشہ یا چوں چوں کا مربہ کے علاوہ اور کیا نام دیا جا سکتا ہے؟

گزشتہ چند سالوں کے دوران پاکستان نے ہر پلیٹ فارم اس بات کو بڑی شدومد سے اٹھایا ہے کہ بھارت پر تمام ممالک مل کر معاشی پابندیاں عائد کر دیں تا کہ اسے اس فیصلہ پر مجبور کیا جا سکے کہ وہ کشمیری عوام کو ان کا حق خود ارادیت دے دے۔ یہ مطالبہ اس اعتبار سے بھی اپنے اندر بڑی جامعیت اور وسعت رکھتا تھا کہ جدید دور میں کسی بھی ملک کو اگر کسی بات پر مجبور کرنا ہو تو اس کیلئے شاید ہی معاشی پابندیوں کے ہتھیار سے بڑھ کر کوئی ہتھیار کارگر ہو۔

بین الاقوامی سطح پر پاکستان کے اس مطالبہ کو اس وقت ایک متاثر کن حد تک پذیرائی مل گئی جب 1993ء میں او آئی سی نے اپنے ایک اجلاس میں متفقہ طور پر اس قرارداد پر صاد فرمایا کہ مسلم امہ اجتماعی طور پر فوراً بھارت پر تجارتی پابندیاں عائد کر دے تا کہ اسے مجبور کیا جا سکے کہ وہ کشمیری عوام کے بالکل جائز اور منصفانہ مطالبہ کو تسلیم کرتے ہوئے انہیں حق خود ارادیت دے دے۔ او آئی سی کے اس فیصلے پر عملدرآمد ہونا باقی تھا اور یہ توقع کی جا رہی تھی کہ تنظیم عنقریب اس جانب کوئی بڑا قدم اٹھائے گی۔ اس خیال کو اس وقت مزید تقویت ملی جب تنظیم نے ایک انتہائی دلیرانہ قدم اٹھاتے ہوئے بوسنیا پر عائد ہتھیاروں کی پابندی کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے ہتھیار فراہم کرنے کا اعلان کر دیا لیکن امید اور توقعات کے اس سلسلہ پر اس وقت اوس پڑ گئی جب حکومت پاکستان نے دسمبر میں اپنے ہی مطالبہ کے بالکل علی الرغم بھارت سے کھلی تجارت کرنے کا باضابطہ فیصلہ کر لیا۔ حکومتی ارکان نے اس فیصلہ کی توجیح کرتے ہوئے اعلان کیا کہ دراصل پاکستان گیٹ اور سیپٹا معاہدوں کا رکن ہے جن میں اسے اس بات کا پابند ٹھہرایا گیا ہے کہ وہ اپنے ہمسایہ ممالک سے ترجیحی تجارتی تعلقات قائم کرے گا۔

حکومت کی اس توجیح کا اگر تجزیہ کیا جائے تو یہ دلیل محض ڈھکوسلے سے بڑھ کر کچھ نہیں کیونکہ گیٹ اور سیپٹا پر بے شمار ممالک نے دستخط کئے ہوئے ہیں لیکن انہوں نے کبھی اپنے قومی موقف یا مفادات کو ان معاہدات کی بھینٹ نہیں چڑھنے دیا خود بھارت کی مثال ایک ہی رہی ہے اور رہے گی اور یہی ان کی راج نیتی ہے کہ اپنے ہمسائے کو روند کر آگے نکل جاؤ اور آگے ہی آگے بڑھتے چلے جاؤ۔ شاید آج یہ بات کچھ عجیب لگے لیکن بھارت کی ہر حکومت نے ہمیشہ ایک ہی خواب دیکھا ہے بھارت کے سپر پاور بننے اور ساری دنیا کو فتح کر لینے کا خواب۔ ان حالات میں اگر ہم آپس میں جوتیوں میں دال ہی بانٹتے رہے تو ہمارا بھی خدا ہی حافظ ہوگا۔ (روزنامہ نوائے وقت سنڈے ایڈیشن ندائے ملت 12 جولائی 1996ء)

1997ء کا آغاز کشمیر میں قتل و غارت گری، دہشت گردی اور بربریت کے ساتھ ہوا۔ یکم جنوری کو 44 بے گناہ افراد کو کشمیر میں ہندوستانی فوجیوں نے انتہائی بے دردی کے ساتھ شہید کر دیا۔ کشمیر کے مسئلہ میں بھارت نے ہمیشہ اس بات کا وعدہ تو کیا وہ کشمیریوں کے مسائل حل کریگا لیکن کبھی بھی اس نے کشمیری مسلمانوں کے مطالبات کی طرف توجہ نہیں دی۔

Marfat.com

1997ء میں دیوی گوڑا نے پاکستان کے وزیراعظم نواز شریف کے اصرار پر کشمیری مسلمانوں کے حوالے سے مذاکرات کو اہمیت دینے کی بظاہر کوشش کی لیکن دیوی گوڑا حکومت چونکہ خود کمزور تھی اور کانگرس بھی کشمیر مسئلہ میں ان کے خلاف تھی اسی وجہ سے اس پیش رفت کے نتیجے میں کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔ اس دوران دیو گوڑا حکومت کا خاتمہ ہوا اور اندر کمار گجرال ہندوستان کے وزیراعظم بنے۔ ان کی آمد سے پاکستانی حلقوں میں ایک تاثر عام پایا جانے لگا کہ شاید ان کے دور میں کوئی مثبت پیش رفت ہوگی۔ چنانچہ ابتدائی طور پر وزیراعظم پاکستان نے اپنے بیانات کے ذریعے بھی اس توقع کا برملا اظہار کیا۔ گجرال نے وزارت عظمیٰ کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد ایک نظریہ پیش کیا جسے ''نظریہ گجرال'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے تحت انہوں نے اعلان کیا کہ ہم اپنے پڑوسی ممالک کے ساتھ سیاسی اور معاشی تعلقات میں استحکام چاہتے ہیں خاص طور پر ہم پاکستان کے ساتھ قریبی روابط اور دوستانہ تعلقات چاہتے ہیں۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ پاکستان کے ساتھ ہندوستان کے وزیراعظم کا دوستانہ رویہ ان کی خارجہ پالیسی میں ایک ڈپلومیسی کی دلیل تھی۔ کیونکہ ہندوستانی معاشی نظام کو سہارا دینے اور بین الاقوامی سطح پر اپنے مفادات کو پورا کرنے کیلئے ہندوستان پر سب سے بڑا الزام بین الاقوامی برادری میں ثابت کیا جاتا رہا ہے کہ اس نے کشمیر میں اور بعض دوسری جگہوں پر انسانی حقوق کو پامال کیا ہے۔

مئی 1997ء میں ایک اہم واقعہ اس وقت رونما ہوا جب ان دونوں ممالک کے سربراہوں کے درمیان سارک کانفرنس منعقدہ مالدیپ میں ملاقات ہوئی' جہاں ان دونوں ممالک کے وزرائے اعظم نے اپنی ملاقات کے نتیجے میں آٹھ اہم متنازع امور پر آٹھ ورکنگ گروپس بنانے کا فیصلہ کیا۔ واضح رہے کہ ان گروپس میں کشمیر کے مسئلے کو بھی شامل کیا گیا لیکن بعد میں بھارت روایتی طریقہ کو اپناتے ہوئے کشمیر کے سلسلے میں اپنے وعدے سے پھر گیا اور کشمیر کے معاملے میں کسی بھی مفاہمی عمل کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس امید افزا صورتحال کے بعد بھارت کے اس منفی رویہ پر امریکہ نے بھی خصوصی طور پر اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ اسی سال بھارت اور پاکستان کے سیکرٹری خارجہ کی ملاقاتیں بھی ہوئیں جن کا مقصد کشمیر سمیت پاکستان اور بھارت کے تعلقات کو مسائل اور ان کے حل کے سلسلے میں پیش رفت کرنا تھا لیکن ہندوستان کے کشمیر کے موقف پر منفی رویے نے سیکرٹری خارجہ مذاکرات پر بھی منفی اثرات مرتب کئے جس کے نتیجے میں سیکرٹری خارجہ کوئی خاطر خواہ نتائج نہیں نکال سکے۔ اسی سال ستمبر میں جنرل اسمبلی کے اجلاس کے موقع پر وزیراعظم پاکستان نواز شریف نے ہندوستان کو ''معاہدہ عدم جارحیت'' کی پیشکش کی جس میں تجویز کیا گیا کہ دونوں ممالک ایک دوسرے پر حملہ آور ہونے کے بجائے اپنے معاملات کو افہام و تفہیم اور مذاکرات کے ذریعہ حل کریں۔ اس پیشکش کے بعد دونوں ممالک کے رہنماؤں کے درمیان ملاقاتیں بھی ہوئیں اور پاکستان کی اس تجویز کو بین الاقوامی سطح پر خاصی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی اس حوالے سے پاکستان کی خارجہ پالیسی کی بھی وضاحت ہوئی کہ پاکستان اپنے پڑوسی ممالک سے ''پرامن بقائے باہمی'' کے بین الاقوامی قانون کے تحت تعلقات مساویانہ بنیادوں پر چاہتا ہے۔ لیکن بھارت نے اس تجویز کو قبول نہیں کیا حتیٰ کہ بھارتی حکومت کے اس منفی رویے پر خود بھارتی ذرائع ابلاغ نے بھی شدید تنقید کی۔ بھارت کے اس رویے کے خلاف پاکستان نے بین الاقوامی برادری کی توجہ اس کے عدم تعاون کی جانب دلاتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ آئندہ اس وقت تک دونوں ممالک کے درمیان مذاکرات نہیں ہو سکتے جب تک کشمیر کے معاملہ کو باقاعدہ تسلیم نہیں کیا

Marfat.com

جاتا۔ اس سال کے اہم واقعات میں ایک اہم واقعہ ہندوستان کی وہ درخواست بھی ہے جس میں بھارت نے سلامتی کونسل میں مستقل رکنیت کیلئے اپنا دباؤ بڑھانا شروع کیا اور اس بات کا اعلان کیا کہ وہ سلامتی کونسل میں مستقل نشست کا حقدار ہے۔ امریکہ اور برطانیہ نے بھارت کی اس درخواست پر اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ بھارت پہلے مسئلہ کشمیر کا حل تلاش کرے پھر اس کے بعد اس کی اس درخواست پر غور کیا جا سکتا ہے۔ کشمیر کے مسئلہ اور ہندوستان کے جارحانہ عمل کو سامنے رکھتے ہوئے پاکستان نے ہندوستان کی سلامتی کونسل میں مستقل رکنیت کی درخواست کو یکساں مسترد کرتے ہوئے یہ مؤقف اختیار کیا کہ جو ملک اپنی حدود اربعہ میں بنیادی انسانی حقوق کو پامال کر رہا ہو ایسے ملک کیلئے سلامتی کونسل میں مستقل نمائندگی سراسر ناانصافی ہونے کے ساتھ ساتھ ہمسایہ ممالک کے وجود کیلئے شدید خطرہ بھی ہوگی پاکستان کا یہ مؤقف بھی اس سلسلے میں سامنے آیا کہ جو ملک اقوام متحدہ کی قراردادوں کو نظرانداز کرنے کی جسارت کر رہا ہو وہ ملک کس طرح مستقل رکنیت کے بعد اس کے چارٹر اور بین الاقوامی انصاف کیلئے کام کر سکتا ہے۔

1997ء میں ہی دونوں ممالک نے معاشی استحکام کے پیش نظر تجارتی تعلقات پر بھی زور دیا جس کے نتیجے میں کچھ وفود ایک دوسرے ممالک میں بھیجے گئے اور تجارتی پابندیاں کسی حد تک نرم کر دی گئیں تا کہ دونوں ممالک ایک دوسرے کے قریب آ سکیں۔ سمندری حدود کی خلاف ورزیاں کرتے ہوئے جو ماہی گیر دونوں ممالک میں قید کئے گئے تھے ان کو بھی باہمی تبادلے کے طور پر آزاد کر دیا گیا اور عوام نے اس عمل کو دونوں ملکوں کے عوام کیلئے ایک نیک شگون قرار دیا۔ گجرال حکومت کوئی واضح اور مستحکم فیصلہ کشمیر کے معاملے پر نہیں کر سکی اور نہ ہی اس کو اس بات کی اجازت تھی کیونکہ اس کی حکومت 13 سیاسی جماعتوں بالخصوص کانگرس کے ذریعہ بنائی گئی تھی جو کشمیر کے معاملہ میں واضح پالیسی رکھتی ہے جس کی قطعی حمایت حکومت کو اس سلسلے میں حاصل نہیں تھی کہ کشمیر کے مسئلے اور کشمیری مسلمانوں کے خود ارادیت کو تسلیم کیا جائے۔ گجرال حکومت کیلئے یہ بھی سب سے بڑا چیلنج تھا کہ وہ کس طرح پاکستان کے ساتھ تعلقات کو مضبوط کرے کیونکہ اس کے اتحادیوں کی اکثریت پاکستان کے خلاف تھی۔ گجرال یوں بھی اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ جا کر کشمیر کے معاملہ میں کوئی فیصلہ کر سکتے کیونکہ اس معاملہ میں ہندوستان کا مؤقف ہمیشہ سے بہت واضح طور پر مخالفانہ رہا تھا۔ ہندوستان اور پاکستان کے مابین مذاکرات اور پیش رفت میں مزید رکاوٹ اس وقت پیدا ہوئی جب گجرال حکومت کے خلاف خود ہندوستان کے اندرونی سطح پر بحران کا آغاز ہوا۔ اس بحران میں گجرال حکومت اور کانگرس کے مابین اختلافات اس وقت شروع ہوئے جب کانگرس نے حکومتی اتحاد میں شامل تامل ناڈو کی تنظیم اور سکھوں کی انتہا پسند تنظیم سے لاتعلقی کے اعلان کیلئے گجرال سے کہا جس پر گجرال نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ نتیجے میں کانگرس نے اپنی حمایت حکومت کے سلسلے میں واپس لے لی اور اس طرح 28 نومبر 1997ء کو گجرال نے وزارت عظمیٰ سے استعفیٰ پیش کر دیا مگر انہیں عبوری حکومت کیلئے نگران وزیراعظم بنا دیا گیا۔ مختلف سیاسی جماعتوں کو صدر نے حکومت بنانے کا حکم دیا لیکن کوئی مخلوط یا عبوری حکومت نہیں بنا سکا۔ جس کے بعد صدر نے گجرال کے مشورے سے لوک سبھا یعنی ''اسمبلی'' توڑنے کا اعلان کیا اور اس کے ساتھ ہی نئے الیکشن کا بھی اعلان کر دیا گیا۔ بھارت کے اس داخلی بحران کے نتیجے میں پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات میں سرد مہری آ گئی۔

Marfat.com

ایران میں منعقدہ آٹھویں اسلامی سربراہ کانفرنس میں بھارت نے مسلمانوں کے کشمیری رہنماؤں کو شرکت سے روک دیا جس پر اسلامی ممالک نے عموماً اور پاکستان نے خاص طور پر اپنا شدید ردعمل کا اظہار کیا۔ بھارت کے اس منافقانہ رویے پر بین الاقوامی سطح پر بھی خاص تنقید کی گئی۔ اسلامی ممالک کی کانفرنس میں کشمیر کے سلسلے میں ''اعلان تہران'' کے ذریعے مسلمانوں کا مؤقف واضح طور پر پیش کیا گیا تو بھارت سے کہا گیا کہ وہ کشمیر میں مسلمانوں کے خلاف اپنی وحشیانہ کارروائیاں بند کرے اور مسلمانوں کو ان کے بنیادی حقوق فراہم کرتے ہوئے ان کی خواہش کے مطابق زندگی بسر کرنے کا حق انہیں تفویض کرے۔ اس سلسلے میں ہندوستان میں ایران کے سفیر نے بھی ایک جداگانہ بیان کے ذریعے بھارت کے ردعمل کو رد کرتے ہوئے کہا کہ کشمیر میں بنیادی انسانی حقوق کی پاسداری بھارتی حکومت کرے اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کا احترام کیا جائے۔ 1996ء میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے مسئلہ کشمیر کو یہ کہہ کر ایجنڈے سے خارج کر دیا تھا کہ اس کی حیثیت ایک مردہ لکڑی سے زیادہ اور کچھ نہیں رہ گئی۔ ایجنڈے سے مسئلہ فلسطین سمیت اور کئی امور بھی قلمزد کئے گئے۔ اقوام متحدہ کے ہیڈکوارٹر میں یہ نوٹس کئی دنوں تک آویزاں رہا لیکن عالمی ادارے میں پاکستان سے مستقل مندوب مسٹر احمد کمال کو اس کی خبر نہ ہوئی۔ جب عالمی ذرائع ابلاغ کے ذریعے یہ اطلاع پاکستانی وزارت خارجہ کو ملی تو حکومتی ایوانوں میں کھلبلی مچ گئی۔

نیویارک میں پاکستان کے مستقل مندوب سے رابطہ کیا گیا وہ دوڑے دوڑے سلامتی کونسل کے صدر کے پاس گئے اور ان سے اس ''بے انصافی'' پر احتجاج کیا۔ سلامتی کونسل کے صدر کا کہنا تھا کہ اقوام متحدہ کے پاس مسائل کا انبار لگتا جا رہا ہے، کئی مسائل ایسے ہیں جو برسوں سے حل طلب پڑے ہیں اور اپنی افادیت کھو بیٹھے ہیں، جبکہ عصر حاضر کے نئے مسائل کی سنگینی نے دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔ ان کا مؤقف تھا کہ اقوام متحدہ کو مالی بحران کا بھی سامنا ہے متعدد ملک ایسے ہیں جو اپنے حصے کی رقم ادا نہیں کر رہے ہیں اور فنڈز کی کمی کی وجہ سے پرانے آپریشنز کو غیر معینہ مدت تک جاری رکھنا ممکن نہیں رہا، ان میں کشمیر کا مسئلہ بھی ہے جو سلامتی کونسل کے ایجنڈے پر کم و بیش نصف صدی سے موجود چلا آ رہا ہے اور سلامتی کونسل کشمیر کی کنٹرول لائن کی نگرانی کیلئے اپنے فوجی مبصرین کی ٹیم پر بھاری رقم خرچ کر رہی ہے جو موجودہ صورت حال میں ضروری نہیں۔ تاہم پاکستانی نمائندے نے منت سماجت کی اور سلامتی کونسل کے صدر کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ مسئلہ کشمیر کو مزید ایک سال کیلئے کونسل کے ایجنڈے پر رہنے دیا جائے۔ اگر ایک سال کے دوران مسئلہ کشمیر کے حل ہونے میں کوئی پیش رفت نہ ہوئی تو کونسل کو اسے اپنے ایجنڈے سے حذف کرنے کا اختیار ہوگا۔

مسئلہ کشمیر کو سلامتی کونسل کے ایجنڈے سے خارج کرنے کی کارروائی درحقیقت کشمیر کے بارے میں امریکہ کے خفیہ پروگرام کا ایک حصہ تھی جو اگرچہ فوری طور پر مکمل نہ ہو سکی۔ لیکن اب بلی تھیلے سے پوری طرح باہر آ گئی ہے اور امریکہ نے کھل کر اقوام متحدہ سے مطالبہ کر دیا ہے کہ اگر وہ اس سے اپنے واجبات وصول کرنا چاہتی ہے تو اسے کشمیر کی ''کنٹرول لائن'' پر متعین اقوام متحدہ کے 42 رکنی فوجی مبصرین کی ٹیم کو ختم کرنا ہوگا جس پر سالانہ لاکھوں ڈالر خرچ ہو رہے تھے۔ اس وقت امریکہ کے ذمے اقوام متحدہ کے ایک ارب ڈالر واجب الادا تھے امریکہ نے ایک مدت سے اقوام متحدہ کو اپنے ذمے

Marfat.com

فنڈز کی ادائیگی روک رکھی تھی۔ امریکی پالیسی سازوں کا کہنا تھا کہ اقوام متحدہ پر ایسے عناصر کا غلبہ ہو گیا ہے جو اسے اپنی مرضی کے مطابق چلانا چاہتے ہیں اور عالمی امن واستحکام کے بارے میں امریکی مئوقف مجروح ہو رہا ہے۔ اس لئے وہ عالمی ادارہ کی سرگرمیوں کیلئے فنڈز فراہم نہیں کر سکتا۔ واضح رہے کہ اقوام متحدہ کے تمام رکن ممالک ''حصہ بقدر جثہ'' کی بنیاد پر عالمی ادارے کو سالانہ اپنے حصے کی رقم فراہم کرنے کے پابند ہیں۔ بہت سے ملک اپنی یہ ذمہ داریاں باقاعدگی سے پوری کر رہے ہیں جبکہ متعدد ممالک ایسے بھی ہیں جو خود شدید مالی بحران سے دوچار ہیں اور اقوام متحدہ کا چندہ ادا نہیں کر سکتے اور بعض ملک ایسے ہیں جو قصداً اس میں تاخیر کرتے رہتے ہیں۔ امریکہ اقوام متحدہ کو سب سے زیادہ ادائیگی کرتا ہے لیکن کچھ عرصہ سے اس نے بھی فنڈز روک رکھے ہیں وہ عالمی ادارے کو اپنے اشارے پر چلانا چاہتا ہے۔ اس کی تازہ ترین مثال امریکہ کا یہ مطالبہ تھا کہ کنٹرول لائن سے اقوام متحدہ کے فوجی مبصرین کی ٹیم واپس بلائی جائے ورنہ اقوام متحدہ کو ادائیگی نہیں کرے گا۔ امریکی کانگرس کی خارجہ تعلقات کمیٹی نے اس سلسلے میں متعدد شرائط پر مشتمل دستاویز کو حتمی شکل دے دی۔ جس میں اقوام متحدہ کے اخراجات کو کم کرنے کے علاوہ دیگر عالمی امور کے بارے میں پالیسی درست کرنے کے مطالبات شامل تھے۔

امریکی ذرائع کے مطابق خارجہ تعلقات کمیٹی نے یہ تجویز بھی دی کہ اقوام متحدہ کے واجبات کی ادائیگی کا ایک پانچ سالہ پروگرام ترتیب دیا جائے اور امریکی صدر ہر سال کانگرس کے نام پر ایک سرٹیفکیٹ جاری کریں جس میں اس بات کی تصدیق کی جائے کہ اقوام متحدہ امریکی شرائط پوری کر رہا ہے۔ ان شرائط میں کنٹرول لائن سے فوجی مبصرین واپس بلانے کی شرط سب سے زیادہ اہم تھی۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ بھارت کنٹرول لائن پر فوجی مبصرین کی موجودگی کا کبھی حامی نہیں رہا۔ اس نے آج تک جنگ بندی کی کسی خلاف ورزی کی اقوام متحدہ سے کوئی شکایت نہیں کی' جبکہ پاکستان بھارت کی طرف سے ہونے والی ہر خلاف ورزی سے اقوام متحدہ کے فوجی مبصرین کو آگاہ کرتا ہے اور انہیں آزاد کشمیر کی جانب سے کنٹرول لائن کا دورہ کرنے کی سہولت فراہم کرتا ہے۔ فوجی مبصرین کا موسم سرما کا ہیڈ کوارٹر راولپنڈی میں اور گرمائی ہیڈ کوارٹر سری نگر میں ہے' اور وہ کشمیر کے دونوں حصوں میں آتے جاتے رہتے ہیں' لیکن مقبوضہ کشمیر کی جانب سے انہیں کنٹرول لائن پر آنے اور سرحدوں کا دورہ کرنے کی اجازت نہیں۔ 1995ء میں جب کنٹرول لائن پر بھارت کی اشتعال انگیزی حد سے بڑھ گئی تھی تو پاکستان نے اقوام متحدہ سے مطالبہ کیا تھا کہ کنٹرول لائن پر فوجی مبصرین کی تعداد بڑھائی جائے تاکہ وہ پورے علاقے کی نگرانی کر سکیں۔ انہی دنوں یہ واقعہ بھی پیش آیا کہ جب فوجی مبصرین کنٹرول لائن کا دورہ کر رہے تھے تو بھارتی فوج نے شدید فائرنگ شروع کر دی اور ان کے ہیلی کاپٹر کو جان بوجھ کر نشانہ بنایا گیا۔ چنانچہ ہیلی کاپٹر کی ایمرجنسی لینڈنگ کے ذریعے ان کی جان بچائی گئی۔ اس واقعہ پر فوجی مبصرین کے احتجاج کے باوجود بھارت نے کوئی پرواہ نہ کی' بلکہ یہ کہا کہ ہم کنٹرول لائن پر ان مبصرین کی موجودگی کے قائل ہی نہیں ہیں' انہیں واپس چلے جانا چاہئے۔ اب امریکہ کی طرف سے فوجی مبصرین کو ہٹانے کے مطالبے پر اصرار سے ظاہر ہوتا تھا کہ کشمیر کے بارے میں امریکہ اور بھارت کا ایجنڈا ایک ہی ہے۔ اور امریکہ بھارت کو اعتماد میں لے کر کشمیر کے بارے میں اپنی پالیسی پر عمل کر رہا تھا۔

Marfat.com

بھارت میں سیاسی بحران کے نتیجے میں قائم ہونے والی گجرال حکومت سے سادہ لوح لوگ بہت سی امیدیں لگا بیٹھے تھے۔ وہ اس غلط فہمی کا شکار ہو گئے تھے کہ شاید خوش نوا اور خوش مقال گجرال مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کی کوئی سنجیدہ خواہش رکھتے ہیں' وہ کوئی مثبت اقدام اٹھائیں گے۔ جہلم میں پیدا ہونے والے اندر کمار گجرال کو بعض لوگوں نے تو خوش فہمی میں ''پاکستانی'' تک کہہ دیا تھا۔ دیوگوڑا کے وزیر خارجہ کے طور پر ان کے بیانات سے پتہ چلتا تھا کہ وہ علاقے میں پائیدار امن کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں۔ لیکن 27 اپریل کو جموں اسٹیڈیم میں انہوں نے جو کچھ کہا وہ ان لوگوں کی آنکھیں کھولنے کیلئے کافی ہے جو مذاکرات کی میز پر بیٹھ کر کشمیر کا قضیہ حل کرنے کی آس لگائے بیٹھے تھے۔ گجرال نے جموں میں اپنے دل کی غلاظت کا اظہار کیا اور اپنے پیش روؤں سے ایک قدم آگے بڑھ کر پاکستان سے نفرت کا اعلان بھی کیا۔

وزیر اعظم بننے سے صرف پانچ روز بعد گجرال جموں یونیورسٹی کے کانوکیشن میں شرکت کرنے کیلئے مقبوضہ جموں پہنچے تو ان کے اعزاز میں دو دن پہلے ہی دہلی سے تازہ کمک منگوائی گئی تھی۔ سیکورٹی کے سخت ترین انتظامات کیے گئے تھے۔ اسٹیڈیم اور شہر میں دس ہزار سے زائد فورس اور سیکورٹی کے دستے مسلسل گشت پر تھے۔ مجاہدین کی طرف سے کسی ممکنہ حملے سے بچنے کیلئے جموں اسٹیڈیم میں طیارہ شکن توپیں بھی نصب تھیں۔ مسٹر گجرال خطاب کرنے آئے تو شہر فوجی چھاؤنی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ اسی اسٹیڈیم میں 26 جنوری 1994ء کو حزب المجاہدین کے جانبازوں نے عین پریڈ کے موقع پر دو زوردار دھماکے کئے تھے' جن میں گیارہ اعلیٰ فوجی افسر اور دو سول افسر ہلاک اور درجنوں زخمی ہو گئے تھے۔

گزشتہ دو ماہ کے دوران بھی جموں شہر میں دو درجن سے زائد دھماکے ہو چکے تھے۔ فوج کی طرف سے حفاظتی انتظامات کا نقصان یہ ہوا کہ شہر کے لوگ تقریب میں شرکت کیلئے نہ آئے' فوجی انتظامات پر عوام کو بھروسہ نہیں رہا۔ مجاہدین کے حملے سے بچنے کیلئے آخری وقت تک گجرال کے دورے کو صیغہ راز میں رکھا گیا۔ گجرال کے دورے کی وجہ بھی ڈولتی کرسی کو مضبوط کرنے کی خواہش تھی۔ بی جے پی جو بھارتی پارلیمنٹ میں سب سے بڑی اپوزیشن جماعت ہے' مسٹر گجرال کے خلاف تحفظات رکھتی ہے' ان کے وزیر اعظم بننے پر انہوں نے اعتراض کیا اور کہا کہ کسی شرنارتھی (مہاجر) کو ملک کا سب سے بڑا عہدہ سونپ دینا دانشمندی نہیں۔ یاد رہے مسٹر گجرال پاکستان سے پناہ گزین بن کر بھارت آئے تھے۔ ہندو ہونے کے باوجود شرنارتھیوں کو بھارت میں ''وفادار'' شہری نہیں سمجھا جاتا۔ مسٹر گوڑا کشمیر پالیسی کی وجہ سے کانگرس کے ہاتھوں ''قتل'' ہو گئے تو مسٹر گجرال کیلئے کشمیر پر اپنی ''وفاداری'' کا اظہار ضروری ہی نہیں لازم تھا' خصوصاً وہ بی جے پی کو یہ بتانا چاہتے تھے کہ تمہارا میرے حق میں پروپیگنڈا درست نہیں۔ چنانچہ جموں آتے ہی مسٹر گجرال کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی اور سینے میں چھپا ہوا ہندو باہر آ گیا۔ اپنی تقریر میں مسٹر گجرال نے کہا کہ کشمیر سرے سے کوئی مسئلہ ہی نہیں اور کشمیر بھارت کا اٹوٹ حصہ ہے۔ دشمن سے ہماری تین جنگیں ہو چکی ہیں اور اب اس نے چوتھی جنگ شروع کر دی ہے اور بھارت اس جنگ کا مقابلہ کرے گا۔ انہوں نے ''علیحدگی پسندوں'' سے کسی قسم کے مذاکرات کرنے سے بھی صاف انکار کر دیا۔ اپنے احساس کمتری کو الفاظ کے پردے میں چھپاتے ہوئے گجرال نے کہا...... ''بھارت ایک عظیم ملک ہے جہاں ایک پناہ گزین بھی ملک کا وزیر اعظم بن سکتا ہے۔ جبکہ بھارت چھوڑنے والوں کو ہتک آمیز اصطلاح ''مہاجر'' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ جموں میں موجود مفرور کشمیری پنڈتوں کو مخاطب کرتے ہوئے بھارت کے وزیر اعظم نے کہا' وہ واپس وادی

Marfat.com

جانے کی تیاری کریں اور حکومت ان کی ملازمت اور وقار بحال کرنے کی پابند ہے' چاہے اس کیلئے خزانے پر کتنا ہی بوجھ پڑے۔ انہوں نے کہا کہ دشمن ملک بھارت کے ٹکڑے کر دینا چاہتا ہے مگر اسکے عزائم کو مکمل نہیں ہونے دیا جائے گا۔ جن لوگوں نے مسٹر گجرال کے وزیر خارجہ کے طور پر بیانات سنے تھے اور اس سے بھی پہلے 95ء میں پاکستان کے دورے کے دوران خیر سگالی کے الفاظ یاد تھے' ان کیلئے یہ روپ انوکھا تھا۔ انہوں نے اسلام آباد اور دہلی کو نزدیک کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی حقیقت یہ ہے کہ مسٹر گجرال دیوگوڑا سے بھی کمزور وزیر اعظم تھے۔ پارٹی کے اندر اور باہر انہیں زبردست دباؤ کا سامنا تھا۔ وہ اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ کشمیر کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتے۔

پاکستان کی طرف سے اس بھارتی لہجے کے جواب میں خیر سگالی کا مظاہرہ دیکھنے میں آیا، بھارتی وزیر اعظم کو نواز شریف نے جس لہجے میں ''السلام علیکم'' اور ''مبارک سلامت'' کہا' اہل کشمیر نے اسے پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا۔ ان دنوں پاکستان کی کرکٹ ٹیم بھارت کا دورہ بھی کر رہی تھی جسے کشمیری عوام نے پسند نہیں کیا۔

مئی میں مالدیپ میں ہونے والے سارک سربراہی اجلاس میں پاکستانی اور بھارتی وزیر اعظم میں ہونے والی بات چیت کے حوالے سے مجاہدین کشمیر کے نمائندہ جریدے ''جہاد کشمیر'' نے جو اداریہ لکھا۔ جس کا عنوان تھا:

مذاکرات یا جہاد

پاکستان کے وزیر اعظم نواز شریف نے مالدیپ میں بھارتی وزیر اعظم سے ملاقات کی۔ ملاقات کے بعد انہوں نے صحافیوں کو بتایا...... ''بات چیت بہت تعمیری اور مفید رہی...... ہم گزشتہ نصف صدی کے لاینحل مسائل کے حل پر رضامند ہوگئے ہیں...... مشترکہ ورکنگ گروپ قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔'' ان مذاکرات میں دونوں وزرائے اعظم مستقبل میں مسلسل اور مستقل رابطے رکھنے کیلئے ہاٹ لائن قائم کرنے پر بھی متفق ہوئے۔ باہمی رضامندی سے چھ سات سو سال قیدیوں کی رہائی کا فیصلہ بھی کیا گیا ہے اور آئندہ ماہ اسلام آباد میں خارجہ سیکرٹریوں کی سطح پر مذاکرات کا دوسرا دور شروع کرنے پر بھی رضامندی ظاہر کی گئی ہے۔ تاہم پاکستان کے سیکرٹری خارجہ نے یہ بھی کہا ہے کہ جون میں ہونے والے مذاکرات سے مسئلہ کشمیر کے بارے میں زیادہ توقعات وابستہ کرنا مناسب نہ ہوگا۔

گویا یہ مذاکرات طرفہ تماشا ہیں جن سے مسئلہ کشمیر کے سلجھنے کی کوئی امید نہیں' بھارت بھی ابھی تک اٹوٹ انگ کی رٹ پر قائم ہے اور پاکستان کے دفتر خارجہ کی جانب سے یہ اعتراف کر دیا گیا ہے کہ ان مذاکرات سے مستقبل قریب میں کسی پیش رفت کی کوئی توقع نہیں۔ سوال یہ ہے کہ مسئلہ کشمیر کے بغیر مذاکرات کا مقصد کیا ہے......؟ دونوں ملکوں کے درمیان تمام نزاعات اور مسائل کی جڑ تو کشمیر ہے جس کے حل ہونے سے باقی مسائل آپ سے آپ حل ہو سکتے ہیں' تجارت کے رشتے بحال ہو سکتے ہیں' دشمنی ختم اور دوستی شروع ہو سکتی ہے اور دفاع پر اٹھنے والا زرکثیر کم ہو سکتا ہے۔ حیرانی تو اس بات پر ہے کہ نواز شریف کشمیر کے بغیر ہی بات چیت کو ''تعمیری اور مفید'' قرار دے رہے ہیں۔ مسٹر گجرال نے ملاقات سے پہلے بار بار کشمیر کو بھارت کا ناقابل تقسیم حصہ قرار دے کر ماحول کو خراب کرنے کی اپنی سی کوشش کی' مگر نواز شریف بدمزہ نہ ہوئے' اس کے باوجود کہا...... ''مسٹر گجرال مجھے بہت پسند ہیں۔''

اس مرحلہ پر حکومت پاکستان سے پوچھا جانا چاہئے کہ بے مقصد و بے نتیجہ مذاکرات کیوں ہو رہے ہیں اور اس

Marfat.com

سے پاکستان کو کیا ملے گا؟ ہمیں معلوم ہے اس سوال کا جواب پاکستانی وزیر اعظم کے پاس بھی نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ صاف نظر آتا ہے مذاکرات کے گھوڑے کی باگ ان کے ہاتھ میں نہیں' وہ کسی اور کے ایجنڈے پر عمل کر رہے ہیں۔ ورنہ پاکستانی عوام نے انہیں مینڈیٹ دیتے ہوئے کشمیر پر سودا بازی کی اجازت نہیں دی تھی۔ کشمیری عوام بھی ایسے مذاکرات کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں جن میں انہیں نمائندگی نہ ملے۔ ان کی واحد نمائندہ سیاسی جماعت آل پارٹیز حریت کانفرنس پہلے ہی ان مذاکرات کو مسترد کر چکی ہے مجاہدین کشمیر کی تمام تنظیمیں بھی ان مذاکرات کو رد کر چکی ہیں...... پھر بھی نواز شریف مذاکرات کے اس ڈرامے میں شرکت پر مصر ہیں' تو ظاہر ہے کوئی اور ہی طاقت ہے جس کا دباؤ ان کو بے مقصد مذاکرات میں حصہ لینے پر مجبور کر رہا ہے۔

مجاہدین کشمیر اس بات کے سب سے زیادہ مستحق تھے کہ ان سے پوچھا جاتا کہ آیا موجودہ حالات میں اور ان شرائط کے ساتھ مذاکرات مناسب ہیں؟ مجاہدین کا کہنا ہے کہ وہ ان مذاکرات کو تحریک جہاد ختم کرنے کی سازش سمجھتے ہیں۔ 8 مئی کو اسلام آباد میں مجاہدین کی جماعت لشکر طیبہ کی طرف سے بلائے گئے ایک سیمینار میں تمام جہادی تنظیموں کے قائدین موجود تھے۔ ان سب نے مذاکرات کو متفقہ طور پر مسترد کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ مذاکرات سے پہلے کچھ ملا ہے نہ آئندہ کچھ حاصل ہوگا۔ بھارت سے کشمیر بزور شمشیر ہی لیا جا سکتا ہے اور مجاہدین اسی کام میں مصروف ہیں۔ اپنے جہاد کے سلسلے میں مجاہدین کشمیر نہایت حساس ہیں۔ کوئی بھی قوت چاہے دوست ہو یا دشمن انہیں جہاد سے روکنے کی کوشش کرے گی تو وہ اسے معاف نہیں کریں گے۔ بے شک انہیں اسلحے کی شدید کمی کا سامنا ہے' لیکن اس سے ان کا جہاد رکا نہیں' اب وہ دشمن کے اسلحے سے لڑ رہے ہیں۔ بھارت کی سات لاکھ فوج ان کے دباؤ سے پریشان ہو کر سمٹ رہی ہے۔ چنانچہ پہلے ان کے جو کیمپ جگہ جگہ نظر آتے تھے' اب بڑے بڑے کیمپوں میں بدل گئے ہیں۔ فوج دور دراز جنگلوں سے بھاگ کر ان کیمپوں میں سمٹ آئی ہے اور مجاہدین کی جرأت و ہمت کا یہ عالم ہے کہ فوجی کیمپوں کے اندر گھس کر کارروائیاں کرتے اور اعلیٰ افسروں کو قتل کر کے چلے جاتے ہیں۔ دشمن بے پناہ طاقت کے استعمال سے بھی مجاہدین کے سیل بے پناہ کے آگے بند باندھنے میں ناکام ہو گیا ہے۔ اسی لئے پوری دنیائے کفر (الکفر ملتہ واحدہ) متحد ہو کر بھارتی فوج اور حکمرانوں کی پشت پناہی کر رہی ہے۔ یہی عالم کفر حکومت پاکستان پر دباؤ ڈال رہا ہے کہ وہ بھارت سے مذاکرات کرے۔

مجاہدین کشمیر مذاکرات کو بلاوجہ مسترد نہیں کرتے۔ وہ جانتے ہیں کہ مذاکرات سے یہ مسئلہ پچاس برس سے حل نہیں ہو سکا نہ آئندہ پچاس برسوں یا ایک صدی میں حل ہوگا۔ 1948ء میں مجاہدین نے جہاد کے ذریعے ہی وہ خطہ آزاد کرایا تھا جسے آج ہم آزاد کشمیر کہتے ہیں یا جو "شمالی علاقہ جات" کے نام سے موسوم ہے۔ اس کے بعد ہم نے جہاد ترک کر دیا تو نصف صدی سے ہم کشمیر کا ایک انچ حصہ بھی آزاد نہیں کرا سکے۔ اب اگر پھر کشمیر میں جہاد آزادی شروع ہوا ہے اور کشمیر کی آزادی کا پھر امکان پیدا ہو گیا ہے تو جہاد کو مذاکرات میں بدلنے کا فائدہ کون اٹھائے گا؟ گزشتہ آٹھ برس میں مٹھی بھر کشمیری مجاہدین نے نہتے ہونے کے باوجود جس طرح اپنی جنگ لڑی ہے' اس سے نہ صرف پاکستان اور کشمیر میں بلکہ پوری امت کے اندر امید کی شمع روشن ہو گئی ہے۔ یہ اللہ کا خصوصی فضل اور نصرت ہے کہ مشکل ترین حالات میں کشمیر کا جہاد جاری و ساری ہے۔ دنیا دیکھ رہی ہے اور جان اور مان رہی ہے کہ یہ جہاد اپنی فطری ترتیب و تدریج سے کامیابی کی منزل

Marfat.com

کی طرف بڑھ رہا ہے۔ حالات مجاہدین کے حق میں سازگار ہو رہے ہیں اور بھارت کی مشکلات بڑھ رہی ہیں۔ بلاشبہ سرزمین کشمیر پر پچاس برس سے مسلسل مسلمانوں کو نشانہ ستم بنایا جا رہا ہے اور وہ آج بھی وہاں سات لاکھ کفار کی فوج کے نرغے میں گھرے ہوئے ہیں۔ لیکن آج ان کے سامنے دو ہی راستے ہیں یا تو اپنی اسلامیت کا گلا اپنے ہاتھوں سے گھونٹ کر مشرکین ہندوستان کے سامنے سپر ڈال دیں یا پھر سر دھڑ کی بازی لگا کر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اس بات کا فیصلہ کر دیں کہ سرزمین کشمیر پر فرزندان توحید کو رہنا ہے یا کفار بھارت کو۔ ان کے سامنے دنیا کی طرف سے ترغیبات تو یہ ہیں کہ ''دہشت گردی'' چھوڑ دیں...... ''مذاکرات'' کریں اور سپر ڈال دیں...... لیکن ان کے خالق و مالک کا حکم یہ ہے کہ اپنی قلت تعداد' بے سروسامانی اور کفار کی کثرت اور ان کے سامان حرب وضرب کو دیکھ کر ہمت نہ ہاریں۔ ان کے آگے صلح کی پیش کش کر کے کمزوری کا اظہار نہ کریں۔

''پس تم بودے نہ بنو اور صلح کی درخواست نہ کرو' تم ہی غالب رہنے والے ہو' اللہ تمہارے ساتھ ہے اور وہ تمہارے اعمال کو ہرگز ضائع نہ کرے گا۔'' (محمد۔35)

اسی امید پر اہل کشمیر پوری ہمت اور جرأت سے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں' اللہ کی نصرت کے اسی وعدے پر وہ اپنی جانیں بھی لے کر آ گئے ہیں اور مال بھی قربان کر رہے ہیں...... بچے بھی ذبح کرا رہے ہیں اور آبروئیں بھی لٹا رہے ہیں۔ ان حالات میں کہ مجاہدین ڈٹے ہوئے ہیں ہمارے وزیراعظم اور وزیر خارجہ پر کیا افتاد پڑ گئی کہ حوصلہ ہار بیٹھے ہیں۔ یہ کہیں شرم کی بات ہے۔ گزشتہ آٹھ برس میں ایک مظلوم نہتی قوم تو بھارت کے آگے نہیں جھکی...... جس کے پاس ہتھیار بھی نہیں اور کھانے پینے کیلئے بھی کچھ نہیں...... وہ جنگلوں میں لڑ رہی ہے...... سات لاکھ فوج بھی اس کے حوصلہ پست نہیں کر سکی۔ مگر پاکستانی حکام اپنے آرام دہ محلات میں بیٹھے ہوئے خوف سے کانپ رہے ہیں۔ آج اگر دنیا بھر میں ملت کفر متحد ہو کر بھارتی فوج کی کشمیر میں پھنسی ہوئی گردن آزاد کرانا چاہتی ہے تو ہمارے وزیراعظم کیوں بھارتی فوج کی امداد کر رہے ہیں۔ امریکہ کی طرف سے مسلط کردہ یہ بے معنی مذاکرات ہمارے لئے اتنے مقدس کیوں ہو گئے ہیں کہ ہم ان کیلئے جہاد کو ترک کرنے پر بھی آمادہ ہیں؟

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو امن' جنگ' صلح اور مذاکرات کیلئے باقاعدہ شرائط کا پابند کیا ہے' خصوصاً کفار سے دوستی کرنے کو منع کیا ہے۔ دوستی تو کجا ان سے بغض و نفرت رکھنے کی تعلیم دی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اہل ایمان کیلئے قرآن میں جہاں ماڈل قرار دیتے ہوئے کہا گیا...... ''تمہارے لئے ابراہیمؑ میں بہترین اور لائق تقلید نمونہ ہے۔'' وہاں ابراہیم علیہ السلام کی ارفع خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کی زبان سے کفار کو ان الفاظ میں خطاب کیا گیا:

''ہم تم سے بے زار' ہم تمہارے انکاری' آج سے ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ ہمیشہ کیلئے دشمنی اور بغض شروع ہوتا ہے۔'' گویا کفر سے دشمنی' بغض و عداوت ہر مسلمان کے عقیدے کا حصہ ہونا چاہئے۔ اگر ہم مسلمان ہیں اور سنت ابراہیمؑ کے پیروکار ہیں' تو کسی اسلام دشمن (گجرال) کیلئے پسندیدگی کی گنجائش کہاں نکل سکتی ہے؟ جس شخص کے ہاتھوں اسلام کی بیٹیوں کی عزت تار تار ہو رہی ہے اسے سلامتی اور امن کے پیغام بھیجے جا رہے ہیں' اس سے ہاٹ لائن کے رشتے استوار کئے جا رہے ہیں۔ اس سے مذاکرات ہو رہے ہیں اور کشمیر کے بغیر مذاکرات ہو رہے ہیں۔ اب اصل خطرہ یہ

Marfat.com

ہے کہ کشمیر کے بغیر کوئی معاہدہ بھی نہ کرلیا جائے۔ ہمارا مشورہ ہے کہ نواز شریف صاحب اس آگ میں کودنے سے پہلے اس معاملے کے تمام پہلوؤں پر اچھی طرح غور کرلیں۔ کہیں ایسا نہ ہو ان کے ہاتھوں کشمیر میں جہادی تحریک ہی کو ٹھکانے کا پروگرام بن رہا ہو اور وہ ''معصومیت'' سے دوسروں کے ہاتھوں میں کھلونا بن جائیں۔ جس طرح ہمارے دشمن نے افغان جہاد کو بعض عاقبت نااندیش افغان رہنماؤں کے ہاتھوں ناقابل تلافی نقصان پہنچایا تھا اسی طرح کشمیر کے جہاد کو سبوتاژ کرنے کی سازش کی جارہی ہے۔ اگر ایسا ہوا تو یہ ملک وقوم کی بدقسمتی ہوگی اور تاریخ میں یہ سیاہ کارنامہ ہمیشہ کیلئے ثبت ہو جائے گا کہ عوام نے جس شخص کو بھارتی مینڈیٹ کا تاج پہنایا' اس نے کند چھری سے انہیں ذبح کردیا۔

نواز شریف صاحب کے کان اگر نصیحت کیلئے بند نہیں ہوگئے تو انہیں ہمارا مشورہ ہے کہ وہ جہاد کیلئے تیاری کریں...... کشمیر جہاد سے آزاد ہوگا۔ صلح اور دوستی کا دور لدگیا۔ اب ہم کسی شملہ معاہدے کیلئے مجبور نہیں' اب تو انشاء اللہ ہمارے مجاہدین اپنے لہو سے معاہدات رقم کریں گے۔ ان معاہدوں میں اہل کفر کیلئے بربادی' ہلاکت اور ناکامی جاوید ہوگی۔ اب ہمیں ان سے صلح کیلئے درخواست نہیں کرنی' یہ بودا بن کر اور موت سے خوف زدہ ہوکر معافی مانگنے کا وقت نہیں' اب تو کفر ہمارے نرغے میں ہے' اب تو وہ صلح کیلئے درخواستیں کرے گا۔ مگر ابھی صلح نہیں' ابھی الٹی ہوئی آبروؤں کا حساب باقی ہے۔ ابھی تو ہمارے دلوں سے لہو رس رہا ہے...... ابھی تو لازم ہے کہ سرکشوں کے سر کاٹیں اور ظالموں کی گردنیں ماریں:

''پس جب ان کافروں سے تمہاری مڈبھیڑ ہو تو پہلا کام گردنیں مارنا ہے' یہاں تک کہ جب تم ان کو اچھی طرح کچل دو' تب قیدیوں کو مضبوط باندھو' اس کے بعد (تمہیں اختیار ہے) احسان کرو یا فدیے کا معاملہ کرو' تاآنکہ لڑائی اپنے ہتھیار ڈال دے۔ یہ ہے تمہارے کرنے کا کام۔'' (اداریہ جہاد کشمیر۔16 مئی 1997ء)

ان دنوں پاک بھارت تجارت پر بھی بہت زور دیا جارہا تھا اس تحریک کا محرک امریکہ تھا۔ میں نے پاک بھارت تجارت کے عنوان سے 1997ء کے حالات میں یہ مضمون لکھا۔

''پاک ہند تجارت کا مسئلہ اپنے مضرات اور نتائج کے اعتبار سے کثیر الجہتی ہے' جبکہ عموماً اسے سطحی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ سطحیت موجودہ حالات میں خطرناک ہوسکتی ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس مسئلے کے سارے پہلوؤں پر اچھی طرح غور و خوض کرلیں۔ برصغیر کی صنعتی اور تجارتی زوال کی یوں تو کئی وجوہ تھیں' مگر بنیادی وجہ یہ تھی کہ انگریزوں نے ہندوستان کو اس کے روایتی زمینی راستوں سے محروم کردیا۔ ہندوستان کی تجارت چین کے ساتھ تھی اور اس کیلئے ہندوستان شاہراہ ریشم والا راستہ اختیار کرتا تھا۔ زمینی راستوں سے ہی یورپ سے بھی تجارت ہوتی تھی۔ مشرق وسطی کے ساتھ تجارت کیلئے بھی زمینی ذرائع اور راستے موجود تھے۔ اس لئے ہندوستان نے کبھی سمندری راستوں کا سہارا نہیں لیا' لیکن جب ایک سمندری قوت نے غلبہ حاصل کیا' یعنی انگریزوں نے سمندر کے ذریعے تجارت شروع کردی جو بری راستے استعمال ہی نہیں کرنا چاہتے تھے' تو ہندوستان کے تجارتی روابط دنیا بھر سے منقطع ہوگئے۔ اس کے بجائے انگریز نے ہندوستان کو سمندری رابطے سے صرف یورپ سے وابستہ کرلیا۔ اس زمانے میں زار روس' سلطنت برطانیہ اور سلطنت ہند کے درمیان کافی عرصے تک سرد جنگ کی کیفیت رہی۔ شمال سے روسی وسط ایشیا میں بڑھے چلے جارہے تھے تو جنوب سے برطانیہ نے

Marfat.com

شمال کی طرف بڑھنے کی کوشش کی۔ یہ دونوں یورپی قوتیں تھیں۔ایک زمینی راستہ استعمال کر رہی تھی دوسری سمندری' لیکن "Great Game" کے نتیجے میں زمینی راستے منقطع ہوتے چلے گئے۔ حالانکہ زمین کے راستے سستے' محفوظ' موزوں اور منافع بخش تھے۔رفتہ رفتہ ہندوستان ان زمینی رابطوں اوران خطوں کی تجارت سے محروم ہوگیا جواس سے جڑے ہوئے تھے۔

آج کی صورت حال یہ ہے کہ تاریخ نے دوبارہ اپنا پورا چکر کاٹ لیا اور پھر اسی مقام پر آ کھڑی ہوئی ہے' حالانکہ ''گریٹ گیم'' ختم ہو چکی ہے۔ بیچ میں کیمونسٹ روس کا دور آیا۔اس کا بہت زور و شور سننے اور دیکھنے میں آیا' لیکن یہ معجزہ افغان جہاد نے دکھایا کہ ایشیا پر استعماریت کا پرچم دوبارہ لہرانے کا خواب دیکھنے والی روس ایمپائر اپنے خوابوں سمیت ٹوٹ گئی اور اس خطے کے ممالک میں دوبارہ روابط پیدا ہونے لگے۔اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وسط ایشیا کے وسیع و عریض ممالک پر مشتمل بہت بڑا ایک خطہ زمین اپنے بے پناہ قدرتی وسائل اور صنعت و تجارت کے بے شمار امکانات سمیت ہمارے سامنے کھلا ہے۔ یہ دنیا کا واحد ایسا خطہ ہے جہاں وسائل و ذرائع بے شمار ہیں اور آبادی بہت کم۔توانائی کے وسائل جو آج کل کے جدید دور میں صنعتی پیداوار کیلئے کلیدی ضرورت سمجھے جاتے ہیں' وہ بھی وسط ایشیا میں موجود ہیں اور یہ وسط ایشیا ہم سے متصل بھی ہے۔اس تناظر میں پاک بھارت اقتصادی حالات کو دیکھیں اور امکانات پر نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے ہندوستان افرادی قوت کے لحاظ سے وسیع ذرائع رکھتا ہے اور خود ایک مارکیٹ بھی ہے۔ پاکستان اپنے محل وقوع کے لحاظ سے بھارتی مین پاور و مارکیٹ اور تجارتی و صنعتی لحاظ سے وسیع امکانات کے حامل وسط ایشیا کے بیچ ایک زنجیر کی حیثیت رکھتا ہے۔اس خطے کے اندر وہ تمام عوامل یکجا ہو گئے ہیں جو اقتصادی طور پر مستقبل کیلئے بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ بالکل واضح ہوگیا ہے کہ پاکستان کو مستقبل کی عظیم اقتصادی قوت (Economic Giant) بننا ہے اور بہت سی مضبوط طاقت حاصل کرنی ہے۔

بھارت کے پردے میں امریکہ:

اس پس منظر کے بعد آیئے اب یہ دیکھتے ہیں کہ اس وقت کہ جب کشمیر میں آزادی کی تحریک زوروں پر ہے' بھارتی افواج کی طرف سے کشمیری مسلمانوں پر ظلم و زیادتی کا سلسلہ جاری ہے' پاکستان اور بھارت میں یہ براہ راست تجارت کا ایشو کیسے اٹھا' کیونکہ ہندوستان کے ساتھ تو پچھلے پچاس سال سے ہمارا تجارتی حجم (Voliume of trade) بہت کم ہے۔اس کی سب سے بڑی وجہ وہی ہے جو ہم کہتے آئے ہیں کہ جب تک کشمیر کا مسئلہ حل نہیں ہوتا بھارت کے ساتھ تجارت نہیں چلے گی کیونکہ اگر تجارت ہوگی تو ثقافتی روابط بھی بڑھیں گے' آنا جانا بھی شروع ہو جائے گا اور کشمیر کا مسئلہ انتہائی پس منظر میں چلا جائے گا۔کشمیر کی موجودہ تحریک آزادی اور اس کے خلاف بھارت کے ظالمانہ ردعمل نے تو اسے مزید مشکل بنا ڈالا ہے۔ہم نے پچاس ہزار شہیدوں کے لہو سے کیسے بیوفائی کر سکتے ہیں؟ ہم نے پچاس سال تک تجارت نہیں کی' آج ہم محض پیاز' آلو اور چینی کی خاطر اپنی آزادی اور اپنی شہ رگ کو قربان کر دیں؟ جہاں تک صنعتی اشیاء کا تعلق ہے اس میں اگر ہم اپنے تاجروں کو تحفظ فراہم نہیں کرتے تو ہماری صنعت اس پوزیشن میں نہیں کہ ہم اپنی برآمدات بڑھا سکیں۔ہم نے بار بار اپنے روپے کی قیمت میں اس لئے کمی کی' تاکہ ہماری برآمدات بڑھیں۔ جیسے بھٹو صاحب نے 1977ء میں روپے کو

Marfat.com

137 فیصد ڈی ویلیو کر دیا۔ اس مفروضے پر کہ برآمدات میں اضافہ ہوگا' لیکن ساتھ ہی انڈسٹری کو تو میا لیا۔ ڈی ویلیو کرنے سے آپ کی ایکسپورٹ بڑھتی مگر جب آپ نے تحفظ ہی ختم کر دیا تو ایکسپورٹ کیا ہوتی۔ یہ ایسی غلط ہے جس کی کوئی توجیہ پیش نہیں کی جاسکتی۔ اب سوال یہ ہے کہ برآمدات میں اضافے کے امکانات کے بغیر گھٹیا آلو پیاز اور پلی چینی کیلئے پاکستان تجارت کیوں کرے؟۔ بھارت کی صنعتی اشیاء کیوں منگوائے جب کہ ہمارے صنعت کاروں کو تحفظ بھی حاصل نہیں؟

دراصل اس پورے کھیل کے پردے میں امریکہ کی اپنی خواہشیں پوشیدہ ہیں۔ بھارت کے خصوصی حالات اور کشمیر کے پس منظر میں یہ ہندوستان کی اپنی خواہش بھی ہے کہ وہ ہم سے تجارتی تعلقات استوار کرے۔ یہ اس کی دیرینہ خواہش ہے مگر اس کو ہم رد کرتے آئے ہیں' لیکن یہ آج محض بھارت کی نہیں بلکہ یہ امریکہ کی اپنی اشد ضرورت بن گئی ہے۔ امریکیوں کا اپنا مسئلہ یہ ہے کہ دنیا بھر میں ان کی تجارت فروغ پائے اور ان کی اشیاء فروخت ہوں۔ ہندوستان کے بارے میں امریکیوں کا غلط یا صحیح تصور یہ ہے کہ اس کی 350 ملین (35 کروڑ) آبادی مڈل کلاس میں داخل ہو چکی ہے اور اس آبادی کے پاس چھوٹی چھوٹی چیزیں خریدنے کی طاقت موجود ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ امریکہ کے اندر بیٹھ کر ان 35 کروڑ ''خریداروں'' کیلئے چیزیں تیار نہیں کی جاسکتیں۔ امریکہ میں مزدوری کے مصارف بہت زیادہ ہیں۔ اس لئے وہ بیرونی منڈیوں میں سستی اشیاء بیچنے والے ممالک سے مسابقت نہیں کر سکتا۔ ہندوستان' پاکستان اور وسط ایشیا کی منڈی میں امریکی اشیاء صرف سی صورت میں فروخت ہوسکتی ہیں کہ ان کی تیاری پر لیبر چارجز کم سے کم ہوں اور یہ مقصد اس طرح حاصل ہوسکتا ہے کہ اس کی بین الاقوامی صنعت ساز کمپنیاں اس افرادی قوت اور مارکیٹ (بھارت) میں اپنی صنعتیں قائم کریں۔

اب تک امریکہ کے باہر صرف ہتھیار بنانے کی صنعت میں امریکہ کو برتری حاصل تھی' لیکن سرد جنگ ختم ہونے سے اس کی وہ فوقیت بھی ختم ہوگئی ہے۔ بڑے ہتھیاروں کی ضرورت نہیں رہی' چنانچہ اب امریکہ صنعتی پیداوار میں دنیا کے ترقی یافتہ ممالک جاپان وغیرہ کا مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔ کھلی مارکیٹ میں یہ مقابلہ اسوقت تک نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنی انڈسٹری کو باہر نہ لے کے جائیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ اگر وہ اپنی صنعت کو ہندوستان لے گئے تو انہیں ہندوستان کی بہت بڑی مارکیٹ ملے گی' پاکستان کی مارکیٹ ہاتھ آئے گی اور اس کے ساتھ وسط ایشیا کی طرف سے خام مال کے ذرائع بھی مل جائیں گے۔ یہاں وہ اس پوزیشن میں ہوں گے کہ انہیں سستا مزدور بھی مل جائے۔ پہلا مقصد حاصل کرنے کے بعد امریکہ ہندوستان کے راستے وسط ایشیا میں داخل ہو کر بیک وقت کئی مقاصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ پاکستان کے بارے میں شکوک وشبہات پھیلا کر انہوں نے اپنے سرمایہ داروں کو یہاں آنے سے پہلے ہی روک دیا ہے۔ کراچی کو انہوں نے ایک طویل عرصے سے بند کر دیا ہوا ہے' اسی طرح افغانستان میں پائیدار امن قائم نہیں ہونے دیا۔ اب اس خطے میں چین کی اقتصادی ترقی کی تیز رفتار اور روس کی موجودگی سے انہیں احساس ہوا ہے کہ وہ یہاں مفادات حاصل کرنے کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہیں۔ چنانچہ پاک بھارت تجارت کی شروعات امریکہ کیلئے اس سلسلے کا بنیادی قدم ہوسکتا ہے۔ بالفاظ دیگر یہ پاکستان اور ہندوستان کی تجارت نہیں بلکہ یہ امریکی ''Multinationals'' کی وسط ایشیا تک رسائی اور اس کے خام مال سے فائدہ اٹھانے کا جامع منصوبہ ہے۔ اگر وہ اس منصوبے پر عمل نہیں کرتے تو وہ سمجھتے ہیں' ابھرتا ہوا چین وسط ایشیا کے

Marfat.com

ذرائع پر حاوی ہو جائے گا اور اس خطے کی مارکیٹ پر قابو حاصل کرلے گا۔ ان کا یہ خدشہ بے بنیاد بھی نہیں کہ چین پہلے ہی بہت آگے جا چکا ہے۔ صرف گزشتہ برس اس کی صنعت نے 23 فیصد ترقی کی۔ اتنی زیادہ ترقی حاصل کرنا ایک معجزے سے کم نہیں۔ امریکہ چین کی ''خطرناک'' ترقی کا راستہ روکنے کیلئے جلد از جلد نئی حکمت عملی کرنا چاہتا ہے۔

اس منصوبہ بندی کا دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ امریکہ کا یہ خیال بھی غلط ثابت ہوا کہ روس اب دوبارہ نہیں اٹھ سکے گا اور سرد جنگ کا دور اب قصہ پارینہ بن چکا ہے۔ میں اس وقت بھی کہا کرتا تھا کہ سرد جنگ ختم نہیں ہوئی بلکہ سرد جنگ کے نئے دور کا آغاز ہونے کو ہے' اب چین اور روس باہمی ملاپ سے آگے بڑھیں گے۔ چنانچہ کچھ ہی عرصہ قبل امریکیوں کو محسوس ہوا کہ روس ان کے دباؤ کی حرارت محسوس کر رہا ہے اور چین بھی اس حرارت کو محسوس کر رہا ہے۔ دوسری طرف جاپان بھی ایک بڑی صنعتی قوت ہے اور اس کے بھی اپنے مفادات ہیں۔ چنانچہ امریکہ نے محسوس کرلیا ہے کہ اس سے پہلے کہ روس اور چین کا حال ہی میں ہونے والا باہمی معاہدہ عملی شکل اختیار کرلے' ہم اس سے پہلے وسطی ایشیا میں داخل ہو جائیں۔ یہ امریکہ کی اشد خواہش ہے۔

تیسرا نکتہ یہ ہے کہ امریکہ ہندوستان کو ابھرتے ہوئے چین کے خلاف سرد جنگ میں ملوث کرنا چاہتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کیلئے پاکستان کی طرف سے ہندوستان کو ہر خطرات اور خدشات لاحق ہیں وہ انہیں دور کرنے کیلئے کوشاں ہے۔ اسی منصوبے کے ایک حصے کے طور پر وہ پاکستانی افواج کو بھی محدود کرنے کی تگ و دو کر رہا ہے' لیکن جب تک کشمیر کا مسئلہ موجود ہے اسوقت تک پاکستانی فوج کے رول کو محدود نہیں کیا جا سکتا نہ پاکستانی عوام ایسا کرنے دیں گے۔ چنانچہ امریکہ چاہے گا کہ مسئلہ کشمیر کو جعلی اور مبہم طریقے سے حل کر کے ہندوستان کو ریلیف دیا جائے۔ اس طرح مسئلہ کشمیر حل تو نہیں ہوگا البتہ اس سے پاکستانی حکمران اپنے عوام کو یہ تاثر دے سکیں گے کہ کشمیر کا مسئلہ ختم ہو گیا ہے۔ عوام بھی ان حالات میں مطالبہ کر سکتے ہیں کہ اب اتنی بڑی فوج اور دفاعی اخراجات کیا کیا جواز ہے۔ اس طرح کی باتیں آج کل بھی ہمارے دانشور کر رہے ہیں۔ وہ کھلے عام یہ کہہ رہے ہیں کہ پاکستان زیادہ اہم ہے یا کشمیر۔!

پاکستان کے بعض دانشوروں اور ماہرین کی نظر میں پاکستان کی اقتصادی پوزیشن اس قدر گر چکی ہے کہ اگر ہم خدانخواستہ کشمیر پر کوئی سمجھوتہ نہیں کرتے تو پاکستان کا اپنا وجود بھی خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ یہ ایک انتہائی غلط اور مہلک تصور ہے جس سے ہندوستان کی پوزیشن کو تقویت ملتی ہے اور امریکی مفادات کو تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ اس تجارت سے ہندوستان اچانک اقتصادی لحاظ سے بہت مضبوط اور توانا ہو جائے گا اور پاکستان مزید کمزور۔ اگر پاکستان کو اقتصادی توانائی دلانا مقصود ہے تو پھر دشمن ملک سے ہی تجارت کو کیوں ضروری تصور کیا جا رہا ہے' ایران سے کیوں تجارت نہیں کی جاتی؟ اس تیل کے بدلے ہم اپنی مصنوعات فروخت کر سکتے ہیں۔ عراق ایک اسلامی ملک ہے اس کو بہت سی اشیاء کی ضرورت ہے۔ ہم اسے برآمد کر سکتے ہیں اور بدلے میں اپنی تیل کی ضروریات پوری کر سکتے ہیں لیکن ان اسلامی ممالک پر تو نام نہاد دہشت گردی کا الزام لگا کر ان سے ہمارا زمینی تجارت کا راستہ بند کر دیا گیا ہے اور ہمیں مجبور کیا جا رہا ہے کہ اپنے بھائیوں اور بہنوں کے قاتلوں سے تجارت کریں۔ وہ ہم پر دباؤ بڑھاتے رہیں گے جب تک ہم ہندوستان سے تجارت کیلئے تیار نہ ہو جائیں۔

Marfat.com

''تجارت'' کے اصل اہداف:

اس ساری کوشش کا اہم ہدف یہ ہے کہ پاکستان دفاعی بجٹ کو کم کرے اور مسئلہ کشمیر کو پس منظر میں رکھنا تسلیم کرلے۔ ہمیں کسی قیمت پر یہ بات قبول نہیں کرنی چاہئے۔ یہ ایک مدافعانہ اور غیروں کی مسلط کردہ پالیسی ہوگی۔ خطرناک بات یہ ہے کہ اس حوالے سے بازگشت ابھی سے سنائی دے رہی ہے۔ اگر ایسا ہوا تو ہم یہ تصور کرلیں کہ ہم نے ہندوستان کو بالادستی کا سرٹیفکیٹ دے دیا۔ اس کے بعد ہر باشعور شخص سمجھ سکتا ہے کہ پاکستان کے وجود کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے۔ اس صورت میں پاکستان کو اپنے نظریے کو بھی چھوڑنا پڑے گا اور اسے اپنے دفاع سے بھی ہاتھ کھینچنا پڑیں گے۔

امریکی پروگرام کا چوتھا پہلو کشمیر کی تحریک جہاد کو ختم کرنا ہے۔ کشمیر میں اسوقت عملی جہاد جاری ہے جس نے پورے خطے کے مسلمانوں کو ایک نئی سوچ دی ہے' یہاں تک کہ ہندوستان کے مسلمان بھی اس سے متاثر ہورہے ہیں۔ اگرچہ وہ اس جہاد میں عملی طور پر شریک نہیں' لیکن ان میں بیداری ضرور پیدا ہورہی ہے۔ امریکہ اس جہاد کو کچلنا چاہتا ہے۔ اگر بھارت سے پاکستان کی تجارت کے یہ اقدامات کامیابی سے ہمکنار ہوگئے تو کشمیر کا جہاں خود بخود کمزور پڑ جائے گا۔ چنانچہ تجارت کے تیر سے امریکہ بیک وقت چار شکار کرنا چاہتا ہے:

1- سب سے پہلے اپنے ملٹی نیشنلز کے ذریعے وسط ایشیا تک رسائی حاصل کرکے اپنی تجارت کو فروغ دینا چاہتا ہے اور اس ضمن میں یہ قطعی اور واضح بات ہے کہ امریکہ کو پاکستان کا کوئی مفاد عزیز نہیں۔

2- قبل اس کے کہ چین اور روس کے باہمی تعلقات اس قدر مضبوط ہوجائیں کہ وہ وسط ایشیا میں تجارتی اور دفاعی لحاظ سے کوئی اہم حیثیت اختیار کرلیں امریکہ وہاں قدم جمانے کی کوشش کررہا ہے...... اس ضمن میں وہ ایران کو بھی قابو میں لانا چاہتے ہیں۔

3- پاکستانی دفاعی بجٹ میں کمی...... پاکستانی حکمران معاشی تباہ حالی سے نجات کے ذیل میں بلند بانگ دعوے کرتے ہیں وہ دفاع پر اٹھنے والی بھاری رقوم سے بھی پریشان ہیں' لیکن وہ اس حقیقت کو فراموش کردیتے ہیں کہ چوری ہونے والی اور باہر منتقل ہونے والی رقوم اس سے کہیں زیادہ ہیں۔ لیکن IMF اور ورلڈ بنک کے چھوڑے ہوئے دانشور محض دفاعی بجٹ کو کم کرنے کو ہی مسئلے کا حل سمجھتے ہیں۔ بھارت کا دفاعی بجٹ کم کرائے بغیر ہمارے بجٹ میں کمی مہلک ہوگی۔

4- مسئلہ کشمیر کو پس منظر میں لے جانا...... اور اس طرح اس تحریک آزادی اور تحریک جہاد کو ختم کرنے کی کوشش کرنا جو بھارت کی بالادستی کیلئے مستقل خطرہ ہے۔

پاکستان کے دفاعی بجٹ میں 30 فیصد کمی کی ایک باقاعدہ تجویز پہلے ہی دے دی گئی ہے۔ اب آپ خود اندازہ کریں 30 فیصد کمی کی تجویز بھی دیتے ہیں' ایف سولہ بھی نہیں دیتے' ہماری رقم بھی کھا جاتے ہیں اور پھر ہم سے اپنی تمام شرائط بھی منواتے ہیں۔ آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک جیسے مالیاتی ادارے یہ سارے معاملات طے کرتے ہیں' جب کہ دوسری طرف ہندوستان ہر بار اپنے دفاعی بجٹ میں روز افزوں اضافہ کررہا ہے۔ اس کو آخر کیا خطرہ ہے کہ وہ اپنے دفاعی بجٹ میں اضافہ کررہا ہے' لیکن اس کے دفاعی بجٹ کو کم کرنے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی' صرف ہم پر دفاعی بجٹ کم

Marfat.com

ذرائع پر حاوی ہو جائے گا اور اس خطے کی مارکیٹ پر قابو حاصل کرلے گا۔ ان کا یہ خدشہ بے بنیاد بھی نہیں کہ چین پہلے ہی بہت آگے جا چکا ہے۔ صرف گزشتہ برس اس کی صنعت نے 23 فیصد ترقی کی۔ اتنی زیادہ ترقی حاصل کرنا ایک معجزے سے کم نہیں۔ امریکہ چین کی ''خطرناک'' ترقی کا راستہ روکنے کیلئے جلد از جلد نئی حکمت عملی کرنا چاہتا ہے۔

اس منصوبہ بندی کا دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ امریکہ کا یہ خیال بھی غلط ثابت ہوا کہ روس اب دوبارہ نہیں اٹھ سکے گا اور سرد جنگ کا دور اب قصہ پارینہ بن چکا ہے۔ میں اس وقت بھی کہا کرتا تھا کہ سرد جنگ ختم نہیں ہوئی بلکہ سرد جنگ کے نئے دور کا آغاز ہونے کو ہے' اب چین اور روس باہمی ملاپ سے آگے بڑھیں گے۔ چنانچہ کچھ ہی عرصہ قبل امریکیوں کو محسوس ہوا کہ روس ان کے دباؤ کی حرارت محسوس کر رہا ہے اور چین بھی اس حرارت کو محسوس کر رہا ہے۔ دوسری طرف جاپان بھی ایک بڑی صنعتی قوت ہے اور اس کے بھی اپنے مفادات ہیں۔ چنانچہ امریکہ نے محسوس کر لیا ہے کہ اس سے پہلے کہ روس اور چین کا حال ہی میں ہونے والا باہمی معاہدہ عملی شکل اختیار کرلے' ہم اس سے پہلے وسطی ایشیا میں داخل ہو جائیں۔ یہ امریکہ کی اشد خواہش ہے۔

تیسرا نکتہ یہ ہے کہ امریکہ ہندوستان کو ابھرتے ہوئے چین کے خلاف سرد جنگ میں ملوث کرنا چاہتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کیلئے پاکستان کی طرف سے ہندوستان کو ہر خطرات اور خدشات لاحق ہیں وہ انہیں دور کرنے کیلئے کوشاں ہے۔ اسی منصوبے کے ایک حصے کے طور پر وہ پاکستانی افواج کو بھی محدود کرنے کی تگ و دو کر رہا ہے' لیکن جب تک کشمیر کا مسئلہ موجود ہے اسوقت تک پاکستانی فوج کے رول کو محدود نہیں کیا جا سکتا نہ پاکستانی عوام ایسا کرنے دیں گے۔ چنانچہ امریکہ چاہے گا کہ مسئلہ کشمیر کو جعلی اور مبہم طریقے سے حل کر کے ہندوستان کو ریلیف دیا جائے۔ اس طرح مسئلہ کشمیر حل تو نہیں ہوگا البتہ اس سے پاکستانی حکمران اپنے عوام کو یہ تاثر دے سکیں گے کہ کشمیر کا مسئلہ ختم ہو گیا ہے۔ عوام بھی ان حالات میں مطالبہ کر سکتے ہیں کہ اب اتنی بڑی فوج اور دفاعی اخراجات کیا کیا جواز ہے۔ اس طرح کی باتیں آج کل بھی ہمارے دانشور کر رہے ہیں۔ وہ کھلے عام یہ کہہ رہے ہیں کہ پاکستان زیادہ اہم ہے یا کشمیر۔!

پاکستان کے بعض دانشوروں اور ماہرین کی نظر میں پاکستان کی اقتصادی پوزیشن اس قدر گر چکی ہے کہ اگر ہم خدانخواستہ کشمیر پر کوئی سمجھوتہ نہیں کرتے تو پاکستان کا اپنا وجود بھی خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ یہ ایک انتہائی غلط اور مہلک تصور ہے جس سے ہندوستان کی پوزیشن کو تقویت ملتی ہے اور امریکی مفادات کو تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ اس تجارت سے ہندوستان اچانک اقتصادی لحاظ سے بہت مضبوط اور توانا ہو جائے گا اور پاکستان مزید کمزور۔ اگر پاکستان کو اقتصادی توانائی دلانا مقصود ہے تو پھر دشمن ملک سے ہی تجارت کو کیوں ضروری تصور کیا جا رہا ہے' ایران سے کیوں تجارت نہیں کی جاتی؟ اس تیل کے بدلے ہم اپنی مصنوعات فروخت کر سکتے ہیں۔ عراق ایک اسلامی ملک ہے اس کو بہت سی اشیاء کی ضرورت ہے۔ ہم اسے برآمد کر سکتے ہیں اور بدلے میں اپنی تیل کی ضروریات پوری کر سکتے ہیں لیکن ان اسلامی ممالک پر تو نام نہاد دہشت گردی کا الزام لگا کر ان سے ہمارا زمینی تجارت کا راستہ بند کر دیا گیا ہے اور ہمیں مجبور کیا جا رہا ہے کہ اپنے بھائیوں اور بہنوں کے قاتلوں سے تجارت کریں۔ وہ ہم پر دباؤ بڑھاتے رہیں گے جب تک ہم ہندوستان سے تجارت کیلئے تیار نہ ہو جائیں۔

Marfat.com

''تجارت'' کے اصل اہداف:

اس ساری کوشش کا اہم ہدف یہ ہے کہ پاکستان دفاعی بجٹ کو کم کرے اور مسئلہ کشمیر کو پس منظر میں رکھنا تسلیم کرلے۔ ہمیں کسی قیمت پر یہ بات قبول نہیں کرنی چاہئے۔ یہ ایک مدافعانہ اور غیروں کی مسلط کردہ پالیسی ہوگی۔ خطرناک بات یہ ہے کہ اس حوالے سے بازگشت ابھی سے سنائی دے رہی ہے۔ اگر ایسا ہوا تو ہم یہ تصور کرلیں کہ ہم نے ہندوستان کو بالادستی کا سرٹیفکیٹ دے دیا۔ اس کے بعد ہر باشعور شخص سمجھ سکتا ہے کہ پاکستان کے وجود کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے۔ اس صورت میں پاکستان کو اپنے نظریے کو بھی چھوڑنا پڑے گا اور اسے اپنے دفاع سے بھی ہاتھ کھینچنا پڑیں گے۔

امریکی پروگرام کا چوتھا پہلو کشمیر کی تحریک جہاد کو ختم کرنا ہے۔ کشمیر میں اسوقت عملی جہاد جاری ہے جس نے پورے خطے کے مسلمانوں کو ایک نئی سوچ دی ہے' یہاں تک کہ ہندوستان کے مسلمان بھی اس سے متاثر ہو رہے ہیں۔ اگرچہ وہ اس جہاد میں عملی طور پر شریک نہیں' لیکن ان میں بیداری ضرور پیدا ہو رہی ہے۔ امریکہ اس جہاد کو کچلنا چاہتا ہے۔ اگر بھارت سے پاکستان کی تجارت کے یہ اقدامات کامیابی سے ہمکنار ہو گئے تو کشمیر کا جہاں خود بخود کمزور پڑ جائے گا۔ چنانچہ تجارت کے تیر سے امریکہ بیک وقت چار شکار کرنا چاہتا ہے:

-1 سب سے پہلے اپنے ملٹی نیشنلز کے ذریعے وسط ایشیا تک رسائی حاصل کر کے اپنی تجارت کو فروغ دینا چاہتا ہے اور اس ضمن میں یہ قطعی اور واضح بات ہے کہ امریکہ کو پاکستان کا کوئی مفاد عزیز نہیں۔

-2 قبل اس کے کہ چین اور روس کے باہمی تعلقات اس قدر مضبوط ہو جائیں کہ وہ وسط ایشیا میں تجارتی اور دفاعی لحاظ سے کوئی اہم حیثیت اختیار کرلیں امریکہ وہاں قدم جمانے کی کوشش کر رہا ہے...... اس ضمن میں وہ ایران کو بھی قابو میں لانا چاہتے ہیں۔

-3 پاکستانی دفاعی بجٹ میں کمی...... پاکستانی حکمران معاشی تباہ حالی سے نجات کے ذیل میں بلند بانگ دعوے کرتے ہیں وہ دفاع پر اٹھنے والی بھاری رقوم سے بھی پریشان ہیں' لیکن وہ اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ چوری ہونے والی اور باہر منتقل ہونے والی رقوم اس سے کہیں زیادہ ہیں۔ لیکن IMF اور ورلڈ بنک کے چھوڑے ہوئے دانشور محض دفاعی بجٹ کو کم کرنے کو ہی مسئلے کا حل سمجھتے ہیں۔ بھارت کا دفاعی بجٹ کم کرائے بغیر ہمارے بجٹ میں کمی مہلک ہوگی۔

-4 مسئلہ کشمیر کو پس منظر میں لے جانا...... اور اس طرح اس تحریک آزادی اور تحریک جہاد کو ختم کرنے کی کوشش کرنا جو بھارت کی بالادستی کیلئے مستقل خطرہ ہے۔

پاکستان کے دفاعی بجٹ میں 30 فیصد کمی کی ایک باقاعدہ تجویز پہلے ہی دے دی گئی ہے۔ اب آپ خود اندازہ کریں 30 فیصد کمی کی تجویز بھی دیتے ہیں' ایف سولہ بھی نہیں دیتے' ہماری رقم بھی کھا جاتے ہیں اور پھر ہم سے اپنی تمام شرائط بھی منواتے ہیں۔ آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک جیسے مالیاتی ادارے یہ سارے معاملات طے کرتے ہیں' جب کہ دوسری طرف ہندوستان ہر بار اپنے دفاعی بجٹ میں روز افزوں اضافہ کر رہا ہے۔ اس کو آخر کیا خطرہ ہے کہ وہ اپنے دفاعی بجٹ میں اضافہ کر رہا ہے' لیکن اس کے دفاعی بجٹ کو کم کرنے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی' صرف ہم پر دفاعی بجٹ کم

Marfat.com

کرنے کا دباؤ ڈالا جاتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ تجارت کا یہ کارڈ امریکہ کھیلنا چاہتا ہے۔ بھارت کے پردے میں امریکہ بول رہا ہے۔ ہمارا بھی یہی ٹرمپ کارڈ ہے۔ میں نے حکومت پاکستان کو یہ تجاویز دی ہیں اور کہہ دیا ہے کہ ہمارا ٹرمپ کارڈ یہی ہے' اسکو ضائع نہ کریں۔ ہم تجارت کرنا چاہتے ہیں لیکن اس کیلئے ضروری ہے کہ بنیادی مسائل پہلے طے کیے جائیں۔ ہمیں آنکھیں بند کر کے دوسروں کے ایجنڈے پر چلنے کے بجائے بھارت سے تجارت کے خطرناک مضمرات پر غور کرنا ہوگا۔ آج اگر ہم نے امریکہ سے کوئی بات منوانی ہے تو ہمارے پاس کوئی کارڈ نہیں سوائے تجارت کے۔ کیونکہ تجارت میں اصل مفاد امریکہ کا ہے۔ ہمیں اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ امریکہ اس کے ذریعے نہ صرف وسط ایشیا پر قبضہ کر کے اپنی اقتصادی اور دفاعی پوزیشن بہتر کرنا چاہتا اور اپنے عوام اور سرمایہ داروں کو بھی خوش کرنا چاہتا ہے' بلکہ جہاد کو بھی کچلنا چاہتا ہے اور پاکستان کے دفاعی بجٹ کو ختم کرنا بھی ان کی تمنا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ پاکستانی افواج کو بھی اس حالت پر لانا چاہتے ہیں کہ محض امن قائم کرنے والی (Peace-Keeping) فوج بن کر ان کے تابع فرمان رہے۔

اپنے منصوبوں کی تکمیل کے لیے امریکی خود قربانی دینے کو تیار نہیں یہ حقیقت صومالیہ میں امریکی فوج کے کردار سے واضح کردی ہے۔ امریکی اپنے مفادات کیلئے دوسری قوموں کو قربانی کیلئے پیش کرتے ہیں۔ استعماری منصوبہ سازی کا سبق انہوں نے انگریز سے سیکھا ہے' تاہم انگریز اپنے زیر تسلط ممالک سے جانی اور مالی قربانی لینے کے ساتھ ساتھ خود بھی قربانی دیتا تھا' مگر امریکیوں کی ایک بہت بڑی کمزوری ہے کہ وہ خود قربانی نہیں دیتے۔ عراق کی کامیاب مہم کے بعد ان کا خیال تھا کہ وہ اب کمزور اقوام پر چڑھ دوڑیں گے تو کوئی مزاحم نہ ہوگا' لیکن صومالیہ پر انہوں نے جو پہلا حملہ کیا اس میں وہ رسوا ہوئے۔ یہاں بھوکے ننگے لوگوں نے ان پر جو چھوٹی سی ضرب لگائی' وہ اسی چوٹ پر بلبلا اٹھے۔ اب وہ ہماری فوج کو اپنے لئے قربانی دینے کی پوزیشن میں لانا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ پاکستان فوج محض کرائے کے سپاہی بن کر رہ جائیں۔ ہمیں امریکہ کی خواہشات کا ایندھن بننے سے بچنا ہوگا۔ ہمیں تجارت کے مصنوعی اعداد و شمار سے فیصلہ نہیں کرنا چاہئے اور نہ یہ دیکھنا چاہئے کہ اس میں ہمارا فائدہ ہے۔ بڑے مقاصد میں محض مادی مفادات کو سامنے نہیں رکھا جا سکتا۔ اس وقت تجارت کا کارڈ ہندوستان نہیں امریکہ کھیل رہا ہے جو آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک کو اس کیلئے استعمال کر رہا ہے۔

یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ان مالیاتی اداروں میں رقم دوسروں کی ہے مگر آئی ایم ایف کے بورڈ میں امریکہ کو 27 فیصد نمائندگی حاصل ہے۔ یعنی ان کا ایک ووٹ 27 ووٹوں کے برابر گنا جاتا ہے۔ اسطرح دراصل امریکہ کو آئی ایم ایف میں ویٹو حاصل ہے اور یہ ویٹو پاور اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ اس میں زیادہ رقم عربوں کی ہے لیکن ان کے سرمائے پر ویٹو پاور امریکہ استعمال کر رہا ہے۔ اسی طرح امریکہ نے ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن قائم کر کے بھی اپنے ذاتی مفادات کو تحفظ دیا ہے۔ اب تک ان کے اقدامات میں کبھی یہ نہیں دیکھا گیا کہ اس سے کسی دوسرے ملک کو اتنا نقصان ہو رہا ہے' محض امریکی فائدہ دیکھا گیا ہے۔ لہٰذا ہمیں تجارت ضرور کرنی چاہئے' یہ سنت نبویؐ ہے لیکن جب تجارت کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جائے اور اس میں دوسروں کو فائدہ اور ہمارا نقصان ہو' تو پھر ہمیں اس تجارت کے جال میں نہیں پھنسنا چاہئے۔

Marfat.com

یہ ایک تلخ تاریخی حقیقت ہے کہ ہندوستان نے آج تک اپنے کسی معاہدے کو نہیں نبھایا۔ پہلی بات یہ ہے کہ وہ اپنی جو اشیاء ہمیں برآمد کریں گے ان کو وہ Sub-sdize کریں گے۔ وہ اس پوزیشن میں ہیں کہ اپنی اشیاء کو امدادی قیمت پر خرید کر ہمیں کم قیمت پر فروخت کریں' اس سے ہماری صنعت کا بھٹا بیٹھ جائے گا۔ یہ حقیقت حکومت پاکستان کے علم میں ہے کہ غیر منقسم پاکستان کے دور میں وہ مشرقی پاکستان کو یہ باور کراتے رہے کہ تمہاری پٹ سن سے مغربی پاکستان پل رہا ہے' مگر بنگلہ دیش بننے کے بعد وہاں کی پٹ سن کی صنعت کو سب سے زیادہ نقصان ہندوستان نے پہنچایا۔ ایک وقت شیخ مجیب کہتا تھا کہ اسلام آباد کی سڑکوں سے اپنے سنہری ریشے کی خوشبو آ رہی ہے' آج اس کی پٹ سن کی صنعت ہندوستان نے برباد کر کے رکھ دیئے۔ گارمنٹس کی صنعت نے انہیں بچا لیا ورنہ ہندوستان نے ان کی مکمل اقتصادی تباہی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ بھارت نے بنگلہ دیش کے ساتھ ہر معاہدے کی خلاف ورزی کی۔ فرغا بیراج کے معاہدے کی کھلی خلاف ورزی کی۔ حال ہی میں اس نے بنگلہ دیش کا پانی ان ایام میں بند کر دیا جب اسے اس کی سخت ضرورت تھی۔ اسی طرح ان کا چاول سستا خرید کر انہیں ہی مہنگا فروخت کر دیا جاتا ہے۔ نیپال جو دوسرا ہندو ملک ہے' اس کی اقتصادی ناکہ بندی کی گئی۔ سری لنکا کی تجارت بڑھی تو وہاں دہشت گردی شروع کرا دی گئی۔ سری لنکا کی نوے فیصد آبادی تعلیم یافتہ ہے' جے وردھنے کے زمانے میں وہاں صنعت زبردست ترقی کر رہی تھی' ہندوستان نے انکا بھی بیڑہ غرق کیا۔ بھارت سے تجارت کیلئے مضطرب ہونے والوں کو یہ مثالیں ضرور سامنے رکھنی چاہئیں اور یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہندوستان کبھی بھی نہیں چاہے گا کہ وہ تجارت کے ذریعے پاکستان جیسے دشمن ملک کو خوشحال بنا دے۔ مسٹر گجرال کا کہنا ہے کہ بھارت اور پاکستان میں چوتھی جنگ جاری ہے۔ (ندائے ملت جون 1997ء)

مئی 1997ء کے دوسرے ہفتے مالدیپ میں ہونے والی سارک کانفرنس میں بھارتی وزیراعظم آئی کے گجرال اور پاکستانی وزیراعظم نواز شریف اور دونوں ملکوں کے وزرائے خارجہ کے درمیان علیحدگی میں بھی مذاکرات ہوئے۔ دونوں ملکوں کے سیکرٹری خارجہ پاکستان کی طرف سے شمشاد احمد خان اور بھارت کی طرف سے سلمان حیدر نے الگ سے دہلی کے حیدرآباد ہاؤس میں مذاکرات کی جن میں سمندری حدود کی غلطی سے خلاف ورزی کرنے والے ماہی گیروں کا مسئلہ' سرکریک کا مسئلہ بطور خاص زیر بحث آیا البتہ مسئلہ کشمیر پر گفتگو کیلئے 18 تاریخ کا تعین ہوا۔ مشترکہ اعلامیہ میں اس بات چیت کو Useful, Productive and Constructive قرار دیا گیا۔ اس مرحلے پر پریس کے ذریعے یہ بات بھی سامنے آئی کہ 1992ء میں سیاچن کے حوالے سے کافی پیشرفت ہو چکی ہے لیکن یہ پیشرفت وہیں کیوں ٹھہر گئی ہے اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔

1997ء کی یہ ملاقات دراصل راجیو گاندھی اور مسز بےنظیر بھٹو کے درمیان جون 1989ء کو اسلام آباد سارک کانفرنس کے موقعہ پر ہونے والے مذاکرات کا تسلسل تھا۔ 1997ء میں پہلی مرتبہ ''ٹریک ٹو'' ڈپلومیسی متعارف ہوئی اور میڈیا کے ذریعے علم ہوا کہ سابقہ ڈپلومیٹ مسٹر نیاز اے نائیک حکومت پاکستان کی طرف سے بھارت سے خفیہ مذاکرات کر رہے ہیں۔ 1997ء میں سیکرٹری خارجہ کے درمیان ہونے والے مذاکرات میں کشمیر کے مسئلے پر یورپی ممالک کی طرف سے ''ورکنگ گروپس'' تشکیل دینے پر اتفاق رائے ہوا یہ گروپس آپس میں مشاورت کے ذریعے مسئلہ کشمیر کا ممکنہ حل تلاش

Marfat.com

کرنے کے مشن پر گامزن تھے۔ 30 دسمبر 1996ء کو اسرائیلی وزیراعظم ایزروائزمین نے بھارت کا دورہ کیا بھارتی وزیراعظم ایچ ڈی دیوی گوڑا نے ان کا استقبال کیا۔ بھارت اور اسرائیل کے درمیان خفیہ تعلقات تو ایک عرصے سے قائم تھے لیکن 1995ء میں ''اوسلو'' کی امن کانفرنس میں بھارتی حکومت نے انہیں بھارت کے باقاعدہ دورے کی دعوت دی تھی۔ بھارت اور اسرائیل کے بڑھتے ہوئے تعلقات پر پاکستان میں تشویش قدرتی بات تھی بعد میں بھارت اور پاکستان کے تعلقات میں امریکہ کے ساتھ ساتھ اسرائیل کا رول بھی نمایاں ہونے لگا۔

1998-99ء پاکستان میں نہیں جنوبی ایشیا کی تاریخ کے دو اہم ترین سال ہیں۔ اس دوران تین اہم واقعات نے ساری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا سب سے پہلا اور اہم واقعہ 11 اور 13 مئی کو بھارت کی طرف سے یکے بعد دیگرے ہونے والے دو تباہ کن ایٹمی دھماکے تھے گو کہ بھارت 1974ء میں ایٹمی دھماکہ کر چکا تھا لیکن تازہ دھماکوں نے جنوبی ایشیا ہی نہیں ساری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ عین ممکن تھا کہ پاکستان ایٹمی پالیسی کے معاملے میں اپنا ''سٹیٹس کو'' برقرار رکھتا لیکن دھماکے کے بعد سے معروف بھاجپا لیڈر لال کرشن ایڈوانی اور بی جے پی کے بھارتی وزیراعظم واجپائی کی طرف سے پاکستان کو دھمکیوں کا نہ ختم ہونیوالا سلسلہ شروع ہو گیا ان دھمکیوں میں پاکستان کو ایک حقیر ملک کی طرح ٹریٹ کیا جا رہا تھا اور ایسا تاثر دیا جا رہا تھا کہ اگر پاکستان نے کشمیر کے مسئلے پر اپنی ضد برقرار رکھی تو بھارت اسے تباہ کر کے رکھ دے گا۔ قریباً ہر روز پاکستان کو اپنے آپ کو ٹھیک کرنے کے احکامات اور بصورت دیگر سنگین نتائج بھگتنے کی دھمکیاں دی جا رہی تھیں۔

پاکستان کی ایٹمی استعداد کے متعلق کم از کم امریکہ کو کوئی غلط فہمی نہیں تھی یہی وجہ ہے کہ امریکہ اور یورپی ممالک نے پاکستان کو دھماکوں سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ دھماکے نہ کرنے کی صورت میں بہت سے لالچ دیئے گئے اور دھماکوں کی صورت میں خطرناک پابندیوں کی دھمکیاں دی گئیں لیکن دوسری طرف حکومت پر اندرونی دباؤ ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا خصوصاً روزنامہ نوائے وقت کا کردار ناقابل فراموش اور تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ ایک مرحلے پر ''نوائے وقت'' کے ایڈیٹر مجید نظامی نے وزیراعظم نواز شریف سے کہا ''اگر آپ نے دھماکہ نہ کیا تو پاکستانی عوام آپ کا دھماکہ کر دیں گے''۔ (بالمشافہ گفتگو جناب مجید نظامی 28 جولائی 2005ء)

28 مئی کو پاکستان کی فضائیں نعرہ تکبیر سے گونجنے لگیں جب پاکستان کی طرف سے جوابی دھماکے کیے گئے عالمی ردعمل انتہائی سخت تھا لیکن 30 مئی کو پاکستان کی طرف سے پھر دھماکے کر کے اپنی برتری ثابت کی گئی اور پاکستان دنیا کا پہلا ایٹمی صلاحیت کا حامل مسلم ملک اور چھٹی عالمی ایٹمی قوت بن گیا۔ حیرت کی بات ہے کہ بھارت نے جو ایٹمی دھماکے کرنے کے بعد پاکستان کو مسلسل دھمکیاں دے رہا تھا ان دھماکوں کے بعد اپنا لہجہ بالکل تبدیل کر لیا اور دنیا کے سامنے اپنی مظلومیت کا رونا شروع کر دیا۔

1999ء کے دوران وطن عزیز سول اور فوجی دونوں اقسام کی حکومتوں کے تجربے سے گزرا ہے۔ 1999ء کے سال کے دوران بھارتی وزیراعظم کی 20 فروری کو لاہور آمد کے موقع پر ''بس ڈپلومیسی'' کا نام دیا گیا۔ جماعت اسلامی نے سخت احتجاج کیا۔ مئی جون میں کشمیر کی لائن آف کنٹرول پر پاک بھارت افواج کے درمیان فائرنگ کا سلسلہ شروع ہو چکا

Marfat.com

تھا۔ جون کے آخر تک کارگل کا مسئلہ شدت اختیار کر چکا تھا۔ 4 جولائی کو کلنٹن نواز مشترکہ اعلامئے پر دستخط ہوئے تو قومی سیاست نے قدرے رنگ بدلا۔ نواز شریف کی مخالفت میں اضافہ ہو گیا۔ کارگل کے واقعہ کے بعد حکومت اور فوج کے تعلقات میں خرابی کی خبریں عام ہوئیں اور 2 ستمبر کو لورالائی میں نواز شریف نے کہا کہ میں استعفیٰ نہیں دوں گا۔ حکومت اپنی مقررہ مدت پوری کرے گی۔ 12 اکتوبر کو فوج کے سربراہ جنرل پرویز مشرف نے نواز شریف حکومت کو برطرف کر کے اقتدار خود سنبھال لیا۔ 1999ء کے آغاز میں امریکہ کی کوششوں اور دباؤ سے بھارت نے پاکستان کے ساتھ جنوری میں بس سروس کا آغاز کر دیا تھا۔ بھارتی وزیراعظم پاکستان جانے کا عندیہ دے چکے تھے لیکن بھارتی انتہا پسند گروپ اس بات پر مصر رہے کہ اٹل بہاری واجپائی کو لاہور نہیں جانے دیں گے اور پاکستان کے قاضی حسین احمد یہ کہتے رہے کہ واجپائی کو لاہور نہیں آنے دیں گے تاہم 20 فروری کو بھارتی وزیراعظم بذریعہ بس لاہور آئے انہیں 21 توپوں کی سلامی دی گئی۔ جماعت اسلامی نے شدید مزاحمت کی' لاہور میں ہڑتال' جھڑپیں' فائرنگ اور گرفتاریاں ہوئیں۔ قاضی حسین احمد نظر بند اور رہا ہوئے۔ اعلان لاہور پر دستخط ہوئے جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ اقوام متحدہ کی قراردادیں نظر انداز' تنازع کشمیر کے حل کیلئے شملہ معاہدے کو مشعل راہ بنایا جائے گا اور تنازع کشمیر اسی کے تحت حل کیا جائے گا۔ ایک دوسرے کے داخلی امور میں پاکستان اور بھارت مداخلت نہیں کریں گے۔ ایٹمی اور روایتی تصادم روکنے کیلئے پاکستان اور بھارت کے درمیان مذاکرات کا انعقاد کیا جائے گا۔ پاک بھارت مفاہمت کی 8 نکاتی یادداشت پر بھی دستخط ہوئے۔ ''بس ڈپلومیسی'' کے بارے میں بے نظیر بھٹو نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ نواز شریف خود کو جنوبی ایشیا کا یاسر عرفات بنانے کی کوشش کر رہا ہے اور اعلان لاہور نواز حکومت کی ناکامی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

بہر طور بھارتی وزیراعظم نے بھی دورہ لاہور کے دوران جو کچھ کہا تھا' دہلی جا کر اس سے منحرف ہو گئے اور اسی حکمت عملی پر گامزن ہو گئے جو گزشتہ 50 برس سے بھارتی حکمران اپنائے ہوئے ہیں۔ واجپائی کے دورہ لاہور۔ اعلان لاہور اور 21 توپوں کی سلامی نے پاکستان کی قومی سیاست کو متاثر کیا اور نواز شریف حکومت کی مخالفت میں اضافہ اور شدت پیدا ہوئی۔

جون 1999ء تک تنازع کشمیر پر پاکستان اور بھارت کے درمیان کشیدگی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ مجاہدین نے سیاچن سے متعلق بھارتی فوج کی سپلائی لائن پر کنٹرول حاصل کر کے بھارت کیلئے مشکلات میں انتہائی اضافہ کر دیا تھا۔ بھارتی لڑاکا طیارے نہ صرف مجاہدین پر حملے کر رہے تھے بلکہ پاکستانی حدود کے اندر واقع پاکستانی فوجی چوکیوں پر بھی بم برسا رہے تھے۔ آزاد کشمیر کی سول آبادی بھی ان کے حملوں کی زد میں تھی۔ ان حملوں کے دوران بھارت کے دو مگ طیارے پاکستانی علاقے میں مار گرائے گئے۔ ایک کا ہواباز ہلاک اور دوسرا جنگی قیدی بنا' جسے عالمی دباؤ کے باعث ریڈ کراس کے ذریعے بھارت کے حوالے کر دیا گیا۔ اب نواز پر دباؤ تھا کہ کارگل سے مجاہدین کو واپس لایا جائے' جس پر 20 جون کو اخبارات میں اس وقت کے وزیراعظم کا بیان شائع ہوا تھا کہ کشمیری حریت پسندوں نے میرے حکم پر جدوجہد آزادی شروع کی ہے' نہ میرے حکم پر ختم کریں گے۔ ادھر اخبارات امریکی عہدے داروں کے حوالے سے ایسی خبریں شائع کر رہے تھے کہ ''صدر کلنٹن پاکستان کے خلاف کشمیر کے معاملے میں ثبوت سامنے لانے والے ہیں۔'' یہ خبریں بھی

Marfat.com

شائع ہو رہی تھیں کہ سندھ کی جانب بھارتی ٹینکوں نے پیش قدمی شروع کر دی ہے۔ جی۔8 ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس میں پاکستان اور بھارت سے کہا گیا تھا کہ جنگ بند کر کے مسئلے کا حل تلاش کرنے کی غرض سے مذاکرات کیے جائیں۔ پاکستانی فوج کے سربراہ جنرل پرویز مشرف نے اعلان کیا تھا کہ ''زمین فضا اور سمندر بھارت سے ہر جگہ نمٹا جائے گا۔'' امریکی سینٹرل کمان کے سربراہ اچانک اسلام آباد آئے' فوج کے سربراہ سے ملاقات کی' نواز شریف سے ملاقات نہ ہو سکی۔ کارگل سے مجاہدین کی واپسی کا مطالبہ تسلیم نہ کرنے پر پاکستان کو سنگین نتائج کی دھمکی دے دی گئی۔ جنرل پرویز مشرف نے 26 جون کو انکشاف کیا کہ مسئلہ کشمیر پر وزیراعظم پاکستان اور امریکی صدر کے درمیان ملاقات کا اہتمام کرنے کیلئے سفارتی رابطے شروع ہو گئے ہیں۔ 28 جون کو سرحدوں پر کشیدگی میں اضافے کے باعث چین کا دورہ مختصر کر کے نواز شریف وطن واپس آ گئے۔ حریت کانفرنس نے دو جولائی کو انکشاف کیا کہ جیتی ہوئی جنگ کو میز پر ہارنے کی سازش ہو رہی ہے۔ 4 جولائی کو ایک فون کال پر پاکستانی وزیراعظم امریکہ چلے گئے اور اعلان واشنگٹن پر دستخط کر آئے تو پاکستان کی قومی سیاست میں ہلچل مچ گئی۔ بیشتر دینی جماعتوں کا ردعمل شدید تھا۔ قومی سطح کے متعدد سیاست دانوں نے کہا کہ کارگل کی جیتی ہوئی جنگ واشنگٹن میں ہار دی گئی ہے لہٰذا وزیراعظم مستعفی ہو جائیں' جب کہ جنرل پرویز مشرف نے کہا کہ کارگل سے مجاہدین کی واپسی شکست نہیں۔ یکم اکتوبر کو بھی جنرل پرویز مشرف کا ایک بیان آیا کہ کارگل ایک عظیم فوجی کامیابی تھی۔ اعلان واشنگٹن کے مطابق ایک طرفہ طور پر ساری ذمے داریاں پاکستان کے ہی سر ایک بہت بڑے حلقے نے بھارت کے ساتھ تجارت کے فروغ کو 70 ہزار کشمیری شہداء کے خون سے غداری قرار دیا۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس سال بھارت کے عام انتخابات ہوئے جس میں بی جے پی نے انتخابی نعرے کے طور پر کارگل کی لڑائی کو بھارتی غیرت کے نام پر استعمال کیا جس کا فائدہ واجپائی کو پہنچا تاہم 1998ء کے مقابلے میں انہیں کم ووٹ ملے چنانچہ 24 جماعتوں نے مل کر معمولی اکثریت سے واجپائی کو وزیراعظم بنا دیا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نواز شریف کی غیر مستحکم سیاسی حکمت عملی اور خارجہ پالیسی نے اس برس پاکستان کی ساکھ کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا۔ جس کے نتیجے میں جنرل پرویز مشرف نے انہیں اقتدار سے الگ کیا۔ بھارت کے ساتھ تعلقات کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا ''بھارت جب تک مسئلہ کشمیر حل کرنے کیلئے سنجیدہ مذاکرات کا سلسلہ شروع نہیں کرتا' اعلان لاہور جیسے معاہدوں سے کچھ حاصل نہیں ہوگا اور اگر بھارت کا یہ خیال ہے کہ وہ اہم معاملات کو نظرانداز کر کے پاکستان کو کسی چھوٹے ملک کی طرح دھمکا سکتا ہے' تو یہ بالکل غلط ہے۔ بھارت مسئلہ کشمیر حل کرنے کیلئے نیک نیتی سے مذاکرات شروع کرے تو پاکستان دس قدم آگے بڑھنے کیلئے تیار ہے۔

23 ستمبر 1998ء کو بھارتی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی اور پاکستانی وزیراعظم میاں نواز شریف کے درمیان نیویارک امریکہ میں امریکی آشیرواد سے ملاقات ہوئی۔ جس میں طے پایا کہ مذاکرات کا اگلا دور آئندہ سال فروری میں بھارتی دارالحکومت دہلی میں ہوگا جبکہ سیکرٹری خارجہ کی سطح پر 16 تا 18 اکتوبر 1998ء کو اسلام آباد میں دونوں حکومتوں کے درمیان مذاکرات ہوئے۔

اسلام آباد کی بات چیت کے بعد امور خارجہ کے دونوں سیکرٹریوں نے ایک مشترکہ پریس کانفرنس سے بھی

Marfat.com

خطاب کیا۔اس پریس کانفرنس میں پاکستان کے سیکرٹری خارجہ جناب شمشاد احمد نے بتایا کہ خطے میں کسی ایٹمی تصادم سے بچنے اور ایٹمی اسلحہ کی دوڑ ختم کرنے کیلئے پاکستان نے ٹھوس تجاویز پیش کی ہیں جن میں یہ تجویز بھی شامل ہے کہ مسئلہ کشمیر کو جو خطے میں بے اعتمادی کی موجودہ فضا اور کشیدگی کے حوالے سے بنیادی تنازعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق کشمیری عوام کی آزادانہ رائے سے حق وانصاف کے مسلمہ بین الاقوامی اصولوں کی روشنی میں حل کیا جائے' اس لئے کہ جب تک یہ بنیادی مسئلہ حل نہیں ہو جاتا اس وقت تک پاکستان اور بھارت کے درمیان دوسرے متنازعہ مسائل' حل ہو ہی نہیں سکتے۔اگرچہ نتائج کے لحاظ سے اسلام آباد کی بات چیت کو بھی محض روایتی ملاقات ہی کہا جائے گا لیکن ایک اہم پیش رفت' بھارتی سیکرٹری خارجہ مسٹر رگھوناتھ کے پریس کانفرنس میں دیئے گئے اس بیان کی صورت میں ضرور نظر آتی ہے جس میں مسئلہ کشمیر کو دونوں ملکوں کے درمیان بنیادی مسئلہ تسلیم کیا گیا ہے۔اس بیان کو کچھ نہ کچھ پیش رفت اس لئے قرار دیا جا سکتا ہے کہ اس سے پہلے تو بھارت کشمیر کو کوئی ایسا مسئلہ بھی تسلیم کرنے کیلئے کبھی تیار نہیں ہوتا تھا جسے حل کرنا ضروری ہے۔بھارت نہ صرف کشمیر کو کوئی مسئلہ تسلیم نہیں کرتا بلکہ وہ تو بین الاقوامی مجالس میں جن میں اقوام متحدہ' غیر جانبدار تحریک' اسلامی کانفرنس کی تنظیم' جنوب مشرقی ایشیاء کے ملکوں کی تنظیم آسیان اور یورپی یونین جیسی بین الاقوامی تنظیمیں بھی شامل ہیں۔کشمیر کا ذرا سا ذکر آنے پر بھی چیخ اٹھتا تھا اور متعلقہ ملکوں اور اداروں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے میں کسی تاخیر سے کام نہیں لیتا تھا۔وہ اپنی روایتی ہٹ دھرمی سے کام لیتے ہوئے یہی دعویٰ کرتا رہتا تھا کہ کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے اور کسی کو کشمیر کے حوالے سے بھی بھارت کے داخلی معاملوں میں مداخلت کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔لیکن گزشتہ چند ماہ سے اور خاص طور پر پاکستان کے 28 مئی اور 30 مئی کے ایٹمی دھماکوں کے بعد سے پے در پے ایسے بیانات آئے تھے جن میں بھارت پر زور دیا گیا وہ حقیقت پسندی' امن وسلامتی اور انصاف پسندی کے تقاضوں سے کام لیتے ہوئے مسئلہ کشمیر کو ریاست کے عوام کی امنگوں اور خواہشات کے مطابق حل کرنے پر تیار ہو جائے۔اس ضمن میں جنوبی افریقہ کے صدر نیلسن منڈیلا کا وہ بیان بطور خاص بڑی اہمیت رکھتا ہے جو انہوں نے غیر جانبدار تحریک کی سربراہ کانفرنس میں تنظیم کے موجودہ صدر کی حیثیت سے دیا تھا۔صدر منڈیلا کے بیان کی سب سے بڑی اہمیت یہ تھی کہ انہوں نے خود گوری اقلیت کے تسلط سے جنوبی افریقہ کے عوام کو نجات دلانے کی طویل جدوجہد کی اور اس جدوجہد میں ربع صدی سے زیادہ کا عرصہ قید و بند میں کاٹ دیا۔اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل' کوفی عنان نے دنیا کے سب سے بڑے ادارے کے انتظامی سربراہ کی حیثیت سے مسئلہ کشمیر کو حق وانصاف' مسلمہ بین الاقوامی اصولوں کے مطابق اور کشمیری عوام کے پیدائشی بنیادی حق...... خود ارادیت کے حق......کی بنیاد پر حل کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔اسی مفہوم کی قراردادیں یورپی یونین اور اسلامی کانفرنس کی تنظیم کے رکن ملکوں کے وزرائے خارجہ کے اجلاس میں بھی منظور کی گئیں اور انہی دنوں پاکستان کے وزیراعظم نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں خطاب کرتے ہوئے مسئلہ کشمیر کی جزئیات بیان کیں اور عالمی ادارے کو بتایا کہ کس طرح بھارت کی سات لاکھ سے زیادہ (دہشت گرد) فوج کشمیری عوام کو نئے نئے مظالم کا نشانہ بنا رہی ہے اور کشمیری نوجوانوں کو وحشیانہ ایذائیں دے کر انہیں یا تو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے یا پھر انہیں زندگی بھر کیلئے معذور بنا دیا جاتا ہے۔وزیراعظم پاکستان سے پہلے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدر بل کلنٹن نے بھی جنرل اسمبلی سے خطاب کرتے

Marfat.com

ہوئے کشمیر کے مسئلے کو ایک ایسا تنازعہ قرار دیا جسے امن وسلامتی کے مقاصد کی خاطر حل کیا جانا ضروری ہے۔اس سارے پس منظر کو سامنے رکھا جائے تو یہ سمجھنا مشکل نہیں رہ جاتا کہ بھارت کن حالات میں مسئلہ کشمیر کو ایک متنازعہ معاملہ تسلیم کرنے اوراس پر بات چیت کرنے پر مجبور ہوا۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان سیکرٹریوں کی سطح کی بات چیت کے اسلام آباد دور کا جائزہ لیتے ہوئے اور بات چیت کے بعد جاری ہونے والے مشترکہ بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے تجزیہ نگاروں نے یہ رائے ظاہر کی کہ بات چیت کا یہ دور کسی ٹھوس پیش رفت کے بغیر ہی ختم ہوگیا ہے۔پاکستان کی طرف سے مسئلہ کشمیر کے قطعی تصفیے کیلئے تجاویز کا ایک الگ اور جامع پیکیج بھارت کو دیا گیا ہے۔دونوں ملکوں کے فنی ماہرین امن وسلامتی کے بارے میں تجاویز کا جائزہ لینے کے لئے اپنی ملاقاتیں جاری رکھیں گے اوران دونوں موضوعات......مسئلہ کشمیراورامن وسلامتی...... پراب مزید بات چیت فروری 1999ء میں نئی دہلی میں ہوگی۔مشترکہ بیان میں یہ دعویٰ ضرور کیا گیا کہ بات چیت خوشگوار اور بے تکلف ماحول میں ہوئی اوردونوں فریقوں نے اپنے اپنے مئوقف کا کھل کراظہار کیا۔

اگست 1999ء میں دونوں ممالک کے درمیان کشیدگی بہت بڑھ گئی جس کی وجہ بھارتی ائرفورس کی ایک انتہائی وحشیانہ کارروائی تھا۔دراصل کارگل کی لڑائی میں پاکستانی علاقے پر حملہ کرنے والے دو بھارتی طیارے پاکستان نے مار گرائے تھے۔ایک پائلٹ پاکستان میں گرفتار ہوگیا تھااور بھارتیوں کو یہ سبکی ہضم نہیں ہورہی تھی وہ موقعہ کی تلاش میں تھے یہ مقصد اگست میں ان کے ہاتھ آیا جب پاکستان نیوی کا ایک تربیتی طیارہ ''اٹلانٹک'' بدین ائربیس سے معمول کی تربیتی پرواز پراڑا۔خیال رہے کہ یہ جنگی طیارہ نہیں۔بھارت کے نالیاائربیس سے آنے والے دو مگ 21 طیاروں نے اس پر پاکستانی سرحد کے اندرحملہ کیااوراٹلانٹک تباہ کردیا جس میں نیوی کے چھ افسراور جوان شہید ہوئے بھارتی جارحیت کی انتہا یہ تھی کہ وہ پاکستانی علاقے میں گرنے والا ملبہ بھی اپنے ہیلی کاپٹر پراٹھا کرلے گئےلیکن عالمی سطح پر یہ بات ثابت ہوگئی کہ بھارت نے اس نہتے جہاز پر پاکستانی علاقے میں حملہ کیا تھا۔پاکستان نے شدید احتجاج کیااور سرحدی تناؤ بڑھ گیا۔خصوصاً سرکریک اور کچھ کی سرحدوں پردونوں ممالک کی افواج حالت جنگ میں مورچہ بند ہوگئیں ایک مرتبہ پھرامریکنوں نے صورت حال کو قدرے نارمل کیا۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان بیک ڈورڈپلومیسی کا آغاز 1998ء میں ہوگیا تھا پاکستان کی طرف سے سابقہ سیکرٹری خارجہ نیاز اے نائیک معاملات چلا رہے تھے۔بھارت کی طرف سے مسٹرمشرا۔کارگل کی لڑائی نے ان تمام مذاکرات اورکوششوں پرپانی پھیردیانیازاے نائیک نے ایک اخباری بیان میں کہا'' کارگل بحران پیدانہ ہوتا تو پاکستان اور بھارت کے درمیان ستمبر یا اکتوبر 1999ء میں مسئلہ کشمیر پر مفاہمت ہوجاتی۔اس بیان نے سیاسی اور عسکری حلقوں کو چونکا دیافوج کی طرف سے اس پر شدید ردعمل سامنے آیااور حکومت سے کہا گیا کہ وہ مسٹر نائیک کے اس بیان کی تردید کرے کہ فوج نے ایسا مسئلہ کشمیر کے حل کوسبوتاژ کرنے کیلئے کیا ہے۔اب آیئے' یہ دیکھ لیا جائے کہ نیاز نائیک سے منسوب اس بیان میں کیا ہے' جس کے باعث ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔اس بیان کے مطابق'' پاکستان اور ہندوستان کے درمیان (کارگل بحران سے قبل) خاموش سفارتکاری کے بارے میں صرف چندافرادکوعلم تھا۔ان میں وزیراعظم' وزیرخارجہ اورسیکرٹری خارجہ

Marfat.com

شامل تھے۔ان کے علاوہ بری فوج کے سربراہ جنرل پرویز مشرف کو بھی کچھ کچھ علم تھا۔کارگل میں سالانہ مشق کرنے والوں کو اس کی خبر نہ تھی کہ بیک چینل ڈپلومیسی چل رہی ہے اور میاں نواز شریف اور واجپائی کے درمیان ستمبر یا اکتوبر میں مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کیلئے معاہدہ یا مفاہمت ہو جاتی۔لیکن کارگل کے بحران نے اسے سبوتاژ کر دیا۔جس کے بعد پاکستان نے وزیراعظم واجپائی کو ایک چار نکاتی پروگرام تجویز کیا:۔

1- اعلان لاہور سے دوبارہ وابستگی کا اظہار کریں

2- شملہ معاہدہ کے تحت لائن آف کنٹرول کا تقدس بحال کریں

3- بمباری اور حملے بند کریں

4- کشمیر سمیت تمام دیگر مسائل کو اعلان لاہور کے تحت حل کرنے کے عزم کا اعلان کریں۔

نیاز نائیک کی اس گفتگو کا اس کے سوا کوئی نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ ''مسئلہ کشمیر کے حل کے بارے میں نواز شریف حکومت اور فوج کے درمیان سوچ اور عمل کا واضح خلاء موجود تھا اور اسی کے نتیجے میں خاموش سفارتکاری کے باوجود کارگل کا بحران پیدا ہو گیا اور باہمی افہام وتفہیم کے ساتھ مسئلہ کشمیر کے حل کی جانب ستمبر یا اکتوبر میں ایک ٹھوس پیش رفت ہونے کا موقع ضائع ہو گیا۔

فوج نے بھی نیاز نائیک سے منسوب بیان سے بالکل یہی نتیجہ اخذ کیا تھا۔نیاز نائیک کا یہ بیان بہت سے لوگوں کیلئے کسی اچنبھے کا باعث نہیں تھا۔حزب اختلاف کے بعض رہنما چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ کارگل میں پاکستان کی جس قدر جگ ہنسائی ہوئی ہے اس کے بعد فوج کو اس کا ذمہ دار ٹھہرانے اور رسوائی کا سارا ملبہ فوج پر گرانے کی تیاری کی جا رہی ہے۔بہت سے لوگوں کے نزدیک یہ ایک ناقابل یقین بات تھی اس لئے انہوں نے حزب اختلاف کے لیڈروں اور بعض دیگر واقعان حال کی تنبیہہ پر توجہ نہ دی۔اس ضمن میں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ہندوستان میں ہونے والی ہر تخریبی کارروائی کے پیچھے آئی ایس آئی اور حکومت پاکستان کا ہاتھ تلاش کر لینے کی عادی ہندوستان کی حکومت کے وزیر دفاع جارج فرنانڈس نے 28 مئی 1999ء کو جب کارگل بحران اپنے عروج پر تھا اپنے ایک بیان میں کہا کہ ''یہ منصوبہ کسی طے شدہ مقصد کیلئے فوج نے تیار کیا تھا۔نواز شریف اور آئی ایس آئی کا نہیں۔یہ مقصد کیا ہے؟اس بارے میں ابھی کچھ پتہ نہیں ہے'' بھارتی وزیر دفاع اور نیاز نائیک کے مبینہ بیان میں کس قدر مماثلت موجود ہے حالانکہ فوج کے سربراہ جنرل مشرف نے جب ان سے سوال کیا کہ کارگل کا فیصلہ صرف فوج نے کیا تھا یا حکومت بھی اس میں شامل تھی' دوٹوک الفاظ میں کہا:

Everybody was on board

یعنی اس فیصلے میں وزیراعظم سمیت ہر اہم حکومتی عہدیدار شامل تھا۔نیاز نائیک نے کہا کہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان مفاہمت پر دستخط کرنے کیلئے طے پایا تھا کہ وزیراعظم نواز شریف دورہ چین کے بعد نئی دہلی میں رکیں گے یعنی کریں گے۔

پاکستان اور ہندوستان کے درمیان مفاہمت کے بارے میں نیاز نائیک نے جو کہا یا جو ان سے منسوب کیا گیا وہ کوئی نئی بات نہیں تھی کیونکہ وزیر خارجہ سرتاج عزیز تو یہ باتیں 13 اگست کو کارگل پر بحث سمیٹتے ہوئے خود کہہ چکے تھے۔

Marfat.com

انہوں نے اپنی تقریر میں کہا۔

''حکومت نے کارگل بحران کے موقع پر جو بیک چینل ڈپلومیسی اختیار کی اس کے باعث دونوں حکومتیں اتنا قریب آ گئی تھیں کہ 25 جون 1999ء کو ان کے درمیان ایک معاہدہ متوقع تھا لیکن ہندوستان کی حکومت یہ مسئلہ طے کرنے کیلئے مدت (9 ماہ سے 12 ماہ) مقرر کرنے کیلئے تیار نہ تھی۔ اگلے بارہ سے اٹھارہ ماہ میں ہندوستان کو اس جانب آنا پڑے گا۔ شہداء کا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔''

وزیر خارجہ نے نیاز نائیک کے بیان کی تردید کرتے ہوئے 17 ستمبر کو تقریباً ایک ماہ بعد کہا کہ بیک چینل ڈپلومیسی کے دو حصے ہیں ایک کارگل سے پہلے دوسرا کارگل کے بعد۔ کارگل کے بعد کشیدگی کم کرنے کی کوشش اس وقت شروع ہوئی جب مسٹر مشرا نے پاکستان کا دورہ کیا حکومت پاکستان نے ان سے کہا کہ کارگل کے مسئلے کو مسئلہ کشمیر سے الگ نہ کیا جائے بلکہ وقت آ گیا ہے کہ مسئلہ کشمیر کو مقررہ وقت میں حل کرنے کیلئے سنجیدگی کے ساتھ مذاکرات کئے جائیں۔ دونوں کے درمیان اتفاق رائے ہو چکا تھا کہ وزیراعظم نواز شریف چین سے واپسی پر نئی دہلی میں رکیں گے اور ایک معاہدے پر دستخط کریں گے لیکن ہندوستان کی حکومت اس سے مکر گئی اور یہ ان کے اندرونی دباؤ کی وجہ سے ہوا۔

سرتاج عزیز کے مطابق کارگل سے پہلے کی صورت حال کا جہاں تک تعلق ہے تو دونوں حکومتیں ایک چار نکاتی معاہدے پر متفق ہو گئی تھیں۔ مسئلہ کشمیر کو مقررہ وقت میں حل کرنے کیلئے جس پر عمل کیا جانا تھا۔ نیاز نائیک کا یہ کہنا غلط ہے کہ اس معاہدے پر ستمبر یا اکتوبر میں دستخط ہونے والے تھے تاہم اس کا امکان تھا کہ 10 ماہ سے 12 ماہ کے اندر ایسے معاہدے پر دستخط کر دیئے جاتے۔

سرتاج عزیز نے کہا کہ مفاہمت پر عمل ''کارگل آپریشن'' کی وجہ سے سبوتاژ نہیں ہوا بلکہ واجپائی حکومت کو سبکدوش کر دیئے جانے کی وجہ سے یہ عمل رک گیا کیونکہ نگران حکومت اہم فیصلے نہیں کر سکی۔ لیکن نیاز نائیک کا کہنا تھا کہ بی جے پی اگر انتخابات جیت گئی تو مذاکرات کا سلسلہ وہیں سے شروع ہو جائے گا جہاں سے 1999ء کے آخری دو ماہ میں پاکستان اور بھارت کے درمیان تعلقات میں شدید تناؤ پیدا ہو گیا یہ تناؤ 24 دسمبر کو اپنے نقطہ عروج کو چھونے لگا جب انڈین ائر لائنز کی ایک پرواز کو جو کھٹمنڈو سے دہلی جا رہی تھی ہائی جیک کر لیا گیا۔ ہائی جیکروں نے جہاز میں امرتسر سے پیٹرول بھرا اور پاکستان کی طرف سے انکار کے بعد افغانستان میں جہاں طالبان کی حکومت تھی جہاز کو قندھار ائر پورٹ پر اتار لیا۔ ہائی جیکر بھارتی قید میں موجود حرکت الانصار کے لیڈر مولانا مسعود اظہر اور کچھ کشمیری لیڈروں کی رہائی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ یہ پاکستان کے خلاف سازش تھی؟ یا واقعی کوئی مجاہدانہ کارروائی؟ آج تک اس سوال کا ڈھنگ سے جواب نہیں مل سکا لیکن وقت نے ثابت کیا کہ اس ہائی جیکنگ کے بعد سے مجاہدین مسلسل زوال کا شکار رہے۔ اس ہائی جیکنگ کے حوالے سے حامد میر نے روزنامہ اوصاف راولپنڈی میں اپنے ایک کالم ''قلم کمان'' میں لکھا:

''بھارت نے 24 دسمبر کو کھٹمنڈو سے نئی دہلی جانے والے انڈین ائر لائنز کے طیارے کے اغوا کی ذمہ داری پاکستان پر ڈال دی لیکن ابھی تک اس سوال کا جواب نہیں دیا کہ بھارتی حکام نے اپنے طیارے کو امرتسر ائر پورٹ سے پرواز کرنے کی اجازت کیوں دی؟ دوردرشن نے یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ جب طیارہ امرتسر ائر پورٹ پر اترا تو مقامی

Marfat.com

پولیس اور فوج کو اطلاع نہیں دی گئی' یہ سب کیوں ہوا؟ بھارتی ذرائع ابلاغ نے یہ الزام تو لگا دیا کہ ہائی جیکر 24 دسمبر کو پی آئی اے کی پرواز سے کھٹمنڈو آئے اور بھارتی طیارے میں سوار ہو گئے لیکن اس نکتے کو سامنے لانے سے گریزاں ہیں کہ پانچ ہائی جیکر صرف ایک بورڈنگ کارڈ کے ذریعہ طیارے میں کیسے سوار ہو گئے؟ زی نیوز پر بھارتی طیارے کے مسافروں کی بورڈنگ لسٹ کا عکس دکھایا گیا تو اس میں واضح نظر آ رہا تھا کہ ''مسٹر ایس اے قاضی +'' دوردرشن پر ایک تبصرہ نگار نے بار بار یہ سوال کیا کہ بورڈنگ کارڈ پر پانچ افراد کا طیارے میں سوار ہونا سیکورٹی کے ناقص انتظامات کی دلیل ہے لیکن مذکورہ تبصرہ نگار کو فوراً غائب کر دیا گیا۔ دنیا کے کسی چھوٹے سے چھوٹے ائرپورٹ پر ایک بورڈنگ کارڈ کے ذریعہ پانچ افراد طیارے میں سوار نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ دودھ پیتے بچے کا بھی علیحدہ بورڈنگ کارڈ بنایا جاتا ہے۔ یہ وہ نکتہ ہے جو اس شک کو تقویت دیتا ہے کہ کوئی نہ کوئی خفیہ ہاتھ ہائی جیکروں کو جہاز میں داخل کرنے کیلئے ضرور سرگرم تھا اور یہ خفیہ ہاتھ پاکستانی نہیں بلکہ بھارتی تھا کیونکہ انڈین ائر لائنز کے اندرونی معاملات میں صرف بھارتی ہاتھ ہی موثر ثابت ہو سکتا ہے۔ کھٹمنڈو ائرپورٹ پر سیکورٹی کے انتظامات میں گڑبڑ کا کوئی ثبوت اس لئے نہیں ملتا کہ فی الحال ہائی جیکروں کے پاس آتشیں اسلحے کی موجودگی کا کوئی ثبوت سامنے نہیں آیا۔ اغوا شدہ طیارے کے رہا شدہ مسافروں نے بتایا کہ ہائی جیکروں نے ایک مسافر کو پھل کاٹنے والی چھریوں سے ہلاک کیا۔

یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ حریت کانفرنس سمیت تمام اہم جہادی تنظیموں نے طیارے کے اغوا کو بھارتی ڈرامہ قرار دیا حالانکہ ہائی جیکروں کی طرف سے جموں جیل میں نظر بند عالم دین مولانا مسعود اظہر سمیت دیگر مجاہد کمانڈروں کی رہائی کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ حریت کانفرنس اور جہادی تنظیموں کے اس ردعمل کی وجہ سے کچھ سابقہ واقعات ہیں جن میں نامعلوم افراد نے اغوا کی وارداتیں کیں اور جہادی تنظیموں کو نقصان پہنچایا۔ 1995ء میں الفاران تنظیم نے مقبوضہ کشمیر سے کچھ مغربی سیاح اغوا کر لئے اور مولانا مسعود اظہر سمیت کئی مجاہدین کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ الفاران اور بھارتی حکومت میں مذاکرات جاری تھے کہ مغربی سیاح قتل ہو گئے اور اس کے بعد الفاران کا آج تک کوئی پتہ نہیں چلا البتہ اس واقعے کی ذمہ داری حرکت الانصار پر عائد کر دی گئی۔ حرکت الانصار مقبوضہ کشمیر کی ایک ایسی تنظیم تھی جو الحاق پاکستان یا خودمختاری کے چکر میں پڑے بغیر صرف کشمیر کی آزادی کیلئے سرگرم تھی۔ سیاحوں کے اغوا نے حرکت الانصار کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ نواز شریف دور میں امریکہ اور بھارت کے دباؤ پر یہ تنظیم پابندی کی زد میں آ گئی حالانکہ اس کیخلاف کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہ تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مولانا مسعود اظہر نے تحریری طور پر اس تنظیم سے اعلان لاتعلقی کر دیا تھا۔ پابندی کے بعد یہ تنظیم تین حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ بھارتی طیارے کے اغوا کے بعد یہ تنظیم ایک دفعہ پھر ٹارگٹ بن گئی حالانکہ حرکت الانصار نام کی تنظیم اب موجود ہی نہیں البتہ حرکت المجاہدین' حرکت الجہاد الاسلامی اور تحریک جہاد کا ماضی اسی تنظیم سے ضرور وابستہ ہے۔ طیارے کے اغوا میں جس تنظیم کا نام سامنے آیا ہے وہ اسلامک سالویشن فرنٹ ہے۔ الفاران کی طرح اس تنظیم کا بھی کوئی وجود نہیں لیکن اس مرتبہ سازش بڑے منظم انداز میں کی گئی ہے۔ ہائی جیکنگ میں ایسے افراد کو استعمال کیا گیا ہے جن سے مولانا مسعود اظہر یا مجاہدین کی لاتعلقی ثابت کرنا کافی مشکل ہے کیونکہ ہائی جیکروں میں سے ایک خود کو مولانا مسعود اظہر کا چھوٹا بھائی قرار دیتا ہے۔ اس سازش کو سمجھنے کیلئے 1971ء میں گنگا نامی بھارتی طیارے کے اغوا کی کہانی پر غور کرنا بہت

Marfat.com

ضروری ہے۔گنگا کے اغوا میں دوہائی جیکر ملوث تھے۔ایک کا نام اشرف قریشی تھا جو نیشنل لبریشن فرنٹ کا حریت پسند تھا جبکہ دوسرا ہاشم تھا جس کے بارے میں کچھ عرصہ بعد پتہ چلا کہ وہ بارڈر سیکورٹی فورس کا ملازم رہ چکا تھا۔پاکستانی سپریم کورٹ نے اشرف قریشی کو بری کر دیا تھا البتہ ہاشم پر شک کا اظہار کیا۔تاہم گنگا کے اغوا سے بھارت نے پاکستان پر حملے کا جواز ضرور پیدا کر لیا تھا۔حالیہ واقعے میں بھی ایسے نوجوان شامل ہو سکتے ہیں جو براہ راست بھارتی ایجنٹ نہ ہوں لیکن کوئی ایک ہاشم کی طرح مشکوک ضرور ہوگا جس نے پاکستان اور کشمیری مجاہدین کو بدنام کرنے کی اس سازش میں بنیادی کردار ادا کیا۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ مولانا مسعود اظہر 1994ء میں پاکستانی پاسپورٹ پر بھارتی ویزا لیکر سرینگر گئے تھے۔ دہلی سے سرینگر تک انہوں نے ہوائی جہاز سے سفر کیا۔وہ ایک جریدے ''صدائے مجاہد'' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے مقبوضہ کشمیر گئے تھے لیکن گرفتار کر لئے گئے۔یہی وجہ تھی کہ اے پی این اے اور سی پی این ای نے انکی رہائی کیلئے متفقہ قراردادیں بھی منظور کیں۔گرفتاری سے قبل انہوں نے مجیب الرحمٰن شامی اور الطاف حسن قریشی کے ہمراہ سوڈان کا دورہ بھی کیا تھا لہٰذا انکے صحافی ہونے میں کوئی شک نہ تھا لیکن انکی رہائی کیلئے جو ڈرامے کئے گئے ان کو کسی بھی صورت میں جائزہ قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اسلام بے گناہ غیر مسلموں کا بلا جواز خون بہانے کی اجازت نہیں دیتا۔ہائی جیکنگ کے حالیہ ڈرامے کے مقاصد تلاش کرنا مشکل نہیں۔اس ڈرامے سے بھارت کو فائدہ اور پاکستان کو نقصان ہوتا دکھائی دیتا ہے اور جس واقعے سے پاکستان کو نقصان ہو اس کے پیچھے بھارت یا امریکہ کے سوا کوئی تیسرا نہیں ہو سکتا۔یہ ڈرامہ اسی کا ہو سکتا ہے جو اس ڈرامے کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔(حامد میر۔روزنامہ اوصاف راولپنڈی 28 دسمبر 1999ء)

جہاز کے اغوا نے بھارتی حکومت کیلئے اندرونی طور پر لاینحل مسائل پیدا کر دیئے اور انہیں بادل نخواستہ مطلوبہ مجاہدین کمانڈروں کو رہا کرنا پڑا لیکن اس واقعہ سے پاکستان کی عالمی سطح پر پوزیشن مزید خراب ہوگئی۔ان حالات کے ساتھ ہم نئی صدی میں داخل ہو رہے تھے۔

Marfat.com

کارگل

مئی 1999ء میں وقوع پذیر ہونے والے کارگل کرائسس کو ہماری ملکی تاریخ میں ہمیشہ ایک خصوصی اہمیت حاصل رہے گی ''کارگل'' کیوں ہوا؟

کس کے اشارے پر ہوا؟

کیا واقعی یہ وزیر اعظم نواز شریف کی حکومت کے خلاف جنرل پرویز مشرف کی ایک سازش تھی؟

ایسے بہت سے سوالات کے جوابات آج بھی تشنہ ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ کارگل کے معرکے نے حکومت اور فوج کے درمیان تفریق پیدا کی۔ مجاہدین کو بددل کیا خصوصاً بھارتی فوج کے خلاف برسر پیکار مجاہدین میں یہ بات راسخ ہونے لگی کہ حکومت پاکستان نے ان کی قربانیاں ضائع کی ہیں عوامی سطح پر بھی ایسا ہی تاثر پیدا ہونے لگا۔ فوج نے حکومت پر اور حکومت نے فوج پر الزام تراشی شروع کی جس کے نتیجے میں عدم اعتماد کی فضا پیدا ہوئی اور سول حکومت کو رخصت ہونا پڑا۔ کارگل بھارتی مقبوضہ کشمیر میں واقع ہے جو 1971ء میں نئی سرحد بندی کے دوران بھارت کا حصہ بنا تھا۔ عموماً بھارتی سردیوں کے آغاز میں اپنے کارگل کے مورچے خالی کر دیتے ہیں اور مئی میں دوبارہ آ کر یہاں پوزیشن سنبھالتے ہیں۔

6 مئی 1999ء کی شام بھارتی فوج کی ایک پٹرولنگ پارٹی دراس سیکٹر میں گشت کر رہی تھی جب انہوں نے ''کھوکھر ننگ'' کی پہاڑی پر دس مجاہدین کو مورچہ بند پایا۔ یہ گشتی پارٹی مجاہدین کی نظروں میں آ گئی تھی جس کے تین جوان موقعہ پر مارے گئے اور دو شدید زخمی ہوئے۔ جو فوجی جان بچا کر واپس پہنچے ان کی رپورٹس کو پہلے تو بھارتی ہیڈ کوارٹر نے نا قابل اعتبار جانا کیونکہ اس علاقے میں مجاہدین کی موجودگی ان کے نزدیک ناممکنات میں سے تھے۔ 9 اور 12 مئی کے دوران بھارتیوں کی مختلف گشتی پارٹیوں نے بٹالک اور کارگل سیکٹر میں مجاہدین کی موجودگی کی خبر دی اور اسی خبر نے عملاً بھارتیوں کے ہوش اڑا دیئے۔ 13 مئی کو دراس کے شمال میں مجاہدین نے اچانک حملہ کر کے بھارتیوں کی ایک اہم پوسٹ چھین لی اور فوج کی مدد کو آنے والے ایک گن شپ ہیلی کاپٹر کو تباہ کر دیا۔

15 مئی کو مجاہدین نے ''مشق کوہ'' میں ایسا ہی ایکشن کر کے بھارتیوں کو بوکھلا کر رکھ دیا۔ کارگل' دراس اور بٹالک کے محاذوں پر مجاہدین نے بلند ترین چوٹیوں پر قبضہ کر کے جہاں پوری دنیا کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا وہیں پاکستان کے دوست اور دشمن بھی ایک بار پھر کھل کر میدان میں آ گئے۔ بھارت کا اس صورت حال پر سیخ پا ہونا تو سمجھ میں آنے والی بات تھی...... مجاہدین کی فتح سے امریکہ کو کیا تکلیف اور پریشانی ہوئی اور اس نے اچانک کیوں پھڑ پھڑانا شروع کر دیا۔ یہ

Marfat.com

بات سمجھ میں آنے والی نہیں تھی امریکہ دنیا میں انسانی حقوق کا سب سے بڑا علمبردار بنتا ہے' وہ جمہوریت کا بھی سب سے بڑا چیمپئن ہے' لیکن دنیا میں جہاں بھی اس کی انسانی ہمدردی اور جمہوریت نوازی سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ پہنچنے کا امکان ہو وہاں اس کے اصول بدل جاتے ہیں۔ عالمی سیاست میں امریکہ کے اس دورخے پن کی کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

کارگل کے محاذ پر مجاہدین کی فتح کی خبر باہر آئی تو امریکہ کو اس خطہ کے مستقبل کی تشویش لاحق ہوگئی اور پاکستان کو یہ نصیحت کی جانے لگی کہ وہ دراندازوں کو واپس بلائے۔ جب پاکستان کی طرف سے یہ حقیقت پسندانہ مؤقف پیش کیا گیا کہ کارگل کی چوٹیوں پر قبضہ کرنے والے درانداز نہیں بلکہ جنگ آزادی لڑنے والے وہ مجاہدین ہیں جو گزشتہ دس سال سے بھارت کے خلاف برسرپیکار ہیں اور بھارت کے انسانیت سوز مظالم کے خلاف جہاد کر رہے ہیں اور مجاہدین پر پاکستان کا کوئی براہ راست کنٹرول نہیں۔ اس کے بعد امریکہ کی طرف سے یہ مؤقف سامنے آیا کہ اگر بھارت نے پاکستان کے خلاف جارحیت کی تو امریکہ حمایت نہیں کرے گا..... امریکہ کا خیال تھا کہ اس طرح کی دھمکیوں یا اپنا دست شفقت' اٹھا لینے سے پاکستانی گھبرا جائیں گے اور امریکہ سے التجائیں کرنے لگیں گے کہ صاحب بہادر ایسا نہ کیجئے گا۔ پاکستان پر ان دھمکیوں کا کوئی اثر نہ ہوا تو امریکہ کی تشویش میں مزید اضافہ ہوتا چلا گیا کہ کہیں پاکستان اس کے اثر و رسوخ سے نکلتا تو نہیں جا رہا۔ اس دوران میں پاکستان کے وزیر خارجہ بھارت جانے سے قبل چین چلے گئے اور چینی حکام کے ساتھ علاقائی صورت حال پر تبادلہ خیال کے بعد دہلی گئے۔ پاکستانی وزیر خارجہ کا اچانک چین چلے جانا امریکیوں کیلئے غیر متوقع تھا' اس سے امریکی دفتر خارجہ میں کھلبلی مچ گئی اور امریکی دفتر خارجہ کے اعلیٰ عہدیداران پاکستان و بھارت کے دورے پر نکل کھڑے ہوئے لیکن امریکی سفارتکار بھی پاکستان کو اس کے اصولی مؤقف سے دستبردار نہ کر سکے۔ وزیر خارجہ نے بھی دہلی مذاکرات میں اصولی مؤقف اپنایا اور بھارت کو دوٹوک الفاظ میں بتا دیا کہ مجاہدین پر ہمارا کوئی اثر و رسوخ نہیں۔ بھارت کو چاہئے کہ وہ کشمیریوں پر ظلم بند کرے' وہاں سے اپنی افواج نکالے اور کشمیریوں کو اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرنے کا موقع فراہم کرے۔

جب بات بھارت کے ہاتھ سے نکلتی دکھائی دی تو امریکی صدر نے پہلے تو پاکستان کو دھمکی آمیز بیانات کے ذریعے رام کرنے کی کوشش کی اور پھر امریکی سنٹرل کمانڈ کے کمانڈر انچیف جنرل انتھونی زنی کو پاکستان بھیج دیا تاکہ پاکستان کو دوٹوک الفاظ میں بتا دیا جائے کہ کارگل سے نہ نکلنے کی اسے کیا قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ جنرل زنی وزیراعظم نواز شریف سے ملاقات کا پروگرام لے کر آئے تھے اور انہیں براہ راست صدر کلنٹن کی دھمکیاں پہنچانا چاہتے تھے۔ امریکی سنٹرل کمانڈ سے جنرل زین پاکستان کیوں تشریف لائے جبکہ ہم نے نہ سیاچن پر ہندوستانی قبضہ پر نہ نیلم وادی پر مستقل گولہ باری کو اتنا طول دیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس کا بھید ہندوستان کے آئندہ الیکشن سے ملتا ہے۔ مہاشہ جی نے یہ سوچا ہوگا کہ الیکشن میں کامیابی حاصل کرنے کا تیر بہ ہدف نسخہ یہ ہے کہ چند سو کشمیری مجاہدین کو نکال دیا جائے تو وہ سورما بن کر الیکشن جیت لیں گے۔ اس کیلئے ایک ڈرامہ رچانا ضروری ہے اور ڈرامہ بھی ایسا کہ یہ بہت بڑا معرکہ لگے' جسے مہاشہ جی نے جیتا ہے۔ اس سے ہر جگہ بی جے پی کی ''جے جے کار'' ہوگی۔ لہٰذا ہوائی فوج کو حملے کا حکم دے دیا۔ خیال تھا کہ چند دن میں چندر گپت موریہ کا دھارا لے کر آپریشن وجے کا سورما بن جائیں گے۔ بدقسمتی یہ چند سو ''گھس بیٹھے'' اپنی جگہ پر جمے رہے۔

Marfat.com

مہاشے جی کو اپنی سینا کے جوان لڑائی میں جھونکنے پڑے۔ بہر حال چونکہ مہاشے کو الیکشن جیتنا تھا تو انہیں ہندوستانی سپاہیوں کو جنگ کی بھٹی میں اپنے مقصد کیلئے جھونکنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔

ہندوستانی فوج کی وہ بے عزتی ہو رہی تھی لگتا تھا کہ ہندوستانی ہاتھی کی سونڈ میں کشمیری مجاہدین گھس گئے ہیں اور محض بی جے پی کے الیکشن کی سیاست کیلئے بی جے پی کو کالی ماتا کے ماتھے پر بھارتی سپاہیوں کے خون کا ٹیکا لگانا ضروری ہو گیا اور ہندوستان پاکستان پر جنگ کے بادل چھا گئے اور نیوکلیئر جنگ کا ہندوستان نے خدشہ مول لے لیا تو یہ محض بی جے پی کی الیکشن میں جیت کی ہوس تھی۔ ہندوستانی عوام' ہندوستانی سپاہی ان کی جانیں' مستقبل' خوش حال بی جے پی کی سیاست کے یرغمالی ہوئے۔ بالکل ایسے ہی جیسے کلنٹن نے مونیکا لوینسکی سے اپنے جنسی سکینڈل پر سے توجہ ہٹانے کیلئے عراق پر دوسری مرتبہ حملہ کیے تھے۔ واجپائی نے الیکشن جیتنے کیلئے کارگل پر جنگ شروع کر دی۔ ماہرین کا عام خیال یہ ہے کہ ہندوستان کیلئے کارگل یا کشمیر میں جنگی فتح پانا اگر ناممکن نہیں تو بے انتہا مشکل ضرور تھا۔ ہندوستانی فوج کا مورال گرا ہوا تھا۔ ان کے پائلٹ دوسری ہوائی افواج کے مقابلے میں بہت زیادہ حادثات کا شکار ہوتے ہیں۔ افسروں کی کمی ہے۔ کارگل میں بے انتہا شرمناک شکست ہو رہی تھی۔ ہندوستانی سپاہی میں اس جذبے کا فقدان ہے' جس سے انسان اپنی جان دینے کیلئے تیار ہو جاتا ہے۔ کشمیری مزاحمت نے اسے غاصب ہونے کا احساس دیا ہے۔ اس کے برعکس کشمیری مجاہدین میں ایک بامقصد حب الوطنی کی جنگ لڑنے کا جذبہ ہے۔ دونوں میں یہ بہت بڑا فرق ہے۔ ہندوستان کی فوج دنیا کی تیسری سب سے بڑی فوج ہے اور ڈیڑھ ماہ میں چند سو مجاہدین نے اسے ناکوں چنے چبوا دیے تھے۔

کارگل کی بلند و بالا چوٹیوں پر مجاہدین کا پہلا گروپ کب پہنچا اس بارے میں مختلف ذرائع سے جو معلومات حاصل ہوئی ہیں ان کے مطابق مجاہدین نے نومبر 1998ء میں ہی ان چوٹیوں پر سامان خورد و نوش اور سامان حرب پہنچانا شروع کر دیا تھا۔ اکتوبر میں ہر سال دونوں ممالک کی فوجیں ان بلند و بالا چوٹیوں سے واپس آ جاتی ہیں۔ اس بار جب بھارتی فوجی سردیاں گزارنے کیلئے اکتوبر 1998ء میں گرم مقامات کی طرف گئے تو مجاہدین نے اہم عسکری نوعیت کی چوٹیوں پر قبضہ کرنے کا مشکل ترین فیصلہ کیا اور پھر اپنی جانوں کو موت کے منہ میں دھکیل کر برفانی تودوں اور انسانی جسم کیلئے ناقابل برداشت سردی کا مقابلہ کرتے ہوئے تقریباً پورے پانچ ماہ تک مسلسل تگ و دو کے بعد پانچ سو کے لگ بھگ مجاہدین ان فوجی چوکیوں پر بٹھا دیے جو آج بھارت کی شہ رگ پر اپنے آہنی پنجے گاڑھے ہوئے ہیں۔ مجاہدین نے پندرہ ہزار فٹ بلند ان چوٹیوں پر پہنچنے کیلئے خود ہی راستے تیار کیے اور اس مقصد کیلئے ایسے ایسے طریقے اختیار کیے جو بھارتی فوجیوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھے...... ان پہاڑی چوٹیوں پر چڑھنا عام حالات میں بھی موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے' موسم سرما میں شدید برف اور برفانی تودوں کے درمیان سے گزرنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا لیکن مجاہدین شوق شہادت میں یہ سب کچھ کر گزرے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی کامیابی دی جو ظاہری اسباب پر نظر رکھنے والوں کی سمجھ اور سوچ سے بالاتر ہے...... مجاہدین نے اپنے لئے برفانی تودوں اور پہاڑی چٹانوں کا سینہ چیر کر راستے بنائے اور قدم بقدم آگے بڑھتے چلے گئے' راہ شوق کے ان دیوانوں نے زیادہ تر سفر رات کے اندھیروں میں کیا کیونکہ دن کی روشنی میں لائن آف کنٹرول پر نصب جدید ترین دوربینوں اور ریڈاروں سے بچ کر چلنا انتہائی مشکل تھا...... مجاہدین نے انتہائی مایوس کن اور صبر آزما

Marfat.com

لمحوں میں اپنا سفر جاری رکھا اور بالآخر وہ اپنے پانچ چھ سو ساتھیوں کے ہمراہ ان فوجی پکٹوں پر قابض ہو گئے جہاں سے بھارتی فوجیوں کو بآسانی نشانہ بنایا جا سکتا تھا اور سری نگر کارگل شاہراہ پر فوجی نقل و حرکت پر نظر رکھی جا سکتی تھی......

مئی 1999ء میں بھارتی فوجی ان پکٹوں پر واپس آئے تو انہیں مجاہدین کی طرف سے بچھائی گئی بارودی سرنگوں کا سامنا کرنا پڑا' اوپر سے مجاہدین نے بھارتی فوجیوں کو چن چن کر نشانہ بنایا اور اس کے ساتھ ہی جب کارگل کی ان چوٹیوں پر مجاہدین کے قبضہ کی خبر باہر آئی تو پوری دنیا میں بھونچال سا آ گیا۔ ''انڈیا ٹوڈے'' کا نمائندہ سب سے پہلے اس علاقے میں پہنچا وہ لکھتا ہے۔

''مجاہدین کے زیر قبضہ علاقوں میں پہنچ کر بڑے تلخ حقائق سامنے آتے ہیں جن کو بھارت کے حکمران اور عسکری ماہرین نظر انداز کر رہے ہیں۔ کارگل' دراس اور بٹالک سیکٹر میں جابجا بھارتی فوجیوں کی لاشیں بکھری پڑی ہیں اور ان سے اٹھنے والی بدبو اور تعفن کی وجہ سے وہاں کھڑے ہونا مشکل ہو گیا ہے۔ بھارت ابھی رائے عامہ کے خوف سے اپنے ہلاک ہونے والے فوجیوں کی صحیح تعداد اور عوام کو نہیں بتا رہا اور نہ ہی میدان جنگ میں اپنے فوجیوں کی پڑی ہوئی لاشوں کو اٹھا رہا ہے' اسے خطرہ ہے کہ جب یہ لاشیں بھارت پہنچیں گی تو حکومت اور فوج کے خلاف عوامی ردعمل کو کنٹرول کرنا مشکل ہو جائے گا اور بھارت کی فوج کا مورال مزید گر جائے گا......اس وقت تک ایک محتاط اندازے کے مطابق چار ہزار بھارتی فوجی میدان جنگ میں مارے جا چکے ہیں جن میں سے تین چار سو فوجیوں کی لاشیں بھارتی فوج اٹھا سکی ہے جبکہ باقی فوجیوں کی لاشیں جنگلی جانور' گیدڑ اور کوے نوچ رہے ہیں۔ ابھی تک بھارت جن فوجیوں کو کارگل کے محاذ پر لایا ہے' ان میں سے بہت کم ہیں جو بچ کر واپس گئے ہیں...... (انڈیا ٹوڈے جون 1999ء)

کارگل پر مجاہدین کے اچانک قبضے نے بھارتی ایوان حکومت میں کھلبلی مچا دی۔ خصوصاً وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی جو دوستی بس کے ذریعے پاکستان آئے اور معاہدہ لاہور کر گئے تھے اور اپنی روایات کے برعکس جنہوں نے مینار پاکستان پر جا کر پاکستان کے قیام کی آئندہ حقیقت کو تسلیم کیا زبردست تنقید کا نشانہ بنے۔ امریکی حکومت نے متوقع جنگ سے بچنے اور صورت حال کو نارمل کرنے کیلئے جنرل زینی کو پاکستان بھیجا۔

امریکی جرنیل زینی پاکستان تشریف لائے تو حسب سابق اپنے ساتھ دھمکیوں کا ایک سلسلہ بھی لے کر آئے تھے۔ اس دورے کا اختتام کچھ زیادہ خوشگوار نہیں تھا جنرل زینی ایک طرح ناکام واپس گئے جس پر روزنامہ نوائے وقت نے یکم جولائی کو اداریہ لکھا اور کہا۔

''پاک فوج کے ترجمان نے کہا کہ امریکی سنٹرل کمان کے کمانڈر انچیف جنرل انتھونی زینی پاکستان کو سمجھانے کیلئے نہیں بلکہ خود سمجھنے کیلئے آئے تھے کہ مسئلہ کیا ہے ہم نے انہیں کارگل کی صورت حال کے بارے میں اچھی طرح سمجھا کر بھیجا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ امریکی انتظامیہ پاکستان کے نقطہ نظر سے اچھی طرح آگاہ ہو گئی ہے۔ کارگل میں پیدا شدہ صورت حال نے ایک طرف تو پاکستان اور بھارت کو آمنے سامنے لا کھڑا کیا ہے دوسری طرف مسئلہ کشمیر کو عالمی سطح پر اجاگر کیا ہے اور دنیا پر یہ واضح ہو گیا ہے کہ اگر مسئلہ کشمیر اقوام متحدہ کی قراردادوں' تقسیم برصغیر کے فارمولے اور کشمیری عوام کی خواہشات کے مطابق حل نہ کیا گیا تو جنوبی ایشیا میں ایک اور جنگ کے خطرے کو ٹالا نہیں جا سکتا اور چونکہ دونوں متحارب

Marfat.com

فریق ایٹمی قوت سے لیس ہیں اس لئے ایٹمی جنگ بھی بعید از امکان نہیں۔'' اس صورت حال سے نمٹنے کا منطقی تقاضہ یہ ہے کہ اقوام متحدہ عالمی برادری اور امریکہ مسئلہ کشمیر حل کرائیں تاکہ جنگ کی نوبت ہی نہ آئے لیکن اب تک کسی طرف سے بھی زمینی حقائق کا اعتراف نہیں کیا گیا اور یکطرفہ طور پر پاکستان پر دباؤ ڈالا جاتا رہا ہے کہ مجاہدین کو واپس بلائے۔ تاہم یہ خوش آئند پیش رفت ہے کہ بھارتی پروپیگنڈے کا سحر ٹوٹ رہا ہے اور دنیا پر اصل صورت حال واضح ہو رہی ہے یہی وجہ ہے کہ امریکی ذرائع ابلاغ بھی کارگل کے معاملے کو مسئلہ کشمیر کیساتھ جوڑنے اور بھارت کی باون سالہ مجرمانہ غفلت کا جو اس نے رائے شماری کے سلسلے میں روا رکھی تذکرے کرنے لگے ہیں۔ امریکہ کی طرف سے اب واضح الفاظ میں یہ کہا جا رہا کہ اس نے مجاہدین کی واپسی کیلئے پاکستان پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا' نہ آئی ایم ایف کو مجبور کیا ہے کہ وہ پاکستان کیلئے دس کروڑ ڈالر قرضے کی قسط روک لے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان امریکہ پر اپنا نقطہ نظر واضح کرنے میں کسی حد تک کامیاب رہا ہے اور اب اگر صدر کلنٹن پاکستان آ کر یا امریکہ میں نواز شریف سے مذاکرات کرنا چاہتے ہیں تو اسکا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ یہ سب کچھ بھارت کے نقطہ نظر سے کر رہے ہیں بلکہ جنوبی ایشیا کے امن واستحکام کے حوالے سے کرنا چاہتے ہیں۔ پاکستان کی طرف سے فرانس کے ساتھ میراج طیارے خریدنے کا سودا اور فرانس کی طرف سے پندرہ دن میں کچھ طیارے فراہم کرنے کا وعدہ بھی یہی ظاہر کرتا ہے کہ جہاں جنگ کا خطرہ بڑھ چکا ہے جس سے نمٹنے کیلئے پاکستان نے اپنی تیاریاں تیز کر دی ہیں وہاں روایتی طور پر بھارت سے ہمدردی رکھنے والے ممالک بھی پاکستان کے نقطہ نظر کو اہمیت دینے لگے ہیں اور انہیں پاکستان کو اسلحہ فراہم کرنے پر کوئی اعتراض نہیں۔ اہم ترین پیش رفت وزیر اعظم کا دورہ چین ہے جس میں چینی قیادت نے کھل کر مشکل وقت میں پاکستان کو تنہا نہ چھوڑنے کا اعلان کیا ہے ان حالات میں پاکستان کے تین نکاتی فارمولے کو تسلیم کرنے سے انکار بھارت کی اس ہٹ دھرمی کا غماز ہے جس کا مظاہرہ وہ مسئلہ کشمیر کے پرامن حل کے سلسلے میں گزشتہ پچاس سال سے کرتا چلا آ رہا ہے اور جو جنوبی ایشیا میں عدم استحکام وکشیدگی کی اصل بنیاد ہے۔ بنا بریں امریکہ کا فرض ہے کہ وہ بھی چین کی طرح پاکستان کے نقطہ نظر کو کشادہ دلی سے قبول کرے اور مسئلہ کشمیر کے دیرپا حل کیلئے اپنی عالمی ذمہ داریاں پوری کرے۔

پاکستان کے نہ تو جارحانہ توسیع پسندانہ عزائم ہیں اور نہ آج تک اس نے بھارت کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی ہے حالانکہ بتیس کروڑ مسلمانوں کا تحفظ لیاقت نہرو پیکٹ کی رو سے پاکستان کی ذمہ داری ہے جہاں تک مسئلہ کشمیر کا تعلق ہے تو یہ برصغیر کے نامکمل ایجنڈے کا حصہ ہے رائے شماری کے ذریعے کشمیری عوام کو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا موقع فراہم کر کے پاکستان اور بھارت اپنے فرض سے سبکدوش ہو سکتے ہیں بھارت کا رائے شماری سے انکار ہی اس امر کا مظہر ہے کہ وہ کشمیری عوام کے متوقع فیصلے سے خوفزدہ ہے اور خطے میں ایک نئی جنگ کا آغاز کر کے نئے مسائل پیدا کرنا چاہتا ہے تاکہ مسئلہ کشمیر پس منظر میں چلا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اب بھی اس نے مسئلہ کشمیر کو اہمیت دینے کے بجائے کارگل سے مجاہدین واپس بلانے اور پاکستان کو ان کی سرپرستی ترک کرنے کی دہائی دے رہا ہے اس مقصد کیلئے وہ جھوٹ اور فریب کا ہر ہتھکنڈہ استعمال کر رہا ہے۔ اسے کارگل میں کبھی تو کشمیری مجاہدین نظر آتے ہیں کبھی افغان مجاہدین اور کبھی اسامہ بن لادن کے ساتھی' ایک ہی سانس میں وہ پاکستانی فوجیوں کی موجودگی کا انکشاف بھی کرتا ہے جو اس کی بدحواسی اور جھوٹ کا آئینہ دار

Marfat.com

ہے۔جس طرح کہ پاک فوج کے ترجمان نے کہا ہے اگر امریکہ کو یہ سمجھ آ گئی ہے کہ کارگل کا تعلق مسئلہ کشمیر سے ہے اور امریکی خواہش کے مطابق پاکستان مذاکرات کے ذریعے مسئلہ حل کرنا چاہتا ہے جب کہ بھارت مذاکرات سے انکار کر رہا ہے تو پھر صدر کلنٹن کا فرض ہے کہ وہ مزید وقت ضائع کئے بغیر بھارت پر واضح کریں کہ وہ مسئلہ کشمیر پر پاکستان سے بامقصد مذاکرات کا آغاز کرے۔ وگرنہ عالمی ردعمل کا سامنا کرنے کیلئے تیار رہے۔امریکہ کے اس واضح مؤقف کو اگر بھارت نے قبول نہ بھی کیا تو کم از کم اس کا یہ فائدہ ضرور ہوگا کہ عالم اسلام اور پاکستانی وکشمیری عوام امریکہ کے بارے میں جن شکوک و شبہات کا شکار ہیں اور چین بھی یہ سمجھتا ہے کہ وہ مسئلہ کشمیر اور کارگل کے بہانے خطے میں مداخلت کے بہانے ڈھونڈ رہا ہے ان کا ازالہ ہوگا اور چین کی طرح امریکہ کا کردار بھی نکھر کر سامنے آئے گا۔ پاکستان عراق یا یوگوسلاویہ نہیں کہ اسے یکطرفہ دباؤ کے ذریعے ایسی شرائط ماننے پر مجبور کر دیا جائے جن کے نتیجے میں مسئلہ کشمیر پھر سرد خانے کی نذر ہو جائے اور بھارت کی علاقائی بالادستی کو تسلیم کر لیا جائے۔کوئی بھی پاکستانی حکومت مسئلہ کشمیر حل کرنے کے بارے میں واضح، دوٹوک یقین دہانی کے بغیر نہ تو کارگل سے واپسی کی شرط قبول کر کے برسر اقتدار رہ سکتی ہے اور نہ مجاہدین کی کامیابی کو مذاکرات کی میز پر رکھ کر عوام کا سامنا کر سکتی ہے اس لئے امریکہ حقیقت پسندانہ طرز عمل اختیار کرے تا کہ جنگ کے خطرات کو ٹالا جا سکے۔

(روزنامہ نوائے وقت۔لاہور)

اس دوران اچانک یہ خبر آئی کہ پاکستان کی طرف سے سابقہ سیکرٹری خارجہ جناب نیاز اے نائیک خصوصی سفارتی مشن پر بھارت گئے ہیں گو کہ پہلے حکومت نے اسے ان کا ذاتی دورہ بتایا لیکن بعد میں اسے سرکاری دورہ بنا دیا گیا' یہ دورہ خاصا متنازعہ اور نہ سمجھ آنے والا تھا اس صورت حال پر ''نوائے وقت'' نے 2 جولائی 1999ء کو لکھا۔

برطانوی نشریاتی ادارے کی رپورٹ کے مطابق حال ہی میں بھارت کا دورہ کرنے والے پاکستان کے سابق سیکرٹری خارجہ نیاز اے نائیک نے کہا ہے کہ دونوں ممالک کے سینئر فوجی حکام کے درمیان ملاقات کی کوشش کی جا رہی ہے تا کہ کشمیر میں کارگل کی صورت حال سے پیدا شدہ تنازعہ دور کیا جا سکے۔نیاز اے نائیک نے کہا کہ بھارتی وزیراعظم واجپائی سے ملاقات میں یہ تجویز بھی سامنے آئی کہ دونوں ملکوں کے ڈائریکٹر ملٹری آپریشنز کے درمیان ملاقات ہو اور کشیدگی کے علاقہ سے انخلا کا سمجھوتہ کیا جائے۔ بین الملکی معاملات میں سفارت کاری اور پرکاری خاص اہمیت رکھتی ہے بھارت ایسے عیار' مکار اور جارحانہ وتوسیع پسندانہ عزائم رکھنے والے ہمسائے کے ساتھ معاملہ فہمی کیلئے محض رسمی سفارت کاری کافی نہیں' اس لئے حکومت نے اگر بیک چینل ڈپلومیسی کا راستہ اختیار کیا ہے تو اسے بدگمانی کی نذر کرنا موزوں نہیں لیکن بیک چینل ڈپلومیسی ہو یا ٹریک ٹو پالیسی' سب کا مقصد اور مدعا اپنے حق وانصاف پر مبنی مؤقف کو منوانا اور فریق مخالف کو ہٹ دھرمی ترک کر کے دوطرفہ معاملات کو پرامن طریقے سے حل کرنے پر آمادہ ہونا چاہیے۔ یہ مقصد اس صورت میں حاصل کیا جا سکتا ہے کہ بیک چینل ڈپلومیسی کیلئے جن لوگوں کا انتخاب کیا جائے ان کی قومی اور تاریخی مؤقف سے کمٹ منٹ کسی شک و شبہ سے بالاتر ہو اور وہ اپنے ذاتی نظریات کی پذیرائی کیلئے سرگرم عمل ہو کر نادانستہ طور پر قومی مؤقف اور مفادات کو نقصان پہنچانے کا باعث نہ بنیں۔ابھی تک یہ طے نہیں ہو سکا کہ نیاز اے نائیک کس حیثیت میں بھارت گئے اگر وہ ذاتی حیثیت میں وہاں گئے تو انہیں فالکن طیارہ استعمال کرنے کی سہولت کیسے ملی اور بھارتی وزیراعظم سے ملاقات کا اہتمام کس طرح

Marfat.com

ہو گیا۔ بیک چینل ڈپلومیسی کے حوالے سے ڈاکٹر مبشر حسن کا نام بھی لیا جا رہا تھا مگر ڈاکٹر صاحب نے اس سارے معاملے سے لاتعلقی کا اظہار کیا ہے۔ ان کے بقول وہ پہلے کی طرح بھارت ضرور گئے لیکن بنگلہ دیش میں مصروفیات کے باعث ان کی واجپائی وغیرہ سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ اس کے برعکس ایک طرف تو نیاز اے نائیک اس دورے کو ذاتی قرار دیتے ہیں' دوسری طرف یہ اعتراف بھی کرتے ہیں کہ واجپائی سے ملاقات میں دونوں ممالک کے فوجی کمانڈروں کی ملاقات اور کارگل سے انخلاء کی تجویز بھی زیر بحث آئی۔ سوال یہ ہے کہ ایک ایسے شخص کے ساتھ جس کی کوئی سرکاری یا نیم سرکاری حیثیت نہیں' بھارتی وزیر اعظم' ڈائریکٹر ملٹری آپریشنز کی ملاقات اور کارگل سے انخلاء کی تجویز پر بات کیوں کریں گے اور موصوف کس کی طرف سے اور کس بناء پر عالمی ذرائع ابلاغ کو باور کرا رہے ہیں کہ یہ ملاقات ہو جائے گی اور آنحالیکہ چند روز قبل امریکی سفیر متعینہ اسلام آباد بھی ایسی ہی ایک تجویز کے بارے میں بعض لوگوں کو بتا چکے ہیں۔

پاکستان کا کوئی صحیح الدماغ شخص بھی موجودہ حالات میں مجاہدین کے کارگل کی چوٹیوں سے انخلاء اور کنٹرول لائن سے پاک فوج کی واپسی کی حمایت نہیں کر سکتا کیونکہ کارگل کی صورت حال سے اگرچہ جنگ کے خطرات میں اضافہ ہوا ہے اور اسکا ذمہ دار بھارت ہے لیکن اس بناء پر مسئلہ کشمیر بھی عالمی سطح پر اجاگر ہوا ہے اور عالمی برادری میں یہ احساس بڑھا ہے کہ اگر یہ مسئلہ اقوام متحدہ کی قراردادوں اور کشمیری عوام کی خواہشات کے مطابق حل نہ کیا گیا تو جنوبی ایشیا میں ایٹمی جنگ کو روکنا مشکل ہو گا۔ اس کے علاوہ بھارت پہلی بار فوجی سطح پر دباؤ میں ہے اور اسکی بری اور فضائی فوج اپنے نقصانات کا اعتراف کر رہی ہے۔ بھارتی فوج کے ترجمان کرنل بکرم سنگھ نے برملا یہ کہا ہے کہ "بمباری سے اپنے ہی فوجی مر رہے ہیں ہم کارگل کی چوٹیاں مجاہدین سے واپس نہیں لے سکتے کیونکہ مجاہدین جذبہ سے سرشار اور بہادر ہیں جبکہ ہمارے فوجی ان کی گولیوں کا نشانہ بن رہے ہیں" ان حالات میں ضرورت اس امر کی ہے کہ کامیابیوں کو مستحکم کرنے کیلئے مجاہدین اور کنٹرول لائن پر موجود پاک فوج کے جوانوں کی ہر ممکن حوصلہ افزائی کی جائے اور سیاسی و سفارتی محاذ پر بھی اسی طرح جارحانہ پیش رفت رکھی جائے جس کا مظاہرہ کارگل میں ہوا جو لوگ جنگ کا خوف پیدا کر کے ان کی کامیابیوں کو ناکامیوں میں بدلنے کے درپے ہیں وہ اس حقیقت سے بے خبر ہیں اسے کوئی بھی شخص خواہ وہ سیاسی حکمران ہو یا فوجی سربراہ پسپائی کا فیصلہ کر کے اپنے منصب پر برقرار نہیں رہ سکتا۔ پاکستان جنگ نہیں چاہتا اور اس کی سفارتی سرگرمیوں کا مقصد جنگ کے خطرات کا سدباب کرنا ہے لیکن اگر کارگل میں شکست سے خائف بھارت کوئی حرکت کرتا ہے تو ہم ایک آزاد اور خود مختار قوم کی طرح اس کا سامنا کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اس مقصد کیلئے ہم نے نیوکلیئر صلاحیت حاصل کی ہے اور سینٹ میں قائد حزب اقتدار راجہ ظفر الحق نے یہ واضح کر دیا ہے کہ اگر بھارت نے ہم پر جنگ مسلط کی تو ہم ایٹمی ہتھیار اور میزائل استعمال کرنے سے دریغ نہیں کریں گے کیونکہ یہ ہتھیار ہم نے محض نمائش یا دراز میں رکھنے کیلئے نہیں بنائے۔

بنابریں قوم کو حوصلہ رکھنا چاہئے اور بھارت کی گیدڑ بھبکیوں یا امریکہ کے مخاصمانہ بیانات سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہئے۔ بھارت جب خود ہی اپنی ناکامی کا اعتراف کر رہا ہے تو پھر ہمیں خواہ مخواہ انخلاء کی باتیں کر کے اپنے مؤقف کی کمزوری کا اظہار نہیں کرنا چاہئے۔ پاکستان نے ابتداء میں سفارتی سطح پر جو کمزوری دکھائی وہ بھی برقرار نہیں رہی اور وزارت خارجہ کے ترجمان نے درست کہا ہے کہ اسلامی وزراء خارجہ کانفرنس کا مشترکہ اعلامیہ سامنے آنے کے بعد واضح ہو

Marfat.com

جائے گا کہ اسلامی برادری ہمارے ساتھ ہے۔ اگر بھارت کسی فوجی یا سفارتی محاذ پر کوئی کامیابی حاصل کر چکا ہوتا تو وہ مذاکرات سے انکار نہ کرتا اور بھارتی وزیر اعظم واجپائی کو یہ اعلان کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی کہ ہم کنٹرول لائن کو عبور نہیں کریں گے لہٰذا بیک چینل ڈپلومیسی خواہ جاری رہے لیکن حکومت کسی شخص کو یہ حق نہ دے کہ وہ مجاہدین کے انخلاء کا شوشہ چھوڑے یا پاکستان کی کمزوری کا تاثر پیدا کرے۔

بھارتی فوج نے دعویٰ کیا ہے کہ مغربی بنگال کے علیحدگی پسندوں کے پاکستان سے رابطے ہیں اور وہ پاکستان کی ایک خفیہ تنظیم کیلئے جاسوسی کرتے ہیں۔ یہ بات بھارت کے مشرقی کمان کے چیف آف سٹاف لیفٹیننٹ جنرل سریش چوپڑا نے کلکتہ میں اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہی ہے۔ مغربی بنگال کے علیحدگی پسندوں کی تنظیم ''الفتح'' نے اسکی تردید کی ہے۔ آئی ایس آئی کے ساتھ رابطوں کی یہ کہانی پہلی بار نہیں گھڑ پ گئی بلکہ بھارت میں کام کرنے والی علیحدگی کی اکثر تحریکوں کا سلسلہ پاکستان کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے۔ بھارت میں اس وقت مقبوضہ کشمیر کی تحریک آزادی نے مصنوعی وفاق کو شدید خطرے سے دوچار کر دیا ہے۔ بھارت کے اکثر علاقے وہاں کے عوام کی خواہشات کے برعکس وفاق میں رکھے گئے ہیں اور اس مصنوعی انتظام کا وہی حشر ہوگا جو سوویت یونین کا ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ بھارت میں کئی قومیں اور نسلیں آباد ہیں' وہاں کے اصل باشندوں کو آدھی باسی قرار دے کر انسانیت کی سطح سے بھی نیچے گرا دیا گیا ہے۔ جو قومیں بھارتی وفاق میں زبردستی اور جبر کے ساتھ رکھی گئی ہیں وہ اپنی آزادی کیلئے مسلح تحریکیں شروع کئے ہوئے ہیں۔ جھاڑکھنڈ' میزورم' ناگا اور دوسری کئی تحریکوں کا ایک ہی مطالبہ ہے کہ انہیں آزاد کیا جائے۔ کشمیر تو شروع سے ہی مسلمانوں کا علاقہ ہے اور بھارت نے اسے سات لاکھ سے زائد فوج کے بل بوتے پر اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے' کشمیری حریت پسند ہی نہیں دوسری آزادی پسند تحریکوں نے بھی بھارتیوں کو عاجز کر دیا ہے اور جب وہ میدان جنگ میں مار کھا جاتے ہیں تو پاکستان کے ساتھ رابطوں کا واویلا شروع کر دیتے ہیں۔ اسطرح بے مقصد شور وغوغا کرنے سے بہتر ہے کہ بھارت ان علاقوں کی آزادی اور خودمختاری کا مطالبہ تسلیم کرلے جہاں یہ تحریکیں برپا ہیں۔ اس طرح وہ اپنی فوج مروانے سے بھی بچ جائے گا اور مصنوعی بھارتی وفاق کو قائم رکھنے کیلئے جو خرابیاں ہو رہی ہیں وہ بھی ختم ہو جائیں گی۔ بھارتی قیادت جس قدر جلد اس حقیقت کا اعتراف کرلے گی اسی قدر بہتر ہوگا۔ (روزنامہ نوائے وقت..... لاہور)

جب ساری قوم جذبات کے طوفان میں بہہ رہی تھی اور سری نگر پر قبضے کے خواب دکھائے جا رہے تھے ان لمحات میں ''حقیقت پسند پاکستانی قیادت'' کو اچانک امریکہ نے وہ بھیانک منظر دکھا دیا جسے دیکھنا قومی قیادت پسند نہیں کرتی تھی چونکہ ہمارا موضوع صرف پاک بھارت تعلقات ہیں اس حوالے سے پاکستانی سول اور ملٹری بیوروکریسی میں پنپنے والی سازشیں ہمارا موضوع نہیں۔ اس ضمن میں ملک بدر ہونے کے بعد سے سابقہ وزیر اعظم میاں نواز شریف کے متعدد مرتبہ دہرائے اس بیان کا حوالہ ہی کافی ہے۔

''کارگل کے ذریعے میری حکومت اور پاکستان کے خلاف خطرناک سازش کی گئی جسے ہم نے ناکام بنا دیا۔''

(انٹرویو میاں نواز شریف۔ اے آر وائی چینل، دبئی)

اس ''سازش'' کو ناکام بنانے کیلئے وزیر اعظم میاں نواز شریف اپنا دورہ چین مختصر کر کے وطن واپس لوٹنے اور

Marfat.com

اچانک امریکہ جانے کا اعلان کر دیا۔ 24 جولائی 1999ء کو میاں نواز شریف عازم امریکہ ہوئے یہاں صدر کلنٹن سے مذاکرات کے بعد مشترکہ اعلامیہ جاری ہوا جس میں پاکستان نے وعدہ کیا کہ وہ مجاہدین سے اپیل کرے گا کہ وہ بھارتی علاقہ خالی کر کے واپس آ جائیں۔ کلنٹن نواز شریف مشترکہ اعلامیہ پر نوائے وقت نے 6 جولائی کو لکھا۔

امریکہ کے صدر بل کلنٹن اور پاکستان کے وزیراعظم میاں محمد نواز شریف نے واشنگٹن میں تین گھنٹے کے مذاکرات کے بعد جاری کیے گئے مشترکہ بیان میں اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ ''کشمیر کے علاقہ کارگل میں جاری جنگ خطرناک ہے اور اس کے نتیجے میں وسیع تر تصادم بھڑک سکتا ہے۔ دونوں لیڈروں کے درمیان اس بات پر بھی اتفاق رائے پایا گیا کہ شملہ معاہدہ کے تحت لائن آف کنٹرول کی بحالی کیلئے ٹھوس اقدامات کئے جائیں۔ صدر کلنٹن نے کہا کہ ان اقدامات کے بعد محاذ آرائی اور دشمنی کا فوری خاتمہ کر دیا جائے۔ دونوں لیڈر اس بات پر متفق تھے کہ لاہور میں شروع ہونے والے دوطرفہ مذاکرات پاکستان اور بھارت کے درمیان مسئلہ کشمیر سمیت تمام متنازعہ امور کو حل کرنے کیلئے اعلان لاہور بہترین فورم ہے۔ صدر کلنٹن نے کہا کہ ان اقدامات کے بعد محاذ آرائی اور دشمنی کا فوری خاتمہ کر دیا جائے۔ دونوں لیڈر اس بات پر متفق تھے کہ لاہور میں شروع ہونے والے دوطرفہ مذاکرات پاکستان اور بھارت کے درمیان مسئلہ کشمیر سمیت تمام متنازعہ امور کو حل کرنے کیلئے اعلان لاہور بہترین فورم ہے۔ صدر کلنٹن نے کہا کہ جب لائن آف کنٹرول کا تقدس پوری طرح بحال ہو جائے تو پھر وہ ان دوطرفہ مذاکرات کی تیز بحالی کی حوصلہ افزائی میں ذاتی دلچسپی لیں گے۔ وزیراعظم نواز شریف کا یہ دورہ امریکی صدر بل کلنٹن کی دعوت پر عمل میں آیا جس کے بارے میں ابتدائی اطلاع پاکستان کے چیف آف آرمی سٹاف جنرل پرویز مشرف نے دی تھی۔ گزشتہ سنیچر کے روز صدر کلنٹن سے ٹیلی فون پر گفتگو کے بعد میاں صاحب اسی شب امریکہ روانہ ہو گئے۔ کارگل کی صورت حال اور وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی کو بھی امریکہ آنے کی دعوت دی تھی لیکن واجپائی نے یہ دعوت قبول نہ کی کیونکہ بھارت کو خدشہ تھا کہ اس سے مسئلہ کشمیر کو بین الاقوامی حیثیت مل جائے گی اور پاک بھارت مذاکرات میں تیسرے فریق کی شمولیت کا امکان بڑھ جائے گا۔ چنانچہ بھارت کے ایک ڈنگ ٹپاؤ بڈھے کھوسٹ وزیراعظم نے جسے کارگل کے محاذ سے ہر روز اپنے فوجیوں کی لاشوں کے تابوت دہلی میں موصول ہو رہے تھے' اپنی ہٹ دھرمی قائم رکھی لیکن قوم سے بھاری مینڈیٹ حاصل کرنے اور دنیا کی ساتویں ایٹمی طاقت بن جانے والے ملک کے جواں سال وزیراعظم نے اس دعوت کا خیر مقدم کیا۔ انہوں نے آناً فاناً امریکہ پہنچ کر امریکی صدر سے ہنگامی ملاقات کی اور مذاکرات کے بعد مشترکہ اعلامیہ بھی جاری کروا دیا جس میں زیادہ زور 1972ء کے شملہ معاہدے اور اس دور میں طے پا جانے والی کنٹرول لائن پر ہے۔ جبکہ صحیح صورت یہ ہے کہ کارگل سیکٹر میں لائن آف کنٹرول کی حد بندی عمل میں ہی نہیں آئی' کارگل کشمیر کے شمالی علاقہ جات کا حصہ ہے اور اس پر ابتداء سے پاکستان کا قبضہ رہا ہے۔ 1965ء کی جنگ میں بھارت نے اس پر دسترس حاصل کر لی تھی لیکن معاہدہ تاشقند کے بعد اسے پاکستان کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ 1971ء کی جنگ میں بھارت نے دوبارہ اس پر قبضہ کر لیا۔ 1972ء میں شملہ معاہدہ طے پایا تو بھارت نے بے جواز طور پر اپنا قبضہ کارگل پر قائم رکھا اور پاکستان نے بھی دباؤ کے تحت اس پر کچھ زیادہ اعتراض نہ کیا۔ شملہ معاہدے میں سیز فائر لائن کی بجائے ''لائن آف کنٹرول'' کی اصطلاح وضع کی گئی تھی لیکن اس لائن کا احترام بھی خود بھارت نے 1984ء میں شکستہ کیا

Marfat.com

اور موقع پاتے ہی سیاچن گلیشیئر پر قبضہ کرلیا۔ یہی عمل 1999ء میں مجاہدین کشمیر نے دہرایا اور کارگل کی چوٹیوں پر قبضہ کرلیا تو بھارت نے شوروغوغا برپا کردیا اور بڑی بے رحمی سے ان پر زمینی اور فضائی حملے شروع کردیئے۔ بھارت نے صورت حال اس حد تک کشیدہ کردی کہ اس عملی جنگ میں ایٹمی طاقت کے استعمال کی دھمکیاں بھی دی جانے لگیں۔ کلنٹن نواز اعلامیہ میں جنگ کے پھیل جانے کا واضح اشارہ موجود ہے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ امریکہ جیسی ''سپر پاور'' نے بھی فساد کی اصل جڑ کو پکڑنے اور اس بنائے نزاع کو رفع کرانے کی بجائے اپنی توجہ صرف کارگل اور ''لائن آف کنٹرول'' تک محدود کردی ہے۔ اس اعلامیے میں کشمیر کا ذکر نہ صرف ضمنی ہے بلکہ اس کے حل ''وعدہ فردا'' پر ٹال دیا گیا ہے۔ ''شملہ معاہدہ'' کے حوالے سے بھی بھارت کو سیاچن سے ''بیل آؤٹ'' ہونے کا موقع فراہم کردیا گیا ہے' جس سے جان چھڑانے کی خود بھارت عرصے سے خواہش کررہا تھا۔

پاکستان اس سے پہلے تمام مواقع پر اس مضبوط مؤقف کا اظہار کرتا رہا ہے کہ کارگل کو مسئلہ کشمیر سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ صورت اب بھی قائم ہے' اور مجاہدین کشمیر اقوام متحدہ کی منظور شدہ قراردادوں کے مطابق استصواب رائے کرانے اور اپنی مرضی کا فیصلہ کرنے کا حق حاصل کئے بغیر کسی اور فیصلے کو قبول نہیں کرسکتے۔ بھارت نے ان کے اس حق کو تشدد' ظلم' کلاشنکوف اور خاک وخون کے زور سے دبانے کیلئے سات لاکھ سے زائد فوج کشمیر میں متعین کررکھی ہے اور یہ سلسلہ گزشتہ پچاس برس سے جاری ہے۔ اس مسئلہ کو بین الاقوامی حیثیت تو 1948ء میں ہی حاصل ہوگئی تھی جب پنڈت نہرو مجاہدین کی یورش کی تاب نہ لاکر اقوام متحدہ میں دوڑے چلے گئے تھے اور مستقبل میں کشمیریوں کو اپنا فیصلہ خود کرنے کیلئے قرارداد منظور کروالائے تھے۔ حالیہ اعلامیہ میں ''شملہ معاہدہ'' اور ''اعلان لاہور'' کا حوالہ اس لئے بے معنی ہے کہ اس سے اقوام متحدہ کی منظور شدہ قراردادوں کی نفی نہیں ہوسکتی اور نہ ہی یہ قرارداد پورے عملدرآمد کے بغیر اقوام متحدہ کے ایجنڈے سے موقوف کی جاسکتی ہے۔ شملہ معاہدے کے تحت طے پاجانے والی لائن آف کنٹرول کو قبول کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ مجاہدین نے کارگل میں جو کامیابیاں حاصل کی ہیں وہ ان سے دستبردار ہوجائیں تاکہ مبینہ امن کی فضا قائم ہوسکے۔ منطقی طور پر شاید یہ بات درست نظر آئے لیکن کیا مجاہدین اپنی کامیابیوں کی قربانی دینے اور مسئلہ کشمیر کو پھر صدہا سیاسی الجھنوں اور بکھیڑوں کا شکار بنانے پر آمادہ ہوں گے؟ نوبت اب یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ مجاہدین دنیا کی کسی طاقت کو خاطر میں لانے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ اگر انہیں کارگل کی چوٹیاں خالی کرنے پر زبردستی مجبور کیا گیا تو داخلی طور پر پاکستان میں فسادات شروع ہوجائیں گے اور میاں نواز شریف ایک ایسی خطرناک صورت حال سے دوچار ہوں گے جس کا سامنا کرنا مشکل ہوگا اور اس طرح وہ قوم کے غیظ وغضب کی نذر ہوجائیں۔ امریکی صدر نے پاکستان کے ایٹمی طاقت بن جانے کے بعد مسئلہ کشمیر میں دلچسپی کا اظہار کیا ہے لیکن انہوں نے انصاف سے کام لینے کی بجائے اپنی ہمدردیوں کا رخ بلاواسطہ طور پر اپنے دوست بھارت کی طرف کررکھا ہے۔ انہوں نے بھارت کے وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی کے استرداد دعوت کو بھی اہمیت نہیں دی اور نہ اس قتل وغارت گری کو ملحوظ نظر رکھا ہے جو گزشتہ پچاس برسوں سے بے گناہ اور معصوم کشمیری مسلمانوں کے ساتھ روا رکھا جارہا ہے۔ پاکستان نے ہر مرحلہ پر امن دوستی کا ثبوت دیا اور اقوام عالم کے مشوروں کو کبھی مسترد کرنے کی ضرورت تک نہیں سمجھی۔ میاں نواز شریف کا صدر کلنٹن کی حالیہ دعوت کو فوراً قبول کرلینا بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ پاکستان اس خطے

Marfat.com

میں امن اور صرف امن کے قیام کا آرزو مند ہے۔ چنانچہ اصل مسئلہ لائن آف کنٹرول کی بحالی کا نہیں بلکہ کشمیر کا مسئلہ ہے جسے حتمی طور پر اقوام متحدہ کی قراردادوں کی روشنی میں حل کرنے کی ضرورت ہے۔ امریکہ کو اس طرف بھی توجہ دینی چاہئے کہ اس خطے کا امن بھارت کی ہٹ دھرمی سے تباہ ہو رہا ہے۔ اگر حالات کی کشیدگی اسے ایٹمی جنگ کی طرف لے جائے تو یہ بھارت کی بے جا ضد اور غیر منصفانہ رویے کا ہی نتیجہ ہوگا۔ نواز کلنٹن اعلامیہ اس بڑے خطرے کو ٹال نہیں سکتا۔ بھارت اس اعلامیے میں شریک نہیں ہے لیکن اس کے منفی ردعمل کا اندازہ لگانا کچھ مشکل بھی نہیں۔ کیونکہ اس نے ہر مرحلہ پر پاکستان کو مذاکرات کی دعوت کو ٹھکرایا ہے۔ اس لئے امریکہ کو چاہئے کہ وہ بھارت کو کشمیر کے فیصلے کی طرف لائے۔ اگر وہ یوگوسلاویہ سے اپنی شرائط منوا سکتا ہے تو بھارت سے کیوں نہیں؟ کلنٹن آخر نواز شریف کو ایٹمی دھماکے کی سزا دینے پر کیوں تلا ہوا ہے؟ امریکی صدر کیوں نہیں سمجھتا کہ نواز شریف اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ وہ مسئلہ کشمیر کے کسی مستقل حل کی شرط اور وہ بھی کسی ٹائم فریم کے ساتھ منوائے بغیر صرف کارگل کو خالی کرنے کیلئے کہہ سکے۔

7 جولائی کو بھی نوائے وقت کا موضوع یہی دورہ امریکہ تھا۔ اخبار نے لکھا۔

”واشنگٹن سے آمدہ اطلاعات کے مطابق وزیراعظم میاں محمد نواز شریف اس بات پر رضامند ہیں کہ وہ کارگل کی چوٹیوں پر بیٹھے مجاہدین کو جنگ بند کرنے اور واپس چلے آنے کی اپیل کریں گے۔ اس ضمن میں پاکستان اپنا اثر و رسوخ استعمال کرے گا۔ دفتر خارجہ کے ترجمان طارق الطاف نے اتوار کی شب اخبار نویسوں کو بریفنگ دیتے ہوئے کہا کہ مجاہدین نے مسئلہ کشمیر کو عالمی سطح پر ابھارنے کا اپنا ٹارگٹ حاصل کر لیا ہے اب کارگل میں مزید جنگ کی ضرورت نہیں۔ وزیراعظم نواز شریف نے واشنگٹن جا کر صدر کلنٹن سے ملاقات میں جو جلد بازی دکھائی اس پر اندرون اور بیرون ملک تعجب کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ اب تک فوج اور حکومت کی طرف سے قوم کو جو کچھ بتایا جاتا رہا ہے اور جس کی تصدیق آزاد ذرائع سے بھی ہوئی تھی اس کے مطابق نہ صرف پاکستانی فوج کنٹرول لائن پر بہتر پوزیشن میں تھی بلکہ کارگل میں مجاہدین بھی اپنی عددی کمزوری کے باوجود بھارت کی فوج کیلئے ناقابل تسخیر حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ بھارت عالمی سطح پر جو واویلا مچا رہا تھا اس سے بھی اس کی بے چارگی ظاہر ہوتی تھی اور علاقائی بدمعاش نے بڑے بدمعاش سے بھی گلوخلاصی کی درخواست کی ہوگی کہ دادا اس شریف آدمی کو لڑی لگاؤ ورنہ اپن کی ذرا پت نہیں رہے گی۔ ٹائیگر ہلز کے نام سے جس چوٹی کو سر کرنے کا پروپیگنڈا ہوا اس کے بارے میں پاک فوج کے ترجمان اور مجاہدین یہ واضح کر چکے ہیں کہ اس نام کی کوئی چوٹی ہی موجود نہیں بھارت ایک خود ساختہ فتح کے نام پر اپنے عوام کو بے وقوف بنا رہا ہے۔

کشمیری عوام اور مجاہدین کارگل کی صورت حال سے نہ صرف خوش ہیں بلکہ وہ اپنی فتوحات کا سلسلہ آگے بڑھاتے ہوئے جموں و کشمیر کی بھارت سے آزادی اور الحاق پاکستان کی منزل کو حاصل کر لینے کی توقع کر رہے ہیں لیکن حکومت پاکستان نے اچانک یہ اعلان کر کے انہیں حیران اور ششدر کر کے رکھ دیا ہے کہ مسئلہ کشمیر کو عالمی سطح پر اجاگر کرنے کا ٹارگٹ حاصل کر لیا گیا ہے اس لئے مجاہدین واپس آ جائیں۔ گویا پاکستان نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ جموں و کشمیر میں دس سال سے جاری مسلح جدوجہد اور باون سال سے دی جانے والی قربانیوں کا مقصد صرف اور صرف امریکہ سے یہ وعدہ

Marfat.com

حاصل کرنا تھا کہ "جب پاکستان کارگل سے مجاہدین کو واپس بلا لے گا اور کنٹرول لائن مکمل طور پر بحال ہو جائے گی تو صدر کلنٹن تنازعات کے حل کیلئے دوطرفہ کوششوں کو دوبارہ شروع کرنے کیلئے ذاتی دلچسپی لیں گے" مشترکہ اعلامیہ کے اس بے مقصد جملے کا اس کے علاوہ کیا مطلب لیا جا سکتا ہے کہ پاکستان کو نہ صرف کارگل سے مجاہدین اور کنٹرول لائن سے اپنے فوجی واپس بلانے ہوں گے بلکہ امریکہ و بھارت کی تسلی کے مطابق کنٹرول لائن بھی بحال کرنی ہوگی جس کے بعد "سرکار دولت مدار" ازراہ کرم اس امر میں دلچسپی لیں گے کہ تنازعات کے حل کیلئے دوطرفہ کوششیں شروع ہو سکیں اور وہ بھی شملہ معاہدہ اور اعلان لاہور کے تحت!

سوال یہ ہے کہ پاکستان اور امریکہ کے اس اعلامیہ میں بھی نہ تو بھارت شریک ہے نہ فریق اور نہ اس نے امریکہ یا عالمی برادری کو کسی قسم کی یقین دہانی کرائی ہے جبکہ پاکستان نے یہ پابندی قبول کرلی ہے کہ وہ مجاہدین کو واپس بلائے' طارق الطاف نے تو ایک لحاظ سے مجاہدین سے اپیل کر بھی دی ہے اور یہ دلیل بھی سامنے لائے ہیں کہ جو مقصد حاصل کرنا تھا وہ حاصل ہو گیا ہے اب واپسی کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔ اسی طرح امریکہ و بھارت کے اس پروپیگنڈے کو بھی درست تسلیم کرلیا گیا کہ پاکستان مداخلت کار ہے اور کنٹرول لائن کا تقدس بحال کرنا اسکی ذمہ داری ہے۔ پاکستان کی طرف سے کنٹرول لائن کے ضمن میں سیاچن سے بھارتی فوجوں کی واپسی کا دعویٰ کیا گیا ہے لیکن بھارتی وزیر خارجہ جسونت سنگھ نے رعونت بھرے انداز میں کہہ دیا ہے کہ سیاچن کنٹرول لائن کا حصہ نہیں۔ مجاہدین کو نکالنے کیلئے جنگ جاری رہے گی اور ضرورت ہوئی تو ایٹمی ہتھیار بھی استعمال کریں گے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ امریکہ نے اپنا سارا وزن بھارت کے پلڑے میں ڈال کر پاکستان سے یہ شرط منوالی ہے کہ پہلے بھارتی خواہش کے مطابق کارگل خالی کرو پھر مذاکرات کا آغاز ہوگا۔ اس طرح نہ تو جنگ بندی کی ایسی صورت سامنے آئی ہے جس میں پاکستان یا مجاہدین کا پلڑا بھاری ہو اور نہ عالمی برادری کے سامنے امریکہ نے یہ اقرار کیا ہے کہ وہ برصغیر میں کشیدگی کی اصل بنیاد پر مسئلہ کشمیر حل کرنے کیلئے اپنی بین الاقوامی ذمہ داریاں پوری کرے گا۔ اول تو یہ ممکن نہیں کہ مجاہدین پاکستان کی اپیل پر اپنی قربانیاں ضائع کر کے کارگل کو خوشی سے بھارت کے حوالے کر دیں لیکن اگر بالفرض محض پاکستان کی خوشنودی کی خاطر وہ اس پر آمادہ ہو بھی جائیں تو یہ ضمانت کون فراہم کرے گا کہ اس کے بعد بھارت مسئلہ کشمیر کے بارے میں بامقصد مذاکرات کا آغاز کرے گا اور وہی وطیرہ اختیار نہیں کرے گا جو گزشتہ پچاس سال سے اس کا طرہ امتیاز ہے۔

نواز کلنٹن اعلامیہ سے نہ صرف اقوام متحدہ کی قراردادیں غائب ہیں اور امریکی عہدیدار نے اس حوالے سے کئے گئے سوال کا جو جواب دیا ہے اس سے بھی یہی تاثر ملتا ہے کہ امریکہ اب ان قراردادوں کو بھارت کی طرح قصہ ماضی سمجھتا ہے اور اس کیلئے اہمیت مسئلہ کشمیر کی نہیں صرف موجودہ اور حاضر مسئلہ کارگل کی ہے جہاں بھارت مشکلات کا شکار ہے اور امریکہ و مغرب نے اسے چین کے مقابلے کی طاقت بنانے کیلئے جو کوششیں کی تھیں وہ رائیگاں ہوتی نظر آتی ہیں۔ عام خیال یہی تھا کہ امریکہ پاکستان اور بھارت کے مابین تنازعات سنجیدگی سے حل کرانا چاہتا ہے لیکن نواز کلنٹن ملاقات کے بعد یہ واضح ہو گیا ہے کہ اسے برصغیر کے تنازعات کا نہ تو گہرا شعور ہے اور نہ وہ مسئلہ کی بنیاد ختم کرنے میں دلچسپی رکھتا ہے وہ صرف اور صرف واحد اسلامی نیوکلیئر پاور سے انتقام لینا چاہتا ہے جس نے امریکی دباؤ مسترد کرتے ہوئے ایٹمی قوت بننے

Marfat.com

کا فیصلہ کیا اور بن کر دکھایا۔ کیونکہ پاکستان کو ایک ایسا فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہے جس پر عملدرآمد نہ تو حکومت کے بس میں ہے اور نہ وہ عملدرآمد پر اصرار کر کے ملک کو انتشار اور افراتفری کی نذر کرا سکتی ہے بین الاقوامی ذرائع ابلاغ نے بھی واضح الفاظ میں یہ تاثر دیا ہے کہ نواز کلنٹن مشترکہ اعلامیہ کی روشنی میں کارگل سے مجاہدین کی واپسی پر اصرار حکومت پاکستان اور نواز شریف کیلئے مشکلات کا باعث بنے گا اور اس مسئلہ پر حکومت اور فوج میں اختلاف پیدا ہو سکتا ہے۔ مشترکہ اعلامیہ سامنے آنے کے بعد کم و بیش تمام سیاسی جماعتوں (بینظیر کی پی پی سمیت) نے جن میں کشمیری سیاسی تنظیمیں اور جہادی تنظیمیں بھی شامل ہیں اسے مسترد کر دیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ امریکہ نے ہوشیاری کے ساتھ نہ صرف بھارت کے مجاہدین سے جان چھڑانے کا اہتمام کیا ہے بلکہ جہادی تنظیموں کا رخ نواز شریف حکومت کی طرف کر دیا ہے کہ وہ ایک ایسی حکومت کے خلاف آواز بلند کریں جس نے محاذ کی کامیابیاں میز پر ہارنے کی حماقت کی ہے۔ واقعتاً صورت حال اتنی مایوس کن نہیں ہوگی جتنی نظر آ رہی ہے لیکن حکومت مخالف عناصر کو تو پروپیگنڈے کیلئے مضبوط ایشو چاہئے جو امریکہ نے کارگل سے پسپائی کی صورت میں فراہم کر دیا ہے اور جسے امریکہ و بھارت کے خیر خواہ ذرائع ابلاغ خوب اچھالیں گے۔

ان حالات میں میاں نواز شریف کو وطن واپسی پر انتہائی دوراندیشی اور احتیاط کا مظاہرہ کرنا ہوگا اور فی الفور پارلیمنٹ کا مشترکہ اجلاس بلا کر یا قومی اسمبلی میں گزشتہ ڈیڑھ پونے دو ماہ کے واقعات، پس پردہ ڈپلومیسی کے مراحل، امریکہ کے سیاسی، اقتصادی دباؤ اور واشنگٹن کی ملاقات کے اسباب کی تفصیل بیان کرنی چاہئے۔ اس اجلاس کی کارروائی ریڈیو ٹی وی پر براہ راست نشر کی جائے، اگر اس مشترکہ اعلامیہ کے علاوہ بھی کوئی وعدے وعید ہوئے ہیں تو ان سے بھی اقوام متحدہ کو آگاہ کرنے میں کوئی حرج نہیں تاکہ کسی کو غلط فہمیاں پیدا کرنے کا موقع نہ ملے۔ وزیراعظم نے پہلے کوتاہی برتی ہے اب وہ ان تمام سیاسی و مذہبی جماعتوں سے مل کر انہیں اعتماد میں لیں جو جہاد کشمیر میں عملاً حصہ لے رہی ہیں یا حکومت کے مؤقف کی تائید و حمایت کر رہی ہیں تاکہ کارگل کا سارا ملبہ ملک کے سیاسی استحکام پر نہ آ پڑے اور ملک کسی نئے انتشار کا شکار نہ ہونے پائے قوم امریکہ پر کسی قسم کا اعتبار کرنے کیلئے تیار نہیں وہ 1971,1965,1962 اور 1988ء میں دھوکہ کھا چکی ہے اب بھی پاکستان پر سب سے زیادہ دباؤ امریکہ نے ڈالا ہے اور پاکستان کو ایسی صورت حال میں مبتلا کیا ہے جس سے نکلنے کیلئے غیر معمولی دانش اور بصیرت کے علاوہ حکمت و تدبر کی ضرورت ہے۔ وزیراعظم قوم کو بتائیں کہ وقت حاصل کرنے کیلئے انہوں نے جو حکمت عملی وضع کی ہے وہ واقعتاً مفید ثابت ہو سکتی ہے اور وہ اپنے دعوؤں کے مطابق بھارت یا امریکہ کے دباؤ کا مقابلہ کرتے ہوئے کشمیر پر ایسی کسی سودے بازی میں ملوث نہیں ہوں گے جو مسئلہ کشمیر کو ہمیشہ کیلئے سرد خانے کی نذر کر دے اور پاکستان کو کیمپ ڈیوڈ کی طرز کے کسی سمجھوتے کی ذلت برداشت کرنا پڑے۔ ستمبر میں سی ٹی بی ٹی پر دستخط کے حوالے سے بھی اب مزید گومگو پالیسی اور خاموشی کی کوئی گنجائش نہیں اور وزیراعظم کو وطن واپسی پر چپ کا روزہ توڑ کر اپنی واشنگٹن یاترا کے قومی فوائد آگاہ کرنا چاہئے ورنہ یہ ثابت کرنا مشکل نہیں رہے گا کہ وہ واقعی کوئی نیا تاشقند یا شملہ معاہدہ کر آئے ہیں۔ (اداریہ روزنامہ نوائے وقت)

Marfat.com

8 جولائی کو چیف آف آرمی سٹاف جنرل پرویز مشرف کے فوجی افسران سے خطاب پر نوائے وقت نے 9 جولائی کو لکھا۔

''آرمی چیف جنرل پرویز مشرف نے گزشتہ روز لاہور اوراوکاڑہ میں کور کمانڈرز گیریژن افسروں اور دیگر سینئر حکام سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ بھارت اندرونی عدم استحکام اور اپنی فوج کے گرتے ہوئے مورال کے باعث کوئی بھی غیر متوقع اور انتہائی قدم اٹھا سکتا ہے پاکستان امن اور دوستی کا خواہاں ہے مگر ہماری اس خواہش کو کمزوری نہ سمجھا جائے۔ آرمی چیف نے فوجی افسروں کو ہدایت کی کہ وہ اپنی تیاریوں میں کوئی خلا نہ چھوڑیں اور متحد ہو کر دشمن کے مقابلہ میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں قوم کسی بھی ہنگامی صورت حال میں فوج کے شانہ بشانہ ہوگی۔ آرمی چیف نے بھارت کے عزائم' سرگرمیوں اور موجودہ سرحدی صورت حال پر جو تبصرہ کیا ہے وہ بڑی حد تک مناسب ہے بھارت اس وقت واقعی اندرونی عدم استحکام کا شکار ہے اور واجپائی حکومت اگلا الیکشن جیتنے کیلئے قوم کے سامنے کوئی لائحہ عمل پیش کرنے میں ناکام رہی ہے کارگل کی صورت حال نے اس کی رہی سہی مقبولیت بھی ختم کر دی ہے اور اس نے جنگی جنون پیدا کر کے جو فوائد حاصل کرنے چاہے تھے وہ بھی تاحال اس کا مقدر نہیں بن سکے۔ بنابریں جس طرح اس نے کارگل کے تنازعہ کو زندگی موت کا مسئلہ بنایا ہے اسی طرح وہ مزید آگے بڑھ کر کوئی بھی غیر متوقع اور انتہائی اقدام کر سکتی ہے۔

یہ محض مفروضہ نہیں بلکہ نواز کلنٹن مشترکہ اعلامیہ جسے اعلان واشنگٹن کا نام دیا جا رہا ہے سامنے آنے کے باوجود وہ امریکی ذرائع ابلاغ کے اس پروپیگنڈے کے باوجود کہ پاکستانی وزیراعظم مجاہدین کی واپسی کا ''ٹائم فریم'' بھی دے آئے ہیں۔ بھارتی وزیراعظم واجپائی کارگل سے آخری مجاہد کی واپسی تک فوجی کارروائی جاری رکھنے کا اعلان کر رہے ہیں جبکہ بھارتی وزیر داخلہ ایل کے ایڈوانی نے پاکستان سے کارگل کا بدلہ لینے کا عزم ظاہر کیا ہے۔ گزشتہ روز بھارتی وزیر خارجہ جسونت سنگھ نے انتہائی رعونت کے ساتھ یہ کہا تھا پاکستان بھارت کے ساتھ رہنا سیکھے جس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ خدانخواستہ نیپال اور بھوٹان کا سٹیٹس قبول کرے۔ ظاہر ہے کہ پاکستان کے عوام' حکومت اور مسلح افواج کیلئے یہ صورت حال قابل قبول نہیں اور یہ بھی ممکن نہیں کہ محض حکومت پاکسان کی ایک اپیل پر مقبوضہ جموں وکشمیر کے عوام اور مجاہدین امریکی خواہش کے مطابق اپنی جدوجہد ترک کرنے اور لاحاصل مذاکرات کے منعقد ہونے اور ان کے مشکوک نتائج کا انتظار کریں۔ خدشہ یہ ہے کہ شرق اوسط کی طرح امریکہ نے برصغیر میں بھی ایک نئے فتنے کی بنیاد ڈال دی۔ ہے۔ جس طرح یاسر عرفات کے مجاہدانہ کردار کی نفی کیلئے حماس کو اس کے خلاف کر دیا گیا ہے اور اب فلسطینی مجاہدین اسرائیل کی بجائے یاسر عرفات کی سربراہی میں قائم ہونے والی فلسطینی اتھارٹی کے خلاف سرگرم عمل ہیں اسی طرح مجاہدین کا رخ بھارت کے بجائے اسلام آباد کی طرف کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اب یہ مجاہدین اور حکومت پاکستان کا امتحان ہے کہ وہ اس صورت حال سے کس طرح حکمت و دانش کے ساتھ عہدہ برآ ہوتے ہیں۔

ماضی کا تجربہ بھی گواہ ہے کہ بھارت نے پاکستان کو کبھی معاف نہیں کیا اور کشمیری عوام کی حمایت کا مزہ چکھانے کا کوئی موقع ضائع نہیں جانے دیا۔ 1965ء کا بدلہ اس نے 1971ء میں لیا تھا جبکہ کارگل میں اسے جس ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا وہ ماضی سے کہیں زیادہ ہے کیونکہ صرف پانچ سو مجاہدین نے چھ سو بھارتی فوجیوں کو ہلاک' سینکڑوں کو زخمی کرنے کے

Marfat.com

علاوہ 1971ء اور 1965ء کی جنگ سے زیادہ گولے بارود کا نقصان کیا ہے' بھارت کے کئی فوجی طیارے اور ہیلی کاپٹر تباہ ہوئے ہیں اور علاقے میں اس کا امیج تباہ ہو گیا ہے' اس لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ محض ہماری امن کی خواہش اور امریکہ کے درمیان میں پڑ جانے سے خوش ہو کر جنگ کا ارادہ ترک کر دے اور کارگل کی شکست کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر لے۔ زیادہ سے زیادہ بی جے پی الیکشن جیتنے کا انتظار کرے گی اور حالیہ لڑائی میں فوجی سطح پر اسے جن کمزوریوں کا احساس ہوا ہے اسے دور کرنے کی کوشش کرے گی یہ بھی بعید از قیاس بات نہیں کہ بھارت ماضی کی طرح پاکستان میں ایک بار پھر دہشت گردی اور تخریب کاری کے علاوہ لسانی و نسلی تعصبات کو فروغ دینے کا ہتھیار استعمال کرے۔ یہ پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا جانا چاہئے کہ وہ پاکستان میں قائم کشمیری مجاہدین کی تنظیموں کو امریکہ سے دہشت گرد قرار دلوانے کے بعد حکومت پاکستان پر اسی قسم کا دباؤ ڈالے جس طرح اس نے کارگل سے مجاہدین کی واپسی کے سلسلے میں ڈالا اور جو بالآخر ہمیں قبول کرنا پڑا اور اس کے بعد اپنی مرضی کا محاذ کھولے کیونکہ موجودہ صورت حال میں یہ ثابت ہو گیا ہے کہ شملہ معاہدہ اور اعلان لاہور امن کی ضمانت فراہم نہیں کرتے اور امریکہ سے بھی یہ توقع عبث ہے کہ وہ کسی بھی معاملے میں ہمارے اصولی اور اخلاقی موقف کی حمایت کرے یا بھارت کی سرپرستی سے باز رہے۔'' (روزنامہ نوائے وقت)

10 جولائی کو اخبار لکھتا ہے:

''اخباری اطلاعات کے مطابق حکومت نے کنٹرول لائن کی صورت حال کے متعلق رونما ہونے والی تازہ ترین عسکری اور سفارتی تبدیلیوں اور اس حوالے سے قومی مفادات سے مطابق رکھنے والے فیصلوں کے بارے میں پارلیمنٹ اور اپوزیشن جماعتوں کو اعتماد میں لینے کا فیصلہ کیا ہے اس ضمن میں جلد ہی طریقہ کار وضع کر لیا جائے گا۔ اعلان واشنگٹن سے قومی سطح پر ابہام اور مایوسی کی جو کیفیت پیدا ہوئی ہے اس سے ملک و قوم کو نکالنے اور امریکہ و بھارت کی طرف سے کئے جانے والے یکطرفہ پروپیگنڈے کا توڑ کرنے کیلئے ضروری ہے کہ قوم کے سامنے حالات کی صحیح تصویر من و عن پیش کی جائے اور حکومت آئندہ جو کچھ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے اس کے بارے میں بھی تمام قابل ذکر سیاسی و مذہبی جماعتوں کے علاوہ عوام میں اثر و رسوخ رکھنے والے طبقات کی رائے لی جائے۔ جمہوری ممالک میں پارلیمنٹ ہی مشاورت اور فیصلوں کا فورم ہوتا ہے لیکن ہمارے ہاں چودھویں ترمیم اور شخصیت پرستی کے کلچر کی وجہ سے پارلیمنٹ اپنا کردار قائدانہ انداز میں ادا نہیں کر سکی اور ہمارے حکمرانوں نے بھی اس سپریم جمہوری ادارے کا وہ مقام بنانے اور تسلیم کرنے پر کبھی آمادگی ظاہر نہیں کی جو اس کا طرہ امتیاز ہے۔

اس بناء پر یہ ضرورت محسوس کی جا رہی ہے کہ میاں صاحب نہ صرف پارلیمنٹ کو اعتماد میں لیں بلکہ پارلیمنٹ سے باہر کی تمام سیاسی و مذہبی قوتوں سے بھی رابطہ کریں اور انہیں تمام صورت حال سے کسی ذہنی تحفظ کے بغیر آگاہ کریں' ریڈیو ٹی وی پر خطاب کا اعلان تو ہو چکا ہے اور وفاقی کابینہ کے علاوہ کابینہ کی دفاعی کمیٹی کے اجلاس بھی منعقد کئے جا چکے ہیں جہاں امید ہے کہ میاں صاحب نے اپنے دورہ واشنگٹن و لندن کی روداد و بے کم و کاست بیان کرنے کے علاوہ اپنے ساتھیوں اور فوجی قیادت سے بامقصد مشاورت کی ہوگی۔ پہلے بھارت یہ پروپیگنڈا کرتا رہا کہ کارگل کا تنازعہ نواز شریف کے بجائے فوج کا پیدا کردہ ہے اب ایک امریکی عہدیدار نے یہ درفنطنی چھوڑی ہے کہ موجودہ صورت حال کی وجہ سے دو

Marfat.com

میں سے ایک اہم شخصیت کو جانا ہی ہے جس کا مطلب واضح ہے کہ یہ عناصر پاکستانی ہیئت مقتدرہ میں شکوک وشبہات کی فضا پیدا کر کے اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں اور یہ سب کچھ اس لئے ہو رہا ہے کہ موجودہ حکومت نے مختلف حلقوں کی طرف سے بار بار مطالبے کے باوجود مشاورت کا دائرہ وسیع کرنے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ میاں صاحب واشنگٹن روانہ ہونے سے قبل جس حد تک ممکن تھا مشورہ کر کے گئے مگر تاثر یہی ابھرا کہ فرد واحد نے اپنی صوابدید کے مطابق جو چاہا کر لیا۔ اگر واشنگٹن جانے سے قبل وسیع تر مشاورت کا اہتمام کر لیا جاتا تو شاید میاں صاحب کی وطن واپسی پر انتظامیہ کو ائیرپورٹ پر کرفیو کی سی کیفیت پیدا کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ (اداریہ روزنامہ نوائے وقت)

مجاہدین کی واپسی کے فیصلے کو حکومت نے گو کہ اپنی سفارتی کامیابی کی آڑ میں چھپانا چاہا لیکن تاریخ کے اس بے رحمانہ مذاق کو ملک کے سنجیدہ حلقوں نے ہضم نہیں کیا اور نوائے وقت نے 13 جولائی کو لکھا۔

''وزیر خارجہ سرتاج عزیز نے گزشتہ روز دفتر خارجہ میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان فوجی حکام کے رابطوں کے نتیجے میں کارگل سیکٹر سے مجاہدین کی واپسی شروع ہو گئی ہے اور فریقین کے مابین جنگی کارروائیاں بند کر دی گئی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ دونوں ممالک کے ڈائریکٹر جنرلز ملٹری آپریشن کی ملاقات میں طے پایا ہے کہ کارگل کے ہر سیکٹر پر بتدریج ہوائی اور زمینی حملے بند کر دیئے جائیں گے تاکہ مجاہدین کی واپسی میں سہولت فراہم کی جا سکے۔ فوجی حکام کی ملاقاتوں میں کیا طے پایا ہے اور مجاہدین نے ان تجاویز کو قبول کرتے ہوئے واپسی پر آمادگی ظاہر کر دی ہے یا نہیں' اس کا اندازہ اگلے چند روز میں ہو جائے گا۔ یہ بہرحال تاریخ کا بے رحمانہ مذاق ہو گا کہ جن کشمیری عوام کی حق خودارادیت کیلئے جدوجہد کو اقوام متحدہ نے تسلیم کیا ہے' ان کے قابل فخر مجاہد فرزندوں کو اپنی دھرتی چھوڑنے پر مجبور کیا جا رہا ہے اور اقوام متحدہ کے پردے میں امریکی مبصرین یہ معائنہ کرنے آ رہے ہیں کہ مجاہدین نے واقعی کارگل کے مورچے خالی کر دیئے ہیں اور بدقسمتی سے پاکستان میں اس میں ایک فریق ہے۔ جنگوں اور جھڑپوں میں فوج کی واپسی کے معاہدے تو ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن آزادی کے مجاہدین کو ایک ایسے سمجھوتے کے ذریعے جس میں نہ تو کشمیری عوام کے نمائندے اور مجاہدین شریک ہیں اور نہ جن کی ضمانت اقوام متحدہ یا کسی دوسرے ملک نے دی ہے' اپنے مورچے چھوڑنے کی ہدایت و توقع کی جا رہی ہے۔ اگرچہ وزیر خارجہ نے مجاہدین کی دلیرانہ کارروائیوں کی تعریف کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ وہ پورے کشمیر میں جہاں چاہیں جا سکتے ہیں لیکن یہ محض شلجموں سے مٹی جھاڑنے کے مترادف دعویٰ ہے۔ جس بھارت نے امریکہ کے زیر سایہ ان مجاہدین کی کارگل میں موجودگی کو تسلیم اور برداشت نہیں کیا اور انہیں وہاں سے نکالنے کیلئے بھارتی فوجی مشینری لاکھڑی کی ہے وہ انہیں جموں و کشمیر کے کسی دور سے علاقے میں جا کر اپنی کارروائیاں جاری رکھنے کی اجازت کیسے دے سکتا ہے؟ حکومت اس طرح کے بیانات دیکر خود ہی نشانہ تضحیک بن رہی ہے۔ جس کا کوئی فائدہ نہیں۔ سیدھی سی بات ہے جسے ہزار پردوں میں چھپانے کی کوشش ہو رہی ہے کہ پاکستان نے امریکی اور بھارتی دباؤ قبول کر کے کارگل' دراس اور بٹالک میں پسپائی کا فیصلہ کیا ہے اور اس پر یکطرفہ طور پر عملدرآمد کا آغاز بھی کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ بھارتی فوج کے ترجمان میجر جے سنگھ ایسی کسی فائر بندی سے انکار رہے ہیں۔ جہاں تک مجاہدین کا تعلق ہے تو ابھی تک کسی بھی جہادی تنظیم نے حکومت کی اس اپیل پر مثبت ردعمل ظاہر کیا ہے اور نہ فوجی کمانڈروں کے کسی اجلاس سے سروکار رکھا ہے وہ یہ

Marfat.com

کہنے میں حق بجانب ہیں کہ مجاہدین گزشتہ دس برس سے حالت جنگ میں ہیں، وہ نہ تو کنٹرول لائن کو مانتے ہیں اور نہ کسی معاہدے میں فریق ہیں۔" (اداریہ روزنامہ نوائے وقت)

عوام کی بے چینی کا نوٹس وزیراعظم نے بھی لیا اور انہوں نے 13 جولائی کو رات 8 بجے قوم سے خطاب کیا وزیراعظم کے اس خطاب کو نوائے وقت نے "وزیراعظم کی تقریر یکطرفہ امن پالیسی کا دفاع" کے عنوان سے 14 جولائی کے اداریے میں کیا۔

وزیراعظم نواز شریف نے گزشتہ شب ریڈیو ٹی وی پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے بھارتی وزیراعظم سے اپیل کی ہے کہ وہ بہتر مستقبل کیلئے مذاکرات کی میز پر آئیں۔ جنگ سے مسائل میں اضافہ ہوتا ہے، طے نہیں ہوتے۔ وزیراعظم نواز نواز شریف نے اعلان واشنگٹن اور کارگل سے مجاہدین کی واپسی کے حوالے سے اپنے مؤقف کے دفاع میں جو نشری تقریر کی، اس کے بارے میں اپوزیشن کا ردعمل تو خیر مخالفت برائے مخالفت کی ذیل میں آتا ہے، لیکن اس پر بیرونی ذرائع ابلاغ نے بھی جو محتاط تبصرہ کیا ہے وہ یہی ہے کہ وزیراعظم نے اپنی امن کوششوں اور کشمیری پالیسی کا دفاع کرتے ہوئے خود کو ایک بے یارومددگار شخص کے طور پر پیش کیا ہے، جس نے شدید بین الاقوامی دباؤ میں آ کر بھارت کے ساتھ لائن آف کنٹرول پر بگڑتی ہوئی صورت حال کو ڈی فیوز کرنے کی کوشش کی ہے۔ اعلان واشنگٹن کے بعد قومی سطح پر جو بددلی پیدا ہوئی اور مجاہدین کے علاوہ آل پارٹیز حریت کانفرنس نے اس پر جس منفی ردعمل کا اظہار کیا، اس کے پیش نظر یہ توقع کی جا رہی تھی کہ وزیراعظم قوم کے سامنے اصل صورت حال رکھیں گے اور امریکہ کی طرف سے کرائی گئی کسی مثبت اور موثر یقین دہانی کے بارے میں قوم کو اعتماد میں لے گے۔ مگر پون گھنٹے کی تقریر میں ایسی کوئی بات نہیں تھی اور اس پر صرف امریکہ نے اطمینان کا اظہار کیا ہے۔ اس تقریر نے پاکستانی عوام کو مایوسی اور بے یقینی کے سوا کچھ نہیں دیا۔ جب تک بھارت بھی امن پسندی کا مظاہرہ نہیں کرتا اور متنازعہ مسائل مذاکرات کے ذریعے حل کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا، یکطرفہ طور پر امن اور مذاکرات کے پروپیگنڈے سے نہ تو کشیدگی ختم ہو سکتی تھی اور نہ مسئلہ کشمیر حل ہو سکتا تھا۔ وزیراعظم نے خود تسلیم کیا کہ وہ تو جنگ کو ٹالنے میں لگے ہوئے تھے، مگر بھارت نے کنٹرول لائن پر توپیں لا کھڑی کیں۔ اب بھی صورت حال یہی تھی کہ وزیراعظم نے تو مجاہدین سے واپسی کی اپیل کی اور ان کے بقول مجاہدین کا مثبت ردعمل بھی سامنے آ گیا لیکن بھارت کی طرف سے "آپریشن وجے" جاری رکھنے کا برملا اعلان کیا جا رہا تھا۔ سیز فائر کے نتیجے میں جو چوٹیں خالی ہوئی تھیں انہیں بھی بھارت اپنی فتح کا نتیجہ قرار دے رہا ہے اور پاکستان کو بھارت کے ساتھ رہنا سیکھنے کی تلقین بھی کی جا رہی تھی۔

وزیراعظم تو شاید نیک نیتی سے خطے میں امن قائم رکھنے کیلئے یہ سب کچھ کر رہے تھے لیکن چند روز پہلے تک سہمے اور خوفزدہ بھارتیوں کا دماغ خراب ہو گیا انہوں نے امن کی اس خواہش کو پاکستان کی مجبوری جان کر عجیب و غریب شرائط عائد کرنا شروع کر دیں جس پر نوائے وقت نے 15 جولائی کو لکھا۔

بھارتی وزارت خارجہ کے ترجمان رمیندر سنگھ نے کہا ہے کہ تین شرائط پوری کئے بغیر پاکسان سے دوطرفہ مذاکرات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان شرائط میں (1) کارگل سے "دراندازوں" کا مکمل انخلاء (2) لائن آف کنٹرول کے تقدس کی بحالی، (3) پاکستان کی طرف سے اس امر کی یقین دہانی کہ آئندہ کسی صورت میں کنٹرول لائن کی خلاف ورزی

Marfat.com

نہیں ہوگی۔ بھارت کے وفاقی وزیر اطلاعات ونشریات پرمود مہاجن نے اخبارنویسوں سے باتیں کرتے ہوئے کہا ہے کہ جب تک تمام ''مداخلت کار'' واپس نہیں چلے جاتے اور اس کی تصدیق نہیں ہو جاتی کہ ''دھرتی'' خالی ہوگئی ہے مذاکرات نہیں ہو سکتے۔ ''سقوط کارگل'' کا سانحہ جس انداز میں رونما ہوا اس کی توقع پاکستانی عوام یا کشمیری مجاہدین تو درکنار بھارتی حکمرانوں کو بھی نہیں تھی یہی وجہ ہے کہ جہاں پاکستان میں ابھی تک یہ طے کرنا مشکل ہو رہا ہے کہ اعلان واشنگٹن کا کیا نتیجہ نکلے گا اور ہر کوئی اپنی ڈفلی بجا رہا ہے وہاں بھارت اسے اپنی مکمل فتح قرار دے کر نت نئی شرائط پیش کر رہا ہے۔ پہلے وہ دوطرفہ مذاکرات کیلئے کارگل سے مجاہدین کے انخلاء کی واحد شرط پیش کرتا تھا۔ وزیر خارجہ سرتاج عزیز اور جسونت سنگھ کی ملاقات میں بھی بھارت کا یہی مؤقف تھا کہ پاکستان مجاہدین کو واپس بلائے تو مذاکرات ہو سکتے ہیں لیکن اب جبکہ ہم نے بھارت سے کوئی شرط منوائے بغیر مجاہدین سے واپسی کی اپیل کر دی ہے تو بھارت اکڑ گیا ہے اور اس نے نئی شرائط پیش کر دی ہیں۔

ہمارے حکمران اور ان کے خوشامدی مشیر خواہ یہ تسلیم کریں یا نہ کریں لیکن یہ حقیقت ہے کہ بھارت کا یہ متکبرانہ رویہ اعلان واشنگٹن کا شاخسانہ ہے اور اگر ہم نے اعلان واشنگٹن کی روشنی میں مزید اقدامات کئے اور شملہ معاہدہ و اعلان لاہور کی رٹ لگائے رکھی تو بھارت کی پالیسی مزید بے لچک ہوتی جائے گی وہ ہمیں رسوا کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دے گا۔ کوئی بھی پاکستانی حکومت اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کر سکتی کہ بھارت کی برہمن قیادت کی ضد، ہٹ دھرمی اور دوسروں کو سرنگوں کرنے کی عادت اور خواہش نے قیام پاکستان کی راہ ہموار کی تھی اور دس سال قبل کشمیری عوام نے مسلح جدوجہد شروع کرنے کا فیصلہ بھی اس بناء پر کیا کیونکہ وہ عالمی برادری کی سرد مہری اور بھارت کے غاصبانہ رویے سے تنگ آ چکے تھے اور انہیں یہ امید ہرگز نہیں رہی تھی کہ یو این کی قراردادوں، پرامن جدوجہد یا مذاکرات کے ذریعے مسئلہ کشمیر کا کوئی آبرومندانہ حل نکل سکتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ مایوسی کا یہ ماحول شملہ معاہدے کا پیدا کردہ تھا چونکہ پاکستان نے یہ سمجھوتہ ایک کمزور فریق کے طور پر کیا تھا اس کے باوجود اس میں اقوام متحدہ کی قراردادوں کا ذکر آیا تھا اور دونوں ممالک کے مسئلہ کشمیر پر مؤقف کی پذیرائی بخشی گئی تھی تاہم اس معاہدے میں مسئلہ کشمیر کسی عالمی فورم پر حل کرنے کے بجائے دوطرفہ مذاکرات اور کوششوں کو جو بیخ لگائی گئی تھی اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بھارت نے طویل عرصہ کیلئے اسے سرد خانے میں ڈال دیا اور ایک لحاظ سے کنٹرول لائن کو مستقل بین الاقوامی سرحد مان لینے پر اصرار شروع کر دیا۔ (اداریہ روزنامہ نوائے وقت)

16 جولائی کو نوائے وقت نے لکھا:

بھارتی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی نے صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے کہ کشمیر میں مداخلت سے شروع ہونے والی لڑائی اعلان لاہور کے بالکل خلاف تھی۔ پاکستان کو جان لینا چاہئے کہ ہم دوستی کا ہاتھ بڑھا سکتے ہیں تو اسے جنگ مسلط کرنے پر سبق بھی سکھا سکتے ہیں۔ پاکستان نے ہماری طاقت کا غلط اندازہ لگایا اور غیر یقینی سیاسی صورت حال سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جو اسے الٹا پڑ گئی۔ پاکستان کی طرف سے خطے میں جنگ سے بچنے کیلئے جو یکطرفہ اقدام ہوا اسے اگرچہ امریکہ نے سراہا کیونکہ یہ امریکی مساعی ومشوروں کا نتیجہ تھا لیکن بھارت نے اس اقدام کو اپنی فتح سے تعبیر کیا ہے اور بھارتی قیادت کی طرف سے ایسے بیانات آنا شروع ہو گئے ہیں جیسے اس نے میدان جنگ میں تاریخی کامیابی حاصل کر لی

Marfat.com

ہو۔حالانکہ بھارت کی سیاسی اور فوجی قیادت کو ہرگز نہیں بھولنا چاہیے کہ چار سو مجاہدین نے جنوبی ایشیا کی اتنی بڑی قوت کو دو ماہ تک لوہے کے چنے چبوائے اور وہ بدترین میدانی وفضائی گولہ باری کے باوجود کارگل کی چوٹیاں طاقت کے ذریعے خالی کرانے میں ناکام رہا۔ چونکہ ہم نے سیاسی سطح پر کمزوری دکھائی اور امریکی جال میں پھنس کر مجاہدین سے واپسی کی اپیل کر بیٹھے۔اس لئے اب بھارتی قائدین بڑھ چڑھ کر باتیں کر رہے ہیں۔ واجپائی کارگل میں اپنے فوجی دستوں سے خطاب نہیں کر سکے تھے اور الٹے پاؤں دوڑ آئے تھے' کئی دن تک واویلا کرتے رہے اور میاں نواز شریف سے بھی شکایت کی تھی کہ مجاہدین نے میرے خطاب کے دوران فائرنگ کر کے ''ہتیا'' کی ہر ممکن کوشش کی' بھگوان نے بچا لیا۔ مگر اب جبکہ پاکستان ناکام سفارتی پالیسی اور جنگ کی تیاری نہ ہونے کی وجہ سے مجاہدین سے واپسی کی اپیل پر مجبور ہوا ہے تو انہیں سبق سکھانے کی باتیں یاد آ گئی ہیں۔ بھارتی وزیر دفاع جارج فرنانڈس نے بھی کہا ہے کہ پاکستان 16 جولائی تک مجاہدین کو واپس بلائے یا نتائج بھگتنے کیلئے تیار ہو جائے اور بھارتی آرمی چیف وید پرکاش ملک نے تو یہ تک کہہ دیا ہے کہ مجاہدین کے کارگل اور دراس خالی کرنے کے باوجود کشمیر میں جنگ جاری رہے گی' جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے تعلقات کی بحالی کیلئے اعلان لاہور پر عملدرآمد رہے گی' جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے تعلقات کی بحالی کیلئے اعلان لاہور پر عملدرآمد کی جو رٹ لگا رکھی ہے اور امریکہ سے جو امیدیں وابستہ کر لی ہیں' وہ وقت کا ضیاع اور خوش فہمی پر مبنی ہیں۔ ہوتا تو یہ چاہیے کہ امریکہ اعلان واشنگٹن کی روح کے مطابق بھارتی بیانات کا نوٹس لے اور خیر سگالی کی فضاء پیدا کرنے کیلئے اقدامات کرے' مگر ہر روز اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ اور وہائٹ ہاؤس کے ترجمان جو بیانات جاری کرتے ہیں' وہ بھارت کا پلڑا بھاری اور پاکستان کو کمزور ثابت کرنے کی سوچی سمجھی کوششوں کا حصہ ہوتے ہیں۔ جس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہیں کہ میاں صاحب نے کلنٹن کے پانچ ٹیلی فون سن کر بھی ایٹمی تجربات کرنے کا جو دلیرانہ فیصلہ کیا تھا اور واشنگٹن کی ڈکٹیشن نہ لینے کا جو اعلان کیا تھا' امریکہ اس کا بدلہ لے رہا ہے اور دنیا کو باور کرا رہا ہے کہ اسلام آباد میں فیصلے اب بھی واشنگٹن کی مرضی سے ہوتے ہیں اور ہم جو چاہیں کرا سکتے ہیں۔ (اداریہ روزنامہ نوائے وقت)

17 جولائی کو وزیراعظم کے شمالی علاقہ جات کے دورے پر اظہار خیال کرتے ہوئے اخبار لکھتا ہے:

''وزیراعظم نواز شریف نے پیون (سکردو) میں ناردرن انفنٹری کے جوانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مجاہدین کہیں سے بھی پسپا نہیں ہوئے انہوں نے امن کی کوششوں کو ایک اور موقع دینے کا فیصلہ کیا ہے وہ جب چاہیں' جہاں چاہیں ایک نیا کارگل برپا کر سکتے ہیں' سو کروڑ انسانوں کی زندگی سے کھیلنا ہمیں گوارا نہیں۔ لیکن امن کی ہماری اس خواہش کو کمزوری نہ سمجھا جائے۔ کارگل سے مجاہدین کے انخلاء کے اعلانات کے بعد وزیراعظم کی طرف سے یہ دعویٰ کہ مجاہدین کہیں سے بھی پسپا نہیں ہوئے عجیب سا لگتا ہے جس کا مطلب یہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ حکومت کو یہ احساس ہو گیا ہے کہ اعلان واشنگٹن پر عملدرآمد میں جو عجلت دکھائی گئی وہ درست نہیں تھی اور دنیا کو مجاہدین کے انخلاء کی جو یقین دہانی کرائی گئی وہ بھی حکمت عملی کے تقاضوں کے منافی تھی۔ امن کی کوششوں کو موقع دینے کا فیصلہ بھی مجاہدین کا نہیں تھا بلکہ حکومت پاکستان کا تھا۔ شملہ معاہدہ' اعلان لاہور اور اعلان واشنگٹن کی طرح انخلاء کے معاملے میں بھی مجاہدین نہ تو فریق ہیں اور نہ دباؤ ڈال کر ان سے کوئی فیصلہ کرایا جا سکتا ہے۔ ویسے بھی مجاہدین نے ثابت کیا ہے کہ وہ بھارت کی جدید ترین جنگی مشینری کو منجمد کرنے

Marfat.com

اور اس فوجی قوت کا مقابلہ کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں شرط صرف پاکستان کے مکمل تعاون اور عزم و جذبے کی ہے۔

(اداریہ روزنامہ نوائے وقت)

آرمی چیف جنرل پرویز مشرف نے کارگل کی کارروائی کے بارے میں کھل کر بتا دیا کہ یہ وزیراعظم کی منظوری سے ہوئی کیونکہ بھارت اور مغربی و امریکی ذرائع ابلاغ تسلسل کے ساتھ اسے پاک فوج کی کارروائی قرار دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ اس کا حکومت حتیٰ کہ وزیراعظم کو علم نہیں تھا۔

آل پارٹیز حریت کانفرنس نے وزیراعظم سے ملاقات کے دوران اعلان واشنگٹن اور اعلان لاہور دونوں کو مسترد کرتے ہوئے قومی اتحاد پارہ پارہ کرنے کی دستاویزات قرار دیا اور مطالبہ کیا کہ حکومت اعلان واشنگٹن سے لاتعلق ہو جائے۔ وزیراعظم نے حریت کانفرنس کے لیڈروں سے تبادلہ خیال کی روشنی میں وفاقی کابینہ کی خصوصی کمیٹی بنانے کا فیصلہ کیا جو کانفرنس کے لیڈروں سے مذاکرات کر کے مستقبل کا لائحہ عمل تیار کرے گی اور اعلان واشنگٹن کے اثرات کا جائزہ لے گی۔ سفارتی نزاکتوں اور حکومتی مصلحتوں کی وجہ سے اگرچہ یہ بات نظر انداز کر دی جائے گی لیکن حقیقت یہی تھی کہ پاکستانی قوم اور کشمیری عوام نے اعلان لاہور کی طرح اعلان واشنگٹن کو بھی قبول نہیں کیا اور حریت کانفرنس کا یہ کہنا غلط نہیں کہ ان دستاویزات کی وجہ سے قومی اتحاد و یکجہتی کو سخت نقصان پہنچا ہے اور حکومت کی ساکھ بھی متاثر ہوئی ہے۔

بھارت سے تو خیر یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کرے گا مگر امریکہ نے بھی مسلسل یہی تاثر دیا کہ ساری کدو کاوش کا مقصد صرف اور صرف کارگل سے مجاہدین کی واپسی کو یقینی بنانا تھا۔ بھارت کی بھد اڑ رہی تھی کیونکہ صرف پانچ سو مجاہدین نے چالیس ہزار بھارتی فوج کو دو ماہ تک لوہے کے چنے چبوائے تھے۔ امریکہ اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیاب ہو چکا تھا وہائٹ ہاؤس کے ایک ترجمان نے واضح کیا کہ کلنٹن انتظامیہ پاک بھارت معاملات میں بروکر بننے کیلئے تیار نہیں البتہ وہ کارگل سے واپسی کی نگرانی کر رہی ہے۔ امریکہ میں متعین بھارتی سفیر نے واضح کیا کہ امریکہ مذاکرات کیلئے دباؤ نہیں ڈال رہا۔ (تبصرہ بی بی سی 18 جولائی 1999ء)

بھارت کے وزیر اطلاعات پرمود مہاجن نے امریکہ سمیت جی ایٹ ممالک کی خصوصی سرپرستی کی وجہ سے کارگل کا مسئلہ سلامتی کونسل میں اٹھانے کا اعلان کیا کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ پاکستان مذاکرات کی بات بھی کر رہا ہے اور مداخلت کاروں کی حمایت بھی جاری رکھے ہوئے ہے۔ آئی ایس آئی کے سابق سربراہ اور ماہر عسکری علوم جنرل (ر) حمید گل نے ''نواز کلنٹن مشترکہ اعلامیہ'' کے اثرات و مضمرات کا جائزہ لیتے ہوئے لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن سے خطاب میں کہا۔

''آج تک مجاہدین کشمیر کی قربانیوں کی بدولت کشمیر کے کل 51 ہزار مربع میل کے علاقہ میں سے 31 ہزار مربع میل کا رقبہ آزاد کروایا جا چکا ہے۔ مجاہدین کشمیر بھارت کی سپلائی لائن مکمل طور پر کاٹ چکے ہیں۔ آج مشرقی پنجاب میں خالصتان کی تحریک آزادی شروع ہو جاتی ہے تو بھارت کوئی بڑی جنگ شروع نہیں کر سکے گا' کیونکہ ریڈ کلف کے معاہدے میں بدنیتی کر کے انگریز نے گورداسپور' شکر گڑھ' بٹالہ وغیرہ کے علاقہ ہندوستان کو بخش دیئے تھے۔ جہاں سے اسے کشمیر میں فوجیں داخل کرنے کا راستہ مہیا کر دیا گیا تھا اور یوں دونوں نو آزاد ممالک میں انگریز نے جاتے ہوئے بھی مسئلہ کشمیر کی شکل

Marfat.com

میں مستقل کشیدگی کے عوامل پیدا کر دیئے۔ جنوری 1949ء میں اقوام متحدہ کی مداخلت پر کشمیر میں ''سیز فائر'' کروایا گیا تھا جبکہ بھارتی وزیراعظم پنڈت نہرو خود بھاگتے ہوئے اقوام متحدہ میں گئے کہ آپ نے جو جال بچھایا تھا' وہ تو ختم ہو رہا ہے اور ہمیں اپنی جان کے لالے پڑ گئے ہیں' لہٰذا ہماری جان چھڑائی جائے۔ یاد رہے کہ اس وقت پاکستان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا' اپنی فوج تک نہیں تھی' یہ جنگ صرف کشمیری مجاہدین اور لشکریوں نے لڑی' جو سرینگر ایئرپورٹ تک پہنچ گئے تھے۔ مگر پنڈت نہرو نے اقوام متحدہ میں جا کر جنگ بند کروا دی۔ غرض 52 سال تحریک آزادی کی داستان بہت طویل اور قربانیوں سے بھری پڑی ہے۔ گزشتہ دس برسوں میں ستر ہزار کشمیری اپنی جانیں آزادی پر قربان کر چکے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ اتنی ہی قربانیاں اور دینی پڑیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سیز فائر لائن' کنٹرول لائن میں کیسے تبدیل ہوئی کیونکہ سیز فائر لائن تو اقوام متحدہ کے ایماء پر جنگ بندی کا مظہر تھی۔ وہ اس لائن کے پار یعنی مقبوضہ کشمیر میں استصواب رائے کروانے کے پابند تھے۔ اس کا ایک بین الاقوامی پس منظر ہے کہ لداخ سے آگے کشمیر میں ایک علاقہ ''آکا سائی چن'' ہے جس کے ایک طرف تبت کا علاقہ ہے اور دوسری طرف چین کی سرحد کے ساتھ سکیانگ کا علاقہ۔ یہ علاقے چین کیلئے انتہائی حساس ہیں اور امریکہ کے بھی یہاں بعض ''مخصوص مفادات'' ہیں۔ اس وقت بھی ہالی وڈ میں سات فلمیں بن رہی ہیں' جن میں دلائی لامہ ہیرو اور چین ولن ہے۔ یعنی مستقبل قریب میں جیمز بانڈ کی جگہ دلائی لامہ لے گا۔ دو فلمیں غالباً ریلیز ہو چکی ہیں اور باقی ابھی تیاری کے مراحل میں ہیں۔

سکیانگ مسلم اکثریتی علاقہ ہے' کسی زمانے میں اسے ''یارکن'' کہا جاتا تھا۔ 1962ء میں ان علاقوں میں بھارت اور چین کی لڑائی شروع ہوئی تو کارگل اور دراس وغیرہ کا علاقہ سیز فائر لائن کے مطابق پاکستانی آزاد کشمیر میں شامل تھا' جو شمالی علاقہ جات اور کشمیر کے لوگوں نے خود آزاد کروایا تھا۔ اس وقت بھارت کو یہ مسئلہ درپیش تھا کہ اپنی فوج کو سپلائی کیسے پہنچائے۔ تب ایک امریکی جنرل پاکستان آیا اور اس نے ایوب خان سے کہا کہ اس موقع پر بھارت کے ساتھ جنگ نہ کرو' کشمیر پر حملہ نہ کرو' ہم تمہاری مرضی کے مطابق مسئلہ کشمیر حل کروائیں گے۔ اسی بنیاد پر وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو بھارت گئے اور 1964ء میں شیخ عبداللہ راولپنڈی آئے اور کہا کہ ہم مسئلہ کشمیر حل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اسی دن بھارت میں وزیراعظم نہرو آنجہانی ہو گئے اور شیخ عبداللہ واپس چلے گئے۔ اس طرح 62ء میں نے بھارت کو ''رعایت'' دے کر کشمیر حاصل کرنے کا سنہری موقع کھو دیا' اس ''رعایت'' کا نتیجہ یہ نکلا کہ 1965ء میں بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا' جس میں ہمارے متعدد علاقے چھین لئے گئے۔ پھر معاہدہ تاشقند ہوا' اس معاہدے میں خواہ کتنی ہی برائیاں ہوں' لیکن اس کی رو سے ہندوستان کو سیز فائر لائن پر واپس اپنی سابقہ پوزیشن پر جانا پڑا تھا۔

یہ صورت حال 1971ء تک چلتی رہی۔ اب اسے ہماری سیاسی یا فوجی قیادت کو کوتاہ نظری کہیے یا محدود ذرائع کہ ہم نے کارگل کے علاقے میں اپنی پوزیشنوں کو مستحکم نہ کیا اور 1971ء کی جنگ میں بھارت نے ان پر قبضہ کر لیا۔ بھارت کو اب کارگل کی پہاڑیوں کی اہمیت کا اندازہ ہو چکا تھا۔ لہٰذا پاکستان کو شملہ معاہدہ پر مجبور کیا گیا اور شملہ معاہدے میں کہا گیا کہ ''ہم سیز فائر لائن پر واپس نہیں جائیں گے اور مسئلہ کشمیر صرف دوطرفہ مذاکرات کے ذریعے ہی حل ہو گا۔ اور اب

Marfat.com

یہ لائن آف کنٹرول کہلائے گی۔''

شملہ معاہدے کے صرف چند ہفتے بعد انہوں نے کارگل میں اپنی پوزیشن کو مزید مضبوط کرنے کیلئے اور علاقے ''چن آف لا'' پر بھی قبضہ کر لیا اور پھر لائن آف کنٹرول کی تاویل وتشریح کرتے ہوئے چین کی سرحد کے ساتھ جنوب مشرقی علاقے میں اپریل 84ء میں سیاچین گلیشئر کے سات میل طویل علاقے پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس پر بھی بھارت نے بس نہیں کیا اور 1988ء میں ایک اور علاقے ''کھر سیکٹر'' پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس طرح شملہ معاہدے کے بعد بھارت نے تین مرتبہ کنٹرول لائن کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے ان پاکستانی علاقوں پر قبضہ کیا مگر کسی امریکہ یا جی ایٹ ممالک کو توفیق نہیں ہوئی کہ وہ بھارت سے کہتے کہ تم نے یہاں ''دراندازی'' کی ہے اور تم ''گھس بیٹھئے'' ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ امریکہ اس خطے میں چین کی ابھرتی ہوئی طاقت کے مقابلے میں بھارت کو آگے لانا چاہتا ہے۔ آج کارگل پر مجاہدین کے قبضے سے جہاں بھارت کو تکلیف ہو رہی ہے' وہاں امریکہ کے پیٹ میں بھی مروڑ اٹھ رہے ہیں۔ بھارت کارگل پر قبضے کیلئے سرتوڑ کوششیں کر رہا ہے' مگر مجاہدین وہاں ڈٹے ہوئے ہیں۔ ایک بھارتی کرنل کے مطابق بھارتی فوجی وہاں کتوں کی طرح مر رہے ہیں اور گدھوں کی طرح کام کر رہے ہیں۔ ہندوستانی فوجی افسروں کی بیویاں دہائی دے رہی ہیں کہ ہمارے خاوندوں کو قربانی کا بکرا بنا کر کارگل اور کشمیر میں نہ بھیجو۔ خود بھارت کے دانشور کہہ رہے ہیں کہ یہ کیا مذاق بنا رکھا ہے' اگر کشمیر کے لوگ ہمارے ساتھ نہیں رہنا چاہتے تو کیوں اپنی فوج مروا رہے ہو۔

اگر بھارت لائن آف کنٹرول پار کرتا ہے تو یہ مسئلہ عالمی حیثیت اختیار کر جائے گا جبکہ مقامی سطح پر مسئلہ حل کرنا اس کے بس کا روگ نہیں۔ اس لئے وہ ''ہمدردی اور مفاد'' کی بناء پر امریکہ سے مدد مانگتا ہے اور ہم امریکہ اور یہودی لابی کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔ آج ایٹمی جنگ کا کوئی امکان نہیں' بھارت مون سون کے موسم میں بین الاقوامی سرحدوں پر پاکستان سے جنگ چھیڑنے کی غلطی کبھی نہیں کر سکتا کیونکہ آج کل کی فوجیں جدید اور بھاری اسلحہ سے لیس ہوتی ہیں اور ان کیلئے طغیانی سے بھرے ہوئے دریاؤں کو عبور کرنا ممکن نہیں۔ علاوہ ازیں بھارت میں خالصتان' آسام' تامل ناڈو' ناگالینڈ' جھاڑکھنڈ' تھلائی اور میزورام جیسی 14 کے قریب علیحدگی کی تحریکیں چل رہی ہیں۔ پاکستان پر حملہ کی صورت میں یہ تحریکیں زور پکڑ سکتی ہیں کیونکہ بھارت کی ساری فوج کشمیر' چین' سیاچین' بنگلہ دیش اور پاکستان کے ساتھ برسرپیکار ہوگی۔ غرض بھارت کا اتحاد ایک غیر فطری مصنوعی اتحاد ہے' خود بھارت کا کہنا ہے کہ خود کو متحد رکھنے کیلئے ہمیں کشمیریوں کو دبا کر رکھنا ہوگا' لیکن کشمیری بھارت کے مصنوعی اتحاد کی قیمت اپنے خون سے ادا کیوں کریں؟ ان حالات میں نیوکلیئر بم بھارت تو چلا سکتا ہے' مگر پاکستان کو بم چلانے کی کیا ضرورت ہے' کیونکہ مٹھی بھر مجاہدین بھارت پر نفسیاتی دباؤ بڑھا رہے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ پاکستان مسئلہ کشمیر پر عالمی سطح پر تنہا ہو گیا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ 147 ممالک میں سے کتنے ملکوں نے پاکستان سے کہا ہے کہ وہ کارگل سے نکل جائے؟ ''جی ایٹ'' تو آٹھ ممالک ہیں۔ میں تو ویسے ہی ان کو 'ڈی ایٹ' یعنی ڈرٹی ایٹ کہتا ہوں۔ کیا کسی سارک کے رکن ملک' بھوٹان یا مالدیپ نے کہا ہے کہ پاکستان کارگل سے نکل جائے۔ چین نے بھی نہیں کہا بلکہ چین نے تو نواز شریف صاحب سے ملاقات کے بعد اپنی فوجوں کو بھارتی سرحد پر مشقیں شروع کر دی ہیں۔ 52 اسلامی ممالک بھی مسئلہ کشمیر پر پاکستان کی حمایت کرتے ہیں۔ کشمیر اور کارگل کے مسئلے پر پوری پاکستانی قوم تمام

Marfat.com

اختلافات بھلا کر متحد ہو گئی ہے اور کہتی ہے کہ قدم بڑھاؤ نواز شریف ہم تمہارے ساتھ ہیں' خود لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن نے ''جہاد فنڈ'' قائم کر کے تحریک جہاد کا آغاز کر دیا ہے۔ یہ جہاد کشمیر کی برکتیں ہیں جس کی علامات اب ہمارے سامنے آ رہی ہیں۔ پھر آخر مسئلہ کیا ہے؟ کشمیر کا مسئلہ حل کیوں نہیں ہوتا۔ ایک مرتبہ ایوب خان چین کے دورے پر ماؤزے تنگ سے ملے اور روایتی طور پر انہیں مسئلہ کشمیر کے بارے میں آگاہ کیا تو ماؤزے تنگ نے ایوب خان سے ایک ہی سوال کیا کہ:

"How serious are you about Kashmir"

یہ ایسا سوال ہے، جس کا جواب کسی پاکستانی کے پاس نہیں۔ اس کے باوجود کہ ہم کشمیر میں جانیں گنوا رہے ہیں' اتنی بڑی فوج کے اخراجات برداشت کر رہے ہیں' کشمیر پر تین جنگیں لڑ چکے ہیں' لیکن ''کیا ہم پاکستانی مسئلہ کشمیر کے حل میں سنجیدہ ہیں؟'' (جنرل (ر) حمید گل کا پاکستان بار کونسل لاہور سے خطاب 9 جولائی 1999ء)

10 جولائی کو نسیم زہرا نے روزنامہ نیوز میں وزیراعظم نواز شریف کے دورہ امریکہ اور واشنگٹن اعلامیہ کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا۔

''ابھی پاکستانی عوام یہی اندازے لگا رہے تھے کہ وزیراعظم نواز شریف کے اچانک دورہ واشنگٹن کا سبب کیا تھا' کہ اسی دوران 4 جولائی کو نواز کلنٹن مشترکہ علامیہ آ گیا اور اس نے اس بات کا انکشاف کر دیا' جس کی توقع کی جا رہی تھی۔ اس اعلامئے میں کہا گیا کہ دونوں فریق ''1972ء کے شملہ معاہدے'' کے مطابق لائن آف کنٹرول کا احترام کریں۔ نواز شریف نے لائن آف کنٹرول کی بحالی کیلئے ''ٹھوس اقدامات'' کرنے پر اتفاق کیا۔ دونوں نے اس امر پر بھی اتفاق کیا کہ ''لاہور میں شروع کئے جانے والے مذاکرات کشمیر سمیت تمام مسائل کو حل کرنے کا بہترین فورم ہیں۔'' کلنٹن نے بھی پاکستان کی جانب سے لائن آف کنٹرول کے قیام کے اقدامات کئے جانے کی شرط کیساتھ ''باہمی کوششوں کی تیزی سے بحالی کیلئے حوصلہ افزائی کرنے میں'' ذاتی دلچسپی لینے کو کہا۔

مشترکہ اعلامئے پر امریکیوں کا واضح نقطہ نظر دفتر خارجہ کے عہدیداروں کی پریس کانفرنس کے ذریعے سامنے آیا۔ نواز شریف کے دورے کے بارے میں انہوں نے کہا کہ ''وزیراعظم نے صدر سے پوچھا کہ ''کیا وہ ایک ہنگامی وجہ سے واشنگٹن آ سکتے ہیں'' اور کلنٹن نے انہیں اسی دوپہر اس کی دعوت دے ڈالی۔'' لائن آف کنٹرول کی بحالی سے متعلق امریکی عہدیداروں نے امریکہ کا یہ نقطہ نظر دوہرایا کہ ''ہماری پوزیشن یہ ہے کہ لائن آف کنٹرول کے پار جو قوتیں ہیں' ان کے پاکستان واپس جانے کی ضرورت ہے'' اور ایسا بہت ہی ''عجلت کے احساس'' کیساتھ کیا جانا چاہئے۔ ہم بہت تھوڑے وقت میں مثبت اقدامات چاہتے ہیں۔ اس ملاقات کا مقصد لازمی طور پر کارگل کے بحران کا حل تھا۔ امریکی عہدیداروں نے نواز کلنٹن ملاقات میں 1984ء میں سیاچین پر قبضے سمیت لائن آف کنٹرول کی ماضی میں کی جانے والی بھارتی خلاف ورزیوں یا کشمیر کے مسئلے کے حل کے بارے میں بات چیت کے مفروضے کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ ''آج کی یہ ملاقات اس معاہدے کی تاریخ یا کشمیر کے بحران کی تاریخ کے بارے میں نہیں تھی۔ یہ بات چیت کارگل میں قبضے میں لئے جانے والی چوکیوں سے پیدا ہونے والی مخصوص صورت حال اور اس سے نمٹنے کے بارے میں تھی۔''

Marfat.com

پاکستان سے واشنگٹن کے تقاضے جو درحقیقت بھارت کے تقاضے تھے' ان کی ترتیب کا تذکرہ کرتے ہوئے عہدیداروں نے کہا کہ "ہمارا نقطہ نظر ہے کہ لائن آف کنٹرول کے دوبارہ قیام' اس کے بعد اختلافات کے خاتمے اور اعلان لاہور کے عمل پر واپسی کیلئے ٹھوس اقدامات کئے جانے چاہئیں۔" تنازع کشمیر میں امریکی ثالثی کو مسترد کرتے ہوئے یہ واضح کیا گیا کہ "ان مسائل کو حل کرنے کا بہترین فورم باہمی مذاکرات ہیں۔" کلنٹن نے پاک بھارت باہمی مذاکرات کی بحالی کی "حوصلہ افزائی" کا ذاتی وعدہ کیا تاہم یہ بھی واضح کیا کہ "اس ملاقات کا مقصد اس تازہ بحران پر قابو پانا ہے۔ جو کئی ہفتوں سے جاری ہے۔" امریکی عہدیداروں نے کہا کہ کلنٹن مسئلہ کشمیر میں دلچسپی لے رہے ہیں "صدر کو اس میں دلچسپی ہے۔" اس مسئلے پر انہوں نے پچھلے سال نائب وزیر خارجہ ٹالبوٹ اور ایک یا دو عہدیداروں کو مامور کیا۔ مسئلہ کشمیر پر واشنگٹن کے نقطہ نظر کا تذکرہ کرتے ہوئے عہدیداروں نے کہا کہ "بہتر' ہم مسئلہ کشمیر کی تاریخ سے بخوبی واقف ہیں۔" حقیقت میں اگر آپ میں سے کوئی چاہتا ہے تو وہ وزیر خارجہ البرائٹ کے والد کی کتاب "کشمیر میں خطرہ" پڑھ سکتا ہے۔ یہ کتاب انہوں نے اقوام متحدہ کے پہلے کمیشن میں شامل رکن کی حیثیت سے لکھی۔ ہم تاریخ اور جو کچھ کہا گیا ہے اور جو کچھ کیا گیا ہے' سب سے بخوبی آگاہ ہیں۔ امریکی بیانات کے برعکس پاکستانی عہدیداروں کے بیانات میں تسلسل اور اکثر اوقات سچ کا بھی فقدان تھا۔ پاکستانی عہدیداروں نے دعویٰ کیا کہ مسئلہ کشمیر اور اسے باہمی مذاکرات سے حل کرنے کی اہمیت کے بارے میں پاکستان اور امریکہ کے خیالات ایک جیسے ہیں۔ امریکی انتظامیہ کے اس یقین کو نظرانداز کرتے ہوئے کہ اس مرحلے پر لازمی طور پر لائن آف کنٹرول کے احترام کو بحال کرنے کیلئے صرف پاکستان کو اقدامات کرنے چاہئیں۔ مشترکہ اعلامئے کے متن کے اس حوالے سے کہ لائن آف کنٹرول کا دونوں ملکوں کو احترام کرنا چاہئے' ترجمان نے کہا کہ "یہ مثبت پیش رفت ہے جو پاکستان کی اس پوزیشن کو جائز ٹھہراتی ہے کہ دونوں ملکوں کو لائن آف کنٹرول کا احترام کرنا چاہئے اور مسئلہ کشمیر کے حتمی حل کیلئے کام کرنا چاہئے۔" بھارت کے وزیر خارجہ جسونت سنگھ نے لائن آف کنٹرول سے منسلکہ سیاچین کے مسئلے کو مسترد کرتے ہوئے 5 جولائی کو سی این این پر انٹرویو دیتے کہا کہ "سیاچین لائن آف کنٹرول کا حصہ نہیں۔"

یہ بات نوٹ کی جانی چاہئے کہ دفتر خارجہ کے ترجمان نے حکومت کے پہلے سے اختیار کئے گئے مؤقف کہ کشمیر اور کارگل کے مسئلے کو ایک ساتھ حل کیا جائے گا' خیرباد کہہ دیا اور واشنگٹن میں یہ کہا کہ "مجاہدین نے مسئلہ کشمیر کو بین الاقوامی رنگ دے کر اپنا مقصد حاصل کرلیا ہے اس لئے کارگل میں مزید لڑنے کی ضرورت نہیں۔" اخباری اطلاعات کی بازگشت کے مطابق "ہم نے کارگل میں حال ہی میں جو کچھ دیکھا ہے وہ پیچھے کی جانب ایک قدم ہے۔" نواز کلنٹن ملاقات کے بارے میں امریکیوں کی وضاحت کے بعد اس بارے میں ابہام کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ پاکستان نے بڑے طمطراق سے جی۔ایٹ اور بھارت کی جانب سے کیا جانے والا مجاہدین کے "انخلاء" کا مطالبہ مان لیا اور اس کے جواب میں بھارت کی رضامندی اور امریکہ کی لاہور میں شروع کئے جانے والے مذاکرات کو جاری رکھنے کی حوصلہ افزائی ملی۔ یہ سب کچھ ہوم گراؤنڈ پر اعلان کردہ امور سے واضح تضاد رکھتا ہے۔ انخلاء کا کیا مطلب؟ پاکستانی فوج کا انخلاء؟ کیا وہ کنٹرول لائن کی ہماری جانب نہیں ہیں؟ اور کیا مجاہدین مقبوضہ کشمیر کے باشندے نہیں ہیں؟ امریکیوں نے پاکستان پر کون سا دباؤ ڈالا ہے۔ جس نے پاکستان کے مؤقف کو بالکل الٹ کر رکھ دیا ہے؟ خاص طور پر ہمارے وطن کے پلے بڑھے بہادر اور بے

Marfat.com

پاک وزیراعظم کی پوزیشن کو۔

واشنگٹن میں چاہے کچھ بھی فیصلہ اور مذاکرات ہوئے ہوں' اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان کی سویلین قیادت مکمل کنٹرول میں ہے تاہم "خاکیوں" کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔ جیسا کہ ہونا چاہئے اور جیسا کہ سویلین قیادت نے نیو کلیئر مسئلے' بھارت سے متعلق پالیسی' سی ٹی بی ٹی اور اب کارگل دراس کے معاملے پر کیا ہے؟ امریکی وزارت دفاع سے خودمختاری سے مذاکرات کرنے والے وہ "اکیلے رینجر" نہیں ہیں۔ یہ تاریخ ہے۔ آخر کار وہ کیا بات تھی' جس نے وزیراعظم کو واشنگٹن کی طرف دوڑایا' بظاہر انہیں اطاعت گزاری کی طرح جانا پڑا اور برمانبرداری کی دستاویز پر دستخط کرنے پڑے؟ اگر نواز شریف نے بھارت اور جی۔ایٹ ممالک کے مطالبے کو ہی منظور کرنا تھا تو پھر انہیں راتوں رات سات سمندر پار جانے کی کیا ضرورت تھی۔ اگرچہ قومی دن کے استقبالئے میں یونائیٹڈ سٹیٹس انفارمیشن سروس کے ایک عہدیدار نے ایک مقامی صحافی کو یہ کہہ کر منانے کی کوشش کی کہ وزیراعظم نے صدر کو بتایا کہ انہوں نے کارگل سے انخلاء شروع کر دیا ہے اور یہی بات نواز شریف کو کلنٹن کی جانب سے دعوت دیئے جانے کا باعث بنی۔ اس بارے میں مزید فراخ دلانہ تشریحات بھی ہوسکتی ہیں۔ ایک یہ کہ نواز شریف روبرو ملاقات کے قائل ہیں وہ کلنٹن کو ذاتی طور پر پاکستان کی امن کیلئے خواہش سے آگاہ کرنے کیلئے گئے یا پھر وہ یہ وعدہ کرنے کیلئے گئے کہ وہ مجاہدین کو نکالنے کیلئے اپنا ذاتی اثر ورسوخ استعمال کریں گے۔ مجاہدین نے انخلاء کی درخواست کرنے کے بعد نواز شریف یہ استدلال کر سکتے تھے کہ خودمختار مجاہدین کارگل اور دراس کا علاقہ خالی نہیں کریں گے۔ انخلاء جسے امریکی "پاکستانی قوتوں" کا انخلاء کہتے ہیں' اس سے پاکستان کے اس مؤقف کی تردید ہوتی ہے کہ پاکستانی فوجیں کنٹرول لائن پر ہیں اور یہ کہ وہ کنٹرول لائن کی بھارتی جانب پر نہیں ہیں؟ نواز شریف کے واشنگٹن کے اچانک دورے کی ایک وجہ بھارت کی جانب سے نئے محاذ کھول کر فوری حملے کا خطرہ بھی ہوسکتی ہے۔ اخبارات اور امریکی اس دورے کی چاہے کوئی بھی وجہ بتائیں' یہ دورہ بظاہر اطاعت گزاری کے ایسے مشروط معاہدے کیلئے تھا' جو تاشقند اور شملہ معاہدے سے بھی بدتر تھا۔ تاشقند کا معاہدہ برابری کی بنیاد پر تھا' جس کے تحت دونوں ممالک نے مقبوضہ علاقے خالی کئے تھے۔ 1971ء میں ہماری فوج شکست خوردہ تھی اس لئے کامیابی کا کوئی پہلو نہ نکلا' ہم نے کارگل اور دراس کے ملحقہ علاقے کھوئے' لیکن کشمیر پر ہمارا جائز مؤقف برقرار رہا۔

قوم جاننے کا حق رکھتی ہے کہ کلنٹن کی مداخلت کے نتیجے میں پاکستان نے کیا پایا؟ مسٹر نائیک کی خفیہ سفارتکاری کے سامنے آنے اور دہلی میں پاکستان مخالف شوروغوغا اور جنگی جنون کے پیش نظر یہ نظریہ بظاہر ممکن نہیں کہ واجپائی پاکستان کی جانب سے کارگل اور دراس سے انخلاء کے جواب میں کچھ دینے کی پوزیشن میں ہیں۔ وزیراعظم کس لئے واشنگٹن دوڑتے ہوئے گئے اور اس سے کیا نجات ملی۔ اس کے بارے میں بتایا جانا چاہئے۔ قوم کو اس محرک کے نیک و بد کا علم ہونا چاہئے جمعہ کو ہونے والی ڈیفنس کونسل میٹنگ میں کارگل کشمیر پالیسی پر حتمی فیصلے نہیں کئے گئے تھے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ وہی افراد' جنہوں نے کارگل کشمیر پالیسی پر خوف و ہراس پھیلایا تھا اور پیچھے ہٹنے اور جان بچانے کا فارمولا پیش کیا تھا' نواز شریف کے دورہ واشنگٹن میں وہی ان کے ساتھ تھے۔

حقیقت میں نواز کلنٹن ملاقات کے بارے میں اخبارات ہمیں جو کچھ بتاتے ہیں اور جو کچھ کہا نواز شریف کے

Marfat.com

پاس سے زیادہ کلنٹن کو دینے کیلئے کچھ نہ تھا۔ جب زمینی صورت حال مکمل طور پر پاکستانی فوج اور مجاہدین کے حق میں تھی اور جب فوج اور مجاہدین کی اطلاعات کے مطابق کم سے کم ایک سال سے برقرار تھی تو ایسے میں کس نے خوف و ہراس پھیلایا؟ بھارتی حملے کا خوف اپنی جگہ لیکن قومیں خطروں سے آزاد پالیسیاں کب اپناتی ہیں؟ کیا یہ بھارتی ہی نہیں تھے' جن کے لداخ' لیہہ اور سیاچین میں پچاس ہزار سے زائد فوجیوں کی رسد بند ہوگئی تھی اور ان کا دم گھٹ گیا تھا؟ کیا یہ کم مورال والی بھارتی فوج نہیں تھی جو آزادی پسندوں سے لڑ رہی تھی' جو کارگل میں بھاری نقصان اٹھا رہی تھی۔ کیا اس کے علاوہ اور بھی عوامل ایسے نہیں تھے' جو بھارت کو پاکستان کے خلاف نئے محاذ کھولنے سے باز رکھنے والے تھے؟ کیا یہ بھارتی ہی نہیں تھے' جو مایوسی میں گالیاں دے رہے تھے' سرکش ریاست' سرکش فوج اور ''ایک بڑی اسلامی سازش'' کا واویلا کر رہے تھے۔

نواز کلنٹن ملاقات سے لگتا ہے کہ سب ملبہ پاکستان پر گر گیا ہے۔ اچانک پاکستان بہت کمزور ہو گیا۔ جب تک وزیراعظم واشنگٹن میں ہونے والے معاملے کی ٹھوس وضاحت نہیں کرتے' نواز کلنٹن ملاقات کا پاکستانیوں' کشمیریوں اور فوج کے مورال پر اثر وحشیانہ حملے سے کم نہیں ہوگا۔ پاکستان کا جھگڑا بھارت کے ساتھ تھا' امریکہ کے ساتھ نہیں۔ کلنٹن کے ساتھ ملاقات کر کے سطحی معیار کی ساکھ بنانے سے کیا حاصل ہوگا' کیا اس کے نتیجے میں پاکستان اس امریکہ کی سکیورٹی کا حصہ نہیں بن جائے گا' جو بھارت کو اپنا ''فطری حلیف'' گردانتا ہے۔ کلنٹن کی ذاتی سطح پر اچھائی کے باوجود واشنگٹن اور دہلی مسئلہ کشمیر پر کسی بھی سطح پر اس وقت تک کوئی تحریک پیدا نہیں کر سکتے جب تک بھارت لائن آف کنٹرول کو پاکستان کی مستقل سرحد ماننے پر تیار نہیں ہو جاتا۔

دریں اثناء کلنٹن کے ساتھ کیے گئے معاہدے پر عملدرآمد آسان نہیں ہوگا۔ اس معاملے میں بہت سے عوامل مجاہدین' کشمیری مجاہدین کے منظم پاکستانی حامی' سیاسی نمبر بنانے کے خواہاں سیاسی جماعتیں اور فوج بھی کارفرما ہوگی۔ ہو سکتا ہے نواز شریف کو واشنگٹن میں کیے گئے معاہدے کے اپنی جماعت میں سے بھی حامی نہ ملیں۔ اس معاہدے سے بین الاقوامی سطح پر مسئلہ کشمیر پر پاکستان کے مؤقف پر بھی منفی اثرات مرتب ہوں گے۔

11 جولائی کو ایاز امیر نے روزنامہ ڈان میں ایک کالم بعنوان ''کارگل فتح معکوس'' کے عنوان سے لکھا جس نے کئی سوالات قارئین کے ذہنوں میں پیدا کر دیئے۔ ایاز امیر لکھتے ہیں۔

''وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مادرزاد اندھوں اور جاہلوں کو بھی یہ صاف نظر آنے لگا تھا کہ کارگل مہم اگر بالکل ہی احمقانہ نہیں' تو ناقابل فہم و قیاس اقدام ضرور تھا۔ یہ بھی ظاہر ہو رہا تھا کہ نتیجے کے طور پر پاکستان کو اپنے جرأت مندانہ اور بہادرانہ الفاظ ہی واپس نہیں لینا پڑیں گے' بلکہ اپنے فخر و افتخار کو بھی ختم کر کے مراجعت اختیار کرنا پڑے گی۔ یہ احساس خاص طور پر نیاز نائیک کے نئی دہلی کے خفیہ دورے کے بعد پیدا ہوا' جو بھارت کو کسی معاہدے پر رضامند کرنے کی ایک مایوسانہ کوشش تھی' تاکہ صورت حال سے نجات پانے کیلئے ہمیں عزت بچانے کا کوئی راستہ مل سکے۔

یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ جب بلند پروازی ختم ہوگی' تو اتنی بری طرح سے سر کے بل گرنا ہوگا اور یہ کہ اس عمل میں ہمارے باقی ماندہ قومی وقار کے بھی چیتھڑے اڑ جائیں گے' جس سے عقوبتوں کا حکم سنانے والے بھی حیران رہ گئے' زندگی

Marfat.com

سے بیزار لوگوں کا ایک گروہ بھی اگر کوئی مسودہ تیار کرتا' تو وہ واشنگٹن میں ''بھارتی مینڈیٹ'' کی صرف ایک اکیلی کارکردگی کا مقابلہ نہ کر سکتا۔

یہاں اعلان واشنگٹن کے پوشیدہ مطالب کی وضاحت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بیان ابہام سے مبرا ہونے کی ایک مثال ہے۔ جس میں پاکستان کی توہین اپنے عروج پر پہنچی ہوئی ہے اور جس سے کوئی شکوک پیدا نہیں ہوتے۔ اگر اب بھی یہ دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ یہ کشمیر کے مسئلے کے حل کی طرف ایک اہم قدم ہے' تو اس سے صرف اسی نظریئے کی توثیق ہوتی ہے کہ پاکستان میں کسی متزلزل حکومت کا آخری سہارا ہمیشہ ہٹ دھرمی ہوتی ہے۔ اول الذکر نکتے پر غور کریں۔ اسوقت یہ پاکستان کی مراجعت نہیں۔ کارگل مہم کی نوعیت کے پیش نظر نظریہ حقیقت کو منصوبہ بندی کرتے وقت فوج کی ہائی کمان نے حقائق کا احساس کرنے کے بجائے بے بنیاد مفروضوں کو سامنے رکھا' اسکے نتیجے میں پاکستان کیلئے واپسی کے سوا کوئی اور چارہ کار نہ تھا۔ حقیقت یہی ہے خواہ اپنے آپ کو جنرل رومیل سمجھنے والے لال بجھکو جو جی چاہئے کہیں۔ بھارتی فوج کو پریشان کرنے کے بہانے سے کارگل آپریشن کا مقصد سمجھ میں آ سکتا ہے' مگر کارگل کی پہاڑیوں پر مستقل طور پر قبضہ کرنا ایک پاگل پن تھا کوئی بھی ملک چاہے بھارت ہو یا پاکستان' اپنے زیر قبضہ علاقے میں ناجائز مداخلت برداشت نہیں کر سکتا۔ اس وقت ہمارے واپس آنے کا طریق کار وہی ہے' جس پر ہمارے دونوں رہنما متفق ہیں۔

پاکستان میں آپ کو بسمارک اور نپولین سمجھنے والوں پر آخر کار یہ عیاں ہوا کہ کارگل پر حملہ ایک فاش غلطی تھی' تو اسوقت بھی خطرے کی کوئی بات نہیں تھی' پاکستان کے پاس ابھی تک کئی اختیارات (آپشنز) تھے' جن پر اگر دانشمندی سے عمل کیا جاتا تو قومی وقار کو معمولی نقصان کے بدلے میں واپسی اختیار کی جا سکتی تھی۔ ہم بھارت کے ساتھ اپنے معاملات طے کر سکتے تھے اور اسے کہہ سکتے تھے کہ یہ اقدام' ایک غلطی تھا' جس کا ہم اب ازالہ کرنا چاہتے ہیں' بشرطیکہ:

1- لائن آف کنٹرول کے ساتھ لڑائی جھگڑے بند کئے جائیں اور

2- یہ کہ بھارت اسے ہماری شکست نہ سمجھے۔

یہ طریق کار موجودہ اپنائے گئے طریق کار سے کہیں بہتر ثابت ہو سکتا تھا۔ مگر اس کام کیلئے تدبر کی ضرورت تھی اور یہ ایک ایسی صلاحیت ہے کہ بحران شروع ہونے کے بعد جس کا وجود اسلام آباد میں نظر نہیں آیا۔ چنانچہ پاکستان کی جنگی قیادت وہی کچھ کرتی ہے۔ جو اس کی جبلت کا حصہ ہے یعنی دست بستہ ہو کر واشنگٹن جانا اور ایک غیر معمولی بیان پر متفق ہوا' جس سے ہم کارگل کی فاش غلطی کا ازالہ کر سکیں۔

اس صورت حال میں ہمدردی کا ایک پہلو بھی شامل ہے یعنی امریکہ کے صدر کی طرف سے یہ وعدہ کہ لائن آف کنٹرول کی بحالی کیلئے ٹھوس اقدامات طے کئے جائیں...... جس کا مطلب ہے کہ ہم اپنی غلطی کا ازالہ کر لیں...... تو وہ بھارت اور پاکستان کے درمیان دوطرفہ مذاکرات دوبارہ شروع کرنے میں ''ذاتی دلچسپی'' لیں گے۔ ایک ایسی قیادت' جسے قومی وقار اور افتخار کا کوئی احساس نہ ہو ہی ایک کھوکھلے وعدے کو ہمارے شہیدوں کے خون کا متبادل سمجھ سکتی ہے۔

پاکستان کے مؤقف کی ایک اور مکمل تردید اور بھارتی مؤقف کی مکمل حمایت کا تصور کرنا بھی تکلیف دہ ہے۔ اس کے باوجود سرکاری ڈھنڈورچی اور پاکستان ٹیلی ویژن' جو حکومت کے ہر اشارے کے مطابق رقص کرنے پر مجبور ہے' اب

Marfat.com

بلیئر ہاؤس' واشنگٹن میں کیے گئے معاہدے کو فروخت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ویانا کی کانگریس کے بعد اسے سب سے بڑی سفارتی فتح قرار دے رہے ہیں۔

پاکستان کے عوام حیران نہیں' وہ حواس باختہ ہیں' کیونکہ یہ صورت حال وہ نہیں' جس کی انہیں امید دلائی گئی تھی۔ دو فریق' جو حیران رہ گئے ہوں گے' وہ بل کلنٹن اور اٹل بہاری واجپائی ہیں۔ جب نواز شریف صاحب نے کلنٹن کو ٹیلیفون کیا اور فوری ملاقات کی درخواست کی تو امریکی صدر' جو یقینی طور پر بے وقوف نہیں ہیں' نے پلک جھپکنے میں اندازہ لگالیا ہوگا کہ پاکستانیوں کا دم ختم ہو چکا ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ امریکی صدر بھی پاکستانی قیادت کی اس بے پناہ خواہش پر حیرت زدہ رہ گئے ہوں گے' جو خود آ کر ایک یکطرفہ دستاویز پر دستخط کرنا چاہتی تھی۔

اسی انداز میں واجپائی بھی حیران رہ گئے ہوں گے۔ کسی حد تک کامیابیاں حاصل کر لینے کے باوجود بھارتی فوج کارگل اور دراس میں مشکل وقت گزار رہی تھی۔ خطرناک علاقہ' شاطر دشمن اور بھاری ہلاکتیں ایسی چیزیں نہیں' جسے کوئی بھی فوج پسند کرتی ہو۔ ذرا تصور کریں کہ نئی دہلی میں کتنا سکون ملا ہوگا' جب کلنٹن نے ٹیلیفون کر کے بتایا ہوگیا کہ پاکستانی قیادت اپنی حکمت عملی میں تبدیلی کرنا چاہتی ہے اور اس کے بدلے میں اس کا صرف یہ مطالبہ ہے کہ اس تبدیلی کو ان کی (کلنٹن کی) آشیر باد حاصل ہو۔ کھودا پہاڑ نکلا چوہا' اس سال خوردہ محاورے کو نئے معانی مل گئے ہیں۔

اگر مقابلتاً دیکھا جائے تو معاہدہ تاشقند اور معاہدہ شملہ فتح نظر آتے ہیں۔ تاشقند میں ایوب خان کی توہین نہیں ہوئی۔ اگرچہ سرکاری پروپیگنڈے کی وجہ سے پاکستان میں معاہدہ تاشقند کو برا بھلا کہا گیا' پھر بھی عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ دونوں ملکوں کے درمیان یہ ایک اچھا معاہدہ ہے' جو ایک دوسرے سے لڑتے رہے ہیں۔ دوسری طرف شملہ میں پاکستان بہت غیر موافق صورت حال میں تھا' کیونکہ اسے بھارت کے ہاتھوں توہین آمیز شکست برداشت کرنا پڑی تھی۔ پھر بھی اس ہلاکت خیز سانحہ کے بعد ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان کے اس وقار اور عزت کو بحال رکھا' جو باقی بچ رہے تھے۔ لیکن اعلان واشنگٹن سمجھ سے بالاتر ہے۔ اس قدر سرنگوں ہونے کیلئے کیا مجبوری درپیش تھی؟

ایسا کیوں ہوا ہے؟ اس کا جواب آسان ہے۔ پاکستان میں لیڈر شپ کا فقدان ہے۔ آئندہ پیش آنے والے حالات سے بے خبری کا فقدان اور سب سے اہم یہ کہ مضبوط اعصاب ہے۔ جب آگے بڑھنے کا وقت آیا' تو سیاسی اور فوجی قیادت سرگرمی نہ دکھا سکی۔

کیا غارت گری کی اس صورت حال کے متعلق وضاحتوں کا مطالبہ کیا جائے گا؟ اس سلسلے میں یہ کہہ دینا کافی ہے کہ نہیں' کیونکہ اس قسم کے پوسٹ مارٹم کی پاکستان میں کوئی روایت نہیں۔ حکومت کی مشین چلتی رہے گی اور معاہدہ واشنگٹن پر کسی رومن فتح کی طرح رنگ چڑھاتی رہے گی' جیسے کہ چڑھا رہی ہے۔ بسمارک نپولینوں کا دفاع کرتے رہیں گے اور نپولین' بسمارکوں کا۔

یہ بات یقینی ہے کہ پاکستانی فوج اور مجاہدین محسوس کریں گے کہ انہیں فریب دیا گیا ہے۔ خود کشمیر کے مؤقف کو جان لیوا دھچکا لگا ہے۔ مگر اس بات کی پرواکس کو ہے؟ ہماری تاریخ میں پیش آنے والے بڑے بڑے حادثات ذہنوں سے نکل چکے ہیں۔ کارگل میں پیش آنے والی ذلت وخواری بھی (یا یہ واشنگٹن کی تذلیل ہے؟) جلد ہی فراموش کردی

Marfat.com

جائے گی۔

ان سب باتوں کے باوجود کیا اب کرنے کو کچھ نہیں رہا؟ آغاز کرتے ہوئے شاہین اور غوری میزائلوں کے تمام ماڈل اور چاغی پہاڑیوں کے تمام نمونے اور نقلیں' جو ہمارے متعدد شہروں کی زیبائش بنی ہوئی ہیں' آدھی رات کے وقت ایک سادہ سی تقریب میں ہماری بحریہ کے ایک بہترین بحری جہاز پر رکھ کر دور لے جا کر بحیرہ عرب کے گہرے پانی میں ڈبو دینی چاہئیں۔ اگر اس بحران سے کچھ حاصل ہوا ہے' تو یہ کہ نیوکلیئر ہتھیاروں کی موجودگی بھی احمقانہ فیصلوں کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتی۔

مزید برآں' اگر وزیراعظم اور آرمی چیف یہ کر سکتے ہوں تو انہیں کچھ عرصے کیلئے کچھ نہیں کہنا چاہئے' نہ وضاحتیں اور نہ بہادرانہ بیانات۔ پاکستانی عوام کے بھی جنگ عسکری قوتوں کے ساتھ ساتھ عوام کی قربانیوں و جذبے سے ہی جیتی جاتی ہے اور جب حکومتی حلقے اپنے آپ کو عوام سے زیادہ محب وطن سمجھیں تو وہیں ہوتا ہے جو ہم دیکھ رہے ہیں یعنی عام آدمی کی سطح پر باوجود حکومتی کوششوں کے اعلان واشنگٹن کو زبردست تنقید کا سامنا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ وزیراعظم نے جو بھی کیا وہ اپنی سمجھ کے مطابق قوم کے بہتر مفاد میں ہی کیا ہوگا لیکن میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ قومی مفاد کو سمجھنے کیلئے بھی علم و تاریخ جاننے کی ضرورت ہے۔ باخبر قارئین جانتے ہیں کہ 1938ء میں برطانوی وزیراعظم نیول چیمبرلین ہٹلر سے سمجھوتہ کرنے میونخ گئے تھے واپس آ کر فرمایا تھا کہ اب جنگ کے امکانات ختم ہو گئے ہیں صرف چرچل ہی نے کہا تھا کہ اب تو برطانیہ پر جنگ مسلط ہو کر رہے گی۔ یعنی ایسے مسائل پر یہ ضروری نہیں ہے کہ حکومتی سوچ ہی صحیح ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اہل اقتدار ایسے مسائل پر عوام اور تمام سیاسی قوتوں کو ساتھ لے کر چلنے کا اہتمام کریں۔

اس سلسلے میں اور اس گزارش کی روشنی میں آخری بات جو عرض کرنی ہے وہ یہ ہے کہ ہم نے ایک بار پھر شملہ ایگریمنٹ 72ء کی کارگل لڑائی کے دوران بھی توثیق کر دی ہے اگر راقم کی کوئی رائے لیتا تو بین الاقوامی قانون کے تحت ہمارا پہلا موقف یہ ہوتا کہ یہ ایگریمنٹ وطن عزیز پر اس وقت مسلط کیا گیا تھا جب مشرقی پاکستان جنگ کے ذریعے ملک سے علیحدہ کر دیا گیا تھا اور ہمارے ایک لاکھ کے لگ بھگ جنگی قیدی ہندوستان کی تحویل میں تھے۔ اس طرح کے معاہدے کو بین الاقوامی عدالت انصاف کے فیصلوں کی روشنی میں چیلنج کیا جا سکتا تھا قانونی اور سفارتی روایات میں مثالیں موجود ہیں جب اس طرح کے مسلط شدہ معاہدے سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے اس کے علاوہ دوسری قانونی بات جو کہی جا سکتی تھی وہ یہ ہے کہ بدلے ہوئے حالات میں معاہدے و قانون کا متعلقہ اطلاق بھی تبدیل ہو سکتا ہے اس کو انٹرنیشنل فورم پر لایا جاتا ہماری مشکل یہ ہے کہ قانوناً ہم پھر اس بات کے پابند ہو گئے ہیں کہ ایک بار پھر ہندوستان سے دوطرفہ بات چیت کے ذریعے ہی ایسے تنازعات کا حل ڈھونڈیں جو موجودہ حالات میں ناممکن دکھائی دیتا ہے۔ اس پس منظر میں یہ بات صاف ظاہر ہے کہ اعلان واشنگٹن یا اس کے پیشتر کیا گیا عمل سوچ و بچار سے خالی تھا اور نہ ہی متعلقہ بین الاقوامی قانون کو سنجیدگی سے جائزہ لیا گیا تھا۔ لڑائی چھڑنے کے بعد یکایک اپنے آپ کو بین الاقوامی سطح پر تنہا پا کر ایسے اقدامات کئے گئے جو مجبوراً بدحواسی panic میں کئے جاتے ہیں وزیراعظم نے اپنی سیاسی بصیرت کے مطابق ملک کیلئے جو کچھ کیا وہ اس سے

Marfat.com

زیادہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن ان کے ارد گرد حکومتی عملہ اتنا نااہل ہے جس نے شائد ایک زبردست موقعہ گنوا دیا اور اپنی غفلت و ناعاقبت اندیشی کو چھپانے کیلئے حکومت سے ایسی کارروائی کروادی ہے جو بے مقصد ہونے کے علاوہ دیر تک ملک و قوم کو متاثر کرتی رہے گی۔'' (دی نیوز۔ لاہور 11 جولائی 1999)

متین فکری نے جہاد کشمیر میں اس صورت حال پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے 31 جولائی کے شمارے ''جہاد کشمیر'' میں نواز کلنٹن ملاقات کے حوالے سے لکھا۔

وزیراعظم نواز شریف واشنگٹن میں صدر کلنٹن سے ملاقات کے بعد مشترکہ اعلامیہ کی سوغات لے کر واپس آ گئے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ پاکستان اور بھارت شملہ سمجھوتے کے تحت کنٹرول لائن کی بحالی اور اسکی پابندی کیلئے موثر اقدامات کریں اور جارحانہ کارروائیاں بند کر دیں۔ مشترکہ اعلامئے میں اعلان لاہور کو ہی دونوں ملکوں کے درمیان تنازعات کے حل کا واحد ذریعہ قرار دیا گیا ہے اور اس بات کی یقین دہانی کرائی گئی ہے کہ کنٹرول لائن کا تقدس بحال ہوتے ہی صدر کلنٹن دونوں ملکوں کے درمیان مذاکرات کی جلد بحالی کی حوصلہ افزائی کریں گے اور اس سلسلے میں ذاتی دلچسپی لیں گے۔ اس مشترکہ اعلان میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکے کہ وزیراعظم نواز شریف کارگل سے مجاہدین کی واپسی پر آمادہ ہو گئے ہیں اور یہ کہ انہوں نے امریکہ کو اس بات کی یقین دہانی کرادی ہے کہ مجاہدین وہ تمام علاقے خالی کر دیں گے جو 1972ء کے شملہ سمجھوتے کے تحت بھارت کی تحویل میں چلے آ رہے تھے' جن پر قبضے کے بعد مجاہدین نے اس شاہراہ کو بھی نشانہ بنالیا تھا جس کے ذریعے بھارت سیاچین میں اپنی سپلائی قائم رکھتا ہے اور ان دنوں سپلائی کے منقطع ہو جانے سے سیاچین میں متعین بھارتی فوجی محاصرے کی حالت میں ہیں۔ اگر یہ صورت حال برقرار رہی تو موسم برسات شروع ہونے کے بعد فضائی راستے سے بھی انہیں غذائی رسد اور دیگر ساز و سامان پہنچانا دشوار ہو جائے گا اور موسم سرما ان پر قیامت بن کر ٹوٹے گا۔ مشترکہ اعلامیہ میں کارگل سے مجاہدین کے انخلاء کی واضح صراحت نہ ہونے کے باوجود ان الفاظ کا یہی مطلب لیا جا رہا ہے۔ خود پاکستان نے بھی اس سے یہی مطلب اخذ کیا ہے کیونکہ صدر کلنٹن اور وزیراعظم نواز شریف کے درمیان تین گھنٹے تک طویل مذاکرات اسی ایک نکاتی ایجنڈے پر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وزیراعظم کے ساتھ امریکہ جانے والے دفتر خارجہ کے عہدیدار مسٹر طارق الطاف نے واشنگٹن میں یہ بیان دیا کہ پاکستان مجاہدین سے کارگل میں لڑائی بند کرنے اور واپس آنے کی اپیل کرے گا۔ انہوں نے کہا مجاہدین کارگل میں کارروائی کر کے مسئلہ کشمیر پر عالمی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ بی بی سی کا کہنا ہے کہ کارگل سے مجاہدین کی واپسی کی تفصیلات طے پا چکی ہیں۔ پاکستان پر امریکہ کا کئی دنوں سے دباؤ تھا کہ اگر وہ مجاہدین کو کارگل سے واپس نہیں بلائے گا' تو ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کی امداد رکوانے اور پاکستان کو دہشت گرد ملک قرار دینے کیلئے امریکی کانگریس میں قرارداد پیش کی جائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکہ نے ایٹمی دھماکوں سے قبل بھی پاکستان کو اسی طرح بلیک میل کرنے کی کوشش کی تھی' لیکن جب پاکستان اپنے موقف پر ڈٹا رہا اور امریکہ کی کوئی دھمکی پاکستان کے ایٹمی دھماکوں کی راہ میں حائل نہ ہوئی' تو اس کی عائد کردہ اقتصادی پابندیاں بھی آہستہ آہستہ دم توڑ گئیں۔

Marfat.com

کارگل کے معاملے میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کی حکمران قیادت کسی ایسی اچانک فتح کو ہضم کرنے کیلئے ذہنی طور پر تیار نہ تھی جب فوج نے اسے بتایا کہ مجاہدین کارگل کی چوٹیوں پر پہنچ گئے ہیں اور انہوں نے بھارتی پوسٹوں پر قبضہ کر کے موسم گرما میں بھارتی فوجیوں کی واپسی ناممکن بنا دی ہے تو وہ حیران رہ گئی' اس کیلئے مجاہدین کی حمایت کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ پاک فوج پوری آمادگی سے مجاہدین کی ہم نوا تھی اسی اثناء میں بھارت کو بھی صورت حال کا علم ہو چکا تھا۔ اس نے ابتداء میں یہ خیال کیا کہ زبردست فوجی کارروائی اور فضائی حملوں کے ذریعے وہ مجاہدین کو کارگل سے پسپا کرنے میں کامیاب رہے گا۔ اسی لئے بھارت کے وزیر دفاع نے اعلان کیا تھا کہ ''دراندازوں'' کو اڑتالیس گھنٹوں کے اندر بے دخل کر دیا جائے گا۔ لیکن جب بھارت نے اپنی جنگی مشینری کو حرکت میں لا کر کارروائی شروع کی تو اسے آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو گیا' مجاہدین نے نہ صرف اسے بھاری نقصان پہنچایا اور اب تک پہنچا رہے ہیں' بلکہ اس کے فضائی آپریشن کو بھی ناکارہ بنا دیا۔ یہی وہ مرحلہ تھا جب اس نے پوری دنیا میں بڑے پیمانے پر یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ کارگل میں پاکستان کی ریگولر آرمی لڑ رہی ہے اور اس نے بھارت کے زیر قبضہ علاقے میں داخل ہو کر کنٹرول لائن کی خلاف ورزی کی ہے۔ بھارت نے اس سلسلے میں امریکہ میں اپنا خصوصی ایلچی بھیجا' جی۔ ایٹ ملکوں کے سربراہ اجلاس کے موقع پر زبردست سفارتی مہم چلائی اور اپنے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے پروپیگنڈے کا ایسا طوفان برپا کیا کہ تمام بڑی طاقتیں اس کے زیر اثر آ گئیں اور امریکہ بھی اس بات پر اصرار کرنے لگا کہ پاکستانی فوجی کارگل میں لڑ رہے ہیں اور پاکستان کو انہیں واپس بلانا ہو گا۔ بھارت کے اس پروپیگنڈے کے مقابلے میں پاکستان کی سفارتی مہم بڑی کمزور رہی ہے وہ اگرچہ عالمی سطح پر یہی تاثر دیتا رہا' کہ کشمیری مجاہدین بھارت کے خلاف برسرپیکار ہیں اور پاکستان کا ان پر کوئی کنٹرول نہیں لیکن جس انداز میں اس نے ''بیک ڈور ڈپلومیسی'' کو فروغ دیا اور خاموش سفارت کاری کے ذریعے معاملات کو طے کرنے کی کوشش کی اس سے اس کا اخلاقی اور اصولی مؤقف کمزور پڑتا چلا گیا اور بالآخر اس نے امریکہ کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے۔

بتایا گیا ہے کہ جب کارگل میں محاذ گرم تھا تو ابوظہبی میں خفیہ سفارت کاری اپنا رنگ دکھا رہی تھی پھر معلوم ہوا کہ پاکستان کے سابق سفارت کار مسٹر نیاز اے نائیک وزیراعظم کے فوکر طیارے میں سوار ہو کر نئی دہلی گئے اور واجپائی کو جنگ بندی کیلئے تین تجاویز پیش کیں جن میں سے ایک تجویز یہ تھی کہ کارگل کے بدلے سیاچین پر پاکستان کا قبضہ تسلیم کر لیا جائے۔ بھارتی وزیراعظم کا کہنا تھا کہ پہلے کارگل خالی کیا جائے پھر کسی اور نکتے پر بات ہو سکتی ہے۔ بھارت آخر وقت تک اپنے ایک نکاتی مؤقف پر اڑا رہا جبکہ پاکستان اس بات پر ڈٹے رہنے کی بجائے کہ کارگل میں کشمیری مجاہدین برسرپیکار ہیں اور وہ ان پر کوئی اختیار نہیں رکھتا' مختلف تجاویز پیش کر کے اپنے مؤقف کو بدلتا چلا گیا حالانکہ اسے اپنے بنیادی مؤقف کی تائید میں کل جماعتی حریت کانفرنس کی حمایت بھی حاصل تھی اور حریت کانفرنس کے چیئرمین سید علی گیلانی نے سری نگر سے یہ بیان جاری کر کے بھارت کے پروپیگنڈے کے غبارے سے ہوا نکال دی تھی کہ کشمیری مجاہدین کارگل میں اپنی سرزمین پر بھارت کی قابض افواج کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں' ان کی یہ جدوجہد تحریک آزادی کشمیر کا حصہ ہے اور کشمیری عوام کی بھرپور تائید انہیں حاصل ہے۔ کل جماعتی حریت کانفرنس کی آزاد کشمیر شاخ بھی حکومت پاکستان کو یہی اخلاقی تائید فراہم کر رہی تھی جبکہ تمام عسکری تنظیمیں بھی مسلسل اس مؤقف کا اظہار کر رہی تھیں کہ مجاہدین کشمیر میں بھارت

Marfat.com

کے ناجائز تسلط کے خلاف برسرپیکار ہیں اور پاکستان انہیں روکنے کا کوئی اخلاقی جواز نہیں رکھتا۔ کشمیر کے سیاسی وعسکری حلقوں کی جانب سے پاکستان کی اس انداز میں حمایت اسے بہت بڑی سفارتی کامیابی سے ہمکنار کرسکتی تھی لیکن افسوس ہمارے دفتر خارجہ نے چپ سادھ رکھی اور وہ بھارت کے پروپیگنڈے کا توڑ کرنے میں ناکام رہا۔

کارگل میں معرکہ برپا ہونے کے بعد جب ہم ملک کی مجموعی صورت حال پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ ہماری حکمران قیادت شروع سے ہی بدنیتی کا شکار تھی۔ بھارتی حکومت نے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے ملک میں ایسا جنگی ماحول پیدا کردیا تھا کہ ہر بھارتی باشندہ یہ محسوس کررہا تھا کہ بس جنگ شروع ہونے والی ہے۔ بھارتی دارالحکومت مکمل طور پر جنگی جنون کی گرفت میں تھا۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں حکومت سارے معاملات میں رازداری برت رہی تھی۔ تمام سیاسی جماعتیں ملک کو درپیش خطرات کے پیش نظر اس جانب دست تعاون بڑھا رہی تھیں لیکن وہ کسی کو سننے کو تیار نہ تھی حتیٰ کہ پارلیمنٹ بھی تمام صورت حال سے بے خبر تھے۔ وزیراعظم چین کے پانچ روزہ دورہ پر گئے پھر اچانک اپنا دورہ مختصر کرکے واپس آ گئے۔ کسی کو بھی دورہ مختصر کرنے کی وجہ معلوم نہ ہوسکی۔ پھر وزیراعظم اچانک واشنگٹن چلے گئے۔ اس دورے کے بارے میں ابتداء میں یہ تاثر دیا گیا کہ وہ صدر کلنٹن کی خواہش پر ان سے ملاقات کیلئے امریکہ گئے ہیں لیکن غیرملکی ذرائع ابلاغ نے سارا پول کھول دیا اور پوری قوم کو یہ جان کر مایوسی اور شرمندگی ہوئی کہ صدر کلنٹن سے وزیراعظم کی ملاقات خود ان کی استدعا پر ہوئی' اخبارات میں اس ملاقات کا جو پس منظر رپورٹ کیا گیا ہے اس کے مطابق جب ہمارے وزیراعظم نے صدر کلنٹن سے ملاقات کی استدعا کی تو امریکی صدر نے کہا کہ وہ واجپائی سے مشورہ کرنے کے بعد ہی کچھ کہہ سکیں گے اور ان سے رائے لی کہ وزیراعظم نوازشریف کو بلایا جائے یا نہ بلایا جائے واجپائی نے نوازشریف کو سب لانے پر اتفاق کیا تو صدر کلنٹن نے ملاقات پر آمادگی ظاہر کی اور وزیراعظم کو فوری طور پر واشنگٹن پہنچنے کا سگنل دیا۔ کلنٹن کا کہنا تھا کہ ان کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اگر نوازشریف چند گھنٹوں میں واشنگٹن نہ پہنچے' تو وہ تعطیلات گزارنے کیلئے اپنی سٹیٹ چلے جائیں گے۔ چنانچہ وزیراعظم نوازشریف مارا ماری واشنگٹن پہنچے۔ دیکھا جائے تو یہ ایک ہنگامی سفارتی مشن تھا لیکن وزیراعظم اپنے ذاتی عملے کے علاوہ اپنی اہلیہ کو بھی ساتھ لے جانا نہ بھولے۔ سی این این اور دیگر ذرائع ابلاغ نے خبر دی کہ وزیراعظم نوازشریف سرکاری مہمان نہیں ہیں اور وہ اپنے خرچے پر پرائیویٹ ہوٹل میں قیام کررہے ہیں۔ پھر ان کے ساتھ مذاکرات بھی وائٹ ہاؤس میں نہیں سرکاری مہمان خانے بلیئر ہاؤس میں کئے گئے جہاں صدر کلنٹن نے مذاکرات شروع کرنے سے پہلے پوچھا کیا آپ اپنی بیگم کے ساتھ آئے ہیں' جب وزیراعظم نے اثبات میں جواب دیا تو صدر کلنٹن نے بیگم کلثوم نواز سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ وزیراعظم تیزی سے کمرے سے باہر نکلے اور اپنے عملے سے پوچھا...... بیگم صاحبہ کہاں ہیں؟ لیکن بیگم صاحبہ شاپنگ کیلئے جا چکی تھی۔ چنانچہ اگلے روز وائٹ ہاؤس میں ناشتے پر ملاقات کا اہتمام کیا گیا اور دونوں لیڈروں اور ان کے اہل خانہ نے ساتھ بیٹھ کر تصویریں بنوائیں...... یہ تھا اس ہنگامی مشن کا انجام جس میں کارگل کی قسمت کا فیصلہ کیا گیا۔

کیا واقعی کارگل کی قسمت کا بھارت کے حق میں فیصلہ ہوگیا ہے اور کیا واقعی مجاہدین کارگل سے دستبردار ہونے پر آمادہ ہوجائیں گے؟ اس سے بھی بڑھ کر ایک سوال یہ بھی ہے کہ کیا فوج کارگل سے پسپائی کو ٹھنڈے پیٹوں قبول کرلے گی

Marfat.com

اور نواز شریف حکومت کو اپنا وعدہ پورا کرنے کی مہلت مل جائے گی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ابھی یہ ساری باتیں پردہ غیب میں ہیں۔ مجاہدین کی تنظیموں نے پاک امریکہ مشترکہ اعلامیہ۔ مسترد کر دیا ہے۔ سری نگر سے کل جماعتی حریت کانفرنس کا ردعمل بھی سامنے آ گیا ہے۔ کانفرنس کے چیئرمین سید علی گیلانی نے کہا کہ کشمیری عوام شملہ سمجھوتے اور کنٹرول لائن کو تسلیم نہیں کرتے اگر امریکہ مسئلہ کشمیر حل کرانے میں سنجیدہ ہے تو اسے کشمیری قیادت کو بھی مذاکرات میں شریک کرنا چاہئے۔ پاکستان میں کل جماعتی کانفرنس کے کنوینئر سید یوسف نسیم نے کہا کہ مجاہدین کشمیری عوام کے حق خودارادیت کی جنگ لڑ رہے ہیں اگر انہیں امریکہ کی طرف سے اس بات کی ضمانت مل جائے کہ بھارت کشمیریوں کا یہ حق تسلیم کرلے گا اور اس پر عملدرآمد کیلئے اقوام متحدہ کی زیرنگرانی انتظامات کئے جائیں گے تو ممکن ہے کہ مجاہدین اپنی کارروائیاں روک دیں لیکن کیا امریکہ اس پوزیشن میں ہے کہ ضمانت فراہم کرے اور کیا بھارت اسے یہ اختیار دینے کو تیار ہے۔؟

اس شمارے میں سری نگر سے نامہ نگار برائے جہاد کشمیر علی محمد ہمدانی کا مراسلہ شائع ہوا جنہوں نے کلنٹن ملاقات اور کارگل سے مجاہدین کی واپسی کے فیصلے پر اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا۔

''سری نگر میں آج شام غریباں کا منظر ہے۔ کارگل کا محاذ کھلنے سے ستم رسیدہ کشمیری عوام نے امید کی جو کرن دیکھی تھی' نواز کلنٹن معاہدے سے وہ دم توڑ گئی۔ شیخ عبداللہ نے بہت پہلے کشمیریوں کی امیدوں کو اسی طرح خاک میں ملایا تھا۔ اہل کشمیر تب سے اپنوں اور غیروں کی ریشہ دوانیوں کے سبب غلامی کی چکی میں پس رہے ہیں۔ آج وہ معاہدہ واشنگٹن پر حیران وششدر ہیں۔ 1947ء کے بعد پہلی بار ایسی صورت حال پیدا ہوئی تھی کہ بھارت مجاہدین کے ہاتھوں بے پناہ جانی اور مالی نقصان سے دوچار ہو رہا تھا' آنے والے موسم میں ایک بڑی اور ناقابل تلافی شکست بھارت کا مقدر بن رہی تھی لیکن ہوا یہ کہ بھارت کے بجائے پاکستانی وزیراعظم فکر اور خوف میں ڈوب گئے۔ انہیں پریشانی لاحق ہوگئی کہ کارگل کے محاذ نے بھارت کی معاشی اور عسکری قوت کو نچوڑنا شروع کر دیا ہے کہیں بھارت تباہ ہی نہ ہو جائے۔ یہاں پر جن خبروں سے ہم کشمیریوں کو سکون اور اطمینان ملتا تھا وہ اسلام آباد میں واجپائی کے دوستوں کو غم زدہ کر دیتی تھیں۔

بھارت کے سابق فوجی سربراہ شنکر رائے چوہدری نے کلکتہ میں اخبار نویسوں کو بتایا کہ ''دہلی کا پالم ہوائی اڈہ'' تابوتوں کا اڈہ بن گیا ہے۔ ان کا یہ بیان دو جولائی کو ٹریبون میں اس سرخی کے ساتھ شائع ہوا......!

"Palam airport junction."

خبر یوں تھی۔ ''جب سے کشمیر میں پاکستانی دراندازوں کے مقابلے کیلئے فوجیوں کو بھیجا جانے لگا' تب سے پالم ایئرپورٹ تابوتوں کا اڈہ بن گیا ہے جہاں سے فوجی آخری سفر کیلئے گھروں کو روانہ کئے جاتے ہیں۔''

''انڈیا ٹوڈے'' نے جون کے آخری شمارے میں لکھا......لداخ کے ضلع لیہہ میں دن رات تابوت تیار کئے جاتے ہیں۔ لیکن ہلاک ہونے والے بھارتی فوجیوں کے مقابلہ میں تابوت کم پڑ جاتے ہیں۔ تابوت تیار کرنے والے ترکھانوں کا کہنا ہے کہ انکا کاروبار حیرت انگیز حد تک بڑھ گیا ہے۔ ان کے پاس جب لکڑی ختم ہوگئی تو انہوں نے بوفورس توپوں کے گولوں کی پیٹیوں کی لکڑی استعمال کرنا شروع کر دی ہے۔ اس کے باوجود تابوت ضرورت پوری نہیں کر رہے ہیں۔

Marfat.com

بھارت کے سرکردہ صحافی پریم شنکر نے اپنے مضمون میں حکومت اور ذرائع ابلاغ کے ان دعوؤں کو جھوٹ کا پلندہ قرار دیا ہے جن میں بھارتی فوج کی کامیابیوں کے دعوے کئے جا رہے تھے۔ ان کا یہ مضمون ہفت روزہ ''آؤٹ لک'' میں شائع ہوا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ بھارت کارگل کی بازی ہار رہا ہے۔ بھارت کی بری فوج کے مطابق سربراہ جنرل وشوا ناتھ شرما نے یکم جولائی کو نئی دہلی میں ایک بیان جاری کیا' جس میں واجپائی حکومت پر زور دیا گیا تھا کہ وہ کارگل میں بھارتی فوج کے مزید جانی نقصان کو روکنے کیلئے لائن آف کنٹرول پار کر کے نئے محاذ کھولیں۔ بھارت زیادہ دیر تک بڑے پیمانے پر فوجی اہلکاروں کی ہلاکت برداشت نہیں کر سکتا۔ بھارتی فوج کے ترجمان کرنل بکرم سنگھ نے ذرائع ابلاغ کے نمائندوں کے سامنے اعتراف کیا کہ انہیں بیسیوں فوجیوں کی لاشیں روزاٹھانا پڑتی ہیں۔

8 جولائی کو بھارتی ذرائع ابلاغ نے یہ خبر نشر کی کہ ان کے اڑتیس فوجی ٹائیگر ہلز کے آس پاس لڑائی میں مارے گئے یاد رہے بھارتی اپنا کم سے کم نقصان ظاہر کر رہے تھے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ بھارت نے اس سے پہلے ٹائیگر ہلز پر قبضے کا دعویٰ کیا تھا لیکن بعد کی صورت حال نے ان کے دعوؤں کی قلعی کھول دی۔ محاذ جنگ سے آنے والے ایک پولیس افسر نے ایک نامہ نگار کو بتایا کہ ہلاک شدہ بھارتی فوجیوں کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ ہے اور زخمی ہزاروں میں ہیں۔ بھارت میں زخمی فوجیوں کیلئے جس بڑے پیمانے پر خون جمع کرنے کی مہم چلائی جا رہی ہے ان اعداد و شمار کی ازخود تصدیق ہوتی ہے۔ حد تو یہ ہے بعض جیلوں میں نظر بندوں سے زبردستی خون نکالا گیا۔ تجزیہ نگاروں نے کارگل کو بھارت کی مقتل گاہ سے تعبیر کیا۔ جان کے علاوہ بھارت کو ناقابل برداشت مالی خرچ بھی برداشت کرنا پڑا۔

اخبار ٹریبون نے دو جولائی کے شمارے میں نوجوان بیواؤں کے مستقبل کے عنوان سے لکھا۔ جن کے شوہر ہمارے کل کیلئے قربان ہو گئے ان میں سے اکثر بیواؤں کی عمریں بیس برس سے زیادہ نہیں۔ معاشرے میں انہیں حقیر نظروں سے دیکھا جاتا ہے اور ہندو معاشرہ ان کی دوبارہ آبادکاری میں آڑے آ رہا ہے۔ (شوہر کے مرنے کے بعد ہندو مذہب دوسری شادی کی اجازت نہیں دیتا) اخبار کے مطابق صرف مالی امداد ہی ان کے دکھوں کا مداوا نہیں بن سکتی۔ انہیں معاشرے میں بحیثیت ایک عورت کے معزز مقام ملنا چاہئے۔ لیکن یہ بیوائیں تنہائی کی زندگی گزارنے پر مجبور کی جاتی ہیں۔ اخبار نے ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کانگڑہ ضلع کے لساپاٹ گاؤں میں چند روز پہلے ایک دل ہلا دینے والا واقعہ پیش آیا' گاؤں کا راکیش کمار نامی نوجوان کارگل میں ہلاک ہوا تھا' اسکی شادی اسی سال مارچ میں ہوئی تھی۔ اس کی نوجوان بیوہ بملا کی عمر صرف بیس برس ہے' اس کے ماتھے پر سیندور موجود ہے۔ وہ سماجی زیادتیوں کا شکار ہو گئی ہے۔ اسے اپنے خاوند کا تابوت شمشان گھاٹ تک پہنچانا پڑا' یہ سارا منظر بقول اخبار تکلیف دہ تھا جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ مرد زار و قطار رو رہے تھے اور بملا اپنی امیدوں کو آگ لگا رہی تھی۔ اخبار کے مطابق یہ صرف ایک بملا کا کیس نہیں' ایسی لاتعداد بدقسمت بیوائیں ہیں جن کے شوہر لڑائی میں مارے گئے۔ اس سے بھارتی سماج کیلئے بہت بڑا مسئلہ پیدا ہو رہا ہے۔ نوجوان لڑکیاں فوجیوں سے بیاہ کرنے سے انکار کرنے لگی ہیں اور عام نوجوان فوجی نوکری سے دور بھاگ رہے ہیں۔ فوج میں بھرتی کیلئے اخبارات اور نشریاتی اداروں سے باضابطہ مہم چلائی گئی' لیکن نوجوان مائل نہیں ہوئے۔ یہ چند نمونے کی خبریں ہیں۔ ورنہ اخبارات ان خبروں سے بھرے ہوئے ہیں۔ سرکاری افسر اور حکمران ہیجان میں مبتلا تھے مگر

Marfat.com

حکومت پاکستان نے سارا منظر بدل ڈالا۔

بھارتی اخبارات نے تیز وتند سرخیاں شائع کیں۔

- ☆ دراندازوں (مجاہدین) کو واپس بلانے پر پاکستان تیار ہوگیا۔
- ☆ کارگل مسئلے پر بین الاقوامی حمایت سے ہندوستان مطمئن۔
- ☆ ملٹری آپریشن جاری رکھا جائے گا۔
- ☆ کشمیر کو بین الاقوامی معاملہ بنانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔
- ☆ تیسرے فریق کی ثالثی تو درکنار دراندازوں کی مکمل واپسی تک پاکستان کے ساتھ بات چیت بھی نہیں ہوگی وغیرہ وغیرہ۔

ایک بھارتی اخبار کے اداریے کی سرخی یہ تھی "Sharif Lost game" واقعی نواز شریف صاحب، ورلڈ کپ کی طرح کشمیر کی جیتی ہوئی جنگ واشنگٹن کی میز پر ہار چکے تھے۔ بھارت کے تن مردہ میں انہوں نے نئی جان ڈال دی تھی۔ بھارتی فوج جن کے حوصلے ٹخنوں سے نیچے نیچے تھے انہیں حوصلہ ملا اور جن لوگوں کے اندر کارگل کے محاذ نے آزادی کی بجلیاں بھر دی تھیں وہ مایوسی کا شکار ہوگئے۔ کشمیری عوام میں بددلی پھیلی۔

سری نگر ریڈیو نے عسکریت کے حوالے سے تبصرہ کرنے چھوڑ دیئے ہیں، لیکن چھ جولائی شام کو اس نے اپنے تبصرے میں کہا "سفارتی محاذ پر زبردست کوششوں کے باوجود پاکستان کوئی کامیابی حاصل نہ کرسکا، بلکہ الگ تھلگ ہو کر رہ گیا۔ پاکستان کے وزیر خارجہ سرتاج عزیز نے دہلی آکر اس سلسلہ میں پہل کرنے کی ناکام کوشش کی لیکن انہیں صاف اور واضح الفاظ میں بتا دیا گیا کہ دراندازوں (مجاہدین) کی واپسی کے بعد ہی مذاکرات کا سلسلہ شروع کیا جاسکتا ہے۔ وزیراعظم پاکستان نے اپنے ایلچی بیرونی ممالک کیلئے روانہ کئے لیکن پاکستان کو کہیں سے بھی حمایت حاصل نہیں ہوئی۔ یورپی یونین کے ممبران بھی اس سلسلہ میں پیچھے نہیں رہے۔ او آئی سی کی وزراء خارجہ کانفرنس نے بھی اس بار بھارت کے خلاف کوئی مذمتی قرارداد پاس نہیں کی بلکہ مسئلہ کشمیر اور کارگل بحران کو بات چیت کے ذریعہ حل کرنے پر زور دیا۔ بہرحال اب جبکہ پاکستان کے کنٹرول لائن کے تقدس کو بحال کرنے اور دراندازوں کو واپس بلانے کی حامی بھر لی ہے۔ امید کی جانی چاہئے کہ برصغیر میں جو جنگ کے بادل منڈلانے لگے تھے وہ چھٹ جائیں گے۔ یہ تبصرہ سن کر کشمیر کے ستم رسیدہ لوگوں پر کیا گزری ہوگی، اس کا اندازہ کم از کم نواز شریف صاحب کو قطعاً نہیں ہوسکتا۔ کشمیری عوام اور پاکستان کے درمیان خلیج پیدا کرنے کی بھارتی میڈیا از حد زور لگا رہا ہے اور اس میں وہ کامیاب ہو رہا ہے۔

یہاں سری نگر میں مجاہد تنظیموں حزب المجاہدین، حرکت المجاہدین، لشکر طیبہ، جمعیت المجاہدین اور البدر مجاہدین وغیرہ نے اس کے خلاف شدید ردعمل کا اظہار کیا اور اسے تحریک آزادی کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے سے تعبیر کیا، تمام مجاہدین تنظیموں نے اس معاہدے کو مسترد کرتے ہوئے جدوجہد جاری رکھنے کا عزم ظاہر کیا ہے۔ کل جماعتی حریت کانفرنس نے بھی کلنٹن نواز معاہدے کو مسترد کردیا۔ 8 جولائی کو چیئرمین سید علی گیلانی کی صدارت میں اجلاس ہوا جس میں کہا گیا کہ مجاہدین نے اپنی زمین آزاد کرالی ہے۔ لہٰذا دنیا کی کوئی طاقت انہیں وہاں سے واپس جانے کو نہیں کہہ سکتی۔" (جہاد کشمیر۔ راولپنڈی)

Marfat.com

''را'' کی پاکستان میں مداخلت

1989ء سے 1999ء تک بھارتی سپریم انٹیلی جنس ایجنسی نے پاکستان میں مداخلت کے ریکارڈ توڑ دیئے یوں لگتا تھا جیسے بھارتی حکومت پاکستان کو (خاکم بدھن) مٹانے پر تلی ہے۔''را'' کا جنم 1962ء میں چین کے ہاتھوں بھارتی فوج کی عبرتناک شکست اور بھارتی انٹیلی جنس آئی کی ناکامی کے بطن سے ہوا تھا لیکن یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس کا سب سے بڑا ہدف پاکستان ہی تھا اور رہے گا۔''را'' نے اپنے قیام اور تنظیم سازی کے فوراً بعد سے اپنے ہزاروں ایجنٹوں' کھربوں روپے کے بجٹ اور بہت بڑی پراپیگنڈہ مشینری کے ساتھ پاکستان کے خلاف بیک وقت تین محاذ کھول رکھے ہیں۔

1- پراپیگنڈہ
2- جاسوسی
3- تخریب کاری

ان تینوں محاذوں پر ''را'' یکسوئی اور تن دہی کے ساتھ مصروف عمل ہے۔ اس گھناؤنے کھیل میں اسے اپنی حکومتوں کی مکمل آشیرواد ہمیشہ سے حاصل رہی ہے۔ بھارت میں یوں تو زیادہ عرصہ مرکز میں کانگریس سرکار ہی رہی ہے لیکن ایک عجیب بات یہ ہے کہ اگر کبھی کانگریس مخالف کوئی حکومت بھی برسراقتدار آئی تو اس نے دیگر تمام معاملات پر اختلاف کیا لیکن پاکستان دشمنی میں کبھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

حکومتوں کی یہی ''کمزوری'' را کی پالیسی میں بنیادی رول ادا کرتی رہی ہے۔''را'' کو اندرونی محاذ پر ایک دور میں جنتا دل حکومت کی معمولی مخالفت کا سامنا ضرور رہا ہے لیکن افسانوی حد تک تو ممکن ہے یہ بات درست رہی ہو تب بھارتی وزیراعظم مرار جی ڈیسائی نے ''را'' کے خلاف پاکستان آپریشن پر تنقید کی ہو لیکن عملاً ایسا ممکن نہیں۔

''را'' کی پاکستان دشمنی کا ایک بدترین نمونہ تو 1971ء کی لڑائی اور بنگلہ دیش کا قیام ہے لیکن اس کے بعد سے آج تک ''را'' نے پاکستان کے خلاف اپنے آپریشنز کی شدت میں اضافہ ہی کیا ہے' کمی نہیں آنے دی۔ حالیہ چند سالوں میں تو ''را'' کی پاکستان دشمن کارروائیاں اپنی حلیف رسوائے زمانہ انٹیلی جنس ایجنسی ''موساد'' کے تعاون سے بہت بڑھ گئی ہیں خصوصاً مقبوضہ کشمیر میں جہاد آزادی نے ''را'' کو پاکستان کے خلاف بہت سیخ پا کر دیا ہے اور ہر آنے والے دن ''را'' پاکستان کے خلاف تخریب کاریوں کا ایک نیا باب کھول رہی ہے۔

پاکستان میں زبان اور نسل کی بنیاد پر منافرت پیدا کرنے میں ''را'' بہت سرگرم دکھائی دیتی ہے خصوصاً پاکستان

Marfat.com

کا صوبہ سندھ اس کی مذموم کارروائیوں کا شکار رہا ہے۔ اشوک رائنا نے اپنی کتاب Inside Raw ''ان سائیڈ'' میں برملا اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ پاکستان کے شمال مغربی صوبہ سرحد میں پختونستان نواز عناصر سے ''را'' کے گہرے روابط استوار رہے ہیں اور اس نے ان ایام میں جب پختونستان نواز عناصر نے کابل میں جلاوطنی اختیار کی ہوئی تھی' ان سے تعلقات مضبوط کئے اور انہیں بے حساب فنڈز مہیا کئے گئے تاکہ پاکستان کے خلاف اور پختونستان کی حق میں اپنا زہریلا پراپیگنڈہ جاری رکھیں۔ ان دنوں ''را'' اور ''خاد'' نے مشترکہ مفادات کے تحت ان باغیوں کو قومی اور بین الاقوامی سطح پر ہر ممکن معاونت بہم پہنچائی۔

پنجاب کے جنوبی حصے میں ''را'' نے سرائیکی تحریک کے تانے بانے بنے اور اس تحریک کو نہ صرف پاکستان میں لاکھوں روپے کی امداد وقتاً فوقتاً پہنچائی گئی بلکہ سرائیکی تحریک کو تقویت بخشنے کیلئے نومبر' دسمبر 1993ء میں دہلی میں ایک ''بین الاقوامی سرائیکی کانفرنس'' کا انعقاد بھی کیا۔ اس نام نہاد کانفرنس میں سرائیکی نواز دانشوروں اور آرٹسٹوں کو مدعو کیا گیا اور سرائیکی صوبے کے حق میں زبردست پرچار رہوا۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ ''را'' کے مستند ایجنٹ سرائیکی نواز بھارتی پروفیسر اور سرائیکی ساھتیا سنگم کے جنرل سیکرٹری چندر بھٹرا نے کچھ عرصہ بعد پاکستان کا دورہ کیا۔ خان پور' رحیم یار خان میں منعقدہ سرائیکی کانفرنس میں زہریلا خطاب کیا۔ مقامی آبادی کو پاکستان کے خلاف بغاوت کر کے سرحدی علاقے میں سرحد کے دوسری طرف موجود سرائیکیوں سے الحاق کی دعوت دی اور اپنا کام کر کے چلتا بنا۔ اخبارات شور مچاتے رہے لیکن ایجنسیوں کے کانوں پر جوں نہیں رینگی۔

مقامی سطح پر حالات و واقعات کی رفتار کے ساتھ ساتھ جنم لینے والی ان تحریکوں کے ساتھ ساتھ ''را'' نے اپنا بنیادی ٹارگٹ سندھ کو بنا رکھا ہے جہاں ایک لمبے عرصے سے اس نے پاکستان کے خلاف ''پراکسی وار'' شروع کر رکھی ہے۔ بدقسمتی سے اپنی تخریبانہ سرگرمیوں کیلئے ''را'' کو سندھ میں بڑی زرخیز زمین میسر آئی ہے۔ سرحدوں کے ساتھ ساتھ موجود بڑی تعداد میں ہندو آبادی کی ہمدردیاں اسے قدرتی طور پر حاصل ہیں۔ ان آبادیوں میں اپنے ''محفوظ مراکز'' قائم کر کے اپنے ہمنوا ہندوؤں کی مدد سے ''را'' کے ایجنٹوں کو سندھ کے اندرونی علاقوں تک آسانی سے رسائی اور تحفظ میسر آ جاتا ہے۔

- ہندو آبادی پر جب بھی کسی شک شبہ کے بعد کوئی انکوائری کیلئے حکومتی ایجنسی ریڈ کرتی ہے تو ''را'' اپنے پروردہ پریس کے ذریعے رائی کا پہاڑ بنا کر کھڑا کر دیتی ہے اور معاملات کو اتنا الجھا دیا جاتا ہے کہ وہ سلامتی کے معاملے سے زیادہ ایک سیاسی مسئلہ بن کر رہ جاتا ہے۔ ایسی متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں کہ جب کبھی پاکستان کی کسی بھی ایجنسی نے سندھ کی ہندو آبادی سے کسی مشتبہ عورت یا مرد کو گرفتار کیا' اس مسئلے کو فوراً مذہبی رنگ دے دیا جاتا ہے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ ہماری نام نہاد ہیومن رائٹس تنظیمیں بھی آسانی سے ''را'' کے اس جال میں پھنستی چلی جا رہی ہیں۔

''را'' نے سندھ کی ہندو آبادی میں بے شمار روپیہ تقسیم کر کے ان لوگوں کو تربیت' اسلحہ اور پراپیگنڈہ کے ہتھیاروں سے لیس کر کے سندھ کو پاکستان سے الگ کرنے کیلئے میدان عمل میں اتارا۔ سندھو دیش تحریک کے ساتھ ہی ''را'' نے ایم کیو ایم کے علیحدگی پسند طبقوں سے بھی روابط استوار کئے اور ان کے ''ملی ٹینٹ ونگ'' کو اپنے تخریب کاری

Marfat.com

کیمپس میں تربیت دی۔ کراچی میں آرمی کی آمد کے بعد سے گرفتار ہونے والے دہشت گردوں کے بیانات نے ''را'' کے اس گھناؤنے کردار سے پردہ اٹھایا۔ (بحوالہ ٹی وی انٹرویوز)

مقامی پریس میں موجود اپنے زرخرید ہمنواؤں کی مدد سے ایک موثر اور مضبوط پراپیگنڈہ مہم کے ساتھ جس میں ''را'' کو پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کی مکمل حمایت حاصل تھی۔ سندھ کے عوام کو ذہنی طور پر پاکستان سے علیحدگی کیلئے تیار کرتی ہیں۔ اس مقصد کے حصول کیلئے ''را'' کی طرف سے وقتاً فوقتاً سیمینارز' لیکچرز کا انعقاد کیا جاتا اور ان سیمینارز کو جو عموماً بھارت یا پھر کسی اور ملک میں ہوتے، پاکستان کے سندھی دانشوروں کو بطور خاص مدعو کیا جاتا جہاں ان کو لذت کام و دھن بہم پہنچا کر اپنے حق میں فضا سازگار کی جاتی۔ سندھی زبان میں ''را'' کی طرف سے لٹریچر ساری دنیا میں تقسیم کیا جاتا ہے جس پر وہ پاکستان کی کسی سندھی تنظیم کا نام لکھ دیتے ہیں۔ سندھی زبان میں ریڈیو نشریات کے ذریعے پاکستان کے خلاف زہریلا پراپیگنڈہ کیا جاتا۔

''را'' نے پاکستانی عوام کو ذہنی پراگندگی کا شکار کرنے کیلئے بڑے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کئے ہیں۔ ''را'' کی طرف سے عموماً اس نوعیت کا پراپیگنڈہ کیا جاتا ہے۔

1- پاکستان کا قیام' دوقومی نظریہ اور ''بھارت ماتا کی تقسیم'' کو الٹے سیدھے دلائل اور موثر پراپیگنڈہ کے ذریعے غلط ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور خصوصاً 1971ء میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد یہ تھیوری سامنے لائی گئی کہ اسلام کا رشتہ کوئی رشتہ نہیں۔ اگر یہ کوئی مضبوط حوالہ ہوتا تو اسلام کے نام پر حاصل کردہ ملک کے دو حصے کیوں ہوتے؟

اس طرح ''را'' کی طرف سے تکرار سے یہ بات دہرائی اور پاکستان میں پھیلائی جاتی ہے کہ اگر ہندوستان متحد رہتا تو مہاجر ہو کر پاکستان میں زندگی بسر کرنے والے موجودہ حالات سے بدرجہا بہتر زندگی بسر کر رہے ہوتے اور اس ''تقسیم'' نے سرحدوں کے آر پار بسنے والے لاکھوں خاندانوں کے مصائب میں اضافہ کیا ہے۔

2- قائداعظمؒ سے اب تک کی تمام پاکستانی لیڈرشپ کو ہدف تنقید بنائے رکھنا ''را'' کا دوسرا بڑا حربہ ہے۔ پاکستانی قوم کو ہمیشہ اپنی لیڈرشپ سے متعلق کنفیوژن کا شکار بنائے رکھنا ''را'' کا مشن ہے۔

3- ایسے نفسیاتی حربے اپنا کر ''را'' نے پاکستانیوں کو جنہوں نے ایک متحدہ قوم بن کر ''نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر'' ہونے کا نعرہ لگا کر اپنے لئے الگ ملک حاصل کر لیا تھا' گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

''را'' نے نفسیاتی محاذ پر بڑی کامیاب جنگ لڑی ہے اور آج پاکستان میں بدقسمتی سے زبان' رنگ و نسل' مذہبی اور سیاسی نظریات' کی بنیاد پر بے شمار جماعتیں اور گروہ معرض وجود میں آ گئے ہیں۔ ''را'' کا مقصد دراصل یہی ہے کہ اس طرح پاکستانی قوم کا شیرازہ بکھیر کر انہیں اپنی لیڈرشپ اور اداروں کی طرف سے مکمل مایوسی کا شکار کر کے بھارت کی طرف راغب ہونے پر مجبور کر دیا جائے۔ اس طرح بھارتی لیڈرشپ کے اس پرانے خواب کو جسے ''اکھنڈ بھارت'' کہا جاتا ہے' پورا کرنے کا سامان خود بخود پیدا ہو جائے گا۔ اس سلسلے میں بھارت کے ٹی وی چینلز بڑا اہم کردار ادا کرتے ہیں اور ہمیں یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ بھارتی ٹی وی چینلز نے پاکستانی نوعمر اور نوجوان نسل کی بڑی تعداد کے ذہنوں کو پراگندہ کر دیا ہے۔

Marfat.com

''را'' کے پراپیگنڈہ کا بنیادی مقصد یہ دکھائی دیتا ہے کہ بھارت کے کسی بھی حصے میں پیش آنے والے کسی بھی حادثے میں آئی ایس آئی (انٹر سروسز انٹیلی جنس) ملوث ہے۔ مقبوضہ کشمیر کی جدوجہد آزادی ہو خالصتان کی تحریک بغاوت' بھارت کی جنوب مشرقی ریاستوں میں موجود باغیانہ اور زیر زمین تحریکیں ہوں' دہلی' بمبئے یا کلکتہ کے بم دھماکے ہوں یا کسانوں مزدوروں اور اقلیتوں کی کوئی احتجاجی تحریک' ''را'' والے اپنے ملک میں پائی جانے والی بے چینی کا ذمہ دار آئی ایس آئی کو گردانتے ہیں۔

اس ضمن میں اپریل 1995ء میں شائع ہونے والا بھارتی فوج کے چیف آف سٹاف جنرل شوری کا یہ بیان محل نظر ہے جس میں انہوں نے بھارت کے جنوب مشرق میں جاری مختلف گوریلا تحریکوں کا ذمہ دار آئی ایس آئی کو قرار دیا۔ مقبوضہ کشمیر' خالصتان تحریک کو آئی ایس آئی کا شاخسانہ بتایا اور حیرت انگیز طور پر یہ الزام بھی داغ دیا کہ ان دنوں بنگلہ دیش کی وزیراعظم محترمہ خالدہ ضیاء جو پاکستان کے دورے پر آئی ہوئی تھیں دراصل آئی ایس آئی سے مدد لینے آئی ہیں کیونکہ وہ چٹا کانگ کی سرحدوں سے بھارت کے خلاف آئی ایس آئی سے آپریشن لانچ کروانا چاہتی ہیں۔ بھارت کی اس قدر ذمہ دار اور اہم شخصیت کی طرف سے ایسا بیان ان کے پراگندہ ذہن کا شکار ہی کہا جائے گا۔ ایل کے ایڈوانی اور بی جے پی کے دوسرے لیڈروں کے بیانات اب معمول کی بات بن چکے ہیں۔

دراصل ''را'' کا مقصد یہ رہا ہے کہ وہ آئی ایس آئی کے خلاف ایک منظم پراپیگنڈہ مہم چلا کر پاکستان کو دنیا کی نظروں میں ایک دہشت گرد ملک ثابت کرے۔

93-1992ء میں ''را'' نے امریکہ اور یورپ میں اس گھناؤنے مقصد کیلئے 20 ملین ڈالر کی رقم مختص کی تھی۔ اس ضمن میں ان دنوں ''را'' کے سربراہ جے ایس بیدی نے اسرائیل' الجزائر' مصر اور اردن کے دورے بھی کئے تا کہ ان ممالک میں ہونے والی ایمرجنسی کو پاکستان کے کھاتے میں ڈال کر ان کی ہمدردیاں بھی حاصل کرے۔ اس میں اسے کسی حد تک کامیابی بھی ہوئی جب مصر اور الجزائر کی طرف سے یہ کہا گیا کہ پاکستان میں موجود عرب مجاہدین ان کے ہاں پائی جانے والی بے چینی کے ذمہ دار ہیں اور اسرائیلی انٹیلی جنس ''موساد'' نے اس سلسلے میں ''را'' کی بھرپور معاونت بھی کی کیونکہ یہودیوں کے مغربی پریس میں تعلقات ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ ''را'' کو کسی حد تک اپنے گھناؤنے مقاصد میں کامیابی بھی حاصل ہوئی جب اس نے پاکستان کو امریکہ کی دہشت گردوں کی ''واچ لسٹ'' میں شامل کروا دیا لیکن بعد میں کوئی ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے پاکستان کو ''واچ لسٹ'' سے نکال دیا گیا۔

1993ء میں ''را'' نے پھر 800 کروڑ روپے پاکستان کو دوبارہ اس ''واچ لسٹ'' میں شامل کروانے کیلئے مختص کئے لیکن مغربی ممالک میں موجود محب وطن پاکستانیوں کی دن رات کی مساعی نے ان کے کئے کرائے پر پانی پھیر دیا اور اسے پھر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

''را'' نے پراپیگنڈہ کے محاذ پر نئی نئی تکنیک ایجاد کی ہیں اور ایک کامیاب حربہ یہ اپنایا ہے کہ ''را'' کی طرف سے بعض اسلامی ممالک اور سنٹرل ایشیائی نو آزاد ریاستوں میں یہ تاثر پھیلایا جا رہا ہے کہ ان کے ہاں پائی جانے والی بنیاد پرستی کے سوتے دراصل پاکستان میں پھوٹتے ہیں۔

Marfat.com

''فنڈامینٹل ازم'' امریکہ اور مغرب کا من پسند موضوع رہا ہے اور بنیاد پرستی کا ہوا ان کے دل و دماغ پر بری طرح سوار ہے' اس لئے ''را'' کو یہاں خاصا ''سافٹ کارنر'' مل جاتا ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ''را'' نے اس ضمن میں پاکستان کے امیج کو بین الاقوامی سطح پر خاصا نقصان پہنچایا ہے۔ پراپیگنڈہ کے محاذ پر اپنی برتری قائم کر کے دراصل ''را'' کا مقصد یہ ہے کہ پاکستان اپنی شناخت برصغیر کے دیگر ممالک جیسے سری لنکا' بھوٹان' نیپال وغیرہ کی طرح کرائے۔ اپنے سیاسی' سماجی' معاشی اور ثقافتی رشتے بھارت سے مضبوط کرنے پر مجبور ہو جائے اور بجائے اپنے قومی تشخص کو نمایاں کرنے کے' جنوبی ایشیا کے دیگر چھوٹے ممالک کی طرح بھارت کے ایک طفیلی ملک کی حیثیت سے زندہ رہے۔ دوسرا اہم مقصد یہ دکھائی دیتا ہے کہ پاکستانی عوام اور حکومت کو یہ باور کروا دیا جائے کہ پاکستان کا کوئی مستقبل نہیں۔ نہ تو یہاں کسی کو انسانی حقوق حاصل ہیں نہ ہی یہاں کا سیاسی کلچر اتنا مضبوط ہے اور جہاں تک ''اداروں'' کا تعلق ہے ان کا سرے سے پاکستان میں وجود ہی دکھائی نہیں دیتا۔ کیونکہ یہاں کی فضا کسی بھی قسم کی سیاسی' معاشی یا ثقافتی نشوونما کیلئے سازگار نہیں۔

کچھ میدانوں میں ''را'' اپنے فن میں ''کمال فن'' کی دعوے دار ہے خصوصاً ہمسایہ ممالک میں توڑ پھوڑ کی سرگرمیاں (تخریب کاری) اس کا خاص میدان ہے اور اسی حوالے سے اس نے پاکستان اور سری لنکا میں خصوصاً بڑے بڑے ''کارنامے'' انجام دیئے ہیں۔ پاکستان میں ''را'' کو ہمیشہ تخریبی عناصر کی تلاش رہی ہے اور کسی بھی حوالے سے تخریبی خیالات رکھنے والے گروہوں اور جماعتوں کو ''را'' کی پشت پناہی حاصل رہی ہے۔ حکومت مخالف عناصر کو ''را'' ''باخبر'' اور ''بے خبر'' رکھ کر دونوں طرح استعمال کرتی ہے۔

کچھ پاکستانی دانشور اور سیاستدان ''را'' کے اکثر مہمان رہتے ہیں ان لوگوں کو مختلف تقاریب کے بہانے بھارت بلا کر ان کے اللے تللے پورے کئے جاتے ہیں اور ''را'' کے مقاصد کی بجا آوری کیلئے تیار کیا جاتا ہے یہ حقیقت کتنی ہی تلخ سہی' لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ پاکستانی میڈیا میں ''را'' کے باقاعدہ ایجنٹ موجود ہیں جو اپنے ''ماسٹرز'' کی فراہم کردہ لائنوں پر اس مضبوط میڈیم کے ذریعے پاکستانیوں کی اعصاب شکستگی میں لگے رہتے ہیں۔

ایک مرحلے پر ''را'' اپنے ان زرخرید دانشوروں اور صحافیوں کو اپنے پروردہ سیاستدانوں سے متعارف کروا دیتی ہے اور انہیں یہ حکم دیا جاتا ہے کہ وہ ان کے خیالات اور بیانات کی خوب تشہیر کریں۔ ان صحافیوں کی رسائی اخبارات تک ہوتی ہے۔ ان کے ذریعے ہر ایسے ادارے اور شخصیت کو مشکوک بنایا جاتا ہے جو محب وطن ہوں۔

پاکستان میں علیحدگی پسند لیڈروں عبدالغفار خان اور ان کے کچھ ساتھی صوبہ سرحد سے سندھ سے جی ایم سید اور ان کے کچھ ساتھیوں کو ''را'' کی مکمل معاونت اور پشت پناہی ہمیشہ حاصل رہی۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ جی ایم سید' عبدالغفار خان اور ان کے ساتھی اپنے دورہ بھارت میں پاکستان کے خلاف کیسی کیسی ہرزہ سرائی کرتے رہے ہیں۔

جی ایم سید کی رسوائے زمانہ کتاب Now Pakistan Should be Disintegrated ''را'' نے راجستھان سے شائع کروا کر پاکستان اور دنیا کے دیگر ممالک میں تقسیم کی تھی۔ اس پراجیکٹ پر ''را'' نے زرکثیر صرف کیا اور اس کو پھیلانے پر بھی خاصا بجٹ صرف ہوا تھا۔ پریس اور پراپیگنڈہ کے ذریعے ''را'' ہمیشہ پاکستانیوں میں ذہنی انتشار پھیلانے' باغیانہ خیالات کو جنم دینے' فرسٹریشن کو بڑھانے خصوصاً ناراض نوجوان نسل کو گمراہ کرنے میں یکسوئی سے جتی رہتی

Marfat.com

ہے۔اس ضمن میں مختلف نوعیت کا لٹریچر شائع کر کے پاکستان میں غیر قانونی طریقے سے بھیجا جاتا ہے۔

بین الاقوامی سطح پر ''را'' نے مختلف ممالک میں سندھ اور مہاجر' پختون' بلوچی' سرائیکی پراپیگنڈہ محاذ بنا رکھے ہیں جن کے ''آفس بیررز'' دکھاوے کیلئے ملک دشمن اور بھگوڑے پاکستانیوں کو ہی دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کیلئے رکھا جاتا ہے لیکن ان کی طنابیں کسی اور کے ہاتھ میں ہوتی ہیں۔ان نام نہاد تنظیموں اور اداروں کی طرف سے پراپیگنڈہ زہریلا لٹریچر' فلمیں اور ہیومن رائٹس رپورٹس شائع کر کے دنیا بھر میں تقسیم کی جاتی ہیں۔

بھارتی پریس' دوردرشن' بھارتی فلمیں اور تمام ایسے بھارت کے ریڈیو سٹیشن جن کی نشریات پاکستان میں سنی جاتی ہیں' پاکستانی عوام کے ذہنوں کو حکومت اور ملکی سالمیت کے خلاف متحرک کرنے کیلئے تسلسل سے مذموم پراپیگنڈہ کرتے آرہے ہیں۔اس سلسلے میں آل انڈیا ریڈیو کی مثال پیش کی جاتی ہے' جس کے بیشتر پروگرام براہ راست ''را'' کے ہیڈکوارٹر لودھی روڈ نیو دہلی کی دوسری منزل پر موجود جدید آلات سے لیس ایک ریکارڈنگ روم میں تیار کئے جاتے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو کے ساٹھ فیصد سے زیادہ ملازمین ''را'' کے ایجنٹ ہیں۔ان کے بیشتر پروڈیوسرز کے نام جعلی ہوتے ہیں اور وہ ہندو ہوتے ہوئے بھی پاکستانی عوام کو دھوکہ دینے کیلئے مسلمانوں والے نام پکارتے ہیں۔

1965ء اور 1971ء کی لڑائیوں میں اور اس کے بعد بھی جب کبھی ''را'' کو ضرورت محسوس ہوتی ہے پاکستان میں موجود اپنے ایجنٹوں کو خفیہ پیغامات اور احکامات آل انڈیا ریڈیو کے پروگراموں سے ''کوڈ'' کی صورت میں جاری کرتے ہیں۔80ء کے عشرے میں سندھ کے سرحدی علاقوں میں ڈاکوؤں کے بھیس میں سرگرم ''را'' کے ایجنٹوں کو آل انڈیا ریڈیو کی رات کی نشریات سے ''پیغامات'' دیئے جاتے تھے بعد میں پاکستان کی کاؤنٹر انٹیلی جنس نے ان ہی پیغامات کو ''ڈی کوڈ'' کر کے بڑے بڑے ڈاکوؤں کو گرفتار بھی کیا جس کے بعد سے یہ معاملہ کچھ ٹھنڈا پڑ گیا۔لیکن اب بھی کراچی میں ہونے والی قتل و غارت گری کیلئے آل انڈیا ریڈیو کے چینل استعمال ہوتے ہیں اور ''مخصوص'' انداز میں ''مخصوص الفاظ'' کے ساتھ ''مخصوص لوگوں'' تک پیغام پہنچا دیا جاتا ہے۔ بھارتی ریڈیو نشریات سے خصوصاً سندھیوں اور مہاجروں میں بددلی اور ملک دشمنی کے بیج بوئے جاتے ہیں۔انہیں یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ وہ پاکستان میں دوسرے درجے کے شہری ہیں اور ان کے ساتھ بے پناہ مظالم ڈھائے جارہے ہیں۔

بدقسمتی سے ''را'' کو اس سلسلے میں دانستہ یا نادانستہ کچھ عاقبت اندیش پاکستانی صحافیوں کی مدد بھی حاصل ہو جاتی ہے۔جن کے ملکی اخبارات میں لکھے کالموں اور مضامین کو ''را'' بطور حوالہ اپنی نشریات میں دہراتی ہے۔سیاسی دشمنی میں اندھے ہو کر کچھ نام نہاد کالم نگار ''را'' کی کٹھ پتلیاں بن چکے ہیں۔انٹیلی جنس کی زبان میں انہیں ''کٹ آؤٹ'' کہا جاتا ہے۔

''را'' کا ایک بہت بڑا اشاعتی مرکز بمبئی میں ہے جہاں سے لٹریچر شائع کر کے سندھ' صوبہ سرحد اور آزاد کشمیر تک غیر قانونی طریقے سے پہنچایا اور تقسیم کیا جاتا ہے۔

لٹریچر' نشریات اور پراپیگنڈے کے دوسرے طریقے اپنا کر ''را'' جن بنیادی اصول ہائے تخریب کاری پر کاربند ہے ان کا تذکرہ تو پہلے ہو چکا ہے۔اس پراپیگنڈہ کا بنیادی مقصد پاکستان میں زبان' رنگ و نسل' مذہبی اور صوبائی سطح پر مختلف

Marfat.com

متشدد گروہوں کی تشکیل اور انہیں اپنے مقاصد کیلئے استعمال کرنا ہے۔

گزشتہ تین چار سال سے ''را'' کی طرف سے جو پراپیگنڈہ مہم پاکستان اور بین الاقوامی دنیا میں چلائی جا رہی ہے اس کے بنیادی مقاصد مندرجہ ذیل دکھائی دیتے ہیں۔

1- مہاجروں کو علیحدہ آزاد ریاست کے قیام کیلئے اکسانا

2- سندھیوں کو ''سندھو دیش'' بنانے کیلئے تیار کرنا۔ بلوچستان میں انتہا پسندوں کو مسلح بغاوت کی راہ دکھانا۔

3- عام پاکستانی اور بین الاقوامی دنیا کو یہ تاثر دینا کہ لاء اینڈ آرڈر کی تباہ کن صورت حال کی وجہ سے کوئی بھی ذریعہ سفر محفوظ نہیں رہا (اس مفروضے کو ''را'' اپنے دہشت گرد ایجنٹوں کے ذریعے ٹرینوں اور بسوں پر حملے کروا کر تقویت بہم پہنچا رہی ہے)۔

4- مقبوضہ کشمیر میں جہاد آزادی کے بعد سے پاکستان اور آزاد کشمیر کے عوام کو یہ تاثر دینا کہ کشمیری پاکستان سے الحاق نہیں چاہتے۔

5- یہ تاثر پیدا کرنا کہ ''سرائیکی تحریک'' نے جنوبی پنجاب میں زور پکڑا ہے اور سرائیکی عوام بھارت کے ساتھ الحاق کر کے الگ ملک بنانے کیلئے کوشاں ہیں۔

6- یہ پراپیگنڈہ کیا جا رہا ہے کہ گلگت اور چترال میں بھی بغاوت کی سی کیفیت پیدا ہو چکی ہے اور یہ علاقے حقوق نہ ملنے کی شاکی رہتے ہیں۔

7- پاکستانی اقلیتوں پر جھوٹے مظالم کا تسلسل سے پرچار کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں جہاں شیعہ سنی تضادات کو ہوا دی جاتی ہے وہاں خصوصاً قادیانیوں اور ذکریوں کو بھی مظلوم بنا کر پیش کیا جا رہا ہے اور یہ تاثر دیا جا رہا ہے کہ وہ ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں۔ انہیں اپنی مذہبی رسومات ادا کرنے سے بزور روکا جاتا ہے۔ عیسائیوں کے ساتھ زیادتیوں کا پراپیگنڈہ تسلسل سے کیا جاتا ہے۔

8- یہ پراپیگنڈہ کیا جا رہا ہے کہ پاکستانی حکومت کے مظالم سے تنگ آ کر سندھ کی ہندو آبادی بھارت کی طرف بھاگ رہی ہے۔ بھارتی شہریت اپنانے والوں کی جعلی تفصیلات جاری کرنا۔

9- بلوچستان میں پاکستانی فوج کے عارضی اور مستقل مراکز بلوچیوں کو کچلنے کیلئے تعمیر کیے جا رہے ہیں۔

10- بلوچستان کے قدرتی وسائل کو بلوچوں کے بجائے دوسرے صوبوں کیلئے استعمال کیا جا رہا ہے۔

11- ''ای'' میل کے ذریعے تخریبی پرچار کر کے نوجوان پاکستانیوں کو گمراہ کیا جا رہا ہے۔

''را'' نے افغان انٹیلی جنس ایجنسی ''خاد'' کے تعاون سے پاکستان میں 90ء کے عشرے میں بہت خطرناک بم دھماکے اور تخریب کاری کی کارروائیاں کروائی تھیں جنکا سلسلہ اب بھی جاری ہے گو کہ اب ''خاد'' کا اس میں عمل دخل نہیں رہا۔ جہاد افغانستان کے دوران ''خاد'' کا بہت سا خفیہ ریکارڈ جو مجاہد تنظیموں کے ہاتھ لگا، سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ان دھماکوں اور قتل و غارت گری کی دہشت ناک وارداتوں میں ''را'' کے ساتھ اس کا مکمل تعاون موجود تھا۔ ''را''

Marfat.com

کے بہت سے دہشت گرد رنگے ہاتھوں بھی پکڑے گئے تھے جوانکے تفتیشی بیانوں سے حاصل کی گئی ہیں۔ نومبر 1984ء میں مسز اندرا گاندھی کی اپنے سکھ گارڈز کے ہاتھوں ہلاکت کے بعد بھارت کی سپریم انٹیلی جنس ایجنسی ''را'' نے بھارتی وزیراعظم مسٹر راجیو گاندھی کے دل ودماغ میں یہ بات راسخ کردی تھی کہ انکی پوجیا ماتاجی کو آئی ایس آئی نے ایک خطرناک سازش کے ذریعے ہلاک کروایا ہے اوراس ''معصومانہ آپریشن'' کو اتنی ہوشیاری سے ترتیب دیا ہے کہ پاکستانی انٹیلی جنس ایجنسی کی براہ راست شمولیت کا کوئی ثبوت ہی باقی نہ رہے اور یہ سمجھا جائے کہ یہ قتل ان دونوں سکھوں کا ذاتی فعل تھا۔ ''را'' کی تعمیر اور تکمیل میں چونکہ مسز اندرا گاندھی کی ذاتی کوششوں کو زیادہ عمل دخل رہا ہے۔ اس سے پہلے بھارتی انٹیلی جنس ایجنسی آئی بی کے کرتا دھرتا بی این ملک کو جواہر لال نہرو کی مکمل آشیر باد حاصل رہی تھی۔ اس طرح بھارت کے انٹیلی جنس نیٹ ورک کو بنانے اور اس سے خصوصی تعلقات استوار کرنے کے حوالے سے نہرو خاندان کو خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے۔

''را'' کے پہلے ڈائریکٹر جنرل آر این کاؤ مسز اندرا گاندھی سے اپنے خصوصی تعلقات کیلئے شہرت رکھتے تھے یہی وجہ تھی کہ کانگرس سے ''را'' کے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے جبکہ مرار جی ڈیسائی کے زمانے میں ''را'' کی سرگرمیاں کافی دب گئیں کیونکہ انہوں نے ''را'' کو شتر بے مہار کی طرح اپنے ہمسایہ ممالک کی سلامتی سے کھیلنے کی اجازت دینے سے انکار کردیا تھا جبکہ مسز اندرا گاندھی کے دوبارہ برسراقتدار آتے ہی ''را'' کے گویا پھر سے تن مردہ میں جان پیدا ہوگئی۔ مسز اندرا گاندھی کے اس دور حکومت میں ''را'' نے مشرقی پنجاب میں شورش برپا کر کے سکھوں کو اشتعال دلایا اور دربار صاحب پر بھارتی فوج کے حملے کا جواز پیدا کردیا تاکہ کانگرس کی جھولی میں ہندو ووٹ پکے ہوئے پھل کی طرح گر پڑیں۔

''را'' کی یہ سازش کامیاب رہی لیکن مسز اندرا گاندھی کو دوبارہ اقتدار کی بجائے موت نصیب ہوئی اور ان کی اس بھینٹ کا سارا لابھ ان کے صاحبزادے نے اٹھایا جو سیاست میں نووارد ہونے کے باوجود ملک کے سب سے بڑے منصب پر فائز ہوگئے۔

''را'' کے پاس ماضی میں مرار جی ڈیسائی کا بھیانک تجربہ موجود تھا اس خطرے کو ذہن میں رکھتے ہوئے انہوں نے مسز اندرا گاندھی کے صاحبزادے کو شروع ہی سے قابو کرلیا اور ان کے ذہن میں پاکستان دشمنی راسخ ہوتی گئی۔ راجیو گاندھی چونکہ ماضی میں پائلٹ رہے تھے انکی طبعیت یوں بھی ایڈونچر پسند تھی اور وہ اپنی آنجہانی ماتا کی طرح کوئی بڑا کارنامہ انجام دینا چاہتے تھے۔ ان کی ماتا جی نے تو مشرقی پاکستان کو منتخب کیا تھا' بیٹا ماں سے دو ہاتھ آگے نکلا اور اس کی نگاہ انتخاب پاکستان کی اقتصادی شہ رگ سندھ پر پڑی۔ راجیو گاندھی نے ''را'' کو سندھ میں مداخلت کیلئے ''فری ہینڈ'' دے دیا۔ جس نے اپنی مذموم کارروائیوں کا آغاز زہریلے پراپیگنڈے سے کیا اور لٹریچر اور ریڈیو کے ذریعے سندھو دیش' سندھ رائزز' سندھ سوجھاگ' سانا سنگت اور باگولی کے نام نہاد لٹریچر اور ریڈیائی پراپیگنڈے کا آغاز کردیا۔ ہزاروں کی تعداد میں سندھ میں پمفلٹ' کتابیں اور رسالے تقسیم ہونے لگے اور اس ضمن میں 1987ء سے 1989ء تک پہلے دہلی اور پھر گجرات میں شاہ لطیف کانفرنس اور سندھی سمیلن نام کی دو کانفرنسیں کی گئیں جن میں سے پہلی میں جی ایم سید نے بہ نفس نفیس اور دوسری میں ان کے رفقاء نے بھرپور شرکت کی۔ یہاں بڑی شدت سے سندھو دیش کا پراپیگنڈہ کیا گیا۔

Marfat.com

سپیشل سروس بیورو (ایس ایس بی) تشکیل دیا گیا اور باوثوق ذرائع سے ملنے والی اطلاعات کے مطابق ''ایس ایس آئی'' نے پاکستان سے ملنے والی راجستھان کی سرحد پر 8 تربیتی کیمپ گنگا نگر' بے پور' اودھم پور' کشن گڑھ' بارمر' جیسلمیر اور چندی گڑھ میں قائم کئے ہوئے ہیں جبکہ ''را'' نے بھارت کے مختلف صوبوں میں تخریب کاروں کی تربیت کیلئے 36 کیمپ بنائے ہوئے ہیں۔ راجستھان کی سرحد پر واقع تخریبی کیمپوں میں سارا سال دہشت گردوں کی تربیت جاری رہتی ہے۔

1987ء تا 1989ء تین سال کے اعداد و شمار کے مطابق ان کیمپوں سے فارغ ہونے والے تخریب کاروں نے 150 سے زیادہ وارداتوں میں 300 سے زائد سیاسی ورکروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ان ہی کیمپوں سے فارغ ہونے والے تخریب کاروں نے پاکستان کے انتہائی حساس نوعیت کے مقامات پر بھی دھماکے کئے جن میں سوئی پائپ لائن' آئل ریفائنری' ٹرینیں' سویلین اور آرمی کے جہاز بھی شامل ہیں۔ 1986ء سے 1990ء تک ''را'' کی سندھ میں تخریبی سرگرمیاں اپنی نقطہ عروج کو چھو رہی تھیں کیونکہ اس دوران ''را'' کو افغان انٹیلی جنس ایجنسی ''خاد'' اور ''کے جی بی'' کی مدد بھی حاصل تھی اور اس درمیان بیشتر تخریب کاری آپریشن مشترکہ تھے۔ اس دوران 1600 بم دھماکے کئے گئے جن میں ایک ہزار سے زائد بے گناہوں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے اور 3800 سے زیادہ شہری زخمی اور معذور ہو گئے۔

''را'' کو ماضی کی ''کے جی بی'' سے بھی زیادہ اختیارات حاصل ہیں۔ دراصل پاکستان میں بیک وقت تین بھارتی انٹیلی جنس ایجنسیاں کام کرتی ہیں۔ ڈائریکٹوریٹ آف ملٹری انٹیلی جنس' ڈی بی آئی' ''را'' بارڈ سکیورٹی فورسز انٹیلی جنس بی ایس ایف۔ ایک لحاظ سے ڈی بی آئی' سی بی ایس ایف سے زیادہ بہتر نتائج حاصل کرتی ہے کیونکہ اس کی 50 بٹالین نفری پاکستانی سرحدوں کے ساتھ ساتھ مورچہ بند ہے اور دن رات اس کا واسطہ سرحدی معاملات ہی سے رہتا ہے لیکن ''را'' کو ان دونوں پر برتری حاصل ہے کیونکہ وہ پاکستان کے سیاسی' معاشی' دفاعی' سماجی' لسانی' سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں مداخلت کرتی ہے اور اس نے ہر جگہ اپنے جاسوسوں کا جال بچھا رکھا ہے۔ اپنے ہزاروں ایجنٹوں کو پاکستان خصوصاً سندھ میں داخل کرنا اس کا معمول بن چکا ہے۔

''را'' نے بھارتی حکومت پر مسلسل دباؤ ڈالا ہوا ہے کہ وہ سندھ پر براہ راست حملہ کر کے مشرقی پنجاب میں پاکستان کی نام نہاد مداخلت کا بدلہ چکائے اور مسز اندرا گاندھی کی موت کا بدلہ لے۔ ''را'' کی پاکستان دشمنی کا یہ عالم ہے کہ وہ پاکستان انٹیلی جنس ایجنسی آئی ایس آئی کو نہ صرف پنجاب میں شورش اور مسز اندرا گاندھی کے قتل کا ذمہ دار گردانتی ہے بلکہ 1986ء میں مسٹر راجیو گاندھی کے تامل ٹائیگرز کے ہاتھوں ہونے والے قتل کا ''ماسٹر مائنڈ'' بھی آئی ایس آئی کو سمجھتی ہے۔ ''را'' کی اس ڈس انفارمیشن مہم نے راجیو گاندھی کو اتنا برافروختہ کیا کہ 1983ء میں اس نے سندھ میں ایک بڑے اور تباہ کن آپریشن کی اجازت دے دی اور راجستھان کی سرحدوں پر حالت جنگ میں فوجوں کو لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ اسی طرح 1986ء اور 1987ء میں ''براس ٹیک'' جنگی مشقوں کی آڑ میں بھی دراصل پاکستان کے خلاف جارحانہ حملے کی مکمل تیاری ہو چکی تھی۔ یہ الگ بات کہ پاکستان کی دفاعی حکمت عملی نے بھارتی جرنیلوں کے ارمانوں پر اوس ڈال دی اور انہیں بالآخر دنیا کی سب سے بڑی جنگی مشق ''نتائج کے حصول'' کے بغیر ہی ختم کرنی پڑی۔

سندھ کے معاملے پر اپنی حکومت کو اشتعال دلاتے رہنا اب ''را'' کی مجبوری بن چکی ہے کیونکہ اس نے

Marfat.com

ہزاروں تخریب کاروں کو دہشت گردوں' ڈاکوؤں اور جاسوسوں کے روپ میں پاکستان کے اس صوبے میں بڑی محنت سے داخل کیا جبکہ نتائج اس کی مرضی کے مطابق حاصل نہیں ہوئے۔''را'' نے اپنے تئیں دراصل یہ مفروضہ قائم کرلیا ہے کہ اندرون سندھ علیحدگی پسند قوتوں' اپنے ایجنٹوں اور بھارتی حکومت کے چھوٹے سے فوجی حملے کے ساتھ وہ پاکستان کی اس اقتصادی شہ رگ کو کاٹ کر الگ کردے گی جس کے بعد اس کا سارا جسم خود ہی اپنی موت مرجائے گا۔ 1983ء میں ''را'' نے سندھ میں لسانی فسادات کا بھرپور آغاز کیا تھا اور یہ سلسلہ ہنوز کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے۔ راجیوگاندھی کی طرف سے ''را'' کو یہ فریضہ سونپا گیا تھا کہ وہ سندھ میں فسادات کی ہنڈیا کو گرم رکھیں تا کہ جب کبھی کوئی بین الاقوامی صورت حال بھارت کے حق میں ہو' سندھ کے اندر موجود علیحدگی پسند تخریب کار قوتیں بھارتی فوج کی پشت پناہی سے انقلاب لائیں اور بنگلہ دیش کی طرح سندھ کو بھی علیحدہ ملک بنادیا جائے۔ اس مقصد کیلئے ''را'' نے ہزاروں ایجنٹوں کو پاکستان میں داخل کیا جن میں سے کئی مارے گئے اور سینکڑوں اب بھی پاکستانی جیلوں میں سزائیں بھگت رہے ہیں۔

اس صورت حال پر مشہور بھارتی مصنف روی راکھی نے اپنی کتاب ''دی وار دیٹ نیور واز'' میں برملا اقرار کیا ہے۔ ''ہم نے ان لوگوں کی حفاظت سے منہ موڑ لیا جو بھارت ماتا کیلئے لڑ رہے تھے۔ سینکڑوں کی تعداد میں ''را'' کے بھیجے ہوئے بھارتی نژاد ایجنٹ جو سندھ میں تخریب کاری کے ذریعے آزاد ملک کے قیام کیلئے کوشاں تھے' آج پاکستانی جیلوں میں ایڑیاں رگڑ رہے ہیں اور بھارتی حکومت کو انکی بالکل پرواہ نہیں۔''

''را'' اور بھارت کی دیگر انٹیلی جنس ایجنسیوں کے نزدیک سندھ کی حیثیت نرم گوشت کی سی ہے جسے وہ آسانی سے ہڑپ کرسکتی ہیں۔ سندھ خصوصاً کراچی اور حیدرآباد میں لاء اینڈ آرڈر کی تباہ کن صورت حال کو بھارتی انٹیلی جنس ایجنسیاں للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی ہیں۔ ان کی رال ٹپک رہی ہے۔ سندھ کی موجودہ صورت حال میں بھارتی پراپیگنڈہ کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ آل انڈیا ریڈیو کی سندھی سروسز کا دائرہ کار بڑی کامیابی سے سندھ کے کم تعلیم یافتہ اور ان پڑھ طبقے میں ملک دشمنی کے زہریلے جراثیم پھیلا رہا ہے۔ ریڈیو پاکستان کے مذہبی پروگراموں کے مقابلے میں آل انڈیا ریڈیو کے رنگ برنگ پروگراموں کے سامعین کی تعداد بہت زیادہ تھی۔

سندھ کے دیہی علاقے ڈاکوؤں' اغواکاروں' ڈرگ اور اسلحہ مافیا کی گرفت میں جکڑے رہے۔ ان لوگوں کو ''را'' کی تربیت کے ساتھ ساتھ چند مقامی وڈیروں اور جرائم پیشہ سرداروں کی پشت پناہی بھی حاصل تھی۔ یہی سبب ہے کہ وہ لاڑکانہ سے پی آئی اے کے مسافروں کی ویگن کو اغوا کرتے اور تعاقب پر بھی کچھ ہاتھ نہیں آتا تھا۔ کیا ان لوگوں کو زمین نگل جاتی تھی یا آسمان اچک لیتا افسوس ایسا کچھ نہیں۔ مقامی کارندے انکے مددگار تھے اور انہیں ہر دو کلومیٹر کے فاصلے پر چھپنے کیلئے جگہ میسر تھی۔

1989ء میں سیکرٹریوں کی میٹنگ میں حکومت پاکستان نے بھارتی حکومت کو اسکے ڈپلومیٹس کی کراچی میں تخریبی سرگرمیوں کے ثبوت فراہم کیے لیکن بھارتی حکومت کے کان پر جوں تک نہیں رینگی جس پر حکومت کو بادل نخواستہ انڈین قونصلیٹ بند کرانا پڑا۔ ''را'' نے پاکستان کے اس جائز حفاظتی اقدام کو بھی اپنے حق میں استعمال کیا اور کراچی اور حیدرآباد کے مہاجر بھائیوں میں یہ زہریلا پراپیگنڈہ کیا گیا کہ محض ان کیلئے مشکلات پیدا کرنے اور انہیں بھارت میں موجود

Marfat.com

اپنے رشتہ داروں سے ملاقات سے روکنے کیلئے پاکستان نے کراچی قونصلیٹ بند کیا ہے۔

پاکستانی حکومت کے اطلاعات کے مطابق جولائی 1987ء سے 25 جولائی 1991ء تک ''را'' کے تربیت یافتہ تخریب کاروں کے ہاتھوں سندھ میں 140 بے گناہ مارے گئے اور 697 زخمی ہوئے تھے۔ پاکستانی حکومت کا دعویٰ ہے کہ کراچی اور اسلام آباد میں بھارتی ڈپلومیٹس کا ان تخریب کاروں سے براہ راست رابطہ رہتا۔ اس ضمن میں کراچی میں بھارتی قونصلیٹ کے بی شرما کو پاکستان ائرفورس کے ایک کارپورل کے ساتھ معاملات طے کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں گرفتار کیا گیا۔ شرما کی بیدخلی کے بعد کراچی کے قونصلیٹ آئی کے رینا نے اس کی جگہ سنبھالی اور شرما کے ''لنکس'' سے ناطہ جوڑا اور اب یہ سلسلہ یہاں سے اسلام آباد منتقل ہو چکا ہے۔

''را'' میں موجود بھارتی فوج کے ماہرین پاکستان کے خلاف تباہ کن کارروائیوں میں ہر وقت مصروف رہتے ہیں۔ 30 ستمبر 1988ء کو حیدرآباد میں ہونے والے قتل عام کے جو مجرم گرفتار ہوئے انہوں نے انکشاف کیا تھا کہ ایک ہی وقت میں بہت سی ہٹ ٹیمیں ''را'' نے میدان میں اتاری تھیں جنہوں نے پہلے سے مقرر کردہ اہداف پر پہنچ کر اندھا دھند فائرنگ کی اور مقرر کردہ راستوں پر فرار ہو گئے۔ ان مجرموں کے فرار کیلئے ''را'' نے ڈاکوؤں میں اپنے ایجنٹوں کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں جن کو مختلف گروپوں کی صورت میں فرار ہونا تھا۔ ڈاکو اپنے ''ہائیڈ آؤٹس'' خفیہ ٹھکانوں پر اپنا کام کر کے چھپ گئے۔ کچھ گروپس دیہاتی علاقوں میں غائب ہو گئے اور کچھ لیڈر قسم کے ''را'' کے ایجنٹ سرحد عبور کر کے بھارت پہنچ گئے۔

بہت سے ایجنٹ جو بعد میں گرفتار ہوئے جنہیں ''را'' کے ایجنٹوں نے سندھ سے بھرتی کیا تھا' نے پاکستانی سکیورٹی ایجنسیوں کو بتایا کہ انہیں بطور خاص ہدایت ملی تھی کہ خطرے کی صورت میں بلا جھجک سرحد عبور کر کے بھارت چلے جائیں جہاں انہیں پناہ اور دیگر سہولیات ملیں گی۔ مگسی بھی سیدھا بھارت پہنچا تھا جہاں اس کا شایان شان استقبال ہوا اور اسے ''سن'' میں ایک پریس کانفرنس میں شرکت کیلئے بطور خاص پاکستان میں بھیجا گیا جہاں وہ بیان دے کر پھر غائب ہو گیا اور بعد میں راجستھان میں واقع ایک تخریبی کیمپ کا مگسی بہت دیر تک انچارج رہا جہاں وہ سندھی نوجوانوں کو دہشت گردی کی تربیت ''را'' کے زیر سایہ دلایا کرتا تھا۔

سندھ میں کی جانے والی دہشت گردی کے پس پردہ بھارت کے بڑے بڑے مقاصد کچھ اس طرح ہیں:

1- بھارتی انٹیلی جنس سمجھتی ہے کہ پاکستان نے مشرقی پنجاب اور مقبوضہ کشمیر میں حریت پسندوں کی پشت پناہی کی ہے اور ''را'' اپنی دانست میں سندھ میں ''آئی ایس آئی'' کو اس طرح کاؤنٹر کر رہی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ''سندھ کارڈ'' کو استعمال کر کے پاکستانی انٹیلی جنس ایجنسی کو ممکنہ مداخلت سے روکا جا سکتا ہے۔

2- ''را'' سندھی عوام کی ہمدردیاں حاصل کر نے انہیں ایکسپلائٹ کرنا چاہتی ہے تاکہ نوجوانوں کو گمراہ کر کے ''سندھو دیش'' کی راہ ہموار کرے۔ سندھیوں میں مہاجروں کے خلاف نفرت پیدا کر کے لسانی فسادات کی راہ ہموار کی جاتی ہے تاکہ مطلوبہ نتائج حاصل ہو سکیں۔

3- 1983ء میں مسز اندرا گاندھی کی سربراہی میں ''سندھی سملین'' کیا گیا جس کا مقصد علاقائی منافرت کو ہوا دے کر

Marfat.com

''سندھودیش'' کے نام پر ایک الگ ملک کیلئے جدوجہد کی ترغیب دینا اور ''پاکستانی مہمانوں'' کو یقین دہانی کرواتا تھا کہ انہیں اس سلسلے میں تمام ممکنہ سہولیات بہم پہنچائی جائیں گی۔ بھارتی وزیراعظم کی سملین میں صدارت ایک طرح سے ضمانت کی حیثیت رکھتی تھی۔

4- جولائی 1987ء جی ایم سید نے بمبئے اور دہلی کا دورہ کیا جہاں اس کی خفیہ ملاقاتیں وزیراعظم مسز اندرا گاندھی ''را'' کی اعلیٰ قیادت اور مسٹر منی شنکر آئر جو ان دنوں مسز اندرا گاندھی کا کلچرل سیکرٹری اور ایک سابقہ قونصل جنرل کراچی تھا' سے کرائی گئیں جہاں سندھ میں بغاوت کیلئے ایک باقاعدہ منصوبہ تیار کیا گیا جس کی بنیاد نسلی فسادات پر رکھی گئی تھی جس پر پھر مرحلہ وار عمل بھی شروع ہوگیا۔ بھارتی میڈیا نے ''را'' کی ہدایت پر جی ایم سید کو زیادہ کوریج دینی شروع کی جس کے بعد اکتوبر 1987ء میں شاہ لطیف کانفرنس اور نومبر 87ء میں آل انڈیا سندھی سملین دہلی میں بھی جی ایم سید نے سرکاری پروٹوکول کے ساتھ شرکت کی۔

5- جی ایم سید کی پراپیگنڈہ مہم کے ساتھ ساتھ ''جئے سندھ محاذ'' کے ملی ٹینٹ ونگ کے ساتھ ''را'' کے تعلقات مضبوط ہوگئے۔ انہیں مالی امداد' اسلحہ' تربیت دے کر پاکستان کے خلاف سرگرم کیا گیا۔ خفیہ راستے اپنائے گئے جہاں سے سرحد کے دونوں اطراف آمدورفت کو ممکن بنایا جائے۔ ان نوجوانوں کو بہلا پھسلا کر ''را'' کے پنجے میں پھنسانے کیلئے کالیاں' اولہاس نگر نزد بمبئے میں خفیہ کیمپ قائم کئے گئے جبکہ تخریب کاری کی تربیت کیلئے انہیں راجستھان میں چوٹان ڈسٹرکٹ بارمیر بھیجا جاتا تھا۔

6- ''را'' نے سندھ نیشنل الائنس (ایس این اے) کو جی ایم سید کی کمان میں متحد کیا جسے سندھودیش تحریک میں بھارتی سنگ میل کی حیثیت دیتے تھے۔ ایس این اے کے قیام پر ''را'' نے دبئی میں اپنے خصوصی ایجنٹ مسٹر سووالنی اور مسٹر پرکاش کے ذریعے خصوصی مبارکباد کے پیغامات دیئے۔ دونوں ہندو سندھیوں نے پراپیگنڈہ مہم کو سنبھالا اور کراچی کے ڈپلومیٹس حلقے میں جی ایس سید کو ''خصوصی حیثیت'' سے متعارف کروایا تھا۔

7- خاتون لیڈر نے جولائی تا ستمبر 1988ء میں لندن کا دورہ کیا تو ''را'' نے اپنا ایک خصوصی ڈیلی گیٹ ان سے اخلاقی اور معاشی امداد کی تفصیلات طے کرنے کیلئے دہلی سے لندن روانہ کیا جس نے خاتون لیڈر کے ساتھ تمام تفصیلات طے کیں اور اس کی وطن واپسی پر بھارتی ڈپلومیٹس بی ڈی شرما' منی لال ترپاٹھی نے خاتون سے مستقل رابطہ رکھا اور انہیں طے شدہ معاہدے کے مطابق ہر طرح امداد بہم پہنچاتے رہے۔

8- سانحہ بہاولپور کے فوراً بعد بھارتی قونصل بی ڈی شرما نے ''سن'' میں جی ایم سید سے تازہ صورت حال میں نئی حکمت عملی پر تبادلہ خیال کیا۔ ستمبر 1988ء میں ''را'' کے دو ایجنٹوں پروفیسر اشوک کمار اور مرلی دھر موٹوانی نے ''سن'' میں جی ایم سید کی ''تیمارداری'' کی اور نومبر 1988ء میں آمدہ الیکشن پر حکمت عملی پر بات چیت ہوئی جہاں ایس این 71 کے پلیٹ فارم سے سندھودیش کیلئے الیکشن لڑنے کا فیصلہ ہوا۔

9- دسمبر 1987ء میں بہت سے ہندو جو پہلے لسانی فسادات کی وجہ سے بھارت چلے گئے تھے' دوبارہ پاکستان میں آباد ہوگئے۔ اس سلسلے میں بھارت کے ہوم ڈیپارٹمنٹ نے 30 ہندوؤں کیلئے بطور خاص پاکستان کے ہوم ڈیپارٹمنٹ

Marfat.com

سندھ سے درخواست کی کہ انہیں دوبارہ آبادکاری میں مدد دی جائے۔ یہی لوگ بعد میں ''را'' کے ایجنٹ ثابت ہوئے۔

-10 آل انڈیا ریڈیو کے سندھی پروگراموں کا دورانیہ بڑھنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی سندھی لٹریچر کی آمد بھی بڑھی۔ بمبئے اور گجرات سے دھڑا دھڑ کتابیں، پمفلٹ، رسالے چھپ کر سمگل ہو کر سندھ میں تقسیم ہونے لگے۔ پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ پراجیکٹ ''را'' کے زیرِ نگرانی چل رہا تھا۔

-11 سندھ کے مختلف علاقوں میں لسانی اور نسلی منافرت بھڑکا کر زیادہ سے زیادہ جانی اور مالی نقصان کروانا ''را'' کا مقصود رہا ہے۔ حال ہی میں گرفتار ہونے والے ''پاکستانی دہشت گردوں'' نے اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ انہیں بھارتی کیمپوں میں تربیت دی گئی تھی۔

-12 بھارتی سرحدوں سے بہاریوں کی پاکستان آمد بھی خطرے میں پڑ گئی ہے۔ ان میں ''را'' اپنے ایجنٹوں کو بھی داخل کر دیتی ہے۔ جو بظاہر جذبہ ترحم کا فائدہ اٹھا کر پاکستان کی شہریت حاصل کر لیتے ہیں۔ (یہ معلومات طارق اسمٰعیل ساگر کی کتاب RAW سے حاصل کی گئیں)

2000ء سے اب تک ''را'' نے بلوچستان کو اپنا ہدف بنا رکھا ہے۔ بلوچ نوجوانوں کو گمراہ کرنے کے لیے وہی حکمت عملی اپنائی جا رہی ہے جو سندھ میں اپنائی گئی تھی۔ اس مرتبہ بھی ''را'' کو افغانستان میں پناہ گاہیں میسر ہیں جہاں سے وہ بلوچستان میں اسلحہ، روپیہ اور پراپیگنڈہ سمگل کر رہے ہیں۔ حکومت پاکستان کی طرف سے سرکاری سطح پر متعدد مرتبہ عالمی توجہ بھارت کی اس زیادتی کی طرف دلائی گئی ہے۔ بلوچ لبریشن آرمی اور دیگر مسلح گروپ جو بلوچستان میں مسائل کھڑے کر رہے ہیں انہیں ''را'' کی پشت پناہی حاصل ہے۔

Marfat.com

2000ءتا2006ء

بھارتی طیارے کے اغوا نے بھارت کو مظلوم بنا دیا امریکہ حسب روایت بھارت کا ساتھی بن گیا۔ امریکہ اور بھارت کے مابین ایک نیا معاہدہ ہوا جس کی رو سے طے پایا کہ دہشت گردی کا مقابلہ کرنے کیلئے دونوں ممالک وسیع پیمانے پر تعاون کریں گے۔ انٹیلی جنس کا ایک مشترکہ نظام قائم کریں گے اور وقت ضرورت دہشت گردوں کے خلاف کارروائی میں ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔ اس معاہدے کو اسرائیل کی بھی حمایت حاصل ہے۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ دہشت گردوں پر نظر رکھنے میں اسرائیلی انٹیلی جنس مدد کرتی رہے گی اور ممکنہ کارروائی میں اسرائیلی کمانڈوز کی خدمات بھی مہیا کی جائیں گی۔ امریکہ اور بھارت کے مابین متذکرہ معاہدے کے بعد امریکی ذرائع ابلاغ نے خبر دی کہ افغانستان کے طالبان پر ایک اور میزائل حملے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔

رپورٹوں میں بتایا گیا تھا کہ کرسمس کی چھٹیوں کے بعد حملہ کر دیا جائے گا۔ 24 دسمبر 1999ء کو نیپال کے دارالحکومت کٹھمنڈو سے پرواز کرنے والا انڈین ایئر لائنز کا مسافر بردار طیارہ جب ہائی جیک کر لیا گیا اور اسے قندھار پہنچا دیا گیا تو طالبان کی حکومت کو یقین ہو گیا کہ ہائی جیکنگ کا ڈرامہ امریکی میزائل حملے کا جواز بنانے کی خاطر کھیلا گیا ہے۔ طالبان نے اپنا ریکارڈ درست رکھنے کیلئے ہائی جیکنگ کی مذمت کی۔ مسافروں کو ہائی جیکروں کی قید سے ممکنہ تعاون کی پیشکش کی اور ہائی جیکروں کو خبردار کیا کہ اگر مسافروں کو ہلاک کرنے کا سلسلہ شروع کرنے کی دھمکی پر عمل کیا گیا تو طالبان طیارے پر دھاوا بول دیں گے اور مسافروں کو رہا کرا لیں گے۔ اس تنبیہ کا اثر یہ ہوا کہ ہائی جیکروں نے ہندوستانی حکومت کے نمائندوں کے ساتھ مذاکرات کیلئے مقرر کی ہوئی مدت میں غیر محدود توسیع کر دی۔ طیارہ 24 دسمبر کی سہ پہر ہائی جیک کیا گیا تھا۔ ہندوستانی وفد 27 دسمبر کی شام قندھار پہنچا۔ تاخیر کی وجہ یہ ہوئی کہ نئی دہلی میں اس سوال پر بحث چل رہی تھی کہ ہائی جیکروں کے مطالبات قبول کیے جائیں یا نہیں۔ ہندوستانی وزیر اعظم اور وزیر خارجہ روز اول ہی اعلان کر چکے تھے کہ ان مجاہدین کو رہا نہیں کیا جائے گا جن کی رہائی کا ہائی جیکروں نے مطالبہ کیا ہے۔ اپوزیشن کی سب سے بڑی پارٹی کانگرس کی ہائی کمان نے وزیر اعظم واجپائی کی درخواست پر ہائی جیکروں کے مطالبات کی منظوری یا نامنظوری کے مضمرات کا جائزہ لینے کے بعد وزیر اعظم کو یہ پیغام دیا کہ کانگرس کوئی حتمی رائے دینا مناسب نہیں سمجھتی اور چاہتی ہے کہ ہندوستان کے وسیع تر مفاد کو ملحوظ رکھ کر خود حکومت کوئی فیصلہ کرے۔ نئی دہلی نے واشنگٹن سے استفسار کیا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے؟

کرسمس کے جشن کا خمار اترنے کے بعد 27 دسمبر کو امریکی انتظامیہ نے ایک مختصر تبصرے میں کہا کہ وہ ہائی جیکنگ کی پرزور مذمت کرتی ہے۔ 28 دسمبر کی صبح نئی دہلی میں امریکی سفارتکاروں نے ہندوستانی ارباب عقد و حل کے ساتھ ملاقاتوں کے بعد ذرائع ابلاغ کے نمائندوں سے بات چیت کرتے ہوئے الزام لگایا کہ پاکستان سرحد پار سے ہندوستان میں دہشت گردی کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے جس پر امریکہ کو گہری تشویش ہے۔ امریکی موقف کھل کر سامنے آ

Marfat.com

جانے کے بعد وزیراعظم واجپائی نے مسلح افواج کے سربراہوں کو طلب کیا۔ اس کانفرنس میں ہندوستانی وزیر دفاع وزیر خارجہ اور اسٹیبلشمنٹ کے نمائندے بھی شریک تھے۔ کانفرنس دو گھنٹے تک جاری رہی۔ کانفرنس کے دوران سرینگر سے خبر آئی کہ فوجی چھاؤنی میں واقع دہشت گردی کا مقابلہ کرنے والی ٹاسک فورس کے ہیڈکوارٹر میں مسلح مجاہدین کا ایک گروپ 27 دسمبر کو دوپہر داخل ہوگیا تھا۔ ان مجاہدین کے ہاتھوں ٹاسک فورس کے کئی افسر اور جوان مارے جاچکے ہیں۔ ہیڈکوارٹر کے اندر لڑائی جاری ہے۔

زی ٹی وی نے 28 دسمبر کو صبح سرینگر کے ہیڈکوارٹر میں جاری فائرنگ کی آوازیں سنائیں۔ ہیڈکوارٹر کی عمارت کے قریب موجود نامہ نگار نے بتایا کہ پولیس یا فوج کے یونیفارم میں ملبوس مسلح مجاہدین ہیڈکوارٹر میں داخل ہو گئے اور فوراً فائرنگ شروع کردی تھی اور ہیڈکوارٹر پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ نئی دہلی میں مسلح افواج کے سربراہوں کے ساتھ وزیراعظم واجپائی کی کانفرنس میں سرینگر سے موصول ہونے والی رپورٹوں کی روشنی میں مجاہدین اور پاکستان کے خلاف سخت اقدامات کے فیصلے کئے گئے اور جلد ہی ہندوستانی فضائیہ کی جارحانہ کارروائیاں شروع ہوگئیں۔ غالباً اسی خطرے کو مدنظر رکھتے ہوئے پاکستانی ہوائی اڈوں پر ریڈ الرٹ کا اعلان کردیا گیا تھا۔

ہندوستانی قیادت کا جو موڈ ہائی جیکنگ کی واردات کے بعد ٹی وی پر نظر آرہا تھا اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ہندوستان چاہتا ہے کہ پاکستان کے ساتھ تعلقات خراب کئے جائیں۔ کشیدگی بڑھائی جائے اور امریکہ منظوری دیدے تو ایک کھلی جنگ بھی شروع کردی جائے۔ ہندوستان کی طرف سے ایسی حکمت عملی اختیار کرنے کی قابل فہم وجوہ یہ ہوسکتی تھیں کہ کشیدگی بڑھا کر پاکستان سے سرمائے کے فرار کی رفتار تیز تر کروائی جائے تاکہ پاکستانی معیشت سنبھلنے نہ پائے اور دفاعی اخراجات میں مزید تخفیف پاکستان کی مجبوری بن جائے۔ امریکہ بھی یہ مطالبہ کرتا آرہا تھا کہ پاکستانی دفاعی بجٹ میں بڑے پیمانے پر کمی کردی جائے۔ فوج کی نفری گھٹادی جائے اور ایٹمی ہتھیار و میزائل بنانے کا پروگرام ترک کردیا جائے۔ امریکہ اور ہندوستان کو اس بات پر بھی گہری تشویش تھی کہ پاکستان میں جہاد پرستی فروغ پارہی ہے اور جہاد پرست تنظیمیں ہندوستان کے خلاف جہاد کی تلقین کررہی ہیں۔ حریت پسند کشمیریوں کو افرادی طاقت اور اسلحہ کی شکل میں کمک پہنچارہی ہیں اور پاکستانی عوام کو امریکہ سے متنفر کرنے کیلئے منظم مہم چلارہی ہیں۔ ہندوستان اور امریکہ کی تشویش ان دونوں ممالک کے مابین اس بات پر اتفاق رائے پیدا کرنے کی موجب بن سکتی تھی کہ پاکستان پر ایک فیصلہ کن جنگ مسلط کردی جائے اور ایسے نتائج حاصل کرنے کی کوشش کی جائے کہ پاکستان میں جہاد پرستی کی پیش قدمی جاری رہنے کا امکان باقی نہ رہ سکے۔ امریکہ نے پاکستان پر دہشت گردی کی حوصلہ افزائی کا الزام لگا کر واضح کردیا کہ اگر ہندوستانی قیادت نے جنگ کرنے کا فیصلہ کرلیا تو امریکہ کو اعتراض نہیں ہوگا اور اس کے مفادات کا تقاضا یہ ہوگا کہ جنگ کی صورت میں ہندوستان کی مدد کی جائے۔

انڈین ایئرلائنز کے مسافر بردار طیارے کی ہائی جیکنگ کے بارے میں جو شواہد و حقائق سامنے آئے ان سے یہ حقیقت عیاں ہوگئی کہ ہندوستانی انٹیلی جنس نے یہ واردات کروائی مگر ڈھنڈورا پیٹا کہ پاکستانی دہشت گرد اس واردات کے ذمہ دار ہیں۔ ہائی جیکروں کی تعداد پانچ بتائی گئی جن کے نام یہ تھے۔ احمد شیخ' ایس اے قاضی' ابراہیم مستری' سعید اختر سعید

Marfat.com

اور گوپال ترپارکر' گوپال صاحب پاکستانی نہیں نیپالی ہیں۔ نیپال کی پولیس کے ریکارڈ کے مطابق وہ ایک پیشہ ور اسمگلر ہے۔ قندھار کے ہوائی اڈے پر موجود طالبان حکومت کے نمائندوں نے ہائی جیکروں کے ساتھ وائرلیس پر بات چیت کے بعد اندازہ لگایا کہ مسلمان ہائی جیکروں کو نئی دہلی کی سفارش کے جال میں نیپالی غیر مسلم اسمگلر نے پھنسایا ہے اور اسی کے ذریعے طیارے کو قندھار پہنچایا ہے اور سارے منصوبے میں مولانا مسعود اظہر کا نام اس لئے شامل کیا کہ چند ماہ قبل ہندوستانی فوج نے جموں جیل میں حرکت المجاہدین کے ایک کمانڈر سجاد شاہد کو شہید کیا تھا جس پر حرکت المجاہدین نے شدید احتجاج کیا تھا۔ یہ شہید کمانڈر 1994ء میں مولانا اظہر مسعود کے ہمراہ گرفتار ہوئے تھے۔ اس بناء پر مولانا موصوف کا حرکت المجاہدین کے ساتھ تعلق ظاہر کرنا نئی دہلی کیلئے آسان ہوگیا۔ مولانا اظہر مسعود کی رہائی کے مطالبے کے ذریعے دنیا کو گمراہ کرنے میں نئی دہلی کو اس لئے بھی مدد ملی کہ طالبان کے حامی جریدے ''ضرب مومن'' میں مسعود اظہر صاحب کے مضامین باقاعدگی کے ساتھ شائع ہوتے رہے۔ سازش کے اس پہلو کو پیش نظر رکھتے ہوئے طالبان نے ہائی جیکروں کے ساتھ سخت رویہ اختیار کیا۔ انہیں پناہ دینے سے انکار کردیا۔ ہائی جیکروں کو متنبہ کیا کہ طیارے کے مسافروں کو ہلاک کرنے کی کوشش نہ کریں ورنہ طالبان' ہائی جیکروں کے خلاف جوابی کارروائی کرنے اور طیارے پر دھاوا بولنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

یہ تنبیہہ کارگر ثابت ہوئی۔ ہندوستانی وزیر خارجہ جسونت سنگھ نے 28 دسمبر کی دوپہر نئی دہلی میں ایک نیوز کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے اعتراف کیا کہ طالبان نے مثبت رویہ اختیار کیا ہے۔ نئی دہلی میں سیاسی مبصروں نے مزید کہا ہے کہ طالبان نے بین الاقوامی سطح پر نیک نامی کمائی۔ ہندوستان کا پروپیگنڈہ دنیا کو باور کروانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا کہ ہائی جیکنگ میں پاکستان ملوث ہے۔ ہندوستانی پروپیگنڈے کا یہ پہلو بھی لائق توجہ ہے کہ پاکستان کی فوجی حکومت کے سربراہ جنرل پرویز مشرف پر کارگل مہم کی ساری ذمہ داری ڈالی جارہی تھی۔ بار بار کہا جارہا تھا کہ جنرل پرویز مشرف کے برسراقتدار آنے کے بعد ہندوستان کے خلاف پاکستان کی دہشت گردی بڑھ گئی ہے اور پاکستان کی انٹر سروسز انٹیلی جنس سروس نے دہشت گردی کیلئے نیپال کو بھی اپنا اڈہ بنالیا ہے۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان بڑھتی ہوئی کشیدگی عالمی امن کیلئے خطرے کی گھنٹی بن گئی تھی۔ امریکہ جواب بھارت کو ''دہشت گردی کا شکار مظلوم ملک'' جاننے لگا تھا ایک مرتبہ پھر میدان میں اترا۔ صدر کلنٹن نے اپنے دورہ جنوبی ایشیا کا اعلان کیا۔ بنگلہ دیش اور بھارت میں انہوں نے ایک ہفتہ گزارا اور شلغموں سے مٹی جھاڑنے کیلئے چند گھنٹے کیلئے پاکستان میں تشریف لے آئے بھارت میں اپنے قیام کے دوران صدر کلنٹن نے بھارتی مؤقف کی کھل کر حمایت کی اور پاکستان کو دہشت گردی پر قابو پانے کی تلقین کرتے رہے۔ ان کا دورہ پاکستان شاید امریکہ کی مجبوری تھی کیونکہ امریکہ کسی بھی مرحلے پر پاکستان کو ناراض کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ صدر کلنٹن کے دورے کو آخری وقت تک خفیہ رکھا گیا۔ 25 مارچ 2000ء کو وہ اپنے خصوصی ائرفورس ون طیارے پر ساڑھے بارہ بجے چکلالہ ائربیس پر پہنچے تو ان کا ''بلیو بک'' Blue Book کے مطابق استقبال کیا گیا انہوں نے بارہ بج کر 40 منٹ پر پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا تو وزیر خارجہ عبدالستار خارجہ سیکرٹری انعام الحق پاکستان میں امریکی سفیر ولیم بی میلائم اور امریکہ میں پاکستانی سفیر ڈاکٹر ملیحہ

Marfat.com

لودھی نے اعلیٰ حکام سمیت ان کا خیر مقدم کیا اس موقع پر دو ننھے منے بچوں نے صدر کلنٹن کو گلدستے پیش کئے اور سادہ استقبالیہ تقریب محض چار منٹ میں مکمل ہوگئی۔ اس موقع پر امریکی صدر نے ایئر پورٹ پر کھڑے صحافیوں کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور طیارے کی سیڑھی کے ساتھ کھڑی کار میں بیٹھ کر ایوان صدر کیلئے روانہ ہوگئے۔ ذرائع کے مطابق کیونکہ امریکی صدر کا دورہ ورکنگ تھا اس لئے انہیں مسلح افواج کی طرف سے گارڈ آف آنر پیش کرنے کی تقریب نہیں ہوئی۔ امریکی صدر بھارت کا پانچ روزہ دورہ مکمل کر کے گہرے اور گرین ملے جلے کلر کے سوٹ میں مسٹرڈ کلر کی ٹائی پہنے اسلام آباد پہنچے جبکہ میڈیلین البرائیٹ کالے سوٹ اور کالا ہیٹ پہنے ہوئے تھیں۔ صدر کلنٹن کے جہاز سے چھ امریکی افسر بھی اترے۔ پاکستانی وزیر خارجہ سفید شلوار سیاہ شیروانی پہنے ہوئے تھے جبکہ امریکی سفیر ڈاکٹر ڈاکٹر ملیحہ لودھی ہلکے نیلے رنگ کے سلکی پاکستانی ڈریس میں ملبوس تھیں۔ امریکی صدر کلنٹن ایوان صدر کے مرکزی دروازے پر دو منٹ جلد پہنچ گئے جس کی وجہ سے انہیں پاکستان کے صدر کی طرف سے خیر مقدم کیلئے جانے کیلئے منتظر رہنا پڑا کلنٹن کی گاڑی ایوان صدر پہنچی تو صدر تارڑ لفٹ سے نیچے آرہے تھے صدر کلنٹن کو صدر دروازے پر پہلے کھڑا دیکھ کر صدر رفیق تارڑ تیزی سے ایوان صدر کے باہر آئے امریکی صدر کو ویلکم مسٹر پریذیڈنٹ کہہ کر ان کا استقبال کیا۔ غیر معمولی سکیورٹی کی بناء پر امریکی سکیورٹی حکام اور صدر کلنٹن کو ایوان صدر کے اندر روایتی گیٹ کی بجائے عقبی راستے پر واقع گیٹ نمبر دو کے ذریعے لیجایا گیا۔ بعدازاں پاکستانی رہنماؤں سے مذاکرات کے بعد صدر کلنٹن پاکستان میں سات گھنٹے قیام کے بعد اسلام آباد سے جنیوا کیلئے روانہ ہوگئے۔ اسلام آباد کے پی اے ایف بیس پر وزیر خارجہ عبدالستار امریکہ میں پاکستان کی سفیر ڈاکٹر ملیحہ لودھی اور اعلیٰ حکام نے انہیں رخصت کیا۔ صدر بل کلنٹن کیلئے چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف اور حکومت پاکستان کی طرف سے 25 قیمتی تحائف امریکہ بھیجے گئے صدر امریکہ کے جہاز پر لوڈ سے پہلے ان تحائف کی امریکی کمانڈوز نے اچھی طرح سکر یننگ کی ان میں تین کارپٹ ایک ایزی چیئر اور تین چھوٹے سائیڈ ٹیبل بھی تھے۔ ایزی چیئر اور ٹیبلز اخروٹ کی لکڑی سے بنے ہوئے تھے اور ان پر کشمیری کندہ کاری ہوئی تھی صدر کلنٹن نے اسلام آباد سے روانگی سے پہلے پی اے ایف بیس کے وی وی آئی پی لاؤنج میں امریکی سفارت خانے میں کام کرنیوالے امریکیوں اور ان کے بیوی بچوں سے ملاقات کی اور ان سے مختصر خطاب کیا۔ ایئر پورٹ پر امریکی صدر کی روانگی کے وقت ایسے بہت سے امریکی نوجوان بھی سب کی توجہ کا مرکز بنے رہے جن کے آدھے سر پر بال تھے اور آدھے سر استرے سے مونڈ رکھے تھے۔ امریکی صدر کی واپسی کے ساتھ ہی جب سڑکوں اور شاہراہوں سے رکاوٹیں ہٹائی گئیں تو لوگ غول درغول باہر ایسے نکلے جیسے مدت بعد آزاد کیا گیا ہو امریکی سکیورٹی کی خلاف ورزی صرف ایک پتنگ کے ذریعے ہوئی جسے وہ صدر امریکہ کے طیارے کے اوپر اڑنے سے کنٹرول نہ کر سکے بعد میں یہ پتنگ کٹ کر وی وی آئی پی لاؤنج پر گر گئی تھی۔ صدر کلنٹن کے دورہ پاکستان کے ایک ایک لمحے کی مانیٹرنگ کیلئے امریکہ نے دو سیٹلائٹ پاکستان کے اوپر چھوڑ رکھے تھے۔ امریکی صدر کو یہاں وزارت اطلاعات اور پی آئی ڈی کی طرف سے دورہ پاکستان کی تصویروں کا البم پیش کیا گیا۔ عین ان لمحات میں جب صدر کلنٹن کا جہاز پاکستانی فضاؤں سے نکل رہا تھا۔ پاکستانی قوم سے ان کی ریکارڈ کردہ تقریر آن ائر ہو رہی تھی جس کو تقریر کم اور دھمکی آمیز وارننگ زیادہ سمجھا جائے گا۔ تقریر کا مکمل متن تاریخ کا ریکارڈ محفوظ رکھنے اور امریکہ کے پاکستان کیلئے بدلتے تیور جاننے اور سمجھنے کیلئے ملاحظہ فرمائیں۔

Marfat.com

''السلام علیکم! یہ بات میرے لئے باعث اعزاز ہے کہ میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا پہلا صدر ہوں جو پاکستان کے عوام سے مخاطب ہے اور میں پہلا صدر ہوں جو تیس سال میں پہلی بار آپ کے ملک کا دورہ کر رہا ہے۔ میں یہاں آپ کی سرزمین کی پرشکوہ تاریخ اور صدیوں پر محیط دریائے سندھ کے ساتھ پھیلی ہوئی تہذیب کے ایک پرستار کے طور پر حاضر ہوا ہوں۔ میں یہاں ایک ایسے فرد کی حیثیت سے آیا ہوں جس کی قوم نے پاکستانی نژاد امریکیوں کی صلاحیتوں سے بھرپور استفادہ کیا ہے مگر ان سب سے بڑھ کر میں یہاں ایک دوست کی حیثیت سے جو آپس کی طویل رفاقت کو بیحد اہمیت دیتا ہے' ایک ایسے فکرمند دوست کی حیثیت سے جو آپ کے ملک کے مستقبل کی سمت کے بارے میں گہری دلچسپی لیتا ہے' ایک ایسے پرخلوص دوست کی حیثیت سے جو پاکستان کے لوگوں کے ساتھ کھڑے ہونے کو تیار ہے جب تک آپ ایک ایسی مستحکم' خوشحال اور جمہوری قوم بننے کی کوشش کر رہے ہیں جو آپ کے بانی کے خوابوں کے عین مطابق ہو۔ نصف صدی سے بھی زیادہ عرصہ پہلے محمد علی جناح نے اپنے اس خواب کا تصور اس وقت پیش کیا تھا جب انہوں نے پاکستان کی قانون ساز اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''اگر آپ اکٹھے کام کریں گے' اس جذبہ کے ساتھ کہ آپ میں سے ہر کوئی یکساں حقوق' مراعات اور ذمہ داریوں کا حامل پہلا' دوسرا اور آخری شہری ہے تو آپ کی ترقی کی کوئی حد نہیں ہوگی'' قائد اعظم نے اپنی اس تقریر کا اختتام ایک ٹیلی گرام پڑھ کر کیا تھا جو انہیں اسی وقت موصول ہوا تھا اس پیغام میں آپ کے اس عظیم کام میں کامیابی کی تمنا کی گئی تھی جس کا آپ آغاز کرنے والے تھے وہ پیغام امریکہ کے عوام کی جانب سے آیا تھا۔ تکالیف اور عارضی رکاوٹوں کے باوجود پاکستان کے لوگوں نے اس قوم کی تعمیر جمہوریت کے اصولوں اور قانون کی حکمرانی کی بنیاد پر کی ہے پچاس سال سے زائد عرصے سے ہم ایک دوسرے کے ساتھی ہیں پاکستان نے چین سے مذاکرات کا دروازہ کھولنے میں امریکہ کی مدد کی' سوویت یونین کے افغانستان پر حملے کے وقت ہم دونوں ساتھ ساتھ کھڑے تھے ہماری رفاقت نے سرد جنگ کے خاتمے میں مدد دی اس کے بعد کے برسوں میں ہم نے دہشت گردی کے خلاف جدوجہد میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کیا ہمارے سپاہی دنیا کے ہر حصہ میں امن کے قیام کے مشن میں شریک کار رہے یہ آپ کی باعث فخر میراث ہے بلکہ یہ ہم دونوں ملکوں کی باعث فخر میراث ہے۔ اب ہم ایک نئی صدی کا آغاز کر رہے ہیں جہاں سے ہمیں ایک نئی اور تبدیل ہوتی ہوئی دنیا نظر آ رہی ہے دنیا کے چاروں طرف ایک انقلاب قدم جما رہا ہے ایک ایسا انقلاب جس نے رکاوٹوں کی دیوار گرا کر کروڑوں انسانوں کیلئے اچھے اسکولوں' اچھی ملازمتوں اور ہمارے بچوں کے بہتر مستقبل کی خواہش پر مبنی ایک بہتر زندگی کے خواب کو حقیقت کا رنگ دیا ہے۔ انسانی تاریخ کے تمام اہم موقعوں کی طرح اس دور میں بھی مشکل فیصلے درپیش ہیں یہ دور ان لوگوں کو کوئی اجر اور انعام نہیں دیتا جو خون سے سرحدوں کو نئے سرے سے تشکیل دینے کی ناکام کوششیں کرتے ہیں بلکہ یہ عہد ان لوگوں کا ہے جن کے سامنے یہ تصور ہوتا ہے کہ وہ اپنی سرحدوں سے پار کاروبار اور تجارت کیلئے ساتھی تلاش کریں یہ عہد ایسی قوموں کا ساتھ نہیں دیتا جن کی حکومتیں تمام تر اختیارات اپنے پاس مرکوز کر لینا چاہتی ہیں تاکہ وہ تمام مسائل کو حل کر دیں بلکہ یہ عہد ان اقوام کی حمایت کرتا ہے جہاں لوگوں کو اپنا مستقبل خود بنانے کی آزادی بھی حاصل ہو اور ذمہ داری بھی۔ آج کی اس نئی دنیا میں پاکستان عظیم کامیابیاں حاصل کر سکتا ہے لیکن اس کی راہ میں ایسی رکاوٹیں حائل ہیں جو خاصی حوصلہ شکن ہیں مثلاً سیاسی صورت حال' اقتصادی حالات اور علاقہ میں موجود کشیدگی۔

Marfat.com

یہ وہ باتیں ہیں جو پاکستان کو آگے بڑھنے سے روکتی ہیں یہ باتیں پاکستانی عوام کی زندگیوں کو دن بہ دن مشکل تر بناتی جارہی ہیں۔ مجھے یہ سب کچھ آپ کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے آپ ان سے باخبر ہیں یہ وہ چیزیں ہیں جنہیں آپ خود اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں لیکن میں پر امید ہوں مجھے توقع ہے کہ پاکستان ان مشکلات کے درمیان سے اپنا راستہ نکال لے گا اور ایک ایسے مستقبل کی تعمیر کرلے گا جو اس کے بانیوں کے تصورات کے عین مطابق ہو۔ ایک مستحکم' خوشحال اور جمہوری پاکستان جو اپنی سرحدوں کے اندر پوری طرح محفوظ ہو جس کے ہمسایوں کے ساتھ تعلقات دوستانہ ہوں ایک ایسا پاکستان جو بقول جناح کے ''اندر سے بھی پرامن اور باہر سے بھی پرامن ہو'' اس تصور کے راستے میں کیا چیز حائل ہے؟ ظاہر ہے کہ جمہوریت کی عدم موجودگی پاکستان کے عوام کے آگے بڑھنے کے عمل کو آسان کی بجائے مشکل بنا رہی ہے جمہوریت آسان نہیں ہوتی اور نہ ہی خامیوں سے پاک ہوتی ہے ہمارے ملک کا آئین لکھنے والوں کو اس بات کا بخوبی علم تھا اسی لئے انہوں نے کہا تھا کہ امریکہ کا ہمیشہ یہی مشن رہے گا کہ وہ ایک مزید بہتر اور جامع یونین کی تشکیل کیلئے کوشش کرتا رہے دوسرے لفظوں میں ہم کبھی بھی اپنے نصب العین کو مکمل طور پر حقیقت کا روپ نہ دے سکیں گے لیکن ہم اس منزل سے قریب تر ہوتے رہیں گے لیکن ہمیشہ سوال یہی رہتا ہے کہ کیونکر پیشرفت جاری رکھی جائے۔ ہم آپ کی اس مایوسی سے متفق ہیں کہ پاکستان میں پچھلی جمہوری حکومتوں نے اپنے عوام کی بہتری کیلئے کچھ زیادہ کام نہیں کیا لیکن ایک بات یقینی ہے کہ اگر جمہوریت کے پودے کو پنپنے کا موقع نہ دیا جائے اور اسے بار بار جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے تو جمہوریت کبھی پروان نہیں چڑھ سکتی متواتر کامیاب حکومتوں کیلئے وقت' برداشت اور سخت محنت کی ضرورت ہوتی ہے ناقص جمہوریت کا حل یہ نہیں ہے کہ جمہوریت کو ختم ہی کردیا جائے بلکہ اس کا حل یہ ہے کہ اسے مزید بہتر بنایا جائے۔ مجھے علم ہے کہ جنرل مشرف نے مقامی سطح کے انتخابات کیلئے تاریخ کا اعلان کردیا ہے یہ صرف ایک قدم ہے لیکن صرف ایک قدم...... سویلین جمہوری حکومت کی واپسی کیلئے ایک مکمل پلان کی ضرورت ہوتی ہے ایک حقیقی روڈ میپ کی۔ ظاہر ہے کہ باہر کا کوئی بھی شخص پاکستان کو یہ نہیں بتا سکتا کہ یہاں کس طرح کی حکومت قائم کی جائے یہ فیصلہ پاکستان کے عوام کا کام ہے اور آپ کو یہ فیصلہ کرنے کا موقع ملنا چاہئے مجھے توقع اور یقین ہے کہ آپ پاکستان کو ایک ایسا ملک بنانا چاہتے ہیں جہاں قانون کی حکمرانی ہو' ایک ایسا ملک جہاں کے اہلکار جوابدہ ہوں' ایک ایسا ملک جہاں کے لوگ اپنے نقطہ نظر کا اظہار بلا خوف وخطر کرسکیں' ایک ایسا ملک جو عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ماضی کے زخموں کا بدلہ چکانے کا خیال دل سے نکال دے بلکہ ایک اچھے مستقبل کے حصول کی خاطر مفاہمت کو ترجیح دے۔ اگر آپ اس راستے کا انتخاب کریں گے تو امریکہ میں آپ کے دوست آپ کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے ہونگے۔ پاکستان کی ترقی کی راہ میں جو رکاوٹیں حائل ہیں ان میں تشدد اور انتہا پسندی شامل ہے امریکیوں نے بھی ان برائیوں کو محسوس کیا ہے۔ یقیناً ہم دونوں اس کے ہاتھوں اتنا کافی نقصان اٹھا چکے ہیں کہ ہمیں یہ اب معلوم ہوجانا چاہئے کہ کوئی بھی شکایت' کوئی مقصد یا کوئی عقیدہ معصوم لوگوں کے دانستہ قتل کو کبھی بھی حق بجانب قرار نہیں دے سکتا۔ بسوں کے اڈوں پر بموں کے دھماکے کرنے والے' سفارت خانوں کو نشانہ بنانے والے یا قانون کی بالادستی قائم رکھنے والوں کو قتل کرنے والے ہیرو نہیں ہوتے یہ ہمارے مشترک دشمن ہیں اس لئے کہ ان کا مقصد تکلیف دہ مسائل سے فائدہ اٹھانا ہوتا ہے انہیں حل کرنا نہیں جس طرح منشیات کا کاروبار کرنے والوں کو شکست دینے کیلئے ہم نے مل

Marfat.com

جل کر جنگ کی ہے بالکل اسی طرح میں پاکستان سے کہتا ہوں کہ دہشت گردی کرنے والوں کو شکست دینے کیلئے بھی اپنی کوششوں کو تیز کر دیں۔ پاکستان کی ترقی کی راہ میں حائل دوسری رکاوٹ ایسی پالیسیوں پر کوششوں، توانائی اور سرمائے کا افسوسناک ضیاع ہے جو پاکستان کو محفوظ تر بنانے کے بجائے اسے غریب تر کرتی ہے اور یہی ایک وجہ ہے کہ ہمیں ایٹمی ہتھیاروں پر اپنے اختلافات دور کرنے کی کوشش کرنی چاہئے آپ سے میرے یہ سوالات ان سوالات سے مختلف نہیں ہیں جو میں نے بھارت میں اٹھائے تھے۔ کیا آپ ایٹمی تجربات کرنے سے پہلے کے زمانے کی نسبت آج واقعی زیادہ محفوظ ہوگئے ہیں؟ کیا یہ ہتھیار بھارت کے ساتھ جنگ کے امکان کو کم کر دیں گے یا اسے زیادہ تباہ کن بنائیں گے؟ کیا اسلحہ کی ایک مہنگی دوڑ آپ کی اقتصادی ترقی کے حصول میں مددگار ہوگی؟ کیا یہ ہتھیار آپ کو دنیا بھر میں اپنے دوستوں سے قریب ترلائے ہیں اور انہوں نے ایسی شراکتوں کے حصول میں مدد دی ہے جس کی آپ کو اپنے خوابوں کی تکمیل کیلئے ضرورت ہے؟ آج امریکہ اپنے ایٹمی ہتھیاروں کے ذخیرہ میں ڈرامائی طور پر کمی کر رہا ہے دنیا بھر کی اقوام ان ہتھیاروں کو ترک کر رہی ہیں میں پاکستان کو ایٹمی ہتھیاروں کے عدم پھیلاؤ کی کوششوں میں قائدانہ کردار ادا کرنے کی دعوت دیتا ہوں اپنے ذاتی مفاد میں خطرناک ٹیکنالوجی کے ان لوگوں تک پھیلنے کو روکنے میں مدد کریں جو ان کے استعمال کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کریں گے کشیدگی کے خاتمے، غلط تخمینوں سے اجتناب اور جنگ کا خطرہ کم کرنے کیلئے آج ہی راست قدم اٹھائیے۔ جیسا کہ آپ کے اپنے ملک کے رہنماؤں نے مشورہ دیا ہے کہ سی ٹی بی ٹی میں شمولیت ایک ایسا قدم ہوگا جو آپ کی سلامتی مضبوط اور مستحکم بنائے گا اگر آپ ایسا کر لیتے ہیں تو تمام دنیا آپ کے ساتھ ہوگی مجھے یقین ہے کہ بھارت سے کشیدگی میں کمی پاکستان کے اپنے مفاد میں بھی ہے۔ جب میں نئی دہلی میں تھا تو میں نے بھارت سے کہا تھا کہ وہ مذاکرات کے موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دے پاکستان کو بھی ایسے حالات پیدا کرنے میں مدد دینی ہوگی جس سے مذاکرات کی راہ ہموار ہو۔ پاکستان اور بھارت کیلئے یہ ایک ایسا وقت ہے جب انہیں برداشت کا مظاہرہ کرنا ہوگا لائن آف کنٹرول کی تعظیم کرنی ہوگی اور آپس میں گفت وشنید کے رابطے بحال کرنے ہوں گے۔ میں نے جنرل مشرف اور دیگر افراد کو بغور سنا ہے میں کشمیر کے بارے میں آپ کی تشویش کو سمجھتا ہوں اور آپ کے اس عزم میں شریک ہوں کہ تمام لوگوں کے انسانی حقوق کا تحفظ کیا جانا چاہئے خواہ وہ کسی بھی جھنڈے کے نیچے رہتے ہوں، ہمیں اس تلخ حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہئے اور وہ یہ کہ کشمیر کا کوئی فوجی حل نہیں ہے بین الاقوامی ہمدردی، حمایت یا مداخلت ایک بڑی اور خون آشام چپقلش کا آغاز کر کے حاصل نہیں کی جاسکتی بلکہ اس کے برعکس ایسا کرنے سے تمام ہمدردی اور حمایت ختم ہو جائے گی شکایت خواہ کچھ بھی ہو لائن آف کنٹرول کی دوسری جانب شہریوں کے خلاف حملے کی پشت پناہی کرنا غلط ہے اور اس تمام عمل میں کیا یہ کبھی ختم نہ ہونے والی مہنگی جدوجہد آپ کے بچوں کیلئے سکول تعمیر کر سکتی ہے؟ کیا اس سے آپ اپنے شہروں کو زیادہ محفوظ بنالیں گے؟ کیا اس کے نتیجے میں صاف پانی اور صحت کی بہتر سہولتیں دستیاب ہو جائیں گی، کیا اس سے امیر اور غریب کے درمیان فرق کم ہو جائے گا؟ کیا ایسا کرنے سے وہ دن قریب آجائے گا جب پاکستان کی قوت اور سرمایہ صرف اس کے مستقبل کی تعمیر میں لگایا جائے گا؟ ان تمام سوالوں کا ایک ہی واضح جواب ہے نہیں! امریکہ کے لوگ کشیدگی اور صعوبتوں میں اضافہ ہوتا نہیں دیکھنا چاہتے ہم امن کو تقویت پہنچانے والی ایک قوت بننا چاہتے ہیں لیکن ہم زبردستی امن قائم نہیں کر سکتے ہم امن مسلط نہیں

Marfat.com

کر سکتے' ہم کشمیر پر ثالثی نہیں کر سکتے اور نہ ہی اسے حل کر سکتے ہیں یہ کام صرف آپ' بھارت اور پاکستان باہم گفت وشنید کے ذریعہ ہی کر سکتے ہیں۔ گزشتہ سال بہتر تعلقات استوار کرنے کی غرض سے جب پاکستان اور بھارت کے رہنما لاہور میں ملے تو ساری دنیا انہیں پرامید نظروں سے دیکھ رہی تھی پاکستان اور بھارت کیلئے یہی امن کے حصول کا راستہ ہے اس لئے دونوں فریقوں کو لاہور میں کئے جانے والے وعدے یاد دلانے میں مدد دینے کی غرض سے مجھ سے جو کچھ بھی ہو سکا میں کرونگا تاکہ لاہور میں شروع ہونے والے عمل کو جاری رکھا جا سکے۔ چند ماہ پیشتر وائٹ ہاؤس میں اختتام رمضان کے موقع پر منعقدہ ایک تقریب میں امام صاحب نے قرآن کریم کا جو اقتباس پیش کیا تھا اس میں کہا گیا تھا کہ "اللہ نے اقوام اور قبیلے اس لئے بنائے ہیں کہ ہم ایک دوسرے کو پہچانیں' اس لئے نہیں کہ ہم ایک دوسرے سے نفرت کریں" میں نے اپنے دور صدارت میں اسلامی دنیا کے ساتھ امریکہ کے تعلقات کو مستحکم بنانے کیلئے بڑی محنت کی ہے گزشتہ کئی برسوں کے دوران میں نے بوسنیا اور کوسوو کے عوام کا ساتھ دیا جو اپنے مسلمان عقائد کی بناء پر بربریت اور ظلم کا شکار بنائے گئے میں نے اردن اور مراکش کے عوام کے ساتھ ان کے بہادر رہنماؤں کی وفات پر اظہار تعزیت کیا اور مجھے یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ میں نے غزہ میں فلسطینیوں کی سپیشل کونسل سے خطاب کیا۔ آج مجھے آپ سے مخاطب ہوتے ہوئے فخر محسوس ہو رہا ہے اس لئے کہ میں اپنی طویل دوستی کو بے حد اہمیت دیتا ہوں' اس لئے کہ میں سمجھتا ہوں کہ ہماری دوستی اب بھی دنیا بھر میں برداشت اور مفاہمت کے حصول کیلئے ایک قوت بن سکتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ ان مشکل چیلنجوں کا مقابلہ کرنے میں کامیاب ہوں گے جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے اگر آپ ایسا نہ کر سکے تو یہ خطرہ موجود ہے کہ پاکستان مزید تنہا ہو جائے۔ عوام کی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے استعمال ہونے والے وسائل کم سے کم ہوتے جائیں اور ایک ایسی چپقلش کے قریب تر ہوتا جائے جس میں کوئی بھی کامیاب نہیں ہو سکتا لیکن اگر آپ نے ایسا کر لیا تو پھر عوام کی بھلائی کی خاطر ہمارا مکمل اقتصادی اور سیاسی اشتراک بحال ہو سکتا ہے۔ ہمیں عظیم پاکستانی شاعر محمد اقبال کے ارشاد سے رہنمائی حاصل کرنی چاہئے انہوں نے فرمایا کہ "اس پر آشوب زمانے سے ہمیں ایک روشن کل کی نوید عطا کر" اگر پاکستان اور جنوبی ایشیا کے عوام ایک ایسے کل پر نظر رکھیں جو برداشت اور فراخدلی پر مبنی ہو تو آپ کی قوم اور یہ سارا خطہ آئندہ پچاس برسوں میں کامیابی کی ایک درخشندہ مثال بن سکتا ہے یہ آپ کی دسترس میں ہے۔ میں پاکستان کے عوام کی ہنر مندی' اولوالعزمی اور ان کے دلوں میں موجزن جذبے کو جانتے ہوئے یہ کہہ سکتا ہوں کہ ایسا ہو سکتا ہے ایسی وسیع النظری سے جو آنے والے روشن کل کیلئے اور گزرے ہوئے دن کے درد میں ڈوبی نہ ہو' پاکستان اسلامی دنیا میں جمہوریت کے روشن مینار' ترقی کیلئے قوت کے سرچشمہ' رواداری کی مثال اور استحکام کی پختہ بنیاد پر اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے پاکستان اس مستقبل کو حاصل کر سکتا ہے جو قائداعظم کے خوابوں کی حقیقی تعبیر ہے۔ اگر آپ مشکل فیصلے کرنے کو تیار ہیں کہ آپ اپنے ہمسایہ سے اپنے مسائل باہمی گفت وشنید کے ذریعے حل کریں گے ایک دوسرے کو تباہ کر کے نہیں اور وہ بھی اس لئے نہیں کہ دنیا یہ چاہتی ہے بلکہ اس لئے کہ یہ آپ کے اپنے بچوں کی ضرورت ہے۔ ایسا ہوا تو امریکہ آپ کے ساتھ قدم ملا کر چلے گا۔ مجھے امید ہے کہ آپ مشکل فیصلے کریں گے اور میں اپنی طویل دوستی کیلئے دعا گو ہوں۔ انہوں نے آخر میں پاکستان زندہ باد کہہ کر خطاب ختم کیا۔ (روزنامہ جنگ 26 مارچ 2000ء)

Marfat.com

بھارتی حکومت کی شدید خواہش اور کوشش تھی کہ امریکی صدر کلنٹن بھارت ہی سے واپس امریکہ لوٹ جائیں اور پاکستان کا دورہ نہ کریں جس روز صدر کلنٹن پاکستان آئے وہ ''ہولی'' کا دن تھا اور بھارتی وزیر اعظم نے ان کی روانگی پر دلی میں اخبار نویسوں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا: ''ہماری خواہش تھی کہ صدر کلنٹن ہولی بھارت میں منائیں لیکن وہ آدھی ہمارے اور آدھی پاکستان کے ساتھ منانا چاہتے ہیں''۔(ٹائمز آف انڈیا۔26مارچ2000ء)

امریکی صدر بل کلنٹن کو پاکستان سے کوئی خاص محبت نہیں تھی ان کیلئے اہم بات یہ تھی کہ اسامہ بن لادن افغانستان میں موجود ہے جہاں طالبان کی حکومت نے اسے پناہ دے رکھی ہے۔امریکی حکومت کے مختلف اداروں نے انہیں پاکستان کا دورہ نہ کرنے کے مضمرات سے آگاہ کر دیا تھا۔پینٹا گون نے اپنی رپورٹس میں امریکی صدر کے پاکستان نہ جانے کے باعث جن تین بڑے خطرات کی نشاندہی کی تھی وہ درج ذیل ہیں۔

1- جہادی تنظیمیں طاقت ور ہو جائیں گی۔

2- پاکستانی جرنیل ایک بار پھر چین پر انحصار بڑھا دیں گے۔

3- امریکی مفادات کو خطے میں خطرات لاحق ہوں گے۔

گویا بل کلنٹن کا پاکستانی دورہ محض ناگزیر مجبوریوں کے باعث وقوع پذیر ہو رہا تھا یہی وجہ ہے کہ بل کلنٹن کا بھارتی دورہ ایک واضح ایجنڈے اور ٹھوس اقتصادی اور عسکری تعاون کے طے شدہ نکات پر ہو رہا تھا۔جب کہ پاکستان کیلئے بل کلنٹن کے پاس سوائے مطالبات کرنے کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔بل کلنٹن کے دورہ جنوبی ایشیا کے عین ان دنوں میں امریکہ نے اپنی یہ خواہش ظاہر کر دی کہ بھارت سلامتی کونسل میں شامل ہو جائے دوسرے معنوں میں امریکہ یہ چاہتا تھا کہ عالمی معاملات میں اس کی وہی طاقت ہو جو چین کی ہے۔امریکہ چین کی مارکیٹ پر پہلے ہی قبضہ کر چکا تھا اب بھارت اس کا ہدف تھا اور بھارت نے درآمدات پر سختیوں اور پابندیوں میں بڑی حد تک نرمی کر دی۔

بھارت اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ امریکہ کے معاملات میں اتنا فراخدل ہوا کہ امریکی وکلاء کو اپنی عدالتوں میں پیروی کی اجازت دے دی۔امریکہ نے بھارت کیلئے اس تاریخی موقع پر اپنے اقتصادی حلیف ہونیکا اعلان کر دیا۔جب کہ بھارت کے ساتھ عسکری تعاون کے مواقع اقتصادی مفادات سے بھی زیادہ پیدا کئے جا رہے تھے۔امریکہ کے اسی گرم جوش تعاون کے باعث بھارت میں بڑے پیمانے پر عوام اور فوج کو ایک ممکنہ جنگ کیلئے تیار کیا جا رہا تھا بھارت سے آمدہ اطلاعات کے مطابق اس حوالے سے بھارت میں ٹھوس بنیادوں پر غور ہو رہا تھا کہ پاکستان پر ایک جنگ مسلط کر کے اسے سبق سکھایا جائے اور ہمیشہ کیلئے کشمیر کا ٹنٹا ختم کر دیا جائے۔ان دنوں تو بھارت کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی البتہ سال کے آخر میں ایک بہانہ اس کے ہاتھ آ گیا اور وہ اپنی دس لاکھ فوج کے ساتھ پاکستانی سرحدوں پر دندنانے لگا۔

اپنے گھناؤنے منصوبے کا آغاز بھارت نے کارگل کرائسس سے پہلے ہی کیا ہوا تھا خصوصاً اس کی انٹیلی جنس ''را'' نے پاکستان میں اپنا کام کبھی ٹھنڈا نہ پڑنے دیا۔16 جنوری 2000ء کو اسلام آباد پولیس نے بھارتی قونصلیٹ کے اہلکار ''پی موسس'' کو اسلام آباد میں ایک بھارتی ایجنٹ کو ریموٹ کنٹرول دیتے ہوئے رنگے ہاتھوں گرفتار کر لیا اس طرح پاکستان میں دہشت گردی کا خوفناک منصوبہ ناکام ہو گیا۔یہ ریموٹ اور نقدی اسلام آباد کے ''روز لینڈ جینز مین گارڈن''

Marfat.com

میں پی موسس "را" کے ایک ایجنٹ کے حوالے کر رہا تھا۔ بھارتی اہلکار نے الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے سامنے بڑی ڈھٹائی سے اپنے جرم کا اقرار بھی کر لیا۔ پی موسس نے اس سے پہلے "را" کی طرف سے حیدر آباد مری اور پشاور میں ہونے والے بم دھماکوں کی ذمہ داری بھی قبول کر لی۔ پاکستان نے اسے ناپسندیدہ شخصیت قرار دے کر ملک سے نکال دیا جبکہ بھارت نے اس کارروائی کو وحشیانہ اور جھوٹ قرار دیا۔ (روزنامہ جنگ لاہور 17 جنوری 2000ء)

25 مارچ کو جنرل پرویز مشرف نے اپنے بیان میں کہا کہ وہ بھارت سے کسی بھی وقت کسی بھی سطح پر مذاکرات کیلئے تیار ہیں۔ واجپائی ہاٹ لائن پر کال کریں گے وہ ضرور جواب دینگے۔ (روزنامہ جنگ لاہور۔ 26 مارچ 2000ء)

بھارتی وزارت خارجہ کے ترجمان نے جنرل مشرف کے اس بیان کا مضحکہ اڑاتے ہوئے انہیں پاکستان میں فوراً جمہوریت بحال کرنے کا مشورہ دیا۔ جسے پاکستان نے اپنے معاملات میں مداخلت جانا۔

(روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی 26 مارچ 2000ء)

بھارتی جارحیت کو صدر کلنٹن کے دورے سے کچھ زیادہ ہی تقویت مل گئی تھی کنٹرول لائن، سیاچن اور ورکنگ باؤنڈری پر بھارتی فوج کی کارروائیاں اپنے نقطہ عروج کو چھو رہی تھیں۔ پاکستان کی طرف سے بھرپور جواب ملنے پر البتہ وہ خاموشی اختیار کر گئے تھے۔ بھارتی حکومت کی پاکستان کے تئیں اس پالیسی پر بھارت کے سنجیدہ حلقے بھی پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ مئی 2000ء میں ہندوستان ٹائمز نے اس کا نوٹس لیا اور لکھا:

Bharat Wariwala on Winning Kargil and Losing Kashmir?

We won the Kargil heights but are we losing the Kashmir Valley? If incidents like what happened at Anantnag happen again, the little hope there is for peace in the Valley would disappear.

After the killing of 35 Sikhs in Chattisinghpura in March, the security forces killed five innocent villagers. As if the shame of Anantnag was not enough, our sentinels of "law and order" killed seven more people.

If further acts of such indiscriminate use of force continue to happen, the liberal West, which has acquiesced in accepting the LoC as the line dividing the two Kashmirs, would turn against us. In Delhi, Bill Clinton called upon Pakistan to respect the LoC but he also asked us to show restraint and engage in a dialogue with the Kashmiri people. British Foreign Secretary Robin Cook has also reiterated Clinton's prescription for Kashmir.

Marfat.com

The West, Russia, and perhaps even China, accept the division of Kashmir along the LoC because they fear that it can only be changed at the risk of a nuclear conflict. The Americans fear that a conflict between India and Pakistan could escalate to a nuclear level. Thus they accept for now the military status quo but hope that India, through a political dialogue with the Kashmiri people, would arrive at a durable settlement of the Kashmir problem.

However, a top strategic expert is of the opinion that nuclear weapons can freeze a conflict and that just as the line dividing Germany did not move by even a millimetre during the Cold War, the line dividing us and Pakistan in Kashmir too would not change once both have nukes. This is absurd, for nuclear weapons did not freeze the German status quo; it was changed peacefully in November 1989 by the German people when they dismantled brick by brick the hideous Berlin Wall. Indeed, no political problem can be frozen forever militarily.

By releasing some Hurriyat leaders, the Centre has begun to tackle the Kashmir problem politically. But for the talks to take off, we must ensure that another Anantnag does not happen. This means that security forces act strictly within limits of law. Since the outbreak of the winter of discontent in Kashmir in 1989, the security forces have committed terrible acts against civilians in the name of combating Pakistan espoused terrorism and the wounds have never really healed.

...The Hurriyat ... comprise pro-Pakistan, pro-azadi, pro-autonomy (within the Indian Union) factions. The negotiations are bound to be exasperating and prolonged and there will be many breakdowns. The negotiators cannot forget the preceding ten years of bloodshed. The most important thing is to talk freely and without a definite agenda.

The demand of some Hurriyat leaders for involving Pakistan in talks is simply a posturing on their part which they will give up as talks

Marfat.com

with other leaders get going. But the (talks) must aim at handing over power to the representatives of the Kashmiri people. This means a fair election, which the Valley never had, except the fateful one in 1977 which ended Indira Gandhi's make-shift authoritarianism.

Democratic processes help in moderating ethnic- religious conflicts; they even solve them... But we have never accepted Kashmiri regionalism as we have accepted Tamil, Andhra, Bengali or Malayali regionalism. We instinctively fear that Kashmir regionalism, if allowed to grow, would ultimately end in separation. We regard the crisis in Kashmir not as a political issue but as a security problem, to be managed militarily and through the agency of the Abdullah family.

It has not worked... The Hurriyat, however, internally divided, represents (Kashmiri) regionalism and we should agree to hand-over power to it after a fair election. The pro-Pakitani faction of the Hurriyat may not have the strength to scuttle the democratic process because Pakistan-aided insurgency has failed. The Mujahideen sent across the LoC has not brought azadi but grief to the Kashmiris...

Autonomy of the kind promised to Sheikh Abdullah in 1953, a promise which was never honoured, is a contentious issue between Srinagar and the Centre. Autonomy is the policy plank of the National Conference. And the Hurriyat would demand much more than the 1953 kind of autonomy. Could we give it to J&K without giving it to other states?

It is strange that a party that said in its manifesto of 1998 that India was one culture and one people has forged a coalition government with 25 regional parties at the Centre. The political system of India today ... mirrors the social, cultural and linguistic diversity. (Can it not accommodate Kashmiriyat?)

(The Hindustan Times, 31 May, 2000)

Marfat.com

ایشیا2025ء

امریکہ کے سیاسی، عسکری اور سفارتی حلقوں میں بھارتی اثر و رسوخ روز بروز بڑھنے لگا تھا اور امریکہ کی طرف سے پاکستان پر دباؤ میں اضافہ ہو رہا تھا کہ وہ بھارت میں ''مداخلت کاروں'' کا راستہ روکے۔ ستمبر 2000ء میں امریکہ کی ایک اعلیٰ سطحی کمیٹی نے جس کی قیادت امریکی انڈر سیکرٹری برائے دفاع کر رہے تھے (ASIA-2025) کے عنوان سے ایک 147 صفحات پر مشتمل رپورٹ شائع کی اس رپورٹ کی تفصیلات جاننے سے پہلے اس رپورٹ کے Participants کا جائزہ لینا ضروری ہے تا کہ اس کی سنگینی کا احساس ہو سکے۔

Participants:

* CHAIRMAN: S. Enders Wimbush, Hicks & Associate
* Lt Col (USMC) Michael F. Brooker, HQMC PP&O
* Victor Cha,Georgtown University
* Nicholas Eberstadt, American Enterprise Institute
* Aaron Friedberg, Princeton University
* Graham Fuller, RAND Corporation
* Stuart Gold Science Applications International Corporation
* Capt (USN) Kari Hasslinger, OSD/Net Assessment
* Jull A. MacDonald, Hicks & Associates
* Rajan Menon,Lehigh University
* Maj (USA) Thomas J. Moffat, National Ground Intelligence Center
* Ross H. Munro, Center for Security Studies
* Abram N. Shuisky, Consultant
* George K. Tanham, RAND Corporation
* Ashley Tellis, RAND Corporation

بھارت کے معروف ہفت روزہ ''Outlook'' کے ہریش مہتہ نے اس رپورٹ کے حوالے سے جو مضمون لکھا اس کا عنوان "The Nuke Box Tune" تھا۔ آؤٹ لک نے تعارفی سطریں یہ دی تھیں۔

Marfat.com

"The United States of America uses its B-2 bombers in the year 2012 to launch conventional air-strikes to destroy Pakistani unclear facilities in a bid to prevent the nukes from falling into the wrong hands. The extraordinary US action follows an unsuccessful Indian conventional attack on Pakistan nukes, and a retaliatory Pakistani nuclear strike against Indian border forces. This sparks the disintegration and disappearance of Pakistan, and creation of an expanded Indian Confederation or Superstate." (Outlook: 18 Sept. 2000)

بھارت کے معروف اردو ہفت روزہ نئی دنیا دہلی نے اس رپورٹ کے حوالے سے ایک مضمون شائع کیا ملاحظہ فرمائیں:

''ہندوستان اور پاکستان ایٹمی آتش فشاں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اگر خدانخواستہ یہ آتش فشاں پھٹ پڑا تو دونوں ملکوں کو قیامت خیز تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ سورج آسمان سے زمین پر اتر آئے گا اور اس کی حدت سے ہر جاندار اور بے جان چیز پگھل کر راکھ ہو جائے گی۔ یہ قیامت کسی وقت بھی آ سکتی ہے۔ پاکستانی ایٹمی طاقت کے خالق ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے حال ہی میں ایک بار پھر یہ دعویٰ کیا ہے کہ ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہر پاکستانی میزائلوں کی زد پر ہیں۔ اسلام آباد میں سائنسی ایوارڈ دیئے جانے کی ایک تقریب میں تقریر کرتے ہوئے پاکستان کے اس ایٹمی دماغ نے کہا کہ پاکستان کے غوری میزائل 5 منٹ کے اندر دہلی اور ممبئی جیسے شہروں کو نشانہ بنا سکتے ہیں اور ''ہمارے پاس اتنی ایٹمی اور میزائلی طاقت ہے کہ ہندوستان کے تمام بڑے شہروں کو تین بار صفحۂ ہستی سے مٹایا جا سکتا ہے۔'' ان کے اس بیان کی ہیبت ابھی تک ختم نہ ہوئی تھی کہ ہندوستان کے وزیراعظم کے چیف ڈیفنس مشیر عبدالکلام کا ہندوستان کی مستحکم میزائل طاقت پر روشنی ڈالنے والا بیان آ گیا۔ عبدالقدیر خان کے دھمکی آمیز بیان پر صرف جنوبی ایشیا کے ملکوں ہی میں نہیں، پوری دنیا میں تشویش کا اظہار کیا گیا ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ پاکستان تیزی کے ساتھ ٹوٹنے اور بکھرنے کے عمل سے دوچار ہے۔ 29 سال قبل اس کا مشرقی بازو ٹوٹا تھا اور وہاں اس بازو کے ٹوٹنے کا غم آج تک منایا جا رہا ہے اس کے علاوہ جس تیزی کے ساتھ بچے کھچے پاکستان میں نسلی، لسانی، ملکی اور قبائلی تنازعات پھیل رہے ہیں اسی تیزی کے ساتھ وہاں مایوسی اور سیاسی عدم استحکام بھی پیدا ہو رہا ہے اور یہی مایوسی ایٹمی تباہی کا سبب بن سکتی ہے۔

جنوبی ایشیا کا نیا نظام:

آج ترقی یافتہ دنیا بالخصوص امریکہ کے بڑے بڑے دماغ پاکستان کی ایٹمی طاقت کے ممکنہ نتائج کا مطالعہ کرنے میں مصروف ہیں، امریکی دماغوں میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ پاکستان کے ایٹمی ہتھیار دوسرے اسلامی ملکوں کے ہاتھوں میں بھی جا سکتے ہیں۔ بڑی طاقتوں کو سب کچھ برداشت ہے مگر یہ بات ایک لحہ کیلئے بھی برداشت نہیں ہے کہ اسلامی ممالک کے

Marfat.com

ہاتھوں میں ایٹمی ہتھیار جائیں کیونکہ وہ ان ہتھیاروں کو بڑی طاقتوں کی بالادستی ختم کرنے کیلئے استعمال کر سکتے ہیں۔

گزشتہ سال امریکہ کے انڈر سیکرٹری ڈیفنس (پالیسی) نے اپنی ایک مطالعاتی رپورٹ میں یہ انکشاف کیا تھا کہ امریکہ کے دفاعی منصوبہ ساز اب اپنی توجہ یورپ سے ہٹا کر ایشیا پر مبذول کر رہے ہیں تا کہ اقتصادی طور پر خوشحالی کی منزلیں طے کرنے والے چین کا راستہ روکا جاسکے۔ 147 صفحات پر مشتمل اس رپورٹ میں جس کا نام ''ایشیا2025ء'' تھا اور جو ایک محدود دائرہ میں تقسیم کی گئی تھی یہ انکشاف بھی کیا گیا کہ چین کا راستہ روکنے کیلئے ہندوستان سے امریکہ اپنے تعلقات میں گہرائی اور قربت پیدا کرے گا۔

اس مطالعاتی رپورٹ میں یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ ''2010ء میں پاکستان کا دوسرا ابکھراؤ شروع ہوگا۔ پنجابیوں کی بالادستی کو ختم کرنے کیلئے مہاجر سڑکوں پر آجائیں گے' طالبان کی سرگرمیاں بھی بڑھ جائیں گی جس کی وجہ سے پاکستان مزید کمزور ہوگا اور جماعت اسلامی کی طاقت میں اضافہ بھی پاکستان کی نقاہتوں میں اضافہ کرے گا۔ جب کہ ہندوستان میں اقتصادی اصلاحات اور سیاسی لامرکزیت کے نتیجہ میں استحکام پیدا ہوگا۔ رپورٹ کے مطابق 2012ء تک مملکت پاکستان مفلوج ہوجائے گی اور کشمیر میں دراندازی کرنے والوں پر حکومت پاکستان کی گرفت کمزور پڑ جائے گی۔ ہندوستان کی جانب سے پاکستان سے یہ مطالبہ کیا جائے گا کہ وہ کشمیر میں دراندازی بند کرے۔ پاکستان اس دراندازی کو بند کرنے میں ناکام رہے گا اور ہندوستان اپنی فوجوں کو ''آزاد کشمیر'' میں داخل کردے گا۔'' ''آزاد کشمیر'' پر ہندوستان کا قبضہ ہوجانے کے بعد پاکستان کی جانب سے ہندوستان پر ایٹمی حملہ کی دھمکی دی جائے گی۔ پاکستان کی اس دھمکی کو چین کی جانب سے تقویت پہنچائی جائے گی اور چین' نیپال اور بھوٹان کے درمیان کے علاقہ میں اپنی فوجیں بھیج دے گا یہ فوجیں ہندوستان کی میزورم' ناگالینڈ' آسام' سکم' چوکی پر قبضہ کرلیں گی اور ہندوستانی جارحیت کو روکنے کیلئے ہر ممکن کارروائی کرنے کی دھمکی دیں گی۔ امریکہ اپنا بحری بیڑا خلیج بنگال میں داخل کردے گا۔ امریکہ کی جانب سے چین کو وارننگ دی جائے گی کہ وہ ہندو پاک جھگڑے میں دخل نہ دے۔ پاکستان کی جانب سے کسی بڑے ایٹمی حملہ کے ڈر کی وجہ سے ہندوستان روایتی ہتھیاروں سے پاکستان کی ایٹمی تنصیبات پر حملہ کر کے انہیں تباہ کردینے کی کوشش کرے گا جس کے نتیجہ میں پاکستان اپنی مشترکہ سرحد پر ہندوستانی فوج کے خلاف ایٹمی ہتھیار استعمال کرے گا اور بچے کھچے ایٹمی ہتھیاروں پر پاکستان کے اسلام پسند عناصر قبضہ کرلیں گے۔

نتیجہ میں پاکستان کی ایٹمی تنصیبات کو تہس نہس کرنے کیلئے امریکہ ان پر روایتی ہتھیاروں سے حملہ کردے گا۔ امریکہ اس لئے بھی ایسا کرے گا تا کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان مکمل ایٹمی جنگ نہ چھڑ جائے۔ ان تمام اقدامات کے نتیجہ میں پاکستان میں مکمل انارکی پھیل جائے گی اور ہندوستان سے ملحقہ پاکستانی علاقے ہندوستان میں شامل ہوجائیں گے۔ ہندوستانی فوجیں پاکستان میں داخل ہو کر امن قائم کریں گی۔ سندھ' بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی صوبہ کی پارلیمنٹس ہندوستانی کنفڈریشن میں شامل ہونے کی قراردادیں منظور کریں گی۔ بعد میں پنجاب بھی اس کنفڈریشن میں شامل ہونے پر مجبور ہوجائے گا اور مشرقی پنجاب میں اس کے ضم ہونے کے بعد عظیم ترین پنجاب عالم وجود میں آئے گا جو کنفڈریشن کا حصہ ہوگا۔ اس کنفڈریشن کی دفاعی اور خارجہ پالیسیاں ہندوستان کی مرکزی حکومت طے کریگی اور کنفڈریشن

Marfat.com

میں شامل یونٹوں کو عظیم تر اندرونی خودمختاری حاصل ہوگی۔''

اس امریکی رپورٹ کا لب لباب یہ تھا کہ ایٹمی ہتھیار پاکستان کی تباہی کا سبب بن جائیں گے اور جنوبی ایشیا میں امریکہ کی مدد سے ایک نیا سیاسی نظام قائم ہوگا جس میں ہندوستان ایک بڑی طاقت کے طور پر ابھرے گا۔ معلوم نہیں اس رپورٹ پر پاکستان کے فوجی حکمرانوں کا کیا ردعمل ہے مگر جس سرعت کے ساتھ پاکستان اپنے امریکہ اور برطانیہ جیسے سرپرستوں کی شفقتوں سے محروم ہو رہا ہے اور جس تیزی کیساتھ امریکہ اور ہندوستان کے تعلقات میں گرم جوشی پیدا ہو رہی ہے اس کے پیش نظر کم از کم یہ تو کہا ہی جا سکتا ہے کہ پاکستان کے وجود کیلئے روز بروز خطرات بڑھ رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں پاکستان کے مہاجر لیڈر الطاف حسین کے ایک حالیہ بیان کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا جس میں انہوں نے کہا ہے کہ ہندوستان کی تقسیم تاریخ کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ اب اگر قدرتی طور پر تاریخ کی اس سب سے بڑی غلطی کو سدھارنے کا عمل شروع ہوا تو امریکہ اپنے نئے رول میں سامنے آئے گا اور پاکستان کیلئے اپنے وجود کو منوانے یا برقرار رکھنے کا سوال ایک بھیانک شکل اختیار کر جائے گا۔ غالباً اسی صورت حال کو پاکستانیوں سے چھپانے اور پاکستانی عوام کو بدستور ایٹمی طاقت کے بھرم میں رکھنے ہی کیلئے عبدالقدیر خان نے ہندوستان کو خاک میں ملا کر رکھ دینے والا بیان دیا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ خود پاکستان کے خاک میں ملنے کا خطرہ زیادہ ہے۔ عبدالقدیر کا بیان اور امریکی دفاعی پالیسی کی رپورٹ سے اگر کوئی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے تو یہی کہ جنوبی ایشیا بالخصوص برصغیر ہندوپاک کے عوام ایٹمی بھٹی پر بیٹھے ہوئے ہیں جو کبھی کھل گئی تو زبردست جانی اور مالی نقصان پہنچانے کے بعد ہی بند ہوگی۔ (نئی دنیا۔ 3 تا 9 اکتوبر 2000ء)

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ایسی رپورٹیں پاکستان پر نفسیاتی حملے کے مترادف ہیں لیکن ان کے پیچھے کارفرما سازش کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

Marfat.com

ورکنگ باؤنڈری

مقبوضہ کشمیر میں مجاہدین کی تیزی سے زور پکڑتی کارروائیوں اور بھارتی افواج کے روز بروز بڑھتے مظالم نے صورت حال کو بہت مخدوش بنا دیا تھا۔ اس مرحلے پر جب کشمیری گاجر مولی کی طرح کٹ رہے تھے ان کی عزتیں اور گھر بار لوٹے اور بارود لگا کر اڑائے جا رہے تھے کشمیریوں کی نمائندہ تنظیم حریت کانفرنس نے بھارتی حکومت سے جنوری 2001ء میں مطالبہ کیا کہ انہیں پاکستان جانے اور مذاکرات کرنے کی اجازت دی جائے جسے بھارت نے درخور اعتنا ہی نہ جانا۔ فروری 2001ء میں بیک ڈور ڈپلومیسی کے تحت بھارت کے ریٹائرڈ فوجی افسران کا 23 رکنی وفد سابقہ بھارتی ایڈمرل رام داس کی سربراہی میں پاکستان کے خیرسگالی دورے پر آیا اور ہمارا میڈیا ان کی پذیرائی میں حریت کانفرس کے وفد کو بھارتی حکومت کی طرف سے پاکستان آنے کی اجازت نہ دینے کے مسئلے کو بھول کر خیرسگالی وفد کے گن گانے لگا۔

اس کے ساتھ ہی بھارتی حکومت کی طرف سے جنرل مشرف کو دورہ بھارت کی دعوت دی جانے لگی' بھارت نے بھارتی علماء کا ایک وفد پاکستان بھیجنے کا اعلان کیا اور اپنی کرکٹ ٹیم کو پاکستان میں کھیلنے کی اجازت بھی دے دی۔ ظاہر ہے بھارت ایسے اقدامات سے دراصل بنیادی اختلافی مسئلہ یعنی کشمیر سے توجہ ہٹانا چاہتا تھا جو پاکستان کیلئے قابل قبول نہیں تھا۔ 2001ء کے آغاز ہی سے بھارت نے ورکنگ باؤنڈری پر باڑ لگانے کی کوششیں تیز کر دی تھیں اور اسے بین الاقوامی سرحد بنانے پر تل گیا تھا۔ ورکنگ باؤنڈری پر بھارت کی طرف سے فائرنگ میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ میں نے اس حوالے سے ایک مضمون ''ورکنگ باؤنڈری پر باڑ لگانے کی کوشش'' لکھا جس سے صورت حال سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

''جموں سیکٹر میں ورکنگ باؤنڈری پر بھارتی فوج کی طرف سے باڑ لگانے کی کوششوں کو ایک مرتبہ پھر پاکستان رینجرز نے ناکام بنا دیا ہے اور بھارتی بارڈر سیکیورٹی فورسز کے ڈائریکٹر گوربچن جگت نے پاکستان رینجرز پر اپنی روایت کے مطابق یہ الزام لگایا ہے کہ انہوں نے بھارت کی طرف سے خاردار باڑ لگانے کیلئے نصب کئے گئے 40 ستون گولہ باری سے تباہ کر دیے ہیں۔ انہوں نے اس عزم کا اظہار کیا ہے کہ وہ بھی ہر صورت یہاں باقی سرحد کی طرح خاردار باڑ لگائیں گے۔ اس عزم کا اعادہ بھارتی وزیر خارجہ مسٹر جسونت سنگھ نے بھی بھرپور انداز میں سرنگر میں اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے کیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ پاکستان سے بھارت میں ہونے والی دراندازی کو روکنے کیلئے نہ صرف خاردار تاروں کا جال بچھائیں گے بلکہ ہر ممکن اقدام کریں گے۔

اس کے برعکس پاکستان کی طرف سے میجر جنرل راشد قریشی نے سختی سے یہ کہا ہے کہ پاکستان رینجرز نے بھارت کی طرف سے جموں کے سامبا سیکٹر میں ورکنگ باؤنڈری پر تار لگانے کی کوشش ایک مرتبہ پھر ناکام بنا دی ہے اور

Marfat.com

مستقبل میں جب بھارت ایسا کرے گا، ہم اس کی بھرپور مزاحمت کریں گے۔ ہم بھارت کو کبھی یہ موقع نہیں دیں گے کہ وہ ورکنگ باؤنڈری یعنی متنازع سرحد کو باقاعدہ اور مستقل سرحد میں تبدیل کرے۔ پاکستان اور بھارت کی سرحدی افواج کے درمیان جموں کے علاقے میں 187 کلومیٹر طویل ورکنگ باؤنڈری پر باڑ لگانے کے سلسلے میں گزشتہ پانچ سال سے تنازع چل رہا ہے۔ ان پانچ سالوں میں بھارتی افواج نے 10 کلومیٹر کی پٹی پر سامبا سیکٹر میں باڑ لگانے کا کام مکمل کر لیا ہے۔

کیا بھارت اس علاقے میں باڑ لگا کر مداخلت بند کرنا چاہتا ہے یا پھر اس کا کوئی اور مقصد ہے؟ اس صورت حال کو سمجھنے کے لئے ماضی میں اس حوالے سے کی گئی بھارتی کوششوں کا جائزہ لینا ہوگا۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان تقریباً گیارہ سو کلومیٹر کی طویل سرحد ہے، جو دریائی، پہاڑی اور میدانی، ہر طرح کے علاقے سے گزرتی ہے۔ اس سرحد میں پاکستان اور بھارت کے درمیان مقبوضہ کشمیر سے ملنے والی کنٹرول لائن بھی شامل ہے، جو بین الاقوامی، یو این او کی قراردادوں اور پاکستان اور بھارت کے درمیان ہونے والے مختلف معاہدوں کے تحت ایک متنازع سرحد ہے یہی وجہ ہے کہ اُسے کچھ عرصہ پہلے تک بھارتی حکومت بھی کنٹرول لائن ہی کہا کرتی تھی۔ البتہ اب انہوں نے انتہا پسندانہ نظریات کی وجہ سے اپنا نقطۂ نظر تبدیل کر لیا ہے، اور اسے اپنی دانست میں مستقل سرحد کا درجہ دے رہے ہیں، حالاں کہ بھارت کا ہر باشعور شہری اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ کشمیر متنازع علاقہ ہے اور متنازع علاقوں کی سرحدیں بھی متنازع ہوا کرتی ہیں، تاوقتیکہ ان کا باقاعدہ تعین نہ ہو جائے۔ اس سرحد کے متنازع ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یو این او کے مبصرین کی یہاں مستقل تعیناتی ہے اور آج تک تمام غیر ملکی سفارتی حکام، جن میں یو این او کے اعلیٰ حکام بھی شامل ہیں، اسے متنازع علاقہ ہے تسلیم کرتے رہے ہیں۔

1984ء سے پہلے پاکستان اور بھارت کے درمیان طویل سرحد پر کہیں بھی خاردار تار نہیں لگائے گئے تھے۔ 1984ء میں بھارتی صوبہ پنجاب میں سکھوں کی علیحدگی پسند تحریک، خالصتان، نے عروج پکڑا اور بھارتی سیکورٹی فورسز کے ساتھ سکھوں کی جھڑپیں شروع ہوئیں تو بھارت نے حسب معمول اس کا ذمے دار پاکستان کو ٹھہرانا شروع کر دیا اور اس الزام کی تکرار ہونے لگی کہ پاکستانی علاقہ سے تربیت حاصل کر کے بھارت میں داخل ہونے والے سکھ انتشار پسند پنجاب میں گڑبڑ پھیلاتے ہیں۔ پاکستان کی طرف سے کبھی اس الزام کو تسلیم نہیں کیا گیا اور نہ ہی کسی بین الاقوامی فورم پر بھارت کبھی اپنے اس الزام کو صحیح ثابت کر سکا۔

بھارت نے اپنے اس پروپیگنڈے میں سچائی کا رنگ بھرنے کیلئے پاکستانی سرحد کے ساتھ خاردار تار لگانے کا سلسلہ شروع کر دیا اور مسلسل ایک ہی بات کی تکرار کی کہ وہ ایسا صرف پاکستان کی طرف سے مداخلت کاروں کو روکنے کے لئے کر رہا ہے۔

طویل اور ناہموار سرحد پر بڑے مضبوط ستون تیار کر کے خاردار تاروں کا جال بچھانا آسان کام نہیں، خصوصاً کسی بھی غریب ملک کیلئے یہ بہت مشکل ہوتا ہے۔ ماضی میں ایسی مثالیں صرف مشرقی یورپ میں ملتی ہیں، جہاں روس کے تسلط کے بعد مشرقی اور مغربی یورپ میں آہنی رسہ تاننے کیلئے روسیوں نے ایسی خاردار باڑوں کا جال بچھانا شروع کیا تھا اور خصوصاً مشرقی اور مغربی جرمنی کے درمیان ایک طویل دیوار بھی تعمیر کر دی، جس کے آر پار جانا ناممکن تھا۔ یہ الگ بات ہے

Marfat.com

کہ اس کے باوجود جنگ عظیم دوم کے خاتمے سے روس کے خاتمے تک ہزاروں لاکھوں لوگوں نے سرحدیں عبور کیں اور مغربی یورپ پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔

ایسا ہی تجربہ کوریا میں ہوا۔ جب کوریا کے شمالی حصے پر کمیونسٹوں کا قبضہ ہوا تو انہوں نے جنوبی کوریا کو اس سے الگ کرنے کیلئے مختلف مقامات پر خاردار تاروں کا جال بچھایا۔

ماضی کے تمام ایسے واقعات اور تجربات یہ بتاتے ہیں کہ جن ممالک نے ایسا کیا اس کی سرحدیں مستقل یعنی بین الاقوامی تھیں اور ان ممالک کے درمیان جنگ عظیم دوم کے خاتمے پر سرحدوں کا باقاعدہ تعین ہو چکا تھا، جس کے بعد خصوصاً کمیونسٹ غلبے والے ممالک نے اپنے عوام کو مغربی ممالک فرار ہونے سے روکنے کیلئے ایسے احتیاطی اقدامات کئے جنہیں آج تک احتیاطی کی بجائے ''جبری'' اقدامات سے تشبیہ دی جاتی ہے اور یہاں سے فرار ہو کر مغربی ممالک تک پہنچنے والوں کو ہیرو کا درجہ دیا جاتا تھا۔ بھارتی عوام مشرقی یورپ کے عوام کی طرح کہاں بھاگے جا رہے تھے؟ اس کا علم تو بھارتی حکام ہی کو ہوگا، لیکن انہوں نے کمیونسٹ دور کی اس یاد کو تازہ کرنے کا جو اہتمام کیا اسے دنیا بھر میں کہیں بھی پذیرائی نہیں ملی۔ بھارت نے یہ تجربہ پاکستان ہی نہیں بنگلہ دیش کی سرحد پر بھی کیا، کیوں کہ بھارتی حکومت کو بنگلہ دیش سے بھی خطرہ رہتا ہے اور وہ بنگلہ دیش سے خصوصاً آسام میں مداخلت کا واویلا بھی کرتی رہتی ہے، حالاں کہ بنگلہ دیش اور بھارت ایک دوسرے کے بہترین دوست ہونے کے دعویدار ہیں۔ اب بنگلہ دیش بھی بھارت کیلئے ناقابل اعتماد دوست بن چکا ہے کیوں کہ بھارت کا کہنا ہے کہ وہاں آئی ایس آئی نے اپنے اڈے قائم کر لئے ہیں جہاں سے وہ گھس بیٹھیوں کو بھارتی علاقے میں داخل کرتی رہتی ہے۔ ورکنگ باؤنڈری پر بھارت کی جانب سے باڑ لگانے اور پاکستان کی جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کی طرف سے بھارت کے اس اقدام کو روکنے کے فیصلے کی اہمیت جاننے کے لئے سب سے پہلے ہمیں اس بات کا جائزہ لینا ہوگا کہ ''ورکنگ باؤنڈری'' کی کیا اہمیت ہے۔ دراصل ورکنگ باؤنڈری، کنٹرول لائن اور حدِ متارکہ جنگ ایک ہی طرح کی سرحد کے مختلف نام ہیں۔ یہ ایسی سرحدیں ہوتی ہیں جو دو ممالک کے درمیان متنازع ہوں اور جن کا فیصلہ ابھی باقی ہو۔ بین الاقوامی سرحد یعنی International Boundary اسے کہتے ہیں جس کا تعین ہو چکا ہو، جس پر دونوں ممالک صاد کر چکے ہوں اور جسے بین الاقوامی سطح پر تسلیم کر لیا گیا ہو۔ جہاں تک مقبوضہ کشمیر کا تعلق ہے، بھارت اور پاکستان کے درمیان اس علاقے سے لگنے والی کوئی بھی سرحد بین الاقوامی سرحد نہیں کہلاتی۔ کیونکہ ابھی ان سرحدوں کا تعین ہونا باقی ہے۔ ان سرحدوں کو ''سیز فائر لائن'' کی حیثیت حاصل ہے، یعنی وہ جگہ جس کے آر پار دونوں ممالک کی فوجوں کے درمیان جنگ بندی ہو چکی ہے اور اب اس جھگڑے کا پُرامن فیصلہ ہونے تک دونوں نے اس ''سیز فائر لائن'' کو کنٹرول لائن تو لیم کر لیا ہے، جس کو عبور کرنا دونوں ممالک کیلئے بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی اور یو این او کی ان قراردادوں کی خلاف ورزی تو لیم کیا جائے گا جنہیں بین الاقوامی برادری منظور کر چکی ہے۔ ایک طے شدہ حقیقت کو تبدیل کرنے کے لئے بھارتی فوج کیوں بہ ضد ہے؟ اس سوال کا جواب کشمیری مجاہدین کی مسلسل جدوجہد ہے جس نے بھارتی فوج اور حکومت کو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ طاقت کے بل بوتے پر کشمیر پر قابض نہیں رہ سکتے، بلکہ انہیں بالآخر مذاکرات ہی کے ذریعے اس مسئلے کا حل تلاش کرنا پڑے گا۔ مجاہدین کی مسلسل قربانیوں، کشمیری عوام کی مسلسل ہلاکتوں اور بھارتی فوج کے بے پناہ مظالم کی رپورٹیں سامنے

Marfat.com

آنے کے بعد اب ساری دنیا، خصوصاً موجودہ امریکی حکومت اس بات کی مکمل طور پر قائل ہو چکی ہے کہ کشمیر ایک فلیش پوائنٹ بن چکا ہے اور اس سرحد پر دونوں ممالک کے درمیان رہنے والی مستقل لڑائی کسی بھیانک جنگ کا روپ اختیار کر سکتی ہے، کیوں کہ دونوں ہی اب ایٹمی صلاحیت حاصل کر چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حال ہی میں امریکی وزیر خارجہ کولن پاؤل اور امریکی صدر بش کے علاوہ کئی امریکی اعلیٰ حکام پاکستان اور بھارت کے درمیان اس مسئلے کے حل کے لئے دلچسپی کا اظہار کر چکے ہیں۔

بھارت اپنے اس جارحانہ عمل کو روکنے کی پاکستانی کوشش کو، جس کا پاکستان کو مکمل حق حاصل ہے اور جسے بین الاقوامی سطح پر تولیم بھی کیا جا چکا ہے، پاکستان کی طرف سے مداخلت قرار دے رہا ہے اور ساری دنیا کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ پاکستانیوں نے گولہ باری کر کے اُن کے چالیس ستون تباہ کر دیئے ہیں، لیکن ابھی تک بھارت نے دنیا کو یہ نہیں بتایا کہ وہ خود کیا چاہتا ہے اور اسے کس بین الاقوامی قانون یا اخلاقیات نے یہ حق دیا ہے کہ وہ اپنی مرضی کے فیصلے دنیا پر ٹھونستا رہے اور ایک متنازع سرحد کو، جس کا فیصلہ ہونا ابھی باقی ہے، خاردار تاروں کے ذریعے اپنے ملک کا اٹوٹ انگ بنا لے؟

دراصل بھارت کا مقصد یہ ہے کہ وہ جموں سیکٹر مین سیالکوٹ کے ساتھ لگنے والی تمام سرحد کو اس طرح باڑ لگا کر بین الاقوامی سرحد میں تبدیل کر لے تاکہ مستقبل میں اگر کبھی اس مسئلے پر مذاکرات ہوں تو بھارتی پہلے ہی سے سرحد کے اس حساس اور متنازع حصے کو بین الاقوامی سرحد کا درجہ دے چکے ہوں اور دنیا سے یہ بات تولیم کرا چکے ہوں۔ یہ ایک گھناؤنی سازش ہے جس کا تعلق براہ راست نہ صرف مسئلہ کشمیر بلکہ پاکستان کی سلامتی سے بھی ہے۔ کیوں کہ ایسی متنازعہ اور غیر مستقل سرحدوں کو اگر مستقل سرحدوں میں تبدیل کرنے کا سلسلہ چل نکلا تو بھارت جموں کے بعد وادی کشمیر کے ساتھ خاردار باڑ لگا کر وہاں بھی مستقل سرحدیں قائم کرنے کا سلسلہ شروع کر دے گا، اس لئے اس جارحانہ کوشش کو ابتدائی مرحلے پر روک دینا پاکستان کے لئے ناگزیر ہے۔

مقام حیرت ہے کہ ساری دنیا اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ ورکنگ باؤنڈری یا کنٹرول لائن کی حیثیت سراسر عارضی اور متنازع ہوتی ہے اور اسے ہرگز بین الاقوامی سرحد کا درجہ نہیں دیا جا سکتا، بھارت اسے نہ صرف بین الاقوامی سرحد کا درجہ دینے کے لئے کوشاں ہے بلکہ اس پر بہ ضد بھی ہے اور اپنے اس عمل کو، جو سراسر زیادتی کے مترادف ہے، بالکل جائز قرار دے رہا ہے۔ اس کا ثبوت بھارتی وزیر خارجہ جسونت سنگھ، بھارتی بارڈر سیکیورٹی فورسز کے ڈائریکٹر جنرل گربچن جگت اور بھارتی وزیر داخلہ ایل کے ایڈوانی کے اس ضمن میں جارحانہ بیانات ہیں۔

بھارتی حکومت گزشتہ دو سال سے عالمی رائے عامہ کو گمراہ کرنے کے لئے یہ تاثر دیتی آئی ہے کہ وہ کشمیر کا مسئلہ بات چیت کے ذریعے حل کرنا چاہتی ہے۔ اب تو انہوں نے پاکستان کو باقاعدہ مسئلہ کشمیر کا ایک فریق بھی تسلیم کر لیا ہے لیکن عملی طور پر بھرتی حکومت کا کردار اس سے بالکل مختلف ہے جس کا ثبوت وہ ورکنگ باؤنڈری پر دے رہے ہیں اس مرحلے پر جب ساری دنیا کے امن پسند حلقوں میں اس امر پر اظہار اطمینان کیا جا رہا ہے کہ امریکا نے نئے سرے سے مسئلہ کشمیر کے پُرامن اور منصفانہ حل کے لئے کوششیں شروع کر دی ہیں، کشمیر جیسے حساس مسئلے کی موجودگی میں امن کو ہمیشہ خطرات لاحق رہے ہیں۔ اب یہ زیادہ ضروری ہو گیا ہے کہ پاکستان بین الاقوامی رائے عامہ کو ورکنگ باؤنڈری پر بھارت کے اس جارحنہ عمل سے آگاہ کرے اور اس کے نتائج و عواقب کا احساس دلائے، کیوں کہ بھارت پر ایک انتہا پسند جماعت کی حکمرانی

Marfat.com

ہے اور اس کے کرتا دھرتا خصوصاً اس مسئلے پر بڑے جارحانہ عزائم رکھتے ہیں۔ ان کا اظہار وقتاً فوقتاً ان کے بیانات کی صورت میں ہوتا رہتا ہے۔ بھارت دوبارہ زیادہ شدت اور طاقت کے ساتھ ورکنگ باؤنڈری پر باڑ لگانے کی کوشش کرے گا، جس کا جواب پاکستانی فوج ضرور دے گی، کیوں کہ پاکستان کی یہ طے شدہ پالیسی ہے کہ وہ بھارت کو ورکنگ باؤنڈری کی حیثیت تبدیل نہیں کرنے دے گا۔ پاکستان کی جوابی کارسائی سے مشتعل بھارتی فوج کوئی بڑا ایڈونچر نہ کر گزرے اس بات کا خطرہ ہمیشہ موجود رہے گا۔ یہاں یہ امر ملحوظ خاطر رہے کہ بھارتی فوج کے موجودہ اور سابق چیف آف آرمی اسٹاف پاکستان کے ساتھ ''محدود جنگ'' کا تذکرہ اکثر کرتے رہتے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس عمل کے پس پردہ بھارتی اعلیٰ فوجی حکام کی ''محدود جنگ'' کی یہ خواہش کارفرما ہو؟ ان حالات میں ایک طرف بھارت ٹریک تو پالیسی کے تحت علماء کو پاکستان بھیج رہا ہے، جنرل مشرف کو دورہ بھارت کی دعوت دی جا رہی ہے اور کرکٹ ٹیم کو پاکستان میں کھیلنے کی اجازت دے دی ہے اور دوسری طرف ورکنگ باؤنڈری پر بھارتی جارحیت میں روز بہ روز اضافہ ہو رہا ہے اسے بھارت کی مستقل مزاجی یا اخلاص کے بجائے سیاسی چال ہے کہا جائیگا۔ (جنگ سنڈے ایڈیشن 3 جون 2001ء مصنف طارق اسماعیل ساگر)

مئی 2001ء جب بھارتی خیر سگالی وفد پاکستان کا دورہ کر رہے تھے تو بھارتی افواج نے راجستھان سیکٹر میں خطرناک جنگی مشق ''پورن وجے'' (مکمل فتح) شروع کر دی جس کا ایک محرک بھارت میں ''تہلکہ ڈاٹ کام'' نامی ایک ویب سائٹ پر جاری ہونے والی بھارتی سیاستدانوں کی کرپشن رپورٹ سے بھارتی عوام کی توجہ ہٹانا بھی بتایا گیا لیکن دراصل یہ پاکستان کے خلاف جاری جارحانہ حکمت عملی ہی کا شاخسانہ تھا۔ اخبار جہاں نے اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھا:

''راجستھان کے ریگزار میں پاکستانی سرحد سے نزدیک گزشتہ دنوں منعقد کی جانے والے بھارتی فوجی مشق کے بارے میں پاک مسلح افواج کے دو ریٹائرڈ جرنیلوں کا فرمانا تھا کہ تہلکہ ڈاٹ کام سکینڈل سے عوام کی توجہ ہٹانے کیلئے واجپائی حکومت نے اہتمام کیا تھا۔ پی ٹی وی کے ایک پروگرام میں آپریشن پورن وجے پر اظہار خیال کرتے ہوئے ریٹائرڈ لیفٹیننٹ جنرل طلعت مسعود اور ایف ایس لودھی نے کہا کہ فوجی آلات حرب وضرب کی خریداری میں کمیشن کھائے جانے پر سیاستدانوں اور مسلح افوج کے اعلیٰ افسران کے خلاف بھارتی ویب سائٹ تہلکہ ڈاٹ کام کی رپورٹس سے پیدا ہونے والے سیاسی بحران سے نمٹنے کیلئے بھارتیہ جنتا پارٹی کی مخلوط سرکار نے آپریشن پورن وجے کا سہارا لیا ہے۔''

1987ء میں ہونے والی جنگی مشق آپریشن براس ٹیک کے بعد حالیہ آپریشن پورن وجے سب سے بڑی ایکسر سائز تھی جس میں 60 ہزار سے زائد فوجیوں اور 120 لڑاکا طیاروں نے پانچ روز تک اپنی حربی وضربی صلاحیت کا بھر پور جائزہ لیا محتاط اندازوں کے مطابق بھارت نے اس مشق پر 600 کروڑ روپے سے زائد رقم خرچ کی۔ سابق وزیر خارجہ آغا شاہی کہتے ہیں کہ اتنے بڑے پیمانے پر جنگی مشق کا مقصد بھارتی قیادت کے اس نظریے کی تصدیق کرنا تھا کہ پاکستان کا جوہری بم اپنے حریف کو حملہ آور ہونے سے روک نہیں سکتا۔ بھارتی حکمرانوں اور مسلح افواج میں یہ سوچ پائی جاتی ہے کہ جنگ کے دوران پاکستان کی جانب سے ایٹم بم کے استعمال کے باوجود بھارت موثر جوابی کارروائی کا اہل رہے گا۔ کیونکہ اس کے پاس افرادی قوت اور روایتی ہتھیاروں کا بہت بڑا ایڈوانٹیج ہے۔ بھارت اپنے وسیع طول وعرض کی بدولت پاکستانی

Marfat.com

ایٹم بم کی تباہ کاریوں سے کافی حد تک بچ سکتا ہے۔ پاکستان کے پاس آٹھ دس ایٹم بم ہوں گے ان سے پورے بھارت کو تباہ نہیں کیا جا سکتا۔ بھارت اپنی افرادی قوت اور روایتی ہتھیاروں کے ذخیرے کو جمع کر کے پاکستان کو فتح کر سکتا ہے۔ آپریشن پورن وجے اس نظریے کو عملی شکل میں دیکھنے کی تفصیلی مشق تھی۔ پورن وجے کا مطلب مکمل فتح بھارت کے دیرینہ جارحانہ عزائم کو بخوبی بے نقاب کرتا تھا۔ آغا شاہی کہتے ہیں، یہ جنگی مشق پاکستان کے خلاف روایتی اسلحہ کی مدد سے لڑی جانے والی محدود جنگ کے خطرے کی گھنٹی ہے۔ (ہفت روزہ اخبار جہاں۔ 21 تا 27 مئی 2001ء)

آپریشن پورن وجے پر بریگیڈیئر (ر) اے آر صدیقی کا روزنامہ The Nation میں لکھا مضمون قابل توجہ ہے۔

''راجستھان کے صحرا میں دس روزہ ''پورنا وجے'' نامی مشقوں کے دوران جنگ میں استعمال ہونے والی مشینری کو پہنچنے والے شدید نقصان اور جوانوں کو لو لگنے کے ناقابل بیان واقعات کے بعد جی ایچ کیو بھارت اس آپریشن کے فوائد اور اس پر اٹھنے والے اخراجات کے مابین پائے جانے والے عدم توازن پر حیران ہو رہا ہوگا۔ 50 سے 54 ڈگری سینٹی گریڈ درجہ حرارت میں جوانوں اور مشینوں کو پہنچنے والا نقصان غیر معمولی طور پر بہت زیادہ ہوتا ہے۔

شدید موسمی حالات میں سخت ترین مشقیں ڈویژنل / بریگیڈ گروپ کی سطح پر قابل فہم اور نتیجہ کی حامل ہو سکتی ہیں۔ کور / آرمی کی سطح پر ایسی مشقیں، پیشہ ورانہ تربیت سے زیادہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے کڑی آزمائش ثابت ہوتی ہیں۔ اگر تو ان مشقوں کا مقصد کارگل میں ناکامی کے بعد جوانوں کا مورال بلند کرنا تھا، تو اس سے سخت منصوبہ تشکیل نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے برعکس اگر ان مشقوں کا مقصد اپنے جوانوں کو ریفریشر کورس کرانا تھا، تو یہ معاملہ پہلے سے لمبی دوڑ دوڑ کر آنے والوں کو کچھ اور فاصلہ طے کرنے پر مجبور کرنے کے مترادف تھا۔ بطور ایک فوجی تجزیہ نگار کے میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ گرم موسم میں فیلڈ آپریشن کے دباؤ اور تناؤ سے جہاں تک ممکن ہو بچنا چاہیے۔ میرا پہلا تجربہ پاک فوج کی مشق ''تیز گام'' تھی۔ یہ مشق مئی 1960ء میں سرگودھا کے علاقے میں کی گئی۔ مشق تیز گام کا مقصد دو پرتی تھا۔

(اے) حال ہی میں پاکستان پہنچنے والے یو ایس، ایم 48 میڈیم ٹینکوں کی میدان کے اندر کارکردگی جانچنا۔

(بی) کمانڈ اور سٹاف کی سطح پر فوج کو 1958ء کے مارشل لاء کے ضمنی اثرات سے نجات دلانا۔

میرا دوسرا تجربہ اپریل مئی 1965ء میں رن آف کچھ میں ہوا۔ یہاں بھارت کے ساتھ ڈویژن کی سطح کا پہلا مقابلہ تھا۔ یہ مشق نہ تھی، بلکہ ایک حقیقی جنگ تھی۔ ایک حقیقی جنگ سے زیادہ ایک تربیت یافتہ، عملی سپاہی (چاہے وہ جوان ہو یا آفیسر) کو پرجوش کوئی اور چیز نہیں کر سکتی۔ ایک مشق چاہے وہ حقیقت کے جس قدر بھی قریب ہو، لڑنے والوں کے جذبوں کو اس حد تک نہیں گرما سکتی، جتنا کہ حقیقی جنگ جوش و جذبہ پیدا کر دیتی ہے۔ چنانچہ رن آف کچھ میں شدید گرمی کے باوجود جوانوں کو وہ تجربہ حاصل ہوا، جو کسی مشق سے کبھی نہیں ہو سکتا۔

پورن وجے مشق میں قابل استعمال گولہ بارود استعمال کیا گیا۔ اس کے باوجود یہ ایک فیلڈ ایکسر سائز تھی اور قطعاً حقیقی جنگ کا متبادل نہ تھی۔ مد مقابل حقیقی دشمن نہ ہونے کی وجہ سے جوانوں میں وہ جوش و جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا جو ہونا چاہیے، جنگ لڑنے والے جوان کا بوجھ کم کر دیتی ہے، جسمانی بھی اور ذہنی بھی۔ اس کے برعکس محض ایک مشق اسے برہم کر کے رکھ دیتی ہے۔

آیئے اب ''پورنا وجے'' کا بغور جائزہ لیتے ہیں۔ 1986ء میں ہونے والی مشق ''براس ٹیکس'' کے بعد یہ کور

Marfat.com

آرمی لیول کی تیسری مشق تھی۔ دوسری مشق شیوو کتی تھی جو 1998ء میں کی گئی۔

جنوبی بلاک نے اعلان کیا تھا کہ ''پورنا وجے'' براس ٹیکس، کے بعد دوسری بڑی مشق ہے۔ یہ اعلان دانستہ ڈس انفارمیشن پر مبنی ہے۔ بھارت کے اوپن ذرائع سے حاصل کردہ معلومات ''اور مشق ''شیو شکتی'' میں پائی جانے والی مشترکہ خصوصیات واضح کر دیتی ہے۔ ہفت روزہ ''آوٹ لک'' نے 21 دسمبر 1998ء کے شمارے میں لکھا:

''شیو شکتی آپریشن براس ٹیکس کے بعد سب سے بڑی مشق ہے۔ اس میں 60 ہزار جوان، 4500 جونیئر کمشنڈ آفیسر اور 1800 ہیوی آرٹلری گنز، آرمرڈ پرسنل کیریئر، ریڈار اینڈ کمیونیکیشن سسٹم، میزائل لانچرز، اینٹی ایئر کرافٹ گنز، جیگوار مگ 27 اور حملہ کی صلاحیت رکھنے والے ہیلی کاپٹروں کو بھی مشق کے دوران استعمال کیا گیا۔ لیفٹیننٹ جنرل ایچ ایم کھنہ جو جنوبی کمان کے جی او سی تھے، نے بتایا ''اس مشق کی اضافی اہمیت تصور کی جاتی ہے کیونکہ اس سے مدمقابل کا جارحانہ آپریشن کر لیا جاتا ہے۔''

آپریشن کی پلاننگ، فوج اور اسلحہ کی میدان میں صف آرائی کے لئے جتنا عرصہ لگتا ہے، اس کے بارے میں بھی ڈس انفارمیشن کا سہارا لیا گیا ہے۔ سرکاری اعلان کے مطابق یہ مشقیں فوجی کمانڈروں کے ایک فیصلے کی نتیجے میں زیر عمل لائی گئیں۔ یہ فیصلہ ان کے نئی دہلی میں ہونے والے اجلاس میں کیا گیا جو 23 سے 26 اپریل تک جاری رہا۔ متعلقہ پیرگراف کچھ یوں تھا ''وزارت دفاع نے اپنے ایک بیان میں کہا ہے کہ کانفرنس میں ہونے والے فیصلوں پر عمل درآمد کے سلسلے میں بھارتی فوج متعدد تربیتی مشقیں کرے گی جس کا مقصد منصوبوں کا اندازہ لگانا اور مستقبل کے لئے میدان جنگ میں جوہری پس منظر کو مدنظر رکھتے ہوئے جارحانہ اور مدافعانہ آپریشنوں کے دوران جنگی حکمت عملی کی پریکٹس کرنا ہے۔

پورنا وجے کا مقصد نیوکلیئر کیمیکل اور بائیولوجیکل حملوں کے لئے درپیش چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لئے طریقہ کار کا جائزہ لینا تھا۔ حاصل معلومات کی روشنی میں اور مناسب درجے کی درستی کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مشقیں بھارت کے ڈرافٹ نیوکلیئر ڈاکٹرائن کا پہلا ٹیسٹ تھیں۔ یہ نظریہ 1998ء میں منظر عام پر لایا گیا جبکہ ابھی پوکھران کے دھماکوں کو تین مہینے بھی پورے نہیں ہوئے تھے۔ ڈرافٹ نیوکلیئر نظریہ کے بارے میں کہا گیا کہ یہ کسی خاص ملک کے لئے نہیں ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر اتنی بڑی مشقیں کرنے کا کیا مطلب ہوا اور وہ بھی پاکستان کی سرحدوں کے بالکل قریب؟ یوں ڈرافٹ نیوکلیئر نظریہ اگر کسی خاص ملک کے لئے نہیں بھی ہے تو پورنا وجے یقیناً دوہرے روایتی جوہری پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر کی گئی۔ ایچ کیو جائنٹ چیفس آف سٹاف اور جی ایچ کیو نے ''پورنا وجے'' کا جائزہ ضرور لیا ہوگا۔ یہ بات بڑے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اتنے بڑے آپریشن کی منصوبہ بندی پر مہینے نہیں تو چند ہفتے ضرور لگے ہوں گے۔ پھر سٹاف ورک اور آپریشن کے لئے فنڈز کی فراہمی کا مرحلہ بھی ہے جوانوں، مشینری اور گولہ بارود کو مقررہ پوزیشنوں تک لانے میں بھی مزید ایک دو ہفتے لگے ہوں گے۔ ایک فیلڈ آرمی کے لئے اپنے ہیڈکوارٹر سے آپریشن کے علاقے تک آنے کے لئے مقررہ ایک ہفتہ کا وقت ماننے والی بات نہیں ہے۔ حقیقی دشمن کی عدم موجودگی اور کارگل اور راجستھان کے موسموں کا فرق تو ایک طرف بھارتی اعلیٰ کمان کو یہ تو پتہ ہونا چاہئے کہ فوجی نظم و انصرام کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ آپ فوجی نظم و انصرام کو بھی چھوڑ دیں، روایتی جوہری مشقوں جیسے کہ پورنا وجے کے بارے میں سوچ بچار پر ہی کئی ماہ لگ جاتے ہیں۔ (The Nation 4 June 2001)

Marfat.com

آگرہ مذاکرات

جنرل مشرف نے بھارتی دورے پر آمادگی ظاہر کردی تھی لیکن ابھی تک سنجیدہ حلقوں کو اس بات کا یقین نہیں آ رہا تھا کہ جنرل مشرف کا یہ دورہ کامیاب رہے گا اور یہی باور کیا جا رہا تھا کہ مقبوضہ کشمیر میں مجاہدین کے ہاتھوں تنگ آنے کے بعد بھارت وقت حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ اس دورے سے پہلے روزنامہ ''اُمت'' نے باخبر ذرائع کے حوالے سے ایک رپورٹ شائع کی جس میں دعویٰ کیا کہ جنرل مشرف اور واجپائی کے درمیان امریکہ کے تیار کردہ ورکنگ پیپر پر بات ہوگی جس کے مطابق کشمیر تین حصوں میں تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

(روزنامہ اُمت کراچی 22 جون 2001ء)

دونوں حکومتوں کی طرف سے اس خبر پر کوئی تبصرہ نہیں کیا گیا۔ آسٹریلیا کے دورے پر گئے بھارتی وزیر خارجہ جسونت سنگھ نے اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ بھارت پاکستان کو اپنا نمبر ون دشمن نہیں سمجھتا۔

(روزنامہ نیوز کراچی 22 جون 2001ء)

مئی کے آخری ہفتے میں بھارتی چیمبر آف کامرس کے عہدیداروں نے پاکستان کا دورہ کیا وفاقی وزیر الطاف سلیم نے وفد سے ملاقات کی اور پاکستان جواب تک یہ کہتا آیا تھا کہ کشمیری عوام کی لاشوں اور خون پر بھارت سے تجارت نہیں ہوسکتی اچانک بدل گیا۔ وفاقی وزیر نے فرمایا ہم بھارت سے تجارتی تعلقات کا فروغ چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں ہر ممکن اقدامات کئے جائیں گے۔ (روزنامہ جنگ کراچی یکم جون 2001ء)

اس سلسلے میں عملی قدم اٹھایا گیا اور بھارت سے درآمد کئے جانے والے خام لوہے کی درآمد پر ڈیوٹی کی شرح ایک فیصد کردی گئی جبکہ دیگر ممالک سے درآمد ہونے والے خام لوہے کی ڈیوٹی میں کمی نہیں لائی گئی۔

(ہفت روزہ تکبیر کراچی ''بھارت مذاکرات پر کیسے آمادہ ہوا'' 7 جون 2001ء)

دہلی میں پاکستان کے ہائی کمشنر اشرف جہانگیر نے اس دعوت کے پس پردہ امریکی کردار کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ بھارت سے دوطرفہ مذاکرات کبھی نتیجہ خیز نہیں رہے۔ مذاکرات کی کامیابی کے لئے تیسرے فریق کی موجودگی ضروری ہے۔ (ٹائمز آف انڈیا 29 مئی 2001ء)

جنرل مشرف بھارت تشریف لے گئے جہاں ان کا پرتپاک استقبال ہوا۔ آگرہ میں مذاکرات ہوئے اور عین آخری لمحات میں جب دونوں حکومتوں کا مشترکہ اعلامیہ جاری ہونے والا تھا اُسے روک لیا گیا بعض الفاظ بعد میں شامل کرنے پر پاکستان معترض تھا لیکن ایک سازش کے تحت (جس کی ذمہ داری بھارتی ذرائع ابلاغ نے ایل کے ایڈوانی پر

Marfat.com

ڈالی) ان مذاکرات کو ناکام بنا دیا گیا۔ صدر مشرف خالی ہاتھ واپس لوٹ آئے لیکن یہ سوال اپنی جگہ قائم تھا کہ آگرہ مذاکرات ناکام رہے یا کامیاب؟ ایسے اور کئی سوالات کے جوابات بھارت میں سابق پاکستانی ہائی کمشنر شاہد امین کے ایک مضمون میں ملتے ہیں۔ شاہد امین لکھتے ہیں:

''آگرہ کی پاک ہند سربراہ کانفرنس بظاہر ناکام رہی لیکن اگر اسے تاریخی پس منظر میں دیکھا جائے تو اس کے مثبت پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت پسندی کا تقاضا ہے کہ آگرہ کانفرنس کی کامیابیوں اور ناکامیوں، دونوں پر نظر رکھی جائے، تاکہ مستقبل کے لئے کوئی بامعنی پالیسی اختیار کی جا سکے۔ تجربے کی بنیاد سیاسی مصلحتیں نہیں ہونی چاہئیں، نہ ہی جذبات میں بہہ کر غیر متوازن نتائج اخذ کرنے چاہئیں اور نہ ہی حکومت کی ہاں میں ہاں ملانے کی درباری رسم سے کچھ حاصل ہو سکتا ہے۔ ایک بات کی شروع میں ہی وضاحت کر دینی چاہئے بعض سرکاری حلقے اس بات پر خوش ہیں کہ ان کے بقول پاکستان نے بھارت کو مجبور کر دیا کہ وہ کشمیر کے مسئلے پر بات کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ بھارت کے وزیر اعظم واجپائی نے اپنے دعوت نامے میں ہی یہ عندیہ دے دیا تھا کہ بات چیت میں کشمیر کا مسئلہ بھی شامل ہوگا۔ اس کے علاوہ گزشتہ دو ماہ میں انہوں نے کئی بار اپنے بیانات میں واضح طور پر کہا کہ کشمیر کے مسئلے پر بات چیت ہوگی۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ جب بھی بات چیت ہوتی ہے، کشمیر کے بارے میں دونوں ممالک کے نظریات بالکل متضاد ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ دو بہروں کے درمیان مکالمے کی طرح کا معاملہ ہوتا ہے۔

اُدھر بھارت میں یہ غلط تاثر تھا کہ صدر پرویز مشرف کشمیر کے علاوہ کسی اور موضوع پر بات چیت کے لئے تیار نہیں۔ صدر پاکستان نے اس بات کی بار بار تردید کی۔ آگرہ کانفرنس میں کئی موضوع زیر بحث آئے تاہم کشمیر کا مسئلہ سرفہرست رہا اور صدر مشرف کے بیان کے مطابق زیادہ تر مسئلہ کشمیر پر ہی مذاکرات ہوئے بلکہ ایک لحاظ سے کشمیر کی مرکزیت پر پاکستان کے اصرار پر بھارتی وزیر اعظم، باوجود اپنے رسمی انکار کے، عمداً اس مسئلے پر بات کرنے پر مجبور ہو گئے۔

پاکستان میں بعض تجزیہ نگار امیدوں کے قلعے بنانے لگے کہ اس کانفرنس میں مسئلہ کشمیر پر کوئی واضح پیش رفت ہو جائے گی۔ یہ بھی کہا گیا کشمیری حریت پسندوں نے بھارت کی فوج کو اتنا نقصان پہنچایا ہے کہ دہلی کو مجبوراً صدر مشرف کو دعوت دینی پڑی تاکہ بات چیت کے ذریعے کشمیر کے مسئلے کا کوئی حل نکالا جائے لیکن بھارت کے سیاسی ماحول پر گہری نظر رکھنے والے مبصرین کو یہ محض ایک خوش فہمی نظر آئی تھی، نہ ہندوستانی حکومت اور نہ ہی حزب اختلاف کی جماعتیں کشمیر کے بارے میں اپنی روایتی پوزیشن سے ہٹنے پر مائل نظر آتی تھیں اور آگرہ مذاکرات نے یہ ثابت بھی کر دیا۔ مشترکہ اعلامیے کے ضمن میں تعطل اور ناکامی کی وجہ مسئلہ کشمیر پر بھارت کی سخت گیر پالیسی ہی تھی۔ بھارت کا مسلسل یہ ہی اصرار ہے کہ کشمیر اس کا اٹوٹ انگ ہے اور کشمیر میں خون ریزی کی بنیاد مبینہ طور پر پاکستان کے لئے قابل قبول نہیں۔ اس کے برعکس پاکستان کا مطالبہ ہے کہ کشمیریوں کو حق خود ارادی ملنا چاہئے اور مقبوضہ کشمیر میں گڑبڑ کی وجہ یہ ہے کہ بھارت یہ حق دینے سے انکار کر رہا ہے اور کشمیریوں کی جائز جدوجہد کو دبانے کے لئے بے رحمانہ انداز میں طاقت کا استعمال کر رہا ہے۔ غرض یہ کہ دونوں ممالک مسئلہ کشمیر پر اپنے اپنے موقف پر سختی سے ڈٹے ہوئے ہیں۔ ان حالات میں عقل یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ کشمیر کے مسئلے کے حل کے لئے کوئی معنی خیز پیش رفت کیسے ہو سکتی ہے۔ جو تعطل گزشتہ 54 برس سے جاری ہے وہ غالباً مستقبل

Marfat.com

قریب میں بھی جاری رہے گا۔

آگرہ کانفرنس کی خاص اہمیت یہ ہے دونوں ممالک میں اعلیٰ ترین سطح پر بات چیت کا سلسلہ جاری ہو گیا ہے۔ مشترکہ اعلامیہ جاری نہ ہونے کے باوجود دونوں طرف سے اس عزم کا اعادہ کیا گیا ہے کہ آئندہ بھی بات چیت جاری رہے گی اور بھارت کے وزیراعظم واجپائی پاکستان آنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ دونوں سربراہ نیویارک میں اور سارک سربراہ کانفرنس کے موقع پر بھی اپنی بات چیت جاری رکھیں گے گویا بجائے محاذ آرائی کے دونوں ممالک پرامن مذاکرات کی راہ پر گامزن ہوں گے۔ ہندوپاکستان تعلقات کے مخصوص پس منظر میں یہ ذات خود ایک امید افزا رخ ہے۔ دوسری کامیابی یہ ہے کہ آزادی کے بعد پاکستان کے کسی صدر کا یہ پہلا باضابطہ دورہ بھارت تھا جس میں پورے پروٹوکول کو ملحوظ خاطر رکھا گیا۔ بھارت میں جتنی دلچسپی اس سربراہ ملاقات میں لی گئی اتنی شاید ہی کسی اور ملاقات میں لی گئی ہو۔ صدر پرویز مشرف کا بہت گرمجوشی سے استقبال کیا گیا چنانچہ ہمیں ایک نادر موقع ملا کہ پاکستان کے نقطہ نظر کو بھارت کی قیادت، ذرائع ابلاغ اور عام لوگوں کے سامنے براہ راست پیش کریں۔ صدر مشرف قابل تحسین ہیں کہ انہوں نے بہت قابلیت اور معقولیت سے ہمارے موقف کو بیان کیا۔ گزشتہ دو سال سے بھارت میں جنرل مشرف کے بارے میں خاصا منفی پروپیگنڈا کیا جا رہا تھا دورہ بھارت میں وہ اپنے آپ کو ایک معقول اور معتدل شخصیت ثابت کرنے میں کافی حد تک کامیاب رہے بلکہ مقابلتاً واجپائی جی کافی ماند پڑ گئے۔ ایک تجزیہ یہ بھی ہے کہ صدر مشرف کی بھارت کے ذرائع ابلاغ اور عام لوگوں کے ساتھ اپنا امیج اونچا کرنے میں کامیابی ہی بالآخر آگرہ کانفرنس کے آخری دور کے تعطل کی وجہ بنی۔ شاید واجپائی حکومت کو یہ خدشہ ہوا کہ اگر مشترکہ اعلامیہ ہاتھ میں لے کر پرویز مشرف پاکستان لوٹتے ہیں تو ایک عام تاثر یہ ہوگا کہ آگرہ کانفرنس میں اصل کامیابی پاکستان کی تھی۔ قدیم روم کے حکمران جولیس سیزر کے بارے میں کہا گیا تھا ''وہ آیا، اس نے دیکھا اور فتح کر لیا'' بھارت تیار نہیں تھا کہ پروز مشرف کے بارے میں بھی ایسا ہی کہا جائے۔ ویسے بھارت کی حکومت کا ایک حد تک یہ کہنا جائز ہے کہ مذاکرات کے دوران برسرعام اپنا موقف بیان کرنا سفارتی روایات سے مطابقت نہیں رکھتا۔ بہتر تھا کہ صدر مشرف بھارت کے ذرائع سے وابستہ افراد سے ملاقات کانفرنس کے اختتام پر کرتے یا کم از کم ان کی یہ ملاقات براہ راست ٹیلی ویژن پر نہ دکھائی جاتی ان کی روانگی کے بعد اسے نشر کیا جا سکتا تھا۔ درحقیقت صدر مشرف نے جس حد تک بھارتی اخبار نویسوں کو قائل کر دیا اس کا بھارت کی حکومت نے یہ مطلب نکالا کہ صدر پاکستان براہ راست بھارت کی رائے عامہ کو متاثر کر کے یہ کوشش کر رہے ہیں کہ بھارت کے عوام خود اپنی حکومت پر دباؤ ڈالیں کہ وہ پاکستان کے ساتھ مذاکرات میں لچک رکھے۔ یہ بات واجپائی حکومت کو ناگوار گزری اور آخری دن تعطل کا شکار ہو گیا۔ اس میں البتہ کوئی شبہ نہیں کہ یہ تعطل بھارت کے رویے کی وجہ سے ہوا جس نے جان کر مشترکہ اعلامیہ کے اجرا کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر دی تھیں۔ اس قسم کی بدنیتی سے اعتماد کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ اس سلسلے میں مختلف اطلاعات آئیں اور قیاس آرائی ہوئی کہ مشترکہ اعلامیہ کو سبوتاژ کرنے میں کسی کا ''غیر مرئی'' طاقت کا ہاتھ تھا۔ جنرل راشد قریشی نے یہ مخصوص الفاظ غالباً بھارت کے وزیر داخلہ ایل کے ایڈوانی کی طرف اشارہ کر کے استعمال کئے تھے۔ بعد میں ایڈوانی صاحب نے اس کی تردید کر دی۔ ایک اطلاع تھی کہ بھارتی حکومت میں شامل دو کٹر ہندو شدت پسند وزیروں نے استعفیٰ دینے کی نہ صرف دھمکی دی تھی بلکہ یہ کہ آر ایس ایس کی قیادت جناب

Marfat.com

واجپائی کی جگہ مرلی منوہر جوشی کو وزیراعظم بنانے کا ارادہ رکھتی تھی اور اس دھمکی کے سامنے واجپائی صاحب نے گھٹنے ٹیک دیئے ان خبروں کی بھی تردید ہوئی۔ بھارت کے وزیر خارجہ جسونت سنگھ نے زور دے کر کہا کہ بھارت کی کابینہ میں کوئی اختلاف رائے نہیں تھا اور ان کے کسی رفیق وزیر نے مشترکہ اعلامیے میں تبدیلی کرنے پر اصرار نہیں کیا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا گیا کہ خود وزارت خارجہ کے افسران مشترکہ اعلامیے میں تبدیلیاں کرنے میں سرگرم تھے۔ یہ قرین از قیاس نہیں۔ سرکاری افسروں کو یہ ہمت نہیں ہوسکتی کہ ملک کے وزیراعظم اور خود اپنے وزیر خارجہ کی ہدایات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایک ایسے تاریخی اعلان کے اجرا کو ناکام بنا دیں اور اگر ایسا ہوا بھی تھا تو جب صدر پرویز مشرف نے اس معاملے کو وزیراعظم واجپائی کے سامنے اٹھایا تو وہ سختی سے اس قسم کے نافرمان افسروں کو تنبیہ کر سکتے تھے۔ بہرحال اس واقعے سے یہ تاثر قائم ہوا کہ حکومت پر واجپائی صاحب کی گرفت ڈھیلی ہے۔ خواہ مخالفت ان کے وزرا کی طرف تھی یا نوکرشاہی کی طرف سے ہوسکتا ہے کہ یہ عمر کا تقاضا ہو اور واجپائی صاحب کی کمزور صحت کا بھی اس میں عمل دخل ہے۔ تاہم برصغیر میں امن کی خواہش رکھنے والوں کی یہ دعا ہوگی کہ واجپائی کم از کم کچھ عرصے کے لئے وزیراعظم رہیں تاکہ بات چیت کا جو عمل شروع ہوا ہے اس میں کوئی تعطل نہ آ جائے جیسا کہ ایک بار پہلے ہو چکا ہے جب جواہر لال نہرو مسئلہ کشمیر پر پاک ہند مذاکرات شروع ہونے کے دوران انتقال کر گئے تھے۔ شیخ عبداللہ ان دنوں پاکستان میں ہی اس سلسلے میں موجود تھے نہرو کی موت کی خبر آئی۔ ایک سال بعد 1965ء کی جنگ چھڑ گئی۔ حالیہ مذاکرات کا دور یقیناً واجپائی کے ایما پر شروع ہوا۔ انہوں نے جنرل پرویز مشرف کو بھارت آنے کی دعوت دے کر سب کو حیران کر دیا۔ قبل ازیں 1999ء میں پاکستان میں اقتدار کی تبدیلی کے بعد سے بھارتی حکومت نے جنرل پرویز مشرف کی حکومت کا ایک طرح سے بائیکاٹ کر دیا تھا کہ وہ فوجی آمر اور کارگل کے واقعے کے ذمے دار ہیں۔ اس کے علاوہ جنرل مشرف کے بھارت کا دورہ کرنے کی دعوت کے پیچھے واجپائی حکومت کی حکمت عملی کے غالباً دو محرکات تھے۔ ایک محرک جنگ بندی کی پالیسی کی ناکامی تھی۔ کئی مہینے گزر جانے کے باوجود نہ مقبوضہ کشمیر میں تشدد کے واقعات میں کوئی کمی آئی تھی اور نہ ہی مجاہدین کی تنظیموں کے ساتھ بات چیت میں کوئی پیش رفت ہوئی تھی چنانچہ دہلی نے جنگ بندی ختم کر کے فیصلہ کیا کہ مذاکرات کے ذریعے مزاحمت کو کچلا جائے دوسرا محرک یہ تھا کہ جنگ بندی ختم ہونے پر بین الاقوامی تنقید روکنے کے لئے پاکستان کو بات چیت کی دعوت دی جائے اگر اس سے کشمیر میں پاکستان کی مبینہ مداخلت کم ہو جائے تو فائدے کی بات ہے اور اگر بات چیت ناکام بھی ہوتی ہے تو دنیا کو بہرحال یہ تاثر دیا جا سکتا ہے کہ بھارت ایک امن پسند ملک ہونے کے ناتے دوستی کا ہاتھ بڑھا رہا تھا گویا کہ پرویز مشرف کو بھارت کے دورے کی دعوت دینا ایک ٹیکٹیک کی تبدیلی تھی۔ یہ کشمیر کے مسئلے پر بنیادی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ہی یہ کہنا بھی شاید درست ہوگا کہ واجپائی جی ذاتی طور پر خواہاں ہیں کہ برصغیر میں کچھ بہتر فضا قائم ہو۔ جب وہ 1977ء میں دو سال کے لئے وزیر خارجہ بنے تھے تب بھی انہوں نے پاکستان کے ساتھ تعلقات کو بہتر کیا تھا۔ میں خود اس وقت ہندوستان میں قائم مقام سفیر اور واجپائی کے دورہ پاکستان میں ان کے ساتھ اسلام آباد اور لاہور میں موجود رہا۔ یقیناً ان کے دورے سے حالات میں کچھ بہتری آئی تھی چنانچہ واجپائی کو ہمیشہ اس بات پر فخر رہا ہے کہ ان کے دو سالہ دور میں پاکستان کے ساتھ تعلقات بہتر ہوئے اب وہ عمر کی اس منزل پر ہیں کہ برصغیر میں حالات کو تبدیل کرنے کے لئے شاید ان کے پاس زیادہ

Marfat.com

وقت نہیں ہے۔ چنانچہ تاریخ میں اپنا ممتاز مقام بنانے کے لئے واجپائی نے صدر پاکستان کو دعوت دے کر امن کا راستہ اختیار کیا۔ بھارت کا موقف تھا کہ جب تک پاکستان سرحد پار مقبوضہ کشمیر میں اپنی مبینہ دخل اندازی ختم نہیں کرتا، اس وقت تک کوئی بات چیت نہیں ہوگی لیکن ان دو مطالبوں میں کامیابی نہ حاصل کرنے کے باوجود مئی میں واجپائی صاحب نے جنرل مشرف کو دعوت نامہ بھیجا۔ اس قلابازی پر کافی تبصرے ہوئے بعض پاکستانی تجزیہ نگاروں نے کہا کہ بھارت کشمیر سے کافی نقصان اٹھا رہا ہے اور فرار کا راستہ تلاش کر رہا ہے۔ بعض مبصرین نے کہا یہ سب کچھ امریکہ اور بعض دیگر ممالک کے دباؤ پر کیا جا رہا ہے۔ غالباً یہ دونوں قیاس آرائیاں حقیقت پر مبنی نہیں، اگر پہلی تھیوری صحیح تھی تو آگرہ میں ہندوستان کا مشترکہ اعلامیے پر رویہ اتنا سخت گیر نہ ہوتا۔ اس کے علاوہ بھارت میں کشمیر کے بارے میں بنیادی پالیسی کے خلاف کوئی آواز نہیں سنی جا رہی چنانچہ امریکہ کا ویت نام میں ناکام ہونا اور سابق سوویت یونین کا افغانستان سے نکلنا، بھارت کی کشمیر پالیسی سے مطابقت نہیں رکھتے۔ ایسے موازنے حقیقت پسندی پر مبنی نہیں بلکہ آگرہ میں آخری دن ایک بیان میں بھارت کی حکومت نے واضح کیا کہ وہ کشمیر میں امن و امان بحال کرنے کی پوری استطاعت رکھتی ہے اور اس کے پاس ضروری طاقت بھی ہے۔ جہاں تک امریکی احکام چلتے رہے ہیں اگر ایسا ہوتا تو پاکستان اپنی نیوکلیئر پالیسی پر قائم نہیں رہ سکتا تھا اور نہ ہی بھارت بار بار ایسی پالیسیوں پر کاربند رہ سکتا تھا، جو امریکی تقاضوں کے منافی تھیں۔ یقیناً امریکہ کی خواہش ہے کہ برصغیر میں امن اور استحکام کی فضا قائم ہوتا کہ دو نیوکلیئر طاقتیں عالمی امن کے لئے کوئی خطرہ نہ بن جائیں لیکن اس سلسلے میں امریکی دباؤ کی کوئی شہادت نہیں البتہ یہ اور بات ہے کہ اس دعوت سے زیادہ فائدہ پرویز مشرف نے اٹھایا۔ آخر میں جب مشترکہ اعلامیے پر دشواریاں محسوس ہوئیں تو اس پر بھارت ہی کو زیادہ تر مبصرین نے مورد الزام ٹھہرایا، گویا کہ ہندوستان کی اس سلسلے میں جو توقعات اور منصوبہ بندی تھی، وہ پوری نہیں ہوئی لیکن بہرحال جب تک امن مذاکرات جاری رہیں گے عالمی رائے عامہ کو اطمینان رہے گا۔ حریت کانفرنس کے بارے میں بھی بھارتی منصوبہ بندی تضاد کا شکار رہی۔ چند ماہ پہلے دہلی اس بات پر رضامند تھا کہ حریت کا ایک وفد پاکستان جائے۔ بعد میں وفد کی تشکیل پر اختلافات ہوئے لیکن اصولاً بھارت حریت کی پاکستانی قیادت سے بات چیت پر تھا۔ اب جب صدر پرویز مشرف نے حریت کے لیڈروں کو دعوت دی کہ وہ دہلی میں ان سے ملاقات کریں تو بھارت کی حکومت نے بلاجواز اس پر اعتراض کر دیا، بلکہ ماضی میں جب صدر فاروق لغاری دہلی سارک کانفرنس کے سلسلے میں گئے تھے تب بھی حریت کے لیڈروں سے ان کی ملاقات ہوئی تھی اور بھارت نے اس پر اعتراض نہیں کیا تھا چنانچہ اس وقت واجپائی حکومت کا اعتراض غیر منطقی تھا۔ پاکستان اور حریت کانفرنس کا یہ موقف بھی صحیح ہے کہ کشمیر پر بات چیت میں کسی مرحلے پر کشمیریوں کو اس عمل میں شامل کرنا ہوگا اس کے بغیر کوئی حل قابل عمل نہیں ہو سکتا۔ ساتھ ہی پاکستان کی حریت کانفرنس کے علاوہ دوسرے کشمیری حلقوں سے بات چیت پر اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔

صدر پرویز مشرف کا مہاتما گاندھی کی سمادھی پر جانا اور ان کے بارے میں نیک خیالات کا اظہار ایک خوش آئند بات تھی۔ صدر نارائین کا اپنی تقریر میں قائداعظم کا اچھے الفاظ میں ذکر بھی دونوں ملکوں میں خیرسگالی بڑھانے کی طرف ایک مثبت قدم تھا۔ اس سے دونوں قیادتوں کی بالغ نظری کی عکاسی ہوتی ہے۔ ہمیں ایک دوسرے کے بانی لیڈروں

Marfat.com

کی عزت کرنی چاہئے اسی سے باہمی اعتماد کی فضا قائم ہوگی۔ قائداعظم نے تو بالکل صحیح تجزیہ کیا تھا کہ جب پاکستان حاصل کر کے برصغیر کا بنیادی تنازع حل ہوگیا تو پوری امید رکھنی چاہئے کہ دونوں آزاد ملک باہمی دوستی اور تعاون کی فضا قائم کریں گے۔ صدر نارائن نے اب قائداعظم کے ان خیالات کی تائید کر دی ہے۔ امن اور تعاون ہی صحیح راستہ ہے۔ اسی کے ذریعے برصغیر کے کروڑوں عوام جو غربت کے سائے میں پس رہے ہیں اپنی حالت سنوار سکیں گے چنانچہ صدر پرویز مشرف کے اس اعلان کا کہ ''کشمیر کا کوئی فوجی حل نہیں'' بھارت میں بھی خیر مقدم کیا گیا۔ ضروری ہے کہ شدت پسند حلقوں کے دباؤ کو کم کر کے دونوں ملکوں کی قیادت میانہ روی اور لچک دار طریقہ رویہ اختیار کرے اسی میں برصغیر کی بہتری ہے۔

(جنگ سنڈے ایڈیشن 29 جولائی 2001ء)

صدر جنرل مشرف کے دورہ بھارت کی ناکامی کے بعد میں نے دونوں ممالک کی حکومتوں کے لئے لمحہ فکریہ جانتے ہوئے ایک مضمون بعنوان ''پاک بھارت دفاعی اخراجات'' لکھا تھا جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ 54 برس پر محیط دشمنی کی قیمت برصغیر کے عوام ادا کر رہے ہیں، ملاحظہ فرمائیں:

''صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف نے گزشتہ دنوں بھارت کا دورہ کیا تو یہ امید پیدا ہوئی کہ اب دونوں ممالک طویل دشمنی ترک کر کے اچھے ہمسایوں کی طرح رہنے لگیں گے۔ تاہم بعد میں پیش آنے والے واقعات نے دونوں ملکوں کے عوام کو مایوس کیا۔ سفارتی مبصرین اور سیاسی تجزیہ نگاران تمام حالات کے باوجود مکمل طور پر مایوس نہیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دشمنی نے ہم سے بہت کچھ چھینا ہے لیکن کچھ بھی نہیں۔ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ دونوں ممالک اپنے غریب اور پسماندہ عوام کی حالت بہتر بنانے کے لئے نئے جوش اور جذبے سے کام کریں۔ اس ضمن میں دونوں ممالک کے دفاعی اخراجات ایک بڑی رکاوٹ ہیں۔ ذیل میں دونوں ممالک کے عوام کی حالتِ زار اور ان کے دفاعی اخراجات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

ایک غیر سرکاری اطلاع کے مطابق صدر جنرل پرویز مشرف نے 2001/2002ء کے بجٹ میں دفاعی اخراجات کم کرنے سے انکار کر دیا تھا جس کی بظاہر بڑی وجہ بھارت کی طرف سے دن رات دفاعی ساز و سامان کی خریداری اور گزشتہ دو سال میں اپنے دفاعی بجٹ میں 41 فیصد اضافہ ہے۔ پاکستان کے دفاعی اخراجات میں اس اضافے کی دوسری اہم وجوہات میں ظاہر ہے، پاکستانی روپے کی روز بہ روز گرتی ہوئی قدر اور ملکی معیشت کی زبوں حالی بھی ہے۔ ہمارے بیرونی قرضے 36 ارب ڈالر ہیں اور وزیر خزانہ شوکت عزیز کے بیان کے مطابق پاکستان میں 4 کروڑ 40 لاکھ افراد یعنی ہماری ایک چوتھائی آبادی غربت کی لکیر سے نیچے زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ پاکستان میں آبادی میں اضافے کی شرح دو اعشاریہ سات فیصد، قومی ترقی کی شرح دو اعشاریہ چھ فیصد، جبکہ ترقی کی سالانہ رفتار بمشکل چار فیصد ہے۔ قرضوں کی شرح سود دس فیصد سالانہ ہے۔ حال کی ایک تحقیقی رپورٹ کے مطابق پاکستان میں دولت کا ارتکاز مسلسل بڑھ رہا ہے۔ یہ رپورٹ سوشل پالیسی ڈیولپمنٹ سنٹر نے جاری کی ہے جس کے سربراہ حفیظ پاشا کا کہنا ہے کہ گزشتہ 25 سال میں حکومتوں کی طرف سے عوام کی فلاح و بہبود کے لئے سرکاری اخراجات میں 125 فیصد اضافے کے باوجود پاکستان میں غربت او عدم مساوات کی شرح میں خوفناک اضافے کا رجحان رہا ہے۔ دولت کی تقسیم میں عدم مساوات 40 فیصد سے زائد ہے۔ فی

Marfat.com

کس آمدنی کا اوسط 1025 روپے ماہانہ ہے۔غربت کی لکیر 547 روپے ماہانہ سے شروع ہوئی ہے۔پاکستان کے 40 فیصد عوام کی اوسط ماہانہ آمدنی اس لکیر سے نیچے ہے۔فی کس ماہانہ آمدنی کا گراف کچھ اس طرح ہے:

صوبہ	فی کس ماہانہ آمدنی
پنجاب	1105روپے
سندھ	1036روپے
سرحد	746روپے
بلوچستان	762روپے

بلوچستان کی 54 فیصد دیہی آبادی اور سندھ کی 50 فیصد دیہی آبادی غربت کی لکیر سے نیچے ہے۔پنجاب میں غربت کی لکیر کی حد 562 روپے،سندھ میں 589 روپے،سرحد میں 433 روپے اور بلوچستان میں 608 روپے ہے۔اس وقت 4 کروڑ 60 لاکھ پاکستانی غربت کا شکار ہیں۔اگلے تین برسوں میں ان کی تعداد میں ایک کروڑ 40 لاکھ کا اضافہ ہو جائے گا۔اس طرح یہ تعداد 6 کروڑ ہو جائے گی۔یعنی ملک کی 40 فیصد آبادی غربت کی لکیر سے نیچے زندگی بسر کر رہی ہوگی۔سرکاری شعبے میں بڑے پیمانے پر چھانٹیوں اور چالیس ہزار سرکاری ملازمین کو بیروزگار کرنے کی خبروں نے سرکاری ملازمین کو ذہنی مریض بنا دیا ہے۔

ڈالر کے مقابلے میں پاکستانی روپے میں ریکارڈ کمی واقع ہوئی ہے اور ڈالر کا کھلے بازار کا نرخ 67 روپے ہو چکا ہے۔آج ملکی معیشت کہاں کھڑی ہے،یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں بجٹ آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک کی ہدایات پر ترتیب پا رہے ہیں جن کا حکم ہے کہ بجٹ خسارہ تین فیصد سے کم ہونا چاہئے لیکن گزشتہ مالی سال میں خسارہ ملکی پیداوار کا چھ فیصد تھا۔زرعی پیداوار مناسب ہونے کے باوجود تیس سے چالیس فیصد فصلوں کو مناسب پانی ہی نہیں مل سکا حکومت نے ٹیکس سروے کا مقصد سوا ارب روپے حکومتی آمدنی میں اضافہ بتایا تھا۔علاوہ ازیں مجموعی ٹیکسوں سے وصولی کا ہدف 435 ارب روپے رکھا گیا تھا بعد میں یہ کم کر کے 417 ارب روپے کر دیا گیا لیکن بمشکل 380 ارب روپے کی وصولی ممکن ہوئی گو کہ سی بی آر کا دعویٰ ہے کہ اس سال پندرہ فیصد زیادہ ٹیکس وصول ہوا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ بیس ارب روپے سیلز ٹیکس اور انکم ٹیکس ری فنڈز کی مد میں ٹیکس دہندگان کو سی بی آر کو لوٹانے ہیں۔

مئی کے آخری ہفتے میں وزیر خزانہ نے خوشخبری سنائی تھی کہ قرضے کی 13 کروڑ 30 لاکھ ڈالر کی دوسری قسط ملنے والی ہے اور آئی ایم ایف کے ''گاڈ فادر'' پاکستانی ''ملازمین'' کی کارکردگی سے بہت خوش ہیں۔حقیقت کا علم حکومت کو ہوگا لیکن زمینی حقائق یہ ہیں کہ گزشتہ مالی سال میں صورت حال بڑی تشویش ناک رہی جس کا نقشہ کچھ اس طرح سامنے آتا ہے۔

تجارتی خسارہ:	1ارب 40 کروڑ
قرضوں میں اضافہ:	4ارب ڈالر
روپے کی قدر میں کمی:	13 فیصد

Marfat.com

اس دوران سرکاری اداروں سے 30 ہزار ملازمین کو نکال گیا۔قرض میں اضافے کی ایک بڑی وجہ ری شیڈولنگ تھی۔دسمبر 1999ء میں قرض کی مجموعی مالیت 34ارب 42 کروڑ 30لاکھ ڈالر تھی۔فروری 2001ء میں قرضوں کی مالیت 38ارب ڈالر سے تجاوز کر گئی۔حکومت کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ ڈالر کے مقابلے میں اگر روپے کی قدر میں کمی ہوئی ہے تو اس سے برآمدات میں اضافہ ہوگا۔ہماری برآمدات کا انحصار درآمدات پر ہے۔ڈالر کی قیمت بڑھنے سے پیداواری اخراجات میں اضافہ ہوگا۔دوسری طرف درآمدات میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے جس کی وجہ سے دس ماہ کے دوران تجارتی خسارہ ایک ارب 39 کروڑ 37لاکھ 69ہزار ڈالر تک پہنچ گیا۔درآمدات کی مالیت اس مدت کے دوران 8ارب 85 کروڑ 44لاکھ 53ہزار ڈالر رہی۔تجارتی خسارے میں پچھلے سال کے مقابلے میں کچھ کمی ضرور ہوئی ہے لیکن پٹرولیم کی مصنوعات کے نرخوں میں اضافے اوران کی وجہ سے دیگر اشیائے ضرورت کی قیمتوں میں ہونے والے اضافے نے اس کا تاثر ختم کر دیا ہے۔ڈالر کے مقابلے میں روپے کی قدر میں مالی 1999/02ء کے دوران 13 تا 14 فیصد کمی ہوئی جبکہ مالی سال 2002/01ء میں گزشتہ سال کے مقابلے میں برآمدات میں صرف 52 کروڑ 35لاکھ 56ہزار ڈالر کا اضافہ ہوا۔ تین ماہ کے دوران غیر ملکی سرمایہ کاری صرف 6 کروڑ 40لاکھ ڈالر ہوئی جبکہ یکم جولائی سے یکم ستمبر 2000 کے دوران 27 کروڑ 80لاکھ ڈالر کی غیر ملکی سرمایہ کاری ہوئی تھی۔

ایک تلخ حقیقت یہ بھی ہے کہ ملکی سرمایہ کاری میں تقریباً دس ماہ کے دوران مختلف سیکٹرز میں 3 تا 3اعشاریہ 10 فیصد کمی ہوئی ہے۔سرکاری اعداد وشمار کے مطابق پورے سال میں 12 تا 15ہزار سرکاری ملازمین کو گولڈن شیک ہینڈ دے کر جبری ریٹائر کیا گیا۔غیر سرکاری اعداد وشمار سرکاری شعبوں سے بے روزگار ہونے والوں کی تعداد 30ہزار بتاتے ہیں اگر سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں بیس فیصد اضافہ ہو بھی گیا تو اس سے کتنے فیصد لوگ مستفید ہوں گے؟ پاکستان میں زیادہ تعداد نجی نوکریاں کرنے والے یا مزدوروں کی ہے جو اس اضافے سے کچھ بھی حاصل نہیں کر سکیں گے۔

یہ ہیں وہ زمینی حقائق جو ہمارے سامنے منہ کھولے کھڑے ہیں لیکن حکومت کی طرف سے اعداد وشمار کے گورکھ دھندے کا سلسلہ معمول کے مطابق جاری ہے گو کہ چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف کئی مرتبہ عوامی اجتماعات میں اپنی تقاریر اور بیانات میں اس صورتحال کی جھلک مختلف انداز سے دکھا چکے ہیں اور یہ بات بھی سمجھا چکے ہیں کہ اپنی کم عقلی، ضد، انا پرستی اور مذہب کو اپنی عقل کے مطابق انتہا پسندانہ طریقے سے بطور ہتھیار استعمال کرنے کی وجہ سے ہم پاکستان میں اور بین الاقوامی سطح پر کسی صورت حال سے دوچار ہے۔حکومت کی طرف سے ناجائز اسلحے کی برآمدگی کی مہم بھی شاید اس صورتحال کی سنگینی کو کم کرنے کی کوشش تھی لیکن بقول چیف ایگزیکٹو ہم اب بھی دلی پر جھنڈے لہرانے کے بیانات بلا سوچے سمجھے داغ رہے ہیں یہ جانے بغیر کہ ان بیانات سے پاکستان کو فائدہ ہوگا یا نقصان؟ ان حالات میں پاکستان کی کوئی بھی باشعور حکومت بھارت سے جنگ نہیں کرنا چاہتی نہ ہی ہم اسلحے کی دوڑ میں حصے دار بننا چاہتے ہیں اس کے برعکس بھارتی رویہ پاکستان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے دفاع کی فکر کرے اور اپنے لئے با دل نخواستہ ہتھیار حاصل کرے۔امریکہ کے اچانک بھارت کی طرف جھکاؤ اور اسے چین کے مقابلے میں پہلوان بنا کر کھڑا کرنے کی خواہش نے اس خطے میں ایک مرتبہ پھر سرد جنگ کی سی کیفیت پیدا کر دی ہے۔

Marfat.com

2000ء میں پاکستان اور بھارت دونوں کی ایٹمی پالیسی نے کروٹ بدلی بھارتی حکومت نے حکومت ہند کے اسٹریٹیجک پالیسی ایڈوائزری بورڈ کی طرف سے 1999ء میں جاری کردہ نیوکلیئر ڈاکٹرائن کا مطلوبہ ہدف حاصل کرنے کے لئے دفاعی بجٹ میں بے تحاشا اضافہ کر دیا ہے۔ اپنی ایٹمی میزائلوں کی استعداد کار بڑھانے اور ہوائی جہازوں کے ذریعے انہیں دور دراز مقامات تک گرانے کے لئے بھارتی دن رات سرگرم ہیں۔ اگنی II۔ اپریل 1999ء تک ٹیسٹ کے مراحل سے نہیں گزرنے پایا تھا لیکن 150 سے 250 کلومیٹر تک سمندر سے زمین تک مار کرنے والے پرتھوی میزائل بھارت میں تیار ہو رہے تھے۔ بھارتی حکومت کی جاری کردہ نیوکلیئر ڈاکٹرائن کے مطابق انہیں اگلے دس سال تک سالانہ 500 ملین ڈالر کی رقم اپنے میزائل پروگرام کے لئے درکار ہوگی۔

پاکستان بھی میزائل سازی کی صنعت میں برابر پیش رفت کر رہا ہے۔ مغربی ذرائع ابلاغ کی رپورٹس کے مطابق 2400 کلومیٹر تک مار کرنے والا پاکستان کا شاہین II کسی بھی لمحے ٹیسٹ کے لئے تیار ہے۔ فضا سے فضا میں مار کرنے والے (ایس ایس ایم) حتف ون میزائلوں کی استعداد کار بڑھائی جا رہی ہے اور ان پر نئے وار ہیڈ نصب کئے جا رہے ہیں۔

600 کلومیٹر تک مار کرنے والے 60 عدد حتف تھری پاکستان کے پاس ہیں 2500 کلومیٹر تک مار کرنے والا غوری ٹو، جسے بھارت کے کسی بھی حصے پر آسانی سے گرایا جا سکتا ہے۔ اسٹیک انجن ٹیسٹنگ کے مراحل سے گزر رہا ہے۔ مغربی ذرائع ابلاغ کا کہنا ہے کہ پاکستان کے لئے اتنا جدید ترین ایٹمی میزائل پروگرام اس کی مجبوری ہے کیونکہ بھارت کو اس پر روایتی ہتھیاروں کی برتری حاصل ہے اور اس کا توڑ صرف ایٹمی استعداد میں برتری سے ہی ممکن ہے۔

بھارت کی طرف سے پاکستان کو کوئی ایسا موقع نہیں دیا جا رہا کہ حکومت سنجیدگی سے ہتھیاروں یا دفاعی بجٹ میں کمی کے متعلق سوچے۔ بھارت نے اس خطے میں فوجی توازن بگاڑنے کا شاید تہیہ کر رکھا ہے اس کی اہم مثال بھارت کی طرف سے ایک نئی کور (XIV) تیار کرنا ہے۔ بھارت یہ نئی کور لیہہ اور نمو (Nimu) کی شمالی سرحدوں پر کھڑی کرے گا۔ اس کے بعد بھارتی XV کور سری نگر میں مستقل قیام کرے گی۔ اس طرح بھارت علیحدگی پسند تحریکوں ULFA اور NDFB کے خلاف دباؤ بڑھانا چاہتا ہے۔

مغربی ذرائع ابلاغ کی اطلاعات کے مطابق پاکستان نے اپنے 1999ء کے دفاعی بجٹ میں 18 فیصد اضافہ کیا جبکہ بھارت نے اپنے 2000ء کے دفاعی بجٹ میں تقریباً 30 فیصد اضافہ کیا جو بھارتی 700 بلین روپے بنتا ہے۔ بھارت نے حالیہ بجٹ میں اپنے کل جی ڈی پی کا 2 اعشاریہ 8 فیصد دفاع کے لئے مختص کیا ہے۔ اس طرح بھارتی فوج کو 1999ء کے مقابلے میں 394 بلین روپے زیادہ دیئے جا رہے ہیں۔ کارگل اور کشمیر میں بھارتی فوج پر روزانہ 100 ملین روپے علیحدہ خرچ ہو رہے ہیں۔

بھارت کی فضائیہ کو 143 بلین روپے زائد ادا کئے جا رہے ہیں جس سے وہ 66 ایڈوانس جیٹ ٹرینرز، 10 بلین روپے 2000ء کے بجٹ سے زائد دیئے گئے ہیں۔ اب وہ 81 بلین روپے (ایک اعشاریہ 8 بلین امریکی ڈالر) سے جدید جنگی ساز و سامان حاصل کر رہی ہے۔ بھارت کی بحریہ کے لئے روس سے 45000 ٹن کے کیریئر، ایڈمرل گورشکوف

Marfat.com

حاصل کرنے کے لئے مذاکرات مسلسل جاری ہیں اور جلد ہی یہ ایٹمی بار بردار جہاز، جو اس وقت سینٹ پیٹرز برگ میں کھڑا ہے بھارت کی بحریہ کا حصہ بن جائے گا اپنی بحریہ کو جدید ترین خصوصیا ایٹمی اسلحہ سے لیس کرنے کے لئے بھارتی حکومت دن رات کوشاں ہے اور اسے جنوبی ایشیا کی مضبوط ترین بحریہ بنانے کا عزم رکھتی ہے۔

پاکستان کا دفاعی بجٹ 1999ء میں 142 بلین روپے تھا جسے 2000ء میں 170 بلین روپے کر دیا گیا تاہم اس کی مکمل تفصیلات جاری نہیں کی گئیں۔ مغربی ذرائع ابلاغ کا اصرار ہے کہ 1999ء کے طے شدہ بجٹ سے زیادہ اخراجات کئے گئے جو دو اعشاریہ 9 بلین ڈالر کے بجائے دراصل 3 اعشاریہ 5 بلین ڈالر تھے۔ پاکستان نے 8 میراج III اور 5 کومبیٹ ائر کرافٹ فرانس سے حاصل کئے اور چین کے ساتھ ایف سی ون کا مشترکہ منصوبہ شروع کیا۔ ان ہی ذرائع کا اصرار ہے کہ پاکستان نے 2000ء میں چین سے 50 ایف سیون ایم جی ایف جی اے بھی حاصل کئے ہیں۔ پاکستان کی بحریہ نے 1999ء میں این فسٹ خالد کلاس (آ گستاپی) آب دوزیں حاصل کیں اور ایسی مزید آب دوزیں فرانس کے اشتراک سے کراچی میں تیار کر رہا ہے جو 2002ء تک تیار ہو جائیں گی۔

آیئے ایک نظر دونوں ممالک کی مسلح افواج کی تعداد پر ڈالیں اور اندازہ لگائیں کہ ہم نئی صدی میں کہاں کھڑے ہیں۔

سرکاری اعداد و شمار کے مطابق بھارت کی آبادی 1,016,242,000 ہے جس میں 80 فیصد ہندو 14 فیصد مسلمان 2 فیصد عیسائی اور 2 فیصد سکھ ہیں۔ باقی 2 فیصد کا تعلق مختلف مذاہب سے ہے۔ اب ایک نظر بھارت کی مسلح افواج پر ڈالتے ہیں۔ بھارت کی ایکٹیو آرمڈ فورسز کی تعداد 1,303,000 ہے اور 535,000 ریزرو ہیں۔

بھارتی آرمی کی نفری 1,100,000

ہیڈ کوارٹر...... 5

ریجنل کمانڈ...... 4

فیلڈ کمانڈ آرمی...... 12 کور، 3 آرمڈ ڈویژن جن میں سے ہر ایک 2 تا 3 آرمڈ، ایک ایس پی آرٹلری، (2 ایس پی فیلڈ، ایک میڈیم رجمنٹ بریگیڈ) پر مشتمل۔

ریپڈ ڈویژن...... 4 (ہر ڈویژن میں 12 انفینٹری بٹالین ٹینک بریگیڈ)

انفینٹری ڈویژن...... 18 (ہر ڈویژن میں 2 تا 5 انفینٹری، ایک آرٹلری بریگیڈ، کچھ کی آرمڈ رجمنٹیں بھی ہیں)

ایم ٹی این ڈویژن...... 9 (ہر ڈویژن میں 3 تا 4 بریگیڈ، ایک موٹر آرٹلری رجمنٹ شامل ہیں)

آرٹلری ڈویژن...... 1 (تین بریگیڈ پر مشتمل ہے)

انڈیپینڈنٹ بریگیڈ...... 15 (7 آرمڈ، 5 انفینٹری، 2 ایم ٹی این، 1 اے بی سی ڈی)

ایس ایس ایم رجمنٹ...... 1

ایڈوانس بریگیڈ 4 (بمعہ 14 سی ڈی آر 3 انجینئرنگ بریگیڈ)

ریزرو: 25 انفینٹری بٹالین بمعہ 29 ڈیپارٹمنٹل یونٹس بھارتی بحریہ:

Marfat.com

نفری...... 53000

پرنسپل کمانڈ...... مغربی، جنوبی اور مشرقی بمعہ فار ایسٹرن سب کمانڈ

سب کمانڈ...... سب میرین، نیول ائیر

بیس......ممبئی (ہیڈ کوارٹر ویسٹرن کمانڈ) گوا (ہیڈ کوارٹر نیول ائیر) کاروار (زیرِ تعمیر) کوچی KOCHI (کوچین) ہیڈ کوارٹر جنوبی کمانڈ، وشاکا پٹنم (ہیڈ کوارٹر ایسٹرن) کولکتہ، مدارس، پورٹ بلیئر، انڈیمان (ہیڈ کوارٹر فار ایسٹ کمانڈ) آراکونام (نیول ائیر)

فلیٹس ویسٹرن بیس ممبئی

ایسٹرن بیس وشاکا پٹنم

بھارتی فضائیہ:

نفری 150,000

کمبیٹ ائرکرافٹ 774

آرمڈ ہیلی کاپٹر 34

اور یجنل ائر کمانڈ 5

(سنٹرل کمانڈ الہ آباد، ڈویژن کمانڈ (نیو دہلی) ایسٹرن

کمانڈ شیلانگ ساؤتھ کمانڈ تریم وتی پورم ساؤتھ ویسٹ (گاندھی نگر)

علیحدہ کمانڈ 2 (آرجی اور مینٹیننس)

اس کے علاوہ بھارت کے پاس 1,069,000 پیرا ملٹری فورسز 7400 سکیورٹی گارڈز، 3 ہزار سپیشل پروٹیکشن گروپ، 9 ہزار سپیشل فرنٹیئر فورسز 36000 راشٹریہ رائفلو، 31 ہزار ڈیفنس سکیورٹی کورس، 30 ہزار انڈو تجبین بارڈر پولیس 52 ہزار آسام رائفلو، 70 ہزار ریلوے پروٹیکشن فورس، 88 ہزار 6 سو سینٹرل انڈسٹریل سکیورٹی فورسز، ایک لاکھ 74 ہزار بارڈر سکیورٹی فورسز، 4 لاکھ 72 ہزار ہوم گارڈز، 4 لاکھ سٹیٹ آرمڈ پولیس، 3 لاکھ 94 ہزار سول ڈیفنس، 8 ہزار کوسٹ گارڈز 36 گشتی جہاز اور تین ایوی ایشن سکواڈرن۔

سرکاری اعداد و شمار کے مطابق پاکستان کی آبادی 148,012,000 ہے جس میں سے 97 فیصد مسلم اور 3 فیصد غیر مسلم آبادی ہے۔ پاکستان کی ایکٹیو آرمڈ فورسز کی تعداد (612,000) ہے۔ ریزرو میں (513,000) ہیں۔

فوجوں کی تعداد اس طرح ہے۔

پاکستان آرمی:

نفری 550,000

کور ہیڈ کوارٹر 9

آرمڈ ڈویژن 2

Marfat.com

کور آرٹلری بریگیڈ	9
انفنٹری ڈویژن	19
ایریا کمانڈ ڈویژن	1
آرمڈ آر ای سی سی ای رجمنٹ	3
انڈیپنڈنٹ آرمڈ بریگیڈ	7
ایس ایف (جی پی) (3 بٹالین)	1
انڈیپنڈنٹ انفنٹری بریگیڈ	9
اے ڈی کمانڈ	1
ایوی ایشن	17 اسکواڈرن

پاک بحریہ:

نفری	22000

بیس: کراچی (فلیٹ ہیڈ کوارٹر اور ماڑہ گوادر میں دو بیس زیرِ تعمیر ہیں)

نیول ایئر	5 سی بی ٹی (اے سی)
اے ایس ڈبلیو، ایس اے آر	2 ہیلی کاپٹر اسکواڈرن

بمعہ 6 سی کنگ ایم 45 (اے ایس ڈبلیو) 3 لائنکس ایچ اے، ایم کے 3 (اے ایس ڈبلیو)

سی او ایم ایم ایس	5 فوکر ایف 27
اے ایس ایم ایگزاسٹ اے ایم	39
میرین	1200

پاک فضائیہ:

نفری	40 ہزار

ریجنل کمانڈز: شمالی کمانڈ (پشاور)، مرکزی کمانڈ (سرگودھا)، جنوبی کمانڈ (فیصل)

بھارتی حکومت کے بڑھتے ہوئے جنگی اثر و رسوخ کو ایشیا میں چین کے مقابلے میں طاقت ور بنانے کے منصوبوں نے بھارتی معیشت کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ گزشتہ مالی سال کا خسارہ مجموعی گھریلو پیداوار سے تقریباً 7 فیصد زیادہ ہے۔ مالی سال 02-1999ء کیلئے بھارت کے وزیرِ خزانہ یشونت سنہا نے 4 اعشاریہ 4 فیصد صد مالی خسارے کا امکان ظاہر کیا تھا لیکن بعد میں بجٹ کے تخمینہ جات کو انتہائی قدامت پسندانہ اور غیر حقیقی کہا گیا۔

گزشتہ سال کے مالی خسارے کی بھارتی ماہرین کی طرف سے جو دو بڑی وجوہات بیان کی گئی ہیں ان میں ایک اہم وجہ کارگل میں پاکستان اور بھارت کی لڑائی تھی۔ اپریل 2000ء میں بین الاقوامی مارکیٹ میں خام تیل کی قیمت میں زبردست اضافہ ہو چکا تھا اور مئی میں لڑائی شروع ہوئی جہاں بھارتی ڈیفنس کو اضافی فنڈز فراہم کرنا ناگزیر ہو گیا۔ اس کے

Marfat.com

ساتھ ہی انتخابات کے لئے ایک ہزار کروڑ روپے اور سرکاری ملازمین کے مہنگائی الاؤنس میں اضافہ کے لئے مزید 1319 کروڑ روپے فراہم کرنے پڑے۔ بھارتی حکومت کو ملک کی ڈوبتی ہوئی معیشت کو سہارا دینے کے لئے 2000ء میں ڈیزل کی قیمتوں میں 25 فیصد اضافہ کرنا پڑا، کیونکہ رواں مالی سال کے لئے حکومت کو 6600 کروڑ روپے کی اضافی رقم کے وسائل پیدا کرنے تھے۔ اس صورت حال نے مہنگائی میں اضافہ کیا اس دوران چھ ماہ میں عالمی مارکیٹ میں خام تیل کی قیمتوں میں دوگنا اضافے سے صورتحال زیادہ نازک ہوگئی۔ 1998/99ء میں بھارت کا مالی خسارہ 6اعشاریہ 9فیصد تھا اور اگلا بجٹ پیش کرتے ہوئے امید ظاہر کی گئی تھی کہ یہ خسارہ کم ہوکر 6اعشاریہ ایک فیصد ہو جائے گا لیکن اس میں اعشاریہ 9فیصد مزید اضافہ ہو گیا اور اب بھی بھارتی حکومت کے دعوؤں کے برعکس ان کے ٹارگٹ یعنی 4 فیصد خسارے کی کوئی امید دکھائی نہیں دے رہی۔ بھارتی حکومت نے پبلک سیکٹر کے 10,000 کروڑ روپے کا ڈس انوسٹمنٹ کرنے کا عزم ظاہر کیا ہے تاکہ خسارہ کسی طرح کم ہو سکے۔

2000-1999ء میں دھان کی ریکارڈ پیداوار 75 ملین ٹن تھی۔ حکومتی دعوؤں کے برعکس گندم اور گنے کی متوقع فصل کاشت نہیں ہو سکی۔ بھارتی حکومت نے پبلک سیکٹر کے حصص مارچ 2000ء تک مارکیٹ میں فروخت کر کے 10 ہزار کروڑ روپے حاصل کرنے کا جو ٹارگٹ مقرر کیا تھا وہ بھی پورا نہ ہو سکا۔

مارچ 2001ء میں ہونے والے بھارت کے نیشنل سیمپل سروے آرگنائزیشن (این ایس ایس او) کی تازہ رپورٹ، جو بھارتی عوام کے غربت کی لکیر سے نیچے زندگی بسر کرنے سے متعلق ہے، چونکا دینے والی ہے۔

یہ سرکاری اعداد و شمار ہیں، جبکہ نجی اداروں کی سروے رپورٹس میں غربت کی لکیر سے نیچے زندگی بسر کرنے والوں کا تناسب کل آبادی کا 33 تا 34 فیصد بتایا گیا ہے۔ یہ اس ملک کے عوام کی حالت زار ہے جہاں 39 آرڈیننس فیکٹریاں دن رات آتش و آہن کے ڈھیر لگا رہی ہیں۔ بھارت نے اپنے 02-2001ء کے بجٹ میں ایک کھرب 30 ارب روپے دفاع کے لئے مختص کئے اور اپنے دفاعی اخراجات میں 13 فیصد اضافہ کیا اس سے کچھ عرصہ قبل بھارت اپنے دفاعی اخراجات میں 28 فیصد اضافہ کر چکا ہے۔ اس طرح گزشتہ دو سال میں بھارت نے اپنے دفاعی بجٹ میں 41 فیصد اضافہ کیا۔

بھارت نے حال ہی میں روس سے ریفلیکٹ گائیڈڈ میزائلوں سے لیس ٹی 90 قسم کے 130 ٹینک خریدنے کا معاہدہ کیا ہے جس کی مالیت 80 کروڑ بنتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی بخوبی ون طیارے خریدے جا رہے ہیں جن کی مالیت اربوں روپے بنتی ہے۔ اس پر احتجاج بھی ہوا لیکن بڑھتے ہوئے جنگی جنون نے بھارتی حکومت کو اپنے عوام کی فلاح و بہبود کے بجائے خود کو مضبوط تر بنانے کے مشن پر لگا دیا ہے۔ حالاں کہ اس تاریخی حقیقت سے ہم سب بخوبی آگاہ ہیں کہ اگر اسلحہ کی زیادتی کسی ملک کو مضبوط بنا سکتی تو روس بھی ٹکڑے ٹکڑے نہ ہوتا۔

بھارتی حکومت کی طرف سے جاری کردہ اعداد و شمار کے مطابق اس وقت 36 کروڑ بھارتی غربت کی لکیر یعنی خط افلاس کے نیچے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان میں ساڑھے پانچ کروڑ وہ ہیں جنہیں ایک وقت کا کھانا بھی میسر نہیں اور وہ فاقہ کشی پر مجبور ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ بھارتی حکومت نے خط افلاس سے نیچے زندگی بسر کرنے والے ان لوگوں کے

Marfat.com

لئے 20 بلین ٹن اناج کا ذخیرہ محفوظ کر رکھا ہے اسے سستے داموں فروخت کرنے کے لئے ملک بھر میں ڈپو بنائے ہیں لیکن بھارت میں خط افلاس سے نیچے زندگی بسر کرنے والے لوگ یہ اناج خریدنے کی سکت نہیں رکھتے اور بھارتی حکومت نے اس ذخیرے میں سے سات برآمد کنندگان کو فوڈ کارپوریشن کے ذریعے 84 ڈالر فی ٹن کے حساب سے عراق کو فروخت کر دی۔ بھارتی حکومت نے 1500 روپے ماہوار کمانے والے خاندان کو خط افلاس سے اوپر شمار کیا ہے۔ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایسا خاندان 1500 ماہوار میں کیا کھاتا اور کیا پکاتا ہوگا۔ اس غربت کی وجہ سے غریب بھارتی شہری حکومت کی طرف سے کم نرخوں پر فراہم کردہ اشیائے خورد و نوش بھی نہیں خرید سکتے۔ یہ اس ملک کی حالت ہے جو خود کو چین کے مقابلے کی طاقت بنانے کے لئے روس سے اسرائیل تک ہر ملک سے اسلحہ خرید رہا ہے۔ 39 آرڈیننس فیکٹریاں قائم کر کے اسلحہ کے انبار لگا رہا ہے اور جس کے نیوکلیائی ہتھیاروں کی تعداد میں تشویش ناک حد تک اضافہ ہو گیا ہے جس کے میزائل پروگرام پر جاپان اور آسٹریلیا بھی تشویش ظاہر کر چکے ہیں اور جس کا اربوں روپیہ سالانہ اسلحے کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔ کیا کسی مہذب قوم کو ایسا کرنا زیب دیتا ہے؟

ڈاکٹر محبوب الحق مرحوم کا شمار بلاشبہ دنیا کے اہم اقتصادی ماہرین میں ہوتا تھا۔ عالمی بینک میں رہے اور بہت سے مالیاتی اداروں اور کمپنیز میں کام کیا۔ جنرل ضیاالحق مرحوم نے ان کی اقتصادی مہارت کو سمجھ لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بے شمار تنقید کے باوجود آخری دم تک جنرل صاحب کے مقرب خاص رہے۔ ڈاکٹر محبوب الحق کو عالمگیر شہرت حاصل تھی اور یہ واقعہ ہے کہ ان کے ایک مضمون کے بعض حصوں کو مسز اندرا گاندھی نے اپنی جنرل اسمبلی کی تقریر میں شامل کر کے اقوام متحدہ کو سنایا اور بہت داد پائی تھی۔ ڈاکٹر محبوب الحق نے شاید سب سے پہلے یہ بات کہی تھی کہ بھارت اور پاکستان کی حکومتیں غریب اور عوام امیر ہیں۔ یہاں بھی حکومتیں عوام کی کوئی مدد نہیں کر رہیں بلکہ عوام حکومتوں کے مددگار ہیں۔ راجیو گاندھی فاؤنڈیشن نے ڈاکٹر محبوب الحق کو بطور خاص بھارت بلایا اور انہیں ہند پاک تعلقات پر لیکچر کی دعوت دی تھی۔ اس لیکچر کو بہت شہرت حاصل ہوئی اور ٹائمز آف انڈیا نے ان دنوں اس حوالے سے ڈاکٹر صاحب کا ایک اہم انٹرویو بھی شائع کیا تھا جس میں ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا کہ ہندو پاک حکومتوں کو آج پچاس برس گزرنے والے ہیں انہیں خود سے سوال کرنا چاہئے کہ وہ 1947ء سے آج تک ایک دوسرے کے خلاف توپیں گاڑے بیٹھی ہیں اور گولیاں اور گولے داغ رہی ہیں، آخر اس طویل اور تھکا دینے والی سرد جنگ نے انہیں کیا دیا ہے یا مستقبل میں کیا دے گی؟ اگر دونوں حکومتیں مثبت انداز میں سوچیں تو لڑائی کے بجائے مفاہمت میں ہی اپنی عافیت نظر آئے گی، کیونکہ یہ توپ و تفنگ کا نہیں، مذاکرات اور امن و آشتی کا دور ہے۔ جرمنی کا ملاپ، برطانیہ اور آئرلینڈ کی صلح صفائی، روس اور امریکہ مفاہمت، عرب اسرائیل سمجھوتے اس کی مثال ہیں جس دنیا میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے، وہاں اگر بھارت پاکستان لڑنا شروع کر دیں تو دنیا انہیں مہذب ممالک کیسے سمجھے گی۔ جب دنیا میں ایٹمی ہتھیاروں میں کمی، فوجوں کی تعداد گھٹانے کے معاملات ہو رہے ہیں تو ہم آخر اپنے بھوکے ننگے عوام سے سب کچھ چھین کر آتش و آہن کے ڈھیر کیوں لگا رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا کہ 1995ء میں ہر سال بھارت تقریباً 20 ارب ڈالر اسلحہ جمع کرنے پر پھونک دیتا ہے، صرف کشمیر بچانے اور چین کے خطرے کا سامنا کرنے کے لئے، حالانکہ دونوں سے بھارت کو کوئی خطرہ نہیں۔

Marfat.com

ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا کہ بھارت کا المیہ یہ ہے کہ بھارت اپنے کسی پڑوسی کو کچھ دینا نہیں چاہتا ورنہ اب تک برصغیر کا نقشہ تبدیل ہو چکا ہوتا۔ پاکستان اور بھارت دونوں کے پاس ڈاکٹر کم اور فوجی زیادہ ہیں، ترقی کے بجائے ہم قرضے مانگ کر سود ادا کر رہے ہیں، ہم ہتھیاروں کے ذخائر پر فخر کر رہے ہیں اور ہمارے عوام بھوکے مر رہے ہیں، یہ جہالت نہیں تو اور کیا ہے۔ انہوں نے بھارت سے کہا تھا کہ اس کے تمام پڑوسی بھارت کے ساتھ امن اور مفاہمت سے رہنا چاہتے ہیں لیکن بھارت پاکستان کے ساتھ کشمیر، بنگلہ دیش کے ساتھ فرخا بیراج، نیپال کے ساتھ راہ داری، چین کے ساتھ تبت کا مسئلہ حل نہیں کرنا چاہتا۔

انہوں نے سارک ممالک کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنے دفاعی اخراجات میں سے رضا کارانہ طور پر صرف پانچ فیصد کمی کر کے عوامی فلاح و بہبود پر خرچ کریں۔ دس سال میں دفاعی اخراجات خود بہ خود کم ہو جائیں گے۔ عالمی ادارے اس کام میں ان کی مدد کریں گے۔ بھارت اور پاکستان ان دنوں چوری سے ڈیڑھ ارب ڈالر سالانہ کی تجارت کر رہے ہیں، جس سے دونوں حکومتوں کو ایک پیسے کا فائدہ نہیں ہو رہا، اگر یہی کام قانونی طریقے سے ہو تو دونوں کو کروڑوں روپے ماہانہ کا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ انہوں نے سوال کیا تھا کہ سیاچن کے برف زار میں دونوں ممالک اب تک کتنے کھرب روپے ضائع کر چکے ہیں کیا چند کلومیٹر اپنی فوجیں پیچھے ہٹانے سے وہ خرچہ نہیں بچا سکتے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان دنوں کشمیر کو اقوام متحدہ کی نگرانی میں دے کر پندرہ سال بعد عوام کی رائے معلوم کرنے کا نظریہ بھی پیش کیا تھا، جس پر پاکستان میں ان کی زبردست مخالفت کی گئی تھی لیکن ڈاکٹر صاحب نے سوال کیا تھا کہ کیا برطانیہ نے جبرالٹر کا مسئلہ اسی طرح حل نہیں کیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس کے بعد بھارت اور پاکستان ایٹمی صلاحیت حاصل کر کے عالمی معاہدوں پر دستخط کر سکتے تھے۔

بھارت اور پاکستان دونوں ممالک کے عوام ہوں یا فوج کوئی بھی ایک دوسرے سے جنگ نہیں لڑنا چاہتا، دونوں ملکوں کے عوام گزشتہ 54 سال میں ہونے والی جنگوں اور جھڑپوں کی اپنی بساط سے بڑھ کر قیمت ادا کر چکے ہیں لیکن جب ایک بڑا ملک دوسرے چھوٹے ملک کو اپنے دیگر ہمسایہ ممالک، سکم، بھوٹان، مالدیپ وغیرہ کی طرح اپنی ذیلی ریاست بنانے پر تلا ہو، وہاں امن کے امکانات معدوم ہو جاتے ہیں۔ پاکستان بھارت کے مقابلے میں چھوٹا ملک ہے لیکن یہاں کے عوام کی اکثریت بھارتی بالادستی کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں اور وہ دونوں ممالک کے تعلقات کو فروغ پاتا اور پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے ہیں۔

جنرل مشرف نے گزشتہ سال صرف اس جذبے کے تحت کہ سرحدوں پر تناؤ کم ہو جائے، پاکستانی فوج کا بڑا حصہ کشمیر کی سرحد سے واپس بلا لیا تھا۔ پاکستان نے اپنے دفاعی بجٹ میں کمی کر دی، حالانکہ بھارت نے 2 فیصد اضافہ کیا، لیکن حیرت کی بات ہے کہ اچانک بھارت نے پورن وجے کا ڈنکا بجا دیا اور راجستھان میں، جہاں بھارتی فوجوں نے یہ مشق کی تھی 30583 دیہات کے 3000000 باشندے بھارتی حکومت کی اطلاعات کے مطابق نان جویں کے بھی محتاج ہیں اور ان کے پاس حکومت کی طرف سے کم نرخوں پر فراہم کی گئی گندم خریدنے کے لئے پیسے نہیں۔ بھارتی حکومت نے یہاں ''کور'' لیول کی تیسری بڑی جنگی مشق کی۔ اس میں 60 ہزار جوانوں، 4500 جونیئر کمیشنڈ افسروں اور 1800 کمیشنڈ افسروں کے علاوہ 600 ٹینکوں، 400 ہیوی آرٹلری گنز، اے پی سی، ریڈار اینڈ کمیونیکیشن سسٹم، اینٹی ائیر کرافٹ

Marfat.com

گنز، میزائل لانچرز، جیگوارنگ 27اور حملہ آور ہیلی کاپٹروں نے حصہ لیا۔ یہ مشقیں بھارت کے نیوکلیئر ڈاکٹرائن کا پہلا ٹیسٹ تھیں جو1998ء میں پیش کیا گیا۔ اس ڈاکٹرائن کا پس منظر مکمل فتح ہے۔ بھارتی حکومت کچھ بھی کہے ہر ذی شعور کو معلوم ہے کہ آرمی کو اپنے ہیڈکوارٹر سے آپریشنل ایریا تک لانے اور واپس لے جانے کے اخراجات کا تخمینہ ہی لرزا دینے والا ہے پھر یہاں جو کیمیائی ہتھیار رہوائی فوج اور آرٹلری استعمال ہوئی وہ اخراجات علیحدہ ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اگر بھارت اپنے وعدوں میں سچا اور مخلص ہے تو وہ ایسے اشتعال انگیز اقدامات کیوں کرتا ہے جو پاکستانی حکومت کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ اپنے دفاع سے غافل نہ ہو اور اس کی فکر کرے۔ یہ سوال بھی بہت اہم ہے کہ برتری کی اس خواہش اور اسلحے کے انبار لگانے کی اس دوڑ کا خاتمہ کہاں اور کب ہوگا؟ اور اس وقت تک برصغیر کے عوام پر کیا قیامت نہیں بیت چکی ہوگی۔ کیا صورتحال کی سنگینی کا احساس کسی کو ہے؟

این ایس ایس او کی رپورٹ:

بھارتی آبادی صوبے کا نام	غربت کی لکیر سے نیچے 30دن کھانا کھانے والے	1999-2000 سروے رپورٹ 7دن کھانا کھانے والے
آندھراپردیش	15.8	13.8
آسام	36.1	30.6
بہار	42.6	36.7
گجرات	14.1	12.8
ہریانہ	8.7	7.8
کرناٹک	20.0	16.6
کیرالہ	12.7	11.1
مدھیہ پردیش	37.4	34.8
مہاراشٹر	25.0	22.6
اڑیسہ	47.2	43.4
پنجاب	6.2	5.4
راجستھان	15.3	13.9
تامل ناڈو	21.1	19.3
اترپردیش	31.1	28.8
مغربی بنگال	27.0	23.4
بھارت	26.1	23.3

Marfat.com

پاکستانی معیشت پر ایک نظر:

تفصیل	1998ء	1999ء
جی پی ڈی	2.8 کھرب	3.0 کھرب
فی کس آمدنی	12,400امریکی ڈالر	2500امریکی ڈالر
نمو	4%	3.1%
افراطِ زر	6.2%	4.1%
خسارہ	32ارب امریکی ڈالر	34ارب امریکی ڈالر
بجٹ خسارہ	145ارب روپے	142ارب روپے

بھارتی دفاعی بجٹ کا تقابلی جائزہ 1995ء تا 2000ء:

1998 USSM	1995	%	1996	%	1997	%	1998	%	1999	%	2000	%
آرمی	4,673	53.0	4,630	53.4	5,663	57.2	5,218	52.2	5,816	48.5	7,074	46.1
ائرفورس	2,274	25.8	2,221	25.6	2,468	24.9	2,271	22.7	2,329	19.4	3,126	20.4
نیوی	1,246	14.1	1,275	13.5	1,168	11.8	1,448	14.5	1,538	12.8	1,776	11.6
R&D	454.51	5.1	429	4.9	365	3.7	431	4.3	632	5.3	670	4.4
DPSO	165	1.9	221	2.6	237	2.4	618	6.2	1,673	14.0	2,705	17.6
متفرق	8,812	100	8,676	100	9,901	100	9,986	100	11,988	100	15,351	100

(روزنامہ جنگ سنڈے میگزین مصنف طارق اسماعیل ساگر 2 ستمبر 2001ء)

آگرہ مذاکرات کے بعد دونوں حکومتیں ایک دوسرے کو مذاکرات کی ناکامی کا ذمہ دار قرار دیتی رہیں دونوں کے اعلیٰ حکام کی ملاقات 10 اگست 2001ء کو سری لنکا میں سارک ممالک کے خارجہ سیکرٹریوں کی میٹنگ میں متوقع تھی اُمید تھی کہ بھارت اس مرحلے پر سنجیدگی کا مظاہرہ کرے گا۔

آگرہ مذاکرات کے بعد بھارتی قیادت نے پاکستان کے خلاف جو مہم جوئی شروع کی تھی وہ کولمبو میں منعقدہ خارجہ سیکرٹری مذاکرات کے بعد بھی جاری رہی جئے جگت کے بجائے جئے بھارت کا نعرہ بلند کرنے والوں نے جب دیکھا کہ ان کے نئے ہمدم اور قدیم حلیف، پاکستان کو دہشت گرد قرار دینے سے انکار کر رہے ہیں تو نئی دہلی کے سامنے سوائے اس کے کوئی راستہ نہ رہا کہ وہ اندرونی طور پر شدت پسندوں کے دباؤ کو کم کرے۔ بھارتی وزیراعظم اور وزیر خارجہ نے پاکستان کے حوالے سے جو سخت بیانات جاری کئے انہیں "کچھ سیاست کچھ ڈپلومیسی" قرار دے دیا گیا۔ حلیفوں کی تنقید سے نالاں واجپائی جب تہلکہ سکینڈل کے بعد یوٹی آئی سکینڈل کے بوجھ تلے دبنے لگے تو انہوں نے شدید دباؤ سے نکل جانے کے لئے جامع حکمت عملی کے تحت حالات کا رخ آگرہ کی طرف موڑ دیا۔ بھارت نے پاکستان کے خلاف بیان بازی کے دوران چین کو بھی اشتعال دلانے کی کوشش کی۔ واجپائی اور جسونت سنگھ کے بیانات کو اشتعال انگیز اور سوچی سمجھی حکمت عملی کا

Marfat.com

حصہ قرار دیا گیا۔ مبصرین کا کہنا ہے کہ واجپائی نیویارک میں صدر مشرف سے مذاکرات کرنے سے گریزاں ہیں اور وہ ملاقات نہ کرنے کا جواز تلاش کر رہے ہیں اس لئے ان کے دورہ اقوام متحدہ کو مختصر رکھے جانے کی امید ہے کہ تاکہ وقت کی کمی کا عذر پیش کیا جا سکے۔

آگرہ مذاکرات میں صدر مشرف کی حقیقت پسندی کے بعد واجپائی شیوسینا ہندو پریشد راشٹریہ سیوک سنگھ جیسے ہندو انتہا پسندوں کے شکنجے میں ایسے پھنسے کہ وہ مستعفی ہو جانے کا اعلان کرنے پر مجبور ہوئے۔

مقبوضہ کشمیر میں نافذ ڈسٹرب ایریا ایکٹ اور آرمڈ فورسز سپیشل پاورز ایکٹ جیسے کالے قوانین کا دائرہ پوری مقبوضہ ریاست میں پھیلانے کا ایک مقصد انتہا پسندوں کے دباؤ کو کم کرنا بھی تھا۔ مقبوضہ جموں و کشمیر میں نافذ العمل یہ قوانین برطانوی راج کے ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ سے مختلف نہیں۔ جن قوانین کے خلاف ہندوستانیوں نے متحدہ طور پر جدوجہد کی آج ان ہی قوانین کو اعلانیہ نافذ کیا جا رہا ہے اور فوج کو عوام کو قتل کرنے کا لائسنس فراہم کیا جا رہا ہے۔ ہندو انتہا پسند آزاد کشمیر پر حملہ کرنے کا بھی مطالبہ کرتے آئے تھے۔ تاہم اس بارے میں بھارتی حکمران فی الحال بیانات کا سہارا لے رہے تھے۔ شدت پسند بھارتی وزیر داخلہ ایل کے ایڈوانی کو کشمیر پالیسی کا نگران اعلیٰ بنائے جانے سے نئی دہلی میں کشمیر سے متعلق تبدیلی کی گئی پالیسی کی عکاسی ہوتی تھی۔

10 اگست 2001ء کو سری لنکا کے دارالحکومت کولمبو میں جنوبی ایشیائی ممالک کی تنظیم سارک کے خارجہ سیکرٹریوں کا اجلاس ہوا۔ اس اجلاس کے دوران بھارت کی خارجہ سیکرٹری مسز چوکیلا آئر اور پاکستان کے خارجہ سیکرٹری انعام الحق نے 75 منٹ تک بند کمرے میں آگرہ مذاکرات کے بعد کی صورتحال اور آئندہ کی حکمت عملی پر بات چیت کی لیکن اگلی سربراہ ملاقات کی تاریخ طے نہ کی جا سکی۔ تاہم آگرہ کانفرنس میں شروع کئے گئے عمل کو آگے بڑھانے پر اتفاق ہو گیا۔ سوا گھنٹے ون ٹو ون ملاقات کے دوران پاکستانی خارجہ سیکرٹری نے اپنی ہم منصب بھارتی خاتون کو تجویز پیش کی کہ سربراہ ملاقات اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس کے دوران نیویارک یا پاکستان میں ہو سکتی ہے۔ لیکن بقول انعام الحق مسز چوکیلا آئر کی ہٹ دھرمی کے باعث تاریخ پر اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ چوکیلا آئر نے اصرار کیا کہ بھارت فوجی حکام کے دورہ پاکستان کی پیشکش کے جواب کا منتظر ہے۔ اجلاس کے بعد مسز چوکیلا نے بتایا کہ مسٹر انعام الحق نے تجویز پیش کی کہ بھارت ایٹمی خطرہ کو کم کرنے کے لئے ماہرین کا وفد پاکستان بھیجے۔ بھارت رواں برس کے آخر یا اگلے سال کے شروع میں پاک بھارت سربراہ ملاقات کے حق میں ہے۔ بھارت نے پاکستان کا یہ مطالبہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ سربراہ ملاقات کے ایجنڈے میں کشمیر کو سرفہرست رکھا جائے۔ کولمبو مذاکرات کے بعد بھارت کی خارجہ سیکرٹری کی طرف سے کسی قسم کا بیان جاری کرنے سے قبل بھارت نے نئی دہلی سے بیان جاری کیا کہ کشمیر میں مجاہدین کی دراندازی اور کراس بارڈر دہشت گردی برداشت نہیں کی جا سکتی۔ قبل ازیں جون کے آغاز میں ہی نیپال کے شاہی خاندان کو قتل کر دیا گیا جس کی وجہ سے سارک کانفرنس کا نیپال میں انعقاد ممکن نہیں رہا تھا۔ اس لئے بعد میں کولمبو کانفرنس ہوئی جو بھارتی ہٹ دھرمی کی بھینٹ چڑھ گئی۔

Marfat.com

نائن الیون

11 ستمبر 2001ء کی صبح وقت 8 بجکر 45 منٹ۔ دنیا کے مصروف ترین شہر کی مصروف ترین بلڈنگ ورلڈ ٹریڈ سنٹر جو اپنی ایک سو دس منزلہ عمارات کے ساتھ نیو یارک کی شناخت اور امریکہ کی تکبر و رعونت کی نشانی بن کر ایستادہ ہے اور جہاں ایک وقت میں قریباً 50 ہزار مرد و خواتین اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہوتے ہیں میں معمول کی سرگرمیاں جاری ہیں۔ زندگی معمول کے مطابق رواں دواں ہے۔ مغربی سرمایہ دارانہ نظام کے پرشکوہ مظہر نیو یارک کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں گہما گہمی شروع ہو چکی ہے۔ ہزار ہا کارکن اس کے جڑواں ٹاورز میں خوش و خرم دن کی مصروفیات کا آغاز کر رہے ہیں کہ ایک جہاز اس کے ایک حصے سے آ کر ٹکراتا ہے اور اس کی 10 منزلیں ملبے کا ڈھیر بن کر نیچے آ رہتی ہیں۔ ابھی کوئی سنبھل نہیں پاتا کہ ٹھیک 18 منٹ بعد ایک دوسرا جہاز ٹاور کے دوسرے حصے سے ٹکراتا ہے اور اس کے انہدام کا خوفناک عمل بھی شروع ہو جاتا ہے۔ آگ بھڑک اٹھتی ہے چاروں طرف دھواں پھیل جاتا ہے۔ چیخوں اور آہ و بکا سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ مرد اور عورتیں کھڑکیوں سے چھلانگیں لگا دیتے ہیں اور ہاتھوں میں ہاتھ دیئے موت کے منہ میں کود جاتے ہیں۔ چند ہی لمحے بعد امریکہ کی فوجی سطوت و جبروت کی مظہر پینٹا گان کی عمارت ایک اور جہاز ٹکرانے سے شعلوں کی لپیٹ میں آ جاتی ہے۔ وہ عمارت جس میں 24 ہزار ماہرین اور کارکن مصروف عمل تھے اور جو سپر ٹیکنالوجی کی مدد سے دنیا کے کونے کونے میں ہونے والی ہر حرکت کو مانیٹر کرنے کا زعم رکھتی تھی، تباہی اور بربادی کا ہولناک منظر پیش کرتی ہے اور پھر آن کی آن میں امریکی طاقت کے مراکز وائٹ ہاؤس، سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ، کیپٹل ہل اور قریباً 800 مرکزی عمارات انخلاء اور بھگدڑ کے ایسے مناظر دیکھتی ہیں جن کی کوئی مثال پہلے موجود نہیں اور جن کا چند لمحے پہلے تک کوئی تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ امریکی صدر کہاں ہیں، کس حال میں ہیں، ان کے Whereabouts کا کسی کو علم نہیں حتیٰ کہ جب وہ فلوریڈا سے ایک جہاز میں سوار ہو کر ایک ہوائی اڈے پر اترتے ہیں تو انہیں خود معلوم نہیں ہوتا کہ انہیں کہاں لے جایا جا رہا ہے اور وہ اور ان کا جہاز کس سرزمین پر اترے ہیں۔ امریکی نائب صدر ڈک چینی، وزیر دفاع رمزفیلڈ، دنیا میں دہشت کی علامت سی آئی اے کے سربراہ جارج ٹینٹ اور ایف بی آئی کے چیف رابرٹ موئیلر کے حدود و اربعہ کا کسی کو علم نہیں۔ امریکہ کی تاریخ میں پہلی دفعہ تمام اندرونی اور بیرونی پروازیں بند کر دی جاتی ہیں وزیر خارجہ کالن پاول پیرو کے دارالحکومت لیما میں تباہی کی خبر سنتے ہیں اور شدید پریشانی کے عالم میں اپنے ملک کی طرف بھاگتے ہیں۔

امریکہ کی تمام سٹاک مارکیٹیں اور مالیاتی ادارے ٹھپ ہو جاتے ہیں کیا صرف بیس منٹ پہلے کوئی امریکی جرنیل، مدبر، مخبر، دفاعی ماہر اس منظر نامے کا تصور بھی کر سکتا تھا؟ سی این این کے چوٹی کے مبصرین حیران ہیں کہ پانچ

Marfat.com

طیارے جو اندرون ملک پرواز پر تھے منٹوں اور گھنٹوں کے اندر اندر کس طرح ہائی جیک ہو جاتے ہیں اور کسی روک ٹوک کے بغیر اپنے اپنے ہدف پر کس طرح اپنے آپ کو گرا دیتے ہیں۔ امریکی وزارت دفاع، پینٹا گان کی عمارت، کہا جاتا ہے کہ دنیا کی سب سے محفوظ (most secured) عمارت ہے لیکن اس کا حفاظتی نظام تار عنکبوت ثابت ہوتا ہے جسے ایک بیلسٹک میزائل نہیں، ایک لڑاکا جنگی طیارہ نہیں، ایک جوہری بم نہیں محض ایک مسافر طیارہ توڑ تاڑ کے رکھ دیتا ہے اور اس کا راستہ روکنے کے لیے کوئی حفاظتی تدبیر بروئے کار نہیں آپاتی۔

الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا کی خبروں کے مطابق 11 ستمبر کو واقعات کچھ اس طرح پیش آئے کہ دو اغوا شدہ طیارے صرف 18 منٹ کے وقفوں سے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے دونوں ٹاوروں سے الگ الگ جا ٹکرائے جس کے نتیجے میں دونوں ٹاورز میں بوس ہو گئے۔ اس کے فوراً بعد امریکہ کی دانست میں اس کے محفوظ ترین مقام "پینٹا گان" سے ایک طیارہ ٹکرایا اور دھماکوں کے ساتھ عمارت کو آگ لگ گئی۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر "طیارہ بموں" سے حملہ کے نتیجے میں ہزاروں افراد کے ہلاک و زخمی ہونے کا خدشہ تھا۔ ان واقعات کے بعد واشنگٹن میں دفتر خارجہ میں کار بم کا دھماکہ ہوا، ان حملوں کے بعد پینٹا گون، وزارت خارجہ، وہائٹ ہاؤس اور دیگر تمام اہم سرکاری عمارتوں کے علاوہ اقوام متحدہ کی عمارت بھی خالی کرا لی گئی۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر طیارہ بموں کے ان حملوں نے پورے امریکہ کو ہلا کر رکھ دیا۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب صبح 8 بجکر 30 منٹ پر زندگی رواں دواں تھی۔ اس وقت پیش آنے والے یہ واقعات ناقابل یقین تھے بتایا گیا تھا کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں 50 ہزار افراد کام کرتے ہیں جبکہ ڈیڑھ لاکھ افراد روزانہ بزنس کے لیے آتے ہیں۔ اس طرح اس سانحہ میں مرنے والے افراد کی تعداد ہزاروں تک پہنچ سکتی تھی بتایا گیا تھا کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹا گون سے ٹکرانے والے تینوں طیارے اغوا کئے گئے تھے جبکہ چوتھا طیارہ بھی اغوا کیا گیا ہے جس نے وہائٹ ہاؤس سے ٹکرانا تھا مگر اس کا بروقت بندوبست کر لیا گیا۔

یہ طیارہ پینسلوانیا کے علاقہ میں گر کر تباہ ہو گیا ورلڈ ٹریڈ سنٹر سے ٹکرانے والے دو طیاروں میں سے ایک بوسٹن اور دوسرا نیوجرسی سے اغوا کیا گیا تھا۔ ان واقعات کی ذمہ داری اسامہ بن لادن پر عائد کی جارہی تھی۔ صدر بش نے اسے قومی سانحہ قرار دیا۔ دونوں شہروں میں پھیلے دھوئیں کے بادل اور تباہی اس "ٹریجڈی" کو اور بھی واضح کر رہے تھے۔ دھماکوں کے بعد پینٹا گون اور دفتر خارجہ کی عمارت بھی شعلوں اور دھوئیں میں لپٹی پڑی تھی اور دونوں شہروں میں "جنگ" کی سی صورتحال نظر آرہی تھی۔ ہر شخص جدھر مرضی منہ اٹھائے بھاگ رہا تھا شہری زندگی مفلوج ہو کر رہ گئی۔ امریکی صدر بش نے اسے دہشت گردی پر مبنی حملہ قرار دیا۔ بتایا گیا کہ طیارے ہائی جیک کرنے کے بعد انہیں ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی عمارت سے ٹکرایا گیا۔ دھماکوں کے بعد ٹاورز سے دھوئیں کے بادل اور آگ کے شعلے نکل رہے تھے۔ ایک عینی گواہ نے بتایا کہ اس نے الارم کی آواز سنی کیونکہ کمرشل جیٹ طیارہ بوئنگ 776، 110 منزلہ عمارت کی 80 سے 85 فلور کے درمیان ٹکرایا اور پھر چند منٹ کے وقفہ کے بعد دوسرا طیارہ جنوبی ٹاور سے جا ٹکرایا۔ سی این این نے بتایا کہ ان میں ایک طیارہ امریکن ائرلائنز کا کمرشل جیٹ تھا جو بوسٹن سے اڑ کر آیا، اسے اغوا کیا گیا تھا۔

فیڈرل ایوی ایشن ایڈمنسٹریشن کی ترجمان لارا براؤن نے بتایا کہ اتھارٹی اس بارے میں حقائق اکٹھے کر رہی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اس علاقہ میں کسی طیارے کو اڑنے کی اجازت نہیں تھی اور یہ ممنوعہ "ائرسپیس" تھی۔ نیشنل

Marfat.com

ٹرانسپورٹیشن سیفٹی بورڈ کے ترجمان ایرا فرمن نے عندیہ دیا کہ یہ طیارے محض حادثاتی طور پر نہیں ٹکرائے کیونکہ ادھر نارمل ائر ٹریفک نہیں۔

پینٹا گون میں دو دھماکوں میں مرنے والوں کا علم نہیں ہو سکا۔ سی این بی سی کے مطابق نیو یارک کی سٹاک ایکسچینج بلڈنگ بھی خالی کرالی گئی۔ نیو یارک کے ایک رہائشی نے بتایا کہ پہلے واقعہ میں کمرشل پسنجر جیٹ ٹاور کی طرف بڑھتا دکھائی دیا اور پھر زور دار دھماکہ سے جا ٹکرایا۔ اس کے بعد دوسرے ٹاور سے ٹکرایا۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر 110 منزلہ عمارت ہے جو نیو یارک کی سب سے بلند عمارت ہے دوسرا ٹاور اس سے صرف دو میٹر لمبا ہے۔ امریکہ بھر میں تمام طیاروں کا ٹیک آف فوری طور پر روک دیا گیا۔ آن لائن کے مطابق مسافر طیاروں کو اغوا کر کے انہیں دنیا کی تیسری بلند ترین عمارت ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور محکمہ دفاع کے پینٹا گون کے صدر دفاتر سے ٹکرا کر دنیا بھر کو ہلا کر رکھ دیا گیا۔ تباہی کے ان واقعات میں ہزاروں افراد کی ہلاکت کا خدشہ تھا منگل کو جب امریکی قوم اپنے روز مرہ معمولات زندگی کے لیے مصروف ہوئی تو صبح نو بجے نیو یارک کی فضاؤں میں غیر متوقع طور پر ایک مسافر بوئنگ طیارہ انتہائی نچلی پرواز کرتے ہوئے دکھائی دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ دو حصوں پر مشتمل ایک سو دس منزل بلند ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے ایک حصے سے جو کہ تقریباً 80 ویں منزل کے قریب تھا انتہائی زور دار دھماکے کے ساتھ جا ٹکرایا۔ اس سے فضا میں آگ کا بڑا بگولہ اٹھا اور ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تقریباً آٹھ منزلوں کی ایک طرف کا حصہ مکمل طور پر تباہ ہو کر طیارے کے ملبے سمیت نیچے آ گرا۔

اس دھماکے کی آواز نیو یارک کے طول و عرض میں سنائی دی اور فوری طور پر ہنگامی صورتحال پیدا ہو گئی۔ ابھی امدادی کارروائیاں شروع ہوئیں تھیں کہ ایک اور مسافر طیارہ نیو یارک کی فضاؤں میں آیا اور وہ بھی نچلی پرواز کرتے ہوئے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی عمارت کے دوسرے حصے سے جا ٹکرایا۔ دنیا کی اس بلند و بالا عمارت سے طیارے ٹکرانے کے باعث ہونے والی تباہی کی خبر دنیا بھر میں جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ اس واقعہ کے تقریباً پون گھنٹہ کے اندر ایک مسافر طیارہ جو کہ دوران پرواز اغوا ہوا تھا امریکہ کے انتہائی حساس ترین ادارے پینٹا گون کے صدر دفاتر پر آ گرا۔ جس سے پینٹا گون کا ایک حصہ مکمل طور پر تباہ ہو گیا۔ اس کے چند منٹ بعد امریکی محکمہ خارجہ سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے قریب کار بم کا زور دار دھماکہ ہوا اور وائٹ ہاؤس کے قریبی شاپنگ سنٹر میں بھی دھماکہ ہونے کی اطلاع ملی۔

ان واقعات کے بعد امریکی فضائیہ کے درجنوں جنگی طیاروں کو فوری طور پر فضاؤں میں بھیج دیا گیا اور انہیں ہدایت دی گئی کہ وہ کسی بھی مشکوک طیارے کو دیکھتے ہی حکم ملنے پر مار گرائیں۔ ملبہ زمین پر گرنے سے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے قریبی علاقے میں تباہی پھیلی اور بتایا گیا کہ ملبہ کی زد میں آ کر بڑی تعداد میں افراد ہلاک ہوئے جن میں امدادی کارکن بھی شامل تھے۔ نیو یارک میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر سے دس کلومیٹر اور شہر کے وسطی علاقے کو مکمل طور پر سیل کر دیا گیا متعلقہ حکام کے علاوہ کسی کو اس علاقے میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ سینکڑوں کی تعداد میں ایمبولینسوں کے ذریعے مرنے اور زخمی ہونے والوں کو ہسپتالوں کی طرف لے جایا جانے لگا جبکہ ہسپتالوں میں ایمرجنسی نافذ کر دی گئی اس کے ساتھ نیو یارک شہر میں بھی ایمرجنسی نافذ کرتے ہوئے ہر قسم کی پبلک ٹرانسپورٹ اور ریل گاڑیاں کو وقتی طور پر روک دیا گیا امریکہ بھر میں ہوائی اڈوں کو سیل کر کے اندرون ملک پروازوں کا شیڈول ملتوی کر دیا گیا جبکہ بیرون ملک سے آنے والی پروازوں کو بھی آنے کی

Marfat.com

اجازت نہ دی گئی جس کے باعث کئی فلائٹس کینیڈا کی طرف موڑ دی گئیں۔

امریکہ نے القاعدہ کو اس حملے کا ذمہ دار قرار دیا اور افغانستان کی طالبان حکومت کو وارننگ دی کہ اسامہ بن لادن کو امریکہ کے حوالے کیا جائے بصورت دیگر بڑی تباہی آنے والی ہے۔ پاکستانی اتھارٹیز کی طرف سے گو کہ اپنے عوام کو حسب روایت اندھیرے میں رکھنے کی روایت کو تسلسل سے دھرایا جارہا تھا اور ذمہ دار حکام کہہ رہے تھے کہ امریکہ کی طرف سے ابھی کوئی مطالبہ ہی نہیں کیا گیا شاید ہماری بیوروکریسی پاکستانی عوام کو کچھ بتانے یا اعتماد میں لینے کا تکلف ہی نہیں کرتی جبکہ بین الاقوامی میڈیا کے ذرائع خبر دے رہے تھے کہ امریکہ پاکستان سے تین اہم مطالبات منوانا چاہتا تھا۔

1۔ پاکستان افغانستان کے ساتھ اپنی سرحد سیل کر دے۔

2۔ طالبان کو ایندھن کی سپلائی بند کر دے۔

3۔ پاکستان کی فضائی حدود کو امریکی جنگی طیاروں کے لیے جائز قرار دے دیا جائے۔

اس کے ساتھ یہ خبر بھی آئی کہ امریکی اپنے مطالبات منظور ہونے کی صورت میں پاکستان کو فوراً 3 ارب ڈالر قرض کی پیشکش کر سکتے ہیں۔ ادھر امریکی وزیر خارجہ کولن پاؤل پاکستان سے بار بار ایک ہی مطالبہ دہرا رہے تھے کہ وہ امریکہ کا مکمل ساتھ دے اور طالبان کی حمایت ترک کر دے۔ واشنگٹن میں ایک پریس کا بریفنگ کے دوران انہوں نے کہا کہ امریکہ ابھی اپنی اس درخواست کے جواب کا منتظر ہے جس میں فضائی کارروائی کے لیے امریکی طیاروں کو پاکستانی فضائی حدود سے گزرنے کی اجازت طلب کی گئی ہے انہوں نے طالبان کی قیادت کو پیغام دیا کہ اسامہ بن لادن جس تنظیم کا سربراہ ہے وہ شہریوں پر حملے کرتی ہے اور وہ ہمارا سب سے بڑا مشتبہ ہے۔ اس کے خلاف تحقیقات جاری ہیں تاہم اسے حتمی طور پر ذمہ دار نہیں ٹھہرایا گیا لیکن اب تک جتنے بھی شواہد ملے ہیں اس سے اسامہ بن لادن ان حملوں میں ملوث پایا گیا ہے اس نے دہشت گردوں کو سامان اور سرمایہ فراہم کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ طالبان کو دہشت گردی کی حمایت ترک کر دینا چاہیے انہوں نے طالبان کو بھی خبردار کیا کہ وہ اپنی سرگرمیوں کو اپنے ملک میں پناہ حاصل کئے دہشت گردوں سے الگ نہیں کر سکتے آپ نے اسامہ بن لادن کی تنظیم سمیت کئی دیگر تنظیموں کو پناہ دی ہوئی ہے وزیر خارجہ نے کہا کہ امریکہ پناہ دینے والوں پر بھی نگاہ رکھے گا، کولن پاؤل حالیہ حملے کرنے والوں کے خلاف ایک عالمی اتحاد بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے پانچ حکومتوں سے رابطہ کیا اور ان پر زور دیا کہ وہ امریکہ کا ساتھ دیں اور شدت پسند تنظیموں کو ملنے والے فنڈ زرو کنے کی کوشش کریں امریکی محکمہ خارجہ کے حکام کے مطابق وزیر خارجہ نے جاپان بھارت سعودی عرب تیونس اور مراکش کے وزرائے خارجہ سے ٹیلی فون پر گفتگو کی اس کا بنیادی مقصد ایک موقف اختیار کر کے اطلاعات کا تبادلہ دہشت گردی کی سرگرمیوں کی حمایت ختم کرنا تھا۔ اس صورتحال کا افسوسناک پہلو یہ تھا کہ پاکستان کا سرکاری میڈیا اب تک منہ میں گھنگنیاں ڈالے بیٹھا تھا اور یہ کہ بھارتی میڈیا کی مسلسل لاف زنی کے خلاف بھی کوئی حکمت عملی دیکھنے میں نہیں آ رہی تھی۔ اس صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے ارشاد احمد حقانی نے اپنے مضمون امریکی بحران اور پاکستان میڈیا میں جو کچھ لکھا وہ آنکھیں کھولنے کے لیے کافی تھا۔ حقانی صاحب رقمطراز ہیں:

میڈیا کے امور کے ابتدائی واقفیت رکھنے والا ہر شخص یہ محسوس کرے گا کہ امریکی بحران پر پاکستان الیکٹرانک

Marfat.com

میڈیا نے بہت دھیما (Low Key) رویہ اب تک اپنایا ہے اس کی مصلحت ایک حد تک قابل فہم ہے۔ مجھے بدھ کے روز دن کے وقت جمعرات کی صبح کے ''نیوز مارننگ'' پروگرام میں امریکی صورتحال پر گفتگو کرنے کے لیے پی ٹی وی نے مدعو کیا۔ بدھ کی شام مجھے بتایا گیا کہ بوجوہ پروگرام کا وقت ایک تہائی کر دیا گیا ہے یعنی کل 15 منٹ اور اس کی مصلحت یہ ہے کہ فی الحال اس موضوع پر جامع اور ہمہ گیر گفتگو کرنا مناسب نہیں۔ میں نے حکومت کی مجبوری سمجھتے ہوئے اس تبدیلی کو قبول کر لیا۔ کوئی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد بتایا گیا کہ پروگرام منسوخ کر دیا گیا ہے۔ میں نے اس فیصلے کو بھی قبول کیا۔ ایک تو اس لیے کہ میں ان نازک اور حساس مذاکرات سے آگاہ تھا جو اس وقت پاکستان اور امریکہ کے درمیان مختلف سطحوں پر جاری تھے اور دوسرے اس لیے کہ میں بہت مختصر، بہت محدود اور بہت یکطرفہ تبصرہ کرنے کی پریشانی (Embarrassment) سے بچ گیا۔ لیکن نئی صورتحال کے کئی پہلو ہیں۔ ایک پہلو تو بدیہی طور پر یہ ہے کہ دہشت گردی کی مذمت کرنے کے ساتھ ساتھ امریکہ کو بھی آئینہ دکھایا جائے۔ یہ کام پاکستان کے پرنٹ میڈیا میں ہو رہا ہے اور اگر سرکاری میڈیا پر فوراً نہ بھی ہو تو اس کی مصلحت سمجھ میں آسکتی ہے لیکن اس معاملے کے کئی اور پہلو بھی ہیں۔

ہندوستان نے پاکستان کو اور کشمیریوں کی جدوجہد کو دہشت گردی ثابت کرنے کی کوششیں دو چند بلکہ سہ چند کر دی۔ جہاد کے تصور ہی کو فی نفسہ ایک تخریبی عمل ثابت کرنے کی کوشش بھی بڑھا دی۔ ان امور پر تو پاکستان کا الیکٹرانک میڈیا موثر خرابی کارروائی کر سکتا تھا۔ بھارت کی ہر ممکن کوشش تھی کہ طالبان پاکستان اور القاعدہ کی ایک تکون بنا کر امریکہ کے سامنے پیش کر دے بھارت کی طرف سے افغانستان میں کارروائی کے لئے امریکہ ہر ممکن سہولتیں فراہم کرنے کی پیشکش کی جا رہی تھی اور اسی کی کوشش تھی کہ امریکہ پاکستان کے بجائے اسے اپنا حلیف بنا لے تاکہ پاکستان کو بھی طالبان کا ساتھی بنا کر بھارت اپنا الو سیدھا کر لے۔

امریکہ پر فدائی حملے کے فوراً بعد ہی پاکستانی قیادت کی بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ انہیں خود کو ایک بڑی آمائش سے گزرنے کے لئے فوراً تیار ہونا ہوگا جہاں ایک طرف امریکی صدر اپنی قوم کو بتا رہے تھے کہ وہ ''حالت جنگ'' میں ہیں وہیں پاکستانی فوجی قیادت خود کو ''حالت جنگ'' کے سے حالات سے نمٹنے کے لئے تیار کر رہی تھی۔ حملوں کے روز جنرل پرویز مشرف کراچی سے واپسی کے فوراً بعد سیدھے جوائنٹ ہیڈ کوارٹرز گئے جہاں انہوں نے اعلیٰ فوجی قیادت سے طویل صلاح مشورہ کیا۔ اسی دن اعلیٰ فوجی قیادت نے نئی صورتحال کا سامنا کرنے اور ملک کو درپیش خطرات سے نمٹنے کے لئے فوجی نوعیت کی تیاریوں کو حتمی شکل دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اگلے روز پاک فضائیہ کے تمام اڈوں اور ایئر ڈیفنس یونٹوں کو مکمل طور پر چوکس کر دیا گیا جبکہ پاک بحریہ بھی ہنگامی حالت میں آ گئی۔ مزید براں کوئٹہ اور پشاور میں تعینات 12 ویں اور 11 ویں کوریں بھی ہائی الرٹ حالت میں آ گئیں۔ اس ابتدائی تیاری کے بعد صدر پرویز مشرف کی انتظامیہ مختلف نوع کی صورتحال سے نمٹنے کے لئے مختصر مدت کے منصوبوں کی تیاری میں مصروف تھے تاکہ فوجی کارروائی کی صورت میں ملکی سلامتی کے حوالے سے سیاسی اور سفارتی نوعیت کے چیلنجوں سے عہدہ برآ ہوا جا سکے۔ یہ منصوبہ بندی پاکستان کی طرف سے دہشت گردی کے خلاف بین الاقوامی اقدامات کی مکمل حمایت کی یقین دہانی کے تناظر میں کی جا رہی تھی۔ یہ باور کرتے ہوئے کہ افغانستان کے خلاف فوجی کارروائی کسی بھی وقت ہو سکتی ہے جی ایچ کیو، ملٹری آپریشنز ڈائریکٹوریٹ، آئی ایس آئی اور

Marfat.com

پشاور اور کوئٹہ لاجسٹکس میں جرنیلوں کی ایک ٹیم قوم اور قومی وسائل کو ایسی کارروائی کے نتائج کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رکھنے کی غرض سے دن رات کام کر رہی تھی۔ امریکہ کی طرف سے پاکستان کی فضائی حدود کے متوقع استعمال نے سب سے پہلے پاکستانی فوجی منصوبہ سازوں کو متوجہ کیا۔ جن کا خیال تھا کہ امریکی افواج افغانستان کے خلاف وسیع پیمانے پر ٹام ہاک کروز میزائل اور سمارٹ بم بی 52 استعمال کریں گی اور اس مقصد کے لئے پاکستانی فضا استعمال کی جائے گی۔ اگرچہ پاکستان کی فوجی حکومت اپنی فضائی حدود کی کسی بھی خلاف ورزی کو نظر انداز کرنے پر تیار ہوگئی مگر ان حملوں کے دوران کسی حادثہ یا اندازے کی غلطی کے بارے میں سخت فکر مند تھے کیونکہ جو راستہ امریکی یا اس کی اتحادی افواج فضائی حملوں کے لئے استعمال نہ کریں اس راستہ میں پاکستان کی کئی حساس ایٹمی تنصیبات موجود تھیں۔ حکام کا کہنا تھا کہ پاکستان ان فضائی حملوں کے دوران کسی تکنیکی غلطی کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ نیوکلیئر تنصیبات کی حفاظت پر مامور فوجی حکام ان تنصیبات کی حفاظت کے فول پروف انتظامات کر رہے تھے۔ پاکستان کو ایسے حملے کے لئے پیشگی اطلاع بھی درکار تھی تاکہ فضا کو ملکی طیاروں کے لئے بند کیا جائے۔

1998ء میں امریکہ نے افغانستان پر پاکستان کو اطلاع دیئے بغیر ٹام ہاک کروز میزائل سے حملہ کیا تو پاکستان کے لئے پیچیدہ صورتحال پیدا ہوئی تھی تاہم اس سے قبل کہ پاکستان اسے بھارتی حملہ خیال کرتا امریکہ نے پاکستان کو اصل صورتحال سے آگاہ کر دیا۔ ملٹری آپریشنز ڈائریکٹوریٹ، اسٹریٹیجک کمانڈ فورسز اور فوج کے دیگر ادارے فی الحال اس بحران سے نمٹنے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ بدھ جوائنٹ اسٹاف ہیڈکوارٹرز میں جنرل پرویز مشرف کے احکام کا مرکز پشاور اور کوئٹہ کی کوریں تھیں نئی صورتحال میں ان دونوں کوروں کو پاک فوج کے تمام یونٹوں کی بھرپور معاونت حاصل تھی۔ کور کمانڈر کانفرنس کے بعد کور کمانڈر پشاور لیفٹیننٹ جنرل احسان الحق اور کور کمانڈر کوئٹہ لیفٹیننٹ جنرل مشتاق کو راولپنڈی میں اپنا قیام بڑھانا پڑا تاکہ جی ایچ کیو آپریشن کے مختلف عناصر کو حتمی شکل دی جاسکے۔ سرکاری ذرائع کو صوبہ سرحد اور بلوچستان کے سرحدی علاقوں میں پرتشدد مزاحمت کا خطرہ تھا جہاں طالبان کے مسلح حامی موجود تھے طالبان کو ملک کے مذہبی حلقوں کی بھی وسیع حمایت حاصل تھی۔ اگر پاکستان افغانستان کو ایندھن کی سپلائی روکنے کے امریکی دباؤ کو پورا کرنے میں ناکام رہتا تو پشاور اور کوئٹہ کے کور کمانڈروں کو خاصی مشکل کا سامنا ہوسکتا تھا۔ پاکستان آرمی اور پیراملٹری دستوں کی طرف سے سرحد پر اس قسم کی کوئی بھی کوشش سرحد کے پاکستانی حصے میں طالبان اور ان کے حامیوں کی سخت مخالفت کو جنم دے سکتی تھی۔ کوئٹہ اور پشاور کو ہنگامی طبی امداد کے انتظامات بھی کرنے تھے کیونکہ 1998ء میں امریکی میزائل حملے کے دوران زخمی ہونے والے تقریباً تمام افراد پشاور اور کوئٹہ کے ہسپتالوں میں لائے گئے تھے۔ پشاور اور کوئٹہ کے کور کمانڈروں کو امریکی حملے کی صورت میں مہاجرین کے نئے طوفانی ریلے کا بندوبست بھی کرنا تھا۔

اس دوران جب ساری دنیا کا میڈیا چیخ چیخ کر بتا رہا تھا کہ پاکستان نے امریکی کی تمام شرائط قبول کر لی ہیں جن میں امریکی فضائیہ کو پاکستانی فضا استعمال کرنے، ری فیولنگ کی سہولیات فراہم کرنے اور اپنی سرحدوں پر کثیر الملکی افواج کی تعیناتی بھی شامل ہے۔ امریکی وزیر خارجہ کولن پاؤل پاکستان کا بار بار شکریہ ادا کر رہے تھے صدر بش جنرل پرویز مشرف کو فون کر کے اس فراخدلانہ پیشکش پر خراج تحسین پیش کر رہے تھے۔ عین ان ہی مراحل میں اچانک ہمارے وزیر

Marfat.com

خارجہ جناب عبدالستار کی پریس کانفرنس کا غلغلہ اٹھا جنہوں نے اپنی روایات کے عین مطابق اپنی دانست میں عالمی پریس کو بے وقوف سمجھتے ہوئے ''ڈپلومیٹک'' زبان بولنا شروع کر دی۔ایسی زبان پاکستانی صحافیوں کے لئے تو معمول کی بات ہے بین الاقوامی پریس کے لئے نئی انہوں نے سیدھے سوالات شروع کئے کہ حضور امریکہ نے مطالبہ کیا کیا تھا؟ آپ کیا کیا سہولیات فراہم کر رہے ہیں ان سوالات پر جناب عبدالستار مشکل قسم کے انگریزی الفاظ بول کر رخصت ہو گئے۔ان کے بیان سے صرف یہ بات سمجھ آئی کہ پاکستان سلامتی کونسل کے فیصلوں پر عمل کرے گا جبکہ بین الاقوامی میڈیا پاکستان کی طرف سے سب کچھ قبول کر لینے کی خبریں سنا رہا تھا۔

اس انتہائی ناخوشگوار صورتحال میں جب ممکنات کے کئی پہلو دکھائے جا رہے تھے پاکستانی قوم اپنے سربراہ کے خیالات جاننے کے لئے بے تاب تھی تاکہ حکومت پاکستان کی حکمت عملی کو سمجھا جا سکے۔19 ستمبر کی رات ساڑھے آٹھ بجے جنرل پرویز مشرف نے قوم سے خطاب کیا جسے ساری دنیا کے قابل ذکر ٹی وی چینلز نے براہ راست دکھایا گیا۔اس کا مکمل متن ملاحظہ کریں اور دیکھیں کہ پاکستان کس بحرانی صورتحال سے دوچار تھا۔

میرے عزیز ہم وطنو!

السلام علیکم!

جن حالات سے پوری قوم گزر رہی ہے اور جو بین الاقوامی بحران آج کل اٹھا ہوا ہے میں نے سوچا کہ میں آپ سب لوگوں کو پوری قوم کو اپنے خیالات میں شامل کروں سب سے پہلے تو امریکہ میں دہشت گردی کے موقع پر ہزاروں جانوں کا نقصان ہوا ہے ان کا مجھے میری حکومت کو اور تمام پاکستانی قوم کو دلی رنج ہے۔ہمیں زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ اس حادثہ میں تقریباً 45 ملکوں کے لوگوں کی جانیں ضائع ہوئی ہیں ہر عمر کے لوگ ضعیف بچے خواتین یہاں تک کہ ہر مذہب کے لوگ اس میں جاں بحق ہوئے ہیں کئی پاکستانی بھی اس حادثہ میں جاں بحق ہوئے یہ وہ لوگ تھے جو بہت قابل پاکستانی اور اپنی زندگی بہتر بنانے کے لئے امریکہ گئے ان کے نقصان پر میں ان کے خاندانوں سے بہت ہمدردی کا اظہار کرنا چاہوں گا اور میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ان کی مغفرت کرے۔اس واقعہ سے اس دہشت گردی کے واقعہ سے امریکہ میں شدید غم غصہ اور انتقال کی لہر دوڑ اٹھی ہے ان کا پہلا ٹارگٹ شروع سے اب تک اسامہ بن لادن سے اور اس سے زیادہ اس کی موومنٹ جس کا وہ کہتے ہیں کہ یہ اسامہ بن لادن کی موومنٹ ہے وہ ان کا پہلا ٹارگٹ ہے۔دوسرا ٹارگٹ طالبان ہیں وہ اس لئے کہ طالبان نے اسامہ بن لادن اور اس کے نیٹ ورک کو پناہ دی ہوئی ہے یہ ان کی کئی سالوں سے ڈیمانڈ ہے کہ اسے Extradite کیا جائے اور انٹرنیشنل کورٹ کے سامنے لایا جائے، اس کو طالبان مسترد کرتے رہے ہیں تو اس لئے دوسرے ٹارگٹ طالبان ہیں۔تیسرا ٹارگٹ عالمی سطح پر دہشت گردی کے لئے ایک طویل جنگ کے ہونے کا ارادہ کیا ہے۔

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ان تینوں ٹارگٹوں جو میں کہہ رہا ہوں میں کہیں اسلام یا افغانستان کے عوام کے خلاف کسی قسم کی جنگ کی بات نہیں ہو رہی ہے۔اس تمام مہم میں پاکستان سے سپورٹ مانگی جا رہی ہے یہ کیا سپورٹ ہے مجموعی طور پر تین اہم باتیں ہیں جس میں امریکہ ہم سے سپورٹ مانگ رہا ہے پہلی انٹیلی جنس اور انفارمیشن ایکسچینج، دوسری

Marfat.com

سپورٹ ہماری ایئر سپیس کا استعمال اور تیسری پورٹ وہ ہم سے لاجسٹک سپورٹ مانگ رہا ہے۔اس وقت میں یہ بھی بتانا چاہوں گا کہ اس وقت تک ان کے کوئی پلین کوئی آپریشنل پلین یا منصوبے تیار نہیں ہیں اس لئے کسی قسم کی ڈیٹیل ہماری سپورٹ کی تفصیلات ہمیں نہیں پتہ ہیں لیکن یہ پتہ ہے کہ جو کچھ بھی امریکہ کے ارادے ہیں ان کو یونائیٹڈ نیشن کی سلامتی کونسل اور جنرل اسمبلی کی قرارداد پاس ہوئی اس کی سپورٹ ہے۔ یہ دہشت گردی سے جنگ کرنے کی قرارداد ہے اور یہ قرارداد ان لوگوں کو سزا دینے کی قرارداد ہے جو دہشت گردی کی حمایت کرتے ہیں اور یہ بھی بتاتا چلوں کہ اس میں تمام اسلامی ممالک نے اس قرارداد کی حمایت کی ہے۔ یہ تھی بیرونی صورتحال، اب میں کچھ اپنی اندرونی صورتحال کے بارے میں آپ کو آگاہ کرنا چاہوں گا پاکستان کو انتہائی نازک دور کا سامنا ہے اور میرے خیال میں 1971ء کے بعد یہ سب سے زیادہ نازک دور ہے۔ اس وقت ہمارے فیصلوں کے دوررس اور وسیع نتائج نکل سکتے اس کا پھیلاؤ بہت بڑا ہے اگر ہم نے کوئی غلط فیصلے کئے تو اس کے بدترین نتائج ہو سکتے ہیں اور دوسری طرف اگر ہم نے صحیح فیصلے کئے تو اس کے مثبت نتائج نکل سکتے ہیں۔ بدترین نتائج سے خدانخواستہ ہماری سالمیت اور ہماری بقاء خطرہ میں ہو سکتی ہے ہماری کریٹیکل کنسرنز یعنی جو ہماری اہم کنسرن ہیں ان کو نقصان پہنچ سکتا ہے ہماری جوہری طاقت، ہمارے کشمیر کاز کو نقصان پہنچ سکتا ہے یہ ہے بدترین صورتحال۔

مثبت صورتحال سیاسی طور پر ہم ایک ذمہ دار اور باوقار ملک کی حیثیت سے ابھر سکتے ہیں اور ہماری تمام مشکلات میں کمی آ سکتی ہے ان حالات کا میں نے مکمل جائزہ لیا اور میں نے مختلف خیالات کے لوگوں سے مشاورت کی، میں نے سروسز چیف سے مشورے کئے، کور کمانڈرز سے ملا، کور کمانڈر کانفرنس بلائی، کابینہ اور نیشنل سکیورٹی کونسل سے مشاورت کی پھر میں نے میڈیا سے انٹریکشن کیا، میں نے علماء کو بلایا ان سے بات چیت کی میں نے تمام سیاستدانوں سے بات چیت کی اب میرا ارادہ ہے کہ کل میں تمام ٹرائبل سرداروں کو بلا کر ان سے میں گفتگو کروں یہ میں نے وہی سلسلہ شروع کیا ہے جو آگرہ جانے سے پہلے کیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اوپنین کسی حد تک ڈیوائیڈڈ ہے لیکن بہت بھاری اکثریت حکمت اور تحمل کے حق میں ہے۔ کچھ لوگ میں سمجھتا ہوں کہ دس پندرہ فیصد جذباتی فیصلے کی طرف مائل ہیں۔

آیئے اب دیکھتے ہیں کہ ہمارے ہمسایہ ملک کے کیا عزائم ہیں انہوں نے اپنی تمام ملٹری فسیلیٹیز امریکہ کو آفر کر دی ہیں ان کی بیسز، ان کی سہولیات، لاجسٹک سپورٹ، انہوں نے بڑے آرام سے امریکہ کو آفر کر دی ہیں وہ چاہتے ہیں کہ امریکہ ان کے ساتھ ہو جائے اور پاکستان کو دہشت گرد ریاست ڈیکلیئر کر دیا جائے اور ہمارے سٹرٹیجک اثاثوں اور کشمیر کاز کو نقصان پہنچایا جائے صرف یہ نہیں حال ہی میں دوشنبے میں چند ملک اکٹھے ہوئے ہندوستان کا نمائندہ بھی شامل ہے ان کا کیا ارادہ ہے ہندوستان کا کوئی افغانستان کے ساتھ بارڈر نہیں ہے وہ ایک لاتعلق ملک ہے افغانستان سے، تو حیرانگی کی بات ہے کہ میری نظر میں وہ یہ چاہتے ہیں کہ اگر افغانستان میں کوئی تبدیلی آئی تو وہاں ایک اینٹی پاکستان گورنمنٹ کو تشکیل دیا جائے افسوسناک بات تو یہ ہے کہ تمام دنیا اس دہشت گردی کے حادثہ کی باتیں کر رہی ہے اور ہمارا ہمسایہ ملک جس سے پیس اور کوآپریشن کی باتیں ہو رہی تھیں وہ پاکستان اور اسلام کو بدنام کر کے نقصان پہنچانا چاہتا ہے اگر آپ ان کے ٹیلی ویژن دیکھیں صبح، دوپہر، شام ہمارے خلاف پروپیگنڈہ چل رہا ہے۔ ان کو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ

Marfat.com

پاکستانی افواج اور ہر پاکستانی فرد پاکستان کے دفاع سالمیت اور پاکستان کے سٹریٹجک اثاثوں کی سیفٹی کے لئے اپنی جان دینے کو تیار ہے کسی قسم کی غلط فہمی میں کوئی نہ رہے اس وقت پوری ایئر فورس ہائی الرٹ میں ہے اور وہ Lay off ڈاؤاور ڈائی مشن کے لئے تیار ہے۔

میرے ہم وطنو! اس تمام صورتحال میں غلط فیصلے کا نا قابل برداشت نقصان ہو سکتا ہے ہماری کریٹیکل کنسرنز یا ضروری ترجیحات کیا ہیں میری نظر میں چار ہیں سب سے پہلے ملک کی حفاظت اور سالمیت ایکسٹرنل تھریٹ ہے۔ دوسرے نمبر پر ہماری معیشت جس کی ریوائیول کے لئے ہم کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ تیسری چیز ہمارے سٹریٹجک اثاثے، نیو کلیئر اینڈ میزائل اور کشمیر کاز، یہ چار ہمارے کریٹیکل کنسرن ہیں ہمارے غلط فیصلے سے خدانخواستہ ان سبھوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ فیصلہ لیتے ہوئے ہمیں ان تمام باتوں کو سامنے رکھنا ہوگا۔ فیصلے میں حق کی بالا دستی ہونی چاہیے اور ابھی تک جو کچھ بھی ہم کر رہے ہیں وہ اسلام کے عین مطابق ہے اور اس میں حق کی بالا دستی ہے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ جہاں ملک کے مفاد یا نقصان کا سوال ہو اس میں حکمت اور دانشمندی سے کام لینا چاہئے۔ اس موقع پر میرا ابھی پہلا رسپانس پہلا ری ایکشن جارحانہ ہوتا ہے لیکن بغیر سوچ کے دلیری بے وقوفی ہوتی ہے جرأت اور حکمت میں کوئی تصادم نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتے ہیں جس کو حکمت ملی ان کو اللہ کی بہت بڑی نعمت ملی۔ حکمت سے کام لینا ہے ابھی اپنے آپ کو نقصان سے بچانا ہے۔ ملک کے وقار کو بلند کرنا ہے۔ پاکستان کمز فرسٹ ایوری تھنگ آفٹر۔ کچھ علماء اور مذہبی رہنما جذباتی فیصلے کی طرف مائل ہیں۔ میں ان کو اسلام کی پہلی چھ سال کی تاریخ یاد دلانا چاہتا ہوں۔

اسلام کا کیلنڈر ہجرت سے شروع ہوا۔ یہ اہمیت ہے ہجرت کی جب حضور ﷺ مکہ سے مدینہ گئے۔ اسلام کو بچانے کے لئے ہجرت کی۔ دانشمندی سے اسلام کو بچانے کے لئے ہجرت کی۔ انہوں نے (نعوذ باللہ) کیا یہ بزدلی تھی۔ ہجرت کر کے جب حضور ﷺ مدینہ پہنچے تو انہوں نے میثاق مدینہ یعنی ایک فرینڈ شپ ٹریٹی کی تھی اپنے دشمنوں کے ساتھ یہودیوں کے ساتھ سائن کئے یہ دانشمندی تھی۔ یہ ٹریٹی چھ سال چلی اور ان چھ سالوں میں تین غزوات ہوئے۔ غزوہ بدر، غزوۂ احد، غزوہ خندق اس میں اہل مکہ جو کافر تھے ان سے یہ غزوات ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے کیونکہ یہودیوں کے ساتھ پیس ٹریٹی کی مسلمانوں کو فتح ملی اور کافروں کو شکست ہوئی۔ صدر مملکت نے کہا کہ چھ سال بعد یہودیوں نے دیکھا کہ اسلام طاقتور ہو رہا ہے وہ پریشان ہوئے۔ اس پریشانی کے حال میں ان کا اہل مکہ کے ساتھ رابطہ شروع ہو گیا۔ جب حضور ﷺ نے ان دو دشمنوں کو اکٹھے ہوتے ہوئے دیکھا تو سن 6 ہجری میں انہوں نے انہی اہل مکہ کے کافروں کے ساتھ جن سے وہ غزوات ہوتے رہے ان سے صلح حدیبیہ سائن کی۔ یہ صلح حدیبیہ ایک پیکٹ تھا۔ انہوں نے کہا کہ میں آپ سب کی اس پیکٹ کے خاص نکتہ کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ اس پیکٹ کے آخر میں دستخط کرنے تھے ادھر محمد رسول ﷺ لکھا تھا۔ کافروں نے ڈیمانڈ کیا کہ ہم آپ کو رسول اللہ نہیں مانتے تو اس کو کاٹیں۔ حضور ﷺ نے یہ مانا اور اس کے کاٹنے پر آمادہ ہو گئے لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ جو وہاں موجود تھے وہ بہت جذباتی ہوئے اس جذبات کے عالم میں انہوں نے حضور ﷺ سے پوچھا کہ کیا آپ ﷺ اللہ کے رسول نہیں ہیں (نعوذ باللہ)۔ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں میں ہوں۔ انہوں نے پوچھا کیا ہم حق پر نہیں ہیں آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہم حق پر ہیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تو پھر ہم کیوں اس پر دستخط کر رہے

Marfat.com

ہیں۔ حضورﷺ نے فرمایا کہ آپ جذبات سے بول رہے ہیں دانشمندی اور حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ اس وقت ہم اس پر دستخط کر دیں اسی میں اسلام کا فائدہ ہے اور جیسے جیسے سال آگے آئیں گے آپ کو اس کا فائدہ کا پتہ چلے گا اور ایسے ہی ہوا۔ چھ مہینے میں مسلمانوں کی یہودیوں کے ساتھ جنگ ہوئی اور اس غزوہ خیبر میں اللہ کے فضل و کرم سے مسلمانوں کو فتح ملی۔ یہ ممکن اس لئے ہوا کہ کافر اہل مکہ کے ساتھ نو وارد پیکٹ ہوا تھا انہوں نے حملہ نہیں کیا اور سن 8 ہجری میں اللہ کے فضل و کرم سے فتح مکہ ہوئی۔

اس واقعہ سے ہم کیا سبق نکالتے ہیں۔ سبق یہ کہ جب بحران کی صورتحال ہو تو جذباتیات کی بجائے حکمت کا راستہ بہتر ہوتا ہے۔ لہٰذا اس وقت ہم سب نے ایک سٹرٹیجک فیصلہ لینا ہے۔ ایمان کی کمزوری یا بزدلی کا سوال نہیں ہے۔ پاکستان کے لئے تو جان حاضر ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ ہر پاکستانی فرد کی جان حاضر ہے۔ دو جنگیں میں نے لڑی ہوئی ہیں خطرات دیکھے ہوئے ہیں بہت خطروں کا سامنا کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے کبھی بزدلی نہیں دکھائی لیکن اس موقع پر خواہ مخواہ اپنے آپ کو نقصان پہنچانا ہے۔ 14 کروڑ عوام کا مستقبل تاریک نہیں کیا جا سکتا۔ ویسے بھی شریعت کی رو سے کہا جاتا ہے کہ اگر دو مصیبتوں کا ایک وقت سامنا ہو اور ان میں سے ایک کو چننا ہو تو چھوٹی مصیبت کا راستہ لینا بہتر ہوتا ہے۔ ہمارے کچھ ساتھیوں کو افغانستان کی بڑی فکر لگی ہوئی ہے۔ میں ان کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مجھے اور میری حکومت کو ان سے کہیں زیادہ فکر ہے۔ طالبان کی اور افغانستان کی۔ میں نے افغانستان کے لئے اور طالبان کے لئے کیا کچھ نہیں کیا جبکہ پوری دنیا ان کے خلاف ہے۔ میں نے ہر ملک کے لیڈر سے تقریباً 20 سے 25 لیڈروں سے میں نے طالبان کے حق میں باتیں کیں۔ میں نے کہا کہ ان پر پابندیاں نہیں لگانی چاہئیں ان سے ہمیں انگیج کرنا چاہئے۔ میں تمام ملک کے لیڈروں کے سامنے ان کا موقف دوہراتا رہا ہوں لیکن افسوس سے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے کسی دوست نے ہماری بات نہیں مانی یہاں تک کہ اب بھی اس صورتحال میں ہم ان کے ساتھ تعاون کرنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں میں نے ڈی جی آئی ایس آئی کو اپنے پرسنل لیٹر کے ساتھ ملا عمر کے پاس بھیجا۔ پچھلے دو دن وہ ادھر رہ کر آئے ہیں اور میں نے ملا عمر کو صورتحال کی سنگینی کے بارے میں بتایا۔ کوشش ہماری پوری ہے کہ اس سنگین صورتحال سے کسی طریقہ سے نکلا جائے جس میں افغانستان کا اور طالبان کا نقصان نہ ہو میری پوری کوشش یہ ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ یہی رہے گی۔ یہاں تک کہ ہم امریکہ کو بھی کہہ رہے ہیں کہ وہ تحمل سے جو کچھ بھی ان کے ارادے ہیں اس میں تحمل اور بیلنس دکھائیں اور اسامہ بن لادن کے سلسلہ میں جو بھی ثبوت ہیں وہ ہم ان سے مانگ رہے ہیں لیکن میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ ہم افغانستان اور طالبان کو کیسے بچا سکتے ہیں۔ نقصان سے کیسے بچا سکتے ہیں یا ان کا نقصان کیسے ہم کم کر سکتے ہیں۔ اقوام عالم سے الگ ہو کر کم کر سکتے ہیں یا ان کے ساتھ چل کر کم کر سکتے ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ آپ کا فیصلہ یہی ہوگا کہ اقوام عالم کے ساتھ چل کر ہی ہم کچھ بہتری لا سکیں گے۔

مجھے اس وقت صرف پاکستان کی فکر ہے میں پاکستان کا سپہ سالار ہوں اور میں پاکستان کے دفاع کو سب سے زیادہ ترجیح دیتا ہوں۔ کسی اور ملک کا دفاع اس کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ ہم پاکستان کے مفاد میں فیصلہ کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ عوام کی بھاری اکثریت ہمارے فیصلوں کے حق میں ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ کچھ عناصر ایسے بھی ہیں جو

Marfat.com

اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے پرنسل ایجنڈے اپنے پارٹی ایجنڈے کو آگے بڑھانا چاہ رہے ہیں۔ وہ ایک فساد پھیلانا چاہ رہے ہیں اور ملک کو نقصان پہنچانا چاہ رہے ہیں۔ اس کی کوئی وجہ نہیں کہ یہ مینارٹی ایک میجورٹی کو یرغمال رکھے۔ میں تمام پاکستانی عوام سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ یونٹی اور یکجہتی دکھاتے ہوئے ایسے عناصر کو جو خواہ مخواہ میں ملک کو نقصان پہنچانا چاہیں ان کو دبائیں اور کامیاب نہ ہونے دیں۔ اس موقع پر ہم نے دشمن کے عزائم کو ناکام بنانا ہے اور ہم نے ملک کے مفاد کو بچانا ہے۔ پاکستان اسلام کا قلعہ سمجھا جاتا ہے اور اگر خدانخواستہ اس قلعہ کو نقصان پہنچا تو اسلام کو نقصان پہنچے گا۔

میرے ہم وطنو! آپ سب مجھ پر بھروسہ کریں۔ جس طریقہ سے آپ نے میرے آگرہ جاتے ہوئے بھروسہ کیا تھا میں نے ادھر قوم کو مایوس نہیں کیا ہے۔ پاکستان کے وقار کا سودا نہیں کیا۔ انشاء اللہ اب بھی اس موقع پر بھی میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔ یہی کچھ اہم باتیں میں نے آپ سے کرنی تھیں۔ آخر میں، میں سورۃ طٰہٰ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دعا کے ساتھ میں آپ سے اجازت لوں گا۔ "اے میرے رب میرے سینے کو کشادہ کر دے۔ میرے کام کو آسان کر دے اور میری زبان کی گرہ کھول دے، لوگ میری بات سمجھ سکیں۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔' پاکستان پائندہ باد۔ (صدر جنرل پرویز مشرف کی تقریر۔ ذریعہ پی ٹی وی۔ 16 ستمبر 2001)

یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ نائن الیون نے ساری دنیا کا سیاسی منظر نامہ تبدیل کر دیا تھا ترجیحات بدل رہی تھیں اور خصوصا پاکستان کے لئے اپنی افغان پالیسی پر یوٹرن کے علاوہ کوئی راستہ بظاہر باقی نہیں رہا تھا جنرل پرویز مشرف نے یہی کیا۔ امریکی طیاروں کو پاکستانی ہوائی اڈے مل گئے اور افغانستان پر انسانی تاریخ کی تباہ کن بمباری کا آغاز ہو گیا۔

ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹاگون پر حملے کے پس منظر میں امریکی انتظامیہ کے بدلتے ہوئے رویے اور صدر جنرل پرویز مشرف کی سخت وارننگ نے بھارتی قیادت کو بدحواس کر دیا۔ دہشت گردی کی وارداتوں کے فوراً بعد اٹل بہاری واجپائی اور ان کے ہمنوا بغلیں بجا رہے تھے کہ اب تو امریکہ، پاکستان کو دہشت گرد ملک قرار دیدے گا۔ جارج بش انتظامیہ کے ابتدائی ردعمل سے بھارتی حکومت کو قوی امید ہو چلی تھی کہ وہ مقبوضہ کشمیر میں جدوجہد آزادی کو پاکستان کی حمایت یافتہ دہشت گردی ثابت کر کے پاکستان کے خلاف ایکشن میں امریکہ کے حلیف بن جائیں گے۔ وزیر خارجہ جسونت سنگھ نے آنے والے مفروضہ سنہرے دنوں کا خواب دیکھتے ہوئے عقل وخرد کو بالائے طاق رکھتے ہوئے آگے بڑھ کر امریکہ کو بھارتی فوجی اڈے اور فضائی اسپیس استعمال کرنے کی پیشکش کر دی۔ منصوبہ یہ تھا کہ دہشت گردی کے خلاف مہم کی آڑ میں امریکہ اور اسرائیل کی مدد سے کہوٹہ ایٹمی ریسرچ لیبارٹری کو تہس نہس کیا جائے اور مقبوضہ کشمیر میں مجاہدین پر کاری ضرب لگائی جائے لیکن الٹی ہو گئیں سب تدبیریں۔ اب صورت حال یہ تھی کہ صدر جارج بش اور وزیر خارجہ کولن پاؤل، صدر پرویز مشرف کی پیٹھ ٹھونک رہے تھے اور پاکستان کو اپنا دوست کہہ رہے تھے۔ اٹل بہاری واجپائی صدر جارج بش کے کشمیر پر تازہ ترین ریمارکس سے شدید مضطرب تھے۔ انہیں خدشہ تھا کہ بدلے ہوئے تناظر میں امریکہ مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے بھارت پر بھرپور دباؤ ڈالے گا۔ پاکستان کو دہشت گرد ملک قرار دلوانے کے سنہری موقع کے ضائع ہو جانے کا انہیں صدمہ تھا۔

Marfat.com

وزیر دفاع وخارجہ جسونت سنگھ جو چند روز پیشتر بغلیں بجا رہے تھے۔اب بغلیں جھانک رہے تھے کیونکہ ان کی اپنی پارٹی بی جے پی اور اپوزیشن نے بیک وقت انہیں آڑے ہاتھوں لیا کہ بھارتی فوجی اڈوں اور فضائی حدود کے استعمال کی بغیر طلب امریکہ کو پیشکش کر کے انہوں نے اقوام عالم میں بھارت کے وقار کو مجروح کیا ہے۔صدر پرویز مشرف کے ٹی وی پر حالیہ خطاب کے دوران بھارت کو Lay Off کی سخت وارننگ نے برسراقتدار رہنماؤں کے ہوش وحواس گم کر دیئے۔ وزیراعظم واجپائی نے اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے صدر پاکستان پر الزام عائد کیا کہ دہشت گردی کے خلاف مہم کے موضوع سے ہٹ کر انہوں نے بھارت کے خلاف جو بات کی ہے۔اس سے پاک بھارت تعلقات کی بحالی کی کوششوں کو سخت دھچکا پہنچا ہے۔واجپائی نے اعلان کیا کہ وہ اور ان کے وزیر خارجہ اب پاکستان کا دورہ نہیں کریں گے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ امریکہ کی خوشامد کر کے پاکستان کی پشت میں خنجر گھونپنے کی واردات میں مصروف تھے۔اس سے کیا پاک بھارت تعلقات بہتر ہو رہے تھے۔ وہ تو جنرل پرویز مشرف نے بروقت اک دانشمندانہ فیصلہ کر کے بھارت۔ اسرائیل گٹھ جوڑ کو ناکام بنا دیا ورنہ واجپائی جی تو اس خوشی میں خم پہ خم لنڈھا رہے تھے کہ کشمیر کا قضیہ تمام ہوا۔اب امریکہ پٹی پڑھا کر پاکستان کو لنگڑا لولا اور مفلوج کر دیا جائے گا جس طرح اندرا گاندھی نے مشرقی پاکستان پر لشکر کشی کی مدد سے اپنے ڈوبتے ہوئے سیاسی مستقبل کو سہارا دیا تھا۔واجپائی کو امید تھی کہ پاکستان کو دہشت گرد قرار دلوا کر وہ آئندہ مارچ میں اتر پردیش میں ہونے والے اسمبلی الیکشن جیت لیں گے۔واجپائی نے انتہائی مایوسی کے عالم میں صدر جارج بش پر تنقید کی کہ وہ واقعات کو اس کے درست تناظر میں دیکھنے میں ناکام رہے ہیں۔انہوں نے صدر بش کو مشورہ دیا کہ وہ جنرل پرویز مشرف سے زیادہ پینگیں نہ بڑھائیں۔ بقول واجپائی کہ جو شخص براہ راست دہشت گردی میں ملوث ہو۔آپ اسی سے دہشت گردی کے خلاف مداوا چاہتے ہیں۔

وزیر خارجہ جسونت سنگھ نے اخباری نمائندوں کو بتایا کہ صدر پرویز مشرف کی بھارت کو Lay off کی تنبیہ ان کی سمجھ میں نہیں آئی۔غالباً یہ پاکستانی عوام کے Consumption کے لئے تھی۔جنرل پرویز مشرف کے لئے مناسب نہ تھا کہ دہشت گردی کے موضوع پر بولتے ہوئے اس میں بھارت کے خلاف اپنے دل کی بھڑاس نکالتے۔واجپائی اور جسونت سنگھ امریکہ کو پاکستان کے خلاف بھڑکانے میں ناکامی اور صدر جنرل پرویز مشرف کی وارننگ کی جو بھی توجیہ پیش کریں۔ایک بات طے ہے کہ بھارت کو اپنے پڑوسی کے خلاف سازشوں میں منہ کی کھانی پڑی۔

صدر جارج بش کی اخباری نمائندوں سے پاک بھارت تعلقات اور کشمیر کے مسئلے پر تازہ ترین گفتگو بھارتی وزیراعظم کے لئے سوہان روح بنی ہوئی تھی۔سابق صدر کلنٹن کے دورہ بھارت سے دونوں ممالک جتنے قریب آ گئے تھے۔ موجودہ صدر جارج بش کے بیانات اور ان پر بھارتی رہنماؤں کی کڑی تنقید سے دونوں ممالک ایک دوسرے سے اتنے ہی دور چلے گئے۔ فلسطینی رہنما یاسر عرفات اور اسرائیلی وزیراعظم ایریل شیرون کی حالیہ مفاہمت نے جارج بش کے تنے ہوئے اعصاب کو بے حد پرسکون کیا۔اب ان کی توجہ افغانستان کے ساتھ ساتھ کشمیر پر تھی۔ بھارت کو خدشہ تھا کہ مسئلہ کشمیر پر امریکہ اب لامحالہ ثالثی کا کردار اپنائے گا اور بھارت کو مجبور کریگا کہ وہ جنوبی ایشیاء میں قیام امن کے لئے اپنے پڑوسی سے اس مسئلہ پر بامعنی اور نتیجہ خیز مذاکرات کرے۔ بھارت کو خوش فہمی تھی کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹاگون پر حملوں کے نتیجے

Marfat.com

میں امریکی ردعمل سرد خانے میں چلا جائے گا مزید حوصلہ افزائی طالبان کے سربراہ ملا عمر اور حریت کانفرنس کے چیئرمین عبدالغنی بھٹ کے بیانات سے ہوئی ملا عمر نے طالبان کو ہدایت کی کہ وہ فی الحال امریکی جارحیت کے مقابلے کے لئے مقبوضہ کشمیر میں جدوجہد آزادی کو موخر کر کے افغانستان واپس آجائیں۔ ملا عمر کے اس اعلان کو سن کر مقبوضہ کشمیر میں تعینات غاصب بھارتی افواج نے سکھ کا سانس لیا۔ حریت کانفرنس کے سری نگر میں منعقدہ اجلاس نے دہشت گردی کے خلاف صدر پرویز مشرف کے ٹی وی پر خطاب کو بے حد سراہا۔ بھارت سرکار نے یہ فرض کر لیا کہ حریت کانفرنس کے صدر پرویز مشرف کے اعلان کے خیر مقدم سے مقبوضہ کشمیر میں مجاہدین اور حریت کانفرنس کے درمیان ٹھن جائے گی۔ بھارت توقعات کے برخلاف ایسی کوئی صورتحال اب تک رونما نہیں ہوئی تھی۔

صدر پرویز مشرف کی تقریر کے فوراً بعد بھارتی ذرائع ابلاغ اور حکومت دونوں نے بیک وقت قلابازی کھائی اور جن طالبان کو وہ کل تک دہشت گرد قرار دے رہے تھے آج ان کی تعریف میں رطب اللسان ہو گئے۔ بھارتی میڈیا پر اب طالبان اور افغان عوام کو دنیا کی مظلوم ترین قوم قرار دیا جا رہا تھا۔ بھارت دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہا تھا کہ جنرل پرویز مشرف کے Assertions کے برعکس بھارت افغانستان کے حالات سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ وزیر خارجہ جسونت سنگھ نے کہا کہ ایک ''سیکولر'' جمہوری اور پر امن افغانستان بھارت کے مفاد میں ہے۔ افغانستان میں رونما ہونے والے حالات سے بھارت متاثر ہوتا ہے۔

کچھ عرصہ پیشتر بھارت نے ایران، تاجکستان اور بعض یورپی ممالک کے نمائندوں سے دوشنبے میں ایک کانفرنس کے دوران طالبان کے خلاف فوج کشی کے امکانات کا بھی جائزہ لیا تھا۔ مذکورہ کانفرنس کے اختتام پر امریکہ کو مشورہ دیا گیا کہ وہ ایران سے مفاہمت کر کے طالبان کے خلاف کمانڈر احمد شاہ مسعود کے شمالی اتحاد کے ہاتھ مضبوط کرے، فوجی کارروائی میں مدد دے تاکہ طالبان کو نکال کر سابق حکمران ظاہر شاہ کو جو ان دنوں روم میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، واپس لا کر افغانستان کے تخت پر بٹھا دیا جائے۔

نومبر 2001ء کے آغاز میں بھارت کے تیور بدلے ہوئے دکھائی دے رہے تھے اور پاکستان کے لئے دھمکیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اس صورتحال پر میں نے جنگ سنڈے ایڈیشن میں مضمون ''بھارتی عیتا دانت تیز کر رہے ہیں'' لکھا ملاحظہ فرمائیں:

''مقبوضہ کشمیر میں بھارتی تاروں کمانڈ کے لیفٹیننٹ جنرل آر کے ناناتی نے ایک بیان میں کہا ہے کہ پاکستان نے بھارت کے لئے 1965ء جیسے حالات پیدا ہو چکے ہیں جس میں بھارت کے لیے اس محاذ پر محدود روایتی جنگ کی گنجائش موجود ہے پھر مشہور مندر سومنات میں خطاب کرتے ہوئے بھارتی وزیر اعظم مسٹر واجپائی نے صدر مشرف کے بیان کے جواب میں کہا ہے کہ ہم نے چوڑیاں نہیں پہن رکھیں ہم لوہے کے کڑے پہننے والے ہیں اور کشمیر ہمارا اٹوٹ انگ ہے۔ چند روز پہلے بھارتی وزیر داخلہ مسٹر ایل کے ایڈوانی آزاد کشمیر پر قبضے کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ گیارہ ستمبر کو مقبوضہ کشمیر اسمبلی پر ہونے والے حملے کے بعد انہوں نے امریکی صدر کو ایک خط لکھ کر ''چیتاونی'' دی تھی کہ ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے اور وہ مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کے لئے پاکستان پر ''ہاٹ پرسوٹ'' کریں گے۔ مجاہدین کا گرم تعاقب پاکستان میں

Marfat.com

موجود ان کے کیمپوں تک کر کے انہیں تباہ کریں گے اور آزاد کشمیر پر قبضہ کر لیں گے۔ اس خط میں مسٹر واجپائی نے ایسی زبان استعمال کی تھی جس نے ایک مرتبہ تو امریکی صدر بش کو بھی پریشان کر دیا جو افغانستان میں پھنسے ہوئے ہیں اور پاکستان ان کے ایک ''مضبوط حمایت'' کے طور پر ان کے شانہ بہ شانہ کھڑا ہے۔ مصدقہ اطلاعات کے مطابق صدر بش نے ولادی میر پیوٹن، صدر روس کو فون کر کے درخواست کی کہ وہ اپنے دیرینہ دوست بھارت کا غصہ ٹھنڈا کریں اور اسے سمجھائیں کہ فی الوقت حالات ایسے نہیں کہ وہ ''دہشت گردوں'' سے آہنی ہاتھ سے نمٹیں کیونکہ پاکستان کے خلاف ہونے والا کوئی بھی اقدام دہشت گردی کے خلاف قائم عالمی محاذ میں دراڑ ڈال دے گا۔

صدر پیوٹن نے مسٹر واجپائی سے اس سلسلے میں بات کی اور صدر بش کو ان کے عزائم سے آگاہ کر دیا، جس پر امریکی وزیر دفاع جنرل کولن پاؤل کو برصغیر پاک و ہند کے ہنگامی دورے پر بھیجا گیا۔ جنرل کولن پاؤل کی اسلام آباد سے ایک روز پہلے یعنی 15 اکتوبر کی رات بھارت میں مسٹر جارج فرنینڈس نے دوبارہ وزارت دفاع سنبھالی اور بھارت نے آزاد کشمیر پر ایک محدود لیکن زوردار حملہ کیا اور دعویٰ کیا کہ اس نے پاکستان کی گیارہ پوسٹیں تباہ کر دی ہیں۔ اس طرح بھارت نے شاید کولن پاؤل کو اپنے ارادوں سے آگاہ کرتے ہوئے آئندہ عزائم سے بھی باخبر کر دیا تھا۔ اس وقت دنیا بھر کا میڈیا اس بات کا شدت سے پروپیگنڈا کر رہا تھا کہ بھارت آزاد کشمیر پر حملے کے لئے پر تول رہا ہے اور اس نے اپنے ان گھناؤنے مقاصد کی بجا آوری کے لئے فوجی تربیت بھی شروع کر دی تھی۔ تازہ دم حملہ آور افواج کا شمالی سرحدوں پر اجتماع بڑھ رہا تھا۔ بھارتی توپ خانے کی معمول کی کارروائیوں میں زیادہ شدت آگئی تھی اور پاکستان میں بھی اس خطرے کا احساس ہونے کے بعد تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ عین اس مرحلے پر جب بھارت نے پوری منصوبہ بندی کی ہوئی تھی، جنرل کولن پاؤل نے بھارتی حکمرانوں کو باور کروایا کہ ان کے ایسے کسی بھی جارحانہ اقدام کی امریکہ مکمل حوصلہ شکنی کرے گا اور موجودہ حالات میں تو وہ کسی بھی طرح پاکستان پر بھارتی حملے کا مکمل متحمل نہیں ہو سکتا جس پر بھارتی حملے کا خطرہ ٹل گیا۔

بھارت کی طرف سے آزاد کشمیر پر متوقع حملہ یا ''حملہ آوروں کا گرم تعاقب'' کوئی نئی بات نہیں۔ اس خواہش کا اظہار بھارتی حکومت کی طرف سے وقتاً فوقتاً کیا جاتا رہا ہے۔ اسے پاکستان کی خوش قسمتی یا پھر بھارت کی بدقسمتی ہی کہا جائے گا کہ بھارت کو اپنے عزائم کے لئے ''سازگار ماحول'' میسر نہیں آسکا جس کی ایک وجہ تو اس کا مقبوضہ کشمیر میں مجاہد تنظیموں کے ہاتھوں ناطقہ بند ہونا اور دوسری اہم وجہ پاکستانی افواج کی چوکسی تھا۔ بھارت نے جب بھی پاکستان کا زور بازو آزمانے کے لئے آزاد کشمیر پر محدود حملے کا پروگرام بنایا، اسے خلاف توقع ایسا ہی جواب ملا اور بھارتیوں کو اپنا ارادہ بدلنا پڑا۔

گیارہ ستمبر کو امریکہ میں ہونے والے دہشت گردی کے واقعات نے جہاں ساری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا اور عالمی سطح پر دہشت گردی کے خلاف کارروائی کا منصوبہ بن رہا تھا تو بھارتی حکمرانوں نے روایتی بغض کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا سارا زور اس دہشت گردی کے ڈانڈے پاکستان سے ملانے پر صرف کر دیا۔ بھارتی میڈیا چلا چلا کر دنیا کو بتانے لگا کہ القاعدہ اور اسامہ بن لادن امریکہ سے زیادہ بھارت میں دہشت گردی کے مرتکب ہوئے ہیں اور مقبوضہ کشمیر میں آزادی کی تحریک کو دہشت گردی کی تحریک بنانے پر تل گیا۔

Marfat.com

بھارتیوں کا خیال تھا کہ پاکستان میں موجود شدت پسند مذہبی عنصر چونکہ اس مرحلے پر امریکہ کے خلاف سرگرم عمل ہوگا، اس لیے بھارت امریکہ مخالف فضا کو اپنے حق میں استوار کر سکے گا۔ بھارتیوں نے ماضی قریب میں جیش محمد کے سربراہ کی رہائی کے لئے بھارتی جہاز کو اغوا کر کے قندھار ایئرپورٹ پر اتارنے اور اپنے مطالبات منوانے کی کارروائی کو ایک مرتبہ پھر پاکستان کے کھاتے میں ڈالتے ہوئے اچانک مولانا مسعود اظہر اور بمبئی کے دھماکوں میں ملوث داؤد ابراہیم کی واپسی کا مطالبہ شروع کر دیا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس مرحلے پر اچانک ہی داؤد ابراہیم کا نام سامنے آیا، اس سے پہلے بھارت کی طرف سے یہ بات تو سننے میں آ رہی تھی کہ داؤد ابراہیم نے پاکستان میں پناہ لے رکھی ہے لیکن اسے بھارتی میڈیا بھی صرف افواہ کی حد تک ایک خبر سمجھ رہا تھا، لیکن اچانک مسٹر ایڈوانی نے داؤد ابراہیم کی رٹ لگانی شروع کر دی۔ حرکتہ المجاہدین کو القاعدہ کی شاخ بتایا جانے لگا اور امریکہ سے درخواست کی جانے لگی کہ وہ کشمیر میں ہونے والی اس دہشت گردی سے بھارت کو نجات دلائے لیکن بھارت کی بدقسمتی کہ اس کی توقعات کے برعکس امریکہ اور مغربی دنیا نے شاید پہلی مرتبہ اس کی امیدوں پر پانی پھیر دیا اور بھارتی توقعات کے بالکل برعکس پاکستان نے عالمی سطح پر اچانک اہمیت اختیار کر لی۔

بھارتیوں نے اس مرحلے پر ایک آخری کوشش بھی کر ڈالی اور اچانک ساری دنیا میں ایک خبر پھیل گئی کہ کوئی بھارتی جہاز اغوا ہو گیا ہے جسے ہائی جیکر پاکستان کے لاہور ایئرپورٹ پر لے جانے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ پاکستان نے فوراً احتیاطی تدابیر اختیار کیں اور لاہور ایئرپورٹ کو بند کر دیا گیا۔ شاید اس "ڈرامے" کا پلاٹ کمزور تھا یا پھر اس کے پیش کاروں کی نالائقی تھی کہ بھارت کو خود ہی اس ڈرامے کو فلاپ کرنا پڑا اور اچانک بھارتی وزیر نے پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ جہاز اغوا نہیں ہوا تھا، پائلٹ کو اغوا ہونے کا شک گزرا تھا جس پر اس نے جہاز کے اغوا کا سگنل جاری کر دیا، جب کہ جہاز کے مسافروں نے بھارتی ٹی وی کیمروں کے سامنے باقاعدہ بیانات دیے کہ جہاز اغوا ہوا تھا پھر اچانک ہائی جیکر غائب ہو گئے۔

اس اوچھی حرکت پر مغربی خبر رساں ایجنسیوں اور الیکٹرانک میڈیا نے بھارت کی خاصی خبر لی اور ساری دنیا کو یہ معلوم ہو گیا کہ یہ سارا کھیل پاکستان کو بدنام کرنے اور دہشت گردی کے خلاف موجودہ فضا کا ناجائز فائدہ اٹھانے کے لئے رچایا گیا تھا، جس کا مقصد پاکستان کو بدنام کرنا تھا۔ شاید اس ڈرامے کی ناکامی کا نتیجہ تھا کہ بھارتی انٹیلی جنس نے سری نگر اسمبلی پر حملہ کروا دیا اور پھر جیش محمد کو اس کا ذمے دار بھی قرار دے دیا، لیکن جیش محمد نے اس کارروائی کی ذمے داری قبول کرنے سے انکار کر دیا ادھر جنرل پرویز مشرف نے شدت سے اس دہشت گردی کی مخالفت کی، نتیجتاً بھارت کو یہاں بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا جس پر اس نے اپنا غصہ 15 ستمبر کو پاکستان کے سرحدی دیہات پر گولا باری کر کے نکالا، ساری دنیا نے ٹی وی اسکرین پر دیکھا کہ بھارت نے یہ حملہ کسی پاکستانی پوسٹ پر نہیں بلکہ آزاد کشمیر کے دیہات پر کیا تھا جہاں کچھ شہری شہید اور زخمی ہو گئے اور حسب سابق ان کے مکانات اس گولا باری کی بھینٹ چڑھ گئے۔

جنرل کولن پاؤل کے دورے کے بعد بھارتی حکومت کی طرف سے پاکستان کو دی جانے والی دھمکیوں میں کچھ کمی آ گئی تھی لیکن اچانک جنرل ناناوتی اور بھارتی وزیراعظم کی طرف سے سومنات کے تاریخی مندر میں اس حوالے سے کی جانے والی تقریر نے پھر فضا کو گرما دیا ہے۔ مقبوضہ کشمیر کے کٹھ پتلی وزیراعظم فاروق عبداللہ کے بیٹے سینیر بھارتی نائب وزیر

Marfat.com

خارجہ عمر عبداللہ نے اس سے ایک روز پہلے ہی مجاہدین کے کیمپوں پر حملوں کی چیتاونی دی ہے جب کہ ان کے والد صاحب کافی عرصہ پہلے سے بھارتی حکومت کو پاکستان پر حملہ کر کے اسے سبق سکھانے کا درس دے رہے ہیں۔

اس مرحلے پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اچانک بھارت دھمکیوں کی زبان کیوں استعمال کر رہا ہے؟ کیا اسے اس مرحلے پر اپنے حق میں فضا سازگار دکھائی دینے لگی ہے یا پھر کیا بھارت اس پوزیشن میں آ گیا ہے کہ وہ امریکہ کو ناراض کرنے کا خطرہ مول لے؟ ان سوالات کے جوابات نفی میں ہیں۔ بھارتی حکومت کو اس بات کا شدت سے احساس ہونے لگا ہے کہ دہشت گردی کے خلاف جاری بین الاقوامی مہم میں جب صدر بش نے ساری دنیا میں دہشت گردوں کے اڈے ختم کرنے کا اعلان کیا تھا تو بھارت جس خوش فہمی کا شکار ہونے لگا تھا، وہ دراصل اس کی غلط فہمی تھی۔ امریکہ ہی نہیں بلکہ دنیا کے ہر باخبر شخص کو اس بات کا علم ہو چکا ہے کہ دہشت گردی اور حریت پسندی میں کیا فرق ہے؟ بھارتی ارمانوں پر زیادہ اوس مغربی ممالک کے رہنماؤں کی طرف سے کشمیر کے حوالے سے جاری بیانات اور شاید امریکہ، برطانیہ، ہالینڈ، جرمنی وغیرہ کی طرف سے یہ حقیقت تسلیم کرنے کی وجہ سے پڑی کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان بنیادی تنازع مسئلہ کشمیر ہے اور جب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا، اس خطے میں امن وامان کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔

عالمی رائے عامہ کی اس اچانک تبدیلی نے بھارتیوں کی بوکھلاہٹ میں اضافہ کر دیا ہے، کیونکہ کہ شاید 55 سال میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ پاکستان کے اس موقف کو عالمی سطح پر پذیرائی ملی ہے کہ بھارتی مقبوضہ کشمیر میں موجود تحریک، آزادی کی تحریک ہے دہشت گردی نہیں اور دونوں ممالک کے درمیان بنیادی تنازع بھی مسئلہ کشمیر ہی ہے۔ جب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا، دونوں ممالک کے درمیان مذاکرات اور کانفرنسوں کے فوائد حاصل نہیں کئے جا سکتے، نہ ہی دونوں کے تعلقات معمول پر آ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ کی طرف سے شاید تاریخ میں پہلی مرتبہ اس مسئلے کے مثبت حل کے لئے کردار ادا کرنے کی بات کی جا رہی ہے اور یہی بات ہمیشہ پاکستان کی طرف سے کہی جاتی تھی کہ یہ بین الاقوامی مسئلہ ہے جو اقوام متحدہ کی فائلوں میں دفن نہیں ہوا بلکہ کشمیروں نے قربانیوں کی لازوال تاریخ رقم کرتے ہوئے اسے ہمیشہ زندہ رکھا ہے۔

عالمی رائے عامہ میں آنے والی اس اچانک تبدیلی نے بھارتیوں کے لئے بڑی پریشانیاں پیدا کر دی ہیں۔ وہ تو یہ سمجھ رہے تھے کہ اسامہ بن لادن سے فارغ ہو کر امریکہ ''کشمیری حریت پسندوں'' پر بھی ہاتھ صاف کرے گا، لیکن یہاں ان کی توقعات کے برعکس گنگا ہی الٹی بہہ رہی ہے۔ ایسا شاید پہلی مرتبہ ہوا ہے جب عالمی سطح پر یہ سوال سر اٹھانے لگا ہے کہ دنیا کو دہشت گردی کی وضاحت کرنی چاہیے اور مغربی میڈیا بالخصوص یہ کہہ رہا ہے کہ اگر امریکہ نے دنیا بھر میں اپنے حقوق کے لیے سرگرم جہادی مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دینا شروع کر دیا تو پھر عالمی امن کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ 11 ستمبر کو ہونے والی دہشت گردی کے بعد سے دنیا کی سوچ خاصی حقیقت پسندانہ ہو گئی ہے اور ان حالات میں بھارت کی طرف سے کشمیر میں ہونے والی ''دہشت گردی'' کا پول بھی کھلتا نظر آ رہا ہے۔ اس بات کے قوی امکانات ہیں کہ جس طرح افغانستان پر بمباری کے بعد مسلم ممالک کی طرف سے امریکہ پر دباؤ بڑھ رہا ہے ان حالات میں امریکہ کو اپنے نزدیکی حلیف اور معاون جنرل پرویز مشرف کی یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ دہشت گردی مجاہدین نہیں کر رہے بلکہ کشمیر کے مظلوم عوام کے ساتھ بھارت دہشت گردی کر رہا ہے اور ان پر آمرانہ قوانین مسلط کر کے مختلف حیلوں بہانوں سے مسلمانوں کی

Marfat.com

نسل کشی کی جارہی ہے۔

یہ بات تو اب تقریباً طے ہے کہ موجودہ حالات میں بھارت کو امریکہ یا برطانیہ کی طرف سے اپنی دہشت گردی کے حق میں کوئی اخلاقی حمایت نہیں مل رہی، لیکن کیا اس صورت حال میں بھارت اپنی ہٹ دھرمی سے باز رہے گا؟ اور کیا وہ پاکستان کے ساتھ ''محدود جنگ'' کے ایڈونچر کا متحمل ہو سکے گا؟

جہاں تک بھارتی عزائم کا تعلق ہے تو یہ بات صاف ظاہر ہے کہ بھارت مقبوضہ کشمیر میں جاری تحریک آزادی کو بزور قوت ختم کرنے کے جنون میں مبتلا ہے، خصوصاً بھارتی حکومت میں موجود مہا سبھائی عنصر کی یہ شدید خواہش ہے کہ حکومت ہند پاکستان سے جنگ کرے اور اسے کچل کر رکھ دے۔ اپنی ان خواہشات کی بجا آوری کے لئے بھارت کو اسرائیل کا تعاون بھی ہر سطح پر حاصل ہے اور خصوصاً بھارتی حکومت مقبوضہ کشمیر کی تحریک کو کچلنے کے لئے اسرائیل کے تجربات سے استفادہ کرنا چاہتی ہے۔ اس ضمن میں بھارتی وزیر داخلہ ایل کے ایڈوانی اور وزیر خارجہ جسونت سنگھ خاصے سرگرم دکھائی دیتے ہیں۔

گزشتہ دنوں ان دونوں صاحبان نے اسرائیل کا دورہ کیا جہاں انہیں بہ طور خاص اسرائیلی ماہرین نے انسداد دہشت گردی اور انٹیلی جینس امور کے حوالے سے بریفنگ دی۔ بھارتی حکام نے اسرائیل کے فالکن ایر بورن وارننگ سسٹم، اے واکس ریڈار سسٹم، سرفیس ٹو سرفیس میزائل اور اپ گریڈیشن آف ایر کرافٹس میں خصوصی دلچسپی ظاہر کی اور شنید ہے کہ اسرائیل بھارت کو اپنا ریڈار سسٹم فروخت بھی کر رہا ہے۔ امریکہ نے اس سے پہلے اسرائیل کو سختی سے ہدایت کی تھی کہ وہ ریڈار سسٹم چین کو فروخت نہ کرے، لیکن بھارت کے معاملے میں اس نے خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔ اسرائیل کے ساتھ بھارتی عاتون سے امریکہ بہ خوبی باخبر ہے لیکن اپنی بعض مصلحتوں کے پیش نظر وہ اسرائیل یا بھارت پر شاید دباؤ بھی نہیں ڈال سکتا۔

حال ہی میں ایک امریکی جریدے میں پاکستان کے ایٹمی ذخیرے پر ہاتھ صاف کرنے کے لئے کی جانے والی اسرائیلی اور امریکی کمانڈوز کی مشقوں کی خبر سے کم از کم ایک بات تو اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ اسرائیل کو بھی بھارت کی طرح پاکستان کے ایٹمی ذخائر پر خاصی تشویش ہے۔ ماضی میں اس حوالے سے دونوں کی مشترکہ کاوشوں کی مثالیں بھی دی جاتی رہی ہیں۔ یہ الگ بات کہ ایسی کوئی کوشش پاکستان کے مضبوط دفاعی نظام کے سبب بارآور ثابت نہیں ہو سکی۔ لیکن یوں دکھائی دیتا ہے جیسے دونوں ممالک نے ابھی تک اپنا ارادہ تبدیل نہیں کیا، خصوصاً بھارت کی طرف سے پاکستان کے لیے خیر سگالی کی توقع عبث دکھائی دیتی ہے۔

جہاں تک پاکستانی حکومت کا تعلق ہے تو ہمیں اس حقیقت سے ہمیشہ باخبر رہنا چاہیے کہ موجودہ جغرافیائی صورت حال ہمیشہ برقرار نہیں رہے گی اور امریکی سفیر وینڈی چیمبرلین کی ان یقین دہانیوں کے باوجود کہ امریکہ ماضی کی طرح اپنا کام نکل جانے پر پاکستان کی طرف سے آنکھیں نہیں پھیرے گا، پاکستان کو کسی خوش فہمی کا شکار نہیں رہنا چاہیے۔ مفادات کی اس دنیا میں خصوصاً طاقت ور ممالک کی ترجیحات بدلتی رہتی ہیں۔ عین ممکن ہے کہ امریکہ نے بھارت کو بھی افغانستان سے نمٹنے کے بعد کشمیر کے حوالے سے کچھ یقین دہانیاں کروائی ہوں کیونکہ بھارتی حکمرانوں نے ابھی تک ہمارے خیر سگالی جذبات کی کوئی قدر نہیں کی۔ صدر جنرل پرویز مشرف کی طرف سے مسلسل گفت وشنید کی دعوت کو بھی

Marfat.com

بھارت مسلسل ٹھکرا رہا ہے اور بھارتی وزیراعظم نے نہ صرف بھارت یا پاکستان بلکہ امریکہ میں بھی جنرل پرویز مشرف سے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا ہے، جو سفارتی آداب کے خلاف ہے۔

اس صورتحال میں دو اہم نکات توجہ طلب ہیں۔ پہلی بات تو طے شدہ ہے کہ بھارت نے اس کشمیر پر اپنی پالیسی بہت سخت کر دی ہے اور وہ ہر قیمت پر اس مسئلے کا ''فوجی حل'' نکالنے پر تلا ہوا ہے۔ دوسری اہم بات ہے یہ کہ فی الوقت بھارت کو موجودہ عالمی صورتحال نے اپنے عزائم سے باز رکھا ہے۔ لیکن کیا یہ صورتحال ہمیشہ ایسی ہی رہے گی؟

تیزی سے رنگ بدلتی اس دنیا میں کسی شے کو ثبات یا دوام حاصل نہیں۔ جس طرح 11 ستمبر کے واقعے نے اچانک عالمی صورتحال کو تبدیل کر کے رکھ دیا ہے، عین ممکن ہے کوئی اور ایسا واقعہ ظہور پذیر ہو اور ہمارے امکانات اور اندازے دھرے کے دھرے رہ جائیں۔ اس لئے محض امریکہ کی یقین دہانیوں پر اعتماد کافی نہیں، بھارتی عزائم سے باخبر رہتے ہوئے بھارت کے متوقع حملے کی پیش بندی ہمارے لئے بے حد ضروری ہے۔ اگر اس مرحلے پر ہم نے کسی کمزوری کا مظاہرہ کیا یا کسی غفلت کے مرتکب ہوئے تو عین ممکن ہے کہ بھارتی دھمکیاں حقیقت کا روپ دھار لیں؟

(روزنامہ جنگ سنڈے ایڈیشن۔ 11 نومبر 2001ء مصنف طارق اسماعیل ساگر)

یورپی یونین کے صدر اور بیلجیم کے وزیراعظم گی ونچا اوسٹڈ نے جو پاکستان کے دورے پر آئے ہوئے تھے 24 نومبر 2001ء کو اسلام آباد میں ایک بیان میں امید ظاہر کی کہ 2002ء مسئلہ کشمیر کے حل کا سال ہے۔

(روزنامہ جنگ لاہور 25 نومبر 2001ء)

اس بیان سے ایسا تاثر ملا کہ پاکستان جو دہشت گردی کے خلاف جنگ میں امریکہ کا فرنٹ لائن اتحادی بن چکا ہے شاید اس کے بھارت سے تعلقات نارمل کرنے کے لئے یورپی ممالک اور امریکہ پاکستان اور بھارت کے درمیان بنیادی وجہ عناد مسئلہ کشمیر حل کروانا چاہتے ہیں لیکن وقت نے ثابت کیا کہ بھارت آج تک اپنی اسی پالیسی پر کاربند ہے کہ وہ کشمیر کے مسئلہ پر کوئی ''ثالثی'' قبول نہیں کرے گا اور اصل میں شملہ معاہدے میں ہم نے بھارت کی یہی شرط قبول بھی کر لی تھی البتہ پاکستان نے اب اپنا دیرینہ موقف بدل دیا اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کے علاوہ بھی ہماری طرف سے وقتاً فوقتاً مسئلہ کشمیر کے مختلف حل پیش کئے جانے لگے ہیں۔ نائن الیون کے بعد حالات تیزی سے پلٹا کھا رہے تھے۔ بھارت، پاکستان کو دہشت گرد ملک قرار دلوانے کی مہم میں بری طرح ناکام ہو کر اقوام عالم میں تنہا رہ گیا تھا ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹاگون پر حملوں کو جواز بنا کر بھارت نے امریکہ اور دیگر مغربی طاقتوں کو قائل کرنے کی سرتوڑ کوشش کی کہ پاکستان کو عالمی دہشت گردی میں کلیدی کردار کا حامل دکھایا جائے۔ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی جانب سے اس موقف کی پذیرائی نہ ہونے کے بعد بھارتی حکومت نے کوشش کی کہ امریکہ طالبان کے خلاف کارروائی کے دائرے کو مقبوضہ کشمیر تک بڑھا دے۔ بھارتی حکومت کے سازشی اور بیمار ذہنوں نے فرسٹریشن میں مقبوضہ کشمیر کی ریاستی اسمبلی پر حملہ کروا کر اس کو پاکستان کی جانب سے دہشت گردی کا رنگ دینے کی کوشش کی۔

ایسی ہی ایک کوشش بھارت نے 21 مارچ 2000ء کو بھی اس روز کی تھی جس دن سابق صدر کلنٹن نے بھارت کا پانچ روزہ دورہ شروع کیا تھا۔ بل کلنٹن اس وقت نئی دہلی میں تھے جب خفیہ ایجنسی ''را'' اور بارڈر سکیورٹی فورس کے

Marfat.com

جوانوں نے مقبوضہ کشمیر میں 36 سکھوں کو مار ڈالا اور اس کا الزام پاکستان پر عائد الزام پاکستان پر عائد کیا۔ صدر کلنٹن اور بھارتی وزیراعظم نے اپنی ابتدائی بات چیت کے بعد خطاب کیا تھا۔ پریس کانفرنس میں صرف چار سوالات کی اجازت دی گئی۔ چاروں سوالات بھارت کے منتخب کردہ اخباری نمائندوں نے پاکستان کی مبینہ دہشت گردی کے بارے میں کئے۔ صدر کلنٹن کو اس حد تک دباؤ میں لایا گیا کہ انہوں نے یقین دلایا کہ وہ اپنے مختصر دورہ پاکستان میں اس بارے میں پاکستانی حکومت سے ''بازپرس'' کریں گے۔

طیاروں کی ہائی جیکنگ کا ڈرامہ بھی نئی بات نہیں۔ 1999ء میں اسی قسم کا ڈرامہ ممبئی تا احمد آباد فلائٹ کے بارے میں بھی رچایا گیا تھا۔ اس مرتبہ ممبئی تا دہلی فلائٹ کو ہائی جیکنگ کا شکار دکھا کر امریکہ کو رجھانے کی ایک اور بھونڈی کوشش کی گئی۔ عالمی ایجنسیوں اور ایئرپورٹ سیکیورٹی کے ماہرین نے جب اس واقعہ کی صحت پر شکوک وشبہات کا اظہار کیا تو بھارت کو تسلیم کرنا پڑا کہ یہ محض ایک ریہرسل تھی۔ صدر کلنٹن کی موجودگی میں بھارتی حکومت کی اسپانسرڈ دہشت گردی کے نتیجے میں ہلاک ہونے والے سکھوں کے لواحقین اور کشمیری مسلمانوں کے ردعمل پر اسٹار ٹی وی نے ایک پاکستانی اور سابق سیکرٹری خارجہ جے این ڈکشٹ کو اظہار خیال کے لئے مدعو کیا۔ پاکستانی صحافی نے کہا عام تاثر یہ ہے کہ امریکی صدر کی رائے پر اثر انداز ہونے اور پاکستان کو دہشت گرد ملک قرار دلوانے کے لئے بھارت نے سکھوں کو ہلاک کروایا۔ مسٹر ڈکشٹ ان ریمارکس پر بے حد برافروختہ ہوئے۔ انہوں نے کہا آپ یہ کیا فضول بات کہہ رہے ہیں کہ ہم نے اپنے ہی آدمیوں کو ہلاک کروایا۔ پاکستانی صحافی نے کہا رموز سلطنت میں یہ کوئی نئی بات نہیں، جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے۔ بھارت اور دیگر ممالک کی تاریخ گواہ ہے کہ اہم مقاصد کے حصول کی خاطر معمولی مہرے پٹوا دیئے جاتے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ امریکہ نے صدر ضیاء الحق کو سین سے ہٹانے کا بندوبست کر لیا تھا۔ بہاولپور سے اسلام آباد واپسی پر اپنے طیارے کی جانب جاتے ہوئے صدر ضیاء الحق نے امریکی سفیر رونالڈ رافیل کو اپنے ہمراہ سفر کرنے کی دعوت دی۔ سفیر اس طیارے میں سوار ہو گئے تباہی جس کا مقدر تھی۔ تو پھر 36 سکھوں کی جان بھارت کے لئے کیا اہمیت رکھتی تھی۔ سکھوں کو تو ویسے ہی دیش دروہی (غدار وطن) سمجھا جاتا ہے۔

بھارتی وزیر خارجہ ودفاع جسونت سنگھ نے بی بی سی کے پروگرام ''ہارڈ ٹاک'' میں پاکستان پر الزامات کی بوچھاڑ کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ دوران پروگرام جذبات ان پر اس قدر غالب آ گئے کہ انہوں نے شکوہ کیا کہ امریکہ نے بھارت کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا ہے۔ میزبان نے دریافت کیا کہ مقبوضہ کشمیر اسمبلی پر مبینہ دہشت گرد تنظیم جیش محمد کے حملے کی بھی امریکہ سے مذمت کرانے میں آپ ناکام رہے۔ جسونت سنگھ نے کہا امریکہ نے ہمیں یقین دہانیاں کرائی ہیں۔ وہ اس وقت پاکستان کو بطور آلہ کار استعمال کر رہا ہے۔ پروگرام کے میزبان نے کہا آپ دوغلی باتیں کر رہے ہیں۔ ایک جانب تو آپ امریکہ کی بے اعتنائی کا شکوہ کر رہے ہیں اور دوسری جانب آپ کہہ رہے ہیں کہ امریکہ نے آپ کو یقین دہانیاں کرائی ہیں۔ جسونت سنگھ نے کہا کہ امریکہ سرکاری سطح پر کچھ کہتا ہے اور نجی سطح پر کچھ اور...... میزبان نے کہا آپ نے اور سیکورٹی کے مشیر برجیش مشرا نے گزشتہ دنوں امریکہ اور برطانیہ کا تفصیلی دورہ کیا۔ وزرائے خارجہ اور تقریباً تمام بااثر عہدیداروں سے ملاقات کی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ امریکہ اور برطانیہ، بھارت کے موقف کی حمایت نہیں کرتے۔ جسونت سنگھ

Marfat.com

نے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک اور سوال کے جواب میں جسونت سنگھ نے کہا کہ پاکستان کی جانب سے شدید ترین اشتعال کے باوجود بھارت نے صبر وتحمل کا مظاہرہ کیا ہے لیکن صبر کی ایک حد ہوتی ہے۔ میزبان نے پوچھا۔ اگر بھارت کا صبر ٹوٹ جائے تو پھر کیا ہوگا؟ کیا بھارت، پاکستان پر حملہ کرے گا۔ جسونت سنگھ نے کہا۔ یہ بات میں آپ کو ٹیلی ویژن پر نہیں بتاؤں گا۔ میزبان نے کہا۔ بھارت کے ایک سابق خارجہ سیکرٹری نے کہا ہے کہ جب امریکہ، افغانستان میں دہشت گردی کے اڈوں پر حملہ کرنے والا ہے تو بھارت کو چاہیے کہ وہ بھی پڑوسی ملک میں قائم دہشت گردی کے اڈوں پر حملہ کرے۔ جسونت سنگھ نے کہا۔ میں آپ کے اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔

جسونت سنگھ نے تو بی بی سی کے نمائندے کے سوال کا جواب نہیں دیا لیکن بھارت کے جنگی جنون میں مبتلا وزراء اور سنگھ پریوار میں شامل کٹر فرقہ پرست جماعتوں نے کھلے عام پاکستان پر حملے کی باتیں شروع کر دیں۔ وزارت داخلہ کے نائب وزیر اور ایل کے ایڈوانی کے دست راست آئی ڈی سوامی نے ٹیلی ویژن انٹرویو میں کہا کہ پاکستان میں قائم دہشت گردی کے کیمپوں پر حملہ بھارت کے آپشنز میں شامل ہے۔ قبل ازیں ریاستی اسمبلی کے اراکین سے خطاب کرتے ہوئے مقبوضہ کشمیر کے کٹھ پتلی وزیر اعلیٰ فاروق عبداللہ نے بھارتی حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ پاکستانی دہشت گردوں کے تعاقب میں جا کر ان کے کیمپوں پر حملہ کرے۔ فاروق عبداللہ کے بیٹے وفاقی وزیر صنعت عمر عبداللہ نے اپنے والد کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بھارت پر زور دیا کہ وہ اسلام آباد کو سبق سکھائے۔ حیرت اور افسوس کی بات یہ تھی کہ فاروق عبداللہ اور ان کے برخوردار عمر عبداللہ نے کشمیری اراکین اسمبلی کی ان تقاریر کو قطعی نظر انداز کر دیا جس میں انہوں نے بھارتیہ جنتا پارٹی پر دہشت گردی کا الزام عائد کرتے ہوئے ریاستی اسمبلی کے 38 ملازمین کی ہلاکت کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔ اسمبلی کے زندہ بچ جانے والے بعض ملازمین نے جو دہشت گردوں کے حملے کے عینی شاہد تھے، اخباری نمائندوں کو بتایا کہ بارڈر سیکورٹی فورس نے چن چن کر ملازمین پر فائرنگ کی۔ جیش محمد کی جانب سے مذکورہ دہشت گردی سے لاتعلقی کے اعلان کے باوجود وزیر داخلہ ایڈوانی بار بار امریکہ سے اپیل اور پاکستان کو دھمکی دے رہے تھے کہ وہ جیش محمد کو دہشت گرد تنظیموں کی فہرست میں شامل کرے اور اس کے سربراہ مولانا مسعود اظہر کو بھارت کے حوالے کرے۔

وزیر اعظم واجپائی، ایڈوانی اور جسونت سنگھ کو پاکستان کے خلاف مہم میں تنہا رہ جانے کے غم کے علاوہ امریکہ کی جانب سے بڑے خدشات لاحق تھے۔ انہیں یقین تھا کہ طالبان اور اسامہ بن لادن کے خلاف ایکشن میں تعاون پر امریکہ اور پاکستان میں کوئی خفیہ معاہدہ ہوا ہے۔ اس خفیہ معاہدے کا تعلق مسئلہ کشمیر کے حل سے متعلق ہے۔ بھارتی قیادت کو یہ فکر بھی کھائے جاتی تھی کہ پاکستان پر عائد اقتصادی اور فوجی پابندیوں کے خاتمے کے بعد پاکستان کی اقتصادی حالت روز افزوں بہتر ہوتی جائے گی۔ سول اور ملٹری ہائی کمانڈ کو اندیشہ تھا کہ موجودہ حالات میں دہشت گردی کا بہانہ بنا کر پاکستان پر حملہ خاصا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ برطانیہ اور امریکہ نے طیارے کی ہائی جیکنگ ڈرامے کی مذمت کرتے ہوئے بھارت کو متنبہ کیا تھا کہ وہ اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ حرکات سے اجتناب کرے کیونکہ اشتعال اور اس کے ردعمل سے جنگ چھڑ سکتی ہے۔ امریکہ خاص طور پر اس وقت پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ کا متحمل نہیں ہو سکتا لیکن پاکستان سے شدید نفرت میں مبتلا انتہا پسندوں کے جنون سے کچھ بعید نہیں تھا ان کی پشت پر ایک اور جنونی اسرائیل بھی تھا جس کی

Marfat.com

نظروں میں کہوٹہ کا ایٹمی پلانٹ کھٹک رہا تھا۔

ستمبر 2001ء کے بعد سے بھارتی نیتاؤں کا رویہ پاکستان کے تئیں بہت سخت ہونے لگا تھا یوں لگتا تھا کہ بھارتی حکومت امریکہ اور یورپی ممالک میں پاکستان کی موجودہ پوزیشن کو جو نائن الیون کے بعد جنرل پرویز مشرف کے یوٹرن کی وجہ سے ہضم نہیں کر پا رہا۔ اس سے پہلے بھارت کی طرف سے پاکستان کے خلاف مسلسل دہشت گردی کا پروپیگنڈہ بھی اب دم توڑ رہا تھا بھارتی راہنماؤں نے امریکہ اور یورپ کے دورے بھی انہیں یہ سمجھانے کے لئے کئے کہ پاکستان انہیں دھوکہ دے رہا ہے لیکن شنوائی نہ ہوئی۔ پاکستانی افواج اپنی شمالی سرحدوں پر مصروف تھیں اور بھارت پاکستان کی مغربی سرحدوں پر دباؤ بڑھا کر اسے پریشان کر رہا تھا۔ اس صورتحال پر روزنامہ جنگ نے اداریٰ نوٹ لکھا۔

کنٹرول لائن پر بھارتی فوج کی نقل وحرکت:

اخباری اطلاعات کے مطابق بھارت کی بارڈر سکیورٹی فورسز نے راولاکوٹ اور باغ کے مختلف محاذوں پر سے اسلحہ کے ذخائر میں زبردست اضافہ کر دیا ہے۔ بھارتی فوج کی نقل وحرکت میں بھی اضافہ ہوا اور اس کی طرف سے مختلف سیکٹروں میں آزاد کشمیر کی سرحدی آبادی پر بلا اشتعال فائرنگ کا سلسلہ جاری رہا۔ ادھر امریکہ نے بھارت کو مقبوضہ کشمیر میں سرحد پار سے چھاپہ ماروں کا داخلہ روکنے کے لئے نگرانی کے جدید آلات کی پیشکش کی ان میں بغیر پائلٹ کے طیارے بھی شامل تھے۔ بھارتی اخبار ''ہندو'' کے مطابق یہ پیشکش واجپائی کے حالیہ دورہ امریکہ کے دوران کی گئی۔

افغانستان پر امریکی حملوں کے بعد بھارت کی طرف سے نہ صرف مقبوضہ کشمیر میں بے گناہ مسلمانوں کے قتل عام میں اضافہ ہوا بلکہ کنٹرول لائن پر بھارتی فوجوں کی نقل وحرکت تعداد اور اسلحہ کے ذخائر میں اضافہ کی خبریں بھی تسلسل کے ساتھ آ رہی تھیں یہ سب کچھ بلاوجہ اور بلا جواز نہیں بھارتی حکمرانوں کی طرف سے پاکستان کو تنازع کشمیر کے حوالے سے سنگین نتائج کی دھمکیاں بھی دی جا رہی تھیں۔ بعض مغربی حلقوں کی طرف سے بیانات میں کشمیری حریت پسندوں کو بھی دہشت گردوں کی فہرست میں شامل کرنے کے موقف سے پاکستان کے عوام میں گہری تشویش پائی جاتی تھی اور حکومتی حلقے اس موقف کی تردید کر رہے تھے۔ بھارت نے ورکنگ باؤنڈری کو مستقل سرحد کا درجہ دینے کے لئے خاردار تار اور باڑ لگانے اور برجیاں تعمیر کرنے کی کوششوں میں اضافہ کر دیا جسے پاکستان کے سرحدی محافظوں نے ناکام بنا دیا لیکن بھارتی فوج کی سرگرمیوں میں اضافہ بھارتی حکمرانوں کی دھمکیوں اور امریکہ کی طرف سے بھارت کو احساس آلات کی فراہمی کی پیشکش ایسے مسائل ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ پاکستان کی حکومت بھارتی عزائم پر نہ صرف کڑی نظر رکھے بلکہ عوام کو صحیح صورتحال کے بارے میں اعتماد میں لینے کا بھی اہتمام کرے بالخصوص بعض سیاسی جماعتوں کی طرف سے مخاصمانہ طرز عمل کے پیش نظر حکومت کو تمام سیاسی جماعتوں اور اس کے قائدین سے رابطوں میں اضافہ کرنا چاہئے اور انہیں اعتماد میں لینے کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔ (روزنامہ جنگ۔ لاہور 25 نومبر 2001ء)

کابل میں 20 سال کے بعد پاکستانی مخالفین کی واپسی پر بھارت کے فوجی اور سفارتی مشنز نے برسر اقتدار آنے والے افغانوں اور ان کے اتحادیوں کے ساتھ طویل المدتی معاہدوں کے لئے مذاکرات شروع کر دیئے اور کابل سے طالبان کے انخلاء پر نئی دہلی میں جشن اور جموں وکشمیر میں بھارتی مظالم میں تیزی سے واجپائی حکومت کے عزائم صاف

Marfat.com

نظر آتے تھے، جب کہ بھارت میں امریکی سفیر رابرٹ بلیک ویل کے جدوجہد آزادی کشمیر اور پاکستان مخالف بیانات امریکی عزائم کو ظاہر کر رہے تھے، تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کو سامنے رکھ کر یہ بات کہی جا سکتی تھی کہ ''عالمی دہشت گردی'' کو ختم کرنے کے نام پر مفادات کی تکمیل اور بالادستی قائم کرنے کے لئے جنوبی ایشیا کو اب کھیل کا نیا میدان بنایا جا رہا ہے اور اس میدان میں کمیونزم کو شکست دینے کے بعد ایک اور زوردار مقابلہ مغرب اور اسلام کے درمیان شروع کیا جا چکا ہے اور روایتی حریف بھی اس میدان میں کود پڑے ہیں اور اب پاکستان اور ہندوستان پر محدود جنگ (Limited Conventional War) کے بادل منڈلا رہے تھے، بھارت تحریک آزادی کشمیر کو کچلنے کے لئے طاقت کا زیادہ سے زیادہ استعمال کر رہا تھا، اس کی فوجیں کنٹرول لائن، ورکنگ باؤنڈری اور پاکستان کے ساتھ لگنے والی بین الاقوامی سرحدوں پر جمع ہو رہی تھیں۔ ایٹمی جنگی مشقوں کے بعد سرحدوں پر فوجوں کا اجتماع غیر معمولی نقل و حرکت تھی بھارت نے جموں و کشمیر، پنجاب اور سرحد سے ملحقہ علاقوں میں جنگی سرگرمیاں تیز کر دی تھیں۔ بھارتی فوج کی شمالی کمان (جموں و کشمیر، پنجاب وغیرہ) کے سربراہ جنرل آر کے ناناوتی اعلان کر چکے تھے کہ آزاد کشمیر اور شمالی علاقہ جات کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ نئی دہلی میں سفارتی، سیاسی، فوجی اور انٹیلی جنس کے ''تال میل'' کے لئے ہنگامی کنٹرول روم بھی قائم کر دیا گیا، اس کے ساتھ ساتھ بھارت کی دفاعی تیاریاں بھی جاری تھیں، ٹینکوں کی خریداری کے لئے بھارت نے روس کے ساتھ 66 کروڑ ڈالر کا سمجھوتہ کرنے کے بعد جدید ہتھیاروں کی تیاری کے لئے رواں سال 3207 کروڑ روپے مختص کئے۔

پاکستان کی ''فرنٹ لائن'' پر وار کرنے کے لئے بھارت نے 11 نومبر کو ''اوسا'' میزائل کا تجربہ کیا جو 15 کلو میٹر تک مار کر سکتا تھا۔ بھارت کے بابائے میزائل ٹیکنالوجی ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کا 11 نومبر کو حکومت کے پرنسپل سائنٹیفک ایڈوائزر کے عہدے سے برخاست ہوتے وقت دیا گیا یہ بیان کہ بھارت کے پاس ہائیڈروجن بم ہے اور میزائل بھی ذخیرہ کے لئے ہیں بلکہ استعمال کے لئے ہیں، بھی کافی اہمیت کا حامل تھا۔ روس اور اسرائیل کے بعد بھارت نے امریکہ اور فرانس سے طویل المدتی فوجی اشتراک کا ڈھانچہ تیار کر لیا۔ بحیرہ عرب میں بھارت اور فرانس کی مشترکہ بحری مشقیں ہوئیں۔ اس دوران فرانس کے وزیر خارجہ ہوبرٹ ویڈرائن نے افغانستان کے خلاف حملوں کے تناظر میں اسلام آباد اور نئی دہلی کا دورہ کر کے نئی دہلی میں وزیر خارجہ جسونت سنگھ کے ساتھ مشترکہ پریس کانفرنس میں کہا کہ فرانس پاکستان اور بھارت کے درمیان تنازعہ کشمیر کو حل کرانے کے لئے دونوں ممالک کی مدد کرنے کو تیار ہے، فرانس کے بھارت کے ساتھ دفاعی تعاون نے، اس کشمیر پر اس کی غیر جانبدارانہ پالیسی مشکوک کر دی تھی۔ پاکستانی صدر جنرل پرویز مشرف نے اپنے حالیہ دورہ فرانس کے دوران فرانس کے صدر جیک شیراک اور وزیر اعظم لیونیل جوسپین سے پیرس میں تفصیلی بات چیت کے بعد پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ اگر بھارت مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کے لئے ایک قدم اٹھائے گا تو ہم تین قدم اٹھائیں گے اور دہشت گردی کا تذکرہ کرتے ہوئے صدر مشرف نے واضح کیا کہ بھارت جموں و کشمیر میں ریاستی دہشت گردی میں ملوث ہے۔ فرانس کے بعد بھارت نے امریکہ سے بھی طویل المدتی فوجی اشتراک کیا۔ امریکہ اور بھارت کے نئے فوجی تعلقات و تعاون کے لئے ایشیا میں امریکی افواج کے کمانڈر ایڈمرل ڈینس بلیئر خصوصی منصوبے لے کر نئی دہلی روانہ ہوئے، جب کہ پینٹاگون کے پالیسی ساز ادارے کے نائب سیکرٹری ڈگلس فیتھ بھی نئی دہلی میں دفاعی تعلقات پر

Marfat.com

مذاکرات کر رہے تھے بھارت میں امریکی سفیر بلیک ویل نے بھی اعتراف کیا کہ ہتھیاروں کے سودے کے بارے میں بھارت کے ساتھ اہم امریکی تعلقات کا آغاز ہونے والا ہے۔

امریکہ نے اپنے مفادات کے لئے ہمیشہ دوسرے ممالک کے ساتھ تعلقات استوار کئے لیکن جب مقاصد حاصل کر لئے تو نظریں پھیر لیں۔ سابق سوویت یونین کو ختم کرنے لئے پاکستان کو استعمال کیا گیا اور اب چین کو تباہ کرنے کے لئے بھارت کو استعمال کیا جا رہا تھا، بھارت امریکہ کی ضرورت تھا اس خطے میں تسلط قائم کرنے کے لئے امریکہ پاکستان کو نظر انداز نہیں کرنا چاہتا تھا دراصل امریکہ دونوں ملکوں کے ساتھ ایک دوسرے کی قیمت پر رشتے استوار رکھنے کے لئے انہیں بلیک میل کر رہا تھا، افغانستان تنازع سے امریکی عزائم کی کامیابی کے امکانات روشن ہوئے، لیکن اس تمام تر صورت حال میں تنازعہ کشمیر کی اہمیت پر سوالیہ نشان لگ گیا۔ افغانستان پر امریکی اور برطانوی حملوں کے شروع ہونے پر عالمی دہشت گردی کے خلاف مہم کو کشمیر تک پھیلانے کے خدشات ظاہر کئے جا رہے تھے، یہ خدشات اب بھی موجود تھے شروع میں کہا جا رہا تھا کہ طالبان کی مدد کے لئے کشمیری مجاہدین افغانستان روانہ ہو رہے ہیں طالبان کی پسپائی کے بعد کہا جانے لگا کہ القاعدہ اور طالبان بھارت کے خلاف لڑنے کے لئے کشمیر جا رہے ہیں، مقبوضہ کشمیر میں بھارتی فوج کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل جے آر مکھر جی نے اس پروپیگنڈا مہم میں کھل کر حصہ لیتے ہوئے خدشہ ظاہر کیا کہ افغانستان سے فرار ہونے والے کشمیر میں داخل ہو سکتے ہیں۔

طالبان کی پسپائی کے بعد افغانستان میں بھارت کی فوجی اور سفارتی سرگرمیوں کا بھی واحد مقصد پاکستان کے خلاف محاذ تیار کرنا تھا، بھارت نے 20 سال بعد افغانستان میں دوبارہ قدم جمانے کے لئے بڑے پیمانے پر رابطے شروع کئے۔ بھارت کا ایک سفارتی وفد سقیند رلامبا کی قیادت میں کابل میں کافی دیر تک سرگرم رہا، ایک اطلاع یہ تھی کہ بھارت نے کابل میں سفارتخانہ کھول لیا۔ علاوہ ازیں بھارت شمالی اتحاد کے ساتھ کئی سال سے مل کر طالبان کے خلاف کارروائیوں میں حصہ لیتا رہا تھا اور اب بھارت کا افغانستان میں طویل المدتی فوجی معاہدے کے لئے مذاکرات کے عمل میں شامل ہونا کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ 1970ء میں معدوم سوویت یونین اور 1971ء میں بنگلہ دیش قائم ہونے کے بعد نئی دہلی نے کابل اور ڈھاکہ کے ساتھ 25 سال پر محیط دفاعی معاہدے کئے تھے اور اب نئی دہلی حکومت شمالی اتحاد کے ساتھ اس نوعیت کے معاہدے کر کے پاکستان کو مغرب سے گھیرنے کی کوشش میں مصروف تھی کابل میں بھارت نواز حکومت کا دوبارہ قائم کرایا جانا پاکستان کے لئے تشویش کن ہو سکتا تھا۔ یہ بھارت کی سفارتی فتح اور پاکستان کی سفارتی شکست تھی اور اس کے کشمیر میں جدوجہد آزادی پر بُرے اثرات مرتب ہوئے تحریک آزادی کے کمزور ہونے کے خدشات بھی ظاہر کئے جا رہے تھے شاید اسی وقت کا بھارت کو انتظار رہا ہو یہی وجہ تھی کہ بھارت افغانستان میں کسی وسیع البنیاد اور کثیر النسلی حکومت میں طالبان کی شراکت کو سختی سے مسترد کر رہا تھا اور اپنے عزائم کی تکمیل کے لئے دنیا بھر میں پروپیگنڈا میں مصروف تھا۔ دوسری طرف یہ ایک خوش آئند بات سامنے آ رہی تھی کہ شمالی اتحاد کے بعض لیڈر اور سربراہ برہان الدین ربانی پاکستان کی نئی افغان پالیسی کی حمایت کرنے لگے۔ لیکن بھارت کی طرف سے ایران کے ذریعے شمالی اتحاد قیادت پر دباؤ ڈالا جانا باعث تشویش تھا۔ تاہم شمالی اتحاد کی طرف سے پاکستان کے ساتھ بہتر تعلقات قائم کرنے کی خواہشات نے بھارت کے ان خوابوں کو

Marfat.com

چکنا چور کر دیا جو وہ کابل سے کشمیر تک پورے خطے کو اپنے تسلط میں لانے کے لئے دیکھ رہا تھا، ادھر امریکی نائب وزیر خارجہ برائے جنوبی ایشیا کرسٹینا روکا کا یہ بیان کہ پاکستان کی طالبان پالیسی میں تبدیلی سے پاک بھارت تعلقات میں نئے امکانات پیدا ہوئے ہیں، اسلام آباد حکومت کو کھائی کی طرف چلنے کی ترغیب دے رہا تھا۔

بھارت دہشت گردی کے خلاف عالمی مہم کا دائرہ کار کشمیر تک بڑھانے کے لئے مسلسل اپیلیں کر رہا تھا، نئی دہلی میں عالمی مذہبی کانفرنس اور وزرائے اعلیٰ کانفرنس کے علاوہ متعدد مواقع پر بھارتی وزیراعظم واجپائی نے عالمی برادری پر زور دیا کہ وہ افغانستان کے بعد کشمیر میں بھی کارروائی کرے، بھارت بار بار الزام لگا رہا تھا کہ جموں وکشمیر میں اسے ''دہشت گردی'' کا سامنا ہے اور اس دہشت گردی کو پاکستان بڑھاوا دے رہا ہے۔ وزیر دفاع جارج فرنانڈیز بار بار پاکستان پر جموں وکشمیر اور شمالی ریاستوں میں دہشت گردی میں ملوث ہونے کا الزام لگا رہے تھے۔

بھارت میں امریکی سفیر متعدد بار یہ کہہ چکے تھے کہ کشمیر میں آزادی کی جنگ نہیں بلکہ دہشت گردی ہو رہی ہے اور اب تو سفیر موصوف نے باضابطہ طور پر امریکہ سے مطالبہ کیا کہ وہ کشمیر میں ''دہشت گردی'' بند کرائے۔ امریکی سفیر نے تمام سفارتی آداب کو بالائے طاق رکھ کر صرف بھارت کے غیر حقیقت پسندانہ نقطہ نظر سے متاثر ہو کر یہ باتیں کہیں تھیں جب کہ پاکستان میں امریکی سفیر نے اگرچہ اسلام کی زبردست تعریف کرتے ہوئے مسلمانوں سے اظہار یکجہتی کے طور پر روزے رکھنے کا اعلان اور افطار پارٹیوں کا اہتمام کیا لیکن بھارت میں امریکی سفیر رابرٹ بلیک ویل کی طرح پاکستان میں امریکی خاتون سفیر وینڈی چمبرلین نے کشمیر پر پاکستانی موقف کی حمایت نہیں کی۔ کیا یہ پاکستان کی سفارتی کمزوری تھی کہ وہ امریکی سفیر کو حقائق بیان کرنے پر آمادہ نہ کر سکے اور سفارتی میدان میں نئی دہلی حکومت نے اسلام آباد پر بازی لے لی۔

نئی دہلی میں امریکی سفیر کی بھارت نواز سرگرمیوں کے بعد 5 نومبر کو نئی دہلی میں امریکی وزیر دفاع جارج رمزفیلڈ نے پریس کانفرنس میں یہ صاف کہا کہ ہم دنیا بھر میں دہشت گردوں کا تعاقب کریں گے اور افغانستان ہمارا پہلا ہدف ہے۔ امریکی نیشنل سیکورٹی ایڈوائزر کونڈولیزا رائس نے بھی بی بی سی کے پروگرام ہارٹ ٹاک پر گفتگو میں طالبان کی پسپائی سے ایک روز قبل کہا تھا کہ ہم ''بھارت میں دہشت گردی'' کے خلاف کارروائی کے لئے افغان جنگ کے خاتمے کا انتظار نہیں کریں گے اور ہم نے پاکستان پر واضح کر دیا ہے کہ ''دہشت گردوں'' کی حمایت ناقابل قبول ہوگی۔ برطانیہ کے وزیر دفاع جیوف ہیون نے بھی 13 نومبر کو بھارتی وزیر دفاع جنرل فرنانڈیز کے ساتھ ملاقات کے بعد صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ''برطانیہ کشمیر میں جاری عسکری تحریک کے لئے بیرونی حمایت کا خاتمہ چاہتا ہے۔ ہم کشمیر سمیت دنیا بھر میں ہر جگہ دہشت گردوں کے خلاف ہیں اور یہ جنگ افغانستان میں ہی ختم نہیں ہوگی، بھارت اور برطانیہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے دوران اتحادی ہیں''۔ واشنگٹن پوسٹ نے بھی ایک اداریہ میں امریکی عزائم کی عکاسی کی امریکی بمباری کا مقصد اسامہ یا طالبان کا خاتمہ نہیں بلکہ مزید نئے اہداف بھی حاصل کرنا ہے جس پر مستقبل میں عمل درآمد ہوگا''۔

یہ تھے وہ اشارے جن سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ پاکستانی تعاون کے باوجود امریکہ اور اس کے دیگر اتحادی کشمیر کی جدوجہد آزادی کو دہشت گردی سے تعبیر کر رہے ہیں اور وہ تنازعہ کشمیر کے سلسلے میں بھارتی موقف سے متاثر ہو رہے ہیں اور بھارت نے کشمیر پر اپنی پروپیگنڈا مہم کا اثر دیکھتے ہوئے نئی حکمت عملی تیار کر لی ہے۔

Marfat.com

بھارتی وزیراعظم واجپائی نے اپنے دورہ روس، برطانیہ اور امریکہ سے واپسی پر یہ حکمت عملی تیار کی۔ وزیراعظم واجپائی نے صدر مشرف کی پیشکوں کے باوجود نیویارک میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس کے موقع پر پاکستانی صدر سے ملاقات کرنے سے گریز کیا یہاں تک کہ بھارتی وفد میں شامل وزیر خارجہ جسونت سنگھ اور دیگر سفارتکار پاکستانی وفد کے سامنے آنے سے بھی ہچکچاہٹ محسوس کرتے رہے۔ ظاہر ہوتا تھا کہ بھارت نے ایک مرتبہ پھر پاکستان کے ساتھ مذاکرات کے دروازے بند کر لیے ہیں، اگلے سال جنوری 2002ء کی 4 تا 6 تاریخ کو نیپال کے دارالحکومت کھٹمنڈو میں جنوبی ایشیا کے ممالک کی تنظیم ''سارک'' کا سربراہ اجلاس منعقد ہو رہا تھا جس میں پاکستانی پیشکش کے بعد بھارتی وزیراعظم واجپائی نے صدر مشرف سے ملاقات کرنے کے لئے مشکوک آمادگی ظاہر کی تھی تاہم سفارتی مبصرین نے پاکستان اور بھارت کے درمیان مجوزہ مذاکرات کو خارج از امکان قرار دے کر خیال ظاہر کیا کہ سارک سربراہ اجلاس میں وزیراعظم واجپائی شرکت نہیں کریں گے بلکہ بھارت کے صدر کے آر نارائنن کھٹمنڈو جائیں گے۔ بھارت کے مذاکرات سے گریز کرنے کے کئی مقاصد ہو سکتے تھے اور ان میں سے ایک یہ کہ سقوط کابل کے بعد بھارت پاکستان کے خلاف زیادہ سے زیادہ مہم جوئی کر کے دنیا میں اپنے ہمنوا پیدا کرنا چاہتا تھا تا کہ اس کی ممکنہ جارحیت کے موقع پر کہیں سے بھی بھارت کے خلاف آواز بلند نہ ہو سکے۔

جنوبی ایشیا میں افغانستان کے بعد امریکہ کا ٹارگٹ مقبوضہ/آزاد کشمیر (بشمول پاکستان) فلپائن کی مسلم تنظیمیں نئی دہلی میں وسیع تر دفاعی تعاون کے امریکہ، بھارت معاہدے کے اہم نکات کو اجاگر کرتے ہوئے بحرالکاہل کی فوجی کمانڈ کے سربراہ ایڈمرل ڈینس بلیئر نے کہا کہ فلپائن میں ابوسیاف گروپ کی سرگرمیوں کا قلع قمع کرنے کے لئے دوست ممالک کا تعاون درکار ہے۔ دوست ممالک میں بھارت، انڈونیشیا، ملائیشیا اور سنگاپور شامل تھے۔ ایڈمرل ڈینس نے غالباً رازداری کے باعث ان اقدامات کی تفصیل نہیں بتائی جو نئے بھارت۔ امریکہ معاہدے کے تحت، مقبوضہ کشمیر میں جدوجہد آزادی کو کچلنے اور آزاد کشمیر پر دہشت گردی کے تربیتی کیمپوں کے بہانے کی آڑ میں حملہ کے لئے تیار کی گئی تھیں لیکن اس موقع پر بھارتی وزیر داخلہ ایل کے ایڈوانی اور مسلح افواج کے سربراہوں کی باچھیں جس طرح کھلی جا رہی تھیں اس سے اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ امریکہ نے کشمیر کے بارے میں جو کچھ ڈیل بھارت سے کی ہے اس سے بھارتی قیادت اور مسلح افواج خاصی مطمئن ہیں۔ افغانستان میں وحشیانہ بمباری سے بیشتر ایسا لگ رہا تھا کہ امریکہ بھارت کے مقابلے میں پاکستان کو زیادہ اہمیت دے رہا ہے بلکہ وزیر خارجہ کولن پاؤل، امریکی سفیر وینڈی چیمبرلین اور سنٹرل کمانڈ کے سربراہ ٹومی فرینکس کی صدر پرویز مشرف سے ملاقات کے بعد اخباری بیانات سے تو ایسا ظاہر ہوا کہ امریکہ کو پاکستان سے گزشتہ 20 سال کے دوران کئے جانے والے سلوک پر شرمندگی اور ندامت ہے۔ مغربی ذرائع ابلاغ نے بھی تاثر یہی دیا کہ افغانستان کے بحران میں بھارت کا کوئی رول نہیں تاہم نئے امریکی سفیر رابرٹ بلیک ول اور وزیر دفاع رمزفیلڈ کے متواتر بیانات اور انٹرویو نے پاکستانی حکام اور دانشوروں کے ذہن میں شکوک و شبہات پیدا کرنے شروع کر دیئے۔ اب افغانستان میں صورت حالات تقریباً ان کے حسب منشاء آ چکے تھے پتہ چل رہا تھا کہ امریکہ نے پاکستان کو اندھیرے میں رکھا اور پس پردہ بھارت سے گہرے، قریبی اور انتہائی حساس نوعیت کے دفاعی تعلقات پر مبنی ڈیل کر لی۔ امریکہ کو جنوبی ایشیا میں جہادی تنظیموں سے

Marfat.com

نمٹنا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ چین کے خلاف مزاحمت کی دیوار کھڑی کرنی تھی Listening Posts قائم کرنی تھیں 9 نومبر کو واشنگٹن میں صدر جارج بش سے ملاقات سے پیشتر اٹل بہاری واجپائی ماسکو میں ولادیمیر پیوٹن سے 20 ارب ڈالر کے اسلحہ اور آلات حرب وضرب کی فراہمی کے معاہدے پر دستخط کر چکے تھے۔ اب افغانستان میں طالبان کے خلاف کامیاب مہم کے اختتام سے ذرا قبل وسیع تر دفاعی تعاون کیا معنی رکھتا تھا جنوبی ایشیا میں صرف پاکستان اور چین ہی دو ایسے ممالک جن سے بھارت کی جنگیں ہو چکی تھیں۔ امریکہ ایک جانب پاکستان کو بہلا رہا تھا کہ وہ مشکل حالات میں پاکستان کا ساتھ نہیں چھوڑے گا اور دوسری جانب پاکستان کے بدترین دشمن بھارت سے ایسا فوجی معاہدے کر رہا تھا جس پر پاکستانی حکومت اور عوام کو بجا طور پر تشویش تھی مبصرین کا خیال تھا کہ آئندہ چند ہفتوں میں دہشت گردی سے نمٹنے کے نام پر مقبوضہ کشمیر میں مجاہدین کے خلاف بڑے پیمانے پر کارروائی ہوگی۔ ایڈمرل ڈینفس بلیئر نے دہشت گردوں کے تعاقب میں بین الاقوامی سرحد عبور کرنے سے متعلق سوالات پر کچھ کہنے سے انکار کر دیا لیکن گزشتہ دو ماہ کے دوران امریکی وزارت خارجہ اور دفاع کے وزراء اور دیگر اعلیٰ حکام کی بھارت آمد ورفت نے بہت سے سوالات کے جواب فراہم کر دیئے۔

پاکستان کی جہادی تنظیموں کا مورال طالبان کی شکست کے بعد خاصا ڈاؤن ہو چکا تھا۔ حکومت کی جانب سے سختی نے بھی ان تنظیموں کے ہاتھ پیر بڑی حد تک باندھ دیئے۔ جہادی تنظیموں سے منسلک روحانی پیشوا اب مساجد میں صرف ''مرگ امریکہ'' کی دعا مانگنے تک محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ افغانستان میں قیام امن یا قیام حکومت کے لئے ایران، بھارت، وسط ایشائی ریاستوں، روس اور پاکستان کے مفادات تھے۔ پانچ سال تک اپنی مغربی سرحدوں سے بےفکر رہنے کے بعد اب پاکستان کو ایک بار پھر Hostile حکومت کا سامنا تھا۔ ایران، روس اور بھارت اپنے مفادات کی خاطر شمالی اتحاد اور قبائلی وار لارڈز کی حکومت تسلیم کرنے پر مجبور تھے امریکہ کو دنیا بھر کی مسلم تنظیموں کے خلاف کارروائی کا بہانہ افغانستان سے مل گیا۔ بحرالکاہل میں متعین مسلح افواج کے سربراہ ایڈمرل ڈینس بلیئر نے نئی دہلی میں برملا کہا کہ بھارت سے وسیع تر دفاعی تعاون کا ایک اہم مقصد دہشت گردوں کے خلاف موثر کارروائی ہے۔ موصوف نے فلپائن میں مسلم لیڈر ابو سیاف کے خلاف جو کچھ کہا ہے اس سے مسلم امہ کے خلاف امریکی عزائم کھل کر سامنے آ چکے تھے۔ دفاعی معاہدے میں شرکت پر امریکہ نے بھارت کو بھی نیشنل میزائل ڈیفنس سسٹم (NMD) ایکسرسائز دیکھنے کے لئے مدعو کیا گیا۔

جن ممالک کو این ایم ڈی ایکسرسائز دیکھنے کی دعوت دی گئی۔ ان میں روس، جنوبی کوریا، جاپان اور نیٹو ممالک شامل تھے۔ امریکہ نے وسیع تر دفاعی تعاون کے تحت امریکی اور بھارتی مسلح افواج کی مشترکہ مشقوں، فوجیوں اور افسروں کی تربیت کا بھی اہتمام کیا۔ اس فوجی تعاون کے لئے امریکہ نے ڈیفنس پالیسی گروپ تشکیل دیا۔ سینئر امریکی عہدیدار رچرڈ ہاس اور ڈگلس فیتھ نے بھارت کے اعلیٰ فوجی حکام اور متعلقہ وزراء سے تفصیلی مشاورت کی۔ رچرڈ ہاس نے 22 رکنی انڈو امریکی بزنس کونسل کی بھارت آمد کا راستہ ہموار کیا یہ اس بات کی کوشش کر رہے تھے کہ کہ دفاعی پروڈکشن کے معاملے میں امریکی سرمایہ اور ٹیکنالوجی بھارت منتقل ہو۔ بھارتی صنعت کار اور سرمایہ دار امریکی ٹیکنالوجی اور سرمایہ سے اسلحہ تیار کر کے عرب اور دیگر ضرورت مند ممالک کو ایکسپورٹ کریں۔

Marfat.com

بھارتی پارلیمنٹ پر "دہشت گردوں" کا حملہ

بھارت عزائم کھل کر اس وقت سامنے آئے جب 13 دسمبر 2001ء کو اچانک بھارتی پارلیمنٹ نے "دہشت گردوں" نے حملہ کر دیا۔ اس حملے کے بمشکل پندرہ بیس منٹ بعد میں بھارت کو الہام ہو گیا کہ حملہ میں "پاکستان" ملوث ہے اور حملہ آوروں کا تعلق پاکستان سے ہے۔ یہ سراسر غلط اور بے بنیاد الزام تھا لیکن بھارت سے اس الزام کی آڑ میں پاکستانی سرحدوں پر دس لاکھ سے زیادہ بحری اور فضائی افواج کا اجتماع کر دیا اس کے ساتھ ہی پاکستان کے ساتھ اپنی فضائی اور زمینی سروس بند کر دی۔ پہلے فضائی سروس بند کی یکم جنوری 2002ء کو بھارت اور پاکستان کے درمیان چلنے والی سمجھوتہ ایکسپریس بھی بھارت نے بند کر دی۔ اس کے ساتھ ہی بھارتی فوجوں نے پاکستانی سرحدوں کا رخ کیا پاکستان کو بھی جواباً اقدامات کرنے پڑے صورتحال اچانک بہت خطرناک رخ اختیار کر گئی 19 جنوری 2002ء کو دونوں ممالک نے امریکہ کے دباؤ پر اعلان کیا کہ وہ آپس میں جنگ نہیں کریں گے۔ جبکہ بھارت کی طرف سے 13 دسمبر 2001ء کو یہ اطلاع ملتے ہی کہ حملہ آور پاکستانی ہیں پاکستان نے سختی سے ان الزامات کی تردید کی تھی اور ان تمام شناختی کارڈز کو جعلی قرار دیا تھا جو مرنے والے حملہ آوروں کی جیب سے برآمد ہوئے تھے یہ بات کوئی احمق بھی جان سکتا تھا کہ پاکستانی حملہ آور اپنے شناخت نامے جیب میں ڈال کر بھارتی پارلیمنٹ پر حملہ نہیں کر سکتے تھے۔

2001ء کا سالانہ جائزہ لیتے ہوئے میں نے 2001ء میں پاکستانی خارجہ پالیسی کو درپیش چیلنجز کے حوالے سے روزنامہ جنگ میں مضمون سپرد قلم کیا جس میں سارے سال میں خارجہ پالیسی خصوصاً پاک بھارت تعلقات کے حوالے سے جو تجزیہ کیا وہ پیش خدمت ہے۔

"2001ء خارجہ پالیسی کے محاذ پر پاکستان کی 54 سالہ تاریخ میں ایک بڑے چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ گذشتہ سال کے اواخر میں امریکہ کے سابق صدر کلنٹن کے دورہ جنوبی ایشیا کے دوران پاکستان میں ایک روزہ قیام اور پاکستانی عوام کے نام خطاب میں پاکستان کو صاف الفاظ میں سمجھا دیا گیا تھا کہ افغانستان خصوصاً بنیاد پرستی کے حوالے سے ہماری پالیسیاں امریکہ کو بری طرح کھٹکنے لگی ہیں اور اگر ہم نے آئندہ اس مہذب دنیا میں بطور قوم زندہ رہنا ہے تو ہمیں امریکی خواہشات کے مطابق اپنی خارجہ پالیسی میں انقلابی تبدیلیاں لانا ہوں گی بصورت دیگر دنیا میں ہمارے لیے کوئی جگہ باقی نہیں بچتی اور پھر رواں سال کے آغاز ہی میں افغانستان میں لگائی گئی بین الاقوامی پابندیوں نے جہاں پہلے سے تباہ حال افغانستان کے افلاس زدہ عوام کے لیے زندگی مزید مشکل کر دی وہیں پاکستان پر مہاجرین کا دباؤ اچانک بڑھ گیا جبکہ ہماری کمزور معیشت اب "مہمان نوازی کے آداب" بھولنے کا تقاضا کر رہی تھی اور پاکستان کو بادل نخواستہ مہاجرین کی آمد پر

Marfat.com

پابندیاں لگانا پڑیں لیکن 14 سو میل طول سرحد پر ان پابندیوں کا اہتمام کیسے ممکن تھا؟ یہ پابندیاں افغانستان پر اسامہ بن لادن کے حوالے سے لگائی گئی تھیں جبکہ طالبان حکومت کے وزیر اطلاعات قدرت اللہ جمالی نے اس کی بنیاد اقوام متحدہ کی مسلمانوں سے نفرت کو بتاتے ہوئے کہا کہ اسامہ بن لادن کو بطور ہتھیار استعمال کیا گیا ہے۔ طالبان وزیر خارجہ مولوی متوکل نے نئی پابندیوں پر اقوام متحدہ کے زیر اہتمام امن کانفرنس کے بائیکاٹ کی دھمکی بھی دے دی اور پاکستان پر بین الاقوامی دباؤ بڑھنے لگا کہ وہ طالبات حکومت پر لگائی پابندیوں کا مکمل احترام کرے جبکہ پاکستان کے لیے اندرونی دباؤ کی وجہ سے ایسا ممکن ہی نہیں تھا۔ 22 فروری کو امریکی کانگریس کے تین اراکین پر مشتمل ایک وفد نے پاکستان کا تین روزہ دورہ کیا اور جنرل پرویز مشرف سے ملاقات میں امریکہ کی طرف سے تحفظات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان اپنی گومگو کی پالیسی چھوڑ کر طالبان حکومت کے خلاف یو این او کی قرارداد پر عمل درآمد یقینی بنائے کیونکہ امریکی کانگریس پاکستانی کردار سے مطمئن نہیں تھی۔ یہ وفد بھارت کا دورہ کر کے پاکستان آیا تھا جہاں اس کے اراکین کی تعداد 4 تھی لیکن وفد کے قائد اور امریکی کانگریس میں ''انڈین کاکس'' ری پبلکن کانگریس مین روئس پاکستان نہیں آئے لہٰذا ڈیموکریٹ کانگریس میں ڈیوڈ بونیئر کی قیادت میں تین رکنی وفد پاکستان آیا۔ ان تین میں سے دوسرے کانگریس مین جم مکیڈرمیٹ بھی امریکہ میں انڈین کاکس کے سرگرم ممبر ہیں۔

اس وفد کی آمد اور اس پر بھارتی اثر و رسوخ سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پاکستان سے متعلق ان کے جذبات کیا ہوں گے ادھر قحط زدہ افغانستان خانہ جنگی کے عذاب میں مبتلا تھا ادھر ملا عمر نے اچانک بامیان میں موجود بدھا کے تاریخی مجسموں کو مسمار کرنے کا عندیہ ظاہر کر کے ایک مرتبہ پھر پاکستان کی مشکلات میں اضافہ کر دیا۔ مغربی دنیا میں بھارت اس بات پر بضد تھے کہ طالبان حکومت پاکستان کے آشیرواد سے قائم ہے لہٰذا پاکستان ہی طالبان کو اس اقدام سے روکے۔ طالبان کو اس ارادے سے روکنے کے لیے دنیا بھر سے مختلف وفود نے پاکستان کا دورہ کیا جن میں سیکرٹری جنرل اقوام متحدہ کوفی عنان بھی شامل تھے جنہوں نے جنرل پرویز مشرف کے ساتھ مشترکہ پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے طالبان کو وارننگ بھی دی کہ وہ اپنے لیے مشکلات پیدا کر رہے ہیں۔ کوفی عنان نے بھارت نیپال اور بنگلہ دیش کا دورہ بھی کیا تھا لیکن پاکستان کے قومی مفاد کے نقطہ نگاہ سے یہ تاریخی دورہ اگر نہ ہوتا تو زیادہ بہتر تھا کیونکہ پاکستان کے لیے یہ دورہ مخاصمانہ اور منفی اثر کا حامل رہا۔ اس دورے سے مسئلہ کشمیر کے بارے بھارت کا حوصلہ بڑھا اور پاکستانی موقف کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ 12 مارچ کو بھارتی وزیر اعظم واجپائی نے بھارتی پارلیمنٹ سے خطاب میں اس پر زبردست مسرت کا اظہار بھی کیا گو کہ 54 سال میں یہ کسی بھی سیکرٹری جنرل کا پہلا پاکستانی دورہ تھا لیکن اس میں کوفی عنان نے پاکستان کی طرف سے مسئلہ کشمیر پر یو این او کی قراردادوں کو اہمیت دیے بغیر اسے ''دو طرفہ مذاکرات'' کے مشورے سے نوازا کوفی عنان نے آزاد کشمیر جانے سے انکار کر دیا۔ لائن آف کنٹرول دیکھنے سے معذرت کی اور کشمیری مہاجرین سے ملاقات سے انکار کر دیا۔ انہوں نے پریس کانفرنس میں کہا کہ اقوام متحدہ کے مبصرین کی تعداد میں اضافہ بھی پاکستان اور بھارت دونوں کی مرضی پر منحصر ہے ان دنوں وزیر داخلہ معین الدین حیدر بار بار کابل اور قندھار کے چکر لگا رہے تھے کہ کسی بھی طرح طالبان اسامہ بن لادن کو افغانستان سے نکالنے پر رضامند ہو جائیں تو پاکستان کو امریکہ کی طرف سے 38 بلین

Marfat.com

ڈالر کے قرضے معاف ہونے کی امید دلائی گئی تھی جبکہ پیرس کلب نے ڈالروں کی بارش برسانے کا وعدہ کیا تھا لیکن طالبان نے پاکستان کی کوئی بھی بات ماننے سے انکار کر دیا۔

مارچ کے آخر میں بھارت نے اس صورتحال کا فائدہ اٹھانے کا عزم کیا اور بھارتی سیکرٹری دفاع یوگیندر نریش ایران جا پہنچے جہاں انہوں نے بھارت اور ایران کے طالبان مخالف محاذ کو عملی شکل دینا شروع کی اور واجپائی کے دورہ تہران کی خبر سننے کو ملی۔ اس دوران علی اکبر ولائتی اور ایرانی وزیر دفاع علی شمخانی نے یکے بعد دیگرے بھارت کے دورے شروع کیے اور تہران سے دہلی جانے والی گیس پائپ لائن کی تنصیب پر مذاکرات شروع ہوئے یہ گیس پائپ لائن پاکستان سے گزرتی لیکن بھارت نے اپنے خدشات کا اظہار کر کے معاملہ کھٹائی میں ڈال دیا۔ مارچ میں بھارتی وزیر اعظم واجپائی نے ایران کا تین روزہ دورہ کیا اور طالبان حکومت کے خلاف ایران بھارت مشترکہ محاذ کا اعلان پریس کانفرنس میں داغ دیا۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ ایران مسئلہ کشمیر پر بھارت کی مکمل حمایت کرتا ہے۔ پاکستانی وزارت خارجہ کی کوششوں کے باوجود بھارتی حکومت براستہ پاکستان ایران گیس کی ترسیل پر رضامند نہ ہوئی اور اس طرح 600 ملین ڈالر کی متوقع آمدنی کی توقعات بھی ختم ہوگئیں۔ ترکی کے وزیر اعظم بلند ایجوت نے بھارتی دورہ کر کے بھارت اور ترکی کے درمیان ہزاروں سال پرانے ثقافتی اور تہذیبی رشتے تلاش کر لیے البتہ ملائیشیا کا دورہ واجپائی کو مہنگا پڑا جب مہاتیر محمد نے مسئلہ کشمیر پر بھارت کی ہاں میں ہاں ملانے سے انکار کرتے ہوئے امریکی میزائل ڈیفنس پروگرام کی بھارت کی طرف سے حمایت کی سختی سے مخالفت کی اور بھارت کو ''آسیان'' کا ممبر بنانے سے بھی انکار کرتے ہوئے اس پر واضح کر دیا کہ سلامتی کونسل کی نشست کے لیے بھی وہ بھارت کی مدد نہیں کریں گے۔ اس مرحلے پر حیرت انگیز طور پر چین نے بھارت کے لیے ''سافٹ کارنر'' اپنایا اور ہمارے وزیر خارجہ عبدالستار کی بیجنگ موجودگی کے دوران چین کی وزارت خارجہ کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ چین افغانستان میں قیام امن کے لیے بھارت کے رول کو تسلیم کرتا ہے جبکہ پاکستان اسے تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

مئی میں ہمارے وزیر خزانہ شوکت عزیز نے امریکہ کا دورہ کیا اور واپسی پر پاکستانی قوم کو یہ خوشخبری سنائی کہ مالیاتی ادارے پاکستان کو کریڈٹ اور قرضوں کی سہولت میں نرمی اختیار کریں گے۔ اس دوران وزیر خارجہ عبدالستار نے واشنگٹن میں کولن پاول سے ملاقات کی اور 6 مئی کو واشنگٹن سے جاری ایک سرکاری بیان کے ذریعے امریکی انتظامیہ نے اس بات کی تصدیق کی کہ پاکستان اب طالبان کی مدد نہیں کر رہا اور اقوام متحدہ کی لگائی پابندیوں کو موثر بنانے میں مکمل تعاون کر رہا ہے جس پر یہ امید قائم ہوئی کہ 14 جون کو عالمی بنک کا بورڈ ہمارے لیے 70 کروڑ ڈالر کے نئے قرضے کی منظوری دے دے گا۔

چینی وزیر اعظم ژوان چی کے دورہ پاکستان کے دوران سات سمجھوتوں پر دستخط ہوئے جن میں گوادر کی تعمیر اور ڈیپ سی پورٹ خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ چین کے اس اعلان نے بھارت کو تشویش میں مبتلا کر دیا اور اس نے اس ضمن میں پاکستان کے خلاف پراپیگنڈہ کا نیا محاذ کھولتے ہوئے امریکہ کو یقین دلا دیا کہ چین Blue Water نیوی بنانے کی تیاریاں کر رہا ہے اور وہ کبھی گوادر سے واپس نہیں جائے گا۔ امریکیوں کے اس سلسلہ میں اپنے تحفظات بھی ہیں اور وہ اس مسئلے کو سنجیدگی سے لیں گے۔ مئی کے تیسرے ہفتے میں جنوبی ایشیا کے لئے امریکی پالیسی کے خدوخال واضح ہوتے گئے

Marfat.com

امریکی وزیر خارجہ کولن پاول کی طرف سے افغان عوام کے لیے 43 ملین ڈالر کی انسانی ہمدردی کی بنیاد پر خوراک اور امداد کا اعلان جنوبی ایشیا کے لیے نامزد سٹیٹ سیکرٹری کرسٹینا روکا کا امریکی سینٹ کے سامنے بیان اور سوال جواب کا متن اور امریکی محکمہ خارجہ کے حکام اور بھارتی ماہرین کے درمیان اشتراک عمل کے لیے ورکنگ سیشن کا انعقاد امریکی خارجہ پالیسی کی سمت بتانے کے لیے کافی تھا۔ کرسٹینا روکا نے پاکستان کے حوالے سے کہا کہ پاکستان سے تعلقات میں پاکستان کو درپیش مسائل کے حل میں مدد دینا شامل ہے جبکہ بھارت کے ساتھ تجارت، معیشت اور عالمی سٹرینجی میں بھارت کی شراکت تعلقات کا محور رہے گی۔ بھارتی حکومت نے جنرل پرویز مشرف کی طرف سے مسئلہ کشمیر پر بات چیت کی پیشکش کو ٹھکرایا تھا کیونکہ بھارت فوجی آمر سے بات چیت کے لیے تیار نہیں تھا جبکہ جنرل مشرف معاہدہ لاہور کو آگے بڑھانے کے متمنی۔ مئی میں اچانک واجپائی نے خط لکھ کر جنرل مشرف کو بھارت آنے کی دعوت دی جسے پاکستانی حکومت نے خوش دلی سے قبول کیا۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ یہ حالات ''امریکی دباؤ'' کا نتیجہ ہیں 8 جون کو واجپائی کے گھٹنے کا آپریشن تھا اور امید تھی کہ جون کے آخر میں ملاقات ممکن ہوگی لیکن یہ ملاقات پھر 14 جولائی کو ممکن ہوئی۔

13 جون کو وزیر خارجہ عبدالستار کینیڈا پہنچے ان کی آمد کے موقع پر کینیڈین سیکورٹی انٹیلی جنس سروس (CSIS) نے ایک رپورٹ جاری کی جس میں کہا گیا کہ دنیا کے مختلف حصوں میں پاکستان کی حمایت رکھنے والے Insurgents کی سرگرمیاں کینیڈا کے لیے باعث تشویش ہیں۔ یہ رپورٹ کینیڈین پارلیمنٹ میں پیش کی گئی 16 جون کو عبدالستار واشنگٹن پہنچے 15 جون کو امریکی حکومت دو پاکستانی امریکن محمد راجہ اور ضیاء محسن کو میزائل اور راڈار کے کچھ پرزوں کی غیر قانونی سمگلنگ پاکستان کرتے ہوئے گرفتار کر چکی تھی اتوار 17 جون کے اخبار ٹائمز آف انڈیا نے سرخی لگائی Pakistan stung by stinger sting on Sattar visit بدقسمتی سے اس صورتحال کا بھارتی حکومت نے خوب فائدہ اٹھایا اور 20 جون کو عبدالستار وزیر خارجہ کی پریس کانفرنس میں خاصی بدمزدگی پیدا کر دی۔ اس دوران امریکی نائب وزیر خارجہ رچرڈ آرمیٹج کا بیان آیا کہ امریکہ پاکستان سے ایسے تعلقات کا خواہاں ہے جو کسی تیسرے ملک کی وجہ سے متاثر نہ ہوں۔ انہوں نے ماضی میں پاکستان اور امریکی تعلقات کو ''جھوٹے تعلقات'' بتایا اور کہا کہ لوگوں نے انہیں سطحی نظر سے دیکھا انہوں نے کہا کہ ماضی میں ہمارے تعلق کی بنیاد پہلے روس بھارت محور پھر افغانستان تھا اور کوئی خاص پالیسی ہی نہیں تھی اس کے ساتھ ہی انہوں نے طالبان اور اسامہ بن لادن سے متعلق پاکستان کی یقین دہانیوں کا تذکرہ اور انہیں پورا کرنے کے لیے کہا اسی روز امریکی سفیر ولیم بی مالکم نے پاکستان میں فوجی حکومت کی مخالفت اور اقتدار عوامی منتخب نمائندوں و منتقل کرنے کی بات انگلش سپیکنگ یونین کی تقریب سے خطاب میں کر دی۔

بھارت کی طرف سے پاکستان کو مذاکرات کی دعوت یوں تو بش انتظامیہ کے دباؤ کا نتیجہ تھا لیکن بھارت کی اپنی بھی کچھ مجبوریاں تھیں اس نے مقبوضہ کشمیر میں چھ ماہ کی نام نہاد جنگ بندی کے خاتمے سے پہلے شبیر شاہ اور دیگر رہنماؤں سے مذاکرات کا ڈول ڈالا تاکہ پاکستان کو اس مسئلے سے آؤٹ کر دے لیکن ان رہنماؤں نے بھارتی حکومت کے مذاکرات کو ڈھونگ قرار دے کر پاکستان کی شمولیت کے بغیر اس کو بیکار اور وقت کا ضیاع بتایا۔ ادھر بھارتی فوجی قیادت کی طرف سے مجاہدین کے خلاف بے بسی کا اظہار ہو رہا تھا اور یہ کہا جا رہا تھا کہ جون میں جب برف پگھلے گی تو سرحدوں پر دباؤ

Marfat.com

بڑھے گا اور مجاہدین کی نقل وحمل روکنا بھارتی فوج کے بس کی بات نہیں۔ حریت کانفرنس اور پاکستان کے درمیان غلط فہمی پیدا کر کے اپنا الو سیدھا کرنے کی بھارتی کوشش تب ناکام ہوئی جب پاکستانی ہائی کمیشن نے حریت رہنماؤں کو خصوصی دعوت دے کر صدر مشرف سے ملاقات کے لیے بلایا حالانکہ بھارت نے اس ملاقات کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔

یکم اپریل کو چین نے امریکہ کے جاسوس طیارے کو اترنے پر مجبور کیا اور دونوں ممالک میں تناؤ بڑھنے لگا تھا۔ طیارہ بعد میں ٹکڑوں کی شکل میں امریکی واپس لے کر گئے تھے اس کے بعد سے صدر بش جو قدرے جارحانہ مزاج رکھتے ہیں چین کے متعلق بھی سخت پالیسی اپنانے لگے اس کا اثر پاکستان پر پڑا جب جنرل مشرف کے دورہ بھارت سے پہلے جولائی کے آغاز میں امریکن اشارے پر بھارت نے پاکستان سے پوچھا کہ گوادر کی بندرگاہ کی توسیع کے منصوبے میں چین کی دلچسپی کی کیا نوعیت ہے؟ اس مرحل پر یوں لگتا تھا جیسے امریکہ اب پاکستان کو چین یا امریکہ؟ کا آپشن دینے والا ہے۔

جنرل مشرف بھارت روانگی سے پہلے صدر کے اختیارات حاصل کر چکے تھے تا کہ وہ بھارت سے اپنی آئینی حیثیت کے ساتھ بات چیت کریں۔ 14 مئی کو صدر مشرف آگرہ پہنچے جہاں دنیا بھر کا میڈیا جمع تھا۔ آگرہ مذاکرات شاید مذاکرات کی بھارت پاکستان تاریخ میں پہلے ایسے مذاکرات تھے جن میں پاکستان کو ہر لحاظ سے بھارت پر برتری حاصل ہوئی۔ جنرل پرویز مشرف نے ان مذاکرات کے دوران حیرت انگیز طور پر ایک زبردست سٹیٹسمین کا کردار ادا کیا اور انتہائی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہوں نے بھارتی میڈیا کے اہم ممبران سے ''ناشتے کی میز'' پر ملاقات کا اہتمام کر کے بھارت کو چاروں شانے چت کر دیا۔ انہوں نے بھارتی اور بین الاقوامی پریس کو باور کروایا کہ جب تک مسئلہ کشمیر حل نہیں ہوتا، بھارت اور پاکستان کے درمیان کسی اور مسئلے پر بات چیت کا کوئی فائدہ نہیں اور نہ صرف یہ کہا بلکہ اسے ثابت کر کے ساری دنیا کو اس بارے میں قائل بھی کیا۔

ان مذاکرات کا انجام بھی ماضی سے مختلف نہیں تھا۔ عین آخری مراحل پر مشترکہ اعلامیہ بھارت کی انتہا پسند قیادت نے واجپائی پر دباؤ ڈال کر مسترد کروا دیا، لیکن ساری دنیا کو یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ بھارت بہت کمزور وکٹ پر کھیل رہا ہے اور ان مذاکرات کو بھارت کی ناکامی اور پاکستان کی کامیابی کہا گیا، جس کے بعد سے دونوں ممالک کے درمیان بحث ومباحثہ اور الزامات کا سلسلہ جاری تھا کہ 11 ستمبر کا واقعہ ہو گیا۔ جس نے ساری دنیا کی سیاست کا رخ پلٹ دیا۔ ورلڈ ٹریڈ سینٹر اور پنٹاگان پر دہشت گردوں کے حملوں سے گویا بھارت کے لیے تو بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ ان حملوں میں ہزاروں بے گناہ افراد لقمہ اجل بنے۔ امریکہ بلکہ دنیا بھر کا مالیاتی نظام درہم برہم ہو گیا۔ بھارت نے ان حملوں کا تعلق پاکستانی آئی ایس آئی، طالبان اور مجاہدین تنظیموں سے جوڑنے کی ہر ممکن کوشش کی اور امریکہ کو گمراہ کرنے کے لیے ہر ممکن طریقہ اختیار کر کے اسے بڑھ چڑھ کر مکمل تعاون کی پیشکش کر دی۔ اس مرحلے پر جب نیویارک میں واجپائی اور مشرف ملاقات اور اس کے ممکنہ نتائج زیر بحث آ رہے تھے، اچانک حالات نے پلٹا کھایا۔ جنرل مشرف نے نیویارک کا دورہ ملتوی کر دیا۔ عالمی منظر نامہ تیزی سے بدل رہا تھا۔ امریکہ دہشت گردی کے خلاف عالمی اتحاد بنا رہا تھا اور فرنٹ لائن اسٹیٹ کی حیثیت سے اس نے پاکستان کے سامنے دو آپشن رکھے تھے۔ امریکہ سے تعاون کرتے ہوئے طالبان اور القاعدہ کے خلاف عالمی اتحاد میں شمولیت یا پھر پتھر کے دور میں واپسی۔ پاکستانی قیادت نے اس مرحلے پر جذبات کے بجائے سیاسی

Marfat.com

بصیرت کا مظاہرہ کیا اور پہلا آپشن قبول کر لیا۔ گو کہ صدر مشرف کے قوم سے خطاب کے بعد پاکستانیوں کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آ گئی تھی کہ بادلِ ناخواستہ ہی سہی، ہمارے پاس اور کوئی چارہ کار نہیں تھا اور عوام نے اس پر صاد بھی کیا۔ البتہ مذہبی اور جہادی حلقوں نے اس کی مخالفت کی۔ پاکستان نے اس مرحلے پر ہر ممکن طریقے سے امریکہ کا ساتھ دیا اور اچانک پاکستان دنیا بھر کی نظروں میں خصوصی اہمیت اختیار کر گیا۔ امریکہ کو ہوائی اڈے، فضائی راستہ اور انٹیلی جنس کی سہولتوں کا اعلان کر کے پاکستان نے اپنی دانست میں ایک بڑا جوا کھیلا تھا، لیکن بھرپور معاونت کے باوجود ہم اس خارجہ پالیسی کے متوقع فوائد سے محروم رہے ہیں، بلکہ اس کے نتیجے میں ہماری دفاعی صلاحیت متاثر ہوئی اور ہم اسٹریٹجک Depth سے بھی محروم ہو گئے۔

7 اکتوبر کو افغانستان پر بمباری کے آغاز پر صدر مشرف نے امریکی فضائی حملے کو Short & Targete کہا۔ 14 اکتوبر کو امریکی صدر نے اس کی تردید کر دی۔ 27 اکتوبر کو اے بی سی کو دیے گئے اپنے انٹرویو میں صدر جنرل مشرف نے اعتراف کیا کہ انہیں امریکہ نے تفصیلات نہیں بتائیں اور مکمل اعتماد میں نہیں لیا۔ اسی طرح 17 اکتوبر کو جنرل کولن پاول کے ساتھ پریس بریفنگ میں جنرل مشرف نے موڈریٹ طالبان کو وسیع البنیاد حکومت میں حصہ دینے کی بات کی، لیکن کولن پاول نے 19 اکتوبر کو واشنگٹن پہنچتے ہی فارن ریلیشنز کمیٹی کے سامنے اس بات سے انکار کر دیا۔ 20 اکتوبر کو رمزفیلڈ نے شدت سے طالبات کی شمولیت کی مخالفت کی اور 22 اکتوبر کو صدر بش کے بیان نے اس پر مہر لگا دی۔ اسی طرح 10 نومبر کو جنرل اسمبلی سے خطاب اور پھر صدر بش کے ساتھ پریس بریفنگ کے دوران جب جنرل مشرف نے کہا کہ شمالی اتحاد کابل میں داخل نہیں ہوگا تو صدر بش نے اس کی بھرپور تائید کی، لیکن اگلے ہی روز شمالی اتحاد کی فوجیں کابل میں گھس گئیں۔ جب جنرل مشرف نے رمضان میں بمباری نہ کرنے کے لیے کہا تو ٹونی بلیئر اور صدر بش دونوں نے اس سے انکار کر دیا۔ بی بی سی نے اس مرحلے پر بڑا خوبصورت لفظ Rebuff استعمال کیا تھا۔ شمالی اتحاد کی طرف سے پاکستان کے خلاف مسلسل ہرزہ سرائی، قندوز اور مزار شریف میں پاکستانی طالبان کا قتلِ عام سامنے کی بات ہے۔ 14 نومبر کو وزیر خارجہ عبدالستار نے اس پر سخت احتجاج بھی کیا، لیکن امریکہ نے قطعاً اس کا نوٹس نہیں لیا بلکہ رمزفیلڈ نے صاف الفاظ میں کہا کہ ہتھیار ڈالنے والے اسی سلوک کے مستحق تھے۔ 20 نومبر کو امریکہ نے طالبان کا سفارت خانہ بند کرنے کا حکم دیا تو ہم نے اپنے پرانے مؤقف سے یکسر انحراف کرتے ہوئے 22 نومبر کو اس حکم کی تعمیل کر دی۔

جہاں تک معاشی بحالی کا تعلق ہے تو ابھی تک ہمیں وعدے زیادہ اور عملی اقدامات کم دیکھنے کو مل رہے ہیں۔ نئے وزیر داخلہ یونس قانونی بھارتی ہم منصب کی گود میں بیٹھ کر پاکستان کے خلاف لاف زنی کر رہے ہیں۔ وزیرِ خارجہ عبداللہ پاکستان پر ایٹم بم پھینکنے کے لیے کہتے ہیں۔ طالبان ہمارے سلوک پر شاکی ہیں۔ ''دہشت گردوں'' کے خاتمے کی عالمی مہم کا سلسلہ مقبوضہ کشمیر تک بڑھانے کی باتیں کی جا رہی ہیں اور بون معاہدے کے نتیجے میں قائم ہونے والی حکومت میں سوائے حامد کرزئی کے کسی نے پاکستان کے لیے کلمۂ خیر نہیں کہا۔ ان حالات میں اس مسئلے پر ہماری خارجہ پالیسی کو کم از کم کامیاب خارجہ پالیسی نہیں کہا جا سکتا۔ مستقبل کے اندیشہ ہائے دور دراز نے ابھی سے ساری قوم کو پریشانی میں مبتلا کر دیا ہے۔ امریکی مداخلت پاکستانی معاملات میں ضرورت سے زیادہ ہونے لگی ہے۔ گردشِ حالات نے آج ہماری خارجہ

Marfat.com

پالیسی کے لیے بڑا چیلنج کھڑا کر دیا ہے اور اب سوال کیا جا رہا ہے کہ کیا ہم اپنا روایتی اسلامی تشخص برقرار رکھتے ہوئے خارجہ پالیسی کو درپیش جدید چیلنجوں کا مقابلہ کر پائیں گے یا نہیں؟

(روزنامہ جنگ سنڈے ایڈیشن 6 جنوری 2002ء مصنف طارق اسمٰعیل ساگر)

2001ء کے آخری ہفتوں میں پورا برصغیر ایک ایسا بم بن گیا، جو کسی بھی لمحے پھٹ سکتا تھا دو روایتی حریفوں پاکستان اور بھارت کی مسلح افواج ایسی پوزیشن پر آ گئیں جو گزشتہ 30 برسوں کے دوران دیکھنے میں نہیں آئی تھیں۔ بھارت اپنے فوجی دستوں اور ٹینکوں کو حملے کی پوزیشن میں لے آیا۔ مزید برآں اس نے بحیرہ عرب میں جنگی جہاز متعین کر دیئے اور درمیانے فاصلے تک مار کرنے والے میزائل پاکستانی سرحد کے نزدیک نصب کر دیئے۔ واضح رہے کہ یہ میزائل ایٹم بم کے جانے کی بھی صلاحیت رکھتے تھے۔ یہ تمام اقدامات بھارت کے جارحانہ عزائم کے آئینہ دار تھے علاوہ ازیں بھارتی حکومت کے کارپردازوں نے ملک کے طول و عرض میں جنگی جنون کو ہوا دینے کیلئے ایک منصوبے کی خوب تشہیر کی، جس میں آگرہ کے تاج محل کو فضائی حملوں سے محفوظ رکھنے کیلئے اس کو چھپانے (کیموفلاج) کے لیے اقدامات تجویز کیے گئے تھے۔ بعض رپورٹوں کے مطابق پاکستان نے بھی افغانستان سے ملحق سرحد پر متعین اپنے فوجی دستے اور بھاری اسلحہ انتہائی خاموشی کے ساتھ بھارت سے ملنے والی اپنی سرحد پر منتقل کر دیا۔ افغانستان پر امریکی حملے کے بعد القاعدہ کے ارکان اور طالبان کے پاکستان میں ممکنہ داخلے کو روکنے کیلئے پاکستانی فوجی دستے افغانستان سے ملحق سرحد پر متعین کیے گئے تھے۔ دونوں ممالک اعلان بھی کر چکے تھے کہ وہ جنگ کیلئے تیار ہیں، اگر خدانخواستہ جنگ چھڑ گئی تو ان دونوں ملکوں کے درمیان نصف صدی میں چوتھی بڑی جنگ ہوگی لیکن زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ایٹمی طاقتیں بننے کے بعد ان کے مابین یہ پہلی جنگ ہوتی۔

کشیدگی کے دوران اب تک دونوں طرف سے جو عندیے دیئے گئے ان سے تو یہی ظاہر ہوتا کہ دونوں ممالک، ممکنہ جنگ میں ایٹمی ہتھیاروں کو استعمال کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ بھارتی وزیر دفاع جارج فرنانڈس کا کہنا تھا کہ کوئی بھی ملک ایٹمی ہتھیار استعمال نہیں کریں گے تاہم امریکی محکمہ دفاع کے ذرائع موجودہ صورتحال سے مطمئن نظر نہیں آتے تو ان کا کہنا تھا کہ جب جنگ چھڑتی ہے تو سب کچھ آپ کے اندازوں کے عین مطابق ہونا ضروری نہیں۔ آپ نہیں جانتے کہ اگر ایک بار لڑائی چھڑی تو پھر وہ کہاں جا کر رکے گی۔ لڑائی کا کوئی یقینی انجام نہیں ہوتا۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان کشیدگی کی یہ لہر 13 دسمبر 2001ء کو نئی دہلی میں بھارتی پارلیمنٹ پر کیے جانے والے حملے کے نتیجے میں آئی، جس کے بارے میں بھارتی حکومت کا یہ دعویٰ تھا کہ یہ حملہ کشمیری علیحدگی پسندوں نے کیا جنہیں پاکستان کی مدد حاصل تھی۔ پارلیمنٹ پر حملے کے بعد بھارتی قیادت نے ویسا ہی ردعمل دینے کی کوشش کی، جیسا کہ 11 ستمبر کے حملوں کے بعد امریکی حکومت نے دیا تھا۔ بھارتی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی نے اس حملے کو 11 ستمبر کو امریکہ میں کیے جانے والے دہشت گردانہ حملوں سے مماثل قرار دیا۔ انہوں نے اس حملے کا ذمہ دار بھی حسب روایت پاکستان کو قرار دیا اور دھمکی دی کہ اگر صدر پرویز مشرف نے کشمیری علیحدگی پسندوں کے خلاف ٹھوس کارروائی نہ کی تو پھر جنگ ہوگی۔ کھٹمنڈو میں سارک سربراہ کانفرنس کے دوران اگرچہ جنرل پرویز مشرف اور وزیراعظم واجپائی کے درمیان مختصر

Marfat.com

ملاقات ہوئی اور صدر پرویز نے سخت کشیدہ ماحول میں واجپائی سے دوستانہ انداز میں مصافحہ کرنے میں پہل کر کے یہ پیغام دینے کی کوشش کی کہ وہ جنگ نہیں بلکہ امن کے خواہاں ہیں لیکن اس کے باوجود دونوں ملکوں کے درمیان موجود سخت کشیدگی بدستور موجود رہی بلکہ اس میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ صدر پرویز مشرف کا کہنا تھا کہ دنیا کو دہشت گردوں اور حریت پسندوں کے درمیان تمیز کرنی چاہئے جبکہ واجپائی کا کہنا تھا کہ بھارت صرف اسی صورت میں دوستی کیلئے پاکستان کا ہاتھ تھامے گا کہ وہ دہشت گردوں (بقول ان کے) کی پشت پناہی ترک کر دے۔

بھارتی مبصرین اور رہنماؤں کی بھرپور کوشش تھی کہ وہ 11 ستمبر اور 13 ستمبر کے واقعات کو ایک ہی سکے کے دو رخ ثابت کر سکیں۔ بھارتی قیادت ماضی میں بھی پاکستان پر دہشت گردی کی حمایت کے الزامات عائد کرتی رہی ہے لیکن اس سے پہلے عالمی سطح پر اسے کبھی بھی اس سلسلے میں بہت زیادہ پذیرائی حاصل نہیں ہو سکی۔ اب بھارتی حکومت 11 ستمبر کے واقعات کے بعد بین الاقوامی سطح پر دہشت گردی کے خلاف قائم ہونے والی فضا کا بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی تا کہ 13 دسمبر کو پارلیمنٹ پر کیے جانے والے حملے کو کیش کرایا جا سکے۔ بھارتی وزیر دفاع جارج فرنانڈس کا کہنا کہ 11 ستمبر کے واقعات کے بعد دنیا بدل چکی ہے۔ ان واقعات کے بعد امریکہ کو اندازہ ہو گیا ہے کہ گنتی کے چند دہشت گرد بھی کس قدر بڑا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

بعض مبصرین کا خیال ہے کہ امریکہ صدر پرویز مشرف پر اندرونی طور پر دباؤ ڈال رہا تھا کہ وہ کشمیر کی بھارت سے علیحدگی کیلئے جدوجہد کرنے والی تنظیموں کو قابو سے باہر نہ ہونے دیں، اس کے نتیجے میں پاکستانی حکومت نے بعض اقدامات بھی کیے۔ جہادی تنظیموں کے تقریباً 100 نمایاں کارکنوں کو گرفتار کر لیا گیا اور بھارت سے برسرپیکار 2 سرکردہ تنظیموں جیش محمد اور لشکر طیبہ کے سربراہوں مولانا مسعود اظہر اور حافظ محمد سعید کو بھی نظر بند کر دیا تاہم اب تک یہ واضح نہیں ہو سکا تھا کہ جنرل پرویز مشرف کے یہ اقدامات بھارتی حکومت کا دل جیتنے کیلئے کافی ثابت ہوں گے یا نہیں۔

دوسری جانب امریکہ پاک بھارت کشیدگی کو جنگ میں تبدیل ہونے سے روکنے کیلئے کوشش کر رہا تھا۔ امریکہ نہیں چاہتا کہ ایک ایسے وقت پر جبکہ وہ افغانستان میں اپنی فوجی مہم کے آخری مراحل میں ہے اور وہ اب اپنی فوجی کارروائیوں کے ثمرات سمیٹ رہا ہے، اس علاقے میں ایک نئی جنگ چھڑ جائے۔ امریکی مبصرین کا خیال تھا کہ پاک بھارت جنگ چھڑ جانے کی صورت میں ایک طرف تو پاکستان افغانستان کے خلاف امریکی مہم سے دور ہو جائے گا اور ایسا ہونا امریکہ کی افغان حکمت عملی کیلئے کسی بھی طور پر معاون ثابت نہیں ہوگا، علاوہ ازیں جنگ جنرل پرویز مشرف کے اقتدار کیلئے بھی خطرناک ثابت ہو سکتی تھی جو کہ امریکہ کیلئے اب تک ایک انتہائی اہم اتحادی ثابت ہوئے تھے۔

11 ستمبر 2001ء کے بعد امریکہ نے دہشت گردوں کے خلاف جو عالمی مہم شروع کی تھی اس کے سبب برصغیر پاک و ہند میں نئی محاذ آرائی شروع ہو گئی۔ امریکن جانتے تھے کہ پاک بھارت جنگ کی صورت میں دہشت گردوں کے خلاف امریکہ کی صورت کو خاصا دھچکا لگ سکتا تھا۔ 1998ء میں پاکستان نے جب ایٹمی دھماکے کیے تو اس وقت سے پہلے ہی امریکہ کا رویہ سرد مہری کا ہو گیا تھا، بالخصوص 1999ء میں جنرل پرویز مشرف کے برسراقتدار آنے کے بعد امریکی انتظامیہ نے پاکستان کے ساتھ خاصا فاصلہ قائم کر لیا تھا لیکن 11 ستمبر 2001ء کے واقعات کے نتیجے میں جب امریکہ نے

Marfat.com

افغانستان میں ''القاعدہ''، تنظیم اور طالبان کے خلاف کارروائی شروع کی تو اپنے محل وقوع کے باعث پاکستان ایک مرتبہ پھر اس کے لئے انتہائی اہم حیثیت اختیار کر گیا۔ دہشت گردی کے خلاف شروع ہونے والی بین الاقوامی مہم میں جب پاکستان امریکہ اور اس کے دیگر اتحادیوں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملائے کھڑا تھا۔ بھارت کی پاکستان کو سفارتی مہم پر تنہا کرنے کی کوششیں ناکام ہو گئیں امریکہ نے بھارتی خواہشات کے علی الرغم پاکستان کو 60 کروڑ ڈالر کی فوری امداد کا اعلان کر دیا۔

اب بھارت کی حالت تململائے ہوئے سانپ جیسی ہو رہی تھی۔ ان حالات میں جنوری کے پہلے مہینے میں کھٹمنڈو نیپال میں سارک کانفرنس منعقد ہوئی۔ بھارتی انٹیلی جنس ایجنسی ''را'' نے یہاں پاکستان کے خلاف ایک گھناؤنی سازش پہلے سے تیار کی ہوئی تھی اور کانفرنس کے آغاز سے دو روز پہلے اس پر عمل شروع کر دیا۔ تفصیلات کے مطابق 3 جنوری کو نیپالی پولیس نے پاکستان کے ایک سفارتکار سراج احمد کو جعلی بھارتی کرنسی کے ساتھ گرفتار کر لیا گرفتاری ان کی رہائش گاہ پر ہوئی اور اس کی خبر سب سے پہلے ایک مخصوص بھارتی چینل کو ملی جس نے گرفتاری کے سمیت پندرہ منٹ بعد کیمرہ سراج احمد کے گھر کے سامنے لگا کر ساری دنیا میں ہنگامہ برپا کر دیا کہ پاکستانی سفارتکار سے جعلی بھارتی کرنسی برآمد ہوئی ہے۔ سازش کی سمجھ آنے پر نیپالی پولیس نے 4 جنوری کو سارک کانفرنس شروع ہونے سے ایک روز پہلے ''را'' کی کارروائی کی حقیقت کھلنے کے بعد نیپالی حکومت نے پاکستان سے سرکاری طور پر معافی مانگ لی۔ تفصیلات کے مطابق نیپالی پولیس کے اہلکاروں نے جمعرات کے روز پاکستانی سفارتخانے کے اہلکار سراج احمد کو دن ساڑھے بارہ بجے اس وقت گرفتار کر لیا جب وہ گھر جا رہے تھے۔ سراج احمد کو تھانہ لالت پور لے جایا گیا اور سفارتخانے رابطہ کرنے کی بھی اجازت نہیں دی گئی۔ تھانہ میں تلاشی کے علاوہ شدید تشدد بھی کیا گیا۔ کچھ برآمد نہ ہونے پر نیپالی پولیس نے الزام لگایا کہ سراج احمد جعلی کرنسی کے کاروبار میں ملوث ہیں اور ان سے 92 سو امریکی ڈالر اور ایک ہزار ڈالر کے قریب بھارتی کرنسی برآمد ہوئی جو پانچ سو کے نوٹوں پر مشتمل تھی، تاہم پاکستانی اہلکار نے اس بارے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ ایک پولیس اہلکار نے اپنے پاس نوٹ دکھاتے ہوئے کہا کہ وہ تسلیم کرے کہ یہ نوٹ اس کے پاس سے برآمد ہوئے ہیں۔ بعد ازاں سراج کو سفارتخانے رابطہ کرنے کی اجازت دیئے بغیر 25 باوردی اور 5 سادہ کپڑوں میں ملبوس کھٹمنڈو پولیس کے اہلکاروں نے بھارتی ایجنٹوں کے ہمراہ سراج احمد کے گھر چھاپہ بھی مارا جس پر ان کی اہلیہ نے دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا اور پاکستانی سفارتخانے میں رابطہ کر کے پاکستانی سفیر فوزیہ نسرین کے پرائیویٹ اسسٹنٹ کو صورتحال سے آگاہ کیا۔ پاکستانی اہلکار فوراً موقع پر پہنچ گئے۔ اس دوران پولیس اہلکاروں نے دروازہ کھولنے کی اجازت نہ ملنے پر بندوقوں کے بٹ مار کر توڑنے کی کوشش کی جنہیں پاکستانی سفارتخانے کے اہلکاروں نے ایسا کرنے سے روکا۔ بھارتی ایجنٹ اور بھارتی میڈیا کے ارکان بھی پولیس کے ساتھ تھے۔ اس دوران پولیس اور پاکستانی اہلکاروں میں جھڑپ ہو گئی۔ پاکستانی سفارتخانے کے اہلکاروں نے انہیں مطلع کیا کہ سراج احمد سفارتخانے کا باقاعدہ ملازم ہے اور سفارتی قوانین کے تحت وہ اسے گرفتار نہیں کر سکتے اور نہ ہی اس کے گھر میں داخل ہو سکتے ہیں۔ نیپالی پولیس کے اہلکاروں اور پاکستانی سفارت کاروں کے درمیان ہاتھا پائی کے دوران سڑک پر ٹریفک بلاک ہو گئی۔ پولیس اہلکاروں نے پاکستانی سفارتخانے کے اہلکاروں کی گاڑیوں کو دھکیل کر سڑک سے اتارا اور گاڑیوں میں بیٹھ کر دوبارہ تھانے روانہ ہو گئے۔ اس دوران سراج احمد کو ایک وین میں بٹھائے رکھا گیا جہاں سے سراج

Marfat.com

احمد نے چیخ چیخ کر اپنے سفارت کاروں کو آگاہ کیا کہ اس کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ اس نے کوئی جرم نہیں کیا۔ پولیس اہلکار اسے جعلی کرنسی کے کاروبار میں ملوث ہونے کا اعتراف کرانا چاہتے ہیں۔ اس دوران بھارتی ایجنٹ اور بھارتی میڈیا کی ٹیمیں اس واقعہ کی فلم بناتی رہیں۔ نیپال کی حکومت نے اپنی تحریری معافی میں واقعہ پر معذرت کرتے ہوئے کہا کہ شناخت کی غلطی کی وجہ سے سراج احمد کو گرفتار کیا گا تھا اس واقعہ پر نیپال کی حکومت کو سخت افسوس ہے۔ پولیس اور سفارت کاروں کے درمیان ہاتھا پائی میں چند سفارتکار زخمی بھی ہوئے۔ پاکستانی سفیر فوزیہ نسرین نے انسپکٹر جنرل سے فون پر بات کی اور رہائی کا مطالبہ کیا۔ آئی جی نے مختلف کہانی سنائی اور کہا کہ سراج احمد کا کسی اور جگہ سے پیچھا کیا جاتا رہا۔ بعد میں آئی جی نے سفیر سے کہا کہ سفارتخانے کے کسی اہلکار کو بھیج دیں آ کر سراج کو لے جائے۔ پاکستانی اہلکاروں نے رہائی کیلئے کاغذات پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ سراج کو بغیر دستخط کرائے رہا کیا جائے۔ بعد میں رات کے 12:30 بجے سراج کو رہا کر دیا۔ پولیس سٹیشن میں رہنے کے دوران سراج کی جعلی کرنسی سامنے رکھ کر تصاویر بنائی گئیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بھارتی میڈیا کے کئی کیمرہ ٹیمیں پاکستانی اہلکار کے گھر پر پولیس کے چھاپے کی کوشش کے وقت وہاں پہنچ گئی تھیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بھارتی میڈیا کے لوگوں کو کیسے معلوم ہوا کہ پاکستانی اہلکار کے گھر پولیس چھاپہ مار رہی ہے۔ یہ پہلا موقع نہیں کہ پاکستانی سفارت کار اہلکاروں کو اس طرح کی صورتحال کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ پاکستانی ترجمان نے اس واقعہ پر شدید تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ نیپال نے بھارتی کی ایما پر پاکستانی سفارتی اہلکار کو گرفتار کر کے سارک سربراہ کانفرنس کو ناکام بنانے کی کوشش کی ہے۔ کھٹمنڈو میں پاکستانی سفارت خانے کے ایک پاکستانی نمائندے نے بتایا کہ نیپال کے بھارت کے ساتھ قریبی، کلچرل اور سیاسی تعلقات ہیں اسی وجہ سے نیپال نے جھوٹے الزامات پر جعلی کرنسی رکھنے کے الزام میں پاکستانی اہلکار کے خلاف فوراً کارروائی کی اور اسے گرفتار کر لیا۔ پاکستانی ترجمان نے بتایا کہ جو 4 نیپالی پولیس اہلکار پاکستانی کو گرفتار کرنے آئے ان کے ساتھ ایک بھارتی ایجنٹ بھی تھا جو اس وقت تک اس منظر کی فلم بناتا رہا جب تک نیپالی افسران نے اسے منع نہ کیا۔ پاکستانی ترجمان نے بتایا 42 سالہ پاکستانی جو کہ بھارت خانے میں کلرک کے عہدے پر کام کرتا ہے اس کو حراست میں لیا گیا ہے۔ جب ایک پاکستانی اہلکار اس سے متعلق بات چیت کرنے پولیس سٹیشن پہنچا تو اسے بھی چہرے پر زخم آیا ہے۔ ترجمان نے بتایا کہ پاکستان نے نیپالی حکومت سے اس واقعہ پر سخت احتجاج کیا تھا۔

(روزنامہ خبریں۔ 5 جنوری 2002ء)

نیوز چینل کے عملے سے جب پاکستانی صحافیوں کا آمنا سامنا ہوا، تو ان سے پوچھا گیا کہ آپ کی ٹیم کو اتنی جلدی خبر کیسے مل گئی کہ سراج احمد کی گرفتاری کے چند منٹ بعد آپ ان کے گھر کے سامنے موجود تھے۔ نیوز چینل کے عملے نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے ٹی وی کیمرہ ٹیم کو پہلے سے اطلاع مل چکی تھی اور انہیں بتا دیا گیا تھا کہ فلاں جگہ پر سراج احمد کا گھر ہے جہاں آپ کو فلم بنانی ہے۔ یہ ٹی وی چینل مسلسل اپنی خبروں میں سراج احمد کی گرفتاری کی خبر دیتا رہا اور مسلسل پاکستان کے خلاف زہر اگلتا رہا۔ البتہ جب نیپال کی حکومت کی طرف سے پاکستانی سفارت خانے سے معافی مانگی گئی تو ٹی وی چینل نے صرف اتنی خبر دی کہ سراج احمد کو رہا کر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ پولیس کے اہلکاروں نے دوران حراست سراج احمد کی زبردستی تصاویر بھی بنائیں۔ اسے یہ بتایا گیا کہ اس کی تصاویر

Marfat.com

ریکارڈ کیلئے ہیں، لیکن جب کیمرہ چلانے کا وقت آیا تو فوراً اس کے سامنے ایک میز لا کر رکھی گئی جس پر جعلی بھارتی کرنسی موجود تھی۔ جب اسے رہا کیا گیا تو پولیس نے کہا کہ نہ تو اس نے کوئی تصاویر بنائی ہیں اور نہ ہی اس کے پاس سراج کی تصویر موجود ہے۔ مزید پوچھنے پر اس نے کہا کہ اگر سراج کی کوئی تصاویر بنی ہیں تو وہ سکیورٹی ایجنسی کے پاس ہوں گی۔ مقامی صحافیوں سے جب اس ساری صورتحال پر بات کی گئی تو انہوں نے اپنا نام ظاہر نہ کرنے کی شرط پر بتایا کہ سراج احمد کی گرفتاری کی خبر پولیس کے اپنے آدمیوں کے بعض مقامی اخبارات کو دی۔ صحافیوں کی رائے یہ تھی کہ اس خبر کو ایسے اخبارات تک پہنچایا گیا جو اپنی بھارت نواز پالیسی کیلئے مشہور ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سارا ڈرامہ بھارت کی کسی ایجنسی نے رچایا تا کہ پاکستان کو بدنام کیا جا سکے۔ مقامی صحافیوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ بھارت کی خفیہ ایجنسی ''را'' نے نیپال میں پاکستان کو بدنام کرنے کیلئے یہ سارا کھیل رچایا۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اس واقعہ بارے پاکستان کی سفیر نے بھارت کے محکمہ خارجہ اور داخلہ کے علاوہ براہ راست نیپال کے وزیراعظم کو بھی تحریری شکایت بھیجی۔ اس کے بعد پاکستان اور نیپال کے وزراء کی آپس میں بات بھی ہوئی اور یہ خبر چین میں جنرل مشرف کو پہنچائی گئی۔ جب نیپال کی حکومت نے دیکھا کہ یہ واقعہ خود سربراہ کانفرنس کے کاز کو نقصان پہنچا رہا ہے تو انہوں نے فوراً سراج کے واقعہ بارے معذرت کر لی اور یہ کہا کہ یہ غلط فہمی کی وجہ سے ہوا ہے۔ (روزنامہ جنگ لاہور 5 جنوری 2002ء)

بھارتی حکومت کی طرف سے جنوری کے پہلے ہفتے میں منعقد ہونے والی سارک کانفرنس میں شرکت کی تصدیق نہیں کی گئی تھی اور جب تک تصدیق نہ ہوئی کانفرنس منعقد نہیں ہو سکتی تھی صدر جنرل مشرف ان دنوں چین کے سرکاری دورے پر تھے جب بھارتی حکومت نے اچانک شمولیت پر آمادگی ظاہر کی اور نیپالی حکومت کو آمادگی کی اطلاع صرف دو دن پہلے دی۔ مقصد یہی تھا کہ صدر جنرل پرویز مشرف کی کانفرنس میں شمولیت کو مشکوک یا ناممکن بنا دیا جائے لیکن پاکستانی حکومت نے بھارتی چالوں سے خبردار ہونے کے بعد طیش میں آ کر معاملات بگاڑنے کے بجائے بھارتی انٹیلی جنس کی سازشوں کو ناکام کرنے کی ٹھان لی تھی۔ یہ بات بھی انتہائی واضح تھی کہ بھارت کی ایجنسیاں اس ملاقات کو رکوانے کیلئے اپنی پوری کوشش کر رہی تھیں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ اس خبر نے نیپال میں پاکستان کے امیج کو بری طرح متاثر کیا۔ بھارتی ٹی وی میڈیا نے فوراً اپنی نشریات میں اس واقعہ بارے خبر کو اپنے بلیٹن میں نشر کرنا شروع کر دیا لیکن جب یہ خبر آئی کہ نیپال کی حکومت نے تحریری معافی مانگ لی ہے تو ٹی وی چینل نے صرف ایک جملے کی خبر دی اور بعد میں اس سارے واقعے کو مکمل طور پر بلیک آؤٹ کر دیا۔ ظاہر ہے کہ یہ سارا کھیل بھارتی ایجنسی کے کہنے پر سٹیج کیا گیا۔

جب یہ سب ہو چکا تو بھارتی میڈیا نے صبح 11 بجے کے بعد یہ کہنا شروع کر دیا کہ مشرف کھٹمنڈو نہیں آ رہے۔ تقریباً دوپہر بارہ بجے تک یہ کنفرم ہو گیا کہ مشرف کا جہاز چین سے روانہ ہو چکا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ صبح بیجنگ سے جہاز لیٹ چلا تھا۔ پھر شیڈول کے مطابق شین ڈونگ نامی شہر سے چائنا ساؤتھ ویسٹ ایئرلائن کے جہاز کے ذریعے انہیں کھٹمنڈو آنا تھا۔ بدقسمتی سے شین ڈونگ میں موسم خراب تھا۔ صدر مشرف کا طیارہ ایک دوسرے شہر لے جایا گیا، پھر چائنا ساؤتھ ویسٹ ایئرلائن کا طیارہ وہاں آیا اور تقریباً دو گھنٹے کی تاخیر سے صدر مشرف کھٹمنڈو کیلئے روانہ ہوئے۔ اسی تاخیر کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایجنسیوں نے اپنا کام دکھایا۔ سربراہ کانفرنس کے منتظمین نے یہ فیصلہ کیا کہ کیونکہ آٹھ بجے نیپال کے بادشاہ کی طرف سے

Marfat.com

سربراہوں کے اعزاز میں کھانا ہے، اس واسطے افتتاحی اجلاس کو ملتوی کر دیا جائے۔ اس پر پاکستانی وفد نے نیپال کو بتانے کی کوشش کی کہ جنرل مشرف صرف دو گھنٹے لیٹ ہیں اور مقامی وقت کے مطابق 3 بجے پہنچ جائیں گے۔ دوسری طرف سربراہ کانفرنس کا افتتاحی اجلاس شیڈول کے مطابق ساڑھے چار بجے ہونا تھا۔ اس طرح جنرل مشرف کے پاس کانفرنس میں شامل ہونے کیلئے کافی وقت تھا لیکن نیپال کے منتظمین نے خواہ مخواہ 4 جنوری کا دن ضائع کر دیا۔ اس طرح 5 جنوری کو ہونے والے غیر رسمی اجلاس کا دن ختم کر دیا گیا۔ یہ فیصلہ دوپہر 1 بجے مشتہر کیا گیا۔ تب تک یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ جنرل مشرف کانفرنس شروع ہونے سے قبل پہنچ جائیں گے لیکن کسی پراسرار وجہ سے افتتاحی اجلاس ملتوی کر دیا گیا۔

سربراہ کانفرنس کا افتتاحی اجلاس ملتوی ہونے کی ظاہری وجوہات تو وہ تھیں جو کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں لیکن اس ساری بات کے پیچھے ایک انتہائی سوچا سمجھا منصوبہ نظر آتا تھا۔

آگرہ مذاکرات کے نتیجے میں بھارتی حکام کو ایک بات بالکل واضح طور پر سمجھ میں آ چکی تھی، وہ یہ کہ پاکستان کشمیر اور دیگر تنازعات کو دور کرنے کیلئے مذاکرات کا راستہ اپنانے کی انتہائی واضح اور مضبوط پالیسی پر سختی سے کاربند ہے۔ دوسری طرف جنرل مشرف کے کھلے دماغ سے بات کرنے کا یہ نتیجہ نکلا کہ تمام علاقائی میڈیا میں بھارت کے مقابلے میں پاکستان اور جنرل مشرف کا نقطہ نظر زیادہ واضح طریقہ سے پہنچا۔ اس بنا پر بھارتی حکام کسی بھی قیمت پر یہ نہیں چاہتے کہ جنرل مشرف اور واجپائی کی ملاقات ہو سکے۔ ان کے نزدیک ایسی ملاقات اول تو واجپائی کی کمزور شخصیت مزید ایکسپوز کرے گی۔ دوئم یہ کہ پاکستان کا واضح مؤقف بھارت کے مؤقف کے مقابلے میں پوری دنیا کو نظر آئے گا۔ اس بنا پر بھارتی ایجنسیاں ہر قیمت پر مشرف، واجپائی ملاقات کو رکوانے یا ملتوی کرانے کی کوشش میں لگی ہوئی تھیں۔

ایک اور اہم پس منظر یہ ہو سکتا تھا کہ فروری کے وسط میں بھارت کے صوبے یوپی (اترپردیش) میں صوبائی اسمبلی کے الیکشن تھے۔ ان الیکشنوں کیلئے حکمران جماعت بی جے پی کی پوزیشن انتہائی کمزور تھی۔ بی جے پی اور اس کی حلیف جماعتوں کے مقابلے میں کانگریس اور اس کی حلیف جماعتوں کے امیدوار کہیں زیادہ مضبوط ہیں۔ اس وجہ سے بی جے پی حکومت نے را اور باقی ایجنسیوں کی مدد سے پہلے تو اپنی پارلیمنٹ پر حملے کا ڈرامہ کیا پھر اس حملے کو آڑ بنا کر پاکستان کی سرحدوں پر اپنی فوجیں جمع کر لیں۔ اس کشیدگی کی وجہ سے بھارت کے عام شہری وقتی طور پر اپنی حکومت کی حمایت کر رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ اگر پاک بھارت کشیدگی الیکشن سے قبل کم ہو گئی تو بی جے پی کا بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا۔

یہ ہیں وہ وجوہات جن کی بنا پر بھارتی ایجنسیوں خصوصاً را نے پوری سارک سربراہ کانفرنس کو سبوتاژ کیا تا کہ دونوں سربراہوں کے درمیان ون ٹو ون ملاقات کا دن ہر قیمت پر ختم کرایا جائے۔ اس مقصد کے حصول کیلئے پہلے تو سراج احمد سراج پر ایک گھٹیا الزام لگا کر پاکستان کے وفد اور حکومت کو طیش دلانے کی کوشش کی گئی تا کہ پاکستان حکومت احتجاج کرتے ہوئے کانفرنس میں شامل ہونے سے انکار کر دے۔ جب منصوبہ سازوں کو پتا چلا کہ پاکستان کی حکومت اور وفد کے ارکان طیش میں آ کر اس طرح کا قدم نہیں اٹھا رہے ہے بلکہ بڑے ٹھنڈے دل اور دماغ سے کام لے رہے ہیں تو پھر جنرل مشرف کی آمد میں تاخیر کا جھوٹا بہانہ گھڑا گیا۔ اس طرح نیپالی حکومت پر دباؤ ڈال کر افتتاحی اجلاس ملتوی کروا دیا گیا۔

البتہ اس ساری صورتحال کے باوجود جنرل مشرف اور ان کے وفد کے ارکان بددل نہیں ہوئے۔ تبدیل شدہ

Marfat.com

شیڈول کے مطابق افتتاحی اجلاس کے بعد کا وقت غیر رسمی ملاقاتوں کیلئے رکھا گیا۔ یہ اس بات کی نشاندہی کہ بھارتی ایجنسیوں کے گھناؤنے عزائم کے باوجود پاکستان کی حکومت کا رویہ مثبت تھا جبکہ بھارتی سکیم اور داؤ پیچ ایک ایک کر کے ختم ہو رہے تھے۔ جنرل مشرف نے کھٹمنڈو پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد نیپالی وزیراعظم سے ملاقات کی۔ نیپالی وزیراعظم نے کہا کہ انہیں کانفرنس میں پہنچنے میں کافی دیر لگی۔ اس پر جنرل مشرف نے جواب دیا کہ اس کانفرنس میں پہنچنے کیلئے اگر مجھے تین دن بھی سفر کرنا پڑتا تو میں ضرور کرتا اور ہر قیمت پر یہاں آتا۔ یہ جنرل مشرف کی مثبت پالیسی کا سب سے بڑا ثبوت تھا۔

اس کانفرنس میں ون ٹو ون ملاقات کا ایک موقعہ تو ضائع ہو چکا تھا لیکن سربراہی اجلاس کے روز یعنی 5 جنوری کو صدر جنرل مشرف تقریر کے خاتمے پر اچانک اپنی جگہ سے اُٹھ کر بھارتی وزیراعظم مسٹر واجپائی کے سامنے آئے اور ان سے گرمجوشی سے مصافحہ کر کے ساری دنیا کو حیران کر دیا۔ بلاشبہ یہ زبردست سفارتی اور اخلاقی کامیابی تھی جس پر بھارتی پریس بھی صدر جنرل مشرف کو داد دینے پر مجبور ہو گیا لیکن واجپائی کا ردعمل سرد رہا۔

بھارتی افواج نے اپنی دانست میں پاکستان کو آکٹوپس کی طرح جکڑا ہوا تھا اور اپنا دباؤ مسلسل بڑھا رہی تھیں۔ معروف عسکری تجزیہ نگار کرنل (ر) اکرام سہگل نے بھارتی افواج کی جنگی حکمت عملی کو ایک مضمون کے ذریعے واقع کیا یہ مضمون انہوں نے ''بھارت کا جنگی اعلان'' کے عنوان سے روزنامہ The Nation میں لکھا تھا۔

بھارت کو تعداد کے لحاظ سے برتری حاصل ہے لیکن جنگ اگر اعداد و شمار کا کھیل ہوتی تو تاریخ میں لڑی جانے والی 75 سے 80 فیصد جنگیں تعداد میں کم بہتر طور پر تربیت یافتہ زیادہ منظم اور تحریک یافتہ جنگجو افواج کبھی نہ جیت پاتیں۔ یرموک کے مقام پر ہونے والی جنگ میں خالد بن ولید مسلم افواج کی کمان کر رہے تھے۔ رومن فوجیں مسلمانوں کی نسبت سات گنا زیادہ تھیں اس کے باوجود اس جنگ میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔ روئے ارض پر لڑی جانے والی جنگوں میں یہ فیصلہ کن ترین جنگ تھی۔

بھارتی فوج کا ہیڈ کوارٹر نئی دہلی میں ہے۔ اس کے چیف کا تعلق جنوبی بھارت سے ہے۔ جنرل ایس پدمنا بھن نے 30 دسمبر 2001ء کو چیئرمین جائنٹ چیفس کوارٹر کا عہدہ سنبھالا ہے۔ بھارتی فوج پانچ کمانوں پر مشتمل ہے۔ شمالی کمان کا ہیڈ کوارٹر جموں کے قریب اودھم پور میں ہے۔ (یہ کمان کشمیر کی نگرانی کرتی ہے) مغربی کمان کا ہیڈ کوارٹر چاندی مندر ہے (اس کا کام پنجاب، راجستھان اور بیکانیر کے سرحدی علاقوں کی نگرانی کرنا ہے) جنوبی کمان کا ہیڈ کوارٹر پونا میں ہے (یہ کمان گجرات اور مہاراشٹر کے علاقوں پر نظر رکھتی ہے) مرکزی کمان کا ہیڈ کوارٹر بھارتی فوج کی مشرقی کمان کولکتہ میں ہے (یہ چین کی سرحد کے ساتھ این ای ایف اے اور آسام کے دفاع پر معمور ہے)۔

دراصل پاکستان کو شمالی، مغربی اور جنوبی کمانوں کا سامنا ہے جبکہ مرکزی اور مشرقی کمان کو آرمی ریزرو کے طور پر رکھا گیا ہے۔

شمالی کمان تین کور پر مشتمل ہے۔ XV کور (سری نگر) انیسویں انفنٹری ڈویژن (بارہ مولہ) اور 28ویں اور 59ویں ماؤنٹین ڈویژنوں پر مشتمل ہے۔ XIV کور (لیہہ) تھرڈ انفنٹری ڈویژن (لیہہ) اور آٹھویں ماؤنٹین ڈویژن (نمیر) پر مشتمل ہے جبکہ XVI کور ناگ روٹا (جمرہ) اس وقت دنیا بھر میں سب سے بڑی کور ہے اور 15 انفنٹری

Marfat.com

ڈویژنوں پر مشتمل ہے۔ 10 ویں ڈویژن (اکھنور) 25 ویں (راجوری) 26 ویں (جمرہ) 29 ویں (پٹھان کوٹ) اور 39 ویں (یوپی) میں ہے۔اس میں تین آزاد آرمرڈ بریگیڈز (دوسری، تیسری اور سولہویں) بھی شامل ہیں۔ ہر کور کے ساتھ ایک آرٹلری بریگیڈ بھی موجود ہے۔

39 ویں انفنٹری ڈویژن اور تین آرمرڈ بریگیڈز جو بغاوت کچلنے کی ڈیوٹی پر فائز ہیں کے علاوہ باقی تمام ڈویژنز لائن آف کنٹرول پر صف آراء ہیں۔ان فورسز کے ساتھ تین ڈویژن فوج ون کور سٹرائیک فورس کے حصے کے طور پر شامل کی جارہی ہے۔ یہ فورس سنٹرل کمان سے آرہی ہے لیکن یہ فورسز تاحال 31 ویں آرمرڈ ڈویژن کے بغیر ہیں جو غالباً مغربی کمان کے علاقے میں بھی ہے اور 2 کور کے آپریشنوں کو سپورٹ کرنے کیلئے ریزو آرمی کے طور پر استعمال ہوگی۔

مغربی کمان تین کور پر مشتمل ہے۔ XI کور، جس کا ہیڈکوارٹر جالندھر ہے نے ساتویں انفنٹری ڈویژن (فیروز پور) نویں انفنٹری ڈویژن (چاندی مندر) اور پندرہویں انفنٹری ڈویژن (امرتسر) کو صف آرا کر رہی ہے۔ 23 ویں آرمرڈ بریگیڈ اور 55 ویں میکینائزڈ بریگیڈ، دوسٹرائیک کور جو اصل میں 2 کور ہیں اور X کور جن کے ہیڈکوارٹر امبالہ اور بھٹنڈہ میں ہیں۔ 2 کور کے پاس فرسٹ آرمرڈ ڈویژن، 14 ویں ریپڈ (Rapid) ڈویژن 22 ویں انفنٹری ڈویژن اور 14 ویں آرمرڈ بریگیڈ جبکہ X کور کے پاس 18 ویں اور 24 ویں ریپڈ (Rapid) ڈویژنوں، 16 ویں انفنٹری ڈویژن اور چھٹی انڈر-یپنڈنٹ آرمرڈ بریگیڈ ہے۔

جنوبی کمان XII کور اور XII کور پر مشتمل ہے۔ XII کور (جودھ پور) 11 ویں اور 12 ویں انفنٹری ڈویژنوں پر مشتمل ہے۔ یہ ڈویژنیں احمد آباد اور جودھ پور میں صف آراء ہیں۔ XXI سٹرائیک کور (بھوپال) 33 ویں آرمرڈ 36 ویں ریپڈ اور 54 ویں انفنٹری ڈویژن پر مشتمل ہے۔مشرقی کمان جس نے 3 کور سے 57 ویں ماؤنٹین ڈویژن پہلے ہی بھیج دی ہے اس کمان نے دوسری ماؤنٹین اور 27 ویں ماؤنٹین ڈویژنوں کو بھی تیار کرلیا ہے (اور ممکن ہے وہ حرکت میں آچکی ہوں) کیونکہ تین دن پہلے تک چین کی طرف سے کسی خطرے کا تصور نہیں کیا جارہا تھا۔

اس کے علاوہ تین ڈائریکٹرز رپورٹنگ یونٹ بھی موجود ہیں۔ 30 ویں آرٹلری ڈویژن جو کہ مغربی کمان سے پاس کی جاچکی ہے۔ 50 ویں انڈیپنڈنٹ پیراشوٹ بریگیڈ اور 33 واں میزائل گروپس (بھارت کا نیوکلیئر آرٹلری یونٹ جس کے پاس پرتھوی میزائل ہیں) جنوبی کمان ایریا سے پنجاب اور راجستھان میں تعینات کئے جاچکے ہیں۔

بھارت کی پانچ فضائی فورسز پانچ آپریشنل کمانڈز پر مشتمل ہے جو درج ذیل ہیں۔مغربی فضائی کمانڈ جو کشمیر سے لے کر راجستھان کے شمال میں فضائی آپریشنز کو کنٹرول کرتی ہے۔جنوب مغربی فضائی کمانڈ جو گاندھی نگر میں تعینات ہے اور راجستھان سے مہاراشٹر تک فضائی آپریشنز کو کنٹرول کرتی ہے۔الہ آباد میں تعینات مرکزی فضائی کمانڈ شیلانگ میں متعین مشرقی کمانڈ اور تریوندرم میں موجود جنوبی فضائی کمانڈ پاکستان میں ہمیں بنیادی طور پر مغربی فضائی کمانڈ اور جنوب مغربی کمانڈ اور دوسری کمانڈز سے یہاں متعین کی جانے والی فضائی کمانڈز سے واسطہ پڑے گا۔

مغربی فضائی کمانڈ کا اودھم پور میں ایک فضائی آپریشن گروپ ہے جو جموں وکشمیر بشمول لداخ کے لیے وقف ہے۔ کشمیر میں اس کا لڑاکا یونٹوں میں لیہہ میں 12 مگ 21 سری نگر میں 17 مگ 21، اودھم پور میں 18 مگ 21، جموں میں

Marfat.com

8 مگ 21، 17 مگ 23 اور پٹھان کوٹ میں 24 مگ 21 شامل ہیں۔ (کل 96 طیارے شامل ہیں) پنجاب میں امرتسر میں 18 مگ 21، آدم پور میں 17 مگ 23، 16 مگ 29 اور 16 مگ 21، ہلواڑہ میں 17 مگ 18,23 مگ 21 اور 8 مگ 23، چندی گڑھ میں 18 جیگوار، 8 کینبراز اور 18 مگ 21، انبالہ میں 19 میراج 2000، 18 جیگوار اور 16 مگ 21، بھٹنڈہ میں 18 مگ 21، سورت گڑھ میں 17 مگ 23 اور 18 مگ 21 اور ہنڈن میں 6 کینبراز، 18 مگ 25 اور 16 مگ 21 موجود ہیں (مجموعی طور پر 332 طیارے)۔

جنوب مغربی فضائی کمانڈ اس سے قبل مغربی کمانڈ کے کنٹرول میں تھی۔ اب یہ راجستھان اور مہاراشٹر میں فضائی آپریشنز کو کنٹرول کرتی ہے۔ اس کے لڑاکا یونٹوں میں بکنار میں 18 مگ 16,27 مگ، 21,29 جیسلمیر میں 18 مگ 16,27 مگ 29 اور 18 مگ 21 آگرہ میں 7 کینبراز، جودھ پور میں 18 میراج 2000 ,20 جیگوار اور 18 مگ 21، جام نگر میں 27 جیگوار اور 16 مگ 21، پونے میں 10 مگ 29 اور 9 کینبراز شامل ہیں (مجموعی طور پر 263 طیارے ہیں)۔

اس کے علاوہ مرکزی فضائی کمانڈ کو گولیار میں میراج 2000۔ ایچ کے دو سکواڈرن کی مدد حاصل ہے جو پاکستان کا مقابلہ کرنے والی کمانڈ کو منتقل کیئے جاسکتے ہیں (اس کمانڈ کے پاس 36 طیارے ہیں) روس سے حاصل کیئے جانے والے 9 یا 10 عدد ایس وی۔ 30 ابھی تک محترک نہیں کیئے گئے ہیں۔ اس لئے انہیں شامل نہیں کیا جاتا ہے۔ یوں پاکستان کے خلاف 735 طیارے لاکھڑے کیئے گئے ہیں۔ بھارتی فضائیہ میں تقریباً اتنے ہی طیارے شامل ہیں۔

بھارتی نیوی کے تین نیول کمانڈر ہیں۔ مغربی نیول کمانڈ کے بیڑے کا بیس ممبئی ہے جو بحر ہند کا سمندری دفاع کرتا ہے۔ ممبئی اور کوچن کے درمیان خلیج بینا گا کے مقام پر ایک نیا نیول بیس تشکیل دیا جارہا ہے۔ دوارکا کے مقام پر ایک ایڈوانس بیس ہے اور نیوی میزائل بوٹ ہیڈ کوارٹر کولابا کے مقام پر ہے۔ مشرقی نیول کمانڈ کا ہیڈ کوارٹر ویراگا پٹم کے مقام پر ہے یہاں سب میرین بیس بھی ہے اور یہ خلیج بنگال کا بحری دفاع کرتا ہے۔ کوچی کے مقام پر جنوبی نیول کمانڈ بنیادی طور پر ایک تربیتی بیس ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ پاکستان کیخلاف آپریشنز میں مغربی اور مشرقی نیول کمانڈ شامل ہوں گے۔

بھارت کی نیوی کا بیڑا جو فی الحال زیر مرمت نہیں، ایک طیارہ بردار جہاز، 7 گائیڈڈ میزائل ڈیسٹرائر 7 گائیڈڈ میزائل فریگیٹ 10 عدد بڑے گشتی طیاروں، 5 عدد تیز تر گشتی کشتیوں 3 انتہائی تیز رفتاری سے حملہ کرنے والی میزائل بوٹس، 18 بارودی سرنگیں صاف کرنے والے جہاز، فی الوقت ان کے پاس نیوکلیئر طاقت کی حامل سب میرین اور 13 ڈیزل پاور سب میرین شامل ہیں (جن میں ایک فاکس ٹرراٹ کلاس، 9 سندھوگوش کلاس اور 3 ششِ کمار کلاس شامل ہیں) بھارت کی نیوی کا Air Arm جس کا ہیڈ کوارٹر گوا میں ہے جگوار Sea Harries کے ایک ایک سکواڈرن پر مشتمل ہے جبکہ 6 سمندری بادشاہ اور 20 چیتے اس کے علاوہ ہیں۔ پونے میں جیگوار کا ایک سکواڈرن کو بھارتی فضائیہ استعمال کرتی ہے۔

خشکی اور تری کی یہ صلاحیت ویز گاپٹم میں فوج کے 304 ویں آزاد بریگیڈ کے اردگرد تشکیل دی گئی ہے۔ ان میں ایک بٹالین نے 1984ء میں جافنا اور بٹی کالاؤ کے سواحل پر لینڈنگ میں حصہ لیا۔ ان کی قیادت میرین کمانڈ و فورس کر رہی تھی۔ (مختصراً اے مارکوس کہتے ہیں) جس میں ممبئی کوچن اور ویزگاپٹم کے 2000 فوجی شامل تھے۔ اب انہیں فوج کے 304 ویں آزاد بریگیڈ کے ساتھ ممبئی میں آئی این ایس انگسیمانیو کے مقام پر جمع کیا گیا ہے۔

Marfat.com

5600 ٹن وزنی دوئی Landing Vessels Magar Class چار عدد لینڈنگ کرافٹ ہیکو پرسنیل (ایل سی وی پی) اورانبالہ ہیلی کاپٹر پلیٹ فارم، چار پلنو چنی کلاس کشتیاں جو ہیلی کاپٹر پلیٹ فارم بھی رکھتی ہیں کے ساتھ بھارت کی بحری صلاحیت بڑھ گئی ہے۔ بھارت کے پاس مقامی طور پر تیار کردہ 7 عدد 500 ٹن وزنی لینڈنگ کرافٹ یوٹیلٹی اور چھوٹی کنگ (سمندری بادشاہ) اور تقریباً 20 چینک ہیلی کاپٹرز ہیں۔

ان کے پاس اٹلی کی بنی ہوئی 11 چھوٹی کاسموس آبدوزیں بھی ہیں جو فاکل ٹراٹ آبدوز کی پشت پر سوار کی جا سکتی ہیں۔ مختصر فاصلے تک تیزی سے حملہ کرنے کیلئے چند معلق جہاز تیار رہتے ہیں۔

بھارت کی زمینی فوج اور فضائی لڑا کا قوت پاکستان کے خلاف متعین کی گئی ہے۔ نیفا میں چین کی سرحد کے قریب صرف تین کورز (Corps) (جن میں سے کچھ فورس نکال لی گئی ہے) متعین کی گئی ہیں جن میں سے ایک کور آسام ''ناگالینڈ'' منی پور اور میزورام میں بغاوت کو کچلنے کیلئے مصروف ہے۔ نیوزی کو بھی بحر ہند اور بحیرہ عرب کیلئے نشان سے مختص کیا گیا ہے۔ نیوی کو چین کے خلاف Deploy نہیں کیا جا سکتا ہے لیکن آپ بھارت کے دفاعی تجزیہ نگاروں کو یہ کہتے ہوئے سنیں گے کہ انہیں سب سے زیادہ خطرہ پاکستان سے نہیں بلکہ چین سے ہے (بھارتی یہ سب کچھ مغرب کی توجہ حاصل کرنے کیلئے کرتے ہیں) اگر ایسا ہے تو پھر انہیں اپنی فوجیں ہمارے خلاف پھیلانے کے بجائے چین کے خلاف پھیلانی چاہئیں۔

اس وقت بھارت نے اپنی چار حملہ آور کورز پاکستان کے خلاف صف آراء کی ہوئی ہیں ان میں سے ایک کور آزاد کشمیر کے جنوبی حصے میں، ایک وسطی پنجاب میں، ایک جنوبی پنجاب میں اور ایک سندھ میں پھیلا رکھی ہے۔ وہ دو یا تین کورز کے ساتھ حملہ کرنے کیلئے ضروری توازن رکھتے ہیں لیکن وقت اور رفتار انہیں اس بات سے آگاہ کرتے ہیں کہ وہ ایک وقت میں کسی ایک محور پر ایک سے زیادہ حملہ آور کور کو حرکت نہیں دے سکتے۔ علاوہ ازیں انہیں ہمارے جوابی حملے کو بھی مدنظر رکھنا ہوتا ہے۔ ان کی فضائی پیش رفت سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ وہ جنوب میں حملہ کریں گے (جنوبی اور مغربی کمانڈ کے ساتھ) کیونکہ صحرا میں بھاری فضائی کور کے بغیر زمینی حملہ ممکن نہیں ہے یہی اصول مشترکہ طور پر پیراشوٹ اور ہیلی کاپٹر سے سپاہیوں کو دشمن کے علاقے میں گرایا خشکی وتری کے آپریشن کے حوالے اپنایا جا سکتا ہے۔

مکمل فضائی کور کے بغیر حملہ آور فورس بھرپور حملہ نہیں کر سکتی۔ جرمنی کے چند طیاروں نے جنگ کی ابتداء میں نارمنڈے کے سواحل پر افراتفری پیدا کر دی تھی۔ بھارت کی دونوں حملہ آور کورز جیلسمیر میں مغربی فوجی کمانڈ کی 2 کور اور بارمر میں جنوبی کمانڈ کی 21 ویں کور کو مشرقی کمانڈ کے ڈویژن بھیج کر کمک بہم پہنچائی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہیں ہیلی کاپٹر کے حملہ آور سکواڈرن انجینئر آرٹلری اور ایئر ڈیفنس بریگیڈ سے بھی مدد فراہم کی گئی۔ فوج کے بلاواسطہ رپورٹنگ یونٹ، تیسول آرٹلری یونٹ کے پھیلاؤ سے حملے کی نوعیت معلوم ہوتی ہے۔ بنا بریں جودھ پور میں ایم آئی 8 اور ایم۔8 اور ایم۔17 ہیلی کاپٹر کی بھاری تعداد جمع کی گئی ہے جن میں آگرہ چندی گڑھ اور گوالیار میں موجود اے این۔32 سے مدد فراہم کی گئی ہے۔ بلاواسطہ رپورٹنگ کا ایک یونٹ 50 واں آزاد پیراشوٹ بریگیڈ آگرہ میں متعین ہے۔

لائن آف کنٹرول کے پار بھارت کی طرف سے آزاد کشمیر میں مجاہدین کے تربیتی کیمپوں پر بھارت کے محدود حملے سے متعلق باتیں سننے میں آتی رہی ہیں۔ اس کا مقصد میدان جنگ کو کشمیر تک محدود رکھنا ہوتا ہے۔ اس حوالے سے

Marfat.com

دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اگر پاکستان محدود جنگ کی آپشن قبول نہیں کرتا تو دوسرے حملہ آور کور پاکستان کیخلاف حملہ کر دیں۔ تین آرمرڈ ڈویژن 4Rapid ڈویژن اور پانچ آزاد آرمرڈ ڈویژن میں سے کم از کم دو کور راجستھان میں جمع کی گئی ہیں۔ ان کے موجودہ وسائل جس انداز سے وقف کیے گئے ہیں اس سے ان کے جارحانہ عزائم کا اندازہ ہوتا ہے۔ چاہے جیسلمیر رحیم یار خان سرحد پر حملہ کریں اور چاہے بارمر میر پور خاص پر حملہ آور ہوں۔

صدر صاحب نے دونوں حساس ترین مقامات پر ہمارے بہترین میجر جنرل حضرات میں سے دو کو مختصر نوٹس پر کمانڈ کا چارج لینے کیلئے بھیجا ہے۔ اس سے جنرل پرویز مشرف کی قیادت کی فطری صلاحیت کا پتا چلتا ہے۔ بھارت ہیلی کاپٹر کے ذریعے اتارے گئے دستوں یا بری و بحری دستوں کے ساتھ حملہ آور ہو سکتا ہے جس کے بعد XXI حملہ آور کور بھی ان کے ساتھ شامل ہو جائے گی۔

بھارتی فوج اس عمل کی مشق کرتی رہی ہے۔ یوں بدین اور دریائے سندھ کے مشرق میں ہجوال کا علاقہ حملے کی زد میں ہے۔ پاکستان کے جوابی حملے کی صلاحیت کو دیکھتے ہوئے اس کا نتیجہ وسیع تر خلیج کی صورت میں نکلے گا۔ روی رکھی کے مطابق 30 دسمبر 2000ء کو تمام سرحد کے ساتھ فوجی دستوں کے پھیلاؤ کے بعد بھی پاکستان کے پاس تین کور ہیڈ کوارٹر (آرمی ریزرو شمال مرکز اور جنوب) کے پانچ ڈویژن اور چار دوسرے ڈویژن بھی جی ایچ کیو کو دستیاب ہیں۔ اگرچہ یہ چار ڈویژن دوسرے محاذ پر موجود ڈویژنوں کو انفنٹری بریگیڈ کی سہولت دے سکتے ہیں۔

پاکستان کے پاس بہت سے آزاد بریگیڈ ہیں جبکہ بہت سارے ڈویژنز کے پاس زائد بریگیڈ ہیں۔ صرف یہی ظاہر کرنے کے لیے کافی ہیں کہ بھارت کو زمینی حوالے سے کسی قسم کی کوئی برتری حاصل نہیں۔ پاکستان نے اپنے آدھے ڈویژنز ریزرو رکھنے کا انتظام کیا ہوا ہے۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان ''چوتھے راؤنڈ'' کے مصنف روی رکھی انتہائی ذہین اور زبردست قسم کا دفاعی تجزیہ نگار ہے جبکہ اس کے تجزیے ضروری حد تک اعتباریت لئے ہوتے ہیں۔

وہ اکثر و بیشتر ترکی بہ ترکی جواب دینے کی بات کرتا ہے اور واضح طور پر اس حقیقت سے انحراف نہیں کرتا کہ پاکستان پوری سرحد کے ساتھ بھارت کی کسی قسم کی جارحیت کا جواب دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مزید براں یہ کہ بھارتی نیوی 1971ء کی طرح کراچی کی بندرگاہ کا محاصرہ نہیں کر سکتی ہے۔ فرانس کے بنے ہوئے مختصر فاصلے کے گائیڈڈ میزائل سے مسلح ہمارے میراج طیارے اور آبدوزوں کا بیڑا جیسے بہتر بنایا گیا ہے۔ بھارتی نیوی ساحل سے دور رکھے گا۔ ہمارے سمندری حدود سے بھی 100 میل کے فاصلے پر رکھے گا۔ ہماری نیوی بھارت کے طیارہ بردار جہازوں کو ائیر کرافٹ کی رینج میں آنے پر خوشی سے اس کا استقبال کرے گی۔

بھارت نے بلا واسطہ رپورٹنگ یونٹ کے 333 ویں میزائل گروپ جو تین پرتھوی بیڑیوں اور 4 لانچرز پر مشتمل ہے کو تمام سرحدی علاقوں میں پہنچا دیا ہے۔ راجستھان کے صحرا میں ان کے دو حملہ آور کورز (2 اور XXI) پاکستان کے ممکنہ تدبیری نیوکلیئر حملے کے لیے بہتر ہدف مہیا کرتے ہیں اور بھارت کو اس بارے کوئی شبہ نہیں ہونا چاہئے۔ خدانخواستہ کسی کی وجہ سے اگر ہماری روایتی فورسز کسی مرحلے پر یا کسی مقام پر کمزور پڑتی دکھائی دیتی ہیں جس سے ہماری شمالاً جنوباً کمیونیکیشنز کو خطرہ لاحق ہو جائے تو ہم بغیر کسی انتظار کے ایٹمی ہتھیار استعمال کریں گے۔

Marfat.com

اچھے لیڈروں کو اچھی قسمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ نپولین اور نکسن نے اسی کی سفارش کی، جنرل پرویز مشرف کو بھی اس صورتحال میں اس کی ضرورت ہے۔ بھارت کی جنگجوئی نے قوم کو متحد کر دیا ہے۔ صدر جنرل پرویز مشرف کھٹمنڈو میں ہونے والی سارک سربراہ کانفرنس میں شرکت کی غرض سے چین میں بھی تھوڑی دیر قیام کریں گے۔ اس نازک موقع پر ان کی چین میں موجودگی چین کی دوستی کا خلوص پر مبنی اظہار ہے۔ جنرل پرویز مشرف نے بھارت کو دکھا دیا ہے کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ بھارت اپنی علاقائی مجبوریوں کی وجہ سے خوفناک ایٹمی نیوکلیئر دہانہ گیری (جنگ میں شامل ہوئے بغیر مناقشت کا سلسلہ جاری رکھنا) کا مرتکب ہو رہا ہے۔ فروری میں بھارت کی سب سے گنجان آباد ریاست یو پی میں انتخابات ہونے والے ہیں۔ بھارتی برے نہیں ہیں ان کے لیڈر قابل مذمت ہیں۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ ہم نے بالغ نظری کا رویہ اختیار کیا اور بھارت کی شیخیوں اور گیدڑ بھبکیوں کا مقابلہ نہیں کیا ہے۔ بھارت کے جنونیوں نے اپنے ملک کو دنیا کے سامنے بے نقاب کر دیا۔ جنگ کی سب سے زیادہ خواہش۔ عام طور پر وہ لوگ کر رہے ہیں جنہوں نے زندگی کے کسی حصے میں چلائی گئی گولی کی آواز کبھی نہیں سنی اور جو جانتے ہیں کہ وہ محفوظ ہیں جبکہ نوجوانوں کی موت کی بھینٹ چڑھنے کیلئے بھیج رہے ہیں۔ جنگ زمین پر نوجوان لوگوں کے ساتھ لڑی جاتی ہے۔ جنگ جیتنے کیلئے اچھی جونیئر قیادت بنیادی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ بھارت کو 10,000 سے زائد جونیئر افسران کی کمی کا سامنا ہے اس لئے بھارت کو بی بی سی کے "question hour" میں زیر تربیت افسران کو بھیجنا پڑے گا جو پاکستان کو تباہ کرنے کیلئے بے چینی و اضطراب محسوس کر رہے ہوں گے۔

دیکھتے ہیں کہ ان کا عمل ان کے قول سے کس حد تک مطابقت رکھتا ہے۔ نیوکلیئر جنگ کے بغیر بھی روایتی جنگ میں بھی پاکستان کو یقینی طور پر زبردست نقصان اٹھانا پڑے گا۔ ہم جنگ کی خواہش نہیں کرتے بلکہ ہم پر جنگ مسلط کی جا رہی ہے۔ اس صورتحال کی وجہ سے ہمارے پاس لڑنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ جنگ کی صورت میں پاکستانی فوج ان کی فوج کو جو زخم لگائے گی بھارت کی سیاسی قیادت اس زخم کو برداشت نہیں کر پائے گی۔ یہ کوئی لفاظی نہیں ہے بلکہ پاکستانی فوج اس کیلئے وقف ہے۔

***

بھارت کی طرف سے مطلوب افراد کی فہرست کے حوالے سے معروف خاتون صحافی نسیم زہرہ نے ''دی نیوز'' میں ایک اہم مضمون بعنوان ''مطلوب افراد کی فہرست اور بھارت'' لکھا: ملاحظہ فرمائیں:

بھارت نے پاکستانی حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ پاکستان ان 20 افراد کو بھارت کے حوالے کرے، جو بھارت کی ''مطلوب افراد کی لسٹ'' میں شامل ہیں۔ اس پر پاکستان کے وزیر خارجہ عبدالستار نے اپنے پہلے ردعمل میں دو نکات بیان کئے ہیں۔ ایک نکتے کا تعلق قانونی معاملے سے ہے۔ دوم یہ کہ اگر شہادت مہیا کر دی جاتی ہے تو پاکستان ان ملزمان کی سپردگی پر غور کر سکتا ہے۔ سوم یہ کہ پاکستان مطلوب افراد کی سپردگی پر سارک کے دہشت گردی مخالف سمجھوتے کے تحت غور کرے گا۔ وزیر خارجہ نے یہ تین نکات اٹھائے ہیں، جو مقامی اخبارات میں شائع ہوئے۔ ان نکات کا بنظر غائر جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ بھارتی مطالبے کے حوالے سے پاکستان کا ردعمل قانونی معاملے سے منسلک ہے، نہ کہ سیاسی یا سفارتی معاملے سے۔ اگر بھارت ایسی شہادتیں مہیا کرتا ہے، جن سے بھارت کے اندر دہشت گرد حملوں میں ان 21

Marfat.com

افراد کے ملوث ہونے کے ثبوت مل جاتے ہیں تو پاکستانی حکومت بھارتی درخواست پر غور کر سکتی ہے۔ شہادتوں کا مطالبہ کرنا متعلقہ معاملہ ہے، لیکن اس کی حیثیت ثانوی ہے۔ بنیادی مسئلہ 20 افراد کی فہرست سے تعلق رکھتا ہے۔ اس فہرست میں سے صرف ایک فرد جیش محمد کا سربراہ مسعود اظہر ہی پاکستان شہریت رکھتا ہے۔

ہوسکتا ہے مولانا مسعود اظہر نے پاکستانی قانون کی خلاف ورزی کی ہو، جس کی وجہ سے حکومت پاکستان کو ان کے خلاف ایکشن لینا چاہیے۔ وہ پہلے ہی زیر حراست ہیں۔ ایسی کوئی توثیقی شہادت موجود نہیں ہے جس کی بنیاد پر بھارت کی حکومت ان کی بھارت حوالگی کا مطالبہ کرے۔ مسعود اظہر کے علاوہ اس فہرست میں پانچ دوسرے افراد کے متعلق بھی بھارت دعویٰ کرتا ہے کہ وہ پاکستانی شہری ہیں۔ بھارت ان افراد پر مبینہ الزام لگاتا ہے کہ وہ دسمبر 1999ء میں بھارتی ایئر لائن کی پرواز آئی سی 814 کو ہائی جیک کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ بھارت یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ ہائی جیکرز پاکستانی تھے، لیکن کھٹمنڈو ایئر پورٹ اتھارٹی نے پرواز نمبر آئی سی 814 کے مسافروں کو جو فہرست جاری کی، اس کے مطابق طیارے میں 164 بھارتی مسافر تھے، جبکہ چند ایک کا تعلق شمالی امریکہ اور نیپال سے تھا۔ پاکستانی حکومت یہ درخواست کرتی ہے کہ پرواز نمبر آئی سی 814 کی اڑان کے وقت مسافروں کا جو ریکارڈ جمع کیا گیا تھا، وہ ہمیں مہیا کیا جائے تا کہ بھارتی دعوے کی سچائی جانچی جاسکے کہ اس پرواز میں پانچ پاکستانی سوار تھے، لیکن بھارتی حکام نے پاکستانی حکومت کی درخواست مسترد کر دی۔ بھارتی الزام لگاتے ہیں کہ پانچ پاکستانی امیگریشن اور سکیورٹی کی رکاوٹوں کے عمل سے گزرے بغیر ہوائی اڈے ہی سے طیارے میں سوار ہو گئے لیکن اس دعوے کو کھٹمنڈو میں موجود بھارتی سٹاف اور نیپال کی سکیورٹی فورسز نے رد کر دیا۔

مطلوب افراد کی شہریت کے سوال کے علاوہ ایک بنیادی سوال یہ بھی ہے کہ ان لوگوں کا ٹھکانہ کہاں ہے؟ مولانا مسعود اظہر اور سید صلاح الدین کے سوا دوسرے افراد کی پاکستان میں موجودگی کی کوئی شہادت نہیں ہے۔ درحقیقت بھارت کے ایک سرکردہ اخبار ''دی ہندوستان ٹائمز'' نے اپنی 2 جنوری 2002ء کی اشاعت میں صفحہ اول پر خبر چھاپی کہ مطلوب افراد کی فہرست میں سے پانچ افراد پاکستان میں موجود نہیں ہیں۔ ''ہندوستان ٹائمز'' کے نامہ نگار نے ان پانچ میں سے ایک فرد پرم جیت سنگھ پنجوڑ سے بات چیت کی، جو یہ دعویٰ کررہا تھا کہ وہ جرمنی سے بول رہا ہے۔

سید صلاح الدین جو پاکستان میں رہتا ہے، درحقیقت بھارتی مقبوضہ کشمیر کا شہری ہے۔ بھارتی مقبوضہ کشمیر، مقبوضہ علاقہ ہے، اس لئے صلاح الدین نہ تو پاکستانی شہری ہے اور نہ ہی بھارتی۔ وہ حق خودارادیت کی ایک تحریک کے مسلح شعبے سے منسلک ہے۔ حق خودارادیت کی تحریک کو سلامتی کونسل کی قرارداد نمبر 91 اور 122 میں جائز قرار دیا گیا ہے۔ اقوام متحدہ کا منشور ان لوگوں کو مسلح جدوجہد کا حق دیتا ہے، جو کسی غیر ملکی تسلط میں رہ رہے ہوتے ہیں۔ ان تکنیکی مسائل سے قطع نظر اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ سید صلاح الدین بھارتی سرزمین پر نام نہاد ''دہشت گرد سرگرمیاں'' جاری رکھے ہوئے ہے۔

بھارت نے پانچ ہائی جیکروں کی تصاویر پاکستانی حکومت کو دے کر اس مسئلے پر زور دیا ہے کہ یہ ہائی جیکرز پاکستانی ہیں۔ یہ بات آج تک واضح نہیں ہوسکی کہ بھارتی حکومت نے ماسک پہنے ہائی جیکروں کی تصاویر کیسے اتار لیں۔ بھارتی حکومت یہ دلیل دیتی ہے کہ ان ہائی جیکروں کی تصاویر بمبئی میں بینک ڈکیتی میں ملوث بھارتی شہریوں نے بھارت کی حکومت کو مہیا کی ہیں۔ بمبئی کی پولیس کے ایک افسر کے مطابق ڈکیتی میں ملوث چار افراد نے ہائی جیکنگ کے واقعہ کے

Marfat.com

ایک ہفتہ بعد تفتیش کے دوران اس بات کا اقرار کیا تھا کہ انہوں نے پانچ پاکستانیوں کو بھارتی پاسپورٹ دیئے تھے، جو ہائی جیکنگ آپریشن کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔

20 مطلوبہ افراد کی بھارت سپردگی کے بھارتی مطالبے کو مختلف وجوہات کی بنا پر رد کر دینے کی ضرورت ہے۔ بھارت نے دہشت گرد سرگرمیوں میں پاکستان کے ملوث ہونے کی انتہائی انجینئرڈ کہانیوں کے خلاف پاکستان کے غیر مناسب اور ناموزوں ردعمل سے فائدہ اٹھایا ہے۔ ملزمان کی حوالگی سے متعلق پاکستانی وزیر خارجہ نے جو دوسرا نکتہ اٹھایا ہے، وہ غلط ہے، کیونکہ پہلے بھارت کے ساتھ ملزمان کی سپردگی کا معاہدہ ہونا چاہئے۔ اس طرح کا کوئی معاہدہ فی الوقت موجود نہیں ہے۔

1987ء کے تیسرے سارک کنونشن کے تحت پاکستان کے ایکشن کے حوالے سے تیسرا نکتہ پاکستان پر یہ فرض عائد کرتا ہے کہ وہ جنوبی ایشیا میں کہیں بھی دہشت گردی کے مرتکب افراد کو سزا دینے کیلئے قانون وضع کرے۔ پاکستانی وزیر خارجہ عبدالستار صاحب کو جنوبی ایشیا کے بنیادی مسائل جو علاقائی تعاون اور سلامتی کو نقصان پہنچاتے ہیں، کو حل کرنے کیلئے ان کے درمیان تعلق پیدا کرنا چاہئے تھا۔ کھٹمنڈو میں ہونے والی سارک سربراہ کانفرنس میں بھارت کا ایجنڈا دہشت گردی اور سارک کا دہشت گردی کنونشن ہوگا۔ پاکستان، بھارت کو اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ اس مسئلے کو اس انداز سے پیش کرے اور یہ ذمہ داری پاکستان پر عائد ہو کہ وہ اپنے آپ کو 13 دسمبر کے واقعہ میں بیگناہ ثابت کرے۔

مطلوب افراد کی فہرست کے تمام دوسرے افراد بھارتی شہری ہیں۔ واضح طور پر ہمیں یہ بات تسلیم کر لینی چاہئے کہ یہ ایک سیاسی اور سفارتی مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ کے مندرجات، دباؤ اور اختلافات بنیادی طور پر سیاسی ہیں اور اس کے پس پردہ یہ مقصد کارفرما ہے کہ پاکستان پر زیادہ سے زیادہ دباؤ ڈال کر اسے مجبور کیا جائے کہ وہ اپنی کشمیر پالیسی کے مقاصد میں تبدیلی لائے۔ اس حوالے سے بھارت کا حالیہ مطالبہ بھارت کے وسیع تر تزویری مقاصد کا حصہ ہے کہ کشمیر کی جدوجہد کو دہشت گرد تحریک قرار دے کر کشمیر کے مسئلے کو دفن کیا جائے۔ یہ اقدامات ان کی 11 ستمبر کے بعد کی پالیسی کی بالواسطہ عکاسی کرتے ہیں کہ طالبان حکومت کے ساتھ ساتھ پاکستان پر بھی فرد جرم عائد کی جائے۔ 11 ستمبر کے واقعات کے بعد جسونت سنگھ امریکہ اور برجیش مشرا یورپ گئے تا کہ دہشت گردی کے خلاف عالمی اتحاد کے رکن ممالک کو اس بات پر قائل کر سکیں کہ پاکستان دہشت گردی کے مسئلے کا حصہ ہے، اس لئے وہ دہشت گردی کے حل کا حصہ نہیں بن سکتا۔

بھارت پاکستان کے خلاف الزامی پراپیگنڈہ جاری رکھے ہوئے ہے۔ ایسے میں ہمیں یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ بھارتی پراپیگنڈہ اتنا ہی عمدہ اور کامیاب ہے، جتنی ہماری اس پراپیگنڈے کا مستعدی سے مقابلہ کرنے کی عدم صلاحیت۔ بھارت کے پراپیگنڈے کا جواب پراپیگنڈے یا جذباتی تقریروں سے نہیں دینا، بلکہ حقائق سے دینا ہے۔ بھارت دوطرفہ معاہدات کی خلاف ورزی کر رہا ہے اور معاہدات بشمول سندھ طاس معاہدہ کو ختم کرنے کی دھمکی دے رہا ہے۔ بھارت کا یہ اقدام اس بات کا شدت سے اعلان کر رہا ہے کہ 13 دسمبر کے حملے کے ذمہ دار پاکستانی حکومت اور کشمیری گروپ ہیں۔ پاکستان دھماکہ خیز انداز سے تردید کے ذریعے جواب نہیں دے سکتا۔ پاکستان کے جواب کو تزویری، حکیمانہ، بصیرت افروز اور منظم ہونا چاہئے۔

Marfat.com

20 اہم دہشت گردوں کی فہرست:

1- داؤد ابراہیم	2- ایوب میمن
3- میمن ابراہیم	4- عزیز پٹھان
5- شکیل ابراہیم	6- اطہر ابراہیم
7- اظہر یوسف	8- مستری ظہور ابراہیم
9- سید شاہد اختر	10- شاکر محمد
11- اسحاق عطا حسین	12- صغیر صابر علی
13- محمد مسعود اظہر	14- محمد یوسف شاہ
15- سید عبدالکریم	16- گجندر سنگھ
17- لکھبیر سنگھ	18- پرم جیت سنگھ
19- رنجیت سنگھ	20- وادھوا سنگھ

(دی نیوز۔4 جنوری 2002ء مضمون نگار: نسیم زہرا)

بھارتی حکومت مسلسل ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اس صورتحال پر ''روزنامہ خبریں'' نے لکھا:

''بھارت کو امریکہ، برطانیہ، چین اور دوسرے ملکوں نے بھی مشورہ دیا ہے کہ وہ اپنے الزامات کو درست ثابت کرنے کے لیے ثبوت دے لیکن بھارتی حکمران بدستور دھونس اور دھمکیوں کے ذریعے اپنی فرمائش پوری کرانے کے لیے کوشاں ہیں۔ صدر جنرل پرویز مشرف نے بھی واضح کیا ہے کہ پاکستان ہر قسم کی جارحیت کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ تمام تیاریاں مکمل ہیں، اگر بھارت نے کوئی غلطی کی تو اسے منہ کی کھانا پڑے گی اور بھارتی حکمرانوں کو ایسی سزا ملے گی کہ وہ مستقبل میں پچھتاتے رہیں گے۔ بھارتی حکمرانوں کا حال یہ ہے کہ وہ بدستور اشتعال انگیزیاں کرتے ہیں۔ وزیراعظم واجپائی سے لے کر شما شوراج تک تمام رہنما پاکستان کو سنگین نتائج کی دھمکیاں دیتے رہتے ہیں۔ بھارتی وزیراعظم واجپائی نے تو انتہا کر دی۔ انہوں نے پاکستان کو افغانستان جیسا حشر کرنے کی دھمکی دی ہے۔

بھارتی حکمرانوں کو چاہئے کہ وہ عالمی برادری کے مشوروں کو اہمیت دیں اور بلاوجہ اشتعال انگیزیاں کر کے کشیدگی میں اضافہ نہ کریں بلکہ کشیدگی کم کر کے مذاکرات کا سلسلہ شروع کریں تاکہ باہمی مسائل اور تنازعات کا خاتمہ ہو سکے۔ اس لیے ضروری ہے کہ بھارتی فوج سرحدوں سے واپس بلائی جائے اور بلاوجہ دھمکیوں کا سلسلہ بند کیا جائے۔ دوسری صورت میں بھارتی حکمران یاد رکھیں کہ پوری پاکستانی قوم میں جذبہ جہاد اور ایمانی قوت موجود ہے اور وہ ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار ہیں۔ اب بھارت کو فیصلہ کرنا پڑے گا کہ وہ جنگ یا امن میں سے کس بات کو اہمیت دیتا ہے۔ بھارتی حکمرانوں کے رویے سے یہ بھی پتا چل جائے گا کہ وہ کس حد تک شرافت کی زبان سمجھتے ہیں۔ حالات کا تقاضا یہی ہے کہ پاکستان اور بھارت میں کشیدگی کو ختم کرایا جائے اس کے لیے عالمی برادری کو بھی اپنے فریضہ کی ادائیگی کرتے ہوئے بھارت کو راہ راست پر لانے کی کوشش کرنی چاہئے تاکہ اس خطہ میں امن برقرار رہے۔ (اداریہ روزنامہ خبریں)

Marfat.com

بھارت کے بڑھتے ہوئے جنگی جنون کے حوالے سے میں نے ایک مضمون روزنامہ جنگ میں بعنوان ''بھارت کا جنگی جنون'' لکھا ملاحظہ فرمائیں:

''13 دسمبر کے بعد سے بھارت کی طرف سے اپنائی جانے والی تزویراتی جارحیت نے اب اپنی انتہائی شکل اختیار کر لی ہے اور ساری دنیا کا میڈیا چیخ چیخ کر یہ کہہ رہا ہے کہ بھارت کی طرف سے پاکستانی سرحدوں پر فوج کا مسلسل بڑھتا ہوا دباؤ کسی بھی لمحے معمولی سی غلطی کے سبب برصغیر کی روایتی قوتوں کے درمیان ٹکراؤ کا سبب بن سکتا ہے، اس ٹکراؤ کے نتائج دونوں ممالک کی مکمل تباہی کے سوا اور کچھ نہیں ہوں گے، اگر بھارت اس خوش فہمی کا شکار ہے کہ اس کے پاس ایٹمی اسلحہ مقدار میں زیادہ ہے تو اسے پاکستانی صدر جنرل پرویز مشرف کی اس بات پر یقیناً غور کرنا چاہئے، جس میں انہوں نے کہا ہے کہ اگر بھارت نے پاکستان پر جنگ مسلط کر دی تو ہم اس کی توقعات سے بڑھ کر تباہ کن جواب دیں گے اور بھارت کو ایسی تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا جس کا وہ فی الوقت تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جنرل پرویز مشرف کے اس بیان کو اگر گزشتہ سال ہونے والے ان بین الاقوامی نیوکلیئر تجزیاتی رپورٹس کے پس منظر میں دیکھا جائے جو امریکہ اور برطانیہ کے تحقیقاتی اداروں کی طرف سے جاری ہوئی ہیں اور جن میں برملا اس حقیقت کا اعتراف کیا گیا ہے کہ پاکستان کو بھارت پر مکمل نیوکلیائی برتری حاصل ہے اور اس کے ایٹمی اسلحے اور تیاری کا معیار بھارت سے کئی درجے بڑھ کر ہے، تو جنرل پرویز مشرف کے اس بیان کی اچھی طرح سمجھ آ جاتی ہے کہ پاکستان نے ابھی اپنے سارے پتے دنیا کے سامنے نہیں رکھے اور بعض معاملات میں خصوصی رازداری کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔

13 دسمبر کو بھارتی پارلیمنٹ پر دہشت گردوں کے مبینہ حملے کے بعد سے بھارت کی مسلسل جارحیت کے جواب میں پاکستان کی طرف سے صبر و تحمل اور متعدد مرتبہ صورت حال کو بذریعہ باہمی گفتگو اور مشاورت سے حل کرنے کی بات کی جا رہی ہے، پاکستان کے ذمے دار حکام ہر فورم پر یہ بات کہہ چکے ہیں کہ وہ بھارت سے ہرگز جنگ لڑنا نہیں چاہتے اور دہشت گردوں کے اتنے ہی مخالف ہیں، جتنا کہ بھارت بلکہ اس سے بھی بڑھ کر پاکستان نے دہشت گردی کے خلاف محاذ میں فرنٹ لائن اسٹیٹ کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ طالبان اور القاعدہ کے ساتھ ہونے والی امریکی لڑائی میں پاکستان کے دہشت گردوں کے خلاف مثالی کردار کی صدر بش نے برملا تعریف کی ہے اور بھارت کو بتایا ہے کہ اب تک سینکڑوں القاعدہ ممبران کو پاکستان گرفتار کر کے امریکہ کے حوالے کر چکا ہے۔ کولن پاول، رمز فیلڈ، کوفی عنان، شاہ حسن، ہراری اور ٹونی بلیئر بھارتی وزیراعظم کو متعدد فون کر کے اس بات کی یقین دہانی کروانے کی کوشش کر چکے ہیں کہ پاکستان دہشت گردی میں ملوث نہیں اور اس نے خلوصِ دل سے پارلیمنٹ پر حملہ آوروں کے خلاف تحقیقات میں بھارت کی ہر ممکن معاونت کا وعدہ کیا ہے۔

دوسری طرف پاکستان جیش محمد کے مولانا مسعود اظہر، لشکرِ طیبہ کے حافظ سعید احمد اور سو سے زیادہ جہادیوں کو گرفتار کر چکا ہے۔ پاکستان میں جہادی تنظیموں کے خلاف حکومتِ پاکستان کا کریک ڈاؤن جاری ہے اور خود بھارتی وزیر خارجہ جسونت سنگھ اس کا اعتراف کر چکے ہیں اور انہوں نے پاکستان کی طرف سے گرفتاریوں اور پابندیوں کو مثبت اقدام بھی قرار دیا ہے۔ اس کے بعد کم از کم بھارتی وزیراعظم واجپائی سے یہ امید تھی کہ وہ پاکستان کی ان مخلصانہ کاوشوں کے پیشِ نظر اپنے رویے میں کچھ لچک پیدا کریں گے اور برصغیر کے کروڑوں عوام کے سروں پر جنگ کے خطرات کی لٹکتی تلوار کو

Marfat.com

ہٹانے میں مددگار ثابت ہوں گے لیکن حیرت انگیز طور پر بھارتی وزیراعظم نے اس کے بالکل برعکس رویہ اختیار کیا بلکہ بھارت کے نائب وزیر خارجہ اے ڈی سوامی نے تو جسونت سنگھ کے خیالات کو ''ذاتی'' قرار دے کر ان کی بھارتی پریس کے سامنے شدید مذمت کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کو سبق سکھائے بغیر کوئی چارہ باقی نہیں رہا۔

اس افسوسناک طرزِ عمل پر گو کہ دنیا بھر کے امن پسندوں کی ہمدردیاں پاکستان کو حاصل ہو گئی ہیں لیکن کیا بھارت کے عزائم میں یہ بات آڑے آ سکتی ہے؟ اور کیا عالمی رائے عامہ کے دباؤ کی وجہ سے بھارت اپنے عزائم سے باز آ جائے گا؟ ان سوالات کے جوابات بدقسمتی سے کچھ زیادہ خوش آئند نہیں ہیں۔

بھارت کی خوش قسمتی ہے یا پھر پاکستان کی بدقسمتی کہ 11 ستمبر کے سانحے نے دنیا میں ''رولز آف بزنس'' تبدیل کر دیئے ہیں اور اب دنیا کی تمام بڑی طاقتوں نے جنگِ آزادی، فریڈم مومنٹ یا اپنے حقوق حاصل کرنے کی جدوجہد کو بھی دہشت گردی کے تناظر میں دیکھنا شروع کر دیا ہے، خصوصاً اگر یہ تحاریکِ آزادی مسلمان چلا رہے ہیں تو امریکہ کے نزدیک وہ صرف اور صرف دہشت گردی ہے، یہی وجہ ہے کہ ہماری لاکھ نیک خواہشات اور بار بار کہنے کے باوجود بھی امریکہ کشمیر کی جدوجہد کو تحریکِ آزادی ماننے پر تیار نہیں، جس طرح وہ چیچنیا اور فلسطین میں تحریکوں کو دہشت گردی قرار دیا ہے، اسی طرح کشمیر میں بھی اس کے نظریات کچھ مختلف نہیں اور یہ بات برملا کہی جا سکتی ہے کہ مستقبل میں بھی دنیا کے کسی کونے میں مسلمان اپنے حقوق کے لیے ہتھیار اٹھائیں گے تو وہ دہشت گرد ہی کہلائیں گے۔

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ جنوبی ایشیا میں بھی بھارت کی مہربانیوں سے اس کے دو ہمسایہ ممالک سری لنکا اور نیپال میں بالترتیب تامل تحریک اور ماؤ تحریک نے دونوں ممالک کے امن و امان کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے لیکن کسی مہذب ملک نے سری لنکا کے چیخنے چلانے کے باوجود تامل تحریک کو دہشت گردی کی تحریک قرار نہیں دیا، جس کے ''فدائین'' نے اب تک درجنوں اہم شخصیات کی جانیں لے لی ہیں۔ ان خودکش بم دھماکوں میں بھارتی وزیراعظم راجیو گاندھی بھی جان ہار چکے ہیں، جن کے عہدِ حکومت میں بطور خاص ''را'' نے تامل تحریک کھڑی کی اور اس سے سری لنکا کے خلاف روبہ عمل کیا، یہاں تک کہ بھارت کی فوج نے بھی تامل ٹائیگرز کی عملی معاونت کی، یہ الگ بات ہے کہ بعد میں یہی تحریک خود اپنے ''آقاؤں'' کے گلے میں استروں کی مالا بن گئی، اسی طرح نیپال کے ماؤ نواز باغیوں کو بھی بھارتی پشت پناہی حاصل ہے لیکن ابھی تک ان تحریکوں پر امریکہ کی طرف سے دہشت گردی کا لیبل نہیں لگا۔

یہی بھارت جو آج دہشت گردی کا رونا رو رہا ہے، کو دنیا یاد نہیں دلاتی کہ بھارت کے مہاتما گاندھی بھارتی دہشت گردی کا پہلا شکار ہوئے تھے، اس کے بعد بھارت کے دو وزیراعظم اور درجنوں اہم شخصیات بھارتی دہشت گردوں کے ہاتھوں ماری جا چکی ہیں، یہ بھارت تھا، جس نے سب سے پہلے دلائی لامہ کو بھارت میں پناہ دے کر تبت کا مسئلہ کھڑا کر کے چین سے تعلقات بگاڑے۔ مکتی باہنی کے ذریعے بنگلہ دیش بنوایا اور پھر بنگلہ دیش میں ''بنگا بھومی'' تحریک چلا کر حسینہ معین جیسی بھارت نواز وزیراعظم کے دور میں اتنی کشیدگی پیدا کر دی کہ بھارت کی اس عظیم ترین دوست حکومت سے بھارتی سیکورٹی فورسز کی جھڑپوں نے باقاعدہ سرحدی جنگ کی صورت اختیار کر لی، جس میں بھارتی سیکورٹی فورسز کے کئی جوان مارے گئے۔

مالدیپ، جس کا بھارت کو بنگلہ دیش کی طرح ''محسن'' ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے، کو ابھی تک بھارت میں اپنا

Marfat.com

سفیر رکھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ بھارت اور مالدیپ کا فضائی رابطہ موجود نہیں، جبکہ سری لنکا میں مالدیپ کا سفارت خانہ موجود ہے۔ بھوٹان جیسے ملک، جسے آج تک بھارت کی ایک ریاست سمجھا جاتا تھا، نے بھی بھارت کی بڑھتی ہوئی مداخلت پر بھارت سے احتجاج کر دیا ہے، موجودہ سارک کانفرنس میں اس نے بھارت کی حمایت سے انکار اور پاکستانی مؤقف کی حمایت کر کے ایجنڈے کی تیاری میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔ 4 سے 6 جنوری تک کھٹمنڈو میں ہونے والی اس 11 ویں سارک سربراہ کانفرنس میں بھارت نے بڑی چالاکی سے پاکستان کو ٹریپ کرنے کے لیے دہشت گردی سے متعلق تحریک پر بہت زور دیا لیکن پاکستان نے اس تحریک کی حمایت کر دی، کیونکہ پاکستان خود بھارتی دہشت گردی کا شکار ہے۔ اس کانفرنس میں بھارت اپنی مرضی کا ایجنڈا اختیار کرنا چاہتا تھا لیکن دیگر ممبر ممالک نے پاکستانی مؤقف کی حمایت کی اور بھارت اپنی من مانی نہیں کر سکا۔

بھارت کی بڑھتی ہوئی جارحیت روکنے کے لیے پاکستان ہر ممکن سفارتی کوششیں کر رہا ہے اور اب شنید ہے کہ پاکستانی حکومت ایک وفد بھی اس ضمن میں غیر ممالک میں روانہ کر رہی ہے لیکن اس مرحلے پر یہ امر انتہائی افسوسناک ہے کہ پاکستان برادر مسلم ممالک کی توجہ اور ہمدردیاں حاصل نہیں کر سکا گو کہ ایران نے پاکستان اور بھارت کے درمیان مصالحت کے لیے کردار ادا کرنے کی پیش کش کی ہے لیکن ابھی تک مسلم ممالک کی طرف سے بھارت کو جارحیت سے روکنے کی مثبت کوشش بظاہر دکھائی نہیں دے رہی۔

البتہ جنرل مشرف کا حالیہ ایک روزہ دورۂ چین پاکستان کے لیے قدرے اہمیت کا حامل ہے، کیونکہ چین ہمارا ایسا ہمسایہ دوست ہے جو کسی بھی مشکل وقت میں پاکستان کو اکیلے نہیں چھوڑتا اور چین کی طرف سے بھارت اور پاکستان دونوں سے صورتِ حال کو مزید کشیدہ نہ کرنے کی اپیل بھی کی گئی ہے۔ امریکہ اور برطانیہ کی طرف سے بھی ایسی اپیلیں کی جا رہی ہیں اور وزیراعظم ٹونی بلیئر کا موجودہ ہنگامی دورۂ پاک بھارت بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے لیکن بھارت پر فی الحال ان کوششوں کا کچھ اثر ہوتا دکھائی نہیں دے رہا، اس کی سب سے بڑی وجہ خود بھارتی حکومت کے اندرونی اختلافات ہیں۔ بھارت پر مسلط جن سنگی قیادت دہلی سے زیادہ ناگ پور (آر ایس ایس کا ہیڈ کوارٹر) کے فیصلوں کی پابند دکھائی دیتی ہے۔ وزیراعظم واجپائی ذاتی طور پر کچھ بھی نظریات رکھتے ہوں، ایل کے ایڈوانی، یشونت سنہا اور پارٹی میں موجود آر ایس ایس کے دوسرے نیتاؤں کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ آگرہ مذاکرات اس کی بہترین مثال ہے۔ جو ان انتہا پسند بھارتی رہنماؤں نے عین آخری لمحات میں ناکام بنا دیئے تھے۔ بھارت کی مسلسل سفارتی اور فوجی جارحیت سے بظاہر یہی دکھائی دیتا ہے کہ وہ 11 ستمبر کے بعد سے پیدا ہونے والی صورتِ حال سے بھرپور استفادہ کرنے کی ٹھان چکا ہے اور گزشتہ 13 سال میں جو مقصد وہ اپنی چھ لاکھ فوج کے ذریعے حاصل نہیں کر سکا، اسے موجودہ بین الاقوامی تناظر کے پس منظر سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کے ذریعے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ بھارت کشمیر کی تحریکِ آزادی کو دہشت گردی کی آڑ لے کر کچل دینے کا عزم کر چکا ہے۔ ان حالات میں اسے پاکستان کے مقابلے میں (ہماری بے پناہ خوش فہمی کے باوجود) امریکہ کا زیادہ تعاون حاصل ہے۔ 13 دسمبر کے بعد بھارت میں امریکی سفیر رابرٹ بیک ول نے یہ بیان بھی دیا کہ بھارتی پارلیمنٹ پر دہشت گردوں کا حملہ بالکل ایسا ہی ہے، جیسا 11 ستمبر کو ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر ہوا تھا۔ بین الاقوامی سفارتی حلقوں میں یہ بات گردش کر رہی ہے کہ جنرل ٹومی فرینکس، بحر اوقیانوس میں امریکی سینٹرل کمانڈ کے سربراہ ایڈمرل ڈینس بلیئر بھارتی وزیر خارجہ جسونت سنگھ اور وزیر داخلہ ایڈوانی اور وزیر

Marfat.com

دفاع جارج فرنانڈس کو آزادی کشمیر میں نام نہاد دہشت گردوں کے گرم تعاقب کے لیے حملے کا دورانیہ مختصر رکھنے کی صورت میں امریکی غیر جانب داری کا یقین دلا چکے ہیں۔ پاکستان میں امریکی انفارمیشن سروسز کا جاری کردہ ''حقائق نامہ'' ہمارے بھولے بادشاہوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے، جس میں اُمہ تعمیرِ نو کے ایٹمی سائنس داں ڈاکٹر بشیر الدین محمود، عبدالمجید اور صنعت کار ایم طفیل کے طالبان اسامہ بن لادن اور القاعدہ سے تعلق کا انکشاف موجود ہے، ان پر سنگین الزام تراشی کی گئی۔ امریکی دباؤ پر پاکستان نے اُمہ تعمیرِ نو کے اثاثے ضبط کر لیے ہیں، اس حقائق نامے میں لشکرِ طیبہ کی مبینہ دہشت گردی کا بھی چرچا موجود ہے امریکی صدر جارج بش لشکرِ طیبہ اور جیشِ محمد کو بھی دہشت گرد تنظیمیں قرار دے چکے ہیں اور حکومت کی طرف سے وضاحتوں کے باوجود حافظ سعید اور مولانا مسعود اظہر کی گرفتاری کا پس منظر اچھی طرح سمجھ آ جاتا ہے۔

ہمارے سیاسی پنڈت امریکی طیاروں، بحری جہازوں اور میرین کی پاکستان میں موجودگی کو ایک ڈیٹرنٹ بتا رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کی موجودگی میں بھارت حملے کی حماقت نہیں کرے گا، یہ بات کیوں بھول جاتے ہیں کہ امریکہ بھارتی حملے کا خوف دلا کر پاکستان سے مزید مراعات حاصل کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں یہ خدشات بین الاقوامی پریس میں شائع ہو چکے ہیں کہ بھارتی فوجی اجتماع امریکی آشیرباد اور ملی بھگت کا نتیجہ ہے تاکہ پاکستان بھارت کے ساتھ الجھا رہے اور امریکی افغانستان میں اپنی مکمل مرضی بروئے کار لا کر اپنے تمام مقاصد حاصل کر لیں۔ وجہ کچھ بھی ہو، ہماری تمام تر نیک خواہشات کے باوجود بظاہر یہ دکھائی نہیں دے رہا کہ امریکہ نے بھارت پر فوجیں سرحدوں سے واپس بلانے کے لیے کوئی اخلاقی دباؤ ڈالا ہے، اس کے برعکس امریکی کشمیر کی تحریکِ آزادی کو بھارت کی عینک سے ضرور دیکھنے لگے ہیں، عین ممکن ہے کہ امریکی ڈپلومیسی کو سمجھتے ہوئے جنرل مشرف نے چین کا ہنگامی دورہ کیا ہو، کیونکہ ابھی دس بارہ روز پہلے بھی وہ چار روزہ چینی دورے سے واپس لوٹے تھے۔ عین ممکن ہے کہ امریکہ پاکستان اور بھارت کے درمیان مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کا بھی خواہش مند ہو، کیونکہ اس کے وسیع تر مفادات کے لیے اس خطے میں امن و امان ناگزیر ہے۔ خصوصاً پاک بھارت جنگ کو امریکہ قطعی پسند نہیں کرتا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی محلِ نظر ہے کہ امریکہ بھارت کی مرضی کے خلاف امن کا کوئی فارمولا بھی پیش نہیں کر سکتا۔

بھارت نے اپنی نمبر ون، نمبر ٹو نمبر 21 کور کو پاکستانی سرحدوں پر پھیلا دیا ہے، یہ تینوں بھارت کی اسٹرائیک کور ہیں، جنہیں پاکستان کے دور اندر گھس کر جنگ لڑنے کی خصوصی تربیت دی گئی ہے۔ امریکہ نے اسرائیل کو جدید ترین ریڈار سسٹم ''فالکن'' Falcon جس کی مالیت ایک ارب ڈالر ہے، بھارت کو فروخت کرنے کا اجازت نامہ بھی جاری کر دیا ہے، جو اس سے پہلے امریکہ بھارت کو دینے کے خلاف تھا، ان حالات میں صرف امریکہ پر بھروسا کرنا یا اس سے بہت زیادہ توقعات وابستہ رکھ کر ماضی کی طرح شرمندہ ہونا ہمارے لیے مناسب نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ پاکستان مسلم بلاک کو متحرک کرے، خصوصاً وہ مسلم ممالک، جو بھارت پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں، کے ذریعے بھارت کو اس ایڈونچر سے باز رکھنے کی کوشش کرے، مڈل ایسٹ کے مسلم ممالک سے بھارت کے بے پناہ معاشی مفادات وابستہ ہیں اور پاکستان بھارت کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ ایسی کوششوں سے ہی بھارت کو خطرناک ارادوں سے روکا جا سکتا ہے، ورنہ تو بی جے پی کے صدر رجنا کرشنا مورتی تو پاکستان کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی دھمکی دے چکے ہیں۔ واجپائی، ایڈوانی اور فرنانڈس ہر روز نئی ''چتاؤنی'' دے رہے ہیں اور کچھ عجیب نہیں کہ بھارت کم از کم کشمیر کی سطح تک کسی ایڈونچر کا خطرہ مول لے لے۔

Marfat.com

کیونکہ مختصر دورانیے کے محدود حملے کا اجازت نامہ اسے امریکہ کی طرف سے پہلے ہی حاصل ہے، البتہ یہ بات شاید امریکہ، بھارت یا اسرائیل کے علم میں نہیں کہ بھارت کی طرف سے "محدود حملہ" بھی پاکستان پر "مکمل حملہ" سمجھا جائے گا اور پاکستان نے اپنی سلامتی اور تحفظ کے لیے تمام آپشن کھلے رکھے ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ پاکستان دنیا کو بتا دے کہ وہ کس قوت کی ایٹمی پاور ہے اور کسی بھی جارحیت کا نتیجہ کتنا بھیانک ہو سکتا ہے۔ (روزنامہ جنگ۔ سنڈے میگزین۔ مصنف طارق اسمٰعیل ساگر)

20 جنوری 2002ء کو میرا مضمون بعنوان "بھارت کے جارحانہ اقدامات" شائع ہوا ملاحظہ فرمائیں:

سارک کانفرنس میں جنرل پرویز مشرف کے کمانڈ وڈپلومیٹک مصافحے کے بعد امید کی جا رہی تھی کہ برف کچھ پگھلے گی اور بھارتی حکومت اخلاقی طور پر ہی سہی جواباً گرم جوشی کا مظاہرہ کرے گی لیکن حیرت انگیز طور پر اور عالمی رائے عامہ کی توقعات کے برعکس بھارتی ارباب حکومت نے جن میں جسونت سنگھ، ایڈوانی اور جارج فرنینڈس پیش پیش ہیں، جنرل پرویز مشرف کے اس فراخدلانہ اقدام کی ایسی ایسی توجیہات پیش کیں اور اس پر اس انداز سے خیال آرائی کی، جسے کم از کم سفارتی آداب کے منافی اور ہٹ دھرمی کا رویہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ امید بھی کی جا رہی تھی کہ جس طرح مغربی اور امریکی پریس نے صدر مشرف کے اس اقدام کو سراہا ہے، برطانوی اور امریکی سربراہان حکومت بھی اس جذبے کا احترام کریں گے، لیکن حیرت انگیز طور پر برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیئر کے نئی دہلی سے اسلام آباد پہنچنے کے بعد مشترکہ پریس کانفرنس میں اختیار کیے گئے مؤقف نے پاکستانیوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھا دی ہے کہ صدر بش اور ٹونی بلیئر نہ صرف بھارت کی ہٹ دھرمی اور "میں نہ مانوں" والے رویے کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں بلکہ وہ پاکستان پر بلا جواز اپنا دباؤ بھی بڑھا رہے ہیں۔ اس دباؤ بڑھانے کا پس منظر کیا ہے؟ یہ بھی اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی۔

برطانوی وزیراعظم نے لگی لپٹی رکھے بغیر 11 ستمبر، یکم اکتوبر اور 13 دسمبر کے واقعات کو دہشت گردی کے ایک جیسے واقعات کہہ کر دراصل بھارت کے اس بے جا پروپیگنڈے کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، جو وہ یکم اکتوبر کو سرینگر اسمبلی پر جعلی حملے کے بعد سے مسلسل کرتا آ رہا تھا اور جسے اس نے 13 کو بھارتی پارلیمنٹ پر ایک سازشی حملے کے ذریعے حقیقت ثابت کرنے کے لیے اپنی پارلیمنٹ کے باہر بے گناہوں کے خون سے ہولی بھی کھیلی۔

برطانوی وزیراعظم کے اس بیان کے بعد بھارت کا یہ استدلال ہے کہ پاکستان اس سلوک کا مستحق ہے، جو امریکہ نے افغانستان سے کیا یا پھر اسرائیل فلسطینیوں کے ساتھ کر رہا ہے۔ حالانکہ سی آئی اے اور ایم آئی سکس سے زیادہ اور کسے اس حقیقت کا علم ہے کہ بھارت میں علیحدگی، آزادی اور نسلی تعصب کی بنیاد پر تقریباً 34 تنظیمیں سرگرم عمل ہیں، جن میں الفا اور زنبیر سینا جیسی جماعتیں بھی موجود ہیں، جن کے نزدیک انسانی جان کی قیمت نہ ہونے کے برابر ہے اور جو بھارتی حکومت کے لیے مسلسل دردِ سر بن چکی ہیں۔ یہ بات ریکارڈ پر موجود ہے کہ بمبئی کے دھماکوں میں وہاں کی بڑی مافیا ملوث تھی، جس نے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے ایک ہی روز میں درجنوں دھماکے کیے، سینکڑوں بے گناہوں کی جان لی اور درجنوں عمارتیں تباہ کر دیں۔ داؤد ابراہیم، چھوٹا ارجن اور چھوٹا شکیل جیسے مافیا کے لوگ جب ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں تو راستے میں آنے والی ہر شے کو تباہ کر دیتے ہیں۔ ان تنظیموں اور مافیا کی طرف سے کی جانے والی ہر کارروائی بھارتی حکومت آئی ایس آئی کے کھاتے میں ڈال دیتی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ سارک کانفرنس میں عین اسی روز جب صدر

Marfat.com

مشرف کھٹمنڈو میں موجود تھے، پاکستان کو بدنام کرنے کے لیے ایک گھناؤنی سازش کی گئی اور سفارت خانے کے ایک اہل کار کے گھر پر حملہ کر کے وہاں سے نیپالی پولیس کے ذریعے جعلی ڈالر اور بھارتی کرنسی برآمد کروائی۔ اس آپریشن کی نگرانی ''را'' کر رہی تھی اور زی نیوز کے کیمرہ مین وہاں پہلے سے موجود تھے۔ سازش بے نقاب ہوئی، نیپالی حکومت نے پاکستان کے زبردست احتجاج پر اس معاملے کی انکوائری کی، پاکستانی سفارت خانے کے ملازم کو بے گناہ قرار دیا اور پاکستان سے معافی مانگی لیکن عالمی امن کے کسی ٹھیکے دار کو بھارت کی اس بھونڈی سازش کے خلاف ایک لفظ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔

یکم اکتوبر کے بعد سے بھارت پاکستان کو دہشت گردی کی دلدل میں گھسیٹنے کے لیے مسلسل سرگرم ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے تمام ڈرامے ناکام ہو رہے ہیں، بوکھلاہٹ میں 13 دسمبر کے ڈرامے کو حقیقت کا رنگ دینے اور اپنے عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے بھارتی حکومت نے اپنی ساری جنگی مشینری سرحدوں پر جھونک کر اب پاکستان کو بلیک میل کرنا شروع کر دیا ہے۔ اصولی طور پر ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ امریکہ اور برطانیہ بطور خاص اس کا نوٹس لیتے اور پاکستان کی طرف سے مسلسل شریفانہ طرزِ عمل کی قدر کرتے ہوئے بھارتی حکمرانوں کی مسلسل دھمکیوں پر ان کی سرزنش کرتے، لیکن اس کے برعکس انہوں نے الٹا پاکستان پر دباؤ بڑھانا شروع کر دیا ہے کہ وہ بھارت کی ناجائز خواہشات کا احترام کرتے ہوئے اس کی فراہم کردہ فہرست کے مطابق پاکستانی شہری ان کے حوالے کر دے، خواہ اس کے لیے بھارت کوئی ثبوت دے یا نہ دے۔ پاکستانی وزیر خارجہ بھارت سے ملزموں کی حوالگی کا معاہدہ کرنے کے لیے تیار دکھائی دے رہے ہیں اور پاکستان بھارت سے بار بار ثبوت مانگ رہا ہے۔

ٹونی بلیئر کی پریس کانفرنس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کشیدگی کی اصل بنیاد مسئلہ کشمیر کو جو برطانوی سامراج ہی کا پیدا کردہ ہے، اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عمل پیرا ہو کر حل کرنے کے لیے بھارت پر دباؤ ڈالنے کے بجائے پاکستان کو ہر قسم کی دہشت گردی ختم کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ اس کا مطلب بظاہر یہی ہے کہ اب امریکہ اور برطانیہ نے جہاد کے ساتھ ساتھ حق خودارادیت کے لیے جدوجہد کو بھی دہشت گردی قرار دے دیا ہے اور وہ پاکستان پر بھی اپنا نام نہاد ''کوڈ آف کنڈکٹ'' جبراً مسلط کر رہے ہیں جو سراسر ناانصافی کے سوا اور کوئی معنی نہیں رکھتا۔

صدر بش نے 9 دسمبر کو اپنے بیان میں کہا کہ پاکستان کو بھارت کے ساتھ کشیدگی کم کرنے کے لیے ابھی کچھ اقدامات کرنے چاہئیں۔ اس '' کچھ اور'' سے ان کی کیا مراد ہے، یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ ان کی بی ٹیم کے کپتان ٹونی بلیئر اس ضمن میں کہہ چکے ہیں کہ پاکستان جیش محمد اور لشکر طیبہ پر پابندی لگا کر اس سے وہی سلوک کرے جو امریکہ القاعدہ سے کر رہا ہے۔ صدر بش کے اس بیان سے یوں دکھائی دیتا ہے، جیسے وہ بھارتی فوج کے دباؤ کے ذریعے پاکستان سے کشمیر اور دہشت گردی کے حوالے سے اپنی مرضی کے مطابق کوئی اقدام کروانا چاہتے ہیں یا پھر اس مسئلے کا حل بھارت کی خواہشات کے مطابق نکالنا چاہتے ہیں۔

امریکہ یہ سلوک اس ملک سے کر رہا ہے، جس نے دہشت گردی کے خلاف امریکہ کے بنائے ہوئے عالمی اتحاد میں فرنٹ لائن اسٹیٹ کا کردار ادا کیا، جس کے 50 ہزار فوجی افغانستان کی سرحدوں پر القاعدہ اور طالبان کو گرفتار کر کے امریکہ کے حوالے کر رہے ہیں اور امریکی پاکستان کی ان خدمات کا نہ صرف برملا اعتراف کرتے ہیں بلکہ اسے ریکارڈ پر بھی لائے

Marfat.com

ہیں۔اس کے برعکس امریکہ کا رویہ یہ ہے کہ وہ بھارتی افواج کی جارحانہ پیش قدمی کے خلاف حکومتِ پاکستان کو احساسِ تحفظ فراہم کرنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کرتا اور کولن پاول برملا کہتے ہیں کہ بھارت سے جنگ کا امکان ابھی ختم نہیں ہوا۔

معروضی حالات کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ جاتی ہے کہ موجودہ صورتحال جو بھارتی فوجی اجتماع سے پیدا ہو گئی ہے، جنوبی ایشیا بلکہ دنیا بھر کے لیے 11 ستمبر سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ بھارت نے جنگی جنون کی انتہا کرتے ہوئے اپنے عوام پر جنگی ٹیکس عائد کر کے کم از کم بھارتی عوام کو یقین دلا دیا ہے کہ وہ پاکستان سے ہر صورت میں جنگ کرنا چاہتا ہے اور اب تک اگر وہ اپنی مذموم کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا تو اس کی وجہ پاکستان کا صلح جویانہ اور امن پسندانہ رویہ ہے۔ یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ اگر بھارت کو عالمی دباؤ پر اپنی فوجیں واپس امن والی پوزیشن پر لانی ہی پڑیں تو اس کے حکمران اپنے عوام کو کیا جواب دیں گے؟

پاکستانی وزارتِ خارجہ کے ترجمان نے 10 جنوری کی بریفنگ میں بڑے واضح الفاظ میں کہا کہ بھارت نے سرحدوں پر بڑی خطرناک صورتِ حال پیدا کر دی ہے اور کسی بھی وقت کوئی معمولی سا واقعہ کسی بڑی تباہی کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ ان حالات میں امریکہ جو خود اس خطے میں موجود ہے اور دہشت گردی سے نمٹ رہا ہے، کوئی خطرناک صورتِ حال پیدا ہونے سے پہلے ہی اسے ''ڈی فیوز'' کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے لیکن چند یوم قبل تک امریکہ کی طرف سے کہا جا رہا تھا کہ ابھی تک جنگ کا خطرہ ٹلا نہیں ہے۔ بھارت کے جنگی جنون کا اندازہ لگانے کے لیے اس کے جنگی اقدامات پر ایک سرسری نظر ڈالنا ہی کافی ہوگا۔

بھارتی فوج 5 کمانڈز پر مشتمل ہے، شمالی کمانڈ کا ہیڈ کوارٹر ادھم پور (جموں) میں، جو مقبوضہ کشمیر میں تعینات ہے۔ مغربی کمانڈ جو پنجاب، راجستھان اور سندھ کی حفاظت پر مامور ہے۔ اس کا ہیڈ کوارٹر چانڈی مندا میں ہے۔ جنوبی کمان جس کو مہاراشٹر اور گجرات میں تعینات کیا گیا ہے، اس کا ہیڈ کوارٹر پونا میں ہے، چین کی سرحد کے ساتھ نارتھ ایسٹرن فرنٹیئر اور آسام کے دفاع پر مامور۔ سینٹرل کمانڈ کا ہیڈ کوارٹر کلکتہ میں ہے جبکہ مشرقی کمان کو آرمی ریزرو کے طور پر رکھا جاتا ہے۔ بھارت نے شمالی، مغربی اور جنوبی کمانڈز کے ماتحت تمام فوجیں پاکستانی سرحدوں پر جمع کر دی ہیں۔ خیال رہے کہ بھارت کی شمالی کمانڈ 3 کورز پر مشتمل ہے، جس میں دنیا کی سب سے بڑی کور XVI ناگ روٹا بھی شامل ہے جو 15 انفنٹری ڈویژن پر مشتمل ہے۔ تادمِ تحریر صورتِ حال یہ ہے کہ بھارت نے 39 ویں انفنٹری ڈویژن اور تین آرمڈ بریگیڈ جو بغاوت کچلنے کی ڈیوٹی پر تعینات ہیں کے علاوہ اس کمان کے باقی تمام ڈویژن لائن آف کنٹرول پر لگا دیئے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ تین ڈویژن فوج فرسٹ اسٹرائیک کور کا حصہ بنا کر بھی شامل کر دی گئی ہے۔ یہ فورس سینٹرل کمانڈ سے اس طرف بھیجی گئی ہے۔ مغربی کمان کی تینوں کورز پاکستانی سرحدوں پر پہنچ چکی ہیں۔ جنوبی کمان کے ساتھ ہی XII کور اور XXI کور پاکستانی سرحدوں پر پہنچا دی گئی ہے۔ علاوہ ازیں تین ڈائریکٹ رپورٹنگ یونٹ، 30 ویں آرٹلری ڈویژن جو مغربی کمانڈ سے آئی ہے، 50 واں انڈیپنڈنٹ پیراشوٹ بریگیڈ اور بھارت کا 33 واں نیوکلیئر آرٹلری یونٹ جو پرتھوی میزائلوں سے لیس ہے، جنوبی کمانڈ کی طرف سے پنجاب اور راجستھان کی سرحد پر مورچے سنبھال چکے ہیں۔ بھارتی فضائیہ کی 5 آپریشنل کمانڈز میں سے 4 کمانیں اور نیوی کی تینوں نیول کمانڈز پورے لاؤ لشکر کے ساتھ پاکستان کے خلاف مورچہ بند ہیں۔

Marfat.com

اتنے ہولناک فوجی اجتماع کا مقصد کیا ہے؟ اور ایک مرتبہ انہیں پاکستانی سرحدوں پر پہنچانے کے بعد واپسی کے امکانات کس حد تک ہیں؟ یہ دونوں بڑے پریشان کن سوالات ہیں۔ بھارت کی طرف سے اس کی ایک ہی توجیہہ پیش کی جارہی ہے کہ پاکستان کشمیر کی تحریکِ آزادی کو بھارتی خواہشات کے مطابق دہشت گردی قرار دے کر تمام مجاہد تنظیموں پر پابندی لگائے۔ظاہر ہے کہ اس کے بعد بھارت مطالبات کی ایک اور فہرست پیش کردے گا۔

اس صورتِ حال میں امریکہ کی پاکستان کو دی جانے والی اب تک کی ڈکٹیشن سے صرف ایک بات سمجھ میں آتی ہے کہ امریکہ بھارت کو جنگ سے روکنے میں ناکامی کا خدشہ ظاہر کر کے پاکستان پر دباؤ بڑھا رہا ہے اور بظاہر ایسا دکھائی دے رہا ہے کہ جنوبی ایشیا میں اپنی فوجی موجودگی کے بعد امریکہ اب مسئلہ کشمیر کو بھی بھارت کی شرائط طے کروانا چاہتا ہے۔اس ضمن میں بھارت اور امریکہ کے درمیان مکمل ہم آہنگی ہے۔ 11 ستمبر کے بعد امریکہ نے افغانستان کے 9 ہمسایہ ممالک میں 13 فوجی اڈے قائم کر لیے ہیں۔ بلغاریہ اور ازبکستان سے ترکی تک 60 ہزار امریکی فوجی مکمل سامان جنگ کے ساتھ یہاں موجود ہیں اور ان ممالک کے ہوائی اڈوں سے سینکڑوں امریکی طیارے روزانہ اڑتے اور اترتے ہیں۔ باہمی معاہدوں کے تحت جو کرغیزستان، تاجکستان اور پاکستان سے طے پائے ہیں، ان ممالک کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ ان اڈوں کے ضمن میں مکمل آزادی کا اہتمام کریں گے۔امریکہ جانتا ہے کہ اگلے تین عشروں میں مشرق وسطیٰ میں تیل اور گیس کے ذخائر ختم ہو جائیں گے اور دنیا میں تیل اور گیس کا سب سے بڑا ذخیرہ وسطی ایشیاء میں ترکمانستان سے بحیرۂ کیسپین تک رہ جائے گا۔ان وسائل پر واحد سپر پاور ہونے کے ناتے امریکہ اپنا حق جتاتا ہے اور اپنے اقتصادی مقاصد کے حصول کے لیے امریکہ نے یہ اڈے قائم کیے ہیں۔اب وہ اس خطے میں ''جہادی گڑبڑ'' برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں اور ایسی ہر قوت جو مستقبل میں ''جہاد'' کو پروان چڑھائے یا امریکہ کے ''نازک مزاج شاہاں'' پر بار گزرے، کا قلع قمع کرنے کے لیے امریکہ آخری حد تک جائے گا اور بھارت اسے اپنا حلیف دکھائی دے رہا ہے، کیونکہ روس اور چین اپنی مجبوریوں کے باوجود اس خطے میں بڑھتے ہوئے امریکی تسلط کے خلاف بالآخر آواز بلند کریں گے۔ان حالات میں بھارت امریکہ کا بہترین دوست ثابت ہوگا۔

اسرائیلی وزیر خارجہ کا دورۂ بھارت اور یہ بیان کہ اسرائیل اور بھارت دونوں کو مسلم دہشت گردی کا سامنا ہے، کسی بھی صاحب عقل کو یہ سمجھانے کے لیے کافی ہے کہ اسرائیل، بھارت اور امریکہ کا اسٹریٹجک اتحاد عمل میں آچکا ہے۔ ایران نے اس خطرے کو ابھی سے محسوس کر کے اس پر سخت احتجاج کیا ہے۔ بھارت اسرائیل کے ذریعے امریکہ سے ہر ممکن سہولت اور اعانت حاصل کر سکتا ہے۔

دوسری طرف پاکستانی وزارت خارجہ کی کارکردگی کا یہ عالم ہے کہ ابھی تک وہ متعدد اعلانات کے باوجود بھارت کو اپنے مطلوب ملزمان کی فہرست نہیں دے سکی ہے جو پاکستان میں دہشت گردی کرنے کے بعد بھارت میں پناہ حاصل کر چکے ہیں۔ان حالات میں یوں لگتا ہے جیسے امریکہ نے بھارت کی مدد سے یا پھر بھارت نے امریکہ کی شہ پر پاکستان کو ماضی میں دنیا بھر کے مسلم حریت پسندوں کی اخلاقی حمایت کا مزہ چکھانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔؟ (روزنامہ جنگ سنڈے ایڈیشن مصنف طارق اسمٰعیل ساگر)

Marfat.com

ایک کے بعد ایک

نائن الیون کے بعد سے دنیا کی بدلتی صورتحال اور بھارت کی طرف سے پارلیمنٹ پر حملے کا الزام پاکستان پر لگا کر پاکستانی سرحدوں پر بھارتی فوج کا اجتماع پاکستان کے لیے بڑے مسائل پیدا کررہا تھا۔ افغانستان میں امریکی فوج کی موجودگی طالبان اور القاعدہ کے خلاف کارروائیاں اور عالمی راہنماؤں کے پاک بھارت دورے عروج پر تھے۔ جنوری میں صدر جنرل مشرف نے قوم سے خطاب میں ''روشن خیال اعتدال پسندی'' کا نظریہ متعارف کروایا۔ 27 جنوری 2002ء کو تازہ ترین صورتحال کے حوالے سے میرا ایک اہم مضمون روزنامہ جنگ میں شائع ہوا ملاحظہ فرمائیں:

صدر جنرل پرویز مشرف کے خطاب سے وابستہ مغربی ممالک خصوصاً امریکہ کی تمام توقعات پوری ہو چکی ہیں اور بلاشبہ صدر کے خطاب کو عالمی اور ملکی سطح پر بے حد سراہا گیا۔ خصوصاً صدر بش اور امریکی سیکرٹری آف اسٹیٹ، کولن پاول نے اس جرأت مندانہ خطاب اور اس کے بعد حکومت پاکستان کی طرف سے کی جانے والی عملی کارروائیوں کا زبردست خیر مقدم کیا اور برملا اس بات کا اعتراف کیا کہ صدر مشرف نے پاکستان کو ایک جمہوری اور مہذب ملک بنانے کا عزم کر رکھا ہے اور وہ دہشت گردی کے خلاف ہر ممکن اقدام کر رہے ہیں۔ جہاں تک صدر کے اقدامات کا تعلق ہے تو انہوں نے لشکرِ طیبہ، جیش محمد کے ساتھ ساتھ سپاہ صحابہ، تحریک نفاذ فقہ جعفریہ، تحریک نفاذ شریعتِ محمدی پر پابندیاں عائد کر کے اور دو ہزار سے زیادہ جہادیوں اور انتہا پسندوں کو گرفتار کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ باتوں سے زیادہ عملی اقدامات کے قائل ہیں اور اس ضمن میں آخری حد تک بھی جا سکتے ہیں۔

باور کیا جاتا ہے کہ صدر جنرل مشرف نے جن اقدامات کا اعلان کیا، ان پر بڑی سختی سے عمل پیرا بھی ہیں۔ ایسے اقدامات کرنے کے بارے میں ان کے پیش رو بھی سوچا کرتے تھے، لیکن ان اقدامات کے نتیجے میں ہونے والی مزاحمت اور اس مسئلے کی حساس نوعیت کے پیشِ نظر وہ ایسا کرنے کی خواہش رکھنے کے باوجود جرأت نہ کر سکے لیکن جنرل پرویز مشرف نے ایسا کر دکھایا۔

صدر مشرف کے اس خطاب کو عالمی سطح پر جو پذیرائی ملی، اس کے بعد ساری دنیا کو اُمید تھی کہ بھارت، جس کے پاس اب کوئی دلیل باقی نہیں رہی ہے اور وہ اس خطے میں امن کو درپیش ہولناک خطرات کے پیشِ نظر فوراً سرحدوں سے اپنی افواج کو واپس بلا کر خود بھی ایک مہذب اور ذمہ دار ملک ہونے کا ثبوت دے گا اور سرحدوں پر روز بروز بڑھتا ہوا تناؤ، جو کسی بھی لمحے کسی بڑے حادثے کا پیش خیمہ بن سکتا ہے، ختم ہو جائے گا لیکن حیرت انگیز طور پر بھارتی حکومت کا رویہ مہذب ترین الفاظ میں بھی ہٹ دھرمی بن کر رہ گیا ہے۔ اس تقریر پر بھارت نے فوری ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ اگلے روز بھارتی وزیر

Marfat.com

خارجہ، جسونت سنگھ نے ایک مختصر سا بیان جاری کیا، جس میں شاید انتہائی مجبوری کے عالم میں صدر کے خطاب کو مثبت تو قرار دیا لیکن اپنی ''تریا ہٹ'' کا مظاہرہ کرتے ہوئے فوجیں ہٹانے سے متعلق ایک لفظ بھی کہنے سے انکار کرتے ہوئے عجیب و غریب تاویل پیش کی کہ بھارت، صدر جنرل پرویز مشرف کے اعلان کردہ اقدامات پر عمل درآمد کا منتظر ہے، جس کے بعد ہی وہ کچھ فیصلہ کر پائیں گے۔ بھارت کے وزیرِ دفاع جارج فرنانڈس نے جو بھارت کی ایک مظلوم اقلیت کے نمائندہ ہونے کے باوجود محض سرکار کی چاپلوسی کے لیے ضرورت سے زیادہ سخت اور غیر پارلیمانی زبان استعمال کر رہے ہیں، وزیر خارجہ جسونت سنگھ کے برعکس کسی بھی صورت میں فوجوں کو پیچھے ہٹانے کے مفروضے ہی کو غلط قرار دیا۔

بھارتی حکومت کے اس رویے پر پاکستان ہی نہیں مہذب دنیا کا ہر شخص انگشت بہ دندان ہے کہ خود کو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت قرار دینے والوں کا طرزِ عمل ایسا افسوسناک بھی ہوسکتا ہے۔

17 جنوری کو کولن پاول بھارت میں جسونت سنگھ کے ساتھ پریس کانفرنس سے خطاب کر رہے تھے، تو وہاں بھی انہوں نے جنرل پرویز مشرف کے اقدامات کو سراہا لیکن اس کے ساتھ ہی ان کا یہ کہنا کہ ''بھارت'' Action on Ground کیوں چاہتا ہے، وہ جانتے ہیں کئی نئے سوالات پیدا کرے گا۔ جسونت سنگھ نے جواب صدر پاکستان کو ہزایکسی لینسی جنرل مشرف کہہ کر مخاطب کرنے لگے ہیں، اپنی پرانی رٹ دہرائی اور اس بات پر اڑے رہے کہ پاکستان نے جو کچھ کیا ہے، اس کا عملی مظاہرہ بھی کرے۔ اس کے بعد ہی ہم کولن پاول کی خواہش کے مطابق ڈپلومیٹک، سیاسی، فضائی اور زمینی روابط کا سلسلہ آگے بڑھائیں گے۔ جب کولن پاول سے اس ضمن میں سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ جنرل مشرف نے جو کچھ کہا، اس کا عملی مظاہرہ وہ دیکھ چکے ہیں۔ پاکستان نے پانچ تنظیموں پر پابندی لگائی، ان کے کارکنوں کو گرفتار کر کے پابند سلاسل کیا، ان کے دفاتر کی تالابندی کی اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ جنرل مشرف اس ضمن میں مزید اقدامات بھی کریں گے لیکن بھارت چونکہ ایک آزاد اور خود مختار ملک ہے، اس لیے وہ اس سلسلے میں بہتر فیصلہ کرسکتا ہے۔ اس مرحلے پر انہوں نے ایک اور سوال کے جواب میں امریکہ کا بطور فریق بھارت اور پاکستان کے درمیان بات چیت میں حصہ لینے اور ثالث کا کردار ادا کرنے کو بھی بھارت اور پاکستان سے مشروط کر دیا اور کہا کہ خطِ متارکۂ جنگ کو مستقل سرحدی لکیر قرار دینے کا فیصلہ بھی امریکہ نہیں کرسکتا، جو بھی فیصلہ ہو وہ بھارت اور پاکستان کے درمیان براہِ راست مذاکرات کے ذریعے ہی ہوسکتا ہے۔ البتہ اگر فریقین خواہش کا اظہار کریں تو امریکہ اس مسئلے پر دونوں کی معاونت کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہے گا۔

اس پریس کانفرنس میں بھارتی ذرائع ابلاغ کے نمائندوں نے حکومتی نمائندوں کی ذمے داریاں بھی بخوبی نبھائیں اور پہلے سے فیڈ کیے ہوئے سوالات کر کے بظاہر پریس کانفرنس کی فضا کو اشتعال انگیز بنانا چاہا۔ انہوں نے جنرل مشرف کے اس فقرے کا بطور خاص ذکر کیا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ کشمیر ہماری رگوں میں خون کی طرح دوڑ رہا ہے اور یہ چاہا کہ کولن پاول اس فقرے کا نوٹس لیں لیکن یوں لگتا ہے کہ اب امریکی واقعی بھارت کی راج نیتی کو سمجھنے لگے ہیں۔ انہوں نے اس سوال کا جواب بھی بڑے تحمل سے دیا اور قطعاً ایسا تاثر پیدا ہونے نہیں دیا، جس سے بھارتی حکومت کو یہ تاثر ملے کہ امریکہ بھی کشمیر کو بھارت کی طرح اس کا اٹوٹ انگ سمجھتا ہے۔

Marfat.com

کولن پاؤل کی پریس کانفرنس سے یہ تاثر ملتا تھا کہ انہوں نے صدر مشرف کی طرف سے بھارتی حکومت کو کچھ یقین دہانیاں بھی کروائی ہیں اور ان کے سامنے اس مسئلے کو بات چیت کے ذریعے حل کرنے کے لیے کچھ تجاویز بھی رکھی ہیں لیکن یوں لگتا ہے جیسے بھارتی خود اپنے بچھائے ہوئے جال میں پھنس چکے ہیں اور اب ان کی پوزیشن سانپ کے منہ میں چھچھوندر والی ہو کر رہ گئی ہے، کیونکہ بھارت نے فوجیں سرحدوں پر خود جمع کی تھیں۔ پاکستان نے ردِعمل اور ممکنہ بھارتی جارحیت کے پیشِ نظر دفاعی اقدامات کیا اور بھارتی پروپیگنڈے کے برعکس اس مرتبہ ساری دنیا نے اس بات کو تسلیم بھی کرلیا ہے حالانکہ جارج فرنانڈس نے امریکہ میں یہ بیان دیا ہے کہ ہمارا فوجی اجتماع ردِعمل ہے۔ اس بیان کو سوائے مضحکہ خیز ہونے اور کیا نام دیا جاسکتا ہے۔ اب بھارت کے لیے صدر پرویز مشرف نے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی اور اخلاقی طور پر اسے پابند کر دیا ہے کہ وہ اپنی فوجیں پیچھے ہٹائے، جبکہ بھارت کے لیے اپنے عوام کا سامنا کرنا کار دارد ہے۔ دوسری طرف پنجاب اور اترپردیش کے انتخابات سر پر ہیں اور بھارتی حکومت کے لیے ان دونوں صوبوں میں ناکامی کا خطرہ سر پر منڈلا رہا ہے۔ اگر وہ فوجی جنون میں کمی کرتا ہے تو وہ انتہا پسند عناصر جن کے ذریعے بی جے پی نے اقتدار حاصل کیا اس کے مخالف نہیں تو غیر جانبدار ضرور ہو جائیں گے۔ اس لیے بھارت فروری کے آخر تک بہ ہر صورت جنگی فضا بنائے رکھنے پر مجبور ہے۔

صدر مشرف کی تقریر کے بعد بھارت کے اندر حکومت کے لیے مشکلات بڑھ رہی ہیں۔ ممتاز بھارتی اپوزیشن لیڈر نہ صرف بی جے پی حکومت کی طرف سے غیر ملکی دورہ کرنے سے گریزاں ہیں بلکہ اپوزیشن کی مضبوط جماعتوں کی طرف سے یہ مطالبہ بھی زور پکڑنے لگا ہے کہ جس طرح صدر مشرف نے پاکستان میں دہشت گرد عناصر پر گرفت کی ہے، بھارت بھی انتہا پسند جن سنگھی ٹولے کو لگام دے اور کم از کم آر ایس ایس، وشواہندو پریشد اور بجرنگ دل جیسی مسلمان دشمن جماعتوں پر پابندی لگائے۔ اس مطالبے کو بھارت کے عوام میں بھی پذیرائی ملنے لگی ہے، کیونکہ بھارت کے باشعور عوام یہ بات جاننے لگے ہیں کہ صدر جنرل مشرف، جنہیں وہ کارگل کا آرکیٹیکٹ سمجھتے تھے، دراصل ایک مدبر ہیں اور وہ دلی طور پر پاکستان اور بھارت کے درمیان دوستانہ تعلقات کے خواہش مند ہیں تاکہ اس خطے سے غربت، جہالت اور بے روزگاری کا خاتمہ ہو اور یہاں کے کروڑوں عوام کو بھی دنیا کے دیگر مہذب ممالک کی طرح باوقار زندگی جینے کا حق مل سکے۔ صدر مشرف نے اپنے دورہ آگرہ کے دوران بھارتی عوام سے جو براہ راست رابطہ کیا تھا، بھارتی عوام صدر کے موجودہ خطاب کے بعد یہ سوچنے لگے ہیں کہ وہ اس میں واقعی مخلص ہیں جبکہ ان کے اپنے حکمرانوں کا طرزِ عمل روز بہ روز افسوسناک ہوتا جارہا ہے۔

واجپائی ہوں، جسونت سنگھ یا ایڈوانی اور یشونت سنہا، یہ تمام لوگ ایسی انتہا پسند جماعتوں کی پیداوار ہیں، جن پر بھارت میں پابندیاں لگانے کا مطالبہ زور پکڑ رہا ہے۔ اس جن سنگھی ٹولے کا ایجنڈہ وہ آگے بڑھا رہے ہیں۔ بھارت جیسے بڑی آبادی والے ملک کے عوام کو جنگی جنون میں مبتلا کرنا ہرگز دانش مندی نہیں، لیکن یہ بی جے پی کی پالیسی کا حصہ ہے اور ان کی لیڈر شپ آج بھی اس بات کی قائل ہے کہ وہ انتہا پسندانہ جذبات کو ہوا دے کر اپنے حق میں فضا بنائے رکھیں گے۔ ایک لحاظ سے یہ ان کی مجبوری بھی ہے کیونکہ انہیں ماضی کے تجربے نے اس کا قائل کر دیا ہے کہ بھارتی عوام کے جذبات سے کھیل کر کوئی بھی سیاسی جماعت اپنا اُلو سیدھا کر سکتی ہے۔

Marfat.com

1977ء کے بھارتی انتخابات میں بی جے پی کو صرف دو نشستیں ملی تھیں۔ 25 سال بعد بی جے پی اگر برسر اقتدار آئی ہے، تو اس میں سب سے اہم کردار ان کی ''ہندوتا'' نے ادا کیا ہے۔ آج جو سیاسی مبصرین وزیراعظم واجپائی کو ایڈوانی کے سامنے لاچار جانتے ہیں، انہیں شاید اس بات کا علم نہیں کہ یہ لال کرشن ایڈوانی کی ''رتھ یاترا'' تھی، جس نے بھارت کے انتہا پسند ہندو ووٹ کو بی جے پی کی جھولی میں ڈالا تھا۔ ایڈوانی نے ہر ممکن طریقے سے مسلم دشمن جذبات کو ہوا دی اور بھارتی تاریخ کا بدترین سانحہ بابری مسجد کی شہادت بھی ان ہی کا کارنامہ ہے، جس کے بعد بھارت کا تمام مسلم دشمن ووٹ بی جے پی کو مل گیا۔ ان حالات میں واجپائی کے لیے ایڈوانی کی کسی بات کو ٹھکرانا کیسے ممکن ہے؟ بھارت میں عیسائیوں کے خلاف پُرتشدد مہم کا سہرا بھی لال کرشن ایڈوانی کے سر باندھا جاتا ہے، حالانکہ واجپائی اس کے خلاف تھے، لیکن ایڈوانی کے سامنے ان کی ایک نہ چلی۔

بی جے پی کی طرف سے ٹاڈا بھی زیادہ سخت اور انسانیت کش قانون ''پوٹو'' (پری وینشن آف ٹیررسٹ آرڈیننس) کی بھارت کی تمام اپوزیشن جماعتیں سخت مخالفت کر رہی تھیں۔ تہلکہ اسکینڈل کے بعد یو ٹی آئی اسکینڈل میں بھارتی وزیراعظم واجپائی کو ملوث کیا جا رہا تھا۔ مرلی منوہر جوشی کی نیشنل کونسل فار ایجوکیشن ریسرچ اینڈ ٹریننگ کے تحت بھارت میں تمام مذاہب کے لیے ہندوارزسول کو ڈ تعلیمی نظام رائج کرنے کا اعلان، شمال شرقی ریاستوں کی مضبوط علیحدگی پسند تنظیمیں، یو پی اور پنجاب کے الیکشن، یہ سب ایسے مسائل ہیں جو کسی بھی وقت بی جے پی کی حکومت کا دھڑن تختہ کر سکتے ہیں۔ اگر بھارت نے پاکستانی سرحدوں پر جنگی جنون پیدا کر کے اپنے عوام کی توجہ اس طرف مبذول نہ کروائی ہوتی تو جارج فرنانڈس، جو تہلکہ اسکینڈل کی وجہ سے استعفیٰ دینے کے لیے مجبور کر دیئے گئے تھے، دوبارہ کبھی بھارتی لوک سبھا میں نہ گھس پاتے کیونکہ بیشتر جماعتیں ان کو سرکار کے بجائے جیل میں دیکھنے کی خواہش مند تھیں۔

ان مسائل سے بچنے یا عہدہ برآ ہونے کے لیے بی جے پی کی حکومت نے بین الاقوامی صورت حال کو اپنے حق میں استعمال کرتے ہوئے جنگی ہوا کھڑا کیا ہے اور انہیں اس بات کا یقین تھا کہ وہ پاکستان سے کوئی محدود جنگ کرنے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے، جس کے بعد ان کا راج سنگھاسن قائم رہ سکتا ہے لیکن صدر مشرف کی تقریر نے ان کے لیے بے پناہ مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ کے محتاط رویے کے باوجود اس بات سے انکار ہرگز ممکن نہیں کہ دونوں ممالک کی طرف سے خصوصاً جنرل مشرف کے خطاب اور اقدامات کے بعد بھارت پر سرحدی کشیدگی ختم کرنے کرنے کا دباؤ آیا ہے اور کولن پاول نے بھی بھارتی حکومت کو یقیناً صدر بش کی طرف سے ایسا ہی پیغام دیا ہے جب کہ وہ اپنے دورہ پاکستان میں جنرل مشرف کو صدر بش کی طرف سے جلدی دورہ امریکہ کا سندیسہ دے کر بھارت کی تشویش میں اضافہ کر چکے ہیں۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ گیند بھارت کے کورٹ میں ہے، تو بے جا نہ ہوگا۔

شنید ہے کہ برطانوی وزیراعظم، ٹونی بلیئر بھارت کو سلامتی کونسل کی سیٹ دلانے کا وعدہ کر گئے ہیں لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ امریکہ اور برطانیہ کی خواہشات کے باوجود اس خطے میں چین کی موجودگی بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ چین کبھی بھارت کو سلامتی کونسل کا رکن نہیں بننے دیگا اور ایسی قرارداد کو ویٹو کر دے گا، کیونکہ جنوبی ایشیا کے اس حصے میں امریکہ کی موجودگی کا چین نے اب نوٹس لینا شروع کر دیا ہے۔ روسی صدر پوٹن تو امریکہ کو اپنا کام جلد ختم کر کے اپنی

Marfat.com

فوجیں واپس لے جانے کا مشورہ دے ہی رہے تھے کہ اب چینی صدر نے بھی کہہ دیا ہے کہ دہشت گردی کے خاتمے کی آڑ میں کسی کو یہاں قدم جمانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اس لیے امریکہ بھی ایک حد تک ہی بھارت کی ناجائز خواہشات کا احترام کرے گا۔

بھارتی حکومت نے کولن پاول کے ذریعے اب 20 مطلوب افراد کی ایک اور فہرست پاکستان کو روانہ کر دی ہے، یعنی اب 20 کے بجائے 40 افراد مطلوب ہیں۔ یہ مطالبہ بھارت کی طرف سے آخری داؤ ہے جو کھیلا جا رہا ہے۔ کیونکہ کولن پاول نے کہا ہے کہ بھارت ان کے خلاف ثبوت بھی پاکستان کو فراہم کرے گا لیکن امید ہے کہ بھارت کی یہ چال بھی ناکام ہو گی اور اس کے پاس جارحیت کا کوئی منطقی جواز باقی نہیں رہے گا۔ جہاں تک پاکستان کی کشمیر پالیسی کا تعلق ہے، کشمیر کمیٹی بنا کر صدر جنرل پرویز مشرف نے اپنے عزائم ظاہر کر دیئے ہیں اور بھارت کو سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آ گئی ہے کہ اس نے سرحد دہشت گردی کی آڑ میں مسئلہ کشمیر کو گڈمڈ کرنے کا جو سوانگ رچایا تھا، یہ بیل منڈھے چڑھتی دکھائی نہیں دے رہی۔ یہ بات بھارتی حکومت کے لیے از حد پریشان کن ہے۔

ان حالات میں پاکستان یک بہترین حکمتِ عملی یہی ہے کہ وہ بھارت کے لیے جرحیت کا کوئی جواز فراہم نہ کرے اور صدر پرویز مشرف ایسے اقدامات کریں، جن سے وزیر اعظم واجپائی کو فوجوں کی واپسی کا قابلِ عزت راستہ مل جائے۔ ایسا کرنے سے پاکستان کی قدر میں اضافہ ہو گا اور اس سے ہرگز ہمارے جھکنے کا تاثر نہیں ملے گا کیونکہ صدر مشرف بھارتی حکومت کو بطور آرمی چیف جو پیغام دے چکے ہیں وہ بھارتی آرمی چیف کی اچھی طرح سمجھ میں آ چکا ہے۔ (روزنامہ جنگ سنڈے ایڈیشن مصنف طارق اسمٰعیل ساگر)

22 جنوری 2002ء کو کلکتہ کے امریکن سنٹر پر دہشت گردوں نے حملہ کیا اور بھارت نے حسب روایت اس کے ڈانڈے پاکستان سے ملا دیئے۔ اس صورتحال پر 3 فروری 2002ء کو میرا مضمون شائع ہوا جس کا عنوان تھا ''بھارت کا کولکتہ ڈرامہ بھی فلاپ ہو گیا'' ملاحظہ فرمائیں:۔

22 جنوری کو کولکتہ کے امریکن سینٹر پر ہونے والے دہشت گردوں کے حملے نے ایک مرتبہ پھر برصغیر پر چھائے جنگ کے بادلوں کو گہرا کر دیا ہے۔ امریکی سیکرٹری خارجہ کولن پاول کے حالیہ دورے کے بعد یہ امید بندھی تھی کہ شاید اب بھارتی حکمران عقل کے ناخن لیں گے اور اس خطے کے کروڑوں عوام کو گومگو کی اس کیفیت سے نجات دلانے کی کوشش کریں گے۔ صدر جنرل مشرف کے خطاب اور عملی اقدامات کے بعد ساری دنیا ان کے جذبہ خیر سگالی پر داد دے رہی تھی اور بھارت سے یہ اُمید کی جا رہی تھی کہ وہ اب جوابی اقدام کرتے ہوئے فوراً سرحدوں سے اپنی افواج زمانہ امن کی پوزیشن پر واپس لے جائے گا لیکن ساری دنیا کی توقعات کے برعکس بھارتی قیادت نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے عجیب و غریب جواز تراشنا شروع کر دیئے اور پاکستان سے ''عملی اقدامات'' کا تقاضا کیا، جب کہ کولن پاول نے بھارتی وزیر خارجہ جسونت سنگھ کے ساتھ اپنی پریس کانفرنس میں بھارتی میڈیا اور حکومت کو ان عملی اقدامات سے آگاہ کیا جو صدر جنرل پرویز مشرف نے کیے تھے اور اس بات کا یقین دلایا کہ وہ مزید اقدامات بھی کر رہے ہیں اور یہ سب کچھ بڑے اخلاص سے کیا جا رہا ہے لیکن حیرت انگیز طور پر بھارتی حکومت ٹس سے مس نہ ہوئی اور اس کے برعکس پاکستان پر دباؤ بڑھانا

Marfat.com

شروع کر دیا اور راجستھان سیکٹر میں تعینات بھارتی اسٹرائیک فورس کے کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل کپل وج بھارتی فوجوں کو انتہائی خطرناک حد تک سرحد کے نزدیک لے آئے۔ امریکہ اپنے سیٹلائٹ کے ذریعے بھارتی اور پاکستانی افواج کی نقل و حرکت پر مسلسل نظر رکھ رہا ہے۔ اس نے بھارتی حکومت کو وارننگ کے انداز میں اس نقل و حرکت سے منع کرتے ہوئے ہوش مندی سے کام لینے کی ہدایت کی۔ بھارتی حکومت نے امریکی دباؤ کے پیش نظر اپنے اس کور کمانڈر کو زبردستی ریٹائر کر کے گھر بھیج دیا ہے اور اب یوں دکھائی دیتا ہے جیسے پاکستان کے خلاف جارحیت کرنے کے بھارتی عزم کو امریکہ بھانپ چکا ہے اور بھارتی حکومت کو خطے کی نازک صورتِ حال کی وجہ سے امریکہ کی طرف سے حملہ کرنے کی اجازت نہیں مل رہی۔ اس کی ایک وجہ تو پاکستانی حکومت کا دانش مندانہ رویہ اور صدر مشرف کی طرف سے اٹھائے گئے دوسرے اقدامات ہیں۔ دوسری اہم وجہ امریکہ کی اپنی مجبوریاں ہیں، کیونکہ افغانستان میں امریکہ کو موجودہ افغان حکومت کی طرف سے جو امیدیں تھیں وہ بظاہر پوری ہوتی دکھائی نہیں دے رہیں۔ جنرل دوستم اور جنرل فہیم کی فوجوں میں تصادم معمول بنتا جا رہا ہے اور امن و امان برقرار رکھنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ کابل کی حد تک تو اتحادی افواج نے حالات کو جبراً قابو میں کر رکھا ہے لیکن ملک کے دوسرے صوبوں میں شورش جڑ پکڑ رہی ہے۔ ملا عمر کی گرفتاری کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں۔ مقامی سردار انتقام کے خوف سے ملا عمر کو امریکہ کے حوالے نہیں کر رہے کیونکہ اس صورت میں پختون قبائل نے اپنے سرداروں کے خلاف بغاوت کی دھمکی دے دی ہے۔ امریکیوں کو قندھار کی موسمی صورتِ حال کا شاید اندازہ نہیں تھا یہاں انہیں انتہائی غیر متوقع صورتِ حال کا سامنا ہے اور اب تک ان کے دو ہیلی کاپٹر تباہ ہو چکے ہیں اور خطرات بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔

ان حالات میں پاکستان کا بھارت کے ساتھ جنگ میں الجھ جانا امریکہ کے لیے گھاٹے کا سودا ہے۔ وہ پاکستان کی افغان سرحد پر موجود پچاس ہزار فوج کی وہاں موجودگی ضرور سمجھتا ہے، کیونکہ امریکی کسی بھی امکان کو نظر انداز کرنے کے لیے تیار نہیں جبکہ بھارتی واویلے کے باوجود افغانستان کی حد تک اس کے کردار کا بھی امریکیوں کو بخوبی اندازہ ہے۔ اگر شمالی اتحاد کے ایک خاص گروپ تک بھارت کو رسائی حاصل ہے تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ افغانستان میں کوئی رول ادا کرنے کے قابل ہے۔ یہ بات امریکہ بخوبی جانتا ہے کہ پاکستان کا افغانوں کے دلوں میں کیا مقام ہے، کیونکہ فطرتاً افغان احسان فراموش نہیں ہیں۔ بھارت نے پہلے روز سے ہی ان 20 افراد کو اس کے حوالے کرنے کی رٹ لگا رکھی تھی، جس کی لسٹ اس نے پاکستان کو دی تھی۔ پاکستانی وزیر خارجہ عبدالستار نے اس فہرست کے حوالے سے کہا ہے کہ اس میں بعض کیس 1981ء کے ہیں اور کچھ اس کے بعد کے اور پاکستان اس کا جائزہ لے رہا ہے۔ صدر مشرف نے واضح کر دیا ہے کہ وہ کسی پاکستانی شہری کو بھارت کے حوالے نہیں کریں گے اور اگر بھارت کے پاس ان کے خلاف کوئی ثبوت ہیں تو وہ پاکستان کو فراہم کیے جائیں تاکہ ان کے خلاف پاکستانی آئین کے تحت مقدمہ قائم کیا جائے۔

ماضی میں بھی ایسی مثال موجود ہے جب سکھ ہائی جیکر پاکستان میں گرفتار ہوئے اور ان کے خلاف مقدمہ چلا تو بھارتی حکومت کی طرف سے وکلاء نے یہ کیس لڑا اور ان ہائی جیکروں کو پاکستانی آئین کے مطابق سزا بھی دی گئی۔ بھارت کی طرف سے جو فہرست پاکستان کو فراہم کی گئی ہے اس کے کچھ اہم نام ودھوا سنگھ، لکھبیر سنگھ، پرم جیت سنگھ، پریتم سنگھ، ٹائیگر میمن اور داؤد ابراہیم ہیں۔

Marfat.com

ودھوا سنگھ خالصتان کی آزادی کے لیے لڑنے والی ایک تنظیم ببر خالصہ کے سربراہ کا نام ہے جو بھارتی حکومت کو 1982ء سے مطلوب ہے اور بھارتی حکومت بہ ضد ہے کہ ودھوا سنگھ پاکستان میں روپوش ہے، جب کہ پاکستان متعدد مرتبہ اس کے شواہد فراہم کر چکا ہے کہ اس نام کا کوئی شخص پاکستان میں موجود نہیں۔ دوسرا نام لکھبیر سنگھ کا ہے جو سنت جرنیل سنگھ بھنڈرانوالا کا بھتیجا اور دربار صاحب کے سابقہ ہیڈ گرنتھی جسبیر سنگھ روڈے کا بھائی ہے۔ لکھبیر سنگھ کینیڈا کا ایک بزنس مین ہے جس کا بھائی جو کبھی اسی کی طرح بھارت کو مطلوب تھا اور جسے بھارتی انٹیلی جنس ایجنسی تھائی لینڈ سے گرفتار کر کے لائی تھی چند ماہ بعد ہی رہا ہو کر عدالتوں سے بری بھی ہو گیا اور بعد میں دربار صاحب کا ہیڈ گرنتھی بھی بنا رہا۔ حیرت کی بات ہے کہ لکھبیر سنگھ کا پتہ اس سے پوچھنے کے بجائے بھارتی حکومت اسے پاکستان میں تلاش کر رہی ہے۔ پرم جیت سنگھ پنجوڑ خالصتان کمانڈو فورس کا سربراہ اور بھارتی حکومت کو 1984ء سے مطلوب ہے اب اچانک بھارت کو یاد آ گیا ہے کہ وہ بھی پاکستان میں چھپا ہوا ہے۔ اسی طرح پریتم سنگھ بھی سکھ سٹوڈنٹس فیڈریشن کا صدر ہے اور بھارتی حکومت کو 1984ء ہی سے مطلوب ہے۔ داؤد ابراہیم اور ٹائیگر میمن کا تعلق ممبئی کی مافیا سے ہے۔ داؤد ابراہیم کی دہشت کا یہ عالم ہے کہ بھارتی حکومت نے گذشتہ دنوں جب اس کی ضبط شدہ جائیداد نیلام کرنے کی کوشش کی تو پورے مہاراشٹر میں کوئی اس کی بولی لگانے نہیں آیا۔ ٹائیگر میمن کی دہشت بھی اسی طرح ممبئی کی فلم انڈسٹری پر طاری ہے۔ بھارتی حکومت نے گذشتہ دنوں سنجے دت کے بعد شاہ رخ خان، سلمان خان اور کچھ دوسرے مسلمان اداکاروں کا تعلق ان سے جوڑا تھا۔ ممبئی پولیس کی طرف سے درجنوں مرتبہ ایسے بیانات میڈیا کو دیئے گئے ہیں جن میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ دونوں ڈان دبئی میں موجود ہیں اور بھارتی سیکیورٹی نے ان کے دبئی سے رابطے کا مکمل ثبوت بھی حاصل کر لیا ہے اور ان کے ٹیلیفون ٹیپ کیے ہیں۔ گذشتہ سال چھوٹا شکیل اور چھوٹا راجن کی بنکاک میں لڑائی اور چھوٹا راجن کے گولیاں لگنے کے بعد ہسپتال سے فرار کا واقعہ اری دنیا کے علم میں ہے لیکن بھارتی حکومت بضد ہے کہ یہ لوگ بھی پاکستان میں چھپے ہوئے ہیں، جبکہ خود بھارتی میڈیا اس بات کی متعدد مرتبہ نفی کر چکا ہے۔

جہاں تک سکھ لیڈروں کا تعلق ہے تو بھارتی حکومت ہر قابلِ ذکر سکھ علیحدگی پسند کو مارنے کا دعویٰ کر چکی ہے اور یہ تحریک عملاً ختم ہو چکی ہے۔ اس کے باوجود بھارتی بضد ہیں کہ کچھ سکھ پاکستانی آئی ایس آئی کے پاس پناہ حاصل کر چکے ہیں۔

یہی بات وہ ٹائیگر میمن اور داؤد ابراہیم کے متعلق کہتی ہے، جب کہ اس کا کوئی ثبوت فراہم کرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہے۔

اس ضمن میں بھارتی وزیر داخلہ ایڈوانی کے اس مضحکہ خیز بیان کا تذکرہ ضروری ہے جو انہوں نے گزشتہ دنوں امریکہ میں دیا تھا۔ اس بیان میں انہوں نے پاکستان کی طرف سے ثبوت مانگنے سے متعلق ایک سوال کے جواب میں کہا کہ امریکہ نے دہشت گردوں پر حملہ کرنے سے پہلے کون سے ثبوت فراہم کئے تھے جو بھارت سے مانگے جا رہے ہیں۔ ایڈوانی کا یہ بیان بھارتی ذہنیت کی عکاسی کے لئے کافی ہے۔ دراصل بھارتی خود کو امریکہ کے پائے کی کوئی طاقت سمجھتے ہیں اور وہ تمام حقوق حاصل کرنے کے متمنی ہیں جو امریکہ نے زبردستی حاصل کر رکھے ہیں۔ کبھی وہ امریکہ کی طرح پاکستان

Marfat.com

سے وہ سلوک کرنا چاہتے ہیں جو اس نے افغانستان سے کیا اور کبھی اسرائیل کی طرح اس سلوک کے خواہش مند ہیں جو وہ یاسر عرفات سے کر رہا ہے۔ بھارت کی ان خواہشات کو نفسیاتی عوارض سے تعبیر کیا جا سکتا ہے کیونکہ کہ پاکستان نہ تو افغانستان ہے اور نہ ہی فلسطین، پاکستان ایک زندہ حقیقت ہے۔ بھارت کے پائے کی ایٹمی قوت ہے، جس کی ایٹمی استعداد کو دنیا کے معتبر ترین تحقیقاتی ادارے بھارت سے کئی گنا زیادہ طاقت ور قرار دے چکے ہیں اور بھارت کو بھی اس بات کا اچھی طرح علم ہے کہ وہ اس میدان میں پاکستان کے مقابلے پر کہاں کھڑا ہے، یہی وہ اہم ترین فیکٹر ہے جو پاکستان پر ممکنہ جارحیت کے راستے میں دیوار بنا ہوا ہے۔

بھارتی حکومت کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ 11 ستمبر کے بعد سے دنیا کی بدلتی صورت حال میں اچانک پاکستان کے اہمیت اختیار کر جانے کا صدمہ برداشت نہیں کر سکا۔ اس نے 11 ستمبر کے سانحے کو اپنے حق میں کیش کروانے کے لئے پاکستانی حکومت خصوصاً آئی ایس آئی کے طالبان اور اسامہ بن لادن سے ڈانڈے جوڑنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی اور ناکامی کا منہ دیکھا۔ خود کو مظلوم ثابت کرنے کے لئے پاکستان کے خلاف اپنے ملک میں دہشت گردی کے پے در پے کھیل رچائے لیکن مطلوبہ ہدف حاصل نہیں کر سکا۔ اس صورت حال نے بھارتی حکومت کے لئے اندرون ملک بڑے مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ بھارتی عوام حکومت کی مختلف پالیسیوں سے شاکی ہیں جس کا بڑا ثبوت یوپی جیسے بی جے پی کے مضبوط تین گڑھ میں اس کی ناکامی ہے اب بھارت میں انتخابات پھر سر پر ہیں۔ صوبائی انتخابات میں بی جے پی کی شکست یقینی دکھائی دے رہی تھی اور بین الاقوامی صورت حال پاکستان کے حق میں فضا ہموار کر رہی تھی۔ اس لئے بھارت نے آخری جوا پارلیمنٹ پر حملے کا ڈرامہ رچا کر کھیلا، جو وہ بری طرح ہار گیا۔

سیکرٹری کولن پاول کے دورۂ ایشیا کے بعد امریکی حکومت کی طرف سے بھارت پر پڑنے والے اخلاقی دباؤ نے بھارت کو تقریباً بوکھلا کر رکھ دیا ہے۔ اب انہوں نے ایک مرتبہ پھر فضا اپنے حق میں سازگار کرنے کے لیے اپنے پانچ شہریوں کو بھینٹ چڑھایا ہے۔ یہ کھیل کیمونسٹوں کے مضبوط گڑھ بنگال کے دارالحکومت میں رچایا گیا ہے جس کے کئی مقاصد ہو سکتے ہیں۔ ایک بڑا مقصد تو بھاری کی بی جے پی سرکار کی طرف سے مغربی بنگال میں کیمونسٹ حکومت کے لاء اینڈ آرڈر کے مسئلے کو ہوا دے کر وہاں گورنر راج کے نفاذ کی کوشش ہے، کیونکہ یہ بات بی جے پی کو اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ کبھی بنگال میں اپنی حکومت نہیں بنا سکتی۔ اس سلسلے کی آخری کوشش ممتا بینرجی اور بی جے پی کا اتحاد تھا جس کو صوبائی انتخابات میں ذلت آمیز شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

اپنے مخصوص نظریات کی وجہ سے بنگال کی صوبائی حکومت امریکہ کی کسی بھی ایجنسی کو اپنے معاملات میں مداخلت کی اجازت نہیں دے گی۔ یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے اور اس سلسلے میں صوبائی اور مرکزی حکومت کے درمیان جتنا تفاوت پیدا ہو گا اس کو بھی بھارتی حکومت اپنے حق میں استعمال کرتے ہوئے امریکہ کے سامنے اپنا کیس مضبوط بنانے کی کوشش کرے گی۔

کولکتہ کی دہشت گردی کے فوراً بعد بھارتی حکومت نے بنگلہ دیش کے ساتھ ملنے والی اپنی سرحد بند کر کے ایک نیا کھیل رچانے کی تیاری شروع کر لی ہے۔ بنگلا دیش میں خالدہ ضیاء حکومت کے پاکستان سے دوستانہ مراسم بھارت کو ہضم

Marfat.com

نہیں ہو رہے، ماضی میں بھی وہ خالدہ ضیاء دور حکومت میں آئی ایس آئی کے اڈے تلاش کرتا رہا ہے اب بھی بھارت یہ شور مچائے گا کہ آئی ایس آئی بنگلہ دیش میں اپنے نیٹ ورک کو متحرک کر رہی ہے۔ اس طرح ایک تیر سے دو شکار کھیلنے کی کوشش کی جائے گی۔ ایک طرف خالدہ ضیاء کو اپنی صفائی پیش کرنے کی مہم میں الجھایا جائے گا اور دوسری طرف آئی ایس آئی کے خلاف ایک اور خطرناک مہم بنگلا دیش کے حوالے سے شروع کر کے بنگلا دیش کی بھارت نواز اور "را" کی پروردہ اپوزیشن کو متحرک کر کے خالدہ ضیاء حکومت کو بلیک میل کیا جائے گا جو بھارتی خواہشات کے برعکس بنگلا دیش کے اقتدار پر اعلیٰ پر سودے بازی کے لئے تیار نہیں ہو رہی۔

موجودہ سارک کانفرنس میں چونکہ سری لنکا، بنگلا دیش، بھوٹان، نیپال میں سے کسی بھی ملک نے بھارتی جارحیت کے حق میں بھارت کی ہاں میں ہاں ملانے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ بات بھارت کو پسند نہیں کہ اس خطے میں اس کی دھونس دھاندلی کی داد نہ ملے لہٰذا اب وہ بنگلا دیش کی مثال قائم کر کے باقی ممالک کو بھی ڈرانے دھمکانے کی کوشش کرے گا۔

جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے اس نے بڑی جرأت مندی س بھارت کی آخری سازش کو بھی ناکام بنایا ہے اور کسی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کیا۔ بھارتی وزیر داخلہ لال کرشن ایڈوانی نے حسب روایت اس حملے کی ذمہ داری ایک اسلامی تنظیم پر ڈال کر اپنا کھیل شروع کر دیا تھا لیکن حرکت الجہاد نے سختی سے اس کی تردید کی ہے۔ کشمیر جہاد کونسل کی طرف سے بھی یہ بیان جاری ہوا ہے کہ کسی مجاہد کشمیری تنظیم نے نہ تو یہ حملہ کیا ہے نہ ہی اس کی ذمہ داری قبول کی ہے اور نہ ہی وہ اس نوعیت کی دہشت گردی پسند کرتے ہیں، جب کہ پاکستان نے اس دہشت گردی کی شدت سے مخالفت کی ہے۔

کولکتہ کے امریکی سینٹر پر فائرنگ کے واقعے کے چند گھنٹے بعد ہی امریکی ایف بی آئی کے سربراہ رابرٹ ملر نے جو گزشتہ دنوں بھارت کے دورے پر تھے، نئی دہلی میں پریس کانفرنس سے خطاب کیا اور اس واقعے کو دہشت گردی قرار دینے سے انکار کر کے بھارت کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ رابرٹ ملر نے اس واقعے کو بھارتی پولیس افسران پر حملہ قرار دیا اور کہا کہ حقائق کی عدم موجودگی میں وہ اس سلسلے میں اور کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتے۔ ادھر واشنگٹن میں امریکی عہدے داروں نے بھی اسے بھارتی پولیس پر حملہ قرار دیا ہے، کیونکہ یہ حملہ اس وقت ہوا جب کوئی امریکی اس عمارت میں موجود نہیں تھا۔

اس مرتبہ شاید بھارت کے واویلے پر دنیا زیادہ توجہ نہ دے، کیونکہ تمام شواہد اس بات کی نشاندہی کر رہے ہیں کہ یہ بھارتی ایجنٹوں کا ڈرامہ ہے جو ماضی کی طرح فلاپ ہو گیا۔ پہلے فرحان مرزا نامی شخص کو اس کا ذمہ دار بتایا گیا پھر حرکت الجہاد کا نام لیا گیا، اس کے بعد دو تین اور مسلم تنظیموں کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا کر اپنا الو سیدھا کرنے کی کوشش کی گئی۔ پاکستان کا کیس بہت مضبوط ہے اور پاکستانی وزارت خارجہ نے کہا ہے کہ بھارت کی طرف سے ملزمان کی حوالگی کے مسئلہ کو باقاعدہ مذاکرات کا حصہ تو بنایا جا سکتا ہے لیکن اس سلسلے میں پاکستان کو بلیک میل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے ساتھ ہی پاکستان کی طرف سے 40 افراد کی ایک فہرست بھی ثبوت بھارت کو عنقریب دی جا رہی ہے۔ ان میں نمایاں نام ان لسانی اور علاقائی تنظیموں کے دہشت گردوں کے ہیں جنھوں نے "را" کے تربیتی کیمپوں میں ٹریننگ حاصل کی، پاکستان میں دہشت گردی کی وارداتیں کرنے کے بعد یہ لوگ "را" کی پناہ میں واپس چلے جاتے ہیں اور بھارت کو اس بات کا علم ہے کہ پاکستان اپنا

Marfat.com

کیس اتنی مضبوط شہادتوں کے ساتھ پیش کریگا جنہیں نظرانداز کرنا اس کے لئے ممکن نہیں ہوگا۔

فروری 2002ء کے آغاز میں میں بھارت نے ''اگنی'' اور ''ترشول'' میزائل کے تجربے کر کے خطے میں میزائلوں کی دوڑ شروع کر دی۔ میں نے ایک مضمون بعنوان خطے میں کشیدگی لکھا جو ان دنوں حالات کی عکاسی کرتا ہے۔

اگنی کے تجربے کے بعد بھارت نے ایک ہی ہفتے میں دوسرے میزائل ترشول کا تجربہ بھی کر لیا۔ زمین سے فضا میں مار کرنے والے ''ترشول'' میزائل کو بھارت نے اپنی بحریہ کے لئے تیار کیا ہے۔ ترشول کے بحری ماڈل کو سطح سمندر کے انتہائی قریب پرواز کر کے بحری جہازوں کی طرف آنے والے میزائلوں اور طیاروں کو نشانہ بنانے کے لئے ڈیزائن کیا گیا ہے۔ ترشول کی رینج 50 کلومیٹر اور اس کے وار ہیڈ کا وزن 15 کلوگرام ہے۔ خیال رہے کہ بھارت نے یہ تجربہ اس وقت کیا جب اس کے ایک ہی ہفتے میں ہونے والی پہلے تجربے پر ساری دنیا میں تنقید کی جارہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی بھارتی وزیراعظم مسٹر واجپائی نے کہا کہ سرحدوں سے فوج کی واپسی کا کوئی امکان نہیں اور نہ ہی بھارت اس کی تعداد کم کرنے کی کسی تجویز پر غور کر رہا ہے۔ انہوں نے پاکستان کی طرف سے فوج کو سرحدوں پر مرحلہ وار ہٹانے کی پیش کش کو بھی مسترد کر دیا اور بھارتی وزیر خارجہ جسونت سنگھ نے بی بی سی کو انٹرویو دیتے ہوئے سرحدوں پر غیر جانب دار مبصرین کی تعیناتی کے امکان کو بھی سختی سے رد کرتے ہوئے اپنے مخصوص سپاٹ لہجے میں کہا کہ وہ اس مسئلے پر اب کسی بھی صورت کسی تیسرے فریق کی مداخلت برداشت نہیں کر سکتے۔ حالانکہ کولن پاول سمیت ہر قابل ذکر غیر ملکی شخصیت نے بھارت کو اپنی سطح پر اس بات کا یقین دلایا ہے کہ پاکستان کے صدر جنرل پرویز مشرف اپنے ایجنڈے پر پورے خلوص کے ساتھ عمل پیرا ہیں۔ دیگر شواہد بھی بتا رہے ہیں کہ صدر مشرف نے جو کچھ کہا اس پر وہ بغیر کسی مصلحت کے عمل کر رہے ہیں۔

قاضی حسین احمد اور مولانا فضل الرحمٰن کو تادم تحریر رہائی نہیں مل سکی۔ حالانکہ قاضی حسین احمد کو ایک مقدمے میں عدالت نے رہا کر دیا تھا لیکن لاہور میں انہیں مشہور زمانہ ''واجپائی کیس'' میں گرفتار کر لیا گیا جو مسٹر واجپائی کی لاہور آمد پر ان کے خلاف مظاہرہ اور ہنگامہ آرائی کرنے پر درج کیا گیا تھا اور جس میں متعدد مرتبہ قاضی صاحب کو اشتہاری قرار دیا جا چکا ہے۔ اس کیس میں انہیں دوبارہ گرفتار کر کے پاکستانی حکومت نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ماضی کی حکومتوں کے برعکس اس کی پالیسی یکسر تبدیل ہو چکی ہے۔ آخر بھارتی حکمرانوں کو کس قسم کی ضمانت درکار ہے؟ شاید بھارتی حکومت پاکستان سے یہ امید رکھتی ہے کہ وہ مقبوضہ کشمیر میں جاری جدوجہد آزادی کو بھی اسی طرح ختم کر دے جس طرح اس نے جیش محمد یا لشکر طیبہ پر پابندی لگائی ہے۔ اب ساری دنیا اس بات کو اچھی طرح سمجھنے لگی ہے کہ مقبوضہ کشمیر میں بھارتی فوج کے خلاف جو بھی مزاحمت ہو رہی ہے اس کا تعلق ماضی میں تو شاید پاکستان سے رہا ہو لیکن اب ایسا ہرگز نہیں ہے۔ یہ مجاہد تنظیمیں اپنے فیصلوں میں آزاد ہیں اور پھر اس بات کی بھی کیا ضمانت ہے کہ اگر کبھی ایسا ہو بھی گیا تو بھارت آسام یا بہار میں سرگرم عمل علیحدگی پسندوں کو بھی آئی ایس آئی کے کھاتے میں نہیں ڈالے گا۔

بھارتی وزیراعظم نے تمام اخلاقی اور سفارتی اصولوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ایک ایسی بات کہہ دی ہے جس کا مطلب سوائے پاکستان کو اشتعال دلانے کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اٹل بہاری واجپائی نے کہا کہ اگر پاکستان نے مسئلہ کشمیر پر بات کرنی ہے تو وہ آزاد کشمیر کو بھارت کے حوالے کر دے۔ ظاہر ہے عام حالات میں کسی بھی باہوش شخص سے

Marfat.com

ایسے بیان کی توقع نہیں کی جاسکتی۔لیکن بھارت اب شاید یہ بات سمجھ چکا ہے کہ امریکہ ہو یا برطانیہ وہ کسی حد تک تو بھارت پر دباؤ ڈال سکتے ہیں لیکن جہاں ان کے تجارتی مفادات کی بات آئے گی وہاں سب خاموشی اختیار کر لیں گے۔لیکن پاکستان کے ساتھ ان کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔پاکستان سے کوئی بھی بات انتہائی دباؤ کے ساتھ منوائی جاسکتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اب تک امریکہ یا برطانیہ کی طرف سے ظالم اور مظلوم برابر کی پالیسی اپنائی جارہی ہے۔یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ بھارت نے جارحیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے پاکستانی سرحدوں پر دس لاکھ فوج کا اجتماع کر دیا ہے اور پاکستانی افواج محض دفاعی حالت میں سرحدوں پر موجود ہیں اور پاکستان کی طرف سے اب تک متعدد مرتبہ بھارت کو بات چیت کے ذریعے مسائل حل کرنے کی پیش کش کی جاچکی ہے۔پاکستان متعدد مرتبہ یہ کہہ چکا ہے کہ بھارت جیسے ہی سرحدوں سے اپنی فوجیں ہٹانے کا اعلان کرے گا پاکستان فوراً اپنی فوجیں پیچھے ہٹا لے گا۔لیکن بھارت ایسی کوئی پیش کش قبول کرنے کی بجائے حقارت اور تکبر کا مظاہرہ کرتے ہوء پاکستان پر مسلسل اپنا دباؤ بڑھا رہا ہے۔لیکن حیرت انگیز طور پر امریکہ، برطانیہ، کینیڈا، جاپان اور دیگر ممالک یک طرف سے عموماً ''دونوں ممالک'' کو نیک مشوروں سے نوازا جارہا ہے، حالانکہ پاکستان تو امریکہ اور برطانیہ کو بھی یہ پیش کش کر چکا ہے کہ وہ خود پاکستان اور بھارت کے درمیان ثالثی کروا دیں، پاکستان ان کی ثالثی قبول کرلے گا، تاہم بھارت ایسی کوئی بات سننے کے لئے بھی تیار نہیں ہے۔غیر جانب دار مبصرین کی تعیناتی بھارت کو گوارہ نہیں بلکہ وہ ان کا ذکر بھی سننے کو تیار نہیں۔اس کے بعد عالمی امن کے ٹھیکے داروں کے پاس دونوں کو ایک جیسے مشورے دینے کا کیا جواز باقی رہ جاتا ہے؟

اسے ستم ظریفی حالات سمجھا جائے یا ہماری خارجہ پالیسی کی ناکامی کہ ہمارے دوست ہمارے لیے آسانیاں پیدا کرنے کے بجائے مشکلات کو جنم دے رہے ہیں۔بھارت کے حوصلے بہت بڑھے ہوئے ہیں۔مغرب کے ماہرین حزب کے مطابق اس کی وجہ بھارت، اسرائیل اور ترکی کا نیا دفاعی بلاک ہے۔عسکری ماہرین کا کہنا ہے کہ اس اتحاد سے اس خطے میں عسکری توازن بگڑ گیا ہے۔افغانستان کی حکومت کا بھارت سے مستقل رابطہ ہے اور ہماری نیک خواہشات کے باوجود افغان حکومت میں شامل شمالی اتحاد کا پاکستان دشمن گروپ روز بہ روز استحکام حاصل کر رہا ہے جس کی ایک مثال وہ بدقسمت پاکستانی ہیں جنہیں افغان وزیراعظم کرزئی تو رہا کرنا چاہتے ہیں لیکن وزیر خارجہ عبداللہ عبداللہ، وزیر داخلہ یونس قانونی اور نائب وزیر دفاع جنرل فہیم نے اس بات کو ناممکن بنا دیا ہے۔ان تینوں صاحبان میں سے کوئی نہ کوئی بھارت سے مستقل رابطے میں ضرور رہتا ہے۔جنرل دوستم تادم تحریر بھارت کے دورہ پر ہیں اور بھارت سے دوستی کی پینگیں بڑھا رہے ہیں۔مغربی ذرائع ابلاغ سے یہ خبر بھی آچکی ہے کہ پاکستان کے اتحادی برطانیہ کے وزیراعظم ٹونی بلیئر گزشتہ دنوں جنوبی ایشیا کے دورے پر تشریف لائے تو وہ بنگلا دیش میں وزیراعظم خالدہ ضیاء کو یہ تنبیہ بھی کرتے آئے کہ پاک بھارت ممکنہ جنگ کی صورت میں وہ اپنی فوج بھارتی سرحدوں سے دور رکھیں تاکہ بھارت کو پریشانی کا سامنا نہ کرنے پڑے، بہ صورت دیگر برطانیہ میں آباد بنگلا دیش کے باشندوں کا مستقبل خطرے میں پڑسکتا ہے۔ٹونی بلیئر دہلی میں اپنے بھارتی دوستوں کو برطانوی طیارے ''ہاک'' اور دیگر جنگی ساز وسامان فروخت کرنے کا عندیہ دینے کے بعد پاکستان تشریف لائے تھے۔

17 جنوری کو امریکہ اور بھارت کے درمیان فوجی تعاون کے معاہدے پر دستخط ہو چکے ہیں۔امریکہ نے

Marfat.com

بھارت کواسلحے کی فراہمی پر سے پابندیاں ہٹالی ہیں اورتازہ اطلاعات کے مطابق مقبوضہ کشمیر میں کشمیری مجاہدین کے خلاف امریکی اور بھارتی فوجی مشترکہ آپریشن کریں گے۔ خیال رہے کہ ایسے مشترکہ آپریشن طالبان اور القاعدہ کے خلاف افغانستان میں بھی امریکی افغان فوج کے ساتھ مل کر کررہے ہیں۔ امریکہ کی طرف سے جہاں پاکستان کی تقدیر بدل دینے کے اعلانات کئے جارہے ہیں وہاں امریکہ کی ہر قابل ذکر شخصیت اب بھارت اور پاکستان دونوں کوامریکہ کا بہترین دوست قرار دینے لگی ہے۔ اس ضمن میں امریکی اسسٹنٹ سیکرٹری برائے جنوبی ایشیا رچرڈ آرمیٹج کا بیان خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ موصوف فرماتے ہیں کہ بھارت کے ساتھ دوستی امریکہ کی پختہ عادت بن چکی ہے۔

بھارت نے موجودہ پاکستان مخالف فضا میں ایک اور بھرپور ضرب ہماری معیشت پرلگانے کی تیاری بھی کرلی ہے اور پاکستان کے احتجاج کو خاطر میں لائے بغیر بھارتی حکومت نے دریائے چناب پر پن بجلی بنانے کا منصوبہ شروع کردیا ہے۔ دریائے چناب کا پانی سلال ڈیم کے ذریعے آٹھ دنوں کے لئے بند کردیا گیااور پاکستانی ذرائع کے مطابق دریا میں پانی کی سطح 6300 کیوسک سے کم ہوکر 2500 پر آگئی۔ ایک ایسا ہی منصوبہ بھارت دریائے جہلم پر مکمل کر چکا ہے۔ بھارت جو پاکستان کوسندھ طاس معاہدہ ختم کرنے کی دھمکی دے کر پاکستان کی زرعی زمینوں کوصحراؤں میں تبدیل کرنے کی دھمکیاں دے رہاہے، اپنے گھناؤنے منصوبے کا کافی حصہ مکمل کر چکا ہے۔ وہ دریائے جہلم اور چناب پر سلال ڈیم اور وولر بیراج بنا کر پاکستان کواس کے حصے کا پورا پانی نہیں دے رہا۔ ستلج اور بیاس کے پانیوں کو پاکستان کی طرف آنے ہی نہیں دیا جاتا۔ ان کا رخ ہی موڑ دیا گیا ہے۔ البتہ ستلج کا کچھ پانی اشک شوئی کے لیے پاکستان کو دے دیا گیا ہے۔ راوی کا سارا پانی بھارت نے روک لیا ہے۔

بھارتی حکومت کی مجبوری یہ ہے کہ جوں جوں ''ودھان سبھا'' کے چناؤ نزدیک آرہے ہیں اسے اپنی پوزیشن ڈانواں ڈول ہوتی محسوس ہورہی ہے، کیونکہ بھارت کی مہا سبھائی پارٹیوں نے، جن میں وشوا ہندو پریشد پیش پیش ہے، بھارتی حکومت سے کہا ہے کہ اگرانہیں رام مندر بنانے کی اجازت نہ دی گئی تو وہ 12 مارچ کے بعد مندر کی تعمیر خود شروع کر دے گی۔ بی جے پی کی مجبوری یہ ہے کہ وہ نیشنل ڈیموکریٹک الائنس کے ساتھ مل کر حکومت چلارہی ہے اور 2004ء تک وہ ایودھیا میں رام مندر کے مسئلے پر کوئی بات کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ بہ صورت دیگر الائنس ٹوٹ جائے گا اور مرکز میں اس کی حکومت ختم ہوجائے گی۔ اب لے دے کر بی جے پی کے پاس اس کے متبادل کے طور پرصرف پاکستان دشمن پالیسی ہی رہ جاتی ہے اوراس بات کے امکانات بہت زیادہ ہیں کہ مارچ کے وسط تک بھارتی حکمرانوں کا لب ولہجہ یہی رہے گا۔ صوبائی انتخابات کے نتائج آنے کے بعد ممکن ہے کہ بھارتی حکومت اس سلسلے میں کوئی نرم گوشہ پیدا کر سکے۔

بھارت کی اس اشتعال انگیز پالیسی کے پیش نظر پاکستانی وزیر خارجہ عبدالستار نے شاید پہلی مرتبہ 30 جنوری کو فارن سروس اکیڈمی سے خطاب کرتے ہوئے پاکستانی سرحدوں پر بھارتی فوج کے دباؤ کو بھونڈی کوشش سے تعبیر کرتے ہوئے کہا کہ ہم دھمکیاں سے ڈرنے والے نہیں ہیں اور پاکستانی فوج ہر جارحیت کا جواب دینے کے لیے تیار ہے۔ دوسری طرف جنرل پرویز مشرف سرحدوں کے تفصیلی دورے کر چکے ہیں اوراگلے مورچوں پر جا کر جوانوں سے بالمشافہ ملاقات کرکے ان کے حوصلوں کی داد دے رہے ہیں۔ بھارت کی طرف سے کنٹرول لائن پر گولا باری اور جارحیت کا سلسلہ تادم تحریر جاری تھا اور پاکستان کی طرف سے اسے بھرپور جواب دیا جارہا تھا۔ کنٹرول لائن اور ورکنگ باؤنڈری پر جہاں بھی

Marfat.com

بھارتی فوج جارحیت کا ارتکاب کرتی ہے اسے بھرپور جواب دیا جاتا ہے جو اس امر کا غماز ہے کہ پاکستان امن قائم کرنے کا خواہش مند ضرور ہے لیکن وہ یہ امن اپنی سالمیت کی قیمت پر ہرگز نہیں چاہتا۔

پاکستان میں امریکی جریدے وال اسٹریٹ جنرل کے رپورٹر ڈینئیل پرل کے اغوا کی سازش میں بھارتی انٹیلی جنس ایجنسی ''را'' کا ہاتھ ہونے کے ثبوت سامنے آ چکے ہیں۔ اغوا کرنے والوں نے دہلی میں جن لوگوں سے فون پر بات کی وہ ''را'' کے آفیسرز ہیں جن کے ثبوت پاکستان کو مل چکے ہیں۔ بھارت کی طرف سے پاکستان کے خلاف عالمی رائے عامہ کو گم راہ کرنے کی یہ ایک اور انتہائی خطرناک اور بھونڈی سازش ہے۔ امید ہے کہ پاکستانی ایجنسیاں اسے ناکام بنا کر ایک مرتبہ پھر بھارت کو شرمندہ کریں گی لیکن بھارت کی طرف سے پاکستان کے خلاف سازشوں کا سلسلہ رکتا دکھائی نہیں دے رہا۔ ایک کے بعد ایک سازش منظر عام پر آ رہی ہے، جس میں بھارت کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے، لیکن بھارت مستقل مزاجی سے اپنے کام میں مصروف ہے اور دنیا کی مقتدر قوتیں ''دونوں ممالک'' کو امن و آشتی کا مشورہ دے رہی ہیں۔ (روزنامہ جنگ سنڈے ایڈیشن 10 فروری 2002ء مصنف۔ طارق اسماعیل ساگر)

فروری 2002ء میں اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کوفی عنان نے 15 ممالک پر مشتمل اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کو ایشیا سے متعلق بریفنگ دیتے ہوئے مسئلہ کشمیر پر بڑھتی ہوئی کشیدگی پر سخت تشویش کا اظہار کیا اور کہا: ''بھارت اور پاکستان مسئلہ کشمیر پر اقوام متحدہ کی ثالثی قبول کر لیں۔ اگر دونوں ممالک رضامندی کا اظہار کریں تو وسیع پیمانے پر لائحہ عمل مرتب کر کے مثبت نتائج حاصل کرنے کے لیے وہ اپنا مثالی کردار ادا کرنے کو تیار ہیں۔'' کوفی عنان کا یہ بیان اگرچہ تاخیر سے آیا مگر آیا تو سہی، کیوں کہ اقوام متحدہ کی ثالثی کو پاکستان گذشتہ پچاس برسوں سے قبول کرتا آیا تھا اور اقوام متحدہ نے اپنی منظور شدہ قراردادوں کے ذریعے یہ مسئلہ حل کرانے کی ذمے داری بھی قبول کی تھی۔ پاکستان کے وزیر خارجہ عبدالستار نے میونخ میں بین الاقوامی سکیورٹی کانفرنس میں اپنے خطاب میں نہ صرف بھارت کے جارحانہ عزائم کے ہولناک نتائج دنیا پر واضح کیے بلکہ انہوں نے عالمی فورم پر پاکستان کی اب تک کی امن کو استحکام فراہم کرنے کی تمام کوششوں اور مذاکراتی عمل شروع کرنے سے متعلق تمام تجاویز کو دہرایا۔ تاہم عالمی سطح پر تشویش کے تمام تر اظہار اور اپیلوں کے باوجود بھارت نے روایتی ہٹ دھرمی کی روش اختیار کی وہ کسی بھی نوعیت کے مذاکرات کی مخالفت کرتا رہا جو اس بات کا مظہر تھا کہ وہ امن نہیں چاہتا۔ تاہم بین الاقوامی دباؤ کی بناء پر بھارت کے رویے میں کچھ لچک نظر آنا شروع ہوئی جس سے ہو سکتا کہ جنگ کے امکانات کم ہو جائیں۔ بہ حیثیت مجموعی جنگ کے خطرات کم ہوئے مگر یہ مکمل طور پر ٹلی نہیں۔ دراصل اس کشیدگی کی بنیادی وجہ مسئلہ کشمیر تھا جس کا حل ہونا بہت ضروری تھا۔

بھارت نے یہ حقیقت تسلیم کر لی کہ جنگ کسی مسئلے کا حل نہیں ہو سکتی۔ دنیا میں اب تک تمام جنگوں اور تنازعات کا حل بالآخر مذاکرات کی میز پر ہی نکلا۔ برصغیر کی 50 سالہ تاریخ میں ہونے والی ہر جنگ میں دونوں ممالک کی معیشت کو شدید نقصان پہنچا اور عوام کے مصائب میں اضافہ ہوا تھا۔ بھارت کو چاہیے تھا کہ وہ غیر حقیقت پسندانہ تحفظات اور تعصبات کے خول سے باہر نکل کر مذاکرات کی میز پر آئے اور امن کی راہ پر چل کر دونوں ممالک کے سوا ارب انسانوں کو غربت، افلاس، بھوک اور بیماری کے عفریت سے بچائے۔ امن اور سلامتی نہ صرف دونوں ممالک بلکہ پورے خطے کے استحکام کے لیے

Marfat.com

ناگزیر تھا لیکن ابھی تک بھارتی قیادت کے رویے میں کوئی خاص تبدیلی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ 21 اپریل کو بھارتی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی نے گوہاٹی میں خطاب کرتے ہوئے پاکستان کے خلاف جی بھر کے زہر اُگلا اور الزام لگایا کہ پاکستان بھارت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے اور جمہوریت ختم کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ (اے۔ایف۔پی 21 اپریل 2002)

یہ بات بڑی عجیب دکھائی دیتی ہے کہ اتنے شدید سرحدی تناؤ کے باوجود ٹریک ٹو ڈپلومیسی'' کے تحت خفیہ مذاکرات کا سلسلہ دونوں ممالک کے درمیان جاری رہا۔ باور کیا جاتا تھا کہ ان خفیہ مذاکرات کو امریکہ کی آشیر باد حاصل ہے۔ ان ہی مذاکرات کے نتیجے میں پہلی مرتبہ اپریل 2002ء میں مقبوضہ کشمیر کے راہنماؤں عمر فاروق، عبدالغنی لون اور سردار عبدالقیوم کے درمیان مذاکرات ہوئے جن کا انکشاف 22 اپریل 2002ء کے اخبارات نے کیا۔ اے ایف پی اور ثنا نیوز کے حوالے سے خبر شائع ہوئی جس میں کہا گیا

''متحدہ عرب امارات میں چیئرمین کشمیر کمیٹی اور حریت راہنماؤں عمر فاروق، لون میں نئے فارمولے پر مذاکرات، کشمیر میں اب جہاد کی گنجائش نہیں'' سردار عبدالقیوم اور عبدالغنی لون میں اتفاق سردار قیوم سے ملقات میں اس نتیجے پر پہنچے کہ اب زمین حقائق بدل چکے ہیں اور صورتحال کا دوبارہ جائزہ لینے کی ضرورت ہے تحریک آزادی میں کشمیری ہی مرکزی کردار ادا کر سکتے ہیں۔ یہ موقع دینا پڑے گا۔ اب وقت آ گیا جہادی ہمیں اپنے حال پر چھوڑ دیں۔ ان کی موجودگی میں ہماری جدوجہد کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ بھارتی حکومت کا رویہ بھی دیکھنا ہوگا۔ عبدالغنی لون کا انڈین ایکسپریس کو انٹرویو۔

(روزنامہ خبریں لاہور 22 اپریل 2002ء)

پاکستان میں بھارتی انٹیلی جنس نے اپنی مذموم سرگرمیاں جاری رکھیں۔ 20 مارچ 2002ء کو جاسوسی سرگرمیوں میں ملوث دو بھارتی سفارتکاروں کو پاکستان چھوڑنے کا حکم دیا گیا جبکہ 12 مارچ کو پاکستانی فوجوں کی پوزیشنوں کی مانیٹرنگ کے لیے آنے والا بھارتی طیارہ پاکستان نے مار بھگایا۔ 20 اپریل 2002ء کو بھارتی سفارتکار مسٹر کھنہ کو حساس اداروں نے دستاویزات وصول کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا اور انہیں پاکستان بدر کر دیا گیا۔ مئی کے مہینے میں بھارتی جارحیت میں اضافہ ہوا کنٹرول لائن اور ورکنگ باؤنڈری پر بھارتی فوج کی گولہ باری سے 20 مئی کو 12 پاکستانی شہری شہید ہو گئے۔ 26 اور 28 مئی کو پاکستان نے 1500 کلومیٹر تک مار کرنے والے غوری میانے فاصلے تک مار کرنے والے ایٹمی میزائل غزنوی کا کامیاب تجربہ کیا جس کی رینج 180 کلومیٹر تھی۔ جون 2002ء میں ''الماتے کانفرنس'' میں دونوں ممالک کے سربراہ پھر اکٹھے ہوئے لیکن یہاں بھی بھارتی وزیراعظم کے منفی رویے نے دونوں ممالک کے درمیان کشیدگی کو کم کرنے کے بجائے مزید بڑھا دیا۔ اس کانفرنس میں جنرل پرویز مشرف نے اپنے خطاب میں کہا کہ دنیا کو دہشت گردی اور جدوجہد آزادی میں فرق کا احساس کرنا پڑے گا جب تک ایسا نہ ہوا دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے فلسطین اور کشمیر کی جدوجہد آزادی کو دہشت گردی کا رنگ دینے والوں کی اچھی طرح خبر لی۔ میرا ایک مضمون ''مسئلہ کشمیر حل قریب آ گیا'' ان دنوں کی صورت حالات کے حوالے سے شائع ہوا۔ ملاحظہ فرمائیں۔

17 مئی کو بھارتی پارلیمنٹ میں متفقہ قرارداد کی منظوری کے فوراً بعد بھارتی کابینہ نے ایک ہنگامی اجلاس میں پاکستان کے خلاف جو ''حکمتِ عملی'' تیار کی تھی اس کی تفصیلات بھارتی وزیر داخلہ ایل کے ایڈوانی نے پریس کے سامنے بتاتے

Marfat.com

سے انکار کر دیا۔ البتہ یہ بات ضرور کہی کہ وہ درپردہ جنگ کو حکمتِ عملی کے ذریعے جیت لیں گے۔ اس حکمتِ عملی کا انکشاف ان کے نائب آئی ڈی سوامی نے کر دیا اور کہا کہ بھارت پاکستان کو اس جگہ زخم لگائے گا جہاں اسے زیادہ تکلیف ہو۔ موصوف نے پاکستان سے سفارتی تعلقات منقطع کرنے، اقتصادی بائیکاٹ، پسندیدہ ملک کا درجہ واپس لینے اور ماضی کے معاہدات بشمول پانی کا معاہدہ توڑنے کی دھمکی دی اور برملا کہا کہ بھارتی اقدامات سے پاکستان کی اندرونی سلامتی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔

اس کے بعد سے بھارت کی طرف سے پاکستان کے خلاف پہلے سے بھی زیادہ سخت زبان استعمال کی جانے لگی۔ پاکستانی ہائی کمشنر جہانگیر اشرف قاضی کو جنہیں پاکستان نے بھارت کے جوابی اقدام کے طور پر واپس نہیں بلایا تھا، زبردستی واپس بھیج دیا گیا اور بھارت نے ''واٹر ٹریٹی'' ختم کرنے کا عندیہ دے کر پاکستانی عوام کو براہِ راست یہ باور کروانا شروع کر دیا کہ ان کی زمینیں بانجھ ہو جائیں گی اور وہ پانی کی بوند بوند کو ترسیں گے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ بھارت کی طرف سے پاکستان کے خلاف جتنی سخت اور قابل اعتراض زبان استعمال کی جارہی تھی، بین الاقوامی دنیا اس کا نوٹس لینے کے بجائے پاکستان کے صدر جنرل پرویز مشرف سے اپنے ''وعدے'' پر عمل درآمد کا مطالبہ کر رہی تھی۔

برطانوی وزیر خارجہ اور یورپی یونین کے کمشنر کرس پیٹن نے تو یہاں تک کہا کہ اصل مسئلہ ''ریاستی دہشت گردی'' کا نہیں بلکہ اس ''ریاست'' کا ہے جس کو دہشت گردوں کی پشت پناہی حاصل ہے۔ ان کے دورے کا آغاز یورپی پارلیمنٹ کی طرف سے پاکستان کو اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل کی قرارداد نمبر 1373 کا حوالہ دے کر اس کی خلاف ورزی کے بارے میں متنبہ کرنے سے ہوا۔ مذکورہ قرارداد 28 ستمبر 2001ء کو منظور ہوئی۔ اس میں رکن ممالک سے کہا گیا ہے کہ وہ دہشت گردوں، ان کے مددگاروں اور انہیں سہولتیں فراہم کرنے والوں کو اپنی سرزمین استعمال نہ کرنے دیں۔ کرس پیٹن نے پاکستان کو اس قرارداد پر عمل درآمد کرنے کی تلقین کی تھی۔ قبل ازیں کرسٹینا روکا اور یورپی ممالک کی دیگر اہم شخصیات نے بھی پاکستان اور بھارت نے جو دورے کیے ان میں پاکستان کو بطور خاص یہ مشورہ دیا کہ وہ ''کراس بارڈر ٹیررازم'' بند کرنے کے اپنے بیانات پر عمل بھی کرے۔

مقبوضہ کشمیر میں آزادی کی تحریک یوں تو 15 اگست 1947ء ہی سے کسی نہ کسی شکل میں موجود رہی ہے لیکن ایسا شاید پہلی مرتبہ ہوا کہ تمام مغربی طاقتیں یک زبان ہو کر کشمیریوں کے اصل مسئلے ''استصواب رائے کا حق'' کو صریحاً نظر انداز کرتے ہوئے پاکستان کے صدر کو ان باتوں کے مشورے دینے لگی تھیں جو بھارتی قیادت کی طرف سے الزامات کی صورت میں کہی جارہی تھیں۔ اس سلسلے کی آخری کڑی امریکی نائب وزیر خارجہ رچرڈ آرمیٹج کے دورہ برصغیر پاک و ہند کے آغاز پر امریکی صدر جارج بش کا وہ بیان تھا جس میں انہوں نے کہا تھا: ''صدر مشرف لائن آف کنٹرول کی خلاف ورزی لازماً بند کریں انہیں ایسا کرنا ہوگا۔ (صدر جنرل مشرف) نے کہا تھا کہ وہ ایسا کریں گے۔ ہم اور دیگر افراد صدر مشرف کو واضح الفاظ میں بتا رہے ہیں کہ انہیں ایسا کرنا پڑے گا۔''

رچرڈ آرمیٹج کی پاکستان آمد سے پہلے الماتے کانفرنس میں صدر جنرل پرویز مشرف کی طرف سے بھارت کے ساتھ تمام مسائل پر غیر مشروط مذاکرات کی پیشکش متعدد مرتبہ کی جا چکی تھی اور روس کے صدر ولادی میر پوٹن جن کی دعوت پر جنرل پرویز مشرف اور بھارت کے وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی قازقستان کے دارالحکومت الماتے گئے تھے، کم از کم

Marfat.com

بھارت اور روس کے تاریخی تعلقات کے پس منظر میں یہ امید ضرور رکھتے تھے کہ وہ دونوں سربراہان کی براہِ راست ملاقات کروانے میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن صدر پوٹن کے علاوہ دنیا کی دیگر اہم شخصیات، جن میں چینی صدر بھی شامل تھے کی کوششوں کے باوجود بھارتی وزیراعظم نے ''میں نہ مانوں'' کے مصداق براہِ راست ملاقات سے انکار کر دیا بلکہ قازقستان کے وزیر خارجہ کو ایک ایسا عشائیہ بھی بادل ناخواستہ منسوخ کرنا پڑا جس میں بھارتی قیادت کو یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں صدر مشرف کھٹمنڈو کی طرح جناب واجپائی سے بڑھ کر ہاتھ نہ ملا لیں۔

اس کانفرنس کے تمام شرکاء خواہ وہ پاکستان سے متعلق کیسے ہی نظریات رکھتے ہوں، اس نتیجے پر ضرور پہنچ چکے تھے کہ پاکستان ہر سطح اور ہر طریقے سے امن کا خواہاں ہے اور سرحدوں پر ہونے والے فوجی اجتماع کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کسی بھی غیر معمولی تلخی کے نقصانات سے بھی بخوبی آگاہ ہے۔ پاکستان کی ہر ممکن کوشش رہی ہے کہ بھارتی افواج زمانہ امن کی پوزیشن پر واپس لوٹ جائیں تاکہ سرحدوں پر منڈلاتے ہوئے جنگ کے بادل چھٹ جائیں۔ بھارتی وزیراعظم اس کے برعکس پاکستان پر حملے کی مسلسل دھمکیاں دیتے رہے اور انہوں نے اپنی بری، فضائی اور بحری افواج کو حملے کی پوزیشن میں لاکر پاکستان پر دباؤ بڑھانا جاری رکھا۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ بھارت اپکستان پر فوجی دباؤ کا ایک ہی جواز پیش کر رہا ہے۔ یعنی ''کراس بارڈر ٹیررازم'' یعنی سرحد پار سے ہونے والی دہشت گردی جسے کشمیری جنگِ آزادی اور جہاد کا نام دیتے ہیں اور پاکستان اسے کشمیریوں کی تحریک آزادی جانتے ہوئے ہمیشہ ان کی سیاسی اور اخلاقی مدد کا اعلان کرتا آیا ہے۔ جب بی بی سی، سی این این اور دیگر ذرائع ابلاغ کی طرف سے پاکستان کے صدر سے انٹرویوز کا سلسلہ شروع ہوا اور ایک خاص مصلحت کے تحت ان سے بار بار یہ سوال پوچھا گیا کہ بھارت کے اس الزام کی حقیقت کیا ہے؟ اور پاکستان اس کا تدارک کیوں نہیں کرتا تو صدر پرویز مشرف نے کہا کہ سرحد پر ساڑھے سات لاکھ بھارتی فوج کی موجودگی میں اگر یہ بات سچ ہے تو پھر اسے کیسے روکا جا سکتا ہے۔ پاکستان کی طرف سے دنیا کو متعدد مرتبہ باور کرایا گیا کہ بھارت محض الزام تراشی کر رہا ہے اور پاکستان نے کنٹرول لائن کی نگرانی کے لئے اقوام متحدہ کے مبصرین یا کسی بھی غیر جانب دار فوج کی موجودگی پر بھی آمادگی ظاہر کر دی، جبکہ بھارت ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتا رہا اور مسلسل الزام تراشی کا سلسلہ جاری رکھا لیکن پاکستان کے اس مضبوط استدلال سے لاجواب ہو کر بالآخر الماتے میں بھارتی وزیراعظم نے بھارت اور پاکستان کی مشترکہ گشت کی تجویز پیش کر کے اپنی دانست میں بہت زبردست سفارتی داؤ کھیلا تھا لیکن ان کی طرف سے پاکستان پر ہر معاملے میں بے اعتمادی کے بعد ایسی تجویز پیش کرنا بہت عجیب لگتا ہے۔ پاکستان نے بھارت کی اس تجویز سے اس بنیاد پر اتفاق نہیں کیا کہ مشترکہ گشت کے بعد بھی منصف کا کردار کون ادا کرے گا؟ اور اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ بھارت پھر پاکستان کو موردِ الزام نہیں ٹھہرائے گا؟

الماتے میں جنرل پرویز مشرف کے استقلال کے باعث اب دنیا کی سمجھ یہ بات آنے لگی ہے کہ بنیادی مسئلہ کشمیر کا ہے جس کی طرف بھارت دنیا کا دھیان جانے ہی نہیں دے گا۔ پاکستان بار بار یہ کہہ رہا ہے کہ دونوں ممالک کے درمیان وجہ کشیدگی مسئلہ کشمیر ہے جسے دونوں ممالک مذاکرات کی میز پر بیٹھ کر حل کر سکتے ہیں۔ پاکستان کا یہ بھی اصرار ہے کہ یہ مسئلہ چونکہ دوطرفہ طریقے سے حل نہیں ہو رہا اس لیے ضروری ہے کہ کوئی تیسرا فریق دونوں ممالک کے درمیان ثالث کا

Marfat.com

کردار ادا کرے لیکن بھارت کسی بھی ثالثی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں، کیونکہ اس کا کیس بہت کمزور ہے اور اب تک وہ صرف دھونس اور دھاندلی سے اپنی بات منواتا آیا ہے۔

اب بھارت کی طرف سے پاکستان پر عائد کی جانے والی فضائی پابندیاں ختم کرنے اور اپنے بحری جہازوں کو پاکستان کی سمندری حدود کے نزدیک سے واپس لے جانے کے اعلانات اور بھارت کی طرف سے پاکستان میں سفارتی عملہ بڑھانے (شاید اس کے بعد ریل اور بس کے ذریعے سفری سہولتیں دوبارہ شروع کرنے) کے اعلانات سے بھارت دنیا کو یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہا ہے کہ اس نے اپنی دانست میں انتہائی مثبت اقدامات کئے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ مثبت اقدامات کر کے بھارت جو مسلسل مذاکرات نہ کرنے کی رٹ لگاتا آیا ہے دنیا کو یہ باور کروانے کی کوشش کر رہا ہے کہ اس نے عالمی برادری کے جذبات کا احترام کیا ہے، حالانکہ حقائق اس کے برعکس ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ زمینی اور فضائی سفر کی پابندیاں بھارت نے خود لگائی تھیں۔ لیکن جلد ہی اسے اس بات کا احساس ہو گیا ہے کہ یہ بھارت کے لیے نرا گھاٹے کا سودا تھا۔ بھارتی تاجروں کی طرف سے حکومت پر پڑنے والے مسلسل دباؤ نے بھارت کو مجبور کر دیا کہ وہ پاکستان سے ریل کا رابطہ کھولنے کی درخواست کرے، کیونکہ بھارت کے تاجروں کو اربوں روپے کا نقصان ہو رہا تھا لیکن پاکستان نے بھارت کی یہ تجویز نہیں مانی، کیونکہ پاکستان سب سے پہلے سرحدی تناؤ ختم کرنے کا مطالبہ کر رہا ہے۔ جہاں تک فضائی پابندیوں کا تعلق ہے تو بھارت کی روزانہ 125 سے 140 پروازیں پاکستان کی فضائی حدود سے گزرتی ہیں، جبکہ پاکستان کی صرف 14 پروازیں متاثر ہوتی ہیں۔ اس سے بھارت کے اس اقتصادی نقصان کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو اسے 31 دسمبر 2001ء کو پابندیاں لگانے کے بعد سے ہو رہا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ صدر جنرل پرویز مشرف نے بھارت کی جانب سے کشیدگی کم کرنے کے حوالے سے کیے جانے والے ان نام نہاد اقدامات پر عدم اطمینان ظاہر کرتے ہوئے فوجوں کی واپسی اور مسئلہ کشمیر کا مذاکرات کے ذریعے حل کو اصل مسئلہ بتایا ہے۔ پاکستان نے ان تمام ممالک کو جو بھارت پر مذاکرات کے۔لیے دباؤ ڈال رہے ہیں یہ باور کرایا ہے کہ ان اقدامات کا اعلان بھارت نے صرف اپنے مفادات کے پیش نظر کیا ہے اور امریکی وزیر دفاع کے دورے کے لیے ایسے علامتی اور نمائشی اقدامات سے نہ تو دونوں ممالک کے مسائل حل ہوں گے اور نہ ہی اس خطے میں مستقل امن قائم ہو پائے گا۔ پاکستان کی طرف سے بھارت کو متعدد مرتبہ جنگ نہ کرنے کے معاہدے اور ایٹمی اسلحہ پہلے نہ استعمال کرنے کی یقین دہانی کرانے کی پیشکش کی جا چکی ہے۔ پاکستان بقول صدر جنرل مشرف ''ماضی کی تمام تلخیوں کو بھلا کر'' بھارت کے ساتھ کھلے دل سے مذاکرات کرنے کے لیے ہر وقت اور ہر جگہ جانے کے لیے تیار ہے، جبکہ بھارتی وزیر اعظم اور ان کے ساتھی اپنے اقدامات سے برصغیر کو ایک تباہ کن جنگ کی طرف دھکیل رہے ہیں۔

جہاں تک ایٹمی جنگ کے خطرات کا تعلق ہے تو دونوں ممالک کی قیادت کو اقوام متحدہ کی ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال سے متعلق قراردادوں کا بخوبی علم ہے۔ قرارداد نمبر 1653/XVI جو 1961ء میں منظور ہوئی تھی۔ اس کے بعد قرارداد نمبر 33/71B (1978) 34/83G (1979) 35/152D (1980) 36/921 (1981) کے مطابق نیوکلیائی ہتھیاروں کا استعمال (کسی بھی شکل میں) یا استعمال کی دھمکی دینا اقوام متحدہ کے منشور کی خلاف ورزی اور انسانیت

Marfat.com

کے خلاف جرم تصور کیا جائے گا۔ 8 جولائی 1996ء کو بین الاقوامی عدالت انصاف نے کہا کہ ایسے ممالک جو ان قراردادوں کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوں گے وہ پوری دنیا کے عتاب کا نشانہ بنیں گے اور دنیا سے کٹ کر رہیں گے۔

بھارت ساری دنیا کے سامنے مسلسل پراپیگنڈا کر رہا ہے کہ کشمیری آزادی نہیں مانگ رہے بلکہ پاکستان کشمیریوں کو ہتھیار دے کر بھارت کے خلاف بغاوت پر اکساتا ہے۔ حالانکہ ساری دنیا اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ کشمیر میں آل پارٹیز حریت کانفرنس کی کچھ جماعتیں مسئلہ کشمیر کے سیاسی حل کے لیے کوشاں ہیں جبکہ متحدہ جہاد کونسل میں شامل کشمیریوں کی 8 جماعتیں بذریعہ جہاد مسئلہ کشمیر کے حل کو جائز سمجھتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ بھارت کے بے حد اصرار کے باوجود امریکہ اور یورپی ممالک نے بھی حزب المجاہدین اور دیگر کشمیری جہادی تنظیموں کو دہشت گرد قرار نہیں دیا اور الماتے کانفرنس کی قرارداد میں بھی اس واضح فرق کو نمایاں کیا گیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ان تنظیموں کی طرف سے کشمیر کے اندر کوئی کارروائی کی جائے گی تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اس کا ذمے دار بھارت پاکستان یا آئی ایس آئی کو قرار نہیں دے گا؟ یہی وجہ ہے کہ بھارت امریکہ سے اس بات کی ضمانت مانگ رہا ہے کہ پاکستان نے سرحد پار کیمپ بند کر دیئے ہیں وہاں پاکستان بھی بھارت سے ایسی ضمانت کا خواہاں ہے۔ خصوصاً وہ ڈھائی سے تین ہزار کے درمیان مسلح القاعدہ کے ارکان جو بھارتی دعوؤں کے مطابق اس وقت مقبوضہ کشمیر میں موجود ہیں۔ اگر وہ کوئی کارروائی کرتے ہیں تو اس کا الزام بھی بھارت پاکستان پر لگائے گا۔ بھارتی انٹیلی جینس کی اطلاعات کے مطابق دہشت گرد اگلے چند دنوں میں بھارت کے کسی بڑے شہر میں کوئی بڑی کارروائی کرنے والے ہیں، یہ کارروائی کس کے کھاتے میں ڈالی جائے گی؟

پاکستان نے بین الاقوامی اتحاد کا ساتھ دے کر القاعدہ کے خلاف ہر کارروائی میں حصہ لیا ہے۔ پاکستان کے ان اقدامات پر یہ لوگ پاکستان سے ناراض ہوں گے اور عین ممکن ہے کہ وہ پاک بھارت کشیدگی کو مزید بڑھانے کے لیے کوئی کارروائی کریں۔ ان حالات میں ایک غیر جانب دار ٹیم کی بھارتی علاقے میں موجودگی ضروری سمجھی جانے لگی ہے اور اس سلسلے میں برطانوی سیکرٹری خارجہ کی طرف سے برطانیہ اور امریکہ کی مشترکہ نگرانی کا فارمولا بھی سامنے آچکا ہے جس پر ظاہر ہے کہ پاکستان کو کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔ البتہ بھارت کو اس پر اعتراض ہے کیونکہ وہ اس مسئلے کو دو طرفہ بنیاد پر حل کرنے پر بضد ہے، لیکن اس میں اپنے لیے منصف کا کردار مانگ رہا ہے۔

انٹرنیٹ اور دیگر ذرائع سے موصول ہونے والی اطلاعات کے ذریعے بھارت کے موجودہ ''مثبت اقدامات'' کی کڑیاں بعض حلقوں کی جانب سے الماتے میں طے پانے والے اس معاہدے سے ملائی جارہی ہیں جو امریکی آشیرواد سے صدر پوٹن کے ذریعے دونوں ممالک کے درم پاچکا ہے۔ ان حلقوں کا کہنا ہے کہ اس معاہدے کے مطابق کنٹرول لائن پر کچھ تبدیلیاں عمل میں آئیں گی جو بھارت کی مرضی کے مطابق ہوں گی۔ ہندو اکثریتی علاقے بھارت میں ضم ہو جائیں گے۔ آزاد کشمیر پاکستان کا حصہ رہے گا اور سری نگر کو داخلی خود مختاری مل جائے گی۔ اس منصوبے کو بھارت کی طرف سے شرف قبولیت عطا ہونے کے عوض امریکہ اور روس نے بھارت کو سلامتی کونسل کا مستقل رکن بنانے کی حامی بھرلی ہے۔ آزاد کشمیر کو پاکستان کا حصہ بنانے کے عوض امریکہ پاکستان سے شمالی علاقہ جات میں ''سہولتیں'' حاصل کرے گا تاکہ چین کے گرد حصار قائم کرسکے۔ خیال

Marfat.com

رہے کہ امریکہ نیپال سے یہ سہولت حاصل کر چکے ہیں۔ ادھر روس کی اقتصادی حالت اسے اجازت نہیں دیتی کہ وہ امریکہ کی اس علاقے میں موجودگی پر احتجاج کرے۔ (روزنامہ جنگ سنڈے ایڈیشن 23 جون 2002ء مصنف۔ طارق اسمٰعیل ساگر)

جون 2002ء میں امریکی وزیر دفاع رمز فیلڈ نے پاکستان اور بھارت کا دورہ کیا۔ حالات و واقعات کے پس منظر میں میرا مضمون ''بھارت اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا؟'' شائع ہوا۔ ملاحظہ فرمائیں۔

امریکہ کی وزیر دفاع رمز فیلڈ اور ان کے نائب رچرڈ آرمٹیج نے گذشتہ دنوں برصغیر کا دورہ کیا تھا جس کے اختتام پر شاید رمز فیلڈ کو اچھی ہمسائیگی کا تاثر دینے کے لیے بھارت نے پاکستان کے ساتھ فضائی پابندیاں ختم کرنے اور بین الاقوامی سمندری حدود کے نزدیک سے حالتِ جنگ میں موجود اپنے سمندری جہاز پیچھے ہٹانے کا اعلان کیا تو یہ امید بندھنے لگی تھی کہ رمز فیلڈ کے دورے کے بعد شاید دونوں ممالک کے درمیان گذشتہ سات ماہ سے جو سخت کشیدگی ہے وہ ختم ہو جائے گی اور رمز فیلڈ اس ضمن میں کوئی حتمی کردار بھی ادا کر سکیں گے لیکن خلاف توقع ایسا نہیں ہوا اور رچرڈ آرمٹیج کے دورے کے بعد سے بھارت کی طرف سے مزید کوئی بھی مثبت قدم نہیں اٹھایا گیا۔ البتہ بین الاقوامی پریس کے حوالے سے بھارت سے توقعات وابستہ کرنے کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے اور یہ باور کیا جاتا ہے کہ بھارت جلد ہی پاکستان میں نئے ہائی کمشنر کا تقرر کرنے کے علاوہ مرحلہ وار اپنی فوجیں بھی سرحدوں سے ہٹالے گا کیونکہ صدر جنرل پرویز مشرف نے بھارتی اقدامات کو ناکافی قرار دیتے ہوئے دنیا پر واضح کیا ہے کہ جب تک بھارتی فوجیں سرحدوں پر موجود ہیں، جنگ کا خطرہ نہیں ٹل سکتا کیونکہ کوئی معمولی سا واقعہ بھی کسی بڑی کشیدگی کا باعث بن سکتا ہے۔

پاکستان نے تمام اقدامات دفاعی پوزیشن اختیار کرتے ہوئے کئے ہیں اور ہمیشہ بھارت سے ہر جگہ ہر موقع پر بات چیت کے ساتھ مسائل حل کرنے پر آمادگی بھی ظاہر کی ہے۔ اس لئے پاکستان پر نہ تو جارحیت کا الزام لگایا جا سکتا ہے اور نہ ہی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے موجودہ صورتحال تک حالات کو پہنچانے میں کوئی کردار ادا کیا ہے۔ یوں دکھائی دیتا ہے کہ امریکہ نے ہی اس مسئلے پر ایک حد مقرر کر رکھی ہے جس سے آگے جانے کا وہ متحمل ہی نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ رمز فیلڈ کے ساتھ ہمارے سابق وزیر خارجہ عبدالستار نے مشترکہ پریس کانفرنس کے دوران حیرت انگیز طور پر امریکہ سے ''زیادہ توقعات'' کا ذکر کیا تو امریکی وزیر دفاع رمز فیلڈ نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ دونوں ممالک کو اپنے آپس کے اختلافات بالآخر آپس میں ہی طے کرنے پڑیں گے کیونکہ دنیا میں آج تک جنگوں کے ذریعے کبھی مسائل حل نہیں ہوئے اور امریکہ سے اس سلسلے میں بہت زیادہ توقعات وابستہ کرنا ٹھیک نہیں۔

وزیر دفاع رمز فیلڈ کے اس بیان کو اگر مقبوضہ کشمیر کے کٹھ پتلی وزیر اعلیٰ فاروق عبداللہ کے ایک بیان کے پس منظر میں دیکھا جائے تو کوئی ابہام باقی نہیں رہتا۔ فاروق عبداللہ نے اپنے بیان میں کہا کہ ہم نے امریکی فوج کی کنٹرول لائن پر بطور نگران تعیناتی کو اس لیے تسلیم نہیں کیا کہ اگر امریکہ ایک مرتبہ کشمیر میں گھس گیا تو وہاں سے باہر نہیں نکلے گا کیونکہ کوئی بھی فوج کہیں داخل ہونے کے بعد مشکل ہی سے واپس جاتی ہے۔ جہاں تک امریکہ کا تعلق ہے تو کشمیر میں اس کی مداخلت ہمیشہ سے جاری ہے۔

فاروق عبداللہ نے یہ بیان کسی ترنگ میں نہیں دیا بلکہ مختلف ذرائع سے یہ خبریں پہلے بھی آ چکی ہیں کہ بھارت نے

Marfat.com

پاکستان کو "درمیانی دوستوں" کے حوالے سے یہ بات سمجھادی تھی کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان غیر ملکی افواج کی موجودگی دونوں ممالک کے حق میں نہیں۔ شاید بھارتیوں نے اس بات کا اندازہ پہلے سے لگا لیا ہے کہ امریکہ اس خطے میں صرف صلح کروانے کے لیے نہیں آنا چاہتا بلکہ اس کے پسِ پردہ اپنا ایجنڈا مکمل کرنے کا بھی متمنی ہے کیونکہ یہ بات کئی حوالے سے سامنے آ چکی ہے کہ امریکہ سرینگر اور پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں اپنے مستقل اڈے کے چین کے سر پر بیٹھنے کا خواہش مند ہے۔ اس صورتحال کا اندازہ چین سے زیادہ اور کسی کو نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چین نے جواب تک خاموشی سے صورتحال کا جائزہ لے رہا تھا، دبے الفاظ میں لیکن کھل کر امریکہ کی اس خطے میں بڑھتی ہوئی مداخلت پر اپنے تحفظات ظاہر کیے ہیں اور یہ بھی شنید ہے کہ چین کی طرف سے اپنے دوست پاکستان کو بھی یہ بات سمجھادی گئی ہے کہ امریکہ کی کس حد تک مداخلت چین پسند کرے گا اور پاکستان سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ اس حد کو عبور نہ کرے۔ بھارتی وزیر خارجہ جسونت سنگھ نے اپنے ایک بیان میں جب یہ کہا کہ امریکہ کی ثالثی کو شاید چین بھی پسند نہ کرے اور کنٹرول لائن پر غیر ملکی فوجوں کی موجودگی پر بھی ان کا موقف وہی ہے جو چین کا ہے تو چین کی طرف سے اس بیان کی تردید یا تائید کی کوئی خبر نہیں آئی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سفارتی سطح پر خصوصاً بھارت نے خاصی پیش رفت کی ہے اور ہم صرف پاک چین دوستی کے نعرے پر ہی خوش رہیں تو یہ ہماری خوش فہمی ہی ہو سکتی ہے، کیونکہ حالات کے جس جبر کا ہم شکار ہیں اس میں بہت سے فیصلے اپنی مرضی سے نہیں کیے جا سکتے۔

پاکستان کی وزارت خارجہ نے ہمیشہ کی طرح پاکستانی عوام کو اندھیرے میں رکھنے کی پالیسی اپنائی ہوئی ہے۔ امریکہ عہدے داروں کی پاکستان آمد سے پہلے ان سے بہت زیادہ توقعات وابستہ کر لی جاتی ہیں۔ رمزفیلڈ کے دورے سے یہ سمجھا جا رہا تھا کہ اس کے بعد بس راوی چین ہی چین لکھے گا، لیکن رمزفیلڈ نے ہماری خوش فہمی یہ کہہ کر دور کر دی کہ امریکہ کے پاس کوئی جادو کی چھڑی نہیں جس کے ذریعے وہ مسئلہ کشمیر حل کروا دے گا۔ بھارت میں امریکہ کے سفیر رابرٹ بلیک ویل نے گذشتہ دنوں یہ بیان دیا کہ آرمیٹج کے دورے کا مقصد پاکستان سے دہشت گردی اور تربیتی کیمپوں کے خاتمے کی یقین دہانی حاصل کرنا تھا۔ انہوں نے امریکن انڈین بزنس کونسل کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے رمزفیلڈ اور آرمیٹج کے حالیہ دوروں کا صرف ایک ہی مقصد بتایا جس کی طرف بھارتی وزیر اعظم مسٹر واجپائی نے ایک ہندی اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے اشارہ کیا ہے۔ بھارتی وزیر اعظم کا کہنا ہے کہ ہم نے لڑائی لڑے بغیر فتح حاصل کر لی ہے کیونکہ امریکیوں نے ہمیں اس بات کی ضمانت دی ہے کہ پاکستان آزاد کشمیر میں "دراندازوں کے تربیتی کیمپ" بند کر رہا ہے اور سرحد پار سے بھارت میں "دہشت گردی" نہیں ہوگی۔ اس کے بعد ہی ہم نے پاکستان کو "سبق سکھانے" کا ارادہ تبدیل کیا ہے۔ بصورت دیگر ہم تو ایٹمی جنگ کی بھی تیاری کر چکے تھے اور وہ تمام ممکنہ اقدامات بھی کر چکے تھے جن سے ہمیں ایٹمی جنگ کے بعد پالا پڑتا۔

بھارتی وزیر اعظم مسٹر واجپائی کے اس انٹرویو کا موجودہ حالات میں کیا مطلب لیا جا سکتا ہے؟ کیا وہ صرف اپنے عوام، فوج اور اسٹیبلشمنٹ کو مطمئن کرنا چاہتے ہیں یا پاکستان کی طرف سے پیدا کردہ اس تاثر کو غلط ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ بھارت نے پاکستان کے ایٹمی ڈیٹرنٹ کے خوف سے اپنا ارادہ تبدیل کیا ہے؟ وجہ کچھ بھی رہی ہو لیکن ان حالات میں خصوصاً مسٹر واجپائی کی طرف سے ایسا بیان جاری ہونے سے کوئی اچھا تاثر پیدا نہیں ہوا اور اس سے امن کے لیے کی جانے والی کوششوں کو دھچکا بھی لگ سکتا ہے۔

Marfat.com

یوں دکھائی دیتا ہے جیسے بھارت میں موجود ایک مخصوص حلقہ امن کے لیے کی جانے والی ان کوششوں کو بار آور نہیں ہونے دے گا۔ اس کا ثبوت بھارتی وزیر داخلہ مسٹر ایڈوانی کے عجیب وغریب بیانات ہیں۔ اپنے ایک بیان میں انہوں نے پاکستان اور بھارت کی کنفیڈریشن کی تجویز پیش کی ہے جس سے پاکستانی وزارت خارجہ نے ان کی بیمار ذہنیت کا شاخسانہ قرار دیا ہے۔ اسی طرح بھارتی وزارت خارجہ کی ترجمان نروپمار اؤ کا یہ بیان کہ جنرل پرویز مشرف نے بھارت کو ایٹمی بلیک میلنگ کی دھمکی دی ہے، سمجھ سے بالاتر ہے۔ یہ بیان دراصل جنرل پرویز مشرف کی اس بات کا ردعمل ہے جو انہوں نے ایٹمی ماہرین اور سائنس دانوں کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہی تھی، جس میں ماہرین کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ پاکستان کی ایٹمی استعداد نے بھارت کو جارحیت سے روکے رکھا۔ اس خطاب کو بھارتی حکومت نے ''ایٹمی بلیک میلنگ'' قرار دیا ہے۔

ہماری وزارت خارجہ کے وعدوں اور حکومتی خوش فہمیوں کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ ماضی کی طرح اب بھی امریکہ پاکستان کی توقعات پر پورا نہیں اتر سکا اور اس نے اپنا ''منافقانہ کردار'' برقرار رکھا ہے۔ امریکہ کی طرف سے پاکستان کو متعدد مرتبہ یہ بات سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ امریکی دوستی کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ پاکستان کی توقعات کے مطابق اپنی خارجہ پالیسی بنائے گا۔ امریکہ کے اس خطے میں بھی اپنے مفادات ہیں اور وہ ان پر کبھی سودے بازی نہیں کر سکتا۔ موجودہ حالات میں بھارت جیسے ایک ارب آبادی والے ملک کو نظر انداز کر کے صرف پاکستان کو خوش کرنا امریکہ کے لیے کیسے ممکن ہے؟ یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے چونکہ پاکستان میں ایک غیر جمہوری حکومت ہے اس لیے بعض اہم فیصلے کرنا خصوصاً موجودہ صورتحال میں بعض انقلابی فیصلے کرنا ممکن نہیں۔ اس کے لیے قوم کو اعتماد میں لینا ضروری ہے اور قوم کی حالت یہ ہے کہ وہ کشمیر کے مسئلے پر بے حد جذباتی ہے۔ کشمیر پالیسی میں کسی بھی قسم کی تبدیلی پاکستانی قوم کے لیے ناقابل برداشت ہے اور وہ اس مسئلے پر کوئی بھی حکومتی دلیل سننے کے لیے تیار نہیں۔ ان حالات میں جبکہ سیاسی جماعتیں حکومتی موقف سے آگاہ نہ ہوں ان کے لیے صرف عوام کو مطمئن کرنا ہی مسئلہ نہیں ہوگا بلکہ وہ حکومتی اقدامات پر شک اور تحفظات کا اظہار بھی کرتی رہیں گی۔ اس کا مظاہرہ لاہور میں گذشتہ دنوں ہونے والی جماعت اسلامی کی کشمیر کانفرنس میں دیکھنے میں آیا۔ جہاں ملک کی بااثر مذہبی وسیاسی قیادت نے کھل کر حکومت پر الزامات عائد کیے کہ اس نے کشمیر کے مسئلے پر سودے بازی کرلی ہے۔

بھارت نے راجستھان سیکٹر سے اپنی کچھ فوجیں اگر پیچھے ہٹائی ہیں تو اس کی وجہ امریکہ کی ثالثی یا ہمارا امن پسند رویہ نہیں بلکہ بھارت کی اپنی مجبوریاں ہیں۔ راجستھان میں 50 ڈگری سینٹی گریڈ گرمی اور حشرات الارض کے کاٹنے سے بھارتی فوجیوں کی ہلاکت نے بھارتی فوج کو بددل کردیا تھا اور اس محاذ پر فوج کے ڈسپلن کو برقرار رکھنا بھارتی جرنیلوں کے لیے ناممکن ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ کسی محاذ سے بھارت نے فوج نہیں ہٹائی اور یہ کہا ہے کہ جب بھارت کو اس بات کا یقین ہوگیا کہ پاکستان سے مجاہدین کی مداخلت بند ہو چکی ہے تو وہ راجستھان اور پنجاب سے مرحلہ وار فوج ہٹائے گا اور جہاں تک کشمیر کا تعلق ہے وہاں سے مکمل امن وامان بحال ہوئے بغیر فوج نہیں ہٹائی جائے گی۔

خیال رہے کہ بھارت نے مقبوضہ کشمیر میں اپنے طے شدہ ایجنڈے پر عمل شروع کردیا ہے۔ جس کا پہلا ثبوت

Marfat.com

سید علی گیلانی کی ''پاکستانی'' کہلانے کے جرم میں گرفتاری اور دو سال کی نظر بندی ہے۔ امریکی حکام کی طرف سے یہ بات ریکارڈ پر موجود ہے کہ بھارت مقبوضہ کشمیر میں الیکشن کروا کر وہاں ''جمہوریت'' بحال کر رہا ہے اور اس منصوبے پر بھارت کو امریکی آشیر باد بھی حاصل ہے۔ اس لیے اکتوبر میں الیکشن اور ''مطلوبہ نتائج'' کے حصول تک بھارتی فوج کے لائن آف کنٹرول سے پیچھے ہٹنے کے بارے میں شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں۔ ان حالات میں پاکستان کی خارجہ حکمت عملی کیا ہونی چاہیے؟ یہ وہ اہم سوال ہے جس کا جواب پاکستانی وزارت خارجہ کے بزرجمہر ہی دے سکتے ہیں کیونکہ بھارت نے بڑی کامیابی سے مسئلہ کشمیر کو مسئلہ دہشت گردی میں تبدیل کر دیا ہے اور خصوصاً آرمیٹج کے دورے کے بعد سے امریکہ اور بھارت کی طرف سے پاکستان کو بار بار ''سرحد پار دہشت گردی'' ختم کروانے کے لیے یاددہانی کروائی جا رہی ہے۔ بھارت نے بڑی ہوشیاری سے اس مسئلے کو الجھا کر سید علی گیلانی کو دو سال کے لیے جیل بھیج دیا ہے۔

آزاد کشمیر میں موجود کشمیری رہنماؤں کے دعوے اپنی جگہ لیکن بین الاقوامی سودے بازی میں ان کی حیثیت کا ابھی تک کوئی واضح تعین نہیں ہو سکا ہے۔ صرف بیانات کے ذریعے خود کو منوانے کی بات الگ ہے۔ اس ساری صورتحال کے تناظر میں یہ واضح دکھائی دیتا ہے کہ بھارتی حکومت نے بڑی کامیابی سے 11 ستمبر کے بعد خصوصاً مسئلہ کشمیر پر عالمی رائے عامہ کو اپنے حق میں دہشت گردی کی آڑ لے کر ہموار کر لیا ہے۔ ہماری حکومت کی طرف سے مدافعانہ طرز عمل نے بھارت کے لیے بڑی آسانیاں پیدا کر دی ہیں، شاید ہی کوئی ایسا موقع 11 ستمبر کے بعد آیا ہو گا جب کسی غیر ملکی رہنما کی پاکستان آمد پر پاکستان نے بھارتی الزامات کے جواب میں اپنی صفائیاں پیش نہ کی ہوں۔ بھارت یہی چاہتا ہے کہ پاکستان پر مسلسل الزامات کی بوچھاڑ کر کے اسے الجھائے رکھے۔ بدقسمتی سے مغربی دنیا مسلمانوں سے نالاں ہے جس میں مسلمانوں کا تو شاید کوئی قصور ہو یا نہ ہو لیکن پراپیگنڈے کا کمال ضرور ہے۔

ان حالات میں سابق وزیر خارجہ عبدالستار کے مستعفی ہونے کا فیصلہ سمجھ میں آ سکتا ہے اور نئے وزیر خارجہ انعام الحق کی تقرری کے بعد یہ امید کی جا رہی ہے کہ وہ پاکستان کو حالات کے جبر سے آزاد کرا لیں گے کیونکہ ان سے متعلق یہ باتیں پہلے سے سننے میں آ رہی ہیں کہ موصوف کو امریکی حلقوں میں پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے اور کسی بھی پاکستانی ذمے دار کے لیے یہ معمولی کریڈٹ نہیں ہے۔ (روزنامہ جنگ سنڈے ایڈیشن 30 جون 2002ء مصنف طارق اسمٰعیل ساگر)

☆ بھارتی حکومت نے پاکستانی سرحدوں پر فوجیں جمع کر کے پاکستان کے خلاف زہریلے پراپیگنڈے کا محاذ گرم کر کے اور بین الاقوامی سطح پر پاکستان کے خلاف مسلسل دہشت گردی کے پراپیگنڈہ کر کے دیکھ لیا تھا کہ اس کی دال گلتی نظر نہیں آ رہی۔ اس مرحلے پر بھارتی حکمرانوں نے ایک چال چلی اور جون 2002ء کے دوران پاکستان پر سرحد پار دہشت گردی کو بڑھاوا دینے اور مجاہدین کی تربیت گاہیں چلانے کا الزام عائد کرنے کے بعد بھارت نے مقبوضہ کشمیر کے سیاستدانوں سے مذاکرات شروع کر دیئے۔ مذاکراتی عمل میں مقبوضہ کشمیر کے سابق وزرائے اعلیٰ سید میر قاسم اور غلام محمد شاہ اہم رول ادا کر رہے تھے۔ سید میر قاسم اور غلام محمد شاہ نے دو برس قبل بھارتی وزیر دفاع جارج فرنانڈس نے بھی خفیہ مذاکرات کیے تھے۔ ان دنوں ایک اہم بات سامنے آئی وہ یہ کہ نئی دہلی حکومت کے اہم ایلچی سرینگر میں سرگرم ہو گئے تھے۔ بھارت نے کشمیری سیاستدانوں سے مذاکرات امریکی صدر بل کلنٹن کے دورہ کشمیر کے موقع پر شروع کیے تھے کیونکہ

Marfat.com

پاکستان اور بھارت کے ایٹمی دھماکوں کے بعد دنیا کی توجہ جنوبی ایشیا کی طرف مبذول ہوگئی تھی اور یہ بھی جان لیا گیا کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان کشیدگی کی بنیادی وجہ مسئلہ کشمیر ہے۔ اس وقت بین الاقوامی برادری نے تنازعہ کو حل کرنے کے لئے ثالثی کی پیش کش کی تھی لیکن بھارت جموں وکشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ قرار دے کر ثالثی کی کوششوں کو ناکام بناتا رہا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ 11 ستمبر کے بعد جنوبی ایشیا کے حالات یکسر بدل گئے، ملکوں نے اپنی پالیسیاں تبدیل کرلیں اور اسلامی جدوجہد کے پیش نظر بھارت سے گٹھ جوڑ کرلیا۔ برطانوی اخبار گارڈین نے ایک رپورٹ میں پاکستان اور بھارت کے درمیان کشیدگی اور جنگی حالات پیدا ہونے کے باوجود برطانیہ کی طرف سے دونوں ملکوں کو جنگی اسلحہ فراہم کرنے کا انکشاف کرکے بہت سے حلقوں کو حیرت زدہ کر دیا لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ پاک بھارت کشیدگی کے دوران برطانیہ دونوں ملکوں کو جنگی اسلحہ فروخت کرتا رہا۔ گولہ بارود، میزائل، بم، تارپیڈو، راکٹ، جنگی کشتیاں، فوجی طیارے اور فاضل پرزوں سمیت 200 قسم کی فوجی اشیاء اسلام آباد اور نئی دہلی کو دی گئیں۔ اگرچہ افغانستان میں القاعدہ اور طالبان کے خلاف جنگی کارروائی میں امریکہ اور برطانیہ نے زبردست اتحاد کا مظاہرہ کیا بالکل اسی تناظر میں امریکہ اور برطانیہ نے پاکستان اور بھارت کے درمیان کشیدگی کو بظاہر کم کرنے کے لیے اعلیٰ سطحی سفارتی کوششیں کیں۔ امریکہ اور برطانیہ نے تنازعہ کشمیر کے حوالے سے بھی اہم رول ادا کرنے کا تاثر دیا اور دونوں ملکوں سے پیش کش کی کہ اینگلو امریکن فوجیں جموں وکشمیر کی جنگ بندی لائن کی نگرانی کریں، جس پر بھارت نے ثالثی کی بو سونگھ لی اور فوری طور پر برطانیہ اور امریکہ کے عزائم کو بھانپ کر پاکستان اور بھارت کی مشترکہ فوجوں کے جنگ بندی لائن پر گشت کا شوشہ چھوڑ دیا لیکن پاکستان نے بروقت بھارتی پیشکش کو مسترد کردیا کہ مشترکہ گشت تو دوستوں کا ہوا کرتا ہے۔ بھارت کے ساتھ ممکن نہیں، تنازعہ کشمیر کے حوالے سے جنگ بندی لائن کے آر پار کے کشمیریوں کو گمراہ کرنے کے لیے بھی بھارت نے کئی چالیں چلیں، نئی دہلی نے کشمیر کے لیے مذاکرات کار کے سی پنت اور وجاہت حبیب اللہ کے رول کو منجمد کرتے ہوئے بھارتی ایجنسی ''را'' کے سابق سربراہ اور وزیراعظم واجپائی کے دفتر میں کشمیر معاملات کے انچارج اے ایس دولت کو جموں وکشمیر روانہ کیا۔ جہاں انہوں نے سابق وزرائے اعلیٰ سمیت حریت کانفرنس کے کئی لیڈروں سے مذاکرات کیے۔ اس کے فوری بعد بھارتی وزیراعظم واجپائی کشمیر کے دورے پر سرینگر پہنچے، سرینگر میں واجپائی نے اقتصادی پیکج کا اعلان کیا۔ اس پیکج کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں فورسز کے لیے مراعات ہی مراعات تھیں۔ کشمیری عوام کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ اس کے بعد شری واجپائی نے دوبارہ کشمیر کا دورہ کرنے کا اعلان کیا اور کہا کہ اس مرتبہ وہ سیاسی پیکج کا اعلان کریں گے لیکن ٹائم میگزین کی طرف سے واجپائی کو بڈھا کھوسٹ قرار دینے کے بعد واجپائی نے 20 جون کو دوسری بار کشمیر جانے کا ارادہ ترک کردیا۔ ٹائم میگزین کے نامہ نگار الیکس پیری نے کہا کہ 77 سالہ واجپائی اب ایٹمی بھارت کو کنٹرول کرنے کے قابل نہیں رہے۔ وہ طرح طرح کے امراض میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ واجپائی نے دورہ ملتوی کرنے کے بعد اعلان کیا کہ وہ مقبوضہ کشمیر میں مجوزہ اسمبلی انتخابات سے قبل سرینگر کا دورہ ضرور کریں گے۔

اسی دوران واشنگٹن، لندن اور نئی دہلی میں کشمیر پر خفیہ مذاکرات شروع ہوئے۔ جن میں سمندر پار کشمیریوں نے شرکت کی۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے غیر مستقل رکن ملک میکسیکو نے بھی اقوام متحدہ کے اجلاس کے موقع پر ایک غیر سرکاری ڈائیلاگ کا اہتمام کیا، جن کو بھارتی لابی نے زبردست پروپیگنڈے کے بعد ناکام بنا دیا۔ نئی دہلی میں امریکی سفارت

Marfat.com

خانے نے کشمیر پر ایک مذاکرے کا اہتمام کیا جس میں کئی کشمیری رہنماؤں نے بھی شرکت کی، ایک کشمیری لیڈر شبیر شاہ نے نئی دہلی میں یورپی یونین، امریکہ، برطانیہ اور متعدد ممالک کے سفارتکاروں سے بات چیت کی۔ شبیر شاہ کے علاوہ کانگرس، جنتا دل، کمیونسٹ پارٹی اور دیگر بھارتی جماعتوں میں شامل کشمیری سیاستدان بھی تنازعہ کشمیر کے حل کے سلسلے میں نئی دہلی اور سری نگر میں خفیہ مذاکرات جاری رہے۔ ان مذاکرات کے راز فاش ہونے کے بعد ہندو انتہا پسند جماعت ویشوا ہندو پریشد نے جموں و کشمیر کو تقسیم کرنے کا فارمولہ پیش کر دیا، اس فارمولے کو ڈکسن نے بھی پیش کیا تھا۔ چناب فارمولے یا واشنگٹن پلان میں جموں و کشمیر کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی بات کہی گئی۔ ان فارمولوں کا مقصد کشمیریوں کی جدوجہد آزادی کا کوئی متبادل سامنے لانا تھا لیکن کشمیریوں کی نمائندہ جماعتوں بالخصوص متحدہ جہاد کونسل نے تقسیم کشمیر کے کسی بھی فارمولے کو مسترد کر دیا۔ جہاد کونسل کا موقف تھا کہ بھارت کی ساڑھے سات لاکھ فوج کشمیر سے نکل جائے، نظر بندوں کو رہا کیا جائے۔ تمام کالے قوانین کو ختم کیا جائے اور بھارت کشمیر کو متنازعہ علاقہ تسلیم کرے تو مجاہدین بھارت کے ساتھ مذاکرات کریں گے۔ یہ مذاکرات برابری کی سطح پر ہونگے۔ یہ بات واضح ہے کہ تنازعہ کشمیر خفیہ مذاکرات سے حل نہیں ہوگا بلکہ یہ تنازعہ پاکستان، بھارت اور کشمیری عوام کے درمیان ہونے والے مذاکرات سے ہی حل ہوگا۔

ایک طرف بھارت جنوبی ایشیا کے ممالک کی فیڈریشن اور کنفیڈریشن بنانا چاہتا تھا تو دوسری طرف کشمیریوں کے دو حصوں کے درمیان حائل عارضی لکیر کو مضبوط کرنے کی باتیں کی جا رہی تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ بھارتی عزائم مکروہ ہیں۔ مغربی دنیا کشمیر میں بھارتی کھیل کو سمجھنے کے باوجود مفادات کی خاطر نئی دہلی کا ساتھ دے رہی تھی جو کہ سراسر ناانصافی تھی۔ تنازعہ کشمیر کو حل کرنے کے سلسلے میں خفیہ مذاکرات کے بعد بھارتی وزیراعظم واجپائی نے جموں و کشمیر کی حکمران جماعت نیشنل کانفرنس کے خودمختاری کے مطالبہ کو مسترد کر دیا اور صاف و شفاف الیکشن کرانے کا اعلان کیا۔ امریکی جریدے نیوز ویک کے ساتھ ایک انٹرویو میں بھارتی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی نے کشمیریوں کی جدوجہد کے خلاف ہرزہ سرائی کرتے ہوئے کہا کہ القاعدہ اور دیگر جہادی گروپوں کے کشمیری مجاہدین سے قریبی رابطے ہیں اور پاکستان ان کی مدد کر رہا ہے۔ واجپائی نے کہا کہ جنگ بندی لائن پر دراندازی بند نہیں ہوئی۔ بھارتی وزیر دفاع نے واجپائی کے اس انٹرویو سے قبل کہا تھا کہ دراندازی تقریباً بند ہو چکی ہے۔ دوسری طرف پاکستان کے صدر جنرل پرویز مشرف کا بھی نیوز ویک کے اسی شمارے میں انٹرویو شائع ہوا جس میں کہا گیا کہ پاکستان جنگ بندی لائن کو سرحد تسلیم نہیں کرے گا اور کشمیریوں کی کسی قسم کی خودمختاری کی مخالفت کرے گا۔ بھارتی وزیراعظم واجپائی اور پاکستانی صدر مشرف کا جموں و کشمیر کو خودمختاری دینے کی مخالفت کے نکتہ پر اتفاق رائے سامنے آیا ہے۔ بھارتی حکومت پاکستان اور کشمیری مجاہدین پر دباؤ ڈال کر مقبوضہ کشمیر میں الیکشن کرانے کی راہیں ہموار کر رہی تھی۔ اس مقصد کے لیے کشمیری سیاستدانوں کو سیاسی مظاہروں کے خوف و ہراس پیدا کیا جا رہا تھا۔ بھارت درپردہ مذاکرات کے ذریعے کشمیریوں کو مصروف رکھنا چاہتا تھا اور دوسرا مقصد کشمیریوں کے درمیان اختلافات بھی پیدا کرنا تھا۔ بھارتی حکومت نے اکتوبر کے آخر تک اس بات کا احساس کر لیا تھا کہ پاکستان پر ان کی فوجی دھونس نہیں چل سکتی نہ ہی بھارتی فوج پاکستان پر حملے کا خطرہ مول لے گی۔ قریباً دس ماہ تک پاکستانی سرحدوں پر اپنی فوجیں رُکنے کے بعد بالآخر بھارت نے فوجیں واپس بلانا شروع کر دیں۔ نومبر ہی میں بھارت نے مقبوضہ کشمیر میں نام نہاد الیکشن

Marfat.com

بھی کروالیا جسے ساری دنیا کے پریس نے ''ڈھونگ'' قرار دیا۔اس صورتحال کے پس منظر میں میرا مضمون ''مقبوضہ کشمیر کی نئی کٹھ پتلی قیادت'' شائع ہوا۔ملاحظہ فرمائیں۔

''مقبوضہ کشمیراور پاکستانی سرحد پر لاکھوں کی تعداد میں افواج تعینات کر کے دس ماہ تک ساری دنیا کے امن پسند انسانوں کوایک اعصاب شکن انتظار کے بعد بالآخر بھارتی حکومت مقبوضہ کشمیر میں نام نہاد الیکشن کروانے میں کامیاب ہوگئی۔اس الیکشن پر جو کچھ ہوا اس سے دہرانے کی ضرورت اس لیے نہیں ہے کہ ساری دنیا کے میڈیا نے آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی سے لوگوں کو آگاہ کیا۔دنیا بھر کی انسانی حقوق کی تنظیموں، بھارتی باشعور رائے عامہ اور ہر قابل ذکر مہذب حکومت کی طرف سے انتخابات کے نام پر رچائے گئے اس ڈرامے کی ہر سطح پر مخالفت کے باوجود بھارتی حکومت نے انہیں کامیاب انتخابات قرار دیا یا پھر بھارت میں موجود امریکی سفیر نے اسے مقبوضہ کشمیر میں امن وامان کی بحالی کی طرف ایک اہم موڑ قرار دے کر بھارت نوازی کی مثال قائم کی۔

انتخابات سے حاصل نتائج میں بھارتی حکومت کے دیرینہ نمک خوار فاروق عبداللہ کی نیشنل کانفرنس کی ناکامی اور پی ڈی پی کے ساتھ کانگرس کے گٹھ جوڑ کے بعد جنم لینے والی مفتی سعید کی قیادت مقامی سیاست میں بہرحال ایک تبدیلی کا اشارہ ہے اور یوں دکھائی دیتا ہے کہ مقبوضہ کشمیر کے بھارت نواز حلقے بھی بھارتی حکومت سے نالاں ہیں۔انہوں نے اسے نام نہاد انتخابات میں بھی فاروق عبداللہ کو کامیاب نہیں ہونے دیا جبکہ ایک دوسرا نکتہ نظریہ بھی ہے کہ اس مرتبہ مرکز میں موجود جن سنگھی قیادت نے ایک منصوبہ کے تحت سری نگر میں کانگریس کو کامیابی دلائی تاکہ وہ استروں کا اپنے گلے میں ڈالے اور آئندہ اس حوالے سے ہونے والی تمام تر قباحت کی ذمہ دار بھی قرار پائے ورنہ جن سنگھی قیادت کے لیے فاروق عبداللہ کو ہی برقرار رکھنا کچھ مشکل نہیں تھا۔

صورتحال کچھ بھی رہی ہو کانگریس کے بعد سب سے زیادہ سترہ سیٹیں حاصل کرنے والی پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی کے سربراہ مفتی سعید اور ان کی صاحبزادی محبوبہ مفتی نے جو اچانک کشمیری سیاست میں نمایاں ہوئے ہیں۔کانگریس کے ساتھ 16 دن تک مذاکرات کیے۔ان مذاکرات میں کانگریس کی نمائندگی سابقہ وزیر خزانہ من موہن سنگھ، غلام نبی آزاد اور سونیا گاندھی نے کی اور انہیں طوعاً کرہاً مفتی سعید کو بطور وزیر اعلیٰ قبول کرنے پر اتفاق کرنا پڑا کیونکہ بصورت دیگر کانگریس کے لیے اپنی خود مختار حیثیت میں کوئی بھی سرکار بنانا ممکن نہیں تھا۔نیشنل کانفرنس نے نتائج کے فوراً بعد اپوزیشن میں بیٹھنے کا اعلان کر دیا تھا اور دوسری علاقائی پارٹیوں یا آزاد امیدواروں کے ووٹ مل کر بھی کانگریس کو حکومت سازی کا موقع نہیں دلاتے تھے۔مفتی سعید کو کانگریس نے پہلے تین سال کے لیے بطور وزیر اعلیٰ قبول کیا ہے اس کے بعد پھر وزارت اعلیٰ کانگریس کو مل جائے گی بشرطیکہ یہ حکومت تین سال تک چلی۔

مفتی سعید جو اس سے پہلے بھارت کے وزیر داخلہ بھی رہ چکے ہیں گذشتہ پچاس سال سے کارزار سیاست میں ہیں بالآخر اپنی مرضی کا منصب حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ان کی موجودہ کامیابی کا سہرا ان کی صاحبزادی محبوبہ مفتی کے سر جاتا ہے جنہوں نے مفتی سعید کو اپنے نازک کندھوں پر بٹھا کر ایوان اقتدار کے اس منصب تک پہنچایا ہے۔محبوبہ مفتی جو ماضی میں حریت پسندوں کے ہاتھوں اغوا بھی ہو چکی ہیں اور دو جان لیوا حملوں سے محفوظ رہی ہیں مقبوضہ کشمیر کی واحد ایسی سیاستدان

Marfat.com

ہیں جنہوں نے اپنی ''راج نیتی'' کے بل پر مقبوضہ کشمیر کے حریت پسند حلقوں میں بھی اپنے لیے سافٹ کارنر پیدا کر لیا ہے۔

محبوبہ مفتی نے اپنے والد کی سیاست کا دھارا بڑی کامیابی سے قومی کے بجائے مقامی سیاست کی طرف موڑا کیونکہ انہوں نے بڑی محنت کے بعد کشمیری عوام کے دلوں میں نیشنل کانفرنس کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا کیے اور مقامی سیاست سے شیخ عبداللہ فیملی کے آؤٹ ہونے کے بعد جو خالی فضا پیدا ہوئی اس ے خود پر کر دیا۔ محبوبہ مفتی نے اس بات کا بخوبی اندازہ لگا لیا تھا کہ نیشنل کانفرنس کا مقامی سیاست پر اب تک قابض رہنے کا واحد راز ''نام نہاد کشمیری'' ہے۔ اس نے بھی یہی نسخہ آزمایا اور اپنے خاتون ہونے کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے اس میں کامیاب بھی رہیں۔

1999ء میں پارلیمانی الیکشن سے پہلے ہی محبوبہ مفتی نے جو بڑی تیزی سے ''کشمیریت'' کی نمائندہ شخصیت ہونے کا اعزاز حاصل کر چکی تھیں پیپلز ڈیموکریٹک فرنٹ پی ڈی پی کے نام سے الگ پارٹی قائم کی اور نیشنل کانفرنس کے عمر عبداللہ کے خلاف الیکشن میں حصہ لیا۔ اس الیکشن میں گو کہ وہ کامیاب نہیں ہو سکیں لیکن انہوں نے بڑی کامیابی سے سری نگر کے کشمیر نواز سیاسی حلقوں کو اپنا گرویدہ کر لیا اور مفتی سعید فیملی کی سیاست جو جنوبی کشمیر کے ضلع اسلام آباد کے قصبہ بیجاڑہ تک محدود تھی اب سرینگر تک پھیل چکی تھی۔

محبوبہ مفتی نے ایک نئے انداز سے سیاست شروع کی وہ سیاستدان سے زیادہ ایک درد دل رکھنے والی سوشل ورکر کا مقام حاصل کرنے لگیں جہاں کہیں بھارتی فوج کسی کشمیری کو شہید کرتی، کسی کا گھر جلاتی، کسی کا بچہ اغوا ہوتا یا پھر کسی کشمیری خاتون کو اغوا کیا جاتا جو یہاں کا معمول ہے محبوبہ مفتی تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر کشمیریوں کو اشک شوئی کے لیے وہاں پہنچ جاتی۔ انہوں نے بھارتی ایجنٹوں کی طرف سے اغوا کر کے ٹارچر سیلوں تک پہنچ جانے والے کشمیریوں کی رہائی کے لیے اہم کردار ادا کیا اور خلاف توقع کشمیریوں میں ایک مسیحا خاتون کی حیثیت حاصل کر لی۔ صورتحال یہ ہوئی تھی کہ کشمیری خور پر ہونے والے مظالم کے خلاف سرکار دربار میں فریاد کرنے کے بجائے محبوبہ مفتی کے گھر درخواستیں لے کر پہنچا کرتے تھے اور محبوبہ مفتی بلا تخصیص ہر کسی کی مدد کے لیے ہر وقت تیار رہتی۔

اسی اثناء میں محبوبہ مفتی نے بڑی کامیابی سے کشمیری حریت پسند قیادت سے بھی تعلقات استوار کیے خصوصاً حریت کانفرنس سے انہوں نے اپنا رابطہ بڑھایا اور بظاہر یہ دکھائی دینے لگا کہ وہ سوائے ''پاکستان زندہ باد'' کے حریت پسندوں کے ساتھ مل کر باقی تمام نعروں میں ان کا ساتھ دے رہی تھیں۔

باخبر حلقوں کا دعویٰ ہے کہ یہ سب بھارت کی گہری چال ہے۔ دراصل بھارتی ایجنٹوں نے بڑی کامیابی سے فاروق عبداللہ جنہوں نے اب پر پرزے نکالنے شروع کر دیئے تھے اور اپنے والد کے ساتھ ہونے والے بھارتی حکومت کے ماضی کے معاہدوں کا حوالہ دے کر ان پر عمل کرنے کا تقاضا کرتے تھے ان کو بھارتی ایجنٹوں نے بڑی ہوشیاری سے کشمیری عوام میں ان کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کیا حیرت کی بات یہ تھی کہ برسر اقتدار رہتے ہوئے فاروق عبداللہ حکومت کے اعلیٰ عہدیدار وہ مراعات حاصل نہیں کر پائے جو محبوبہ مفتی کو حاصل تھیں جن میں خصوصاً اغوا ہونے والوں اور طویل عرصے بھارتی ٹارچر سیلوں میں گرفتار کشمیری نوجوانوں کی رہائی بھی شامل ہے۔

کشمیر میں حریت پسندوں کی تمام کارروائیاں اور ان کے خلاف حکومتی اقدامات کو دلی سرکار نے بڑی سختی سے خود

Marfat.com

تک محدود رکھا تھا اور نیشنل کانفرنس کو ان میں مداخلت کی اجازت نہیں تھی جبکہ محبوبہ مفتی کو یہ خصوصی رعایت حاصل تھی اور اسی ''رعایت'' کے بل بوتے پر اس نے کشمیریوں میں مسیحا کا اعزاز حاصل کر لیا۔ جس ہوشیاری سے بھارتی ایجنسیوں نے انہیں سیاست میں یہ مقام دلایا ہے اور جس طرح اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر محبوبہ مفتی نے خصوصاً حریت کانفرنس اور جہادی لیڈر شپ میں مقبولیت حاصل کی ہے اس سے بظاہر تو یہی دکھائی دے رہا ہے کہ مستقبل میں وہ فاروق عبداللہ سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتی ہیں اور خصوصاً حریت کانفرنس سے ان کے بڑھتے ہوئے تعلقات محل نظر ہیں۔ جہاں تک مفتی سعید کا تعلق ہے وہ خود بھی کشمیر کی مقامی سیاست میں ایسا مقام نہیں بنا سکے۔ انہوں نے گذشتہ پچاس سال میں اتنی سیاسی پارٹیاں تبدیل کی ہیں کہ اب مفتی سعید کو بھی ان کے نام یاد نہیں رہے ہوں گے۔ 1989ء میں جب وہ وی پی سنگھ کی پارٹی ''جن مورچہ'' کی طرف سے اتر پردیش کے حلقہ مظفر نگر سے پارلیمانی انتخابات لڑ رہے تھے تو ان کے حمایتی ان کے لیے ''مفتی سعید ہندوستانی، باقی سب پاکستانی'' کا نعرہ لگایا کرتے تھے اور اس نعرے کے بل پر انہوں نے مظفر نگر سے کامیابی بھی حاصل کی تھی بعد میں جنتا دل سرکار نے انہیں وزارت داخلہ کے منصب سے نوازا۔ جہاں تک اسلام آباد کے قصبہ بجباڑہ کا تعلق ہے تو یہاں سے مفتی سعید کا مقابلہ نیشنل کانفرنس کے ایک عام سے سیاستدان عبدالغنی ویری سے ہوتا تھا جس کے ہاتھوں انہیں متعدد مرتبہ شکست ہوئی۔

مفتی سعید کا آبائی قصبہ ''بجباڑہ'' بھارت نواز شہرت رکھتا تھا لیکن 1993ء میں جب بھارتی افواج نے درگاہ حضرت بل کا محاصرہ کیا تو اس قصبے کے لوگوں نے بھارتی فوج کے خلاف بھرپور جدوجہد کر کے عظیم تاریخ رقم کی تھی اس قصبے سے پچاس افراد نے بھارتی فوج کی گولیوں سے شہادت حاصل کی جس کے بعد سے ان کی شناخت ہی تبدیل ہو گئی۔

حریت پسند کشمیری لیڈر بشیر احمد شاہ نے مفتی سعید کی بطور وزیر اعلیٰ تقرری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ مقبوضہ کشمیر کے وزیر اعلیٰ کی قسمت کا فیصلہ دلی میں ہوتا ہے اور اس مرتبہ دلی والوں نے بڑا جوا کھیلا ہے جس کا اندازہ وہ خود بھی نہیں کر پائے۔ بھارتی حکومت نے بظاہر ان انتخابات کے دوران مقبوضہ کشمیر اور کنٹرول لائن پر لاکھوں کی تعداد میں افواج جمع کر کے خوف و دہشت کی جو فضا پیدا کی تھی اور جس طرح 11 ستمبر کے واقعہ کے بعد بھارت کو جہاد کشمیر کو دہشت گردی کا روپ دلانے میں کسی حد تک کامیابی ملی اس کے بعد سے پاکستان پر امریکہ کے بے پناہ دباؤ سے بظاہر مقبوضہ کشمیر میں تحریک آزادی دم توڑتی دکھائی دے رہی تھی لیکن حیرت انگیز طور پر ابھی تک حریت پسندوں کی برتری برقرار ہے جس سے ایک بات تو صاف ظاہر ہے کہ یہ تحریک خالصتاً مقامی ہے۔ اگر پاکستان کی پیدا کردہ ہوتی تو اب تک ختم ہو جاتی۔

مفتی سعید جب دو نومبر کو وزارت اعلیٰ کا حلف اٹھانے کے لیے سری نگر کی مشہور جھیل ڈل کے کنارے بنے انٹرنیشنل کنونشن سنٹر جا رہے تھے تو نوگام میں ان کے گھر پر مجاہدین نے دستی بموں سے حملہ کر دیا جس میں وہ اور ان کی صاحبزادی محبوبہ مفتی بال بال بچ گئیں اس حملے میں ان کا ایک گارڈ زخمی ہو گیا اسی روز سری نگر میں کانگریسی رہنما سکندر خان کو ان کے تین محافظوں سمیت مجاہدین نے مار ڈالا جبکہ بھارتی فوج نے مختلف مقابلوں میں بارہ مجاہدین کی شہادت کا دعویٰ کیا۔

مقبوضہ کشمیر کی دھماکہ خیز فضا میں مفتی سعید نے اپنی نو رکن مخلوط کابینہ کے ساتھ کٹھ پتلی وزیر اعلیٰ کا منصب تو سنبھال لیا ہے انہیں ''را'' کے سابقہ ڈائریکٹر جنرل اور موجودہ گورنر مقبوضہ کشمیر گریش چندر سکسینہ کی مکمل معاونت بھی حاصل

Marfat.com

ہوگئی ہے۔ مفتی سعید زگرفتاریوں کا خاتمہ، گرفتاروں کی رہائی، بھارتی افواج کے کنٹرول کا خاتمہ اور کشمیریوں کو لگائے زخموں کا مداوا کرنے کا ایجنڈا اور عزم لے کر میدان میں اترے ہیں انہیں محبوبہ مفتی کی صورت میں کشمیری عوام میں مقبولیت حاصل کرنے والی بیٹی کا ساتھ بھی میسر ہے عین ممکن ہے اگلے چند دنوں میں کشمیر کے حالات میں ڈرامائی تبدیلیاں بھی دیکھنے کو ملیں جن میں فوجوں کی تعداد میں کمی، قیدیوں کی رہائی اور حریت کانفرنس سے مفتی سعید کے مذاکرات بھی شامل ہو سکتے ہیں۔ اس صورتحال سے کشمیر کی حقیقی قیادت کیسے عہدہ برآ ہوگی یہ ایسا سوال ہے جس کا جواب شاید ابھی حریت پسند قیادت کے پاس بھی نہیں ہے۔ (روزنامہ جنگ سنڈے ایڈیشن 17 نومبر 2002ء مصنف: طارق اسمٰعیل ساگر)

☆ دسمبر 2002ء تک صورتحال یہ تھی کہ بھارت کو پاکستان نے اخلاقی طور پر چاروں شانے چت کر دیا تھا۔

جنوری 2003ء میں اسلام آباد میں مجوزہ 12 ویں سارک سربراہ کانفرنس جس کے لیے 11 تا 13 جنوری کی تاریخیں طے پا چکی تھیں بھارت کی ہٹ دھرمی بلیک میلنگ اور بزعم خویش خود کو اس خطے کا تھانیدار تسلیم کروانے کی ہوس کی بھینٹ چڑھ گئی۔ حکومت پاکستان کے اعلامیہ کے مطابق بھارت اور بھوٹان کی طرف سے ابھی تک شرکت کی تصدیق نہ ہونے کی وجہ سے بادل نخواستہ سارک سربراہ کانفرنس کو ملتوی کرنا پڑا۔ نئی تاریخ کا اعلان ممبران کی مشاورت سے ہوگا۔ وزارت خارجہ کے ایڈیشنل سیکرٹری برائے ایشیاء بحرالکاہل ریجن نے پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے بتایا کہ سربراہ کانفرنس کے انعقاد کے لیے پہلے اپریل 2003ء کی تاریخ طے پائی تھی لیکن سارک کانفرنس کی وزارتی کونسل کے اجلاس میں بھارتی وفد نے یہ موقف اختیار کیا کہ بھارتی وزیراعظم واجپائی بھارت میں قومی بجٹ کے سلسلے میں مصروفیت کی وجہ سے ان دنوں پاکستان نہیں آسکیں گے جس پر بھارتی وفد کی معاونت سے بھارتی وزیراعظم کی سہولت کے پیش نظر جنوری کی 11 تا 13 تاریخیں طے پائیں۔ تمام رکن ممالک اور سارک کے سیکرٹری جنرل کو سفارتی ذرائع سے اگست 2002ء میں ان تاریخوں سے مطلع کر دیا گیا تھا اور بتایا گیا تھا کہ 9 تا 10 جنوری کو وزارت کونسل کے اجلاس ہوں گے۔ جبکہ اس سے پہلے پانچ چھ جنوری کو پروگرامنگ کمیٹی اور 7 تا 8 جنوری کو سارک سٹینڈنگ کمیٹی کے اجلاس طے پائے تھے۔

پاکستانی وزارت خارجہ کے ترجمان کے مطابق 16 ستمبر 2002ء کو نیویارک میں ہونے والے غیر رسمی اجلاس میں سارک وزرائے خارجہ نے ان تاریخوں پر اتفاق کر لیا تھا اور پاکستان کو جلد ہی ان کی باقاعدہ تصدیق کے متعلق بھی بتایا گیا تھا۔ سارک سیکرٹریٹ کے ذریعے بنگلہ دیش، نیپال اور مالدیپ نے ان تاریخوں کی تصدیق کر دی لیکن بارہ ہفتے گزرنے کے باوجود بھارت اور بھوٹان کی طرف سے ابھی تک شمولیت کی اطلاع نہیں آئی جبکہ سارک سیکرٹریٹ کے ذریعے حکومت پاکستان نے انہیں یاددہانی بھی کروائی ہے اس کے باوجود دونوں ممالک کی طرف سے شرکت کی تصدیق نہ ہونے کی وجہ سے مجبوراً کانفرنس ملتوی کی جا رہی ہے۔ سارک تنظیم کے طے شدہ ضابطے کے مطابق کسی بھی ایک رکن ملک کی طرف سے سربراہی کانفرنس میں شرکت نہ کرنے کے باعث سربراہ کانفرنس کا التوا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

بھارت کی طرف سے سارک کانفرنس میں رکاوٹ ڈالنے کی یہ کوئی پہلی مثال نہیں دراصل بھارت سے خلاف توقع اس کے ہمسایہ ممالک نے اس کی چودھراہٹ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے اور پاکستان کی تقلید کرتے ہوئے بنگلہ دیش، سری لنکا اور نیپال نے بھی بھارت کے ناجائز مطالبات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جس کے بعد بھارت کا رویہ

Marfat.com

خاصا جارحانہ ہو گیا بھارت جانتا ہے کہ خصوصاً کشمیر پر پاکستان کے اصولی موقف کو اس خطے میں نہیں بلکہ دنیا بھر کے تمام مہذب ممالک تسلیم کرتے ہیں جبکہ بھارت کی یہ خواہش تھی کہ پاکستان دنیا کے کسی فورم پر بھی کشمیر کا ذکر نہ کرے کیونکہ بھارت کو اس مسئلے پر سبکی کا سامنا ہوتا ہے۔

چھٹی سارک سربراہی کانفرنس منعقدہ 1991ء سری لنکا میں بھی بھارت نے اسی طرح سری لنکا سے اپنے تنازعات اور جارحانہ رویے کو تبدیل کرنے کے بجائے عدم تعاون کا مظاہرہ کیا بروقت شرکت کی تصدیق نہ کی جس پر کانفرنس کا انعقاد ایک ماہ بعد ہوا تھا۔ 1999ء میں نیپال میں سارک سربراہ کانفرنس کا انعقاد پھر بھارت کی ضد کی وجہ سے کھٹائی میں پڑ گیا اور یہ کانفرنس بعد 2002ء جنوری میں منعقد ہوئی۔ اس موقع پر جنرل پرویز مشرف نے بھارت کی تمام تر زیادتیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے بھارتی وزیر اعظم مسٹر واجپائی سے اپنی دانست میں گرمجوشی سے مصافحہ کر کے برف پگھلانے کی ناکام کوشش بھی کی تھی لیکن کشمیر پر پاکستان کے اصولی موقف کی تکرار نے بھارت کی جن سنگھ حکومت کے سربراہ کو سفارتی آداب کا احترام کرنے سے بھی مانع رکھا۔

سارک ممبران ممالک میں سب سے بڑا ملک ہونے کے حوالے سے بھارتی حکومت عجیب وغریب کمپلیکس کا شکار ہے۔ بھارت کی ضد تھی کہ علاقے کے تمام ممالک اس کی بالادستی بالکل اس طرح تسلیم کر لیں جیسے امریکہ کی بالادستی دنیا نے تسلیم کر رکھی ہے اور ان تمام متنازعہ مسائل اور معاملات سے دستبردار ہو جائیں جو کئی عشروں سے اس کے ہمسایہ ممالک کے ساتھ چلے آ رہے ہیں۔

پاکستان ہی نہیں بھارت اپنے دیگر تمام ہمسایہ ممالک کے ساتھ کسی نہ کسی مسئلے پر الجھا ہوا ہے۔ سری لنکا، مالدیپ، بھوٹان، نیپال، بنگلہ دیش ہر ہمسایہ ملک کے ساتھ بھارت کو کوئی نہ کوئی مسئلہ درپیش ہے۔ بھارتی مسلح افواج کی طرف سے بنگلہ دیش اور نیپال کے سرحدی علاقوں میں گھس کر غیر قانونی کارروائیاں کرنا معمول سا بن کر رہ گیا ہے۔ بنگلہ دیش اور بھارت کے سرحدی محافظوں کے درمیان فائرنگ کے واقعات نے صورتحال کو حاصا بگاڑ دیا تھا جبکہ بنگلہ دیش کے سرحدی محافظوں کی جوابی فائرنگ سے بھارتی بارڈر سکیورٹی فورسز کے آٹھ جوان مارے بھی گئے بنگلہ دیش سے حسینہ واجد سرکار کی رخصتی کے بعد بھارت کی جارحانہ کارروائیوں میں کئی گناہ اضافہ ہو گیا جس کا اظہار بیگم خالدہ ضیاء کی طرف سے متعدد مرتبہ کیا جا چکا ہے۔ بنگلہ دیش میں ہونے والے بم دھماکوں کے لیے بھی ''را'' کو ذمہ دار ٹھہرایا جا رہا ہے۔

سارک کے قیام کا مقصد جنوبی ایشیا کے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے رکن ممالک کے درمیان دوستی اور مختلف معاملات پر تعاون کو فروغ دینا تھا لیکن ان مقاصد کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بھارت ہے جو اس خطے کے چھوٹے اور کمزور ممالک پر سیاسی اور اقتصادی بالادستی قائم کرنے کے جنون میں مبتلا ہے۔ بھارت کے ان عزائم کے راستے کی سب سے بڑی دیوار پاکستان ہے جس نے آج تک بھارتی بالادستی کو بدترین حالات میں بھی قبول نہیں کیا جبکہ بھارت سارک کو صرف اپنے سیاسی اور اقتصادی مفادات کے لیے استعمال کرنے کے درپے ہے۔

بھارت کا المیہ یہ ہے کہ 11 ستمبر کے حادثے کے بعد بھارتی حکومت کی دانست میں اسے پاکستان اور مسئلہ کشمیر سے چھٹکارے کا تاریخی موقع ملا تھا کیونکہ افغانستان پر امریکی حملے تک پاکستان کے خلاف بھارت کا جھوٹا پراپیگنڈہ

Marfat.com

نقطہ عروج کو چھو رہا تھا۔ بھارت کی ہر ممکن کوشش یہی ہے کہ اس سے پیدا ہونے والی مسلم دشمنی کی نفسیاتی فضا کا پاکستان کے خلاف بھرپور استعمال کرے جبکہ خلاف توقع پاکستانی حکومت کے کردار نے بھارت کو برکھلاہٹ میں مبتلا کر دیا اس نے اپنے ہی ملک میں پارلیمنٹ پر حملے کا ڈرامہ رچایا، مندروں پر حملے کروائے اپنے بے گناہ عوام کے خون میں ہاتھ رنگے لیکن کچھ ہاتھ نہ آیا۔ گذشتہ دو سالوں میں امریکہ کے کسی بھی قابل ذکر وفد کی بھارت آمد پر بھارتی حکومت کی طرف سے کسی نہ کسی حملے کا ڈرامہ رچانا معمول بن چکا تھا۔ چٹی سنگھ پورہ سے جموں کے رگھوناتھ مندر تک ''دہشت گردوں کے حملوں'' کو اب ساری دنیا اچھی طرح سمجھنے لگی تھی اور بھارت کو اس سلسلے میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔

بھارت کی طرف سے 11 ستمبر کے بعد اچانک پاکستان کی طرف سے دہشت گردوں کے حملے، القاعدہ کو ان حملوں میں ملوث کرنے کے لیے جھوٹے بیانات اور مصنوعی شواہد کا سلسلہ زور وشور سے جاری رہا لیکن حیرت انگیز طور پر بھارت امریکہ کو اپنے موقف کا قائل نہیں کر سکا اس کی وجہ بھارت کے نزدیک امریکہ کی پاکستانی اڈوں کی ضرورت تھی کیونکہ افغانستان پر امریکی حملہ پاکستان کی حمایت کے بغیر ہرگز ممکن نہیں تھا جبکہ حقیقت یہ تھی کہ جنرل مشرف نے خلوص دل سے پاکستانی سرزمین کو بھارت کے خلاف کسی بھی ممکنہ کارروائی کے لیے ممنوع بنا دیا تھا جس کا ثبوت امریکہ کو مل چکا تھا اور ساری دنیا یہ بھی جاننے لگی تھی کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاکستان نے مغرب کی توقعات سے بڑھ کر اس کی مدد کی ہے پاکستان میں ایف بی آئی اور سی آئی اے کی موجودگی اس کا بڑا ثبوت تھا۔

بھارت کو اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ امریکہ جو خود تمام معاملات پر نظر رکھے ہوئے ہے اس بات سے بخوبی آگاہ ہے پاکستان کی طرف سے مداخلت نہیں ہو رہی۔ امریکہ کی طرف سے جب بھی بھارت کو پاکستان کے ساتھ گفتگو پر راضی کرنے کی کوشش کی گئی بھارت کی طرف سے ''سرحدی مداخلت'' کا بے بنیاد الزام لگا کر اس سے انکار کر دیا تھا حالانکہ امریکہ نے خود سرحدی مداخلت روکنے کی ضمانت بھی دی لیکن بھارت کی ہٹ دھرمی برقرار رہی۔

دراصل بھارت یہ نہیں چاہتا تھا کہ امریکہ اس کے اور پاکستان کے معاملات طے کروائے یا وہ مسئلہ کشمیر کو حل کر کے پچاس سال سے اس خطے کے کروڑوں انسانوں کو خوشحال زندگی گزارنے کا موقع دینے کے حق میں تھا کیونکہ جہاں تک مسئلہ کشمیر کی وجہ سے اس خطے میں پیدا ہونے والی نزاعی صورتحال کا تعلق ہو تو بھارت جب چاہے اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عمل کر کے اس مسئلے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر سکتا تھا۔ پاکستان کو معاہدہ شملہ اور معاہدہ لاہور کے تحت بھی مذاکرات کے لیے ہر وقت تیار تھا لیکن بھارت کا مدعا اور منشا کچھ اور تھا وہ یہ چاہتا تھا کہ امریکہ پاکستان اور بھارت میں افہام وتفہیم کروانے کے بجائے ایسے حالات پیدا کرے کہ پاکستان بھارتی بالادستی کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائے اور بھارتی شرائط پر پاکستان کے ساتھ معاملات طے پا جائیں۔

عین ممکن ہے امریکہ نے ایسا چاہا بھی ہو کہ وہ بھارتی خواہشات کا احترام کرے لیکن پاکستان کے اصولی موقف خصوصاً 11 ستمبر کے حادثے کے بعد پاکستان کی پالیسیوں میں انقلابی تبدیلی کے بعد سے امریکہ کے لیے بھارتی خواہشات کا احترام ممکن نہیں رہا بھارت کی طرف سے امریکہ پر اس سلسلے میں مسلسل دباؤ ڈالا گیا جس کی حیثیت کھیلنے کے لیے چاند مانگنے سے زیادہ نہیں تھی۔

Marfat.com

بھارت کے لیے دوبارہ امید تب پیدا ہوئی جب امریکہ نے افغانستان میں اپنا کام مکمل کر لیا طالبان حکومت ختم ہو گئی۔ القاعدہ کا صفایا ہو گیا اور امریکی فوجوں نے افغانستان میں مستقل ڈیرے جما لیے۔ بھارت کو امید تھی کہ اب امریکہ کو پاکستانی اڈوں اور افواج کی ضرورت نہیں رہی وہ دوبارہ زور شور سے اپنے ایجنڈے کی تکمیل ے لیے سرگرم ہو گیا ایک مرتبہ پھر وہی ڈرامہ دہرایا جانے لگا۔ مقبوضہ کشمیر میں ہندو مندروں پر حملے شروع ہو گئے لیکن اس دوران بھارت کو اس مرحلے پر جھٹکا لگا جب اس کی مسلمانوں کے خلاف متعصبانہ پالیسیوں کا فائدہ اٹھا کر بھارتی جن سنگھ پریوار نے گجرات کے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنی شروع کر دی گجرات میں بے گناہ مسلمانوں کے ہندو بلوائیوں کے ہاتھوں قتل عام نے بھارت کا امیج بیرونی دنیا میں خاصا متاثر کیا کیونکہ اس سے پہلے گجرات ہی میں عیسائیوں کے خون س ے بھی ہندو انتہا پسند ہولی کھیل چکے تھے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ بھارت نے ان واقعات پر شرمندہ ہونے کے بجائے پاکستان کے خلاف الزامات کا جھوٹا سلسلہ جاری رکھا اور بین الاقوامی پریس کی طرف سے بھارتی نہاد سیکولرازم کی دھجیاں اڑانے کو خاطر میں لائے بغیر تمام واقعات میں پاکستان کو ملوث کرتا رہا۔ اس دوران بھارت کے ایک مندر پر ''حملے'' کا ڈرامہ بھی رچایا گیا لیکن کوئی ثبوت نہ مل سکا۔ اس طرح جہاز کے اغوا کا ڈرامہ بھی نامکمل اور ناقص منصوبہ بندی کی بھینٹ چڑھ کر بھارت کی رسوائی کا باعث بن گیا۔ بھارت کی ان مضحکہ خیز حرکات کا بین الاقوامی پریس کی طرف سے مسلسل نوٹس لیا گیا بھارت پر تنقید بھی کی گئی لیکن بھارتی حکومت نے ڈھٹائی سے اپنا کام جاری رکھا۔

پاکستانی صدر کے آگرہ مذاکرات میں کشمیر پر مضبوط موقف نے بھارتی حکومت کو غصے میں مبتلا کر دیا۔ بھارت کی طرف سے پہلا اعلان بھارتی وزیراعظم کے دورہ پاکستان کی منسوخی کا تھا اس کے بعد نیپال کی سارک کانفرنس میں صدر مشرف کی فراخدلی کے باوجود بھارت کا متعصب رویہ جاری رہا۔ بھارت نے الزامات لگاتے ہوئے اپنے ہائی کمشنر کو واپس بلا لیا، ریل اور ہوائی سروس بند کر دی جبکہ پاکستان نے کسی مرحلے پر اشتعال کا مظاہرہ کرنے کی بجائے بڑے تحمل اور بردباری سے بھارت کے ان اوچھے ہتھکنڈوں کا مقابلہ کیا۔

پاکستان کی طرف سے بھارت کو مسلسل مذاکرات کے ذریعے مسائل حل کرنے کی دعوت دی جاتی رہی نئے وزیر خارجہ خورشید محمود قصوری نے اپنا منصب سنبھالنے کے فوراً بعد پہلا بیان یہی دیا کہ پاکستان بھارت سے اپنے تعلقات معمول پر لانا چاہتا ہے اور اسے پھر مذاکرات کی پرخلوص دعوت دی۔ صدر مشرف کی طرف سے یہاں تک کہا گیا کہ وہ دنیا کے کسی بھی فورم میں بھارت کے ساتھ مذاکرات کے ذریعے اپنے مسائل حل کرنے کے لیے تیار ہیں جبکہ بھارت کی ہٹ دھرمی جاری رہی۔

بھارت نے عالمی دباؤ کے تحت خود ہی ہائی کمشنر کو واپس بھیجا، فضائی راستے کھولنے کا اعلان بھی کیا لیکن پاکستان نے بھارت کی اس سازش کو کامیاب نہیں ہونے دیا اور کہا کہ بھارت سے زمینی راستے بحال کرے اس کے بعد ہی اگلی بات ہوگی۔ اس ے بعد بھارت کی طرف سے گڈز ٹرین چلانے کا مطالبہ ہونے لگا جبکہ پاکستان کا اصولی موقف یہ تھا کہ بھارت پہلے سمجھوتہ ایکسپریس چلائے جو اس نے خود ہی بند کی تھی۔ پاکستان میں سول حکومت قائم ہونے کے بعد سے بھارت کا یہ جواز بھی ختم ہو گیا کہ وہ فوجی حکومت سے بات نہیں کرنا چاہتا لیکن اس کے باوجود بھارت کی ہٹ دھرمی جاری تھی۔

Marfat.com

بھارت کی جھنجھلاہٹ

2003ء کے آغاز پر بھارت نے پاکستان ہائی کمیشن کے چار سفارت کاروں کو ناپسندیدہ شخصیت قرار دے کر ملک چھوڑنے کا حکم دے دیا اور سرحد پار دہشت گردی کا واویلا مچایا' جس سے دونوں ملکوں میں سفارتی تعلقات میں تعطل پیدا ہوا۔ بھارتی وزیر خارجہ یشونت سنہا نے عراق پر امریکی حملے کو جواز بناتے ہوئے پاکستان کو حملے کیلئے فٹ کیس قرار دیتے ہوئے دھمکی دی کہ سرحد پار دہشت گردی کے خلاف سب کچھ کر گزریں گے' جس پر امریکہ نے بھارت کو خبردار کیا کہ وہ عراق پر امریکی حملے کو مثال یا جواز بنا کر پاکستان کے خلاف کسی حملے میں پہل کرنے سے باز رہے اور عراق کا کشمیر کی صورت حال سے موازنہ نہ کرے اور ان میں مماثلت پیدا کرنے کی کوشش یا طالع آزمائی نہ کرے۔ پاکستان نے ہر بڑے بین الاقوامی فورم اور عالمی سربراہوں سے ملاقاتوں میں مسئلہ کشمیر بڑے مدبرانہ انداز میں اٹھایا اور دونوں ملکوں کے درمیان مذاکرات کی ضرورت پر زور دیا۔ صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف نے امریکی صدر جارج ڈبلیو بش' روسی صدر ولادی میر پوٹن' برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیئر' فرانس کے صدر شیراک' جرمنی کے چانسلر شروڈر اور دیگر عالمی رہنماؤں کو یہ باور کرایا کہ تنازعہ کشمیر پاک بھارت تعلقات کی کشیدگی کا اصل سبب ہے اور یہ تنازعہ کشمیریوں کی امنگوں اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق حل ہونا چاہئے۔ 114 ممالک پر مشتمل غیر جانب دار ممالک کے سربراہی اجلاس میں بھی صدر پاکستان نے غیر وابستہ تحریک کو یاد دلایا کہ اسے ایسے لوگوں کیلئے امید کی کرن ہونا چاہئے' جو اپنے پیدائشی حق خودارادیت کے حصول کیلئے جدوجہد میں مصروف ہیں' ان میں کشمیر اور فلسطین کے کچلے ہوئے لوگوں کو مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ دہشت گردی کے خلاف لڑائی کو ایسے لوگوں کی جدوجہد آزادی سے منسلک نہیں کرنا چاہئے جن پر دوسرے ممالک نے زبردستی قبضہ کر رکھا ہے۔ صدر پرویز مشرف کے مسئلہ کشمیر اٹھانے پر بھارتی وزیراعظم واجپائی بہت تلملائے۔ پاکستان کا کامیاب خارجہ پالیسی کے باعث بھارت پر مذاکرات کیلئے عالمی دباؤ بڑھا تو اس دباؤ کو کم کرنے کیلئے بھارتی حکمرانوں کے رویے میں اچانک تبدیلی آئی اور بھارتی وزیراعظم واجپائی نے مقبوضہ کشمیر کے دورے کے دوران پاکستان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے کی پیشکش کی اور لوک سبھا میں خطاب کرتے ہوئے پاکستان سے مکمل سفارتی اور فضائی رابطوں کی بحالی کے فیصلوں کا اعلان اور مذاکرات کیلئے آمادگی کا اظہار کیا۔ پاکستان نے اس پیشکش کا خیر مقدم کیا اور بھارت کے ساتھ تعلقات معمول پر لانے کیلئے تنازعہ کشمیر سمیت تمام تصفیہ طلب امور پر مذاکرات کرنے اور کنٹرول لائن پر غیر جانبدار مبصر تعینات کرنے کی پیشکش کا اعادہ کیا۔ پاکستان کے وزیراعظم میر ظفر اللہ جمالی نے بھارتی وزیراعظم واجپائی سے ٹیلی فون پر بات چیت کرتے ہوئے ان سے خطے کو درپیش مسائل پر تبادلہ خیال کیا اور توقع ظاہر کی کہ کشمیر سمیت تمام متنازعہ امور پر بات چیت ہوگی۔ انہوں نے

Marfat.com

بھارتی وزیراعظم پر یہ بھی واضح کیا کہ پاکستان بھارت کے ساتھ کسی بھی سطح پر مذاکرات کیلئے تیار ہے۔ انہوں نے بھارتی وزیراعظم کو یہ دعوت بھی دی کہ وہ اپنی سہولت کے مطابق پاکستان کا دورہ کریں اور وہ (جمالی) بھی جنوبی ایشیا میں امن و استحکام کے مفاد میں بھارت کا دورہ کرنے کو تیار ہیں۔

پاکستان نے 3 مئی کو قائم مقام بھارتی ہائی کمشنر پی سی راگھون کو دفتر خارجہ بلا کر وزیراعظم واجپائی کیلئے پاکستان کے دورے کی باضابطہ دعوت دی لیکن اس پر بھی بھارت نے یہ شرط عائد کردی کہ سرحد پار سے دہشت گردی کا ختم ہونا لازمی ہے۔ اس سے قبل بھارتی وزیر دفاع نے انتہائی غیر ذمہ دارانہ بیانات دیتے ہوئے دھمکی دی کہ ایٹمی جنگ میں پاکستان کا نام ونشان مٹادیں گے۔ پاکستان نے اس کے باوجود بھارت کے ساتھ غیر مشروط بات چیت اور بحالی اعتماد کیلئے کئی اقدامات کئے جن میں بھارتی مچھیروں کی رہائی اور سفری رابطے بحال کرنے کے اعلانات شامل تھے۔ پاکستان کے وزیر خارجہ خورشید محمود قصوری نے جنوبی ایشیا میں ہونے والی پیش رفت کے حوالے سے روس، چین، برطانیہ، فرانس اور جاپان کے وزرائے خارجہ سے ٹیلی فون پر بات چیت کی اور انہیں باور کرایا کہ پاکستان بھارت سے مسئلہ کشمیر سمیت تمام مسائل مذاکرات کے ذریعے حل کرنا چاہتا ہے اور وہ پاک بھارت مذاکرات کو آگے بڑھانے کیلئے تعاون کریں۔ ان روابط سے دونوں ملکوں کے درمیان ماحول کچھ سازگار رہا۔ دونوں ملکوں میں سفارتی رابطے بحال ہوئے اور دونوں ملکوں کے درمیان وفود کے تبادلوں کی شروعات بھی ہوئیں۔ پاکستان کے ممتاز مذہبی، سیاسی رہنما مولانا فضل الرحمٰن کو دورۂ بھارت کے دوران بڑی پذیرائی ملی۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان تعلقات قائم کرنے کیلئے سارک کے سرکردہ دانش وروں اور صحافیوں کی تنظیم سلما کے زیراہتمام اسلام آباد میں کانفرنس ہوئی جس میں پہلی بار بھارت کے ایک بڑے وفد نے شرکت کی۔ وفد میں شامل سیاست دانوں کا تعلق بی جے پی، کانگریس، راشٹریہ جنتا دل، سماج وادی پارٹی، سمتا پارٹی، تیلگو دیشم، کمیونسٹ پارٹی، بہوجن سماج پارٹی اور دیگر سیاسی جماعتوں سے تھا۔ ڈیڑھ سال کے تعطل کے بعد لاہور اور دہلی کے درمیان دوستی بس سروس شروع ہوگئی۔ پاکستان نے بس سروس کے آغاز کے بعد سمجھوتہ ایکسپریس اور فضائی رابطوں کی بحالی کا بھی عندیہ دیا، حالانکہ دونوں ملکوں کے درمیان بس اور سمجھوتہ ایکسپریس کی آمد ورفت بھارت نے ہی بند کی تھی اور فضائی حدود پر پابندی بھی لگوائی تھی۔ بھارتی حکمرانوں نے تعلقات کی بحالی کے حوالے سے صرف تجارتی مفاد کو اہمیت دی، حالانکہ تعلقات کی کشیدگی سے لے کر تین جنگوں کی بنیادی وجہ تنازعہ کشمیر ہے۔ پاک بھارت تعلقات کی فضا جب قدرے بہتر ہونے لگی تو بھارتی راہنما اپنی پرانی پالیسی پر عمل پیرا ہوگئے۔ بھارتی وزیر خارجہ یشونت سنہا نے دعویٰ کیا کہ ''پاکستان کے زیرانتظام کشمیر بھارت کا حصہ ہے اور ہم اس سے آگے نہیں سوچتے''۔

بیس ماہ سے معطل پاک بھارت فضائی رابطوں کی بحالی کیلئے راولپنڈی میں ہونے والے مذاکرات ناکام ہوگئے۔ یہ مذاکرات پاک بھارت تعلقات کی بحالی کیلئے گزشتہ چار ماہ سے جاری کوششوں میں بڑی اہمیت کے حامل تھے۔ اس موقع پر بھارت نے دراندازی کا الزام دہراتے ہوئے مطالبہ کیا کہ پاکستان 19 مطلوب مجرم بھارت کے حوالے کرے، حالانکہ پاکستان نے اس کی واضح طور پر تردید کی تھی۔ بھارت نے پاکستان کے وزیر خارجہ خورشید محمود قصوری کی دورۂ نئی دہلی کی پیشکش بھی مسترد کردی۔ بھارتی وزارت خارجہ کے ترجمان نے سارک کانفرنس کا دعوت نامہ ذاتی طور

Marfat.com

پر بھارتی وزیراعظم کو پہنچانے کیلئے پاکستان کے وزیر خارجہ کے دورۂ بھارت کو غیر ضروری قرار دیتے ہوئے پاکستان کی ایک مثبت اور جذبہ خیر سگالی پر مبنی پیشکش ٹھکرا کر سفارتی آداب کے وقار کو مجروح کیا اور اپنے روایتی الزام کا اعادہ کیا کہ پاکستان سرحد پار دہشت گردی روکنے کیلئے مزید اقدامات کرے گا تو مذاکرات کا عمل شروع ہو سکتا ہے۔ 25 ستمبر کو پاکستان کے صدر جنرل پرویز مشرف نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے 58 ویں اجلاس میں بھارت کو کنٹرول لائن پر مکمل جنگ بندی کی پیشکش کے ساتھ ایک بار پھر مذاکرات کی دعوت دی اور اس یقین کا اعادہ کیا کہ خیر سگالی کے جذبے کے ساتھ مسائل کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے لیکن اگلے ہی روز بھارتی وزیراعظم نے جنرل اسمبلی سے اپنے خطاب کے دوران صدر پاکستان کی طرف سے مذاکرات کی نئی پیشکش کو کھلے لفظوں میں مسترد کر دیا اور سرحد پار دہشت گردی کا وہی پرانا بہانہ دہرایا' جسے بھارت مذاکرات سے راہ فرار اختیار کرنے کیلئے پہلے بھی استعمال کرتا رہا تھا۔

بھارت نے پاکستان کے ساتھ تعلقات معمول پر لانے کیلئے 12 تجاویز پیش کیں' جن میں مسئلہ کشمیر کا ذکر تک نہیں تھا۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بھارت پاکستان کے ساتھ مسئلہ کشمیر پر مذاکرات کیلئے تیار نہیں۔ یہ تجاویز بھارتی وزیر خارجہ یشونت سنہا نے 22 اکتوبر کو بھارتی کابینہ کی سکیورٹی کونسل کے اجلاس کے بعد پیش کیں۔ ان میں فضائی سفر کیلئے مذاکرات' کراچی ممبئی فیری سروس' مظفر آباد سرینگر اور راجستھان سندھ میں بس سروس کا پہلی مرتبہ اجراء' کرکٹ سمیت دوسرے کھیلوں کے رابطوں کی بحالی' ایک دوسرے کے ماہی گیروں کی گرفتاریوں کو بند کرنا' دونوں ملکوں میں ویزا کیمپ قائم کرنا' سفارت کاروں کی تعداد بڑھانا وغیرہ شامل تھا۔ بھارت نے جن تجاویز کا اعلان کیا ان میں سے بعض پر پہلے بھی عمل ہوتا رہا تھا بلکہ 1965ء اور 1971ء کی جنگ کی عارضی پابندیوں کے بعد بھی تعلقات بحال ہونے پر عوام کو سفری سہولتیں حاصل رہیں۔ نائن الیون کے واقعہ کے بعد' جب امریکہ نے تصوراتی خطرے سے نمٹنے کیلئے حفظ ماتقدم کی ڈاکٹرائن جاری کی اور افغانستان میں اس پر عمل درآمد بھی شروع کر دیا تو اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے بھارت نے بھی اپنی پارلیمنٹ پر حملے کا ڈرامہ رچایا اور اس کی آڑ لیتے ہوئے پاکستان کے خلاف کارروائیاں شروع کر دیں۔ سفارتی رابطے محدود کر دیئے۔ ریل' بس اور ہوائی سروس کے رابطے معطل کر دیئے۔ کھیلوں کے علاوہ وہ سب سلسلے بھی بند کر دیئے' جن سے عوام کو براہ راست سہولتیں ملتی تھیں۔ بھارت نے دونوں ملکوں میں اعتماد کی بحالی کیلئے تازہ ترین تجاویز بھی امریکی دباؤ کے تحت پیش کیں اور ان میں بھی یہ ڈنڈی ماردی کہ مسئلہ کشمیر کو سرے سے فہرست میں نہ رکھا اور صدر جنرل پرویز مشرف اور وزیراعظم میر ظفر اللہ جمالی کے جذبہ خیر سگالی کو اہمیت نہ دی۔ پاکستان نے امن کی خاطر بھارت کی ان تجاویز میں سے بھی بعض کو قبول کر لیا لیکن تجویز پیش کی کہ مظفر آباد سری نگر کے درمیان بس سروس کو اقوام متحدہ کے نمائندے مانیٹر کریں۔ اس تجویز کا خیر مقدم کرنے کی بجائے بھارتی وزیر دفاع جارج فرنانڈس نے مضحکہ خیز دھمکی دی کہ تعلقات معمول پر لانے کیلئے پاکستان ان تجاویز پر بلا تاخیر بات چیت شروع کرے یا میدان جنگ میں فیصلہ کیلئے تیار ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اگر بھارت کے پیش نظر برصغیر میں قیام امن عزیز ہوتا تو بھارتی وزیر دفاع میدان جنگ میں آ کر فیصلہ کرنے کی بات نہ کرتے۔ بھارت کی ان چال بازیوں اور دھمکیوں کے باوجود مسئلہ کشمیر پر پاکستان کے مؤقف میں ذرا بھی تبدیلی نہیں آئی۔ پاکستان نے اسی کو فوقیت دی اور باور کرایا کہ دونوں ملکوں کے درمیان بنیادی تنازعہ مسئلہ کشمیر ہے' جسے کشمیریوں کی امنگوں اور اقوام

Marfat.com

متحدہ کی قراردادوں کے مطابق حل ہونا چاہئے' دونوں ملکوں کے درمیان خوشگوار تعلقات کی بحالی کیلئے آئندہ سال پاکستان میں ہونے والی سارک سربراہ کانفرنس سے بڑی توقعات وابستہ تھیں۔ پاکستان کے وزیر اطلاعات شیخ رشید نے سارک وزرائے اطلاعات کے اجلاس میں بھارتی وزیراعظم کو پاکستان کے صدر اور وزیراعظم کا نیک خواہشات کا پیغام پہنچایا اور سارک کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی۔ نومبر میں وزیراعظم میر ظفر اللہ جمالی اور صدر جنرل پرویز مشرف نے پاک بھارت تعلقات کی بحالی کیلئے یک طرفہ اقدامات کا اعلان کیا' جن کے حوصلہ افزاء نتائج سامنے آئے۔ وزیراعظم جمالی نے سیاچین سمیت کشمیر کی کنٹرول لائن پر سیز فائر کا یک طرفہ اعلان کیا' جس کا بھارت نے بھی مثبت جواب دیا اور چودہ سال کی طویل مدت کے بعد کنٹرول لائن پر آباد ہزاروں کشمیریوں نے امن کے ساتھ عید منائی۔

بھارتی وزیراعظم نے بھی پاکستان کے اس اقدام کی پذیرائی کرتے ہوئے اسلام آباد میں ہونے والی سارک کانفرنس میں شرکت اور وزیراعظم جمالی سے براہ راست ملاقات پر آمادگی کا اظہار کیا۔ صدر جنرل پرویز مشرف نے بھارت کے ساتھ فضائی رابطے بحال کرنے کا یک طرفہ اعلان کیا جس کے نتیجے میں یکم دسمبر کو پاک بھارت فضائی رابطے کی بحالی پر دونوں ملکوں کے درمیان اتفاق رائے ہوگیا اور دو سال کی بندش کے بعد یکم جنوری سے یہ پروازیں شروع ہوگئیں۔ ان اقدامات سے دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات کی بحالی نتیجہ خیز ہونے کی توقع تھی اور سارک کانفرنس میں بھارتی وزیراعظم واجپائی کی شرکت کے اشارے سے اس کا انعقاد یقینی ہوگیا۔ سارک کے رکن ممالک کے ساتھ بھی پاکستان کے تعلقات اچھے رہے۔ نیپال کے وزیراعظم موریا بہادر تھاپا نے پاکستان کا دورہ کیا اور اس توقع کا اظہار کیا کہ سارک کانفرنس رکن ممالک میں تعلقات کے فروغ میں اہم کردار ادا کرے گی۔

▪▪▪

مئی 2003ء کو بدلتے عالمی منظرنامے کے پس منظر میں ایک مضمون بعنوان ''پاک بھارت تعلقات اور عالمی منظرنامہ'' میں نے روزنامہ جنگ میں لکھا تھا ملاحظہ فرمائیں۔ اس مضمون کے مطالعے سے اس دور کے حالات اور پاک بھارت تعلقات کو سمجھنے میں خاصی مدد ملتی ہے۔

بھارت کے وزیر خارجہ یشونت سنہا کی اس ہرزہ سرائی کے بعد کہ ''پریمیڈی ایٹیو اسٹرائیک'' کیلئے پاکستان ''فٹ کیس'' ہے' ایک مرتبہ پھر جنوبی ایشیا میں پہلے سے موجود کشیدگی کو نہ صرف ہوا ملی' بلکہ بھارت کی مہاسبھائی قیادت کے ان عزائم کو بھی واضح کر دیا کہ جیسے ہی انہیں امریکہ کی طرف سے گرین سگنل ملا' وہ ماضی کی طرح پاکستان کے خلاف جارحیت کے مرتکب ہوں گے اور اپنے دیرینہ عزائم کو پورا کریں گے' جن میں خاکم بدہن پاکستان کی شکست و ریخت اور متعصب ہندو کا ''مہابھارت'' منصوبہ شامل ہے' جو اشوک اعظم کے زمانے کی یاد دلاتا ہے' جب راس کماری سے کنیا کماری تک اس کی حکومت تھی۔ ممکن ہے بعض عملیت پسندوں کو آج یہ بات مضحکہ خیز معلوم ہو' لیکن تاریخ کا طالب علم ان حقائق کو نظرانداز نہیں کر سکتا' جس سے اسے فی زمانہ واسطہ رہا ہو۔ ماضی قریب میں جب بھارتی حکومت میں موجود مہاسبھائی ٹولے کے کرتا دھرتا اور بھارت میں فلسفہ ''ہندوتا'' کے بانی بھارتی وزیر داخلہ مسٹر ایڈوانی نے بابری مسجد کو شہید کر کے یہاں رام مندر بنانے کی مہم کا آغاز ''دھارمک رتھ یاترا'' سے کیا تو انہوں نے آغاز میں نہ صرف بابری مسجد' بلکہ بھارت

Marfat.com

میں موجود مسلمانوں کے قابل ذکر مذہبی مراکز کو مسمار کرنے کا بھی برملا اعلان کیا۔ خیال رہے کہ ان دنوں بھارت میں بی جے پی حکومت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اور مرکز میں نرسیما راؤ کی کانگریس سرکار برسراقتدار تھی' البتہ یو پی میں معمولی اکثریت سے بی جے پی کی حکومت ضرور قائم ہوئی تھی۔ پھر ساری دنیا نے ٹی وی اسکرینوں پر بابری مسجد کی شہادت کے مناظر دیکھے' جس پر عالمی سطح پر احتجاج بھی ہوا لیکن نتیجہ کیا نکلا؟ سب جانتے ہیں۔ تازہ ترین صورت حال یہ ہے کہ بھارتی عدالتوں کے فیصلوں کے برعکس' بھارتی اکثریتی آبادی کی خواہشات کے منافی' بلکہ زبانی کلامی طور پر بھارتی حکومت کے اعلانات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ڈیسائی کے ان چیلوں نے نہ صرف مسجد کی جگہ مندر کی بنیادیں رکھ دی ہیں' بلکہ وہاں پوجا کا سلسلہ بھی زور و شور سے جاری ہے اور عالمی رائے عامہ صرف تماشا دیکھ رہی ہے۔

اگر سانحہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر سے عراق پر امریکی قبضے تک بھارت میں برسراقتدار جن سنگھی قیادت کے اعمال و افکار کا محاسبہ کیا جائے تو کوئی بھی غیر جانب دار محقق بڑی آسانی سے اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ بھارتی قیادت تیزی سے بدلتی اور ڈرامائی عالمی صورت حال کا فائدہ اٹھا کر پاکستان کے خلاف گھناؤنے عزائم کی تکمیل کی متمنی ہے۔ 2002ء میں بھارت نے 7 لاکھ فوج پاکستانی سرحدوں پر لا کر اسی ذہن کی عکاسی کی تھی۔ لیکن پاکستانی حکمت عملی یا پھر بھارتی انٹیلی جنس ایجنسیوں کی طرف سے اپنی حکومت کو پاکستان کی فوجی استعداد کے متعلق فراہم کردہ مبنی برحقائق رپورٹس نے بھارتی قیادت کو یہ باور کروایا کہ اسرائیلی معاونت اور امریکی پشت پناہی کے باوجود وہ مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کر سکتی۔ البتہ ممکنہ مہم جوئی کے نتیجے میں انہیں اقتدار سے ضرور رخصت ہونا پڑے گا' ورنہ بھارتی حکومت تو اس بات پر تلی ہوئی تھی کہ وہ اس موقع کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دے گی۔

پاکستان کے خلاف بھارتی قیادت کی ہرزہ سرائی یا بڑھکیں ہمارے لئے کوئی نئی بات نہیں۔ 1948ء میں کشمیری حریت پسندوں کے ہاتھوں آزاد کشمیر اور بلتستان کی آزادی کے بعد سے بھارت اس ''پالیسی'' پر سنجیدگی سے عمل پیرا ہے۔ 1965ء میں سابق بھارتی وزیراعظم لال بہادر شاستری نے مقبوضہ کشمیر میں جاری جنگ آزادی سے تلملا کر پاکستان پر حملے کی دھمکی دی اور 6 ستمبر 1965ء کو اس پر عمل بھی کر دکھایا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس جنگ کا انجام کیا ہوا اور بھارتی دعوؤں اور دھمکیوں کے برعکس اسے بین الاقوامی سطح پر کتنی سبکی اٹھانی پڑی۔

1971ء میں بھی پاکستان کے داخلی انتشار سے جو بھارتی انٹیلی جینس ایجنسیوں ہی کا پیدا کردہ تھا' بھارتی قیادت نے فائدہ اٹھایا اور تمام عالمی قوانین اور اخلاقیات کی دھجیاں اڑاتے ہوئے ایک آزاد اور خود مختار ملک کے خلاف نہ صرف نام نہاد گوریلا فورس (مکتی باہنی) کھڑی کی بلکہ خود بھی حملہ کر کے سابقہ مشرقی پاکستان میں فوجیں داخل کیں اور پاکستان کو دولخت کر دیا۔ حیرت کی بات ہے کہ تب بھی دنیا کی سپر پاور امریکہ اور روس نے بھارت کو نہیں روکا' نہ ہی اقوام متحدہ کو یہ توفیق ہوئی کہ وہ بھارت کی اس کھلی جارحیت کے خلاف اپنے منشور پر عمل کرتے ہوئے کارروائی کرتا۔ البتہ بھارت کو اس وقت لینے کے دینے پڑ گئے' جب بنگلہ دیش کے عوام نے اس کی جبری حاکمیت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا' تب سے آج تک اپنی تمام تر ریشہ دوانیوں کے باوجود بھارتی قیادت بنگلہ دیش کے مسلمانوں کو ورغلانے میں ناکام رہی ہے اور وہ آج بھی بھارت کیلئے مستقل دردسر بنے ہوئے ہیں' جس کا ثبوت بھارت کی طرف سے بھارت بنگلہ دیش سرحد پر

Marfat.com

لگائی گئی وہ حفاظتی باڑھ ہے جس میں ''گھس بیٹھیوں'' کے خطرے کے پیش نظر شام کے بعد برقی رو دوڑا دی جاتی ہے اور دونوں ممالک کی سرحدی افواج کی جھڑپیں روزانہ کا معمول بن گئی ہیں۔

بھارتی قیادت کو 11 ستمبر 2001ء کے بعد یہ امید پیدا ہو گئی تھی کہ جلد یا بہ دیر امریکہ کی طرف سے اسے پاکستان کے خلاف حملے کا گرین سگنل مل جائے گا اور نہ صرف سگنل بلکہ امریکہ پاکستان کے خلاف حملے میں بھارت کا حلیف بھی ہوگا لیکن پاکستانی قیادت کے اس فیصلے سے کہ وہ طالبان حکومت کے خلاف امریکہ کا حلیف ہے اور امریکہ کو دہشت گردی کے خلاف اس جنگ میں لاجسٹک اور انٹیلی جینس تعاون مہیا کرے گا' بھارتی ارادوں پر پانی پھیر دیا' گو بھارت نے اس کے بعد ایڑی چوٹی کا زور لگا کر ''پاکستان کو طالبان کی خفیہ حمایت'' کا ملزم گردانے کی مہم جاری رکھی لیکن حیرت انگیز طور پر اسے کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

بھارتی قیادت اس غلط فہمی کا بھی شکار تھی کہ اس حادثے سے پہلے برصغیر میں ہونے والے خونی فوجی تصادم یعنی معرکہ کارگل پر انہوں نے جس طرح سابق صدر کلنٹن کی حمایت حاصل کر لی تھی اور امریکی جرنل ٹومی فرینکس نے پاکستان کے سابق وزیر اعظم کو امریکی صدر کا یہ دھمکی آمیز پیغام پہنچایا تھا کہ اگر پاکستان نے بھارت کی مفتوحہ پوسٹیں واپس نہ کیں تو امریکہ بھارت کی فوجی مدد کرتے ہوئے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو ناکارہ کر دے گا' جس کے بعد سابق وزیر اعظم نواز شریف نے امریکہ کا دورہ کیا اور پاکستانی فوج کو مفتوحہ علاقہ خالی کرنا پڑا۔ اس کے بعد بل کلنٹن نے پاکستان میں قیام کے دوران پاکستانی قوم سے خطاب کرتے ہوئے انہیں مہذب اور اخلاقی سفارتی زبان میں ان نتائج کی کھل کر دھمکی دی تھی' جن سے پاکستان اپنی اسلام پسندانہ اور آزادانہ پالیسیوں کی وجہ سے دوچار ہو سکتا تھا۔

اس صورت حال کو بھارتی قیادت نے اپنے حق میں خوب خوب استعمال کیا لیکن صدر جنرل پرویز مشرف کے دورۂ آگرہ نے بھارتی جارحانہ حکمت عملی کو ایک مرتبہ تو گڑ بڑا کر رکھ دیا۔ اس دورے کے پاکستان کے حق میں مرتب ہونے والے ممکنہ اثرات سے بچنے کیلئے بھارت کی مہا سبھائی قیادت نے بھارتی وزیر اعظم مسٹر واجپائی کو بھی چاروں شانے چت کر دیا اور مسلم دشمنی کیلئے خصوصی شہرت کے حامل بھارتی وزیر داخلہ مسٹر ایل کے ایڈوانی اور ان کے ٹولے نے صدر مشرف کو بھارت سے بھی خالی ہاتھ لوٹنے پر مجبور کر دیا۔ صدر مشرف کے بھارتی پریس سے خطاب اور پاکستان کے اصولی مؤقف کو بہر صورت عالمی سطح پر پذیرائی ملی' جس سے بھارت کی بوکھلاہٹ میں اضافہ ہوا۔ بھارتی حکومت نے اس مرحلے پر محض اپنے اس مؤقف کو سچ ثابت کرنے کیلئے کہ پاکستان دہشت گرد ریاست ہے' پہلے اپنی پارلیمنٹ پھر مقبوضہ کشمیر کی پارلیمنٹ پر حملے کا ڈرامہ رچایا اور بلاشبہ اس کا یہ ڈرامہ ہمارے کچھ عاقبت نااندیش مجاہد لیڈروں کے غیر ضروری اور غلط بیانات کی وجہ سے کامیاب بھی رہا۔ بھارتی قیادت امریکہ اور عالمی رائے عامہ کو یہ باور کرانے میں بہر صورت کامیاب رہی کہ حملہ آوروں کا تعلق پاکستان سے ہو سکتا ہے۔ اس مرحلے پر بھارتی مہا سبھائی قیادت کو پھر امید پیدا ہوئی کہ پاکستان کے خلاف انہیں امریکی حمایت حاصل ہو جائے گی' لیکن امریکہ افغانستان میں بری طرح پھنسا ہوا تھا۔ خواہش کے باوجود وہ بھارت کی مدد نہ کر سکا اور دونوں ممالک کو اپنے معاملات افہام و تفہیم کے ساتھ نمٹانے کی نصیحتیں کی جانے لگیں' البتہ بھارت کو یہ کامیابی ضرور حاصل ہوئی کہ امریکہ اور برطانیہ کی اعلیٰ قیادت نے برصغیر کے مسلسل دورے کر کے پاکستانی

Marfat.com

قیادت کو یہ باور کروا دیا کہ اگر پاکستان میں موجود کشمیری مجاہد تنظیموں نے اپنے آپریشن اور پاکستانی علاقے میں موجود کیمپ اسی طرح قائم رکھے تو پاکستان کے خلاف بھارت کا کیس نہ صرف مضبوط ہو جائے گا بلکہ امریکہ اور برطانیہ بھی اس کی حمایت کرنے پر مجبور ہوں گے۔ اس مرحلے پر پاکستان نے پھر امریکہ کو باور کروانا چاہا کہ پاکستانی سرحدوں سے بھارت میں مداخلت نہیں ہو رہی اور صدر جنرل پرویز مشرف نے مزید سخت پالیسی اختیار کرتے ہوئے مجاہد تنظیموں پر پابندی لگائی اور انہیں پاکستان میں چندہ جمع کرنے کی اجازت دینے سے بھی انکار کر دیا۔ صدر مشرف کے مذہبی انتہا پسندوں کے خلاف کئے گئے ان اقدامات کو سراہا گیا اور ایک مرتبہ پھر بھارت کو منہ کی کھانی پڑی۔ اس مرحلے پر صدر مشرف نے امریکہ سے یہ بات ضرور کہی کہ وہ پاکستان سے یہ امید نہ رکھیں کہ وہ مقبوضہ کشمیر میں جاری جہاد آزادی ختم کر سکے گا' کیونکہ اس پر ان کا اختیار نہیں' نہ ہی وہ بھارت میں موجود دیگر علیحدگی اور آزادی پسند تحریکوں کی سرگرمیاں روک سکتے ہیں۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ بھارت اپنا انسانی حقوق کے احترام کا ٹریک ریکارڈ ٹھیک کرے۔

بھارتی حکومت کی طرف سے اس مرحلے پر پاکستان کو پھانسنے کیلئے ایک اور جال پھینکا گیا اور عجیب وغریب قسم کی مشترکہ پٹرولنگ کی تجویز پیش کی گئی' جس کا عملی نفاذ ناممکن تھا اور پاکستان کیلئے اس احمقانہ تجویز کو قبول کرنا کسی بھی طور ممکن نہیں تھا۔ پاکستان نے اس مرحلے پر بھارتی حکومت کی تجویز کے برعکس امریکہ سے کہا کہ وہ کنٹرول لائن پر مبصرین کی زیادہ پوسٹیں قائم کرے' جو غیر جانبداری سے اس امر کا جائزہ لیں کہ کیا پاکستان بھارت میں دہشت گرد بھیج رہا ہے' یا یہ صرف بھارتی پراپیگنڈہ اور بھارتی عوام کی توجہ اندرونی مسائل سے ہٹا کر انہیں جنگی جنون میں مبتلا کر کے مذموم مقاصد اور سیاسی کامیابیاں حاصل کرنے کی سازش ہے۔ ظاہر ہے بھارت کیلئے یہ تجویز قابل قبول نہیں تھی اور اس نے ایسا ہی کیا۔ بھارتی حکومت کی طرف سے غیر جانبدار مبصرین کی مزید پوسٹیں قائم کرنے کی شدید مخالفت کی گئی بلکہ امریکہ اور برطانیہ کو یہ باور کروایا گیا کہ اگر انہوں نے اس پاکستانی تجویز کی حمایت کی تو وہ بھارت میں اپنے تجارتی مفادات سے بھی ہاتھ دھو سکتے ہیں' جس کے بعد امریکہ اور برطانیہ نے اس مسئلے پر پراسرار خاموشی اختیار کر لی۔ البتہ بھارتی وزارت خارجہ کو اپنی ناکامی کا احساس ضرور ہو گیا۔

اس مرحلے پر بھارتی حکومت نے یشونت سنہا کو' جو سابقہ بیوروکریٹ اور وزیر خزانہ رہے ہیں' نئی تیاریوں کے ساتھ وزیر خارجہ بنا کر آگے بڑھایا' جنہوں نے اپنی دانست میں پاکستان پر مسلسل الزام تراشی اور اشتعال انگیز بیانات کے ذریعے پاکستانی قیادت کو پریشان کرنے کی پالیسی اپنا رکھی ہے۔ یشونت سنہا نے پاکستان پر زبانی حملوں کا آغاز ایسا ن سے کیا کہ انہوں نے مقبوضہ کشمیر میں ایسے طالبان گرفتار کئے ہیں' جن کا تعلق القاعدہ سے ہے اور انہوں نے آزاد کشمیر میں اپنے اڈے بنا رکھے ہیں' جہاں سے ساری دنیا' خصوصاً امریکہ میں دہشت گردی کے آپریشن بنائے جاتے ہیں۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اس مرحلے پر ان کی طرف سے ہونے والی اس وقتی اشتعال انگیزی نے پاکستان کیلئے کچھ مسائل ضرور کھڑے کئے' لیکن پاکستانی قیادت نے حکمت عملی سے اس صورت حال پر قابو پالیا' لیکن یشونت سنہا ہر قابل ذکر فورم پر اس الزام میں تکرار کرتے رہے۔ یشونت سنہا وزیر خزانہ کی حیثیت سے بی جے پی سرکار کا حصہ تھے' تب بھی بھارتی پریس کے حوالے سے یہ بات سامنے آئی تھی کہ ان کا شمار بی جے پی کے ہاکس میں ہوتا ہے اور یشونت سنہا اس گروپ کی نمائندگی

Marfat.com

کرتے ہیں جو واجپائی کے بجائے ایڈوانی کو بھارتی وزیراعظم کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہے۔ اس گروپ میں آر ایس ایس کے وہ انتہا پسند شامل ہیں' جو بی جے پی کے پلیٹ فارم سے ہی آگے بڑھ سکتے ہیں' بصورت دیگر شاید ابھی سیاسی کامیابی انہیں نہیں مل سکتی۔

جولائی 2001ء میں صدر جنرل پرویز مشرف جب آگرہ گئے تو ان کی آمد سے کچھ عرصہ پہلے ہی بی جے پی کے انتہا پسند ٹولے نے پارٹی کی سطح پر قیادت کی تبدیلی کی تحریک شروع کر رکھی تھی' اس کی بنیاد وہ مسٹر واجپائی کی بیماری کو بنا رہے تھے۔ مسٹر واجپائی کو گٹھیا اور کینسر کا عارضہ لاحق ہے' جب ان کے گھٹنوں کے جوڑ ممبئی کے ایک اسپتال میں تبدیل کئے جا رہے تھے تو بی جے پی کے یہ افراد اپنی سیاسی چالوں میں مصروف تھے اور ان دنوں پارٹی کے اندر وزیراعظم کی تبدیلی کی تحریک نے خاصا زور پکڑ رکھا تھا۔ یشونت سنہا اور ایڈوانی ٹولے کو یقین تھا کہ وزیراعظم واجپائی کی بیماری کی شدت سے گھبرا کر پارٹی ان کی ہاں میں ہاں ملائے گی اور انڈین پریس کے حوالے سے یہ بات بھی ان دنوں سامنے آئی تھی کہ مسٹر واجپائی کو دراصل کینسر کا عارضہ نہیں تھا' نہ ہی وہ کثرت سے شراب نوشی کرتے ہیں بلکہ یہ سارا پراپیگنڈہ ایک سازش کے تحت اس گروپ کی طرف سے ان کے خلاف کیا جا رہا تھا۔ یشونت سنہا کو زیادہ حوصلہ اس وقت ملا جب ان کی وزارت اور بھارتی بحریہ کے درمیان کھڑے ہونے والے تنازعے پر بھارتی ایڈمرل نے استعفیٰ دے دیا' جسے یشونت سنہا کی فتح قرار دیا گیا اور یہ باور کیا جانے لگا کہ وہ بی جے پی میں ایڈوانی کی سطح پر انتہا پسند لیڈر رہیں۔

وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی کی صحت یابی اور ان کے کامیاب دورۂ امریکہ نے ایک مرتبہ پھر اس انتہا پسند جن سنگھ ٹولے کی امیدوں پر پانی پھیر دیا' لیکن ان لوگوں نے ہمت نہ ہاری اور وزیراعظم واجپائی کو الگ کرنے میں ناکام رہنے کے باوجود ایل کے ایڈوانی کو نائب وزیراعظم کا عہدہ دلانے میں کامیاب ہو گئے' تاکہ کسی بھی مرحلے پر اگر وزیراعظم واجپائی ڈگمگا جائیں تو پہلے سے ایڈوانی کی شکل میں وزارت عظمیٰ کا ایک امیدوار ان کے پاس موجود ہو۔

یہ تھا وہ پس منظر جس میں صدر جنرل پرویز مشرف نے جولائی 2001ء میں بھارت کا دورہ کیا۔ اس دورے سے پہلے امریکی حکام کی طرف سے برصغیر کے مسلسل دورے اور امریکہ میں مسٹر واجپائی سے بش کی ملاقاتوں میں یہ طے پا گیا تھا کہ اب بھارت اور پاکستان کو ایک دوسرے کے خلاف تناؤ کی کیفیت ختم کر دینی چاہئے۔ دونوں ممالک پر بات چیت کے ذریعے مسئلے کے حل کیلئے دباؤ بہت بڑھ چکا تھا۔ امریکہ نے پاکستان کو بطور خاص یہ باور کروا دیا تھا کہ صدر بش کی خواہش ہے کہ پاکستان اپنے رویے میں لچک پیدا کرے اور دونوں ممالک کے درمیان اقتصادی اور تجارتی روابط استوار ہو جائیں۔ صدر جنرل پرویز مشرف یہی عزم لے کر آگرہ گئے تھے اور یہ بات اب اظہر من الشمس ہو چکی ہے کہ دونوں رہنماؤں نے جب علیحدگی میں مذاکرات کئے تو انکے درمیان ایک ایسا سمجھوتہ طے پا گیا تھا' جس کی بنیاد پر شاید آئندہ برصغیر کے کروڑوں عوام کی قسمت بدل جاتی اور یہاں اقتصادی ترقی کی نئی راہیں کھل جاتیں' جب یہ مسودہ تیار ہو کر ٹائپ ہونے کیلئے گیا تو بی جے پی کے یہی ہاکس جو مسٹر واجپائی کی بیماری کو بنیاد بنا کر انہیں ہٹانے میں ناکام رہے تھے' اس فکر میں غلطاں ہوئے کہ اگر پاکستان سے صلح صفائی کا کریڈٹ مسٹر اٹل بہاری واجپائی کو مل گیا تو وہ کبھی اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔

Marfat.com

دوسری طرف امریکی اس معاہدے کے ڈرافٹ کو اپنی کامیابی سمجھ رہے تھے' کیونکہ اگر صدر مشرف اس مسئلے کو حل کرانے میں کامیاب ہو جاتے تو پھر پاکستان میں ان کی پوزیشن سیاسی طور پر اتنی مضبوط ہو جاتی کہ اس کے بعد ہونے والے الیکشن میں وہ مضبوط قوت بن کر سامنے آتے۔ امریکیوں کیلئے' جو افغانستان میں قریباً پھنسے ہوئے تھے' صدر مشرف کا مضبوط ہونا بہت ضروری تھا' کیونکہ سیاسی طور پر مضبوط صدر مشرف امریکہ کیلئے طالبان کے خلاف آپریشن اور القاعدہ کی سرکوبی میں بہترین معاون ثابت ہو سکتے تھے۔

برصغیر کے کروڑوں عوام اور امریکی حکومت کو تب شدید دھچکا لگا' جب اچانک اس بات کا انکشاف ہوا کہ بھارتی حکومت میں موجود ''پراسرار ہاتھوں'' نے مشترکہ اعلامیے کا مسودہ تبدیل کر کے اس میں ایک ایسی شق کا اضافہ کر دیا ہے' جو دونوں رہنماؤں کے درمیان طے نہیں ہوئی تھی۔ اس شق میں ایسے الفاظ کا چناؤ جان بوجھ کر کیا گیا تھا' جو انتہائی اشتعال انگیز اور پاکستان کیلئے ناقابل قبول تھے۔ اس کے باوجود صدر مشرف اور وزیراعظم واجپائی نے ہمت نہیں ہاری اور دونوں رہنماؤں نے اس مسودے کو رد و بدل کے ساتھ دوبارہ ٹائپ ہونے کے لئے بھیج دیا' لیکن یشونت سنہا اور ایڈوانی مسٹر واجپائی کو قطعاً کامیاب ہونے نہیں دیکھنا چاہتے تھے' اس مرحلے پر پھر آڑے آئے اور آخری لمحات تک انہوں نے معاملات پر اپنی گرفت مضبوط رکھتے ہوئے معاہدہ نہ ہونے دیا۔ صدر مشرف کو خالی ہاتھ واپس لوٹنا پڑا اور واجپائی کو ایک بڑے کریڈٹ سے محروم کر دیا گیا۔

اس کے بعد سے آج تک بی جے پی کا یہ انتہا پسند جن سنگھی ٹولہ جو تعداد میں کم ہونے کے باوجود حکومتی معاملات میں گہری رسائی رکھتا ہے' ہاتھ دھو کر پاکستان کے پیچھے پڑا ہے۔ اس ٹولے کی ہر ممکن کوشش یہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح ایک مرتبہ پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ ہو جائے' کیونکہ اس جنگ کا نتیجہ کچھ بھی نکلے' یہ بات طے شدہ ہے اور متعدد مرتبہ امریکہ کی طرف سے بھی بھارت کو باور کرائی جا چکی ہے کہ ممکنہ لڑائی کے پہلے ہی مرحلے میں مقبوضہ کشمیر بھارت کے ہاتھوں سے نکل جائے گا۔ اس ٹولے نے بھارتی فوجوں کو سرحدوں پر دھکیلا تھا لیکن ایک مرتبہ پھر انہیں ہزیمت اٹھانا پڑی' کیونکہ بین الاقوامی تعلقات اور تیزی سے تبدیل ہوتی جیوپولیٹیکل صورت حال نے انہیں بعض ایسے حقائق کا ادراک کروا دیا تھا جن سے وہ اس سے پہلے آشنا نہیں تھے۔

دوسری طرف وزیراعظم واجپائی بھی ٹھنڈے دل و دماغ کے مالک' ایک ایسے مدبر لیڈر کے طور پر سامنے آئے' جنہوں نے بڑی کامیابی سے ایک طرف انتہا پسندوں کو ناکام بنائے رکھا اور دوسری طرف پاکستان کے خلاف وہ زبان بھی مسلسل استعمال کرتے رہے' جو اس ٹولے کی خواہش تھی لیکن دونوں اطراف سے اس بات کا خصوصی اہتمام اعلیٰ ترین سطح پر ضرور کیا گیا کہ کسی بھی مرحلے پر معمولی جھڑپیں' باقاعدہ جنگ کی شکل اختیار نہ کر لیں۔ بھارتی افواج کے پاکستانی سرحدوں پر ڈیرے ڈالے رکھنے کے نقصانات بھارتی پریس میں زیر بحث آتے رہے اور ملک کے اندر موجود اعتدال پسند لیڈر خصوصاً بی جے پی سے مخاصمت رکھنے والی اپوزیشن جماعتوں نے بی جے پی کا محاسبہ اس حوالے سے جاری رکھا' حالانکہ کانگریس نے جو بظاہر اس وقت بھی بھارت کی سب سے بڑی قومی جماعت ہے' پہلے پہل شاید عوامی دباؤ کے تحت وہی لائن اختیار کی' جو بی جے پی کی خواہش تھی' لیکن آہستہ آہستہ اپوزیشن نے اس احمقانہ اقدام کی مخالفت شروع کر دی۔

Marfat.com

دوسری طرف پاکستان کی ثابت قدمی اور معتدل خارجہ پالیسی نے بھارتی حکومت کو اخلاقی طور پر لاجواب کر دیا اور اس پر امریکہ کی طرف سے فوجیں سرحدوں سے ہٹانے کا دباؤ بڑھنے لگا' کیونکہ جنرل مشرف کی حکومت نے امریکی خواہشات کے عین مطابق نہ صرف امریکی خواہشات کے عین مطابق نہ صرف امریکی ایف بی آئی کو پاکستان میں ''فری ہینڈ'' دیئے رکھا' بلکہ ہر مرحلے پر دہشت گردی کے خلاف بھرپور آپریشن کر کے امریکی صدر کو یہ احساس دلا دیا کہ پاکستان ان کیلئے ناگزیر ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس دوران پاکستان نے قریباً پانچ سو القاعدہ اراکین کو پکڑ کر امریکہ کے حوالے کیا۔

پاکستانی سرحدوں سے بھارتی فوج کی بے نیل و مرام واپسی سے ایک مرتبہ پھر انتہا پسند ٹولے کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ اس کے بعد امریکہ' چین اور برطانیہ ہی نہیں دنیا کے ہر قابل ذکر ملک کی طرف سے دونوں ممالک پر گفت و شنید کیلئے دباؤ بڑھنے لگا۔ ایک مرحلے پر امریکی کانگریس میں موجود ''انڈین ہاکس'' نے بھی بھارتی حکومت پر مذاکرات کیلئے دباؤ بڑھانا شروع کر دیا۔ اسکے ساتھ ہی امریکی سفارت کاروں نے زور پکڑا' لیکن بی جے پی کے یہ رہنما اپنی کارروائیوں میں مصروف رہے اور جب بھی امریکہ کی کوئی اہم شخصیت صلح کا مشن لے کر برصغیر کا دورہ کرتی' مقبوضہ کشمیر میں ہندوؤں اور سکھوں کے خون سے ہولی کھیلنے کا ڈرامہ رچایا جانے لگتا' جس سے ان کا مشن ناکام ہو جاتا۔ شاید امریکن بھی یہ بات اب اچھی طرح سمجھنے لگے ہیں کہ اس کھیل میں کم از کم پاکستانی ایجنسیاں ملوث نہیں ہیں اور یہ سارا اہتمام پاکستان کو دہشت گرد ثابت کرنے کیلئے کیا جاتا ہے۔ عین ان لمحات میں جب یہ امید پیدا ہونے لگی تھی کہ شاید بھارت پاک تعلقات پھر سے قائم ہو جائیں' امریکہ عراق کے ساتھ جنگ میں الجھ گیا۔

جن سنگھی شاطر ایک مرتبہ پھر سرگرم ہو گئے۔ پہلے مرحلے پر تو ان کی طرف سے کوشش کی گئی کہ پاکستان اور امریکہ کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کر دی جائیں لیکن پاکستان میں اپوزیشن کے بے پناہ احتجاج اور میڈیا کے دباؤ کے باوجود صدر مشرف اور وزیراعظم جمالی نے بڑا محتاط رویہ اختیار کیا۔ انہوں نے نہ تو امریکہ کی براہ راست حمایت کی اور نہ ہی اس کی مخالفت کا کریڈٹ لیا بلکہ ایسی معتدل پالیسی اپنائی جس سے امریکہ پاکستان پر صدام کا حمایتی ہونے کا الزام نہ لگا سکے۔ اس مرحلے پر حکومت کی استقامت کو داد نہ دینا زیادتی ہوگی کہ ایک بار بھرپور جذباتی فضا میں جب کہ مخصوص عناصر کی طرف سے حکومت پر بھرپور نفسیاتی حملہ ہو رہا تھا کسی حکومتی ذمہ دار کی طرف سے کوئی ایسا بیان نہیں دیا گیا جسے بہانہ بنا کر بھارت امریکہ کے سامنے پاکستان کے خلاف اپنا کیس مضبوط کر سکتا۔

بھارتی وزیر خارجہ کی طرف سے اس نوعیت کے بیانات خاصے اشتعال انگیز تھے کہ پاکستان بھارت کیلئے ''فٹ کیس'' ہے اور وہ بھی امریکہ اور عراق کی مثال بنا کر پاکستان پر اپنے دفاع کیلئے ''پیشگی حملہ'' کر سکتا ہے' کیونکہ پاکستان بھارت کے خلاف دہشت گردی میں مصروف ہے۔ بدقسمتی سے بھارتیوں کو شروع ہی سے امریکہ میں ایک مخصوص پاکستان مخالف لابی کا تعاون ہمیشہ حاصل رہا ہے۔ بھارت میں سابقہ امریکی سفیر مسٹر بلیک ول کی باتیں اس کی شاندار مثال ہیں۔ موصوف نے یشونت سنہا کے بیانات کی بڑھ چڑھ کر پزیرائی کرتے ہوئے ان کی حمایت میں ایسے بیانات دیتے رہے جن سے پاکستان کے خلاف ان کے بغض کا ثبوت ملتا رہے۔ مسٹر بلیک ویل کے ان بیانات کا پاکستان نے بالآخر

Marfat.com

نوٹس لیا اور امریکہ سے باقاعدہ شکایت کی شاید امریکہ کی طرف سے بلیک ویل کی سرزنش کے بعد بھی انہوں نے بھارت میں اپنے منصب سے استعفیٰ دے دیا ہے۔

عراق میں اپنے مقاصد حاصل کرنے کے بعد امریکی حکام کی طرف سے فلسطین اور کشمیر کے دیرینہ تنازعہ کو حل کرنے کا عندیہ دیا جانے لگا۔ امریکہ نے فلسطین کیلئے جو روڈ میپ تیار کیا ہے اس میں 2005ء تک فلسطین کی آزاد ریاست کے قیام کا منصوبہ شامل ہے' جس پر یاسر عرفات کے اختیارات سلب کرنے کے ساتھ عمل درآمد کا آغاز بھی ہو چکا ہے اس کے ساتھ ہی امریکن حکام نے دسمبر 2004ء تک مسئلہ کشمیر کے حل کا بھی مصمم ارادہ کرلیا ہے اور پاکستانی وزیر اطلاعات شیخ رشید احمد برملا اس کا متعدد مواقع پر اعلان بھی کر چکے ہیں۔ امریکیوں کی خواہش ہے کہ یہ مسئلہ جنرل مشرف اور واجپائی کی موجودگی میں حل ہو اور اپریل کے پہلے ہفتے میں بھارتی وزیر اعظم کی طرف سے سری نگر کے جلسہ عام میں پاکستان سے دوستی کی خواہش کا اظہار ایک بڑا بریک تھرو تھا۔ بھارتی وزیر اعظم کی طرف سے یہ اعلان عین اس موقع پر کیا گیا جب بھارتی وزیر دفاع جارج فرنانڈس چین کا دورہ کرنے والے تھے۔

1992ء کے بعد یہ کسی وزیر دفاع کا پہلا دورۂ چین تھا اور چین کی طرف سے بھارت پر پاکستان سے بات چیت کا اخلاقی دباؤ بھی مسلسل جاری ہے۔ پاک چین تعلقات کا بھی بھارت کو بخوبی احساس ہے اور چین اس حقیقت سے بھی بخوبی آگاہ ہے کہ شمالی علاقہ جات اور لداخ پر امریکہ ایک عرصے سے نظریں جمائے ہوئے ہے اگر دونوں ممالک نے ایک دوسرے کے خلاف سخت رویہ نہ چھوڑا تو زیادہ عرصہ تک جنگ کو نہیں روکا جا سکتا' کیونکہ بھارت کے ساتھ ساتھ پاکستان میں بھی کچھ ایسے حلقے موجود ہیں جو اس مسئلے کا واحد حل ''جہاد'' ہی کو سمجھتے ہیں۔ چین کو اس حقیقت کا بھی بخوبی ادراک ہے کہ کسی مرحلے پر امریکہ دونوں ممالک کو آپس میں ٹکرا کر امن و امان قائم کرنے کے بہانے کشمیر میں ڈیرے جما سکتا ہے جس کے بعد اس کا قیام مستقل چین کے سر پر رہے گا جو چین کیلئے اچھی بات نہیں۔ دوسری طرف روس دنیا اور خصوصاً اس خطے میں امریکہ کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ سے بڑا پریشان ہے' یہی وجہ ہے کہ روسی سفیر نے پاکستان میں میڈیا سے تین چار مرتبہ انٹرویو میں مسئلہ کشمیر کے حل اور تنازعات کو آپس میں نمٹانے پر زور دیا ہے اور اس سلسلے میں روس کی طرف سے بار بار معاونت کی پیشکش بھی کی گئی ہے۔

اس صورت حال میں ظاہر ہے امریکہ بھی یہ نہیں چاہے گا کہ مسئلہ کشمیر کو حل کروانے کا کریڈٹ روس یا چین لے جائیں اور اس کیلئے برصغیر میں مداخلت کا ایک بڑا دروازہ بھی بند ہو جائے' اس لئے امریکہ نے بھارت کو پاکستان سے مذاکرات کیلئے مجبور کیا ہے' جس کا ایک ثبوت 18 اپریل کو بھارتی چینل پر نشر ہونے والا امریکی وزارت خارجہ کے ایک سینئر آفیسر رچرڈ ہیچن کا یہ بیان ہے کہ امریکہ پاکستان کی طرف سے دراندازی بند کروانے میں کامیاب نہیں ہو سکا' تاہم اس سلسلے میں پاکستان پر امریکہ کا دباؤ مسلسل جاری ہے۔ خیال رہے کہ یہ الزام پاکستان پر اس وقت لگایا گیا ہے جب پاکستان سے واجپائی دوستی کا اظہار کر چکے ہیں۔

ایسی عجیب و غریب صورت حال پیدا کر کے اپنے مقاصد کیلئے فضا ہموار رکھنا امریکہ کی دیرینہ پالیسی ہے جس کا پاکستان اور بھارت دونوں کو بخوبی اندازہ بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں ممالک میں موجود ایک اہم طبقے کی طرف سے

Marfat.com

اب یہ بات کہی جانے لگی ہے کہ امریکہ کو درمیان میں لائے بغیر پاکستان اور بھارت آپس میں ہی مسئلہ حل کر لیں' کیونکہ عین ممکن ہے امریکہ جو حل پیش کرے وہ دونوں ممالک کیلئے قابل قبول نہ ہو یا پھر امریکہ اس حل میں اپنا حصہ رکھے۔

بھارتی وزیراعظم کی طرف سے اس بیان کے اگلے ہی روز یشونت سنہا اور ایڈوانی دونوں کی طرف سے پاکستان پر دراندازی کرنے مجاہدین کے کیمپ ختم نہ کرنے کے الزامات کی تکرار کی گئی' جب کہ اپنے سرینگر کے بیان میں مسٹر واجپائی نے پاکستان سے مذاکرات کو مشروط نہیں کیا تھا اور پاکستان کی طرف سے اس پیشکش کا بھرپور اور گرم جوشی سے جواب بھی دیا گیا۔

اس مرحلے پر وزیراعظم جمالی نے ایک اور اہم قدم اٹھایا اور وزیراعظم واجپائی کو براہ راست فون کر کے ان سے کھلے دل سے گفتگو کی' ان کا شکریہ ادا کیا اور انہیں پاکستان آنے کی دعوت بھی دی۔ وزیراعظم جمالی کا کہنا ہے کہ انہوں نے بھارتی وزیراعظم سے یہ بھی کہا کہ وہ پاکستان آنا نہیں چاہتے تو وزیراعظم جمالی خود بھارت جا کر ان سے بات چیت کرنے کیلئے تیار ہیں۔

انتہائی مصدقہ ذرائع اس بات کا دعویٰ کر رہے ہیں کہ بھارتی وزیراعظم کی طرف سے پاکستان کو دوستی کی پیشکش کے پس پردہ بھارت کے انتہائی اہم سٹریٹیجک ساتھی اسرائیلی وزیراعظم شیرون کا بھی بھرپور ہاتھ ہے' کیونکہ مسٹر شیرون یہ سمجھتے ہیں کہ اس مرحلے پر اگر بھارت نے پاکستان کے خلاف کارروائی کی یا امریکہ نے اس کا ساتھ دیا تو پہلے سے امریکہ کے خلاف موجود مسلمانوں کا غصہ دوچند ہو جائے گا اور خصوصاً مڈل ایسٹ کے ممالک ''اسرائیل اور امریکہ کے مشترکہ فلسطینی روڈ میپ'' کیلئے خطرہ پیدا کر سکتے ہیں جو شیرون کو گوارا نہیں اور انہوں نے بھارت کو یہ باور کروا دیا ہے کہ اس نے اب پاکستان سے لڑائی چھیڑی تو اسرائیل کیلئے اس کا ساتھ دینا ممکن نہیں ہوگا' کیونکہ اسرائیل فی الوقت مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک کی ناراضگی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اسرائیل کی طرف سے بھارت کی امداد سے ہاتھ روک لینا بھارت کیلئے سراسر گھاٹے کا سودا ہے اس لئے بھارت کو ایک مرتبہ مذاکرات کی میز پر تو آنا ہی ہوگا۔ ان مذاکرات میں مسئلہ کشمیر کے کیا ممکنہ حل پیش کئے جائیں گے؟ اس سوال کے جواب میں کئی آراء سامنے آتی ہیں لیکن جس حل پر زیادہ رائے عامہ متفق ہے وہ یہ کہ کنٹرول لائن کو مستقل سرحد تسلیم کرتے ہوئے سری نگر کو ''محدود آزادی'' دے کر اسے بھارت کے زیر کنٹرول رکھا جائے اور دونوں اطراف کے کشمیریوں کو آزادی سے بغیر کسی رکاوٹ کے ایک دوسرے کے پاس آنے جانے کی آزادی دے دی جائے۔ ظاہر ہے پاکستان کا مؤقف اس سلسلے میں بالکل مختلف ہے اور وہ ہمیشہ اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق اس مسئلے کے حل کا مطالبہ کرتا آیا ہے لیکن اس مرحلے پر سردار قیوم کی یہ رائے بہت مستند ہے کہ بھارت کی طرف سے اس مرحلے کے بدترین حل کو بھی پاکستان یکسر نظرانداز نہ کرے اور اس سلسلے میں سخت مؤقف اپنانے کی بجائے ڈپلومیسی سے فضا کو اپنے حق میں ہموار کرنے کی کوشش کرے۔ پاکستان کی طرف سے بھارت کیلئے زمینی راستے کھولنے کی یکطرفہ پیشکش اس امر کی غماز ہے کہ پاکستان صدق دل سے مذاکرات کی کامیابی کا متمنی ہے۔ شاید پہلی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ بھارت نے ''کشمیر سمیت تمام ایشوز'' اور پاکستان سے ''کشمیر کے علاوہ دیگر ایشوز'' پر بھی بات چیت کرنے پر آمادگی ظاہر کی ہے۔

اس مرحلے پر پاکستان کیلئے ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ وہ محض وقت گزاری یا وقتی مصلحت کے تحت اس انداز

Marfat.com

میں سمجھوتا نہیں کرسکتا جن سہولتوں کے ساتھ بھارت کرسکتا ہے' کیونکہ گذشتہ پچاس سال سے پاکستان نے کشمیر پر ایک مضبوط مؤقف اپنا رکھا ہے جو ہماری خارجہ پالیسی کا مرکزی ستون بھی سمجھا جاتا ہے۔ پاکستان کیلئے کشمیری عوام کو نظر انداز کر کے مسئلے کا کوئی بھی حل قبول کرنا ممکن نہیں' کیونکہ پاکستانی عوام کا کشمیر سے ایک جذباتی اور مضبوط رشتہ قائم ہے' مستقبل قریب میں پاکستان کیلئے پانی کا حصول ایک بڑا پیچیدہ مسئلہ بننے والا ہے اور پاکستان کی طرف سے آنے والے اہم دریا مقبوضہ کشمیر میں ہیں اس لئے پاکستان کی ہر ممکن کوشش ہوگی کہ جو بھی فیصلہ ہو اس میں بھارت کو سری نگر پر کلی اختیارات نہ مل جائیں اور اس مسئلے کے حل میں پاکستانی مستقبل کی پانی کی ضروریات کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے۔ ماضی کی تاریخ گواہ ہے کہ بھارت نے پاکستان کی طرف آنے والے پانیوں کے راستے میں بند باندھ کر ہماری زمینوں کو بنجر کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔

دوسرا اہم مسئلہ حریت کانفرنس کا ہے جو کشمیریوں کی نمائندہ جماعت ہونے کے ناطے ان مذاکرات میں اپنی شمولیت کو یقینی بنانے کی کوشش کریگی اس کے ساتھ ہی کشمیر کو علیحدہ ریاست بنانے کا متمنی کشمیریوں کا مضبوط گروپ جموں کشمیر لبریشن لیگ بھی اپنے ہمنواؤں کے ساتھ اپنا ایک مضبوط نقطہ نظر رکھتا ہے اور وہ بھی کشمیریوں کی اکثریتی پارٹی ہونے کا دعویدار ہے۔ حریت کے پرچم تلے اس وقت متضاد خیالات کی حامل کشمیری جماعتیں جمع ہیں جب بھی فیصلے کا مرحلہ آیا وہ اپنے اپنے نظریات کے مطابق مسئلہ کشمیر کے حل کیلئے بضد ہوں گی اور حریت کانفرنس کی لیڈر شپ قبول کرنے سے انکار کردیں گی۔ ان حالات میں بظاہر تو فاروق عبداللہ کی یہ تجویز کہ مقبوضہ اور آزاد کشمیر کی قیادت کو آپس میں مل بیٹھ کر کسی ایک نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرنی چاہئے' غیر معقول دکھائی نہیں دیتی' کیونکہ کشمیری قیادت کو اعتماد میں لئے بغیر محض امریکہ کی طرف سے مسلط کئے جانے والا کوئی فیصلہ بھی اس مسئلے کا شاید مستقل حل ثابت نہ ہوسکے۔

ماضی کے تجربات سے دونوں حکومتوں نے کافی سبق سیکھا ہے جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ دونوں حکومتوں نے فوراً ہی کوئی جذباتی قدم اٹھانے سے پہلے حکومتی اداروں اور مختلف طبقہ خیال کے لوگوں کو اعتماد میں لینا ضروری سمجھا ہے۔ وزیر اعظم میر ظفر اللہ خان جمالی نے وزیر اعظم واجپائی کو فون کرنے کے بعد اپوزیشن پارٹیوں سے مذاکرات کئے اور بھارت کے ساتھ ممکنہ معاہدات کیلئے انہیں نہ صرف اعتماد میں لینا ضروری سمجھا ہے' بلکہ ان کی مکمل حمایت حاصل کی اور شاید پہلی بار پاکستان میں اپوزیشن جماعتوں نے حکومت کو طے شدہ ایجنڈے پر مذاکرات کی خوشدلی سے اجازت دی ہے۔ وزیر اعظم واجپائی نے پارلیمنٹ سے خطاب میں پاکستان سے کہا تھا کہ وہ مذاکرات کیلئے ٹھوس بنیادیں قائم کرے۔ خود حکومت پاکستان بھی اس مرتبہ ہوم ورک مکمل کرنے کے بعد مذاکرات کی میز پر بیٹھنا چاہے گی۔ اسی لئے وزیر اعظم جمالی نے پاکستان میں موجود کشمیری لیڈر شپ سے بھی مذاکرات کئے اور انہیں آگاہ کیا کہ پاکستان نے کشمیر میں اپنا مؤقف تبدیل نہیں کیا' دوسری طرف وزیر اعظم واجپائی بھی اپنی حکومت کے مختلف عناصر اور اپوزیشن کو اعتماد میں لے رہے ہیں اور بھارتی پارلیمنٹ میں اس حوالے سے مباحثہ بھی ہورہا ہے۔ وزیر اعظم واجپائی نے صدر بھارت کو بھی اعتماد میں لیا ہے۔ دونوں طرف ہونے والے باہمی مذاکرات سے ایک ایک بات تو صاف ظاہر ہے کہ پاکستان اور بھارت دونوں ہی اس مرتبہ مکمل تیاری اور مذاکرات کی کامیابی کا عزم لیکر آمنے سامنے بیٹھیں گے۔ دونوں طرف موجود (ہاکس)

Marfat.com

بھی سرگرم عمل ہیں۔ لیکن اس مرتبہ یوں دکھائی دے رہا ہے جیسے انہیں اپنے مقاصد میں کامیابی نہیں ہو سکے گی۔ ایک عام بات جو موجودہ مذاکرات کے دوران دیکھنے میں آئی ہے' وہ پاکستان کا لچک دار رویہ ہے۔ باور کیا جاتا تھا کہ ماضی کی طرح پاکستان پہلے کشمیر اور بعد میں دیگر مسائل پر بات کرے گا لیکن اس مرتبہ حیرت انگیز طور پر پاکستان نے یہ موقف نہیں اپنایا اور ''کمپوزٹ ڈائیلاگ'' کی بات کی ہے۔ اس سلسلے میں حکومت کو خاصی تنقید کا بھی سامنا ہے' لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے' جیسے پہلے سے طے شدہ ایجنڈے پر بھی بات کی جا رہی ہے اور یہ خدشات بھی کافی حد تک صحیح دکھائی دیتے ہیں کہ شاید امریکہ نے دونوں ممالک کے سامنے مسئلہ کشمیر کا کوئی ممکنہ حل رکھا ہے' جس پر دونوں غالباً راضی بھی ہو چکے ہیں۔

اس سلسلے کی ایک پیش رفت امریکی نائب وزیر خارجہ آرمیٹج اور کرسٹینا روکا کا دورۂ پاک' بھارت اور افغانستان ہے۔ اطلاعات کے مطابق دونوں امریکی زعما مذاکرات کی کامیابی کیلئے کوئی ایجنڈہ لے کر آئے ہیں' خصوصاً وزیراعظم واجپائی کی طرف سے پاکستان پر دراندازی روکنے کی جو شرط مسلسل عائد کی جا رہی ہے' جبکہ پاکستان کی طرف سے انکار کیا جا رہا ہے۔ آرمیٹج کے دورے کا ایک اہم مقصد اس سلسلے میں پاکستان سے ضمانت اور وضاحت حاصل کرنا تھا اور انہوں نے اپنے دورے کے اختتام پر پریس کانفرنس میں بھی یہ بات کہی کہ صدر مشرف نے ان سے کہا ہے کہ آزاد کشمیر میں کوئی تربیتی کیمپ موجود نہیں' اگر ہے تو وہ ختم ہو جائے گا۔ امید تو یہی کی جا رہی کہ اس کے بعد بھارت کی طرف سے اس سلسلے میں تکرار نہیں ہوگی لیکن بھارت کے نائب وزیراعظم ایل کے ایڈوانی نے 9 مئی کو ایک بار پھر پاکستان سے دہشت گردی بند کرنے کی بات کی ہے' جس سے بظاہر یہی لگتا ہے کہ انڈین ہاکس نے ابھی تک مسٹر واجپائی کی دوستی کی خواہش کا احترام نہیں کیا اور وہ مستقبل میں بھی اس میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کی کوششیں کریں گے' دوسری طرف بھارت کی طرف سے ہائی کمشنر کے نام کی منظوری کی درخواست اور پاکستان کے پارلیمانی وفد کی بھارت روانگی اور اگلے چند دنوں میں بھارتی وفد کی آمد مثبت صورت حال کی نشاندہی بھی کر رہی ہے۔ بہرحال یہ بات طے ہے کہ برصغیر کے کروڑوں عوام اس مرتبہ کامیاب مذاکرات اور مسئلہ کشمیر کے مستقل حل کے خواہاں ہیں' کیونکہ اس میں دونوں ملکوں کی معاشی بقاء کا راز مضمر ہے۔

(روزنامہ جنگ سنڈے میگزین 18 مئی 2003ء مصنف طارق اسمٰعیل ساگر)

دسمبر 2003ء کی سب سے اہم خبر بھارتی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی کی طرف سے 12 ویں سارک کانفرنس میں شمولیت پر آمادگی کا اظہار تھی۔ اس صورت حال پر میں نے دسمبر میں ایک مضمون بعنوان ''12 ویں سارک کانفرنس'' سپرد قلم کیا تھا۔ جس میں پاک بھارت تعلقات کا 2003ء میں آگرہ اور آئندہ کیلئے توقعات کا اظہار کیا۔ ملاحظہ فرمائیں:

''12 ویں سارک سربراہ کانفرنس 4 جنوری سے اسلام آباد میں شروع ہو جائے گی' جس میں اب تک کی اطلاعات کے مطابق بھارتی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی بھی شریک ہوں گے' جنہوں نے وزیراعظم جمالی اور صدر مشرف سے کانفرنس کے موقع پر ملاقات کو روایتی قرار دیتے ہوئے کہا کہ انہیں اس ملاقات سے خوشی ہوگی۔ اس سے پہلے مسٹر واجپائی نے پاکستانی حکومت کی طرف سے امن بحال کرنے اور برصغیر میں اچھا ماحول پیدا کرنے کی کوششوں کو سراہا اور وزیراعظم جمالی کی طرف سے کنٹرول لائن' ورکنگ باؤنڈری اور سیاچن میں یک طرفہ جنگ بندی کی پیشکش کی تعریف کی۔ اب تک کی اطلاعات کے مطابق دونوں ممالک کی افواج کے درمیان سیز فائر پر عمل جاری ہے اور اس کی خلاف ورزی کا

Marfat.com

ابھی تک کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ یہ طویل عرصے کے بعد پہلا موقع ہے' جب سرحدوں کے اطراف رہنے والے ہزاروں بے گناہ شہریوں نے سکھ کا سانس لیا' پرامن اور خوش گوار فضا میں عید گزاری اور اب وہ اس قابل بھی ہوگئے ہیں کہ اپنے کھیتوں میں اپنی مرضی سے کام کرسکیں۔

کسی بحث میں پڑے بغیر یہ بات برملا کہی جاسکتی ہے کہ سیز فائر کے اس جرأت مندانہ فیصلے کا کریڈٹ پاکستان حکومت کو جاتا ہے' جس کے صرف ایک اہم اور جرأت مندانہ اقدام سے سرحدوں کے آر پار فضا بدل کر رہ گئی اور حکومت کے اس اقدام کو دنیا بھر میں تحسین کی نظروں سے دیکھا گیا۔ اس کے باوجود کہ بھارتی حکومت میں موجود وہ انتہا پسند لابی جو ہمیشہ امن کی کوششوں میں رکاوٹ ڈالتی آئی ہے۔ اس کی طرف سے پاکستان کے اس اقدام کا تمسخر اڑایا گیا اور ایسی زبان استعمال کی گئی جسے نرم ترین الفاظ میں بھی غیر سفارتی زبان کہا جاسکتا ہے۔

دو دسمبر کو بھارتی بارڈر سکیورٹی فورسز کے یوم تاسیس پر تقریب سے خطاب کرتے ہوئے بھارت کے نائب وزیراعظم اور وزیر داخلہ ایل کے ایڈوانی نے کہا کہ پاکستان نے کنٹرول لائن پر جنگ بندی عالمی طاقتوں کے دباؤ پر کی ہے' کیونکہ بھارت نے اپنا معاملہ عالمی برادری کے سامنے رکھا تھا' جس نے بھارتی مؤقف کی تائید کرتے ہوئے پاکستان کو مجبور کیا کہ وہ جنگ بندی کرے۔ انہوں نے کہا کہ بھارت نے جنگ بندی کی یہ پیشکش صرف اس لئے قبول کی ہے کہ اسے سرحد پر رہنے والوں کا تحفظ زیادہ عزیز ہے۔ انہوں نے ایک مرتبہ پھر پاکستان پر دراندازی کا الزام لگایا اور کہا کہ فائر بندی کے باوجود دراندازی جاری ہے اور بھارت کو اس فائر بندی کی آڑ میں سرحدوں پر خاردار تاروں کا کام آسانی سے مکمل کرنے کی سہولت میسر ہوجائے گی۔

اس تقریب میں بھارتی وزیر خارجہ یشونت سنہا نے اپنے مخصوص انداز میں کہا کہ پاکستان بھارتی خارجہ پالیسی کا محور نہیں ہے۔ انہوں نے وزیراعظم جمالی اور واجپائی کے درمیان کسی بھی طرح کی گفت وشنید کے امکان کو خارج قرار دیتے ہوئے کہا کہ پاکستان کے ساتھ سربراہی سطح پر بات چیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' جب کہ نچلی سطح پر مذاکرات کا امکان موجود ہے اور مذاکرات جب بھی ہوئے' نچلی سطح پر ہی ہوں گے۔ البتہ موسم اور کھانے پر وزیراعظم واجپائی اپنے ہم منصب سے بات کرسکتے ہیں۔ بھارتی وزیر مملکت آئی ڈی سوامی نے کہا کہ بھارت نے جموں کشمیر سرحد پر 2007ء تک باڑ لگانے کا کام مکمل کرنا تھا' جس میں مسلسل فائرنگ کی وجہ سے رکاوٹ پیش آرہی تھی' فائر بندی کے بعد ہم اپنا ٹارگٹ بہت پہلے حاصل کرلیں گے۔

اس نوعیت کے بیانات ایسے موقع پر جاری کرنا' جب پاکستان کی طرف سے فضائی رابطے کی پیشکش کی گئی اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ فضائی رابطے منقطع ہونے سے بھارت کو پاکستان کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ نقصان ہورہا تھا۔ صدر مشرف نے ایک اور جرأت مندانہ فیصلہ کیا' جس کا مقصد تعلقات کو معمول پر لانا اور ایسی فضا پیدا کرنا ہے' جس میں وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی کھلے ذہن کے ساتھ پاکستان آسکیں اور گفت وشنید کے ذریعے ان پیچیدہ مسائل کا حل تلاش کیا جائے' جن کی وجہ سے برصغیر پاک وہند کے کروڑوں عوام جانوروں سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور ہیں اور فی زمانہ جب دنیا بھر میں اقتصادی بلاک بن رہے ہیں' ہمسایہ ممالک ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر اپنے عوام کی فلاح و بہبود کیلئے

Marfat.com

تعاون کر رہے ہیں' قریباً دنیا کے ہر خطے میں ہمسایہ ممالک نے اپنے اقتصادی معاملات سدھارنے اور ایک دوسرے کے وسائل سے فائدہ حاصل کرنے کیلئے مشترکہ مفادات کی تنظیمیں بنا رکھی ہیں' اس دوڑ میں "سارک" بھی متحرک ہوا اور محض دو ممبر ممالک کے آپس کے اختلافات کا خمیازہ جنوبی ایشیاء کے کروڑوں عوام کو نہ بھگتنا پڑے' کیونکہ سارک میں صرف پاکستان اور بھارت شامل نہیں بلکہ اس میں بھوٹان' سکم' نیپال' سری لنکا' مالدیپ اور بنگلہ دیش بھی شامل ہیں۔ عوامی فلاح و بہبود کے درجنوں منصوبے جو سارک نے تیار کئے ہیں' ان پر محض اس لئے عمل درآمد نہیں ہو سکتا کہ اس کے دو بڑے ممبران ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

حیرت اور دکھ کی بات تو یہ ہے کہ آج تک ان ممالک کے درمیان موجود تجارتی معاہدوں پر بھی اس لئے عمل درآمد نہیں ہو سکا کہ اس کے دو بڑے ممبران ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے۔ حال ہی میں بھارت اور پاکستان کے درمیان نرم ترجیحی تجارت کے اقدامات (PTA) اور فری ٹریڈ ایگریمنٹ یعنی (FTA) پر بھی قابل ذکر پیش رفت ہوئی ہے۔

اس کے علاوہ سروس بحال کرنے اور فضائی حدود استعمال کرنے کے معاہدے پر بھی پیش رفت ہوئی ہے۔

بھارت کی طرف سے 18 اور 19 دسمبر کو ٹرین کا رابطہ بحال کرنے کیلئے پاکستان کو مذاکرات کی دعوت دی گئی ہے اور امید کی جانی چاہئے کہ کم از کم دونوں ممالک کے شہ دماغ ان تاریخوں کو یہ خوش خبری ضرور سنا دیں گے' تا کہ برصغیر کے لاکھوں بدقسمت عوام' جن کا اس کے علاوہ اور کوئی گناہ نہیں کہ سرحد کے دونوں اطراف ان کی رشتہ داریاں موجود ہیں' سکھ کا سانس لے سکیں' کیونکہ ان پر دونوں ممالک میں آنے جانے کے دروازے بند کر دیئے گئے تھے۔

واہگہ اور امرتسر کے درمیان ریل اور سڑک کا مضبوط سلسلہ موجود ہے لیکن سرحدی پھاٹک پر 50 گز کا فاصلہ طے کرنے کیلئے دونوں شہروں کے لوگوں کو پہلے دبئی جانا پڑتا تھا' جس کے بعد کوئی اور راہ نکلتی تھی۔ دونوں ممالک کے درمیان لیڈرشپ کی فراخدلی سے جو بس سروس شروع ہوئی ہے۔ اس بس میں سوار ہونے کیلئے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں' شاید دنیا بھر میں ایسی کوئی مثال نہ مل سکے' جہاں ایک دوسرے ملک کے مجبور اور بے بس شہریوں کو ایک دوسرے کے پاس آنے جانے کیلئے ان ناروا پابندیوں سے گزرنا پڑتا ہو۔

کیا برصغیر کے کروڑوں عوام کا یہی مستقبل ہے؟ اگر پاکستان یا بھارت کا کوئی بھی شہری چند منٹ کیلئے غیر جانبدار ہو کر سوچے تو اس پر ساری صورت حال روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی' زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ صدر جنرل پرویز مشرف کی مثال ہی کافی ہے۔

صدر مشرف اور وزیراعظم جمالی نے بھارت سے پہلے سیز فائر پھر فضائی حدود کھولنے کی پیشکش کر کے جس فراخدلی کا مظاہرہ کیا' اس نے دونوں ممالک کے درمیان تناؤ میں کتنی کمی کر دی۔ صدر مشرف نے بی بی سی پروگرام میں لوگوں کے سوالات کے جوابات دیتے ہوئے بھارت کو پیشکش کی کہ وہ اپنی فوج کنٹرول لائن سے ہٹائے' پاکستان اگلے ہی لمحے اپنی فوج ہٹا لے گا۔ انہوں نے کھوکھراپار اور مظفرآباد سے بھی سرحد کھولنے کی پیشکش کو دہرایا ہے۔ پی آئی اے نے اپنی پروازیں دلی کے علاوہ بھارت کے دوسرے شہروں تک بڑھانے کی پیشکش کی ہے' جس کے جواب میں بھارت کی طرف سے صرف ٹرین سروس پر مذاکرات کی دعوت ملی ہے' حالانکہ پاکستان ٹرین سروس شروع کرنے کی متعدد مرتبہ پیشکش

Marfat.com

کر چکا ہے۔

بھارت سے متعلق پاکستانی قیادت کے رویے میں اس انقلابی تبدیلی اور اتنی بڑی پیشکش کے بعد یہ امید کی جا رہی ہے کہ بھارت بھی بڑا ملک ہونے کے ناطے زیادہ فراخدلی کا مظاہرہ کرے گا لیکن اس کے جواب میں جب بھارتی اعلیٰ قیادت ایسے اقدامات کو پاکستان کی کمزوری اور عالمی دباؤ کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے دراندازی کی تکرار کے الزامات بھی عائد کرتی رہے' تو اس کا کیا مطلب کیا جائے؟ کیا ایسے غیر ذمہ دارانہ بیانات کو صرف ''پریشر ٹیکٹکس'' کہہ کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟ یا یہ ڈپلومیسی کی کوئی قسم ہے؟ یا پھر پاکستان کو یہ باور کروانے کی کوشش کہ بھارت اس کے ان اقدامات کو پاکستان کی فراخدلی کے بجائے اپنی برتری سمجھتا ہے۔

اس پریشان کن صورت حال سے کیسے بچا جائے؟ کیونکہ بھارت کسی بھی معاملے میں ثالث کے کردار کو پسند نہیں کرتا' جب پاکستانی حکومت بھارت کی تجویز پر صاد کرتے ہوئے مظفر آباد سری نگر بس سروس کیلئے رضامندی ظاہر کرتی ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ کسی ممکنہ قیامت سے بچنے کیلئے اس سروس کی نگرانی یو این او کے مبصرین کریں' تاکہ دونوں ممالک کو ایک دوسرے کے خلاف الزامات لگانے کا موقع نہ ملے تو بھارت اسے بھی اپنے معاملات میں مداخلت سمجھتا ہے۔

پاکستان کے ساتھ فضائی' ریلوے' سرحدی پیدل رابطے بھارت نے منقطع کئے تھے۔ پاکستان نے ایسا نہیں کیا تھا۔ پاکستان کی طرف سے تو گزشتہ دو سال سے درجنوں مرتبہ انہیں بحال کرنے کی پیشکش کی جا چکی ہے لیکن بھارت نہیں مانتا تھا۔ پاکستان نے فضائی رابطوں کی بحالی کے وقت اگر یہ ضمانت مانگ لی کہ بھارت آئندہ یک طرفہ طور پر ایسا نہ کرنے کی ضمانت دے تو یہ بالکل اصولی بات تھی لیکن بھارت نے اس سے بھی انکار کر دیا۔ اس کے باوجود پاکستان محض حالات نارمل کرنے اور دونوں ممالک کے عوام کی بہبود کیلئے اپنے اس اصولی مؤقف کو بھی چھوڑنے کیلئے تیار ہو گیا اور صدر جنرل مشرف نے حیرت انگیز طور پر بھارتی تاجروں کے وفد سے گفتگو کرتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ پاکستان فضائی رابطے بحال کر رہا ہے اور بھارتی وفد چاہے تو پاکستانی فضا سے گزر کر بھارت جا سکتا ہے۔

ایسی فراخدلانہ پیشکش کے بعد بھی پاکستان کی نیت پر شک کرتے رہنا اور دراندازی کی مسلسل تکرار کرتے رہنا آخر کہاں کا انصاف ہے؟ اس مرحلے پر جب کہ دونوں ممالک کی اعلیٰ قیادتیں ایک دوسرے سے ملاقات کیلئے بہتر ماحول پیدا کر رہی ہیں' اس نوعیت کے اشتعال انگیز بیانات کا متعلقہ ملک کو نوٹس لینا چاہئے' کہیں ایسا نہ ہو کہ دونوں ممالک کے تعلقات میں پیدا ہونے والی بہتری کسی ایک شخص کے تعصب کی بھینٹ چڑھ جائے۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان یوں تو طویل عرصے سے حالت جنگ کی سی صورت حال رہی ہے لیکن گزشتہ دو ڈھائی سال میں دونوں ممالک کے درمیان جو شدید تناؤ دیکھنے میں آیا' اس کی وجہ صرف دسمبر 2001ء میں بھارتی پارلیمنٹ پر ہونے والا دہشت گردوں کا حملہ نہیں' کیونکہ پاکستان متعدد مرتبہ اس سے انکار کر چکا ہے اور جنرل مشرف کی طرف سے انتہا پسندوں اور دہشت گردوں پر لگائی جانے والی پابندیاں خصوصاً دہشت گردی کے خلاف ہونے والی جنگ میں ان کا کردار کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ اب تک پاکستان میں کئی جماعتوں پر پابندی لگ چکی ہے۔ ان حالات میں یہ امید کرنا کہ پاکستان اپنے ملک کی کسی انتہا پسند تنظیم سے بھارتی پارلیمنٹ پر حملہ کروائے گا' مناسب نہیں ہے۔

Marfat.com

پاکستان اور بھارت کے درمیان تناؤ کی جو موجودہ صورت حال ہے اس کے ڈانڈے دراصل امریکہ میں ہونے والی دہشت گردی سے ملتے ہیں۔ جب امریکہ پر دہشت گردوں کا حملہ ہوا اور اس کی طرف سے انتہائی شدید رد عمل سامنے آیا تو بھارتی قیادت نے اسے اپنے حق میں استعمال کرنے کیلئے جارحانہ حکمت عملی اپنائی اور اچانک بھارت کی طرف سے یہ واویلا شروع ہو گیا کہ وہ بھی دہشت گردی کا شکار ہے اور یہ دہشت گردی اس کے خلاف پاکستان کو کروا رہا ہے۔ بھارت نے کشمیر میں جہاد کرنے والوں کو دہشت گرد قرار دیکر انہیں پاکستان کے کھاتے میں ڈال دیا۔

بھارت کی طرف سے پاکستان کے خلاف دہشت گردی کے اس پراپیگنڈہ کو اس لئے بھی پذیرائی نہ مل سکی کہ پاکستان نے جس طریقہ سے گزشتہ کچھ عرصہ میں دہشت گردی کے خلاف اقدامات کئے ہیں امریکہ بھی نہیں دنیا بھر کے تمام قابل ذکر حکومت اور لیڈر پاکستان کے اس کردار کو سراہتے رہے۔ امریکی صدر اور امریکی زعماء کی طرف سے متعدد مرتبہ پاکستان کو دہشت گردوں کے خلاف جنگ کی تعریف کی ہے اور پاکستان کا عالمی سطح پر اقرار بھی کیا گیا ہے۔

یہ صورت حال بھارت کیلئے پریشان کن تھی کیونکہ وہ پاکستان پر دہشت گردی کا لیبل چسپاں کروانے کے بعد پاکستان سے اس سلوک کا متمنی تھا جو امریکہ نے افغانستان اور عراق سے کیا ہے اپنے مؤقف میں شدت پیدا کرنے اور خود کو صحیح ثابت کرنے کیلئے بھارت کی طرف سے یکے بعد دیگرے ایسے اقدامات کئے گئے جن سے پاکستان کی دہشت گردی ثابت ہو سکے۔ ان میں پارلیمنٹ پر حملہ پھر سری نگر اسمبلی پر حملہ اور اس سے بھی پہلے بھارتی جیلوں سے مجاہدین کی رہائی ایسے اقدامات دیکھنے میں آئے۔

عین ممکن تھا کہ بھارت کو اس میں کامیابی بھی حاصل ہو جاتی لیکن پاکستان کی طرف سے امریکی اعتماد پر پورا اترتے رہنے کی وجہ سے بھارت مطلوبہ نتائج حاصل نہ کر سکا۔ جس کے بعد بھارتی قیادت نے پاکستان کو طالبان سے نتھی کرنے اور کشمیر میں طالبان کے ذریعے دہشت گردی کروانے سے کئی جعلی منصوبوں کا انکشاف بھی کیا لیکن ایسے خود ساختہ ثبوت عالمی سطح پر چیلنج نہیں کئے جاتے۔ صدر جنرل پرویز مشرف اور بھارتی وزیراعظم کے درمیان آگرہ کی کامیابی صورت حال کو ناکامی میں بدلنے کیلئے مشترکہ ڈرافٹ میں آخری موقع پر بھی پاکستانی دراندازی کے الفاظ اسی لئے شامل کئے گئے تھے کہ پاکستان اس الزام سے بچ نہ پائے حالانکہ تمام معاملات پر اصولاً اتفاق ہو چکا تھا اور معاہدہ لاہور کے بعد خاصی پیشرفت بھی اسی سلسلے میں ہوئی تھی کہتے ہیں پاکستان دشمن لابی جس نے بھارتی قیادت کے گرد مضبوط گھیرا ڈال رکھا ہے حرکت میں آئی اور صدر مشرف کا دورہ ناکام بنا دیا جس کی کامیابی سے بہت سی توقعات وابستہ کی جا رہی تھیں۔

صدر مشرف کے دورہ آگرہ کے بعد سے بھارتی رویہ میں روز بروز سختی آتی گئی جس کا ڈراپ سین بھارتی پارلیمنٹ پر دہشت گردوں کا حملہ تھا جس کے بعد سے بھارت کا رویہ پاکستان کے ساتھ خطرناک حد تک بگڑ گیا اور بھارت کی طرف سے اچانک پاکستانی سرحدوں پر لاکھوں افواج کا اجتماع اور ''حالت جنگ'' کی کیفیت نے ایک مرتبہ تو برصغیر کو آتش فشاں کے دھانے پر پہنچا دیا تھا جس کو پاکستانی قیادت کی طرف سے کمال ضبط اور جنگ کو ٹالتے رہنے کی حکمت عملی نے بالآخر بھارت کو اپنی افواج سرحد سے واپس بھیجنے پر مجبور کر دیا جو پاکستان کی زبردست اخلاقی اور سفارتی فتح ہے کیونکہ پاکستان نے گولی چلائے بغیر جنگ جیت لی تھی۔

Marfat.com

اس دوران پاکستان سے یہ قابل ذکر بین الاقوامی فورم پر بھارت سے اس تعلقات کی خواہش کو دہرایا۔ بھارت کو کئی مرتبہ مذاکرات کی پیشکش کی اور آپس میں مل بیٹھ کر مسائل کا حل نکالنے کی دعوت دی گئی لیکن بھارت کی انتہا پسند قیادت کی طرف سے اس پیشکش کا کوئی مثبت جواب نہیں ملا۔

پاکستان کی طرف سے عالمی سطح پر پوزیشن مضبوط کرنے کے بعد بھارت پر پاکستان سے تعلقات بحال کرنے کیلئے دباؤ ڈالا گیا خصوصاً اس میں امریکہ، روس نے صدر مشرف کے خلوص نیت کا صدر پوٹن کو بھی قائل کر دیا اور یہ کہا جا رہا ہے کہ اس کانفرنس کے موقعہ پر صدر مشرف اور صدر پوٹن کے درمیان ہونے والی اہم ملاقات جس میں صدر مشرف نے انہیں پاکستان کے مئوقف سے آگاہ کرنے کے بعد بھارت کے ساتھ تعلقات نارمل کرنے کی خواہش کو نہ صرف دھرایا بلکہ اس ضمن میں صدر پوٹن کو بھی بھارت اور پاکستان کا مشترکہ دوست ہونے کے ناطے ان کی اخلاقی ذمہ داری کا احساس دلایا اور صدر پوٹن سے کہا کہ وہ بھارت کو بات چیت پر آمادہ کریں جس کے بعد سے صدر پوٹن نے بھی بھارت پر اس سلسلے میں اپنا اثر ورسوخ استعمال کیا۔

صدر جنرل مشرف پر عالمی طاقتوں کی طرف سے بھارتی پروپیگنڈہ یا کسی اور وجہ سے دباؤ شدت اختیار کر رہا تھا کہ پاکستان کشمیر میں دراندازی بند کروائے۔

حکومت پاکستان کا اس سلسلے میں یہ مؤقف تھا کہ جب بھارت کی سات لاکھ فوج اس دراندازی کو نہیں روک سکتی تو پاکستان کے لیے یہ کیسے ممکن ہے؟ جبکہ پاکستانی حکومت نے امریکہ اور دنیا کے دیگر ممالک کو اس بات کی متعدد مرتبہ یقین دہانی کروادی تھی کہ پاکستان کی طرف سے دراندازی کی مستقل حوصلہ شکنی کی جا رہی ہے۔

جدید دنیا میں جب کہ امریکہ اپنے حساس ترین سیٹ لائٹ سسٹم کے ساتھ پاکستان کے سر پر بیٹھا ہے کم از کم اس مسئلے میں امریکہ کی آنکھوں میں دھول جھونکی جا سکتی کیونکہ زمین پر ہونے والی معمولی نقل وحرکت بھی امریکہ نوٹ کر سکتا ہے۔ امریکی حکام نے شاید اپنے طور پر پاکستان کے دعوے کی اس حقیقت کو چیک بھی کیا اور انہیں صدر مشرف کی بات سچ دکھائی دی یہی وجہ ہے کہ پاکستان پر بھارتی خواہشات کے مطابق پابندیاں عائد نہیں کی گئیں ورنہ تو عراق میں پاکستانی فوج نہ بھیج کر پاکستان نے امریکہ کی اچھی خاصی ناراضی مول لے رکھی ہے یوں بھی اپنے تجارتی مفادات کے پیش نظر امریکہ بھی بھارت کے مطابق میں خواہ مخواہ نہ تو پاکستان کی حمایت کرتا ہے اور نہ ہی بھارت کو ناراض کرنے کا خطرہ مول لے سکتا ہے لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ بھارت کی طرف سے ابھی تک دراندازی کا پروپیگنڈہ جاری ہے۔ جو صورت حال کو منوانے کے بجائے صرف بگاڑنے کی کوشش بھی ہوسکتی ہے۔

بھارت اور پاکستان دونوں یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کی طرف سے کیا گیا کوئی بھی اچھا اقدام برصغیر کے کروڑوں عوام کی قسمت بدل سکتا ہے۔ وزیر اعظم جمالی کی طرف سے سیز فائر کے اعلان کے بعد 198 کلومیٹر طویل بین الاقوامی سرحد 778 کلومیٹر طویل کنٹرول لائن اور 150 کلومیٹر طویل ''اے جی پی'' لائن کے دونوں اطراف آباد لاکھوں بے گناہ شہریوں نے سکون کا سانس لیا ہے اگر ٹرین کی آمدورفت کا سلسلہ شروع ہوجائے تو ایک ماہ میں ایک محتاط اندازے کے مطابق 70 تا 60 ہزار دونوں ممالک کے شہریوں کو سفر کرنے کی سہولت میسر آتی ہے۔ صدر جنرل پرویز

Marfat.com

مشرف کی پیشکش پر اگر بھارت بھی فراخدلی کا مظاہرہ کرے تو کھوکھرا پار کی سرحد سے جو 1965ء تک کھلی ہوئی تھی سندھ میں آباد ہزاروں ہندو خاندان جن کی رشتہ داریاں آر پار موجود ہیں آسانی سے آ جاسکیں گے۔ اسی طرح کراچی' حیدر آباد اور سندھ کے دوسرے شہروں کے ہزاروں منقسم خاندانوں کو سکھ کا سانس آ جائے گا۔ محض یہ کہہ دینا کہ سرحدیں کھلنے سے دہشت گردی کے امکانات بڑھ جائیں گے ٹھیک نہیں۔ دونوں ممالک اپنا مضبوط انٹیلی جنس سسٹم رکھتے ہیں اور اپنی ایک دوسرے کے شہریوں کو چیک کرنے کا بھی خاصا طویل تجربہ ہے یوں بھی صرف امکانات پر کروڑوں عوام کا سکھ چین داؤ پر نہیں لگایا جاسکتا۔

پاکستان کی طرف سے کشمیر سے فوجیں ہٹانے کی تجویز پر امید تو یہی کی جاتی تھی کہ بھارت مثبت ردعمل کا مظاہرہ کرے گا اور فوری طور پر نہ سہی تو بھی کسی نہ کسی حد تک فوجوں کی واپسی کا عمل شروع ہو جائے گا لیکن یہاں بھی بھارت نے اپنی روایتی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا اور بھارتی وزیر مملکت برائے امور خارجہ امور دگو سے سنگھ نے بھارتی لوک سبھا میں سوالات کے جوابات دیتے ہوئے کہا کہ جموں کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے اس روز بھارتی وزارت خارجہ کے ترجمان نے دونوں ممالک کے کوسٹ گارڈز کے درمیان ہاٹ لائن قائم کرنیکی تجویز دی ہے تا کہ سمندری حدود کی خلاف ورزی اور آئے دن دونوں ممالک کے ماہی گیروں کی گرفتاریوں کے مسئلے کا بھی حل نکالا جا سکے۔ پاکستان نے ان تجاویز کا خیر مقدم کیا ہے اور یہ امید کی جانی چاہئے کہ یکم جنوری کے بعد سے دونوں ممالک اس ضمن میں بھی کسی معاہدے پر پہنچ جائیں گے اور دونوں کی سمندری حدود محفوظ ہونے ایک دوسرے سے تعاون کی ضرورت میں غریب ماہی گیر بھی سکون کا سانس لیں گے جنہیں اچانک اس بات کا علم ہوتا تھا کہ وہ دوسرے ملک کی حدود سے مچھلیاں پکڑ رہے ہیں اور کئی کئی مہینے جیلوں میں کاٹنے پڑتے تھے یہ تجویز سامنے آئی ہے کہ یکم جنوری سے پاکستان میری ٹائم ایجنسی اور بھارتی کوسٹ گارڈز کے درمیان ہاٹ لائن قائم کردی جائے اور دونوں اداروں کے سربراہ سال میں دو مرتبہ باقاعدہ ملاقات کیا کریں۔ ان تجاویز پر عملدرآمد سے یہ امید پیدا ہونے لگی ہے کہ جب بھارتی وزیراعظم مسٹر واجپائی سارک کانفرنس میں شرکت کیلئے پاکستان آئیں گے تو دونوں ممالک کے درمیان شدید تناؤ ختم ہو چکا ہوگا اور عین ممکن ہے جب ایسے ماحول میں دونوں ممالک کے وزرائے اعظم ملیں گے تو سربراہی ملاقات یا پھر کشمیر پر گفت و شنید کو آگے بڑھانے کی پیشرفت بھی ممکن ہو۔

جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے گزشتہ دو ماہ میں پاکستان نے بھارت کے ساتھ اپنے تعلقات نارمل کرنے کیلئے ہر ممکن مراعات کا اعلان کردیا ہے۔ نومبر کے آخری ہفتے میں پاکستان آنے والے امریکی وفد اور حال ہی میں ہیلری کلنٹن اور دوسرے سینیٹرز کی صدر مشرف سے ملاقات کے بعد سے پاکستانی حکومت نے عسکری اور مذہبی تنظیموں کا جو انتہا پسندی کے زمرے میں آتی ہیں سخت محاسبہ کیا ہے۔ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق آزاد کشمیر میں کالعدم مذہبی اور عسکری تنظیموں کے خلاف 3 دسمبر کی شام سے زبردست آپریشن شروع کردیا گیا ہے حساس اداروں کے سربراہوں اور مقامی انتظامیہ کے درمیان مشاورت کے بعد سے شروع ہونے والے اس آپریشن کے بعد تقریباً ہر قابل ذکر عسکری اور مذہبی تنظیم کے دفاتر سیل کر کے ان کا ریکارڈ قبضے میں لے لیا گیا ہے اور ان کے کارکنوں کی گرفتاری کا سلسلہ جاری ہے۔ اس مہینہ پاکستان کی طرف سے ہونے والے اقدامات سے مجاہد تنظیموں میں حکومت کے خلاف بڑا غم وغصہ پایا جاتا ہے کیونکہ مجاہدین کے لیڈر

Marfat.com

حکومت سے کہہ چکے ہیں کہ وہ ان کے ہاتھ پاؤں باندھ کر بھارت کے سامنے نہ پھینکے عین ممکن ہے کہ اس کے بعد ان تنظیموں کا سخت ردعمل بھی سامنے آئے اور پاکستان کیلئے مزید داخلی مشکلات کھڑی ہو جائیں لیکن پاکستانی حکومت نے اپنی بین الاقوامی ساکھ بحال کرنے خصوصاً امریکہ اور یورپی ممالک کی طرف سے ہونے والے مسلسل مطالبات کے بعد اس سلسلے میں انقلابی فیصلے کر لئے ہیں۔

پاکستان کی طرف سے کئے جانے والے ان اہم فیصلوں اور اقدامات کو تب ہی پذیرائی مل سکتی ہے اور ان کے ثمر آور نتائج تب ہی برآمد ہو سکتے ہیں جب امریکہ اور دوسری عالمی قوتیں بھارت کو بھی پاکستان کی طرح ایسے اقدامات پر مجبور کریں اور اب وقت آ گیا ہے کہ امریکہ اور دوسرے اہم ممالک طرف تماشائی کا کردار ادا کرنے کے بجائے مسئلہ کشمیر کے حل کیلئے اپنا بھرپور کردار ادا کریں۔

اس تلخ حقیقت کو تو فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ 80 ہزار کشمیری اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر چکے ہیں ہزاروں عصمتیں لٹی ہیں اور ہزاروں کشمیریوں کو ظلم وستم کا نشانہ بنایا گیا اور یہ سلسلہ ابھی تک پوری شدت سے جاری ہے اگر عالمی طاقتوں نے اس کا نوٹس نہ لیا اور بھارت کا ہاتھ نہ روکا تو ان اقدامات کے نتیجہ خیز ہونے کے امکانات معدوم ہو جائیں گے۔

12 ویں سارک سربراہ کانفرنس سے ایک مرتبہ پھر برصغیر پاک و ہند اور جنوبی ایشیا کے دیگر ممالک کے کروڑوں عوام نے امیدیں وابستہ کر لی ہیں اور یہ امید کی جا رہی ہے کہ اس مرتبہ نتائج توقعات کے مطابق برآمد ہوں گے اور سارک کے ذریعے اس خطے کے عوام کی تعلیمی، اقتصادی، ثقافتی اور صحت عامہ کی حالت میں بہتری آئے گی اور سارک کی روح کو برقرار رکھتے ہوئے تعاون اور دوستی کی نئی راہیں کھلیں گی۔

(روزنامہ جنگ سنڈے میگزین 14 دسمبر 2003ء مصنف طارق اسمٰعیل ساگر)

سارک سربراہ کانفرنس کو کامیاب بنانے کیلئے وزیراعظم ظفر اللہ خان جمالی کا 23 نومبر کا یکطرفہ اعلان فائر بندی بڑا بروقت اور برمحل رہا۔ بھارت نے لائن آف کنٹرول پر فائر بندی کے اعلان کا مثبت جواب دیا۔ 23 نومبر سے اب تک مقبوضہ کشمیر میں لائن آف کنٹرول پر فائر بندی موثر رہی۔ اس سے ثابت ہوتا تھا کہ بھارت اور پاکستان کی حکومتیں اگر چاہیں تو صلح صفائی، امن و آشتی کے ماحول کو برقرار رکھا جا سکتا تھا۔ اسلام آباد کانفرنس کو نتیجہ خیز بنانے کیلئے صدر جنرل پرویز مشرف کا اعلان بے حد حوصلہ افزا رہا۔ صدر پرویز مشرف نے کہا کہ پاکستان کشمیر پر اپنے دیرینہ موقف میں لچک لانے پر تیار ہے اگر اس سے پاک بھارت مذاکرات کی بحالی میں مدد مل سکے۔ یوں دکھائی دیتا تھا کہ زمینی اور فضائی رابطوں کی بحالی کے فیصلوں سے دلوں کی کدورتوں میں خاصی کمی آئی ہے۔ مقبوضہ کشمیر کے مستقبل اور کشمیریوں کی حالت زار پر گزشتہ نصف صدی سے ماتم کناں انجمنوں اور نوحہ خوانوں نے ان فارمولوں کو منظر عام پر لانا شروع کر دیا تھا جن کے بارے میں خوش فہمی تھی کہ یہ ان فارملوں اور مصالحتی پیشکشوں میں سے کوئی ایک مظلوم کشمیریوں کی تکالیف کا مداوا بن سکتا تھا۔

مسئلہ کشمیر کے حل کیلئے کم وبیش 34 حل یا فارمولے اب تک پیش کئے جا چکے تھے۔ ان فارمولوں کی ابتدا اقوام

Marfat.com

متحدہ کے خصوصی نمائندہ سراداین ڈکسن نے کی تھی۔اوداین ڈکسن کشمیر کو مذہبی اورلسانی اکائیوں میں بانٹنے کے حامی تھے۔ کشمیر پر ٹریک ٹو ڈپلومیسی کے شرکاء نے دریائے چناب کو تقسیم ریاست کی بنیاد قرار دینا چاہا تھا۔اقوام متحدہ کی قراردادوں کے حوالے سے کشمیری اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرنے کا حق رکھتے ہیں۔علی گڑھ یونیورسٹی کے سابق چانسلر پروفیسر خسرو نے کشمیر کو وادی (مسلم اکثریت) جموں (ہندو اکثریت) اور لداخ (بدھ مت کے پیروکار) پر مشتمل تین خودمختار خطوں میں تقسیم کرنے کا منصوبہ دیا۔معاہدہ شملہ میں استصواب رائے کا حق تسلیم کرنے کی بات کہی گئی۔سابق صدر بل کلنٹن پورے جموں و کشمیر کو ایک قطعی خودمختار ریاست کا درجہ دینے کے حامی تھے۔ان کا خیال تھا کہ خودمختار کشمیر پاکستان اور بھارت دونوں کیلئے Face-Saving کا باعث بن سکتا ہے۔اس پوری مدت میں بھارتی حکومت نے سات لاکھ سے زائد مسلح افواج وادی میں تعینات رکھیں۔قتل و غارت کا بازار گرم کئے رکھا۔دس لاکھ سے زائد کشمیری جام شہادت نوش کر چکے۔ کشمیری کی عزت و ناموس کی دھجیاں برسر عام اڑائی گئیں۔ان کی املاک و کاروبار' اثاثوں کو جلا کر خاکستر کر دیا گیا۔ 1999ء میں حکومت پاکستان نے اقوام عالم کی بے حسی سے تنگ آ کر کارگل میں محاذ آرائی اختیار کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسئلہ کشمیر ایک بار پھر عالمی ایجنڈے پر آ گیا اب اگر بعد از خرابی بسیار پاکستان اور بھارت بارود کے اس سلگتے ہوئے ڈھیر کو خاموش کرنے کی فکر کر رہے تھے تو یہ انسانیت اور عالمی امن کیلئے ایک بڑی خوشخبری تھی۔مغربی طاقتوں نے احساس کر لیا تھا کہ وہ عراق' اسرائیل' فلسطین' شمالی کوریا' ایران' لیبیا اور شام کے ساتھ چومکھی لڑتے ہوئے جنوبی ایشیا میں کشیدگی کی متحمل نہیں ہو سکتی۔یہ بات اب کوئی راز نہیں رہی کہ پاکستان اور بھارت نے کشیدگی کو کم از کم حد تک لانے کا فیصلہ مغربی طاقتوں کے سمجھانے بجھانے پر کیا۔اب یہی محرکات اور عوامل مسئلہ کشمیر پر ایک وسیع البنیاد سمجھوتے کی داغ بیل ڈال سکتے تھے۔

▪▪▪

2004ء کا آغاز خاصا خوشگوار تھا۔جنوری میں سارک کانفرنس اور 6 جنوری کو صدر جنرل پرویز مشرف اور بھارتی وزیراعظم واجپائی کی ایوان صدر میں ملاقات اور مشترکہ اعلامیہ ایک بڑا بریک تھرو تھا کیونکہ اب تک مسٹر واجپائی پاکستان سے بات کرنا ہی گوارہ نہیں کرتے تھے۔سارک کانفرنس کے خاتمے پر میں نے ایک مضمون بعنوان ''کریڈٹ عوام کو جاتا ہے'' لکھا۔ملاحظہ فرمائیں:

سارک کانفرنس کے اختتام پر پاک بھارت تعلقات کے حوالے سے جاری ہونے والے اسلام آباد اعلامیہ نے بلاشبہ جنوبی ایشیا میں موجود بے پناہ تناؤ کو قریباً ختم کر دیا ہے اور عالمی سطح پر پاک بھارت تعلقات کے حوالے سے تشویش ناک صورت حال ختم کرنے کیلئے راہیں ہموار کر دی ہیں۔سارک کانفرنس پر بھارتی وزیر خارجہ یشونت سنہا اور وزیراعظم واجپائی کے مشیر خاص برجیش مشرا اور پاکستان کی طرف سے وزیر خارجہ خورشید قصوری نے جب اخبار نویسوں سے خطاب کیا تو ان سے بطور خاص یہ درخواست کی تھی کہ وہ پاکستان اور بھارت کے درمیان تعلقات میں پیدا ہونے والی بہتری کو میڈیا کی بھینٹ نہ چڑھنے دیں اور ایسے متنازعہ یا تکلیف دہ سوالات سے اجتناب برتیں' جس سے بعد از خرابی بسیار پیدا ہونے والی خوشگوار صورت حال کے بگڑنے کا اندیشہ ہو۔

میڈیا سے اس نوعیت کی اپیلیں عموماً اس سطح کی کانفرنسوں میں نہیں کی جاتیں' نہ ہی ماضی میں کوئی ایسی مثال

Marfat.com

موجود ہے' لیکن بطور خاص یہ اپیلیں اس لئے کی گئی تھیں کہ دونوں ممالک کے تعلقات کے بگاڑ میں انتہا پسندی کا نمایاں حصہ رہا ہے' خصوصاً بھارتی پریس میں موجود ایک خاص ذہنیت رکھنے والے میڈیا مین ہمیشہ بات کا بتنگڑ بناتے رہے ہیں اور صورت حال کو اپنی مخصوص عینک سے دیکھ کر اپنی مرضی کے نتائج مرتب کرنے کے بعد انہیں دوسروں پر ٹھونسنے کے متمنی رہتے ہیں۔ ایسے لوگ پاکستان میں بھی موجود ہیں جو صورت حال کو ایک مخصوص انداز سے دیکھتے اور اپنی مرضی کے نتائج عوام تک پہنچاتے ہیں۔ اس طرح جو غلط فہمیاں جنم لیتی ہیں' ان کا ازالہ کاردارد ہوتا ہے۔

صدر جنرل پرویز مشرف نے سارک کانفرنس کے آخری روز پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے ایک بھارتی صحافی کے سوال کے جواب میں بھارتی پریس سے اپیل کی تھی کہ وہ ذمہ دارانہ رویے کا مظاہرہ کرے اور بہتر ہوتے تعلقات کو بگاڑنے کے بجائے مزید بہتر کرنے کیلئے اپنی صلاحیتیں وقف کردے۔ جنرل پرویز مشرف نے بطور خاص یہ بات بھی کہی کہ مذاکرات کے نتیجے میں جاری ہونے والا مشترکہ اعلامیہ دونوں طرف موجود امن پسندوں کی فتح ہے۔ اسے کسی حکومت کی فتح یا شکست قرار دینا غلط ہوگا' کیونکہ دونوں ممالک کے درمیان تعلقات کی بحالی برصغیر کے عوام کا دیرینہ خواب ہے۔

سارک کانفرنس کے خاتمے کے بعد سے بھارت اور پاکستان دونوں اطراف کے پریس اور عوامی سطح پر بہت انقلابی تبدیلیاں دیکھنے کو ملی ہیں۔ اتحاد کی مثالوں کو چھوڑ کر بظاہر یہی دکھائی دے رہا ہے جیسے میڈیا نے اپنی ذمہ داری کا احساس کرلیا ہے اور وہ اشتعال انگیزی سے اجتناب برت رہا ہے۔ دونوں طرف سے یہ پرخلوص کوشش کی جارہی ہے کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان تعلقات میں جو بہتری پیدا ہوئی ہے' اسے نہ صرف برقرار رکھا جائے بلکہ مزید بہتر بنانے کی کوشش کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ تب سے اب تک دونوں ممالک کے ذمہ دار عہدیداروں کی طرف سے ایک دوسرے کے خلاف اشتعال انگیز زبان استعمال نہیں کی گئی' صرف بھارتی وزیر خارجہ یشونت سنہا حال ہی میں ڈاکٹر قدیر خان کی طرف سے ٹی وی پر آکر اپنی غلطی کا اقرار کرنے اور حکومت پاکستان کی طرف سے انہیں ''معافی'' دینے کے اقدام پر قدرے سخت ردعمل کا اظہار کیا اور کہا کہ یہ پاکستان کا ذاتی مسئلہ نہیں بلکہ بین الاقوامی مسئلہ ہے اور بھارت اس مسئلے کو ہر اہم فورم پر اٹھائے گا تاکہ آئندہ ہمیشہ کیلئے ایٹمی پھیلاؤ کا سدباب ہوسکے اور ان واقعات کا اعادہ نہ ہو۔

یہ بیان بھارتی وزیر خارجہ نے برطانوی وزیر خارجہ جیک اسٹرا کی بھارت آمد کے موقع پر ایک مشترکہ پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے ایک رپورٹر کے سوال کے جواب میں دیا تھا' جبکہ برطانوی وزیر خارجہ نے بڑے محتاط طرزعمل کا مظاہرہ کیا اور اس سلسلے میں کوئی سنجیدہ بات نہیں کی۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یشونت سنہا نے یہ بیان کسی وقتی جوش کے تحت دیا تھا' کیونکہ ان کے اس بیان کی بھارتی حکومت کے کسی بھی ذمہ دار نے نہ تو تائید کی اور نہ ہی اس معاملے کو آگے بڑھایا۔ اس بیان کے اگلے ہی روز پاکستانی وزارت خارجہ کے ترجمان مسعود خان نے بھارتی وزیر خارجہ کے اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے صرف یہی کہنے پر اکتفا کیا کہ بھارتی وزیر خارجہ اس طرح کے بیانات دے کر 16 تا 18 فروری کو ہونے والے پاک بھارت مذاکرات کو متاثر نہ کریں اور دونوں ممالک کے درمیان جو فضا بن رہی ہے' اسے برقرار رہنے دیں۔

Marfat.com

بھارتی حکومت کی طرف سے اس کے بعد سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی گئی' جبکہ اس کے تین چار روز بعد جب وزیر خارجہ خورشید محمود قصوری اور بھارتی مشیر خاص برجیش مشرا نے سلامتی کونسل کے اجلاس میں جو این پی ٹی کے حوالے سے منعقد ہوا تھا' ایک دوسرے کے خلاف ایک لفظ بھی پیش نہ کیا' بلکہ دونوں ممالک نے مشترکہ موقف اپناتے ہوئے کہا کہ وہ این پی ٹی پر دستخط نہیں کریں گے اور نہ ہی اپنے ایٹمی پروگرام کو بین الاقوامی ایٹمی کمیشن کیلئے اوپن کریں گے۔ اس موقع پر برجیش مشرا' یشونت سنہا اور خورشید قصوری کے درمیان امریکہ میں بڑے خوشگوار ماحول میں ملاقاتیں بھی ہوئیں اور سب نے آئندہ ہونے والے مذاکرات میں کامیابی کی امید بھی دلائی۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یشونت سنہا کی طرف سے ڈاکٹر قدیر کے حوالے سے دیئے گئے بیانات کو بھارتی حکومت اور ان کی اپنی پارٹی بی جے پی نے بھی تسلیم نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد ایل کے ایڈوانی' جارج فرنانڈس اور وزیراعظم واجپائی کی طرف سے پاکستان کیلئے مسلسل نیک خواہشات کا اظہار کیا جا رہا ہے اور خصوصاً ایل کے ایڈوانی جو اپنی پاکستان اور مسلم دشمنی کیلئے خاصی شہرت رکھتے ہیں' دونوں ممالک کے درمیان فروری میں ہونے والے مذاکرات سے بہت پرامید دکھائی دیتے ہیں اور ان کی طرف سے یہ امید بھی کی جا رہی ہے کہ اب دونوں ممالک کے درمیان وجہ نزاع بننے والا سب سے اہم مسئلہ کشمیر بھی حل ہو جائے گا۔

6 جنوری سے اب تک دونوں ممالک کے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا میں ایک انقلابی تبدیلی دیکھنے میں آ رہی ہے۔ بھارت کے وہ اخبارات' جن کی کوئی اشاعت پاکستان کے خلاف زہرافشانی کے بغیر شاید ماضی میں نامکمل سمجھی جاتی تھی' اب بہت محتاط ہو گئے ہیں۔ اگر انٹرنیٹ پر ان اخبارات کا مطالعہ کیا جائے تو ایک ماہ کے دوران رونما ہونے والی تبدیلی بڑی واضح دکھائی دے رہی ہے۔ بھارتی دارالحکومت دہلی سے چھپنے والے دو انگریزی اخبارات جو اکثر پاکستان مخالف مضامین اور کالموں سے بھرے ہوتے تھے۔ اب دونوں ملکوں کے درمیان بہتری کے اسباب پیدا کرنے والے مضامین اور معتدل مزاج دانشوروں کی تحریریں شائع کر رہے ہیں۔ یہی صورتحال بڑے واضح انداز میں بھارت کے علاقائی پریس میں دکھائی دیتی ہے۔

یکم فروری کو لاہور میں ہونے والی بین الاقوامی پنجابی کانفرنس پر بھارت سے جو پنجابی زبان کے لکھاری' دانشور' سیاستدان' سرمایہ کار اور صحافی پاکستان آئے' ان میں سے بہت سے لوگوں سے گفتگو کا بالمشافہ موقع ملا۔

لدھیانہ کے جگجیت سنگھ نے جو بھارتی پنجاب کی جانی پہچانی شخصیت ہیں' اس حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ سارک کانفرنس سے پہلے ہی بھارتی میڈیا میں خوشگوار تبدیلیاں دیکھنے میں آ رہی تھیں۔ اس کی وجہ ایک تو دونوں ممالک کے وزرائے اعظم کی طرف سے امن اور دوستی کی خواہشات اور پاکستانی وزیراعظم جمالی کی طرف سے یکطرفہ سیز فائر کا اعلان اور دوسرے اہم اقدامات تھے' جنہوں نے خصوصاً بھارت میں موجود انتہا پسند حلقوں کو حیران کر کے رکھ دیا' کیونکہ وہ اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتے ہیں کہ پاکستان' بھارت کو کشمیر پر کوئی رعایت دے گا' جبکہ پاکستان نے یکطرفہ جنگ بند کرنے کا اعلان کر دیا۔

سریندر سنگھ منگلا نے جو اس سے پہلے بھی پاکستان آ چکے ہیں' کہا کہ پاکستان اور بھارت کی حکومتیں تو شاید اپنے

Marfat.com

اپنے مؤقف پر قائم رہتیں لیکن دونوں ممالک کے عوام خصوصاً اہل قلم اور اداین جی اوز نے اس سلسلے میں ناقابل فراموش کردار ادا کیا ہے۔ سریندر سنگھ منگلا کا کہنا تھا کہ پاکستان اور بھارت دونوں میں بڑی تعداد میں انتہا پسند موجود ہیں' جو ایک دوسرے کا وجود بھی برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں تھے لیکن جس طرح پتھر پر پانی کی بوند مسلسل گرتے رہنے سے بالآخر اس میں سوراخ ہو جاتا ہے' بالکل اسی طرح گزشتہ تین سال سے دونوں اطراف کے امن پسند اور صلح جو دانشوروں کی کوششوں سے بالآخر دونوں ممالک کی حکومتیں بھی یہ محسوس کرنے لگی ہیں کہ دونوں ممالک کے عوام جنگ کے بجائے امن کے خواہاں ہیں اور عوامی احساسات اور قربانیاں ہیں' جنہوں نے دونوں ممالک کی حکومتوں کو اپنا دیرینہ مؤقف تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا۔ (روزنامہ جنگ سنڈے ایڈیشن 29 فروری 2004ء مصنف طارق اسمٰعیل ساگر)

فروری 2004ء میں امریکی ٹاسک فورس کی ایک چشم کشا رپورٹ منظر عام پر آئی جس میں پاکستان اور بھارت کے حوالے سے سفارشات اور لائحہ عمل بتایا گیا تھا۔ اس رپورٹ کا ترجمہ ابرار بختیار نے کیا۔ پاکستان اور بھارت سے متعلقہ مسئلہ کشمیر کے حوالے سے ٹاسک فورس کی رپورٹ میں لکھا گیا۔

کشمیر اور پاک بھارت کشیدگی کا حل:

اگست 1947ء میں جب برطانیہ نے اپنا بوریا بستر سمیٹا' تو کشمیر کا مستقبل غیر حل شدہ چھوڑ گیا' چند ماہ میں ہی برطانوی راج کے دونوں جانشین' پاکستان اور بھارت اس مسئلے پر لڑ بیٹھے۔ بعدازاں ایک سال سے زائد عرصے بعد یکم جنوری 49ء کو اقوام متحدہ کے تحت جنگ بندی عمل میں آئی۔ بھارت کے کنٹرول میں وادی کشمیر سمیت ریاست کا دو تہائی جنوبی حصہ رہا' جو تنازعے کی جڑ ہے۔ پاکستان کے پاس شمالی اور تہائی حصہ ہے۔ تقریباً 56 برس بعد بھی سیز فائر لائن' جسے لائن آف کنٹرول کا نام دے دیا گیا' پاکستان اور بھارت کے زیر کنٹرول علاقے کو تقسیم کرتی ہے اور کشمیر دونوں کے درمیان دشمنی کا اب بھی اصل سبب ہے۔ (پاکستان دو علاقوں کو کنٹرول کرتا ہے' ایک طویل پٹی' جسے آزاد کشمیر کہا جاتا ہے' جہاں لسانی طور پر پنجابی بولنے والوں کی اکثریت ہے اور مرکزی حکومت کے سخت کنٹرول میں نمائشی صوبائی درجہ حاصل ہے' دوسرا گلگت و ہنزہ کا شمالی علاقہ' جو براہ راست اسلام آباد کے ماتحت ہے۔ بھارت کے زیر اختیار علاقہ' جہاں منتخب جموں و کشمیر ریاستی حکومت ہے' یہ تین اضلاع پر مشتمل ہے' مسلم اکثریت کی وادی کشمیر ہندو اکثریت کے علاقے جموں اور بدھ اکثریت کے علاقے لداخ ہیں۔ ریاست کی کل آبادی تقریباً 16 ملین ہے' جب کہ اصل تنازع وادی کے کشمیری بولنے والے پانچ ملین افراد کے مستقبل کا ہے) اگر دونوں ملک ایک دوسرے کے ساتھ خوشگوار طور پر رہنے لگیں' تو وہ تنازع کشمیر حل کر لیں گے' خطرات کم ہو جائیں گے اور ایک دن کسی تصفیے پر پہنچ سکیں گے۔ ناسور بن جانے والی یہ دشمنی علاقائی استحکام کیلئے سب سے بڑا واحد خطرہ ہے۔ دونوں ملک ایٹمی طاقت ہیں اور ہیروشیما' ناگاساکی کے بعد ایٹم بم کے استعمال کا خدشہ حقیقی ہے۔

کشمیر پر تنازعے نے دونوں ملکوں میں مذہبی انتہا پسندی کو پروان چڑھایا ہے' جو اس کے مناسب حل کے بغیر جاری رہے گی' دونوں ملکوں کا سیاسی کلچر اس طرح بن گیا ہے کہ کشمیر کا مسئلہ انتہائی جذباتی ہو گیا ہے اور دونوں ریاستوں کی قیادت کیلئے یہ انتہائی دشوار ہے کہ وہ مسئلے کا کوئی ایسا حل پیش کریں' جو ایک دوسرے کیلئے بھی قابل قبول ہو۔ مسئلہ کشمیر کا

Marfat.com

حل نہ ہونا بڑی طاقت کا درجہ حاصل کرنے کی بھارتی خواہش' بنیادی اصلاحات کے حصول کی پاکستانی امیدوں اور مستحکم و پرامن جنوبی ایشیاء کے امریکی مفاد کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہے۔ حالیہ برسوں میں کشمیر سے متعلق امریکی پالیسی بحران سے محفوظ رہنے پر مرکوز رہی' واشنگٹن بحران سے نمٹنے کیلئے حرکت میں آیا کہ صورت حال ہاتھ سے نہ نکل جائے' جب جون' جولائی 99ء میں پاکستان نے کارگل کے قریب لائن آف کنٹرول عبور کرلی۔ دسمبر 2001ء میں جب بھارتی پارلیمنٹ پر دہشت گردوں نے حملہ کیا اور جب مئی 2002ء میں کشمیر میں بھارتی فوجی کیمپ پر حملے میں درجنوں عورتیں اور بچے مارے گئے۔

طویل بحث کے بعد ٹاسک فورس اس نتیجے پر پہنچی کہ پاک بھارت تنازعے کے پس منظر میں ایٹمی جنگ کے خدشات کے باعث مسئلے کے حل کیلئے صرف ''ردعمل میں اقدام'' کی امریکی سوچ نامناسب ہے' اسلام آباد اور دہلی اپنے اختلافات آپس میں حل کرنے کا خراب ریکارڈ رکھتے ہیں' اب بھی ایسا ہی ہے' ٹاسک فورس' پاک بھارت تنازعات کے حل اور ایک ایسے ماحول کی تیاری کی سفارش کرتی ہے' جو آگے چل کر مسئلہ کشمیر کے حل کا سبب بنے۔ اس کیلئے ٹاسک فورس ایسی امریکی پالیسی کی سفارش کرتی ہے' جو معاونت اور سہولت فراہم کرنے والی ہو' نہ کہ ثالث اور مصالحت کنندہ کی۔ اس سلسلے میں اسپیشل ورکنگ گروپ تشکیل دیا جائے' جو واشنگٹن میں جنوبی ایشیا کے معاملات سے متعلق لوگوں پر مشتمل ہو۔ اس کے دو مقاصد ہونے چاہئیں (1) ٹریک ٹو کشمیر ڈیویلپمنٹ اور نئی دہلی' سری نگر' اسلام آباد کے درمیان تبادلہ خیال۔

پاکستان اور بھارت میں امریکی چیفس آف مشنز اور دورے کرنے والے سینئر افراد کو آئیڈیاز' رہنما اصول اور ہدایات دی جائیں کہ اس مسئلہ پر معنی خیز پیش رفت کس طرح حاصل کی جاسکتی ہے۔

فوری طور پر امریکی ڈپلومیسی کا مقصد پاکستان و بھارت کے درمیان مذاکرات کا عمل شروع کرنے میں تعاون کی فراہمی ہونا چاہئے۔

پاکستان پر دباؤ ڈالا جائے کہ لائن آف کنٹرول سے سرحد پار مداخلت روکنے کے صدر پرویز مشرف کے وعدے کی تکمیل کی جائے۔

بھارت پر زور دیا جائے کہ وہ کشمیریوں پر سکیورٹی فورسز کا دباؤ گھٹائے تاکہ جنگجویت کا ماحول ختم ہو۔

پاکستان تمام باہمی اختلافات کو کشمیر کے تصفیے سے منسلک کرنے کی اپنی مذاکراتی حکمت عملی کو تبدیل کرے۔

بھارت ریاست کو زیادہ سیاسی خودمختاری دینے اور معاشی ترقی کو تیز کرنے کیلئے جموں و کشمیر کی منتخب حکومت کے ساتھ کسی مفاہمت پر پہنچنے کیلئے کوششیں تیز کرتے۔ لائن آف کنٹرول پر (جو تنازعے کا آتش فشاں ہے) جامع جنگ بندی کیلئے پاک بھارت مذاکرات شروع کرانے کی کوشش کی جائے۔

ایٹمی جنگ کے خدشات کم کرنے کیلئے اقدامات' سیاچن گلیشئر تنازعے کے حل' باہمی تجارت کو فروغ دینے' شہریوں کی نقل و حرکت پر پابندیاں نرم کرنے اور ایک دوسرے کے خلاف نفرت آمیز پروپیگنڈہ ختم کرنے سمیت دیگر مسائل بھی حل کئے جانے چاہئیں۔

باہمی تعلقات میں سردمہری کم ہونے کے باوجود دونوں ملک کشمیر پر اپنی شرائط کے بغیر آگے بڑھنے کیلئے

Marfat.com

تیار نہیں۔ اس حقیقت اور عدم اعتماد کے باعث امریکہ کیلئے اس موقع پر امریکہ کیلئے مسئلے کا متبادل حل پیش کرنا خلاف منشا ہوگا' اس کے بجائے' امریکہ کو پردے کے پیچھے رہ کر ایسی مدد کرنا چاہیے کہ پاکستان و بھارت ایسا عمل شروع کر سکیں' جو آگے چل کر دونوں کیلئے مثبت باہمی راستہ بن جائے۔ تاہم اگر مختصر المدت پیش رفت کا عمل مشکل ہو' تو امریکہ کو تعمیری اور طویل المیعاد کوششیں کرنی چاہئیں' جس کے ذریعے دونوں ملکوں کے درمیان کشیدگی اور جنگ کے امکانات کم ہوں اور تصفیہ کشمیر کے امکانات روشن ہو سکیں۔

کشمیر پر پاکستان و بھارت کا سرکاری مؤقف:

بھارت کا مؤقف

☆ 16 اکتوبر 1947ء میں مہاراجا ہری سنگھ کی جانب سے ریاست کے بھارت سے الحاق کے بعد کشمیر اس کا اٹوٹ انگ ہے اور اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی قرارداد میں ایسا کچھ نہیں: جو ریاست پر بھارتی خودمختاری کے برخلاف ہو۔

☆ سلامتی کونسل کی قرارداد میں جو بات تسلیم کی گئی ہے' وہ یہ ہے کہ پاکستان اپنے زیر قبضہ کشمیر کو خالی کر دے' ریاست کے مستقبل کا معاملہ قطعی طور پر بھارت کا داخلی مسئلہ ہے' جو بھارتی آئین کے اندر رہ کر ہی حل کیا جا سکتا ہے۔

☆ کشمیر پر باہمی مذاکرات ہی ہونے چاہئیں' جیسا کہ 1972ء میں شملہ معاہدے میں طے ہوا تھا۔

سرکاری مؤقف اور پوری ریاست پر دعوے کے باوجود بھارت طویل عرصے سے صورتحال جوں کی توں رکھتے ہوئے لائن آف کنٹرول کو بین الاقوامی سرحد میں تبدیل کرنے کی خواہش کا اظہار کرتا رہا ہے۔ وزیراعظم جواہر لال نہرو نے مئی 1953ء میں امریکی وزیر خارجہ جون فاسٹر کو یہ تجویز دی تھی' دائیں بازو کے انتہا پسندوں کے سوا تمام بھارتی سیاسی حلقے ایسے کسی تصفیے کی حمایت کر سکتے ہیں' تاہم کسی بھی ایسے تصفیے یا عمل کی' جس کا مقصد علاقہ پاکستان کو دینا' خودمختار کشمیر یا بھارتی خودمختاری میں تخفیف ہو' سخت مخالفت موجود ہے۔

پاکستان کا مؤقف:

☆ برطانوی راج کے خاتمے کے بعد سے جموں و کشمیر متنازع علاقہ ہے' اکتوبر 1947ء میں بھارت سے الحاق عارضی تھا' جیسا کہ اگست 1948ء اور جنوری 1949ء کی سلامتی کونسل کی قراردادوں میں تسلیم کیا گیا ہے۔

☆ مذاکرات' سلامتی کونسل کی قراردادوں کے مطابق کشمیریوں کو حق خوداختیاری دینے کیلئے ہونے چاہئیں' اس کا مقصد کشمیریوں کو بھارت یا پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے کا حق دینا ہے۔

☆ بین الاقوامی ثالثی کو مسترد نہیں کیا جائے اور شملہ معاہدے میں بھی اس سے انکار موجود نہیں ہے۔ اگرچہ برسوں سے پاکستان کے سرکاری مؤقف میں تبدیلی نہیں آئی' تاہم غیر سرکاری نقطہ نظر سامنے آیا ہے۔ آج پاکستان پورے کشمیر میں استصواب رائے کے مؤقف سے کم پر راضی ہو سکتا ہے' اس میں کشمیری بولنے والے علاقوں کی خودمختاری پر رضامند ہونا یا وادی کشمیر کیلئے کوئی ایسا خصوصی انتظام' جس کے تحت کشمیر کلی طور پر بھارت کے ماتحت نہ رہے۔ بعض

Marfat.com

پاکستانی صورت حال جوں کی توں رکھنے کی تجویز قبول کرنے کی بات بھی کرتے ہیں' بعض عناصر کشمیر کے مسئلے سے ہٹ کر دیگر شعبوں میں پاک بھارت تعلقات میں بہتری چاہتے ہیں' لیکن پاکستان آرمی' جو پالیسی سازی میں اثر انداز ہے' کے مؤقف میں نمایاں تبدیلی کے آثار کم ہیں۔

ماضی میں مسئلہ کشمیر حل کرنے کی کوششیں:

48-1947ء میں پاکستان نے بہ زور طاقت کشمیر پر قبضے کی کوشش کی' 1947ء کے آخر میں غیر ریگولر ملیشیا اس علاقے پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگئی' جسے آج آزاد کشمیر کہا جاتا ہے' (بھارت اسے پاکستان کے زیر قبضہ کشمیر کہتا ہے) مہاراجہ کی جانب سے ریاست کے بھارت سے الحاق کے بعد 48ء کے دوران پاکستانی فوج وملیشیا کی بھارتی فوج سے جنگ ہوئی' اس کے بعد دونوں ملکوں نے اقوام متحدہ کے تحت جنگ بندی قبول کرلی' جس پر یکم جنوری 1949ء سے عملدرآمد ہوا۔

1948ء سے 1961ء پاکستان اپنا کیس سفارتی سطح پر خصوصاً اقوام متحدہ میں اٹھاتا رہا' اقوام متحدہ کی ثالثی کی کوششیں (تین امریکی کوششیں 1961ء' 1958ء' 1949ء) بھارتی عدم دلچسپی کے باعث ناکام ہوگئیں۔ 1954ء میں پاکستان کے امریکہ کا فوجی اتحادی بن جانے کے بعد استصواب رائے پر بھارتی مؤقف مزید سخت ہوگیا اور اس نے اصرار شروع کردیا کہ 1952ء کے اسمبلی الیکشن سے ظاہر ہوگیا کہ کشمیری بھارت کا حصہ رہنا چاہتے ہیں اور مزید کسی ووٹ کی ضرورت نہیں رہی۔

63-1962ء چین' بھارت سرحدی تنازعے کے بعد لندن اور واشنگٹن کے دباؤ پر پاکستان و بھارت کے باہمی مذاکرات کے چھ دور ہوئے' جو کسی تصفیے پر پہنچنے میں ناکام رہے' بات چیت کے دوران دونوں ملکوں نے کشمیر کو تقسیم کرنے کی برطانوی اور امریکی تجویز کو مسترد کردیا۔ 1965ء پاکستان کی جانب سے کشمیر پر بہ زور قوت قبضہ کرنے کی کوشش مکمل جنگ میں تبدیل ہوگئی' بھارت نے علاقہ کھوئے بغیر یہ سترہ روزہ جنگ جیت لی۔ اقوام متحدہ کے زیر اہتمام جنگ بندی قبول کرکے دونوں ملک سوویت یونین کے تحت معاہدہ تاشقند پر متفق ہوگئے۔ جس میں جموں وکشمیر میں صورت حال جوں کی توں رکھنے کا عہد کیا گیا۔

جولائی 1972ء میں دونوں ملک شملہ میں اپنے اپنے اصولوں سے ہٹے بغیر کشمیر اور دیگر تنازعات باہمی طور پر طے کرنے پر رضامند ہوگئے اور سیز فائر لائن کو لائن آف کنٹرول کا نام دے دیا گیا۔ تقریباً پندرہ برس تک حالات پرسکون رہے۔ کشمیر ایک مسئلہ رہا' لیکن باہمی کشیدگی میں اضافے کا سبب نہیں بنا۔

1989ء کے بعد کشمیر میں پرتشدد شورش شروع ہوگئی' حالات سے نمٹنے میں بھارتی غلطیوں اور الیکشن میں دھاندلیوں نے اس کو مزید ہوا دی' بعد ازاں پاکستان کی انٹر سروسز انٹیلی جنس ڈائریکٹریٹ (آئی ایس آئی) نے افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف گوریلا جنگ کا تجربہ استعمال کیا اور اسلامی انتہا پسندوں کو تربیت دی' مسلح کیا اور تکنیکی مدد فراہم کی' جنہوں نے لائن آف کنٹرول عبور کرلی۔ (بھارت اور امریکہ انتہا پسندوں کو' دہشت گرد اور پاکستان انہیں حریت پسند قرار دیتا ہے)۔

Marfat.com

تعلقات کی بہتری کیلئے حالیہ پاک بھارت کوششیں:

حالیہ برسوں میں دونوں ملکوں نے تعلقات بہتر بنانے کیلئے تین اہم لیکن ناکام کوششیں کیں۔

☆ 1997ء وزیراعظم نواز شریف اور وزیراعظم اندر کمار گجرال کے درمیان کشمیر سمیت باہمی مسائل پر وسیع تر مذاکرات ہوئے' تاہم کمزور گجرال حکومت کے خاتمے پر آگے نہ بڑھ سکے۔

☆ فروری 1999ء دونوں ملکوں کی جانب سے ایٹمی ہتھیاروں کے تجربات کے بعد وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی نے لاہور کا دورہ کیا' جہاں وہ اور وزیراعظم نواز شریف ایک جامع ایجنڈے (بشمول کشمیر) پر متفق ہوئے' چند ماہ بعد پاکستان کی جانب سے کارگل کے قریب لائن آف کنٹرول سے بھارتی حصے پر قبضے کی کوششوں نے لاہور کے مذاکراتی عمل کو شدید نقصان پہنچایا اور ایک نئے بحران کو جنم دیا' امریکی دباؤ اور سخت بھارتی فوجی ردعمل کے پیش نظر پاکستان کی کارگل سے واپسی پر حل ہوا۔

(روزنامہ جنگ سنڈے میگزین 29 فروری 2004ء امریکی ٹاسک فورس کی چشم کشا رپورٹ'' مترجم ابرار بختیار)

19 فروری 2004ء میں ایک بڑی اہم ڈویلپمنٹ Development تھی کہ پاکستان اور بھارت ایک امن روڈ میپ پر متفق ہو گئے۔ یہ تمام مذاکرات دراصل امریکی دباؤ کے مرہون منت تھے اس ضمن میں 19 مارچ 2004ء کو امریکی وزیر خارجہ کولن پاؤل نے اسلام آباد میں صدر مشرف اور وزیراعظم جمالی سے مذاکرات کئے جبکہ بھارت میں انہوں نے اعلیٰ حکام سے بات چیت کی۔

مارچ 2004ء میں بھارتی چینل پر جنرل مشرف کا انٹرویو نشر ہوا جس میں انہوں نے برملا کہا کہ کشمیر ''کور ایشو'' ہے جس کو حل کئے بغیر پاک بھارت تعلقات میں مستقل بہتری نہیں آ سکتی انہوں نے مقبوضہ کشمیر میں جاری جہاد کو دہشت گردی سے الگ جنگ آزادی سے تعبیر کیا اور کہا کہ اب وقت آ گیا ہے جب دنیا دہشت گردی اور جدوجہد آزادی میں فرق کو سمجھے۔ اس انٹرویو کا بھارتی حکومت نے سخت نوٹس لیا اور بھارتی ترجمان نے کہا کہ اسلام آباد اعلامیہ میں کشمیر کا بنیادی مسئلے کے طور پر نام نہیں دیا گیا اور نہ ہی جنوری کی بات چیت میں کسی ایسے مسئلے کا حوالہ دیا گیا تھا' خیال رہے کہ فروری میں مسٹر واجپائی اور ایڈوانی دونوں نے کہا تھا کہ کشمیر کا مسئلہ کچھ لو کچھ دو' کی بنیاد پر حل ہو سکتا ہے۔ لیکن وقت نے ثابت کیا کہ دراصل یہ سارا گورکھ دھندہ بی جے پی مسلم ووٹ کے حصول کیلئے پھیلا رہی تھی اور ان کے عزائم ابھی جوں کے توں تھے۔

امریکہ جس کی آشیرباد پر پھر مذاکرات شروع ہوئے تھے کے بھارتی سفیر نے 17 مارچ کو کہا کہ امریکہ مسئلہ کشمیر پر ثالث کا کردار ادا نہیں کر سکتا۔ صاف ظاہر تھا کہ امریکی بھارتی حکومت کو ناراض نہیں کرنا چاہتا لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ دونوں ممالک کے درمیان جنگ ہو جائے اس بات کا اظہار کرسٹینا روکا نے 10 مارچ 2004ء کو واشنگٹن پوسٹ میں لکھے اپنے ایک مضمون میں کیا اور کہا کہ 2002ء میں جب پاک بھارت جنگ کا خطرہ پیدا ہوا تو بین الاقوامی برادری نے اپنا رول ادا کر کے اس خطرے کو ٹالا اور دونوں ممالک کو مذاکرات پر آمادہ کیا۔

جون 2004ء میں بھارت میں کانگریس کی مخلوط حکومت سابقہ وزیر خزانہ سردار من موہن سنگھ کی سربراہی میں

Marfat.com

قائم ہوگئی۔ گو کہ اس مرکزی حکومت میں کانگریس میں سب سے بڑی پارٹی تھی لیکن یہ مخلوط حکومت چوں چوں کا مربہ ہونے کی وجہ سے من موہن سنگھ جو بنیادی طور پر امن پسند اور صلح جو طبعیت کے مالک ہیں کوئی خاطر خواہ نتائج حاصل نہ کر سکے۔ انہوں نے سابقہ حکومت کی پالیسیوں کو جاری رکھنے کا اعلان کیا اور زیادہ زور حسب روایت ڈیلی گیشن تبادلوں پر ہی رکھا۔ وہ بھی کشمیر کے ایشو کو نظر انداز ہی کرتے رہے۔

ٹریک ٹو ڈپلومیسی تھی یا امریکی دباؤ یا پھر امن بحال کرنے کی شدید خواہش کہ صدر جنرل پرویز مشرف نے پہلی مرتبہ مسئلہ کشمیر پر پاکستان کے 57 سالہ مؤقف سے ہٹ کر بات کرنے کی خواہش ظاہر کی اور امن مشن میں اقوام متحدہ کی قراردادوں کے علاوہ بھی کشمیر کا حصل نکالنے کی ضرورت پر زور دیا نومبر 2004ء رمضان المبارک میں صدر جنرل پرویز مشرف نے پاکستانی قوم سے کہا کہ وہ مسئلہ کشمیر کے حل کیلئے مختلف آپشنز پر کھل کر بحث کرے اور اتفاق رائے کے حصول کی کوشش کرے۔ ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے صدر جنرل پرویز مشرف نے اس معاملہ پر تفصیلی اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ پاک بھارت مذاکرات کے ذریعے مسئلہ کشمیر حل ہوتا نظر آ رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارا مؤقف استصواب رائے رہا ہے جبکہ بھارت لائن آف کنٹرول کو مستقل بین الاقوامی سرحد تسلیم کروانا چاہتا ہے۔ بھارت ہمارے مؤقف کو تسلیم نہیں کرتا اور ہم لائن آف کنٹرول کو بین الاقوامی سرحد نہیں مان سکتے۔ صدر مملکت کا کہنا تھا کہ ہمیں تمام دوسرے آپشنز کو سامنے رکھنا ہوگا' کوئی راستہ نکالنا ہوگا' راستہ اندر سے ہی نکلے گا' اب وقت آ گیا ہے کہ ہم آپشن تلاش کریں اور اس پر اتفاق رائے کی تعمیر عمل میں لائی جائے۔ پاکستان کا مؤقف یہ رہا کہ مسئلہ کشمیر کا ایسا حل ہونا چاہئے جو پاکستان' بھارت اور کشمیری عوام تینوں کیلئے قابل قبول ہو۔ انہوں نے کہا کہ بعض حلقے اسے ناقابل عمل اور ناممکن قرار دیتے ہیں مگر میں اسے تسلیم نہیں کرتا' قوم پہلے اس مسئلہ پر بحث کرے' پھر اتفاق رائے تک پہنچے۔ صدر جنرل پرویز مشرف نے اس مسئلہ کے پرامن حل کیلئے ابتدائی مرحلے میں کشمیر کے سات علاقوں سے فوجیں ہٹانے کو اپنے ذاتی تجزیہ کا حصہ قرار دیا۔ انہوں نے آزاد کشمیر' شمالی علاقہ جات' دریائے چناب اور اکھنور کا درمیانی علاقہ' جموں' سانبھا' پیر پنجال' ڈوڈہ' پونچھ' راجوڑی' اودھم پور' وادی' دراس اور کارگل' دریائے اکسر اور قراقرم کے درمیانی علاقوں پر مشتمل سات علاقوں کا تذکرہ کیا۔ ان میں سے دو علاقے پاکستان کے پاس ہیں جبکہ پانچ علاقوں پر بھارت کا قبضہ ہے۔ پاکستان پہلے بھی کئی بار یہ بات کہہ چکا تھا کہ کشمیر کا تنازع طے کرنے کیلئے سب کو اپنے اپنے رویہ میں لچک پیدا کرنی ہوگی۔

پاکستان اور بھارت گزشتہ نصف صدی سے کشمیر کے حوالے سے روایتی انداز فکر اختیار کرتے آئے۔ دونوں کشمیر کی ملکیت کا دعویٰ کرتے رہے اور دونوں نے اس سلسلے میں بے حد سخت اور غیر لچک دار رویہ اختیار رکھا جس کی وجہ سے مزید پیچیدگیوں نے جنم لیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ پاکستان اور بھارت کی حکومتیں تمام اختلافات کو ختم کرنے اور بہتر تعلقات قائم کرنے کی باقاعدہ کوششیں کر رہی تھی دونوں طرف کے حکام پہلی مرتبہ ایک دوسرے کا مؤقف مثبت انداز میں سننے کیلئے تیار تھے۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان ایک طویل عرصہ تک محاذ آرائی کا سلسلہ جاری رہا۔ کئی جنگیں لڑنے کے بعد دونوں ممالک کے رہنما اس نتیجہ پر پہنچے کہ برصغیر میں امن قائم رکھنا سب سے اہم فریضہ ہے۔ اس مرحلے پر کشمیر کے مسئلہ کا حل ڈھونڈنے کیلئے مختلف آپشنز کی تلاش بظاہر ایک نہایت عمدہ پیش رفت تھی جو ایک جانب اس مسئلہ کو حل کرنے کیلئے

Marfat.com

پاکستان کی نیک نیتی کا ثبوت تھی اور دوسری جانب ایک ایسا حل تلاش کرنے کی صحت منداور مثبت کوشش بھی جو مسئلہ کشمیر کے تینوں فریقوں یعنی پاکستان، بھارت اور کشمیریوں کیلئے قابل قبول ہو۔ پاکستان جیسے ملکوں میں اگر چہ کھلے بحث ومباحثہ کے ذریعے عوام کی حقیقی رائے جاننے یا پاکستان کے بیشتر عوام کو کسی اہم قومی معاملہ پر رائے دینے کے عمل میں شریک کرنے کی کوئی روایت موجود نہیں رہی تھی لیکن شاید یہ کوئی اہم بات نہیں۔ اہم تر بات یہ تھی کہ پاکستان نصف صدی سے زیادہ عرصہ پر محیط اس تنازع کا حل تلاش کرنے کیلئے کھلے دل اور کھلے ذہن کے ساتھ قومی سطح کی یہ بڑی مشق کرنے کیلئے تیار تھا۔ کشمیر جیسے پیچیدہ اور گھمبیر مسائل کا حل ڈھونڈنے کیلئے ایسی ہی روشن خیالی اور وسیع القلبی درکار تھی۔

صدر جنرل مشرف کی اس تجویز پر پاکستان میں زبردست تنقید ہوئی لیکن عالمی سطح پر اسے بہت سراہا گیا اور امریکنوں کو یقین آ گیا کہ پاکستان سنجیدگی سے اس مسئلے کا حل چاہتا ہے لیکن بھارت کے کان پر جوں رینگتی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ بھارت پر ساری دنیا کا اسلحہ اپنے ملک میں جمع کر لینے کا جنون سوار تھا۔ اکتوبر 2004ء میں بھارت نے روس سے ایٹمی آبدوزوں کی فراہمی کا معاہدہ کیا تو پاکستان نے روسی ایٹمی آبدوزوں کی بھارت کو فراہمی کا مسئلہ پڑوسی ملک کی اعلیٰ ترین قیادت کے ساتھ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ مغربی میڈیا نے خبر دی تھی کہ روس دو ایٹمی اسلحہ بردار آبدوزیں اور دو روایتی اسلحہ لے جانے والی آبدوزیں بھارت کو دے گا۔ بھارت کو اس سے پیشتر جرمنی نے ایٹمی آبدوزیں اسرائیل کے توسط سے بھارت پہنچائی جاتی تھی۔ اب اس کے فوراً بعد روسی آبدوزوں کی ڈیل کی بازگشت سنائی دی۔

ماسکو نے اگر چہ اس کی تردید کر دی لیکن تردید میں وہ زور وشور، یقین دلانے کی کیفیت اور خبر جہاں سے نکلی اس کے خلاف قدم اٹھانے وغیرہ قسم کی کوئی بات نہیں کی گئی۔ یعنی تردید میں کوئی جان نہ تھی، پاکستان کا خیال تھا کہ روسی تردید برائے تردید ہے اور مغربی میڈیا کی خبر درست ہے کہ روس ایٹمی آبدوزیں بھارت کو فراہم کرے گا۔ مغربی خبر رساں ایجنسیوں نے واضح الفاظ میں بتایا تھا کہ امریکہ نے جرمن چانسلر شروڈر سے کہا تھا کہ وہ بھارت کو اسلحہ فراہم کرنے کیلئے اسرائیل کی مدد لیں۔ یہ بات جارج بش نے چانسلر شروڈر سے 2001ء کے اوائل میں کہی تھی۔ جرمنی نے امریکی حکم کی تعمیل میں آبدوزوں کی تیاری شروع کر رکھی تھی۔

فی الوقت یہ کہنا دشوار تھا کہ یہ آبدوزیں کب اسرائیل کو ڈیلور کی جائیں گی جہاں سے انہیں بھارت بھیجا جائے گا۔ ایک بات بہر حال طے تھی کہ 2007ء تک بھارت کو بحر ہند کے نیلے پانیوں کی سب سے بڑی طاقت بنا دیا جائے گا۔ اس وقت تک بھارت کو کم از کم 50 تا 60 آبدوزوں اور چار طیارہ بردار بحری جہازوں کی ضرورت ہوگی۔ آبدوزوں اور ایک طیارہ بردار جہاز کی فراہمی کی ضمانت روس نے دی۔ کوشش یہ کی جا رہی تھی کہ روسی اور جرمن سائنسداں بھارت میں لائسنس کے تحت ایٹمی اسلحہ بردار آبدوزیں تیار کریں۔ اس منصوبے کے تحت وقت اور اخراجات دونوں کی کافی بچت ہوگی۔

روسی صدر ولادی میر پیوٹن کے دسمبر میں ہونے والے دورۂ بھارت میں بحر ہند کیلئے درکار نیوی کی ضرورت اور طاقت کا جائزہ لیا گیا۔ بھارت کے بعض قابل اعتماد ذرائع نے بتایا ہے بھارت نے امریکہ سے طیارہ بردار ایٹمی بحری جہاز دینے کی درخواست کی۔ امریکی نائب وزیر خارجہ کرسٹینا روکا نے دورۂ دہلی میں بھارت کی اس درخواست پر حوصلہ افزا ردعمل کا اظہار نہیں کیا، تاہم جارج بش انتظامیہ نے بھارتی وزیراعظم کو یقین دہانی کرائی کہ آئندہ ماہ نائب وزیر خارجہ رچرڈ

Marfat.com

آرمیٹیج دہلی پہنچ کر بھارت کی درخواست کا ازسرنو جائزہ لیں گے۔ کرسٹینا روکا نے بش انتظامیہ کو بتایا کہ امریکی طیارہ بردار جہاز کی بھارت کو فراہمی جنوبی ایشیا میں طاقت کا توازن بگاڑ دے گی لیکن امریکی نقار خانے میں جہاں بھارتی لابی کی چیخ و پکار نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا کرسٹینا روکا کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ امریکہ نے خود تو کوئی پیشرفت ان دنوں نہیں کی لیکن روس اور بھارت کے معاہدے پر خاموشی اختیار کئے رکھی۔

مقبوضہ کشمیر میں صورت حالات کنٹرول کرنے کیلئے بھارت نے حریت کانفرنس کے رہنماؤں کو مذاکرات کی پیشکش کی جبکہ پاکستان نے حریت راہنماؤں کو پاکستان کے دورے کی دعوت دی تاکہ کشمیریوں کی نمائندہ جماعت سے جو مسئلے کے اصل فریق ہیں بات ہو سکے۔ بھارت نے انہیں تو پاکستان آنے کی اجازت نہ دی البتہ پاکستان پر الزام لگا دیا کہ وہ حریت راہنماؤں کو بھارت سے مذاکرات کرنے سے روک رہا ہے۔ (روزنامہ نوائے وقت لاہور 8 نومبر 2004ء)

24 نومبر 2004ء کو بھارتی وزیراعظم من موہن سنگھ اور پاکستانی وزیراعظم شوکت عزیز کی نئی دہلی میں ملاقات اور ڈیڑھ گھنٹہ مذاکرات ہوئے اس پر روزنامہ اسلام نے بڑا شاندار تبصرہ کیا تھا ملاحظہ فرمائیں:

شوکت عزیز، من موہن سنگھ ملاقات:

وزیراعظم شوکت عزیز نے بدھ کے روز نئی دہلی میں بھارتی وزیراعظم من موہن سنگھ سے ڈیڑھ گھنٹے کی تفصیلی ملاقات کی اور ان سے کشمیر سمیت دیگر دوطرفہ اور علاقائی معاملات پر تبادلہ خیال کیا۔ وزیراعظم نے بھارتی صدر جمہوریہ اے پی جے عبدالکلام سے بھی ملاقات کی اور اس سے پہلے وہ سابق بھارتی وزیراعظم واجپائی اور حریت کانفرنس کے رہنماؤں سے بھی ملے۔ ان ملاقاتوں کے دوران دونوں جانب سے ایک دوسرے کیلئے خیر سگالی اور مصالحت کے جذبات کا اظہار کیا گیا اور پاکستانی و بھارتی رہنماؤں نے امن مذاکرات اور بہتر تعلقات کے حق میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر بیانات دیئے لیکن کشمیر کے اہم اور بنیادی مسئلہ پر وزیراعظم شوکت عزیز کے اس اہم دورے اور بالخصوص بھارتی وزیراعظم من موہن سنگھ کے ساتھ ان کی ملاقات میں جس اہم پیش رفت کی توقع کی جا رہی تھی اس کے بارے میں کوئی مشترکہ اعلان سامنے نہیں آیا اور جنوبی ایشیا کے دو اہم ترین ملکوں کے وزیراعظم کی یہ اہم ترین ملاقات بھی اس روایتی اعلان کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی کہ ''دونوں ممالک نے جامع مذاکرات کا عمل جاری رکھنے پر اتفاق کر لیا ہے'' بلکہ وزیراعظم شوکت عزیز نے اپنے دورے کے اختتام پر بھارتی رہنماؤں سے اپنی ملاقاتوں کے جو احوال بیان کئے ان سے تو یہی اشارہ ملتا ہے کہ دونوں ممالک کے درمیان کئی اہم معاملات پر بات چیت ناکام ہو گئی ہے اور دونوں ممالک نے اپنے اپنے مؤقف پر ڈٹے رہنے کا اعادہ کیا ہے۔ بعض تجزیہ نگاروں کے مطابق بھارتی رہنما حسب روایت پاکستان کو کشمیر کے علاوہ دیگر مسائل پر بات کرنے اور تجارت سمیت مختلف معاملات پر بھارت سے معاہدے کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ بھارت کا اصرار تھا کہ پاکستان ایران سے گیس پائپ لائن لے جانے کے معاہدے سے پہلے بھارت کو ''پسندیدہ ملک'' قرار دے اور تجارت کے زیر التوا معاہدوں پر دستخط کرنے پر آمادہ ہو جائے لیکن پاکستانی وزیراعظم نے ان پر واضح کر دیا کہ پاکستان مسئلہ کشمیر کے حل کے بغیر ایسا نہیں کر سکتا۔ دریں اثناء پاکستان کے صدر جنرل پرویز مشرف کا یہ بیان بھی اہمیت کا حامل سمجھا جا رہا ہے جس میں انہوں نے بھارتی کانگریس کی سربراہ سونیا گاندھی سے مسئلہ کشمیر کے حل

Marfat.com

میں کردار ادا کرنے کی اپیل کرتے ہوئے کہا کہ بعض انتہا پسند عناصر پاکستان اور بھارت کے درمیان بحالی تعلقات کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ان کا اشارہ غالباً بھارتی اسٹیبلشمنٹ میں شامل ایسے لوگوں کی طرف ہے جو پہلے بھی کئی مرتبہ پاکستان اور بھارت کے درمیانی مذاکرات کو سبوتاژ کر چکے ہیں اور جن کو بھارت کی انتہا پسند ہندو تنظیموں کی حمایت حاصل ہے۔بظاہر ایسا لگ رہا ہے کہ من موہن سنگھ حکومت کشمیر سے متعلق کوئی اہم فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں ہی نہیں ہے اور وہاں چونکہ ایک خالص جمہوری حکومت قائم ہے جسے ہر حال میں اکثریت کی رائے کا پابند ہونا پڑتا ہے اس لئے شاید من موہن سنگھ کی مخلوط حکومت یہ خطرہ محسوس کرتی ہے کہ کشمیر سے متعلق کوئی بڑا فیصلہ کرنے سے اس کو بھارتی ہندو انتہا پسند اکثریت کے سیلاب بلا کا سامنا کرنا پڑے گا' اس لئے وہ محض تاخیری حربوں کے ذریعے مسئلہ کشمیر کو قصہ پارینہ بنانے کی روایتی بھارتی پالیسی پر گامزن رہنے پر اپنے آپ کو مجبور سمجھتی ہے۔دوسری اہم بات یہ بھی ہے کہ شاید بھارتی قیادت یہ محسوس کرتی ہے کہ پاکستان میں اگرچہ بظاہر ایک جمہوری حکومت قائم ہے جس کے اسٹیج پر جناب شوکت عزیز فائز ہیں لیکن اختیار و اقتدار کا اصل منبع کہیں اور ہے اور یہ کہ کوئی بھی فیصلہ کن بات جنرل پرویز مشرف کے ساتھ ہی کی جاسکتی ہے۔اگر ایسا ہے تو جنوبی ایشیا کے عوام کو کشمیر پر کسی مزید پیش رفت کیلئے من موہن سنگھ اور جنرل مشرف کی آئندہ ملاقات تک انتظار کرنا پڑے گا لیکن خود صدر مشرف نے اپنی حالیہ تجاویز پر بھارت کے ردعمل کو دیکھتے ہوئے گزشتہ دنوں جس مایوسی کا اظہار کیا ہے اور اپنے ایک تازہ بیان میں جس طرح انہوں نے سونیا گاندھی سے کردار ادا کرنے کی اپیل کی ہے' اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بھی اب کچھ زیادہ پرامید نہیں رہے ہیں اور جس گرم جوشی کا مظاہرہ ان کی جانب سے اب تک ہو رہا تھا اس کا مثبت جواب نہ ملنا ان کیلئے سخت باعث قلق بنا ہوا ہے۔

بھارت نے پاکستان پر بحالی تعلقات کے اقدامات جاری رکھنے پر زور دیا ہے' اس کا مطلب یہ ہے کہ بھارت پاکستان کی جانب سے کئے گئے اب تک کے اقدامات سے مطمئن نہیں ہے اور بھارت کو اس بات سے بھی تسلی نہیں ہوئی کہ صدر مشرف نے استصواب رائے کے مطالبے سے دستبردار ہونے اور کشمیر کی تقسیم پر راضی ہونے کا بھی عندیہ دیا۔اب بھارت کے "بت کافر" کو سمجھانے کیلئے نہ معلوم صدر مشرف کو اور کیا کیا "تاریخی" اقدامات کرنے پڑیں۔دراصل پاکستان اور بھارت کے درمیان موجودہ مذاکرات کی بنیاد شروع سے ہی ایک فریق کے مسلسل اصرار اور دوسرے مستقل انکار پر قائم چلی آرہی ہے اور پاکستانی حکمرانوں کے بے تابانہ وفدا کارانہ سفارتی طرز عمل اور اس ذہنیت رکھنے والے عیاؤں کو یہ تاثر لینے کا موقع دیا ہے کہ بھارت کے ساتھ تعلقات پاکستان کی کوئی بڑی داخلی یا بین الاقوامی مجبوری ہے۔یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ کشمیر کے مسئلہ آبرومندانہ حل سے زیادہ دلچسپی قدرتی طور پر پاکستان کو ہی ہوسکتی ہے کیونکہ کشمیر پاکستان کیلئے بہت اہم مسئلہ رہا ہے جبکہ بھارت اب تک پاکستان کشمیر کے مسئلہ کو نظرانداز کرتا رہے اور دنیا کو یہ تاثر دیتا رہا کہ کشمیر پر بھارت کا قبضہ درست اور قانونی ہے جس پر پاکستان سمیت کسی دوسری قوت کو بات کرنے کا کوئی حق نہیں۔اس بناء پر پاکستان کی جانب سے مسئلہ کشمیر کے حل کے تمام امکانی ذرائع استعمال کرنے میں زیادہ دلچسپی دکھانا قابل فہم ہے۔لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ خصم کو بار بار کی یکطرفہ پیشکش کر کے اپنی کمزوری کا تاثر دیا جائے' بالخصوص ایسے حالات میں جبکہ وہ طاقت اور برتری کے زعم میں بھی مبتلا ہو۔صدر مشرف وقت آنے سے پہلے بہت پہلے اپنے سارے کارڈز بھارت کے

Marfat.com

سامنے رکھ چکے ہیں اور پاکستان کے پاس ان کی پیش کردہ تجاویز سے پیچھے ہٹنے کا کوئی موقع باقی نہیں رہا لیکن پھر بھی ان کا ارشاد ہے کہ انہوں نے اپنے کارڈ ابھی چھپا کر رکھے ہیں۔ اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جائے گا کہ شاید وہ کشمیر کے بٹوارے کی اپنی تجاویز سے بھی آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ ان کی جانب سے ان سے بھی آگے کوئی قدم اٹھایا گیا تو قوم اسے کسی بھی صورت میں قبول نہیں کرے گی۔ اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ صدر مشرف کو بھارت کے سامنے اپنے پیش کردہ کارڈز بھی واپس لے لینے چاہئیں اور صاف لفظوں میں اعلان کر دینا چاہئے کہ جب تک بھارت پاکستان کے ساتھ حقیقت پسندانہ مذاکرات کیلئے آمادہ نہیں ہوتا' پاکستان اس کو کسی بھی قسم کی رعایت نہیں دے سکتا۔ (روزنامہ اسلام اداریہ 26 نومبر 2004ء)

پاکستان کے صدر جنرل مشرف نے 25 اکتوبر کو افطار ڈنر میں مسئلہ کشمیر پر نئی بحث چھیڑ دی۔ جس کے نتیجے میں مختلف حلقوں اور طبقات کی جانب سے ایسے ایسے مؤقف اور انکشافات سامنے آ رہے تھے جنہوں نے پاکستانی عوام کو چونکا کر رکھ دیا۔ حقیقت میں جنرل مشرف نے پاکستان کے اس مؤقف کو واضح الفاظ میں قوم کے سامنے رکھا جس پر پچھلے چالیس سال میں مختلف حکومتیں غیر اعلانیہ طور پر عمل پیرا رہیں۔ 1958ء میں ایوب خان کے دور میں کشمیر کا ایک حصہ ''اقصائے چین'' پڑوسی ملک چین کے حوالے کر کے پہلی دفعہ پاکستان نے مسئلہ کشمیر پر اپنے مؤقف میں تبدیلی کا اشارہ دیا تھا۔ پھر 1966ء کے تاشقند معاہدے میں تو گویا مسئلہ کشمیر کو عالمی سطح سے اٹھا کر پہلی دفعہ دوطرفہ بنا دیا گیا۔ 1971ء کے شملہ معاہدہ نے تو مسئلہ کشمیر پر مؤقف میں تبدیلی پر مہر تصدیق ثبت کر دی جب پاکستان نے ایک ایسے معاہدے پر دستخط کر دیئے جس میں لکھا تھا کہ ''مسئلہ کشمیر سمیت تمام تنازعات دوطرفہ بنیادوں پر مذاکرات کے ذریعے حل کئے جائیں گے اور یہ کہ مسئلہ کشمیر کو کسی عالمی فورم پر نہیں اٹھایا جائے گا'' سیز فائر لائن کا نام بدل کر ''لائن آف کنٹرول'' رکھا گیا۔ 1984ء میں بھارت نے سیاچن پر قبضہ کیا جسے 19 سال بعد تسلیم کرتے ہوئے یک طرفہ جنگ بندی کا اعلان کیا گیا۔ 1999ء کا ''معاہدہ لاہور'' اور 2004ء کا ''اعلان اسلام آباد'' غیر اعلانیہ عمل کا وہ تسلسل تھا جسے جنرل مشرف نے افطار ڈنر میں پوری ذمہ داری کے ساتھ قبول کرتے ہوئے مسئلہ کشمیر پر اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عملدرآمد کی ضد چھوڑنے کا اعلان کرتے ہوئے قوم کو بحث کا نیا موقع فراہم کر دیا۔ جس کے حق و مخالفت میں دلائل دیئے جا رہے تھے۔

سوال پیدا ہوتا تھا کہ 57 سال سے الجھے اس پیچیدہ مسئلے کا حل کیا ہے؟ مسئلہ کشمیر کے اب تک سات حل زیر بحث آ چکے ہیں اور مستقبل میں جب بھی مسئلہ کشمیر حل ہوا تو انہی میں سے ایک صورت سامنے آئے گی۔ وہ حل کیا ہیں؟

1- سٹیٹس کو:

یعنی پوزیشن جوں کی توں رکھی جائے۔ بھارت کے نزدیک سب سے پسندیدہ حل یہی ہے کہ کنٹرول لائن کو مستقل سرحد بنا دیا جائے۔ جو علاقے اس وقت بھارت کے پاس ہیں' اس کے پاس رہیں اور آزاد کشمیر و گلگت بلتستان جو پاکستان کے زیر کنٹرول ہیں وہ پاکستان کے پاس ہی رہیں۔ یہ حل پاکستان کیلئے بھی قابل قبول ہو سکتا تھا اگر اسے کشمیری قبول کر لیں لیکن چونکہ کشمیریوں کو یہ حل کسی صورت قبول نہیں اس لئے پاکستان بھی اس پر آمادہ نہیں ہوگا۔ یہ حل قبول کرنے کی صورت میں ایک لاکھ کشمیریوں کی قربانیوں کا جواب کون دیگا؟ ایسا حل تو شملہ معاہدے کے بعد بھی سامنے آیا تھا۔ جب

Marfat.com

کشمیر کے اندر کوئی عسکری تحریک تھی نہ ایک لاکھ کشمیریوں کی قربانی' اس لئے اس حل پر عملدرآمد آسان نہیں۔

2-چناب فارمولہ:

اس حل میں دریائے چناب کو باؤنڈری بنا کر کشمیر کی مذہبی اور جغرافیائی تقسیم عمل میں آئے گی۔ دریائے چناب کشمیر کے صوبے جموں کے انتہائی بائیں کونے سے ریاست جموں و کشمیر میں داخل ہو کر ایک کڑے کی شکل بنا کر پاکستان داخل ہو جاتا ہے۔ اس تقسیم میں 5 ہزار مربع میل جموں کے چھوٹے سے ٹکڑے کو چھوڑ کر بھارت کو سارے کشمیر سے دستبرداری کا اعلان کرنا پڑے گا۔ کیا بھارت ایسے حل پر آمادہ ہو جائے گا جس میں اسے تقریباً سارے کشمیر سے ہاتھ دھونے پڑیں۔ پھر یہ کہ دوقومی نظریے کا اطلاق تقسیم برصغیر کے اصول کے مطابق صرف برصغیر تک محدود تھا نہ کہ آزاد ریاستوں پر' ایسی صورت میں ایسے حل پر بھارت کو نہ تو پاکستان مجبور کر سکتا ہے نہ عالمی دنیا' اس فارمولے کے روح رواں ناقابل عمل حل تجویز کر رہے ہیں۔

3-الحاق پاکستان:

مسئلہ کشمیر کا ایک حل الحاق پاکستان ہے۔ لیکن یہ صرف اسی صورت ممکن ہے جب اقوام متحدہ کی قراردادوں کی روشنی میں فیصلے کا اختیار کشمیری عوام کو دیا جائے اور وہ ووٹ کے ذریعے مستقبل کا فیصلہ کریں۔ یہ حل دو طرح ممکن ہے ایک یہ کہ پاکستان اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عمل درآمد پر زور دے دوسرا رائے شماری کے وقت کسی قرارداد میں معمولی سی تبدیلی بھی قبول نہ کرے۔ اس لئے کہ اقوام متحدہ کی قراردادوں کی رو سے حق خودارادیت ملنے پر کشمیریوں کے سامنے پاکستان یا بھارت کے ساتھ الحاق کے علاوہ کوئی تیسرا راستہ نہیں ہوگا۔ ایسی صورت میں کشمیری بھارت سے الحاق کے بجائے خوش دلی سے پاکستان کے حق میں فیصلہ دیں گے۔ لیکن موجودہ حالات میں کشمیر کے اس حل پر عملدرآمد آہستہ آہستہ مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ رائے شماری بھارت کے مفاد میں نہیں ہوگی اسی لئے وہ اسے قبول بھی نہیں کریگا۔

4-الحاق بھارت:

مسئلہ کشمیر کا ایک حل ساری ریاست کو بھارت کے حوالے کرنا بھی ہے۔ یہ حل بھارت کے تو مفاد میں ہے لیکن کشمیریوں اور پاکستان کے مفاد میں نہیں۔ اس لئے اس حل پر عملدرآمد ناممکن حد تک مشکل ہے۔

5- مکمل خودمختاری:

مسئلہ کشمیر کے اس حل پر بھارت اور پاکستان کے حلقوں میں کم کشمیری حلقوں میں بحث مباحثہ زیادہ چل رہا ہے۔ خود کشمیریوں کے ایک بڑے طبقے کی رائے کے مطابق کشمیریوں کیلئے سب سے فائدہ مند حل یہی ہے کہ پاکستان اور بھارت کشمیریوں کو آزاد کر دیں۔ اس طرح نہ صرف جنوبی ایشیا میں ایک نئے اسلامی ملک کا اضافہ ہوگا بلکہ کشمیریوں کا بھی دنیا میں تشخص برقرار رہے گا کشمیر کے بے پناہ وسائل سے حاصل کردہ پیداوار کو برآمد کر کے کشمیر کو خطے کا خوشحال علاقہ بنایا جا سکتا ہے لیکن مکمل خودمختاری کے حل کو پاکستان اور بھارت کسی صورت قبول نہیں کریں گے۔ ایسی صورت میں پاکستان کو شمالی علاقہ جات چھوڑ کر نہ صرف چین سے جغرافیائی کٹ برداشت کرنا پڑے گا بلکہ دریائے سندھ کے پانی پر پاکستان کا

Marfat.com

کنٹرول بھی کمزور پڑ جائے گا جو پاکستان کیلئے ناقابل عمل ہے۔ اسی طرح بھارت کشمیر کی اربوں روپے کی سیاحت سے محرومی کے علاوہ فروٹ کے بڑے منبع سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ اس لئے دونوں ملک کشمیریوں کی خودمختاری کو آسانی سے قبول نہیں کریں گے۔ اس حل پر عملدرآمد کی ایک صورت یہ ہے کہ اگر دونوں ملک مسئلہ کشمیر باہمی رضامندی سے حل نہ کر سکے تو ایک وقت آ سکتا ہے جب اقوام متحدہ کشمیر کو کچھ عرصے کیلئے اپنے کنٹرول میں لے لے۔ پھر رائے شماری کرائے جس میں کشمیری الحاق کے بجائے آزاد رہنا پسند کرینگے۔ اس لئے کہ جب کسی قوم کے ہاتھ میں آزادانہ فیصلے کرنے کا اختیار آ جائے تو اس سے دستبردار ہونے کیلئے کوئی تیار نہیں ہوتا۔

6-وادی خودمختار باقی تقسیم:

کشمیر کی عسکری تحریک کا بیس سری نگر اور اس کے آس پاس کے 6 اضلاع پر مشتمل 8 ہزار مربع میل کے قریب علاقہ وادی کشمیر ہے۔ مسئلہ کشمیر کا ایک حل یہ بھی زیر بحث رہا ہے کہ ''وادی کشمیر'' کو آزادی دے دی جائے جبکہ باقی کشمیر پاکستان اور بھارت تقسیم کر لیں یعنی آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان پاکستان کے پاس ہی رہیں جبکہ جموں' کارگل' لداخ اور لیہ بھارت کے پاس رہنے دیئے جائیں۔ یہ حل پاکستان کیلئے تو قابل قبول ہو سکتا ہے لیکن کشمیری اور بھارت اس کو قبول نہیں کر سکتے۔ اس حل میں بھارت کو یکطرفہ طور پر اپنے زیر کنٹرول 8 ہزار مربع میل علاقہ چھوڑنا پڑے گا۔ بھارت اپنی اہمیت اور وقار بچانے کیلئے یکطرفہ طور پر ایک انچ علاقہ چھوڑنے پر بھی تیار نہیں' چہ جائیکہ 8 ہزار مربع میل پر پھیلے پورے 6 اضلاع چھوڑ دے۔ کشمیری بھی اس حل کو اس لئے قبول نہیں کر سکتے کہ اس طرح بکھرے خاندانوں کو ملانے والی تحریک کا نتیجہ مزید خاندانوں کی تقسیم کی صورت میں نکلے گا۔ کشمیری اس وقت کنٹرول لائن کے باعث بظاہر دو حصوں میں تقسیم ہیں۔ وادی کو آزادی ملنے کے بعد بھارت' پاکستان اور کشمیر تین حصوں میں تقسیم ہو جائیں گے جو مستقبل میں ایک اور تحریک کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔

7-وادی اور آزاد کشمیر ملا کر خودمختار علاقہ:

پاکستان اور بھارت کے سیاسی سفارتی اور فوجی حلقے عرصے سے اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ مسئلہ کشمیر کا ایسا حل نکالا جائے جو تینوں فریقوں کیلئے قابل قبول ہو حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مذاکرات نئی دہلی میں ہوں یا اسلام آباد میں۔ اس بات پر زور دیا جا رہا ہے کہ مسئلہ کشمیر کا دیرپا اور پرامن حل تلاش کرنے کیلئے مسئلہ کشمیر کا تینوں فریقوں کو مطمئن کرنے والا حل نکالنا پڑے گا۔ جنرل مشرف نے تو کشمیر کے 7 ریجن گنوا کر خودمختاری اور تقسیم کشمیر کی طرف واضح اشارہ دیا۔ البتہ مکمل الحاق کی بحث آہستہ آہستہ بند ہوتی جا رہی تھی۔ جنرل مشرف کے یہ الفاظ معنی خیز تھے کہ دونوں ملک فوجیں نکالیں اقوام متحدہ کا کنٹرول یا دونوں ملکوں کا مشترکہ کنٹرول ہو یہ دونوں باتیں خودمختاری کی طرف واضح اشارہ تھا البتہ یہ بات کہ پاکستان وادی کشمیر سے فوج نکالنے کا مطالبہ جب بھارت سے کریگا تو جواب میں ہمیں آزاد کشمیر سے فوجیں نکالنے کا کہا جائے گا۔ اس فقرے میں مشرف نے تقسیم کشمیر کی طرف اشارہ دیا۔ تینوں فریقوں کو مطمئن کرنے والی بات کو اس فقرے سے ملا کر دیکھا جائے تو واضح ہوتا تھا کہ پاکستان آزاد کشمیر کو ملا کر ایک خودمختار کشمیر بنانے سے نہ صرف کشمیری کسی حد تک مطمئن ہو سکتے بلکہ اس حل پر بھارت اور پاکستان بھی آمادہ ہو جائیں گے۔ بھارت جموں' لداخ اور کارگل کا

Marfat.com

کنٹرول اپنے پاس رکھے گا اور وادی کا 8 ہزار مربع میل علاقہ چھوڑ کر دنیا کو یہ تاثر بھی دیگا کہ اس نے کشمیر کے متعلق اقوام متحدہ سے کیا گیا اپنا وعدہ پورا کر دیا بلکہ پاکستان سے بھی کشمیر کا ایک حصہ لے کر کشمیریوں کے حوالے کر دیا۔ اس حل میں بھارت کو کسی خفت کا سامنا کرنا پڑے گا نہ پاکستان کو' پاکستان کو کشمیریوں کی خاطر آزاد کشمیر کی قربانی دینا ہوگی گلگت بلتستان چھوڑ کر پاکستان چین سے دوستی داؤ پر لگانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔

اس بات کا واضح اظہار جنرل مشرف نے کشمیری قیادت سے ملاقات کے دوران بھی کر دیا کہ پاکستان کشمیریوں کیلئے ہر قربانی دیگا لیکن چین سے اپنا سرحدی تعلق توڑنے کا رسک نہیں لے گا۔ پاکستان گلگت بلتستان لے کر اور آزاد کشمیر کشمیریوں کے حوالے کر کے مطمئن' بھارت وادی کشمیریوں کے حوالے اور جموں' لداخ' کارگل خود لے کر مطمئن جبکہ کشمیری دو اہم ترین جگہوں پر مشتمل آزاد اور خود مختار علاقے لے کر ایک حد تک مطمئن ہو جائیں گے۔ بھارت اور پاکستان اس الزام سے بھی بچ جائیں گے کہ انہوں نے کشمیر کو ایک دوسرے کے حوالے کر دیا ہے۔ دونوں دنیا کے سامنے جواز پیش کر کے خفت سے بچ جائیں گے کہ کشمیر کشمیریوں کا تھا جو انہی کے حوالے کر دیا ہے۔ مسئلہ کشمیر پر یہی آخری حل ہی قابل قبول نظر آتا تھا۔ یہی وہ حل ہے جس میں تینوں فریقوں کو مطمئن کرنے والی بات کا بھرم قائم رکھا جا سکتا تھا۔

دسمبر 2004ء کو میں نے ایک مضمون بعنوان ''پاک بھارت تعلقات'' لکھا جو اس دور کے حالات کو سمجھنے میں معاون بنے گا۔

''پاکستان اور بھارت کے درمیان جاری مذاکرات میں تازہ پیش رفت کی خبر یہ ہے کہ دونوں ممالک 3 جنوری کو ایک مشترکہ سرحدی گشت کے ذریعے سر کریک کے مقام پر متنازعہ سمندری سرحدی حدود کا تعین کریں گے۔ ایک اور اطلاع کے مطابق دونوں ممالک بیسٹک میزائل ٹیسٹ کے قبل از وقت وارننگ سمجھوتے کے نزدیک پہنچ گئے ہیں' جبکہ منشیات کی اسمگلنگ روکنے کیلئے مشترکہ کوششوں پر اتفاق رائے ہو چکا ہے۔ لیکن ایک مرتبہ پھر پانی کے مسئلے خصوصاً بھارت کی طرف سے بگلیہار ڈیم کی تعمیر پر ہونے والے مذاکرات کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ختم ہو گئے اور ایک مشترکہ اعلامیہ جاری ہوا کہ دونوں ممالک اس مسئلہ پر مشترکہ حل تلاش کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔ پانی کا مسئلہ پاکستان کیلئے اب کشمیر کے مسئلے کی طرح اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے کیونکہ بھارت سندھ طاس معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مقبوضہ کشمیر میں دریائے چناب پر بگلیہار ڈیم بنا رہا ہے' جس سے وہ 450 میگاواٹ بجلی پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس ڈیم کی تعمیر کیلئے بھارت نے پانی ذخیرہ کرنے اور اسے روکنے کیلئے واٹر گیٹس کی تنصیب قریباً مکمل کر لی ہے۔ جن کی مدد سے وہ دو لاکھ کیوسک پانی ذخیرہ کر سکے گا۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچ گیا تو بھارت 25 روز تک پاکستان کو دریائے چناب کے پانی سے محروم رکھنے کی صلاحیت حاصل کر لے گا' جبکہ بھارت نے دریائے نیلم پر کشن گنگا ہائیڈرو پاور پروجیکٹ کی تعمیر بھی بڑی تیزی سے شروع کی ہوئی ہے۔ جس سے وہ 300 میگاواٹ بجلی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بھارت کی طرف سے دریائے نیلم کے پانی کو ذخیرہ کرنے کے اقدامات بھی جاری ہیں۔ یہ صورت حال پاکستان کیلئے بے حد تشویش ناک ہے، جہاں پہلے ہی پانی کی کمی اب بعض علاقوں میں قحط جیسے اثرات مرتب کرنے لگی ہے۔ پاکستان اس صورت حال پر

Marfat.com

بھارت سے فوری بات چیت کا متقاضی تھا اور اس کیلئے اس سال 27 نومبر کی تاریخ طے پائی تھی جو بھارت کے مطالبے پر 6 دسمبر کر دی گئی۔ اس کے بعد 15 دسمبر کو بھارت نے اس مسئلے پر مذاکرات کئے۔ اور دو روزہ مذاکرات کا نتیجہ ایک بار چار سطری مشترکہ اعلامیہ کی صورت میں سامنے آیا جو کم از کم پاکستان کیلئے بہت پریشان کن ہے اور پاکستان کی طرف سے اس مسئلے پر عالمی عدالت انصاف کا دروازہ کھٹکھٹانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں' کیونکہ بھارت کی طرف سے اس مسئلے کو مسلسل لٹکایا جا رہا ہے' جبکہ بھارت خود اس طرح وقت حاصل کر کے تیزی سے تعمیرات مکمل کر رہا ہے اور پاکستان کے بعض عسکری ماہرین کی رائے کے مطابق بھارت مارچ 2005ء تک بگلیہار ڈیم مکمل کر کے اس پر گیٹ لگا دے گا' اس سے پاکستان کو جہاں پانی کی قلت کا مسئلہ درپیش ہوگا' وہاں دفاعی اعتبار سے بھی اس ڈیم کی تعمیر پاکستان کیلئے نقصان دہ ثابت ہوگی۔ اس سے ہیڈ مرالہ واٹر ورکس اور بی آر بی نہر میں پانی کم ہو جائے گا جو ہمارے دفاعی نظام کیلئے ایک زبردست دھچکا ثابت ہو سکتا ہے۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان سارک کانفرنس منعقدہ جنوری 2004ء کے فوری بعد مذاکرات کے ذریعے تعلقات کی بحالی کا جو عمل شروع ہوا تھا اب تک کی صورت حال یہ ہے کہ اس میں سوائے ثقافتی وفود کے تبادلے' ادب وثقافت پر گفتگو' آزادانہ تجارت' مشترکہ ثقافت اور ایک جیسا کلچر ہونے کی باتوں کے اور کوئی پیش رفت بظاہر دکھائی نہیں دے رہی۔ صورت حال یہ ہے کہ پاکستان کی طرف سے بے پناہ لچک دار رویے کے باوجود ابھی تک بھارت کی طرف سے اس مسئلے پر کوئی پیش رفت دکھائی نہیں دے رہی۔ فروری 2004ء کے آخری ہفتے میں ایک بھارتی چینل کے ساتھ اپنے انٹرویو میں صدر جنرل پرویز مشرف نے انڈیا ٹوڈے کے زیر اہتمام سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ پاکستان نے چار سال سے اپنا دفاعی بجٹ منجمد کیا ہوا ہے۔ ہم اپنی فائر پاور مضبوط کرنے کے ساتھ فوجی کی تعداد میں کمی کر رہے ہیں۔ انہوں نے یہ بات بھی کہی تھی کہ دونوں ممالک کو بہتر تعلقات کیلئے ماضی کو بھول کر مستقبل پر نظر رکھنی ہوگی اور اس کی ابتداء مسئلہ کشمیر کے حل سے ہونی چاہئے۔ اس کے بعد صدر پرویز مشرف کی طرف سے مسلسل بھارت کو کھلے دل سے پیش کشیں کی جا رہی ہیں کہ وہ اپنی ہٹ دھرمی کو چھوڑ کر مسئلہ کشمیر کے حل کیلئے عملی اقدامات کرے۔ اس ضمن میں صدر جنرل پرویز مشرف نے پہلے اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق مسئلے کے حل کے 57 سال پرانے پاکستانی مؤقف پر لچک کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ امن کی بحالی کیلئے پاکستان اپنے اس اصولی مؤقف میں نرمی کرنے کیلئے تیار ہے' جس کے بعد کشمیر کی جغرافیائی اور مذہبی بنیادوں پر تقسیم کے حوالے سے آراء پر بحث ہوتی رہی اور اب صدر جنرل پرویز مشرف نے کہا ہے کہ ان کے پاس مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کے 15 آپشنز موجود ہیں۔ اگر بھارت سنجیدہ ہو تو وہ کسی بھی آپشن پر بات کر سکتے ہیں۔ صدر جنرل مشرف کی طرف سے اتنی فراخ دلانہ پیشکشوں کے بعد امید کی جا رہی تھی کہ بھارت کی موجودہ کانگریس حکومت' جو خود کو سیکولر اور کھلے دل و دماغ سے مذاکرات کی دعوے دار بھی سمجھتی ہے' ضرور کوئی پیش رفت کرتی لیکن صدر جنرل مشرف کو بھی لاہور میں ساؤتھ ایشین جرنلسٹ فورم پر یہ بات کہنی پڑی کہ ان کی طرف سے خیرسگالی اقدامات کا بھارت کی طرف سے ابھی تک کوئی مثبت جواب نہیں ملا' جو ان کیلئے مایوس کن بات ہے۔ سارک کانفرنس اسلام آباد کے موقع پر جاری اعلامیہ میں پاکستان اور بھارت کے درمیان کمپوزٹ ڈائیلاگ کا معاہدہ طے پایا تھا اور پاکستان کی طرف سے ہمیشہ اس بات کا اعادہ کیا گیا کہ پاکستان مسئلہ کشمیر کو اولیت اور سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے' کیونکہ اس کے بغیر ہونے والے دوستی

Marfat.com

اور خیر سگالی اقدامات کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ پاکستان کی طرف سے دنیا کے ہر فورم پر یہ بات کہی گئی ہے اور ساری دنیا نے اس بات کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے کہ واقعی جب تک پاکستان اور بھارت کے درمیان اصل نزاع مسئلہ کشمیر طے نہیں پاتا' باقی اقدامات بے معنی ہو کر رہ جائیں گے۔ پاکستان کی طرف سے مسئلہ کشمیر کو بنیادی مسئلہ قرار دینے' اس کی اہمیت منوانے اور بھارت کی طرف سے ''مسئلہ کشمیر کو اہم مسئلہ'' تسلیم کرنے کے باوجود بھارت نے اس مسئلے کو سوائے ایک فروعی مسئلے کے ابھی تک کوئی اور اہمیت نہیں دی' جو افسوسناک اور پریشان کن رویہ ہے۔ بھارتی وزیراعظم جو پہلے پہل پرجوش دکھائی دیتے تھے' اب وہ بھی ''کشمیر میں مداخلت'' کے حوالے کے بغیر کوئی بیان نہیں دیتے اور ایک ہی بات بھارت کی لیڈر شپ کی طرف سے دہرائی جاتی ہے کہ پاکستان کشمیر میں مداخلت بند کرنے کا اپنا وعدہ پورا کرے۔ 15 دسمبر کو پاکستانی وزیر خارجہ خورشید قصوری کے ساتھ ملاقات کرنے والے بھارتی فود کی طرف سے بھی یہی بات دہرائی گئی اور حیرت انگیز طور پر کہا گیا کہ ابھی تک آزاد کشمیر میں ٹریننگ کیمپ موجود ہیں۔ اس نوعیت کے بیانات سوائے پریشر ٹیکٹکس کے اور کوئی اہمیت نہیں رکھتے' جبکہ بھارت کو اب اس کی ضرورت نہیں رہی' کیونکہ یہ پاکستان ہی تھا جس کی طرف سے یکطرفہ سیز فائر اور بے پناہ اظہار خلوص کی آڑ میں اس نے کنٹرول لائن پر باڑ مکمل کر لی' جبکہ ماضی میں اس کی یہ کوشش کبھی بھی کامیاب نہیں ہوئی۔ حال ہی میں امریکہ میں بننے والی تازہ پالیسی اور قانون سازی کے بعد کہا جاتا ہے کہ امریکہ پاکستان کے مسائل کیلئے کردار ادا کرنے پر مجبور ہوگا اور یہ خوش فہمی بھی ہمارے ہاں پائی جا رہی ہے کہ اس قانون کی منظوری کے بعد اب امریکہ ضرور پاکستان اور بھارت کے درمیان ثالث کا کردار ادا کرے گا۔ کیا ایسا ممکن ہوگا؟ اس سوال کا جواب تو چند مہینوں کے اندر مل جائے گا لیکن ماضی کی صورت حال اور چند روز پہلے تک کی امریکی قیادت کے بیانات سے یہ بات صاف ظاہر ہو چکی ہے کہ امریکہ' پاکستان اور بھارت کے درمیان نہ صرف یہ کہ ثالثی کا کردار ادا نہیں کرے گا بلکہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ امریکہ صرف پاکستان سے ہی خیر سگالی اقدامات کروا رہا ہے' جبکہ فریق مخالف پر اس کی طرف سے کوئی دباؤ نہیں ہے اور صدر جنرل مشرف کے حالیہ غیر ملکی دورے میں تو انہوں نے برطانیہ سے پھر مسئلہ کشمیر کے حل کیلئے ثالثی کی درخواست کی تھی' جسے اس مسئلے کے بانیوں نے کمال سفارت کاری سے انکار کر دیا' کیونکہ بھارت کی مرضی کے بغیر شاید برطانیہ اور امریکہ اس مسئلے میں کودنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ صرف پاکستان کی طرف سے ثالثی کی خواہش کوئی معنی نہیں رکھتی۔ بھارت کا ایک طرف تو یہ مئوقف ہے کہ مسئلہ کشمیر اور دیگر معاملات صرف ''بائی لیٹرل'' طریقے سے حل کئے جائیں لیکن حقائق یہ ہیں کہ بائی لیٹرل طریقے سے وہ مسئلہ کشمیر کو چھیڑنے کیلئے بھی تیار نہیں' جو طے شدہ مسائل ہیں' ان پر بھی ایسے ایسے نکات اٹھاتا ہے جو صرف اُلجھاؤ پیدا کرتے ہیں۔ کشمیر مظفر آباد بس سروس وہ بھارتی پاسپورٹ کے بغیر شروع کرنے پر تیار نہیں' جبکہ بھارت یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ بین الاقوامی قوانین اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق دونوں اطراف کے کشمیریوں کو ایک دوسرے حصے میں جانے کی مکمل آزادی ہے اور کنٹرول لائن کو بین الاقوامی سرحد اسی لئے نہیں سمجھا جاتا کہ ابھی یہ مسئلہ طے نہیں ہو سکا۔ اسی نوعیت کی صورت حال سمندری سفر' کھوکھراپار موناباؤ ریلوے سروس کو بھی درپیش ہے کہ بھارت ہر مسئلہ کو خوامخواہ الجھا دیتا ہے اور معمولی مسائل پر بھی پاکستان کے برعکس فراخ دلی کا مظاہرہ نہیں کرتا۔ ایک عرصے سے گیس پائپ لائن کا مسئلہ چل رہا ہے۔ پاکستان نے بھارت کو اس پائپ لائن کی مکمل سکیورٹی دے دی ہے لیکن اچانک بھارتی نے عجیب

Marfat.com

وغریب مطالبہ کردیا کہ پہلے پاکستان سے ''موسٹ فیورٹ نیشن'' قرار دے' اس کے بعد ہی وہ اس مسئلے پر پیش رفت کرے گا۔اس کے ساتھ ہی بھارت سے ڈیزل خریدنے کی شرط بھی عائد کردی ہے۔یوں دکھائی دیتا ہے کہ تجارت اور ثقافت میں بھی بھارت صرف ان اقدامات پر رضامندی ظاہر کرے گا' جن میں اسے پاکستان پر فوقیت حاصل رہے۔ابھی تک خیر سگالی کے جتنے اہم اقدامات ہوئے ہیں' پاکستان کی طرف سے ہی شروع کئے گئے ہیں' بھارت کی طرف سے کوئی بڑا اقدام نہیں اٹھایا گیا۔اب بھارت کی طرف سے اچانک پاکستان کی آبی ناکہ بندی نے صورت حال کو پھر بگاڑنا شروع کردیا ہے۔معاہدہ سندھ طاس کی رو سے دریائے سندھ' چناب اور جہلم پاکستان کے حصے آئے تھے' جبکہ دریائے راوی' ستلج اور بیاس بھارت کو ملے تھے۔اس معاہدے میں واضح طور پر لکھا گیا ہے کہ بھارت اگر پاکستان کے حصے میں آنے والے دریاؤں پر پن بجلی کی غرض سے ڈیم تعمیر کرے گا تو ان میں پانی ذخیرہ کرنے یا انہیں روکنے کی اجازت نہیں ہوگی لیکن بھارت نے سندھ طاس معاہدے کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جو وہ اقوام متحدہ کی کشمیر سے متعلق قراردادوں کے ساتھ کرتا آیا ہے۔اس نے دریائے جہلم پر وولر بیراج' دریائے چناب پر بگلیہار ڈیم اور دریائے نیلم پر کشن گنگا پروجیکٹ کا آغاز کردیا ہے۔بھارت کی طرف سے یہ بھی کہا جارہا ہے کہ ہم معاہدہ طاس کی خلاف ورزی نہیں کررہے۔پاکستان جب بھی طے شدہ پروگرام کے مطابق مسئلہ کشمیر پر بات چیت کیلئے کہتا ہے تو بھارتی وزیر خارجہ نٹور سنگھ کی طرف سے پاکستان کو صبرو تحمل کی تلقین کرتے ہوئے مقبوضہ کشمیر میں مداخلت روکنے کی تلقین کی جاتی ہے۔بھارت' اسرائیل' روس' امریکہ' برطانیہ اور دنیا کے دوسرے ممالک سے روایتی اسلحے کے انبار جمع کررہا ہے۔لیکن جب امریکہ کی طرف سے پاکستان کو اسلحہ دینے کی بات ہوتی ہے تو بھارتی قیادت اسے جنوبی ایشیا کے امن کیلئے خطرناک قرار دیتی ہے بلکہ اب تو پاک بھارت مذاکرات کیلئے بھی نقصان دہ قرار دینے لگتا ہے۔امریکہ کی طرف سے پاکستان کو ایف۔16 ملنے پر اسے شدید اعتراض ہے' جبکہ امریکہ بھارت کو ایف۔16 سمیت جدید ترین اسلحہ فروخت کرنے کی پیش کش کررہا ہے۔یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ پاک' بھارت تاریخ میں شاید پہلی بار یہ موقع آیا ہے' جب پاک بھارت تعلقات میں بہتری اور دیرینہ مسائل کے حل کیلئے سازگار اور بہترین فضا مل رہی ہے۔پاکستان کی موجودہ حکومت نے ہی بھارت کے ساتھ تعلقات میں انقلابی طرز عمل اختیار کیا ہے ورنہ تو ماضی میں بے نظیر بھٹو اور نواز شریف جیسی لبرل اور جمہوری حکومتوں کی طرف سے بھارت کے ساتھ خیر سگالی کیلئے کئے جانے والے اقدامات کا اپوزیشن جماعتیں جو حشر کرتی رہی ہیں' وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔اگر اس آئیڈیل فضا کا بھی فائدہ نہ اٹھایا گیا اور بھارت کی طرف سے جوابی خیر سگالی کے عملی اقدامات نہ ہوئے تو دونوں ممالک کے کروڑوں عوام کی قسمت بدلنے اور خوشحالی لانے کا خواب شاید کبھی اپنی تعبیر نہ پاسکے۔اس ضمن میں تمام تر تحفظات کے باوجود یہ بات ضروری ہے کہ امریکہ' برطانیہ اور دنیا کی دوسری اہم قوتیں جس طرح پاکستان پر اخلاقی دباؤ ڈالتی ہیں' اسی طرح وہ بھارت پر بھی دباؤ ڈال کر اور خود ثالث بن کر مسئلہ کشمیر کا باعزت حل نکالیں' کیونکہ اس بنیادی مسئلے کو حل کئے بغیر دوستی اور محبت کیلئے کئے جانے والے اقدامات کوئی معنی نہیں رکھتے۔

(روزنامہ جنگ سنڈے ایڈیشن 26 دسمبر 2004ء مصنف طارق اسمٰعیل ساگر)

Marfat.com

پاکستان اور بھارت میں بظاہر تو امن مذاکرات چل رہے تھے اور ان سے دنیا نے بڑی امیدیں بھی وابستہ کر لی تھیں لیکن دسمبر 2004ء میں واشنگٹن امریکہ میں قائم انسٹی ٹیوٹ فار سائنس اینڈ انٹرنیشنل سکیورٹی کی ایک رپورٹ نے ساری دنیا کو چونکا کر رکھ دیا ہے۔

واشنگٹن میں جاری کردہ ایک جائزہ میں دعویٰ کیا گیا کہ پاکستان کے پاس 50 تا 90 ایٹمی ہتھیار موجود ہیں' جبکہ اس کے مقابلے میں بھارت کے ایٹمی ہتھیاروں کی تعداد 55 سے 115 کے درمیان بتائی گئی۔ دنیا بھر میں ایٹمی معاملات پر نظر رکھنے والے واشنگٹن میں قائم انسٹیٹیوٹ آف سائنس اینڈ انٹرنیشنل سکیورٹی نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ پاکستان کے پاس ایک ہزار سے ایک ہزار دو سو پچاس کلوگرام تک انتہائی افزودہ یورینیم یا یورینیم 235 جو 20 فیصد یا اس سے زیادہ افزودہ کیا جا چکا ہے' وہ بھی موجود ہے۔

اس ادارے نے یہ یقین ظاہر کیا ہے کہ ہندوستان کے پاس بھی یہ مادہ موجود ہے جو ہتھیاروں کی تیاری میں استعمال کے لائق ایٹمی ایندھن ہوتا ہے' تاہم اس جائزہ میں یہ نہیں بتایا گیا کہ بھارت کے پاس یہ افزودہ یورینیم کتنی مقدار میں ہے' ویسے جوہری ہتھیاروں کی تیاری میں استعمال ہونے والی ایک اور ایٹمی دھات پلوٹونیم کی 300 سے 470 کلوگرام مقدار بھارت کے پاس ہے' جبکہ پاکستان کے پاس صرف 20 سے 60 کلوگرام پلوٹونیم ہے۔ پاکستان ایٹمی ایندھن کی تیاری کیلئے بالخصوص یورینیم پر اور بھارت پلوٹونیم پر انحصار کرتا ہے۔

جس انسٹیٹیوٹ نے یہ جائزہ مرتب کیا کہ یہ وہی ادارہ ہے جس نے 2003ء میں یہ رپورٹ شائع کی تھی کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان ایران' لیبیا اور شمالی کوریا کو ایٹمی ٹیکنالوجی فروخت کرنے میں ملوث ہیں۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے اعتراف سے ایک سال قبل شائع ہونے والی اس رپورٹ سے امریکہ میں تہلکہ مچ گیا تھا' لیکن پاکستان میں اسے قیاس آرائی پر مبنی قرار دے کر مسترد کر دیا گیا تھا۔ اس ادارے کے تازہ ترین سروے میں یہ کہا گیا کہ بھارت' پاکستان اور اسرائیل کے ایٹمی ہتھیاروں کی تعداد دن بدن بڑھتی جا رہی ہے اور بین الاقوامی برادری کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ جوہری ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنے کیلئے انشقاقی (Fissile) مواد کی پیداوار پر پابندی لگائے۔

پاکستان' بھارت اور اسرائیل کو اگرچہ بین الاقوامی برادری میں ایٹمی ممالک کے طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا' لیکن درحقیقت یہ وہ ممالک ہیں جن کے پاس ایٹمی ہتھیار موجود ہیں۔ شمالی کوریا کو اس معاملے میں مبہم ملک کا درجہ دیا گیا ہے' جبکہ جنوبی افریقہ وہ واحد ملک ہے جس نے نسل پرست حکومت کے خاتمے کے بعد اپنا ایٹمی پروگرام ختم کر دیا تھا۔

انسٹیٹیوٹ فار سائنس اینڈ انٹرنیشنل سکیورٹی کے اس جائزے میں بتایا گیا ہے کہ اسرائیل کے پاس 510 سے 650 کلوگرام پلوٹونیم موجود ہے' جبکہ اس کے جوہری ہتھیاروں کی تعداد 110 سے 190 ہے' شمالی کوریا کی ملکیت میں 15 سے 38 کلوگرام پلوٹونیم اور 2 سے 9 ایٹمی ہتھیار ہیں اور جنوبی افریقہ نے اگرچہ 1990ء کی دہائی کے شروع میں اپنا ایٹمی پروگرام ختم کر دیا تھا' اس کے باوجود اس کے پاس 430 سے 580 کلوگرام غیر تابکار یورینیم کا ذخیرہ موجود ہے۔

اس سروے میں یہ اعتراف کیا گیا کہ اسرائیل کے پاس جو پلوٹونیم اور انتہائی افزودہ یورینیم ہے' اس کی صحیح مقدار کا تخمینہ لگانا بہت مشکل ہے۔ اسی طرح بھارت جو گزشتہ کئی سال سے گیس سے چلنے والے ایک سینٹری فیوج پلانٹ پر

Marfat.com

بھاری مقدار میں انتہائی افزودہ یورینیم تیار کر رہا ہے' لیکن سروے رپورٹ مرتب کرنے والے ڈیوڈ البرائٹ اور کمبر لے کریمر بھارت کی تحویل میں موجود افزودہ یورینیم کی صحیح مقدار کا تخمینہ پیش کرنے سے قاصر رہے۔

جائزہ رپورٹ تیار کرنے والوں کا کہنا تھا کہ پاکستان کے پاس کتنا انفجاری مواد ہے' اس بارے میں بھی درست تخمینہ لگانا بہت مشکل کام ہے' لیکن اس کے اسٹاک میں بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اتنا زیادہ جوہری مواد ہے کہ وہ بھارت کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ شمالی کوریا نے بھی گزشتہ دو ادوار میں نامعلوم مقدار میں وہ پلوٹونیم الگ کر لیا ہے جو جوہری ہتھیاروں کی تیاری میں استعمال ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ اب وہ یورینیم افزودہ کرنے میں مصروف ہو۔

تاہم اس رپورٹ میں جو دلچسپ بات کہی گئی ہے' وہ یہ ہے کہ ان پانچوں ملکوں کے پاس جو مجموعی ہتھیار اور مواد موجود ہیں' وہ ترقی یافتہ ملکوں کے ایٹمی ذخائر کے مقابلے میں کہیں کم ہیں' ترقی یافتہ ملکوں کے پاس بہت بڑی تعداد میں ایٹمی ہتھیار موجود ہیں۔ 2003ء کے اختتام تک ان کے پاس 3700 میٹرک ٹن پلوٹونیم اور انتہائی افزودہ یورینیم موجود تھا جو تقریباً 60 ملکوں میں ہزاروں کی تعداد میں جوہری ہتھیاروں کی تیاری میں استعمال ہو سکتا تھا' اگرچہ کچھ انفجاری مواد تلف کر دیا گیا' لیکن اب بھی بھاری مقدار میں یہ تیار ہو رہا ہے اور اس کی وجہ سے ہر سال اس کی مقدار بڑھتی جا رہی ہے۔

دنیا بھر میں پلوٹونیم اور انتہائی افزودہ یورینیم کے ذخائر تقریباً یکساں ہیں' جبکہ سول اور فوجی اداروں کے پاس موجود انفجاری مواد کی مقدار بھی تقریباً ایک ہی جیسی ہے' لیکن اس کے باوجود زیادہ تر پلوٹونیم سول اسٹاک میں موجود ہیں اور افزودہ یورینیم کی بھاری مقدار ملٹری اسٹاک کی تحویل میں ہے۔

دنیا کے تسلیم شدہ ایٹمی ممالک کے پاس فوجی استعمال کیلئے افزودہ یورینیم اور پلوٹونیم کی خاطر خواہ مقدار موجود ہے' فوجی اسٹاک میں موجود اس افزودہ یورینیم اور پلوٹونیم کی بڑی مقدار ایٹمی ہتھیاروں' محفوظ ہتھیاروں' تباہ شدہ ہتھیاروں' بحریہ کے پاس اور پروڈکشن ری ایکٹر پروگراموں میں زیر استعمال ہے۔

▪▪▪▪

پاکستان اور بھارت کے درمیان اگرچہ مذاکرات کا سلسلہ جاری تھا کہا جاتا تھا کہ ان مذاکرات کے ذریعے مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کی راہ بھی ہموار ہو جائے گی لیکن بھارت نے مذاکرات کے علی الرغم اپنا 9 نکاتی فارمولہ بھی پیش کر دیا اس فارمولے کا لب لباب یہ تھا کہ پاکستان کے ساتھ دو طرفہ تعلقات کو وسعت دینے' تجارت میں اضافہ کرنے اور ثقافتی میل جول بڑھانے کیلئے تو مذاکرات کا سلسلہ جاری رہے گا لیکن بھارت مسئلہ کشمیر اپنے طور پر حل کرنے کیلئے کشمیر کے سیاسی وعسکری گروپوں سے بات چیت کرے گا اور مقبوضہ کشمیر کے اقتصادی مسائل حل کرنے پر توجہ دے گا۔ بھارت کی وزارت داخلہ کے ترجمان نے اس 9 نکاتی فارمولے کو پیش کرتے ہوئے وضاحت کی کہ بھارت ان عسکری گروپوں سے بات چیت کو اہمیت دے گا جو یا تو ہتھیار ڈال چکے ہیں یا ہتھیار ڈالنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور بھارت کے ساتھ امن سے رہنے کے خواہاں ہیں۔ 9 نکاتی فارمولے میں بھارتی افواج کو جدید ترین ہتھیاروں سے لیس کرنے کا پروگرام بھی شامل تھا تاکہ مسلح جدوجہد کو زیادہ قوت سے کچلا جا سکے۔ حریت کانفرنس کے چیئرمین سید علی گیلانی نے بھارتی فارمولے کو مسترد کرتے ہوئے پاکستان کے بغیر بھارت کے ساتھ مذاکرات کو خارج از امکان قرار دیا۔ کشمیر کی نمائندہ عسکری تنظیم حزب المجاہدین

Marfat.com

بھی بھارت کے ساتھ مذاکرات کو چند شرائط سے مشروط قرار دیتی رہی۔حزب کے امیر سید صلاح الدین بھارت کے ساتھ مذاکرات اور جنگ بندی کے بارے میں کئی بار اپنا یہ مئوقف واضح کر چکے تھے کہ یہ اسی وقت ممکن ہے جب بھارتی فوجیں مقبوضہ کشمیر سے نکل جائیں تمام کشمیری قیدیوں کو رہا کیا جائے' بھارت مقبوضہ علاقے میں انسانی حقوق کی پاسداری اور شہری آزادی کی ضمانت دے اور کشمیر کو متنازعہ علاقہ تسلیم کرتے ہوئے کشمیریوں کو حق خودارادیت دینے کے معاملے پر پاکستان اور کشمیری قیادت سے بات چیت کرے۔پاکستان کے دفتر خارجہ نے بھی بھارتی فارمولے کو یہ کہہ کر مسترد کردیا کہ بھارت اس سے پہلے بھی اس قسم کے تجربے کرتا رہا ہے لیکن اس سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوسکا اور نہ ہی آئندہ بھارت کا مذکورہ فارمولہ کارگر ہوسکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بھارت نہایت عیاری کے ساتھ پاکستان کو مذاکرات میں الجھا کر اپنا الو سیدھا کر رہا تھا۔وہ پاکستان کے ساتھ ان معاملات پر بات چیت کرنے میں مصروف تھا جن سے اس کے اقتصادی' تجارتی' ثقافتی اور سیاسی فوائد وابستہ ہیں۔وہ پاکستان کی تجارتی منڈی پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔پاکستان کے ساتھ مشترکہ فلم سازی میں دلچسپی رکھتا تھا۔اسکے سیاسی رہنما ادیب' دانشور اور فنکار یہ باور کرانے میں مصروف تھے کہ پاکستان اور بھارت میں ایک ہی قوم بستی ہے' حالات کے جبر نے دو بھائیوں کے درمیان دیوار کھڑی کردی ہے اور اب وقت آگیا ہے کہ محبت اور پیار کی ضرب سے اس دیوار کو گرا دیا جائے۔بھارتی لیڈر برملا اس رائے کا اظہار کرتے تھے کہ اگر پاکستان اور بھارت ایک ہوجائیں تو مسئلہ کشمیر خود بخود حل ہوجائے گا۔بھارت کے 9 نکاتی فارمولے میں بھی در پردہ یہی خواہش موجود تھی۔

▪▪▪

امریکہ نے اس وقت پوری دنیا میں امن کا ٹھیکہ لے رکھا تھا۔کشمیر بھی اس کے نشانے پر تھا وہ یہاں ہر قیمت پر امن قائم کرنا چاہتا تھا۔اسے اس بات سے غرض نہیں کہ کشمیری عوام کو ان کا بنیادی حق ملتا ہے یا نہیں' وہ تو صرف اس بات میں دلچسپی رکھتا تھا کہ وہاں ہر حال میں امن قائم ہونا چاہئے۔بھارت کی ان کوششوں کو تقویت دینے کیلئے امریکہ اس کی سیاسی' سفارتی اور اخلاقی مدد کرتا رہتا ہے۔اسے معلوم ہے کہ کشمیر بھارت کے گلے کی ہڈی بنا ہوا ہے اور یہ ہڈی کسی نہ کسی طرح نکالنا ہی پڑے گی۔چنانچہ امریکہ کے تھنک ٹینکس اور اس کی این جی اوز بھی اس نیک کام میں اپنا حصہ ڈالتے رہتے ہیں۔دسمبر 2004ء میں نیپال کے دارالحکومت کٹھمنڈو میں ہونے والی ٹریک ٹو کشمیر کانفرنس بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی جس کا اہتمام ایک امریکی این جی او ''پگ واش'' (Pugwash) نے واشنگٹن سے آکر کیا تھا۔کانفرنس میں مقبوضہ و آزاد کشمیر کے سیاسی لیڈروں سمیت بھارت' پاکستان' برطانیہ' امریکہ اور کوئی یورپی ملکوں کے ساتھ سے زیادہ مندوبین نے شرکت کی۔آزاد کشمیر سے مسلم کانفرنس کے صدر اور مجاہد اول سردار قیوم خان کے فرزند سردار عتیق' پیپلز پارٹی آزاد کشمیر کے صدر بیرسٹر سلطان محمود جموں و کشمیر پیپلز پارٹی کے صدر خالد ابراہیم اور لبریشن لیگ آزاد کشمیر کے صدر جسٹس (ر) عبدالمجید ملک کو کانفرنس میں مدعو کیا گیا تھا جبکہ ممتاز دفاعی تجزیہ نگار ریٹائرڈ جنرل جناب طلعت مسعود کو پاکستان سے بلایا گیا تھا۔مقبوضہ کشمیر سے کانفرنس میں شریک ہونے والوں میں عباس انصاری گروپ کے میر واعظ عمر فاروق' پروفیسر عبدالغنی بھٹ' ڈیموکریٹک فریڈم پارٹی کے شبیر احمد شاہ اور جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ کے یسٰین ملک کا نام نمایاں تھا۔ظاہر ہے کہ اس

Marfat.com

کانفرنس کے انعقاد میں امریکہ اور بھارت کی حکومتوں کی رضامندی ضرور شامل تھی ورنہ نیپال کی حکومت اس کی اجازت ہی نہ دیتی۔ نیپال بھارت کی بھوٹان جیسی طفیلی ریاست تو نہیں ہے لیکن اس کے باوجود وہ بھارت کے حکم سے سرتابی کی مجال نہیں رکھتی۔ دونوں ملکوں کے درمیان آمدورفت میں بھی ویزے کی پابندی نہیں ہے۔ کوئی بھی بھارتی باشندہ اپنی شناخت کرا کے سرحد پار کر سکتا ہے اس مقصد کیلئے اس کے پاس شناختی کارڈ' ڈرائیور لائسنس' انکم ٹیکس سرٹیفکیٹ یا ایسی ہی کسی قانون دستاویز کا ہونا ضروری ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ وہ واقعی بھارتی باشندہ ہے۔

اس کانفرنس میں سید علی گیلانی کو شرکت سے روک دیا گیا۔ پہلے تو یہ شوشہ چھوڑا گیا کہ اس کانفرنس میں سید علی گیلانی کو مدعو ہی نہیں کیا گیا۔ ممکن ہے کہ کانفرنس کے منتظمین یا گیلانی صاحب کے سیاسی مخالفین کی طرف سے یہ بات پھیلائی گئی ہو تا کہ کشمیری عوام کا ردعمل معلوم کیا جا سکے۔ لیکن جب انہیں اندازہ ہوا کہ اس طرح تو کانفرنس کی کریڈیبلٹی ہی مجروح ہو جائے گی تو گیلانی صاحب کو باضابطہ دعوت نامہ جاری کر دیا گیا البتہ انہیں شرکت سے روکنے کی ذمہ داری بھارت پر ڈال دی گئی۔ گیلانی صاحب کا کہنا تھا کہ وہ تو کھٹمنڈو کانفرنس میں شریک ہونا چاہتے تھے لیکن بھارت نے ان کے پاس کوئی ایسی قانونی دستاویز ہی نہیں رہنے دی جسے دکھا کر وہ سرحد پار کر سکتے۔ بھارت نے ان کا پاسپورٹ 1986ء سے ضبط کر رکھا تھا اور اسے آج تک واگزار نہیں کیا گیا۔ او آئی سی اپنی کانفرنسوں میں انہیں حریت کانفرنس کے چیئرمین کی حیثیت سے بطور مندوب مدعو کرتی تھی۔ اقوام متحدہ اور انسانی حقوق کمشن کے مختلف اجلاسوں میں بھی انہیں بلایا جاتا۔ گیلانی صاحب ان کانفرنسوں اور اجلاسوں میں شرکت کیلئے ہر بار پاسپورٹ اور دیگر قانونی دستاویزات کیلئے درخواست دیتے لیکن انہیں کا جواب نفی میں ملتا۔ اب کی دفعہ وہ حج پر جانا چاہتے تھے' تمام تیاریاں مکمل تھیں لیکن بھارت نے انہیں اجازت دینے سے انکار کر دیا اس طرح وہ ایک مقدس مذہبی فریضہ ادا کرنے سے بھی محروم رہے' یہی صورت حال کھٹمنڈو کانفرنس کے معاملے میں بھی پیش آئی۔ میر واعظ عمر فاروق نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے فرمایا کہ سید علی گیلانی بھی اس کانفرنس میں شرکت کرنے والے تھے لیکن نجانے کیوں وہ نہ آ سکے۔ جب انہیں بتایا گیا کہ ان کے پاس کوئی قانونی دستاویز ہی نہ تھے جس دکھا کر وہ کھٹمنڈو جا سکتے تو میر واعظ نے مسکراتے ہوئے کہا کہ میں بھی اپنا ڈرائیونگ لائسنس دکھا کر یہاں آیا ہوں۔ گویا ان کے نزدیک ڈرائیونگ لائسنس تو گیلانی صاحب کے پاس ہونا چاہئے تھا۔ اول تو ڈرائیونگ لائسنس گیلانی صاحب کے پاس نہیں تھا اگر ہوتا بھی تو بھارت اسے ضبط کر لیتا۔ بھارت گیلانی صاحب کو کوئی رعایت دینے کیلئے تیار نہیں تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہی کشمیری عوام کے حقیقی ترجمان ہیں' وہ ایک لاکھ سے زیادہ کشمیری شہداء کے لہو کا سودا کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ دوسرے کشمیری لیڈروں کو تو ٹریپ بھی کیا جا سکتا تھا لیکن گیلانی صاحب کیلئے بھارت ابھی تک کوئی ایسا جال نہیں تیار کر سکا جس میں انہیں پھانسا جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ انہیں الگ رکھ کر کشمیر پر سودے بازی کرنا چاہتا تھا۔

Marfat.com

2005ءاور2006ء

پاکستان اور بھارت کے تعلقات میں روز اول سے کبھی استحکام نہیں آیا۔ دونوں ممالک کے درمیان دوستی تاحال ابھی خواب بنی ہوئی ہے۔ بھارت کو اپنے حجم پر زعم ہے اور اسے غلط یا درست یہ احساست تفاخر دلاتا ہے کہ وہ عالمی منظر کا اہم فریق ہے۔ اس بناء پر اسکے نسبتاً چھوٹے پڑوسی اسکی اطاعت کا دم بھرتے ہیں۔ اسی تاثر کو راسخ کرنے کیلئے وہ براہ راست اپنی افواج' خفیہ دشت گرد ادارے غرضیکہ کسی بھی جائز و ناجائز ہتھکنڈے کو استعمال کرنا درست سمجھتا ہے اور اس کا گاہے بگاہے عملی مظاہرہ بھی کرتا آیا ہے۔ گزشتہ ایک سال کے دوران دونوں ممالک کے درمیان جس قدر مذاکرات ہوئے آزادی کی 59 سالہ تاریخ میں اس کی کم ہی مثال ملے گی۔ ان مذاکرات کیلئے کونسے عوامل کارفرما تھے جنہوں نے جذبہ محرکہ کا کام دیا' یہ الگ اور طولانی بحث ہے۔ دونوں ملکوں نے نوے کے عشرے میں جامع مذاکرات کیلئے آٹھ نکات پر مشتمل ایک ایجنڈا ترتیب دیا تھا جو مذاکرات کیلئے اساس اور حوالے کا کام دیتا ہے۔ 2002ء میں جب بھارت نے اپنی کم وبیش دس لاکھ فوج کو کیل کانٹے سے لیس کر کے پاکستان کی سرحدوں پر تعینات کر دیا تھا اور ایک سال تک دونوں افواج ایک دوسرے کے سامنے صف آرا رہیں اور کسی بھی لمحے جنگ چھڑ جانے کا احتمال موجود رہا۔ بین الاقوامی دباؤ نے اپنا رنگ دکھایا اور بھارت کو اپنی فوج کو سرحدوں سے ہٹانا پڑا۔ پاکستان نے بھی اس کا مثبت جواب دیا۔ ایٹمی ہتھیاروں سے لیس دو انتہائی قریبی ہمسایہ ممالک کے درمیان اس صف آرائی اور جنگ ہوئے بغیر افواج کی واپسی نے پہلی مرتبہ نئی دہلی اور اسلام آباد کو یہ باور کرنے پر مجبور کر دیا کہ اب انکے درمیان مسائل کو حل کرنے کیلئے جنگ بطور ایک حل باقی نہیں رہی۔ اب انہیں تنازعات طے کرنے کیلئے کسی دوسرے راستے کا انتخاب کرنا ہوگا۔ کئی نشیب و فراز آنے کے بعد بھارتی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی اسلام آباد آئے اور اس طرح ایک مشترکہ بیان جاری ہونے کے بعد سارک کا اجلاس ہوا جس کی قیادت پاکستان کے حصے میں آئی اور دیرینہ ایجنڈے پر مذاکرات کیلئے ڈول ڈالنے پر مفاہمت ہوگئی۔ اسکے ساتھ ہی مذاکرات کا پہلا دور شروع ہوگیا جبکہ دوسرا دور زیر نظر سال میں مکمل ہوا۔ پہلے سال میں انہیں بہتر بنانے اور مستحکم بنانے پر توجہ دی گئی۔ جن آٹھ نکات پر مذاکرات ہوئے ان میں 1- تنازع کشمیر 2- امن و سلامتی 3- سیاچن 4- وولر بیراج 5- سر کریک 6- دہشت گردی و انسداد منشیات 7- دوستانہ تبادلوں کا فروغ اور 8- اقتصادی و تجارتی تعلقات میں اضافہ شامل تھے۔ پہلے دونوں موضوعات پر انکی اہمیت کے پیش نظر طے تھا خارجہ سیکرٹری صاحبان ان کے بارے میں مذاکرات کریں گے جبکہ دیگر موضوعات اعلیٰ حکام اور ماہرین کی سطح پر ہونا طے پائے تھے۔ یہ بھی طے تھا کہ اعلیٰ حکام کے مذاکرات کے نتائج کا جائزہ خارجہ سیکرٹری لیں گے اور خارجہ سیکرٹری صاحبان کے مذاکرات مکمل ہونے پر مجموعی نتائج کا جائزہ وزرائے خارجہ کی سطح پر لیا جائے گا۔ عملی طور پر یہ پوری کارروائی طے شدہ طریق کار کے مطابق جاری رہی اور مکمل ہوئی۔ نتیجے کے اعتبار سے یہ مذاکرات کسی بڑی ابتداء کا مضمون نہ بن سکے۔ ہر چند بعض شعبوں میں پیش رفت ہوئی لیکن اسے کامیابی کی بڑی جست

Marfat.com

سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔اس کا سبب بھارت کی سوچ کی یہ بنیادی خرابی ہے کہ پاکستان کے ساتھ تعلقات کے ضمن میں ہر شعبے میں آگے بڑھنا ہے بلکہ تیزی سے آگے بڑھنا ہے اور مسئلہ کشمیر پر آگے کی جانب کسی بھی قدم سے گریز کرنا ہے۔ پاکستان کا نقطہ نگاہ اس سے سراسر مختلف ہے۔وہ اس کا مرکا خواہاں ہے کہ تنازعہ کشمیر پر پیش رفت کئے بغیر کسی بھی دوسرے شعبے میں آئے بڑھنا بے معنی رہے گا۔ پاکستان سمجھتا ہے کہ تنازعہ کشمیر' پاکستان اور بھارت کی آزادی کے ایجنڈے کا حصہ ہے اگر یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا تو یہ ایجنڈا نامکمل رہے گا۔پاکستان کے خیال میں کشمیر کے ڈیڑھ کروڑ مسلمانوں کی تقدیر کا سوال اس تنازعہ سے منسلک ہے۔اگر اس مسئلے کو حل نہ کیا جائے اور دیگر موضوعات پر سرگرمی دکھائی گئی تو یہ حرماں نصیب کشمیریوں کے ساتھ سراسر زیادتی ہوگی۔ بھارت تنازعہ کشمیر کو مستقلاً حل کرنے کی بجائے اس سے گلوخلاصی کرانے کیلئے عارضی ہتھکنڈوں کے ذریعے اسکے حل کو ٹالنے پر یقین رکھتا ہے تاکہ کشمیری عوام پاکستان سے بدظن ہو جائیں۔انکے صبر کا پیمانہ اس حد تک لبریز ہو جائے کہ وہ پاکستان سے دلبرداشتہ ہو جائیں انہیں آزادی کے تصور سے دلچسپی نہ رہے۔پاکستان کیلئے ایسی کوئی بھی صورت حال ہرگز قابل قبول نہیں ہے۔دراصل زیر تذکرہ ایک سال کے دوران تنازعہ کشمیر کا ذکر بہت ہوا لیکن توجہ اور پیش رفت دوسرے موضوعات پر ہوئی۔اس عرصے میں تین سربراہی ملاقاتیں ہوئیں۔صدر جنرل پرویز مشرف آسٹریلیا' نیوزی لینڈ جاتے ہوئے پاکستان اور بھارت کی کرکٹ ٹیموں کے درمیان ایک روزہ میچ دیکھنے کیلئے نئی دہلی میں رکے' جہاں انکی بھارتی وزیراعظم ڈاکٹر من موہن سنگھ سے تفصیلی ملاقاتیں ہوئیں اور دونوں رہنماؤں نے کافی وقت ایک ساتھ گزارا۔ان کے درمیان دوسری ملاقات نیویارک میں ہوئی جہاں وہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کیلئے گئے تھے۔نیویارک کی ملاقات میں زیادہ امید افزا رجحانات سامنے نہیں آئے کیونکہ پاکستان نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں تنازعہ کشمیر کا ذکر زیادہ جوش وخروش سے کر دیا تھا۔تیسری سربراہی ملاقات ڈھاکہ میں دونوں ممالک کے وزرائے اعظم کے درمیان سارک کی سربراہ کانفرنس کے موقع پر ہوئی۔ان کے درمیان چوتھی ملاقات بھی ہو جاتی جب مالٹا میں دولت مشترکہ کا سربراہی اجلاس منعقد ہوا لیکن بھارتی وزیراعظم نے وہاں جانے کو ترجیح نہ دی۔سربراہی سطح کی تینوں ملاقاتوں کے اختتام پر امید افزا اعلانات جاری ہوئے۔ان اعلانات کا ایک پہلو خصوصی طور پر قابل ذکر ہے کہ پاکستان نے ہر مرتبہ دہشت گردی سے اپنی برأت کا اعلان کیا۔بھارت کو باور کرایا گیا کہ وہ سرحد پار کی مداخلت نہیں کر رہا۔بھارتی افواج کی قیادت اور بعض دیگر اہم رہنما بھی بلادھڑک کہتے رہے کہ پاکستان کی جانب سے سرحد پار کی دراندازی نہیں ہو رہی اور پوری دنیا چلا چلا کر کہہ رہی ہے کہ پاکستان دہشت گردی کے خلاف سینہ سپر ہے۔اسکے باوجود بھارت نے مسئلہ کشمیر پر قدم بڑھانے میں لگاتار اجتناب کیا ہے۔پاکستان اور بھارت کے درمیان سربراہی سطح پر آٹھ نکاتی ایجنڈے پر شق وار مذاکرات کے علاوہ زیر نظر سال میں 8 اکتوبر کے ہولناک زلزلے کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل رہی۔اس زلزلے نے پاکستان کے صوبہ سرحد کے علاوہ یکساں طور پر آزاد کشمیر اور لائن آف کنٹرول سے ملحقہ مقبوضہ کشمیر کے علاقے میں زبردست تباہی مچا دی۔جس میں اربوں کھربوں کی جائیدادیں تباہ ہوگئیں اور ہزاروں بے گناہ انسان آن واحد میں لقمہ اجل بن گئے۔اس زلزلے کے بعد صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف کی تجویز پر بھارت لائن آف کنٹرول کو پانچ مقامات سے عبوری طور پر کھولنے کیلئے آمادہ ہوا تاکہ تباہ حال کشمیری باشندے جو باہم کئی رشتوں میں بندھے ہیں' ایک دوسرے کی

Marfat.com

مدد کر سکیں اور آپس میں دکھ بانٹ سکیں۔ قیامت خیز زلزلے کے اثرات پر قابو پانے اور متاثرین کی مدد کیلئے حکومت پاکستان نے وسائل کی پرواہ کئے بغیر امداد کا طومار باندھ دیا۔ اس زلزلے نے کئی تلخ حقیقتوں کو طشت از بام کیا لیکن اس نے یہ بھی اجاگر کر دیا کہ کشمیری عوام کیلئے پاکستان کے بغیر کسی آسودگی کا کوئی تصور ہی نہیں ہے مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کیلئے کئی تجاویز در بام آتی رہیں ان میں سے زیادہ تر پاکستان کی طرف سے پیش ہوئیں جن سے پاکستان کے لچکدار رویے کا تاثر نمایاں ہوا تاہم بھارت نے کشمیر کو تنازعہ تسلیم کرنے کے سوا کوئی دوسرا اقدام یا اعلان نہیں کیا جس سے یہ ظاہر ہو سکے کہ نئی دہلی نے مسئلہ کشمیر کے حقائق کو تسلیم کر لیا ہے۔ اس نے کشمیر کو تنازعہ مانا ہے تو یہ بھی اپنے مخصوص زاویہ نگاہ سے' جسے پیش رفت بھی سمجھا جا سکتا ہے اور بھارتی مؤقف کا الجھاؤ بھی۔ پہلی مرتبہ نئی دہلی کی حکومت نے کل جماعتی حریت کانفرنس کی قیادت کے اعتدال پسند دھڑے سے مذاکرات کئے۔ اس نے کشمیری عوام کی اس نمائندہ تنظیم کے اس گروپ کے ساتھ سلسلہ جنبانی استوار نہیں کیا جسے وہ سخت گیر کہتا ہے اور جسے بلاشبہ کشمیری عوام میں قابل لحاظ توقیر حاصل ہے۔ حریت کانفرنس کے بعض رہنما اس عرصے سے پہلی مرتبہ ایک گروپ کی صورت میں پاکستان آئے۔ یہاں انہوں نے صدر جنرل پرویز مشرف' وزیراعظم شوکت عزیز پاکستان مسلم لیگ کے زعما چوہدری شجاعت حسین' مشاہد حسین' اطلاعات ونشریات کے کشمیری نژاد وفاقی وزیر شیخ رشید احمد اور بلاتفریق سیاسی رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں۔ پاکستان نے مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کی غرض سے پہلے اور بڑے قدم کے طور پر بھارت کو رسمی طور پر تجویز پیش کر دی کہ کشمیر کو سیلف گورننس دے دی جائے۔ یہ خودمختاری کے بہت قریب تصور ہے' اس کے ساتھ ساتھ کشمیر کو غیر فوجی علاقہ بنا دیا جائے۔ اس تجویز کو زبردست پذیرائی مل رہی ہے۔ بھارت نے اس کے بارے میں پہلے تو اپنے تحفظات ظاہر کئے اور پھر چپ سادھ لی۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کوفی عنان سے لیکر امریکی صدر جارج بش اور اسرائیل کی قیادت سے لیکر عربوں کے مقبول رہنماؤں نے بھی اس عرصے میں کسی نہ کسی انداز میں مسئلہ کشمیر کا حوالہ دیا اور اسے حل کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔

مذاکرات کے دوسرے دور میں پاکستان اور بھارت کے درمیان میزائلوں کے تجربات کی باہم پیشگی اطلاع دینے معاہدے کو قطعی شکل دی گئی۔ دونوں ممالک کے ملٹری آپریشنز کے ڈائریکٹر جنرلز کے درمیان پہلے سے قائم ہاٹ لائن کو اپ گریڈ کر دیا گیا اور اس مقصد کیلئے ایک ہاٹ لائن کو وقف کر دیا گیا تا کہ ہنگامی صورت حال میں دونوں ڈائریکٹر جنرل فوری ایک دوسرے سے رابطہ کر سکیں۔ دونوں ممالک کے خارجہ سیکرٹریوں کے درمیان ہاٹ لائن قائم کر دی گئی' ابھی تک اس ہاٹ لائن نے تمام ضروری کارروائیوں کی تکمیل کے باوجود کام شروع نہیں کیا۔ دوسرے دور کے مذاکرات میں سیاچن کے حوالے سے بھارتی ہٹ دھرمی افسوسناک طور پر قائم رہی۔ بھارت تسلیم کرتا ہے کہ اس نے 1984ء میں سیاچن پر آگے بڑھ کر قبضہ کر لیا تھا یہ زمانہ امن کے ایام تھے اور کوئی بھی فریق معاندانہ سرگرمیوں میں مصروف نہیں تھا۔ دنیا کے بلند ترین میدان جنگ بننے والے اس علاقے میں قبضے کے بعد جب بھارت کو احساس ہوا کہ یہاں قبضہ رکھنا مہنگا سودا ہے تو اس نے آبرومندانہ طور پر واپسی کیلئے پاکستان سے بات چیت کی۔ پاکستان اس کیلئے رضامند ہو گیا بھارتی قابض افواج کی واپسی کیلئے پاکستان نے تمام تر رعایات دیدیں اور تفصیلات طے ہونے کے بعد نوے کے عشرے میں جب کاغذات دستخطوں کیلئے تیار ہو گئے تو بھارتی اسٹیبلشمنٹ نے اس مفاہمت کو سبوتاژ کر دیا اور معاہدے پر دستخط نہ ہو سکے۔ سیاچن پر

Marfat.com

دوسرے دور کے مذاکرات میں بھارتی مؤقف کے بعض نئے گوشے بھی سامنے آئے اس نے تقاضا کیا کہ پاکستان سیاچن میں بھارتی افواج کی موجودہ پوزیشن کو تسلیم کر لے۔ اس مقصد کیلئے بھارتی فوج کی موجودگی کو اس کے آئندہ استحقاق کیلئے بنیاد مانا جائے۔ اس نے اصرار کیا کہ سیاچن کے علاقے کو خطہ تصادم کے طور پر مان لیا جائے۔ پاکستان نے بھارتی مؤقف کو سیدھے سبھاؤ مسترد کر دیا۔ پاکستان نے صاف طور پر کہا کہ بھارت کو اپنی جارحیت تسلیم کرتے ہوئے اسے خالی کرنا ہوگا۔ جہاں تک حد بندی اور نشان بندی کا سوال ہے جب لائن آف کنٹرول کا معاملہ طے ہوگا تو این جے 9482 سے آگے جہاں سیاچن کا علاقہ واقع ہے زیر غور آ سکتا ہے اسی طرح سیاچن کو خطہ تصادم تسلیم کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ یہ بے معنی سی فرمائش ہے تاکہ بھارت بعدازاں نئے مسائل کھڑے کر سکے۔ سرکریک کے سلسلے میں مذاکرات کے دوران یہ طے ہوا کہ اس علاقے کا افقی سروے کیا جائے گا جو زیر نظر سال میں مشترکہ طور پر مکمل کر لیا گیا۔ اس سروے سے معاملے کو طے کرنے میں قرار واقعی مدد نہیں مل سکی بھارت سرکریک کے وسط میں حد بندی چاہتا ہے جبکہ تاریخی طور پر اس کی شرقی ساحلی سرحد کو تک پاکستان کے زیر تصرف علاقے ہیں۔ کریک کا علاقہ تبدیل ہوتا رہتا ہے اگر اس میں نیوی کیشن ہو رہی ہے تو وسط میں حد کھینچی جا سکتی ہے جبکہ یہاں صورت حال مختلف ہے۔ سرکریک کے علاقے میں بھارت اپنی صوابدید حد بندی کے ذریعے وسیع سمندری علاقے میں حقوق حاصل کرنا چاہتا ہے جو قدرتی طور پر پاکستان کا حصہ بنتا ہے۔ دہشگردی اور منشیات کی سمگلنگ کے خلاف دونوں ممالک میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی بھارت نے پاکستان سے ایسے تیس کے قریب افراد طلب کئے جنہیں وہ پاکستان میں روپوش سمجھتا ہے پاکستان نے بھارت کو ایسے پچاس مجرموں کی فہرست دی جو پاکستان میں سنگین جرائم کا ارتکاب کرنے کے بعد بھارت میں پناہ لئے ہیں۔ ثقافتی تبادلوں کے ضمن میں دونوں ممالک ایک دوسرے کے ہاں مذہبی مقامات کیلئے آنے والے زائرین کی تعداد بڑھانے پر متفق ہوئے۔ اسی طرح ویزے کی سہولتیں بھی بڑھانے پر اتفاق ہوا۔ کھوکھرا پار موناباؤ کی سرحد کھولی جا رہی ہے۔ بمبئی میں پاکستان کا جبکہ کراچی میں بھارت کا قونصل خانہ کھولنے کیلئے مفاہمت طے پا گئی۔ بدقسمتی سے بھارت بمبئی میں بانی پاکستان حضرت قائداعظم محمد علی جناح کے ذاتی بنگلے کو حکومت پاکستان کو واگزار کرنے سے منکر ہو گیا جہاں پاکستان اپنا قونصل خانہ کھولنا چاہتا ہے اب پاکستان کو بمبئی میں انتہائی گراں نرخوں پر کرائے کی عمارت میں اپنا مشن قائم کرنا پڑے گا۔ دونوں ملکوں میں تجارت کے سلسلے میں جوائنٹ سٹڈی گروپ (مشترکہ مطالعاتی گروپ) قائم کیا گیا۔ بھارت مذاکرات میں تقاضا کرتا رہا کہ اسے تجارتی لحاظ سے انتہائی پسندیدہ قوم کا درجہ دیدیا جائے۔ پاکستان اس بارے میں اپنے نقطہ نگاہ سے بھارتیوں کو آگاہ کرتا رہا۔ پاکستان کا کہنا تھا کہ بھارت نے پاکستان کو انتہائی پسندیدہ قوم کا درجہ دے رکھا لیکن لیکن اس کی کیا وجہ ہے کہ پاکستان سے بھارت کے برآمدات جامد ہو کر رہ گئی ہیں اور ان میں اضافہ نہیں ہو رہا۔ اس کا سبب بھارت کا تجارتی قواعد وضوابط کی سخت گیری ہے جو اپنی برآمدات کیلئے موزوں ہو سکتے ہیں لیکن درآمات کیلئے ہرگز سازگار نہیں ہیں۔ امریکی اداروں نے ہی نہیں عالمی بنک نے بھی اپنی رپورٹس میں بھارتی قواعد وضوابط کو دنیا کے سخت ترین قواعد میں شمار کیا ہے۔ سارک کے تحت جنوبی ایشیا کو تجارت کیلئے آزاد علاقہ قرار دیئے جانے سے بھارت نے اپنی امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں لیکن یہاں بھی بھارت کے قواعد و ضوابط آڑے آئیں گے۔ زیر تذکرہ سال میں بگلیہار ڈیم کے متنازعہ بھارتی منصوبے کو پاکستان اور بھارت کے تعلقات

Marfat.com

اور مذاکرات کے ذیل میں تکلیف دہ باب قرار دیا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ بھارت مقبوضہ کشمیر میں اس منصوبے کو تعمیر کر کے سندھ طاس کے 1961ء کے معاہدے کی سنگین خلاف ورزی کا ارتکاب کر رہا ہے جس کے ذریعے وہ پاکستان کو ان ہمالیاتی دریاؤں کے پانی سے محروم کر دینا چاہتا ہے جس کا وعدہ معاہدے میں کیا گیا تھا۔ دونوں ممالک کے سیکرٹریوں کے دو مرتبہ مذاکرات ہوئے جو ناکام رہے صدر پاکستان کی مداخلت بھی کام نہ آ سکی بھارتی ہٹ دھرمی کے باعث پاکستان کو عالمی بنک سے رجوع کرنا پڑا جس نے ایک غیر جانبدار ماہر کو جائزے کیلئے مامور کر دیا جس کی رپورٹ زیر ترتیب ہے۔ پاکستان اور بھارت نے غیر جانبدار ماہر کے ساتھ پیرس میں ملاقات کی ستمبر میں مقبوضہ کشمیر میں منصوبے کا زمینی جائزہ لیا گیا۔ اکتوبر میں جنیوا میں اجلاس ہوا۔ دوسری جانب بھارت نے اس متنازعہ منصوبے پر پاکستان کے مطالبے کے باوجود کام نہیں روکا۔ یہی نہیں اس نے کشن گنگا کے ایک دوسرے منصوبے پر بھی کام شروع کر دیا۔ سندھ طاس کے کمشنروں کی سطح پر مذاکرات ہوئے جو تاحال ناکام رہے ہیں۔ اس طرح پاکستان کو چھ ملین ایکڑ فٹ کی بجائے یہاں سے چار ملین ایکڑ فٹ کی فراہمی تک محدود کرنے کی سازش بنائی گئی ہے جو اس منصوبے کے ذریعے پوری کی جائے گی۔ ایک زمانہ تھا کہ بھارت کو عالمی رائے عامہ کا قدرے احساس رہتا تھا کہ اس نے 85-1884ء میں پاکستان کی طرف سے وولر بیراج پر اعتراض کے بعد 1986ء میں اس پر کام روک دیا تھا۔ قبل ازیں سلال ڈیم تعمیر کرنے کی بھارت نے ٹھانی تو پاکستان نے چیلنج کر دیا بھارت کو اس پر بھی کام روک دینا پڑا۔ ایک مرحلے پر بھارت سر کریک کے سوال پر پاکستان کے مؤقف کو تسلیم کرنے پر رضامند ہو گیا لیکن اب وہ اس سے سرے سے ہی منکر ہو گیا ہے۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان مذاکرات کے سلسلے میں زیر نظر سال ہنگاموں سے بھرپور دکھائی دیتا ہے دونوں ممالک میں چل رہی خاموش سفارتکاری کو اس وقت بڑا دھچکا لگا جب بھارتی وزیراعظم کے مشیر جے این ڈکشٹ کی اچانک موت واقع ہو گئی۔ اس طرح صدر پاکستان کے قریبی معتمد مسٹر طارق عزیز کو نئے سرے سے ان مذاکرات کا ڈول ڈالنا پڑا۔ اب ان کے سامنے ایس کے لامبا لائے گئے جو ڈکشٹ کے مقابلے میں زیادہ چالباز سفارتکار تھے لامبا کی ٹانگ خود بھارتی وزیراعظم کے دفتر سے بھی کھینچی جا رہی تھی جہاں ڈکشٹ کی جگہ بننے والے مشیر ایم کے نرائن در پردہ مذاکرات کا دفتر سنبھالنا چاہتے تھے۔ نئی دہلی میں متعین پاکستان کے سفارتکاروں کیلئے مشکلات موجود رہیں ان کا تعاقب ہوتا رہا اور انہیں تنگ کیا جاتا رہا جبکہ پاکستان میں بھارتی سفارتکار پوری آزادی اور بے باکی سے اپنی سرگرمیاں جاری رکھے رہے۔ بھارتی وزیر خارجہ نٹور سنگھ کی وزارت خارجہ سے بے آبروئی کے ساتھ علیحدگی کو بھی اہم واقعہ کی حیثیت حاصل رہے گی کیونکہ پاکستانی ہم منصب میاں خورشید محمود قصوری کو توقع تھی کہ نٹور سنگھ ڈھب پر آ گئے ہیں اور وہ پاکستان کے ساتھ معاملہ آرائی میں زیادہ ڈنگ نہیں ماریں گے۔ بھارت کے نئے خارجہ سیکرٹری شیام سرن جو پاکستان کے بارے میں ہرزہ سرائی میں ید طولیٰ رکھتے ہیں نئی صورت حال میں کھل کر اپنا ہاتھ دکھائیں گے۔ اسلام آباد میں دفتر خارجہ سے بھارت کے سلسلے میں نسبتاً سخت سوچ رکھنے والے سفارتکار یکے بعد دیگرے رخصت ہوتے رہے خارجہ سیکرٹری ریاض حسین کھوکھر، ترجمان مسعود خان، ایڈیشنل سیکرٹری سلمان بشیر اور آخر میں جلیل عباس جیلانی کو منظر سے ہٹا دیا گیا اب دونوں ملک ایک دوسرے کے ہاں اپنے کمرشل بنک کھولنے پر بھی رضامند ہو چکے ہیں۔ ثقافتی طائفوں کی آمد و رفت شروع ہونے والی ہے۔ فلمی شخصیات بھی ایک دوسرے کے ہاں جلوہ گر ہو رہی ہیں۔ پاکستان اور بھارت نے ایران

Marfat.com

سے گیس پائپ لائن کے ذریعے قدرتی گیس لانے کیلئے اصولی مفاہمت کر لی ہے اس طرح جامع مذاکرات کی راہ ہموار ہوگئی ہے۔ الغرض بھارتی مفادات سے وابستہ تمام امور پر پیش رفت ہو رہی ہے اور مقابلتاً تیز رفتاری سے ہو رہی ہے جبکہ اصل مسئلہ تنازعہ کشمیر خاطر خواہ توجہ سے محروم ہے۔ صدر جنرل پرویز مشرف کا کہنا ہے کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان تعلقات میں مثبت پیش روی نا قابل رجعت ہے لیکن وہ اپنی امید افزائی کے ہاتھوں مجبور ہیں اور یہ کہنے سے گریز کرتے ہیں کہ تنازعہ کشمیر پر مجرمانہ لیت ولعل سے کام لیا گیا تو مذاکرات کی بساط لپیٹ دیئے جانے میں تاخیر بھی نہیں ہوگی۔

پاکستان اور بھارت کے تعلقات کے عہد نو میں جن تدابیر کو اعتماد کی بحالی کے اقدامات سے تعبیر کیا گیا تھا وہ اپنے طور پر کسی مقصد کا درجہ نہیں رکھتے تھے بلکہ یہ تصور عام تھا کہ ان اقدامات کی بدولت وہ ماحول جنم لے گا جو حقیقی مسائل کو حل کرنے کی خاطر ساز گار ہوگا۔ نئی دہلی پہلے دن سے ہی اعتماد سازی کے اقدامات پر غیر معمولی اور غیر ضروری توجہ اور زور دیتا آیا ہے۔ اسکی خواہش رہی ہے کہ اصل اور بنیادی مسئلے کی جانب توجہ نہ ہی مبذول ہو۔ پاکستان نے بھارت کے ان ہتھکنڈوں کو سمجھنے کے باوجود کمال صبر اور حوصلے کے ساتھ اعتماد سازی کی سرگرمیوں کیلئے اپنے دراز دست تعاون کو واپس کھینچنے سے گریز کیا۔ یہ اسی ''جرأت مندانہ'' سفارت کاری کا اعجاز تھا کہ پاکستان کے خلاف بھارتی نقطہ نظر کو عالمی رائے عامہ میں پذیرائی نہ مل سکے۔ اعتماد کی بحالی کی تدابیر میں سے ایک کا تعلق دونوں ممالک کے اہم شہروں اور کشمیر کے دونوں دارالحکومتوں کے درمیان بس سروس کا اجراء تھا۔ مظفر آباد سے سری نگر تک جانے والی بس شروع ہوگئی۔ ہر چند اسکی حیثیت محض علامتی رہی تاہم 8 اکتوبر تک یہ جاری ساری رہی۔ زلزلے نے اس پل کو ہی برباد کر دیا جس سے کشمیری پا پیادہ گزر کر مقبوضہ سے آزاد اور آزاد سے مقبوضہ علاقے میں داخل ہوتے تھے۔ پل کی مرمت کے بعد ان مسافروں بس سروس کی بحالی کے امکانات روشن ہو رہے ہیں۔ لاہور اور نئی دہلی کے درمیان بس سروس پہلے ہی چل رہی تھی۔ اب لاہور اور امرتسر کے درمیان بس سروس بھی شروع کر دی گئی ہے۔ پنجاب میں لاہور اور امرتسر کے درمیان آزادی سے پہلے بس سروس کی زبردست تاریخ ہے۔ اب اسکی وہ اہمیت و افادیت تو باقی نہیں رہی لیکن سرحدوں کو نرم کرنے کے ضمن میں یہ بس سروس کافی اہمیت رکھتی ہے۔ بعض محب وطن حلقوں کے نزدیک یہ بس سروس کوئی کار آمد کارروائی نہیں تاہم حکومتوں کا فیصلہ اب اطلاق پذیر ہو گیا ہے۔ چند دنوں میں امرتسر اور ننکانہ صاحب کے درمیان بھی بس سروس جاری ہو جائے گی۔ ان تمام اقدامات کے تناظر میں حقیقی مسائل پر توجہ دینے کی ضرورت ہے جس کے بغیر اعتماد سازی محض فریب نظر رہے گی۔

زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ پاکستان اور بھارت کی فوجیں بارڈر پر ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑی تھیں اور عالمی طاقتیں دونوں ممالک کی ایٹمی صلاحیت کے پس منظر میں دنیا کو بڑی تباہی سے بچانے کیلئے متفکر تھیں۔ اگر اس وقت اٹل بہاری واجپائی کی بجائے کوئی اور ہندوستان کا وزیر اعظم ہوتا تو شائد یہ خطہ تباہی سے نہ بچ سکتا۔ صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف اور اٹل بہاری واجپائی نے مذاکرات کا جو عمل شروع کیا اس کی راہ میں آنے والی مشکلات کا ادراک سب کو تھا۔ کسی کو بھی یہ خوش فہمی نہ تھی اور نہ ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان مذاکرات کا عمل آسان ہوگا اور معاملات جلدی حل ہو جائینگے۔ جس صورت حال میں دونوں ملکوں کے درمیان مذاکرات شروع ہوئے تھے اس میں

Marfat.com

مذاکرات کا شروع ہونا ہی ایک کامیابی تھی۔ جب بھی اس طرح کی صورت حال میں مذاکرات ہوتے ہیں کچھ بیک اور معاملات بھی چل رہے ہوتے ہیں۔ ماضی میں چین اور امریکہ کے درمیان مذاکرات میں خود پاکستان درپردہ مذاکرات میں کردار ادا کر رہا تھا۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان مذاکرات کے بارے میں کولن پاول نے کہا ہے کہ ان کی دونوں ملکوں کے سربراہوں کو ٹیلیفون کالز نے اہم کردار ادا کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان درپردہ مذاکرات میں انتہائی اہم بیورو کریٹس نے بھی کردار ادا کیا۔ پاکستان کی طرف سے صدر پرویز مشرف کے بااعتماد دوست طارق عزیز پاکستان کی نیشنل سکیورٹی کونسل کے سیکرٹری کی حیثیت سے اس درپردہ عمل جسے ٹریک 2 ڈپلومیسی کا نام دیا جاتا ہے میں ریڑھ کی ہڈی کا کردار ادا کر رہے تھے۔ لاہور کے مشہور فارمن کرسچن کالج کی سٹوڈنٹس یونین کے صدر طارق عزیز طالب علمی کے دور سے ہی لبرل، پروگریسو اور ترقی پسند خیالات کے حامل سمجھے جاتے تھے۔ طارق عزیز کیریئر ڈپلومیٹ نہیں لیکن کیریئر بیوروکریٹ ہیں۔ ان مذاکرات میں بھارت کی طرف سے پہلے برجیس مشرا اور بعد میں جے این ڈکشٹ طارق عزیز سے مذاکرات کرتے رہے حالیہ دنوں میں جے این ڈکشٹ بھارت کی طرف سے مذاکرات میں اہم کردار ادا کرتے رہے ہیں لیکن ان کی اچانک وفات سے ان مذاکرات کو دھکا لگا۔ دونوں ملکوں کے عوام خصوصاً سرحد کے دونوں طرف بسنے والے پنجابی دونوں ممالک کے درمیان تعلقات کی بحالی کے اس حد تک متمنی تھے کہ اعتماد کی بحالی کے ابتدائی اقدامات کو اتنی پذیرائی ملی کہ لگ رہا تھا کہ شائد دونوں ملک اعتماد کی مکمل بحالی تک آسانی سے پہنچ جائیں گے لیکن جونہی مذاکرات Procedural نوعیت سے Substantive نوعیت پر پہنچے مشکلات ابھر کر سامنے آنا شروع ہو گئیں۔ بگلیہار ڈیم پر مذاکرات کی ناکامی اس سلسلے کی پہلی بڑی مثال تھی۔ پاکستان 1992ء سے اس ڈیم پر اپنے تحفظات کا اظہار کر رہا تھا۔ 1960ء میں ورلڈ بنک کی ثالثی کے نتیجے میں پاکستان اور بھارت کے درمیان سندھ طاس معاہدہ ہوا تھا۔ اس معاہدہ کی رو سے بیاس، راوی اور ستلج کا پانی بھارت جبکہ جہلم، چناب اور سندھ کے پانیوں پر پاکستان کا حق تسلیم کیا گیا۔ 1992ء میں بگلیہار ڈیم کشمیر کے مقام پر بھارت چناب دریا پر ڈیم کی تعمیر شروع کر دی۔ پاکستان کو ڈیم بنانے پر اعتراض نہیں لیکن اس کے ڈیزائن پر پاکستان نے چھ بنیادی اعتراضات اٹھائے۔ بدقسمتی سے بھارت نے پاکستان کے ان اعتراضات پر مثبت جواب نہیں دیا اور اب پاکستان عالمی بنک کی ثالثی کیلئے جا رہا تھا۔ اسی طرح مسئلہ کشمیر پر کوئی واضح پیش رفت نہیں ہو رہی۔ مسئلہ کشمیر پاکستان کیلئے گزشتہ پچاس برس میں سب سے اہم خارجی مسئلہ رہا ہے اور بہت مشکل ہوگا اگر یہ تصور کر لیا جائے کہ کشمیر پر پیش رفت کے بغیر پاک، بھارت مذاکرات اور اعتماد کی بحالی کے اقدامات چلتے رہیں گے۔ اگر پاکستان اور بھارت کے درمیان مذاکرات کے تعطل کا جائزہ لیا جائے تو غیر جانبدار ترین مبصر بھی بھارت کو مورد الزام ٹھہرائے گا۔ بدقسمتی سے بھارت اب وہ غلطی کر رہا تھا جو ماضی میں پاکستان کرتا رہا یعنی بڑے فیصلوں سے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ، بھارت میں اٹل بہاری واجپائی کی ایوان وزیراعظم سے رخصتی ان مذاکرات کیلئے توقع سے کہیں زیادہ نقصان دہ ثابت ہوئی، سابق ضلع جہلم سے تعلق رکھنے والے من موہن سنگھ اور ان کی سیاسی سرپرست سونیا گاندھی اعتماد کے بحران کا شکار ہیں۔ سونیا گاندھی نہیں چاہتیں کہ وہ کوئی ایسا متنازعہ فیصلہ کر لیں کہ جس سے اپوزیشن کو یہ کہنے کا موقع ملے کہ اطالوی نژاد سونیا گاندھی نے ہندوستان کی آزادی کو داؤ پر لگا دیا اور من موہن سنگھ خود یہ قدم اٹھانے کے اہل نہیں کہ تمام سیاسی قوت کا منبع سونیا گاندھی کی ذات تھی۔ دوسری طرف

Marfat.com

پاکستان میں صدر پرویز مشرف نہ صرف بڑے فیصلے لینے کی صلاحیت رکھتے تھے بلکہ لے بھی رہے تھے۔ کشمیر پر پاکستان جہاں تک چلا گیا ہے اس کے آگے جانا اس کیلئے شائد ممکن نہ ہو یا کم از کم شائد اس وقت تک ممکن نہ ہو جب تک بھارت لچک کا مظاہرہ نہ کرے۔ دوسری طرف بھارت میں ایک طبقہ یہ منفی سوچ بھی رکھتا ہے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ جونہی ختم ہوگی پاکستان ایک بار پھر عالمی طاقتوں کے عتاب میں آ جائیگا اور اس وقت بھارت اپنی شرائط منوا سکے گا۔ لہٰذا فی الحال مذاکرات میں وقت گزارنا چاہئے۔ یہ ایک بالکل تباہ کن سوچ تھی۔

فروری 2005ء میں سابق پاکستانی سفیر مسٹر افضال محمود نے پاک بھارت تعلقات پر ایک مضمون روزنامہ نوائے وقت میں بعنوان ''2005ء اور پاک بھارت تعلقات'' لکھا۔ جس میں انہوں نے بڑے ڈپلومیٹک انداز میں صورت حال کا جائزہ لیا۔ ملاحظہ فرمائیں:

''پاک بھارت جامع مذاکرات کو شروع ہوئے ایک سال ہو چکا ہے۔ اس عرصے میں دونوں ملکوں کے درمیان مختلف سطح پر 16 بار مذاکرات ہوئے ہیں لیکن ایجنڈے کے کسی موضوع پر کوئی قابل ذکر پیش رفت نہیں ہو سکی ہے البتہ ہر میٹنگ کے بعد مشترکہ بیان میں دونوں جانب سے اس بات کا اعادہ ضرور کیا گیا ہے کہ دونوں ملک صلح و آشتی کی فضا کو آگے بڑھانے پر متفق ہیں۔ اگر بغور دیکھا جائے تو اس ایک سال میں جامع مذاکرات سے سوائے طفل تسلیوں کے کچھ حاصل نہیں ہوا ہے۔ یعنی بقول ایک فارسی شاعر:

نشستند، گفتند و برخاستند

لیکن یہ بھی غنیمت ہے کیونکہ اس سے قبل عام طور پر پاک بھارت مذاکرات کے بعد الگ الگ بیان جاری ہوتے تھے جس میں مذاکرات کی ناکامی کا الزام ایک دوسرے پر عائد کیا جاتا تھا۔ اب یہ تبدیلی ضرور آئی ہے کہ دونوں جانب سے مشترکہ بیان جاری کیا جاتا ہے اور مورد الزام کسی کو نہیں ٹھہرایا جاتا۔

جامع مذاکرات کی ابتداء مشرف، واجپائی کے 6 جنوری 2004ء کے اس مشترکہ بیان کے بعد ہوئی تھی جس میں دونوں نے کشمیر سمیت تمام باہمی مسائل کو گفت و شنید کے ذریعے حل کرنے پر اتفاق کیا تھا لیکن اگر ان مذاکرات کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ کشمیر تو دور کی بات ہے، ان امور پر بھی بات آگے نہیں بڑھی جو بظاہر آسان اور کم متنازعہ نظر آتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے۔ کیا بھارت اور پاکستان اپنے متنازعہ مسائل کو حل کرنے کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہیں اور یہ مذاکرات کا تماشہ ایک ڈھونگ ہے اور اگر یہ وجہ نہیں ہے تو پھر ایک سال تک جاری رہنے والے ان جامع مذاکرات میں آخر پیش قدمی کیوں نہیں ہو سکی اور اس کی زیادہ ذمہ داری کس فریق پر ہے؟

کشمیر کے بعد نیوکلیئر مسئلہ پاک بھارت تعلقات میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ وسط دسمبر میں اس مسئلے پر دونوں ملکوں میں جو مذاکرات ہوئے وہ نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئے۔ لیکن دونوں ملکوں کو اس بات کا احساس ہونا ضروری ہے کہ جب تک اس مسئلے پر وہ کسی مفاہمت پر نہیں پہنچتے بین الاقوامی برادری انہیں ''نیوکلیئر کلب'' کا ممبر تسلیم نہیں کرے گی اور ان کے نیوکلیئر پروگرام کو شک و شبے کی نظر سے دیکھتی رہے گی۔

اس میں شک نہیں کہ نہ صرف پاکستان اور بھارت بلکہ پورے جنوبی ایشیا کی سلامتی کیلئے نیوکلیئر سی بی ایم کے

Marfat.com

بارے میں باہمی مفاہمت ہونا ضروری ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ دونوں ملکوں میں وقتاً فوقتاً فوجی نوعیت کا تناؤ پیدا ہو جاتا ہے اسے روکنے کا کوئی اہتمام کیا جائے کیونکہ بعض اوقات یہ فوجی تناؤ خطرناک صورت اختیار کر لیتا ہے اور کسی بھی وقت صورت حال ہاتھ سے نکل سکتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس خدشے کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ خدانخواستہ ایسی صورت حال پیدا ہو سکتی ہے جب دونوں ملکوں کا سرحدوں پر فوجی تناؤ بڑھتے بڑھتے نیوکلیئر تناؤ میں تبدیل ہو سکتا ہے یہ صورت حال انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔

مایوسی کی اس فضا میں پاک بھارت تعاون اور مفاہمت کی ایک کرن نظر آتی ہے۔ طویل تذبذب اور پس و پیش کے بعد بھارت ایرانی گیس لائن کو پاکستان توسل سے لینے پر اب معترض نہیں ہے۔ اس سے قبل بھارت اس بات کیلئے تیار نہیں تھا کہ گیس لائن پاکستانی علاقے سے گزر کر اس تک پہنچے۔ گیس لائن کے سلسلے میں پاکستانی پالیسی میں بھی ایک قابل ذکر تبدیلی آئی ہے۔ ایرانی گیس لائن واحد اقتصادی پروجیکٹ ہے جسے پاکستان نے شہر کے حصے سے الگ رکھا ہے۔ ورنہ پاکستان کی یہ بنیادی پالیسی رہی ہے کہ وہ بھارت سے کسی قسم کا اقتصادی تعاون اس وقت تک نہیں کرے گا جب تک بھارت کشمیر کے مسئلے کو حل کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتا لیکن ایرانی گیس لائن کے راستے میں ابھی کئی رکاوٹیں ہیں جن میں سے ایک اہم رکاوٹ کا تعلق ایران کے بارے میں امریکی اقتصادی پابندیوں سے ہے۔

اس وقت جو سوال مبصرین کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے وہ ہے: کیا سال 2005ء پاک بھارت مذاکرات کیلئے مبارک ثابت ہوگا اور کیا 2004ء کے مقابلے میں ان مذاکرات سے بہتر نتائج کی توقع کی جاسکتی ہے؟ سچ بات تو یہ ہے کہ پاکستان اور بھارت کے مابین کشمیر سمیت جتنے بھی تنازعے ہیں ان سب میں پیش رفت ہو سکتی ہے بشرطیکہ بھارت کی نیت صاف ہو اور وہ ان مسائل کو حل کرنے میں سنجیدہ ہو۔ کشمیر کے مسئلے پر پاکستان اور بھارت کو اپنے اپنے مؤقف کو پیش کرنے کا پورا حق حاصل ہے لیکن ان دونوں کے مؤقف میں اس قدر فاصلہ ہے کہ جب تک دونوں ملک ''کچھ لو کچھ دو'' کے دستور پر عمل نہیں کرتے اس وقت تک کشمیر کے مسئلے کو سلجھانا ممکن نہیں ہے۔ یہ دونوں ملکوں کیلئے ایک المیہ سے کم نہیں ہوگا اگر مشرف واجپائی کے 6 جنوری کے مشترکہ بیان کی روشنی میں بھارت اور پاکستان کشمیر کے کسی ایسے حل پر رضامند نہیں ہوتے جو نہ صرف ان دونوں ملکوں کیلئے بلکہ کشمیر کے عوام کیلئے بھی قابل قبول ہو۔

انگلستان کے موقر روزنامے دی ٹائمز کے ڈپلومیٹک ایڈیٹر مائیکل بن یون نے پتے کی بات لکھی ہے کہ کشمیر کے مسئلے کو سلجھانے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ دونوں ملکوں یعنی بھارت اور پاکستان نے کشمیر کو اپنی داخلی سیاست میں ایک طویل عرصے تک استعمال کیا ہے۔

پاکستان کے داخلی مسائل یعنی اقتصادی زبوں حالی' بے روزگاری' کرپشن ایسے مسائل سے توجہ ہٹانے کیلئے بھارتی Threat کو استعمال کیا ہے۔ بھارتی حکمرانوں نے بھی کشمیر کے تنازعے کو داخلی سیاست میں استعمال کیا ہے مثلاً اندرونی خلفشار' غربت اور اقتصادی مشکلات سے توجہ ہٹانے کیلئے نام نہاد آئی ایس آئی کے ''ایجنٹوں'' اور ''تخریب کاروں'' کا بہانہ بنا کر کشمیری عوام پر سختیاں کرنے کیلئے اور ''پاکستانی خطرے'' کا بہانہ بنا کر عوام دشمن قوانین اور پالیسیاں مرتب کرنے کیلئے۔ ایک حوصلہ افزاء تبدیلی یہ ضروری آئی ہے کہ بھارت اور پاکستانی دونوں ملکوں میں عوام اب پہلے سے

Marfat.com

زیادہ باشعور ہو چکے ہیں اور وہ حکومت وقت کی ان چالوں کو سمجھنے لگے ہیں۔

متنازعہ مسائل کو حل کرنے کیلئے ضروری ہے کہ بھارت اور پاکستان یہ سمجھ لیں کہ انہیں حل کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ پاکستان نے ایک اہم قدم یہ اٹھایا ہے کہ اس نے جامع مذاکرات میں کشمیر کے علاوہ دوسرے مسائل کو شامل کرنے پر رضامندی ظاہر کی ہے۔ بھارت کی طرف سے یہ عندیہ دینا ضروری ہے کہ وہ اب ''کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے'' کی رٹ لگانا بند کر دے گا۔

کیا 2005ء میں بھارت اپنی حکمت عملی تبدیل کر کے کشمیر اور دوسرے متنازعہ مسائل کو حل کرنے کیلئے سنجیدگی سے کوشش کرے گا؟ اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ وزیراعظم من موہن سنگھ کو کانگریس پارٹی کی طرف سے اس بارے میں کیا ہدایات ملتی ہیں اور اپوزیشن یعنی بی جے پی کی پالیسی ایڈوانی کی سخت گیر پالیسی کے مطابق بنائی جاتی ہے تو کانگریس پارٹی کیلئے مذاکرات میں قابل ذکر مراعات دینا مشکل ہو جائے گا اور اس طرح پاک بھارت تعلقات میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئے گی۔ (روزنامہ نوائے وقت 10 فروری 2005ء مصنف افضال محمود سابق سفیر)

ایک طرف تو بھارت پاکستان سے صلح' امن اور دوستی کی باتیں کر رہا تھا اور پاکستان پر نہ صرف خود بلکہ بعض دوست ممالک کے ذریعے دباؤ ڈال رہا تھا کہ بھارت کو ''موسٹ فیورٹ نیشن'' قرار دیا جائے۔ پاکستان نے اپنی دفاعی بجٹ اور فوجوں میں کمی کا اعلان کر دیا تھا لیکن دوسری طرف فروری کے آخری دنوں میں بھارت کے وزیرخزانہ پی چدمبرم نے نئے مالی سال کے بجٹ کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ دفاع کیلئے آٹھ کھرب 30 ارب روپے مختص کئے گئے ہیں۔ یہ گزشتہ سال کے دفاعی بجٹ کے مقابلے میں 7.8 فیصد اضافہ تھا۔ بجٹ کا 41 فیصد مسلح افواج کو جدید تر بنانے پر خرچ ہونا تھا۔ بھارت کے دفاعی بجٹ میں مجموعی طور پر 60 ارب روپے کا اضافہ کیا گیا۔

بھارت اور پاکستان کے مابین قیام امن کیلئے مذاکرات ایک سال سے جاری تھے اور اعتماد سازی کے اقدامات کی روشنی میں دونوں ممالک کے بعض خوش فہم حلقے دوستی اور خوشگوار تعلقات کی توقع کر رہے تھے' تجارتی' اقتصادی اور ثقافتی وفود کی آمد و رفت اور پیار محبت کی باتوں سے بھی یہی تاثر ملتا کہ دونوں ممالک شاید دیرینہ دشمنی بھلانے اور تصفیہ طلب مسائل حل کرنے میں سنجیدہ ہیں' اس لئے امید کی جا رہی تھی کہ بھارت سال رواں کے بجٹ میں دفاعی بجٹ کم کرنے کی کوشش کرے گا کیونکہ پاکستان گزشتہ چار سال کے دوران اپنے دفاعی بجٹ میں خاصی کمی کر چکا تھا۔ بھارت یہ اعتراف کر چکا تھا کہ جنرل پرویز مشرف کے اقدامات کی وجہ سے سرحد پار دہشت گردی میں کمی واقع ہوئی اور جموں و کشمیر میں صورت حال خاصی بہتر ہے۔ بھارت سے آنے والے وفود تسلسل سے یہ راگ الاپتے کہ دفاع پر خرچ ہونے والے وسائل غربت و بے روزگاری کے خاتمے کیلئے مختص کئے جائیں تاکہ برصغیر کے عوام کی محرومیوں کا خاتمہ ہو اور ترقی و خوشحالی کا پائیدار عمل پایہ تکمیل کو پہنچے۔ تاہم بھارتی قیادت کے عزائم اور اسلام و پاکستان دشمن ذہنیت سے آگاہ پاکستانی عوام کو کبھی یہ خوش فہمی لاحق نہیں رہی کہ حالات واقعی نئی کروٹ لے سکتے ہیں اور بھارت اپنی پاکستان دشمنی ترک کر کے برصغیر میں امن و سلامتی کو یقینی بنا سکتا ہے۔ بھارت کے جنگی بجٹ میں 60 ارب روپے کی خطیر رقم کا اضافہ اس بات کا ثبوت تھا کہ یہ انتہا پسند ہندو

Marfat.com

ریاست ''بگ پاور'' بننے کی راہ پر گامزن تھے اور وہ خطے میں فوجی بالادستی کے علاوہ ہتھیاروں کی دوڑ جاری رکھنے کی خواہش مند تھی۔ بھارت کے فوجی بجٹ کا حجم آٹھ کھرب تیس ارب روپے تک پہنچ گیا جو تمام ہمسایہ ممالک کیلئے خطرہ تھا۔ بھارت اور چین کے تعلقات بہتر ہو چکے تھے' جبکہ پاکستان سے وہ موسٹ فیورڈ نیشن قرار دلوانے کا مطالبہ کر رہا تھا۔ کوئی دوسرا ہمسایہ بھی بھارت کی سلامتی کیلئے خطرہ نہیں' اس کے باوجود جنگی بجٹ میں مسلسل اضافہ اور امریکہ سے ایف سولہ طیارے' پیٹریاٹ میزائل' روس سے 125 جدید طیاروں' راکٹ لانچر اور فرانس سے جدید ترین آبدوزوں کے علاوہ اسرائیل سے اسلحے کی خریداری یہ واضح کرنے کیلئے کافی تھے کہ بھارت کے عزائم کیا ہیں اور پاکستان کے ساتھ چین اس کا ہدف ہے۔

پاکستان کا کل سالانہ بجٹ 9 کھرب 2 ارب 77 کروڑ روپے ہے' جس سے عدم توازن کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

بھارت پاکستان سے نہ صرف یہ مطالبہ کر رہا تھا کہ وہ کشمیری عوام کی جائز جدوجہد سے لاتعلقی اختیار کرے بلکہ بگلیہار ڈیم پر عالمی بنک سے رجوع کرنے کے فیصلے پر نظر ثانی کا خواہش مند تھا۔ بھارتی سیکرٹری خارجہ شیام سرن نے نئی دہلی میں ایک بار پھر یہ مطالبہ دہرایا کہ عالمی بنک سے درخواست واپس لے کر پاکستان بھارت سے مذاکرات کرے' پاکستان کا عالمی بنک سے رجوع کرنا' پختہ اقدام ہے جبکہ نٹور سنگھ نے نئی دہلی میں پاکستانی وفد سے ملاقات میں دونوں ممالک کے مذاکرات پر اطمینان ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ دونوں ممالک میں خیر سگالی جذبہ پایا جاتا ہے۔

پاکستان بھارت کی جنگی تیاریوں کا مقابلہ روایتی ہتھیاروں سے نہیں کر سکتا' دونوں ممالک کی بحری' بری اور فضائی قوت میں ایک اور چار کا فرق ہے۔ جبکہ امریکہ و یورپ کی عائد کردہ بیس سالہ پابندیوں کی وجہ سے پاکستانی ہتھیار بھی فرسودہ ہو چکے تھے جبکہ بھارت کو روس' اسرائیل' فرانس اور امریکہ سے مسلسل ہتھیار اور ان کے پرزے مل رہے تھے۔

اس بناء پر ہمارا ایٹمی و میزائل پروگرام ہی قومی دفاع اور علاقائی امن و سلامتی کی ضمانت فراہم کر سکتا تھا۔ بھارت ایک طرف پاکستان کو بگلیہار ڈیم پر مذاکرات کی دعوت دے رہا تھا دوسری طرف اس نے نئے بجٹ میں بگلیہار ڈیم کیلئے 70 ملین کی رقم مختص کی' جس کا مطلب واضح ہے کہ مذاکرات کی دعوت محض دھوکہ اور وقت حاصل کرنے کا ہتھکنڈہ تھا۔ اس صورت حال پر پاکستان میں شدید مایوسی کا اظہار کیا گیا تھا۔

اپریل 2005ء میں صدر جنرل پرویز مشرف نے بھارت کا دورۂ کیا صدر جنرل مشرف نے 18 اپریل کو نئی دہلی کے حیدر آباد ہاؤس میں بھارتی وزیر اعظم من موہن سنگھ سے ڈھائی گھنٹے سے زائد وقت پر محیط طویل ملاقات کی جس میں کشمیر سمیت تمام علاقائی مسائل پر گفتگو ہوئی۔ ان مذاکرات کے نتیجے میں دونوں ممالک نے تجارت کے فروغ کیلئے مشترکہ بزنس کونسل کے قیام' جوائنٹ ٹریڈ کمیشن کی بحالی' دسمبر تک کھوکھراپار مونا باؤ ریل سروس کے ازسر نو آغاز' کنٹرول لائن سے تجارتی سرگرمیوں کی بحالی اور مسئلہ کشمیر پر مذاکرات جاری رکھنے پر اتفاق کیا جبکہ بگلیہار ڈیم کو ماہرین کی مشاورت سے حل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس ملاقات میں دہشت گردی کے خاتمے کیلئے کوششوں اور پاکستان' ایران اور بھارت کے درمیان گیس پائپ لائن کے مجوزہ منصوبے پر بھی تفصیلی بات چیت ہوئی۔ بھارت کے سیکرٹری خارجہ شیام سرن نے پریس کانفرنس میں مذاکرات کے ماحول کو سازگار اور دوستانہ قرار دیتے ہوئے بات چیت کو انتہائی کامیاب قرار دیا۔

صدر پرویز مشرف کے دورۂ بھارت میں مذکورہ امور پر پیش رفت کی حیثیت کیا ہے؟ اور کیا ان میں سے کسی بھی ایشو کو

Marfat.com

مذاکرات کی اس سطح پر کامیابی کی علامت قرار دیا جا سکتا ہے جس کی توقع کی جا رہی تھی؟ اس کا جواب نفی میں آتا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ دہلی میں ہونے والے مذاکرات اور 4 سال قبل منعقد ہونے والے آگرہ مذاکرات اس لحاظ سے یکساں طور پر ناکام دکھائی دیتے تھے کیونکہ دونوں ممالک کے درمیان تنازعات کی بنیادی وجہ مسئلہ کشمیر جوں کا توں تھا اور پاکستان کی جانب سے غیر معمولی لچک کے باوجود بھارت اس بارے میں اپنے اٹل مئوقف پر قائم رہا۔ صدر پرویز مشرف نے 4 سال قبل بھی بھارت کا دورہ کیا تھا تو اس وقت پاک بھارت تعلقات میں کسی قسم کی گرم جوشی نہیں تھی۔ آگرہ مذاکرات میں بھارت نے جس مایوس کن رویے کا مظاہرہ کیا اس سے یہ ثابت ہو گیا تھا کہ دونوں ممالک کے درمیان بداعتمادی کی ایک وسیع خلیج حائل ہے جسے پُر کیے بغیر کسی قسم کے مذاکرات کی کامیابی ممکن نہیں۔

آگرہ مذاکرات کے بعد 4 سال کے دوران پاک بھارت تعلقات میں اتار چڑھاؤ کے کئی مراحل آئے۔ ایک موقع پر تو پاکستان کی سرحدوں پر بھارتی افواج کا سیلاب امنڈ آیا تھا اور یوں لگتا تھا کہ آج یا کل دونوں ممالک میں ہولناک جنگ کا آغاز ہوا ہی چاہتا ہے جس کے نتیجے میں ایٹمی جنگ کی نوبت بھی آ سکتی ہے مگر اس موقع پر حکومت پاکستان کی ہوشمندی، افواج پاکستان کی مستعدی اور امریکہ کی مداخلت کے باعث بھارت اپنی تمام تر طاقت کے باوجود سرحدیں عبور کرنے کی جرأت نہ کر سکا اور افواج کی واپسی کا عمل شروع ہو گیا۔ ایک سال تک پاک بھارت تعلقات میں کوئی غیر معمولی تبدیلی نہیں آئی، تاہم اس دوران بھارت کی جانب سے کشمیر کو اٹوٹ انگ قرار دینے اور سرحد پار دہشت گردی بند کرنے کا واویلا جاری رہا جس کے نتیجے میں پاکستان پر عالمی طاقتوں بالخصوص امریکہ کا دباؤ بڑھتا گیا حتیٰ کہ پاکستان نے جہاد کشمیر میں فعال تمام تنظیموں کی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی۔ تحریک آزادی کشمیر کو پاکستان کے اس اقدام سے سخت نقصان پہنچا مگر پاکستان نے علاقائی امن کی بحالی، بھارت کے اعتماد کے حصول اور عالمی طاقتوں کے اطمینان کی خاطر مجاہدین کشمیر کے کاز کے نقصان کی کوئی پرواہ نہ کی، 2004ء کے آغاز میں پاکستان کی جانب سے بھارت سے تعلقات کو مضبوط کرنے کی یکطرفہ کوششیں مزید تیز ہو گئیں۔

صدر پرویز مشرف اور ان کے رفقائے کار نے نہایت لچک دار رویہ اپنا کر بھارتی حکمرانوں کو اپنے قریب کرنے کی کوشش کی، دونوں ممالک کے درمیان اعلیٰ سطحی وفود کے تبادلے کے علاوہ ثقافتی طائفوں کی آمد و رفت میں بھی تیزی آ گئی، کرکٹ ڈپلومیسی کے ذریعے بھارتی عوام کو دوستی کا پیغام دیا گیا اور بھارتی کرکٹ ٹیم کا سرزمین پاکستان میں قومی ہیروز کی طرح استقبال کیا گیا۔ اس دوران بھارت کی جانب سے اقوام متحدہ کی قراردادوں کے خلاف کنٹرول لائن پر باڑ کی تنصیب کا کام بھی جاری رہا جس پر پاکستان حیران کن انداز میں خاموشی اختیار کیے رہا۔

سال 2004ء کے وسط میں بھارت کی جانب سے بگلیہار ڈیم کی تعمیر آخری مراحل میں داخل ہونے سے پاکستان کی زراعت کے بانجھ ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ حکومت پاکستان کی سفارتی کوششوں کے باوجود بھارت نے اس پروجیکٹ پر کام جاری رکھا جس کے بعد پاکستان کو عالمی بنک سے رجوع کا فیصلہ کرنا پڑا۔ تاہم بھارت سے پاکستان کا رویہ بدستور دوستانہ رہا اور دونوں ملکوں کے مابین حال ہی میں سری نگر، مظفر آباد بس سروس کے آغاز کی شکل میں خوشگوار تعلقات کی راہ پر ایک نئی پیش رفت ہوئی تھی۔

Marfat.com

ان تمام باتوں کے باوجود اگر دیکھا جائے تو اب تک دوستانہ تعلقات کا سارا بوجھ پاکستان ہی کے سر پر پڑا تھا اور اسے مسئلہ کشمیر میں اپنے مؤقف سے کسی نہ کسی حد تک پیچھے ضرور ہٹنا پڑا۔ سب سے پریشان کن بات یہ تھی کہ بھارت کی اس ڈپلومیسی کے باعث ہمارے سیاست دانوں اور عوام کے ایک بڑے حلقے میں مسئلہ کشمیر کی اہمیت ثانوی ہوتی جا رہی تھی اور بھارت کی لچھے دار باتوں میں الجھ کر ہم کنٹرول لائن کو مستقل سرحد تسلیم کرنے پر ذہنی طور پر متفق ہوتے جا رہے تھے۔

پاکستان نے دوطرفہ تعلقات کی بحالی کیلئے اب تک جو بھاری قیمت ادا کی اس کے نتیجے میں اہل پاکستان دہلی مذاکرات سے غیر معمولی توقعات وابستہ کئے ہوئے تھے۔ اس دوران پاکستانی کرکٹ ٹیم کے دورۂ بھارت کو بھی دونوں ملکوں کے عوام میں دوستانہ جذبات کے ابھرنے کا ذریعہ قرار دیا جا رہا تھا اور توقع کی جا رہی تھی کہ اس دوستانہ فضا میں دونوں ممالک کے سربراہوں کی ملاقات تنازعات کے مستقل حل کا سنگ میل ثابت ہوگی مگر جاری کردہ اعلامیے سے عوام کو یہ جان کر مایوسی ہوئی کہ مذاکرات کا سارا زور تجارتی اور اقتصادی روابط کو مضبوط کرنے پر مرکوز تھا جبکہ تنازعہ کشمیر کو ایک پیچیدہ مسئلہ قرار دے کر اس پر دوٹوک گفتگو سے قصداً گریز کیا گیا۔

صدر پاکستان کے دورۂ بھارت میں کسی بھی موقع پر بھارت کی جانب سے ایسا تاثر نہیں ملا کہ وہ کشمیر کے اٹوٹ انگ ہونے کے اپنے دعوے میں کچھ لچک پیدا کرنے پر آمادہ ہے' بھارت کشمیر میں 7 لاکھ بھارتی افواج کی موجودگی کو اب بھی ضروری سمجھتا تھا اور اس نے ایسا کوئی عندیہ نہیں دیا کہ پاکستان کی دوستی کے جواب میں وہ کشمیری عوام پر جبر و تشدد کا سلسلہ بند کرتے ہوئے وہاں سے اپنی افواج کے انخلاء یا ان کی تعداد میں کمی پر آمادہ تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پاک بھارت دوستانہ تعلقات دونوں ممالک کے عوام کے مفاد میں ہیں اور مذاکرات کے اعلامیے کے مطابق کھوکھرا پار موناباؤ ٹرین سروس' پاکستان کے راستے ترکمانستان سے بھارت تک گیس پائپ لائن بچھانے کے منصوبے اور بزنس کونسل کے قیام جیسے امور پر اتفاق' دونوں ممالک کیلئے معاشرتی' تجارتی اور اقتصادی فوائد کا ذریعہ بن سکتے تھے مگر یہ بات اہل بصیرت پر بخوبی عیاں تھی کہ تنازعہ کشمیر کی موجودگی میں یہ تمام امور ثانوی حیثیت رکھتے تھے۔ مسئلہ کشمیر کا پائیدار اور منصفانہ حل پاک بھارت تعلقات کی پہلی سیڑھی تھی' جب تک ہم اسے طے نہیں کر لیتے دونوں ممالک میں خوشگوار تعلقات کی تمام کوششیں حسب سابق نقش برآب ثابت ہوئیں۔ صدر پاکستان بھارت میں بچشم خود ملاحظہ کر چکے تھے کہ مسئلہ کشمیر سے قطع نظر کر کے دیگر پہلوؤں سے بھارتی حکومت کے سامنے لچک دار انداز اپنا کر ہمیں بھارت میں کوئی پذیرائی نہیں ملی جس طرح کہ بھارتی کرکٹ ٹیم کو ہم نے پاکستان میں اپنی پلکوں پر بٹھایا تھا' فیروز شاہ کوٹلہ گراؤنڈ میں اس کی شکست کے آثار ظاہر ہوتے ہی بھارتی تماشائیوں کی اکثریت تنگ نظری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسٹیڈیم سے باہر چلی گئی جبکہ سینکڑوں تماشائی پاکستانی کرکٹ ٹیم کو زدوکوب کرنے کیلئے میدان میں اتر گئے۔ کیا یہ اس بات کا کھلا ثبوت نہیں تھا کہ بھارتی حکمران اور بھارتی عوام پاکستان کے بارے میں بدستور معاندانہ جذبات رکھتے تھے اور کسی بھی صورت میں پاکستان کی سرخروئی برداشت نہیں کر سکتے؟

صدر پاکستان کے دورۂ بھارت میں حریت کانفرنس کے چیئرمین سید علی گیلانی نے انہیں بجا طور پر خبردار کیا کہ

Marfat.com

کشمیر پر پاکستانی مؤقف کمزور ہو رہا ہے۔ اگر چہ صدر پرویز مشرف نے اپنے دورے سے پہلے بھی اس بات کا اعلان کیا تھا کہ کنٹرول لائن کو مستقل سرحد نہیں بنایا جائے گا اور نئی دہلی میں حریت کے رہنماؤں سے ملاقات کے دوران بھی انہوں نے اس مؤقف کا اعادہ کیا مگر اس کے باوجود کشمیر کے مستقبل کے بارے میں شکوک وشبہات کی دھند چھٹتی نظر نہیں آ رہی تھی۔

پاکستان نے تاریخ میں پہلی مرتبہ اپنی خارجہ پالیسی کی ترجیحات بدلتے ہوئے بھارت کے ساتھ کشمیر اور تجارت پر ایک ساتھ مذاکرات کرنے کا فیصلہ کیا۔ دوسری طرف بھارت' پاکستان اور کشمیر کے سیاستدانوں نے اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں' پاکستان پیپلز پارٹی کی سربراہ بے نظیر بھٹو' حریت کانفرنس انصاری گروپ کے راہنما میر واعظ عمر فاروق' بھارتی کمیونسٹوں سمیت سمندر پار کشمیری تاجر فاروق کٹھواری کافی متحرک ہو گئے تھے۔ اسلام آباد' نئی دہلی' سرینگر' نیو یارک' لندن اور برسلز میں موجود باخبر اور باوثوق ذرائع سے معلوم ہوتا تھا کہ سرینگر بس سروس شروع کرنے کے بعد پاکستانی صدر جنرل پرویز مشرف کا کرکٹ ڈپلومیسی کے تحت بھارت کا دورہ کافی اہمیت اختیار کرے گا۔ پاکستانی حکومت بھارت سے یہ مطالبہ کرنے کیلئے منصوبہ بندی کر رہی تھی کہ مقبوضہ جموں وکشمیر کے شہری علاقوں سے بھارتی ریگولر فوج کو بارکوں میں واپس بلایا جائے اور انسانی حقوق کے احترام کیلئے فوری اقدامات کئے جائیں۔ حکومت پاکستان کا یہ بھی ارادہ تھا کہ بھارت سے بگلیہار اور کشن گنگا منصوبوں پر عمل روک دینے کا مطالبہ جاری رکھتے ہوئے عالمی بنک سے رابطہ قائم رکھا جائے۔ سرینگر مظفر آباد بس سروس شروع کرنے کے ساتھ بھارت زوردار مطالبہ کرنے لگا کہ جنگ بندی لائن کی نگرانی کیلئے تعینات اقوام متحدہ کے فوجی مبصرین کو واپس بلایا جائے کیونکہ جنگ بندی لکیر کھل گئی ہے اور اب ان کی یہاں موجودگی کا کوئی جواز نہیں ہے۔

نئی دہلی حکومت کا اصرار تھا کہ پاکستان عالمی بنک سے رجوع کرنے کی بجائے دوطرفہ مذاکرات سے سندھ طاس معاہدے پر عملدرآمد کر کے یقین دہانیاں حاصل کرے اور تمام متعلقہ امور کو دوطرفہ مذاکرات کے نکتہ نظر سے ہی نپٹانے کی طرف توجہ دے۔ امریکہ' برطانیہ' یورپی یونین اور چین سمیت کی ممالک پاکستان اور بھارت کے درمیان جاری جامع مذاکرات پر تحسین پیش کر رہے تھے' امریکہ اس سلسلے میں کلیدی کردار ادا کر رہا تھا۔ امریکہ میں موجود کشمیری نژاد تاجر فاروق کٹھواری ان دنوں کافی سرگرم ہو گئے تھے۔ جناب کٹھواری کے واشنگٹن حکومت سے قریبی روابط تھے انہوں نے چند برس قبل ڈکسن پلان نما کشمیر فارمولہ بھی پیش کیا تھا۔ ڈکسن اور دیگر فارملوں پر بحث ومباحثہ ابھی تک جاری تھا' کشمیری سیاستدان تنازعہ کشمیر کے حل کے بارے میں جداگانہ خیالات ظاہر کرتے ہیں' کوئی الحاق کی بات کرتا ہے تو کوئی خودمختار کشمیر کا تصور پیش کرتا ہے' کوئی چناب فارمولہ سامنے لاتا ہے تو کوئی ڈکسن پلان پر عملدرآمد کو ترجیح دیتا ہے۔ کوئی کشمیر کو بفر سٹیٹ بنانا چاہتا ہے تو کوئی جنگ بندی لکیر کو بین الاقوامی سرحد بنانے کی مہم چلاتا ہے۔ فاروق کٹھواری نے گزشتہ دنوں اچانک بھارت اور مقبوضہ کشمیر کا ایک خفیہ دورہ کر کے مختلف حلقوں کو حیرت زدہ کر دیا' سرینگر سے شائع ہونے والے ایک جریدے نے انکشاف کیا کہ کٹھواری نے دہلی میں اعلیٰ حکومتی عہدیداروں اور جموں میں ریاستی وزیر اعلیٰ مفتی سعید کے علاوہ دیگر سیاستدانوں سے ملاقاتیں کیں۔ ان کے اس دورہ سے یہ بات زیر بحث آئی کہ بھارتی حکومت حریت کانفرنس کے متبادل چہروں کو تلاش کر رہی تھی اور کیا حریت والوں کو نظرانداز کرنے کا منصوبہ بنایا جا رہا تھا؟ اگر یہ بات حقیقت تھی تو وہ

Marfat.com

نئے چہرے کون تھے۔ مفتی سعید' فاروق کٹھواری' میر واعظ عمر فاروق' ڈاکٹر فاروق عبداللہ پر نئی دہلی کی نظریں جمی ہوئی تھیں کانگرس حکومت کو مفتی سعید کی شکل میں ایک روایتی حمایتی مل چکا تھا۔ مفتی سعید کافی تجربہ کار سیاستدان تھے' وہ بھارتی بیوروکریسی اور ایجنسیوں کے منظور نظر رہ چکے تھے' یہی وجہ تھی کہ تاریخ میں پہلی بار کسی کشمیری مسلمان کو بھارت کا داخلہ بنایا گیا تھا' مفتی سعید کی نئی سیاست ان کی دختر محبوبہ مفتی کی مرہون منت تھی۔ جنہوں نے حریت کانفرنس کے ایجنڈے پر عمل کرتے ہوئے عوام کی ہمدردیاں حاصل کیں۔ اقتدار تک پہنچنے کیلئے مفتی سعید کی علاقائی جماعت پی ڈی پی نے مسلح جدوجہد کی دبے الفاظ میں حمایت کی' اس جماعت نے نیشنل کانفرنس کو مات دینے کیلئے نئے گر آزمائے' اقتدار حاصل کرنے کے بعد کشمیریوں کے زخموں پر مرہم لگانے کا اعلان کیا' اور بعدازاں ایسے بیانات جاری کئے جن سے یہ تاثر ملا کہ مفتی سعید کے حزب المجاہدین سے قریبی روابط ہیں۔ حزب المجاہدین نے بعد میں مفتی حکومت کے ساتھ کسی بھی قسم کے روابط کو خارج از امکان قرار دے دیا' مفتی سعید کا دوسرا ایجنڈا سرینگر مظفرآباد بس سروس شروع کرنا تھا' ہیلنگ ٹچ پالیسی کے ناکام ہونے کے بعد مفتی سعید سرینگر مظفرآباد بس سروس چلانے میں کامیاب ہو گئے' اگرچہ بس سروس کو شروع کرنے میں غیبی طاقتوں نے کردار ادا کیا تاہم کشمیر میں مفتی سعید نے اس کا کریڈٹ لیا' مفتی سعید نیشنل کانفرنس کو تذبذب میں مبتلا کرنے میں کامیاب ہوئے۔ کانفرنس کے سرپرست اور سابق وزیراعلیٰ فاروق عبداللہ نے بھارتی پارلیمنٹ میں سرینگر مظفرآباد بس سروس کو پاسپورٹ کے بغیر شروع کرنے کی مخالفت کرتے ہوئے بی جے پی کا ساتھ دیا' لیکن فوری طور پر فاروق عبداللہ کو پارٹی کے سربراہ اور اپنے فرزند عمر عبداللہ کی طرف سے شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا' عمر عبداللہ نے سرینگر میں ایک ہنگامی پریس کانفرنس بلائی اور اعلان کیا کہ ان کے والد کے خیالات پارٹی کے نہیں بلکہ ان کے اپنے ہیں۔ انہوں نے واضح کیا کہ نیشنل کانفرنس پاسپورٹ کے بغیر بس سروس چلانے کے حامی ہے البتہ غیر ریاستی باشندوں کو (یعنی پاکستان اور بھارتی عوام کو) سرینگر مظفرآباد بس سے سفر کی اجازت نہ دی جائے۔

یہ بات دلچسپ ہے کہ مفتی سعید کی طرح عمر عبداللہ بھی کشمیری حریت پسندوں کے ایجنڈے پر چلنے کا تاثر دے رہے تھے' جبکہ جہادی تنظیمیں کے اتحاد متحدہ جہاد کونسل نے واضح کر دیا تھا کہ وہ سرینگر مظفرآباد بس سروس شروع کرنے کی مخالف ہے البتہ اس سلسلے میں جہادی تنظیمیں کافی محتاط نظر آ رہی تھیں' وہ کوئی ایسا ریمارکس نہیں دینا چاہتی جس سے یہ محسوس ہو کہ جہاد کونسل بس سروس سفر کرنے والوں کو دھمکی دے رہی ہے' شاید کونسل کو خدشہ ہو کہ بھارت بس سروس کو خوسبوتاژ کرنے کیلئے کوئی خطرناک کارروائی کر سکتا تھا' جس کا الزام مجاہدین پر عائد کیا جاتا۔ حریت کانفرنس کے شدت پسند دھڑے کے سربراہ سید علی شاہ گیلانی بس سروس کی مخالفت کر رہے تھے۔ انہوں نے احتجاجاً نئی دہلی میں منعقدہ یوم پاکستان کی تقریب میں شرکت کی دعوت کو مسترد کر دیا اور پاکستان کے خلاف کشمیریوں کے زخموں پر نمک پاشی کا الزام عائد کیا۔ جبکہ اعتدال پسند دھڑہ اس سروس کو شروع کرنے کا حامی تھا اور اس کا اصرار تھا کہ اسے بھی سفر کی اجازت دی جائے۔ تاکہ انٹرا کشمیر ڈائیلاگ کی راہیں ہموار ہو سکیں۔ اس دھڑے کے لیڈر میر واعظ عمر فاروق نے حال ہی میں امریکہ اور متحدہ عرب امارات میں اعلیٰ امریکی عہدیداروں اور کشمیری لیڈروں سے بات چیت کی تھی۔ امریکہ نے انہیں کیا ٹاسک دیا اس بارے میں بات کرنا قبل از وقت تھا۔ البتہ جس مشن پر فاروق کٹھواری نے بھارت اور کشمیر کا دورہ کیا وہ سب پر عیاں تھا۔

Marfat.com

بھارت' فاروق کٹھواری' میر واعظ عمر فاروق اور شبیر شاہ پر نظریں جمائے ہوئے تھا' نئی دہلی کو معلوم تھا کہ امریکہ نے میر واعظ سے رابطے بنا رکھے ہیں' یہی وجہ تھی کہ میر واعظ نے 3 ہفتے کے دورۂ امریکہ کے بعد دہلی پہنچنے پر کہا کہ تنازعہ کشمیر 2007ء میں حل ہو جائے گا' 2007ء ایک اہم سال ہوگا۔ پاکستان میں صدر جنرل مشرف چاہتے تھے کہ وہ 2007ء کے آخر تک تنازعہ کشمیر کے حل کا کوئی حتمی روڈ میپ بھارت سے طے کر لیں۔ بھارتی حکومت بھی چاہتی تھی کہ وہ صدر مشرف سے معاملات طے کر لے نئی دہلی والے سمجھتے تھے کہ اگر مشرف کے جانے تک کسی فارمولے پر اتفاق نہ ہوا تو پھر کافی مشکل پیش آئے گی۔ بھارت کی طرح امریکہ بھی چاہتا تھا کہ صدر مشرف پاکستان پر اتنی دیر حکومت کرتے رہیں جب تک اس کے اس خطے میں مفادات تکمیل کو پہنچ جاتے ہیں۔ امریکی وزیر خارجہ کونڈو لیزا رائس نے برصغیر کے دورۂ کے موقع پر اعلان کیا کہ امریکہ دہشت گردی کے خلاف لڑنے کیلئے پاکستان کو اسلحہ دے گا' سی آئی اے کا دعویٰ تھا کہ پاکستان میں دہشت گرد امریکی مفادات پر حملے کیلئے پرعزم ہیں۔ امریکہ نے پاکستان اور بھارت کو ایران سے گیس لینے سے بھی منع کر دیا' دوسری طرف چین بھی پاکستان کے ہاتھ مضبوط کرنے کے اعلانات کر رہا تھا' تازہ اعلان چین کے وزیر خارجہ لی ژاؤ ژنگ نے کیا' چین نے بھی اپنے دفاعی بجٹ میں 12.6 فیصد اضافہ کرتے ہوئے اسے 247.7 ارب یوان (30 ارب ڈالر) کر دیا' چین اپنے فوجیوں کی تعداد میں ایک لاکھ کی کمی کا بھی ارادہ رکھتا تھا۔ چینی وزیر اعظم کا دورہ اسلام آباد کافی اہم تھا۔ انہوں نے نئی پالیسی کے بارے میں پاک حکام سے مشورہ کیا۔

پاک بھارت تعلقات کی تاریخ میں پہلی بار بھارتی کمیونسٹ بھی میدان میں کود پڑے' بی جے پی اور کانگرس کی پاکستان پالیسی کو بدلتا دیکھ کر اور حالات کو خوشگوار محسوس کرتے ہوئے انہوں نے بھی دوڑ دھوپ شروع کر دی' کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے جنرل سیکرٹری اے بی بردہان اور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (ایم) کے جنرل سیکرٹری ہرکشن سنگھ سرجیت کا دورۂ پاکستان اس کی کڑی تھی' کمیونسٹ پاکستان پر ظاہر کر رہے تھے کہ وہ اسلام آباد سے دوستی چاہتے ہیں۔ اس تناظر میں سیاسی مبصرین کی نظریں اس بات پر مرکوز تھیں کہ آیا پاکستان عالمی بنک میں کشن گنگا پروجیکٹ کا مسئلہ بھی اٹھائے گا یا پھر غیر جانبدار ماہر کے تقرر کا مطالبہ ترک کر دے گا۔

پاکستان تنازعہ کشمیر پر دیرینہ' لچکدار' فراخدلانہ' قدم اٹھانے کا فیصلہ کر چکا تھا لیکن ابھی تک اس سلسلے میں کوئی حتمی روڈ میپ منظر عام پر نہیں لایا گیا' نئی دہلی اور اسلام آباد میں کرکٹ ڈپلومیسی' وفود کے تبادلے' قیدیوں کی رہائی' تجارتی تعلقات' سرحدوں کی نرمی جیسے اعتماد سازی کے اقدامات کا سلسلہ جاری تھا۔ کیا پاکستان حریت کانفرنس کے متبادل شخصیات کو تسلیم کر لے گا؟ اسلام آباد نئی خارجہ پالیسی کی ترجیحات بدل کر یہ تاثر دے رہا تھا کہ وہ نئی قیادت کو تسلیم کرنے میں پیچھے نہیں رہے گا۔ کیا کشمیری عوام متبادل قیادت کو تسلیم کر لیں گے؟ پاکستان اور بھارت کیلئے کشمیریوں کا بدلا ہوا مزاج سمجھنا کافی مشکل دکھائی دے رہا تھا۔

اسلامی جمہوریہ پاکستان کے باوردی صدر جنرل پرویز مشرف کو اپنا حالیہ دورۂ بھارت مکمل کئے بہت سارے دن ہو گئے تھے، یہی نہیں وہ فلپائن اور انڈونیشیا سمیت کچھ دوسرے ملکوں کے دورے کر کے جو بھارت کے دورے کے اختتام پر شروع ہوئے تھے واپس پاکستان بھی پہنچ چکے تھے لیکن کمال یہ ہے کہ ان کے دورۂ بھارت کی کامیابی کی داستانوں

Marfat.com

کی صدائے بازگشت ابھی تک سنائی دے رہی تھی اور اس صدائے بازگشت سے یہی تاثر مل رہا تھا کہ ہمارے صدر مملکت بھارت سے فتح یاب ہو کر آئے ہیں اور اس صدائے بازگشت میں ہماری قومی کرکٹ ٹیم کے بھارتی کرکٹ ٹیم پر فتح یاب ہونے کا حقیقی تاثر بھی دب کر رہ گیا۔

ایک سینئر بھارتی اہلکار نے کہا کہ ''بھارت پاکستان کو آہستہ آہستہ زمینی راستے سے تجارت کی طرف لا رہا ہے''۔ اس بھارتی اہلکار نے بتایا کہ ''بھارت نے پاکستان کو اس بات پر آمادہ کر لیا ہے کہ وہ بھارت کو تجارت کے معاملے میں پسندیدہ ترین ملک کا درجہ دے یا نہ دے کم سے کم دو طرفہ تجارت کیلئے مختلف نوعیت کے اقدامات ضرور کرے۔ اس حوالے سے بھارت نے آہستہ آہستہ پاکستان کو یہ تجویز ماننے پر رضا مند کر لیا ہے کہ سرینگر مظفر آباد روٹ پر (بس سروس شروع ہو جانے کے بعد) تجارت کیلئے ٹرک چلانے کی اجازت دے دی جائے''۔

(روزنامہ نوائے وقت۔12 اپریل2005ء)

اس کا مطلب یہ تھا کہ بھارت کسی باقاعدہ اعلان کے بغیر پہلے مرحلے میں ٹرانزٹ ٹریڈ (Transit Trade) یا راہداری تجارت کیلئے اپنے ٹرک سڑک پر لانے میں کامیاب ہو گیا۔ سینئر بھارتی اہلکار نے بڑے پرمسرت انداز میں کہا کہ آج پہلے مرحلے میں اگر سرینگر...... مظفر آباد روٹ تجارت کیلئے ٹرک چلانے کی اجازت ملی ہے تو کل اگلے مرحلے میں یہی سلسلہ واہگہ سے بھی شروع کرایا جا سکتا ہے۔ بھارت کے سیکرٹری امور خارجہ شیام سرن نے اس موقع پر ایک زبردست یقین دہانی کرائی۔ انہوں نے کہا کہ (مقبوضہ کشمیر میں) بگلیہار ڈیم کا ڈیزائن تبدیل کرنے کے بارے میں ہمارے وزیر اعظم ڈاکٹر من موہن سنگھ نے جو وعدہ صدر جنرل پرویز مشرف سے کیا ہے اس کی روشنی میں ضرور نظر ثانی کی جائے گی۔ ڈیم پر گیٹ نہ لگانے کی پاکستان کی تجویز اصولی طور پر مان لی گئی ہے تاہم اس سلسلے میں قطعی فیصلہ فنی ماہرین ہی کریں گے۔ اگرچہ شیام سرن نے اس ضمن میں کچھ وضاحت نہیں کی تاہم یہ بات طے نظر آتی تھی کہ یہ فنی ماہرین بھارت ہی کے ہوں گے اور وہ جو قطعی فیصلہ کریں گے اس کے بارے میں پاکستان کو کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے' یہ علیحدہ بات ہے کہ بھارت کے من موہن وزیر اعظم نے جو وعدہ کیا تھا اسے ہمارے ہاں صدر جنرل پرویز مشرف کے دورۂ بھارت کے سلسلے کی بہت بڑی کامیابی قرار دیا جا رہا تھا۔

صدر جنرل پرویز مشرف نے جب نئی دہلی میں پاکستان اور بھارت کے درمیان بین الاقوامی ایک روزہ کرکٹ میچوں کے حالیہ سلسلے کا چھٹا اور آخری میچ دیکھنے کیلئے بھارتی حکومت کی دعوت حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی تو ان کی یہ خواہش پوری کرتے ہوئے بھارتی حکومت نے انہیں بھارت کا دورۂ کرنے کی دعوت دو دے دی تھی تاہم ساتھ ہی بھارتی حکومت کے ترجمانوں نے اپنے بیانات کے ذریعے یہ واضح کرنا شروع کر دیا تھا کہ پاکستان کے سربراہ مملکت کا یہ دورۂ صرف میچ دیکھنے تک محدود رہے گا اور اسے دونوں حکومتوں کے درمیان بات چیت کیلئے استعمال نہیں کیا جائے گا' بہرحال ہماری حکومت کے ترجمانوں نے یہی تاثر دینا شروع کر دیا کہ اس دورے میں بھی دونوں ملکوں کے مابین کشمیر کے مرکزی مسئلے سمیت تمام اہم متنازعہ معاملوں پر تبادلہ خیال ہوگا اور مسئلہ کشمیر کے حل کی طرف پیش رفت کی جائے گی۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جوں جوں صدر جنرل پرویز مشرف کے دورۂ بھارت کی تاریخ (16

Marfat.com

اپریل 2005ء) قریب آتی گئی بھارتی ترجمانوں کے رویے میں کچھ لچک اوران کے بیانات میں کچھ نرمی آتی چلی گئی اور انہوں نے بھی کہنا شروع کر دیا کہ مسئلہ کشمیر پر بھی صدر جنرل پرویز مشرف اور من موہن سنگھ وزیراعظم کے درمیان بات چیت ہوسکتی ہے لیکن بھارتی وزیر خارجہ نٹور سنگھ نے اس معاملے میں حسب معمول کوئی لگی لپٹی رکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی اور مسئلہ کشمیر کو صرف ایک بات تک محدود کر دیا' نٹور سنگھ کا کہنا ہمیشہ کی طرح یہی تھا کہ ''ہاں مسئلہ کشمیر پر اس حوالے سے بات چیت ہوسکتی ہے کہ پاکستان نے بھارت کے ایک علاقے (آزاد کشمیر) پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہے اسے یہ علاقہ بھارت کو واگزار کر دینا چاہئے''۔ (روزنامہ نوائے وقت 12 اپریل 2005ء)

یہ علیحدہ بات ہے کہ ہمارے ترجمانوں نے مسٹر نٹور سنگھ کے رویے اور بیانات کو کوئی زیادہ اہمیت دینا مناسب نہ سمجھا اور وزیراعظم ڈاکٹر من موہن سنگھ سے کچھ امیدیں وابستہ کر لیں' لیکن جب بات چیت شروع ہوئی تو پتہ چلا کہ بھارتی وزیراعظم اتنے بھی موہن نہیں کہ مسئلہ کشمیر پر بھارت کی روایتی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ نہ کریں' انہوں نے بات چیت کے دوران میں مسئلہ کشمیر کے بارے میں جو کچھ کہا وہ ان کے وزیر خارجہ نٹور سنگھ کے بیانات سے مختلف نہیں تھا۔ بلکہ سردار من موہن سنگھ تو یہاں تک کہہ گئے کہ بھارت اپنی سرحدوں میں مذہب کی بنیادوں پر مزید کوئی تبدیلی..... یعنی مسئلہ کشمیر کے منصفانہ اور کشمیری عوام کے حق خود اختیاری کی بنیاد پر کسی حل..... کا متحمل نہیں ہوسکتا۔

اور یہ وہ بات ہے جو ہم بھارتی لیڈروں کی زبان سے گزشتہ نصف صدی سے زیادہ عرصے سے سنتے آئے ہیں شاید یہی وجہ ہے کہ ایک انگریزی روزنامے کے کالم نویس نے یہ سوال کیا کہ ''آخری یہی کچھ سننے کیلئے صدر جنرل پرویز مشرف کو کرکٹ میچ دیکھنے کی دعوت حاصل کرنے (اور بعض بھارتی لیڈروں کے بیانات کے مطابق کرکٹ میچ کے بہانے) بھارتی لیڈروں سے بات چیت کی غرض سے نئی دہلی جانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟''۔

(دی نیشن 18 اپریل 2005ء)

اسلامی جمہوریہ پاکستان کی وزارت امور خارجہ کے ترجمان جلیل عباس جیلانی نے بعض لوگوں کے اس خیال کے اظہار پر بڑی برہمی ظاہر کی کہ نئی دہلی کی حالیہ سربراہ بات چیت میں بھارت کے من موہن سنگھ وزیراعظم نے کچھ ایسی من موہنی دکھائی کہ ہمارے صدر صاحب کو کشمیر کے مرکزی اور اصلی مسئلے کو چھیڑنے کا موقع ہی نہیں ملا' ترجمان نے دفتر خارجہ کی معمول کی بریفنگ میں یہ دعوی کیا کہ کشمیر کے مرکزی اور اصل مسئلے پر نہ صرف یہ کہ نئی دہلی کی بات چیت میں تبادلہ خیال کیا گیا بلکہ اس مسئلے میں اتنی پیش رفت بھی ہوئی ہے کہ بھارت کے رویے میں لچک پیدا ہوگئی اور اس نے کشمیر کو واقعی مرکزی مسئلہ تسلیم کر لیا۔

جن لوگوں نے یہ اعتراض کیا ہے کہ پاکستان نے نئی دہلی میں مسئلہ کشمیر کو پس پشت دھکیل دیا ہے اور اس پر بات چیت نہیں کی انہوں نے دراصل مشرف من موہن بات چیت کے بعد جاری ہونے والے مشترکہ بیان کو اپنی نظروں کے سامنے رکھا ہے اور یہ بہت ہی زیادتی کی بات ہے ورنہ اگر وہ اس بیان کی گہرائیوں میں جانے کی کوشش کرتے (جو حقیقتاً میں بہت ہی مشکل کام تھا) اور وہ اب اگر اس مشترکہ بیان کا مطالعہ اور تجزیہ اپنی وزارت خارجہ کے ترجمان کے دعوے کی روشنی میں کرتے تو ان پر منکشف ہوگا کہ نئی دہلی میں تو زیادہ تر بات چیت مسئلہ کشمیر ہی پر ہوئی۔

Marfat.com

یہ درست ہے کہ صدر جنرل پرویز مشرف اور من موہن سنگھ وزیراعظم کے درمیان ہونے والی بات چیت میں کشمیر کا وہ مرکزی مسئلہ جیسا کہ انگریزی میں کہتے ہیں As Such زیر بحث نہیں آیا جس کا تعلق ریاست جموں وکشمیر کے مستقبل، ریاستی عوام کے حق خوداختیاری اور اس سلسلے میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی قراردادوں سے ہے (وہ تو پہلے ہی ہم ان قراردادوں کو ایک طرف رکھ دینے کی پیش کش کر چکے ہیں) لیکن بنظر غائر دیکھا جائے بلکہ ہماری قیادت کی بصیرت والی آنکھ سے دیکھا جائے تو نئی دہلی کی بات چیت میں قدم قدم پر کشمیر ہی کے حوالے سے گفت وشنید ہوتی رہی۔ 613

بگلیہار ڈیم پر بات چیت ہوئی، سرکریک کی چوٹی پر قبضے کا مسئلہ زیر بحث آیا، کشن گنگا ڈیم (دریائے جہلم پر بند باندھنے) کے بھارتی منصوبے پر تبادلہ خیال کیا گیا اور تو اور مقبوضہ کشمیر کے گرمائی دارالحکومت سرینگر اور آزاد کشمیر کے دارالحکومت مظفرآباد کے درمیان جاری ہونے والی بس سروس کے ساتھ ساتھ پاکستان کی طرف سے بھارت کی اس تجویز پر رضامندی کہ اس بس سروس کے روٹ پر تجارتی ٹرک بھی چلنے دیئے جائیں، کرگل سے ایک مسافر بس سروس چلانے کی تجویز اور سیاچن سے فوجوں کے انخلاء جیسے مسائل پر بھی غور کیا گیا۔ کشمیر کا مرکزی مسئلہ بھارت کی روایتی ہٹ دھرمی کی وجہ سے زیر بحث نہ آسکا۔ اگر ہم نے سیاچن سمیت جموں وکشمیر میں کنٹرول لائن کے ساتھ جنگ بند کرکے بھارت کو کنٹرول لائن پر لوہے کی باڑ مکمل کرنے اور اس میں بجلی کی رو دوڑانے کا موقع فراہم کر دیا تو اس سے بھی مقصد یہی تھا کہ دراندازی بند کر دی جائے۔ نام نہاد دراندازی کا ڈھنڈورا پیٹ پیٹ کر بھارت دنیا کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ مقبوضہ کشمیر میں جو جنگ آزادی جاری ہے وہ کشمیری عوام نہیں لڑ رہے بلکہ یہ پاکستان سے جانے والے درانداز لڑ رہے ہیں، لیکن بھارت کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں کہ اگر یہ جنگ کشمیری عوام نہیں لڑ رہے تو پھر نوے ہزار سے زائد شہداء کی قبریں کہاں سے آ گئیں؟۔

معروف سیاسی تجزیہ نگار حبیب الرحمٰن نے اگست 2005ء میں اپنے کالم ''اسلام آباد کی ڈائری'' میں لکھا:

''ہندوستان ایک سے زائد مرتبہ واضح کر چکا ہے کہ اس کی ایٹمی طاقت پاکستان کے خلاف استعمال کرنے کیلئے نہیں بلکہ عوامی جمہوریہ چین کو دکھانے کیلئے ہے۔ چینی قیادت نے دیکھ لیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بیجنگ اور نئی دہلی کے تعلقات میں بہتری کا عمل جاری وساری ہے۔ سرحدی تنازعوں کی پیدا کردہ کشیدگی باقی نہیں رہی ہے اور باہمی تجارت فروغ پا رہی ہے۔ امریکہ اور ہندوستان کے حالیہ معاہدے نے تو ایٹمی ومیزائل ٹیکنالوجی میں ہندوستان کو عوامی جمہوریہ چین پر برتری دلانے کا بندوبست کر دیا ہے۔ ذہین چینی قیادت روسی فیڈریشن کے ساتھ رفاقت کے پرانے رشتے بحال کرنے لگی ہے۔ ماسکو اور نئی دہلی کے دوستانہ تعلقات دیرینہ ہیں۔

ان ساری باتوں کا حاصل یہ ہے کہ پاکستان اب ہندوستان پر دباؤ ڈالنے کی پوزیشن میں نہیں رہا ہے۔ چینی کارڈ اسلام آباد کے ہاتھوں سے نکل چکا ہے۔ چینی دوستوں کا مشورہ ہے کہ پاکستان دوطرفہ مذاکرات کے ذریعے ہندوستان سے معاملات طے کرنے کی کوشش کرتا رہے۔ پاکستان اپنے طور پر ہندوستان کو چھیڑنے کی غلطی اس لئے نہیں کر سکتا کہ ہندوستان کی فوجی طاقت ہر لحاظ سے کہیں زیادہ ہے۔ 06-2005ء کے دوران ہندوستان دفاعی ضرورتوں پر انیس ارب ڈالرز خرچ کرے گا۔ پاکستان کا دفاعی بجٹ پونے چار ارب ڈالرز کے لگ بھگ ہے۔ پاکستان کے پاس پچیس

Marfat.com

سے پچاس تک ایٹم بم بنانے کی صلاحیت ہے۔ ہندوستان ایک سو سے ڈیڑھ سو تک ایٹم بم بنا سکتا ہے۔ پاکستانی فوج کی تعداد چھ لاکھ انیس ہزار ہے جبکہ بھارتی فوج تیرہ لاکھ پچیس ہزار کے لگ بھگ ہے۔ پاکستان کے پاس دو ہزار چار سو ساٹھ ٹینک ہیں۔ ہندوستانی ٹینکوں کی تعداد تین ہزار آٹھ سو چھیانوے ہے۔ پاکستان کی آرٹلری دو ہزار اور ہندوستان کی ساڑھے چار ہزار' پاکستان کے لڑاکا طیارے چار سو پندرہ اور ہندوستان کے چھ سو اسی اور پاکستان کی آبدوزیں نو اور ہندوستان کی سولہ۔ غرضیکہ ہندوستان کی برتری پوری طرح نمایاں ہے۔

ان دنوں کہا جا رہا ہے کہ طاقت کا توازن قائم رکھنے کیلئے پاکستان ہتھیار خریدنا چاہتا ہے اور زیادہ سے زیادہ میزائل بنانا چاہتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ پاکستان کے پاس اتنے مالی وسائل کہاں ہیں کہ ہندوستان کے برابر طاقت بنا سکے۔ صدر فیلڈ مارشل ایوب خاں نے 65ء کی جنگ شروع کی تھی اور گیارہ دن بعد دنیا سے یہ اپیل کرنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ جنگ بند کرنے پر ہندوستان کو رضامند کیا جائے۔ اس مجبوری کی وجہ یہ ہوئی تھی کہ پاکستان کے اسلحہ خانوں میں ہتھیاروں کا ذخیرہ ختم ہو رہا تھا اور پاکستان جنگ جاری رکھنے کی پوزیشن میں نہیں رہا تھا۔ 65ء کی جنگ سترہ دن میں ختم ہو گئی تھی۔ کشمیر کے محاذ پر ڈھکی چھپی جنگ کو جہاد کا نام دے کر تقریباً آٹھ برس چلایا گیا۔ فرض کر لیا گیا کہ جنگ کی طوالت ہندوستان کی معیشت کو تباہ کر دے گی اور نئی دہلی کے حکمران مقبوضہ کشمیر سے نکلنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ مگر یہ مفروضہ بھی غلط ثابت ہوا۔ ہزاروں مجاہد جاں بحق ہوئے۔ پاکستانی معیشت کمزور ہوتی چلی گئی اور مقبوضہ کشمیر کا ایک انچ علاقہ بھی پاکستان کے ہاتھ نہ آ سکا۔

صدر جنرل ضیاء الحق مرحوم کی حالیہ برسی کے موقع پر چند قلم کاروں نے یہ تاثر دیا کہ افغانستان میں ضیاء الحق مرحوم نے سوویت یونین کو شکست دی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ امریکہ کے جدید ترین ہتھیاروں' اس کے اربوں ڈالرز' سعودی عرب کی بے حساب دولت اور سرد جنگ ختم کرنے پر ماسکو اور واشنگٹن کی رضامندی نے افغانستان سے روسی فوجوں کی واپسی کی راہ ہموار کی تھی۔

بات دراصل یہ ہے کہ ہم لوگ روز اول سے خود فریبی میں مبتلا رہے ہیں' حقائق کو مسخ کرنے اور تاریخ کا حلیہ بگاڑنے کا شوق پورا کرتے رہے ہیں۔ علم اور شعور سے عاری عوام کو گمراہ کرنے والے نعرے دیتے آئے ہیں اور ان کی توجہ اصل مسائل سے ہٹاتے آئے ہیں۔ عرصہ دراز کے بعد 65ء کی جنگ کے صحیح نتائج سامنے آئے۔ مشرقی پاکستان ہاتھ سے گیا۔ کشمیر میں نام نہاد جہاد کی تباہ کاریاں عیاں ہوتی گئیں۔

معرکہ کارگل کے نتائج سامنے آ گئے اور غربت' بے روزگاری اور مہنگائی وبال جان بن گئی تو ہمیں ہوش آنے لگا۔ اب عوام کو احساس ہو رہا ہے کہ پاکستان کو قائم رکھنے کیلئے امن ضروری ہے۔ ہندوستان کے ساتھ اچھے تعلقات ناگزیر ہیں اور امریکہ سے تعاون میں عافیت ہے۔ (ہفت روزہ اخبار جہاں۔ 29 اگست تا 4 ستمبر 2005ء)

Marfat.com

پاک بھارت عسکری توازن

2005ء میں پاکستان اور بھارت کے درمیان عسکری توازن بہت بگڑ چکا تھا۔ بھارت دھڑا دھڑ اسلحہ کے انبار لگا رہا تھا اور پاکستان کے معاشی حالات اس مہم جوئی کے متحمل نہیں تھے۔ 6 جنوری 2003ء کو بھارت نے ''سٹریٹجک فورس کمانڈ'' تشکیل دینے کا اعلان کر کے خطے کے عسکری توازن میں ہلچل پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس فورس کی ذمہ داری میں تمام اقسام کی جوہری حکمت عملی طے کرنا' اس پر عملدرآمد کرنا اور جوہری حرکات (نیوکلیئر مومنٹس) کا تعین کرنا شامل ہے۔ یہ فورس نیوکلیئر کمانڈ اتھارٹی کے تحت ہے جس کے چیئرمین بھارتی وزیراعظم ہیں۔ مئی 2003ء میں پاکستان نے ایک مرتبہ پھر بھارت کو پیشکش کی کہ خطے کو مشترکہ طور پر جوہری ہتھیاروں سے پاک علاقہ بنایا جائے جسے بھارت نے مکمل طور پر مسترد کرتے ہوئے اپنے ایٹمی میزائل ''اگنی سوم'' کی استعداد کار اور رینج بڑھانے کا اعلان کر دیا۔ خطے میں عسکری توازن بگڑتے دیکھ کر پاکستان نے بھی پہلے حتف چہارم' شاہین ون جوہری میزائل کا کامیاب تجربہ کیا اور بعدازاں ایک اور جوہری میزائل غوری کا تجربہ کیا جس کی رینج 1500 کلومیٹر تک ہے۔ پاکستان نے بھی کمانڈ اینڈ کنٹرول اتھارٹی قائم کر دی۔ خطے میں ایک عرصہ سے میزائل ریس جاری ہے۔ جس کی تمام تر ذمہ داری بھارت پر عائد ہوتی ہے۔ ایک بڑی جوہری طاقت اور بڑا ملک ہونے کی وجہ سے بھارت عرصہ دراز سے توسیع پسندانہ اور اپنے پڑوسی ممالک کے خلاف جارحانہ عزائم کا کھلم کھلا اظہار کرتا چلا آ رہا ہے۔ پاکستان دو مرتبہ بھارت کی جارحیت کا شکار ہو چکا ہے۔ دوسری مرتبہ تو اس نے پاکستان کو بڑی کامیابی کے ساتھ دولخت بھی کر دیا تھا۔ بھارت کو اپنے شمال مغرب میں جارحانہ عزائم اور اقدامات سے باز رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان عسکری توازن قائم رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپریل 1998ء میں جب بھارت نے ایٹمی دھماکے کر کے پاکستان کو مرعوب اور متاثر کرنے اور ڈرانے' دھمکانے کی کوشش کی تو عالمی طاقتوں کے دباؤ' لالچ اور دھمکیوں اور ساری دنیا کی مخالفت کے باوجود پاکستان نے جوابی چھ ایٹمی دھماکے کر کے بھارت کے غبارے سے ہوا نکال دی۔

بھارت پاکستان سے 10 گنا بڑا ملک ہے۔ اس کی معاشی اور عسکری صلاحیت بھی پاکستان سے کہیں زیادہ ہے۔ محض بھارت کے جارحانہ عزائم کی وجہ سے پاکستان کو اپنی ہمت اور بساط سے کہیں زیادہ رقم دفاع پر خرچ کرنا پڑ رہی ہے۔ اگر اعداد و شمار پر ایک نظر ڈالی جائے تو آسانی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پاکستان جنوبی ایشیا میں عسکری توازن قائم رکھنے کیلئے کیا کچھ کر رہا ہے؟ مثال کے طور پر پاکستان سے 10 گنا بڑے ملک بھارت کی فوج کی افرادی قوت 13 لاکھ 25 ہزار ہے جبکہ پاکستان کی فوج کی افرادی قوت چھ لاکھ بیس ہزار ہے۔ بھارت کے پاس 5 لاکھ 35 ہزار محفوظ سپاہ جبکہ

Marfat.com

پاکستان کے پاس پانچ لاکھ تیرہ ہزار ریزرو فوج موجود ہے۔ بھارت کے پاس سٹریٹجک فورسز کمانڈ ہے جبکہ پاکستان نے ایسی کوئی فورسز تشکیل نہیں دی۔ انڈیا کی ریگولر بری فوج کی تعداد گیارہ لاکھ جبکہ پاکستان کی ریگولر بری افواج کی تعداد ساڑھے پانچ لاکھ ہے۔ بھارت کی پانچ علاقائی کمانڈ ہے جبکہ پاکستان نے کوئی علاقائی کمانڈ قائم نہیں کی۔ بھارت کے پاس 12 کور' 3 آرمڈ ڈویژن' 4 ریپڈ ڈویژن' 18 انفنٹری ڈویژن' 10mtn ڈویژن'' 2 آرٹلری ڈویژن' 16 آزاد بریگیڈ ایک سپیشل رجمنٹ (پرتھوی)' 4 اے ڈی بریگیڈ اور 3 انجینئر بریگیڈ ہیں۔ علاقائی فوج میں بھارت کے پاس 25 انفنٹری بٹالین اور 29 ڈیپارٹمنٹل یونٹس موجود ہیں۔ ریگولر آرمی میں بھارت کے پاس 200 آرٹلری رجمنٹس موجود ہیں۔ پاکستان کے پاس ریگولر آرمی میں 9 کور ہیڈ کوارٹرز' دو آرمڈ ڈویژن' 19 انفنٹری ڈویژن' 9 آرٹلری کور بریگیڈ' 26 آزاد بریگیڈ' 3 آرمڈ رجمنٹ ایک ایس ایف گروپ (تین بٹالین) جبکہ ایوی ایشن کے سولہ سکوارڈن بھی موجود ہیں۔ پاکستان کے پاس کوئی علاقائی فورسز بھی نہیں ہیں۔ بھارت کے پاس 700 ٹی پچپن' 1900 ٹی بہتر' 1200 وجانتا' 4 ارجن اور 124 ٹی۔ نوے ایس' ایم بی ٹینک ہیں اس کے جواب میں پاکستان کے پاس 232 ایم اڑتالیس اے پانچ' 5 ٹی چون' 1100 پی آر سی ٹائپ انسٹھ' 400 پی آر سی ٹائپ انہتر' 250 سے زائد پی آر سی ٹائپ پچاسی' 321 ٹی اسی یوڈی اور پندرہ الخالد ایم بی ٹینک موجود ہیں۔ بھارت کی فوج 90 پی ٹی چھہتر' 100 پی آر ڈی ایم ٹو' 1600 بی ایم پی ہاف' 157 او ٹی باسٹھ' چونسٹھ اور 160 کیسپر سے بھی مسلح ہے جبکہ پاکستانی فوج صرف 1100 ایم ایک سو تیرہ' 120 بی ٹی آر 70 اسی اور 31 یو آر چار سو سولہ ٹینکوں سے لیس ہے۔ بھارتی آرٹلری کے پاس 75 ملی میٹر دھانے کی 900 توپیں' 215 ایف آر وائی ایم اڑتالیس' 105 ملی میٹر دھانے کی 1300 آئی ایف جی ففٹی ایم چھپن' 130 ملی میٹر کی 1200 ایم چھیالیس' 155 ملی میٹر والی 410 ایف ایچ ستتر بی توپیں' 105 ملی میٹر والی 80 ایبٹ' 130 ملی میٹر کی 100 جدید ایم چھیالیس' 152 ملی میٹر کی 19 ایس ٹو' 122 ملی میٹر کی 150 بی ایم اکیس' 214 ملی میٹر کی 30 پناچا' 8 ملی میٹر کی 5000 ای ون' 120 ملی میٹر کی 1500 برانٹ اے ایم ففٹی' 160 ملی میٹر کی 500 ایم انیس سو تینتالیس' میلان' ساگر' سپائی گاٹ اور سپینڈرل موجود ہیں۔ بھارت کے پاس نزدیک اور دور تک مار کرنے والی دنیا کی جدید ترین توپوں کی بڑی ورائٹی موجود ہے۔ اس کی بری افواج 84 ملی میٹر کے دھانوں والی کارل گستاف اور 106 ملی میٹر کی 1000 سے زائد ایم چالیس اے ون گنوں سے مسلح ہے۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ ہندوستانی سپاہ کے پاس دو ہزار چار سو چوبیس 20 ملی میٹر والی اوئرلکن' 23 ملی میٹر والی تین سو زیڈ یو تیئیس ٹو' ایک سو زیڈ ایس یو تیئیس فور ایس پی' 30 ملی میٹر والی دو سو بیالیس ایس سکس' 40 ملی میٹر والی بارہ سو ایل چالیس ساٹھ اور آٹھ سو ایل چالیس ستر ٹینک شکن گنز اور میزائل موجود ہیں۔ بھارتی فوج کے پاس 180 ایس اے سکس' 620 ایس اے سیون' 50 ایس اے ایٹ بی' 400 ایس اے نائن' 50 ایس اے سیون' 250 ایس سے تھرٹین اور 500 ایس سے سکسٹین میزائل موجود ہیں جو زمین سے فضا میں مار کرنے والے میزائل ہیں۔ بھارتی فوج کو ایک سو ''چیتاک'' ہیلی کاپٹر' 50 چیتا' 12 لانسر' سرچ' نشانات اور لینڈنگ کرافٹ کی سہولت بھی حاصل ہے۔ بھارت نے اپنی سب سے زیادہ فوج شمال میں کشمیر اور مغرب میں پاکستانی سرحدوں پر تعینات کر رکھی ہے۔ شمال میں اس کی تین کارپس موجود ہیں جس میں آٹھ انفنٹری ڈویژن اور دو ماؤنٹین ڈویژن بھی موجود ہیں۔ مغرب میں پاکستانی سرحد کے ساتھ تین کارپس میں ایک آرمڈ' 5 انفنٹری ڈویژن اور 3 ریپڈ ڈویژن فوج

Marfat.com

تعینات ہے۔وسط میں ایک کارپس' ایک آرمڈ' ایک انفنٹری' 7 ماؤنٹین' جبکہ جنوب میں دو کارپس' ایک آرمڈ اور تین انفنٹری ڈویژن موجود ہیں۔اس کے مقابلے میں پاکستان کے پاس 1317 توپیں ہیں جن میں 85 ملی میٹر کی 200 پی آر سی ٹائٹ 556' 10 ملی میٹر کی 300 ایم ون ہنڈرڈ ون' 50 ایم ففٹی سکس پیک 122 ملی میٹر دھانے والی 80 آر سی ڈی تھرٹی توپیں' 250 پی آر سی ٹائپ ففٹی فور' 130 ملی میٹر والی 227 پی آر سی ٹائپ ففٹی نائٹ ون'' 155 ملی میٹر والی 60 ایم ون فائمن اور 124 ایم ون نائٹی ایٹ توپیں جبکہ 203 ملی میٹر دھانے والی 26 ایم ون ففٹین توپیں ہیں۔پاکستانی فوج کو 105 ملی میٹر دھانے والی 50 ایم سیون' 155 ملی میٹر والی 200 ایم ون زیرو نائن اے ٹو اور 203 ملی میٹر والی 50 ایم ون ٹین اے ٹو توپوں کی معاونت بھی حاصل ہے۔122 ملی میٹر والے 50 ''آزاد'' ملٹی پل راکٹ لانچر اور 81 ملی میٹر اور 120 ملی میٹر والی 1475 اے ایم ففٹی' ایم سکسٹی ون مارٹر توپیں بھی پاک فوج کی آرٹلری میں شامل ہیں۔پاکستان کے پاس زمین سے زمین پر مار کرنے والے 80 حتف ون' 65 حتف تھری شاہین ون اور 20 حتف پنجم (غوری) میزائل ہیں جبکہ ٹینک شکن ایم نائن زیرو ون' بکتر شکن (ریڈ ایروائیٹ) 73 ملی میٹر والے آر پی جی سیون' 89 ملی میٹر والے ایم ٹونٹی' 75 ملی میٹر والے ٹی ففٹی ٹو' 106 ملی میٹر والے 3700 ایم فورٹی اے ون راکٹ لانچر' 14,5 ای لیٹر لرز 35 ملی میٹر والی 1900 ایئر ڈیفنس گنز بھی موجود ہیں۔اس کے علاوہ فضائی دفاع کیلئے آرٹلری میں 37 ملی میٹر والی پی آر سی ٹائپ ففٹی فائیو' 40 ملی میٹر والی ایم ون' 50 ایل سکسٹی' 57 ملی میٹر والی پی آر سی ٹائپ ففٹی نائن' 85 ملی میٹر والی 200 پی آر سی ٹائپ سیونٹی ٹو گنز بھی شامل ہیں۔پاکستان کے پاس زمین سے فضا میں مار کرنے والے 60 ایچ این فائیو اے سنگر' 400 آر بی ایس سیونٹی' 500 کے ون ٹو عنزہ اور 230 مسترال میزائل بھی ہیں جو کسی بھی تیز سے تیز رفتار فائٹر طیارے کو گرانے کی مکمل صلاحیت رکھتے ہیں۔آرمی کے پاس دو کمانڈر ایٹ فارٹی' سیسنا فورٹو ون' کمانڈر سکس نائٹ زیرو تھری' وائی ٹو ئیلو' 90 مشاق اور 30 او ون ای طیارے بھی ہیں۔19 اے ایچ ون ایف ہیلی کاپٹر' 12 بیل سیون فور جی' 5 ٹو زیرہ فائیو اے ون' 8 ٹو زیرو سکس بی' 10 ایم آئی ایٹ'' 15 آئی اے آر' 20 ایس اے تھری ون نائن' 25 ایس اے تھری تھری زیرو' 5 یو ایچ ون ایچ اور 10 شویز ربفر تھری زیرو زیرو سی ہیلی کاپٹر بھی فضائی حفاظت کیلئے موجود ہیں۔

نیوی:

جنگیں ایک خاص حکمت عملی کے تحت لڑی جاتی ہیں۔قدیم یا جدید جنگوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ جس ملک کی بحری فوج زیادہ طاقتور تھی' اس کا دفاع اور جارحانہ قوت اسی قدر زیادہ تھی۔بھارت ایک بڑی بحری قوت ہے' جس کی کل افرادی قوت 55 ہزار ہے۔خطے میں بحری طاقت کا توازن قائم کرنے کیلئے پاکستان کو بھی اپنی بحری قوت میں مسلسل اضافہ کرنا پڑتا ہے۔

پاکستان بحریہ کی افرادی قوت 25000 ہے۔بھارت نے اپنی بحریہ کو مغربی' جنوبی اور مشرقی کمانڈز میں تقسیم کر رکھا ہے۔ممبئی میں مغربی کمانڈ کا ہیڈ کوارٹر' کوچن میں جنوبی' وشاکاپٹنم' میں مشرقی اور گوا میں بحری ایوی ایشن کے ہیڈ کوارٹر ہیں جبکہ ایرا کونام' کلکتہ' مدراس اور کارور میں نیول ایوی ایشن زیر تعمیر ہیں۔بھارتی بحریہ کے پاس 10 سندھو گھوش' 4 شیشوماایا پانچ کرسورا سب میرین موجود ہیں۔ایئر کرافٹ کیریئر میں برطانوی حرمس (ویرات)' 15 سی ایگل اے ایف

Marfat.com

ایم اور 15 سی کنگ ہیلی کاپٹر موجود ہیں۔ بھارت نے اپنی بحریہ کو راجپوت' سٹکش اور گوا جیسے لیزر گائیڈڈ اور فضا سے زمین پر مارنے والے میزائلوں دہلی' گیڈفلائی' زمین سے زمین پر مار کرنے والے سوچ بلیڈ نامی خطرناک میزائلوں اور 30 سے زائد ہیوی ہیلی کاپٹروں سے بھی مسلح کر رکھا ہے۔ بھارتی بحریہ میں شامل جنگی بحری بیڑوں میں برہما پترا' گوداوری' بلجر ی' کرشنا' آرنالا اور کھکری شامل ہیں جو سٹکش' کیکو' لبوچتاک' گریل اور سوچ بلیڈ جیسے خوفناک میزائلوں اور فضائی معاونت سے لیس ہیں۔ ساحلی علاقوں کی مسلسل گشت پر وجے درگ' ویر' وبھوتی اور ابھئے نامی جہاز مامور ہیں جو پاکھ' نانچکا اور دیگر جدید میزائلوں سے مسلح رہتے ہیں۔ بھارتی نیوی میں ایئر کرافٹ ودایت' اوسہ' سٹکش' سکانیا' سپر دورا بھی شامل ہیں۔ بھارت کے پاس پانڈی چیری' گھوپاڈ' یوگینیا' مگھر' اوتیا' دیپک' جیوتی سیندھیاک' مکر اور ساگر دھوانی نامی آبدوزیں شامل ہیں۔ بھارت نے بحری ایوی ایشن کو مضبوط بناتے ہوئے سی ہاریئر' بیئر (ریچھ) ' ڈیفنڈر اور ترسیل کیلئے طیاروں کے 8 سکوارڈرن بھی اپنی نیوی میں شامل کر رکھے ہیں۔ بھارتی بحریہ کے پاس آبدوز شکن طیاروں کے 7 سکوارڈن بھی ہیں جن میں سی کنگ اور سینکڑوں چیتاک طیارے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ 20 سی ہاریئر ایف آر ایس' دوٹی سکس زیرو' 5 نوتھری ایٹ' 8 ٹی یوون فورٹو ایف (ریچھ) 25 ڈونوٹو ایٹ فائیو' 8 کے اے ٹو ایٹ' 15 سی کنگ ہیلی کاپٹر اور فضا سے فضا اور فضا سے زمین پر مار کرنے والے میجک ون ٹو' سی ایگل' سی سکوا اور کے ایچ تھری فائیو میزائل بھی بھارتی بحریہ کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ بھارت کی قوی الجثہ بحریہ کے مقابلے میں پاکستان کو بھی اپنی نیول پاور کو مسلسل بہتر کرنا اور خطے میں امن اور توازن قائم رکھنے کیلئے مضبوط بنانا پڑتا ہے۔ پاکستانی بحریہ افرادی قوت میں کم ہونے کے باوجود اپنی صلاحیت اور استعداد کار کے لحاظ سے کسی بھی دوسری بحریہ سے کم نہیں ہے۔ کراچی میں پاک بحریہ کی ایک بیس ہے جبکہ گوادر اور ''آرمارا'' میں دونئی بیسز بھی تعمیر کی جارہی ہیں۔ پاکستانی آبدوز بیڑے میں خالد (اگوسٹا) نائٹ زیرو بی' ایگزوسٹ (Exocet) ایس ایم تھری نائن' حشمت (اگوسٹا سیون زیرو)' ہارپون یو ایس جی ڈبلیو' ہنگور (فرانسیسی ڈالفن) اور ہارپون یو ایس جی ڈبلیو نامی آبدوزیں شامل ہیں۔ جن پر جدید ترین طیارہ شکن' میزائل شکن' آبدوز شکن' توپیں' راکٹ لانچر اور لیزر گائیڈڈ میزائل نصب ہیں۔ پاکستانی جنگی بحری بیڑے میں طارق اور شمشیر شامل ہیں جن پر جدید ہارپون میزائل' توپیں اور راکٹ لانچر نصب ہیں۔ پاکستان کے پاس پانچ میزائل کرافٹ میں جن میں 3 سبقت اور دو جلالت کرافٹ ہیں جو ایچ وائی ٹو اور سی ایٹ زیرو ٹو' سمندر سے سمندر پر مار کرنے والے جدید میزائلوں سے لیس ہیں۔ ساحلی گشت کیلئے ایک لاڑکانہ پی سی 2' کوئٹہ پی سی سی اور سمندر کے اندر گشت کیلئے ایک پی سی آئی راجشاہی جہاز بھی شامل ہیں۔ پاک بحریہ میں جدید ترین فرانسیسی مائن ایری ڈان بھی شامل ہے۔ علاوہ ازیں پاک بحریہ فیو جنگ اے اوٗ معاون اے اوٗ گوادر اے اوٹی' اٹک اے اوٹی اور بحر پیا اے آبدوزیں اور میزائلوں کی قوت سے بھی مالا مال ہے۔ پاک بحریہ کے ہوائی جہاز بردار کرافٹس میں فضا میں زمین پر مار کرنے والے میزائلوں سے مسلح اٹلانٹک اور ین' فوکر ایم اے 400 اور فوکر ایف ٹو سیون جبکہ ہیلی کاپٹرز میں میزائلوں سے مسلح سی سپرائٹ' لنکس' الاوٹ (Alouette) اور سی کنگ ایم کے فور فائیو جبکہ فضا سے زمین پر مار کرنے والے میزائل ایگزاکٹ (Exocet) اے ایم تھری نائن شامل ہیں۔

Marfat.com

فضائیہ:

امریکہ نے جدید دور میں بری افواج کو سامنے لائے بغیر صرف فضائی قوت کو استعمال کر کے افغانستان اور عراق جیسے بڑے ممالک کو نہ صرف تباہ و برباد کر کے رکھ دیا بلکہ ان پر مکمل طور پر قبضہ جما کر کسی بھی ملک کی فضائی قوت کی اہمیت کو ثابت کر دیا۔ بھارت کی فضائی قوت نے بھی خطے میں طاقت اور امن کے توازن کو خراب کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ بھارتی فضائیہ کی افرادی قوت ایک لاکھ بہتر ہزار ہے اور بھارت نے اپنی فضائیہ کو 5 کمانڈز مرکزی (الہ آباد)' مغربی (نئی دہلی)' مشرقی (شیلانگ)' جنوبی تری ونڈرم اور جنوب مغربی (چندی گڑھ) کمانڈز میں تقسیم کر رکھا ہے۔ پاکستانی فضائیہ کی افرادی قوت اگرچہ صرف 45 ہزار ہے اور اسے شمالی (پشاور)' مرکزی (سرگودھا) اور جنوبی (فیصل آباد) کمانڈز میں تقسیم کیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود پاکستانی فضائیہ نے ہمیشہ دشمن کو دندان شکن جواب دیا ہے۔ 1965ء کی جنگ میں یادگار معرکے بھلا کون بھلا سکتا ہے؟ بھارتی فضائیہ میں لڑاکا طیاروں کے 40 سکوارڈن شامل ہیں جن میں 28 ایس یو تھری زیرو' 52 مگ ٹو تھری' 64 جیگوار ایس ون' 135 مگ ٹو سیون ایم' 55 مگ ٹو ون ایم ایف' 165 مگ ٹو ون' 40 میراج ٹو تھاوزنڈ ایچ' 36 مگ ٹو ون ایف ایل' 26 مگ ٹو تھری ایم ایف' 63 مگ ٹو نائن بی طیارے شامل ہیں جبکہ جوابی حملوں کیلئے مگ ٹو ون ایم کا ایک سکوارڈن اور انٹیلی جنس کیلئے دو بوئنگ سیون زیرو سیون اور دو بوئنگ سیون تھری سیون' میری ٹائم حملوں کیلئے سی ایگل سے مسلح 10 جیکوار' 12 کینبرا' مگ ٹو فائیو آر اور مگ ٹو فائیو یو بھی موجود ہیں۔ 40 ہیلی کاپٹروں پر مشتمل تین سکوارڈن' گلف سٹریم' لر جیت' نقل و حمل کیلئے 6 ستلج اور 4 گجراج طیارے' 123 چیتا اور چیتاک ہیلی کاپٹر' 2 بوئنگ سیون تھری سیون' 7 بی اے ای' 6 ایم آئی ایٹ' 28 بی اے ای' 120 کرن اے ٹو زیرو' 56 کرن ٹو' 88 ایچ پی ٹی' 14 جیگوار بی ون' 40 سے زائد مگ ٹو ون زیرو' 9 سے زائد مگ ٹو نائن یو بی' 44 ٹی ایس الیون اسکارہ طیارے' 20 چیتاک ہیلی کاپٹر موجود ہیں۔ بھارتی فضائیہ زمین سے زمین پر مار کرنے والے پرتھوی' فضا سے زمین پر مار کرنے والے کیری' سی ایگل' ایگزاسٹ' کرپٹن' فضا سے فضا میں مار کرنے والے اپیکس' اے فڈ' الامیو' آرچرا' ایڈر' میجک' سپر اور پکورہ میزائل سے بھی مسلح ہے۔

پاکستانی فضائیہ میں فائٹر طیاروں کے 18 سکوارڈن ہیں جن میں 16 میراج ون تھری' 52 میراج فائٹر' 41 کیو فائیو (اے فائیو سوم) 59 ایف سیون پی جی' 77 ایف سیون بی ایف ٹی' 32 ایف سولہ اور 43 میراج تھری اور سیون او ڈی جبکہ 11 میراج تھری آر پی طیارے موجود ہیں۔ انٹیلی جنس کیلئے دو فالکن ڈی اے ٹوٹنٹی اور میزائلوں سے مسلح ہیلی کاپٹر کے 7 سکوارڈن ہیں۔ پاکستانی فضائیہ میں ٹی پی ٹی اور ٹی آر جی طیاروں میں 14 سی ون تھرٹی' 2 بوئنگ سیون زیرو سیون' 1 فالکن ٹوئنٹی' 2 ایف ٹو سیون' 2 وائی ٹو یلو دوم' 4 سیسنا ون سیون ٹو' 1 پائپر پی اے تھرٹی فورسیسنا' 4 ایم ایف آئی' ون سیون جی مشاق' 30 ایف ٹی فائیو' 15 ایف ٹی سکس' 39 سے زائد (MF1-178) مشاق' 30 ٹی تھری سیون بی وسی اور 12 کے ایٹ طیارے بھی شامل ہیں۔ ایئر ڈیفنس کیلئے زمین سے فضا میں مار کرنے والی 7 بیٹریاں (Batteries) ہیں جن میں 6 چوبیس چوبیس کروٹیل (Crotale) اور ایک 6 سی ایس اے اور ایس اے سولہ سے مسلح ہے۔ پاکستانی فضائیہ کے پاس جدید ترین اے ایم تھری نائن ایگزاکٹ' لیزر گائیڈڈ میورک (Maverick)' اے آئی ایم نائن ایل کے سائیڈ وائنڈر'

Marfat.com

آرفائیوتھری میجک اور لیزر گائیڈڈ اینٹی ایٹ ہارم (Harm) میزائل بھی موجود ہیں۔

بڑا ملک ہونے اور توسیع پسندانہ عزائم رکھنے کی وجہ سے بھارت نے خطے میں ایک بڑی فوج پال رکھی ہے۔اس کی متحرک پیرا ملٹری دستوں کی تعداد دس لاکھ نواسی ہزار سات سو ہے جبکہ 7400 نیشنل سکیورٹی گارڈ' اہم شخصیات کی حفاظت کیلئے 3000 سپیشل پروٹیکشن گروپ 9000 سپیشل فرنٹیئر فورس' 4000 راشٹریہ رائفلز' 31 ہزار ڈیفنس سکیورٹی کارپس' 32 ہزار 4000 انڈو تبتی سرحدی پولیس' ساڑھے 52 ہزار آسام رائفلز' 70 ہزار ریلوے پروٹیکشن فورس' 95 ہزار مرکزی صنعتی سکیورٹی فورس 167400 مرکزی ریزرو پولیس فورس' ایک لاکھ 74 ہزار بارڈر سکیورٹی فورس (BSF)' پانچ لاکھ 74 ہزار رجسٹرڈ ہوم گارڈز' 4 لاکھ اسٹیٹ آرمڈ پولیس' 4 لاکھ 53 ہزار رجسٹرڈ سول ڈیفنس اور آٹھ ہزار سے زائد کوسٹ گارڈ ہیں جنہیں سمر' ورکرم اور جیجا بھائی نامی گشتی جہازوں ون سیون ڈٹوٹو ایٹ نامی جہازوں کے تین سکوارڈن اور 15 چیتاک ہیلی کاپٹر کی معاونت بھی حاصل ہے۔

پاکستان کی متحرک پیرا ملٹری فورس کی تعداد دو لاکھ 94 ہزار کے لگ بھگ ہے جبکہ ایک لاکھ 85 ہزار نیشنل گارڈ' جانباز فورس' مجاہد فورس' نیشنل کیڈٹ کارپس اور ویمن گارڈ' 65 ہزار فرنٹیئر کارپس' 30 ہزار کے لگ بھگ رینجرز' 12 ہزار ناردرن لائٹ انفنٹری اور 2000 میری ٹائم سکیورٹی ایجنسی کے اہلکار شامل ہیں جنہیں ایک عالمگیر (امریکی گیرنگ ڈی ڈی) 4 برکت پی سی او اور 2 پی سی کی معاونت حاصل ہے۔ پاکستانی کوسٹ گارڈ میں 23 جہاز بھی شامل ہیں۔

(ذرائع اطلاعات: بھارتی وزارت دفاع کی ویب سائٹس' ڈیفنس کالج اسلام آباد کی ویب سائٹس' ملٹری جنرلز)

جنرل اسمبلی کے ساٹھویں اجلاس کے موقع پر نیویارک میں پاکستانی صدر جنرل پرویز مشرف اور بھارتی وزیراعظم من موہن سنگھ نے چار گھنٹے تک مذاکرات کئے۔اس دوران بھارتی وزیراعظم کی طرف سے ضیافت بھی دی گئی۔ مذاکرات کے بعد دونوں لیڈر پریس کے سامنے آئے' جہاں صدر مشرف نے ایک مختصر اعلامیہ پڑھ کر سنایا اور پھر دونوں رہنما کسی سوال کا جواب دیئے بغیر وہاں سے چلے گئے۔اس ملاقات کو ایک مثبت سمت قرار دیا جا سکتا تھا لیکن اس سے اگر کسی نے ٹھوس نتائج کی امید لگا رکھی تھی' تو اس کا اندازہ غلط تھا۔ٹھوس نتائج باقاعدہ طول طویل مذاکراتی عمل سے گزرنے کے بعد ہی سامنے آتے ہیں۔اس نوع کی مثبت سمت تو محض ملاقات اور مزید ملاقاتوں کا ایک بہانہ ہوتی ہے۔ جنرل اسمبلی کے سالانہ اجلاس کے موقع پر جہاں 160 ممالک کے سربراہان مملکت وحکومت جمع ہوں' وہاں سنجیدہ مذاکرات کی توقع عبث تھی۔صدر مشرف نے جو مختصر اعلامیہ پڑھ کر سنایا' اس کی رو سے دونوں ملکوں نے دہشت گردی کے خطرات کے باوجود مذاکرات جاری رکھنے پر اتفاق رائے کا اظہار کیا ہے اور صدر مشرف کے بقول بھارتی وزیراعظم نے اگلے ماہ پاکستان کے سرکاری دورے کی دعوت قبول کر لی تھی۔

اعلامیہ میں ''دہشت گردی'' کے باوجود الفاظ سے بھارت نے اپنے موقف پر اصرار کی کوشش کی' اگر یہ الفاظ اعلامیہ میں نہ ہوتے تو بھی بھارتی وزیراعظم کی جنرل اسمبلی میں تقریر ہی پاکستان کے خلاف الزام تراشی کیلئے کافی تھی' جہاں انہوں نے بڑے محکم لہجے میں کہا کہ بھارت کو کئی عشروں سے سرحد پار دہشت گردی کا خطرہ لاحق رہا ہے' لیکن ہم

Marfat.com

نے تہیہ کر رکھا ہے کہ جموں و کشمیر یا کہیں اور دہشت گردی پر کوئی سمجھوتہ کریں گے' نہ اس کے سامنے جھکیں گے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو جنرل اسمبلی کا یہ اجلاس پاک بھارت کشیدگی کو کم کرنے کا ذریعہ ثابت نہیں ہوا۔ پاکستان کو بھارت سے وہی کچھ سننے کو ملا' جس کی بھارت ہمیشہ رٹ لگائے رکھتا تھا کہ پاکستان دراندازی کا ارتکاب کر رہا ہے۔ پاکستانی صدر جنرل پرویز مشرف نے اپنی تقریر میں واضح کیا کہ وہ سویلین افراد کے خلاف دہشت گردی کے حق میں نہیں ہیں' خواہ یہ ریاست کی طرف سے کی جارہی ہو یا ان لوگوں کی طرف سے' جنہیں بھارت درانداز قرار دیتا ہے۔ پہل کون کرتا ہے کا سوال اس طرح ہے' جیسے یہ پوچھا جائے کہ مرغی پہلے یا انڈہ۔ بہرحال اس بحث میں الجھے بغیر دونوں قسم کی دہشت گردی سے نمٹنے کی ضرورت ہے اور ان کا ازالہ کیا جانا چاہئے۔

الزامات اور جوابی الزامات کی فضا میں یہ کہنا بڑا آسان تھا کہ پاکستان کو اس منی سمٹ اور جنرل اسمبلی کے اجلاس سے کچھ نہیں ملا' اور کشیدگی میں بھی کوئی واضح کمی نہیں ہوئی' جبکہ دوسری طرف مذاکرات جاری رکھنے اور بھارتی وزیراعظم کی طرف سے دورۂ پاکستان کی دعوت قبول کرنے سے ظاہر ہوتا تھا کہ معاملات الجھے نہیں' ڈیڈلاک پیدا نہیں ہوا' بلکہ پیش رفت کے آثار واضح اور نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ منی سمٹ اور ایک سائڈ لائن ملاقات سے اس سے زیادہ حاصل ہونے کی توقع بھی نہیں تھی۔ صدر مشرف اپنے آپ کو پاکستان کے معاملات کا فیصلہ کرنے میں حرف آخر سمجھتے ہیں' لیکن بھارتی وزیراعظم من موہن سنگھ اپنی حکومت میں ایک کمزور اتحادی ہیں' وہ اپنے حلیفوں سے پوچھے بغیر ایک انچ آگے پیچھے نہیں سرک سکتے' بالفرض وہ ایک مضبوط وزیراعظم بھی ہوتے تو بھارتی جمہوریت کا تقاضا تھا کہ کوئی فرد واحد فیصلوں کا اختیار نہیں رکھتا' تمام فیصلے پارلیمنٹ اور کابینہ کے مشورے ہی سے کئے جاسکتے ہیں۔

صدر مشرف نے بہرحال اپنی تقریر میں مسئلہ کشمیر کے حل کے سلسلے میں دو فارمولے پیش کئے۔ ایک طرف انہوں نے کہا کہ اقوام متحدہ کی قراردادوں کا صرف ذکر نہیں ہونا چاہئے' ان کا اطلاق بھی ہونا چاہئے' ان کو عملی جامہ بھی پہنانا چاہئے۔ دوسری طرف انہوں نے بارہ مولہ اور کپواڑہ کے اضلاع سے بھارتی فوج کے انخلاء کی تجویز پیش کی۔ بھارت کی طرف سے کہا جارہا تھا کہ یہی دو اضلاع دراندازی کیلئے استعمال کئے جارہے ہیں اور پاکستانی چاہتے ہیں کہ یہاں سے بھارتی فوج نکل جائے' تاکہ ایک طرف دراندازی کیلئے اسے کھلی چھٹی مل جائے' دوسری طرف وہ ان اضلاع کو ہڑپ کرلے۔ ایک لحاظ سے یہ تجویز وادی کشمیر کی تقسیم کے مترادف تھی۔ چھٹے عشرے میں پاکستان اور بھارت کے مابین مذاکرات کے چھ ادوار ہوئے اور ان کے نتیجے میں امریکی رپورٹ کے مطابق بھارت یہ دو اضلاع پاکستان کے حوالے کرنے کو تیار ہوگیا تھا اس پر جب امریکی نمائندے نے بھارتی وزیراعظم نہرو سے کہا کہ وہ سری نگر کا ضلع بھی پاکستان کے حوالے کرے اس تجویز پر سیخ پا ہوگئے' اس طرح وادی کی تقسیم کا فارمولا ٹھپ ہوگیا۔ بھارتی تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ صدر مشرف نے اس فارمولے کو زندہ کرنے کی کوشش کی ہے' تاہم جب دوسرے سانس میں یہ بھی کہا ہے کہ کشمیر کا کوئی فیصلہ بھارت' پاکستان اور کشمیریوں کی مرضی کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ اب اس اتفاق رائے پر کیسے پہنچا جائے۔ یہی تینوں فریقوں کی آزمائش تھی۔

Marfat.com

برصغیر کے کروڑوں عوام کی نگاہیں نیویارک میں ہونے والے ان مذاکرات پر لگی تھیں اوران سے بہت سی امیدیں باندھی جارہی تھیں لیکن بھارتی وزیراعظم کے عجیب وغریب رویے نے تمام امیدیں خاک میں ملا کر رکھ دیں۔ دراصل بھارتی حکومت دنیا پر یہ ثابت کرنے پر تلی تھی کہ مقبوضہ کشمیر صرف بھارت کا مسئلہ ہے پاکستان کا نہیں۔انہوں نے اپنی دانست میں حریت کانفرنس کے دو دھڑے کروا کر بڑی کامیابی حاصل کر لی تھی۔سید علی گیلانی کا واضح مؤقف چونکہ ''کشمیر بنے گا پاکستان'' ہے بھارتی حکومت نے بظاہر اُن سے نجات حاصل کرنے کے لئے حریت کانفرنس کے دو دھڑے کروا دیئے۔انہوں نے حریت کا دوسرا دھڑا' مولوی انصاری کے زیر کمان قائم کر دیا جس میں میر واعظ عمر فاروق' عبدالغنی لون اور عبدالغنی بھٹ وغیرہ بھی شامل ہو گئے اسے بھارتی اپنی کامیابی سمجھ رہے تھے۔سید علی گیلانی نے صدر جنرل پرویز مشرف کی اقوام متحدہ کی تقریر کے حوالے سے کہا کہ کشمیریوں نے قربانیاں صرف دو اضلاع کپواڑہ اور بارہ مولہ کیلئے نہیں دیں بھارتی فوج کو سارا کشمیر خالی کر کے وہاں سے نکلنا ہوگا یہی ہماری قربانیوں کا مقصد اور ہمارا عزم ہے۔

ستمبر 2005ء میں حالات نے اس وقت اچانک پلٹا کھایا جب بھارتی حکومت نے حریت انصاری گروپ کو بذریعہ بس پاکستان جانے کی اجازت دے دی اور مولوی انصاری کے ساتھ عمر فاروق' یسٰین ملک' عبدالغنی بھٹ' بلال یسٰین وغیرہ پاکستان آئے۔ان لوگوں نے پاکستانی میڈیا' سرکاری اور نجی محافل میں جو باتیں کیں وہ اس امر کی غماز تھیں کہ کسی خفیہ اور طے شدہ ایجنڈے پر عملدرآمد شروع ہو چکا ہے اور کشمیر کی قسمت کا فیصلہ بھی واشنگٹن کے ایوانوں میں طے پا گیا ہے۔میں نے اس صورت حال پر اپنی حاصل اطلاعات پر مبنی ایک اہم مضمون ''نوائے وقت'' کی خصوصی اشاعت میں بعنوان ''مسئلہ کشمیر کا فیصلہ ہو چکا ہے'' لکھا۔ یہ مضمون 27 ستمبر 2005ء کو شائع ہوا تھا اگر آپ اس کا مطالعہ 5 اپریل 2006ء کو لاہور میں دیئے گئے میر واعظ عمر فاروق کے بیان کے ساتھ فرمائیں تو شاید مزید مغز ماری کی ضرورت باقی نہ رہے۔خاکسار نے اپنی ناقص معلومات اور اس مسئلے سے خصوصی دلچسپی کے پیش نظر جو باتیں 27 ستمبر 2005ء کو کہہ دی تھیں انہیں میر واعظ عمر فاروق نے 5 اپریل 2006ء کو اپنی زبان سے ادا کر کے اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ ملاحظہ فرمائیں:

کشمیر کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا ہے؟:

یہ بات عرصے سے کہی اور سنی جارہی تھی کہ کشمیر کی قسمت کا فیصلہ حکمرانوں کی میٹنگز کے بجائے بیک ڈور ڈپلومیسی کے ذریعے ہوگا کیونکہ کشمیر جیسے حساس مسئلے پر دونوں ممالک کی اعلیٰ قیادت کو جب اخبار نویسوں کی طرف سے الٹے سیدھے سوالات کا سامنا ہوتا ہے تو مزاج شاہاں پر ناگوار گزرتا ہے اور بسا اوقات ایسی باتیں وقت سے پہلے منکشف ہو جاتی ہیں جن کا انکشاف جاری شدہ معاملات اور مذاکرات کیلئے نقصان دہ ہوتا ہے ہمارے ارباب دانش کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ وہ معروضی حالات بیان کرتے ہوئے تاریخی حقائق کو نظر انداز کر دیتے ہیں اس طرح ان کی طرف سے تبصرہ یا تجزیہ سامنے آتا ہے وہ عموماً کچھ ہی عرصے بعد غلط ثابت ہو جاتا ہے۔

گزشتہ تین سال سے پاکستان اور بھارت کے درمیان جاری میٹنگز میں ایک مرتبہ بھی باقاعدہ مسئلہ کشمیر کے حوالے سے کوئی ملاقات طے نہیں پائی جبکہ سیاچن' سرکریک پانی' قیدیوں کا تبادلہ' تجارت وغیرہ جیسے ثانوی نوعیت کے

Marfat.com

مسائل اکثر زیر بحث آئے ہیں لیکن حیرت انگیز طور پر گزشتہ تین سال سے کشمیر کے مسئلے پر پیشرفت دکھائی دے رہی ہیں سب سے پہلے پاکستانی وزیراعظم میر ظفراللہ جمالی کی طرف سے سیز فائر کا اعلان، اٹل بہاری واجپائی کی سارک کانفرنس میں آمد، طے شدہ معاملات سے ہٹ کر صدر جنرل پرویز مشرف اور مسٹر واجپائی کے درمیان ملاقات جس میں دونوں وزرائے اعظم اور وزرائے خارجہ سے زیادہ اہم کرداران کے مشیروں نے ادا کیا اور دونوں ممالک کے وزرائے خارجہ نے بڑی تیاری سے پریس کانفرنسوں میں محدود بیانات چبھتے ہوئے سوالوں کو نظرانداز کرنے اور اصل معاملات کو ہوا بھی نہ لگنے کی پالیسی اپنائے رکھی۔ سارک کانفرنس سے آج تک کشمیر کے حوالے سے جو بھی ڈیولپمنٹس سامنے آئیں حیرت انگیز طور پران میں برصغیر کی ایک اہم شخصیت سردار عبدالقیوم خان کو پریس نے نظرانداز کئے رکھا اور حریت کانفرنس کی خصوصاً میرواعظ عمر فاروق والے گروپ کی سرگرمیوں اور بیانات کو خاص طور پر اچھالا گیا اس دوران اچانک جب سردار عبدالقیوم کی طرف سے یونائیٹڈ سٹیٹس آف کشمیر کی شرلی چھوڑی گئی تو اہل خبر چونکے کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے شاید اس مرحلے پر انہیں یاد بھی آیا ہو کہ سردار عبدالقیوم کو جنرل ضیاء الحق مرحوم اپنا سیاسی مرشد کہا کرتے تھے اور جنرل ضیاء الحق کا دور شاید سیاسی اور تزویراتی دونوں لحاظ سے پاکستان کیلئے مشکل ترین دور تھا کیونکہ انہیں نہ صرف افغانستان کے ''جہاد'' کو گرم رکھنا تھا اسی کے ساتھ ساتھ ذوالفقار علی بھٹو کو بھی پھانسی پر لٹکانا تھا اس انتہائی پیچیدہ اور مشکل دور میں جنرل ضیاء الحق کی طرف سے سردار عبدالقیوم کو اپنا سیاسی گرو ماننے کا اعلان سردار صاحب کی ''سیاسی بصیرت'' کیلئے بہت بڑی سند ہے۔ سردار عبدالقیوم نے جنرل ضیاء الحق کی زندگی ہی میں امریکہ کیلئے پاکستانی پریس کے سامنے پہلی مرتبہ بونی ٹرل پاور کی اصطلاح استعمال کی تھی اور یہ بیان دیا تھا کہ کشمیر کا مسئلہ یو این او نہیں بلکہ امریکہ کی مداخلت سے حل ہوگا کیونکہ اس وقت روس کے ٹوٹنے کے بعد دنیا کی سب سے بڑی اور اہم قوت جو عالمی مسائل اور حالات پر اثرانداز ہونے کی اہلیت رکھتی ہے وہ امریکہ ہی ہے یہ سردار قیوم کی طرف سے شاید پہلا باقاعدہ اعتراف تھا کہ اب یو این او میں موجود کشمیر سے متعلق قراردادوں کا رونا رونے کی بجائے امریکہ بہادر کی طرف رجوع کیا جائے اس بات سے قطع نظر کہ یہ نظریہ صحیح ہے یا غلط یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ بالآخر وہ بات سچ ہو کر رہی اور پاکستان کی طرف سے امریکہ کو درجنوں مرتبہ سرکاری اور غیر سرکاری طور پر یہ درخواست کی جا چکی ہے کہ وہ مسئلہ کشمیر حل کروائے اور آج مسئلہ کشمیر کے حوالے سے جو بھی پیشرفت ہو رہی ہے اس میں سب سے اہم کردار امریکہ نے ہی ادا کیا ہے۔ جس کا کردار امریکی اعلیٰ قیادت کی طرف سے کئی مرتبہ آن ریکارڈ ہو چکا ہے یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ جب سردار قیوم کی طرف سے امریکہ کو مسئلہ کشمیر کے حل میں مداخلت کی دعوت دی گئی تو ان دنوں امریکہ کی طرف سے ابھی عالمی معاملات میں کھلم کھلا مداخلت کی پالیسی نہیں اپنائی گئی تھی نہ ہی اس نے عالمی امن قائم کرنے کا باقاعدہ ٹھیکہ لیا تھا لیکن تاریخ اور وقت کی تیزی سے دھڑکتی نبضوں پر ہاتھ رکھنے والے سردار قیوم نے شاید تب ہی اس سازش کو بھانپ لیا تھا جو ان دنوں شاید انٹیلی جنس ایجنسیوں کی میٹنگز یا پھر آف دی ریکارڈ گفتگو تک ہی محدود رہی ہو اور ''مجاہد اول'' ہونے کے ناطے انہوں نے فوراً یہ کریڈٹ بھی سب سے پہلے اپنے سر منڈھنے کا قصد کیا اور برملا اس کا اظہار بھی کر دیا۔ اگر گزشتہ تین سال سے مذاکرات کا جائزہ لیا جائے تو بھی سب سے نمایاں بات جو کشمیر کے حوالے سے سامنے آتی ہے وہ سردار عبدالقیوم کی طرف سے حریت کانفرنس کے لیڈروں کا دورۂ پاکستان ہے کچھ عرصے پہلے ''ریاست ہائے

Marfat.com

متحدہ کشمیر" کا فارمولا تھا جس پر اخبارات میں بہت لے دے بھی ہوئی لیکن اس کے کچھ عرصہ بعد ہی صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف کی طرف سے کشمیر کی پانچ یا سات حصوں میں تقسیم کا فارمولا سامنے آ گیا جس پر ایک مرتبہ پھر پریس میں ہنگامہ آرائی شروع ہوئی کچھ لوگوں کے نزدیک یہ بروقت اور مناسب حل تھا جبکہ اکثریت نے اسے اظہار شکست اصولی مؤقف سے فرار اور امریکی دباؤ کو تسلیم کرنے سے تعبیر کیا۔ حریت کانفرنس کا وفد جب پاکستان کے دورے پر آیا تو اس کی لیڈر شپ کو پاکستان کے قریباً تمام اہم شہروں میں آزادی سے آنے جانے کی اجازت ملی جہاں انہوں نے عشائیوں میں بھی شرکت کی۔ پریس کانفرنس بھی منعقد کیں لیکن حیرت انگیز طور پر ان کی طرف سے سوائے مسئلہ کشمیر کا حل پیش کرنے کے باقی تمام معاملات پر باتیں کی گئیں۔

ایک نجی ٹی وی سے انٹرویو کے دوران اس ٹی وی کے ایک منجھے ہوئے میزبان نے جو گھما پھرا کر الٹے سیدھے سوالات کے ذریعے سیاسی لوگوں سے اندر کی بات اگلوانے کے فن میں طاق سمجھے جاتے ہیں جب حریت کانفرنس کی لیڈر شپ اور سردار عبدالقیوم کی موجودگی میں اس حوالے سے گفتگو شروع کی تو انہوں نے سردار قیوم اور ان کے ساتھیوں سے گھما پھرا کر درجنوں مرتبہ یہ دریافت کرنا چاہا کہ وہ آخر اپنے ساتھ مسئلہ کشمیر کے حل کا کیا فارمولا لے کر آئے ہیں کیونکہ حریت کے وفد کی طرف سے عمر فاروق میر واعظ نے یہ بات اپنی آمد سے پہلے ہی کہنی شروع کر دی تھی کہ وہ مسئلہ کشمیر کے ممکنہ حل لے کر پاکستان جا رہے ہیں اور پاکستانی قیادت سے اس پر بات کریں گے لیکن کیا مجال جو انہوں نے اصل بات کو ہوا بھی لگنے دی ہو جب میزبان نے سردار قیوم کے تازہ فارمولے "ریاست ہائے متحدہ کشمیر" کی بات کی تو بھی خاموشی اختیار کی گئی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان تمام لیڈر صاحبان کو بطور خاص یہ بریفنگ دی گئی تھی کہ وہ سوائے اصل بات کے باقی تمام باتیں کر کے پریس والوں کا جی بہلاتے رہے۔

حریت کانفرنس کے لیڈروں کی پاکستان میں موجودگی کے دوران ہر دل عزیز کشمیری لیڈر جنہیں صحیح معنوں میں کشمیریوں کی نمائندگی کا حق بھی حاصل ہے سید علی گیلانی نے عالمی پریس کو یہ بیانات دیئے تھے کہ پاکستان جانے والی کشمیری لیڈر شپ دراصل اس سازش پر عملدرآمد کروانے کیلئے پاکستان جا رہی ہے جس کا شکار پاکستان کے صدر جنرل پرویز مشرف بھی ہو چکے ہیں۔ انہوں نے متعدد مرتبہ یہ بات دہرائی ہے کہ کشمیریوں کے نزدیک اس مسئلے کا واحد حل اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق استصواب رائے ہے لیکن حیرت انگیز طور پر پاکستان جو گزشتہ 55 سال سے ان قراردادوں پر عملدرآمد کا حقیقی اور اصولی مؤقف رکھتا تھا کی طرف سے ان کا ذکر ہی چھوڑ دیا گیا اور کشمیر بنے گا پاکستان کے نعرے پر سیاست کرنے والے سردار عبدالقیوم کی طرف سے ریاست ہائے متحدہ کشمیر کا انقلابی نظریہ پیش کر دیا گیا۔ صدر جنرل پرویز مشرف کے دورۂ امریکہ اور وہاں بھارتی وزیراعظم من موہن سنگھ سے متوقع ملاقات کے حوالے جو اندازے قائم کئے جا رہے تھے ان میں سب سے نمایاں یہ بات تھی کہ صدر جنرل پرویز مشرف کے اس دورے اور ملاقات میں ضرور کوئی "بریک تھرو" ہوگا اور امریکہ میں ان کی موجودگی اور امریکی حکام کے ساتھ دونوں کی ملاقاتوں کے بعد کوئی اہم پیشرفت کشمیر کے حوالے سے ضرور ہوگی یہ اندازہ لگایا جا رہا تھا کہ کم از کم بھارت مقبوضہ کشمیر سے اپنی افواج کا کچھ حصہ نکالنے کا اعلان ضرور کرلے گا۔ کشمیری قیدیوں کو جو اپنی جرم بے گناہی کی سزا بھارتی عقوبت خانوں میں دس دس بارہ بارہ سال سے

Marfat.com

بھگت رہے ہیں ضرور رہا کر دیا جائے گا اور سیاچن سے دونوں ممالک اپنی فوجیں نکال کر انہیں دوبارہ پہلے والی پوزیشن پر لے جائیں گے لیکن حیرت انگیز طور پر ایسا نہیں ہوا اس کے برعکس دونوں سربراہان کے درمیان ہونے والی ملاقات میں کوئی غیر معمولی گرم جوشی بھی دیکھنے میں نہیں آئی بلکہ مشترکہ بیان جو صدر جنرل پرویز مشرف نے پڑھ کر سنایا بھی کئی مرتبہ ڈیڈ لاک کا شکار ہونے سے بچا یہ سمجھا جا رہا تھا کہ شاید آگرہ مذاکرات کی طرح یہاں بھی معاملہ خراب ہی نہ ہو جائے بہرحال مختصر سا مشترکہ اعلامیہ پڑھا گیا لیکن جیسے ہی ایک صحافی نے وزیر اعظم من موہن سنگھ سے یہ سوال کیا کہ اگر وہ موجودہ سرحدوں میں ردوبدل کے بغیر مسئلہ کشمیر کے حل کا کوئی فارمولا رکھتے ہیں تو انہیں بتا دیا جائے لیکن اس کا جواب وزیر اعظم من موہن سنگھ کی خشمگیں نگاہیں تھیں جن کا سامنا پریس کو کرنا پڑا انہوں نے غصے سے فرمایا کہ ہر سوال کا جواب دینا ضروری نہیں اور وہاں موجود وزرائے خارجہ نے صحافیوں سے کہا کہ وہ سوالات جوابات کا سیشن نہیں کریں گے اس سے غلط فہمیاں جنم لیں گی۔ اس مرحلے پر پھر یہ بات صحافیوں کے علم میں آئی کہ دراصل مذاکرات تو پس پردہ مشیر سکیورٹی امور طارق عزیز بھارتی وزیر خارجہ نٹور سنگھ ...... رہے ہیں بلکہ ایک مرحلے پر سردار نٹور سنگھ نے صحافیوں کے بار بار پوچھنے پر طارق عزیز کا ان سے تعارف بھی کروا دیا اور بتایا کہ یہ جنرل مشرف کے خصوصی امور برائے سکیورٹی معاملات ہیں یہ صورتحال اس امر کی غماز ہے کہ دراصل کشمیر کے مذاکرات کہیں اور ہو رہے ہیں۔ دونوں سربراہان مملکت اپنی ملاقاتوں کے بعد جب پریس کانفرنسوں میں سامنے آتے ہیں تو شاید اپنے خفیہ ایجنڈے کے مطابق صرف سٹیٹس کو برقرار رکھنے پر توجہ مرکوز رکھتے ہیں یہی حال خورشید قصوری اور نٹور سنگھ کا ہے جو عموماً پریس سے احتراز کرتے ہیں اور مسئلہ کشمیر کے حوالے سے سوالات کے جوابات نہیں دیتے۔

اس مرحلے پر یہ سوال اور اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ آخر کیا اسرار ہے جس کو ظاہر نہیں کیا جا رہا جبکہ دونوں ممالک کی قیادت کی طرف سے یہ بات تکرار کے ساتھ کہی جا رہی تھی کہ 2006ء میں یہ مسئلہ حل ہو جائے گا اس اہم سوال کا جواب تلاش کرنے کیلئے ہمیں اس بظاہر غیر اہم لیکن انتہائی اہم سرگرمی کو نظر میں رکھنا ہوگا جو عین ان لمحات میں جب صدر جنرل مشرف امریکہ میں عالمی پریس سے نبرد آزما تھے دہلی میں جاری تھی جی ہاں! یہ تھی ''دل سے دل تک'' کانفرنس جس میں جنرل ضیاء الحق کے سیاسی گورو سردار عبدالقیوم اپنے صاحبزادے اہم آزاد کشمیر کے رہنماؤں کے ساتھ شرکت فرما رہے تھے ایک طرف برصغیر کے کروڑوں عوام امریکہ میں ہونے والی صدر جنرل مشرف اور وزیر اعظم من موہن سنگھ کی گفتگو پر نظر رکھے ہوئے تھے جبکہ دوسری طرف دہلی میں اس اہم کانفرنس میں دراصل کشمیر کی دونوں اطراف کی قیادت اپنے مستقبل کے معاملات طے کر رہی تھی اگر بار خاطر نہ گزرے تو یہ کہنا کچھ غلط نہیں لگتا کہ مستقبل میں کشمیر کی ہونے والی بندر بانٹ میں اپنے اپنے حصے میں آنے والے کشمیر کے معاملات طے کر رہی تھی۔ اس کانفرنس کے موقع پر بالآخر وہ پٹاری بھی کھل ہی گئی جس میں موجود سانپ عقل کے اندھوں کو بھی کافی عرصے سے دکھائی دے رہا تھا لیکن اسے نظر انداز کیا جا رہا تھا یہ دراصل وہ عالمی سطح پر شہرت یافتہ امریکی دانشوروں کا فارمولا ہے جسے **Kashmir a way forward** کا نام دیا گیا تھا اس منصوبے کی تیاری اور تفصیلات کی خبریں تو وقتاً فوقتاً منظر عام پر آتی رہی تھیں لیکن پہلی مرتبہ جب یہ منصوبہ **Self governing entities** یعنی خودمختار ریاستوں کا منصوبہ کے نام سے خود کو ابھی سے مستقبل میں مقبوضہ

Marfat.com

کشمیر کا وزیراعظم سمجھنے والے میرواعظ عمر فاروق کے ذریعے حکومت پاکستان کو پہنچایا گیا تو اس کی تفصیلات منظر عام پر آئیں اور اب دہلی میں ''دل سے دل تک'' کانفرنس میں تو میرواعظ عمر فاروق نے کھل کر اس کو بیان کر دیا ہے۔ بنیادی طور پر اس منصوبے میں کشمیر کو پانچ خودمختار ریاستوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں سے دو نیم خودمختار ریاستیں موجودہ آزاد کشمیر اور شمالی علاقہ جات پاکستان کے حصے میں آئیں گی جبکہ دیگر تین نیم خودمختار ریاستیں جموں لداخ اور وادی کشمیر بھارت کے کنٹرول میں رہیں گی جس کے بعد بھارتی وزیراعظم من موہن سنگھ کے اس بیان کی اچھی طرح سمجھ آ جاتی ہے کہ موجودہ سرحدوں میں کوئی ردوبدل نہیں کیا جائے گا یہی بات دہلی کی دل سے دل تک کانفرنس میں فاروق عبداللہ نے بھی دہرائی اور سردار قیوم سے بغلگیر ہوتے ہوئے پریس والوں کو بتایا کہ سردار صاحب کا ''یونائیٹڈ سٹیٹس آف کشمیر'' والا فارمولا ہی در اصل مسائل کا حل ہے جس کے مطابق دونوں ممالک کے پاس اپنا اپنا کشمیر بھی ہے اور موجودہ سرحدیں بھی برقرار رہیں گی۔ ان نیم خودمختار ریاستوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت کیا ہوگی؟ اس سلسلے میں یہ طے پایا ہے کہ پانچوں کشمیری اکائیوں کے درمیان ایک کوآرڈینیشن باڈی قائم کی جائے گی جبکہ پانچوں نیم خودمختار ریاستوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت جن میں تجارت' پانی کے معاملات اور مالیاتی امور شامل ہیں سے متعلق معاملات طے کرنے کیلئے پاکستان اور بھارت پر مشتمل ایک الگ کمیٹی بنائی جائے گی جسے شاید ''مشترکہ تعاون کونسل'' کہا جائے گا جس میں بھارت اور پاکستان کی نمائندگی یکساں ہوگی۔ ہر نیم خودمختار ریاست کا اپنا جھنڈا' انتظامیہ' اسمبلی اور آئین ہوگا جو متفقہ ریاست کے دفاع اور خارجہ امور کے علاوہ ریاست کے اندرونی معاملات سے متعلق باقاعدہ قانون سازی کر سکے گی ہر ریاست کا شہری ریاست کا پاسپورٹ ہولڈر ہوگا لیکن چاہے تو دوہری شہریت یعنی پاکستان اور بھارت کا پاسپورٹ بھی رکھ سکتا ہے البتہ ان ریاستوں کے شہریوں کو کشمیر کے اندر آنے جانے کی آزادی ہوگی پاکستان اور بھارت دونوں ان ریاستوں سے اپنے اقتصادی معاملات الگ الگ طے کر سکتے ہیں موجودہ کنٹرول لائن برقرار رہے گی لیکن دونوں ممالک یہاں سے اپنی فوجیں نکال لیں گے اور متعلقہ ریاستیں اپنی اپنی پولیس قائم کریں گی۔ دونوں ممالک یعنی بھارت اور پاکستان کے درمیان موجود سرحدیں اس وقت تک قائم رہیں گی جب تک کہ دونوں ممالک اس سلسلے میں کوئی فیصلہ نہیں کرتے ایک مرتبہ فوج نکل جانے کے بعد دونوں ممالک کی افواج اس وقت تک ان ریاستوں میں داخل نہیں ہوسکیں گی جب تک کہ اس سلسلے میں کوئی بین الاقوامی ضمانت حاصل نہ ہو جائے۔ ان ریاستوں کے دفاع کا ذمہ دار کون ہوگا؟ اس سلسلے میں دو باتیں سامنے آ رہی ہیں پہلی بات تو یہ طے شدہ سرحدوں کے آر پار یعنی بھارت کے حصے کے تین ریاستوں کے دفاع کا ذمہ دار بھارت اور پاکستان کے حصے کی دو ریاستوں کے دفاع کا ذمہ دار پاکستان ہوگا جبکہ یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ یو این او' امریکہ یا نیٹو کی افواج کو بھی یہ ذمہ داریاں سونپی جاسکتی ہیں جب یو این او یا نیٹو کا نام لیا جائے تو اس سے مراد امریکہ ہے اور امریکی فوج کی یہاں موجودگی کا چین کی صحت پر کیا اثر ہوگا؟ ظاہر ہے چین یہ کبھی برداشت نہیں کرے گا کسی بھی بہانے اس کی سرحدوں پر امریکی ڈیرے جمالیں۔ کیونکہ پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں امریکیوں کی طرف سے قائم ''خفیہ تنصیبات'' کے حوالے سے پہلے ہی چین پاکستان پر اپنے تحفظات ظاہر کر چکا ہے خصوصاً ''دیوسائی'' میں امریکی جاسوسی آلات کی موجودگی میں بھی چین نے کبھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کی۔ یہاں یہ سوال اور زیادہ اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ کیا اس منصوبے پر چین کی مرضی

اصل حل

Marfat.com

کے خلاف عمل کیا جا سکے گا؟

جو حلقے مسئلہ کشمیر کے مختلف قسم کے حل پیش کر رہے ہیں یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ وہ چین کو کیوں نظرانداز کر رہے ہیں جبکہ بھارتی حکومت کی طرف سے یہ بات برملا کہی جا چکی ہے کہ شاہراہ ریشم بھی کشمیر کے کافی حصے پر مشتمل ہے اور پاکستان نے کشمیر کا کچھ حصہ چین کو دے دیا تھا۔ بعض مصلحتوں کے تحت اب بھارتی حکومت کی طرف سے اس کی تکرار نہیں کی جاتی کیونکہ بھارت اور چین کے تعلقات میں اب خاصی بہتری آ گئی ہے خصوصاً اس سال کے آغاز میں چینی وزیراعظم جب پاکستان کے دورۂ کے بعد بھارت تشریف لے گئے اور ان کی طرف سے تبت اور سکم کے بھارتی علاقوں کو بھارت کا باقاعدہ حصہ تسلیم کرنے کا اعلان کیا گیا تو بھارت نے بھی چین کے تئیں اپنی پالیسی تبدیل کر لی۔ یوں بھی چانکیائی حکمت عملی کا پہلا اصول یہی ہے کہ ''دشمن کے ہمسائے کو ہمیشہ اپنا دوست رکھو۔''

بھارت چونکہ اس خطے میں خود ایک منی سپر پاور بننے کا عزم رکھتا ہے اس لئے وہ چین سے براہ راست ٹکراؤ کی پالیسی کبھی بھی اپنائے گا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ بھارت نے چین سے بڑی اہم ڈپلومیسی سے سبق سیکھا ہے۔ جو اسی اصول پر مبنی ہے کہ خاموشی سے اپنی طاقت بڑھاتے جاؤ اور اپنے ہمسایوں سے الجھنے سے پرہیز کرو۔ چین نے اپنی طے شدہ پالیسی میں یہ بات ٹھان لی ہے کہ وہ آئندہ پچیس سال تک کسی سرحدی جھڑپ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے سکم اور تبت کے ان علاقوں سے دستبرداری کا اعلان کر دیا ہے جو بھارت اور چین کے درمیان متنازعہ کہلاتے تھے لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ امریکہ کی اس خطے میں موجودگی کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر لے گا۔ چین کی طرف سے جنوبی ایشیا اور سنٹرل ایشیا میں امریکن افواج کی موجودگی پر سخت ردعمل سامنے آ چکا ہے اور وقتاً فوقتاً چین اسے دہراتا بھی رہتا ہے۔ اسلئے ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ مسئلہ کشمیر کا کوئی بھی ایسا حل جس کے نتیجے میں کشمیر میں امریکی افواج آ جائیں چین کیلئے کبھی قابل قبول نہیں ہوگا گو کہ چین اس جھگڑے کا فریق نہیں ہے لیکن وہ اس سے الگ بھی نہیں رہ سکتا۔ بہرحال دنیا میں امریکہ کے بعد اسے دوسری اہم قوت ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔

صدر مشرف کے حالیہ دورۂ امریکہ میں اسرائیلی وزیراعظم شیرون سے ان کی اچانک ملاقات اور صدر مشرف کی پاکستان واپسی کے بعد پاکستانی سفیر کی اسرائیلی سفیر سے ''آن ریکارڈ'' ملاقات سے یہ بات تو عیاں ہے کہ ہم اسرائیل سے تعلقات بہتر بنانے کا عزم کر چکے ہیں۔ ہمارے سیاسی پنڈتوں کا کہنا ہے کہ اگر اسرائیل سے پاکستان کے تعلقات بہتر ہوتے ہیں تو بھارت پر قدرتی طور پر دباؤ آئے گا جو اس خطے میں اسرائیل کا سرگرم دوست بنا ہوا ہے اور کئی شعبوں میں اسرائیل کی مدد حاصل کر رہا ہے کیونکہ پاکستان کی اسرائیل سے دوستی یا حمایت اسرائیل پر ''حماس'' اور اس نوعیت کی دوسری جہادی تنظیموں کا دباؤ کم کرنے کا باعث ہوگی۔ پاکستان کی حمایت سے محروم ہونے کے بعد یا اس حمایت میں سرد مہری آنے کے بعد فلسطینیوں کا بھی اسرائیل کے ساتھ رویہ مختلف ہو جائے گا کیونکہ پاکستان کی اخلاقی حمایت ہی فلسطین کیلئے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ پاکستان بہرحال ایک ایٹمی طاقت ہے اور زبانی ہی سہی خود کو مسلماں ملک کہتا ہے جس کا نام بھی اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے۔

یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ ہمارا قائم کردہ مفروضہ کتنی حقیقت رکھتا ہے اور ہمارے ان دوستانہ اقدامات

Marfat.com

سے ہندو یہود اتحاد کو زک پہنچتی ہے یا اسے ہماری کمزوری سمجھ کر تمسخر کا نشانہ بنایا جائے گا۔ اسرائیلی وزیر خارجہ کا یہ بیان محل نظر رہے کہ کچھ ممالک امریکی حملہ کے خوف سے اسرائیل سے تعلقات میں اتاؤلے ہوئے جاتے ہیں گو کہ انہوں نے اس سلسلے میں صدر قذافی کو "ٹیسٹ کیس" کے طور پر بطور مثال پیش کیا ہے لیکن اسے صرف صدر قذافی تک محدود نہیں کیا جا سکتا بہر حال اس بیان کے بین السطور میں پاکستان کیلئے بھی ایک پیغام موجود ہے۔

جہاں تک ہماری تازہ ڈپلومیسی کا تعلق ہے تو ہمیں تاریخی حقائق کو نظر انداز کر کے کوئی مفروضہ قائم نہیں کرنا چاہئے۔ یہ بات یاد رہے کہ قیام اسرائیل کے صرف دو سال بعد یعنی 1950ء میں بھارت نے اسرائیل کو تسلیم کر لیا تھا۔ چونکہ ان دنوں بھارت میں پنڈت جواہر لال نہرو برسر اقتدار تھے جو اپنی غیر جانبدار حیثیت کو دنیا سے منوانے میں خصوصی دلچسپی لیا کرتے تھے اور پاکستان کے "سیٹو" اور "سنٹو" سے معاہدوں کے بعد سے اپنی مظلومیت کا رونا رو کر امریکہ اور روس دونوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے تھے۔ اسلئے انہوں نے "پی ایل او" کو بھی بھارت میں اپنا سفارتی مشن قائم کرنے کی اجازت دے کر اپنی دانست میں بڑا کمال دکھایا تھا۔ اسی طرح ایک ہی وقت میں بھارت اسرائیل اور فلسطین دونوں کو کامیابی سے خوش رکھنے کی پالیسی پر گامزن رہا اور اس کی یہ پالیسی خاصی کامیاب بھی رہی۔ 1962ء اور 1965ء میں چین اور پاکستان کے خلاف لڑائی کے دوران اسرائیلی انٹیلی جنس نے بھارتی انٹیلی جنس کی ہر ممکن مدد کی۔ یہ بات ریکارڈ پر موجود ہے۔ 1965ء کی جنگ کے بعد بھارت سے خصوصی فوجی وفد اسرائیل گیا جس کے بعد اسرائیل میں بھارتی فوجی افسران کی خصوصی تربیت ہوتی رہی اور 1971ء کی لڑائی میں بھارت کی کامیابی میں اسرائیل کا بڑا ہاتھ تھا۔ آج اسرائیل میں قریباً ایک لاکھ یہودی ایسے ہیں جو ہندی زبان بولتے ہیں کیونکہ 50 اور 70ء کی دہائی میں قریباً 27 ہزار یہودیوں نے بھارت سے اسرائیل میں ہجرت کی۔ اسرائیل اور بھارت کی اسلحی تجارت قریباً ڈیڑھ ارب ڈالر کا ہدف عبور کرنے والی ہے۔ بھارت کو اسرائیل کی طرف سے جدید میزائل پیشگی حملے کا وارننگ سسٹم مل چکا ہے اور دیگر حساس نوعیت کے آلات مل رہے ہیں۔ مقبوضہ کشمیر میں اسرائیلی ایس ایس جی کی موجودگی امر واقعہ ہے۔ مقبوضہ کشمیر میں پاکستانی کنٹرول کے ساتھ باڑ سسٹم اور حساس آلات کی تنصیب میں اسرائیل کا کردار نمایاں ہے۔ ان حالات میں ہمارا یہ مفروضہ کہ اسرائیل سے تعلقات قائم کر کے ہم مسئلہ کشمیر پر اس کی حمایت حاصل کر سکتے ہیں کیا اہمیت رکھتا ہے؟

یوں دکھائی دے رہا ہے کہ مسئلہ کشمیر کا جو بھی فیصلہ ہوگا' اسے کسی روز اچانک ہی پاکستان پر نافذ کر دیا جائے گا جہاں تک بھارت کا تعلق ہے اسے البتہ امریکہ اعتماد میں لے کر ہی فیصلہ کرے گا۔ پاکستان کو نائن الیون کی طرح صرف بتایا جائے گا کہ ہم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟ (روزنامہ نوائے وقت لاہور خصوصی اشاعت 27 ستمبر 2005ء مصنف طارق اسمٰعیل ساگر)

8 اکتوبر کو پاکستان میں تباہ کن زلزلہ آیا جس میں صرف آزاد کشمیر میں قریباً 70 ہزار انسانوں کی جان لے لی۔ ہنستے بستے شہر کھنڈرات کا ڈھیر بن گئے اور صورتحال ایسی ہوگئی کہ آزاد کشمیر کے وزیر اعظم سردار سکندر حیات خان نے برملا کہا "میں قبرستان کا وزیر اعظم ہوں۔" (روزنامہ جنگ لاہور 10 اکتوبر 2005ء)

اس مرحلے پر جب کہ ساری دنیا نے پاکستان کے دکھ درد میں اپنا حصہ ڈالنا اہم انسانی فریضہ سمجھا بھارتی حکمرانوں نے اپنی مروجہ چانکیائی سیاست کا مظاہرہ کیا۔ پاکستان کی اس اپیل پر کہ کنٹرول لائن کو کھول دیا جائے تا کہ مقبوضہ

Marfat.com

کشمیر کے مسلمان اپنے کشمیری بھائیوں کی مدد کر سکیں بھارت نے پہلے صرف پانچ پوائنٹ کھولنے کا اعلان کیا پھر بمشکل دو تین پوائنٹ کھولے لیکن وہاں بھی کسی کو سرحدی علاقے میں ملاقات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ بھارتی حکومت نے بجائے پاکستان کی امداد کرنے کے کشمیریوں میں پراپیگنڈہ شروع کر دیا کہ پاکستان فوج ان کی حفاظت نہیں کر سکتی اور اب بھی وقت ہے وہ پاکستان کو چھوڑیں اور بھارت کا حصہ بن جائیں۔ پہلے ہیلی کاپٹر دینے کا وعدہ کیا پھر اس سے مکر گئے کیونکہ پاکستان نے صرف ہیلی کاپٹر مانگے تھے بھارت انہیں پائلٹوں سمیت بھیجنا چاہتا تھا تاکہ حساس سرحدی علاقے کی اچھی طرح تصویر کشی بھی کر سکے۔ پاکستان نے یہ چال ناکام کی تو بھارت نے ہیلی کاپٹر بھی دینے سے انکار کر دیا۔ اب صورتحال یہ تھی کہ ایک طرف کشمیر میں لائن آف کنٹرول کو چند مقامات پر کھولنے اور اس سے بھی بڑھ کر اسے غیر متعلق (Irrelevant) بنانے کی باتیں ہو رہی تھیں اور دوسری طرف مشرق اور شمال' ہر سمت میں خون آشام جنگی مشقوں کا اہتمام کیا جا رہا تھا اور وہ بھی ایک ایسے وقت جب جنوبی ایشیا زلزلوں اور آسمانی تباہی کی ہولناک گرفت میں تھا۔

ابھی مغربی بنگال میں بھارت کی تاریخ کی سب سے اہم جنگی مشقیں بھارت اور امریکہ کی مشترکہ مشق کی حیثیت سے ختم نہیں ہوئی تھیں کہ پاکستان کی سرحد کے قریب راجستھان میں 1987ء کے Operation Brass Tracks کے بعد اسی نوعیت کی 14 روزہ مشقوں کا آغاز 18 نومبر 2005ء سے ہو گیا جسے Opration Desert Strike کا نام دیا گیا' اور اس میں 20 ہزار فوجی شرکت کر رہے تھے اور بھارت کی ایئر فورس فرانسیسی ساخت کے میراج 2000' روسی ساخت کے ایم جی۔ 27 اور برطانوی ساخت کے Jaguar لڑاکا طیاروں نے اس شان سے شرکت کی کہ مشقوں کا 40 فیصد ہوائی فوج اور باقی بری فوج کی کارروائی کیلئے مختص تھا۔ بری فوج اس موقع پر روسی ساخت کے این ٹی۔ 90 ٹینکوں کو زیر مشق لائی جو 310 کی تعداد میں بھارت نے روس سے اس طرح حاصل کئے تھے: 124 بنے بنائے روس نے فراہم کئے' جبکہ 186 روس سے حاصل شدہ خام مال اور ٹیکنالوجی کی مدد سے بھارت نے خود آخری شکل میں تیار کئے۔ یہ وہ ٹینک ہیں جنہیں اس وقت کا بہترین ٹینک سمجھا جا رہا ہے اور ان میں سے ہر ایک کی قیمت 10 کروڑ 50 لاکھ روپے تھی۔

مغربی بنگال کی بھارت امریکہ مشترک مشقوں کے آخری دن دہلی میں امریکہ کے ناظم الامور رابرٹ او بلیک نے ایک چونکا دینے والا بیان دیا کہ اگرچہ مشقیں تجرباتی ہیں لیکن اب بھارت اور امریکہ کی دوستی اس مقام پر ہے کہ ایسی مشقیں مستقبل میں کسی تیسرے ملک میں فوجی آپریشن کی طرف بھی جا سکتی ہیں۔ البتہ ایسا مشترک فوجی آپریشن ایک فوجی فیصلہ ہوگا جو بھارت کی حکومت کو کرنا ہوگا۔ یہ مشترکہ مشقیں اور اس سے بڑھ کر ان کے اختتام پر یہ بیان اس علاقے کے بارے میں بھارت اور امریکہ کے مستقبل کے عزائم کا آئینہ دار اور علاقے کی دوسرے ممالک کیلئے خطرے کی گھنٹی کا درجہ رکھتا تھا۔

امریکہ نے مشرق وسطیٰ' جنوبی ایشیا اور وسطی ایشیا کو اپنی گرفت میں رکھنے کیلئے جو نقشہ بنایا تھا اس میں شاہ ایران اور اسرائیل دو بنیادی کردار تھے۔ ایران کے اسلامی انقلاب نے اس نظام کا ایک ستون منہدم کر دیا۔ امریکہ کا سارا انحصار اسرائیل پر رہ گیا جو غیر حقیقت پسندانہ تھا۔ اسی لئے اسرائیل اور بھارت کی دوستی کا آغاز ہوا تاکہ بھارت کو اس نظام میں

Marfat.com

بالآخر شامل کرلیا جائے۔ پہلے دور میں 15,10 سال میں بھارت اسرائیل گٹھ جوڑ کو مستحکم کیا گیا جس نے کلنٹن کے دور میں بھارت کو اس نظام کا حصہ بنا کر ایک تثلیث بنانے کے عمل کا آغاز کر دیا مگر 1998ء کے بھارت کے ایٹمی تجربات نے سطح کے اوپر بظاہر اس عمل کو سست کر دیا۔ عراق اور افغانستان پر قبضہ اور وسط ایشیا میں تاجکستان' ازبکستان اور قازقستان میں فوجی اڈوں کا قیام اس حکمت عملی کا حصہ ہے لیکن اصل ہدف بھارت کو اس نظام کا حصہ بنانا تھا جو بش انتظامیہ نے پچھلے دو سال میں مستحکم کرلیا ہے' اور اکتوبر کی مغربی بنگال مشقیں' بھارت اور امریکہ کا 10 سالہ دفاعی تعاون کا معاہدہ اور سب سے بڑھ کر جولائی 2005ء میں کیا جانے والا ایٹمی ٹیکنالوجی کی منتقلی کا معاہدہ جس نے عملاً بھارت کو ایک نیوکلیئر پاور تسلیم کرلیا ہے اور ہائی ٹیک تعاون کا دروازہ کھول کر پورے علاقے کے دفاعی توازن کو درہم برہم کر دیا ہے۔ اس پورے عمل کا اصل ہدف چین' ایران' پاکستان اور عرب ممالک ہیں۔ حالیہ مشقوں کو اسی پس منظر میں سمجھا جا سکتا تھا۔ مغربی بنگال کی مشترک مشقوں کے فوراً بعد راجستھان کی جنگی مشقیں پاکستان اور ایران کیلئے خصوصی پیغام رکھتی تھیں۔ مشقوں کے آغاز ہی پر بھارت کے ہوائی فوج کے سربراہ ایئر چیف مارشل ایس پی تیاگی کا بیان جو انہوں نے یونا یونیورسٹی میں دیا۔ جو بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ ان کا ارشاد تھا:

گو کہ گزشتہ تین سال میں ان دونوں قوموں کے درمیان حالات بہت کچھ تبدیل ہو گئے ہیں' مگر سلامتی کی صورت حال اسی طرح ہے۔ دہشتگردی کا انفراسٹرکچر پاکستان میں ابھی تک موجود ہے اور سرحد پار دہشت گردی میں بھی کوئی کمی نہیں ہوئی ہے...... ہماری سلامتی کی منصوبہ بندی میں چین جو کچھ کرسکتا ہے اسکو مقام ملنا چاہئے کیونکہ مجھے اپنے پڑوس میں چینی اسلحہ نظر آ رہا ہے۔ چین کی جانب سے ہمارے ملک کا اسٹریٹجک گھیراؤ کافی آگے بڑھ چکا ہے اور اس سے مستقبل میں ہمارے لئے مزید مسائل پیدا ہوں گے۔ پاکستان اور چین کو بھارت کیلئے ایک خطرہ قرار دیتے ہوئے انہوں نے کہا: اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اپنے ان دو پڑوسی ممالک کے ساتھ جنگ کیلئے بے تاب ہیں۔

(ٹائمز آف انڈیا' 18 نومبر 2005ء)

■■■

دسمبر 2005ء میں اسلام آباد میں منعقدہ آزاد کشمیر کی سیاسی جماعتوں کی قومی کانفرنس نے یونائیٹڈ اسٹیٹس آف کشمیر کی تجویز مسترد کر دی۔ کانفرنس میں جماعت اسلامی آزاد کشمیر' جموں وکشمیر پیپلز پارٹی' جموں وکشمیر لبریشن فرنٹ سمیت بارہ سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں نے شرکت کی۔ جموں وکشمیر پیپلز پارٹی کے صدر سردار خالد ابراہیم نے کہا کہ یونائیٹڈ اسٹیٹس آف کشمیر کا منصوبہ دراصل تقسیم کشمیر کا منصوبہ ہے اور 1972ء کے خفیہ معاہدہ کے تحت لائن آف کنٹرول کو مستقل سرحد بنانے کی سازش ہو رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ تقسیم کشمیر بھارت کا سیاسی ایجنڈا ہے اور وہ کنٹرول لائن کو مستقل سرحد بنا کر اپنے ایجنڈے کو عملی جامہ پہنانا چاہتا ہے۔ سردار خالد ابراہیم نے صدر جنرل پرویز مشرف کی کشمیر کو سات ریجنز میں تبدیل کرنے کی تجویز بھی تقسیم کشمیر کا منصوبہ قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ اگر یونائیٹڈ اسٹیٹس آف کشمیر کی تجویز کو عملی جامہ پہنایا گیا تو بھارت کو ہالہ تک آ جائے گا۔ جموں وکشمیر لبریشن فرنٹ کے چیئرمین امان اللہ خان نے کہا کہ کشمیری قیادت کشمیر کی وحدت اور بحالی اور خودمختاری کے ایجنڈے پر متفق ہو جائے تو پھر کوئی ابہام باقی نہیں رہ جائے گا اور ساری سازشیں دم

Marfat.com

توڑ جائیں گی۔ جماعت اسلامی آزاد کشمیر کے نائب امیر نور الباری نے اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عملدرآمد کو ہی مسئلہ کشمیر کا واحد حل قرار دیا۔ لبریشن لیگ آزاد کشمیر کے چیئرمین جسٹس (ر) عبدالمجید نے کہا کہ یونائیٹڈ اسٹیٹس آف کشمیر کی تجویز پیش کرنے والے دراصل بھارت کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ کانفرنس کے دیگر مقررین نے بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا۔

آزاد کشمیر کی ممتاز سیاسی جماعتوں کی قومی کانفرنس کی مذکورہ رپورٹ سے اندازہ ہوتا تھا کہ یونائیٹڈ اسٹیٹس آف کشمیر کی تجویز کے خلاف آزاد کشمیر میں سیاسی اتفاق رائے پایا جاتا تھا۔ مسلم کانفرنس کے سوا کوئی بھی جماعت اس تجویز کے حق میں نہیں تھی جبکہ مقبوضہ کشمیر کی مقبول عام نمائندہ سیاسی قیادت جس کی ترجمانی کا فریضہ سید علی گیلانی ادا کر رہے تھے پہلے ہی اس تجویز کو مسترد کر چکی تھی۔ اس تجویز کو پیش کرنے والے اور اس کی حمایت کرنے والے وہی لوگ تھے جن پر پہلے ہی بھارت کی سرپرستی کا الزام لگا ہوا تھا۔ وہ بھارت کو کسی صورت بھی ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے ان کے تمام مفادات بھارت سے وابستہ تھے۔ وہ اگرچہ پاکستان کی حمایت کا دم بھی بھرتے تھے اور یہ تاثر بھی دیتے تھے کہ انہیں پاکستان کے صدر جنرل پرویز مشرف کی حمایت بھی حاصل ہے لیکن حقیقت یہ تھی کہ خود یہ لوگ بھی پاکستان کے وفادار نہیں رہے۔ ان کے بارے میں اگر زیادہ محتاط انداز میں تبصرہ کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ وہ بیک وقت دو کشتیوں میں سوار ہیں اور جب بھی موقع آئے گا وہ پاکستان کی کشتی سے اتر کر بھارت کی کشتی میں جا بیٹھیں گے کیونکہ وہ کشمیری عوام کے برعکس بھارت کو اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ پاکستان کی حکمران قیادت ان پر انحصار کرنے کے بجائے پوری یکسوئی کے ساتھ ان لوگوں کی سرپرستی کرے جو کھلم کھلا پاکستان کے مفادات کی ترجمانی کر رہے ہیں اور جنہیں اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ پاکستان کے مفاد سے ہی کشمیریوں کا مفاد وابستہ ہے۔

2005ء گزر گیا لیکن اپنے پیچھے کشمیر کے مصائب کی ایک غبار آلود کہانی چھوڑ گیا اس سال کو اس اعتبار سے اہم قرار دیا جا سکتا تھا کہ پاکستان اور بھارت مسئلہ کشمیر پر مذاکرات کی آڑ میں اپنے تعلقات کو معمولات پر لانے کی کوششوں میں لگے رہے۔ بظاہر ان مذاکرات کا مرکزی موضوع مسئلہ کشمیر تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ دوطرفہ مذاکرات کے دوران کسی مرحلے پر بھی مسئلہ کشمیر پر کوئی سنجیدہ گفتگو نہیں ہوئی۔ مذاکرات دہلی اور اسلام آباد میں مرحلہ وار ہوتے رہے۔ ان میں مسائل و موضوعات کا چناؤ بھی بھارت کی صوابدید پر کیا گیا۔ مذاکرات میں دونوں ملکوں کے درمیان فضائی اور زمینی رابطوں کی بحالی، بس سروس کا اجراء، سیاچن اور سرکریک کے معاملات، دوطرفہ تجارت اور دیگر امور شامل تھے۔ پاکستان نے مذاکرات کیلئے فضا کو سازگار بنانے کی غرض سے اعتماد کی بحالی (CBMs) کے بہت سے اقدامات کئے جبکہ بھارت کی طرف سے کوئی قدم بھی نہ اٹھایا گیا البتہ اس نے مذاکرات کے ذریعے وہ تمام فوائد سمیٹنے کی کوشش کی جو اسے مطلوب تھے۔

اسی سال سرینگر مظفر آباد بس سروس کا اجراء بھی عمل میں آیا اور محب وطن کشمیری حلقوں کی طرف سے شکوک وشبہات کے باوجود اسے حکومتوں کی سطح پر کامیاب بنانے کی پوری کوشش کی گئی۔ تحریک حریت کے قائد سید علی گیلانی نے بس سروس کے اجراء پر اسے ایک نان ایشو قرار دیتے ہوئے کہا کہ کشمیریوں کا بنیادی مطالبہ انہیں آزادانہ استصواب رائے کا حق دینا ہے لیکن اس مطالبے پر غور کرنے کے بجائے انہیں بس سروس جیسے بے نتیجہ اقدامات میں الجھایا جا رہا ہے۔ سید علی گیلانی کے اس اختلافی بیان کے بعد حکومت پاکستان نے بھی ان سے دوری اختیار کر لی اور ان کے مقابلے میں میر واعظ گروپ کی سرپرستی

Marfat.com

کی جانے لگی۔

اپریل میں صدر جنرل پرویز مشرف کرکٹ میچ دیکھنے کے بہانے نئی دہلی گئے تو انہوں نے وہاں بھارتی وزیراعظم سے بھی بات چیت کی جبکہ میرواعظ عمر فاروق اور سید علی گیلانی بھی ان سے ملے۔ کہا جاتا ہے کہ اس موقع پر سید علی گیلانی اور صدر جنرل پرویز مشرف کے درمیان نہایت تلخ باتیں ہوئیں۔ گیلانی صاحب نے پاکستانی صدر پر واضح کیا کہ پاکستان مسئلہ کشمیر پر مسلسل پسپائی اختیار کرتا جارہا ہے۔ جس کے تحریک آزادی کشمیر پر نہایت منفی اثرات مرتب ہورہے ہیں۔ انہوں نے واضح کیا کہ مسئلہ کشمیر کا حل کشمیری عوام اور ان کی نمائندہ قیادت کی مرضی کے بغیر ممکن نہیں۔ کہا جاتا ہے صدر جنرل پرویز مشرف کو گیلانی صاحب کی کھری کھری باتیں ناگوار گزریں اور انہوں نے میرواعظ گروپ کی سرپرستی کا اصولی فیصلہ کرلیا۔ صدر صاحب کی بھارت سے واپسی کے بعد پاکستانی میڈیا کا لب ولہجہ بھی بدل گیا اور پاکستانی ٹیلی ویژن جو سید علی گیلانی کا راگ الاپتے نہیں تھکتا تھا۔ اب ان کے ذکر سے کترانے لگا۔ میرواعظ کی حریت کانفرنس کے چیئرمین کی حیثیت سے پاکستان کے سرکاری میڈیا میں پروجیکشن شروع ہوگئی اور سید علی گیلانی صرف کشمیر کے ایک بزرگ سیاسی رہنما بن کر رہ گئے۔ حکومت پاکستان کی شہ پر او آئی سی کے اجلاسوں میں بھی میرواعظ عمر فاروق کو بطور مبصر مدعو کیا جانے لگا جبکہ اس سے پہلے او آئی سی کے دعوت نامے سید علی گیلانی کو موصول ہوتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ بھارت نے کبھی انہیں ان اجلاسوں میں شرکت کی اجازت نہیں دی جبکہ میرواعظ عمر فاروق ان اجلاسوں میں برابر شریک ہورہے ہیں۔ 7 دسمبر 2005ء کو مکہ مکرمہ میں اسلامی سربراہوں کا ایک غیر معمولی اجلاس ہوا تو میرواعظ عمر فاروق نے اس میں بھی شرکت کی اور صدر جنرل پرویز مشرف سے خصوصی ملاقات کی۔

2005ء اس اعتبار سے بھی غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے کہ اس سال کے دوران صدر جنرل پرویز مشرف کی طرف سے مسئلہ کشمیر کے حل کے حوالے سے ایک درجن سے زیادہ تجویزیں پیش کی گئی ہیں۔ انہوں نے باضابطہ طور پر اس بات کا اعلان کیا کہ کشمیر پر اقوام متحدہ کی قراردادیں اب قابل عمل نہیں رہیں اور اگر بھارت لچک کا مظاہرہ کرے تو پاکستان ان قراردادوں سے ہٹ کر بھی مسئلہ کشمیر کے حل کیلئے بات چیت پر تیار ہے لیکن بھارت نے پاکستان کی کسی تجویز کا جواب نہ دیا۔ جو بھارتی حکام دوطرفہ مذاکرات کے سلسلے میں پاکستان آئے انہوں نے پاکستان کی سرزمین پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کیا کہ کشمیر کا تنازعہ صرف یہ ہے کہ پاکستان نے کشمیر کے ایک حصے پر ناجائز قبضہ کررکھا ہے۔ اگر وہ یہ قبضہ چھوڑ دے تو مسئلہ کشمیر آج ہی حل ہوسکتا ہے۔ اس طرح بھارت نے اپنے مئوقف میں ذرا سی بھی لچک پیدا کرنے کے بجائے اس میں اور سختی پیدا کرلی۔ لیکن پاکستان کی قیادت اس پر کوئی مخالفانہ ردعمل ظاہر کرنے سے گریز کرتی رہی اور وہ پاکستانی عوام کو یہی تاثر دیتی رہی کہ بھارتی حکام کے بے لچک مئوقف کے باوجود دوطرفہ مذاکرات صحیح رخ پر آگے بڑھ رہے ہیں۔ یہ انتہائی مغالطہ انگیز صورتحال تھی جس میں سید علی گیلانی نے ایک بار پھر اپنی اہمیت منوائی۔ انہوں نے 7 اگست کو حیدر پورہ سرینگر میں اپنی نئی سیاسی جماعت سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ کشمیری عوام نے گزشتہ پندرہ سال کے دوران ایک لاکھ سے زیادہ انسانی جانوں کی قربانی اس لئے نہیں دی کہ وہ مذاکرات کے نام پر دھوکے کھاتے رہیں اور مختلف قسم کی تجاویز پر غور کرتے رہیں۔ انہوں نے اعلان کیا کہ ہماری جدوجہد کشمیر کی مکمل آزادی کے بغیر ختم نہیں ہوگی۔ مبصرین کا کہنا تھا کہ

Marfat.com

حیدر پورہ سرینگر کے جلسہ عام نے ان تاریخی جلسوں کی یادتازہ کی جو کسی زمانے میں شیخ عبداللہ کیا کرتے تھے۔بعض کشمیری اخبارات نے لکھا کہ سید علی گیلانی شیخ عبداللہ کے مقابلے میں زیادہ بڑے لیڈر کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں اور انہیں کسی صورت بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

8 اکتوبر کو آزاد کشمیر میں آنے والے ہولناک زلزلے نے مسئلہ کشمیر کو ایک نیا رخ دے دیا۔صدر جنرل پرویز مشرف نے اس موقع پر کنٹرول لائن کو متعدد مقامات سے کھولنے کی تجویز پیش کی۔ جسے بھارت نے کسی پس وپیش کے بغیر قبول کر لیا۔کیونکہ کنٹرول لائن کو ''سافٹ باڈر'' کی حیثیت دینا خود بھارت کی سکیم کا ایک حصہ ہے۔اس کے ساتھ ساتھ صدر جنرل پرویز مشرف نے ریاست جموں وکشمیر سے فوجوں کے انخلاء اور سیلف گورننس کی تجویز بھی پیش کی۔ابھی اس تجویز کی بازگشت فضاء میں موجود تھی کہ میر واعظ عمر فاروق کی طرف سے یونائیٹڈ اسٹیٹس آف کشمیر کا آئیڈیا بھی سامنے آ گیا۔جس کا پاکستان کے سرکاری حلقوں میں بھی خیر مقدم کیا گیا۔میر واعظ عمر فاروق کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے یہ آئیڈیا پیش کرتے ہوئے صدر جنرل پرویز مشرف کو اعتماد میں لیا۔اس کا مقصد ریاست جموں وکشمیر کو پانچ حصوں میں تقسیم کر کے انہیں داخلی خودمختاری دینا اور دفاع اور خارجہ امور میں پاکستان اور بھارت کو شریک کرنا ہے۔اس میں ریاست جموں وکشمیر کی پانچ حصوں میں تقسیم اس طرح کی گئی کہ جو حصے پاکستان کے پاس ہیں وہ پاکستان ہی کے پاس رہیں گے اور جن حصوں پر بھارت قابض ہے وہ ان پر بدستور قابض رہے گا جبکہ دونوں ملکوں کے مشترکہ انتظام کے تحت ان حصوں کی ایک ڈھیلی ڈھالی کنفیڈریشن بھی بن جائے گی جسے دونوں ملک مل کر چلائیں گے۔یہ ایک انتہائی احمقانہ تجویز تھی جس پر کشمیر کے محب وطن حلقوں نے شدید ردعمل کا اظہار کیا جبکہ بھارت حسب معمول خاموشی اختیار کئے ہوئے ہے۔یونائیٹڈ اسٹیٹس آف کشمیر کی تجویز 2005ء کا آخری تحفہ ہے جو تہی دست اہل کشمیر کو طالع آزماؤں نے دیا ہے۔2005ء مجاہدین کیلئے بھی بہت بھاری ثابت ہوا۔اس سال کے دوران ان کے اہم کمانڈر شہید ہوئے اور انہیں انتہائی ناموافق حالات کا سامنا رہا۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان سترہ اور اٹھارہ جنوری 2006ء کو نئی دہلی میں خارجہ سیکرٹریوں کی سطح پر مذاکرات کا تیسرا دور ہوا۔ان مذاکرات کے اختتام پر جو مشترکہ اعلامیہ جاری کیا گیا' اس کے مطابق دونوں ملک مسئلہ کشمیر حل کرنے کیلئے اعتماد سازی کے مزید اقدامات کرنے پر متفق ہو گئے۔ان اقدامات میں لائن آف کنٹرول کے قریب نئی دفاعی چوکیاں نہ بنانے اور ماہانہ فلیگ میٹنگ کرنے کا فیصلہ کیا گیا جبکہ پونچھ راولاکوٹ بس سروس اور سرینگر مظفر آباد ٹرک سروس جلد شروع کرنے پر بھی دونوں ملکوں کے درمیان اتفاق رائے پایا گیا۔دونوں ملکوں نے لائن آف کنٹرول پر پانچ مقامات کو کشمیریوں کی آمدورفت کیلئے کھولنے پر اطمینان کا اظہار کیا اور جامع مذاکرات کے عمل میں ہونے والی پیشرفت کو قابل قدر قرار دیا۔

دونوں ملکوں کے درمیان مذاکرات کے مذکورہ تیسرے دور میں اگرچہ اور بھی بہت سے دوطرفہ معاملات زیرغور آئے اور فریقین نے بعض اہم فیصلے بھی کئے۔لیکن ہماری دلچسپی صرف مسئلہ کشمیر سے ہے۔دوسال پہلے جب ''اعلان اسلام آباد'' کے تحت دونوں ملکوں کے درمیان مذاکرات کا آغاز ہوا تھا تو پاکستان کی طرف سے یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ ان مذاکرات میں مسئلہ کشمیر کو ''کور ایشو'' کی حیثیت حاصل ہوگی اور بات چیت کا مرکزی موضوع یہی ہوگا لیکن دوسالہ

Marfat.com

مذاکرات کی روداد اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ ان مذاکرات میں مسئلہ کشمیر پر سرسری گفتگو بھی نہیں کی گئی۔ بھارت نے مذاکرات کا جو ایجنڈا دیا اسی پر بات ہوئی اس ایجنڈے کے تحت سارا زور مسئلہ کشمیر کو نظرانداز کر کے تعلقات کو بہتر بنانے پر تھا۔ دونوں ملکوں کے درمیان زمینی اور فضائی رابطے بحال ہوئے فنکاروں اور عوامی وفود کا سلسلہ شروع ہوا' دوطرفہ تجارت بڑھانے پر توجہ دی گئی اور اس وقت کھانے پینے کی بہت سی چیزیں بھارت سے پاکستان آ رہی ہیں۔ پاکستان ابتداء ہی میں کنٹرول لائن اور سیاچن پر رضا کارانہ جنگ بندی کا اعلان کر چکا تھا۔ اس جنگ بندی کے بعد بھارت کا حوصلہ بڑھا اور اس نے کنٹرول لائن پر خاردار باڑ کی تنصیب شروع کر دی۔ پاکستان نے دبے لفظوں میں احتجاج تو کیا لیکن عملاً اس نے اس عمل میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ کی۔ بلکہ بھارت نے تو یہ دعویٰ کیا کہ اسے خاردار باڑ لگانے میں پاکستان کی خاموش تائید حاصل تھی اس طرح خاردار باڑ کی تنصیب کے بعد سرینگر مظفرآباد بس سروس شروع کی گئی جس کے ذریعے میرواعظ گروپ نے پاکستان آ کر امن اور دوستی کا راگ الاپا اور مذاکرات کے تیسرے دور میں پونچھ راولاکوٹ بس سروس اور سرینگر مظفرآباد ٹرک سروس شروع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ دونوں ملک مطمئن تھے کہ مذاکرات صحیح رخ پر جا رہے ہیں لیکن اہل پاکستان اور کشمیری عوام کو تشویش تھی کہ مسئلہ کشمیر کا کیا بنے گا۔ مسئلہ کشمیر پر ٹریک ٹو اور ٹریک تھری ڈپلومیسی تو بہت ہو رہی ہے نئی نئی تجویزیں اور فارمولے پیش کئے جا رہے ہیں۔ میرواعظ عمر فاروق نے بھی امریکی تھنک ٹینکس سے ماخوذ ''یونائیٹڈ اسٹیٹس آف کشمیر'' کی تجویز پیش کر کے میلہ لوٹنے کی کوشش کی تھی لیکن پاکستان کے وزیر خارجہ نے اس سے لاتعلقی کا اعلان کر دیا۔ اس طرح دیکھا جائے تو مذاکرات کی میز پر ابھی تک مسئلہ کشمیر زیرغور ہی نہیں آیا اور شاید کبھی نہ آ سکے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب پاکستان بھی اس مسئلے سے نظریں چرا رہا ہے۔ اس کی تمام تر کوشش یہ ہے کہ بھارت کے ساتھ دوستی بڑھائی جائے جبکہ بھارت کی حکمت عملی بھی یہ ہے کہ پاکستان کے ساتھ اس قدر قربت پیدا کی جائے کہ مسئلہ کشمیر کا نام و نشان ہی باقی نہ رہے۔

▀▄▀▄

مارچ کے آغاز میں امریکی صدر جارج بش نے بھارت اور پاکستان کا دورہ کیا ہے۔ دورہ بھارت میں انہوں نے بھارت سے ''سویلین نیوکلیئر ٹیکنالوجی'' کا معاہدہ بھی کر لیا۔ پاکستانی حکومت کو امید تھی کہ صدر بش اپنے دورہ بھارت میں کسی نہ کسی حوالے سے کشمیر کا ذکر ضرور کریں گے اور ان کے دورے سے یہ توقعات وابستہ کی جا رہی تھیں کہ دورے کے بعد مسئلہ کشمیر کا کوئی واضح حل ضرور سامنے آ جائے گا۔ کچھ خوش گمان اس سلسلے میں طویل عرصے سے چل رہی ٹریک ٹو گفتگو کا حوالہ دیتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ اب یہ گفتگو اپنے منطقی انجام یعنی مسئلہ کشمیر کے حل کی طرف جا رہی ہے اور صدر بش کا دورہ اسی سلسلے کی اہم کڑی ہے لیکن صدر بش نے بطور خاص دورۂ بھارت میں کشمیر کے حوالے سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ کشمیر کے بجائے صدر بش نے بھارتی نقطہ نظر کے مطابق ''ٹیررازم'' پر ضرور بات کی اور پاکستان کو نصیحت کی وہ اپنے ملک میں کشمیری مجاہدین کے ٹریننگ کیمپ بند کر دے یہ بیان صدر بش نے واشنگٹن سے روانگی پر بھی دیا تھا اور بھارت میں بھی اسے دھرانا ضروری سمجھا۔ ان کی 6 مارچ کو پاکستان آمد پر وزیر خارجہ خورشید قصوری نے ان کا استقبال کیا جو ایک طرح سے صدر بش سے ناراضگی کا اظہار سمجھا گیا۔ پاکستان نے امریکہ پر زور دیا کہ وہ اس کے ساتھ بھی معاہدہ کرے۔ پاکستان کی

Marfat.com

اس خواہش پر کہ اس کے ساتھ بھی بھارت کی طرز کا جوہری معاہدہ Nuclear Deal امریکہ کرے کے جواب میں امریکہ کی خاتون وزیر خارجہ (فارن سیکرٹری کونڈا لیزا رائس) نے دہلی میں 2 مارچ کو ''دی نیوز'' کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ ایسا ممکن نہیں' اسلئے کہ ''جوہری ہتھیاروں کے پھیلاؤ (Proliferation) کے معاملے میں پاکستان کے بارے میں ہمارے خدشات (Concerns) ہیں''۔ انہوں نے کہا ''اس مرحلے پر بھارت کی طرز کا کوئی معاہدہ اس کے ساتھ نہیں ہوگا'' تاہم پاکسان اور مشرف کو امریکہ کا ''بڑا حلیف'' (Tremendous ally) قرار دیتے ہوئے کہا ''پاکستانی فوج اور فرنٹیئر فورس انتہائی چابک دستی کے ساتھ القاعدہ کیخلاف جنگ لڑ رہے ہیں۔ مشرف کے ساتھ کام ہم کر رہے ہیں اور ہمیں دہشت گردی کے خلاف انتہائی بے رحمی کے ساتھ لڑنا چاہئے'' اس سے پہلے پچھلے ماہ صدر امریکہ جارج بش نے پاکستان سے کہا تھا کہ وہ اس معاملے میں ''برداشت'' سے کام لے۔ (دی نیوز۔ 2 مارچ 2006ء)

اگر بات صرف جوہری راز اور ٹیکنالوجی دوسرے ملکوں کو چوری چھپے دینے کی ہی ہو' جیسا کہ پاکستان کے معاملے میں اس پر الزام لگایا جاتا ہے تو پاکستان ہی پر غصہ کیوں اور اس کی ہی گردن کیوں ناپی جاتی ہے؟ پاکستانی بم کے خالق ڈاکٹر قدیر خان کا ''گناہ'' اگر یہی تھا کہ اس نے خفیہ طریقے سے ایران اور شمالی کوریا کو نیوکلیئر راز افشا کئے اور اس کے بدلے میں بڑی رعایت حاصل کی تو خود بھارت سمیت دوسرے کئی ملکوں پر اسی قسم کے الزامات عائد ہو سکتے ہیں۔ مثلاً اسرائیل کے نیوکلیئر سائنسدان دوسرے ملکوں کو اس میں مدد کرتے رہے' خود روس سے اس نے یہ ٹیکنالوجی حاصل کی۔ بھارت کے دو سائنسدان 2004ء میں ایران کو اس بارے میں مدد کرتے ہوئے پائے گئے۔ بھارت نے اس بارے میں اس وقت کہا کہ یہ ان کا ذاتی معاملہ تھا۔ (بھارت کے حوالے سے باتیں مشاہد حسین نے 4 مارچ کو ''وائس آف امریکہ'' کے اردو پروگرام میں بتائیں۔ موصوف ایک مشہور صحافی اور پاکستان مسلم لیگ (ق) کے سیکرٹری جنرل ہیں) تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ صرف پاکستان کو ہی ''اچھوت'' کیوں سمجھا جاتا ہے؟ اور اس تلخ حقیقت سے آنکھیں کیوں بند کی جاتی ہیں کہ برصغیر میں ایٹمی اسلحہ سازی کے پرخطر اور تباہ کن ماحول کو بھارت نے ہی جنم دیا ہے؟ انصاف اور حق پسندی کا تقاضا یہ تھا کہ بھارت کو پہلے جوابدہی کے کٹہرے میں کھڑا کیا جاتا اور بعد میں پاکستان کی سرزنش کی جاتی لیکن یہاں' جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں' مادی منفعت اور قومی مفادات کے چھرے سے انصاف اور اصولوں کا خون کرتے ہوئے بات کی جاتی ہے اور منزلوں کا تعین کیا جاتا ہے۔ ویسے بھی اگر دیکھا جائے' کس ملک اور کن پانچ بڑوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی تجوریاں جوہری ہتھیاروں سے بھر دیں مگر دوسروں پر ایٹمی قوت بننے پر پابندی لگائیں اور بہ زور طاقت ان کو اس حق سے محروم رکھیں؟ یہ ایسی ہی بات ہے کہ اخلاقیات اور خدا ترسی کی بات وہ کرے جس نے اپنے آنگن میں چکلہ قائم کیا ہے اور آبرو باختہ ہو۔ چند سال قبل امریکہ اور مغرب نے بھارت کے ساتھ جدید نیوکلیئر ٹیکنالوجی کی رسائی اور فوجی نوعیت کے اشتراک و تعاون کو ختم کیا تھا اور اس پر متعدد اقتصادی پابندیاں لگا دی تھیں مگر اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ بھارت عالمی منظر نامے پر ایک ایسی بڑی قوت کے طور پر ابھر رہا ہے کہ امریکہ بہادر لگتا ہے برق رفتاری کے ساتھ بھارت کے ساتھ دوستانہ اور قریبی تعلقات قائم کر کے ماضی کی ''غلطیوں'' کا ازالہ چاہتا ہے تاکہ آئندہ کسی قسم کے گلے شکوے نہ رہیں۔ صدر بش کی بھارت آمد اور یہاں اس کی سیاسی تقریریں' طرز تخاطب' احساس اپنائیت اور ''Body Language'' ہر چیز اس امر

Marfat.com

کی عکاس تھی کہ بھارت سے زیادہ امریکہ اس نئے رومانس اور بندھن کا خواہشمند اور بے تاب ہے۔حقیقت یہ ہے کہ بھارت سیاسی' عسکری اور سفارتی لحاظ سے اپنے آپ کو عالمی نقشے پر ایک اہم پلییئر کے طور پر منوانے میں کامیاب ہو چکا ہے۔قریباً آٹھ فیصد تک اس کی قومی شرح نمو پہنچ چکی ہے۔اس کے مضبوط جمہوری ادارے اور اس کا سیاسی استحکام (چند علاقوں کو چھوڑ کر) قانون کی بالادستی اور عدلیہ کے سامنے جوابدہی (چاہے وہ وزیراعظم ہی کیوں نہ ہو) اور بڑھتی فوجی قوت تناؤ سے بھرپور علاقے میں اسے ایک امتیازی مقام عطا کرتی ہے۔اس کی فوجی قوت کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ 11 ستمبر کے واقعہ کے بعد بھارتی نیوی نے امریکی سمندری جہازوں کو آبنائے ملاکا میں سے گزرنے میں تحفظ فراہم کیا تھا' جس پر صدر بش نے اپنے حالیہ دورے میں بھارت کا شکریہ ادا کیا۔''دہشت گردی'' کے نام پر امریکہ کی سربراہی میں جو جنگ چل رہی ہے' سب کو معلوم ہے اس کا رخ عالم اسلام کی طرف ہے۔پھر بھارت امریکہ کی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیوں کیلئے ایک بہت بڑی تجارتی منڈی ہے۔بش نے بھارت کے متوسط طبقے کی افادیت کو اجاگر کرتے ہوئے کہا کہ یہ طبقہ پوری امریکی آبادی کے برابر ہے۔یہ تمام چیزیں امریکہ کی نظر میں بھارت کو اس کا ''قدرتی حلیف'' (Natural ally) سمجھ کر اس کے عزائم کی تکمیل کے حق میں موافق بن جاتی ہیں۔نئی دہلی میں واقع پرانا قلعہ میں اپنی تقریر میں مسٹر بش نے دو ملکوں کے مابین بڑھتے روابط کے بارے میں کہا کہ ''ہم میں اب پہلے سے زیادہ قرب ہے'' اور اب یہ اشتراک اتنا زیادہ مضبوط ہے کہ ہم دنیا کو بدل سکتے ہیں۔بھارت کو عظیم جمہوریہ قرار دیتے ہوئے انہوں نے بھارت سے کہا کہ ''جمہوریت'' اور ''آزادی'' کے امریکی پروجیکٹ' جس کا جھنڈا امریکہ عالمی سطح پر لہرا رہا ہے' کا ساتھ دے۔اس سلسلے میں انہوں نے بھارت اور امریکہ کو ''لبرٹی'' کے کاز کو تقویت دینے کے سلسلے میں ایک دوسرے کے بھائی (Brothers in the cause of human Liberty) قرار دیا۔''دہشت گردی'' کے خلاف مؤقف کا اظہار کرتے ہوئے ''وڈبیامین'' نے کہا کہ ''دہشت گردوں'' نے امریکہ اور بھارت جیسے ملکوں کی طاقت کو غلط سمجھا ہے' مزید کہا "We love our freedom and we will fight to keep it" اور ہم ''دہشت گردی کے خلاف جنگ میں حلیف ہیں'' (Allies in war against terror)۔

اس دورے کے حوالے سے معروف سیاسی کالم نگار حبیب الرحمٰن نے لکھا:

''بھارت نے شاید امریکہ سے یہ فرمائش کی ہے کہ ایسا بندوبست کر دیا جائے کہ پاکستان کی ایٹمی طاقت کے حوالے سے بھارت کی تشویش ہمیشہ کیلئے رفع ہو جائے۔بھارت کا مؤقف غالباً یہ کہ پاکستان ایک سے زائد مرتبہ کشمیر کے محاذ پر لڑائی لڑنے میں پہل کر چکا ہے۔اس کا کہنا ہے کہ 48-1947ء میں پاکستانی فوج کے چند افسروں کی قیادت میں قبائلی لشکر مقبوضہ کشمیر پر حملہ آور ہوا۔اگست 1965ء میں پاکستانی فوج کے چھاتہ بردار کمانڈو وادی کشمیر میں اتارے گئے۔ 1998ء میں کارگل کی پہاڑیوں پر پاکستانی فوج اور مجاہدین نے مل کر قبضہ کر لیا اور صدر جنرل ضیاء الحق کے عہد میں آزاد خالصتان بنوانے کی کوشش میں سکھوں کی مدد کی گئی۔ان واقعات کے حوالے سے بھارتی قیادت باور کرتی ہے کہ پاکستان کے پاس ایٹمی ہتھیاروں کی موجودگی بھارت کیلئے مؤجب تشویش ہے۔

مسئلہ کشمیر کے بارے میں بھارت کا مؤقف اگرچہ ناجائز ہے اور بھارت ماضی میں سندھو دیش کی تحریک کی

Marfat.com

حمایت کرتا رہا ہے' سندھ میں تخریب کاری کی وارداتوں میں ملوث رہا ہے اور اب افغانستان کے راستے سے وزیرستان میں دہشت گردوں کی مدد کر رہا ہے لیکن امریکہ اب بھارت کے خلاف پاکستان کی شکایتوں پر توجہ دینے کے موڈ میں نہیں ہے۔ وجہ صریحاً یہ ہے کہ بھارت کے ساتھ امریکہ کا پکا گٹھ جوڑ ہو گیا ہے۔ بھارت کو مزید اطمینان دلانے کیلئے امریکہ کی وزیر خارجہ محترمہ کنڈولیزا رائس امریکی کانگرس کی کمیٹی کے سامنے ایک بیان میں کہہ چکی ہیں کہ ایٹمی ہتھیاروں کے سلسلے میں امریکہ نے ایک ہنگامی منصوبہ بنایا ہے جس کی تفصیلات ظاہر نہیں کی جا سکتیں۔

زیادہ تشویش کی بات یہ ہے کہ امریکہ کے ایک تھنک ٹینک نے پیشگوئی کی ہے کہ 2015ء تک دنیا کے نقشے پر پاکستان نظر نہیں آئیگا۔ اس پیشگوئی کا جماعت اسلامی پاکستان کے امیر قاضی حسین احمد نے ایک مضمون میں ذکر فرمایا ہے۔ اس مضمون میں قاضی صاحب نے یہ بھی بتایا ہے کہ امریکہ کے ایک ممتاز دانشور اسٹیفن کوہن نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ پاکستان کو اپنا وجود برقرار رکھنے کیلئے ضروری ہے کہ وہ امریکی فشار کے مطابق ایک سیکولر ریاست بن جانا قبول کر لے ورنہ ایک اسلامی نظریاتی ریاست کے طور پر اس کا برقرار رہنا ممکن نہیں ہے۔ قاضی صاحب نے اس مضمون میں لکھا ہے کہ ایک پاکستانی صحافی نے بہت پہلے' جب نرسیما راؤ صاحب بھارت کے وزیراعظم تھے' ان کے ساتھ ملاقات کا حال بیان کرتے ہوئے ان کی دو باتوں کا خصوصی ذکر کیا تھا۔ پہلی بات یہ کہ پاکستان کا وجود ایک اسلامی ریاست کے طور پر انہیں اس لئے قبول نہیں ہے کہ پاکستان نے بھارت کے پندرہ کروڑ مسلمانوں کو اپنے حلقہ اثر میں لے رکھا ہے۔ پاکستان ایک سیکولر ریاست بن جائے' ہمیں اس کے وجود پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ دوسری بات انہوں نے یہ بتائی کہ کشمیر کو بھارتی آئین کے مطابق بھارت کا حصہ رہتے ہوئے جتنی خود مختاری چاہئے' وہ دینے کیلئے بھارت تیار ہے۔ یہ سب کچھ بتانے کے بعد قاضی صاحب نے فرمایا ہے کہ بھارت کی اسی منشاء کو پورا کرنا بش انتظامیہ کے ایجنڈے میں شامل ہے۔

امریکہ ہی میں شائع کسی ''سید صاحب'' کی کتاب میں 2006ء میں بلوچستان کی آزادی کی پیشگوئی کی جا چکی ہے۔ بلوچستان کے حالات بتا رہے ہیں کہ بلوچستان میں علیحدگی کی تحریک شروع ہو چکی ہے۔ اس بات کا ذکر برمحل ہوگا کہ متحدہ پنجاب کے منصوبے پر ایک تفصیلی مقالہ لکھا جا چکا ہے۔ جس میں پاکستانی اور ہندوستانی پنجاب کو ملا کر ایک پنجاب بنانے کے فوائد تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ اس مقالے کی کاپیاں برطانیہ میں تقسیم کی گئی ہیں۔ عوامی نیشنل پارٹی کے ایک لیڈر غلام احمد بلور صاحب یہ مقالہ دیکھ چکے ہیں اور پڑھ چکے ہیں۔ آزاد سندھو دیش کی تحریک کے وجود سے انکار ممکن نہیں۔

نرسیما راؤ صاحب کی کہی ہوئی محولہ باتیں پرانی ہو چکی ہیں۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کے ممتاز بااثر لیڈر ایڈوانی صاحب نے پچھلے برس پاکستان کے دورے کے اختتام پر فرمایا تھا کہ اکھنڈ بھارت کا نظریہ وفات پا چکا ہے۔ اگر پاکستانی عوام چاہیں تو پاکستان اور بھارت کی کنفیڈریشن بنائی جا سکتی ہے۔ بھارت کے چند لیڈروں نے کہا ہے کہ دونوں ملکوں کے تنازعوں کو ختم کر دینے کا طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ کنفیڈریشن بنا لی جائے۔ کنفیڈریشن ایک سے زائد آزاد مملکتوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ جس میں مشترکہ دفاع کا نظام اور مشترکہ خارجہ پالیسی شامل ہوتی ہے۔ کنفیڈریشن میں شامل ہونے والی مملکتیں بدستور آزاد رہتی ہیں۔ کنفیڈریشن کی تجویز اچھی ہے یا بری' یہ ایک الگ بحث ہے۔ فی الحال غور طلب بات یہ ہے کہ اگر

Marfat.com

امریکہ کا ایجنڈا یہی ہے کہ باقیماندہ پاکستان کے بھی حصے بخرے کروادیئے جائیں اور منقسم کئے جانے والے پاکستانی علاقوں کی ہندوستان کیساتھ کنفیڈریشن پر مجبور کیا جائے۔(ہفت روزہ اخبار جہاں 13 تا 19 مارچ 2006ء)

19 مارچ کو بھارتی دفتر خارجہ کے ترجمان نے پاکستان پر تربیتی کیمپ چلانے کا الزام لگایا اور کہا کہ الظواہری اور اسامہ بن لادن نے بھی پاکستان میں پناہ لے رکھی ہے۔(روزنامہ جنگ لاہور 20 مارچ 2006ء)

پاکستانی دفتر خارجہ نے 20 مارچ کو بریفنگ میں تربیتی کیمپوں کی موجودگی کا الزام مسترد کرتے ہوئے بھارت سے کہا کہ وہ کشمیر پر بھی تجاویز دے۔ پاکستانی ترجمان نے کہا سول ایٹمی ٹیکنالوجی کے معاملے پر امتیازی سلوک قبول نہیں بھارت امریکہ معاہدہ خطہ میں امن کوششوں کو سبوتاژ کرے گا۔ پاکستان نے بھارت کی طرف سے ملا الظواہری اور اسامہ بن لادن کی پاکستان موجودگی کے الزام کو مضحکہ خیز اور لغو قرار دیا اور کہا کہ ہمیں دہشت گردی کے خلاف جنگ میں کسی سے سرٹیفکیٹ لینے کی ضرورت نہیں۔(روزنامہ ایکسپریس لاہور 21 مارچ 2006ء)

مارچ میں پاک بھارت مشترکہ کمیشن کے اجلاس کی خبر آئی۔ یہ کمیشن 1989ء میں پاکستانی وزیر خارجہ صاحبزادہ یعقوب خان اور ان دنوں بھارتی وزیر خارجہ اٹل بہاری واجپائی کے درمیان مذاکرات کے نتیجے میں قائم ہوا تھا۔ ابتدائی اجلاسوں کے علاوہ کمیشن کا مکمل اجلاس اب 17 سال بعد منعقد ہونے جا رہا تھا۔ اخباری اطلاع کے مطابق اسلام آباد میں سائنسی تعاون، موسمی پیشگوئیوں اور تباہ کاریوں سے نمٹنے کی تدابیر پر بات ہوئی اور دہلی میں اپریل میں زراعت اور تعلیم کے مشترکہ ورکنگ گروپ کا اجلاس ہونا تھا۔(روزنامہ پاکستان۔ 21 مارچ 2006ء)

21 مارچ کے روزنامہ جنگ کراچی ہی کی ایک خبر کے مطابق لائن آف کنٹرول کے دونوں جانب سے زندگی کے مختلف شعبوں پر مشتمل سول سوسائٹی کے کشمیری ماہرین کی پانچ روزہ انٹرنیشنل کانفرنس مالدیپ کے دارالحکومت مالے میں ختم ہوگئی۔ کانفرنس میں شریک کشمیری رہنماؤں نے خطہ میں مستقل اور پائیدار امن کیلئے تنازعہ کشمیر کے جلد پرامن حل کی ضرورت پر زور دیا۔ کانفرنس میں آزاد کشمیر اور پاکستان میں مقیم مختلف شعبہ ہائے فکر سے تعلق رکھنے والے کشمیری ماہرین کے چودہ رکنی وفد نے شرکت کی۔ اس موقع پر شرکاء نے مطالبہ کیا کہ جموں و کشمیر میں امن کی بحالی کیلئے موجودہ کوششوں کو تقویت دی جائے، عوام کے مابین رابطوں کو فروغ دیا جائے اور کشمیریوں کی آزادانہ آمدورفت کیلئے تمام قدرتی راستوں کو کھولا جائے، انٹرا کشمیر کانفرنس کے شرکاء نے جموں و کشمیر کی تاریخ مرتب کرنے کا فیصلہ بھی کیا، اس موقع پر زلزلے کے نتیجے میں ہلاک ہونے والوں کی یاد میں ایک منٹ کی خاموشی بھی اختیار کی گئی۔ آزاد کشمیر سے چودہ رکنی وفد میں آزاد کشمیر قانون ساز اسمبلی کے رکن شاہ غلام قادر، آزاد جموں و کشمیر قانون ساز اسمبلی کے ممبر خواجہ فاروق احمد آزاد جموں و کشمیر کونسل کے ممبر نجیب خان اور مسلم کانفرنس کے رہنما راجہ ظفر، کشمیر انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل ریلیشنز کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر امجد یوسف، تنویر احمد مرزا، ماہرین تعلیم پروفیسر تقدیس گیلانی، مس شفق ملک، ماہر اقتصادیات مس عدیلہ عباسی، مظفرآباد کے سابق میئر منظور احمد، گوہر الرحمٰن ایڈووکیٹ اور تجزیہ نگار عاشق علی ہمدانی پر مشتمل تھا۔(روزنامہ جنگ کراچی...... 21 مارچ 2006ء)

22 مارچ کو دہلی میں پاکستانی ایف آئی اے کے سربراہ اور بھارتی سی بی آئی کے ڈی۔ جی مسٹر وجے شنکر کے درمیان ایک اہم میٹنگ میں پاکستان اور بھارت ایک دوسرے کے ملک میں تفتیشی افسر تعینات کرنے پر متفق ہوگئے۔ سی

Marfat.com

بی آئی کا ایک افسر اسلام آباد اور ایف آئی اے کا دہلی میں تعینات ہوگا۔(روز نامہ جنگ لاہور۔23 مارچ2006ء)

اس اہم فیصلے کے حوالے سے روزنامہ نوائے وقت لاہور کا ادارتی نوٹ ملاحظہ فرمائیں:

سارک پولیس کی مضحکہ خیز تجویز:

پاکستان اور بھارت نے اشیاء منشیات انسانی سمگلنگ اور دیگر منظم جرائم پر قابو پانے کیلئے سارک پولیس تشکیل دینے پر اتفاق کیا ہے۔ دونوں حلقوں کے درمیان سترہ سال بعد نئی دہلی میں ہونے والے مذاکرات میں یورپ کی یورو پولیس کی طرز پر سارک پولیس قائم کرنے پر تبادلہ خیال کیا گیا ہے جس میں پاکستان بھارت کے علاوہ بنگلہ دیش سری لنکا نیپال بھوٹان اور مالدیپ بھی شامل ہوں گے۔

یہ حیران کن ہے کہ پاکستان بھارت کے ساتھ دوستی کے نام پر ایسی شرائط بھی مانتا چلا جارہا ہے جن سے پاکستان کی سلامتی پر براہ راست حرف آتا ہے۔ بھارت نے نہایت چالاکی سے ایک بار پھر سارک پولیس کی جو تجویز دی ہے اس کے تحت اپنے ایجنڈوں کا دائرہ کار پاکستان تک پھیلانا ہے۔ وہ اس سے قبل مطلوب دہشت گردوں کی فہرست بھی پاکستان کے حوالے کر چکا ہے۔ اب ان سے تفتیش کیلئے بھی اپنی پولیس لانے کا خواہش مند ہے۔ پاکستانی حکومت کو بھارت کی ان مکارانہ سازشوں کا مقابلہ کرنے کیلئے دوٹوک جواب دینا چاہئے مگر ہم نجانے کن مجبوریوں کی بنیاد پر بھارت کے آگے بچھتے چلے جارہے ہیں حالانکہ بھارت یہ تمام تاخیری حربے کشمیر جیسے بنیادی اور دیرینہ مسئلے کو نہ حل کرنے کیلئے اختیار کررہا ہے۔ سارک پولیس کی سرگرمیوں کا احاطہ کون کرے گا؟ دہشت گرد کا تعین کون کرے گا؟ بھارت تو اس بہانے اپنا اثر ورسوخ پورے ملک کی مذہبی جماعتوں اور لیڈروں تک پھیلا سکتا ہے۔ ہندو بنیا کبھی پاکستان کا دوست نہیں رہا اور اس کے ہر فعل سے سازش کی بو آتی ہے۔ تازہ ترین کاوش بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے جو ملک دوستی کے نام پر بگلیہار ڈیم اور کشن گنگا ڈیم بنا کر پاکستان کو ریگستان بنانے کا خواب دیکھ رہا ہو۔ کالا باغ ڈیم کو نہ بنانے کیلئے سرگرم ہو اور وزیرستان بلوچستان میں شرپسند عناصر کو ہوا دے رہا ہو وہ کس طرح پاکستان کا خیرخواہ ہوسکتا ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ حکومت پاکستان ہوش کے ناخن لے اور بھارت کے ساتھ ہر قسم کا تعاون ختم کر کے مسئلہ کشمیر کے حل کیلئے دوٹوک مذاکرات کرے جو سلامتی کونسل کی قراردادوں پر عملدرآمد کے علاوہ اور کوئی نہیں۔(روزنامہ نوائے وقت لاہور ادارتی نوٹ 24 مارچ 2006ء)

امریکی تھنک ٹینک ''پگواش'' کے زیراہتمام دس اور گیارہ مارچ کو اسلام آباد میں دو روزہ کشمیر کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں بھارت کی سیاسی جماعتوں اور مقبوضہ کشمیر کی بھارت نواز سیاسی جماعتوں کے نمائندوں کے علاوہ پاکستان اور آزاد کشمیر کے مندوبین نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں سید علی گیلانی کو بھی مدعو کیا گیا تھا جو بھارت سے آزادی اور الحاق پاکستان کے حامی ہیں لیکن بھارت نے انہیں کانفرنس میں شرکت کیلئے اجازت نامہ دینے سے انکار کردیا۔ اس طرح اس کانفرنس میں عملاً ایک ہی نقطہ نظر رکھنے والوں کی نمائندگی ہوئی جو مقبوضہ کشمیر میں تشدد اور دہشت گردی کا رونا روتے رہے۔ بھارتی مندوبین نے کانفرنس کے بند کمرے کے اجلاس میں پاکستان پر کڑی تنقید کی اور دراندازی و دہشت گردی کے وہی الزامات لگائے جو بھارتی قیادت پاکستان پر لگاتی رہتی ہے بھارتیہ جنتا پارٹی کے مندوبین نے دعویٰ کیا کہ مسئلہ کشمیر کی کوئی حقیقت نہیں ہے یہ تنازعہ درحقیقت پاکستان کی دراندازی سے پیدا ہوا ہے اور پاکستان اس کارروائی کے

Marfat.com

ذریعے کشمیر کے حالات بگاڑ رہا ہے۔ بھارتی مندوب نے کہا کہ اگر کنٹرول لائن کو مستقل سرحد تسلیم کرلیا جائے اور پاکستان دراندازی بند کردے تو مسئلہ کشمیر کا کوئی وجود باقی نہیں رہتا۔ دیگر بھارتی مندوبین نے بھی اسی قسم کی زبان استعمال کی۔ پاکستان سے کانفرنس میں شریک قائداعظم یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر پرویز ہود بھائی نے بھی تائید میں سر ہلایا اور مجاہدین کی سرگرمیوں پر کڑی تنقید کی۔ انہوں نے بھی پاکستان پر دراندازی کا الزام لگانے میں کوئی جھجک محسوس نہ کی بلکہ وہ اس سے بھی دو ہاتھ بڑھ کر اس بات پر بھی معترض ہوئے کہ جہادی تنظیموں کو زلزلہ زدہ علاقوں میں ریلیف کا کام کرنے کی اجازت دیکر ان کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے۔ آزاد کشمیر سے جو سیاسی راہنما کانفرنس میں شریک ہوئے ان میں سے بھی ایک دو کے سوا سب کا انداز معذرت خواہانہ تھا' کسی نے بھی کانفرنس میں بھارت کی ریاستی دہشتگردی کو موضوع بحث نہیں بنایا اور نہ ہی انسانی حقوق کی ان سنگین خلاف ورزیوں کا ذکر کیا جو بے گناہ کشمیری عوام کے ساتھ روا رکھی جا رہی ہیں۔ کانفرنس کے شرکاء نے اس بات پر تو زور دیا کہ مقبوضہ علاقے میں تشدد بند ہونا چاہئے لیکن تشدد سے ان کی مراد مجاہدین کی سرگرمیاں تھیں جن کا ہدف قابض بھارتی افواج ہیں۔ لیکن بھارتی فوج کے مظالم کا کوئی ذکر نہ ہوا۔

کانفرنس کے شرکاء سے ایوان صدر اسلام آباد میں صدر جنرل پرویز مشرف کا خطاب کانفرنس کے شرکاء کا بنیادی موضوع بن گیا جس میں جنرل صاحب نے کشمیر سے فوجوں کے انخلاء' سیلف گورننس اور مشترکہ کنٹرول کی تجویز کو دہرایا ہے۔ جنرل صاحب یہ تجویزیں پہلے بھی پیش کر چکے ہیں جن پر بھارت نے کسی مثبت ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ خاص طور پر جنرل صاحب کی طرف سے پیش کردہ فوجی انخلاء کی تجویز کو تو بھارت بڑی حقارت سے ٹھکرا چکا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ پاکستان یہ تجویز پیش کرنے والا کون ہے۔ کشمیر ہمارا اٹوٹ انگ ہے ہم اس میں فوج رکھیں یا نکالیں پاکستان کو اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہئے۔ سیلف گورننس کی تجویز کے بارے میں بھی بھارت یہ ردعمل ظاہر کر چکا ہے کہ اس کی مقبوضہ علاقے میں تو سیلف گورننس پہلے سے قائم ہے جبکہ پاکستان کے زیر قبضہ علاقے میں اس کا وجود نہیں ہے۔ خاص طور پر شمالی علاقہ جات کے لوگوں کو سیلف گورننس سے محروم رکھا گیا ہے اس لئے پہلے پاکستان کو سیلف گورننس کا اہتمام کرنا چاہئے' اس کے بعد ہی کوئی بات کی جا سکتی ہے۔ جنرل صاحب نے مشترکہ کنٹرول کی تجویز بھی پیش کی ہے جس پر بھارت نے کوئی ردعمل ظاہر کرنے سے گریز کیا ہے تاہم مبصرین کا کہنا ہے کہ اگر پاکستان نے مذاکرات کی میز پر یہ تجویز پیش کی تو بھارت کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا وہ ریاست جموں و کشمیر تو کیا پورے برصغیر یعنی پاکستان اور بھارت دونوں پر مشترکہ کنٹرول کے حق میں ہے۔ بھارتی لیڈر دونوں ملکوں کے درمیان فیڈریشن یا کنفیڈریشن کی تجویز اکثر پیش کرتے رہتے ہیں وہ یہی دام ہم رنگ زمین ہے۔ یعنی وہ کھلے لفظوں میں تو مشترکہ کنٹرول کی بات نہیں کرتے لیکن جو تجویز وہ پیش کرتے ہیں اس کا مقصد یہی ہوتا ہے۔ حیرت ہے کہ جنرل صاحب ریاست جموں و کشمیر پر مشترکہ کنٹرول کی تجویز کس کے اشارے پر پیش کر رہے ہیں۔ اس تجویز پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک دفعہ سید علی گیلانی نے کہا تھا کہ یہ تجویز ایسے ہی ہے جیسے ایک عورت کو دو مردوں کے نکاح میں دینے کی تجویز پیش کی جائے۔ مشترکہ کنٹرول کی تجویز ہر اعتبار سے لغو اور احمقانہ ہے۔ اگر خدانخواستہ اس تجویز کو عملی جامہ پہنایا گیا تو کشمیریوں کی حالت زار بھارت کی غلامی سے بھی ابتر ہو جائیگی اور ریاست جموں و کشمیر کا پورا خطہ ناقابل بیان سازشوں کا گھر بن جائے گا۔

Marfat.com

پگواش کانفرنس میں مشترکہ کنٹرول کی تجویز پر تو کوئی خاص موافق یا مخالف ردعمل سامنے نہیں آیا۔ البتہ سیلف گورننس کی تجویز پر حمایت کا آرکسٹرا بج رہا ہے۔ عمر عبداللہ نے اس تجویز کو ریاست کی اندرونی خودمختاری کی تجویز کے مماثل قرار دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ جب ان کے والد ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی حکومت تھی تو مقبوضہ کشمیر اسمبلی نے اندرونی خودمختاری کے حق میں ایک قرارداد منظور کی تھی اور صدر جنرل پرویز مشرف کی طرف سے سیلف گورننس کی تجویز بھی اسی قرارداد کا پرتو ہے۔ پروفیسر عبدالغنی بٹ، سردار قیوم، یاسین ملک اور بھارت و مقبوضہ کشمیر سے آئے ہوئے دیگر مندوبین نے بھی صدر جنرل مشرف کی اس تجویز کو ان کی ذہانت کا شاہکار قرار دیا۔ میرواعظ عمر فاروق اگرچہ پگواش کانفرنس میں شریک نہیں ہو سکے لیکن انہوں نے اس کے ایجنڈے سے اتفاق کیا۔ بھارت کشمیریوں زیادہ سے زیادہ صوبائی خودمختاری دینے کو تیار ہے لیکن شرط یہی ہے کہ وہ اپنے حق خودارادیت سے دستبردار ہو جائیں۔ حریت کانفرنس کے حقیقی راہنما سید علی گیلانی نے ان تمام تجاویز کو دھوکہ، فریب اور کشمیری شہیدوں کی روحوں سے مذاق قرار دیا ہے اور پاکستان سے اپیل کی کہ وہ اپنے دیرینہ مؤقف پر قائم رہے کیونکہ ہم "کشمیر بنے گا پاکستان" کی جنگ لڑ رہے ہیں اور اس مرحلے پر پاکستان کا کردار ہمارے لئے مسائل پیدا کر رہا ہے۔ روزنامہ نوائے وقت نے پگواش کانفرنس کو "بکواس کانفرنس" قرار دیا تھا۔

(بحوالہ اداریہ روزنامہ نوائے وقت 13 مارچ 2006ء)

19 مارچ کو بھارت کی قومی سلامتی کے مشیر ایم کے نارائن نے الیکٹرانک میڈیا کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ پاکستان مسئلہ کشمیر کا حل تلاش کرنے کے سلسلے میں سنجیدہ دکھائی نہیں دیتا اس نے جو تجویزیں پیش کی ہیں ان سے بھارت کنفیوز ہو گیا ہے۔ انہوں نے متحدہ جہاد کونسل کے سربراہ سید صلاح الدین کے ساتھ مسئلہ کشمیر پر مذاکرات کے امکان کو رد نہیں کیا۔ انہوں نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کیلئے دونوں ملکوں کے مشترکہ کنٹرول کا کوئی آپشن موجود نہیں ہے۔ ایسی تجاویز سے مسئلہ کشمیر کے حل کی طرف کوئی پیشرفت ممکن نہیں۔

بھارت کے ایک ذمہ دار فرد نے ان خیالات کا اظہار ایک ایسے موقع پر کیا ہے جب صدر جنرل پرویز مشرف کی طرف سے پیش کردہ سیلف گورننس اور کشمیر پر مشترکہ کنٹرول کی تجاویز کا بہت چرچا ہے۔ صدر نے یہ تجاویز اسلام آباد میں منعقدہ پگواش کانفرنس کے مندوبین کے سامنے پیش کی تھیں جبکہ اس سے پہلے بھی وہ ان تجاویز کو دہراتے رہے ہیں۔ پگواش کانفرنس میں شریک بھارت نواز کشمیری راہنما عمر عبداللہ نے سیلف گورننس کی تجویز کا پرجوش خیر مقدم کیا اور اسے اپنی جماعت نیشنل کانفرنس کے اندرونی خودمختاری کے مطالبے کے مماثل قرار دیا۔ نیشنل کانفرنس نے اپنے دور اقتدار میں نام نہاد ریاستی اسمبلی سے اندرونی خودمختاری کے حق میں ایک قرارداد منظور کروائی تھی جسے بھارت نے کسی پس و پیش کے بغیر مسترد کر دیا تھا۔ اب عمر عبداللہ سیلف گورننس کی تجویز میں اس قرارداد کا عکس دیکھ رہے ہیں اور صدر جنرل پرویز مشرف کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ ایم کے نارائن نے یہ بات بالکل درست کہی ہے کہ پاکستان کی نت نئی تجویزوں نے بھارت کو کنفیوز کر دیا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ بھارت ہی نہیں خود اہل پاکستان اور کشمیری عوام بھی ان تجویزوں کے نتیجے میں بری طرح کنفیوز ہو گئے ہیں۔ انکی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا کہ آخر پاکستان کے حکمران چاہتے کیا ہیں۔ پاکستان کا دیرینہ اور اصولی

Marfat.com

مؤقف تو یہ تھا کہ اہل کشمیر کو اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق حق خودارادیت ملنا چاہئے۔ اگر وہ اسی اصولی مؤقف پر قائم رہتے تو اس میں کوئی کنفیوژن نہ تھا۔ بھارت بے شک پاکستان کے اس مؤقف کے مقابلے میں ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتا لیکن وہ یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ پاکستان کی تجویزوں نے اسے کنفیوز کر دیا ہے۔ یہ جہاں پاکستان کی خارجہ پالیسی کی ناکامی ہے وہیں پاکستان کی رسوائی اور بدنامی بھی ہے۔ پاکستان کی حکمران قیادت نہ جانے کس دباؤ کے تحت اپنے مؤقف سے پسپائی اختیار کر رہی ہے۔ بھارت کے راہنماؤں نے پاکستان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا ہے کہ بھارت پاکستان کے بجائے جہادی تنظیموں کے مشترکہ فورم متحدہ جہاد کونسل کے چیئرمین سید صلاح الدین سے مذاکرات کر سکتا ہے۔ سید صلاح الدین کا کہنا ہے کہ بھارت اگر واقعی مجاہدین سے بات چیت کا خواہاں ہے تو اسے اصولی طور پر ان کی چند شرائط ماننا ہونگی۔ پہلی شرط یہ ہے کہ وہ ریاست جموں وکشمیر کو متنازعہ علاقہ تسلیم کرے اور اپنی پارلیمنٹ سے منظور کردہ قرارداد واپس لے جس میں ریاست کو بھارت کا اٹوٹ انگ قرار دیا گیا ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ ان تمام کشمیری قیدیوں کو رہا کرے جنہیں تحریک مزاحمت کے دوران گرفتار کیا گیا ہے اور تیسری اہم شرط یہ ہے کہ وہ مقبوضہ علاقے سے اپنی فوجیں واپس بلائے۔ اگر وہ یہ شرائط پوری نہیں کرتا تو مجاہدین کی قیادت اس کے ساتھ پاکستان کی طرح بے مقصد مذاکرات کیلئے تیار نہیں ہے۔ ہم یہاں یہ کہنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر پاکستان نے اپنی لایعنی تجویزوں کے ذریعے بھارت کو کنفیوز کر رکھا ہے تو خود بھارت بھی مسئلہ کشمیر پر کنفیوژن پھیلانے میں پاکستان سے کم نہیں ہے۔ اس نے بھی کشمیر میں جاری تحریک آزادی کو دہشت گردی قرار دیکر پوری دنیا میں کنفیوژن پھیلا رکھا ہے اور کشمیر کی صورتحال کو اپنا داخلی معاملہ قرار دے رہا ہے حالانکہ بھارت کشمیر کے بارے میں بھی پروپیگنڈا کر رہا ہے اس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ بھارت مسئلہ کشمیر پر بامقصد اور نتیجہ خیز مذاکرات چاہتا ہے تو اسے اپنا ہٹ دھرمی پر مبنی رویہ ترک کرنا ہوگا۔ (ماہنامہ کشمیر الیوم اپریل 2006ء)

سرینگر اور مظفر آباد کے مابین بس سروس کا افتتاح کرتے ہوئے ہندوستانی وزیراعظم ڈاکٹر من موہن سنگھ نے کہا تھا کہ امن کا کارواں چل پڑا ہے اور یہ چلتا ہی رہے گا۔ سیاچن گلیشئر کے حالیہ دورے کے موقع پر ہندوستانی فوجیوں سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ وہ چاہتے ہیں کہ اس گلیشئر کو کوہ امن بنا دیا جائے اور انہیں یقین ہے کہ ان کی یہ خواہش پوری ہو کر رہے گی۔ پچھلے ہفتے مشرقی پنجاب میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے پاکستان کو امن' سلامتی اور دوستی کے معاہدے کی پیشکش کی۔ ماضی کے جھگڑوں کو بھلا دینے' ان جھگڑوں کی پیدا کردہ تلخیاں ختم کر دینے کا مشورہ دیا اور دونوں ممالک کے عوام کے مشترکہ دشمنوں' غربت' جہالت اور بیماریوں کے خلاف جنگ میں باہمی تعاون کی دعوت دی۔ وزیراعظم من موہن سنگھ نے اسی تقریر میں یہ امید بھی ظاہر کی کہ سیاچن سرکریک اور بگلیہار ڈیم کے تنازعوں کا جلد تصفیہ ہو جائے گا۔ دریں اثناء ہندوستان کے چند موقر روزناموں نے خبر دی ہے کہ پس پردہ مذاکرات کے نتیجے میں سیاچن اور سرکریک تنازعوں پر سمجھوتہ ہو گیا ہے اور سمجھوتوں کی دستاویزوں پر عنقریب دستخط ہو جائیں گے۔ بگلیہار ڈیم کے تنازعہ کے حوالے سے یہ خبر آئی ہے کہ ڈیم میں پانی کے ذخیرے کی مقدار کم کرنے اور پاکستان کے خدشات رفع کرنے کیلئے ہندوستان کچھ اور اقدامات کرنے پر رضامند ہو گیا ہے۔ نتیجتاً یہ امید پیدا ہو چلی ہے کہ یہ تنازعہ بھی بالآخر

Marfat.com

طے پا جائے گا۔ مسئلہ کشمیر کے تصفیے میں پیشرفت کی راہ ہموار کرنے کیلئے وزیراعظم من موہن سنگھ نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ پاکستان اور ہندوستان اپنے زیرانتظام کشمیری علاقوں کے نمائندوں سے مذاکرات کریں' سرحدوں کو نرم بنا کر کشمیریوں کی آمدورفت اور میل ملاپ کو آسان بنائیں۔ ہندوستانی قیادت غالباً یہ چاہتی ہے کہ پاکستان کے زیرانتظام شمالی علاقے جو تقسیم ہند سے قبل ریاست جموں وکشمیر میں شامل رہے ہیں' ان کے نمائندوں اور آزاد کشمیر کے ترجمانوں سے حکومت پاکستان دریافت کرے کہ ان کی خواہش کیا ہے۔ اسی طرح مقبوضہ کشمیر کے مختلف علاقوں کے نمائندوں کی رائے معلوم کرنے کیلئے نئی دہلی نے مذاکرات کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔

پاکستان اور ہندوستان کی باہمی رضامندی سے آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر کی مختلف جماعتوں کے لیڈروں کو تبادلہ خیالات کی سہولت مہیا کرنے کیلئے کئی کانفرنسیں منعقد کروائی جا چکی ہیں۔ ان کانفرنسوں میں جو مباحثے ہوئے ہیں ان سے ظاہر یہ ہوا ہے کہ پاکستان کے زیرانتظام علاقوں میں بسنے والے کشمیری دو دھڑوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک دھڑا پاکستان سے الحاق چاہتا ہے اور دوسرا دھڑا آزادی کا خواہاں ہے۔ اس طرح مقبوضہ کشمیر کے جن علاقوں میں غیر مسلموں کی اکثریت ہے' ان کے نمائندے ہندوستان سے الحاق کے حق میں ہیں۔ وادی کشمیر میں جہاں کشمیری مسلمان واضح اکثریت میں ہیں وہاں تین دھڑے ہیں۔ ایک پاکستان سے الحاق چاہتا ہے' دوسرا آزاد رہنا چاہتا ہے اور تیسرا دھڑا ہندوستان کے ساتھ رہتے ہوئے وسیع خودمختاری کا طلب گار ہے۔

پاکستان اور ہندوستان کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کشمیریوں کو آزادی نہیں دی جا سکتی۔ ریاست کی آزادی کا مطالبہ کرنے والی تنظیم لبریشن فرنٹ کے لیڈروں سے حالیہ ملاقاتوں میں پاکستان صاف لفظوں میں یہ بات بتا چکا ہے۔ بھارت اور پاکسان روز اول ہی سے آزادی کی تجویز کے مخالف رہے ہیں' اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل جب رائے شماری کی قرارداد پر بحث کر رہی تھی تو پاکستان کے وزیر خارجہ چوہدری ظفراللہ خان نے اصرار کیا تھا کہ صرف پاکستان یا ہندوستان سے الحاق کے سوال پر رائے شماری ہونی چاہئے۔ آزادی کے سوال کو استصواب کے دائرے سے باہر رکھا جانا چاہئے۔ پاکستان کے اس مئوقف کی ہندوستان نے مخالفت نہیں کی تھی۔ اس معاملے میں دونوں ممالک کے اتفاق رائے کی وجہ غالباً یہ تھی کہ دونوں کو یہ اندیشہ تھا کہ اگر ریاست جموں وکشمیر کو آزادی مل گئی تو ریاست کا علاقہ بین الاقوامی سازشوں اور دو اقلیتوں کی آماجگاہ بن سکتا ہے۔ الحاق کے سوال پر بھی رائے شماری کی تجویز کو ہندوستان اس بناء پر مسترد کرتا آ رہا ہے کہ مذہبی بنیادوں پر رائے شماری ہندوستان کے سیکولر نظریات کے منافی ہے۔

ان تمام گروپس کا دعویٰ ہے کہ تعداد میں وہ دوسرے سے زیادہ ہیں۔ اس مسئلے کا حل جموں کمشیر لبریشن فرنٹ کے چیئرمین یاسین ملک نے 4 اپریل کو روزنامہ نوائے وقت اور دی نیشن کے زیراہتمام حمید نظامی ہال میں ایک خصوصی تقریر میں پیش کرتے ہوئے کہا کہ کشمیریوں کو ریفرنڈم کے ذریعے اپنے نمائندے چننے کا اختیار دیا جائے جو ان کی نمائندگی کر سکیں۔ (روزنامہ نوائے وقت لاہور 5 اپریل 2006ء)

اسی فورم سے مقبوضہ کشمیر سے براہ راست خطاب کرتے ہوئے سید علی گیلانی نے کہا کہ جو کشمیری لیڈر پاکستان کے دورے کرتے ہوئے عجیب وغریب قسم کی تجاویز دے رہے ہیں وہ معاملات کو سدھارنے کے بجائے بگاڑ رہے ہیں

Marfat.com

اور پاکستانی حکومت کو ان کی ہرگز حوصلہ افزائی نہیں کرنی چاہیئے۔ اسی روز لاہور کے اخبارات میں میر واعظ عمر فاروق کا بیان شائع ہوا کہ کشمیر کو 5 خودمختار ریاستوں میں تقسیم کر کے اسکا مشترکہ کنٹرول پاکستان اور بھارت کو سونپ دیا جائے۔

(روزنامہ پاکستان لاہور۔ 4 اپریل 2006ء)

ایسی بھانت بھانت کی تجاویز نے پاکستان کے اصولی مئوقف کی اہمیت ہی ختم کر دی ہے اور یہ مسئلہ روز بروز الجھتا جا رہا ہے جبکہ امریکی پنڈتوں کا دعویٰ ہے کہ 2007ء میں کشمیر کا مئسلہ ختم ہو جائے گا۔ میں اپنی کتاب ''پاک بھارت مذاکرات'' کا موجودہ ایڈیشن روزنامہ نوائے وقت کے اُس اداریے پر ختم کر رہا ہوں۔ انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں بعد کے حالات و واقعات بھی شامل کرتا رہوں گا تاکہ یہ تاریخی دستاویز آئندہ نسلوں کیلئے ایک مستند حوالہ بن جائے۔

مسئلہ کشمیر اور جمہوریت......امریکہ سے نا امیدی کے بعد؟:

سینٹ کی خارجہ تعلقات کمیٹی سے خطاب کرتے ہوئے امریکی وزیر خارجہ کنڈولیزا رائس نے کہا ہے کہ مسئلہ کشمیر کے حل کا انحصار پاکستان اور بھارت پر ہے' مسئلہ کے حل میں دونوں کی سنجیدگی یقینی ہونے پر ہم نے ثالثی کا خیال ترک کر دیا۔

9/11 کے بعد حکومت پاکستان نے امریکہ سے تعاون کا فیصلہ اس خوش فہمی کی بنا پر کیا تھا کہ عالمی طاقت دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ہماری کارکردگی سے خوش ہو کر نہ صرف مسئلہ کشمیر حل کرائے گی بلکہ ایٹمی پروگرام پر ہم جس دباؤ کا شکار ہیں' اس سے بھی نجات مل جائے گی۔ امریکہ نے بھی ابتداء میں یہی تاثر دیا کہ وہ پاکستان اور بھارت کے مابین کشیدگی کم اور ختم کرانے کی خواہش رکھتا ہے اور اپنے اثر و رسوخ کے ذریعے بھارت کو مسئلہ کشمیر حل کرنے پر مجبور کر سکتا ہے مگر وقت گزارنے کے ساتھ ساتھ اس کے اصل عزائم سامنے آ چکے ہیں اور ثابت ہو گیا ہے کہ وہ بھارت کا یار ہے' اسے علاقائی نہیں' بلکہ گلوبل طاقت بنانے اور چین کے مقابل کھڑا کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور پاکستان کو وہ اپنا بندہ بے دام سمجھتا ہے اور سول نیوکلیئر تعاون سے صاف انکار کے بعد مزید واضح ہو گیا ہے کہ اس کی نظروں میں پاکستان کا کیا مقام ہے۔ یہ قابل فہم بھی ہے کیونکہ جس عالمی طاقت نے 9/11 کے بعد اسلام آباد اور مسلمانوں کے خلاف کروسیڈ شروع کر رکھا ہے۔ وہ دنیا کی واحد نیوکلیئر اسلامی ریاست کو جو قائم بھی اسلام کے نام پر ہوئی' آخر کس طرح نیوکلیئر کلب کا رکن بنانے اور اسے نیوکلیئر تعاون فراہم پر آمادہ ہو سکتی ہے۔

اگرچہ قوم تو روز اول سے جانتی تھی کہ طوطا چشم امریکہ مسئلہ کشمیر اقوام متحدہ کی قراردادوں اور کشمیری عوام کی خواہشات کے مطابق حل کرنے میں مددگار ثابت نہیں ہوگا مگر ہمارے حکمرانوں اور طبقہ اشرافیہ کو جو غلط فہمی لاحق تھی' وہ بھی دور ہو گئی ہے اور اب کنڈولیزا رائس نے کھل کر کہہ دیا ہے کہ مسئلہ کشمیر دونوں ممالک خود حل کریں' ہم تو ثالثی کا ارادہ بھی ترک کر چکے ہیں۔ امریکہ کے صاف انکار کے بعد ایک تو ہمیں مسئلہ کشمیر پر لچکدار مئوقف ترک کر کے دوبارہ قومی اور تاریخی مئوقف پر واپس آنا چاہیئے تاکہ کشمیری عوام کی مایوسی ختم ہو اور وہ اپنی جدوجہد سابقہ جوش و جذبے کیساتھ جاری رکھ سکیں۔

امریکہ کی طرف سے مسئلہ کشمیر پر ثالثی اور کشمیری عوام کی حمایت سے انکار کے بعد یہ امید تو نہیں رہی کہ وہ کسی اور معاملے میں ہمارا ساتھ دے یا اچھے دوست کی طرح کسی موقع پر کام آئے' تاہم اس نے ملک میں جمہوریت کی بحالی' فوج پر سول کنٹرول' تمام سیاسی جماعتوں کی شرکت کے ساتھ منصفانہ اور آزادانہ انتخابات اور وردی کا مسئلہ حل کرنے کے

Marfat.com

سلسلے میں اپنا دباؤ بڑھایا ہے اور ایک طرف نائب وزیر خارجہ رچرڈ باؤچر نے اسلام آباد آ کر دو بڑی سیاسی جماعتوں کے قائدین سے ملاقات کی ہے' دوسری طرف صدر بش کے قومی سلامتی امور کے مشیر سٹیفن ہیڈلے نے واضح کیا ہے کہ صدر جنرل پرویز مشرف سے مل کر آزادانہ و منصفانہ انتخابات کو جو 2007ء میں ہونے والے ہیں' یقینی بنائیں گے۔ ظاہر ہے کہ امریکہ کو پاکستان میں نہ تو جمہوریت سے دلچسپی ہے اور نہ وہ منصفانہ انتخابات کو ضروری سمجھتا ہے۔ اس نے ایوب خان' ضیاء الحق اور پرویز مشرف دور میں فراڈ ریفرنڈم اور جعلی انتخابات کے نتائج کو ہمیشہ تسلیم کیا ہے اور اب تک باوردی صدارت پر معترض نہیں۔ اب وہ صدر پرویز مشرف سے مزید کچھ منوانے کیلئے جمہوریت کا شوشا چھوڑ رہا ہے۔ تاہم یہ حکومت کی آزمائش ہے کہ وہ اس دباؤ سے نکلنے اور امریکہ کی کسی خفیہ گیم کو ناکام بنانے کیلئے کیا کرتی ہے؟

دانشمندی اور قومی مفاد کا تقاضہ یہ ہے کہ اندرونی و بیرونی دباؤ بڑھنے سے قبل ہی حکومت ایسے اقدامات کرے کہ امریکہ کے عہدیداروں کو ہیرو بننے اور جمہوریت سے وابستگی کے نام پر حکومت سے مطالبات منوانے اور اپوزیشن کی طرف سے کوئی تحریک شروع کرنے کا موقع ہی نہ ملے۔ اگر رچرڈ باؤچر کی پاکستان آمد سے قبل ہی حکومت اپوزیشن رہنماؤں کو اعتماد میں لیتی' ان کے جائزہ مطالبات از خود مان کر ملک میں مصالحت و مفاہمت کو پروان چڑھاتی اور 2007ء کے انتخابات آئین کی روشنی میں مسلمہ جمہوری اقدار و روایات کے مطابق کرانے کی یقین دہانی کرا دیتی تو کسی امریکی عہدیدار کو اسلام آباد بیٹھ کر ہمارے اندرونی معاملات میں مداخلت کی جرأت نہ ہوتی۔ تاہم اب بھی وقت ہے کہ حکومت گھریلو معاملات کو خود درست کرنے کا آغاز کرے' اپوزیشن کے مطالبات میں سرفہرست 2007ء کے آزادانہ' منصفانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات ہیں' چودھری شجاعت حسین اور ارباب رحیم کی طرف سے یہ انتخابات ایک سال ملتوی کرنے کے بیانات سے حکومت کی ساکھ متاثر ہوئی ہے' اس لئے صدر جنرل پرویز مشرف واضح انداز میں یہ انتخابات 2007ء ہی میں ایک غیر جانبدارانہ عبوری حکومت کے تحت کرانے کا اعلان کریں' تاکہ شکوک و شبہات کا خاتمہ ہو۔

الیکشن کمشن کی آزادانہ اور خود مختار حیثیت کو یقینی بنانے کیلئے بھی اپوزیشن کا اعتماد حاصل کیا جائے اور میاں نواز شریف و بینظیر بھٹو کی وطن واپسی کیلئے بھی اقدامات کئے جائیں تاکہ یہ تاثر نہ ملے کہ حکومت امریکہ کے کہنے پر تو بڑے سے بڑا فیصلہ کر لیتی ہے اور قومی احساسات و جذبات بھی پس پشت ڈال دیئے جاتے ہیں مگر اپنی قوم اور اس کی نمائندگی کرنے والی سیاسی و مذہبی جماعتوں کے جائز مطالبات کی پذیرائی میں پس و پیش سے کام لیتی ہے۔ جو کام حکومت کو بیرونی دباؤ پر بالآخر کرنا ہی پڑے گا' آخر خوش دلی سے اور اپنے قومی مفادات کی روشنی میں کرنے میں کیا مضائقہ ہے۔ صدر کی وردی بھی ایک ایسا ایشو ہے' جس کی وجہ سے انہیں خود اور ان کے ساتھیوں کو ہر فورم پر وضاحتیں کرنا پڑتی ہیں' ظاہر ہے کہ اس سے ملک و قوم کی بھی تضحیک ہوتی ہے کہ وہ اکیسویں صدی میں مسلمہ جمہوری اقدار و روایات سے کس قدر دور ہیں' اس لئے صدر اس بارے میں بھی مزید تذبذب کا مظاہرہ نہ کریں اور ان خوشامدیوں کی باتوں میں نہ آئیں جو محض اپنے سیاسی فائدے کیلئے ان کی پوزیشن خراب کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ہمیں اپنے دشمن بھارت سے سبق سیکھنا چاہئے جس کی حکمران جماعت کی سربراہ سونیا گاندھی نے معمولی مطالبہ پر پارلیمنٹ کی رکنیت سے استعفیٰ دے کر مخالفین کا منہ بند کر دیا۔ (اداریہ روزنامہ نوائے وقت 8 اپریل 2006ء)

وما علینا الا البلاغ

Marfat.com

سارک کا تاریخی پس منظر

جنوبی ایشیا کے سات ملکوں کے درمیان علاقائی سطح پر تعاون کو فروغ دینے کی خواہش کو بروئے کار لانے کیلئے 1985ء میں سارک تنظیم معرض وجود میں آئی جسے ساؤتھ ایشین ایسوسی ایشن فار ریجنل کواپریشن کا نام دیا گیا اور انگریزی کے انہی لفظوں کے پہلے حروف کو اکٹھا کر کے سارک کا نام دیا گیا۔ سارک کا تصور 1980ء میں بنگلہ دیش کے سابق صدر جنرل ضیا الرحمان مرحوم نے پیش کیا تھا۔ اس کی بنیاد رکھنے کا پہلا مرحلہ اپریل 1981ء میں اس وقت طے پایا جب پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش، بھوٹان، سری لنکا اور مالدیپ کے خارجہ سیکرٹریوں کا اجلاس کولمبو میں ہوا جس میں پاکستان کی تجویز پر اجلاس میں شریک سینئر افسروں کی ایک کمیٹی قائم کی گئی جسے یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ ممکنہ تعاون کے شعبوں کی نشاندہی کریں۔ نومبر 1981ء میں کھٹمنڈو میں ساتوں ممالک کے خارجہ سیکرٹریوں کا ایک اور اجلاس ہوا جس میں سٹڈی گروپ تشکیل دیئے گئے جنہیں مستقبل میں تعاون کے لئے جامع پروگرام تیار کرنے کے لئے کہا گیا۔ 1982ء میں خارجہ سیکرٹریوں کے اجلاس ڈھاکہ اور اسلام آباد میں ہوئے جن میں ایک مربوط پروگرام طے کیا گیا۔ مختصر اور طویل المیعاد منصوبوں کا تعین کیا گیا اور علاقائی تعاون پر رضامندی ظاہر کی گئی۔ یہ فیصلہ ہوا کہ 1983ء میں نئی دہلی میں وزرائے خارجہ کانفرنس بلائی جائے اس سلسلے میں خارجہ سیکرٹریوں کی سطح پر ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ 1983ء میں دہلی میں خارجہ سیکرٹریوں کا پانچواں اجلاس ہوا جس میں ساتوں ممالک کے وزرائے خارجہ نے کانفرنس کی تیاریوں کو حتمی شکل دی اور مشترکہ اعلامیہ کیلئے مسودہ تیار کیا گیا۔

اگست 1983ء میں نئی دہلی میں پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش، نیپال، بھوٹان، سری لنکا اور مالدیپ کے وزرائے خارجہ کی پہلی کانفرنس ہوئی جس کا افتتاح بھارت کی آنجہانی وزیراعظم اندرا گاندھی نے کیا تھا۔ وزرائے خارجہ کی اس کانفرنس میں سارک تنظیم کی بنیاد رکھی گئی اور تنظیم کی بنیادی دستاویزات پر دستخط کئے گئے۔

اساسی دستاویز میں کہا گیا:

- ☆ سارک کے رکن ممالک کا سال میں کم از کم ایک اجلاس ہوا کرے گا۔
- ☆ متعلقہ ممالک کے سربراہوں کو تجویز پیش کی جائے گی کہ وہ اپنی سطح پر مناسب وقت پر اجلاس منعقد کریں۔
- ☆ خارجہ سیکرٹریوں کے اجلاسوں میں طے پانے والے مربوط پروگرام پر عملدرآمد شروع کیا جائے۔

دوسری دستاویز سارک ڈیکلریشن کے نام سے منظور کی گئی جس میں سارک کے مقاصد، تنظیمی ڈھانچے اور مالی انتظامات سے متعلق امور کی وضاحت کی گئی تھی۔

Marfat.com

سارک وزرائے خارجہ کی مئی 1985ء میں بھوٹان میں ہونے والی کانفرنس میں 1981ء سے 1985ء تک ہونے والی پیش رفت کا جائزہ لیا گیا اور یہ طے کیا گیا کہ پہلی سارک سربراہ کانفرنس 7 اور 8 دسمبر کو ڈھاکہ میں منعقد ہوگی اور اس سے قبل وزرائے خارجہ کے اجلاس میں سربراہ کانفرنس کے ایجنڈے کی تیاری، تنظیم کے صدر دفاتر کے قیام اور تنظیم کیلئے فنڈز کی فراہمی کے معاملات طے کئے جائیں گے بعد ازاں سارک کیلئے ایک مستقل سیکرٹریٹ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس تنظیم کے اغراض و مقاصد مندرجہ ذیل ہیں:

☆ سارک ممالک کے درمیان مختلف شعبوں میں تعاون اور اشتراک
☆ علاقائی ترقی کیلئے وسائل کو یکجا کرنا۔
☆ تنازعات طے کرنے کیلئے فورم اور تلخیوں کو کم سے کم کرنے کی تلاش کے طریقے
☆ ماحولیاتی مسائل میں تعاون اور اشتراک۔
☆ رکن ممالک کے مابین دوستانہ تعلقات استوار کرنا۔
☆ امن و سلامتی کے قیام اور فروغ کیلئے موثر اجتماعی تدابیر اختیار کرنا۔
☆ سارک کے رکن ممالک کی معاشی پسماندگی دور کرنا اور ان کے معیار زندگی کو بہتر بنانا۔

دی ساؤتھ ایشین ایسوسی ایشن فار ریجنل کوآپریشن:

''دی ساؤتھ ایشین ایسوسی ایشن فار ریجنل کوآپریشن'' کا قیام 8 دسمبر 1985ء کو بنگلہ دیش کے دارالحکومت ڈھاکہ میں عمل میں آیا۔ پاکستان، بھارت، سری لنکا، مالدیپ، بھوٹان، نیپال اور میزبان ملک بنگلہ دیش کے سربراہان حکومت و مملکت نے متفقہ طور پر ''سارک'' کے منشور کی منظوری دی۔ تنظیم کے تاسیسی اجلاس میں پاکستان کے صدر محمد ضیا الحق، بھارتی وزیراعظم راجیو گاندھی، بنگلہ دیش کے صدر حسین محمد ارشاد، بھوٹان کے شاہ جگمے سنگیئے وانگ چوک، مالدیپ کے صدر مامون عبدالقیوم، نیپال کے بادشاہ بریندرا بیر بکرم شاہ دیو اور سری لنکا کے صدر جونیئس رچرڈ جے وردنے، نے شرکت کی۔ اس تنظیم کے قیام کا مقصد جنوبی ایشیا کے عوام کو ایک ایسا پلیٹ فارم مہیا کرنا ہے جہاں وہ دوستی اعتماد اور مفاہمت کی فضا میں باہمی فلاح و بہبود کیلئے کام کر سکیں اور تمام رکن ممالک کی معاشی و سماجی ترقی کی رفتار تیز کی جا سکے۔

پہلی سارک سربراہ کانفرنس	ڈھاکہ (بنگلہ دیش)	دسمبر 1985ء
دوسری سارک سربراہ کانفرنس	بنگلور (بھارت)	نومبر 1986ء
تیسری سارک سربراہ کانفرنس	کھٹمنڈو (نیپال)	نومبر 1987ء
چوتھی سارک سربراہ کانفرنس	اسلام آباد (پاکستان)	دسمبر 1988ء
پانچویں سارک سربراہ کانفرنس	مالے (مالدیپ)	نومبر 1990ء
چھٹی سارک سربراہ کانفرنس	کولمبو (سری لنکا)	دسمبر 1991ء
ساتویں سارک سربراہ کانفرنس	ڈھاکہ (بنگلہ دیش)	اپریل 1993ء
آٹھویں سارک سربراہ کانفرنس	نئی دہلی (بھارت)	مئی 1995ء

Marfat.com

نویں سارک سربراہ کانفرنس	مالے(مالدیپ)	مئی1997ء
دسویں سارک سربراہ کانفرنس	کولمبو(سری لنکا)	جولائی1998ء
گیارہویں سارک سربراہ کانفرنس	کھٹمنڈو(نیپال)	جنوری2002ء
بارہویں سارک سربراہ کانفرنس	اسلام آباد(پاکستان)	جنوری2004ء
تیرہویں سارک سربراہ کانفرنس	ڈھاکہ(بنگلہ دیش)	جنوری2005ء

سارک ممالک ایک نظر میں:

پاکستان:

یوم آزادی: 14اگست1947ء

رقبہ: 803940مربع کلومیٹر

آبادی: 14,155,3775

سرکاری زبان: اُردو

مذہب: اسلام

مذہبی تشخص: 97فیصد مسلم،3فیصد غیر مسلم

معیشت: زراعت

شرح خواندگی 37.8فیصد

بھارت:

یوم آزادی: 15اگست1947ء

رقبہ: 3287590مربع کلومیٹر

آبادی: 1,01,4003817

سرکاری زبان: ہندی

مذہب: ہندو80فیصد،مسلمان14فیصد،عیسائی سکھ اور دیگر6فیصد

معیشت: زراعت،صنعت

شرح خواندگی: 52فیصد

بنگلہ دیش:

یوم آزادی: 16دسمبر1971ء

Marfat.com

رقبہ: 1,44,000 مربع کلومیٹر

آبادی: 12.315 کروڑ، 2001ء کی مردم شماری کے مطابق

سرکاری زبان: بنگلہ، انگریزی

مذہب: اسلام، مسلمان 88 فیصد، ہندو 10 فیصد دیگر 1.2 فیصد

معیشت: 60 فیصد لوگ، زراعت سے وابستہ ہیں

شرح خواندگی: 38.1 فیصد

سری لنکا:

یوم آزادی: 4 فروری 1948ء

رقبہ: 65610 مربع کلومیٹر

آبادی: 19,238575 نفوس

سرکاری زبان: سنہالی، تامل

مذہب: بدھسٹ ...... 69.3 فیصد، ہندو ...... 15.5 فیصد،
عیسائی ...... 7.6 فیصد، مسلمان ...... 7.5،

معیشت: ایکسپورٹ

شرح خواندگی: 90.2 فیصد

مالدیپ:

یوم آزادی: 26 جولائی 1965ء

رقبہ: 300 مربع کلومیٹر

آبادی: 301475 نفوس

سرکاری زبان: DHIVEHI

مذہب: اسلامی سنی ریاست

معیشت: سیاحت، ماہی گیری

شرح خواندگی: 93.3 فیصد

نیپال:

رقبہ: 140800 مربع کلومیٹر

Marfat.com

آبادی:	24,702,119
سرکاری زبان:	نیپالی
مذہب:	ہندو 85 فیصد، بدھ مت کے ماننے والے 7.8 فیصد، دیگر 7.2 فیصد
معیشت:	80 فیصد لوگ زراعت سے وابستہ ہیں
شرح خواندگی:	27.5 فیصد

بھوٹان:

یوم آزادی:	8 اگست 1948ء
رقبہ:	47000 مربع کلومیٹر
آبادی:	638,000
سرکاری زبان:	DZONGKHA
مذہب:	لامائی...... 75 فیصد، نیپالی، ہندو اور دیگر 25 فیصد
معیشت:	80 فیصد افراد زراعت سے وابستہ ہیں
شرح خواندگی:	42.2 فیصد

سارک کی کہانی

پہلی سارک کانفرنس:

جنوبی ایشیا کے سات ملکوں کے درمیان علاقائی سطح پر تعاون کی تنظیم سارک کی پہلی تاریخی سربراہ کانفرنس 7 اور 8 دسمبر 1985ء کو بنگلہ دیش کے دارالحکومت ڈھاکہ میں ہوئی۔ بنگلہ دیش کے صدر حسین محمد ارشاد کو سارک کا پہلا چیئرمین مقرر کیا گیا۔ اجلاس میں پاکستان کے صدر جنرل ضیاء الحق، بھارت کے وزیراعظم راجیو گاندھی، سری لنکا کے صدر مامون عبدالقیوم، نیپال کے شاہ بریندرا بیر بکرم اور بھوٹان کے شاہ جگمے سگمینے وانگ چک نے شرکت کی۔ سارک رکن ممالک کے سربراہوں کا پہلا اجلاس بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ اس پر جہاں جنوبی ایشیاء کے ایک ارب سے زیادہ باشندوں کی نظریں اپنے روشن مستقبل کے لئے ڈھاکہ پر لگی ہوئی تھیں وہاں بعض خدشوں اور اندیشوں کا اظہار بھی کیا گیا تھا۔ اس اجلاس میں سارک کے منشور اور نشان کی منظوری دی گئی (سارک کے نشان کو نیپال نے تیار کیا ہے) اور فیصلہ کیا گیا کہ دوسری سارک سربراہ کانفرنس 1986ء میں بھارت اور تیسری کانفرنس بھوٹان میں ہوگی۔ نیز سارک سربراہ کانفرنس سال میں کم از کم ایک

Marfat.com

بارضرور ہونی چاہے اور سارک کے وزرائے خارجہ کو سال میں کم از کم دو بار ضرور ملاقات کرنی چاہے۔ پہلی سارک سربراہ کانفرنس میں پاکستان کے صدر جنرل ضیاء الحق اور بھارتی وزیراعظم راجیو گاندھی کو بڑی اہمیت دی گئی۔ اس کانفرنس میں شریک تمام راہنماؤں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ وہ صرف امن و اسلامتی کے ماحول ہی میں اپنے انفرادی اجتماعی مقاصد مئوثر طور پر حاصل کر سکتے ہیں اور اپنے عوام کا معیار زندگی بہتر بنا سکتے ہیں۔ مشترکہ اعلامیہ میں ہتھیاروں کی غیر معمولی دوڑ خاص طور پر اس کے ایٹمی پہلو، بین الاقوامی سیاسی صورت حال اور عالمی اقتصادی بحران پر گہری تشویش کا اظہار کیا گیا۔ ساتوں ممالک کے سربراہوں نے ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملکوں کے درمیان ناانصافی اور عدم توازن دور کرنے کے لئے مالیات اور سرمائے کی اہمیت، علاقے میں غربت، اقتصادی پسماندگی، کم پیدوار، بیروزگاری اور آبادی کے بڑھتے ہوئے دباؤ سے نمٹنے کیلئے مئوثر علاقائی تعاون کی ضرورت پر زور دیا اور یہ رائے ظاہر کی کہ باہمی تعاون کے ذریعے ہی وہ اپنے اپنے ملکوں میں اقتصادی ترقی کی رفتار تیز کر سکتے ہیں۔ ان لیڈروں نے باہمی دوستی، اعتماد اور مفاہمت کے ذریعے اپنے مشترکہ مسائل حل کرنے کے عزم کا اظہار کیا اور ایٹمی ممالک سے مطالبہ کیا کہ وہ ایٹمی ہتھیاروں پر پابندی کے سمجھوتے کیلئے فوری بات چیت کریں تا کہ اس کے نتیجہ میں ایٹمی ہتھیاروں کے تجربات، تیاری اور ان کی تنصیب پر مکمل پابندی عائد کی جا سکے۔ صدر جنرل ضیاء الحق نے مشترکہ اعلامیہ کو "اعلان ڈھاکہ" کا نام دینے کی تجویز پیش کی، جسے فوری طور پر منظور کر لیا گیا۔ صدر ضیاء الحق نے اعلان ڈھاکہ کو تاریخی دستاویز قرار دیتے ہوئے کہا کہ ایشیائی ممالک کے لیڈروں نے اس عہد کی تجدید کی ہے کہ وہ ایک دوسرے کی آزادی، خودمختاری کا احترام کریں گے اور تنازعات کے پرامن تصفیے اور ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں عدم مداخلت اور ایک دوسرے کی علاقائی یکجہتی اور سیاسی آزادی کے خلاف طاقت یا طاقت کے استعمال کی دھمکی سے گریز کرنے کے اصول پر کاربند رہیں گے۔ انہوں نے کہا کہ مئوثر علاقائی تعاون کے ذریعے تمام رکن ممالک اپنے عوام کی اقتصادی ترقی اور انفرادی اور اجتماعی خود انحصاری کے مقاصد حاصل کر سکیں گے۔

دوسری سارک کانفرنس:

سارک رکن ممالک کے سربراہان کا دوسرا اجلاس 16 نومبر 1986ء کو بھارت کے شہر بنگلور میں منعقد ہوا۔ جس میں ایک دوسرے کی سلمیت، قیام امن، سیاسی آزادی، قوت کا عدم استعمال، ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں عدم مداخلت اور جھگڑوں کے پرامن حل کے سلسلے میں اقوام متحدہ کے اصولوں پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ تمام ممبر ممالک پر زور دیا گیا کہ باہمی مسائل کو حل کرنے کی سلسلے میں مل کر کوششیں کریں اور ایک ملک میں ہونے والی ترقی سے دوسرے ممالک کو بھی مستفید ہونے کا موقع دیا جائے۔ ممبر ممالک نے اس سلسلے میں فیصلہ کیا کہ وہ باہمی ترقی کیلئے ایک دوسرے کو معلومات فراہم کریں گے۔ لوگوں میں باہمی تعاون بڑھانے کے لئے فیصلہ کیا گیا کہ دانشوروں، فنکاروں، ادیبوں اور تاجروں کو تمام ممالک کا دورہ کرنے کی اجازت دی جائے اور اس سلسلے میں عائد پابندیوں کو نرم کیا جائے۔ ایک سال کے دوران سارک کے پروگراموں کا جائزہ لیا گیا اور اس سلسلے میں اطمینان کا اظہار کیا گیا۔ عورتوں کے متعلق کمیٹی کے قیام کا فیصلہ کیا گیا، جو ان کی ناخواندگی، موت اور سارک میں ان کے کردار پر غور کرے گی۔ منشیات کی سمگلنگ اور اس کے استعمال کی روک تھام کیلئے ٹیکنیکل کمیٹیوں کے قیام کو ایک مثبت قدم قرار دیا گیا۔

Marfat.com

سارک کے لئے ایک مستقل سیکرٹریٹ کے قیام کے فیصلے کی تصدیق کی گئی اور اس سلسلے میں نیپال کے دارالحکومت کھٹمنڈو کو منتخب کیا گیا۔ بنگلہ دیش کے ابوالحسن کو اس کا پہلا سیکرٹری چنا گیا۔ اعلان میں کہا گیا تھا کہ ملکی ترقی کے لئے بچوں کی اچھی پرورش انتہائی ضروری ہے اور ان کی تمام بنیادی ضرورتوں کو پورا کیا جانا چاہے۔ اس سلسلے میں فیصلہ کیا گیا کہ تمام ترقیاتی منصوبوں میں بچوں کو اہمیت دی جائے اور ایسے اقدامات کئے جائیں کہ 2000ء تک کوئی بچہ سہولتوں سے محروم یا اپنے خاندان کی غربت کی وجہ سے موت کے منہ میں نہ جانے پائے۔ سٹینڈنگ کمیٹی کو ہدایت کی گئی کہ وہ بچوں کے مسئلے پر ہر سال رپورٹ پیش کرے۔ دہشت گردی کی مذمت کی گئی اور عملی اقدامات کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اقوام متحدہ کے اصولوں پر کاربند رہنے کا عزم اور غیر جانبدار ملکوں کی تحریک کے فیصلوں کی حمایت کی گئی۔ معاشی حالات کی ابتری اور تجارت مین ترقی یافتہ ممالک کے کردار پر بحث کی گئی اور فیصلہ کیا گیا کہ تمام ایسی معاشی تنظیموں سے رابطہ قائم کیا جائے، جو معاشی ترقی کی رفتار بڑھانے میں معاون ثابت ہوں۔ منشیات کے کنٹرول کے سلسلے میں ایک کمیٹی کا قیام عمل میں آیا، جس کا پہلا چیئر مین پاکستان کو نامزد کیا گیا۔ منشیات کی سمگلنگ کو روکنے کے لئے اقدامات کا جائزہ لیا گیا۔ سارک ممالک کے مابین براڈ کاسٹنگ، وظائف، سیاحت، سارک چیئر کے قیام کے علاوہ جنگلات کے فروغ کیلئے کام کرے گی۔ اعلان میں سربراہی کانفرنس کو باہمی تعاون بڑھانے کیلئے انتہائی مفید قرار دیا۔

تیسری سارک کانفرنس:

سارک کا تیسرا سربراہی اجلاس 2 سے 4 نومبر 1987ء تک نیپال کے دارالحکومت کھٹمنڈو میں ہوا جس میں پاکستان کے وزیراعظم محمد خان جونیجو، بھارت کے وزیراعظم راجیو گاندھی، سری لنکا کے صدر جے وردھنے، نیپال کے شاہ بریندرا، بنگلہ دیش کے صدر حسین محمد ارشاد، مالدیپ کے صدر مامون عبدالقیوم اور بھوٹان کے بادشاہ شاہ جگمے سنگیمے نے شرکت کی۔ کھٹمنڈو کانفرنس میں پاکستان کے وزیراعظم محمد خان جونیجو نے ایٹمی تجربات پر پابندی کا علاقائی معاہدہ کرنے کی تجویز پیش کرتے ہوئے کہا کہ سارک ممالک کو امن وامان کے استحکام کی خاطر تعمیری اقدامات بروئے کار لانے میں ہچکچاہٹ سے کام نہیں لینا چاہیے۔

کھٹمنڈو میں پاک بھارت وزرائے اعظم کی ملاقات میں دونوں ملکوں کے درمیان مذاکرات کا عمل تیز کرنے کا فیصلہ ہوا اور یہ طے پایا کہ دونوں ملکوں کے وزرائے خارجہ نئی دہلی میں 28 دسمبر 1987ء کو مذاکرات کریں گے۔ مشترکہ وزارتی کمیشن کا اجلاس آئندہ برس 1988ء کو اسلام آباد میں ہوگا جس میں سیاچن گلیشیر کے مسئلہ پر غور ہوگا۔ پاکستان کی جانب سے یہ پیشکش بھی کی گئی کہ وہ ایٹمی پروگرام کے بارے میں دوطرفہ مذاکرات کیلئے تیار ہے۔

تیسری سارک کانفرنس کے اختتام پر جاری ہونے والے مشترکہ اعلامیہ کو ''اعلان کھٹمنڈو'' کا نام دیا گیا جس میں سارک کے قیام کو علاقائی تعاون اور امن واعتماد کے سلسلے میں ایک نئے دور کا آغاز قرار دیا گیا اور سارک کے چارٹر کے تحت تعاون بڑھانے، اقوام متحدہ اور غیر جانبدار تحریک کے اصولوں پر کاربند رہنے کے عزم کا اعادہ کیا گیا۔ اس امر کو دہرایا گیا کہ سارک کے ممالک صرف باہمی تعاون کے ذریعے ہی بھوک، بیماری، ناخواندگی، بیروزگاری اور ماحولیاتی آلودگی جیسے مسائل پر قابو پاسکتے ہیں۔

Marfat.com

چوتھی سارک کانفرنس:

چوتھی سارک سربراہ کانفرنس پاکستان کے وفاقی دارالحکومت اسلام آباد میں 31 دسمبر 1988ء کو ہوئی جس میں ساتوں ممالک کے تین صدور، دو وزرائے اعظم اور دو بادشاہوں نے شرکت کی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ سارک سربراہ کانفرنس کی میزبانی کے فرائض پاکستان نے انجام دیئے۔ پاکستان کی سابق وزیراعظم بینظیر بھٹو کو سارک کا چیئرمین منتخب کیا گیا۔ دیگر شرکا میں بھارت کے وزیراعظم راجیو گاندھی، بنگلہ دیش کے صدر حسین محمد ارشاد، مالدیپ کے صدر مامون عبدالقیوم، نیپال کے شاہ بریندرا بیر بکرم شاہ اور بھوٹان کے شاہ جگمے سنگھے وانگ چک شامل تھے۔

اس کانفرنس کی خاص بات یہ تھی کہ مالدیپ، سری لنکا، اور نیپال کے سربراہان نے پاکستان کے سابق صدر جنرل ضیاء الحق کو سارک کے بانی کی حیثیت سے خراج تحسین پیش کیا۔ راجیو گاندھی کی آمد پر پاکستان اور آزاد کشمیر میں احتجاجی مظاہرے ہوئے۔ بینظیر بھٹو، راجیو گاندھی مذاکرات میں کئی امور پر اتفاق رائے ہوا۔

- ☆ سیاچن گلیشیئر سے دونوں ملکوں کی فوجیں واپس بلائی جائیں گی۔
- ☆ وولر بیراج پر بات چیت میں پیش رفت ہوئی۔
- ☆ اقتصادی تعاون، موسیمات اور قدرتی آفات کے مواقع پر تعاون کے سمجھوتے طے پائے۔
- ☆ مسئلہ کشمیر شملہ سمجھوتے کے تحت حل کیا جائے گا۔
- ☆ ایٹمی تنصیبات پر حملہ نہ کرنے اور دفاعی اخراجات کم کرنے کی تجاویز زیر غور آئیں۔

مشترکہ اعلانیہ میں سارک کے مربوط لائحہ عمل پر عملدرآمد کی رفتار پر اطمینان کا اظہار کیا گیا اور جاری سرگرمیوں میں قریبی تعاون کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ سارک سرگرمیوں کو نئی سمت دینے کے لئے متعدد اقدامات کی منظوری دی گئی تا کہ اس خطے کے لوگوں کا معیار زندگی بہتر بنایا جا سکے۔ سربراہان مملکت نے سارک آڈیو ویژول ایکسچینج پروگرام SAVE کو سراہا۔ اس میں سماجی اقتصادی اور تکنیکی موضوعات پر زیادہ زور دینے کی تجویز پیش کی۔ یہ بھی فیصلہ ہوا کہ تعلیم کو ان شعبوں میں شامل کیا جائے جن پر تمام رکن ممالک میں مکمل اتفاق اور ہم آہنگی پائی جاتی ہو۔ انسداد دہشت گردی کے بارے میں سارک کنونشن کی توثیق کی گئی۔ مشترکہ اعلامیہ میں منشیات کی سمگلنگ میں روز افزوں اضافے اور اس کے نوجوانوں پر سنگین اثرات پر گہری تشویش کا اظہار کیا گیا اور اس امر پر اتفاق پایا گیا کہ رکن ممالک منشیات کی سمگلنگ اور نوجوانوں میں اس کے بڑھتے ہوئے رجحان کو روکنے کے لئے اپنے اپنے ملکوں میں ٹھوس اقدامات کریں گے۔ کانفرنس میں بچوں کی حالت زار کا بھی جائزہ لیا گیا اور اس عزم کا اعادہ کیا گیا کہ قومی ترقیاتی منصوبوں میں بچوں کی ضروریات کو اولین ترجیح دیں گے اور ان کی فلاح و بہبود بالخصوص خواندگی اور صحت کے پروگراموں پر خصوصی توجہ دیں گے۔ رکن ممالک پر زور دیا گیا کہ اقوام متحدہ کے منشور کے مقاصد حاصل کرنے کیلئے اقوام متحدہ کو بطور ادارہ مضبوط بنائیں اور غیر جانبدار تحریک کے اصولوں پر کاربند رہیں۔ اعلامیہ میں درمیانے درجے کے جوہری ہتھیاروں پر سوویت یونین اور امریکہ میں طے پانے والے سمجھوتے کا خیر مقدم کیا گیا۔

Marfat.com

پانچویں سارک کانفرنس:

شیڈول کے مطابق 1989ء میں سارک کانفرنس منعقد نہ ہو سکی۔ پانچویں سارک کانفرنس مالدیپ کے دارالحکومت مالے میں 22 اور 23 نومبر 1990ء کو ہوئی۔ مالدیپ کے صدر مامون عبدالقیوم سربراہ اجلاس کے چیئرمین منتخب ہوئے۔ پاکستان کے سابق وزیراعظم میاں نواز شریف، بھارت کے وزیراعظم چندر شیکھر، بنگلہ دیش کے صدر حسین محمد ارشاد، نیپال کے وزیراعظم کرشنا پرشاد بھٹارائے، سری لنکا کے وزیراعظم وجے ٹنگے اور بھوٹان کے بادشاہ وان چک نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں پاکستان کے وزیراعظم نواز شریف کا کسی بین الاقوامی اجلاس میں پہلا خطاب تھا۔ سارک سربراہ اجلاس کی افتتاحی تقریب ایک گھنٹہ کی تاخیر سے شروع ہوئی۔ کانفرنس کے آغاز پر تجویز پیش کی گئی کہ اجلاس میں رکن ممالک کے درمیان سیاسی اور باہمی تنازعات پر بحث کی جائے۔ بھارت نے اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ اسکانفرنس میں پاکستان نے واضح کیا کہ منصفانہ تصفیے کے بغیر جنوبی ایشیاء میں تعاون فروغ نہیں پاسکتا۔ اس سلسلے میں ایٹمی ہتھیاروں پر مکمل پابندی کا علاقائی سمجھوتہ ایک اہم قدم ہے اس کانفرنس میں اس بات پر زور دیا گیا کہ تیسری دنیا کے ممالک افلاس اور بدحالی دور کرنے کیلئے باہمی تنازعات اور اختلافات کو نظر انداز کر کے اپنے عوام کی خوشحالی' ترقی اور اقتصادی حالت بہتر بنانے کیلئے اقدامات کئے جائیں۔ سارک کو فعال بنانے' ایک دوسرے کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کیلئے ٹھوس طریقہ کار اختیار کیا جائے۔ دوسری ممالک کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ کی جائے۔ ایک علاقائی فنڈ قائم ہونا چاہیے جس سے بوقت ضرورت علاقے کے ملک اپنی بعض ضروریات پوری کر سکیں۔ چھوٹے ملکوں کا احساس کمتری ختم ہونا چاہیے۔ دنیا میں رونما ہونے والی تبدیلیوں۔ باعث رکن ممالک کو مخلصانہ سوچ کے ساتھ مل بیٹھ کر اپنے مسائل کے حل کے لئے عملی اقدامات کرنے چاہئیں۔ کانفرنس کے موقع پر پاک بھارت وزرائے اعظم نواز شریف اور چندر شیکھر کی 30 منٹ تک علیحدگی میں ملاقات ہوئی جس میں مسئلہ کشمیر سمیت تمام امور پر تبادلہ خیال ہوا اور متنازع امور مذاکرات کے ذریعے طے کرنے پر اتفاق ہوا اور خارجہ سیکرٹریوں کا اجلاس (18 سے 20 دسمبر 1990) کو اسلام آباد میں ہونا طے پایا تھا۔

پانچویں سارک سربراہ کانفرنس کے اختتام پر 18 نکاتی مشترکہ اعلامیہ جاری ہوا جسے ''اعلان مالے'' کا نام دیا گیا۔ اعلامیہ میں ساتوں ممالک کے سربراہوں نے علاقے کے لوگوں کا معیار زندگی بلند کرنے کے لئے رکن ممالک میں تعاون پر زور دیا دیگر اہم نکات مندرجہ ذیل تھے۔

- ☆ عراقی حملہ سے متاثرہ ممالک کو بین الاقوامی امداد دی جائے۔
- ☆ سارک ممالک انفرادی اور اجتماعی خود انحصاری کی کوشش کریں۔
- ☆ علاقے میں امن و استحکام کے لئے اصولوں کی پابندی کی جائے۔
- ☆ سیاحت کے فروغ کے لئے وزارتی کونسل کے فیصلے کی توثیق کی گئی۔
- ☆ سارک ممالک سے باہر کے سیاحوں کو ان علاقوں میں سیاحت کیلئے متوجہ کرنے کیلئے سیاحت کی صنعت میں مربوط تعاون کی تجویز کا خیر مقدم کیا گیا۔
- ☆ ذرائع ابلاغ کے شعبوں میں تعاون پر زور دیا گیا۔

Marfat.com

☆ منشیات کی لعنت میں بین الاقوامی اسلحہ کی تجارت اور دہشت گردی کی سرگرمیوں پر قابو پانے کے لئے تعاون پر اظہار اطمینان کیا گیا۔

چھٹی سارک کانفرنس:

چھٹی سارک سربراہ کانفرنس سری لنکا کے دارالحکوت کولمبو کے بندرا نائیکے میموریل انٹرنیشنل کانفرنس ہال میں 21 دسمبر 1991ء کو ہوئی۔ سارک کے نئے چیئرمین صدر پریما داسا نے صدارت کی۔ دیگر شرکاء میں پاکستان کے سابق وزیراعظم نواز شریف، بھارتی وزیراعظم پی وی نرسمہا راؤ' بنگلہ دیش کی وزیراعظم خالدہ ضیاء' مالدیپ کے صدر مامون عبدالقیوم' بھوٹان کے شاہ جگمے سنگھے وانگ چک شامل ہیں۔ سربراہ کانفرنس سے قبل نواز شریف اور نرسمہا راؤ کے درمیان ملاقات طے تھی لیکن اجلاس کی طوالت کے باعث یہ مذاکرات کانفرنس کے اختتام پر ون ٹو ون بنیاد پر ہوئے جس میں کشمیر سمیت دوسرے تنازعات زیر غور آئے۔ اس کانفرنس کے اختتام پر جاری ہنے والے مشترکہ اعلامیہ میں چھوٹے ملکوں کی سلامتی کو درپیش خطرات کے ازالہ پر زور دیا گیا نیز انسانی حقوق کے مسئلے کو محدود اور سیاسی نکتہ نظر سے نہیں دیکھنا چاہیے اور اس ضمن میں رکن ممالک اپنے اپنے ملکوں میں انسانی حقوق کی مکمل ضمانتیں فراہم کریں۔

☆ خود انحصاری کیلئے رکن ممالک کے درمیان تعاون کو فروغ دیا جائے۔

☆ خطے میں غربت، بھوک، افلاس ناخواندگی اور بیماریوں کے خاتمے کیلئے مشترکہ کوششیں کی جائیں۔

☆ رکن ممالک میں باہمی تجارت کو فروغ دینے کیلئے اقدامات کئے جائیں۔ بے گھر لوگوں کو گھر فراہم کرنے کیلئے کوششیں تیز کی جائیں۔

مشترکہ اعلامیہ میں اس بات پر زور دیا گیا کہ رکن ممالک خطے میں دہشت گردی اور منشیات کے خاتمے کیلئے سارک کنونشن میں سفارشات پر مکمل عملدرآمد کیا جائے۔ کانفرنس میں رکن ممالک کی ترقی کیلئے مشترکہ فنڈ زقائم کرنے کے فیصلے کو سراہا گیا اور یہ فیصلہ بھی ہوا کہ اگلی کانفرنس 1992ء میں بنگلہ دیش میں ہوگی۔ اس کانفرنس میں پاکستان کے وزیراعظم نے اپنے خطاب میں بطور خاص اس بات پر زور دیا کہ جنوبی ایشیا میں پائیدار امن کے لئے اقوام متحدہ کے اصولوں اور بین الاقوامی سطح پر کئے جانے والے اصولوں کی پاسداری کی جانی چاہیے۔ پاکستان ایٹمی اور بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کے خاتمہ کیلئے کی جانے والی کسی بھی کوشش کی حمایت کرے گا۔ اس کے لئے بین الاقوامی، علاقائی اور دو طرفہ بنیادوں پر معاہدہ کیلئے تیار ہیں بشرطیکہ اس معاملے میں پاکستان کے ساتھ امتیاز نہ برتا جائے۔

ساتویں سارک کانفرنس:

ساتویں سارک سربراہ کرنفرنس 10 اور 11 اپریل 1993ء کو بنگلہ دیش کے دارالحکومت ڈھاکہ میں منعقد ہوئی جس میں بنگلہ دیش کی وزیراعظم بیگم خالدہ ضیاء، بھوٹان کے بادشاہ جگمے سنگمینے وانگ چک، بھارت کے وزیراعظم پی وی نرسمہا راؤ، مالدیپ کے صدر مامون عبدالقیوم، نیپال کے وزیراعظم گریجا پرشاد کوئرالہ پاکستان کے سابق وزیراعظم نواز شریف، سری لنکا کے صدر رانا سنگھے پریما داسا نے شرکت کی۔

11 اپریل کو جاری ہونے والے مشترکہ اعلامیہ میں کہا گیا کہ جنوبی ایشیاء میں غربت کے خاتمہ کو اولین ترجیح

Marfat.com

دیتے ہوئے کم از کم ممکن وقت میں یہ مقصد حاصل کرنے کیلئے اپنی کوششیں جاری رکھیں گے۔ سربراہان مملکت وحکومت نے دہشت گردی کی ہر طرح کی کارروائیوں کی مذمت اور دہشت گردی کے برے اثرات پر افسوس کا اظہار کیا۔

آٹھویں سارک کانفرنس:

آٹھویں سارک سربراہ کانفرنس کا 2 مئی 1995ء کو بھارت کے دارالحکومت نئی دہلی میں آغاز اور 4 مئی 1995ء کو اعلان دہلی کے ساتھ اختتام ہوا۔ اس کانفرنس میں پاکستان کے سابق صدر فاروق لغاری بھارتی وزیراعظم نرسمہاراؤ کے علاوہ نیپال، بنگلہ دیش سری لنکا، بھوٹان اور مالدیپ کے سربراہان حکامت ومملکت نے شرکت کی۔ اس موقع پر پاکستان کے صدر فاروق احمد خان لغاری اور سابق وزیراعظم نرسمہاراؤ کے درمیان 45 منٹ تک تفصیلی ملاقات ہوئی جس میں دونوں ملک کشمیر سمیت دیگر دیرینہ حل طلب تنازعات حل کرنے کیلئے مذکرات دوبارہ شروع کرنے پر متفق ہو گئے۔ حریت کانفرنس کے وفد نے بھی صدر لغاری سے ملاقات کی تھی۔ اس کانفرنس کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کشمیر یا دیگر دوطرفہ مائل کا نام لئے بغیر کہا تھا کہ ''بین الاقوامی قانون اور انصاف پسندی کی بنیادوں پر ہمیں آگے بڑھ کر سارک کے پلیٹ فارم کو سیاسی اختلافات کم کرنے کیلئے استعمال کرنا چاہیے۔ تنازعات سے چشم پوشی مشکلات کا حل نہیں۔ حق خودارادیت، آزادی جمہوریت، انسانی حقوق کے احترام کی تحریکوں کو طاقت سے دبایا نہیں جا سکتا۔ انہوں نے سرد جنگ کے خاتمے کے بعد پیدا ہونے والے نئے عالمی نظام کے تصور پر بھی بصیرت افروز باتیں کیں کہ نیاورلڈ آرڈر ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ کمزوری جرم اور طاقت لائسنس ہو۔

سارک ممالک جنوبی ایشیاء کو آزاد تجارتی علاقہ بنانے اور علاقے کی اقتصادی اور تکنیکی ترقی کیلئے جنوبی ایشیائی ترقیاتی فنڈ کے قیام پر اصولی طور پر متفق ہو گئے۔ مشترکہ اعلامیہ میں کہا گیا:

☆ ترقی یافتہ ممالک تجارتی پابندیاں نہ لگائیں۔
☆ ایٹمی ہتھیاروں پر پابندی ساری دنیا میں بلاامتیاز لگائی جائے۔
☆ سارک کے ممالک اقتصادی اور دوسرے شعبوں میں قریبی تعاون کریں۔
☆ غربت کے خاتمے کیلئے جامع حکمت عملی بنائی جائے۔
☆ 1996ء کو خواندگی کے سال کے طور پر منانے کا فیصلہ ہوا۔
☆ تمام سارک ممالک پر زور دیا گیا کہ وہ سمگلنگ اور منشیات کی روک تھام کیلئے باہمی تعاون کو زیادہ موثر بنائیں۔

نویں سارک کانفرنس:

نویں سارک سربراہ کانفرنس مالدیپ کے دارالحکومت مالے میں 12 مئی 1997ء سے 14 مئی 1997ء تک ہوئی جس میں پاکستان کے سابق وزیراعظم نواز شریف، بھارت کے وزیراعظم آئی کے گجرال، نیپال کے وزیراعظم لوکیندرا بہادر چند، سری لنکا کی صدر مسز چندریکا بندرانائیکے کمارا تنگا، بنگلہ دیش کی وزیراعظم حسینہ واجد، بھوٹان کے بادشاہ جگمے سنگمیے وانگ چک نے شرکت کی۔ مالدیپ کے صدر مامون عبدالقیوم کو سارک کا نیا چیئرمین منتخب کیا گیا۔ اس موقع پر مالے کے ایک خوبصورت جزیرے میں پاکستان اور بھارت کے وزرائے اعظم کے درمیان ملاقات ہوئی جس میں ویزا

Marfat.com

پابندیاں نرم کرنے اور قیدیوں کے تبادلے پر اتفاق ہوا۔ پاک بھارت مذکرات، کشمیر سمیت تمام تصفیہ طلب مسائل پر جامع طریق کار طے کرنے کیلئے مشترکہ گروپ قائم کرنے اور دونوں ملکوں کے وزرائے اعظم کے درمیان مستقل ہاٹ لائن رابطہ قائم کرنے کا فیصلہ ہوا۔

یہ کانفرنس بلند بانگ توقعات اور خوش آئند امیدوں کے پس منظر میں ہوئی اور اس کے مشترکہ اعلامیہ میں سارک ممالک نے تجارت، عورتوں، بچوں کی ترقی اور ماحولیاتی معاملات میں علاقائی اشتراک کو فروغ دینے کے عزم کا اظہار کیا گیا۔ مشترکہ اعلامیہ میں کہا گیا کہ غربت کو ختم کرنے، خطہ کو ایک آزاد تجارتی زون میں بدلنے، انسانی وسائل کو فروغ دینے، عورتوں اور مردوں میں برابری کا درجہ قائم کرنے، عورتوں، بچوں اور نوجوانوں کو اختیارات سونپنے کا کام مقررہ وقت میں پورا ہونا چاہیے نیز سارک اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے آئندہ اجلاس میں اپنی اجتماعی حیثیت کو پیش کرے گی۔ سارک ملکوں نے دہشتگردی کو کچلنے، منشیات کے کاروبار کو ختم کرنے کیلئے سارک علاقائی کنونشن کے نفاذ، ممبر ممالک کی طرف سے ایک مناسب قانون مرتب کئے جانے پر زور دیا۔ خطے میں سیاحت کے فروغ میں اشتراک پر بھی زور دیا گیا۔

دسویں سارک کانفرنس:

دسویں سارک سربراہ کانفرنس 29 جولائی 1998ء سے 31 جولائی 1998ء کو سری لنکا کے دارالحکومت کولمبو میں ہوئی جس میں پاکستان کے سابق وزیراعظم نواز شریف، بھارت کے وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی، بنگلہ دیش کی وزیراعظم حسینہ واجد، نیپال کے وزیراعظم گورجہ پرشاد کوئرالہ، مالدیپ کے صدر مامون عبدالقیوم اور بھوٹان کے وزیراعظم نے شرکت کی۔ سری لنکا کی صدر چندریکا کمارا تنگا بندرانائیکے کو دسویں سارک کانفرنس کی چیئر پرسن مقرر کیا گیا۔ پاکستان اور بھارت کے ایٹمی دھماکوں کے بعد یہ پہلی سارک سربراہ کانفرنس تھی جس میں بڑا واقعہ پاک بھارت وزرائے اعظم کی ملاقات کا تھا۔ دونوں رہنماؤں کے درمیان ایک گھنٹے سے زیادہ دیر تک ون ٹو ون ملاقات ہوئی جس میں کشمیر سمیت دیگر متنازع مسائل پر بات چیت کا سلسلہ دوبارہ شروع کرنے پر اتفاق رائے ہوا۔ واضح رہے کہ دونوں ملکوں میں بات چیت کا سلسلہ جون 1997ء سے معطل ہو گیا تھا۔ کولمبو کانفرنس کے موقع پر کشمیر ایک بار پھر فلیش پوائنٹ بن کر ابھرا اور پاکستان نے خطے میں ایٹمی دھماکوں سے پیدا شدہ اثرات پر غور، قیام امن اور کشیدگی کے خاتمے کیلئے ایک تین نکاتی فارمولا پیش کیا۔ بھارت کے سوا تمام سارک ممالک نے امن و سلامتی کیلئے پاکستان کے موقف کی حمایت کی۔ اگرچہ سارک چارٹر کے تحت سیاسی مسائل زیر بحث نہیں آ سکتے۔ اس کے باوجود سارک ممالک کے سربراہوں نے اپنی تقریروں میں امن و سلامتی کے بارے میں خطے کی صورت حال پر تشویش کا اظہار کیا۔

اس سارک سربراہ کانفرنس میں اس بات پر زور دیا گیا:

☆ اقتصادی تعاون کے فروغ پر توجہ اور آزادانہ تجارت بڑھائی جانی چاہیے۔

☆ منشیات کی سمگلنگ، خواتین بچوں کا استحصال اور سارک کے رکن ممالک میں عصمت فروشی کے خاتمے کیلئے موثر اقدامات کرنے چاہئیں۔

☆ خطے میں معاشی ماحول بہتر بنانے کیلئے اعتماد کی فضا بحال ہونی چاہیے۔

Marfat.com

گیارہویں سارک کانفرنس:

گیارہویں سارک سربراہ کانفرنس نیپال کے دارالحکومت کھٹمنڈو میں 6 جنوری 2002ء کو منعقد ہوئی جس میں پاکستان کے صدر پرویز مشرف، بھارت کے وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی، سری لنکا کی وزیراعظم چندریکا کمارا ٹنگا، بنگلہ دیش کی وزیراعظم خالدہ ضیاء، مالدیپ کے صدر مامون عبدالقیوم، نیپال کے وزیراعظم شیر بہادر ڈیوبا، بھوٹان کے وزیراعظم کوانگ چک نے شرکت کی۔ یہ کانفرنس ایسے موقع پر انعقاد پذیر ہوئی جب اس تنظیم کے دو بڑے ممالک بھارت اور پاکستان کے درمیان کشیدگی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ کھٹمنڈو میں ہونے والی یہ کانفرنس طے شدہ پروگرام کے تحت نومبر 1999ء میں منعقد ہونی تھی لیکن بھارت کے غیر ضروری رویے کے باعث اس کانفرنس کے انعقاد میں دو سال کی تاخیر ہو گئی۔ 11ویں سارک کانفرنس کے موقع پر پروگرام کے مطابق 5 جنوری 2002ء کو کھانے کی میز پر صدر پرویز مشرف اور وزیراعظم واجپائی کی موجودگی میں وزرائے خارجہ کی سفارشات کا جائزہ لیا جانا تھا کہ چین میں موسم کی خرابی کے باعث صدر پرویز مشرف تین گھنٹے کی تاخیر سے نیپال کے دارالحکومت پہنچنے کے باعث اجلاس کا پہلا دن ضائع ہو گیا بھارت نے دباؤ ڈال کر پہلے دن کی کارروائی منسوخ کرادی تھی جس سے صدر پرویز مشرف واجپائی ملاقات کا امکان ختم ہو گیا تھا۔ (صدر پرویز مشرف کو بھارتی پابندیوں کے باعث چین کے راستے کھٹمنڈو جانا پڑا تھا) 6 جنوری 2002ء کو صدر پرویز مشرف نے اس وقت غیر متوقع اقدام اٹھایا جب انہوں نے کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں اپنی تقریر کے اختتام پر ڈائس سے اتر کر بھارتی وزیراعظم واجپائی سے اچانک ہاتھ ملانے ان کی نشست پر پہنچ گئے۔ تحریر شدہ تقریر سے ہٹ کر بھارت کی طرف مخلصانہ دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور واجپائی سے مصافحہ کر کے صدر پرویز مشرف نے انتہائی انقلابی سفارتی قدم اٹھایا جس نے بھارتیوں کو حیران کر دیا۔ سری لنکا کی وزیراعظم چندریکا کمارا ٹنگا کی کوششوں سے صدر پرویز مشرف اور وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی مین غیر رسمی ملاقات بھی ہوئی جسے ایک بڑا بریک تھرو قرار دیا گیا۔

مشترکہ اعلامیہ میں سارک نے آزادانہ تجارت غربت کے خاتمے فلسطین کے بارے میں اقوام متحدہ کی قراردادوں پر مکمل عملدرآمد، دہشگردی کے خلاف مشترکہ جنگ اور اس ضمن میں قانون سازی اور مختلف شعبوں میں تعاون بڑھانے پر اتفاق کیا گیا۔ یہ بھی طے پایا کہ سارک کو زیادہ موثر فعال اور نتیجہ خیز بنایا جانا چاہیے۔ مشترکہ اعلامیہ میں مستقبل کے رہنما اصول وضع کیے گئے ممبر ملکوں نے نئے جذبے سے غربت کے مسئلے سے نمٹنے کیلئے اس عزم کا اظہار کیا کہ سارک کے سماجی منشور کو جلد حتمی شکل دی جائے گی اور علاقائی کونشنوں پر دستخط کر کے سماجی شعبے میں پیش رفت ہو گی یہ بھی طے پایا کہ سارک کا آئندہ سربراہ اجلاس پاکستان میں ہوگا۔

بارھویں سارک کانفرنس:

12ویں سارک سربراہ کانفرنس بلاشبہ ایک ناقابل فراموش تاریخی واقعہ ہے۔ جب طویل اور تھکا دینے والی کش مکش اور اعصاب شکن انتظار کے بعد بالآخر نا امیدی کے بطن سے ایک بھرپور امید اور نئی صبح نے جنم لیا۔ اعلان اسلام آباد اور پاک بھارت مشترکہ اعلامیہ نے نہ صرف جنوبی ایشیاء کے ڈیڑھ ارب سے زیادہ انسانوں بلکہ دنیا بھر میں موجود امن پسندوں کو نیا حوصلہ اور نئی امید عطا کی اور دنیا بھر سے مبارک باد کے پیغامات وصول ہو رہے تھے۔ امید کی جارہی تھی کہ اس

Marfat.com

مرتبہ خصوصاً پاکستان اور بھارت کے درمیان گفت وشنید کی جو بنیاد قائم ہوئی ہے اس پر آہستہ روی ہی سے سہی ایک ایسی شان دار عمارت ضرور تعمیر ہوگی جو آنے والی نسلوں کیلئے امن وآشتی کی پیامبر ہو اور جنوبی ایشیا کے کروڑوں نوجوانوں کو اس خطے کے بے پناہ وسائل اور قدرتی نعمتوں سے بہرہ ور ہونے کا موقع ملے گا۔

اپنے قیام 8 دسمبر 1985ء سے اب تک سارک کے پلیٹ فارم سے جنوبی ایشیا کے عوام کی فلاح و بہبود کے جتنے منصوبے بھی طے پائے ہیں یا جو بھی کارگزاری دیکھنے کو ملتی ہے، اس پر 12 ویں سارک سربراہ کانفرنس کے صرف دو اعلامیے بھاری ہیں اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سارک کی تاریخ میں شاید پہلی مرتبہ یہ دن دیکھنے کو ملا ہے جب اس کا مثبت کردار سامنے آیا ورنہ اب تک توان کانفرنسوں نے گفتند، نشستند اور برخاستند کے علاوہ اور کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا تھا، لیکن 12 ویں سربراہ سارک کانفرنس نے ایک مرتبہ پھر ثابت کر دیا کہ جنوبی ایشیا کے لیڈر بصیرت سے مالا مال ہیں اور وہ اپنے عوام کیلئے کچھ کر گزرنے کا عزم بھی رکھتے ہیں اور اس کانفرنس کے بطن سے امید کی جو کرنیں پھوٹی ہیں وہ خصوصاً گزشتہ 55 سالوں سے برصغیر پاک و ہند پر چھائے اندھیروں کو اجالوں میں تبدیل کرنے کے سفر کا آغاز ثابت ہوں گی۔

یاسیت اور ناامیدی سے بھرپور امید اور کامیابی کا یہ سفر بڑا اعصاب شکن اور تھکا دینے والا تھا۔ سارک کا قیام دسمبر 1985ء کو ڈھاکا میں عمل میں آیا اور بنگلہ دیش کے صدر حسین محمد ارشاد اس کے پہلے چیئر مین قرار پائے۔ اس اجلاس میں نیپال کا تیار کردہ سارک کا نشان اور منشور تیار کیا گیا اور طے پایا کہ سال میں کم از کم دو مرتبہ سارک کے وزرائے خارجہ اور ایک مرتبہ سربراہان مملکت آپس میں ضرور ملیں گے تا کہ مل بیٹھ کر جنوبی ایشیا کے کروڑوں عوام کی فلاح و بہبود کے منصوبے بنائیں، تعاون کی نئی راہیں کھلیں اور اپنے مسائل کو آپس میں مل جل کر حل کریں، ایک دوسرے کے وسائل کے استفادہ کرتے ہوئے باہمی تجارت کو فروغ دیا جائے۔ سارک ممالک کے عوام کے درمیان پہلے سے موجود مضبوط ثقافتی رشتوں کو علاقے کی تعمیر و ترقی کیلئے استعمال میں لایا جائے اور ایک دوسرے کی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا جائے۔ پہلے ہی اجلاس سے یہ امید کی جانے لگی تھی کہ اب جنوبی ایشیا کے سات ممالک بنگلہ دیش، مالدیپ، بھوٹان، سری لنکا، نیپال، بھارت اور پاکستان آپس میں مل بیٹھ کر کوئی ایسی راہ ضرور نکالیں گے جو اس خطے سے غربت اور جہالت کے اندھیروں کو ختم کر کے یہاں کے کروڑوں عوام کو تعمیر و ترقی کی راہ پر گامزن کرے گی۔

دوسری کانفرنس 16 نومبر 1986ء کو بھارت کے شہر بنگلور میں منعقد ہوئی جس میں ساتوں ممالک کے سربراہوں نے شرکت کی اور ایک دوسرے کی سلیت کا احترام کرتے ہوئے ایک دوسرے کے معاملات میں عدم مداخلت اور قوت کے استعمال کے بجائے ڈائیلاگ کے ذریعے اپنے مسائل کا پُر امن حل تلاش کرنے کی قراردادیں منظور کی گئیں۔ کانفرنس میں اقوام متحدہ کے چارٹر پر عمل درآمد کا یقین بھی دلایا گیا۔

تیسری سارک کانفرنس نومبر 1987ء کو نیپال کے دارالحکومت کھٹمنڈو میں ہوئی، جس میں ساتوں ممالک کے سربراہ شریک ہوئے۔ ان دنوں بھارتی افواج نے سیاچن میں اچانک پیش قدمی کرتے ہوئے پاکستانی علاقے پر قبضہ کر لیا تھا اور یہ مسئلہ دونوں ممالک کے درمیان شدت اختیار کر رہا تھا۔ اس کانفرنس میں دونوں ممالک کے وزرائے اعظم محمد خان جونیجو اور راجیو گاندھی کے درمیان طے پایا کہ پاک بھارت مذاکرات کا عمل بلند ہوگا۔ دسمبر 1987ء کو اس سلسلے میں دونوں

Marfat.com

ممالک کے وزرائے خارجہ نے دہلی میں مذاکرات کئے اور دسمبر 1988ء میں اسلام آباد میں وزارتی اجلاس میں سیاچن کے مسئلے پر دوطرفہ مذاکرات کی تجویز بھی پیش کی گئی۔

چوتھی سارک سربراہ کانفرنس 31 دسمبر 1988ء کو اسلام آباد میں ہوئی جس میں بھارتی وزیراعظم راجیو گاندھی اور پاکستانی وزیراعظم بینظیر بھٹو کے درمیان پاک بھارت تعلقات کے حوالے سے مذاکرات بھی ہوئے لیکن پاکستان میں اپوزیشن جماعتوں نے اس پر خاصا ہنگامہ کیا اور مسز بینظیر بھٹو پر الزام لگایا گیا کہ انہوں نے اسلام آباد میں شاہراہوں سے کشمیر کے بورڈ ہٹادیئے ہیں اور مسئلہ کشمیر کو نظرانداز کیا جارہا ہے۔ پاکستان میں یہ کانفرنس خاصی متنازع رہی اور اس حوالے سے مسز بینظیر بھٹو کو شدید تنقید کا نشانہ بھی بنایا گیا۔

پانچویں سارک سربراہ کانفرنس 1989ء کے بجائے نومبر 1990ء کو مالدیپ میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں پاکستانی وزیراعظم میاں نوازشریف اور بھارتی وزیراعظم چندر شیکھر کے درمیان آدھا گھنٹہ تک علیحدگی میں ملاقات ہوئی جس میں دونوں وزرائے اعظم نے پاک بھارت متنازع امور، جن میں مسئلہ کشمیر بھی شامل تھا، پر گفتگو اور دونوں کے درمیان پاک بھارت خارجہ سیکرٹریوں کا اجلاس دسمبر 1990ء میں اسلام آباد میں طے پا گیا۔ یہ ملاقات خاصی بھرپور رہی لیکن بات چیت کا اختتام بہرحال ایک دوسرے کیلئے نیک خواہشات کے پیغامات تک ہی محدود رہا اور کوئی خاص پیش رفت نہ ہوسکی۔ اس کانفرنس میں تمام ممبر ممالک نے عراق کی طرف سے کویت پر ہونے والی جارحیت کی مذمت کی اور متاثرہ ممالک کی امداد کا اعلان بھی کیا گیا۔

چھٹی سربراہ کانفرنس سری لنکا کے دارالحکومت کولمبو میں 21 دسمبر 1991ء میں ہوئی جس میں پاکستانی وزیراعظم میاں نوازشریف اور بھارتی وزیراعظم نرسیماراؤ کے درمیان کانفرنس کے آغاز سے پہلے علیحدگی میں مذاکرات پہلے سے طے پاچکے تھے لیکن بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر یہ ممکن نہ ہوا۔ البتہ کانفرنس کے خاتمے پر دونوں کے درمیان ملاقات ہوئی جس میں کانگریس کے وزیراعظم نرسیماراؤ اور میاں نوازشریف کے درمیان متنازع امور پر بات چیت ہوئی اور پاکستانی وزیراعظم نے اس کانفرنس میں برصغیر میں ایٹمی دوڑ ختم کرنیکی خواہش کا اظہار کیا گیا اور کہا کہ وہ برابری کی بنیاد پر تمام مسائل کا خلوص نیت سے حل چاہتے ہیں۔ اس ملاقات سے یہ امید پیدا ہونے لگی تھی کہ شاید دونوں ممالک کے درمیان تناؤ میں کمی آئے گی اور بعد اس کے مظاہر بھی دیکھنے کو ملتے رہے۔

ساتویں سارک سربراہ کانفرنس 10 اپریل 1993ء کو پھر ڈھاکہ میں ہوئی جس میں پاکستانی وزیراعظم نوازشریف اور بھارتی وزیراعظم وی پی سنگھ نے شرکت کی لیکن حیرت انگیز طور پر وی پی سنگھ نے، جو اپنی غیر جانب داری کانگریس مخالفت اور امن پسندی کے لئے خاصی شہرت بھی رکھتے تھے۔ پاکستان وزیراعظم سے علیحدگی میں ملاقات سے احتراز برتا جس سے یہ گمان زور پکڑنے لگا کہ ان پر بھارتی حکومت میں شریک کار باقی پارٹیوں کے انتہا پسند عناصر کا دباؤ ہے جسے وی پی سنگھ نظرانداز نہیں کرسکتے۔

2 مئی 1995ء کو آٹھویں سارک سربراہ کانفرنس دہلی میں ہوئی، جس میں پاکستانی صدر فاروق لغاری نے شرکت کی، جہاں ان کی بھارتی وزیراعظم نرسمہاراؤ سے 45 منٹ تک علیحدگی میں بات ہوئی اور دونوں کی گفتگو میں طے

Marfat.com

پایا کہ سلسلہ گفت وشنید جو منقطع ہو گیا تھا وہ دوبارہ بحال کیا جائے اور دونوں ممالک کے سیکریٹریوں کی ملاقات ہوتی رہے۔ دونوں نے کشمیر اور دوسرے متنازع معاملات پر ایک دوسرے سے بات چیت کی، لیکن اس کا کوئی خاص نتیجہ برآمد نہ ہوا اور نہ ہی کوئی بڑی پیش رفت ہوئی۔

12 مئی 1997ء کو نویں سارک کانفرنس مالدیپ کے دارالحکومت مالے میں ہوئی جہاں پاکستانی وزیراعظم میاں نواز شریف اور بھارتی وزیراعظم آئی کے گجرال کے درمیان علیحدگی میں مذاکرات ہوئے اور دونوں نے ایک دوسرے کے قیدی رہا کرنے کے علاوہ ویزا پابندیاں نرم کرنے کا اعلان کیا۔ تصفیہ طلب امور پر جامع طریق کار طے کرنے کے لئے مشترکہ گروپ کے قیام کا فیصلہ ہوا اور دونوں وزرائے اعظم کے درمیان ہاٹ لائن قائم کردی گئی جسے بڑی اہم پیش رفت سمجھا گیا اور جنتا دل کی مخلوط حکومت کے وزیراعظم آئی کے گجرال، جو پاکستان کے شہر جہلم کے رہنے والے اور پاکستان سے مستقل بنیادوں پر دوستی کے خواہش مند بھی تھے۔ اس سلسلہ جنبانی کو آگے نہ چلا سکے، کیوں کہ اگلے ہی سال ان کی حکومت ختم ہو گئی۔

جون 1997ء میں دونوں ممالک کے درمیان سلسلہ گفتگو منقطع تھا۔ جو دسویں سارک سربراہ کانفرنس منعقدہ 29 جولائی 1998ء میں پاکستانی وزیراعظم میں نواز شریف اور بھارتی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی کے درمیان ایک گھنٹہ تک علیحدگی میں ہونے والی ملاقات کے بعد بحال ہو گیا۔ سری لنکا کے دارالحکومت کولمبو میں ہونے والی اس کانفرنس کی اہمیت اس لئے بھی بہت بڑھ گئی تھی کہ دونوں ممالک نے اس سے پہلے ایٹمی دھماکے کئے تھے اور دونوں کے درمیان کشیدگی بہت بڑھ چکی تھی۔ کولمبو کانفرنس میں ایک مرتبہ پھر مسئلہ کشمیر کی گونج سنائی دی اور دونوں وزرائے اعظم نے ایک دوسرے کے ساتھ کشمیر سمیت تمام تنازعات کو بات چیت کے ذریعے طے کرنے پر زور دیا۔ پاکستان کی طرف سے ایٹمی دھماکوں کے بعد پیدا ہونے والی صورتِ حال کے پیش نظر تین نکاتی امن فارمولا بھی پیش کیا گیا۔

گیارھویں سارک کانفرنس نومبر 1999ء کو منعقد ہوئی تھی لیکن بھارت اور پاکستان کے درمیان پیدا شدہ تناؤ کی وجہ سے یہ کانفرنس بالآخر 6 جنوری 2002ء کو انعقاد پذیر ہوئی۔ یہ کانفرنس انتہائی تلخ ماحول اور حالات میں منعقد ہوئی تھی اس سے پہلے جہاں آگرہ مذاکرات ناکام ہو چکے تھے وہیں عالمی اور برصغیر کی سطح پر دو اہم واقعات نے دونوں ممالک کے درمیان قریباً حالت جنگ کی سی کیفیت پیدا کردی تھی۔ 11 ستمبر 2001ء کو امریکہ میں ہونے والی تخریب کاری کے کچھ ہی عرصہ بعد جب بھارتی پارلیمنٹ پر دہشت گردوں نے حملہ کیا تو بھارت نے اسے پاکستانی ایجنسیوں کا شاخسانہ قرار دیا اور پاکستان کے ساتھ ریل، زمین اور فضائی تمام رابطے منقطع کرنے کے بعد نہ صرف اظہار ناراضگی کے لئے اپنے ہائی کمشنر کو واپس بلا لیا بلکہ دسمبر 2001ء میں پاکستانی سرحدوں پر آٹھ لاکھ فوج بھی لاکر بٹھا دی۔

یہ صورتحال ساری دنیا کے لئے انتہائی پریشان کن تھی۔ ایک طرف تو افغانستان میں امریکی افواج مقامی شورش سے نبرد آزما تھیں اور القاعدہ کی سرگرمیوں نے امریکہ ہی نہیں ساری دنیا کو پریشان کر رکھا تھا، جبکہ دوسری طرف پاکستان جو امریکہ کا فرنٹ لائن اتحادی تھا جس کی 90 ہزار افواج شمال مشرقی سرحدوں پر دہشت گردی کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کھڑی تھیں، بھارتی حکومت کے اس فیصلے سے صورتحال بہت نازک ہو گئی۔

Marfat.com

ظاہر ہے پاکستان کے لئے اپنی افواج کو مغربی سرحدوں پر مشتمل کرنا ضروری تھا، جبکہ امریکہ کے لئے یہ سراسر گھاٹے کا سودا تھا اور یہ خطرہ ہر وقت موجود رہتا تھا کہ کسی بھی لمحے اگر دونوں افواج میں سے کسی ایک سر پھرے جرنیل نے کوئی غلطی کر دی تو یہ علاقہ اپنی جنگ کی تباہ کاریوں کی لپیٹ میں آ جائے گا اور پھر یہ سلسلہ یہاں رکنے والا نہیں تھا۔ یہ خطرہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ دونوں ممالک کی فوجیں آگر آپس میں ٹکرا گئیں تو شاید اس آگ میں ساری دنیا کا امن جھلس جائے گا، اس لئے امریکہ اور اس کے قریب ترین حلیف برطانیہ نے بھارت پر شدید دباؤ ڈالے رکھا کہ وہ اس خطے کو تباہی سے بچانے کے لئے کوئی ایڈونچر نہ کریں۔ بھارت کی طرف سے پاکستان کے خلاف مسلسل دہشت گردی اور کراس بارڈر ٹیررازم کا پروپیگنڈہ کیا جا رہا تھا۔ بھارتی وزیراعظم کا کہنا تھا کہ وہ لاہور میں بس کے ذریعے آئے تو ان کے خیر سگالی جذبے کا جواب کارگل کی صورتحال میں دیا گیا اور اب پاکستان بھارت کے خلاف مسلسل دہشت گردی کروا رہا ہے جبکہ پاکستان کی طرف سے بھارت میں ہونے والے دہشت گردی کے واقعات سے مسلسل لاعلمی ظاہر کی جا رہی تھی۔

ان حالات میں ناگزیر ہو گیا تھا کہ دونوں حکومتیں میز پر بیٹھ کر کسی فیصلے پر پہنچیں اور جتنی جلدی ممکن ہو بھارتی افواج کو سرحدوں سے واپس بلا لیا جائے۔ اس صورتحال میں جبکہ کشیدگی اپنے نقطہ عروج کو چھو رہی تھی، اس کانفرنس میں صدر مشرف اور بھارتی وزیراعظم واجپائی نے شرکت کی۔ اس مرحلے پر جبکہ واجپائی کسی بھی صورت پاکستان سے بات کرنے کے لئے راضی دکھائی نہیں دے رہے تھے، صدر مشرف نے انتہائی اہم اور سفارتی تاریخ کا انقلابی قدم اٹھاتے ہوئے اپنی تقریر میں بھارت کو مذاکرات شروع کرنے اور معاملات کو گفتگو کے ذریعے نمٹانے کی مخلصانہ دعوت دی۔ صدر مشرف اپنی تقریر کے اختتام پر اچانک ڈائس سے اتر کر مسٹر واجپائی کی طرف بڑھے اور ان سے گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔

اس گرم جوش مصافحے نے اعصاب شکن ماحول کو قدرے پرسکون کر دیا اور دونوں ممالک ہی نہیں بلکہ سارے جنوبی ایشیا نے سکھ کا سانس لیا اور یہ امید کی جائے گی کہ اب برف ضرور پگھلے گی، لیکن بھارتی وزیراعظم اپنی بات پر ڈٹے رہے، جس کا مظاہرہ ماسکو میں بھی ہوا، جب انہوں نے روسی صدر کی کوششوں کے باوجود جنرل مشرف سے کسی بھی طرح بات کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کانفرنس میں جو وسطی ایشیا اور پاک و ہند کے سربراہوں پر مشتمل تھی، جنرل مشرف نے دنیا کو باور کروایا کہ وہ دہشت گردی اور آزادی کی تحریکوں کو گڈمڈ نہ کریں اور نہ ہی کسی کو اجازت دی جائے کہ وہ آزادی کی تحریکوں کو دہشت گردی قرار دے۔ صدر مشرف کی طرف سے اس اصولی اسٹینڈ کو ایجنڈے اور مشترکہ اعلامیہ کا حصہ بھی بنایا گیا۔ ماسکو میں بھی دونوں سربراہوں کے درمیان کوئی بات چیت نہ ہوئی، لیکن اس دوران دوست ممالک کی طرف سے دونوں پر دباؤ مسلسل جاری رہا اور صدر مشرف نے دنیا کے قریباً ہر قابل ذکر فورم پر بھارتی وزیراعظم کو مذاکرات کی دعوت دینے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ اس دوران پاکستان کی طرف سے دہشت گردی اور انتہا پسندی میں ملوث مختلف تنظیموں پر پابندی عائد کرنے کے اہم فیصلے نے دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں کو اس بات کا کافی حد تک یقین دلایا کہ پاکستان اپنی کوششوں میں مخلص ہے اور وہ کسی قسم کی دہشت گردی میں ملوث نہیں۔ صدر مشرف نے اپنے خطاب میں پاکستانی سرزمین پر سرگرم عمل اپنی تمام جماعتوں کے ساتھ سختی سے نمٹنے کا نہ صرف اعلان کیا، بلکہ عملاً بھی ایسا کر کے دکھایا۔ پاکستان کی طرف سے ہونے والے ایسے مسلسل اقدامات اور خصوصاً القاعدہ کے خلاف کاروائی اور افغانستان سے بھاگ کر پاکستان آنے

Marfat.com

والوں کو پکڑ کر امریکا کے حوالے کرنے کی کارروائیوں کے بعد امریکا پر پاکستان کا اخلاقی دباؤ بڑھ گیا۔ اس اخلاقی دباؤ کا نتیجہ بھارت کی طرف سے سرحدوں سے فوجیں واپس بلانے کی صورت میں برآمد ہوا، کیوں کہ اب بھارت کے اندر سے بھی اس سلسلے میں حکومت کی مخالفت زورشور سے ہونے لگی تھی اور عالمی سطح پر بھی بھارت کے اس عمل پر تنقید جاری تھی۔ بھارتی فوجوں کی سرحدوں سے واپسی سے سرحدوں پر موجود بے پناہ تناؤ بہرحال کچھ کم ہوا، اس کے ساتھ ہی ٹریک ٹو ڈپلومیسی کا بھرپور آغاز ہوا اور یہ بات اب کوئی راز نہیں رہی کہ اس ڈپلومیسی کو امریکا، برطانیہ اور دوسرے بڑے ممالک کی بھرپور حمایت حاصل تھی۔ امریکا اور برطانیہ کی طرف سے اہم شخصیات نے مسلسل بھارت اور پاکستان سے رابطہ قائم رکھا اور دونوں ممالک پر بات چیت کے ذریعے مسائل حل کرنے کیلئے دباؤ بڑھتا چلا گیا، آخری مرحلے پر اس کوشش میں روس اور چین کو بھی شامل کر لیا گیا اور اپریل 2003ء کو جب مقبوضہ کشمیر میں بھارتی وزیراعظم واجپائی نے پاکستان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تو ان کوششوں کی رفتار کم ہونے کے بجائے ان میں اور تیزی آ گئی۔

دونوں ممالک کے درمیان صلح کروانے کیلئے سرگرم طاقتوں کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ دونوں طرف انتہا پسندوں کے کچھ گروپ ایسے ہیں جو ان کوششوں کو کامیاب نہیں ہونے دیتے۔ اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس مرتبہ خاموش اور خفیہ ڈپلومیسی کا سہارا لیا جائے جس میں بھارت کی طرف سے برجیش مشرا اور پاکستان کی طرف سے طارق عزیز نے حصہ لیا۔ دونوں کی مئی میں لندن میں اہم ملاقات ہوئی، جس میں کچھ ریٹائرڈ لیکن متحرک ڈپلومیسی نے بھی حصہ لیا اور خاموشی سے مذاکرات ہوتے رہے۔ ان مذاکرات کی لحظہ لحظہ کی رپورٹیں امریکی انتظامیہ حاصل کرتی رہی اور جب کبھی ان میں تسلسل ٹوٹنے لگتا فوراً دونوں اطراف پر دباؤ بڑھا دیا جاتا۔ بھارتی حکومت کا ایک ہی اصرار تھا کہ پاکستان بھارتی سرحد کے نزدیک مجاہدین کے کیمپس کا مکمل خاتمہ کرے، جب کہ پاکستان کی طرف سے اس بات کی یقین دہانی عالمی طاقتوں کو کروائی جا چکی تھی کہ پاکستان نے ان گروپوں پر اپنی گرفت بہت سخت کر دی ہے۔ البتہ پاکستان کی طرف سے یہ گارنٹی نہیں دی جا سکتی تھی کہ وہ مقبوضہ کشمیر کے اندر سرگرم عمل مجاہدین کو روک سکے، کیوں کہ ان پر پاکستان کا کنٹرول نہیں ہے، جب کہ بھارت بہ ضد رہا، کیوں کہ بھارتی حکومت سمجھتی تھی کہ اس مرحلے پر وہ پاکستان، پر اپنا مسلسل دباؤ بڑھا کر اپنی مرضی کے اور مطالبات بھی منوا لے گی، لیکن ان اعصاب شکن مراحل میں پاکستانی دفتر خارجہ کے کردار کو نظر انداز کرنا زیادتی ہوگی۔ پاکستان اپنے اصولی موقف پر قائم رہا۔ پاکستان کے اصولی موقف کی فتح سامنے آئی جب بھارت کی طرف سے رابطوں کی بحالی اور ہائی کمیشن کی واپسی کا اعلان کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ٹریک ٹو ڈپلومیسی میں شدت آئی۔ بھارت اور پاکستان کی طرف سے مختلف سماجی اور ثقافتی وفود کا تبادلہ واہگہ کے راستے ہونے لگا۔ اس دوران بھارت اور پاکستان کی طرف سے مختلف پیکیج ایک دوسرے کو پیش کیے گئے، جن میں ہوائی راستوں، ریلوے رابطوں کی بحالی کے اعلانات بھی شامل ہیں۔ مظفر آباد سے سری نگر اور موناباؤ سے کھوکھراپار تک بس سروس، سمندری راستے سے ممبئی اور کراچی کے درمیان فیری سروس کے اجراء کی تجاویز بھی سامنے آئیں، جن پر مرحلہ وار سلسلے میں عمل بھی جاری ہے۔

اس مرحلے پر جنوبی ایشیا میں امن کی بحالی کا انقلابی قدم پاکستان کی طرف سے اٹھایا گیا جب وزیراعظم جمالی نے یکطرفہ فائر بندی کا اعلان کیا جس سے سرحدوں پر برسوں سے جاری فائرنگ رک گئی اور دونوں اطراف بسنے والے

Marfat.com

لاکھوں سرحدی باشندوں نے سکھ کا سانس لیا۔ پاکستان کے اس یکطرفہ قدم نے ساری دنیا کو اس بات کا یقین دلایا کہ پاکستانی حکومت امن کی بحالی کے لئے کتنی پرخلوص ہے۔

اس دوران بھارتی اور پاکستانی وزرائے اعظم کی فون پر بات ہوتی رہی اور بھارتی وزیراعظم کی طرف سے ایک مرحلے پر پاکستان میں منعقد ہونے والی بارہویں سارک کانفرنس میں شرکت کی یقین دہانی بھی کروائی گئی۔ اس مرحلے پر خاموش سفارت کاری کے اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے آخری لمحات تک یہ اسرار قائم رکھا گیا کہ جناب واجپائی پاکستان سے دوطرفہ مذاکرات بھی کریں گے۔ دونوں طرف سے میڈیا کے اندازے سامنے آتے رہے۔ بھارتی وزیرخارجہ یشونت سنہا کی طرف سے بھارتی وزیراعظم کی پاکستانی صدر اور وزیراعظم سے علیحدہ ملاقات کے امکان کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا گیا کہ اگر ایسی کوئی ملاقات ہوئی بھی تو یہ ایک مہمان اور میزبان کی ملاقات سے زیادہ اور کسی حیثیت کی حامل نہیں ہوگی جبکہ بھارتی وزیر دفاع جارج فرنانڈس کی طرف سے وہی زبان بولی جاتی رہی جس کے لئے وہ شہرت رکھتے ہیں۔

بھارتی حکومت نے سیز فائر کا فائدہ اٹھا کر کنٹرول لائن پر باڑ لگانے کا سلسلہ تیز کیا تب بھی پاکستان نے صورتحال کو بگڑنے نہیں دیا اور انتہائی تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے بھارت کی توجہ اس طرف دلائی گئی جبکہ بھارت میں موجود کچھ انتہا پسند رہنماؤں کی طرف سے اس مرحلے پر بھی اشتعال دلانے کا سلسلہ جاری رہا گو کہ بھارت کی طرف سے کسی بھی ذمہ دار نے ابھی تک بھارتی وزیراعظم اور پاکستانی قیادت کے دوران ملاقات کی خبر نہیں دی تھی لیکن باخبر حلقوں کی طرف سے اصرار کے ساتھ یہ بات کہی جاتی رہی کہ دونوں حکومتوں کے درمیان معاملات طے پا چکے ہیں اور واجپائی صاحب نہ صرف ملاقات کریں گے بلکہ بات اس سے بھی آگے جائے گی۔

وزیراعظم واجپائی کی آمد سے کچھ روز پہلے ہی ان کے دست راست برجیش مشرا کی پاکستان آمد اور میڈیا سے ان کا مکمل اجتناب محل نظر رہا اور ان حلقوں کی بات میں وزن دکھائی دے رہا تھا۔ برجیش مشرا کا پاکستان کی سکیورٹی کے حوالے سے اعلیٰ شخصیات کے ساتھ مذاکرات کا سلسلہ مسلسل جاری رہا۔ باخبر حلقوں کی اطلاع کے مطابق ان مذاکرات کے حوالے سے پل پل بدلتی صورتحال پر امریکی حلقے مکمل آگاہی رکھتے تھے، جو پاکستان میں ان مذاکرات کی نگرانی کر رہے تھے۔

یہ سلسلہ جاری تھا، جب بھارتی وزیراعظم کی اسلام آباد آمد ہوئی جہاں ان کا فقیدالمثال استقبال کیا گیا اور وزیراعظم جمالی کے ان کے ساتھ گرم جوش مصافحے اور معانقے نے یہ بات سمجھا دی کہ اس کے بعد سب اچھا ہی ہوگا۔ بھارتی وزیراعظم کی آمد سے پہلے کانفرنس ایجنڈے کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ رکن ممالک کے خارجہ سیکرٹریوں پر مشتمل مجلس قائمہ کا اجلاس 31 دسمبر کو اسلام آباد میں منعقد ہوا، جو یکم جنوری 2004ء کی شام اختتام کو پہنچا۔

اس اجلاس میں مجلس قائمہ نے 1987ء کی منظور شدہ قرارداد کی فائنل دستاویز پر اتفاق کر لیا جس کی رو سے رکن ممالک کو اس بات کا پابند کیا گیا ہے کہ وہ دہشت گردوں کو کسی بھی قسم کی حمایت فراہم نہیں کریں گے۔ اس قرارداد کے مسودے پر کچھ اختلاف رائے ہوا کیونکہ پاکستانی حکومت کے کچھ تحفظات تھے لیکن اس ابہام کو دور کر دیا گیا۔

سربراہی اجلاس کے آغاز سے پہلے مکمل ایجنڈا اتفاق رائے سے تیار کر لیا گیا ہے جسے بعد میں اعلان اسلام

Marfat.com

آباد کے نام سے جاری کیا گیا۔ اس 43 نکاتی اعلان کے اہم نکات کچھ اس طرح ہیں دو سال بعد خطے کے ممالک کے درمیان آزادانہ تجارت شروع ہو جائے گی۔ جنوبی ایشیائی اقتصادی یونین قائم کی گئی۔ دہشت گردی کے خاتمے کے لئے موثر اقدامات کئے گئے، کسٹم کا یکساں طریقہ کار تمام ممالک پر لاگو کریں گے جو آسان بھی ہوگا اور اس میں موجودہ پیچیدگیاں ختم کر دی جائیں گی۔ انسدادِ غربت کے لئے ایک پلان کی منظوری دی گئی ہے جبکہ 2005ء کو سارک سیاحت کا سال قرار دینے کا اعلان کیا گیا۔ نیپال کے دارالحکومت کھٹمنڈو میں سارک انفارمیشن سینٹر قائم کیا گیا ہے اور تمام ممالک اتفاق رائے سے جنوبی ایشیائی بنک کے قیام کا جائزہ لے رہے ہیں۔ تمام ممالک نے اتفاق کیا کہ اہم امور پر مشترکہ مذاکروں اور مباحثوں کا اہتمام کیا جائے اور ہر سال خطے کی ممتاز شخصیات کے لئے ایوارڈز کا اعلان کیا جائے۔

اعلان اسلام آباد کو ایک اہم کامیابی قرار دیا جا رہا تھا، کیونکہ بھارت کی خواہش پر دہشت گردی کے اضافی پروٹوکول پر سب نے سائن کئے تھے اور کوئی قباحت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ تمام سربراہوں نے اس پر اطمینان کا اظہار کیا اور سب نے اپنے خطاب میں اس بات پر زور دیا کہ اس خطے کے کروڑوں عوام کی قسمت تب ہی بدل سکتی ہے جب ان کے درمیان اختلافات ختم ہو جائیں گے اور ایک دوسرے کے وسائل سے استفادہ کرتے ہوئے ایک دوسرے کی بھرپور معاونت کر کے سارک کو دنیا میں ایک معتبر مقام دلایا جا سکے۔ تمام رہنماؤں کا کہنا تھا کہ اگر آسیان، مغربی اقتصادی تنظیمیں اور دوسری علاقائی تنظیمیں ایک دوسرے کے لئے اتنی آسانیاں اور ترقی کے مواقع پیدا کر سکتی ہیں تو ہم ایسا کیوں نہیں کر سکتے تمام سربراہوں نے پاکستانی حکومت کے انتظامات اور کردار کی دل کھول کر تعریف کی۔

اعلان اسلام آباد کے بعد اس کانفرنس کا سب سے بڑا حاصل اور کارنامہ پاک بھارت مشترکہ اعلامیہ ہے، جس کی امید پر دنیا بھر سے قریباً تین سو اخبار نویس اور الیکٹرانک میڈیا کے لوگ پاکستان آئے ہوئے تھے اور برصغیر کے کروڑوں عوام جس کا بے چینی اور بے صبری سے انتظار کر رہے تھے۔ شاید ماضی کے تلخ تجربات نے دونوں حکومتوں کے اکابرین اور ذمہ داروں کو اس بات کا شدت سے احساس دلا دیا تھا کہ وقت سے پہلے کی جانے والی کوئی بھی بات مذاکرات کے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے اور میڈیا اسے کوئی بھی رنگ دے کر مذاکرات کے رنگ میں بھنگ ڈال سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 6 جنوری کو دوپہر دو بجے تک دونوں ممالک کے وزرائے خارجہ اور دیگر اہم شخصیات کی طرف سے گزشتہ کئی ماہ سے جاری مذاکرات کے حوالے سے اخبار نویسوں کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دی گئی جو خفیہ ڈپلومیسی کے تحت دونوں حکومتوں کے درمیان انجام پا رہے تھے۔ صرف ممتاز صحافی زہرا نسیم کے دلی سے روانگی پر بھارتی وزیر اعظم کے ساتھ ہونے والے ایک مختصر ترین انٹرویو میں ان کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے مسٹر واجپائی نے کشمیر کے حوالے سے کہا کہ کشمیر پر پاکستان اور بھارت کا اپنا اپنا موقف ہے لیکن انہیں ایسا لگتا ہے کہ اس مسئلے پر ابھی تک جم کر بات نہیں ہوئی اور یہ کہ انہوں نے بات چیت سے کبھی انکار نہیں کیا۔ وہ پاکستانی صدر کے ساتھ کشمیر کے مسئلے پر بھی مذاکرات کے لئے تیار ہیں۔

جناب واجپائی کے منہ سے نکلے ان الفاظ کو لے کر برصغیر کا پرنٹ الیکٹرانک میڈیا ایک بحث میں الجھ چکا تھا اور ہر کوئی ان الفاظ کو اپنے اپنے انداز سے سوچ رہا تھا گو کہ تمام مبصرین کے نزدیک ایک مختصر انٹرویو سے یہ امید تو بندھ رہی تھی کہ جناب واجپائی اپنے گزشتہ موقف میں نرمی پیدا کر کے پاکستانی قیادت کے ساتھ غیر مشروط گفتگو کے لئے راضی ہو چکے

Marfat.com

ہیں لیکن وہ سارک کانفرنس کے موقع پر بات کریں گے یا نہیں؟ بیشتر ماہرین کے نزدیک اس سوال کا جواب نفی میں تھا اور یہ سمجھا جارہا تھا کہ سارک کانفرنس میں صرف سارک کے طے کردہ ایجنڈے پر ہی بات ہوگی اور اگر مسٹر واجپائی نے پاکستانی قیادت سے ملاقات بھی کی تو اس کی حیثیت ''رسمی ملاقات'' سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوگی۔ یہی بات یشونت سنہا کی طرف سے اسلام آباد روانگی سے پہلے آخری لمحات تک کہی جاتی رہی تھی۔

بھارتی وزیراعظم سے جنرل مشرف کی پہلی ملاقات ان کی طرف سے سارک سربراہان کو دیئے گئے ڈنر کے موقع پر ہوئی لیکن یہاں بھی سلسلہ دعا سلام اور ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرنے سے آگے نہ بڑھ سکا اور واجپائی صاحب اپنے ہوٹل پر آرام کرنے واپس تشریف لے گئے، البتہ ان کی باڈی لینگویج ایک بات کی صاف نشاندہی کررہی تھی کہ اندر ہی اندر کچھ کھچڑی ضرور پک رہی ہے۔ امریکی سفارت کاری کے اسرار ورموز جاننے کے دعوے دار بالکل ابتدا ہی میں شیخ رشید کو جناب واجپائی کے وزیرمہمان داری کے منصب سے اچانک ہٹا کر ان کی جگہ شوکت عزیز کو مقرر کرنے کی حکمت البتہ کچھ کچھ سمجھ رہے تھے، کیونکہ شوکت عزیز کی شہرت امریکیوں کے ایک اہم دوست اور دھیمے مزاج کے ڈپلومیٹ کی حیثیت سے مسلمہ ہے۔ گو کہ ابھی تک ایسی کوئی شہادت سامنے نہیں آئی جس کے حوالے سے اس سلسلے میں کوئی رائے قائم کی جاسکے لیکن یہ سمجھا جارہا تھا کہ وہ بھی برجیش مشرا کی طرح کوئی اہم رول ادا کررہے ہیں۔

6 جنوری کو بھارتی وزیراعظم کی جنرل پرویز مشرف سے ایک گھنٹہ ہونے والی ملاقات کو جس میں یشونت سنہا اور برجیش مشرا بھی ان کے ساتھ شامل تھے، بڑی اہمیت حاصل تھی۔ لیکن ملاقات کے بعد جب اخبار نویسوں نے دونوں ممالک کے وزرائے خارجہ کا گھیراؤ کیا تو انہوں نے کوئی بات کہنے سے انکار کردیا۔ البتہ عوامی مزاج رکھنے والے وزیر اطلاعات شیخ رشید کی طرف سے ایک روز پہلے کہی گئی یہ بات کہ دونوں ممالک کے وزرائے خارجہ مشترکہ اعلامیہ تیار کررہے ہیں، ابھی تک میڈیا کو کھٹک رہی تھی کہ اور وہ شدت سے کسی ''بریک تھرو'' کے منتظر تھے۔ جب شیخ رشید کے اس بیان کے حوالے سے یشونت سنہا سے سوال کیا گیا تو انہوں نے برملا کہا کہ شیخ رشید اچھے وزیر اور سیاست دان تو ہوسکتے ہیں لیکن اچھے ڈپلومیٹ نہیں ثابت ہوئے۔ بہت کم لوگوں کو اس بات کی سمجھ آئی کہ دراصل بھارتی وزیرخارجہ کا یہ بیان بھی اسی خفیہ ڈپلومیسی کا حصہ تھا جس پر سختی سے دونوں طرف کے ذمہ دار عمل پیرا تھے۔

اسی روز ٹھیک دو بجے بھارتی وزیرخارجہ کے مشیر خصوصی ایک اہم پریس کانفرنس میں مشترکہ اعلامیہ پڑھ رہے تھے جو بلاشبہ ایک بڑا ''بریک تھرو'' اور سب کو چونکا دینے والا اعلان تھا۔ اس مشترکہ اعلامیہ میں بتایا گیا کہ کشمیر سمیت تمام متنازعہ مسائل پر فروری میں دونوں ممالک کے درمیان جامع مذاکرات ہوں گے۔ بیان میں کہا گیا کہ اعتماد کی بحالی کے لئے اقدامات سے مثبت رجحان مزید مستحکم ہوگا۔ تعمیری مذاکرات سے آئندہ نسلوں کے لئے اقتصادی ترقی کی طرف پیش رفت ممکن ہوگی۔ تشدد اور دہشت گردی کو روکا جائے گا اور صدر پاکستان نے یقین دہانی کروائی ہے کہ وہ پاکستانی علاقے کو دہشت گردی کے لئے ہرگز استعمال نہیں ہونے دیں گے۔ یشونت سنہا نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ دہشت گردی کے خلاف دونوں ممالک مشترکہ کارروائی بھی کرسکتے ہیں اور امن کے اس عمل کو آگے بڑھانا جنوبی ایشیا میں رہنے والے سب لوگوں کی ذمہ داری ہے۔ مذاکرات کے لئے تاریخ کا تعین اور طریقہ کار ابھی طے ہونا باقی ہے اور دونوں ممالک کے

Marfat.com

ذمہ داران اس سلسلے میں تفصیلات طے کر رہے ہیں جن کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔

یہی بیان یشونت سنہا کے بعد خورشید محمود قصوری نے ایک کانفرنس میں پڑھا کر سنایا۔ دونوں وزرائے خارجہ پر سوالات کی بوچھاڑ کی گئی۔ اخبار نویس ''اندر کی بات'' جاننے کے لئے بے چین تھے۔ کچھ رپورٹرز نے اشتعال انگیز سوالات بھی کئے لیکن دونوں وزرائے خارجہ نے کسی سوال کا جواب جذباتی انداز سے نہیں دیا۔ بڑے دھیمے انداز سے جواب دیتے ہوئے دونوں کی طرف سے پریس کے لوگوں سے درخواست کی گئی کہ وہ امن اور صلح کے اس مشن کو آگے بڑھانے کے لیے دونوں حکومتوں کا ساتھ دیں اور کنفیوژن پھیلانے کے بجائے دونوں حکومتوں کی معاونت کریں۔ دونوں نے میڈیا سے درخواست کی کہ وہ ذمہ داری کا احساس کرے۔

بھارت وزیراعظم کے مشیر برجیش مشرا نے اس سوال کے جواب میں کہ انہوں نے آئی ایس آئی کے سربراہ سے ملاقات کی ہے؟ کا بڑا ذو معنی جواب دیا اور کہا کہ انہوں نے انٹیلی جنس کے سربراہ سے نہیں البتہ انٹیلی جنس لوگوں سے ملاقاتیں کی ہیں جب کہ ذمہ دار اور باخبر حلقوں کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے جنرل احسان سے طویل نشستیں کیں جن میں بیش تر معاملات طے پا گئے تھے اور یہ سلسلہ صرف یہیں تک محدود نہیں تھا بلکہ انہوں نے سیکیورٹی کے حوالے سے پاکستانی حکومت کے بہت سے ذمہ داروں سے بھی مذاکرات کیے جب کہ ان مذاکرات کی نگرانی پس پردہ رہ کر امریکی حکام بھی کرتے رہے جنہوں نے اس مرحلے پر جب بات بگڑنے لگتی تھی اس میں مداخلت کر کے اسے دوبارہ سنوارا۔

برجیش مشرا' ایوان صدر کے اہم ترین ذمہ داروں جن میں طارق عزیز' جنرل حامد جاوید اور چھ سابقہ اور موجودہ اہم سفارت کار بھی شامل ہیں' بھارتی صدر کی آمد سے پہلے ہی مذاکرات شروع کر چکے تھے اور ایک مشترکہ اعلامیہ کی تیاری جاری تھی۔ اس کی کچھ بھنک بھارتی پریس کو مغربی ذرائع سے پڑ چکی تھی اور وہ بار بار یشونت سنہا سے مشترکہ اعلامیہ کے حوالے سے گھما پھرا کر سوال کر رہے تھے' جن کا جواب طے شدہ ڈپلومیسی کے مطابق یشونت سنہا کی طرف سے نفی میں دیا جا رہا تھا۔ بعض حلقے اس بات کا دعویٰ بھی کر رہے تھے کہ پاکستانی اور بھارتی دفتر خارجہ کو آخری مرحلے تک اس صورت حال سے بے خبر رکھا گیا کیوں کہ یشونت سنہا اور خورشید محمود قصوری کوئی مشترکہ اعلامیہ تیار کرنے میں ناکام رہے تھے البتہ تیاری مکمل ہونے کے بعد وزیراعظم جمالی اور وزیر خارجہ قصوری کو صدر نے اعتماد میں لیا اور آخری مرحلے پر تمام تفصیلات ان کے علم میں آئیں۔

اگر گزشتہ تین سال کی صورت حال کا تجزیہ کیا جائے تو دونوں ممالک کی طرف سے اختیار کی گئی اس پالیسی کو بہترین اور بروقت کہا جائے گا۔ دونوں طرف سے اطمینان اور آہستگی سے قدم بہ قدم آگے بڑھنے کا فیصلہ ہوا ہے اور یہ بھی طے کیا گیا کہ اس مرتبہ بطور خاص راز داری کا اہتمام کیا جائے' کیوں کہ ماضی میں آگرہ مذاکرات کی ناکامی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ دونوں سربراہوں کے درمیان تیار شدہ مشترکہ اعلامیہ کا ڈرافٹ انتہا پسندوں کے ہاتھ لگ گیا تھا جنہوں نے مسائل کھڑے کر دیے تھے۔

اس روز شام کو جنرل پرویز مشرف نے بھی پریس کانفرنس سے خطاب کیا جس میں انہوں نے اپنے اور بھارتی وزیراعظم کے درمیان طے پانے والے معاملات سے پریس کو آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے بھارت کے ساتھ کوئی

Marfat.com

خفیہ ڈیل کی ہے نہ ہی مسئلہ کشمیر کو پس پشت ڈالا ہے۔ البتہ صدر مشرف نے بھی میڈیا سے یہی درخواست کی کہ وہ اپنی ذمہ داری کا احساس کریں اور اسے ایک دوسرے کی فتح شکست بنانے کی بجائے جنوبی ایشیا کے عوام اور امن پسندوں کی فتح کہا۔ (روزنامہ جنگ سنڈے میگزین 18 جنوری 2004ء منصف طارق اسمٰعیل ساگر)

2005ء میں ڈھاکہ میں تیرہویں سارک سربراہ کانفرنس ملے جلے ردعمل سے ختم ہوئی۔ بدقسمتی سے جنوبی ایشیا کے ممالک کا یہ نیٹ ورک ابھی تک کوئی بڑا معرکہ سرانجام نہیں دے سکا ہے۔ اس برس بھی کئی تجاویز سامنے آئیں اور ان کی منظوری بھی دی گئی مگر سوال یہ ہے کہ کیا ان تجاویز پر خلوص نیت سے عمل بھی ہو سکے گا یا گذشتہ برسوں کی طرح یہ تمام تجاویز بھی فائلوں میں بند ہو کر بھارت کی بالادستی کے خواب کے نیچے دب جائیں گی۔

بدقسمتی سے آبادی کے لحاظ سے غریب ترین خطہ کے مجبور و بے کس عوام کو خطِ غربت سے نیچے زندگی گزارنے پر مجبور کرنے میں حکومتی سربراہوں اور ان کے ذاتی مفادات کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ خاص طور پر بھارت کا رویہ ہمیشہ ایسا رہا ہے کہ اس نے نہ صرف اپنے عوام بلکہ خطہ کے دیگر ملکوں کے مفادات کو بھی اپنی ہٹ دھرمی کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔

ڈھاکہ میں ہونے والی تیرہویں کانفرنس کا ایجنڈا پچاس نکات پر مشتمل تھا جس میں سارک کے آئین میں تبدیلی کر کے افغانستان کو ممبر بنانے اور چین کو مبصر کا درجہ دینے کی بھی سفارش کی گئی۔ پاکستان نے اس تجویز کی حمایت کی اس بنیاد پر کہ یہ دو ممالک بھی خطہ میں اہم پوزیشن رکھتے ہیں اور سارک کو زیادہ فعال اور منظم بنانے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ افغانستان کو ممبر بنانے کی تجویز کی حمایت دراصل پاکستان کے اس ایجنڈا کا بھی حصہ ہے جس کی بنیاد پر پاکستان اپنے پڑوسی ملک سے دیرینہ مسائل کو حل کرنے میں دلچسپی رکھتا ہے۔

کانفرنس نے نئی دہلی میں سسمک سنٹر کے قیام اور ڈھاکہ میں زرعی مرکز اور سارک موسمیات سنٹر قائم کرنے کی بھی سفارش کی۔ سارک کانفرنس کے ایجنڈا میں شامل ایک اور اہم مطالبہ سارک ممالک کے سفر کے لئے ویزا کی پابندیاں نرم کرنے کا بھی تھا۔ اجلاس میں سیفٹا کو بھی متحرک کرنے کے لیے تصفیہ طلب امور پر غور کیا گیا' تاکہ جنوری 2006ء سے اس پلیٹ فارم کو بہتر انداز میں چلایا جا سکے۔ انسداد دہشت گردی کے لیے پروٹوکول کی منظوری اور سیاحت کا فروغ بھی ایجنڈے میں سرفہرست رہا۔

یہاں یہ ذکر کرنا بھی مناسب ہوگا کہ سارک کا آئین ممبر ممالک کے دوطرفہ تنازعات کو حل کرنے کے بارے میں خاموش ہے۔ امید کی جانی چاہیے کہ آئندہ برسوں میں اس طرف بھی دھیان دیا جائے گا۔ سارک کو اقوام متحدہ میں اپنے قیام کے اٹھارہ سال بعد مبصر کی حیثیت اس وقت ملی جب پاکستان سارک کا سربراہ تھا۔

پاکستان میں منعقدہ بارہویں سارک سربراہ کانفرنس میں ممبر ممالک کے درمیان آزادانہ تجارت کو فروغ دینے اور انسداد دہشت گردی کے پروٹوکول کی منظوری بھی شامل تھی۔

Marfat.com

سافٹا معاہدہ اور پاکستان کا معاشی مستقبل

اسلام آباد میں 12 ویں سارک سربراہ کانفرنس ختم ہوگئی۔ اس کانفرنس کے سیاسی فیصلوں کا رفتہ رفتہ علم ہوتا رہے گا اور ممکن ہے کہ چند فیصلوں کو معلوم کرنے کیلئے برسوں بیت جائیں لیکن اس کانفرنس میں معاشی تعاون کیلئے ضروری معاہدے مکمل ہوگئے ہیں۔ اسلام آباد کی سارک سربراہ کانفرنس میں سارک ممالک کے درمیان معاشی تعاون کیلئے ساؤتھ ایشیاء فری ٹریڈ ایریا پر دستخط ہوگئے جس کے بعد توقع ہے کہ ممبر ممالک کے درمیان تجارت کو فروغ حاصل ہو سکے گا۔ اس طرح اسلام آباد سارک سربراہ کانفرنس سارک قیام کے بعد پہلی مرتبہ اپنے اولین مقاصد کے مطابق کام کر رہی ہے۔ سارک کے مقاصد میں یہ شامل ہے کہ یہ تنظیم جنوبی ایشیاء کے کروڑوں عوام کی فلاح و بہبود کیلئے کام کریگی اور سارک ممالک تجارتی تعاون سے عوام کو بہت فائدہ ہوگا۔ سارک ممالک کے وزرائے تجارت نے سارک ممالک کے درمیان تجارت کے فروغ کیلئے اپریل 1993ء میں سارک ساپٹا (SAPTA) کے معاہدوں پر دستخط کئے تھے۔ اس معاہدہ کے تحت سارک ممالک کی تین ہزار 400 مصنوعات کو منتخب کیا گیا۔ آزاد تجارتی معاہدہ کے تحت دسمبر 1995ء میں ساؤتھ ایشیا فری ٹریڈ ایریا کا معاہدہ کیا گیا۔ اس وقت سے یہ معاہدہ ہوا میں معلق ہے اور سارک ممالک کے درمیان آزاد تجارت شروع نہیں ہوسکی ہے۔

بھارت نے 1995ء میں ڈبلیو ٹی او میں شمولیت کے بعد اس بات کا فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ پاکستان کو پسندیدہ تجارتی ملک میں شامل کر دیگا۔ بھارت نے اپنے اس فیصلہ پر عمل کرتے ہوئے پاکستان کو پسندیدہ تجارتی ملک کی فہرست میں شامل کر لیا تھا اور بھارت کا پاکستان سے بھی یہی مطالبہ تھا کہ ڈبلیو ٹی او کے تحت بھارت کو پسندیدہ تجارتی ملک کی فہرست میں شامل کیا جائے۔ ڈبلیو ٹی او کے تحت اگر کسی ملک کو دوسرے ملک سے سکیورٹی رسک ہے تو وہ اس ملک کو پسندیدہ تجارتی ملک قرار نہیں دے سکتا ہے۔ پاکستان نے ڈبلیو ٹی او کی اس چھوٹ سے فائدہ اٹھایا اور اب تک بھارت کو پسندیدہ تجارتی ملک میں شامل نہیں کیا ہے۔ پاکستان کا کہنا تھا کہ علاقہ میں کشمیر کے مسئلہ کے حل کے بغیر بھارت کو پسندیدہ تجارتی ملک کی فہرست میں شامل نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان بھارت سے یہ بھی مطالبہ کرتا رہا ہے کہ بھارت اپنی صنعتوں کو دی گئی خفیہ سبسڈی کو ختم کر دے۔ خاص طور پر بجلی اور سوئی گیس کے نرخ سے بھارت کی صنعتی پیداواری لاگت کم ہو جاتی ہے جبکہ پاکستان میں ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف کی ہدایات پر بجلی سوئی گیس اور دیگر یوٹیلیٹیز کے نرخ بہت زیادہ ہیں جس کی وجہ سے پاکستان میں 35 سے 40 فیصد زائد ہے۔ اس صورتحال کے باعث سافٹا پر عملدرآمد مشکل ہوتا جا رہا تھا۔

Marfat.com

پاکستان بھارت کے درمیان سیاسی تنازع نے سارک ممالک کے درمیان آزاد تجارت کو روک رکھا ہے لیکن اب یہی صورتحال رفتہ رفتہ تبدیل ہو رہی ہے۔ سال گزشتہ کے شروع میں دونوں ممالک کے درمیان سیاسی کشیدگی میں بے پناہ اضافہ ہو چکا تھا اور دونوں ممالک نے اپنے اپنے سفارتی عملہ کو کم کر دیا تھا۔ اس طرح دونوں ممالک نے اپنے اپنے ملک سے متعدد سفارتی عملے کو غیر سفارتی سرگرمیوں میں ملوث ہونے کا الزام لگا کر نکال دیا تھا جس کی وجہ سے دوطرفہ تجارت تو کجا سیاسی رابطے بھی بحال کرنا مشکل ہو چکا تھا۔ پاکستان کے وزیراعظم میر ظفر اللہ جمالی نے جب کنٹرول لائن پر سیز فائر کا اعلان کیا تو دونوں ممالک کے درمیان سیاسی تناؤ میں کمی آنی شروع ہوگئی اس اقدام کے باعث سارک سربراہ کانفرنس کا انعقاد ممکن ہو سکا اور دوطرفہ تجارتی سرگرمیوں میں اضافہ کی توقع پیدا ہوئی۔ سافٹا سارک ممالک کے درمیان آزاد تجارت کا معاہدہ ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سے پاکستانی مصنوعات کی بھارت برآمدات پر کیا اثرات پڑیں گے۔

اس بات کا جائزہ لینے کے لئے ضروری ہے کہ پاکستان اور سارک ممالک کے درمیان اور پاکستان و بھارت کے درمیان تجارت کا جائزہ لیا جائے۔ پاکستان اور سارک ممالک کے درمیان تجارتی حجم 47 کروڑ 7 لاکھ 53 ہزار ڈالر کا ہے۔ اس تجارتی حجم میں برآمدات 22 کروڑ 65 لاکھ 26 ہزار ڈالر کے لگ بھگ اور درآمدات 24 کروڑ 42 لاکھ 27 ہزار ڈالر ہے۔ اس تجارتی حجم میں پاکستانی برآمدات کا 50 فیصد کے لگ بھگ بنگلہ دیش کو ہوتی ہے۔ بنگلہ دیش کے لئے پاکستانی مصنوعات کی برآمدات کی مالیت 10 کروڑ 8 تا 10 لاکھ ڈالر ہے۔

پاکستان بھارت کو سالانہ 4 تا 5 کروڑ ڈالر کی اپنی مصنوعات برآمدات کرتا ہے جبکہ بھارت 18 تا 20 کروڑ ڈالر کی برآمدات کر رہا ہے جبکہ بھارت سے بھاری تعداد میں سمگل ہو کر بھی سامان پاکستان لایا جا رہا ہے جس کی مالیت 50 کروڑ ڈالر سے زائد بتائی جاتی ہے۔ پاک بھارت تجارت کے شروع ہوتے ہی منفی اثرات سب سے زیادہ پاکستانی مصنوعات پر پڑیں گے۔ خاص طور سے انجینئرنگ اور آٹو موبائل کی صنعت کے لئے پاک بھارت تجارت خطرے کی گھنٹی ہے۔ بھارت کی انجینئرنگ کی صنعت اعلیٰ معیار کی مصنوعات کی تیاری میں مہارت رکھتی ہے اسی طرح بھارتی انجینئرنگ کی صنعتوں کا معیار بھی اچھا ہوتا ہے۔ بھارتی انجینئرنگ کی مصنوعات کم قیمت ہیں یہی صورتحال آٹو موبائل کی صنعتوں کی ہے۔

بھارتی گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں کی قیمتیں پاکستانی گاڑیوں، موٹر سائیکلوں کے مقابلہ میں نصف سے بھی کم ہیں اگر موجودہ حالات میں بھارتی گاڑیاں اور موٹر سائیکل پاکستان کی مارکیٹوں میں لائی گئیں تو پاکستانی صنعتکار بھارتی مصنوعات کا مقابلہ کم قیمت اور اعلیٰ معیار کی تیار کی جائیں جس کے لئے ہمارے صنعتکار تیار نہیں ہیں۔ ہمارے صنعتکاروں نے اب تک نہ اپنی مصنوعات کو بہتر بنانے پر توجہ دی ہے اور نہ ہی انہوں نے قیمتوں کی کمی پر توجہ مرکوز رکھی ہے وہ ہر سال نہیں بلکہ ہر ماہ گاڑیوں کی قیمتوں میں اضافہ کرنے میں مصروف ہیں۔ اس کے علاوہ پاکستانی صنعتکار پاکستان میں گاڑیوں کی کھپت پوری نہیں کر پاتے۔ وہ بھارت سے کس طرح برآمدات بڑھا سکتے ہیں۔ بھارت پاکستان تجارت کے بعد بھارت کو پاکستان کی تیرہ کروڑ عوام کی مارکیٹ ملے گی لیکن پاکستانی تاجروں کو بھارت کی ایک ارب عوام کی مارکیٹ مل سکے گی۔ اس مارکیٹ سے فائدہ اٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ پاکستانی صنعتکار راتوں رات امیر ہونے کے خواب دیکھنا

Marfat.com

چھوڑ دیں وقت حالات بتا رہے ہیں کہ دنیا کی مارکیٹ میں یکم جنوری 2005ء سے وہی کمپنیاں تجارت کرنے کے قابل ہوں گی جس کی مصنوعات کا معیار اعلیٰ اور قیمتیں کم ہونگی۔ساؤتھ ایشیا میں پاکستان او بھارت کے درمیان سیاسی تناؤ کے باعث مارچ 1997ء میں بھارت انڈین اوشین رم ایسوسی ایشن فارکوآپریشن سے منسلک ممالک پر مشتمل ایک الگ تجارتی گروپ میں شمولیت اختیار کر لی ہے۔اس تجارتی گروپ میں سارک کے ارکان بنگلہ دیش اور سری لنکا بھی شامل ہیں اس طرح سارک ممالک میں اہم تجارتی ممالک انڈین اوشین رم میں شامل ہوں گے۔اس طرح پاکستان ایشیا کے اکثر ممالک سے تجارتی میدان میں الگ تھلگ ہو کر رہ گیا ہے۔ پاکستان کو ضرورت ہے کہ وہ سارک علاقائی تجارتی گروپ کو فعال بناتے ہوئے اس میں اپنی جگہ بنائے تا کہ 2005ء جنوری سے نافذ ہونے والے ڈبلیوٹی او کا مقابلہ کرنے کے لئے قابل ہو سکے۔ڈبلیوٹی او کا مقابلہ کرنے کے لئے ساری دنیا میں علاقائی تجارتی گروپ فعال ہو رہے ہیں۔ڈبلیوٹی او ہو یا علاقائی تجارت دونوں صورتوں میں صنعتکاروں کا کردار بڑی اہمیت کا حامل ہے۔سرپلس ایکسپورٹ اور اعلیٰ معیار کے لئے صنعتکاروں کو اپنا کردار ادا کرنا ہوگا اس سلسلہ میں حکومت کو اپنا کردار ادا کرنے کی ضرورت ہوگی۔ معاشی پالیسیوں کا تسلسل، پٹرول، یوٹیلٹی کے نرخوں میں کمی بہت ضروری ہے۔اس کے بغیر پاکستانی مصنوعات عالمی مارکیٹوں میں مسابقت نہیں کر سکیں گی۔(روزنامہ آواز لاہور — 20 جنوری 2004ء)

Marfat.com

بھارت کی آبی جارحیت

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے کشمیر کو پاکستان کی شہ رگ قرار دیا تھا اور بالکل درست قرار دیا تھا اس لئے کہ ہم جانتے ہیں کہ شہ رگ کے راستے دل سے سارا خون جسم کو فراہم ہوتا ہے اور اگر شہ رگ کاٹ دی جائے تو جسم کا سارا خون چند لمحوں میں نکل جاتا ہے اور جسم مردہ ہو جاتا ہے۔ قائداعظم کی سیاسی بصیرت اور عمیق تدبر کا یہ ناقابل تردید ثبوت ہے کہ انہوں نے بہت پہلے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ پاکستان جن دریاؤں سے سیراب ہوتا ہے اس کا منبع و سرچشمہ جنت نظیر وادی کشمیر ہے اور اگر خدانخواستہ کسی بھی وجہ سے ان دریاؤں کا پانی پاکستان کی طرف آنے سے روک دیا گیا تو پاکستان بے جان اور بنجر ہو جائے گا۔

اس ضمن میں قائداعظم کے خدشات اور اندیشے بالکل بجا تھے۔ یہ بات بہت تواتر اور دعوے کے ساتھ کہی جاتی رہی ہے کہ پاکستان روز اول سے ہی ہندوستان کی آنکھوں میں کانٹا بن کر چبھتا رہا ہے۔ اس نئی مملکت خداداد کے مخالفین کے دلوں میں یہ خیال راسخ ہو چکا تھا کہ ہندوستان کے نقشے پر جنم لینے والا یہ نیا ملک گھڑی دو گھڑی کا مہمان ہے۔ پھر سب کچھ پہلے جیسا ہی ہو جائے گا۔ لیکن جب ان کی امیدیں بر نہ آئیں تو انہوں نے مختلف ریشہ دوانیوں کا سہارا لینا شروع کیا جس کی فہرست خاصی طویل ہے۔ پاکستان کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرنے کیلئے جو حربے استعمال کئے گئے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ پاکستان کی سرزمین جن پانچ دریاؤں سے سیراب ہوتی ہے ان کا رخ موڑ دیا جائے۔ اس طرح نہ رہے گا بانس، نہ بجے گی بانسری۔ قائداعظم محمد علی جناح کی زندگی ہی میں ہندوستان نے پاکستان کی طرف بہہ کر آنے والے دریائے سندھ اور اس کے معاون دریاؤں کا پانی روکنے کی کوشش کی تھی۔ یکم اپریل 1948ء کو برصغیر کے ان نوزائیدہ ملکوں کے درمیان شروع ہونے والی کشیدگی خوفناک صورت اختیار کرتی جا رہی تھی جو بالآخر ان کے مابین پہلی جنگ پر منتج ہوئی۔

آخر کار 1960ء میں دریائی پانی کی تقسیم کے مسئلے کو حل کرنے کیلئے سندھ طاس معاہدے پر دستخط ہوئے۔ اس معاہدے کے تحت مغربی حصے میں واقع ہونے کی بناء پر پاکستان کا حق تسلیم کیا گیا۔ جبکہ ستلج راوی اور بیاس کے پانیوں سے استفادہ کا اختیار بھارت کو دیا گیا۔ اس معاہدے میں یہ شق بھی شامل تھی کہ ان تینوں مغربی دریاؤں پر جو پاکستان کی طرف بہتے ہیں، پن بجلی کی پیداوار کیلئے بھارت بجلی گھر تعمیر کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ زیر آب دروازے لگا کر پانی کو روکنے کی کوشش نہ کرے۔ لیکن یہ حالات کی ستم ظریفی ہے کہ ہندوستان سندھ طاس معاہدے کے تحت اپنے حصے کے دریاؤں کے پانی سے تو پوری طرح استفادہ کر ہی رہا ہے، ساتھ ہی اس معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے وہ پاکستان کی طرف بہنے والے دریاؤں کے پانی کو روکنے کی متعدد وارداتیں کر چکا ہے۔ پاکستان کے پانی پر تازہ ترین شب خون بگلیہار کے

Marfat.com

مقام پر مارا گیا ہے۔

بگلیہار ہندوستانی مقبوضہ جموں کشمیر میں جموں کے شمال میں 150 کلو میٹر دور ایک گاؤں ہے جو دریائے چناب کے کنارے آباد ہے اور اسی گاؤں کے قریب ہندوستان بگلیہار ڈیم کی تعمیر میں مصروف ہے۔ اس ڈیم کی تعمیر سے اسے 450 میگا واٹ بجلی حاصل ہونے کی توقع ہے، جس سے جموں کے ایک بڑے علاقے کو وہ بجلی فراہم کرنا چاہتا ہے۔

بگلیہار ڈیم کے سلسلے میں پاکستانی موقف بالکل واضع ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ ان دریاؤں پر جن کے پانیوں پر پاکستان کا حق تسلیم کیا گیا ہے، بھارت کو بجلی گھر تعمیر کرنے کی مشروط اجازت دی گئی ہے اور بھارت دریائے چناب پہ جو بگلیہار ڈیم تعمیر کر رہا ہے وہ سندھ طاس معاہدے کی خلاف ورزی ہے اسلئے کہ بگلیہار ڈیم پر جو زیر آب پٹ (گیٹس) لگائے جا رہے ہیں اسکے ذریعہ بھارت دریائے چناب کے پانی کو روک کر اپنے پاس ذخیرہ کرنا چاہتا ہے اس طرح ڈیم میں پانی کی ذخیرہ اندوزی کی گنجائش ایک لاکھ 64 ہزار ایکڑ فٹ تک بڑھ جائے گی جو مقررہ حد سے کہیں زیادہ ہے۔ اسکے نتیجے میں پاکستان کو یومیہ آٹھ ہزار کیوسک پانی سے محروم ہونا پڑے گا۔ علاوہ ازیں دسمبر سے فروری کے دوران جبکہ دریاؤں میں پانی پہلے ہی کم ہوتا ہے، کسی وقفے کے بغیر مسلسل 26 روز تک پانی کی فراہمی معطل ہو سکتی ہے۔

بگلیہار ڈیم پر کام شروع کرنا اس لحاظ سے بھی سندھ طاس معاہدے کی خلاف ورزی ہے کہ اس کے تحت بھارت دریائے چناب پر پاکستان کی پیشگی منظوری کے بغیر کوئی تعمیراتی کام شروع نہیں کر سکتا۔ تاہم دونوں ملکوں کے درمیان جو کشیدہ تعلقات رہے ہیں اسکے پیش نظر پانی جیسے سرچشمہ حیات مسئلہ پر بھارت نے پاکستان کے ساتھ محض اس خیال سے صلاح مشورہ کرنا ضروری نہیں سمجھا کہ پاکستان اس میں بلاوجہ مین میخ نکالے گا۔ دونوں ملکوں میں جو شکوک و شبہات عدم اعتماد کی فضا پائی جاتی ہے اس کی وجہ سے ہندوستان نے ڈیم کی ڈیزائننگ پر پاکستان سے مشورہ نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور اس طرح سندھ طاس معاہدے کی خلاف ورزی کی گئی۔ ایک ایسے وقت میں جبکہ پاکستان میں خود پانی کی شدید قلت ہے اور صوبے پانی کے بحران پر باہم دست و گریباں ہیں اگر ہمیں ہمارے جائز قانونی 8 ہزار کیوسک پانی سے روزانہ محروم کیا جاتا رہا تو یہ بہت بڑا المیہ ہوگا اور آنے والی نسلیں ہمیں اس غفلت پر معاف نہیں کریں گی۔ یہ ہماری بقاء کا سوال ہے اور بعض قانونی ماہرین کے مطابق یہ اتنا سنگین معاملہ ہے کہ پاکستان بین الاقوامی قوانین کے تحت اس مسئلے پر ہندوستان کے خلاف اعلان جنگ کر سکتا ہے۔ ہندوستان میں بھی ایسے انتہا پسندوں کی کمی نہیں ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ کشمیر میں مبینہ دراندازی روکنے اور اس سلسلے میں پاکستان کو سزا دینے کیلئے بگلیہار ڈیم بنانا ضروری ہے اور اس سے سندھ طاس معاہدے کی خلاف ورزی ہوتی ہے تو ہونے دیں۔

سندھ طاس معاہدے کے تحت اگر پاکستان اور بھارت کے مستقل انڈس واٹر کمشنر باہمی گفت و شنید کے ذریعہ اپنے مسائل کو حل کرنے سے قاصر رہیں تو معاہدہ کی دفعہ 9 کے تحت متعلقہ فریق اس معاملے کو کسی غیر جانبدار ماہر یا پھر ثالثی کی بین الاقوامی عدالت (Court of Arbitration) تک لے جا سکتا ہے۔ سات ارکان پر مشتمل اس عدالت کے دو دو ارکان جس میں چیئرمین بھی شامل ہوتا ہے ان چھ افراد میں سے لئے جاتے ہیں جن کے نام معاہدے میں درج ہیں۔ چیئرمین کے انتخاب کیلئے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل یا عالمی بینک کے صدر برائے تعمیر نو و ترقی کے ناموں پر غور ہو

Marfat.com

سکتا ہے۔انجینئر رکن کیلئے فہرست میں میساچوسٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی، کیمرج کے صدر یا امپریل کالج آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی لندن کے ریکٹر شامل ہیں۔قانونی ارکان کے انتخاب کیلئے فہرست میں امریکہ کے چیف جسٹس یا انگلستان کے لارڈ چیف جسٹس کے نام شامل کئے گئے ہیں۔

بگلیہار ڈیم کے مسئلے کو حل کرنے کیلئے پاکستان اور ہندوستان کے درمیان مذاکرات کے کئی دور ہو چکے ہیں اور اب تک ہورہے ہیں۔اکتوبر 2003ء میں نئی دہلی میں، جنوری 2004ء میں اسلام آباد میں، اسی سال مئی میں ایک بار پھر نئی دہلی میں ماہرین کی ملاقات ہو چکی ہے۔18 جنوری 2004ء کو اسلام آباد میں دونوں ملکوں کی تکنیکی ماہرین کے درمیان سہ روزہ مذاکرات کے بعد بھارتی انڈس واٹر کمشنر ڈی کے مہتا نے پاکستانی صحافیوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا تھا کہ ان ملک پاکستان کے اعتراضات دور کرنے کیلئے بگلیہار ڈیم کے ڈیزائن میں تبدیلی پر آمادہ ہے۔اس سے پہلے پاکستان کی ایک تین رکنی تکنیکی ماہرین کی تیم جس کی قیادت پاکستان کے کمشنر برائے انڈس واٹر سید جماعت علی شاہ کر رہے تھے اکتوبر 2003ء میں نئی دہلی میں اپنے ہم منصبوں سے مذاکرات کے علاوہ مجوزہ بگلیہار ڈیم کا معائنہ بھی کر چکی تھی، گزشتہ سال 21 اکتوبر کو ڈیم کے مقام کا دورہ کرنے کے بعد پاکستانی تکنیکی ماہرین نے اس بات کی تصدیق کر دی تھی کہ یہ ڈیم انڈس واٹر ٹریٹی کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بنایا جا رہا ہے۔پاکستانی ماہرین نے یہ بات بھی واضح کر دی کہ ہندوستان کے اس دعویٰ میں کوئی صداقت نہیں ہے کہ جس جگہ ڈیم بنایا جا رہا ہے وہاں گیٹس کے بغیر بند بنانا ممکن نہیں ہے۔علاوہ ازیں سندھ طاس معاہدے کے مطابق پانی کی جو مقدار ذخیرہ کرنے کی اجازت دی گئی ہے بگلیہار ڈیم میں اس سے دگنی مقدار میں پانی ذخیرہ کرنے کی گنجائش رکھی گئی ہے۔

لاہور میں انڈس واٹرز کے پاکستان کمیشن کے ماہرین کے ساتھ طویل صلاح مشورہ کے بعد حکومت پاکستان نے گذشتہ سال 7 نومبر کو بھارت کو دوسرا اور حتمی نوٹس بھیج دیا تھا، جس میں اس سے کہا تھا کہ وہ فوری طور پر بگلیہار ڈیم کے مسئلے کو حل کرے۔اس سے پہلے جون میں جو پہلا نوٹس بھیجا گیا تھا اس میں ہندوستانی حکومت سے فوری طور پر مجوزہ ڈیم پر تمام تر تعمیراتی کام روک دینے کا مطالبہ کیا گیا تھا اور یہ بھی کہا گیا تھا کہ 31 دسمبر 2003ء تک اس معاملے کو طے کرنے کیلئے وہاں کے معائنہ جاتی دورے کے انتظامات کئے جائیں۔

پاکستان ہندوستان کے درمیان جو متنازعہ معاملات ہیں ان میں صرف بگلیہار ڈیم کا معاملہ ہی نہیں ہے بلکہ ایک اور ڈیم بھی وجہ مناقشت بنا ہوا ہے لیکن اسکی تفصیلات ابھی منظر عام پر نہیں آئی ہیں۔یہ دوسرا ڈیم کشن گنگا ڈیم ہے جو بھارت دریائے نیلم کے رخ کو موڑنے اور اسکا پانی دریائے جہلم پر بنے وولر بیراج کو پہنچانے کے لئے تعمیر کرنا چاہتا ہے۔بھارت میں دریائے نیلم کو کشن گنگا کے نام سے پکارا جاتا ہے۔سندھ طاس معاہدے کے تحت بھارت اس کا مجاز نہیں ہے۔پاکستانی ماہرین نے اس سال مئی میں نئی دہلی میں اپنے ہندوستانی ہم منصبوں سے مذاکرات کے بعد اسلام آباد پہنچ کر بتایا کہ بھارت نے یہ یقین دہانی کرائی ہے کہ وہ کشن گنگا ہائیڈرو پاور ڈیم پر ہر قسم کا تعمیراتی کام چھ ماہ کیلئے روک دے گا اور کوشش کرے گا کہ پاکستان کے اس ضمن میں جو تحفظات ہیں وہ دور کئے جا سکیں۔اس کے بعد ہی وہاں دوبارہ کام شروع ہوگا۔

یہ کہنا بھی درست نہیں ہوگا کہ ہندوستان نے کبھی سندھ طاس معاہدے کی پابندی نہیں کی۔ان دنوں جس طرح

Marfat.com

بگلیہار ڈیم مسئلہ بنا ہوا ہے، اسی طرح ایک زمانے میں سلال ڈیم پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جھگڑے کی بنیاد بن گیا تھا، لیکن پھر 1978ء میں باہمی مذاکرات اور سلال ڈیم معاہدے پر دستخط کے بعد بالآخر اس مسئلے کو حل کر لیا گیا تھا جس طرح سلال ڈیم کے مسئلے کو بات چیت کے ذریعے حل کیا گیا تھا اسی طرح بگلیہار ڈیم کا معاملہ بھی طے ہو سکتا ہے۔ یہ کوششیں ناکام ہوئیں تو پاکستان نے عالمی بینک سے رجوع کیا جو لندن میں اس کیس کی سماعت کر رہا ہے۔

بگلیہار ڈیم کے مسئلے پر پاکستان اور ہندوستان کے درمیان سیکرٹری سطح کی تازہ ترین بات چیت 21/22/ جون 2004ء نئی دہلی میں ہوئی۔ 9 گھنٹے طویل مذاکرات کے بعد پاکستان کے سیکرٹری پانی و بجلی اشفاق محمود نے صحافیوں کو بتایا کہ ہم نے اس مسئلے کو اس طرح حل کیا ہے کہ اس میں دونوں ملکوں کی جیت ہو اور کسی کو ہارنے کا احساس نہ ہو۔ اس سلسلے میں ایک وسیع البنیاد معاہدے پر اتفاق ہو گیا ہے۔ مذاکرات کامیاب رہے ہیں اور تنازعات کو تقریباً حل کر لیا گیا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اس زیادہ پیش رفت کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ اگرچہ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ مسئلہ کس حد تک حل ہو گیا ہے اور پاکستان کے ایک وسیع رقبے کو بنجر ہونے سے روکنے کی کوششیں کہاں تک کامیاب رہی ہیں۔

جن دنوں بگلیہار ڈیم کے مسئلے پر نئی دہلی میں پاک ہند سیکرٹری سطح کے مذاکرات ہو رہے تھے ان ہی دنوں چین کے شہر کنگ ڈاؤ میں دونوں ملکوں کے وزرائے خارجہ ایک دوسرے سے ملاقات کر رہے تھے۔ اس موقع پر بھارتی وزیر خارجہ نٹور سنگھ نے کہا تھا کہ اگرچہ دونوں ملک بہت تیزی سے مسائل حل کرنے کی جانب پیش رفت کر رہے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس راستے میں دشواریاں نہیں ہیں۔ ہمیں پیچیدگیوں کا بھی سامنا ہے اور اہم سوالات کے جوابات بھی ڈھونڈنے ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ کوئی نہ کوئی راستہ نکل ہی آئے گا۔ پاکستان کے وزیر خارجہ خورشید محمود قصوری اپنے ہندوستانی ہم منصب سے چین میں ملاقات سے پہلے گذشتہ ماہ کے شروع میں اپنے ملک کی قومی اسمبلی کو بتا چکے ہیں کہ ہندوستان نے بگلیہار ڈیم کے سلسلے میں پاکستان کے خدشات دور کرنے کیلئے جزوی طور پر اس کا مطالبہ تسلیم کرتے ہوئے پاکستانی ماہرین کو موقع کا معائنہ کرنے کی اجازت دی تھی اور اس معائنے میں یہ بات دیکھی گئی کہ بگلیہار ڈیم سندھ طاس معاہدے کے مطابق تعمیر نہیں کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اس سال جنوری میں اسلام آباد میں اس مسئلے پر پاکستان انڈیا کمیشن کا جو اجلاس ہوا تھا وہ بھی نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکا۔ لہٰذا ہم یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ اگر ہندوستان نے اس منصوبے پر تعمیراتی کام نہیں روکا اور پاکستان کے خدشات کا ازالہ نہیں کیا تو پھر پاکستان اس مسئلے پر عالمی بینک سے رجوع کرنے پر مجبور ہوگا، جو سندھ طاس معاہدے کا ایک فریق اور ضامن ادارہ ہے۔

ادھر صورتحال یہ ہے کہ بگلیہار پروجیکٹ مکمل ہونے کے قریب ہے اور اس سال کے آخر تک بھارت اپنے اس پن بجلی گھر سے جموں و کشمیر کے وسیع علاقے کو بجلی کی فراہمی یقینی بنانے کی کوششوں میں شب و روز مصروف ہے۔ ہمیں مقبوضہ علاقوں میں بجلی کی فراہمی پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن یہ بات یقیناً قابل اعتراض اور قابل گرفت ہے کہ دوسروں کے گھروں کے چراغ بجھا کر اپنے گھر میں چراغاں کیا جائے۔ ہندوستان کی حکومت کو اس نکتے پر غور کرنا چاہئے۔

(روزنامہ جنگ۔ جولائی 2004ء)

Marfat.com

معاہدہ امرتسر

گلابو، جو بعد میں مہاراجہ گلاب سنگھ کے نام سے مشہور ہوا، ابتدا میں قلعہ منگلا کے قلعہ دار کے پاس تین روپے ماہوار پر ملازم تھا۔ بعد میں اس نے بھمبر کے جاگیردار سلطان خان اور پھر آخر میں رنجیت سنگھ کے ہاں سپاہی کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی۔ گلاب سنگھ کے ساتھ اس کے دو بھائی دھیان سنگھ اور سچیت سنگھ بھی رنجیت سنگھ کے ہاں ملازم تھے۔ بعد میں گلاب سنگھ کو جموں، دھیان سنگھ کو پونچھ اور سچیت سنگھ کو رام نگر کی جاگیریں دی گئیں۔

1839ء میں رنجیت سنگھ کی موت پر لاہور دربار رنجیت سنگھ کے وارثوں اور فوجی سربراہوں کے درمیان جنگ اقتدار کی آماجگاہ بن چکا تھا۔ اسی اثناء میں سکھوں اور انگریزوں کی کشمکش بھی شروع ہو چکی تھی۔ گلاب سنگھ نے خفیہ طور پر لاہور دربار کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دینا شروع کیا۔ فروری 1846ء میں وہ ننگِ انسانیت معاہدہ طے پایا جو ''معاہدہ امرتسر'' کہلاتا ہے سات لاکھ کشمیریوں کو سات روپے فی کس کے عوض فروخت کر دینے والے اس معاہدے کی بناء پر آج بھارتی حکومت کشمیر پر اپنی حاکمیت کا دعویٰ کرتی ہے۔ ''معاہدہ امرتسر'' کے مکمل متن کا ترجمہ یہ ہے:

دفعہ1: حکومت برطانیہ تمام پہاڑی علاقہ مع دریائے سندھ کے مشرق اور دریائے راوی کے مغرب کا درمیانی علاقہ مع چھمب، اور بغیر لاہور کے جو 9 مارچ 1846ء کی ''معاہدہ لاہور'' کی دفعہ 6 کے تحت ریاست لاہور کو دے دیا گیا ہے، مہاراجہ گلاب سنگھ اور ان کی اولاد نرینہ کے آزاد قبضے میں تبدیل کرتی ہے۔

دفعہ 2: خطہ زمین کی مشرقی سرحد، جو کہ مندرجہ بالا دفعہ کے تحت مہاراجہ گلاب سنگھ کے نام منتقل ہو گئی ہے، اس مقصد کیلئے حکومت برطانیہ اور مہاراجہ گلاب سنگھ کی طرف سے مقرر کردہ کمشنر طے کریں گے اور سروے کے بعد ایک الگ انتظام کے تحت اس کا تعین کیا جائے گا۔

دفعہ 3: مہاراجہ گلاب سنگھ اور ان کے وارثوں کے نام مندرجہ بالا دفعات کی رو سے جو انتقال کیا گیا ہے، اس کے معاوضے میں مہاراجہ گلاب سنگھ حکومت برطانیہ کو 75 لاکھ روپے (نانک شاہی) ادا کرے گا۔ 50 لاکھ روپیہ اس معاہدے کے شروع ہوتے وقت اور 25 لاکھ روپیہ یکم اکتوبر 1846ء کو یا اس سے قبل ادا کر دیں گے۔

دفعہ 4: مہاراجہ گلاب سنگھ کے ان علاقوں کی سرحدیں کسی بھی وقت حکومت برطانیہ کی مرضی کی بغیر تبدیل نہ ہو سکیں گی۔

دفعہ 5: اگر مہاراجہ گلاب سنگھ اور ریاست لاہور یا کسی اور پڑوسی ریاست کے درمیان کوئی متنازعہ مسئلہ کھڑا ہو تو اسے طے کرنے کیلئے انہیں حکومتِ برطانیہ کو ثالث مقرر کرنا ہوگا اور حکومتِ برطانیہ کا فیصلہ ان کیلئے قابلِ قبول ہوگا۔

دفعہ 6: مہاراجہ گلاب سنگھ اور ان کے ورثاء اپنی تمام قوت کے ساتھ برطانوی سپاہیوں کے ساتھ شامل ہو جائیں گے، جب وہ پہاڑوں پر یا ان کے مقبوضہ علاقوں کے پڑوس میں مصروف ہوں گے۔

Marfat.com

دفعہ 7: برطانوی حکومت مہاراجہ گلاب کو بیرونی حملہ آوروں سے بچانے میں اس کی مدد کرے گی۔

دفعہ 8: مہاراجہ گلاب سنگھ برطانوی حکومت کی اطاعت قبول کرتے ہیں اور اس اطاعت کی نشانی کے طور پر برطانوی حکومت کو ہر سال ایک گھوڑا 12 بکریاں اعلیٰ نسل کی (چھ بکریاں اور چھ بکرے) اور تین جوڑے کشمیری شالوں کے پیش کریں گے۔

یہ معاہدہ آج کے روز فریڈرک کیوری اور میجر ہنری منٹگمری لارنس کے ذریعے رائٹ آنریبل سر ہنری ہارڈنگز، گورنر جنرل کے حکم سے برطانوی حکومت اور بہ نفس نفیس مہاراجہ گلاب سنگھ کے درمیان طے ہوا اور آج کے روز رائٹ آنریبل سر ہنری ہارڈنگز جی سی بی، گورنر جنرل کی مہر ثبت ہو کر منظور ہوا۔ (امرتسر میں آج ماہ مارچ کے سولہویں دن 1846ء عیسوی بمطابق ربیع الاول کے 17 ویں دن 1246 ہجری کو لکھا گیا)۔

دفعہ 9: مہاراجہ گلاب سنگھ اور ان کے ورثاء کے نام مندرجہ بالا دفعات کی رو سے انتقال ریاست کے عوض مہاراجہ گلاب سنگھ حکومت برطانیہ کو 75 لاکھ روپیہ نانک شاہی، جن میں سے 50 لاکھ روپیہ اس معاہدے کے شروع ہوتے وقت اور 25 لاکھ یکم اکتوبر 1846ء کو یا اس سے قبل ادا کر دیں گے۔

اس معاہدے کے مطابق یہ بھی طے پایا کہ وہ ہر سال ایک تنومند اسپ تازی، چھ پشم دار بکرے اور چھ بکریاں اور تین جوڑے کشمیری جامہ دار شالوں کا تحفہ خراج کے طور پر انگریز حاکموں کو ادا کرتا رہے گا۔

اس غیر اخلاقی بیع نامے کے شرمناک پہلوؤں پر ابوالاثر حفیظ جالندھری نے طنزیہ یہ کہا تھا:

وادیاں کہسار جنگل پھول اور سب اناج
ڈھور ڈنگر آدمی ، ان سب کی محنت کام کاج
یہ مویشی ہوں کہ آدم زاد ، ہیں سب زر خرید
ان کے بچے بچیاں ، اولاد ہیں سب زر خرید

اس معاہدے کو گاندھی جی نے ''بکری پتر'' کہا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اسے ریاستی عوام کی غلامی کی دستاویز کہا۔ کشمیر کی تحریک آزادی کے ایک سرکردہ سپاہی سردار بدھ سنگھ نے اس معاہدے کو دو ڈاکوؤں کے درمیان خرید فروخت کا نام دیا۔ مولانا محمد سعید مسعودی نے اسے ''نیلامی کے مال کا سند نامہ'' کہا اور مولانا غلام رسول مہر نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

1846ء میں انگریزوں نے کشمیر کو گلاب سنگھ ڈوگرا کے ہاتھ اس بے رحمی سے فروخت کیا کہ امریکی آبادکاری کے ابتدائی دور میں حبشی غلام بھی شاید اس طرح نہ بکے ہوں۔''

گلاب سنگھ کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ کشمیر کا گورنر امام دین تھا۔ گلاب سنگھ نے انگریزوں کی بروقت امداد سے امام دین کو شکست دی اور ریاست پر قبضہ کرلیا۔ چند دن کے بعد رانی پور اور راجوری کی جاگیروں میں بھی اس کے خلاف بغاوت رونما ہوئی، جسے انگریز فوجیوں کی مدد سے دبا دیا گیا۔ 19 نومبر 1846ء کو مہاراجہ گلاب سنگھ پوری ریاست جموں و کشمیر کا مالک و مختار بن کر انگریزی فوج کے ہمراہ سری نگر میں داخل ہوا اور اس طرح ریاست میں ڈوگرہ حکومت کے آغاز کے ساتھ ہی برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں ظلم و تشدد کے ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ (کشمیر الیوم۔ اپریل 2005ء)

Marfat.com

معاہدہ قائمہ

ریاست کشمیر کے وزیر اعظم کا تار بنام محکمہ ریاستی تعلقات حکومت پاکستان

(مورخہ 12 اگست 1947ء)

''حکومت جموں وکشمیران تمام امور کے بارے میں پاکستان سے معاہدات قائم کرنے کا خیر مقدم کرے گی جو اس وقت رخصت ہونے والی برٹش انڈیا گورنمنٹ سے موجود ہیں۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ موجودہ انتظامات اس وقت تک برقرار رکھے جائیں جب تک تفصیلات طے نہ ہو جائیں اور نئے معاہدات کی رسمی تعمیل شروع نہ ہو۔''

سیکرٹری وزارت خارجہ حکومت پاکستان کا تار بنام وزیر اعظم کشمیر

(مورخہ 15 اگست 1947ء)

''بحوالہ آپ کا تار مورخہ 12 اگست 1947ء حکومت پاکستان حکومت جموں وکشمیر سے معاہدہ قائم کرنے پر اپنے اتفاق کا اظہار کرتی ہے تاکہ موجودہ انتظامات کو اس وقت تک برقرار رکھا جا سکے جب تک تفصیلات طے نہ ہو جائیں اور نئے معاہدات کی رسمی تعمیل شروع نہ ہو۔''

S.C.O.R 4th Year Special Supple No.7 DCE.

S. 1430 (Add. Annex 43. PP. 162-63)

متنازعہ الحاق بارے مہاراجہ اور گورنر جنرل ہندوستان کی خط وکتابت

(1)

ہز ہائی نس مہاراجہ آف جموں وکشمیر کا خط بنام ہز ایکسی لینسی گورنر جنرل ہندوستان

(مورخہ 26 اکتوبر 1947ء)

''مائی ڈیر ماؤنٹ بیٹن!

میں جناب والا کو اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ میری ریاست میں شدید ہنگامی کیفیت پیدا ہو گئی ہے جس کی بنا پر میں آپ سے فوری مدد کی درخواست کرتا ہوں۔

جناب والا اس سے آگاہ ہیں کہ ریاست جموں وکشمیر نے ہندوستان یا پاکستان کسی ایک سے بھی الحاق نہیں کیا

Marfat.com

ہے۔ جغرافیائی لحاظ سے میری ریاست دونوں ہی مملکتوں سے ملحق ہے اور دونوں ہی کے ساتھ اس کے اہم اقتصادی اور ثقافتی رشتے ہیں۔

علاوہ ازیں میری ریاست کی سرحدیں روس اور چین سے بھی ملتی ہے اور ہندوستان و پاکستان دونوں مملکتیں اپنے خارجہ تعلقات کی اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتیں۔

مجھے یہ فیصلہ کرنے کیلئے وقت درکار تھا کہ میں کس مملکت کے ساتھ الحاق کروں یا کیا یہ صورت دونوں مملکتوں ہی کے مفاد میں بہتر نہ ہوگی کہ میں آزاد ہوں اور دونوں ہی سے دوستانہ تعلقات رکھوں۔ چنانچہ میں نے پاکستان اور ہندوستان کی مملکتوں سے معاہدات قائم کرنے کی درخواست کی۔ حکومت پاکستان نے اس معاہدے کو تسلیم کرلیا لیکن حکومت ہندوستان نے میری حکومت کے نمائندے سے مزید بات چیت کرنے کی خواہش ظاہر کی جس کا مندرجہ ذیل اسباب کی بنا پر میں انتظام نہ کرسکا۔ بہرحال اس معاہدے کی رو سے حکومت پاکستان ریاست کی اندرونی ڈاک اور تار کا انتظام کر رہی ہے۔

اگرچہ ہم پاکستان کے ساتھ معاہدہ قائمہ کر چکے ہیں اس کے باوجود اس حکومت نے اشیائے خورد و نوش نمک اور پٹرول کی سپلائی بند کردی ہے۔

آفریدیوں، سادہ لباس میں سپاہیوں اور جدید اسلحہ سے لیس لوگوں کو ریاست میں گھسنے دیا گیا ہے۔ یہ لوگ پہلے پونچھ سے داخل ہوئے، پھر سیالکوٹ کی طرف سے اور آخر میں ضلع ہزارہ سے ملحق علاقے رام کوٹ کی جانب سے گروہ در گروہ پہنچتے گئے نتیجہ یہ ہوا کہ محدود تعداد میں ریاستی سپاہ کو مختلف جگہوں پر تقسیم کردینا پڑا اور انہیں ایک ہی وقت میں کئی مقامات پر دشمن کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اب جان و مال کی تباہی اور لوٹ مار سے بچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ مہورا کا بجلی گھر جو تمام سری نگر کو بجلی سپلائی کرتا ہے، جلا دیا گیا ہے۔ مغویہ اور عصمت دریدہ عورتوں کی تعداد مجھے خون کے آنسو رلا رہی ہے۔ وحشی قوتیں جو ریاست میں در آئی ہیں۔ موسم گرما کی دارالحکومت سری نگر کی جانب تیزی سے اس مقصد کی خاطر بڑھ رہی ہیں کہ پوری ریاست پر قبضہ کیا جاسکے۔

شمالی مغربی سرحد کے دور دراز علاقوں سے بڑی تعداد میں باقاعدگی کے ساتھ مانسہرہ اور مظفر آباد کی سڑک پر سے ٹرکوں پر بیٹھ کر قبائلیوں کا ریاست میں داخل ہونا اور جدید اسلحہ سے پوری طرح لیس ہو کر آنا، یقیناً شمال مغربی سرحدی صوبے کے صوبائی حکام اور حکومت پاکستان کے علم کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ میری حکومت کی طرف سے بار بار کی درخواستوں کے باوجود ان حملہ آوروں کو روکنے یا ریاست میں داخل ہونے سے منع کرنے کیلئے کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا بلکہ ریڈیو پاکستان، پریس ان واقعات کا ذکر بھی کر رہے ہیں۔ پاکستان ریڈیو نے ایک کہانی یہ بھی گھڑی ہے کہ کشمیر میں ایک عارضی حکومت قائم کردی گئی ہے۔ لیکن میری ریاست کے عوام نے، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، اس میں کوئی حصہ نہیں لیا۔

چنانچہ میری ریاست میں پیدا ہونے والی موجودہ صورتحال اور شدید ہنگامی حالات کے پیش نظر میرے لئے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار ہی نہیں ہے کہ میں مملکت ہندوستان سے امداد طلب کروں۔ قدرتی طور پر مجھے یہ مدد اس وقت تک نہیں مل سکتی جب تک میری ریاست ہندوستان سے الحاق نہیں کرلیتی چنانچہ میں نے الحاق کا فیصلہ کرلیا ہے اور اس خط کے ہمراہ الحاق کے کاغذات آپ کی حکومت کی منظوری کیلئے ارسال کر رہا ہوں۔ میرے لئے دوسرا راستہ یہ ہے کہ میں

Marfat.com

ریاست کو حملہ آوروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دوں۔ ظاہر ہے کہ اس بنیاد پر کوئی مہذب حکومت قائم یا برقرار نہیں رہ سکتی۔ یہ راستہ میں اس وقت تک اختیار کرنا پسند نہیں کروں گا جب تک اس ریاست کا حکمران میں ہوں اور اپنے ملک کو بچانے کیلئے زندہ ہوں۔

میں جناب والا کو مطلع کر دینا چاہتا ہوں کہ میرا ارادہ ہے کہ فوری طور پر ایک عبوری حکومت قائم کروں اور شیخ عبداللہ سے کہوں کہ وہ میرے وزیر اعظم سے مل کر اس ہنگامی حالت میں ذمہ داری سنبھال لیں۔

اگر آپ میری ریاست کو بچانا چاہتے ہیں تو سری نگر کو فوری مدد کی ضرورت ہے تمام صورت حال سے آگاہ ہیں اور اگر مزید کسی استفسار کی ضرورت ہو تو وہ آپ کو بتا دیں گے۔ یہ تحریر بہت جلدی میں لکھی گئی ہے

بصد احترام
محل جموں
آپ کا مخلص
26۔ اکتوبر 1947ء
ہری سنگھ

(2)

ہز ایکسی لینسی گورنر جنرل ہندوستان کا خط بنام ہز ہائی نس

مہاراجہ آف جموں و کشمیر

مورخہ 27 اکتوبر 1947ء

''مائی ڈیئر مہاراجہ صاحب!

مسٹر وی پی۔ مینن نے آپ کا خط مورخہ 26۔ اکتوبر مجھے دیا۔

ان خصوصی حالات میں جو آپ نے بیان فرمائے ہیں، میری حکومت نے آپ کی ریاست کا الحاق ہندوستان سے منظور کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ہماری اس پالیسی کے پیش نظر کہ جس ریاست کا الحاق متنازعہ ہو، اس کے الحاق کا فیصلہ وہاں کے عوام کی خواہشات کے مطابق ہونا چاہئے، میری حکومت یہ چاہتی ہے کہ ریاست جموں و کشمیر میں نظم و نسق کی بحالی اور ریاست کو حملہ آوروں سے پاک کرنے کے بعد الحاق کا مسئلہ عوام کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے۔

اس اثناء میں آپ کی اس اپیل پر کہ آپ کو فوجی امداد دی جائے۔ ہندوستانی فوج کے دستے آپ کی فوج کی مدد کیلئے روانہ کئے جا رہے ہیں تاکہ آپ کے علاقے اور آپ کے عوام کی جان، مال اور عزت کی حفاظت کر سکے۔

میں اور میری حکومت اس بات پر اطمینان کا اظہار کرتے ہیں کہ آپ نے شیخ عبداللہ سے عارضی حکومت قائم کرنے اور آپ کے وزیر اعظم کے ساتھ مل کر کام کرنے کیلئے کہا ہے۔

بہترین خواہشات کے ساتھ
نئی دہلی میں ہوں آپ کا مخلص
27 اکتوبر 1947ء
ماؤنٹ بیٹن آف برما

Marfat.com

کمیشن اقوام متحدہ برائے بھارت و پاکستان کی قراردادیں

1۔ قرارداد منظور کردہ مورخہ 13 اگست 1948ء:

ریاست جموں و کشمیر کی موجودہ صورت حال کے بارے میں بھارت و پاکستان کے نمائندوں کے موقف پر احتیاط سے غور و خوض کرنے کے بعد اور۔۔۔۔ یہ رائے رکھتے ہوئے کہ لڑائی فوراً بند ہونا اور ان حالات کی اصلاح جن کے جاری رہنے سے بین الاقوامی امن اور سلامتی کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے، اقوام متحدہ کی ان مسائی کو بروئے کار لانے کے لئے ضروری ہے جو اس مسئلے کا آخری حل تلاش کرنے کی خاطر بھارت اور پاکستان کی حکومتوں کی مدد کیلئے اختیار کی گئی۔

بھارت اور پاکستان کی حسب ذیل تجاویز پیش کرنے کی قرارداد پیش کرتا ہے

(حصہ اول):

الف:

بھارت اور پاکستان کی حکومتیں ان تجاویز کو منظور کر لینے کے بعد چار دن کے اندر اندر کسی ایسی قریب ترین تاریخ کے تعین پر اتفاق کریں گی جب ہر دو حکومتوں کی متعلقہ ہائی کمانیں علیحدہ علیحدہ اور بیک وقت اپنے ماتحت جملہ افواج کو ریاست جموں و کشمیر میں جنگ بندی کے احکام جاری کریں گے۔

ب:

بھارت اور پاکستان کی افواج کی ہائی کمانیں ایسے اقدام سے اجتناب پر متفق ہوں گی جن سے ریاست جموں و کشمیر میں ان کی متعینہ افواج کی عسکری قوت میں اضافہ ہو۔

(جہاں تک ان تجاویز کا تعلق ہے زیر اختیار افواج کے مفہوم میں وہ تمام منظم اور غیر منظم سپاہ شامل ہیں جو ہر دو جانب حرب و ضرب میں شریک ہیں)

ج:

بھارتی اور پاکستانی افواج کیلئے جنگ بندی میں سہولت پیدا کرنے کی غرض سے فی الفور افواج کے موجودہ مواقع میں ضروری مقامی تبدیلیوں کے بارے میں مشورہ کرتے رہیں۔

د:

کمیشن اپنی دانست کے مطابق، اور جیسا وہ قابل عمل محسوس کرے، ایسے فوجی مبصر مقرر کرے گا جو کمیشن کے زیر اختیار اور دونوں ملکوں کی فوجی کمانوں کے تعاون سے جنگ بندی کے حکم پر عمل درآمد کی نگرانی کریں گے۔

ہ:

بھارت اور پاکستان کی حکومتیں اپنے عوام سے یہ اپیل کرنے پر اتفاق کرتی ہیں کہ وہ ایسا سازگار ماحول پیدا کرنے اور اسے برقرار رکھنے میں مدد دے گی جو مزید مذاکرات کو ترقی دینے کیلئے ممد و معاون ہو۔

Marfat.com

(حصہ دوم):

حصہ اول فوری جنگ بندی کی تجاویز قبول کرنے کے ساتھ ہی دونوں حکومتیں مندرجہ ذیل اصولوں کو معاہدہ صلح مرتب کرنے کی بنیاد کے طور پر قبول کرتی ہیں جن کی تفصیل دونوں کے نمائندوں اور کمیشن کی باہمی گفتگو سے طے پائیں گی۔

الف:

1۔ چونکہ پاکستانی افواج کی ریاست جموں وکشمیر کے علاقے میں موجودگی اس صورت حال میں، جو حکومت پاکستان نے سلامتی کونسل کے روبرو پیش کی تھی، نمایاں تبدیلی پیدا کر دیتی ہے، اس لئے حکومت پاکستان ریاست سے اپنی افواج ہٹا لینے پر رضامند ہے۔

2۔ حکومت پاکستان ریاست جموں وکشمیر سے قبائلوں اور ان پاکستانی شہریوں کو جو معمولاً وہاں بود و باش نہیں رکھتے اور وہاں جنگ کی غرض سے داخل ہوئے ہیں ہٹا لینے کی پوری پوری کوشش کرے گی۔

3۔ آخری فیصلہ ہونے تک جو علاقہ پاکستانی فوجوں نے خالی کر دیا ہے اس کا انتظام کمیشن کے زیر نگرانی مقامی حکام کریں گے۔

ب:

1۔ جب کمیشن بھارتی حکومت کو یہ اطلاع دے دے گا کہ وہ قبائلی اور پاکستانی شہری جن کر ذکر حصہ دوم الف (2) میں کیا گیا ہے، جموں وکشمیر سے چلے گئے ہیں، اور بنابریں وہ صورت حال ختم ہو چکی ہے جس کے متعلق بھارتی حکومت نے سلامتی کونسل کے سامنے کہا تھا کہ یہی بھارتی افواج کے جموں کشمیر میں داخل ہونے کا باعث ہوئی۔ نیز یہ کہ جموں وکشمیر سے پاکستانی افواج کا انخلاء عمل میں آ رہا ہے، تو بھارتی حکومت جیسا کہ کمیشن کے ساتھ طے پایا ہے، اقرار کرتی ہے کہ وہ ریاست سے اپنی بیشتر فوجوں کو آہستہ آہستہ واپس ہٹانا شروع کرے گی۔

2۔ ریاست جموں وکشمیر میں صورت حال کے آخری فیصلے کے متعلق شرائط قبول کرنے تک بھارتی حکومت ان حدود میں جو جنگ بندی کے وقت مقرر ہوئی تھی اپنی افواج کی وہ کم از کم تعداد رکھے گی جو کمیشن کے اتفاق رائے کے مطابق قانون وامن کو برقرار رکھنے کی خاطر مقامی حکام کی امداد کے لئے ضروری خیال کی جائے۔

3۔ بھارتی حکومت اس امر کی ضمانت دیتی ہے کہ ریاست جموں وکشمیر حتی الامکان وہ تمام تدابیر اختیار کرے گی جس سے عوام کو یہ اطلاع فراہم کی جائے کہ امن، قانون اور نظم وضبط کا تحفظ کیا جائے گا اور تمام انسانی اور سیاسی حقوق کی ضمانت دی جائے گی۔

ج:

اس معاہدہ صلح پر دستخط ہو جانے کے بعد اعلامیہ کا مکمل متن عوام کی اطلاع کے لئے شائع کیا جائے گا جس میں دونوں حکومتوں اور کمیشن کے مابین طے شدہ اصولوں کا اندراج ہوگا۔

Marfat.com

(حصہ سوم):

بھارت اور پاکستان دونوں کی حکومتیں اپنی ان خواہشات کی دوبارہ تصدیق کرتی ہیں کہ ریاست جموں وکشمیر کی آئندہ حیثیت عوام کی مرضی کے مطابق طے کی جائے گی اور اس مقصد کیلئے صلح نامہ کی شرائط کو قبول کر لینے کے بعد دونوں حکومتیں کمیشن سے اس بارے میں مذاکرات کریں گی ایسی مناسب اور منصفانہ شرائط متعین کی جائیں جن سے آزادانہ اظہار رائے کی ضمانت ہو۔

2 :۔(قرارداد منظور کردہ مورخہ 5 جنوری 1949ء):

کمیشن اقوام متحدہ برائے بھارت و پاکستان نے ہرگاہ کہ بھارت اور پاکستان کی حکومتوں سے ان کے مراسلات مورخہ 23 دسمبر اور 25 دسمبر 1948ء (علی الترتیب) کے ذریعے مندرجہ ذیل اصولوں کی منظور وصولی پالی ہے، جو کمیشن کی قرارداد منظور شدہ 13 اگست 1948ء ضمیمہ ہے لف ہذا:

1۔ ریاست جموں وکشمیر کے بھارت یا پاکستان سے الحاق کا مسئلہ آزاد اور غیر جانبدارانہ رائے شماری کے جمہوری طریقے سے طے پائے گا

2۔ استصواب اس وقت ہوگا جب کمیشن کو یہ وثوق ہو جائے گا کہ جنگ بندی اور صلح نامہ کی رائے شماری سے متعلق انتظامات کی تکمیل ہو چکی ہے، جو کمیشن کی قرارداد مورخہ 13 اگست 1948ء کے حصہ اول و دوم میں درج ہیں۔

3۔ (الف) سیکرٹری جنرل اقوام متحدہ کمیشن سے اتفاق رائے کے بعد ایک ناظم رائے شماری نامزد کرے گا جو ایک نہایت اعلیٰ بین الاقوامی شخصیت کا مالک اور بالعموم قابل اعتماد لیڈر تصور کیا جاتا ہو۔ اس کا باقاعدہ تقرر حکومت جموں وکشمیر کی طرف سے عمل میں آئے گا۔

(ب) ناظم رائے شماری وہ تمام اختیارات ریاست جموں وکشمیر سے حاصل کرے گا جنہیں وہ استصواب کے اہتمام اور کارروائی اور اس کے آزاد اور غیر جانبدار ہونے کی ضمانت کیلئے ضروری خیال کرے۔

(ج) ناظم رائے شماری کو مبصرین کی امداد کیلئے ایسے عملے کے تقرر کا اختیار ہوگا، جس کی وہ ضرورت محسوس کرے۔

4۔ (الف) کمیشن کی 13 اگست 1948ء کی قرارداد کے حصہ اول و دوم پر عمل درآمد اور کمیشن کے اس اطمینان پر کہ ریاست میں پُرامن حالات قائم ہو چکے ہیں، ناظم رائے شماری بھارتی حکومت کے ساتھ مشورہ کر کے بھارت اور کشمیر کی مسلح افواج کے آخری انخلا کا فیصلہ کرے گا، جس میں ریاست کے تحفظ اور استصواب کے آزادانہ ہونے کو بخوبی ملحوظ رکھا جائے گا۔

(ب) 13 اگست 1948ء کی قرارداد کے حصہ دوم، (الف) 6 میں جس علاقے کا ذکر کیا گیا ہے اس میں مسلح فوجوں کے آخری انخلا کا فیصلہ کمیشن اور ناظم رائے شماری مقامی حکام کے مشورے سے کریں گے۔

5۔ ریاست کے اندر تمام سویلین و فوجی حکام اور سرکردہ سیاسی عناصر استصواب کی تیاری اور کارروائی میں ناظم رائے شماری کے ساتھ تعاون کریں گے۔

Marfat.com

6۔ (الف) ریاست کے اندر تمام شہریوں کو جو فسادات کی وجہ سے جا چکے ہیں واپس آنے کی دعوت دی جائے گی اور اپنے تمام حقوق استعمال کرنے کی اجازت ہوگی۔ واپس آنے کی سہولت فراہم کرنے کیلئے دو کمیشن مقرر ہوں گے۔ ان میں سے ایک بھارت اور دوسرا پاکستان کے نمائندوں پر مشتمل ہوگا۔ یہ کمیشن نیز ریاست جموں وکشمیر کے تمام حکام ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کیلئے ناظم رائے شماری کے ساتھ تعاون کریں گے۔

(ب) تمام اشخاص (ریاست کے باشندوں کے علاوہ) جو 15 اگست 1947ء تک یا اس کے بعد ریاست میں قانونی مقاصد کے علاوہ وارد ہوئے ہیں، انہیں ریاست سے چلا جانا پڑے گا۔

7۔ ریاست جموں اور کشمیر کے جملہ حکام ناظم رائے شماری کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے اس امر کے ضامن ہوں گے کہ:

(الف) رائے شماری کے سلسلے میں ووٹروں کی کسی دھمکی، دباؤ، تخویف اور رشوت یا کسی اور ناواجب اثر سے مرعوب نہیں کیا جائے گا۔

(ب) تمام ریاست میں سیاسی زندگی کی سرگرمیوں پر کوئی پابندی نہیں لگائی جائے گی۔ ریاست کے تمام باشندے بلالحاظ عقیدہ، ذات یا جماعت بھارت یا پاکستان کے ساتھ الحاق کے بارے میں اپنے خیالات اور ووٹ اندازی کے معاملہ میں محفوظ ہوں گے۔ ریاست میں اخبارات کی آزادی، تقریر اور میل جول کی آزادی اور چلنے پھرنے کی آزادی ہوگی، جس میں ریاست کے اندر یا باہر جائز آمد ورفت کی آزادی بھی شامل ہے۔

8۔ جن مسائل کے لئے مدد درکار ہو، ناظم رائے شماری انہیں کمیشن اقوام متحدہ برائے بھارت و پاکستان کے سامنے پیش کرے گا، اور کمیشن چاہے تو ناظم رائے شماری کو یہ ہدایت کرسکتا ہے کہ وہ اس کی قائم مقامی میں کوئی ذمہ داری انجام دے جو اس کے سپرد کی گئی ہے۔

9۔ استصواب کے ختم ہونے پر ناظم رائے شماری کمیشن اور حکومت جموں وکشمیر کو اس کے نتیجے سے مطلع کرے گا۔ ازاں بعد کمیشن سلامتی کونسل کے سامنے اس امر کی تصدیق کرے گا کہ رائے شماری آزادانہ اور غیر جانبدارانہ ہوئی ہے یا نہیں۔

10۔ صلح نامے پر دستخط ہونے کے بعد کمیشن کی 13 اگست 1948ء کی قرارداد کے حصہ سوم میں جو مشورے مدنظر ہیں۔ ان کے مطابق محولہ بالا تجاویز کی تفصیلات کی توضیح وتشریح کی جائے گی۔ استصواب ان مشوروں میں پوری طرح شریک رہے گا۔

11۔ بھارت اور پاکستان کی حکومتوں سے سفارش کی جاتی ہے کہ وہ کمیشن کی 13 اگست 1948ء کی قرارداد کے مطابق طے شدہ معاہدہ کی تعمیل کرتے ہوئے یکم جنوری 1949ء کو رات کے بارہ بجے سے ایک منٹ پہلے جنگ بندی کا حکم جاری کرنے کے سلسلے میں فوراً کارروائی کریں اور طے کرتا ہے کہ فی الفور ہی برصغیر میں واپس آکر ان ذمہ داریوں کو انجام دے گا جو اس پر 13 اگست 1948ء کی قرارداد اور مذکورہ بالا اصولوں کے مطابق عائد ہوتی ہیں۔

Marfat.com

ایوب نہرو مشترکہ اعلامیہ

(29 نومبر 1962ء)

صدر پاکستان اور وزیراعظم ہند نے اس امر پر اتفاق کیا ہے کہ کشمیر اور دیگر متعلقہ معاملات پر دونوں ملکوں کے درمیان موجود اختلافات کو دور کرنے کی از سرنو کوشش کرنی چاہیے تاکہ بھارت اور پاکستان امن و دوستی سے ایک دوسرے کے ساتھ رہ سکیں۔ چنانچہ اُنہوں نے باعزت اور منصفانہ سمجھوتے پر پہنچنے کے مقصد کیلئے جلد ہی مذاکرات شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ مذاکرات ابتدا میں وزارتی سطح پر ہوں گے۔ مناسب مرحلہ پر پنڈت نہرو اور صدر ایوب کے درمیان براہ راست گفت وشنید ہوگی۔

(Documents on the Foreign Relation of Pakistan. The Kashmir Question

(کے سرور حسن۔ 397)

وزارتی سطح پر مشترکہ اعلامیہ

(16 مئی 1963ء)

29 نومبر 1962ء کو پاکستان کے صدر اور بھارت کے وزیراعظم نے ایک مشترکہ بیان جاری کیا۔ جس میں دونوں ممالک کے درمیان کشمیر اور دوسرے متعلقہ تنازعات کا حل تلاش کرنے کیلئے از سرِ نو کوششوں کی ضرورت پر زور دیا۔ تاکہ پاکستان اور بھارت دوستی اور امن کے ماحول میں ساتھ ساتھ چل سکیں۔ اس بیان میں صدر پاکستان اور وزیراعظم ہند نے اتفاق کیا کہ جلد از جلد بات چیت کا آغاز کیا جائے اور اس کی ابتداء وزارتی سطح پر کی جائے تاکہ باعزت اور مساوی حل تلاش کرنے کا مقصد حاصل کیا جا سکے۔ اس مقصد کے حصول کیلئے پاکستان کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو اور بھارت کے وزیر ریلوے سردار سورن سنگھ کے درمیان 26 دسمبر 1962ء اور 16 مئی 1963ء کے دوران چھ اجلاسوں میں متعدد نشستیں ہوئیں۔ یہ نشستیں راولپنڈی، نیو دہلی، کلکتہ اور کراچی میں ہوئیں۔ جس میں بے تکلفی اور تعاون کی فضا برقرار رہی۔ آخری نشست کے اختتام پر جو آج ختم ہوئی دونوں وزراء نے اس بات پر گہرے افسوس کا اظہار کیا کہ مسئلہ کشمیر پر کوئی معاہدہ نہیں ہو سکا۔ (کے۔ سرور حسن 398-399)

Marfat.com

وزارتی سطح پر مشترکہ اعلامیہ

(29 دسمبر 1962ء)

29 نومبر 1962ء کو صدر پاکستان اور وزیراعظم ہند نے ایک مشترکہ بیان میں اتفاق کیا کہ ''کشمیر اور دیگر متعلقہ معاملات پر دونوں ملکوں کے درمیان موجود اختلاف کو دور کرنے کی ازسرِ نو کوشش کرنی چاہیے تاکہ بھارت اور پاکستان امن و دوستی سے ایک دوسرے کے ساتھ رہ سکیں''۔

اس فیصلے کی روشنی میں بھارتی وزیر ریلوے سردار سورن سنگھ اپنے مشیروں کے ساتھ 26 دسمبر کو راولپنڈی آئے۔ تاکہ پاکستانی وزیر صنعت، قدرتی وسائل اور محنت اور اُن کے مشیروں کے ساتھ مذاکرات کیے جاسکیں۔ دونوں وزراء اور ان کے مشیروں نے 27 دسمبر کی صبح ایک رسمی اجلاس میں ملاقات کی۔ دونوں وزراء کے درمیان 28,27 اور 29 دسمبر کو پانچ ملاقاتیں ہوئیں، جن میں مسئلہ کشمیر کے مختلف پہلوؤں پر بحث ہوئی۔ آخری اجلاس میں دونوں وزراء کے مشیروں نے بھی شرکت کی۔ مذاکرات خوشگوار اور افہام وتفہیم کے ماحول میں منعقد ہوئے، جن میں آزادانہ اور دوستانہ طور پر تبادلہ خیال کیا گیا۔

وزراء نے اپنے مشترکہ اعلامیہ میں دونوں ملکوں کے راہنماؤں، سرکاری حکام، پریس، ریڈیو اور دوسرے تشہیراتی اداروں پر زور دیا کہ وہ مسئلہ کشمیر سمیت دوسرے تمام اہم مسائل کے حل کی جانب پیشرفت کیلئے خوشگوار فضا پیدا کرنے میں اپنا کردار ادا کریں اور کسی بھی ایسے بیان، تنقید یا پروپیگنڈے سے باز رہیں۔ جو ان مذاکرات کی کامیابی کو سبوتاژ کر کے دونوں ممالک میں اختلافات پیدا کر دے۔ (کے۔ سرور حسن 397)

اعلان تاشقند

(10 جنوری 1966ء)

وزیراعظم بھارت اور صدر پاکستان نے تاشقند میں ملاقات کی۔ بھارت اور پاکستان کے باہمی تعلقات کی موجودہ صورت حال پر بحث کرنے کے بعد وہ ان ممالک کے درمیان نارمل اور پُرامن تعلقات کی بحالی اور ان کے عوام کے درمیان افہام وتفہیم اور دوستانہ تعلقات کی ترقی کے مضبوط عزم کا اعلان کرتے ہیں۔ ان (سربراہوں) کا خیال ہے کہ ان مقاصد کا حصول بھارت اور پاکستان کے ساٹھ کروڑ عوام کی فلاح و بہبود کے لئے بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔

(1) وزیراعظم بھارت اور صدر پاکستان اس بات پر اتفاق کا اظہار کرتے ہیں کہ دونوں فریق اقوام متحدہ کے چارٹر کے تحت پاکستان اور بھارت کے درمیان بہترین دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی پوری پوری کوشش کریں گے وہ (اقوام

Marfat.com

متحدہ کے چارٹر کے تحت) اپنے اس وعدے کا اعادہ کرتے ہیں کہ وہ قوت کا استعمال نہیں کریں گے اور اپنے تنازعات پُرامن ذرائع سے حل کریں گے۔ان کا خیال ہے کہ اس علاقے میں اور بالخصوص برصغیر پاک و ہند میں امن کے مفادات اور بھارت اور پاکستان کے عوام کے مفادات کو ہرگز تقویت نہیں ملے گی جب تک دونوں ممالک کے تعلقات میں کھچاؤ باقی رہے گا۔اس پس منظر میں جموں وکشمیر پر بات چیت کی گئی اور دونوں فریقوں نے اپنا اپنا مؤقف پیش کیا۔

(2) بھارت کے وزیراعظم اور صدر پاکستان اس پر متفق ہیں کہ دونوں ممالک کے مسلح دستے 25 فروری 1966ء سے پہلے پہلے اپنی اُن پوزیشنوں پر واپس بلالئے جائیں جہاں وہ 25 اگست 1965ء سے پہلے تعینات تھے،اور یہ کہ دونوں فریق جنگ بندی لائن پر سیز فائر کی شرائط کی پابندی کریں گے۔

(3) وزیراعظم بھارت اور صدر پاکستان اس پر اتفاق کرتے ہیں کہ بھارت اور پاکستان کے باہمی تعلقات کی بنیاد یہ اصول ہونا چاہیے کہ دونوں ممالک ایک دوسرے کے داخلی معاملات میں مداخلت نہ کریں۔

(4) وزیراعظم بھارت اور پاکستان اس پر اتفاق کرتے ہیں کہ دونوں ممالک ایک دوسرے کے خلاف پروپیگنڈے کی حوصلہ شکنی کریں گے اور ایسے پروپیگنڈے کی حوصلہ افزائی کریں گے جو دونوں ممالک کے درمیان دوستانہ تعلقات میں مُمدّ ومعاون ہو۔

(5) وزیراعظم بھارت اور صدر پاکستان اس پر اتفاق کرتے ہیں کہ بھارتی ہائی کمشنر برائے پاکستان اور پاکستانی ہائی کمشنر برائے بھارت اپنے اپنے عہدوں پر واپس چلے جائیں گے اور دونوں ممالک کے سفارتی مشن حسب معمول اپنا اپنا کام بحال کردیں گے سفارتی تعلقات میں دونوں حکومتیں وی آنا کنونشن 1961ء کی پابندی کریں گی۔

(6) وزیراعظم بھارت اور صدر پاکستان نے بھارت اور پاکستان کے درمیان اقتصادی اور تجارتی تعلقات،مواصلات اور ثقافتی تبادلوں کی بحالی پر نیز موجودہ معاہدوں پر عمل درآمد کے لائحہ عمل پر بھی غور کرنے پر اتفاق کیا ہے۔

(7) وزیراعظم بھارت اور صدر پاکستان نے اس پر اتفاق کیا کہ وہ اپنے اپنے متعلقہ حکام کو جنگی قیدیوں کے تبادلے کے بارے میں احکامات جاری کریں گے۔

(8) وزیراعظم بھارت اور صدر پاکستان نے اس پر اتفاق کیا کہ دونوں فریق مہاجرین کی بے دخلی اور غیر قانونی داخلے کے مسائل پر گفت وشنید جاری رکھیں گے۔اُنہوں نے اس پر بھی اتفاق کیا کہ دونوں فریق ایسے حالات پیدا کریں گے کہ وطن چھوڑنے کا عمل رک جائے۔اُنہوں نے اس جائیداد اور ان اثاثوں کی واپسی کے بارے میں گفت وشنید پر بھی اتفاق کیا ہے جن پر کسی فریق نے جنگ کے دوران میں قبضہ کرلیا تھا۔

(9) وزیراعظم بھارت اور صدر پاکستان نے اس پر اتفاق کیا کہ دونوں فریق اُن مسائل پر گفت وشنید کرنے کیلئے جو اُن سے براہ راست تعلق رکھتے ہیں،اعلیٰ اور دیگر سطحوں پر آپس میں ملاقات کرتے رہیں گے۔دونوں فریقوں نے اس ضرورت کے احساس کا بھی اظہار کیا کہ مشترکہ بھارتی و پاکستانی تنظیمیں بنائی جائیں جو اپنی حکومتوں کو اس امر پر مشورے دیں کہ مزید اقدامات کیا اُٹھائے جانے چاہئیں۔

وزیراعظم بھارت اور صدر پاکستان،سوویت یونین کے لیڈروں،سوویت حکومت اور ذاتی طور پر چیئرمین آف

Marfat.com

دی کونسل آف منسٹرز آف دی ''یو۔ایس۔ایس۔آر'' کیلئے اس امر پر گہری تحسین اور تشکر کا اظہار کرتے ہیں کہ اُنہوں نے اس قابل اطمینان فیصلے پر منتج ہونے والی ملاقات کے انعقاد میں نہایت تعمیری، دوستانہ اور شریفانہ انداز میں حصہ لیا۔

وہ از بکستان کے دوست عوام اور حکومت کا بھی نہایت خلوص سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ اُنہوں نے شاندار استقبال اور مہمان نوازی کا ثبوت دیا۔ وہ چیئرمین آف دی کونسل آف منسٹرز آف دی ''یو۔ایس۔ایس۔آر'' کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ بھی بطور گواہ اس اعلان پر دستخط ثبت کریں۔

وزیراعظم بھارت: لال بہادر شاستری صدر پاکستان: محمد ایوب خان
(بحوالہ: اعلانِ تاشقند، صفحہ 16 تا 19، مطبوعہ حکومت پاکستان، کراچی)

معاہدہ شملہ

(1) پاکستان اور بھارت کی حکومتیں باہمی طور پر پائی جانے والی کشیدگی کو ختم کرنے اور باہم دوستی و یگانگت کی فضا کو پروان چڑھانے کا عہد کرتی ہیں تاکہ دونوں ممالک کے مابین مستقل طور پر امن قائم ہو جائے اور ان کے ذرائع و وسائل عوام کی فلاح و بہبود پر صرف ہو سکیں۔ اس مقصد کیلئے پاکستان اور بھارت کی حکومتیں مندرجہ ذیل نکات پر اتفاق رائے کا اظہار کرتی ہیں۔

(الف) دونوں ممالک کے تعلقات اقوام متحدہ کے چارٹر کے مطابق استوار ہوں گے۔

(ب) دونوں ممالک باہمی تنازعات کو پُرامن طریقے سے دوطرفہ مذاکرات یا کسی بھی ایسے طریقے سے جس پر دونوں اتفاق کر لیں، حل کریں گے۔ جب تک باہمی تنازعات کا حتمی فیصلہ نہیں ہو جاتا، دونوں ممالک کے درمیان واقع سرحدوں پر کسی بھی ملک کی طرف سے کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔ نیز دونوں ممالک ایسی کارروائیوں کی حوصلہ شکنی کریں گے، جو ان کے مابین خوشگوار تعلقات کو متاثر کرتی ہوں۔

(ج) دونوں ممالک کے مابین اچھے تعلقات برقرار رکھنے کیلئے دونوں ممالک کی جانب سے اس اصول کی پابندی کی جائے گی کہ آپس میں پُرامن طور پر رہا جائے نیز دونوں ممالک ایک دوسرے کی سالمیت اور علاقائی خودمختاری کا احترام کریں گے اور ایک دوسرے کے اندرونی مسائل میں دخل نہیں دیں گے۔

(د) گذشتہ پچیس سال سے دونوں ممالک کے مابین جھگڑے کا سبب بننے والے مسائل کو حتمی طور پر حل کیا جائے گا۔

(ہ) دونوں ممالک ایک دوسرے کی سالمیت اور علاقائی خودمختاری کے تحفظ کا عہد کرتے ہیں۔

(و) دونوں ممالک اقوام متحدہ کے منشور کے تحت ایک دوسرے کے خلاف طاقت کے استعمال کی دھمکی سے گریز کریں گے۔

Marfat.com

(2) دونوں حکومتیں اپنے اپنے دائرہ کار میں ایک دوسرے کے خلاف پروپیگنڈہ بند کردیں گی اور تعلقات کوفروغ دینے کی معلومات کے تبادلے کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔

(3) دونوں ممالک کے مابین بتدریج تعلقات بہتر بنانے کے لئے درج ذیل نکات پر اتفاق کیا جاتا ہے۔

(الف) دونوں ممالک کے مابین ٹیلی مواصلات، ڈاک، ٹیلیگرام اور سفر کی سہولیات بہتر بنائی جائیں گی۔

(ب) ایک ملک کے شہریوں کو دوسرے ملک کے سفر کیلئے سہولتیں فراہم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(ج) دونوں ممالک کے درمیان تجارت اور اقتصادی تعاون کی راہیں استوار کی جائیں گی۔

(د) سائنس اور ثقافت کے شعبوں میں تعاون کو فروغ دیا جائے گا۔

(4) مستقل امن کے حصول کی خاطر دونوں حکومتیں یہ فیصلہ کرتی ہیں۔

(الف) دونوں ممالک اپنی اپنی افواج کو بین القوامی طور پر مسلمہ سرحدوں پر واپس پہنچائیں گے۔

(ب) ریاست جموں وکشمیر میں دونوں فریق اس کنٹرول لائن کا احترام کریں گے جو 17 دسمبر 1971 کو جنگ بندی کے موقع پر قائم ہوئی۔ دونوں میں سے کوئی بھی فریق موجودہ صورتحال کو کسی بھی طرح کے اختلافات کی بنا پر یا قانونی تعبیرات کے سہارے بدلنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ نیز دونوں فریق کنٹرول لائن کو بدلنے کی کسی بھی کوشش یا طاقت کے استعمال سے اجتناب کریں گے۔

(ج) فوجوں کے پیچھے ہٹانے کا عمل اس معاہدے پر عمل درآمد کی تاریخ سے شروع ہو جائے گا اور تیس دن کے اندر اندر مکمل ہو جائے گا۔

(5) یہ معاہدہ دونوں ممالک کے دستوری تقاضوں پر عمل درآمد کے بعد ضروری دستاویزات کی تصدیق اور تبادلے کے دن نافذ العمل ہو جائے گا۔

(6) دونوں ممالک کے سربراہ باہمی طور پر اتفاق رائے سے دوبارہ ملاقات کریں گے۔ اس کے علاوہ دونوں ممالک کے نمائندے بھی وقتاً فوقتاً آپس میں ملتے رہیں گے تاکہ تعلقات معمول پر لانے کا عمل جلد شروع ہو سکے اور امن کے اصول کی کوششیں تیز ہو سکیں۔ جنگی قیدی رہا ہو سکیں۔ ایک ملک میں پھنسے ہوئے دوسرے ملک کے شہری اپنے ملک میں واپس جا سکیں۔ کشمیر کا مسئلہ حتمی طور پر حل ہو سکے اور دونوں ممالک کے مابین سفارتی تعلقات بحال ہو سکیں۔

(دستخط)	(دستخط)
ذوالفقار علی بھٹو	اندرا گاندھی
(صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان)	وزیراعظم جمہوریہ ہند

(یہ معاہدہ جولائی 1972ء میں طے پایا)

Marfat.com

2005ء میں پاکستان کی دفاعی پیش رفت

پاکستان نے 2005ء کے دوران چار اہم دفاعی سنگ میل طے کیے۔ زمین سے زمین پر مار کرنے والے تین میزائلوں کے تجربات ہوئے جن میں نمایاں کروز میزائل "حتف سیون، بابر" کا اولین تجربہ بھی شامل تھا اس برس پاکستان نے تیسری نسل کے نئے لڑاکا طیارے "جے ایف 17 تھنڈر" کی اپنے طور پر تیاری کے منصوبے کا آغاز کیا لیکن یہ منصوبہ بہت جلد مشکلات اور ناکافی وسائل کی وجہ سے تعطل کا شکار ہو گیا۔ 5 اپریل 2005ء کو پاکستان ایروناٹیکل کمپلیکس کامرہ کی طیارہ ساز فیکٹری "اے ایم ایف" میں تھنڈر لڑاکا جہاز بنانے کا آغاز ہوا لیکن مطلوبہ وسائل، افرادی قوت، مہارت اور کچھ تکنیکی مسائل کی وجہ سے اس کی تیاری کا عمل رک گیا۔ اس برس پاکستان کی تاریخ میں فضائیہ کی سب سے بڑی مشقیں ہوئیں جو ایک ماہ تک جاری رہیں پاک بحریہ نے بھی ان مشقوں میں حصہ لے کر فضائی جوج کے ساتھ اشتراک کار اور ہم آہنگی کی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ 2005ء میں دفاعی شعبے کا چوتھا سنگ میل ایٹمی بجلی گھر "چشمہ ٹو" کا سنگ بنیاد تھا۔

پاکستان نے گزشتہ برس 22 سو کلومیٹر طویل فاصلے تک مار کرنے والے جدید ایٹمی میزائل "حتف 6، شاہین 2" کا کامیاب تجربہ کیا۔ 19 مارچ 2005ء کو اس میزائل نے "سونمیانی" کراچی کے ساحل سے لے کر 2000 کلومیٹر دور بحر ہند میں افریقی ساحلوں کے قریب واقع اپنے ہدف کو محض 15 منٹ میں نشانہ بنایا۔

31 مارچ کو "حتف 2 ابدالی" میزائل کا تجربہ کراچی میں بحیرہ عرب کے ساحل پر کیا گیا۔ "ابدالی" کی حد ضرب 180 کلومیٹر ہے۔ 11 اگست 2005ء کو پاکستان نے اپنے وسائل سے تیار کیے گئے کروز میزائل "حتف 7 بابر" کا تجربہ کامیابی سے کیا۔ 300 کلومیٹر تک مار کرنے کی صلاحیت رکھنے والا یہ کروز میزائل بھی کراچی میں سونمیانی کے ساحل سے داغا گیا۔

7 ستمبر 2005ء سے پاک فضائیہ کی جنگی مشقیں "ہائی مارک 2005ء" کا آغاز ہوا تین مراحل پر مشتمل ان فضائی مشقوں کے دوران پنجاب کے میدانوں، شمالی علاقہ جات کے کہساروں اور سندھ کے ساحلوں پر جنگ میں فضائیہ کی حربی استعداد و صلاحیت اور دفاعی اہلیت کو جانچا گیا۔ "ہائی مارک 2005ء میں ایف سولہ، میراج ایف 7 اور اے 5 جنگی طیارے شریک تھے۔ ان مشقوں کے دوران پاک فضائیہ کو دو متحارب افواج بلیو لینڈ اور فاس لینڈ میں تقسیم کیا گیا تھا۔

28 دسمبر 2005ء کو وزیراعظم پاکستان شوکت عزیز نے 325 میگاواٹ پیداواری صلاحیت کے بجلی گھر چشمہ 11 کا سنگ بنیاد رکھا یہ منصوبہ چین کی اعانت سے مکمل کیا جائے گا۔

روزنامہ جناح لاہور 26 جنوری 2006ء تحقیق تحریر: ناصر احمد مغل

Marfat.com

2005ء میں بھارت کے میزائل تجربات

تاریخ	نام میزائل	مقام	رینج
19 جنوری	ترشول	اڑیسہ	12 کلومیٹر
21 جنوری	آ کاش	اڑیسہ	27 کلومیٹر
25 فروری	آ کاش	اڑیسہ	27 کلومیٹر
26 فروری	آ کاش	اڑیسہ	27 کلومیٹر
20 مارچ	ناگ	مہاراشٹر	4 کلومیٹر
15 اپریل	براہموس	بحیرہ عرب	290 کلومیٹر
26 اپریل	ترشول	اڑیسہ	12 کلومیٹر
12 مئی	پرتھوی I	اڑیسہ	150 کلومیٹر
17 جون	آ کاش	اڑیسہ	25 کلومیٹر
20 جون	آ کاش	اڑیسہ	25 کلومیٹر
21 جون	آ کاش	اڑیسہ	25 کلومیٹر
25 جولائی	ترشول	اڑیسہ	9 کلومیٹر
26 جولائی	ترشول	اڑیسہ	9 کلومیٹر
03 اکتوبر	آ کاش	اڑیسہ (3 تجربات)	25 کلومیٹر
05 اکتوبر	ترشول	اڑیسہ	9 کلومیٹر
30 نومبر	براہموس	اڑیسہ	290 کلومیٹر
03 دسمبر	آ کاش	اڑیسہ	27 کلومیٹر
07 دسمبر	آ کاش	اڑیسہ	27 کلومیٹر
08 دسمبر	ترشول	اڑیسہ	9 کلومیٹر
28 دسمبر	پرتھوی II	اڑیسہ	250 کلومیٹر

(بھارتی وزارت دفاع کی ویب سائٹ)

Marfat.com

بھارت کا میزائل نیٹ ورک:

نمبر	نام	قسم	ٹیکنالوجی/ایندھن	حد ضرب	پے لوڈ
.1	پرتھوی I	زمین سے زمین	بیلسٹک (مائع)	150 کلومیٹر	1000 کلوگرام
.2	پرتھوی II	زمین سے زمین	بیلسٹک (مائع)	250 کلومیٹر	500 کلوگرام
.3	پرتھوی III	زمین سے زمین	بیلسٹک (مائع)	350 کلومیٹر	250 کلوگرام
.4	اگنی I	زمین سے زمین	بیلسٹک (ٹھوس)	800 کلومیٹر	1500 کلوگرام
.5	اگنی II	زمین سے زمین	بیلسٹک (ٹھوس)	2200 کلومیٹر	1000 کلوگرام
.6	براہموس	زمین سے زمین/ سمندر	کروز	290 کلومیٹر	200 کلوگرام
.7	ترشول	زمین سے فضا	گائیڈڈ (ٹھوس)	12 کلومیٹر	15 کلوگرام
.8	آکاش	زمین سے فضا	گائیڈڈ	27 کلومیٹر	70 کلوگرام
.9	ناگ	ٹینک شکن	فائر اینڈ فارگیٹ انفراریڈ	4 کلومیٹر	10 کلوگرام
.10	آسترا	فضا سے فضا	-	40-25 کلومیٹر	-

(بھارتی وزارت دفاع کی ویب سائٹ)

Marfat.com

بھارت کی کامیاب خارجہ پالیسی

امریکہ کی طرف سے بھارت کے لئے سویلین نیوکلیئر ٹیکنالوجی اور بھارت کی مرضی کا اسلحہ دینے کا اعلان ہو چکا اور برطانوی وزارت دفاع نے اعلان کیا ہے کہ عنقریب بھارتی اور برطانوی افواج مشترکہ جنگی مشقیں کرینگی چند ہفتے پہلے بھارت اور چین کے وفود ایک دوسرے کے ممالک کے انتہائی کامیاب دورے کر چکے ہیں۔ بھارت اور اسرائیل کا ہر شعبے میں باہمی تعاون عروج پر ہے۔ ایران بھارت کو ارزاں نرخوں پر تیل فراہم کر رہا ہے جبکہ گیس کی بھارت کو فراہمی کے لئے ایرانی قیادت مضطرب ہے۔ بھارت سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات سے بھی تیل درآمد کر رہا ہے۔ اپنی کامیاب خارجہ پالیسی کی بدولت بھارت اسرائیل اور عرب ممالک سے بیک وقت مفادات سمیٹ رہا ہے۔ عرب ممالک میں 3500000 بھارتی باشندے روزگار کے لئے مقیم ہیں۔ یہ لوگ ماہانہ کروڑوں ڈالر کا زرمبادلہ بھارت بھیجتے ہیں جس سے بھارتی قیادت جدید ترین اسلحہ خریدتی ہے۔ بھارت کی مسلسل یہ کوشش ہے کہ افغانستان اور وسطی ایشیائی ریاستوں سے بھی گیس درآمد کرلے۔ فرانس، جرمنی، سویڈن، کینیڈا اور جاپان بھارت کو سلامتی کونسل کی مستقل رکنیت دلانے کیلئے کوشاں ہیں۔ روس سے بھارت کے تعلقات سے پوری دنیا آگاہ ہے۔

بھارت جدید دنیا کی سب سے بڑی جمہوری مملکت ہے۔ عالمی مبصرین اسے ابھرتی ہوئی سپر پاور قرار دیتے ہیں۔ بھارت کی خارجہ حکمت عملی کے بانیوں نے اس کے تین اصول غیر وابستگی، غیر جانبداری اور آزادانہ رسائی متعین کئے ہیں۔ اس وقت بھارت غیر وابستہ ممالک کا سرخیل بنا ہوا ہے۔ بھارتی خارجہ حکمت عملی کے ماہرین اس امر پر زور دیتے رہے ہیں جنوبی ایشیا میں بھارت ہی سب سے بڑا ملک ہے۔ مہاتما گاندھی نے ایک مرتبہ کہا تھا:

Because of its size and location India will always be strategically important.

جو ممالک بھارت کی اس بڑائی کو تسلیم کرنے سے انکار کریں بھارت ان کے خلاف جارحیت کے ارتکاب کو بھی جائز سمجھتا ہے۔ 1948ء جونا گڑھ اور حیدرآباد پر جارحانہ قبضہ، کشمیر پر غاصبانہ تسلط، نیپال اور سری لنکا کے اندرونی معاملات میں مداخلت، سکم پر قبضہ، سقوط مشرقی پاکستان اور سیاچن گلیشیئر پر قبضہ بھارت کی جارحانہ خارجہ پالیسی کے غماز ہیں۔ پاکستان سے بھارت کے باہمی تعلقات کی تاریخ بارودی فضا کی حامل ہے۔ بھارت نے سری لنکا میں پہلے ہندو قاتلوں کی سرپرستی کی پھر ان کے قتل عام کے لئے چالیس ہزار فوج بھیج کر اسے Peace Keeping Force کا نام دیدیا۔ مالدیپ میں صدر کے سیاسی مخالفین کو کچلنے کے لئے بلا معاوضہ فوج بھیج دی۔ بھوٹان عملاً بھارت کے زیرنگیں ہے۔ نیپال میں بھارتی مداخلت سے پورا عالم واقف ہے۔ 1971ء میں کھلی جارحیت کے بعد آج بھارت نے ہمارے ملک پر

Marfat.com

ثقافتی یلغار کر رکھی ہے۔ ہمارے ہاں ہندووانہ تہوار، بسنت، بھارتی موسیقی کلچر اور شادی بیاہ کی بیہودہ رسومات بھارتی ثقافت کی آئینہ دار ہیں۔ بھارت اپنے داخلی مسائل کو اپنے ہمسایہ ممالک سے خارجہ تعلقات کی بنیاد بنا تا ہے۔ پاکستان سے کشمیر میں دراندازی، بنگلہ دیش سے غیر قانونی تارکین وطن کا داخلہ، نیپال کی سرحد سے دہشت گردوں کی آمد سب اسی ذیل میں آتے ہیں۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد پوری دنیا میں دو ایسے ممالک ہیں جن کی جغرافیائی سرحدیں فوجی کارروائی کے نتیجے میں پھیلی اور بڑھی ہیں۔ یہ دو ممالک آج کے بہترین دوست انڈیا اور اسرائیل ہیں۔ دونوں ممالک کی خارجہ پالیسی کا اہم جزو ہوس ملک گیری ہے۔ دونوں ممالک کی ریاستی دہشت گردی ایک عالمگیر حقیقت ہے۔

بھارت کے ایک ممتاز صحافی کلدیپ نیئر نے کچھ عرصہ قبل ایک بیان میں کہا تھا نئی دہلی کا یہ دعویٰ کہ اس کے پاکستان کے ماسوا تمام پڑوسی ممالک سے بہتر تعلقات ہیں حقائق پر مبنی نہیں ہے۔ صرف پاکستان ہی نہیں دیگر چھوٹے ہمسایہ ممالک کو بھی بھارت کے بارے میں شبہات اور شکایات ہیں ان کے بھارت مخالف اظہارات کم و بیش سامنے آتے رہتے ہیں۔ (ٹائمز آف انڈیا۔ 26 فروری 2006ء)

بھارت کی کامیاب خارجہ پالیسی اس کی سیکولر جمہوریت کی وجہ ہے۔ 1965ء کی جنگ کے بعد بھارت نے اپنی خارجہ پالیسی پر خاصی توجہ دی۔ 1965ء کی جنگ کے دوران ہمارے بہترین دوست ترکی ایران اور انڈونیشیا 1971ء کی جنگ میں غیر جانبدار ہے۔ ملائیشیا میں ٹنکو عبدالرحمان کی حکومت نے دونوں جنگوں میں بھارت کا ساتھ دیا۔ 1971ء کی جنگ کے فوراً بعد انڈونیشیا اور ملائیشیا نے بنگلہ دیش کو تسلیم کر کے بھارت کی اخلاقی امداد کی۔ 1971ء کی جنگ میں بیشتر عرب ممالک نے بالعموم اور روسی دوستی کے علم بردار عرب ممالک نے بالخصوص بھارت کو امداد فراہم کی۔ یہ امداد جدید ترین روسی سامان حرب و ضرب کی صورت میں فراہم کی گئی۔ افغانستان سے بھارت کے تعلقات (ماسوائے طالبان دور حکومت) ہمیشہ خوشگوار رہے ہیں۔ آج بھی ان دونوں کے درمیان گہرے روابط ہیں۔ 1974ء کی اسلامی سربراہی کانفرنس میں افغان مندوب عبدالرحمان پژواک نے بھارتی موقف کو سراہتے ہوئے بھارت کو اسلامی سربراہی کانفرنس میں مدعو کرنے پر زور دیا تھا۔ 70 کی دہائی میں بھارت نے مسلم ممالک سے تعلقات کو فروغ دیا۔ ترکی ایران لیبیا لبنان یمن الجزائر مراکش اور تیونس سے خصوصی تعلقات کو فروغ دیا۔ اپنی غیر وابستہ حیثیت میں پہلے ہی مصر شام فلسطینی قیادت اور افغانستان سے اس کے بہترین تعلقات تھے۔ افغانستان پر روسی جارحیت کی انڈیا نے بھرپور حمایت کی مسلم ممالک بھارتی قیادت کے اس قدر قریب تھے کہ ہزاروں کشمیری مسلمانوں کی شہادت پر ٹس سے مس نہ ہوئے۔ ایران کا آنجہانی شاہ 1974ء سے 1979ء تک بھارت کو خاص اہمیت دیتا رہا۔ خمینی انقلاب کے بعد نئی ایرانی قیادت نے بھی بھارت کو خصوصی اہمیت دی۔ ایران کی سرکاری نیوز ایجنسی ارنا بھارت کے حق میں پروپیگنڈا کرتی رہی۔ ایران کے ایک سابق وزیراعظم حسین موسوی بھارت کے زبردست ہمنوا تھے اپنے بعض تعصبات کی وجہ سے ایران کی انقلابی حکومت پاکستان کی سخت مخالف تھی جبکہ پاکستان نے ایران کو ہمیشہ برادر ملک سمجھا ہے۔ بھارتی قیادت نے ارزاں نرخوں پر تیل کے ساتھ ساتھ ایران سے مفادات حاصل کئے۔ ایران عراق جنگ کے دوران بھی انڈیا دونوں ممالک سے مفادات سمیٹتا رہا لیکن ہم

Marfat.com

دونوں کو ناراض کر بیٹھے۔

ستمبر کے بعد ہم نے ہر امریکی حکم مان لیا۔ اپنی افغان پالیسی پر 180 درجے کا یوٹرن لیا۔ عالم اسلام کا مسلمان ہم سے متنفر ہوگیا۔ یہود نصاریٰ کو خوش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہر قسم کا مفاد حاصل کرنے کے باوجود امریکی قیادت ہم سے دور رہی۔ نہ ہماری مکمل فوجی امداد بحال ہوئی نہ ہمیں مسئلہ کشمیر پر امریکی حمایت حاصل ہوئی۔ امریکہ کی جنگ ہم لڑ رہے ہیں اور ایٹمی معاہدے امریکہ بھارت سے کر رہا ہے۔ امریکہ نے ہمیں استعمال کرنے کے بعد ٹشو پیپر کی طرح پھینک دیا۔ ہم نے ایف 16 جہازوں کی قیمت ادا کر دی تھی امریکہ نے یہ طیارے فراہم نہ کئے لیکن بھارت نے یہ آفر مسترد کر دی۔ تاہم پیٹریاٹ میزائل اور دوسرا جدید ترین امریکی اسلحہ حاصل کرنے میں بھارت کو کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

بھارت کی موثر خارجہ پالیسی کی وجہ سے آج پورا عالم کفر اس کا پشت پناہ ہے۔ 90 فیصد سے زیادہ مسلم ممالک اس کے ہم نوا ہیں۔ روس کی ہر مارکیٹ بھارت کے لئے کھلی ہے۔ اگست 1971ء سے آج تک کسی بھی روسی حکومت نے بھارت کو کسی بھی قسم کے اسلحہ کی فراہمی سے انکار نہیں کیا۔ سویڈن نے جدید ترین لانگ رینج گنز بھارت کو مہیا کی ہیں۔ برطانیہ کی حکومت نے بھارتی فضائیہ کے لئے جیگوار طیارے اور بھارتی بحریہ کے لئے سی ہیرر طیارے فراہم کئے ہیں۔ فرانس نے اپنے جدید ترین طیارے میراج 2000 کی موجودگی کی وجہ سے بھارتی حکومت نے امریکی ایف سولہ کی آفر مسترد کی ہے۔

بھارت اسرائیلی اسلحے کا سب سے بڑا خریدار ہے ماضی قریب میں اسے اسرائیل سے تین ''اواکس'' مل چکے ہیں۔ اسرائیلی ٹینک مرکاوا اور آرٹلری گنز کے لئے مذاکرات جاری ہیں۔ بھارت کی خارجہ پالیسی اتنی کامیاب اور شاطرانہ ہے کہ اس نے بیک وقت اسرائیل اور عرب ممالک سے بہترین تعلقات قائم کر رکھے ہیں۔ فلسطینی چیمپئن یاسر عرفات بھارت کا سب سے بڑا ہمنوا تھا۔ مصر کے جمال عبدالناصر اور انور سادات بھارتی قیادت کے گرویدہ تھے۔ شام کا حافظ الاسد اور عراق کا احمد حسن البکر بھارتی دوستی کا دم بھرتے رہے۔ 1977ء سے لیبیا کا قذافی بھارت کا ہمنوا ہے۔ ایران ترکی مصر فلسطین شام یمن اور الجزائر اپنے فوجی افسروں کو انڈین ملٹری اکیڈمی ڈیرہ دون میں فوجی تربیت کے لئے بھیج رہے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ بھارت کے سفیر اور ان کا عملہ بیرون ملک شاندار خدمات انجام دے رہا ہے۔ بھارتی حکومت بیرونی ممالک میں سفیر مقرر کرتے وقت ان کی اہلیت اور میرٹ کو مدنظر رکھتی ہے جبکہ ہمارے ہاں ریٹائرڈ سینئر آرمی افسر وغیرہ کو سفیر نامزد کیا جاتا ہے۔ عرب ممالک میں بھارتی سفیروں اور عملے کی غالب اکثریت راسخ العقیدہ اور باعمل مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ دوران حج بھارتی مشنوں کی کارکردگی انتہائی عمدہ ہوتی ہے جبکہ ہمارے سفارتی عملے اور حج مشن سستی، کاہلی، اقربا پروری کی وجہ سے ملک کو بدنام کرتے ہیں۔ نومبر 2001ء کے بعد ہم نے دینی مدارس پر عرصہ حیات تنگ کیا ہے۔ غیر ملکی مسلم طلبہ کو ملک بدر کیا ہے کم عمر طلبہ کو ہتھکڑیاں پہنائی ہیں۔ ان عوامل کا بھارت نے خوب پروپیگنڈا کیا۔ ہمارے حکمرانوں کے سینکڑوں افراد کے ہمراہ سرکاری عمرے بھی ہماری خارجہ پالیسی میں مثبت تبدیلی نہیں لا سکے۔

Marfat.com

بادی النظر میں ہمارے حکمران بھارتی حکمرانوں سے پانچ گنا زیادہ بیرونی دورے کرتے ہیں۔ ہمارے صدر وزیراعظم کے بیرونی دورے سے زیادہ انڈین سفیر کارنامے انجام دیتے ہیں۔ کروڑوں کا زرمبادلہ اڑا کر ہمارے صدر اور وزیراعظم خالی ہاتھ واپس آتے ہیں۔ ہمارے وزیر خارجہ اور سپیکر قومی اسمبلی بھی بیرونی دوروں کے تمام ریکارڈ توڑ چکے ہیں۔ دنیا کے کونے کونے میں کئے جانے والے یہ سرکاری دورے محض سیر سپاٹا ثابت ہو رہے ہیں۔ ہمارے حکمران ان باتوں پر بہت اتراتے ہیں کہ ان کے لئے بیت اللہ شریف کے دروازے کھولے گئے جبکہ یہ سعادت کئی غیر ملکی مسلمان راہنماؤں کو بھی حاصل رہی ہے۔

آخر میں ہماری پوری قوم کے لئے لمحہ فکریہ ہے کہ بھارت کے سربراہان مملکت ہمارے حکمرانوں سے 80 فیصد کم بیرونی دورے کرنے کے باوجود بھی اپنی خارجہ پالیسی میں انتہائی کامیاب ہیں جبکہ ہمارے حکمران کروڑوں ڈالر ماہانہ بیرونی دوروں پر اڑا کر بھی اپنی خارجہ پالیسی میں انتہائی ناکام ہیں۔ جب بھی ہمارے حکمران بیرونی دورے سے واپس لوٹتے ہیں تو ذرائع ابلاغ پر سننے کو ملتا ہے کہ صدر، وزیراعظم امریکہ کے انتہائی کامیاب دورے سے وطن واپس پہنچ گئے۔ درحقیقت یہ کامیابی صرف امریکی صدور کے ساتھ فوٹو سیشن تک محدود ہوتی ہے۔

بھارت کی انتہائی کامیاب خارجہ پالیسی کی بنیادیں اس کی مضبوط جمہوری روایات، اعلیٰ اختیاراتی عدلیہ، مضبوط پارلیمنٹ، سفیروں اور ان کے عملے کی بہترین کارکردگی، سرکاری پالیسیوں میں تسلسل اور ماتحت ہائی کمان ہیں جبکہ ہماری خارجہ پالیسی کی ناکامی آمریت آئین شکنی بے اختیار عدلیہ نمائشی پارلیمنٹ نااہل بیرونی سفیر اور ان کا عملہ پالیسیوں میں یوٹرنز قومی معاملات پر اعلیٰ کمان کی کمزور گرفت اور اقربا پروری کی وجہ سے ہے۔

2006ء کے آغاز میں سعودی عرب کے شاہ عبداللہ کا دورہ بھارت اور مارچ میں امریکی صدر بش کا دورہ بھارت پاکستان کے سیاسی پنڈتوں کو چیتاونی دے رہا ہے کہ وہ محض بڑھکیں مارنے اور ٹی وی کی سکرینوں پر عقل و دانش کے دریا بہانے کے بجائے جدید ڈپلومیسی خارجہ حکمت عملی کے تقاضے سمجھیں اور بدلتی عالمی صورتحال کے مطابق اپنی ترجیحات کا تعین کریں بصورت دیگر ہم تیسرے درجے کا ملک بن کر رہ جائیں گے۔

Marfat.com

کتابیات

1. ڈاکٹر عبدالحمید۔Muslim Separatism in India۔آکسفورڈ یونیورسٹی پریس لاہور۔1971
2. احمد عباس خان۔Let India Fight for Freedom۔دی ساؤتھ میگزین بمبئے۔1943
3. جی الانہ۔Quaid-i-Azam Jinnah - The Story of a Nation۔فیروز سنز لاہور۔1967
4. ایم۔آر۔اے۔بیگ۔The Muslim Dilemma in India۔بک ٹریڈرز لاہور۔1980
5. نریندر سنگھ بھلیر۔سکھوں کے لیے ہندو اچھے یا مسلمان؟۔موہن پریس جالندھر (انڈیا)۔1966
6. مائیکل ایڈورڈ۔The Last Years of British in India۔Cassell لندن۔1963
7. نہرو۔اے پولیٹیکل بائیوگرافی۔پیلکن بکس یو کے۔1973
8. این۔کے۔موجدار۔جناح اینڈ گاندھی۔پیپلز پبلی کیشن لاہور۔1976
9. چوہدری محمد علی۔Emergence of Pakistan۔ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان۔پنجاب یونیورسٹی لاہور۔1979
10. رابرٹ پیون The Life and Death of Mahatama Gandhi۔Bodley Head۔لندن (یوکے)
11. سید شریف الدین پیرزادہ۔Foundation of Pakistan۔نیشنل پبلشنگ ہاؤس کراچی۔1970
12. ہفت روزہ ''مدینہ''۔بجنور۔بھارت
13. ہندوستان ٹائمز۔دہلی۔انڈیا
14. روزنامہ ملاپ۔جالندھر۔انڈیا
15. ہفت روزہ ''الجمعیۃ'' دہلی۔انڈیا
16. ماؤنٹ بیٹن کی رپورٹ نمبر 11 محررہ 4 جولائی 1947 بنام سیکرٹری آف سٹیٹ
17. ظفر اللہ خاں۔تحدیث نعمت۔ربوہ
18. ہفت روزہ ''نئی دنیا'' دہلی۔انڈیا
19. ہنری کسنجر۔White House Years۔امریکہ
20. Pakistan: The Formative Phase
21. وی پی مینن۔Transfer of Power of India
22. ہیرالڈ ٹریبون۔نیویارک
23. ایچ۔وی۔ہڈسن۔The Great Divide

Marfat.com

24. امرت بازار پتریکا۔جالندھر۔انڈیا
25. جنرل محمد ایوب خان۔Friends Not Masters
26. سٹیٹسمین ۔کلکتہ۔انڈیا
27. مہر چند مہاجن۔وکاس پبلشرز۔انڈیا۔On Look Back
28. جی ڈبلیو چوہدری۔پاک بھارت تعلقات1947-66
29. لارڈ ماؤنٹ بیٹن۔آٹو بائیو گرافی۔لندن
30. ہیکٹر بولیتھو۔پاکستان ناگزیر تھا۔(اردو ترجمہ)
31. سید کمال الدین احمد۔تاریخ حیدرآباد دکن اور رضا کار
32. شیخ محمد عبداللہ۔آتش چنار۔دہلی۔انڈیا
33. میجر جنرل محمد اکبر خان۔Raiders in Kashmir۔راولپنڈی
34. ایلن کیمبل۔Mission with Mountbaton۔لندن
35. آر۔ایس۔پٹیل۔India's Foreign Policy
36. ڈاکٹر محمد جہانگیر تمیمی۔غیر جانبدار تحریک مطبوعہ ہفت روزہ ندائے ملت16 تا22 جون2005
37. مصنف نامعلوم۔Indian Policies Toward Peace
38. سردار کپور سنگھ۔ساچی ساکھی (گورمکھی زبان)
39. محمد یوسف صراف۔Kashmir Fight for Freedom
40. تنازعہ جموں وکشمیر قرطاس ابیض وزارت خارجہ پاکستان۔جنوری1977
41. نیو یارک ٹائمز۔31 اکتوبر1962 کا اداریہ
42. واشنگٹن پوسٹ۔31 اکتوبر1962 کا اداریہ
43. ہربرٹ فیلڈ مین۔From Crisis to Crisis Pakistan
44. وزارت خارجہ پاکستان کا قرطاس ابیض
45. رگھوناتھ راون۔Soviet Policy Toward Pakistan
46. Kashmir Contemporary Archives
47. ڈاکٹر صفدر محمود۔East Pakistan Tragedy
48. حسن زمان۔ایسٹ پاکستان کرائسس اینڈ انڈیا
49. طارق اسمٰعیل ساگر۔RAW
50. اشوک رائنا۔Inside RAW
51. ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ۔لاہور
52. ماہنامہ حکایت۔لاہور

Marfat.com

53. ہفت روزہ قندیل۔لاہور
54. ہفت روزہ بادبان۔لاہور
55. ہفت روزہ زندگی۔لاہور
56. ہفت روزہ ندائے ملت۔لاہور
57. ہفت روزہ ٹائم۔امریکہ
58. ہفت روزہ نیوز ویک۔امریکہ
59. ہفت روزہ اکنامک ریویو
60. ہفت روزہ کرسچین سائنس مانیٹر
61. ہفت روزہ آتش فشاں۔لاہور
62. آغا مسعود حسین۔بنگلہ دیش اور پاکستان
63. ہنری کسنجر۔وائیٹ پیپر آن ویسٹ پاکستان
64. زین العابدین۔RAW and Bangladesh
65. رابن گونارتنے۔Indian Intervention in Sri Lanka
66. جنرل گل حسن۔آخری کمانڈر انچیف
67. Pakistan Horizon Vol. XXV, XXXV
68. اسی تاوا۔India's Policy Towards Pakistan
69. بے نظیر بھٹو۔فارن پالیسی ان ریسکیو
70. بریگیڈیر صدیق سالک۔ہمہ یاراں دوزخ
71. ہفت روزہ پاک جمہوریت۔لاہور
72. ہفت روزہ ہلال۔راولپنڈی
73. سروپالی گوپال۔جواہر لال نہرو
74. تقاریر نیشنل اسمبلی آف پاکستان 1975
75. وی پی دت۔انڈین فارن پالیسی
76. World Military Expenditure and Arms Transfer by US Arms Central and Disarmament Agency 1967-76, P. 47 to 57
77. لیونارڈ سپکٹر۔Nuclear Proliferation Today
78. ٹیرو السمان ہربرٹ کرونسی۔The Islamic Bomb
79. جواہر لال نہرو۔بھارت مغربی جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیائی کور
80. جنرل ضیاء الحق کی تقاریر حصہ دوم

Marfat.com

81. Pakistan 1977-78 Official Handbook
82. کرنل محمد ذاکر۔ سیاچن دنیا کا بلند ترین محاذ جنگ
83. مارٹن اے شوگرمین۔ War Above The Clouds Siachen Glacier
84. ہیومن رائٹس کمیشن رپورٹس 1985-1990-1992
85. ہفت روزہ سنڈے۔ دلی 18 ستمبر 1993
86. ہفت روزہ ٹائمز آف انڈیا۔ 19 فروری 1992
87. ہفت روزہ نیشن۔ بنگلور 25 فروری 1994
88. ماہنامہ جہاد کشمیر راولپنڈی کے متعدد شمارے
89. حامد میر۔ کالم: قلم کمان۔ روزنامہ اوصاف راولپنڈی۔ 28 دسمبر 1999
90. ہفت روزہ انڈیا ٹوڈے کے متعدد شمارے
91. لیفٹیننٹ جنرل (ر) حمید گل کا لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن سے خطاب۔ 9 جولائی 1999
92. محترمہ نسیم زہرا کا کالم۔ روزنامہ نیوز 10 جولائی 1999
93. ایاز امیر کا کالم۔ روزنامہ ڈان 11 جولائی 1999
94. متین فکری۔ نواز کلنٹن ملاقات۔ ماہنامہ جہاد کشمیر 31 جولائی 1999
95. طارق اسمٰعیل ساگر: ''را'' اُردو ایڈیشن
96. ٹائمز آف انڈیا۔ 26 مارچ 2006
97. ہندوستان ٹائمز۔ 31 مئی 2000
98. Outlook. 12 Sept 2000
99. نئی دنیا۔ دہلی 3 تا 9 اکتوبر 2000
100. اخبار جہاں۔ 21 تا 27 مئی 2001
101. بریگیڈیر (ر) اے۔ آر۔ صدیقی۔ روزنامہ دی نیشن 4 جون 2001
102. ٹائمز آف انڈیا۔ 29 مئی 2001
103. ارشاد محمود۔ پاک بھارت مذاکرات۔ انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز۔ اسلام آباد
104. ڈاکٹر محمد عارف۔ پاک بھارت تعلقات 1972 تا 1982۔ پروگریسو پبلشرز۔ لاہور
105. طارق اسمٰعیل ساگر۔ تاریخ کی گواہی
106. طارق اسمٰعیل ساگر۔ کارگل کرائسس
107. حسن زمان۔ East Pakistan Crisis and India
108. اے۔ ایچ۔ سہروردی۔ A Tragedy in Kashmir
109. شیریں طاہر خیلی۔ The United States & Pakistan

Marfat.com

110. انورادھا سرین۔India & Afghanistan
111. راج ویر سنگھ۔US Pakistan and India
112. کے۔کے۔مشرا۔Kashmir & India Foreign Policy
113. شمسہ نواز۔India's Nuclear Weapon's Program
114. جواہر لال نہرو۔The Discovery of India
115. ڈی کے نمبرودی۔Pakistan's Islamic Bomb
116. ڈاکٹر محمد صفدر۔Pakistan Divided
117. رضا مہدی۔Pakistan Today
118. لیفٹیننٹ جنرل (ر) فضل مقیم۔Pakistan Cisis in the Leadership
119. محمد ظفر اللہ خان۔Pakistan Foreign Relation
120. سردار محمد ابراہیم خان۔Kashmir Saga
121. سردار عبدالقیوم خاں۔مقدمہ کشمیر
122. جان فریکر۔1965 کا فضائی معرکہ جنگ پاکستان۔مترجم لطیف احمد خان
123. ذوالفقار علی بھٹو۔اگر مجھے قتل کیا گیا
124. خواجہ افتخار حسین۔جب امرتسر جل رہا تھا
125. مشتاق احمد خان۔حیدر آباد کی ان کہی کہانی۔اُمت مسلمہ کا ایک دلخراش المیہ
126. میر غلام احمد کشفی۔مسئلہ کشمیر کچھ یادیں کچھ باتیں
127. کوثر نیازی۔اور لائن کٹ گئی
128. بے نظیر بھٹو۔Foreign Policy in Perspective
129. ایس ایم برق۔Pakistan's Foreign Policy - An Historical Analysis
130. اولف کیرو۔The Pathans
131. جی ڈبلیو چوہدری۔Pakistan Relations with India
132. پران چوپڑہ۔Contemporary Pakistan
133. افضال احمد۔2005 اور پاک بھارت تعلقات۔روزنامہ نوائے وقت
134 حبیب الرحمٰن کی ڈائری ہفت روزہ اخبار جہاں۔28 اگست تا 4 ستمبر 2005
135. ایضاً......13 تا 19 مارچ 2006
136. بھارتی وزارت دفاع کی مختلف ویب سائٹس
137. پاکستانی وزارت دفاع کی مختلف ویب سائٹس
138. ''سارک پولیس کی مضحکہ خیز تجویز'' اداریٰ نوٹ روزنامہ نوائے وقت 24 مارچ 2006

Marfat.com

اخبارات

روزنامہ نوائے وقت
روزنامہ جنگ
روزنامہ امروز۔لاہور-ملتان
روزنامہ پاکستان ٹائمز
روزنامہ نیوز
روزنامہ ڈان
روزنامہ دی نیشن
روزنامہ اُمت
روزنامہ خبریں
روزنامہ ایکسپریس
روزنامہ جناح
روزنامہ اوصاف
روزنامہ حریت کراچی
روزنامہ تعمیر راولپنڈی
روزنامہ کوہستان لاہور

دیگر ذرائع ابلاغ

- ☆ مصنف کتاب ہذا طارق اسمٰعیل ساگر کے 1985ء سے 2006ء تک وقتاً فوقتاً چھپنے والے مضامین جو متعلقہ موضوع کے حوالے سے لکھے گئے۔
- ☆ حکومت پاکستان کے جاری کردہ مختلف قرطاس ابیض، رپورٹس، غیر مطبوعہ تحقیقی رپورٹس۔
- ☆ مختلف شخصیات کے انٹرویوز، ملاقاتیں، تاثرات، ٹی وی سے نشر ہونے والے کچھ مباحثے۔
- ☆ مختلف اخبارات کے فورمز میں ہونے والے کچھ مباحثے۔

Marfat.com

704

افغانستان پر کیا گزری؟

مصنف: طارق اسمٰعیل ساگر

- ❖ تاریخ عالم کے سب سے بڑے فراڈ ''افغان جہاد'' کا آغاز کس نے، کب اور کیوں کیا؟ مجاہدین کی سادگی اور جانثاری کی قیمت کس نے اور کتنی وصول کی؟
- ❖ جہاد شروع کروانے والے کون تھے؟ مجاہدین کی حقیقت کیا ہے؟ اصلی اور نقلی مجاہدین کون ہیں؟
- ❖ اپنا مال و متاع راہِ شہادت میں لٹانے والوں پر کیا گزری؟
- ❖ افغان جہاد نے پاکستان میں کتنے مفلسوں کو ارب پتی اور کروڑ پتی بنایا اور کتنوں کو گونتاناموبے پہنچایا؟
- ❖ طالبان کون ہیں؟ کیا چاہتے ہیں؟ اور کیوں چاہتے ہیں؟
- ❖ سی آئی اے، موساد، خاد، را، آئی ایس آئی نے کیا کیا گل کھلائے؟
- ❖ زمین نے خون اُگلا، آسمان نے آگ برسائی۔
- ❖ جب انسانوں کے دن بدلے تو انسانوں پر کیا گزری۔

ایک تحقیق جو کئی پردہ نشینوں کے چہروں سے نقاب نوچے گی۔ ایک کتاب جو آپ کی بند آنکھیں کھولے گی۔ سچ کی جستجو کرنے والوں کے لئے ایک کڑوا سچ۔

طاہر سنز اُردو بازار، لاہور
فون: 7234137 - 7312159

Marfat.com

Marfat.com

یہ کتاب ہم اس فخر کے ساتھ پیش کر رہے ہیں کہ آج تک اس موضوع پر دنیا کی کسی بھی زبان میں پیش کی جانے والی کتاب میں اتنا مکمل، بھرپور مبسوط، جامع، تاریخی، تحقیقی اور تزویراتی مواد پیش نہیں کیا گیا۔ اس کی سب سے بڑی سند ساؤتھ ایشیا کے معاملات پر مکمل عبور رکھنے والے طارق اسمٰعیل ساگر کا نام ہے جو متعلقہ موضوع پر پاکستان، برطانیہ، امریکہ اور کینیڈا میں مختلف فورمز پر درجنوں لیکچرز دے چکے ہیں اور جنہیں اس موضوع پر اتھارٹی سمجھا جاتا ہے۔

پبلشر

[illegible] جان زیدی

طاہر سنز
40-بی اردو بازار-لاہور
فون: 7312159 - 7234137

Marfat.com